تنقیدِ شعری

(یہ عنوان مستقل ہے)

اب آپ بنیں گے اپنی دُنیا
دُنیا تجھے بھول جائیں گے ہم

(تاجور)

اگر ہمیں اپنی زندگی میں محبت کرنے والے اعزاء مخلص احباب، تعاون پسند ساتھی، ہمدرد پڑوسی، قدرشناس مربی، اور دستگیر رہنا نصیب ہو جائیں تو پھر یہ دُنیا ہمارے لئے بہشت ہے ۔

لیکن اگر عقارب صفت اقارب، خودغرض دوست۔ تخریب پسند ساتھی، بے درد پڑوسی اور بے اعتنا اہلِ نظر کے درمیان زندگی بسر ہوتی ہو۔ دوستوں کی دوستی دشمنوں کی دشمنی سے زیادہ گراں پڑ رہی ہو۔ ایسے منحوس ماحول میں سانس لے رہے ہوں جہاں ہمارے کمال سے چشم پوشی کی جاتی ہو۔ ہمارے ہنر کو لباسِ عیب میں پیش کیا جاتا ہو۔ ہمارے حسن خدمات کا کوئی صلہ نہ ملے ۔

ارباب اقتدار مذاق ہنرشناسی سے بیگانہ اور توفیقِ جوہرنوازی سے ناآشنا ہوں۔ تو پھر یہ رستی بستی دُنیا اپنی تمام وسعتوں کے باوجود ہمارے لئے تنگ ہو جائے گی۔ اور ہم اس ناقابل رشک زندگی سے گھبرا کر غالب کے الفاظ میں کہہ اُٹھیں گے کہ

"ہیں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دِل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دُنیا جل گیا"

دُنیا اور اہلِ دنیا کے خلاف ہمارا دِل بغاوت کرنے لگے گا دُنیا کے منافقانہ طرزِ عمل سے بیزار ہو کر ہمیں سمجھائے گا کہ

"تنہا نشین وصحبت دیو اختیار کن
کا ثارِ اُنس در گہر آدمی نماند"

ہم اپنے اعزا و اقارب، دوست احباب اور ساتھیوں سے بالکلیہ مقاطعہ کرکے عزلت نشینی ہی کو اپنی دنیا بنانے پر مجبور ہو جائینگے۔

شاعر اس رنج آگیں ماحول اور ناساز گار فضا سے متاثر ہو کر یہ کہہ رہا ہے کہ

"اب آپ بنیں گے اپنی دُنیا
دُنیا تجھے بھول جائیں گے ہم"

اِس شعر میں کوئی لفظ مشکل نہیں۔ کوئی ترکیب پیچیدہ نہیں۔ مختصر الفاظ ہیں مگر یہ تمام طویل وملول کن ماحول ان دو مختصر جملوں سے اپنی تمام درد ریز تفاصیل کے ساتھ نمایاں ہو رہا ہے ۔

"خدا تم کو توفیق دے اب وفا کی
اُمیدوں میں پھر جان ڈالی ہے ہم نے"

وقارالاعظم حضرت شرف (چادرہ)

اِس شعر کے الفاظ کی طرح مفہوم سادہ ہے۔ الفاظ بامعنی ہیں کوئی اغلاق نہیں۔ تعقیدِ لفظی ومعنوی سے مبرّا ہے۔ شعر میں [illegible] ہے [illegible] مصرعہ حد سحر تک اثر [illegible] ہو رہا ہے۔ "پھر" کا لفظ دوست کی عہدشکنیوں وفاپامالی اور عذر آشنائی کی المناک داستان بیان کر رہا ہے۔

اُمیدوں میں پھر جان ڈالی ہے ہم نے

اسی کے ساتھ اس لفظ "پھر" سے محبت کی سادہ لوحی، تجربہ فراموشی اور اُمید آرائی پر بھی تفصیلی روشنی پڑ رہی ہے۔ اسی قسم کے سحر پرور کلام کو سہل الممتنع کہتے ہیں کہ بظاہر نظر آسان اور ہر شاعر کے واسطے طبع آرائی کی ترغیب پیش کرتا ہے لیکن جب کوئی ایسا کہنا چاہے تو یہ محسوس کرا دے کہ ایسا کہنا ناممکن ہے ۔

"حقیقت ہے تو اتنی ہے طلسم رازِ ہستی کی

کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہو جائے"

(مولینا سیماب اکبرآبادی)

حقیقت ہے تو اتنی ہے طلسم راز ہستی کی
کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی ———

یہاں تک تو یہ شعر باعتبار مفہوم و الفاظ عامیانہ ہے۔ یعنی ہر کہہ ومہ شاعر اور غیر شاعر۔ عالم اور جاہل سب کہہ سکتے ہیں۔ لیکن

"افسانہ ہو جائے"

کا مہ پارہ لگا کر زریں کار سحر نگار نے عالم وجدان کو جگمگا دیا ہے۔

سگِ دنیا پس مردن بھی جیفہ خوار دنیا ہے
کہ اس کتے کی مٹی سے بھی کُتّا گھاس پیدا ہے

(خاقانی ہند ذوق مرحوم)

حضرت پیغمبر اسلام علیہ اسلام کا ارشاد ہے کہ

"الدنیا جیفۃ و طالبھا کلاب"

(دنیا مردار ہے اور دنیا پرست مُردار خور)

اس حدیث سے ذوق نے یہ مضمون پیدا کیا کہ طالب دنیا نہ صرف دنیا ہی میں مردار خوار ہے بلکہ مرنے کے بعد اُس کی قبر پر گل و ریحان کی بجائے کُتّا گھاس اُگتی ہے۔ اور آنے جانے والوں کو چمٹتی ہے۔

ذوق اور غالب دونوں صنائع و بدائع کو نظم کرتے ہیں۔ مگر غالب صنعت آرا ہے۔ اور ذوق صنعت پرست۔ غالب صنعت کو اس خوبصورتی سے نظم کرتا ہے کہ شعر کی لطافت دوچند ہو جاتی ہے اور قاری یہ محسوس نہیں کر سکتا کہ شاعر نے بالقصد صنعت کو نظم کیا ہے۔ مگر ذوق اس حریصانہ انداز میں صنعت نویسی کرنے کا عادی ہے کہ شعر کو پڑھنے والا سب سے پہلے یہی احساس کرنے لگتا ہے کہ شاعر نے صنعت کو نظم کرنے کے لئے شعر کیا ہے شعر کو آراستہ کرنے کی خاطر صنعت استعمال نہیں کی۔

ملاحظہ فرمائیے:-

"کہ اِس کُتّے کی مٹی سے بھی کُتّا گھاس پیدا ہے"

مجھے تو یہ شعر پڑھ کر سرے سے صنعت ہی سے نفرت ہو گئی ہے۔ یہ شعر اپنی تخلیلی اور اجتماعی دونوں صورتوں میں مذاق شعری کے لئے ناقابل برداشت ہو رہا ہے۔ اِس کے بالمقابل غالب کی صنعت آرائی توجہ طلب ہے۔

"جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں"

تاجور

رباعیات

پہلو نہ بدل مجھے ڈبونے کیلئے
ہر روز نئی فضا میں کھونے کیلئے
تکمیل غمِ حیات ہو گی کہ نہیں
آزادیٔ بے جہات ہو گی کہ نہیں

اے نفس ٹھہر کہ خاکساری تیری
دھوکا تو نہیں بلند ہونے کیلئے
تم دُوسری دُنیا کی سُناتے ہو خبر
دُنیا سے کبھی نجات ہو گی کہ نہیں

نجم آفندی

سوال و جواب

سوالات

(۱) اردوئے معلّیٰ اور اردوئے مطلّیٰ میں کیا فرق ہے ؟

پیارے لال شاکر بی - اے
ایم - بی ہائی اسکول (پٹھانکوٹ)

(۲) دلّی اور لکھنؤ کے ادبی اسکولوں کی خصوصیات بیان فرما کر ممنون کیجئے!

قاضی فیض محی الدین مسلم زمیندارہ ہائی اسکول (گجرات)

(۳) ایک کتاب میں یہ فقرہ میری نظر سے گزرا تھا - مگر مجھے اس کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا - اس کی تشریح فرمائی جائے۔

"شکل اوّل بدیہی الانتاج ہوتی ہے -"

عبدالعزیز اظہر منشی فاضل جالندھر شہر

(۴) آسمان کو فلک مینائی کیوں کہتے ہیں؟
لکھنؤ کے مشہور شاعر امیر کو بھی امیر مینائی لکھا جاتا ہے مینائی کا کیا مطلب ہے؟

ہربنس لال گپتا بی - اے چکوال

(۵) آپ نے پہلا شعر کب لکھا تھا، کس جذبہ سے اثر لے کر لکھا تھا اور وہ شعر کیا تھا؟ تفصیل سے بیان فرما کر رہینِ کرم فرمائیے!
میں مشاہیر شعراء کے اوّلین اشعار جمع کر رہا ہوں -

نیاز احمد راز کوٹلوی

(۶) آپ کے حالاتِ زندگی مطلوب ہیں اور تصویر بھی - حالاتِ زندگی میں خاندان - پیدائش - عمر - تعلیم - معاش - خدماتِ ادبی موجودہ مشاغل پر روشنی ڈالئے -

عبدالعلیم فانی متھرا

(۷) میونسپل لائبریری میں آپ کا رسالہ شاہکار نظر سے گزرا اس کا حسنِ ظاہری آنکھوں کو روشنی بخشتا ہے اور اُس کے بلند اور مفید مضامین دل کو سرور پہنچاتے ہیں - میں خریدار بننا چاہتا ہوں - بواپسی ایک پرچہ بطور نمونہ بھیج کر ممنون فرمائیے!

محمد صدیق طالب علم
انٹرمیڈیٹ کالج لکھنؤ

جوابات

(۱و۲) اردوئے معلّیٰ سے یوں تو اردو زبان ہی مراد ہے - لیکن دہلی کے قلعۂ معلّیٰ کی اردو چونکہ مستند سمجھی جاتی تھی اس لئے اہلِ دہلی نے دلّی کی اردو کو اردوئے معلّیٰ کا لقب دیا - وہ اردوئے معلّیٰ کے لفظ سے فصیح اور مستند زبان مراد لیتے ہیں - لکھنؤ والوں نے دلّی کی بربادی کے بعد چونکہ اردو زبان کی سرپرستی کی - اسے جلا دی، ناخوشگوار الفاظ سے اسے پاک کیا - اس کی لفظیات کے لئے قوانین و آئین بنائے - اس طرح اپنے مطلب کی چیز بنا کر اسے اردوئے مطلّیٰ کا خطاب دیا -

گویا لکھنؤ کی ترقی پذیر اور مستند اردو اردوئے مطلّیٰ کے نام سے موسوم ہے -

دلّی کا تمدّن چونکہ ہمیشہ سادگی آمیز رہا ہے - دلّی کی معاشرت تکلفات و تصنعات سے منزہ چلی آئی ہے - اس کا اثر قدرتی طور پر دلّی کی زبان و ادب پر بھی پڑا ہے - اس لئے دلّی کی شاعری میں خارجی عنصر بہت کم ہے - الفاظ و عبارات کی آرائش دلّی کے اردو ادب سے نمایاں نہیں ہوتی -

بخلاف لکھنؤ کے کہ لطافت، نفاست و نزاکت لکھنوی تہذیب کی امتیازی خصوصیات رہی ہیں -

شاہی عہد کے لکھنؤ کی معاشرت تکلّف و تصنع سے غیر قدرتی سی ہو گئی تھی - اس بنا پر اُس وقت کی لکھنوی شاعری اور انشا پردازی میں آرٹ کو زیادہ دخل رہا - صنائع و بدائع کا استعمال بڑھتے بڑھتے ضلع جگت تک ترقی کر گیا تھا - میرزا رجب علی سرور کی "فسانۂ عجائب" اور پنڈت دیا شنکر نسیم - کی مثنوی "گلزارِ نسیم" اُس عہد کی صنعتی نثر و نظم کے نمونے کے طور پر پیش کی جا سکتی ہیں -

اس کے مقابلے میں دلّی کی زندگی ہر رنگ میں حسنِ فطرت کی آئینہ دار رہی ہے - اسی لئے دلّی کے ادب و شاعری میں فطری سادگی نمایاں خصوصیت بنی رہی -

میر حسن کی مثنوی سحر البیان اور میر امن کی "باغ و بہار" کا موازنہ گلزارِ نسیم اور فسانۂ عجائب سے کیا جائے تو دلّی و لکھنؤ کے ادبی اسکولوں

کا امتیاز سمجھ میں آجاتا ہے -

(۳) یہ منطقی زبان ہے - منطق میں ہر دعوے اشکال اربعہ میں سے کسی شکل کے ذریعہ ثابت کیا جاتا ہے - جو دعوے شکل اوّل کے قالب میں ڈھل جائے وہ یقینی الثبوت بن جاتا ہے مثلاً

دعوےٰ یہ ہے کہ " دنیا حادث ہے ۔"

اسے شکل اوّل کے معیار پر کسا جائے گا اس طرح کہ

دنیا تغیر پذیر	ہر تغیر پذیر شئے حادث ہوتی ہے
صغریٰ	کبریٰ

حد اوسط کو ساقط کرنے سے یہ نتیجہ نکلے گا کہ

" دنیا حادث ہے "

یہ نتیجہ بدیہی اور ناقابلِ انکار متصور ہوگا - اس بحث کا سلسلہ دراز ہے

(۴) مینا - شراب کی صراحی کو کہتے ہیں - یہ عموماً نیلے رنگ کی ہوتی تھی - آسمان کا رنگ بھی نیلا نظر آتا ہے - اسی لئے آسمان کو "چرخِ نیلگوں" اور فلکِ مینائی کہا جاتا ہے - فلکِ مینائی کے معنی ہوئے ، صراحی جیسے نیلے رنگ کا آسمان - باقی لکھنو کے مشہور شاعر مفتی امیر احمد مینائی مرحوم کے نام کے ساتھ "مینائی" کا ضمیمہ ـــ ؟ وہ کچھ اس لئے نہ تھا کہ مرحوم کا رنگ نیلا تھا ! بلکہ لکھنو میں شاہ مینا رحمتہ اللہ علیہ ایک بہت بڑے پیرطریقت گزرے ہیں - مفتی امیر احمد صاحب کا خاندانی یا روحانی سلسلہ شاہ مینا سے ملتا ہے - اس لئے آپ کے خاندان کا ہر فرد اپنے نام کے ساتھ "مینائی" کا لفظ استعمال کرتا ہے -

(۵) [illegible] اپنے عمزاد بھائی کے خلاف انتقام کے طور پر چار سال کی عمر میں کہا تھا - وہ شعر کیا تھا؟ یہ نہ بتاؤں گا [illegible] اگر ارادے کو بھی دخل ہے تو پھر تو سرے سے وہ شعر ہی نہ تھا - ارتجالاً زبان پر ایک منظوم فقرہ آگیا تھا بالکل اسی طرح جیسے لکھنو کے ایک سقے نے کنوں سے پانی بھرتے ہوئے مینہ کی جھڑی دیکھ کر بے ارادہ یہ مصرعہ چست کیا تھا کہ

"اگر یونہیں پانی برستا رہے گا"

یہ سن کر اس کے دوسرے ساتھی پر شاعری طاری ہوگئی اور اس نے فوراً یہ کہہ کر مصرعے کو مطلع بنا دیا ع

تو کاہے کو گلیوں میں رستا رہے گا

میرا اوّلین شعر بھی کچھ اسی قسم کی تک بندی ہے - اس میں ایک لفظ کا تلفظ بھی غلط ہے - میں اس غلطی کو رنگ دوام دینا پسند نہیں کرتا -

(۶) آپ کو میرے حالاتِ زندگی مطلوب ہیں ؟ کچھ انتظار کیجئے !

جہازِ عمر تیزی سے رُو بہ ساحل ہے مستقبل قریب ہی میں ایک صبح کے لاہوری اخبارات آپ کو میرے حالاتِ زندگی سے باخبر کر دیں گے - اس وقت تصویر میرے وارثوں سے طلب کر لیجئے گا -

میرے موجودہ مشاغل یہ ہیں :-

ماضی سے متاسف ہوں - حال سے پریشان اور مستقبل سے خائف کبھی فرصت ملتی ہے تو اردو زبان کی جان کو بددعا دے لیا کرتا ہوں -

(۷) آپ نے میونسپل لائبریری میں شاہکار کا پرچہ دیکھا - خوش ہوں کہ اس کا مطالعہ آپ کے دل و دماغ کے لئے موجب نور و سرور ہوا - آپ اس کے خریدار بننا چاہتے ہیں؟ جانے دیجئے اس خیال کو - چھ روپے اگر آپ کے بجٹ میں زیادہ ہیں تو کسی غریب رشتہ دار کو بخش دیجئے ! اور لائبریری میں جا کر شوقِ مطالعہ کی تسکین کر لیا کیجئے - اور اگر خریداری ہی پر اصرار ہے تو شکریہ - چھ روپے دفتر شاہکار کے نام بھیج دیجئے -

رہا نمونہ؟ وہ آپ نے لائبریری ہی میں دیکھ لیا ہے - وہی رائے قائم کر لینے کے لئے کافی ثابت ہو چکا ہے - مزید نمونے کی طلب سے توجہ آنے کے ٹکٹ مینیجر شاہکار کے حوالے کیجئے ! دوسرا نمونہ آپ کی خدمت میں بھیج دیا جائے گا -

معاف فرمایئے مجھے شبہ ہوتا ہے کہ آپ مفت بینی کے مرض میں مبتلا ہیں - تو قبلہ مفت بینوں کے مظالم کا تو میں کارٹون ہوں - اب دل پر کسی مزید زخم کی گنجائش ہی نہیں کہ

"تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم"

میں اپنی معاشی اور صحافتی زندگی میں مفت خوروں ، مفت گیروں اور مفت بینوں کی ضرورت سے زیادہ خدمت انجام دے چکا ہوں - مینیجر کی زبانی معلوم ہوا کہ میرے دفتر کے مفت پیشہ گان کی فہرست میں آپ کا نام نامی پہلے ہی سے درج ہے - گویا مجھ سے اپنی مفت بینی کا ٹیکس آپ وصول کر چکے ہیں - اب کوئی نیا پرچہ نمونے میں طلب کیجئے ! آپ کے دیرینہ ستم خوردگان تو شاید آپ کی مزید خدمت کے لائق نہیں رہے ہیں -

تاجور

تصحیح

(یہ عنوان مستقل ہے)

"آرام آگیا"

پنجاب میں بیماری سے شفایاب ہونے کے معنی میں

"آرام آگیا"

بولتے ہیں۔

یہ صحیح نہیں۔ صحیح اور فصیح محاورہ یہ ہے:۔

آرام ہوگیا

اردو پڑھانے والے اساتذہ اس تصحیح کو اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیں۔ کیونکہ تعلیمی فضاؤں کے ذریعہ جو تصحیح رائج ہوتی ہے ہمہ گیر بن جاتی ہے۔

تاجور

عالمگیرؒ پر ایک بہتان اور اُس کی تردید

حضرت اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ پر جتنے بہتان لگائے گئے ہیں۔ شاید ہی دنیا کے کسی بادشاہ پر لگائے گئے ہوں۔ ستمبر ۱۹۳۷ء کے ہندی رسالہ سرسوتی الہ آباد میں "جے جنگل دھر بادشاہ" کے عنوان سے ایک مضمون نظر سے گزرا۔ اس سے حضرت عالمگیر علیہ الرحمۃ کی ذات کے ساتھ ایک ایسی بہتان بندی کا پتہ چلا جو شاید بہت سے مؤرخین کے علم میں کبھی نہ آئی ہو، لیکن مقام مسرت ہے کہ اس بہتان کی کافی و کامل تردید خود مضمون نگار کنور چاند کرن شاردا نے ہی کر دی ہے۔ اگرچہ کنور صاحب کا مقصد حضرت عالمگیرؒ کی ذات سے بہتان کا دفع کرنا نہیں، بلکہ بیکانیر کے ایک مسلمان فقیر کی آمدنی بند کرانا ہے۔ پھر بھی ہم خوش ہیں کہ ہر نوع ایک تاریخی بہتان کی تردید ہو گئی۔ اس خوشی کے ساتھ ہمیں اس کا رنج بھی نہیں کہ ایک مسلمان فقیر کی آمدنی بند ہو جائے گی۔ جس روایت کی بنا پر اسے یہ آمدنی ہوتی ہے وہ ایک مسلمان کے لئے حد سے زیادہ شرمناک ہے۔ اس آمدنی سے تو اس فقیر خاندان کو از خود دستکش ہو جانا چاہیئے۔

ہم ایک تاریخی غلط بیانی کی تردید کے پیش نظر کنور چاند کرن شاردا کے مضمون "جے جنگل دھر بادشاہ" کا ترجمہ کر دینا از بس ضروری سمجھتے ہیں۔

ابو محمد امام الدین رام نگری

ہندو سماج میں دان کا بہت غلط استعمال ہوتا ہے۔ فرضی قصے گھڑ کر لوگ ہندو بھائیوں سے کس طرح پیسے وصول کرتے ہیں۔ اس کا ثبوت "جے جنگل دھر بادشاہ کا فسانہ ہے۔ میں بعد از غور و فکر اس کی صداقت کے بارے میں جس نتیجے پر پہنچا ہوں اسے ہندو بھائیوں کے مفاد کی غرض سے یہاں سپرد قلم کرتا ہوں۔

بیکانیر کے فقیر جیون شاہ کی اولاد (نیچے والے فقیر / سید عبدالرحمٰن وغیرہ) کو اب تک ریاست بیکانیر میں فی گھر سالانہ ایک پیسہ ملتا ہے۔ اگر کوئی پیسہ دینے سے انکار کرتا ہے تو ریاست اس پیسے کو وصول کرا دیتی ہے۔

اس پیسے کی وصولی کے حق کے متعلق اس فقیر خاندان کے پاس پوس بدی ۶ سمت ۱۷۲۲ (مطابق یکشنبہ ۱۷ دسمبر ۱۶۶۵ء) کی ایک تحریر موجود ہے۔ جس کا انگریزی ترجمہ شائع ہوا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ ایک بار اورنگ زیب تقریباً تمام ہندو راجاؤں کو لئے ہوئے اٹک پار جا رہا تھا۔ اثنائے راہ میں راجاؤں کو اندیشہ ہوا کہ بادشاہ انہیں اٹک پار لے جا کر کوئی دغا تو نہ کرے۔ اس معاملے پر غور کرنے کے لئے تمام راجا شب میں یکجا ہوئے اور بالآخر طے پایا کہ جیون شاہ کے ذریعے بادشاہ کی نیت معلوم کرنے کی کوشش کی جائے۔

اس قرار داد کے مطابق تمام راجہ جیون شاہ کے پاس گئے اور اُن سے استدعا کی کہ وہ بادشاہ کے ارادے کا پتہ لگا دیں۔ جیون شاہ نے راجاؤں کی درخواست منظور کر لی اور ہدایت کی کہ وہ ان باتوں کو مخفی رکھیں وہ بادشاہ کے ارادے کا پتہ لگا دیں گے۔ چنانچہ جیون شاہ اورنگ زیب کے پاس گئے اور باتوں ہی باتوں میں معلوم کر لیا کہ بادشاہ کا ارادہ کیا ہے۔

جیون شاہ نے بادشاہ کے پاس سے واپس آ کر رؤسائے ہنود سے کہا کہ بادشاہ چاہتا ہے کہ تمہیں اٹک پار لے جا کر مسلمان کر لے۔ اس لئے تم لوگوں کو کوشش کرنی چاہیئے کہ اٹک پار نہ جاؤ۔ چنانچہ جب بادشاہ نے راجاؤں کو اٹک کے پار جانے کے لئے کہا تو راجاؤں نے عرض کی کہ آپ بادشاہ ہیں پہلے آپ کو دریا عبور کرنا چاہیئے۔ اس کے بعد ہم بھی آپ کی پیروی کریں گے۔

اورنگ زیب نے راجاؤں کی بات مان لی اور مسلمان فوج کو لے کر اٹک پار چلا گیا۔ اس کے بعد جب راجاؤں کے لینے کے لئے کشتیاں اس پار آئیں تو ان کشتیوں کے توڑنے کے لئے سب سے پہلا وار فرمانروائے بیکانیر کرن سنگھ راٹھور نے کیا۔ اس کے بعد والیان ہند نے مل کر تمام کشتیاں تباہ و برباد کر دیں۔

جیون شاہ نے راجاؤں کی جو خدمت انجام دی تھی اس کے صلے میں راجاؤں نے چاہا کہ جیون شاہ اور اُن کی اولاد کے لئے اپنی ریاست

میں فی گھر ایک روپیہ سالانہ مقرر کردیں، لیکن جیون شاہ نے اس رقم کو زیادہ قرار دیا اور ایک پیسہ سالانہ فی گھر لینے پر اکتفا کی۔

راجاؤں نے جیون شاہ کی بات مان لی۔ چونکہ کرن سنگھ والئی بیکانیر نے شاہی کشتیوں کے توڑنے میں تقدیم کی تھی۔ لہذا اس کو "جے جنگل دھر بادشاہ" کا خطاب دیا گیا۔ اس تحریر پر حسب ذیل راجاؤں کے نام درج ہیں جو اس وقت وہاں موجود تھے۔

(۱) مرزا راجہ جے سنگھ والئی جے پور۔
(۲) مہاراجہ جسونت سنگھ والئی جودھ پور۔
(۳) رنبیر سنگھ فرزند والئی اودے پور۔
(۴) رام سنگھ ہاڑو والئی کوٹا۔
(۵) راجہ راج سنگھ والئی کشن گڑھ۔
(۶) راول جگت سنگھ والئی جیسلمیر۔
(۷) راجہ شیوداس سنگھ جاٹ والئی جیرواڑا۔
(۸) راجہ گج سنگھ والئی نرور۔
(۹) دلپت سنگھ نکھیل والئی رلیواں۔

اسی واقعہ کے متعلق ایک گیت بھی مشہور ہے جو بیکانیر کے چارن (بھاٹ) دیال داس کی سمت ۱۹۰۸ (مطابق ۱۸۵۱ء) کی لکھی ہوئی "کھیات" (؟) کے صفحہ ۲۳۹ پر ملتا ہے۔

ڈاکٹر ٹے سی ٹوری نے اسی "قلمی کھیات" سے اس گیت کو "بیکانیر۔ پروز کرانیکل" جلد ۲ صفحہ ۱۱ - ۱۲ میں نقل کیا ہے۔ ڈاکٹر ٹے سی ٹوری نے ۱۹۱۸ء میں یہ کتاب تصنیف کی ہے اور "بنگال ایشیاٹک سوسائٹی" نے اسے شائع کیا ہے۔

اس گیت میں اورنگ زیب کا راجپوتوں کو اٹک پار لے جا کر مسلمان کرنے اور راجاؤں کے کشتیوں کے توڑنے کا ذکر تو ہے لیکن جے جنگل دھر بادشاہ کا تذکرہ نہیں ہے۔ قارئین کے ملاحظے کے لئے وہ گیت نقل کیا جاتا ہے :-

کرن پرتھی اکراہ بپت ساہ آرمبھ کرے
کو پچ کرئیلے درکوچ کاج
اٹک اسواران راکتک سب اترے
رہے تٹ وار ہر وانر راجہ

(۲)

بنس شٹ تیس مل بات یہ بچاری ؛ جور اورنگ پڑے سور جاہڑ و
سور دو سو کیوان بھوج ساہیاں ؛ آبھ پڑتا ہور و بھوپ آرڑو

(۳)

کو ہاڑا مارا جہاج ٹبکا کرے ؛ دھیر ساز ادھرے مسٹ دھو کو
کران کھگ تول مکھ بول کھیو کرن ؛ جیتے او ایتے نہیں جو کھو

(۴)

کرن باکھانڈ دنیان گھن گھن کہے ؛ دھرم چھتریان بھوج امر دھارو
اٹک سوں سیاں ہدوان آیو اُوارڑ ؛ موارڑ پت ساہ بیکان مارو

ہمارا خیال ہے کہ متذکرہ بالا کاغذ (جو جیون شاہ کی اولاد کے پاس ہے) فرضی ہے۔ اس لئے کہ ہندو راجہ اورنگ زیب کے ساتھ ایسی گستاخی ہرگز نہیں کر سکتے تھے۔ اور اگر وہ اس کا کیمپ چھوڑ کر اس طرح بھاگتے تو بادشاہ اُنہیں پوری سزا دئے بغیر نہ چھوڑتا۔ لیکن اس واقعہ کی بنا پر کسی ریاست پر فوج کشی کرنے کا تذکرہ نہیں ملتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس وقت راجپوت راجاؤں کو اٹک پار جانے میں کوئی خوف نہیں تھا۔ کیونکہ اکبر، جہانگیر، شاہجہان وغیرہ کے وقت میں شاہی فوجیں بلخ اور بخارے تک جا چکی تھیں۔ راجا لوگ بھی اٹک پار رہ چکے تھے۔ ایسی حالت میں ان کے لئے اٹک کے پار جانے میں اندیشہ کرنا بالکل بے معنی تھا۔

تیسری بات یہ ہے کہ جن راجاؤں کے نام اس تحریر میں درج ہیں ان میں سے کشن گڑھ کے راجا راج سنگھ راٹھور اس وقت موجود نہیں تھے۔ کیونکہ وہ سمبت ۱۷۶۳ میں مسند نشیں ہوئے تھے۔ اور سمبت ۱۸۰۵ (مطابق ۱۷۴۹ء) میں انتقال کر چکے تھے[1]

اسی طرح جیسلمیر میں اس وقت راول امر سنگھ نہیں بلکہ جگت سنگھ حکمران تھے۔ راول امر سنگھ سمبت ۱۷۱۷ میں گدی پر بیٹھے تھے اور سمبت ۱۷۵۹ میں اُن کا انتقال ہو چکا تھا[2]

چوتھی بات یہ ہے کہ مہاراجہ سوائی جے سنگھ والئی جے پور سمبت ۱۷۲۱ میں شیواجی کے مقابلے کے لئے دکن بھیج دئے گئے تھے اور وہ دکن ہی میں ساون بدی ۳ سمبت ۱۷۲۴ (مطابق ۱۱ جولائی ۱۶۶۶ء) کو مر چکے تھے۔

پانچویں بات یہ ہے کہ اورنگ زیب سمبت ۱۷۲۱ سے سمبت ۱۷۲۳ تک صرف دلی اور آگرے میں رہا۔ وہ ماگھ سدی یکم سمبت ۱۷۲۰ (مطابق ۱۹ جنوری ۱۶۶۴ء) کو کشمیر سے دلی واپس آ گیا تھا۔ اس کے بعد کا تک

[1] چارن رام ناتھ رتنو، تاریخ راجستان صفحہ ۲۲۰ (۱۸۹۲ء)
[2] مہتہ نتھ مل ماہیشوری، تواریخ جیسلمیر صفحہ ۶۱ (۱۸۹۱ء)

سمبت ۱۷۲۳ سے قبل وہ پنجاب کی طرف گیا ہی نہیں۔

ان حقائق کی موجودگی میں متذکرہ بالا فقیر کے خاندانی کاغذ کو قابلِ اعتماد قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن بعض لوگ ایک اور ثبوت پیش کرتے ہیں۔ ایک کتاب جس کا نام "سوا ہو نزی" (شوک سار) ہے اور جو مہاراجہ کرن سنگھ (سمبت ۱۷۲۶ - ۱۶۸۸) کے عہد میں بیکانیر میں کسی نامعلوم پنڈت نے لکھی تھی۔ اس میں ایک دوہا ہے۔

"نیہوں تپے راجہ کرن جنگل کو پتی ساہ"

ان کا خیال ہے کہ اس دوہے میں "جنگل کو پتی ساہ" کا جو ٹکڑا ہے اسی سے "جے جنگل دھر" نکلا ہے۔ لیکن یہ خیال بھی قابلِ غور ہے۔ اس لئے کہ اس دوہے میں تو اس کا صرف ریگستانی علاقے کا راجہ ہونا ظاہر کیا گیا ہے۔ اس سے (راجاؤں کے مسلمان کرنے) مذکورہ بالا واقعہ کا کوئی تعلق ثابت نہیں ہوتا۔ اسی کویتا (نظم) میں بیکانیر کا نام بھی "بکرم پور" لکھا ہوا ملتا ہے۔ مثلاً

بکرم پور سوہا منو سکھ سمپت کی ٹھور
ہندوستان ہندو دھرم البسو شہر نہ اور

یہ سب کویوں (شاعروں) کی خیال آرائیاں ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ پوس سدی ۱۲ مطابق ۲۸ دسمبر ۱۸۷۶ء کو جب ملکہ وکٹوریہ نے قیصرۂ ہند کا لقب اختیار کیا تھا۔ دلی میں ایک عظیم الشان دربار منعقد ہوا تھا۔ اس دربار میں برطانوی حکومت کی جانب سے ہندوستانی رئیسوں کو ریشمی جھنڈا ملا تھا۔ جس پر "قیصرۂ ہند" لکھا ہوا تھا، ان جھنڈوں پر دوسری طرف [illegible] کے مطابق ان کا نشان حکومت اور "موٹو" بھی درج تھا۔ لیکن یہ نشان ہائے ریاست بھی برطانوی حکومت نے رئیسوں کی رائے اور اپنی منظوری سے قائم کئے تھے۔ اس لئے کہ ان میں جی۔سی۔ایس۔آئی اور کے۔سی۔ایس۔آئی وغیرہ خطابوں کے علاوہ ہمیلیوں کا بھی اندراج کیا گیا تھا۔ علاوہ ازیں جن راجاؤں نے اس وقت اپنا موٹو طے نہیں کیا تھا۔ انہیں موٹو کے بغیر صرف ان کا نشان حکومت بنا کر ہی جھنڈے دیدئے گئے تھے۔ اس کے ثبوت میں ریاست جیسلمیر کا نام پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ اس ریاست نے ابھی حال میں اپنا موٹو "چھاترا لوایا دوایتی" قرار دیا ہے۔

اسی طرح۔

"بل ہٹ بنکا دیوڑا کرنت بکا گوڑ"
"ہاڑا بنکا گاڑھ میں ان بنکا راٹھور"

اور۔

"جو دڑھ راکھے دھرم کو تہہ راکھے کرتار"

موٹو بھی بعد ہی کے تصنیف کردہ معلوم ہوتے ہیں۔ امید ہے کہ اہلِ علم ان باتوں پر غور کر کے اظہار رائے کی زحمت گوارا کریں گے۔

میرا مقصد تو اس مضمون سے یہ ہے کہ باشندگان بیکانیر پر اس فرضی فسانے کی بنا پر جو فی گھر ایک پیسہ سالانہ عاید ہے وہ بند ہو جانا چاہیئے فرضی فسانے کی بنا پر ٹیکس ادا کرنا درست نہیں ہے۔

اس مضمون کے لکھنے میں ہمیں جودھ پور کے مشہور مؤرخ منشی دیوی پرشاد جی کے جانشین اور پوتے منشی پرشوتم پرشاد گوڑ بیرسٹر نیز تاریخ نویس جناب جگدیش سنگھ صاحب گہلوت سے امداد ملی ہے۔ اس لئے وہ ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں۔ (سرسوتی بابت ستمبر ۱۹۳۷ء)

نوٹ:۔

اس مضمون کے ترجمہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جیون شاہ یا اس کی اولاد کو اتنی جرأت نہیں ہو سکتی کہ وہ ایسی بے اصل دستاویز ترتیب دے اور اس کے ذریعے باشندگان بیکانیر سے سالانہ باضابطہ ٹیکس وصول کرے اور نہ ٹیکس کی طرح لوگ اسے باقاعدہ ایک پیسہ سال دے سکتے تھے۔ ایسی حالت میں ریاست اس سے باز پرس بھی کر سکتی تھی لیکن اس کے برعکس ریاست خود انکار کرنے والوں سے پیسے وصول کرا دیتی ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہے کہ یہ پرچہ ریاست بیکانیر کے ایما اور منشا کے مطابق تیار کیا گیا اور محض اس لئے تیار کیا گیا کہ اورنگ زیب اور اسلامی حکومت کی جانب سے ہندوؤں کا خیال خراب کیا جائے۔ اس سازش کی پردہ دری سے اس حقیقت پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ اسی طرح نہ جانے کتنے واقعات حضرت اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے مسلم فرمانروایان ہند کے خلاف گھڑ لئے گئے ہوں گے۔ جنہیں آج تاریخی حیثیت حاصل ہے اور انہیں بہتانات کی بنا پر شاہانِ اسلام کی ہندوکشی کی ہولناک عمارت کھڑی ہے۔

جس مسلمان فقیر نے اس سازش کے لئے اپنے کو پیش کیا وہ بہت بڑا قومی غدار تھا۔ اور اس کی اولاد جو اس غداری کے صلے میں بیکانیر سے فی گھر ایک پیسہ سالانہ وصول کرتی ہے۔ اس کی شرمناک قومی بے حمیتی ہے۔ بیکانیر کے مسلمانوں کو خصوصاً اور مسلمانان ہند کو عموماً چاہیئے کہ وہ ریاست بیکانیر سے کہیں کہ وہ اس پیسے کی وصولی کو حکماً بند کرا دے۔

ابو محمد امام الدین رامنگری

ایک رات

(۱)

نیلگوں چرخ ابر پوش ہے آج — ذرّہ ذرّہ سکوں فروش ہے آج
چار سُو خوفناک ظلمت ہے — بزمِ کُن اِک مقامِ ہیبت ہے
انجمِ تابدار غائب ہیں — رات کے سحر کار غائب ہیں
جلوۂ منظر نواز نہیں — طائرِ دل نوا طراز نہیں
ابر خاموش ہے، ہوا خاموش — سازِ فطرت کی ہر نوا خاموش
موت ساکن ہے، زندگی ساکن — رگِ ہستی کی بیکلی ساکن
پُرسکوں عالمِ حیات تمام — بے صدا بزمِ کائنات تمام
عیش و غم کا وجود — خواب و خیال — عالمِ ہست و بُود — خواب و خیال
رنجِ امروز، فکرِ فردا — وہم — وہم ہر روز کا یہ جھگڑا — وہم
منظرِ صبح و شام — ایک فریب — زندگی کا نظام — ایک فریب
ذکرِ مستی جوانی — ہیچ — قوتِ عیش و کامرانی — ہیچ
لطفِ راز و نیاز — بے بنیاد — لذّتِ سوز و ساز — بے بنیاد

لو وہ برقِ تپاں چمک اُٹھّی — دفعتہً دل میں اِک کسک اُٹھّی
مضطرب روشنی ہوئی پیدا — جسم میں سنسنی ہوئی پیدا
پھر اُسی طرح چھا گئی ظلمت — رنگ اپنا جما گئی ظلمت

آہ! یہ منظرِ ہراس انگیز
کیا کہوں اپنا حالِ یاس انگیز

(۲)

شہر کے اِک اُداس گوشے ہیں — سبز منڈی کے پاس گوشے ہیں

وہ جہاں تنگدست رہتے ہیں — حادثاتِ زمانہ سہتے ہیں

جن کے مسکن ہیں بے چراغ تمام — جن کے سینے ہیں داغ داغ تمام

کوئی جن کا شفیقِ حال نہیں — جن کے زخموں کا اندمال نہیں

ہر نفس آہِ سرد بھرتے ہیں — شکرِ پروردگار کرتے ہیں

پاس کھانے کو ہے نہ پینے کو — اِک غمِ بیکسی ہے جینے کو

آہ! کیا جانگزا ہے ناداری

کوئی غیبی سزا ہے ناداری

وجہِ آلام بے حساب ہے یہ — سو عذابوں کا اک عذاب ہے یہ

سختیاں جھیل جھیل کر جینا! — جان پر کھیل کھیل کر جینا!

کوئی نادار ہو خدا نہ کرے — جی سے بیزار ہو خدا نہ کرے

کوئی مفلس کو پوچھتا ہی نہیں

جیسے اُس کا کوئی خدا ہی نہیں

ہاں! تو ایسے اُداس گوشے ہیں — سبز منڈی کے پاس گوشے ہیں

اِک مکاں ہے وہاں گوالوں کا — روز آپس میں لڑنے والوں کا

اُس کے پہلو میں ایک کمرا ہے — وہیں محدود میری دُنیا ہے

تنگ و تاریک صورتِ زنداں — ایک تصویرِ عبرتِ زنداں

در و دیوار غم فزا یکسر — ایک فریادِ بے صدا یکسر

کوئی سامان نہیں امارت کا — کوئی درماں نہیں مصیبت کا

لیمپ رکھا ہے تیل سے خالی — آگ پانی کے میل سے خالی

زینتِ فرش اِک چٹائی ہے — ایک کونے میں چارپائی ہے

نہ کوئی میز ہے، نہ کرسی ہے   ہے اگر کچھ تو کس مپرسی ہے
آہ! کس بیکسی میں رہتا ہوں
اس پہ طرّہ، کہ شعر کہتا ہوں

خوش مذاقی سے ہے خمیر مرا   نکتہ بیں ہے دلِ بصیر مرا
شعریت ہے مری طبیعت میں   روشنی کی جھلک ہے ظلمت میں
ایک ہی دُھن ہے، ایک ہی لے ہے
کیا کہوں ذوقِ شعر کیا شے ہے

(۳)

دیکھ! او گردشِ زمانہ! دیکھ!!   او ستم پرورِ یگانہ! دیکھ!!
اِس طرح مجھ کو پائمال نہ کر   شاعری کو فنا مآل نہ کر
گرچہ شاعر ہوئے ہیں پہلے بھی   اور ساحر ہوئے ہیں پہلے بھی
رُوح افزا مقامِ شیکسپیئر   عرش پیما خیالِ شیکسپیئر
طبع ہومر کی آن بان نئی   فکرِ ڈانٹے میں ایک شان نئی
گوئٹے رازدارِ فطرت کا   بلکہ آئینہ کارِ فطرت کا
وجد پرور کلام حافظ کا   سرِّ غیبی پیام حافظ کا
شاعرِ سحر کار کالیداس   نازشِ روزگار کالیداس
نکتہ آرا طبیعتِ غالب   خلد پرور لطافتِ غالب
شعرِ ٹیگور دلنشیں نغمہ   بر لبِ رُوح کا حسیں نغمہ
نظمِ اقبال شاہکارِ خیال   جنّت افروز نوبہارِ خیال
الغرض باکمال سب کے سب   آپ اپنی مثال سب کے سب
میں کوئی اُن سا باکمال نہیں   مجھ میں وہ کیفیت، وہ حال نہیں

پھر بھی کچھ سوز و ساز رکھتا ہوں ذوقِ راز و نیاز رکھتا ہوں
اے زمانے! تُو سازگار نہیں غمگساری ترا شعار نہیں
تُو جو دلسوز ، دلنواز بنے چارۂ دردِ جانگداز بنے
پھر کوئی میری رنگینیں دیکھے حُسنِ شعری کی طلعتیں دیکھے
نقشِ فطرت میں رنگ بھر دوں مَیں شاعری کو جوان کر دوں مَیں
توڑ ڈالوں نظامِ ہستی کو آسماں تک اٹھاؤں پستی کو
وہ تجلّی بھر دوں تکلّم میں جس سے نُور آئے چشمِ انجم میں
الغرض لاجواب ہو جاؤں
ذرّے سے آفتاب ہو جاؤں

بیدار

رباعیات

تُو تیرے ستم کی ہستی کیا ہے
دو لفظ ہیں بس ستم و کرم کی ہستی کیا ہے
مَیں چھیڑ رہا ہوں اپنے احساس کو خود
مَیں خالقِ غم ہوں غم کی ہستی کیا ہے

افسانۂ بیدار دِلی چھوڑ گئے
آوازۂ درد پروری چھوڑ گئے
دِل والوں پہ کچھُ اجل کا قابُو نہ چلا
مرنے کو چلے تو زندگی چھوڑ گئے

سب فلسفۂ حیات کہہ دیتا ہوں
سو بات کی ایک بات کہہ دیتا ہوں
شاعر ہوں مجھے دماغ تفصیل کہاں
اک حرف میں کائنات کہہ دیتا ہوں

یہ ولولۂ مزاجِ عالی کیا ہے
یہ سلسلہ غلط خیالی کیا ہے
کِس وہم میں ہیں مجھے مٹانے والے
مجھ میں اب چیز مِٹنے والی کیا ہے

نجم آفندی اکبر آبادی

بالا

گولکنڈہ کی آخری رقاصہ

(از ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، ایم - اے - پی - ایچ - ڈی (لندن) پروفیسر ادبیات اردو جامعہ عثمانیہ)

بالاؔ گولکنڈہ کی وہ بدقسمت مہ جبین تھی جس کے حسن و جمال اور رعنائیوں کا چرچا اس وقت شروع ہوا جب قطب شاہی سلطنت کا نیّرِ اقبال غروب ہونے کو تھا - اس کی اٹھتی جوانی اس کی گلنار آنکھیں، اس کے سڈول بدن کی اٹھان اس کا کندنی رنگ، اس کی رسیلی آواز اور اس کی ہر ایک مستانہ ادا ظاہر کرتی تھی کہ وہ بھاگ متی اور تارا متی کی جانشین اپنی جانشین ہے - اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ وہ حیدر آباد کی آخری عظیم الشان مغنیہ تھی اور اگر اس کے عین عنفوان شباب کے ساتھ وابستہ ہو جاتا اور رقص و سرود کے آسمان پر ایک اور ستارہ کا اضافہ ہوتا -

وہ بارہ سال کی تھی جب پہلی دفعہ شاہی محل میں لائی گئی اور اس کے رقص و سرود نے خداداد محل کو گرما دیا - اس قدردان ماحول میں کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ اپنے حُسنِ خداداد اور کمالِ فن کی داد حاصل نہ کرتی - ملکہ نے پہلے ہی مجرے میں زر و جواہر سے بھری ہوئی دو کشتیاں انعام میں عطا کیں اور بالاؔ کو عمر بھر کے لئے مالامال کر دیا - اسی طرح جب کبھی وہ محل میں آتی توقع سے زیادہ انعام و اکرام حاصل کرتی - حالانکہ ابھی بادشاہ کو اپنے کمالات سے محظوظ کرنے کی اسے عزت حاصل ہوئی تھی - اور نہ شاہی داد و دہش سے سرفراز ہونے کا موقع ملا تھا -

وہ اصل میں مادنا دیوان کے بھتیجے کے لئے زیورِ رقص و سرود سے سنواری جا رہی تھی اور دیوان ہی کے حکم سے ملکہ کی سالگرہ کے موقع پر دیوان کی طرف سے نغمۂ مبارک باد سنانے کے لئے محل میں روانہ کی گئی تھی -

محاصرۂ گولکنڈہ کے زمانہ میں جب دیوان مادنا کو شر انگیزوں نے قتل کر دیا تو اس کے دوسرے وابستگانِ دولت کی طرح یہ نازنین بھی گوشہ نشینی اختیار کرنے کے خیال سے گولکنڈہ کے خفیہ راستہ سے نکلی - اس کا وطن ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جو ستم دیدہ دیوان کی جاگیر میں واقع تھا - اتفاق سے شہزادہ معظم کے فوجیوں نے اس خانماں برباد قافلہ کو دیکھ لیا اور شہزادہ کے یہاں پکڑ لائے - اس عالم سراسیمگی میں بھی اس قافلہ کے ساتھ اتنا زر و جواہر تھا کہ اس کو دیکھ کر شہزادہ معظم حیران رہ گیا - مگر وہ اس سیم و زر سے زیادہ بالاؔ کے دلکش خد و خال اور حُسن و جمال پر متحیر تھا - اس کے شائستہ لباس اور پاکیزہ ذوقِ آرائش کو دیکھ کر اس نے بیک نظر خیال کیا کہ شاید یہ کوئی شاہزادی ہے - مگر اس کی پیشانی کا ٹیکا اس کے ہندو ہونے کی چغلی کھا رہا تھا - میدانِ جنگ کی مصروفیت نے موقع نہ دیا کہ وہ اس قافلے اور اس کے پری جمال قافلہ سالار کے متعلق زیادہ پوچھ گچھ کر سکتا - رات میں جب فرصت ملی تو اپنے ملازمِ خاص کے ذریعہ سے بالاؔ کو اپنے خیمہ میں بلا بھیجا اور ایسے التفات سے پیش آیا کہ بے خبر بالاؔ سارا واقعہ بلا کم و کاست بیان کر دینے پر مجبور ہو گئی -

شہزادہ نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا: - "ہم تم کو دلی سے لے [illegible] چاہتے ہیں [illegible]

[illegible] ہمارے [illegible] دل کی ملکہ بنی رہو گی -"

بالاؔ دل ہی دل میں متردد تھی کہ الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ وہ حواس باختہ ہو گئی اور کچھ بگڑ کر کچھ سنبھل کر یوں گویا ہوئی: -

"آپ ہمارے بادشاہ کے دشمن ہیں - آپ کی فوجوں نے ہمارے ملک کو ویران اور ہمارے گھروں کو بے چراغ کر دیا ہے - آپ نے اتنے عرصہ سے دکن کے کوہستانوں کو میدانِ رستخیز بنا رکھا ہے - پھر بھی آپ کو معلوم نہیں کہ جو شخص ایک دفعہ بھی تاناشاہ بادشاہ کا نمک کھا لیتا ہے تو وہ پھر کسی اور کی غلامی پسند نہیں کرتا -"

شہزادہ سٹپٹا گیا اور متعجب ہو کر پوچھا: -

"کیا تم نہیں جانتیں کہ تمہارا آقا مادنا دیوان تاناشاہ ہی کے اشارہ سے قتل ہوا ہے - پھر بھی تعجب ہے کہ تم اس کے نمک کا پاس کرنا چاہتی ہو -"

بالا نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔ "صاحبِ عالم ایسا ارشاد نہ فرمائیں آپ ہمارے بادشاہ پر اتنا بڑا الزام نہیں لگا سکتے۔ گولکنڈہ یا حیدرآباد میں کوئی انسان آپ کو ایسا نہ ملے گا جو اس ہر دلعزیز بادشاہ کے خلاف اس طرح کا ایک لفظ بھی زبان سے نکال سکے اور اگر واقعی تاناشاہ نے میرے آقا کے قتل کا حکم دیا ہے تو کیا تعجب کہ میرا آقا اس سزا کا مستحق ہوا ہم تو ہمیشہ یہی سمجھتے رہیں گے کہ ہمارے آقا نے اپنے آقا کی راہ میں جان دیدی اور ہم میں سے ہر شخص ہر وقت یہی کرنے کے لئے تیار ہے۔"

شہزادہ بالا کی اس بے باکانہ گفتگو پر حیران تھا۔ اس کے ذہن میں نہ آسکتا تھا کہ ایک طوائف کی تربیت اور ذہنی ارتقا اور معیار زندگی اسقدر بلند ہوتا ہے۔ اس نے اب ایک دوسرے طریقہ سے اس مہ جبین کو پھانسنا چاہا۔ اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا:۔

"تم مغلوں کی اصلی شان و شوکت سے واقف نہیں ہو۔ گولکنڈہ والوں نے ہم کو اپنے اصلی رنگ میں نہیں دیکھا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ شہنشاہ کی مسلسل معرکہ آرائیوں اور خونریزیوں کی وجہ سے تمہیں ہماری بہیمیت اور جنگجوئی کی فنونوں کو آزمانے کا موقع ملا ہے۔ تم لوگ نہیں جانتے کہ ہم شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں سے زیادہ نرم بن جاتے ہیں۔"

پھر ذرا نرم ہو کر یوں گویا ہوا:۔

"بالا تم اپنے دل سے ہر قسم کا خطرہ دُور کر دو۔ اور خوش خوش میرے ساتھ چلو۔ دلّی دیکھ کر تم گولکنڈہ کو بالکل بھول جاؤ گی۔ گولکنڈہ اب تم جیسی پری جمالوں کی قدر نہ کر سکے گا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ تم شاہوں اور شاہنشاہوں کے دربار کے لائق ہو۔ تمہارا نام بھی بالا ہے اور شاید یہ مصرعہ تمہارے ہی لئے کہا گیا تھا ؎

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

مادنا تو مارا ہی جا چکا ہے۔ نہ معلوم اس کے بھتیجے کا کیا حشر ہوا ہے۔ تم اس ذلیل ہستی کے خیال میں ...."

شہزادہ اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ سرمست شباب بالا کا جذبۂ خودداری شعلہ کی طرح بھڑک اٹھا۔ اس نے جھلّا کر کہا کہ:۔

"آپ ایسا نہ فرمائیے۔ مغل ایک طوائف کی کیا قدر کر سکتے ہیں۔ جب انہوں نے ایک بلند مرتبت شہزادی کی کچھ قدر نہ کی۔ میری ملکہ کی سگی بہن سلطان عبداللہ کی منجھلی شہزادی آپ ہی کے بھائی سے بیاہی جا چکی تھی اور جس گھڑی وہ نیک بخت شہزادی اس قلعہ کے دروازہ سے باہر نکلی اسی وقت سے خیر و برکت اور امن و عافیت نے بھی ہمارے پیارے قلعہ کا ساتھ چھوڑ دیا۔"

مغل شہزادہ سراسیمہ تھا۔ وہ پہلے ہی بالا کے حسن و جمال کے رُعب میں اپنا شاہی وقار کھو بیٹھا تھا۔ گولکنڈہ کی اس نوخیز مطربہ کی شوخ و شنگ آنکھوں نے اس پر پہلے ہی جادو کا سا اثر کیا تھا۔ اب جو اس بلا نے کڑک کر گفتگو شروع کی تو اس کو اپنے والد شہنشاہ اورنگزیب کے جاسوسوں کے خوف نے لرزہ براندام کر دیا۔ وہ جانتا تھا کہ شہنشاہی جاسوس اس کی ہر نقل و حرکت پر نظر رکھتے ہیں۔ کیونکہ شہنشاہ کو شبہ ہو گیا تھا کہ وہ تاناشاہ سے مل گیا ہے۔ اس نے دبی زبان سے کہا:۔

"بالا تمہاری گفتگو نے مجھے اور زیادہ تم پر مائل کر دیا ہے۔ میں آج رات اس خیال کی صداقت کا قائل ہو گیا کہ ؎

بساکین دولت از گفتار خیزد

بس تم کو ایک رات کی مہلت دیتا ہوں۔ اگر کل اس وقت تک تم بخوشی راضی نہ ہو جاؤ گی تو ہم مجبور ہو جائیں کہ قیدیوں کی طرح دلّی کی طرف روانہ کر دیں۔"

مصیبت زدہ بالا رات بھر سر بگریباں رہی۔ صبح ہوتے ہی شہزادہ نے اپنے ملازمِ خاص کے ذریعہ سے مطلع کر دیا کہ "سب قیدی دلّی کو روانہ کر دئے جائیں گے۔ اگر بالا بخوشی اپنے آپ کو شہزادہ کے سپرد نہ کر دے۔"

بالا نے جواب میں کہلا بھیجا کہ:۔ "اگر صاحبِ عالم کا ایسا ہی منشا ہے اور وہ اسی طرح جبر و تعدی پر اُتر آئے ہیں تو ہمیں بھی کچھ کرنا ہی پڑے گا۔"

جیسا جیسا دن چڑھتا گیا مغل فوجوں کی مصروفیت بڑھتی گئی۔ آج سرنگ کے ذریعہ سے قلعہ کی فصیل مسمار ہونے والی تھی اور مغل فوج کی ایک بڑی جماعت اس سمت جمع ہو گئی تھی جہاں سے فصیل میں رخنہ پڑنے والا تھا تاکہ راستہ ملتے ہی قلعہ پر فوراً حملہ کر دیا جائے۔ سرنگ کی بتی کو آگ لگانے کا وقت گزر چکا تھا۔ سب سر اُٹھائے ہوئے فصیل کی طرف دیکھ رہے تھے اور منتظر تھے کہ اب سرنگ اڑے گی اور حملہ کا آغاز ہوگا۔ اتنے میں ایک بڑے دھماکہ کے ساتھ خود مغل فوجوں کے نیچے کی زمین شق ہوئی اور سینکڑوں سپاہی اور گھوڑے اور ہتھیار گرد و غبار کے ساتھ ہوا میں اُڑتے ہوئے نظر آئے۔ اہل گولکنڈہ

کو مغلوں کی سرنگوں کا پتہ چل گیا تھا اور انہوں نے پہلے ہی سے ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ چاہ کندہ را چاہ درپیش کی مثل صادق آجائے۔ چنانچہ سیکڑوں مغل سپاہیوں کے علاوہ متعدد بڑے بڑے افسر اور سرداران فوج بھی یا تو سرنگوں میں زندہ درگور ہو گئے یا سخت زخمی ہوئے۔ شہزادہ معظم اور اس کے ساتھیوں کو ان آفت زدوں کی دستگیری میں ہمہ تن مصروف رہنا پڑا۔ اور اس کے خیموں اور نو گرفتار شدہ قیدیوں کی کافی نگرانی نہ ہوسکی۔ بالا نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر خیمہ کے پاسبان کو ایک ہیرے کی انگوٹھی دکھاتے ہوئے کہا:۔

"اگر تم شہنشاہ اورنگ زیب تک ہماری اس حالت
زار اور ہمارے مال و متاع کے لوٹ کھسوٹ کی خبر پہنچا
دو تو یہ بیش بہا انگوٹھی تمہاری نذر ہے۔"

پاسبان سپاہی نے پہلے تو صاف انکار کر دیا۔ لیکن بالا اور اس کے ساتھیوں کی منت سماجت اور ترغیب و تحریص سے آخر کار رضامند ہو گیا اور اپنی جگہ ایک دوسرے سپاہی کو متعین کر کے شہنشاہ کے جاسوسوں تک یہ خبر پہنچا دی۔

شہزادہ معظم تمام دن کی پریشانیوں سے تھکا ماندہ اپنے خیمہ میں واپس ہوا تھا اور ابھی بالا کا خیال بھی نہ کرنے پایا تھا کہ شہنشاہی حکم آ پہنچا اور شہزادہ کو مجبوراً قیدیوں کے علاوہ ان سے حاصل کیا ہوا تمام زر و جواہر بھی بارگاہ سلطانی میں روانہ کر دینا پڑا۔ بالا نے چلتے چلتے اس مغل سپاہی کو ادھر ادھر دیکھا تاکہ اس کا موعودہ انعام یعنی گراں بہا ہیرے کی انگوٹھی اس کو عطا کر دی جائے۔ مگر [illegible] وہ بیچارا آفت کا مارا شہنشاہ کے جاسوسوں کے پاس مخبری کر کے ہیرے کی انگوٹھی کی توقع میں واپس ہو رہا تھا کہ خود شہزادہ کے جاسوسوں نے اس کو گرفتار کر لیا۔

جب دوسرے روز صبح شہزادے نے معلوم کیا کہ بالا کس ہوشیاری سے اس کے قبضہ سے نکل گئی ہے تو بیحد خشمناک ہوا اور اپنے جاسوسوں کے ذریعہ سے اس کے یہاں کہلا بھیجا کہ

"یاد رہے ایک روز اس فریب کا ضرور بدلہ لیا جائیگا۔"

اورنگ زیب نے ان قیدیوں کو دو چار روز تک ٹھہرائے رکھا۔ اور کوشش کی کہ قلعہ کے حالات معلوم کرنے میں ان سے مدد لی جائے۔ مگر جب دیکھ لیا کہ یہ لوگ اس کے کسی کام کے نہیں ہیں تو ایک رات ان کو لشکر سے باہر نکل جانے کا حکم دیا۔ بالا اور اس کے ساتھی رات کی تاریکی میں کچھ اس طرح غائب ہو گئے کہ شہزادہ معظم کے جاسوسوں کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائی۔

(۲)

اس واقعہ کو عرصہ گزر چکا۔ اس اثنا میں گولکنڈہ کی اینٹ سے اینٹ بج چکی تھی۔ شہزادہ معظم اور شہنشاہ اورنگ زیب ایک عرصہ قبل اس رشک فردوس کہستان کو ایک وحشت خیز خرابہ کی شکل میں چھوڑ گئے تھے۔ اورنگ زیب کا چہیتا شہزادہ کام بخش حیدر آباد کے مشہور آفاق خداداد محل کے ایک عقبی دالان میں ٹہل رہا تھا۔ اس کو مستقبل کی فکر دامنگیر تھی۔ اس عظیم الشان محل کا گوشہ گوشہ اپنی عظمت گزشتہ پر نوحہ خوانی کرتا نظر آ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک نئی نویلی اور آراستہ و پیراستہ دلہن یکایک بیوہ ہو گئی ہے اور اس کا تمام سنگھار اس کے سہاگ کے ساتھ ختم ہو گیا ہے۔ لیکن اس تباہی کے باوجود اس کے نوعروسی کے آثار باقی ہیں۔ کام بخش کے مضطرب دل کو اس ستم زدہ ماحول اور اجڑے دیار کا چپہ چپہ ہر گھڑی ایک نئی ٹھیس لگاتا تھا۔ جب کبھی کسی دروازہ یا کھڑکی کے اکھڑے ہوئے زریں یا ہاتھی دانت کے نقش و نگار یا چھتوں، محرابوں اور دیواروں کے طلاکار حاشیوں کے باقی ماندہ آثار پر اس کی نظر پڑتی تو اس کی وحشت میں اور اضافہ ہو جاتا۔ وہ کبھی فتحمند باپ کی ظالم فوجوں اور اس کے متعین کردہ صوبہ داروں کی ان تباہ کاریوں پر افسوس کرتا اور کبھی قطب شاہی حکمرانوں کے ذوق لطیف اور سلیقۂ زندگی کی بے تحاشہ تعریف اس کے منہ سے نکل پڑتی۔

اس ویران شہر کی بے رونق اور تباہ [illegible] آسودہ حالی کے لئے وہ اس وجہ سے فکرمند تھا کہ اس کو وہ پایۂ تخت بنا کر اپنے باپ کی زندگی ہی میں اپنی بادشاہت کا اعلان کرنا چاہتا تھا مگر بار بار اس کو یہی خیال ستاتا تھا کہ مغل فوجوں نے اس کو اس بری طرح تباہ کیا ہے کہ اس کا اب عرصہ دراز تک اصلی حالت پر پہنچنا مشکل ہے۔ اس کی دولت و ثروت پوری طرح غارت ہو چکی ہے اور برسوں تک شہر لٹتا رہا ہے۔ تاہم کام بخش کو توقع تھی کہ اس خرابہ میں بھی کوشش سے اتنی دولت مل سکیگی کہ اس کے ذریعے سے وہ اپنے کو اپنے بھائیوں کے مقابلہ میں مستحکم کر سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اہل حیدر آباد کو شہر میں لا کر بسانے کے لئے دور دور تک اپنے جاسوس پھیلا دئے تھے اور جو کوئی خوشی سے نہ آتا اس کو مجبور کر کے قیدیوں کی طرح شہر میں لایا جاتا تھا اور ہر ایک کو لالچ دے کر یا ڈرا دھمکا کر قطب شاہوں کے مخفی دفینوں اور غیر معمولی

ذرائع آمدنی کے بتانے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ چنانچہ بعض گھر کے بھیدیوں نے کچھ پتے بھی بتلائے مگر کھوج لگانے سے معلوم ہوا کہ ؎

حریفاں بارہا خوردند و رفتند
تہی خم خانہا کردند و رفتند

اس قسم کی کوششوں سے ناامید ہو کر اب کام بخش ایک اور ہی ادھیڑبن میں تھا کہ ٹہلتے ٹہلتے اس کی نظر اس در و دیوار شکستہ کے باقی ماندہ نقش و نگار پر ایک ایسی جگہ جم گئی جہاں کوئی غیر معمولی نقوش آ رہے تھے۔ اس نے فوراً دیوار کے قریب ہو کر محراب کے اوپر اپنی لکڑی سے دو چار جگہ مار کر دیکھا۔ معلوم ہوا کہ دیوار کھوکھلی ہے۔ وہ خوشی کے مارے اچھل پڑا۔ فوراً اپنے ملازمین کو آواز دی۔ شام تک زر و جواہر کے کئی قلمدان اس مخفی تہ دان سے نکل آئے۔ کام بخش کی شادکامی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اس کی ہمت بڑھ گئی۔ اس نے جگہ جگہ دیواروں کو کھدوانا شروع کیا۔ اگرچہ یہ دیواریں پہلے ہی عالمگیری احکام کی بنا پر توڑ پھوڑ دی گئی تھیں۔ کام بخش کی کھدائیوں نے ان کہنہ زخموں پر نمک پاشی کا کام کیا اور خداداد محل کے بچے کھچے نقش و نگار بھی حرف غلط کی طرح مٹا دئے گئے۔

ابھی یہ تباہ کاریاں جاری تھیں کہ ایک روز ایک کمرہ میں ایک بہت بڑی چھپکلی نظر آئی۔ کام بخش کے خادموں نے اس کا پیچھا کیا۔ وہ تیزی سے چھت کی طرف چڑھ گئی اور ایک سوراخ میں گھس پڑی۔ اس کو وہاں سے نکالنے کی کوشش جاری تھی کہ چھت سے اشرفیاں برسنے لگیں۔

اس غیبی امداد نے کام بخش کی ساری فکریں دور کر دیں۔ اس نے اب عیش و عشرت کا بازار گرم کیا اور جیسے جیسے اس کی بزم طرب کی رونق بڑھتی جاتی تھی۔ قطب شاہیوں کی شان و شوکت اور ذوقِ لطیف کے باقی ماندہ آثار مٹتے جاتے تھے۔ اگرچہ وہ اس عظیم الشان محل کے ایک چھوٹے سے گوشہ میں مقیم تھا اور اگر وہ چاہتا تو اس حصہ کو منہدم ہونے سے بچا لیتا، لیکن ایک انسان اپنے لالچ کے مقابلہ میں تہذیب و شائستگی کے بڑے سے بڑے خزانہ کو بھی اہمیت نہیں دینا چاہتا۔ اس نے اپنے قیام کے لئے اپنے محل سے قریب ہی پادشاہی عاشور خانہ کے محاذی ایک حویلی کی تعمیر کا حکم دیا۔ اور اس طرح اس عظیم الشان قطب شاہی محل کے پتھروں اور چوبینہ سے ایک چھوٹا سا مکان تعمیر کیا گیا جو قطب شاہیوں کے عالیشان اور بلند محلات کے مقابلہ میں کسی غریب کی گڑیوں کا ایک بدوضع گھروندا نظر آتا تھا۔

اورنگ زیب عالمگیر نہایت مدبر اور فرلیس حکمران تھا۔ اس نے معلوم کر لیا کہ کام بخش کو چھوڑی ہوئی ہڈیوں سے بھی غیر متوقع دولت حاصل ہو رہی ہے تو اس کو گوارا نہ ہوا کہ اپنے حق شہنشاہی سے دست بردار ہو جائے۔ اس توقع سے کہ شہزادہ خوف زدہ ہو کر اس دولت کا کچھ نہ کچھ حصہ اس کے ہاں ضرور روانہ کر دے گا۔ اس نے اپنے سعادت مند فرزند کو خط لکھا کہ

"قطب شاہوں کے عالیشان محلات کے موجود ہوتے ہوئے اپنے لئے ایک چھوٹی سی حویلی بنانا کیا معنی رکھتا ہے؟"

کام بخش بھی اورنگ زیب ہی کا بیٹا تھا۔ اس نے ایک ایسا جواب دیا کہ باپ کو ساکت ہی رہتے بنی۔ اطاعت گذار فرزند نے لکھا کہ:۔

"قطب شاہوں کے محل ایسے وسیع اور عظیم الشان ہیں کہ ان میں رہ کر اُن کو بارونق رکھنا اور ان میں روشنی کا انتظام کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ یہ انہی صاحب ہمت بادشاہوں کا حوصلہ تھا کہ انہوں نے بڑے بڑے محلوں کو رشک فردوس بنا رکھا تھا۔"

ابھی شہزادہ کام بخش خداداد محل ہی میں مقیم تھا کہ اس کے جاسوس جو تمیم اور باخبر حیدرآبادیوں کی تلاش میں پھر رہے تھے۔ ایک دور دراز کے گاؤں سے ایک طوائف کو پکڑ لائے۔ جب وہ کام بخش کے حضور میں پیش کی گئی تو بے اختیار اس کی زبان سے نکلا:۔

"یہ کون ہے؟ میں نے آج تک ایسا حسن ملیح نہیں دیکھا! کیا اس خرابہ میں ایسے ہیرے اب بھی موجود ہیں؟"

جب اس کو مطلع کیا گیا کہ یہ ایک طوائف پیشہ عورت ہے اور دیہات والے اس کو آسمان گولکنڈہ کا آخری ستارہ سمجھتے ہیں تو کام بخش نے اس کی طرف مخاطب ہو کر پوچھا کہ:۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

اس رقاصہ نے رُکتے رُکتے جواب دیا کہ:۔

"اس ناچیز کو بالا کہتے ہیں۔"

"بالا! کیا تم وہی بالا ہو جس کی یاد میں شہزادہ معظم ایک زمانہ

تک بے چین رہا کرتے تھے؟"

"جی ہاں صاحبِ عالم میں وہی بالا ہوں۔ برگشتہ قسمت؟"

"مگر تم اتنے عرصہ تک کہاں چھپی رہیں؟ شہزادہ معظم کے جلسے مہینوں تمہاری تلاش میں سرگرداں رہے! کیا تمہیں میری دلچسپیوں کی بھی خبر نہ ہوئی۔ میں تو اس خواب آباد میں ایک اچھی مطربہ کے لئے ترس گیا اور اب تو ناامید بھی ہو چکا تھا۔ کیا اچھا ہو کہ ابھی گرمئ بزم کا سامان ہو جائے۔ کوئی اچھی سی چیز سناؤ کہ ہم بھی خوش ہو جائیں۔"

بالا نے دمِ سرد بھر کر کہا:۔

"صاحبِ عالم! ابھی آپ گرم و سردِ زمانہ سے واقف نہیں ہیں۔ ایک خفتہ بخت دُکھیا سے کیونکر توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ کسی کی بزم کو گرما سکے گی۔ میں۔ اس قابل نہیں ہوں اور اگر ہوتی بھی تو یقین مانئے کہ دنیا کی کوئی قوت مجھے اس جگہ گانے پر مجبور نہ کر سکتی۔ پھوٹ جائیں یہ منحوس آنکھیں جنہوں نے کبھی اس جگہ کو رشکِ ارم دیکھا تھا اور آج اس ویران حالت میں دیکھ رہی ہیں۔ . . . . . . صاحبِ عالم مجھے معلوم ہے کہ آپ مجھے ہر طرح سے مجبور کرنا چاہیں گے، لیکن آخر میری مجبوری بھی تو قابلِ لحاظ ہے! میں صاف صاف کہہ دینا چاہتی ہوں کہ اگرچہ میں ایک ادنےٰ طوائف ہوں، لیکن اپنے دل اور جذبۂ وفاداری سے مجبور ہوں۔ میں نے جب کبھی اس محل میں قدم رکھا اپنی محبوب ملکہ کے قدمبوس ہونے کے لئے آئی تھی۔ وہ منظر میری آنکھوں میں اب بھی موجود ہے، جب شہنشاہ عالمگیر نے بیجاپور [illegible] کا رُخ کیا تھا اور یہ منحوس خبر اس وقت ملکہ کے گوش گزار ہوئی جب کہ انہوں نے اپنی سالگرہ کی تقریب میں میرے آقا مامتا دیوان سے فرمائش کر کے مجھے چوتھی بار محل میں طلب کیا تھا اور میرا مجرا سُن رہی تھیں۔ چنانچہ جونہی وہ منحوس خبر انہوں نے سُنی، میری طرف مخاطب ہو کر اندوہناک انداز میں فرمایا کہ:۔

"بالا اب تو ہم یہاں سے جاتے ہیں۔ تم رہو گی اور کسی روز اسی جگہ ہمارے دشمنوں کی بزمِ طرب کو بھی گرماؤ گی!"

میں اور میری نائکہ دونوں نے آگے بڑھ کر اپنی ملکہ کی بلائیں لیں اور کہا:۔ "مالکنی ہم جیسی ہزاروں لونڈیاں آپ پر سے قربان ہو جائیں آپ ایسا کلمہ اپنی زبان سے کیوں نکالتی ہیں؟ گونگی ہو جائے وہ زبان جو آپ کے بعد اس جگہ کوئی راگ الاپے اور کٹ جائے وہ گلا جو کسی اور کے لئے اس محل میں آواز . . . . . ."

بالا کے قدم لڑکھڑائے۔ وہ بُری طرح بل کھا کر گری۔ وہ دالان کی سب سے بلند سیڑھی پر کھڑی تھی اور قبل اس کے کوئی شخص اس کو تھامے دالان کی سیڑھیوں پر سے گرتی ہوئی نیچے تک پہنچ گئی۔ اس کی گردن اور کمر میں سخت چوٹ آئی۔ شہزادہ نے حکم دیا کہ بالا کو اس کے اصل مکان میں ٹھہرایا جائے اور شاہی طبیب اس کا معالجہ کریں۔ اس حادثہ کا بالا پر اتنا اثر ہوا کہ وہ عرصہ تک بسترِ علالت پر دراز رہی۔

اس اثنا میں خود شہزادہ اس راہ سے گزرتے ہوئے دو چار دفعہ اس کے مکان پر بھی اس کی عیادت کے لئے ٹھہرا۔ جب وہ اچھی طرح صحتمند ہو گئی تو کام بخش شاہی محل چھوڑ کر اپنی جدید حویلی میں منتقل ہو چکا تھا۔ اب اس نے بالا کو بلا بھیجا اور گانے کی فرمائش کی۔ اس اثنا میں بالا جواں سال شہزادہ کے حُسنِ اخلاق، شگفتہ مزاجی اور رُعبِ مردانہ سے متاثر ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ انکار کرنے کی یوں بھی کوئی وجہ باقی نہ رہی تھی۔ اس نے بسر و چشم منظور کیا، مگر اس شرط کے ساتھ کہ شہزادہ اس کے رقص و سرود سے خوش ہو کر اس کو کوئی انعام و اکرام نہ دے۔

کام بخش بالا کے کمالِ فن سے اتنا محظوظ ہوا کہ اُس کے واپس جانے کے بعد شایانِ شان انعام و اکرام سے سرفراز کرنا چاہا اور جب اس کے ملازمین اس سرفرازی کے ساتھ اس کے مکان پر پہنچے تو بالا آگ بگولا ہو گئی۔ اس نے شاہی خدمتگاروں کو جوں کا توں واپس [illegible] ہے یہ خلافِ مصلحت بھی۔ مگر بالا کب ماننے والی تھی۔ اس نے صاف صاف انکار کر دیا اور کہلا بھیجا کہ:۔

"فسخِ معاہدہ کرنا شاہزادوں کے شایانِ شان نہیں ہے!"

کام بخش حیران تھا۔ اور اس کی حیرانی رفتہ رفتہ غصہ میں تبدیل ہوتی گئی۔ ایک شہزادہ کے لئے اس سے بڑھ کر ذلت اور کیا ہو سکتی تھی۔ اس کو ایسی عجیب و غریب ذہنیت کی رقاصہ سے پہلی بار سابقہ پڑا تھا۔ لیکن بالا کی شخصیت اور غیر معمولی حُسن و جمال نے اس کو ضبط سے کام لینے پر مجبور کیا۔ چند روز بعد اس نے اس مغرور رقاصہ کو سرِ دربار طلب کیا اور پوچھا کہ:۔

"تم سے ایسی نازیبا حرکت کیوں کر سرزد ہوئی؟ اگر تمہاری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو سخت سے سخت سزا پاتا۔ میں حیران ہوں کہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟"

بالاؔ نے شہزادہ کے غصہ کو بڑھتا ہوا دیکھ کر دست بستہ عرض کیا:۔

"حضور، قصور معاف۔ اگرچہ اصل میں قصور میرا نہیں ہے۔ میں نے پہلے ہی سے شرط منظور کرا لی تھی کہ صاحبِ عالم سرفراز فرمانے کا خیال نہ فرمائیں تو مجرے کے لئے حاضر ہوں!"

شہزادہ نے خشمگین ہو کر کہا:۔

"مگر شاہی انعام و اکرام قبول نہ کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ اس کی آخر وجہ بھی ہو؟"

"حضور اگر یہی وجہ پہلے ہی شرط منظور کرتے وقت دریافت فرما لیتے تو آج بات اس حد کو نہ پہنچتی۔ اب بھی میں اصل وجہ کہنے کو تیار ہوں بشرطیکہ ناگوارِ خاطر نہ ہو۔"

شہزادہ نے بات کاٹ کر کہا:۔

"اس واقعہ سے بڑھ کر بھی ناگوار کوئی اور بات باقی ہے؟"

بالاؔ نے مؤدبانہ انداز میں کہا:۔

"صاحبِ عالم ناگوار اور گوارا کے درمیان کوئی حدِ فاصل بھی ہے! ایک ہی بات کسی وقت ناگوارِ خاطر ہو جاتی ہے۔ اس کا تعلق کسی بات یا چیز سے زیادہ گوارا یا ناگوارا سمجھنے والے کی کیفیت اور حالت پر منحصر ہے۔"

بالاؔ کی طرزِ گفتگو اور حُسن و جمال کی موہنی کچھ ایسی تھی کہ شہزادہ کے دل کو پھر سے موہ لیا۔ اس نے نہایت اخلاق سے پوچھا:۔

"میں اصل وجہ معلوم کرنے کا کئی روز سے مشتاق ہوں۔ بہتر یہ ہے کہ تم منطقی بحثوں کی بجائے وہی بیان کر دو جو بات بھی ہے۔"

بالاؔ نے مجبور ہو کر بادلِ ناخواستہ کہا:۔

"حضور یہ بھی کوئی کم بے ادبی کی بات نہیں ہے۔ مگر حکم حکم سے مجبور ہوں۔ جس وقت مجھے یہ معلوم ہوا کہ شہنشاہ اورنگ زیب نے فتح گولکنڈہ کے بعد میری ملکہ یعنی زوجہ تاناشاہ بادشاہ کو اپنا امیدوارِ فضل و کرم بنا کر پچیس۲۵ روپیہ حلبی ماہوار مقرر کی ہے۔ اس وقت سے قسم کھا لی ہے کہ آئندہ سے کبھی کسی سے کوئی رقم نہ لوں گی۔ صاحبِ عالم ملکہ گولکنڈہ اور صرف پچیس۲۵ روپیہ ماہوار! شہنشاہ کو شاید یہ خبر نہ تھی کہ ملکہ ایک ایک وقت میں ہم جیسی کنیزوں کو ایسا انعام سرفراز کیا کرتی تھیں کہ اس سے ہم تمام عمر کے لئے خوشحال ہو جاتیں اور صرف ایک ہی وقت کا انعام اتنا ہوتا کہ اس سے پچیس روپیہ ماہوار پانے والے بیسیوں ملازم ہمیشہ کے لئے مامور کئے جا سکتے تھے۔ جس ملکہ نے ایسی داد و دہش کی ہو اس کو صرف پچیس۲۵ روپیہ ماہوار مقرر کرنے سے جو روحانی صدمہ ہوا ہوگا اس کا اندازہ آپ شاید ہی کر سکیں۔ اس واقعہ سے ہم لونڈیوں کے دل پر ایسا زخم لگا ہے جو تا دمِ واپسیں ہرا رہے گا۔ حضور ہم کیونکر انعام و اکرام قبول کریں جب معلوم ہے کہ ہماری انعام و اکرام سے سرفراز کرنے والی آج پچیس۲۵ روپیہ حلبی میں زندگی بسر کر رہی ہے۔"

کام بخش پر اس دردناک بیان کا اتنا اثر ہوا کہ وہ فوراً مجلس سے اُٹھ گیا۔ غمزدہ بالاؔ بھی روتی ہوئی اپنے مکان کو واپس ہوئی۔

اس واقعہ کے چند ماہ بعد کام بخش کی سالگرہ کی تقریب بڑی دھوم دھام سے منائی گئی اور اس جشن میں بالاؔ نے شہزادہ کو اپنے کمالات سے اور بھی مسحور کر دیا۔ اب ان دونوں نے ایک دوسرے کو سمجھ لیا تھا۔ جواں سال شہزادہ کے مردانہ حُسن اور رنگین طبیعت نے ماہ پیکر بالاؔ کے شباب کی بجھتی ہوئی چنگاریوں کو چمکا دیا۔ وہ عہدِ ماضی کو بھول چکی تھی۔ مادنا کا بھتیجا جس کا گوشۂ خلوت گرم کرنے کے لئے وہ تیار کی گئی تھی اب اس کے لئے خواب و خیال ہوتا جا رہا تھا۔ حیدر آباد آنے کے بعد پوچھ گچھ اور تلاش و جستجو سے اس کو معلوم ہو گیا کہ شہزادہ معظم کے سپاہیوں نے فتح گولکنڈہ کے بعد سب سے پہلے اس بدقسمت نوجوان کو قتل کیا تھا۔ ورنہ وہ یہ سمجھتی تھی کہ شاید وہ بھی اس کی طرح کہیں روپوش ہے اور ایک نہ ایک روز اُس سے ضرور آ ملے گا۔ جب وہ کئی سال قبل رات کی تاریکی میں اورنگ زیب کے حکم سے مغل فوج کے پڑاؤ سے باہر نکل رہی تھی تو بار بار پلٹ کر قلعہ گولکنڈہ کی طرف دیکھتی جاتی تھی۔ وہ پہنچ کر جب رشکِ محل کے قریب سے اُس نے گولکنڈہ کی طرف نظر ڈالی تو تاریک آسمان کے نیچے اس کو ایک منور آسمان دکھائی دیا جس پر جگہ جگہ قطب شاہی محلات، بالاحصار کی عمارتوں، امراء و عمائدین کے مکانوں اور بارونق بازاروں کے چراغ ستاروں کی طرح جگمگا رہے تھے۔ انہی روشن ستاروں میں ایک اس کے نوجوان محبوب اور اس کے دھڑکتے ہوئے دل کے مالک کے مکان کا چراغ بھی تھا۔ جس کا خیال آتے ہی اس نے اپنے فرقت زدہ دل کو اپنے ہاتھوں سے تھام لیا۔ اس کو توقع تھی کہ وہ بہت جلد اس رشکِ فردوس قلعہ کو واپس آئے گی اور اپنے محبوب کے دیدار سے اپنی آنکھوں کو منور کرے گی۔ مگر وہ اس وقت تک انقلاباتِ دہر سے ناآشنا تھی۔ اس کو کیا خبر تھی کہ جب دوبارہ اس کی نظر گولکنڈہ پر پڑے گی تو یہ منتخب روزگار آبادی ایک کھنڈر سے زیادہ اہمیت نہ رکھتی ہوگی۔ چنانچہ کئی سال بعد جب سرِ شام وہ کام بخش

کے سپاہیوں کے جھرمٹ میں قیدی کی طرح حیدرآباد آ رہی تو راستہ
میں دُور سے اس کو ایک خاک کا بلند تودہ آسمان کی طرف اُٹھتا ہوا
دکھائی دیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا کہ:۔
"یہ کونسا مقام ہے؟ ہم اب کس طرف کو جا رہے ہیں؟"
کام بخش کے سپاہیوں نے تمسخرانہ لہجہ میں جواب دیا:۔
"یہی تو وہ گولکنڈہ ہے جس پر تم لوگوں کو اتنا ناز ہے!"

(۳)

جب شہزادہ معظم کو بالا کے حیدرآباد میں موجود ہونے کی خبر
پہنچی تو اُس نے اپنے آدمی روانہ کئے اور کہلا بھیجا:۔ "تمہارے گذشتہ
قصور معاف کر دیا جاتا ہے۔ اگر تم اپنی خیر چاہتی ہو تو ان کے ہمراہ
فوراً چلی آؤ۔ ورنہ سخت باز پرس کی جائے گی۔"
بالا نے جواب دیا:۔
"میں برسوں کے بعد ابھی ابھی حیدرآباد آئی ہوں اور اب
تو مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ پھر جیتے جی یہاں سے نکلوں۔"
اس اثنا میں شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر غازی کا انتقال
ہو گیا اور اس کے ہر فرزند نے اپنی اپنی جگہ بادشاہت کا اعلان
کر دیا۔ کام بخش کے جشن تخت نشینی میں بالا نے دل کھول کر اپنے
کمالات رقص و سرود دکھائے۔ وہ مسرور تھی کہ حیدرآباد پھر سے
ایک بادشاہ کی تخت گاہ بن گیا ہے۔ نہ صرف بالا بلکہ تمام اہلِ
حیدرآباد کو اس کی مسرت تھی کہ ان کے ملک میں پھر سے بادشاہی
کا آغاز ہو گا۔ کام بخش اپنے زمانۂ قیام میں اسقدر ہر دلعزیز ہو چکا
تھا کہ سب اس کو اپنا بادشاہ تصوّر کرنے لگے اور چاہتے تھے کہ
اس کی سلطنت کو استحکام ہو اور اس کے ذریعے سے دوبارہ حیدرآباد
اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو حاصل کرے۔ لیکن حیدرآباد کی گلیوں اور
سڑکوں کی قسمت میں تو ابھی کئی دفعہ خون کی ندیاں بن کر بہنا لکھا تھا۔
امن و عافیت کا زیادہ زمانہ گزرنے نہیں پایا تھا کہ شہزادہ معظم نے
کام بخش کو اپنی اطاعت قبول کرنے کی دھمکی دی اور تاکید کی کہ بالا کو
فوراً اس کے یہاں روانہ کر دیا جائے۔ شہزادہ کام بخش ان معلون

فرمائشات کی تکمیل کرنے سے متعذر تھا۔ اس نے صاف انکار کر دیا۔
حیدرآباد جیسی سلطنت اور بالا جیسی حسن کی دیوی ہر صاحبِ ہمت کو
عزیز ہو سکتی ہیں کام بخش کو دونوں ایک سے بڑھ کر ایک عزیز تھے۔
اس نے آخر دم تک ان کو قبضہ میں رکھنے کی کوشش کی۔ جس وقت
معظم کی لاتعداد فوجیں ایک طوفانی سمندر کی موجوں کی طرح شہر حیدرآباد
کی فصیلوں سے آ آ کر ٹکرا رہی تھیں۔ شہزادہ کام بخش کی بہادری اور ماہِ
پیکر بالا کی فراست ایک مستحکم پہاڑی ساحل بن کر اُن کو واپس ہونے
پر مجبور کر رہی تھیں۔ لیکن حملہ آور شہزادہ کے ساتھ دکن میں تمام
ہندوستان کی فوجیں اور قوت کھنچی چلی آ رہی تھی۔ اگرچہ غریب کام بخش
نے مغلوں کی ان ٹڈی دل افواج کا مردانہ وار مقابلہ کیا مگر اس کی قسمت
میں لکھا تھا کہ اپنی پیاری بالا کے وطن کو اپنے خون سے رنگین کرے۔
اُدھر مظفر و منصور شہزادہ کی فوجیں شہر حیدرآباد میں داخل
ہو رہی تھیں اور اِدھر آسمانِ گولکنڈہ کا آخری ستارہ غروب ہو رہا تھا۔
معظم نے شہر کا چپہ چپہ ڈھونڈھ ڈالا مگر بالا نہ ملنا تھی نہ ملی! وہ ایسی
غائب ہوئی کہ پھر کسی کو اس کا پتہ نہ چلا۔
معظم کی فتح اور تسخیر حیدرآباد کے چند روز بعد ہی اس کی فوج
کے ایک بوڑھے سپاہی کو حیدرآباد کے مشہور محلہ بارہ گلی میں ایک
غریب شخص ملا جس نے اس کو روک کر ہیرے کی ایک گراں بہا انگوٹھی
پیش کی اور کہا کہ:۔
"بالا نے محاصرہ گولکنڈہ کے زمانے میں تم سے جس
انعام کا وعدہ کیا تھا اس کے ایفا کا برسوں کے بعد
آج موقعہ ملا ہے۔"
بوڑھا سپاہی ہیرے کی انگوٹھی دیکھ رہا تھا اور اس کا عالم
سراسیمگی ابھی ختم نہ ہونے پایا تھا کہ وہ غریب شخص قریب کی گلی میں
داخل ہو کر آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

(ڈاکٹر سید) محی الدین قادری زور ایم۔ اے
پی۔ ایچ۔ ڈی

صہبائے سادہ

(دو آتشہ)

(۱)

جس سے تری آنکھ جا لڑی ہے　اُس کیلئے نزع ہر گھڑی ہے
ہر شاخ ترے لئے چمن میں　پھولوں سے لدی ہوئی کھڑی ہے
ظالم! ترا تازیانۂ جور　میرے لئے پھول کی چھڑی ہے
جب اُس نے چھوا ہے جام و مینا　مستی کی گھٹا برس پڑی ہے

ماہرؔ سے جدا وُہ ہو رہے ہیں
شائد یہی نزع کی گھڑی ہے

(۲)

مرکز سے زمین ہٹ گئی ہے　یا میری نظر پلٹ گئی ہے
اللہ رے! تری جفا کی ہیبت　دُنیائے وفا سمٹ گئی ہے
جب سے ہے خرد کا گرم بازار　قیمت ہی جنوں کی گھٹ گئی ہے
اِس راہ سے کون آرہا ہے　ہر چیز جگہ سے ہٹ گئی ہے
سورج کی کرن بہ رنگِ وحدت　ذروں کی جبیں میں بٹ گئی ہے

کشتی مری آرزو کی ماہرؔ
ساحل کے قریں اُلٹ گئی ہے

ماہر القادری

بسمارک ۳

خارجہ پالیسی اور نوآبادیات

یورپ میں بسمارک کا اقتدار

سلطنت جرمنی کا قیام ۱۸ جنوری ۱۸۷۱ء کو عمل میں آیا۔ اِس تاریخ سے یورپ میں بسمارک یُگ شروع ہوگیا۔ چنانچہ ۱۸۷۱ء سے ۱۸۹۰ء تک سیاسیات یوروپ میں بسمارک سب سے بڑی شخصیت تھی۔ بیس سال کے اس عرصے میں اِسے وہی حیثیت حاصل رہی۔ جو ۱۸۱۵ء سے ۱۸۴۸ء تک آسٹریا کے وزیراعظم مٹیرنک کی تھی۔ مگر جہاں مٹیرنک کے بہت سے حریف تھے اور یہ حریف اِس سے ہمسری کا دعویٰ کرتے تھے۔ بلکہ بسا اوقات اسے مات بھی دے دیتے تھے۔ مثلاً انگلستان کے کیسلرے۔ کیننگ اور پالمرسٹن اور رُوس کا شہنشاہ نکولس۔ وہاں بسمارک کی ہمسری کا حوصلہ کِسی کو نہ ہوسکتا تھا۔ چنانچہ لارڈ ایمپٹھل نے جو برلن میں برٹش سفیر تھا۔ ۱۸۸۰ء میں اپنی گورنمنٹ کو ایک مراسلہ لکھا جس کے دوران میں تحریر کیا۔

"سینٹ پیٹرز برگ میں بسمارک کی زبان سے نکلا ہؤا ایک لفظ انجیل کی آیت کا حکم رکھتا ہے۔ یہی حال پیرس اور روم کا ہے۔ جہاں اِس کا سخن احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اور جہاں اس کی خاموشی سے تشویش پیدا ہو جاتی ہے ؁"

لیکن حقیقت یہ ہے، بسمارک کے متعلق لارڈ ایمپٹھل کے یہ الفاظ وائنا۔ میڈرڈ اور قسطنطنیہ پر بھی اتنے ہی صادق آتے تھے۔ جتنے سینٹ پیٹرزبرگ پیرس اور روم پر۔ گویا یورپ کا کوئی دربار ایسا نہ تھا۔ جہاں بسمارک کی حکمت عملی کا سکہ نہ چلتا تھا۔ عملی طور پر پُورے براعظم میں بسمارک کی فضیلت اور جرمنی کی فوقیت تسلیم کی جاتی تھی ؁

خارجہ معاملات سے بسمارک کی رغبت ۱۸۷۰ء کی جنگ فرانس کے بعد بسمارک جرمنی کے اندرونی معاملات میں منہمک ہوگیا لیکن بین الاقوامی سیاسیات میں جوڑ توڑ کا مرغوب کھیل اس نے کبھی نہ چھوڑا۔ وُہ پرشیا کے وزیراعظم کی حیثیت سے سلطنت جرمنی کا چانسلر مقرر ہؤا تھا۔ مگر جیسا کہ پہلے بیان ہوچکا ہے۔ ۱۸۷۳ء میں اُس نے وزیراعظم پرشیا کا عہدہ چھوڑ دیا۔ اَور اپنے ایک معتمد رُون کو یہ عہدہ دلادیا۔ اپنے پاس اُس نے سلطنت جرمنی کے چانسلر اور وزیرخارجہ کا عہدہ رکھا۔ وزیراعظم پرشیا کے عہدے سے مُستعفی ہونے کی بڑی وجہ تو وُہ مخالفت تھی۔ جس کا سامنا اُسے پارلیمنٹ جرمنی میں آئے دن کرنا پڑتا تھا۔ لیکن یہ بھی ناممکن نہیں۔ کہ وُہ معاملات خارجہ کے لئے اپنے آپ کو زیادہ فارغ رکھنا چاہتا ہو ؁

۱۸۷۰ء کے بعد سلطنت جرمنی کا فائدہ اسی میں تھا کہ نہ صرف جرمنی کسی اور طاقت سے برسرِ پیکار نہ ہو۔ بلکہ یُورپ کی مختلف طاقتیں آپس میں بھی امن و امان سے رہیں۔ بسمارک اس بات کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ کہ اگر یورپ کی دو طاقتیں آپس میں لڑ پڑیں۔ تو دوسری طاقتوں کو بھی کِسی نہ کِسی حیثیت سے لڑائی میں [illegible]

بعد وُہ ہمیشہ یہی کوشش کرتا تھا۔ کہ باہمی تنازعات کا تصفیہ سفارتی ذرائع سے ہوجائے اور تلوار اٹھانے کی نوبت نہ آئے ؁

اِس میں شک نہیں۔ کہ جرمنی کی فوجی طاقت میں اضافہ کرنا ہمیشہ اس کا عزیزترین مقصد رہا۔ لیکن اس سے اُسے یہ مقصود نہیں ہوتا تھا۔ کہ دُوسرے ممالک پر دستِ تصرّف دراز کرے۔ اگر وُہ جرمنی کی فوجی طاقت بڑھاتا تھا۔ تو اس لئے کہ اس کے خیال میں جرمنی کا طاقتور ہونا ہی یورپ کے امن و امان کی بہترین ضمانت تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ اگر جرمنی طاقتور ہوگا۔ تو وُہ یورپ میں امن قائم رکھ سکے گا۔ اس خیال پر وہ اپنے اقتدار کے خاتمہ تک قائم رہا۔ چنانچہ اِس کی آخری معرکہ آرا تقریر بھی جو اُس نے ۶ فروری ۱۸۸۸ء یعنی چانسلر کے عہدہ سے الگ ہونے سے دو سال پیشتر کی۔ اِس میں بھی اِس نے کہا۔

"جرمنی کی فوج اتنی زبردست ہونی چاہئے جو کسی سے مغلوب نہ ہوسکے۔

تاکہ بین الاقوامی تنازعات میں جرمنی ایک ایسے ثالث کی حیثیت اختیار کر سکے۔ جس کی طاقت سے سب خوف کھاتے ہوں ؛"

بین الاقوامی معاملات میں جرمنی کی اہمیت مسلم کر چکنے کے بعد بسمارک اپنے دیرینہ خواب یعنی اس مقصد کو پورا کرنے میں مصروف ہو گیا کہ جرمنی کی ہستی یورپ میں اور جرمن نسل کی ہستی دُنیا بھر میں فائق ترین ہو۔ یہی مقصد اس کی خارجہ پالیسی کا مرکز تھا۔

خارجہ پالیسی اور سفارتی جوڑ توڑ کے معاملے میں بسمارک میٹرنک کا ہم عقیدہ تھا۔ میٹرنک کی طرح اس کا بھی یہی خیال تھا کہ بین الاقوامی معاہدوں کی بات چیت ایسے اشخاص کے ہاتھ میں ہونی چاہئے جو اپنی اپنی حکومت کو اس بات چیت کا پابند کر دینے کی اہلیت اور قدرت رکھتے ہوں۔ زبانی بحث مباحثہ میں اظہار خیال کی بڑی وسیع آزادی ہوتی ہے۔ اور حکومتیں اپنے نمائندوں کے خیالات سے بے تعلقی کا اظہار کرنے کے لئے قریب قریب بالکل آزاد ہوتی ہیں۔ نظر بریں بسمارک کا خیال تھا کہ بات چیت کرنے والے ایسے اشخاص ہونے چاہئیں۔ جو پُورے طور پر بااختیار ہوں۔ سنہ ۱۸۶۵ء اور سنہ ۱۸۶۶ء کے درمیان نپولین سوم کے ساتھ بسمارک کی گفت و شنید اس پولیٹیکل مداری کے طریق کار کا صحیح نمونہ پیش کرتی ہے۔ جنگ کریمیا کے بعد نپولین یورپ کی عظیم ترین شخصیت اور پیرس یوروپ کا سیاسی مرکز بن گیا تھا۔ فرانس اس کے ہر قول کا پابند ہوتا تھا۔ اس لئے اس کے ساتھ بات چیت کرتے وقت بسمارک صحیح طور پر یہ سمجھتا تھا کہ میں فرانس سے بات چیت کر رہا ہوں ؛

اسی طرح سنہ ۱۸۷۱ء کے بعد رُوس اور جرمنی کے درمیان جو بات چیت ہوتی رہی۔ اس کا انحصار بھی زیادہ تر اس بات پر تھا کہ بسمارک الیگزنڈر دوم اور الیگزنڈر سوم کے ساتھ بالمشافہ تبادلہ خیالات کرتا تھا۔ کبھی شہنشاہ روس اسے مدعو کر لیتا تھا۔ اور کبھی وُہ شہنشاہ روس کو دعوت ملاقات دے دیتا تھا۔ رُوس کا شہنشاہ مطلق العنان تھا۔ بسمارک جرمنی کا شہنشاہ نہیں تھا۔ لیکن جرمنی کا مطلق العنان شہنشاہ مکمل طور پر اس کے بس میں تھا۔ اس لئے وُہ جو کچھ کرتا تھا۔ شہنشاہ جرمنی کو اس پر صاد کرنا پڑتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ بسمارک اور شہنشاہ رُوس کے درمیان جو کچھ طے پا جاتا تھا۔ رُوس اور جرمنی دونوں اس کے پابند ہوتے تھے ؛

اسی اصُول کے پیش نظر بسمارک انگلستان سے گفت و شنید کرنا بیکار سمجھتا تھا۔ کیونکہ انگلستان کی حکومت پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ اور ہر معاملہ کے متعلق ممبران پارلیمنٹ کو اعتماد میں لینے پر مجبور تھی۔ دُوسرے بسمارک کا یہ خیال بھی تھا کہ انگلستان میں جو لوگ آج برسر حکومت ہیں۔ انہیں ممکن ہے کہ کل پارلیمنٹ میں اکثریت کے اعتماد سے محروم ہو جانے کے باعث وزارت کی گدیاں خالی کرنی پڑیں۔ اور نئے وزرا کی پالیسی ان سے مختلف بلکہ ان کے متضاد ہو ؛

دو درندے ۔ رُوس اور آسٹریا

سنہ ۱۹۱۴ء میں جو حالات رونما ہوئے اور جن کی وجہ سے ساری دُنیا جنگ میں مبتلا ہو گئی۔ ان کا تصور سنہ ۱۸۷۱ء ہی سے بسمارک کو پریشان رکھتا تھا۔ اسی امکان کے پیش نظر وُہ ہمیشہ اس بات کے لئے کوشاں رہتا تھا کہ روس یا آسٹریا کا اتحاد فرانس سے نہ ہونے پائے۔ اس میں اسے زیادہ مشکل اس وجہ سے پیش آتی تھی کہ بلقان میں روس اور آسٹریا کے مفاد باہم متصادم تھے۔ اس لئے ان میں ہر وقت تلوار چل جانے کا خطرہ رہتا تھا۔ بسمارک کہا کرتا تھا کہ ان دونوں درندوں کو پکڑ کر ایک دوسرے سے جُدا رکھنا میری خارجہ پالیسی کا اولین مقصد ہے۔ کیونکہ اگر دونوں کو چھوڑ دیا جائے تو وُہ ایک دوسرے کو پھاڑ کھائیں گے اور اگر ایک کو پکڑ رکھا جائے۔ تو دُوسرا جرمنی پر چل پڑے گا۔ نظر بریں اس نے آسٹریا کو بھی گانٹھے رکھا اور رُوس کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

برلن کانگرس کے بعد ایسے حالات پیدا ہو گئے۔ جن کی وجہ سے بسمارک مجبور ہو گیا کہ یا آسٹریا کو اپنے ساتھ رکھے یا روس کو۔ زار روس کو شکایت تھی کہ بسمارک نے برلن کانگرس میں روس کو جنگ روس وترکی کے ثمرات سے محروم کر دیا ہے۔ اس شکایت کی بنا پر وُہ جرمنی سے کشیدہ تھا۔ اس لئے بسمارک نے آسٹریا کے ساتھ ایک خفیہ معاہدہ کر لیا جس کا مقصد یہ تھا۔ کہ اگر کوئی طاقت فریقین معاہدہ میں سے کسی ایک پر حملہ کرے۔ تو دُوسرا فریق اپنی پوری فوجی قوت سے اس کی امداد کو آئیگا۔ قیصر ولیم اس معاہدہ کے سخت خلاف تھا۔ کیونکہ زار روس اس کا قریبی رشتہ دار تھا۔ مگر بسمارک نے ولیم کی ایک نہ سُنی۔ جن حالات میں یہ معاہدہ ہُوا اور ولیم نے جن طریقوں سے اس کی مخالفت کی۔ وُہ نہایت دلچسپ ہیں۔ اور تفصیل کے ساتھ آئندہ صفحات میں بیان کئے جائیں گے۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ اگرچہ بسمارک کے طرز عمل سے زار ناراض ہو گیا۔ لیکن بسمارک نے کسی نہ کسی طرح ایسا انتظام کر لیا کہ فرانس کے ساتھ روس کا اتحاد نہ ہو سکے ؛

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ خارجہ معاملات میں بسمارک کبھی غلطی کا مرتکب نہ ہوتا تھا۔ لیکن اگر اس بارے میں ماہرین سیاست کا اختلاف بھی

ہو کہ آسٹریا کی خاطر روس کی دوستی کو قربان کر دینا بسمارک کی فاش غلطی تھی۔ تو کم از کم اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اگر وہ کوئی غلطی کر بیٹھا تھا۔ تو اس کی تلافی کا ڈھنگ بھی آسانی سے نکال لیتا تھا۔ چنانچہ فرانس کے ساتھ روس کا اتحاد نہ ہونا اس کے اس کمال کا بین ثبوت ہے ؏

آسٹریا سے جرمنی کا خفیہ معاہدہ ۱۸۷۹ء کا واقعہ تھا۔ اس کے آٹھ سال بعد یعنی ۱۸۸۷ء میں بسمارک روس کے ساتھ بھی ایک خفیہ معاہدہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس طرح اس نے فرانس کو ہمیشہ بے یار و مددگار رکھا۔ روس اور فرانس کا اتحاد اگر ہوا۔ تو ۱۸۹۶ء میں۔ جبکہ بسمارک کو وزارت سے برطرف ہوئے چھ سال ہو چکے تھے۔

سفارتی انقلاب کا آغاز

بسمارک کی خارجہ پالیسی کا ایک قابل ذکر پہلو یہ تھا کہ جہاں وہ دوسری طاقتوں کو جرمنی کے خلاف نہ ہونے دیتا تھا۔ اور اس بات کا بھی خیال رکھتا تھا کہ دوسری طاقتیں آپس میں بھی برسر پیکار نہ ہوں۔ وہاں وہ ان کے باہمی جذبۂ رقابت کو ٹھنڈا بھی نہیں ہونے دیتا تھا۔ چنانچہ ۱۸۸۱ء میں اس نے فرانس کو ٹیونس پر قبضہ کر لینے کی شہ دی اور اس طرح اٹلی کو اس سے بدظن کر دیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اٹلی جرمنی اور آسٹریا کی طرف مائل ہو گیا۔ اور ان تینوں طاقتوں کا ایک اتحاد ثلاثہ عمل میں آ گیا۔ جو ۱۹۱۵ء یعنی یورپ کی جنگ عالمگیر شروع ہونے کے ایک سال بعد تک قائم رہا۔ ۱۸۸۲ء میں اور اس کے بعد اس نے مصر پر قبضہ رکھنے میں انگلستان کی حوصلہ افزائی کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگلستان اور فرانس میں کشیدگی پیدا ہو گئی۔ روس کو وسط ایشیا کی طرف بڑھاتا رہا۔ اس سے روس اور انگلستان کے تعلقات خراب ہو گئے ؏

اس طرح ہمسایہ ممالک کو ایک دوسرے سے بدظن رکھنے کے متعلق بسمارک کی پالیسی پورے طور پر کامیاب رہی۔ مگر ۱۸۹۰ء سے جب قیصر ولیم دوم نے بسمارک کو برطرف کر دیا۔ تو اس کے جانشین اس پالیسی کو کامیابی کے ساتھ جاری نہ رکھ سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس پالیسی کو کامیابی کے ساتھ جاری رکھنا تو ایک طرف اسے پورے طور پر سمجھنا بھی ان کی طاقت سے باہر تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بسمارک کے زوال پر دنیا میں ایک سفارتی انقلاب شروع ہو گیا۔ جو انجام کار روس۔ فرانس اور برطانیہ کے اتحاد ثلاثہ پر منتج ہوا اس طرح عالمگیر جنگ کے حادثۂ عظیم کو روکنے کی کوشش بسمارک ۱۸۷۱ء سے کر رہا تھا۔ وہ اس کی برطرفی کے ۲۴ سال بعد اور اس کی وفات کے ۱۶ سال بعد ظہور پذیر ہو گیا ؏

سطور بالا میں یہ بیان ہو چکا ہے۔ کہ ٹیونس پر فرانس کا قبضہ ہو جانے کی وجہ سے اٹلی کا میلان جرمنی اور آسٹریا کی طرف ہو گیا اور ۱۸۸۲ء میں اس نے ان وسطی طاقتوں کے ساتھ اتحاد ثلاثہ میں شرکت کر لی۔ لیکن جیسا کہ آگے چل کر بیان ہو گا۔ بسمارک کو اٹلی سے کوئی امید نہ تھی۔ اور اس کا یہ خیال کبھی نہ ہوا کہ جنگ کی صورت میں جرمنی اور آسٹریا کو اٹلی سے مسلح امداد ملیگی۔ بسمارک کا یہ اندیشہ درست نکلا۔ چنانچہ جب ۱۹۱۴ء میں یورپ کی عالمگیر جنگ شروع ہوئی۔ اس وقت فرانس۔ روس اور برطانیہ کے اتحاد ثلاثہ کے مقابلہ میں اگرچہ جرمنی۔ آسٹریا اور اٹلی کا اتحاد ثلاثہ موجود تھا۔ لیکن اٹلی شریک جنگ نہ ہوا۔ بلکہ ۱۹۱۵ء میں فرانس۔ روس اور برطانیہ کا مسلح حلیف بن گیا ؏

بسمارک کی خارجہ پالیسی اس حد تک کامیاب تھی۔ اور بین الاقوامی سیاسیات میں اس کا اقتدار اس حد تک مسلم تھا کہ یورپ کی کوئی سیاسی گتھی اس کی مداخلت کے بغیر سلجھ نہ سکتی تھی۔ اور کوئی معاہدہ جس کا علم اسے نہ ہو۔ قابل عمل نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اگر سینٹ پیٹرز برگ کا نمائندہ آسٹریا سے کوئی معاملہ طے کرنے وائنا یا برطانیہ کا نمائندہ سپین سے بات چیت کرنے میڈرڈ جاتا تھا۔ تو اس کے لئے ضروری تھا کہ ایک دو دن کا چکر کاٹ کر برلن سے ہوتا اور اپنے مقصد سفر سے بسمارک کو آگاہ کر جائے۔ بین الاقوامی معاہدوں کو اگر سیاسی سودے تصور کیا جائے۔ تو بسمارک کی حیثیت سیاسی دلال کی تھی۔ جو تھوڑا سا کمیشن لے کر سودا مکمل کرا دیتا تھا۔ بسمارک نے آسٹریا اور روس دونوں سے خفیہ معاہدے کئے۔ مگر دوسری طاقتوں کی یہ مجال نہ تھی کہ بسمارک کی لاعلمی میں باہم کوئی معاہدہ کر لیں ؏

نو آبادیات کے معاملہ میں لاپروائی

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے ۱۸۷۱ء کے بعد بسمارک کی خارجہ پالیسی کا ایک بڑا مقصد یہ تھا کہ جرمنی کی جو سلطنت قائم ہو چکی ہے۔ اس کو برقرار رکھا جائے اور مضبوط بنایا جائے۔ اس میں مزید علاقے کی توسیع کرنا وہ مفاد سلطنت کے منافی سمجھتا تھا۔ وہ یورپ سے باہر نو آبادیات کی سلطنت قائم کرنے کے خلاف تھا۔ اور قیصر نے اپنی یادداشتوں میں بالکل بجا لکھا ہے کہ نو آبادیات کی قدر و قیمت اس کی نگاہ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں تھی کہ انہیں سیاسی سودوں میں معاوضہ چکانے کی غرض سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اول یورپ کی باہمی جنگ کا فیصلہ ہر صورت یورپ ہی میں ہو گا۔ اور اسی طاقت کا پلڑا بھاری رہے گا۔ جو یورپ میں غالب آئے گی ؏

اسی قول کی زیادہ وضاحت مقصود ہو۔ تو مثال کے طور پر فرض کر لیجئے کہ

برطانیہ اور فرانس کے مابین ساری دُنیا میں جنگ پکڑ جاتی ہے۔ اور برطانوی فوجیں فاتحانہ طور پر فرانس کے دارالحکومت پیرس میں داخل ہو جاتی ہیں۔ نیز فرانس کے دیگر اہم شہروں پر بھی برطانیہ کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں اگر ہندوستان یا افریقہ کے اندر فرانس کی فوجوں نے برطانیہ کی فوجوں کو زیر بھی کر لیا ہو۔ تو شرائط صلح میں فرانسیسیوں ہی کو جھکنا پڑے گا۔ کیونکہ اِن کے اپنے گھر پہ برطانیہ کا قبضہ ہوگا ؛

بسمارک کے نزدیک غیر جرمن سفید اقوام کو جرمنی کی ماتحتی میں لانا خطرناک تھا۔ کیونکہ اِس سے سلطنت کی ہم آہنگی اور یگانگت میں خلل آجانا اور کارپردازان سلطنت کو ایک مستقل بے چینی اور دائمی شورش سے دوچار رہنا پڑتا۔ لیکن رعایا سلطنت میں رنگدار اقوام کا اضافہ کرنا وہ اِس سے بھی زیادہ خطرناک اور نقصان دہ سمجھتا تھا۔ کیونکہ اِن میں اور جرمنوں میں طبائع اور عقائد کا اختلاف اِس سے بہت زیادہ ہے۔ جتنا جرمنوں اور دُوسری سفید اقوام میں ہے۔ وُہ سمجھتا تھا کہ رنگدار اقوام کی شمولیت سے سلطنت جرمنی کو تقویت تو کچھ نہیں پہنچے گی۔ البتہ ذمہ واریوں کا بوجھ اِس کی گردن پر پڑ جائے گا ؛

امر واقعہ یہ ہے کہ اگرچہ ۱۸۷۰ء کے بعد بسمارک کو یُورپ کے اندر کوئی لڑائی نہ کرنی پڑی۔ لیکن اِس کے باوجود جرمنی نے ۱۸۸۴ء تک یُورپ سے باہر ایک انچ بھی زمین حاصل نہ کی۔ اقتصادی ضروریات کے سامنے آخر بسمارک کو بھی سر جھکانا پڑا ؛

صنعتی خوشحالی کا اثر

۱۸۷۰ء کے بعد بین الاقوامی سیاسیات میں جرمنی کا سر اونچا رکھنے کے ساتھ ہی ساتھ بسمارک نے اندرون سلطنت بھی رعایا کی صنعتی اور تجارتی خوشحالی کو بڑھانے کی طرف پُوری توجہ دی اور اِس غرض سے وزیر تجارت و صنعت و حرفت کا عہدہ بھی خود ہی سنبھال لیا۔ اِس کی محنت و کوشش سے جرمنی جو پہلے ایک زراعتی ملک تھا۔ بہت جلد ایک صنعتی ملک میں مبدل ہو گیا۔ تمام بڑے بڑے شہروں میں وسیع پیمانہ پر کارخانے جاری ہو گئے۔ صنعت و حرفت کی ترقی سے آبادی میں بھی روز افزوں ترقی ہونے لگی۔ جب بڑھتی ہُوئی آبادی ملک کے ذرائع معاش پر بار ہو گئی۔ تو بے شمار جرمن نقل وطن کرکے ریاستہائے متحدہ امریکہ اور برازیل کو چلے گئے۔ اب بسمارک کو اس بات کی ضرورت محسوس ہُوئی کہ سمندر پار سے کارخانوں کے لئے خام مال منگوایا جائے۔ اور جو مال کارخانوں میں تیار ہو۔ اِس کی کھپت کے لئے سمندر پار منڈیاں تلاش کی جائیں۔ یہ ضرورت صرف اِسی طرح پُوری ہو سکتی تھی کہ جرمنی بھی یورپ سے باہر اپنی نوآبادیاں قائم کرے ؛

چنانچہ ۱۸۸۴ء کے بعد بسمارک نوآبادیاں حاصل کرنے کی طرف متوجہ ہُوا۔ اِس میں اپنے بین الاقوامی اقتدار سے اِس کو بڑی مدد ملی۔ چنانچہ چھ سال کے قلیل عرصہ کے اندر اندر یعنی ۱۸۹۰ء تک اِس نے نوآبادیات کی ایک اچھی خاصی سلطنت قائم کر لی ؛

اگرچہ حصول نوآبادیات کے لئے بسمارک نے اپنی کوششوں کا آغاز ۱۸۸۴ء کے بعد کیا۔ لیکن ملک میں نوآبادیاں حاصل کرنے کی تحریک ۱۸۸۲ء ہی میں شروع ہو گئی۔ چنانچہ اسی سال کے ماہ دسمبر میں بمقام فرینکفورٹ جرمن کالونیل سوسائٹی یعنی انجمن نوآبادیات جرمنی کی بنیاد رکھی گئی۔ اخبارات میں دھڑا دھڑ مضامین شائع ہونے لگے۔ جن میں جرمنی کے لئے نوآبادیات کی ضرورت پر زور دِیا جاتا تھا۔ اِن مضامین سے ملک میں نوآبادیات کی ضرورت کے متعلق عالمگیر بیداری ہو گئی۔ اِس بیداری سے اخبارات کی ہمت اور بڑھ گئی اور وُہ بڑے وسیع پیمانہ پر اس خیال کا اظہار کرنے لگے کہ جس طرح برطانیہ نے ایشیا میں ہندوستان جیسا عظیم ملک حاصل کر لیا ہے۔ اسی طرح جرمنی کو بھی اِس بات کا حق حاصل ہے کہ وُہ براعظم افریقہ کے بیچوں بیچ ایک اپنا ہندوستان بنا لے۔ جو بحر اوقیانوس سے لے کر بحر ہند تک پھیلا ہُوا ہو۔ بالفاظ دیگر برطانیہ۔ فرانس۔ بلجیم اور پرتگال سے کچھ افریقی علاقہ لے کر اِسے ایک جرمن نوآبادی بنا دِیا جائے۔ اخبارات اِس بات پر بھی زور دیتے تھے۔ کہ دُنیا کے مختلف حصوں میں جرمنی کو فوجی اہمیت کے مقامات پر قبضہ کر لینا چاہیئے۔ تاکہ اگر اسے برطانیہ سے جس کی سلطنت ساری دُنیا میں پھیلی ہُوئی ہے۔ جنگ میں اُلجھنا پڑے۔ تو جرمن جہازوں کو نقل و حرکت کرنے میں دِقتیں پیش نہ آئیں ؛

انجمن نوآبادیات کی بنیاد پڑنے سے کئی سال پہلے افریقہ کے نئے نئے علاقوں کی دریافت میں جرمنی کے عالی ہمت اُولوالعزم بھی نمایاں حصّہ لے رہے تھے اور ۱۸۸۰ء کے بعد جنوبی افریقہ کے ولندیزوں نے جو وہاں کی صورت حالات سے نامطمئن تھے۔ جرمنی کو اِس علاقہ پر قبضہ کر لینے کی دعوت دی اِسی طرح خلیج سینٹ لوئیسیا اور پانڈولینڈ میں بھی اہل جرمنی کی طرف سے قدم جمانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن چونکہ حکومت جرمنی اِن کی پُشت پر نہ تھی۔ اِس لئے یہ کوشش کامیاب نہ ہُوئی ؛

افریقہ میں ۱۰ لاکھ مربع میل علاقہ لے لیا گیا

آخر پبلک ایجی ٹیشن سے متاثر ہو کر حکومت جرمنی میدان میں آگئی۔

۱۸۸۴ء میں قیصرا لینڈ اور نماکوالینڈ پر جرمنی کی سیادت قائم ہوگئی - یہ علاقہ مجموعی طور پر ۳ لاکھ ۳۰ ہزار مربع میل تھا - اور اس کی سرحدیں کیپ کالونی سے ملتی تھیں - مغربی افریقہ کے ساحل پر ٹوگو لینڈ اور کیمرون پر جرمنی کا قبضہ ہوگیا - تیسری نوآبادی جو سب سے زیادہ اہم تھی - مشرقی ساحل پر جرمن ایسٹ افریقہ کے نام سے قائم ہوئی - اس طرح ۱۸۸۴ء سے ۱۸۹۰ء تک کے مختصر زمانہ میں افریقہ کے یورپین مالکوں میں جرمنی تیسرے نمبر پر آگیا - اوّل درجہ پر فرانس تھا - جس کے مقبوضات کا رقبہ ۴۰ لاکھ مربع میل تھا - اور دُوسرے درجہ پر برطانیہ جس کے مقبوضات ۳۰ لاکھ مربع میل میں پھیلے ہُوئے تھے - مگر ان میں سوڈان اور مصر شامل نہیں تھے - جرمن مقبوضات کا رقبہ دس لاکھ مربع میل تھا ؀

لیکن حصول نوآبادیات کے متعلق جرمنی کی سرگرمیاں صرف افریقہ تک محدود نہ تھیں - ۱۸۸۴ء میں بسمارک نے نیوگنی کا شمالی ساحل حاصل کیا - نیز ایک مجمع الجزائر بھی جرمنی کے ہاتھ آیا - جس کا نام مجمع الجزائر بسمارک رکھا گیا ؀

یہاں یہ ظاہر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ افریقہ میں بھی اور بحرالکاہل میں بھی جرمنی کو آبادیات برطانیہ کی رضامندی سے ہاتھ لگیں - اس میں شک نہیں کہ مقامی انگریزوں نے جرمنی کی دست اندازی کے خلاف زور دار احتجاج کیا - لیکن حکومت برطانیہ نے اس احتجاج کی پروانہ کی - بلکہ مسٹر گلیڈسٹون کے الفاظ میں نوآبادیات کے میدان میں جرمنی کے داخلہ کا خیر مقدم کیا - مسٹر موصوف نے کہا بنی نوع انسان کی بھلائی کے لئے خُدا کی مرضی کو چلانے میں جرمنی نے برطانیہ کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا ہے اور اب سے اس معاملہ میں وُہ برطانیہ کا حلیف اور حصہ دار ہے - ۱۸۹۰ء میں افریقہ کی پُرامن تقسیم لارڈ سالسبری کے تدبّر کا نتیجہ تھا - جو اس وقت برطانیہ کا وزیر اعظم تھا ؀

مختصر یہ کہ نوآبادیات حاصل کرنے کے لئے جرمنی کو جنگ بالکل نہ کرنی پڑی - بلکہ ایک گولی چلائے بغیر ہی وُہ سمندر پار اتنی بڑی سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا - اندریں حالات اگر بسمارک جرمنی کی بحری طاقت بڑھانے پر توجہ نہ دیتا تھا - تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں - بجائے خود وہ خیال کرنے میں راستی پر تھا - کہ اگر سفارتی ذرائع اور سیاسی جوڑ توڑ ہی سے مقصد برآوری ہو جائے - تو جنگی جہازوں کی تعمیر پر روپیہ خرچ کرنے کی کیا ضرورت ہے ؀

لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے - کہ اس کی نگاہ میں بحری فوج کی وقعت ہی کچھ نہیں تھی - امر واقعہ یہ ہے کہ نہر کیل جو جرمنی کے بحری پروگرام کی سب سے بڑی مد تھی - اس کی سکیم اسی نے تیار کی تھی - اور شلسوگ اور ہولسٹین کے صوبے بھی اس نے اسی لئے ڈنمارک کے قبضہ سے نکال لئے تھے - کہ ان میں کیل کی بندرگاہ واقع تھی ؀

(باقی باقی)

(پنڈت) میلا رام وفا

غزل

دلِ مایُوس کو سرگرم تمنّا کر دے
حشرِ جذبات کا دِل میں مرے برپا کر دے

تجھکو اپنی ہی سکوں سوز نگاہوں کی قسم
دِل کو پھر سوزِ محبّت سے شناسا کر دے

وحشتِ عشق عطا کر مرے دل کو آدمت
یعنی اِس ذرۂ ناچیز کو صحرا کر دے

میری تاریکیٔ قسمت کی قسم ہے تجھ کو
اب تو دُنیائے محبّت میں اُجالا کر دے

پھر وہی بادۂ سرجوش پلا دے مجھ کو
جو مری مُردہ تمنّاؤں کو زندہ کر دے

گوپال مِتّل

اپنی بیماری کی یاد میں
(ایک طبیب)

فرانسیسی ادب و انشا کا نمونہ، شائستہ خوش طبعی کا مکالمہ
(نامور زبان آور مسیو گلفٹن M. Glifton کے قلم سے)

ملازم - سرکار! حکیم صاحب کو آپ کے پاس لے آیا ہوں - یہ دنیا جہان میں سب سے بڑے طبیب ہیں - غیر ملک کے ڈاکٹر ہیں - اور عجیب و غریب معالجے کر دکھاتے ہیں - ان کا شہرہ و نام یہاں بہت ہے - اور ہر شخص انہیں کے پاس آتا ہے ؞

آقا - تو ابھی سامنے لے آؤ -

ملازم - یہ آرہے ہیں -

آقا - مَیں آپ کو اپنے مکان پر دیکھ کر دِل شاد و مسرور ہوں - مجھ کو آپ کے نیک مشورہ کی بہت بڑی ضرورت ہے ؞

طبیب - مَیں بھی خوش ہوں کہ آپ کو میری خدمات درکار ہیں اور میں اپنے تمام دِل و جان سے چاہتا ہوں کہ آپ کا سارا کنبہ اِسی حالت میں ہو جائے ؞

آقا - ان خیالات و احساسات کے لئے میں آپ کا احسان مند ہوں ؞

طبیب - مَیں آپ کو یقین دلاتا ہوں - کہ مَیں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ میرے عمق روح سے نکل رہا ہے ؞

آقا - آپ حد سے زیادہ میری عزّت فرما رہے ہیں ؞

طبیب - کسی طرح نہیں - آپ کی طرح کے مریض روز روز تھوڑے ہی نصیب ہوتے ہیں ؞

آقا - مَیں تو آپ کا عاجز ترین خادم ہوں ؞

طبیب - مَیں شہر بہ شہر اور صوبہ بہ صوبہ جاتا ہوں، ایک بادشاہت سے دُوسری سلطنت کو - اِسی لئے تاکہ ایسے مریض دستیاب ہوں جو میرے عِلاج و توجہ کے قابل ہوں ؞

معمولی بیماریوں سے اپنا جی بہلانے میں اپنی حقارت سمجھتا ہوں ؞ جِرِیع مفاصل (گنٹھیا) اورام، خُون کے جوش ——

مَیں بڑی اور اہم اقسام کی بیماریاں چاہتا ہوں مزمن یا مُدار بخار جن کے ساتھ بدحواسی بھی طاری ہو گئی ہو - زور کی وبائیں، اچھا خوب بڑھا ہُوا استقار اچھے ذات الجنب - یہی وہ چیزیں ہیں - جن میں مجھے مزہ آتا ہے - یہی وہ چیزیں ہیں جن پر میں فتح پاتا ہوں ؞

جناب! میری آرزو تو یہ ہے کہ میں یہ جملہ امراض آپ میں مجتمع دیکھوں، جن کے نام ابھی ابھی گنا چکا ہوں - جبکہ تمام ڈاکٹر دستکش ہو چکے ہوں - نا اُمیدی کی حالت ہو جائے - سکرات کا عالم اور نفس آخرین ہو - اُس وقت میں آپ کو دکھا دوں کہ میری دوائیں کیسی کیسی عمُدہ ہیں ؞

آقا - جناب! مَیں آپ کا ممنون ہوں - کہ مجھُ پر آپ کی مہربانیاں اس درجہ ہیں ؞

طبیب - مجھے اپنا ہاتھ دیجئے - اب آئیے - اُس کو تڑپنے دیجئے، جیسا کہ ہونی چاہیئے ؞

آپ کا ڈاکٹر کون ہے؟

آقا - مانشیر پرگن - M. PURGON

طبیب - اِس شخص کا نام تو بڑے بڑے طبیبوں کے زمرہ میں میری کتابوں میں لکھا نہیں ہے - وُہ کیا کہتا ہے - آپ کی بیماری کو کیا بتاتا ہے؟

آقا - وُہ کہتے ہیں - کہ جگر کی شکایت ہے - اور اور لوگ کہتے ہیں کہ طحال کی ہے -

طبیب - یہ سب کے سب احمق ہیں - آپ کی بیماری کی جڑ پھیپھڑوں میں ہے ؞

آقا - کیا - پھیپھڑوں میں؟

طبیب - ہاں، ہاں - آپ خود کیا محسوس کرتے ہیں؟

آقا - مجھے سر میں (اقسام کے) درد معلوم ہوتے ہیں۔ (درد سر کی تکلیف کوئی نہ کوئی رہتی ہے) وقتاً فوقتاً۔

طبیب - ٹھیک ہے۔ بالکل درست۔ پھیپھڑے۔

آقا - کبھی کبھی مجھے ایسا نظر آتا ہے گویا میری آنکھوں کے سامنے کپڑا چھایا ہوا ہے۔

طبیب - وہی پھیپھڑے۔

آقا - بعض اوقات میرے معدہ میں درد ہوتا ہے۔

طبیب - وُہی پھیپھڑے۔

آقا - گاہ گاہ مجھے اپنے تمام اعضا میں ایک قسم کی ماندگی کا احساس ہوتا ہے ٭

طبیب - وُہی پھیپھڑے۔

آقا - کبھی کبھی پیٹ میں درد اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ جیسے قولنج کا ہوتا ہے۔

طبیب - وُہی پھیپھڑے۔ آپ جو کچھ کھاتے ہیں۔ اُس کی اشتہا بھی ہوتی ہے؟

آقا - ہاں۔ صاحب۔

طبیب - وُہی پھیپھڑے۔ تھوڑی سی شراب پینے کی بھی رغبت ہوتی ہے؟

آقا - ہاں۔ صاحب۔

طبیب - وُہی پھیپھڑے۔ غذاؤں کے بعد تھوڑی سی جھپکی لے لینے کو بھی طبیعت چاہتی ہے؟ اور آپ سو جانے سے بہت خوش ہو جاتے ہیں؟

آقا - جی ہاں۔ جناب۔

طبیب - بس۔ وُہی پھیپھڑے۔ وہی پھیپھڑے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں۔ آپ کے ڈاکٹر نے آپ کو کیا کیا کھانے کی ہدایت کی ہے ٭

آقا - یخنی کا حکم ہے ٭

طبیب - احمق۔

آقا - مُرغ اور چوزے۔

طبیب - احمق۔ اجہل۔

آقا - بچھڑے کا گوشت۔

طبیب - احمق۔

آقا - شوربے۔

طبیب - احمق۔

آقا - تازہ تازہ دیئے ہوئے انڈے۔

طبیب - احمق۔

آقا - اور رات کو کچھ چھوٹے چھوٹے خشک بیر۔

طبیب - احمق۔

آقا - اِن کے علاوہ میری (اپنی) شراب بھی، خوب پانی مِلا کر۔

طبیب - آپ کا ڈاکٹر دماغ خر رکھتا ہے۔ آپ کو اپنی خالص شراب (مئے ناب) پینا چاہیئے۔ اپنے خون کو گاڑھا بنانا چاہیئے۔ وہ بہت زیادہ رقیق ہو رہا ہے۔ آپ کو کھانا چاہیئے۔ کچھ تو خوب فربہ لحم تور، عمدہ دانہ خوری کے خنزیر کا گوشت۔ اچھا ولندیزی پنیر۔ جو کا آٹا اور چاول۔ شاہ بلوط اور اوبلیان ٭ میں اپنے انتخاب سے ایک ڈاکٹر آپ کے پاس بھیجوں گا اور آپ کو دیکھنے کے لئے پہنچوں گا۔ (یعنی آؤں گا) وقتاً فوقتاً۔ جب تک اِس شہر میں میرا قیام ہے ٭

آقا - آپ مجھے نہایت درجہ ممنون فرمائیں گے ٭

طبیب - ہاں۔ اس بازو کے ساتھ آپ یہ کیا شیطنت کر رہے ہیں ٭

آقا - کیا؟

طبیب - وُہ ایک ہاتھ ہے جس کو میں جلد سے دُور کرا چکا ہوتا، اگر میں آپ کی جگہ پر ہوتا ٭

آقا - کیوں؟

طبیب - آپ دیکھتے نہیں کہ [illegible] کی یہ تمام تقویت رسانی کو جذب کر لیتا ہے۔ اور اِس [illegible] میں ذرہ بھر پہنچنے سے بھی روکتا ہے ٭

آقا - ہاں۔ مگر مجھے تو اپنا ہاتھ درکار ہے۔

طبیب - آخر آپ کی داہنی آنکھ بھی تو ہے جس کو میں تو ضرور نکلوا دیتا اگر آپ کی جگہ میں ہوتا ٭

آقا - میری، آنکھ نکلوا دی جائے؟

طبیب - آپ دیکھتے نہیں کہ اس سے دوسری کو ضرر پہنچتا ہے۔ اور اُس کو اپنی تقویت کے پانے سے محروم رکھتی ہے۔ میری بات یاد کیجیئے۔ اور جس قدر جلد ممکن ہو اُس کو نکلوا دیجیئے۔ تو پھر بائیں آنکھ سے آپ اور بھی بہتر دیکھ سکیں گے ٭

آقا - ابھی اس کی جلدی نہیں ہے۔

طبیب - الوداع و سلام۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ سے اس قدر جلد رخصت ہو رہا ہوں۔ لیکن مجھے تو ایک بڑے جلسۂ مشورے میں موجود ہونا

(شریک ہونا) لازم ہے جو ایک ایسے آدمی کی نسبت منعقد ہوگا جو کل فوت ہوا ہے ۔

آقا۔ ایک شخص کے متعلق؛ جو کل مر چکا ہے ۔

طبیب۔ جی ہاں۔ تاکہ سوچا جائے اور تحقیق کیا جائے کہ اُس کے شفا پا جانے کے لئے کیا کیا عمل ہونا چاہیے تھے۔ رخصت! جب تک کہ پھر آپ کو دیکھوں ۔

آقا۔ آپ تو جانتے ہیں۔ کہ بیمار آدمی اپنے ملاقاتیوں کو باہر پہنچانے نہیں جاتے ۔

(ترجمہ)

(مولینا سید مقبول احمد صمدانی)

سادھو کی چتا

ہمنشیں کشمیر سے لاہور کو آتے ہوئے — اِک سماں دیکھا جگر پر نیش غم کھاتے ہوئے

گر چکا تھا طاقِ مغرب سے چراغِ آفتاب — بند تھی جُزدان تاریکی میں فطرت کی کتاب

ظلمتیں گردوں کی کالی فصیل سے چھلکی ہوئی — جھکڑوں سے ٹہنیوں کی گردنیں ڈھلکی ہوئی

اَبر کے دامن میں کوندے کی لپک، چشموں کا شور — ہلکی ہلکی بوندیوں کا سلسلہ، جھونکوں کا زور

دُور وادی میں کہیں مدھم سا دہقانوں کا غُل — تیز نالے پر گذرنے کیلئے لکڑی کا پُل

پُل کی اک دیوار کے نیچے قریب رہ گذر — ایک سادھو کی چتا تصویرِ انجامِ بشر

بوندیوں میں آگ کا پرتو چٹانوں پر جھلک — مست بادل کی گرج سے کوہساروں میں دھمک

[illegible] خونخوار جبڑوں سے دھواں اُٹھتا ہوا — پیچ و خم کھا کر زمیں سے آسماں اُٹھتا ہوا

چو طرف جیسے [illegible] — [illegible]ف سے ٹھنڈی ہوا کو ہلکا ہلکا سا بخار

کھولتا سینہ، سلگتی کھوپڑی، پکتا بدن — بڑبڑاتی آگ، جھلاتی لپٹ، جلتا کفن

ٹوٹتی نبضیں، چٹختی ہڈیاں، اُڑتے شرار — لوتھڑوں کی سنسناہٹ، سُرخ شعلوں کی ڈکار

ہونکتے جھونکوں کے آگے چونکتی چنگاریاں — بولتے شعلوں کی لہراتی ہوئی نیلی زباں

ہر طرف لہرا رہا تھا بے ثباتی کا علم — موت کی دیوی کے خونیں قہقہوں کا زیر و بم

میرے قصرِ زندگی میں زلزلہ سا آگیا — رُوح کے آئینہ خانہ پر دُھندلکا چھا گیا

بزم عشرت اُٹھ گئی، طنبورِ غم بجنے لگا — ضربتِ تشویش سے سازِ الم بجنے لگا

عبرت اُٹھی، آرزو بیٹھی، تمنا سو گئی — یاس نے انگڑائی لی، اُمید زخمی ہوگئی

رات بھر میرے دلِ محزوں کو بیتابی رہی — خواب پر غالب پریشانی سے بے خوابی رہی

اب بھی وہ منظر کبھی جب یاد آتا ہے مجھے
زندگی میں موت کا نقشہ دکھاتا ہے مجھے

احسان دانش

گروجی

اِن کا نام پریم سروپ تھا۔ وُہ ایک چھوٹے سے گاؤں میں پاٹھ شالا کے گروجی تھے۔ اِن کی جھونپڑی گاؤں کے کنارے گھاس پھوس کی بنی ہوئی تھی۔ اِن کی بیوی مر چکی تھی۔ اِس لئے وُہ اور صرف ان کی بیٹی دیا وتی ہی اِن کا سارا خاندان تھا۔ دیا اِس وقت نو سال کی تھی۔ وُہ روز سویرے اُٹھتی اَور گھر کا کام کاج کر کے کھانا پکانے میں لگ جاتی تھی۔ کھانا پک جانے پر گروجی کھانا کھا کر پاٹھ شالا چلے جاتے۔ دیا برتن مانجھ دھو کر سینے پرونے بیٹھ جاتی +

ہمیشہ کی طرح آج بھی گروجی کھانا کھا کر پاٹھ شالا گئے۔ شالا اِن کے گھر کے بالکل پاس ہی تھا۔ وہاں پہنچ کر گروجی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے اور لڑکوں کے آنے کی راہ دیکھنے لگے۔ دھیرے دھیرے دو دو چار چار لڑکوں کی ٹولی آنے لگی۔ پہلے سات برس کا ایک بچہ آیا۔ اور گروجی کو پرنام کر کے پاس ہی پڑی ہوئی چٹائی پر بیٹھ گیا۔ وُہ ابھی بیٹھا ہی تھا کہ دو تین لڑکے اور بھی آ گئے۔ اِسی طرح تھوڑی ہی دیر میں شالا کے سارے لڑکے اکٹھے ہو گئے +

شالا کے کل لڑکوں کی تعداد صرف اٹھارہ تھی۔ سارے لڑکے ایک عمر کے نہ تھے۔ کوئی صرف پانچ برس کا تھا تو کوئی بارہ تیرہ سال کا۔

گھنٹہ بجتے ہی لڑکوں نے اپنے اپنے بستے کھولے۔ اور کتابیں نکال گھٹنوں پر رکھ کر پڑھنا شروع کیا۔ شالا کے سبھی لڑکے حاضر تھے۔ صرف مادھو کی جگہ خالی تھی۔ مادھو کو شالا سے غیر حاضر ہوئے آج پُورے تین دن ہو چکے تھے۔ اِس کی خالی جگہ پر نظر پڑتے ہی گروجی نے رامو سے پوچھا۔۔ "کیوں رامو! مادھو کی طبیعت کیسی ہے؟"

"گروجی! اِس کا بخار پہلے سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ اُترنے کی جگہ اُلٹا بڑھتا ہی جاتا ہے۔" رامو کی بات سُنکر گروجی کے چہرے پر اُداسی چھا گئی۔ وُہ گھٹنے پر سر رکھ کر خیالات کی رو میں بہنے لگے۔ لڑکوں نے اپنا اپنا سبق یاد کرنا شروع کیا +

رامو کا خیال سبق کی طرف نہ تھا۔ وُہ کُرتے کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر اس میں پڑی ہوئی گولیاں گننے لگا۔ اِس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ کہ اگر موقع ملے تو کتابیں پھینک کر گولیاں کھیلنے لگے +

اِدھر مہیش نے کالو رام سے ہنسی مذاق کرنا شروع کر دیا۔ لڑکوں کو اودھم مچاتے دیکھ کر گوبند سے بھی نہ رہا گیا۔ اس نے بھی پیچھے سے چھپ چھپ کر دھول بازی شروع کر دی +

بیچارے گوروجی لڑکوں کے سامنے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ اُنہوں نے اپنے دل کو کام میں لگانے کی کوشش کی۔ لیکن اِس بیمار شاگرد کا خیال انہیں بار بار ستا رہا تھا۔ گروجی کی یہ حالت دیکھ کر شرارتی لڑکوں کی بن آئی۔ مہیش نے گروجی کو خیالات میں محو دیکھ کر مونگ پھلی چھیل چھیل کر اٹوٹھو کھیلنا شروع کیا۔ جوکھو چاقو کی نوک سے تختی پر اپنا نام لکھنے لگا۔ ہری جو گروجی کو سبق سُنا رہا تھا۔ موقع پا کر بالکل گروجی کی بغل میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ اَور بھولے ہوئے [illegible] کی دیوار یا چھپر کی طرف نہ دیکھنا پڑتا تھا۔ وُہ گروجی کے سامنے پڑی ہوئی کتاب میں سے دیکھکر سبق سُنا رہا تھا۔ بہاری نے شالا کے سب سے چھوٹے لڑکے گنیش کو چڑھانا شروع کیا۔ لیکن مہیش کی طرح آج اسے گنیش کو چڑھاتے وقت اپنے منہ کے سامنے کھُلی ہوئی کتاب کی آڑ نہ کرنا پڑی +

درمیان میں اگر کبھی گروجی چونکتے اَور اپنا سر اُوپر اُٹھاتے تو لڑکے شور و غل بند کر دیتے۔ اَور اپنی صورتیں ایسی بنا لیتے جیسے نہایت توجہ سے جی لگا کر پڑھنے میں مصروف ہوں۔ لیکن گروجی جوں ہی کچھ سوچنے لگتے لڑکے پھر پہلے سے زیادہ شور مچانا شروع کر دیتے +

پاٹھ شالا کے کچھ لڑکے تو ایسے بھی تھے۔ جن کا دِل شالا میں بیٹھنے میں بالکل لگتا ہی نہ تھا۔ اِن کی آنکھیں پاٹھ شالا کے کھُلے ہوئے دروازے اَور کھڑکیوں کی طرف تھیں۔ ان کے چہروں کے دیکھنے سے ایسا معلوم

ہوتا تھا۔ جیسے وہ اُٹھ کر بھاگنا ہی چاہتے ہوں۔ کسی کا خیال گاؤں کے باہر والی نیم پر چڑھ کر انڈا ڈاوری کھیلنے میں لگا ہوا تھا۔ تو کوئی ندی میں جا کر تیرنے کی سوچ رہا تھا۔ کوئی سوچتا کیا ہی اچھا ہوتا اگر میں گرمیوں کی اس دوپہر میں پاٹھ شالا کا کتابی کیڑا نہ ہوتا۔ بلکہ تتلی۔ شہد کی مکھی یا کوئی چڑیا ہوتا۔ اور ایک پیڑ سے کود کر دُوسرے پر جا بیٹھتا ؞

صرف اِتنے ہی پر بس نہ تھا۔ برجُو جو بالکل دروازے کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ موقع پا کر چُپکے سے باہر کھسک گیا۔ اور کنوئیں پر رکھی ہوئی بالٹی میں مُنہ ڈال کر پانی پی پاٹھ شالا کی دیوار سے لگے ہوئے برگد کی چھاؤں میں جا بیٹھا۔ اِس گھاس کے مخملی فرش پر لیٹ کر وہ جو سکھ چین پا رہا تھا۔ بڑے بڑے خوش قسمت دولتمند بھی اِس سے محروم تھے۔ پاٹھ شالا کے دُوسرے لڑکے اِسے للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ لیکن اِس کا دِل پھُول پر بیٹھی ہوئی اِس تتلی کی طرف تھا۔ جو حد سے بڑھی ہوئی گرمی کے باعث اُڑنا چھوڑ کر پھولوں کا رس چوسنے میں لگی ہوئی تھی۔ برجُو کا خیال تھا کہ آج کا دِن آرام ہی کرنے کے لئے بنا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر دِن بھر اسی گھاس پر پڑا پڑا نیلے آسمان کی طرف دیکھا کرتا۔ اور سُورج ڈوبنے کے بعد گھر جا کر چپ چاپ سو جاتا۔ بھلا یہ دِن پاٹھ شالا میں بیٹھ کر کتابوں پر آنکھ پھوڑنے کا ہے ؟

تھوڑی دیر کے بعد دُوسرا گھنٹہ بجا۔ یکایک ایک بار پھر گروجی چونکے۔ اور بولے "لڑکو! اب اپنی کتابیں بند کر دو اور کاپی نکال کر لکھنا شروع کر دو ؞

گروجی کا حکم پاتے ہی لڑکوں نے بستے کھولے اور کاسے کے قلم نکال کر لکھنا شروع کیا۔ پہلے کی نسبت یہ وقت کچھ پرسکون تھا۔ لڑکے لکھ لکھ کر باری باری گروجی کے پاس آئے۔ گروجی کاپی میں لکھے ہُوئے حروف دیکھ کر سُرخ روشنائی سے غلطیاں بنا دیتے۔ کسی کسی کاپی میں جس میں دستخط بالکل ہی خراب ہوتے اس میں خود دو ایک سطر میں کھینچ دیتے۔ کبھی کبھی اپنی جگہ سے اُٹھ کر لکھنے والے لڑکوں کے پاس چکر بھی لگاتے۔ اور ان کی غلطیاں بنا دیتے۔ اس طرح جب گروجی چکر لگانے لگتے تو لڑکے چپ ہو جاتے۔ اور شور و غل بند کر کے خاموشی سے لکھنا شروع کر دیتے۔ لیکن یہ سب کچھ صرف چند منٹوں کے لئے ہوتا ؞

گروجی نے آج بہت کوشش کی کہ ان کا دِل پاٹھ شالا کے کاموں میں لگ جائے۔ لیکن انہیں کامیابی نہ ہوئی۔ بار بار انہیں بیمار مادھو کا خیال آجاتا۔ آخر کار بارہ ایک بجتے بجتے جب ان کا دِل بالکل ڈوب گیا تو انہوں نے لڑکوں سے کہا۔ "بچو! اب تم اپنے اپنے گھر جا سکتے ہو۔ آج تمہیں آدھے دِن کی چھُٹی دی جاتی ہے۔"

گروجی کا یہ کہنا تھا کہ لڑکوں کی خوشی کی حد نہ رہی۔ اُنہوں نے کھڑے ہو کر شور مچاتے ہوئے گروجی کا شکریہ ادا کرنا شروع کیا۔ گروجی نے خاموش کرنے کی لاکھ کوشش کی۔ لیکن بھلا لڑکوں کے شور و غل میں گروجی کی بات کون سُنتا۔ آخر انہوں نے اپنا ہاتھ اٹھا کر اشارے سے چپ کراتے ہُوئے کہا۔ "لڑکو! چھٹی ہونے سے پہلے تم لوگ وعدہ کرو کہ بغیر شور و غل مچائے یہاں سے چلے جاؤ گے۔ اگر تمہیں شور ہی کرنا ہو تو یہاں سے دور جا کر کرنا۔ کیونکہ مادھو کا گھر پاس ہی ہے اگر تم شور کرو گے تو اسے تکلیف ہوگی ؞

گروجی کی بات سُنکر لڑکے چپ چاپ ہو گئے۔ لیکن انہیں پرنام کر کے جوں ہی پاٹھ شالا کے باہر نکلے پھر وہی شور و غل مچانا شروع کیا۔

گروجی نے گھر جاتے ہوئے ایک بار لڑکوں سے چلّا کر کہا۔ "لڑکو! دیکھو تم ابھی میرا حکم بھول گئے۔ ایشور کے لئے شور نہ کرو۔"

لیکن گروجی کے چلّانے سے اب کیا ہو سکتا تھا۔ لڑکے آخر لڑکے ہی تو تھے۔ لڑکوں کی تو یہ فطرت ہوتی ہے۔ کہ انہیں جس بات سے منع کیا جائے اِسے ضرور کرتے ہیں ؞

طالب علموں کے لئے اگر کسی دن آسمان پر سورج چمکتا ہے۔ اور برگد کی گھنی ٹہنیوں میں چڑیاں بولتی ہیں تو صرف چھٹی ہی کے دِن۔ اور دنوں میں سُورج چمکے۔ چڑیاں بولیں۔ لیکن سکول کی چہار دیواری میں قید لڑکوں کے لئے کیا ؟ اس لئے پاٹھ شالا سے چھوٹتے ہی لڑکے اپنے اپنے گھر بستے رکھ اپنی اپنی من بھاتی جگہوں میں چلے گئے۔ کوئی پیڑ پر چڑھ کر انڈا ڈاوری کھیلنے لگا۔ تو کوئی کھیتوں میں رکھے ہوئے پیال پر چڑھ کر نیچے کو سرکنے لگا۔ کسی نے آنکھ مچولی کھیلنا شروع کیا۔ کوئی اُچھلنے کُودنے لگا۔ کوئی جنگلی بیر توڑ توڑ کر کھانے لگا ؞

لڑکوں کے پاٹھ شالا سے چلے جانے پر گروجی نے دِل ہی دِل میں کہا۔ "یہ تو لڑکوں کا سُبھاؤ ہی ہے۔ میں نے فضول ہی انہیں چپ ہونے کو کہا۔ یہ کہتے ہوئے گروجی اُٹھے اور کونے میں رکھی ہوئی چھڑی اُٹھا کر گھر کی طرف چلے ؞

× × × × ×

آج خلاف معمول وقت سے پہلے گھر آئے ہوئے اور اُداس دیکھ کر دیاوتی بولی ــــ " پتاجی ! آج آپ اُداس کیوں ہیں ؟ "

" بیٹی ! مادھو کی بیماری کی وجہ سے آج پاٹھ شالا میں نہ جانے کیوں میرا جی نہیں لگا۔ اِس لئے گھر چلا آیا۔ چلو ہم دونوں چل کر اِسے دیکھ آئیں۔" یہ کہہ کر گروجی نے گھر کا دروازہ بند کیا۔ اور دیاوتی کو ساتھ لے کر مادھو کے گھر کی طرف چلے۔ اس کے گھر پہنچ کر انہوں نے دھیرے سے اس کے دروازے کی کُنڈی کھٹکھٹائی۔ آواز سُنکر ایک بُوڑھی عورت نے فوراً کواڑ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی گروجی دیا کے ساتھ گھر میں داخل ہوئے۔ کچھ عورتیں ایک بوڑھی عورت کے پاس جمع تھیں۔ یہ بوڑھیا مادھو کی نانی تھی۔ گروجی کو دیکھتے ہی ہاتھ مل مل کر رونے لگی اور کہنے لگی " تمہاری ہی وجہ سے میرا بچہ مر رہا ہے۔ نہ تم زیادہ سبق دیتے نہ اسے یاد کرنے کی فکر میں اِس کی یہ حالت ہوتی۔ ہائے ! اب میں کیا کروں ؟ "

بوڑھیا کا یہ طعنہ سُنکر گروجی نرم لہجے میں بولے ــــ " میں تمہارے کہنے کا ذرا بھی بُرا نہیں مانتا۔ میں جانتا ہوں کہ اِس وقت تمہارے اُوپر ایک خوفناک مُصیبت آپڑی ہے۔ اِس لئے بدحواس ہوکر تم ایسا کہہ رہی ہو۔ نہیں تو میں خوب جانتا ہوں کہ تم ایسا کبھی نہ کہتیں ۔"

" ہونہہ کہتی کیوں نہ ؟ کہتی۔ کہتی اور سو بار کہتی ۔"

بوڑھیا کے یہ الفاظ سُنکر گروجی حسرت بھری نگاہوں سے دُوسری عورتوں کی طرف دیکھنے لگے۔ تاکہ اِن میں سے کوئی میری طرف سے دو بات کہہ کر بوڑھیا کے غصّہ کو ٹھنڈا کردے۔ لیکن انہیں کیا پڑی تھی۔ جو ایسا کرتیں۔ آخر کچھ جواب دئے بغیر ہی گروجی دیاوتی کو لئے ہوئے اس کمرے میں پہنچے۔ جہاں مادھو چارپائی پر پڑا تھا۔ مادھو ابھی صرف سات آٹھ برس کا تھا۔ جب گروجی اس کے کمرے میں پہنچے تو اس کے بکھرے ہوئے بال اِس کے چہرے پر پڑے تھے۔ اِس کی آنکھوں میں ایک عجیب روشنی تھی۔ گروجی نے اِس کی چارپائی کے پاس جاکر دھیرے سے پکارا ــــ " مادھو ! "

اپنا نام سُنکر مادھو اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور اپنے کمزور ہاتھوں کو گروجی کے گلے میں ڈالکر اِن سے لپٹ گیا۔ اور کہنے لگا ــــ " گروجی ! آپ دیا بہن کو یہاں کیوں لائے ہیں ؟ مجھے بخار ہے کہیں دیا کو بھی نہ لگ جائے اور وُہ بیمار ہوجائیں ۔"

دیا جواب تک چُپ چاپ کھڑی مادھو کو دیکھ رہی تھی بولی ــــ " بھیا اس کی چنتا نہ کرو۔ شالا کا کوئی لڑکا جب بیمار ہوتا تھا تو تم برابر دیکھنے جایا کرتے تھے۔ میں بھی جب ساون میں بیمار پڑی تھی۔ تو تم روز دیکھنے آتے تھے۔ پھر میں تمہیں دیکھنے نہ آتی۔ یہ کیسے ہوسکتا تھا کسی کا بخار کسی کو لگتا تھوڑا ہی ہے ۔"

اِتنا کہتی ہوئی دیا مادھو کے بالکل پاس آگئی۔ اور اس کے سرہانے بیٹھ گئی۔ مادھو کے چہرے پر اُداسی دیکھکر گروجی بولے ــــ " کیوں مادھو ! جب ہم شام کے وقت باہر گھومنے جایا کرتے تھے تو کتنا آنند تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم جلدی سے اچھے ہوجاؤ۔ اور ہم پھر گھومنے چلیں۔ تمہارے نہ رہنے سے پھلواری کے پھول بھی اُداس رہتے ہیں۔ ان میں پہلا سا رنگ رہا ہے نہ روپ۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ جلدی سے اچھے ہوکر پھر پھلواری کی سیر کرو ؟ "

بالک مادھو کے لبوں پر پیاری مُسکراہٹ کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اِس نے اپنا ہاتھ گروجی کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اور کچھ کہنے کی بھی کوشش کی۔ لیکن اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا ۔

اسی وقت مادھو کے کانوں میں اس کے دُوسرے ساتھی لڑکوں کی آواز آئی۔ سکول سے چھٹی پاکر سب گاؤں کے باہر کھیلنے کے لئے اکٹھے ہوئے تھے۔ ہوا اِسی طرف کی تھی۔ اِس لئے چارپائی پر پڑے ہوئے مادھو کے کانوں میں لڑکوں کے شور وغل کی آواز برابر آرہی تھی۔ اِس نے اپنی بند آنکھوں کو کھولتے ہوئے گروجی سے پُوچھا ۔

" گروجی ! یہ [illegible] ہے ؟ "

" بیٹا ! تمہارے ساتھی باڑی میں کھیل رہے ہیں۔ انہیں کا یہ شور ہے ۔" یہ سُنکر مادھو نے پھر چارپائی سے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن حد سے بڑھی ہوئی کمزوری کی وجہ سے اُٹھ نہ سکا۔ اور پھر چارپائی پر لیٹ گیا ۔

اِس کے سرہانے ایک رومال رکھا ہُوا تھا۔ اسے اُٹھا کر اس نے ہلانا شروع کیا۔ لیکن ہاتھ میں طاقت نہ ہونے کی وجہ سے رومال چھوٹ کر گر گیا ۔

رومال ہاتھ سے گرتا ہُوا دیکھ کر گروجی نے پُوچھا ــــ " کیوں مادھو ! یہ رومال کیوں ہلانا چاہتے ہو۔ کیا گرمی معلوم ہورہی ہے۔ گرمی لگتی ہو تو پنکھا جھل دوں ۔"

" نہیں گروجی ! میں رومال اِس لئے ہلانا چاہتا تھا کہ اسے کھڑکی میں سے دیکھ کر میرے ساتھی لڑکے شاید میری طرف آجائیں ۔"

لیکن کھیل کی دھن میں مست لڑکوں کو مادھو کی کیا پڑی تھی ۔

دُنیا میں جس پر مصیبت پڑتی ہے - وہی جانتا ہے - دُوسروں کو کیا خبر کہ اس کے دِل پر کیا گذر رہی ہے - اگر آدمی کی مصیبت میں اس کے بھائی بند دوست آشنا اِس کے ساتھ برائے نام بھی ہمدردی کریں تو اس کی مصیبت کا بوجھ بہت کچھ ہلکا ہو سکتا ہے - لیکن کرنا تو دُور کی بات ہے سُوارتھی دنیا کو سوچنے کی بھی فرصت نہیں - اِسے تو صرف اپنے عیش و آرام سے کام ہے ؂

مادھو کو اُمید تھی کہ اِس کے ساتھی اسے دیکھنے کے لئے ضرور آئیں گے - لیکن اس کی ساری اُمیدوں پر پانی پھر گیا - شالا کے اٹھارہ لڑکوں میں سے ایک نے بھی اِسکی خبر نہ لی ؂

مادھو مایُوس ہو کر اب اپنے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا - اِس کی نگاہ اپنے بستے - گُلّی ڈنڈے اَور گولیوں پر پڑی - اِس کے چہرے کا رنگ ہر ہر لمحہ بدل رہا تھا - ایسا معلوم ہوتا تھا - جیسے اس کا دِل گوناگوں جذبات کی آماجگاہ بن رہا ہے - اِس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا - کہ اِس کی حد سے بڑھی ہوئی خواہش ہے کہ اُٹھ کر گُلّی ڈنڈا اَور گولیاں کھیلے - لیکن بے چارہ بے بس تھا - آخر اس نے اپنا سر سرہانے رکھے ہُوئے تکیہ پر رکھ دِیا - اور دیاوتی کی طرف دیکھنے لگا - دَیا ہی اِس کی صرف ایسی ساتھی تھی - جو اِس کے آڑے وقت میں کام آئی تھی ؂

دَیا نے اِس کے پاس آکر اِس کا سر دبانا شروع کیا - گرو جی بھی مادھو کے کمزور ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر دھیرے دھیرے سہلانے لگے - اس وقت مادھو نے ایک پھر اپنی باہیں گرو جی کے گلے میں ڈال دیں - اور کروٹ بدل کر دیوار کی طرف منہ پھیر لیا - تھوڑی دیر کے بعد اسے نیند آگئی - لیکن اِس کی آج کی نیند ہمیشہ کی طرح معمولی نیند نہ تھی . . . . !

× × ×

مادھو کو سوئے ہوئے بُہت دیر ہو چکی تھی - گرو جی اب بھی بیٹھے ہوئے اِس کی ہتھیلیاں مل رہے تھے - انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ مادھو کا ٹھنڈا ہاتھ اب مرے ہوئے بچے کا ہاتھ ہے - لیکن وُہ اب بھی اسے مَلتے ہی جا رہے تھے - اور اِن کی دِلی آرزو تھی - کہ ایک بار پھر اس کے مُنہ سے "گرو جی!" سُنتے ---- !!

آسی رام نگری

تِیر اَور نغمہ

تِیر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ کمان سے نکلا اَور ہوا کی لامتناہی وسعتوں میں گُم ہو گیا -
وُہ کہیں زمین پر گر پڑا - لیکن -
مجھے تو اِس کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو سکا -

مَیں نے ایک دِلنشیں نغمہ چھیڑا - فضائے بسیط اِس کو لینے کے لئے بیتاب تھی - ادھر زبان سے نکلا - اَور اُدھر فضا کی خاموشیوں میں تحلیل ہو گیا -
مَیں نے اِس کو پکڑنے کی بہتیری کوشش کی مگر -
مجھے تو اِس میں کامیابی کی کوئی صُورت نظر نہ آئی -

مجھے اب تِیر اور نغمے کی جستجو تھی - میں اِن کو دوبارہ حاصل کرنے کیلئے مضطرب تھا - اِس بیچینی اَور گھبراہٹ میں کئی سال گُزر گئے -
ایک دِن ---- یکایک ---- وُہ تِیر مجھے دکھائی دِیا -
ہاں وُہی تِیر جو مَیں نے ہوا میں چھوڑا تھا -
ایک درخت کے نرم و نازک تنے میں گڑا ہُوا تھا -
اَور میرا وُہ کھویا ہُوا نغمہ؟
وُہ میرے ایک دوست کے محبت سے لبریز دِل میں رقص کر رہا تھا ؂

(انگریزی سے) "لانگ فیلو"

لطیف اسلم جالندھری

تنویرات

امریکن اخبارات اور اشتہارات

یونائیٹڈ سٹیٹس امریکا میں صرف روزانہ اور ہفتہ وار اخبارات و جرائد کی تعداد ۲ ہزار ۴ سو پچاس ہے اور ان کی مجموعی اشاعت ۵۳ کروڑ۔ یہ اخبارات ۱۴ سو شہروں میں جاتے ہیں۔ ان کو صرف اشتہارات کے ذریعے ....۲۱ سے لے کر ....۲۷۵ تک سالانہ آمدنی ہوتی ہے۔

ممکن ہے کہ امریکن اخبارات و صحائف کی اشتہاری آمدنی آپ کو مبالغہ آمیز معلوم ہو اس لئے بعض امریکن اخبارات کی شرح اُجرت ملاحظہ فرمایئے۔ جو اشتہارات کی اشاعت کے لئے مقرر ہے:

(۱) "دی سٹرڈے ایوننگ پوسٹ" کے سرورق کے چوتھے صفحے کی ایک بار کی اُجرت نوّے ہزار روپے ہے۔

(۲) "دی امریکن ویکلی" کے اسّی صفحے کی ایک بار کی اُجرت ۶۱ ہزار سات سو پچاس روپے ہے۔

(۳) "سنڈے نیویارک ٹائمس" کے معمولی صفحات کی اُجرت اشتہار فی صفحہ ۷ ہزار ۹ سو چالیس روپے ہے۔

یاد رہے کہ وہاں جو شرح مقرر ہوتی ہے وہ قطعی ہوتی ہے ہندوستانی اخبارات و صحائف کی طرح نہیں کہ درج ہے کچھ لیکن خط و کتابت کے بعد معاملہ طے ہوتا ہے کسی اور شرح پر۔

ہندوستان اور امریکا میں جتنا بعد ہے اس سے زیادہ دونوں ملکوں کی اقتصادی اور کاروباری حالت میں فرق ہے۔ امریکا کے مشتہرین صرف اخباری اشتہارات پر اتنی گرانقدر رقم خرچ کرتے ہیں تو اشاعت و پروپیگنڈے کی دوسری مدوں پر کتنا خرچ کرتے ہوں گے۔ اسی بات سے آپ یہ اندازہ بھی لگا سکتے ہیں کہ امریکا کی کاروباری حالت کتنی وسیع اور ترقی یافتہ ہوگی۔

برطانیہ میں مسئلہ نسواں

برطانیہ میں پندرہ لاکھ سے زیادہ عورتیں مختلف کاروبار میں مصروف ہیں۔ ان میں سے ۴ لاکھ دکانوں پر سودا بیچنے کا کام کرتی ہیں۔ تقریباً ۵ لاکھ عورتیں کلرکی کے کام سے تعلق رکھتی ہیں جن میں سے ۲ لاکھ ۱۲ ہزار ٹائیپسٹ ہیں۔ تقریباً ڈھائی لاکھ عورتیں آزاد تجارت کر رہی ہیں۔ ان کی دکانیں کھلی ہوئی ہیں یا ہوٹل چل رہی ہیں۔ ۴ لاکھ ۵ ہزار دوسرے کاروبار کر رہی ہیں۔ جن میں ایک لاکھ ۹۹ ہزار عورتیں بچوں کی پرورش کا کام کرتی ہیں اور ایک لاکھ ۲۴ ہزار معلّمات ہیں۔ چالیس ہزار عورتیں خانہ داری کے کاموں پر ملازم ہیں۔

جنگِ عظیم سے پہلے بڑے گھرانوں کی عورتوں کے لئے حصول معاش کا کوئی کام کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ صرف نادار عورتیں گھروں اور کارخانوں میں کام کرتی تھیں۔ لیکن جنگ عظیم میں جب مرد میدان جنگ میں چلے گئے تو عورتوں کے لئے مختلف کاموں کا انجام دینا ضروری ہو گیا۔ اس کے بعد جب جنگ ختم ہوئی اور مرد میدان جنگ سے واپس آ گئے تو حصول [illegible] کے مسئلے نے بہت پیچیدہ صورت اختیار کر لی۔ عورتوں کو آزادانہ معاش حاصل کرنے کا [illegible] پڑ چکا تھا [illegible] کو بھی کام ملنا ضروری تھا لیکن معاش کے اتنے وافر ذرائع کہاں ملتے۔ جو مردوں اور عورتوں کو حسب [illegible] کام ملتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں بیکاری پھیل گئی۔

اس وقت برطانیہ کی صرف ۳۷ فیصدی عورتیں بارو زگار ہیں باقی بیکاری کی حالت میں مبتلا ہیں۔ مسز اسٹریچی برطانیہ کی تحریک نسواں کی ممتاز لیڈر ہیں۔ وہ اپنی کتاب "ہماری آزادی اور اس کے نتائج" میں عورتوں کی بیکاری کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"عورتوں کی اقتصادی آزادی کے راستے میں مختلف رکاوٹیں ہیں۔ ان میں سے بعض فطری ہیں۔ جن کا ازالہ ناممکن ہے اور کچھ رواجی اور سماجی توہمات کے نتائج ہیں جن کے دور ہونے میں کافی وقت صرف ہوگا۔

حمل قبول کرنا اور بچے جننا عورتوں کا فطری وظیفہ ہے جسے

کسی حالت میں بھی مردوں کے سر ڈالنا ممکن نہیں، اگرچہ اس میں زیادہ وقت صرف نہیں ہوتا پھر بھی یہ امر یقینی ہے کہ اس کے باعث سے عورتوں کو کام ملنے میں دقت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ خانہ داری کے کاموں کی انجام دہی اب تک عورتوں ہی کے ساتھ خاص سمجھی جاتی ہے۔ اس خیال میں کچھ تبدیلی ضرور ہوئی ہے۔ علاوہ ازیں ہوٹلوں میں کھانا کھانے کے رواج نیز وقت بچانے والی مشینوں اور بنے بنائے سامان کے خرید و فروخت ہونے کے باعث اب خانہ داری کے کاموں میں عورتوں کا زیادہ وقت برباد نہیں ہوتا۔ پھر بھی تاہنوز مردوں نے فرائض خانہ داری کو اپنے ذمہ نہیں لیا ہے۔ لڑکیوں کو کھانے پکانے اور سینے پرونے کا کام سکھایا جاتا ہے۔ لیکن ان کاموں کو سیکھ کر وہ گھروں میں نہیں بیٹھتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ باہر کام کرنے والی عورتوں پر کام کا دُہرا بار پڑ جاتا ہے۔ جس سے ان کی صحت برباد ہو جاتی ہے۔

اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عورتیں مردوں کے مقابلے میں کمزور ہوتی ہیں۔ چنانچہ جنگ عظیم کے دوران میں اس کا مشاہدہ و تجربہ ہوا۔ کہ جو کام دو مردوں سے انجام پا جایا کرتے تھے۔ ان کے لیئے تین عورتوں کی ضرورت ہوتی تھی۔ یہ حقیقت بھی ملحوظ رکھنے کے قابل ہے کہ چالیس برس کی عمر ہو جانے کے بعد عورتوں کی طاقت کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ اتنی عمر ہو جانے پر جس کو علیحدہ کرنا ضروری ہو اسے کام دینے میں تامل ہونا ایک فطری امر ہے۔

مشاہدے سے معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر انہیں عورتوں کو کام ملتا ہے جن کی عمر ۱۸ سے ۲۰ برس تک کی ہوتی ہے۔

برسر کار عورتوں کا فیصدی اوسط بلحاظ عمر حسب ذیل ہے۔

(۱) ۱۸ سے ۲۰ برس تک کی عمر کی عورتیں فیصدی ۸۰۔

(۲) ۲۱ سے ۲۵ برس تک کی عمر کی عورتیں فیصدی ۶۵

(۳) ۲۵ سے ۳۴ برس تک کی عمر کی عورتیں فیصدی ۳۶

۳۵ برس سے زیادہ عمر والی عورتوں کو بہت مشکل سے کام ملتا ہے۔

عورتوں کو تنخواہ بھی مردوں سے کم ملتی ہے۔ اس لیئے وہ اپنے مصارف کے بعد اپنی آمدنی میں سے کچھ پس انداز نہیں کر سکتیں وہ اس اندیشے سے کہ لگے ہوئے کام کو چھوڑ کر دوسرا کام تلاش کریں۔ اور نہ ملے تو بیکاری کی مصیبتیں جھیلیں۔ جس کام میں رہتی ہیں اسی میں لپٹی رہتی ہیں اور انجام کار اپنی صحت ضائع کر بیٹھتی ہیں۔

عورتوں میں ایک نقص اور ہے، وہ جو کام کرتی ہیں اس کے درپے ہو جاتی ہیں۔ اگر کام مذاق کے مطابق ہو تو یہ ایک خوبی ہے۔ لیکن اگر صورت اس کے برعکس ہو تو صحت پر اس کا اثر بہت ضرر رساں ہوتا ہے۔

مردوں کی نسبت عورتیں محبت پرست اور رقیق القلب زیادہ ہوتی ہیں، گھر بار، بچے، بوڑھے، مریض وغیرہ کو چھوڑ کر ان سے بآسانی باہر نہیں جایا جاتا۔ عورتوں کے آزادانہ حصول معاش کے راستے میں یہ جتنی مشکلات ہیں ان کی نسبت یہ کہنا مشکل ہے کہ ان میں کتنی قدرتی ہیں اور کس قدر رسم و رواج سے تعلق رکھتی ہیں۔

مسز اسٹریچی کا خیال ہے کہ عورتوں کی اقتصادی آزادی کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے۔ ابھی تو اس کے تجربات کی ابتدا ہے۔ اس سوال کا جواب وقت ہی دے گا کہ طبقۂ نسواں اور سوسائٹی پر اس کا اثر ہوگا

انگلستان کے ایک نامور فاضل مسٹر جوڈ نے ”اخلاق کا مستقبل“ کے عنوان سے ایک کتاب تصنیف کی ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ۔

”جس رَو میں پڑ کر عورتیں ملازمت اور تجارت کی دلدادہ ہو رہی تھیں وہ اب یقینی طور پر پیچھے ہٹ رہی ہے۔ جنگ کا زمانہ ختم ہو چکا جب مردوں کی کمی کے باعث عورتوں کے لئے کاروباریوں کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ اب تو سماج انہیں وہی کام دینا چاہتا ہے جو ہوں تو صبر آزما، لیکن تنخواہ کم ہو۔ بڑی بڑی ملازمتوں کے لئے تو کوئی ان کا نام تک نہیں لیتا۔ مرد ان کے ماتحت کام کرنے میں اپنی ذلت محسوس کرتے ہیں۔ یونیورسٹیوں سے ہر سال سینکڑوں کی تعداد میں عورتیں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے نکل رہی ہیں۔ جن کے لئے کہیں موزوں کام موجود نہیں۔ صرف لندن میں متوسط درجے کی ۵۳ ہزار تعلیم یافتہ عورتیں تلاشِ معاش سرگرداں ہیں۔ انجام کار انہیں پھر گھر یاد آنے لگا ہے۔ اور وہ سوچنے لگی ہیں کہ بے شمار مالکوں کی جھڑکی اور ملامت برداشت کرنے سے تو یہ کہیں بہتر ہے کہ ایک شخص سے شادی کر لیں اور تمام گھر پر حکومت کریں۔ (باقی مضمون صفحہ ۶۴۴ پر)

ماسٹر کے چلے جانے کے بعد بجے کمار اسی اُونچے ہموار ٹیلے پر کھڑا ہوکر دونوں ہاتھوں سے اِس زور کی تالیاں بجاتا کہ وُہ پُورا کوہستانی خطّہ گونج اُٹھتا، اور ان تالیوں کے جواب میں پکّی، اوشا، ہرش وغیرہ کی جیرمقدمی ٹولی بھی لکڑی کے بنے ہوئے فرش پر اپنے بھاری بوٹوں سے دھم دھم کرتی اور تڑتڑ تالیاں بجاتی تیزی سے باہر نکل پڑتی۔ پھر اسے ہرے بھرے ڈھلوان مقام پر سب کے سب الجھی بیل کی طرح ایک دُوسرے سے لپٹ جاتے، اور قہ، قہ، کی پُرشور صدا سے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ چھلانگیں لگاتے نیچے نالے تک پہنچ جاتے۔ اور اِس برفیلے نالے کے کنارے پر کی صاف ڈھلی ہُوئی چٹانوں پہ طرح طرح کے کھیل کود کرتے ؛

بچّوں کی اِس نازک سریلی ہنسی میں جیٹھ کے مہینے کی دلفریب فضا جیسے اور بھی متوالی ہو جاتی، آسمان تک اُونچے گھنے درختوں میں جابجا چھپے ہوئے سینکڑوں لامعلوم پرندے اپنی مترنم آواز میں چہچہا اُٹھتے۔ سامنے کی پہاڑی پر جھر جھر کر کے مسلسل گرتی ہوئی آبشار جیسے اور متوالے پن سے گرنے لگتی، خوشبودار پھولوں سے لدی ہوئی جھاڑیوں میں مستانہ وار جھوم جھوم کر چلتی ہوئی ہوا بھی ان سب کے ساتھ سر میں سر ملانے لگتی۔ کبھی کبھی نہ جانے کس کس طرف سے سفید بادلوں کے جھنڈ ہرے میدان تک نیچے اُتر آتے۔ اور ان بچّوں کو گلے لگا کر واپس چلے جاتے۔ اِس کے بعد سُورج کی ہلکی عنبریلی کرنیں گھنی جھاڑیوں سے چھن چھن کر پھُول سے نازک اور بھولے مکھڑوں کو چومنے لگتیں ؛

بھائی بہنوں کی اِس مسرّت و شادمانی اور کھیل کود کے سیلاب میں تیرنے اور ڈبکیاں لگانے کے لئے ترستیں تو صرف دو مایوس اور کس مپرس آنکھیں، وُہ آنکھیں تھیں اِس کوٹھی کے چوکیدار کی اکلوتی ہشت سالہ لڑکی مُکتا کی، روزانہ دوپہر کو اِس کا باپ پیچھے کے گھنے جنگل میں لکڑی کاٹنے چلا جاتا اور مُکتا کو نیچے کے میدان میں چرواہوں کے لڑکوں کے ساتھ مویشیوں کی دیکھ بھال کے لئے چھوڑ جاتا۔ لیکن وُہ میلی کچیلی غریب لڑکی میدان سے بھاگ آتی۔ اور اِن صاف سُتھرے شہری لڑکوں کے کھیل کُود اور ہنسی خوشی کے ہنگامے کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دُور ہی سے دیکھنے لگتی۔ اور جیسے اِن کے کھیل کُود میں حِصّہ لینے کے لئے بیتاب ہو کر کبھی دائیں، کبھی بائیں۔ اور کبھی سامنے سے آکر ان لڑکوں کے آس پاس چکّر لگاتی، لڑکوں کے اِس کھیل کُود سے بالکل علیحدہ رہتے ہُوئے بھی کچھ ہی دِنوں میں اِن کے مزاج و مذاق سے مُکتا کو اِتنی مناسبت ہو گئی۔ کہ ان کی ہنسی کے ساتھ وُہ بھی خواہ مخواہ مُسکرا پڑتی۔ اور اِن کے لڑائی جھگڑے میں اِس کے چہرے کا انداز بھی انہیں جیسا ہو جاتا ؛

حسبِ معمُول ٹھیک گیارہ بجے تڑتڑ تالیاں بج اُٹھیں۔ اور دھم دھم کی آواز سُنائی دی۔ لیکن اور دنوں کی نسبت آج اس ہنگامۂ مسرّت و شادمانی میں سم تال کا حِصّہ زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ قہ، قہ کر کے ہنستے ہوئے اور ڈھب ڈھب کر کے ناچتے ہوئے یہ بچّے گویا خواب راحت میں پڑی ہُوئی پہاڑی چوٹیوں کو جگا رہے تھے ؛

اپنا دلچسپ ناول وہیں انگیٹھی پر رکھتے ہوئے سنتوش کماری نے کہا۔ بھابی جی! آج تو یقیناً بجے کمار کو کوئی نئی چیز ملی ہے۔ آگے چل کر دیکھیں ؛

"ہوگا کوئی رے بن کا گھونسلا یا کوئی نئے رنگ کی تتلی۔ ماسٹر کیا جاتا ہے۔ ان کے سر سے بلا ٹل جاتی ہے۔" پرکاش وتی نے سویٹر بُننے کی سلائی اُٹھاتے ہوئے جواب دیا ؛

"اور کیا، وُہ بھی آپ کی طرح دن رات سویٹر بنا کریں!" سنتوش کماری بولی۔

ساتھ ہی بغل کے کمرے سے بھی آواز آئی۔ اجی، زندگی کا لطف سویٹر بُننے میں نہیں ہے۔" نہیں زندگی کا لطف تو بستر پہ لیٹ کر کتابیں پڑھنے میں ہے ؟ آئے ہیں پہاڑ پر تفریح کرنے ے" پرکاش وتی نے اپنے شوہر دیو کمار کی بات کا طنزیہ جواب دیتے ہوئے کہا۔

سنتوش کماری نے پرکاش وتی کے گلے میں پیچھے سے باہیں ڈالتے ہُوئے ناز سے کہا۔ بھابی، چلو نہ! رسوئیے کو جلد کھانا تیار رکھنے کی ہدایت کر کے نند بھاوج نالے کے پاس گئیں، دیکھا۔ بچّوں کا ناچنا کُودنا بے وجہ نہیں ہے۔ نیچے کے ہاتھ میں دودھ سا سفید بلّی کا ایک بچّہ ہے۔ اور تمام

لڑکے نہایت سرگرمی کے ساتھ نالے کے کنارے پر ہی ایک جھونپڑا بنانے کا سامان کر رہے ہیں۔حیرت کی بات تو یہ ہے کہ مُکتا بھی بچّوں کی اس فوج میں شامل ہوگئی ہے۔ اور نبجے ایک کمانڈر کی طرح اسے حکم دے رہا ہے ۔جاؤ، وُہ لکڑی لاؤ۔ وُہ پتھر اُٹھا لاؤ۔ اور بھولی سی لڑکی دَوڑ دوڑ کر جنگل کی ٹوٹی پھوٹی تختیاں اَور سیدھے پتھر لا رہی ہے اَور نبجے کے سامنے رکھتی جا رہی ہے۔ بلّی کا بچّہ دے کر نبجے سے راہ و رسم بڑھانے کا بے خطا طریقہ مُکتا ہی کے دماغ کا پیدا کردہ تھا، لیکن آج اوشا، ہرش، بلّی، وغیرہ کیلئے مُصیبت تھی۔ مُکتا کی طرح محنت اَور تیزی کے ساتھ ان سب سے کام نہیں ہو سکتا تھا +

سنتوش کماری نے موقع دیکھ کر کہا۔ واہ سارجنٹ صاحب! آج تو اچھا شکار ہاتھ لگا ہے +

نبجے سارجنٹ کے نام سے بہت چڑتا ہے اس لئے وُہ کچھ بولا نہیں۔صرف" ہوں، ہوں" کر کے دانت کٹکٹاتا رہا +

(۲)

پہاڑ پر جانے سے ایک مہینہ پہلے ہی دیو کمار نے اپنے دوست مسٹر کول کو مکان وغیرہ کے اِنتظام کے ساتھ ہی نبجے کے واسطے ایک ٹیوٹر مقرر کرنے کے لئے لکھدیا تھا۔ تاکہ دو تین مہینے کی چھٹیوں میں لڑکے کا وقت ضائع نہ ہو۔ یہی وجہ تھی کہ اس سال خاندان کو ساتھ لے جا کر بھی انہیں کسی طرح کی فکر و پریشانی نہ تھی۔ خاندان سے ان کے تین بچّوں اَور بیوی کے علاوہ [illegible] کالج کی چھٹیوں میں [illegible] اِن کی بڑی بہن کے بھی دو تین بچّے تھے +

عنوان و اقسام کے جنگلی درختوں سے گھری ہوئی یہ ۹۷ نمبر کی کوٹھی۔ خوشبودار جھاڑیوں سے چھپی ہُوئی اس فلک بوس پہاڑ کے ڈھلوان پر واقع ہے۔کوٹھی کے چاروں طرف بہت سی کھُلی جگہ چھوڑ کر جو بیں جنگلے سے اِس ناپیداکنار میدان کی حد بند کر دی گئی ہے۔اِس جنگلے کا ایک کچّا پھاٹک کوٹھی سے پچاس ساٹھ گز نیچے کی طرف ایک ٹیڑھی ترچھی پگڈنڈی کے سرے پر ہے۔ اسے پھاٹک کے پاس ہی نالے کا پُل ہے۔کوٹھی کے وسیع احاطے میں جہاں سفید پھولوں کے تختے بن گئے ہیں۔ ایک اُونچی ہموار جگہ نبجے نے اپنے پڑھنے کے لئے چُنی ہے +

کچے پھاٹک سے کچھ ہی اوپر ایک چھوٹی سی کوٹھڑی چوکیدار کے لئے بنی ہے۔چوکیدار کی بجائے اسے لوگ مالی کہتے ہیں۔اَور مُکتا کو مالی کی لڑکی۔ مالی یہیں نیچے کے ایک پہاڑی گاؤں کا رہنے والا ہے۔ برسوں سے اِسی کوٹھی کی چوکیداری کا کام کرتا ہے۔ موسم سرما میں جب یہ عظیم الشان پہاڑی ٹکڑا برف کا سفید دوشالہ اوڑھ کر گہری نیند سو جاتا ہے تو چوکیدار بھی اِس کے خواب راحت میں خلل انداز نہ ہونے کی غرض سے چپکے سے اپنے گاؤں کو چلا جایا کرتا ہے ÷

مالی کا کام دن میں جنگل سے لکڑی کاٹ کر لانا۔ نالے سے پانی بھرنا اَور رات کو پہرہ دینا ہے۔مگر جب کبھی اسے کمرے صاف کرنے کو کہا جاتا ہے تو وہ روکھے پن کے ساتھ بڑبڑانے لگتا ہے ۔"حضور! ہم سے اِتنا کام نہ ہوگا۔" اِسے بچّوں کا پھُول وغیرہ خراب کرنا بھی پسند نہیں، اس لئے دیو کمار کو اس کے خلاف روزانہ شکایتیں سننی پڑتی ہیں۔ اور اس کی لڑکی مکتا نے جس کے چہرے پر کچھ ہی دنوں پہلے یاس و محرومی، خوف و ہراس اَور کس مپرسی طاری رہتی تھی۔کیسی حکمت و تدبیر سے اِن سب اثرات کو زائل کر دیا۔ یہ بات واقعی قابل داد ہے۔اس دیہاتی لڑکی کی حکمت عملی اَور دانشمندی پر حیرت ہوتی ہے ÷

× × × ×

آج نبجے کے سو کر اُٹھنے سے پہلے ہی مالی کی لڑکی مُنہ ہاتھ دھو کر، اپنا لمبا کُرتہ اَور سُرخ ٹوپی پہنے بے جھجک آ کر برامدے میں کھڑی ہوگئی۔کچھ ہی دیر کے بعد چائے پینے کے وقت بچّوں نے بسکٹ، مکھن، ٹوسٹ کے لئے ادھم مچایا تو اس نے بھی اپنے باپ کو مٹّی کے پیالے میں چائے اور کلچہ دینے پر مجبُور کر دیا۔ دوپہر کو جب نبجے کی پارٹی کھانے کے لئے بیٹھ کر عنوان و اقسام کے لذیذ [illegible] کھانے کھانے لگی تو مُکتا بھی مٹی کے بڑے برتن میں باسی چاول لے کر ایسی جگہ کھانے بیٹھ گئی۔ جو کھانے کے کمرے کی کھڑکی میں سے صاف صاف دیکھی جا سکتی تھی۔بچّوں کے چھین جھپٹ کر کھانے کھانے میں جو بے تکلفی اور محبّت بھری ہوتی ہے۔ شائد اِس کے لئے مُکتا کا دِل مچل مچل اُٹھتا تھا ۔ لیکن اس کے لئے جہاں تک پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ وہاں تک پہنچنے کی اس نے کوشش بھی نہیں کی ÷

نبجے نے کھڑکی سے جھانک کر اسے دیکھا تو مُکتا کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ اَور [illegible] مسرّت میں بھاگ کر گلاب کی خوشبودار جھاڑیوں میں چھپ گئی۔نبجے اَور اس کے ساتھی بھی کھانا چھوڑ کر "مالی کی لڑکی، مالی کی لڑکی" چلّاتے ہُوئے اِسے ڈھونڈنے کیلئے جھاڑیوں میں گھُس پڑے۔اِن کے آگے پیچھے گونا گوں رنگوں سے منقش ننّھے ننّھے پروں والی پریوں کی طرح حسین تتلیاں اُڑنے لگیں۔ جیسے وُہ ناچ ناچ کر انہیں چیلنج دے رہی ہوں کہ آؤ ہمیں پکڑو تو جانیں ÷ لڑکے مُکتا کو تلاش کرتے کرتے عاجز آگئے۔لیکن اس کا پتہ نہ چلا۔

اَور جب انہوں نے دیکھا کہ مُکتا نہ جانے کس طرف نکل کر پھاٹک کے پاس زرد و سُرخ پھُولوں کا گلدستہ لئے کھڑی ہنس رہی ہے تو ان کی حیرانی کی انتہا نہ رہی، اوشا، ہرش وغیرہ نے مجھے دو مجھے دو کہتے ہوئے جھپٹ کر اِس کے ہاتھ سے گلدستہ چھین لیا، غرض کبھی روز بِلّی کا بچّہ دے کر، کبھی روز بکری کا بچّہ دکھا کر، کبھی روز آس پاس کے جنگلوں میں چھپی ہُوئی کھیل کُود کے لائق نئی جگہ بتا کر مُکتا نے ان امیر شہری لڑکوں سے کافی میل جول پیدا کر لیا +

(۳)

دو روز سے مسلسل بارش ہو رہی ہے، ایسی موسلا دھار اَور اندھا دُھند جیسے آسمان کے دوش پر اُڑنے والے بادل زمین کی آغوش میں کھیلنے کے لئے مچل رہے ہیں۔ بیقرار ہو رہے ہیں۔ پہاڑی ندی نالے ایک ساتھ اُبل پڑے ہیں۔ اَور اپنے گیروے پانی کے ساتھ جیسے ہولی کھیل رہے ہیں۔ کوٹھی کے نیچے کا نالا اپنی کتنی بچھڑی ہوئی سہیلیوں کو منا لایا ہے۔ اَور جوشِ مسرّت میں اُچھل اُچھل کر بہتی ہُوئی ندیوں سے ہنس ہنس کر مل رہا ہے۔ اس سنسان کوہستان میں اِس طرح فطرت جشنِ بہار منا رہی ہے +

سردی بڑھ جانے کی وجہ سے پرکاشش وتی نے چھوٹے بچّوں کو زبردستی سلا دیا اَور نبجے سے کہا کہ اگر وُہ سونا نہیں چاہتا تو باہر والے کمرے میں انگیٹھی کے پاس بیٹھ کر پڑھے لکھے۔ کاڈھیر لے کر نبجے باہر بیٹھا تو، لیکن اِن قدرتی ندی نالوں اَور چشموں کی طرح اِس کے دِل و دماغ میں بھی تو معصومانہ جذبات کا سیلاب امنڈ آیا ہے۔ پھر صحیفۂ کائنات کے ان جیتے جاگتے اوراق کے سامنے نبجے کا دِل بےجان کتابوں کے صفحات میں کیسے لگتا؟ وہ دونوں ہاتھ کوٹ کی جیب میں ڈالے کھڑکی کی راہ سے ان حسین قدرتی مناظر کو دیکھ رہا تھا۔ اَور چھپا نالے کر نیچے نالے کے کنارے جانے کے منصوبے باندھ رہا تھا۔ اِس وقت وُہ بالکل تنہا تھا۔ ساری کوٹھی میں خاموشی طاری تھی۔ اوشا، ہرش وغیرہ تمام بچّے پڑے سو رہے تھے۔ ایک دو بار پاؤں میں گدگدانے کے بعد بھی جب وُہ اُوں اُوں کر کے سوئے ہی رہے تو نبجے نے مایُوس ہو کر انہیں چھوڑ دیا۔ ادھر بارش بھی کم ہو گئی۔ جس سے ایک طرح کا اَور سنّاٹا چھا گیا +

ناگہاں نبجے کو کسی بات کا خیال آیا لہٰذا حالتِ وارفتگی میں اِس کے دونوں ہاتھ جیب سے نکلے۔ اَور زور سے نیچ اُٹھے۔ اتنے میں مالی انگیٹھی میں لکڑی ڈالنے آیا تو نبجے نے دیکھا اِس کے ساتھ بھیگے کپڑوں میں لپٹی ہوئی مُکتا بھی موجود ہے۔ نبجے کا چہرہ خوشی سے شگفتہ ہو گیا۔ خوش ہو کر بولا ــ

"او مالی کی لڑکی! آؤ تمہیں کیرم کھیلنا سکھائیں" +

سردی سے اکڑتی ہوئی مُکتا کو اِس طرح انگیٹھی کے پاس بیٹھنے اَور کیرم کھیلنے کا موقع مِلا تو وہ سُورج کی پہلی کرن کی طرح کھل اُٹھی سُوہ تو کیرم کھیلنا کیا جانتی تھی۔ نبجے خود ہی سیاہ و سفید نردیں اسٹرائیکر کی چوٹ سے بورڈ کے سوراخوں میں پھینکدیتا اَور ناز و غرور سے مُکتا کی افسردہ و مضمحل آنکھوں میں اپنی روشن اور بشاش آنکھیں ڈال کر کہتا ـ دیکھا، اب تمہاری چھ نردیں اور باقی ہیں۔ اب چار ہی رہیں ـ اب دو ہی اَور رہ گئی ہیں +

بھولی اور نادان مُکتا اپنی ہار سمجھ کر ہر دفعہ جھینپ جاتی ـ اس کا ننّھا سا نازک دِل اس ہار کے بوجھ سے دب جاتا۔ نبجے نے دو ہی چار روز میں مُکتا کو لوڈو اَور تاش کے چھوٹے چھوٹے کئی کھیل سکھا دیئے ـ اب مُکتا ہر وقت اسی فِکر میں رہتی کہ وہ کسی طرح تاش کی ایک بازی جیت کر نبجے کو اپنی ذہانت و ہوشیاری کا ثبوت دے +

اب مُکتا اپنے کو پہلی سی مُکتا نہیں سمجھتی تھی ـ وُہ اپنے کو کچھ اَور ہی سمجھنے لگی تھی ـ وُہ ایک روز سفید پھُولوں کے درمیان بیٹھی لوڈو کھیل رہی تھی ـ کچھ دیہاتی لڑکے جن کے ساتھ مُکتا اپنی گائیں چرایا کرتی تھی ـ کھڑے تعجب سے اس کا کھیل دیکھ رہے تھے ـ ایک لڑکے نے ہمّت کر کے کہا ــ

اِس پر مُکتا نے برہم ہو کر چھڑی اُٹھائی اَور اپنے پُرانے ساتھیوں کو مار کر بھگا دیا۔ نادان لڑکی نے اس وقت ذرا بھی نہ سوچا کہ نبجے ایک روز اس کے غرور کو خاک میں ملا کر اور اس کی اُمیدوں کی مالا کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے یہاں سے چلا جائے گا۔ پھر وہی چرواہے لڑکے ہوں گے اَور وُہی مُکتا +

(۴)

اپنے نیکدل کرائے داروں کی رُخصتی کے وقت چوکیدار پر جو عارضی غم طاری ہو گیا تھا۔ وُہ تنخواہ کے علاوہ اِنعام کے پانچ روپے اَور گرم کپڑوں کے ڈھیر دیکھ کر زائل ہو گیا۔ اپنے مالکوں کو کچھ دُور پہنچا کر وہ اپنی کوٹھڑی میں واپس آیا تو سب سے پہلے اِس نے کپڑوں کی گٹھڑی کھولی۔ اور دیکھ کر خوشی سے نہال ہو گیا۔ اسے یاد آیا کہ گذشتہ سال کے کرایہ داروں سے بھی دو کوٹ ملے تھے۔ اِس سے قبل ایک صاحب نے اسے عمدہ اونی سویٹر بھی دیا تھا۔ جو اب تک اِسی طرح پڑا ہے۔ آج کے انعام میں ایک سیاہ

بڑی جرسی کے علاوہ بچوں کے بہت سے کپڑے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوا کہ اس سال کی ہولناک سردی خوب آرام سے گذرے گی۔

یکایک آسمان میں بہت سے کالے کالے بادل گھر آئے، مالی کی لڑکی ٹکٹا جو صبح ہی سے جنگلے پر منہ لٹکائے کھڑی تھی۔ اس ابر آلود آسمان اور اس سنسان احاطے کو دیکھ کر سسکیاں بھرنے لگی، اور پھر چیخ چیخ کر رونے لگی۔

غریب مالی بجز اس کے کہ دوڑ کر اپنی پیاری بچی کو کلیجے سے لگالے اور اس کے گرم گرم آنسوؤں کو پونچھ ڈالے یہ بھی نہ جان سکا کہ اس معصومہ کے رونے کی کیا وجہ ہے اور اس کے نازک دل پر کیا چوٹ لگی ہے۔ اپنے جہاندیدہ اور عقلمند باپ کے بہت سمجھانے بجھانے پر بھی اس معصوم بچی کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ اسی طرح اس کوٹھی میں کرائے دار آتے جاتے رہتے ہیں۔ اور آئندہ بھی ان کی آمد و رفت کا سلسلہ اسی طرح جاری رہے گا۔

ٹکٹا کتنے زمانے تک اس پہاڑی چشمے کی روانی میں، اس معطر ہوا کی شوخ رفتاری میں، اور شاخوں پر جھوم جھوم کر گاتے ہوئے پرندوں کی موسیقی میں ایک زبردست اداسی اور ایک گہری ٹھیس محسوس کرتی رہی اور تالی کی تڑتڑ کی صدائے بازگشت اس کے کانوں میں گونجتی رہی۔

بچے گھر پہنچ کر حسب معمول کالج جاتا ہے۔ لوٹتے وقت راستے ہی سے تالیاں بجاتا آتا ہے۔ اس کی زور دار تالیوں سے پوری بلند عمارت گونج اٹھتی ہے۔ اور آس پاس رہنے والوں تک کو معلوم ہو جاتا ہے کہ بچے کالج سے آگیا۔ بچے پہاڑ کی یاد کو رفتہ رفتہ بھولتے جا رہے ہیں۔ سنتوش کماری کو پہاڑ پر جا کر شریر بچے کو قابو میں رکھنے کا ایک نیا نسخہ ہاتھ لگ گیا ہے۔ سنتوش کے کالج سے واپس آتے ہی بچے اسے تنگ کرنے آتا ہے تو وہ چپکے سے اس کے کان میں کہہ دیتی ہے۔ سار جنٹ صاحب! مالی کی لڑکی کا کیا حال ہے؟

اتنا کہنا کافی ہوتا ہے، بچے منہ لٹکا کر کہتا ہے "چلو۔ ہم تم سے نہیں بولتے"

ابو محمد امام الدین رام نگری

بقیہ مضمون تنویرات

اس خیال کی تجدید بیسیوں نے بہت سے آثار نظر آ رہے ہیں۔ چنانچہ پارلیمنٹ کے گذشتہ انتخابات کے اعداد و شمار کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ عورت امیدواروں کی تعداد میں برابر کمی ہو رہی ہے اور ایک دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ مردوں کی نسبت عورتیں عورتوں کے انتخاب کے زیادہ خلاف ہیں۔ علاوہ بریں عورتوں میں بناؤ سنگھار کا جذبہ از سر نو ترقی کر رہا ہے۔ ۲۲ ہزار عورتیں بال سنوار نے کا پیشہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ ہر عورت زیب و زینت کی اس درجہ دلدادہ ہو رہی ہے کہ وہ سامان آرائش اپنے بیگ میں ساتھ رکھتی ہے اور جہاں موقع پاتی ہے سنگھار شروع کر دیتی ہے۔ ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ عورتوں کا رجحان کس طرف ہے۔

ان تمام باتوں کے باوجود مسٹر جوڈ کی رائے ہے کہ از لبکہ تحریک نسواں کا رخ آجکل بدلتا نظر آ رہا ہے۔ تاہم "ضبط تولید" کا ایک اثر یہ پڑے گا کہ عورتوں کی اقتصادی اور اخلاقی آزادی تسلیم ہی کرنی پڑے گی۔ اور اس وقت سوسائٹی کی تنظیمی صورت کچھ اور ہی ہوگی۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اس رو کے سامنے اخلاقی، مذہبی، تمدنی، معاشرتی، اقتصادی کوئی طاقت برقرار نہ رہ سکے گی۔

ایک اور برطانوی فاضل نے جس کا نام مسٹر لوڈوِلیس ہے "عورتوں کا مستقبل" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جس میں ضبط تولید کی خوب خبر لی ہے۔

ادارہ

تعلیمات

ہارکورٹ ٹیکنولاجیکل انسٹی ٹیوٹ کانپور

گذشتہ سے پیوستہ

ٹیکنولاجیکل انسٹی ٹیوٹ میں اب محض روغن سازی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اور کامل تعلیم دی جاتی ہے۔ تمام ہندوستان میں روغن سازی کی اس سے بہتر کوئی تعلیم گاہ نہیں ہے۔ ہندوستان میں تیل نکالنے کی جتنی چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ ان سب سے تیل نکالنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ جدید اصولوں کے مطابق تیلوں کی صفائی کے طریقے بتائے جاتے ہیں۔ روغن سازی سے تعلق رکھنے والے صابن۔ رنگ روغن وغیرہ کی تعلیم ہوتی ہے۔ علمی اور عملی دونوں طرح کی تعلیم کا انتظام ہے ✦

اس انسٹی ٹیوٹ کو بھی امپیریل کونسل آف اگریکلچرل ریسرچ سوسائٹی سے امداد ملتی ہے۔ اس امداد کے معاوضے میں سوسائٹی کی سفارش پر دوسرے صوبوں کے پانچ طلبہ انسٹی ٹیوٹ میں داخل کئے جاتے ہیں۔ ان طلبہ کے علاوہ دوسرے صوبوں اور ریاستوں کے جو طلبہ انسٹی ٹیوٹ میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ان سے پچاس روپے ماہانہ فیس لی جاتی ہے ✦

ڈپلومہ حاصل کرنے والے طلبہ کے علاوہ روغن سازی کی مختلف شاخوں (مثلاً تیل، صابن، رنگ روغن وغیرہ) کی تعلیم کے چھوٹے چھوٹے کورسوں میں بھی کچھ طلبہ داخل کئے جاتے ہیں ✦

روغن سازی کی معینہ تعلیم ختم کرنے کے بعد دو طلبہ کو تحقیقاتی عمل کے لئے بھی سہولتیں دی جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک متعلم کو صوبے کی حکومت دو برس تک ساٹھ روپے ماہوار کا وظیفہ دیتی ہے۔ شعبۂ روغن سازی کے علاوہ عام تحقیقاتی شعبے میں بھی ہر سال دو متعلم لئے جاتے ہیں۔ ان متعلمین کے لئے کوئی خاص کورس نہیں ہے۔ انہیں بعض اہم صنعتی مسائل کی تحقیقات و مطالعہ کا کام کرنا پڑتا ہے ✦

اس انسٹی ٹیوٹ کی تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے۔ جو تکمیل تعلیم کے بعد صنعت و حرفت اور کاروبار کو مدد دے سکیں۔ ان کا انتظام کر سکیں۔ موقع ملنے پر ذاتی کاروبار کرکے معاش پیدا کریں۔ یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی طرح ملازمت اور چاکری کے لئے دریوزہ گری کرتے نہ پھریں۔ اس مقصد کے پیش نظر علی العموم ایسے ہی طلبہ انسٹی ٹیوٹ میں لئے جاتے ہیں جنہیں صنعت و حرفت اور کاروبار سے خاص دلچسپی ہوتی ہے۔ یا جو خود اپنا سرمایہ لگا کر ذاتی طور پر کاروبار کر سکتے ہیں۔ یا تکمیل تعلیم کے بعد کسی کامیاب کاروبار میں جگہ پانے کی توقع رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ انسٹی ٹیوٹ کے ارباب حل و عقد انسٹی ٹیوٹ کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے کام دلانے میں یا ان کے ذاتی کاروبار کے کامیاب بنانے میں ان کی ہر طرح امداد کرتے ہیں۔ اور ان سے ہمیشہ تعلق وابستہ رکھتے ہیں۔ دوسری درسگاہوں کی طرح اختتام تعلیم کے بعد انسٹی ٹیوٹ کے اساتذہ اور افسران کا تعلق طلبہ سے منقطع نہیں ہو جاتا — یہی وجہ ہے جو یہاں کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو کام ملنے میں خاص آسانی ہوتی ہے ✦

ہر طرح کی صنعت و حرفت کا سنگ بنیاد کیمسٹری ہے۔ اور کیمسٹری کی دو قسمیں ہیں۔ ایک علمی اور دوسری عملی، ہندوستانی درسگاہوں میں علی العموم علمی ہی کیمسٹری کی تعلیم ہوتی ہے۔ کچھ عرصے سے بعض درسگاہوں نے عملی کیمسٹری کی طرف توجہ کی ہے۔ لیکن اکثر درسگاہوں میں اب بھی کیمسٹری کی ایسی عملی تعلیم نہیں ہوتی جو قابل ذکر خصوصیات کی مالک ہو ✦

یو پی میں عملی کیمسٹری کی اعلیٰ تعلیم کے اہتمام کا امتیاز ٹیکنولاجیکل انسٹی ٹیوٹ کانپور ہی کو حاصل ہے۔ اور یو پی ہی پر موقوف نہیں۔ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس" بنگلور کے بعد ہندوستان بھر میں ٹیکنولاجیکل انسٹی ٹیوٹ کانپور سے بہتر عملی کیمسٹری کی کوئی درسگاہ نہیں ✦

عملی اور صنعتی کیمسٹری کی تعلیم کے لئے علی العموم تین چیزوں کی ضرورت

ہوتی ہے ؎

(۱) علمی اور اصولی کیمسٹری سے کامل واقفیت ۔

(۲) عملی کیمسٹری کی تعلیم کے لئے زمانۂ حاضرہ کے مطابق اعلیٰ درجہ کے دارالتجارب ۔

(۳) میکینکل اور الیکٹریکل انجینیرنگ کی تعلیم کا معقول اِنتظام ۔

ٹیکنولاجیکل انسٹی ٹیوٹ میں تینوں طرح کی تعلیم کا معقول اِنتظام ہے ۔ جو لوگ انسٹی ٹیوٹ میں داخل ہونے ہیں ۔ وہ چونکہ عام طور پر یونیورسٹیوں کے بی ۔ ایس ۔ سی اور ایم ۔ ایس ۔ سی ہوتے ہیں ۔ اِس لئے انہیں علمی کیمسٹری پر کافی عبور ہوتا ہے ۔ عملی کیمسٹری اور انجینیرنگ کی تعلیم کا انسٹی ٹیوٹ میں معقول بندوبست ہے ۔ کیمسٹری کے ایک ہوشیار اور کارگذار ماہر کے لئے انجینیرنگ سے متعلق جس قدر معلومات کی ضرورت ہو سکتی ہے ۔ وہ اس انسٹی ٹیوٹ میں حاصِل ہو سکتی ہیں ۔ کیمسٹری کے ایک عامل سے انجینیر ہونے کی امید تو کی نہیں جا سکتی ۔ اِس کے لئے اتنے ہی کی ضرورت ہے کہ وہ انجینیرنگ کی اصطلاحات کو سمجھ سکے ۔ اور اپنا ما فی الضمیر انجینیر کو سمجھا سکے ۔ بوقت ضرورت اپنے لئے خاص آلات بھی ایجاد کرنے پڑتے ہیں ۔ اس لئے انسٹی ٹیوٹ میں مشین ڈیزائن اور مشین بنانے کی تعلیم کا بھی بندوبست ہے ؎

خام اشیاء ۔ اور مشینوں کی خریداری ۔ مشینوں کی فیٹنگ اور [illegible] کی فروخت وغیرہ تمام باتوں میں ایک شخص کا ماہر ہونا تو آسان نہیں ہے ۔ لیکن حتی الوسع انسٹی ٹیوٹ ان تمام چیزوں کے متعلق معلومات حاصِل کرنے میں طلبہ کو مدد دیتی ہے ؎

انسٹی ٹیوٹ میں عہد حاضرہ کی ضروریات کے مطابق اعلیٰ درجے کی تجربہ گاہوں کے عِلاوہ چھوٹے چھوٹے کارخانے بھی ہیں ۔ اِس لئے تجربہ گاہوں کے ساتھ اِن کارخانوں کے ذریعہ طلبہ عملی تعلیم بھی حاصِل کرتے ہیں ؎

انسٹی ٹیوٹ کی فیکٹریوں کے عِلاوہ صنعت و حرفت کے ممتاز اور مرکزی کارخانوں کے دیکھنے اور ان میں کام کرنے کا بھی بندوبست کیا جاتا ہے ۔ بہت سی باتوں کا عِلم صرف کارخانوں کے دیکھنے ہی سے ہو جاتا ہے ؎

طلبہ میں خود اعتمادی اور کاروباری صلاحیت پیدا کرنے کیلئے انسٹی ٹیوٹ کی فیکٹریوں کے کام طلبہ کے سپرد کر دیئے جاتے ہیں انسٹی ٹیوٹ کے افسر انہیں ضروری مشورے دیتے اور ان کی نگرانی کرتے رہتے ہیں ۔ یہاں کی فیکٹریوں میں تیل ، صابن ، رنگ روغن اور شکر کی فیکٹریاں خصوصیت سے قابل ذکر ہیں ۔ ان فیکٹریوں میں طلبہ کو کاروباری نقطۂ نظر سے مال تیار کرنے کی تعلیم دی جاتی ہے ۔ اور طلبہ میں کارخانوں کی فضا میں کام کرنے کی صلاحیت پیدا کی جاتی ہے ۔ انسٹی ٹیوٹ میں مطالعہ اور تحقیقات کا جو کام ہوتا ہے ۔ ان فیکٹریوں کے ذریعہ ان کا پورا اِمتحان ہو جاتا ہے ؎

انسٹی ٹیوٹ کے افسر دوسرے کاروباریوں اور صنعت و حرفت کے کارخانوں سے بھی تعلق وابستہ رکھتے ہیں ۔ اور ان کی دقتوں کو حل کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں ۔ چنانچہ وہ کارخانوں میں جاتے ہیں ۔ کارخانے والوں کی مشکلات پر غور کرتے ہیں ۔ اور ان کے ازالہ کی تدابیر بتاتے ہیں ۔ نیز انہیں برابر ایسے مشورے دیتے رہتے ہیں ۔ جن سے ان کے کاروبار کو ترقی اور کامیابی حاصِل ہو ؎

انسٹی ٹیوٹ کے ساتھ ایک موزوں اور معقول دارالمطالعہ بھی ہے ۔ اِس دارالمطالعہ میں سائنس ، صنعت و حرفت ، کاروبار اور تجارت نیز ٹیکنولاجی سے تعلق رکھنے والی ہزاروں بلند پایہ کتابیں موجود ہیں ۔ ٹیکنیکل موضوع پر اشاعت پذیر ہونے والا تازہ لٹریچر برابر آتا رہتا ہے ۔ انگریزی کے عِلاوہ جرمن اور فرنچ زبانوں میں شائع ہونے والی کتب و جرائد کے منگانے کا بھی اِنتظام ہے ۔ سائنس کے متعلق جرمن زبان کا لٹریچر انگریزی زبان کے علمی سرمائے سے کہیں فائق ہوتا ہے ۔ اکثر معیاری کتابیں جرمن زبان سے ہی ترجمہ کی جاتی ہیں دارالمطالعہ سے طلبہ کے عِلاوہ عوام اور کارخانوں کے مالک بھی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں ؎

انسٹی ٹیوٹ کے طلبہ میں سائنس سے متعلق دلچسپی اور تقریر و تحریر کی صلاحیت پیدا کرنے کے لئے انسٹی ٹیوٹ کے طلبہ کی ایک مجلس بھی قائم ہے ۔ جس کا نام "سائنٹفک سوسائٹی" ہے ۔ اس مجلس کی جانب سے ایک سہ ماہی رسالہ "جرنل آف ٹیکنولاجی" بھی شائع ہوتا ہے ۔ یہ رسالہ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ ممالک غیر میں بھی قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے ۔ طلبہ کی تحقیقات کے کوائف بھی اِسی رسالے میں شائع ہوتے رہتے ہیں ؎

اِس انسٹی ٹیوٹ کے تقریباً پچانویں فیصدی تعلیم یافتہ برسرروزگار ہیں ۔ روغن اور شکر کے شعبوں کو اپنے کامیاب نوجوانوں کو کام دلانے میں نمایاں کامیابی حاصِل ہوئی ہے ۔ ہندوستان خصوصاً یو پی میں تیل کے

(باقی مضمون صفحہ ۶۴۶ پر)

ہندوستان کے شہ زور

ہمارے بزرگوں کو یہ شکائت عام ہے کہ موجودہ طریق تعلیم ہمارے دِلوں کو ہندوستانی روایات اور تمدن سے بیگانہ بنا رہا ہے۔ ہمارے دماغ میں یورپی آدرش اور مثالیں اسقدر گھر کر لیتی ہیں۔ کہ تعلیم کے خاتمہ تک ہماری ہندوستانیت بالکل فنا ہو چکتی ہے۔ اور ہم اپنے ملک میں رہتے ہوئے بھی غیر ملکی بن جاتے ہیں۔ یہ کلیہ زندگی کی معمولی سے معمولی باتوں پر بھی صادق آتا ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب میں نے ایک اسکولی لڑکے سے کسی دریا کا نام لینے کو کہا تو اس نے فوراً ٹیمز کا نام لے دیا۔ حالانکہ وُہ پانچ دریاؤں کی مقدس سرزمین کا باشندہ تھا۔ اِسی طرح جب ایسے لوگوں کا تذکرہ مقصود ہوتا ہے۔ جو مافوق العادت قوت کے مالک ہوں تو عام طور پر یورپی لوگوں کی مثالیں ہی دی جاتی ہیں۔ حالانکہ اِس گئے گزرے زمانے میں بھی ہندوستان میں ایسے ایسے یودھا موجود ہیں جن کے کارناموں کے آگے یورپ کے بہادروں کی کوئی بھی قدر منزلت باقی نہیں رہتی ٭

اِس مضمون کا مقصد اسی قسم کے چند لوگوں کی زندگی اور کمالات پر روشنی ڈالنا ہے۔ اور ان سب لوگوں سے ذاتی واقفیت رکھنے کی بنا پر مضمون نگار کو اس کا حق بھی پہنچتا ہے۔ یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے۔ کہ اِن لوگوں نے جسمانی قوت کا جو معیار قائم کیا ہے۔ وُہ اِس وقت تک انتہائی ہے۔ ان کے نام رام مورتی، دیوی چوہدری، سہدیو، بھوانی شاہ اور بھگوت راؤ ہیں۔ ان میں سے رام مورتی کو بین الاقوامی شہرت نصیب ہوئی اور بھوانی شاہ کو صرف بنگال میں۔ باقی اشخاص نے ننگِ شہرت گوارا ہی نہیں کی۔ اور بہت کم ہندوستانی ہونگے جو ان کے نام بھی جانتے ہوں ٭

اِس تذکرے میں سرِفہرست رام مورتی کا نام ہوگا۔ جس نے اپنی تمام عمر ہندوستانی جوانوں کی جسمانی اصلاح میں صرف کی ہے۔ وُہ دُنیا میں پہلا شخص تھا۔ جس نے اپنے سینے پر ایک ہاتھی کا وزن سنبھالا اور ایسے ایسے کرتب دکھلائے جو یورپی بہادروں کے خواب و خیال میں بھی نہیں آ سکتے۔ ہاتھی کو اُٹھانے کی مثال تو اسی نے قائم کی تھی۔ لیکن بعد میں ایسے لوگ بھی پیدا ہو گئے جنہوں نے اس مثال کی پیروی کی۔ مضمون نگار اس قسم کے چھ اشخاص سے ذاتی واقفیت رکھتا ہے۔ البتہ رام مورتی نے جس طریقے پر آٹھ ہزار پونڈ وزنی پتھر کو اُٹھایا وہ دُنیا کے تھیٹر میں اپنی مثال نہیں رکھتا۔ ہرکولیس ایک روائتی بہادر تھا اور اس کی بہادری معیاری متصور ہوتی تھی۔ لیکن کیا رام مورتی نے اس معیار کو واقعاتی طور پر پورا نہیں کر دیا ٭

وُہ اِس وزنی پتھر کو صرف اپنی پیٹھ پر رکھ ہی نہیں لیتا تھا۔ بلکہ اِس پر ہتھوڑوں سے ضربیں بھی [illegible] جس کے بعد وُہ اسے اُچھال کر اپنے جسم سے الگ پھینک دیتا تھا۔ ایک اچھے خاصے ہمالیہ کو اتنی آسانی سے پرے پھینک دینا۔ ایک ایسا کارنامہ ہے جس کی مثال روایات میں بھی نہیں ملتی ٭

جب رام مورتی نے لندن میں اپنے کمالات کی نمائش کی تو اس پتھر کو سرکاری طور پر [illegible] گیا تھا [illegible] ایک اونس بھی کم نہ تھا۔ جس شخص نے بھی اسے دیکھا۔ وُہ اِس امر کا اقرار کرتا تھا کہ وُہ یودھاؤں کا بادشاہ ہے۔ ایک برطانوی اخبار نے تو اس کی اسقدر تعریف کی تھی کہ اس سے شاعرانہ مبالغہ ٹپکتا تھا۔ اِس نے لکھا تھا کہ تاریخ توہمات اور روایات میں کہیں بھی اِس شجاعانہ کمال کی مثال نہیں ملتی ٭

دیوی چوہدری ۱۲۰۰ پونڈ کا پتھر اپنے ہاتھوں میں اُٹھا لیتا تھا۔ اور اِس امر کی تصدیق ایک انگریز ڈیسمانڈ نے بھی کی ہے۔ اِس نے دیوی چوہدری کا تذکرہ کسی سیاح سے سنا تھا اور صرف اِس کی تصدیق کرنے کے لئے ہندوستان آیا تھا۔ دیوی چوہدری کا لڑکا سہدیو بھی اپنے باپ کی پیروی کرتے ہوئے ایک مدت تک وہی وزن اُٹھاتا رہا۔ اور اب جب کہ وُہ دونو مر چکے ہیں۔ میں یہ بات بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ اتنے بڑے وزن کو ہاتھوں سے اُٹھا لینا عام انسانی قوت سے باہر ہے۔ آجکل اِس فن کا ماہر مرزا پور کا ایک شخص رگھوناتھ سہائے

ہے ✦

بھوانی شنکر کلکتہ کا رہنے والا تھا۔ اور سب سے پہلے اِس نے کشتی لڑنا شروع کیا۔ اِس کی بہادری کو دیکھ کر رام مورتی نے اِس کو اپنی شاگردی میں لے لیا۔ اور بہت جلد اِس کی شہرت نزدیک و دُور پھیل گئی۔ اس نے رام مورتی کے بہت سے کرتب سیکھ لئے لیکن ۸۰۰ پونڈ کا وزنی پتھر اُٹھانا اسے نصیب نہ ہُوا۔ ہاتھی اُٹھانے کے معاملے میں البتہ وُہ رام مورتی پر سبقت لے گیا۔ وُہ دُنیا میں پہلا اور آخری آدمی تھا جس نے اپنے سینے پر دو ہاتھیوں کا وزن اُٹھایا لیکن یہ آزمائش اِس کے لئے طاقت آزما ثابت ہُوئی۔ اِس کرتب کی نمائش کے بعد وہ بیمار ہوگیا اور آنٹھ یوم کے بعد راہیِ مُلکِ عدم ہُوا۔ اِس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وُہ تین سو پونڈ وزن بڑی آسانی سے اُٹھا کر جہاں چاہتا تھا۔ لے جاتا تھا ✦

بھگوت راؤ کو کبھی شہرت نصیب نہیں ہوئی۔ وُہ ایک ایسے زمانے میں پیدا ہُوا ہے۔ جب لوگ اِس قسم کے کرتبوں کی نسبت سینما کے زیادہ شائق ہیں۔ اِس کے علاوہ اِس قسم کے کرتب دکھانا اس کا پیشہ بھی نہیں ہے۔ مَیں نے تو اسے اتفاقاً دیکھا۔ وُہ بھی اپنے سینے پر ہاتھی اُٹھا سکتا ہے۔ لیکن اِس میں خوبی یہ ہے کہ جہاں اور لوگ خاموش پڑے رہتے تھے۔ وہاں وُہ تقریر بھی کرتا ہے۔ اور اِس حالت میں جبکہ سینے پر ہاتھی کھڑا ہو بولنا کسی ذیصفت آدمی کا ہی کام ہے۔ جب مَیں نے اسے دیکھا تھا تو اس نے کوئی دو منٹ تقریر کی تھی ✦

وُہ ضلع باندا کا رہنے والا ہے۔ جو یو پی میں ہے اور اِس کی جسمانی نشو و نما ہندوستانی پہلوانی کی مرہون منت ہے۔ بھوانی ورزش کے لئے پہلوانی بھی کیا کرتا تھا۔ اور وزن بھی اُٹھایا کرتا تھا۔ دیوی اور سہدیو صرف وزن اُٹھاتے تھے۔ اور رام مورتی کی غیر معمولی طاقت کا راز ہٹھ یوگ پر عمل کرنے میں مضمر تھا۔ اگر یہ سب لوگ یورپی یودھاؤں کی طرح اپنا اشتہار دیتے تو آج ان کا نام دُنیا میں بچے بچے کی زبان پر ہوتا ✦

(ترجمہ)

گوپال متل

بقیہ مضمون تعلیمات

کارخانوں کی معقول تعداد ہے۔ اِن سب کو روغن سازی میں مہارت رکھنے والے نوجوانوں کی سخت ضرورت تھی۔ اِس لئے ان کارخانوں میں انسٹی ٹیوٹ کے فارغ التحصیل نوجوانوں کا حوصلہ افزا خیر مقدم ہُوا۔ روغن ساز کارخانوں کے علاوہ انسٹی ٹیوٹ کے کچھ کامیاب نوجوان صابن اور رنگ و روغن وغیرہ کے کارخانوں میں بھی معقول اسامیوں پر ہیں۔ بعض نے اپنے ذاتی کارخانے قائم کر لئے ہیں۔ اور اپنے کاروبار سے حسب خواہش فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ ۱۹۳۵ء تک کامیاب ہونے والے نوجوانوں میں بہت کم ایسے ہیں۔ جو اب تک بیکار ہوں ✦

انسٹی ٹیوٹ کے اساتذہ اور طلبہ سے نہ صرف یو پی میں تیل کے کاروبار کو نمایاں فائدہ پہنچا ہے۔ بلکہ ہندوستان کے دُوسرے صوبوں کے تیل، صابن، رنگ و روغن وغیرہ کے کارخانوں نے بھی کافی فائدہ اُٹھایا ہے ✦

شعبۂ شکر سازی کو اپنے طلبہ کو باکار بنانے میں پوری کامیابی ہوئی ہے۔ آج ہندوستان میں شائد ہی کوئی ایسا کارخانۂ شکر سازی ہوگا۔ جس میں اس انسٹی ٹیوٹ کے دو ایک فارغ التحصیل کیمسٹ نہ ہوں ✦

عام شعبۂ تحقیقات سے بہت کم نوجوان کامیاب ہوئے لیکن جو کامیاب ہوئے ان کی غالب تعداد باکار ہے۔ بعض نے دوا سازی کے کارخانے کھول لئے ہیں۔ ایک نے شیشہ سازی کا کارخانہ قائم کیا ہے۔ بعض کو ادویہ ایجاد کرنے والے کارخانوں میں جگہیں مل گئی ہیں۔ غرض "ہارکورٹ بٹلر ٹیکنولاجیکل انسٹی ٹیوٹ کانپور" ہر اعتبار سے ایک ممتاز اور مفید ادارہ ہے ✦

خواجہ محمود جاوید ایم۔ اے

پریم کہانی

قدیم عہدِ یُونان کی رومانی داستان

اَپالو اپنے طلائی رتھ پر سوار پُوری تیزی کے ساتھ دُنیا پر زندگی کی کرنیں نچھاور کرتا ہُوا چلا جا رہا تھا۔ میدانوں میں۔ پہاڑوں پر۔ سنسان جنگلوں میں ہر طرف زندگی کے آثار نمایاں تھے ؛

سنسان جنگل میں ایک مضبُوط زیتون کے درخت تلے ایک ننھا حسین بچہ کپڑوں میں لپٹا سو رہا تھا۔ ایک بُڈھا گڈریا اپنے بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کو چراتا ہُوا وہاں پہنچا۔ اُس نے بچے کو دیکھا۔ اور اُٹھا لیا۔ "یہ ضرور دیوتاؤں کا عطیہ ہے۔" اُس نے دِل میں خیال کیا۔ وُہ اُسے اپنے گھر لے آیا۔ اور رفتہ رفتہ وُہ حسین بچہ پَل کر ایک وجیع نوجوان بن گیا۔ اِس کے مقابلہ کا حسین تیر انداز۔ طاقتور اور خوبرو یونان بھر میں موجود نہ تھا ؛

اُسی جنگل کی ایک حسین وادی میں جہاں سے روپہلی ندیاں سرشاریوں کے نغمات گاتی ہوئیں بحیرہ روم میں جا ملتی تھیں۔ جہاں نرگس اور سوسن کے خوبصُورت پھُول ہر طرف اپنی بھینی بھینی سرود اَور خوشبو پھیلاتے تھے۔ ایک حسین ترین دیوی کا مسکن تھا۔ وہ حسین تھی اور جوان۔ شباب کی مستیوں میں کھیلتی تھی۔ مگر تن تنہا۔ خداؤں کے عطیات ہی اُسکی مستیوں کے محرک تھے۔ نامعلوم وُہ کب سے اپنی معصُوم زندگی تنہا یہاں بسر کر رہی تھی۔ اُسے بنی نوعِ اِنسان سے دِلی نفرت تھی۔ گو اِس کا باپ ایک اِنسان تھا۔ مگر اُس کی والدہ ایک آسمانی دیوی تھی۔ وُہ راتوں کو ندی کے کنارے جا بیٹھتی۔ اَور چاندکی دیوی ڈائنا کے جلوؤں سے لُطف اندوز ہوتی۔ وُہ پھُولوں میں کھیلا کرتی۔ اِسی طرح اَیام مسرت میں بسر ہوتے رہے۔ اَپالو نے اُسے ہر قسم کے زخم کو پل بھر میں اچھا کر دینے کی برکت دے رکھی تھی۔

ادھر گڈریئے کا بیٹا۔ اپنے شباب کے ولولہ انگیز جذبات میں کھیل رہا تھا۔ ایکدن وُہ شکار ڈھونڈنے کے لئے اُس وادی میں آ نکلا۔ جس میں اینوَن رہتی تھی۔ نوجوان نے اسے دیکھا ـــــ وُہ ندی میں پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔ اَور اُس کے سُنہری لانبے لانبے بال ہوا میں اُڑ اڑکر چمک رہے تھے۔ وُہ دیر تک وہیں ساکت کھڑا رہا۔ یکایک دیوی نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک وجیع نوجوان تیر و ترکش کے ساتھ بھالا ہاتھ میں سنبھالے اُسے تک رہا تھا۔ دونو کی نگاہیں چار ہوئیں ادھر ان کے دِل میں کیوپڈ کا تیر ترازو ہوگیا۔ عشق کی آگ نے دیوی کے تمام تعصبات کو جلا کر راکھ کر دیا۔ اب مٹی سے تخلیق شُدہ اِنسان دیوتاؤں سے بڑھ کر تھا۔ دونوں کی ارواح باہم محبت کی رنگین فضاؤں میں پرواز کرنے لگیں۔ اَور وُہ میاں بیوی بن گئے ؛

ایکدن اُس کا مرغوب ترین سانڈھ کھوگیا۔ اَور وُہ اُس کی تلاش میں ایسا نکلا کہ مدتوں واپس نہ لوٹا۔ معلُوم اینوَن کو تر پتا چھوڑ گیا۔ پھرتے پھراتے وُہ سلطنت کے دارالخلافہ ٹرائے میں جا نکلا۔ اُس کی عمر میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ وُہ شہر دیکھے۔ تمام دِن بازاروں میں سیر کرنے کے بعد شام کو جب وُہ واپس لوٹنا چاہتا تھا۔ تو بازار میں دُور سے اُس نے ایک پرشکوہ جلوس آتے دیکھا۔ "یہ کیا ہے ؟" اُس نے ایک تیل فروخت کرنے والے سے دریافت کیا۔ "یہ ؟" دُکاندار نے حیرت سے نوجوان کی طرف دیکھا۔ "یہ ملکہ ٹرائے کا جلوس ہے۔ وُہ چندرماں دیوی کے مندر سے واپس آرہی ہے۔" جلوس آہستہ آہستہ اُس کے قریب آگیا۔ ملکہ اپنی رتھ میں بیٹھی عوام کو نگاہ اُلفت سے تکتی ہُوئی مُسکرا رہی تھی۔ اُس نے اُسے بھی دیکھا۔ شائد اُس نے پہچان لیا تھا۔ پہلے تو وُہ جھجکی پھر رتھ کو کھڑی کرتے ہوئے اُس کے پاس آئی۔ "بیٹا اُس نے کہا۔" اَور اُس سے لپٹ گئی۔ ہاں وہ اُس کا بیٹا ہی تھا۔ بیٹا جسے اُس کے خاوند شہنشاہ ٹرائے نے جنگل میں پھینکوا دیا تھا۔ کیونکہ اُس کی پیدائش پر پیشینگوئی کی گئی تھی کہ یہ بچہ "جلتی ہُوئی مشعل ہوگا۔" محبت مادری یہ برداشت نہ کر سکی۔ کہ اُسکا بیٹا جنگلوں میں رہے ؛

اب دوبارہ وُہ ایک شہزادہ تھا۔

وہ دیوی اینون کو بھُول کر شاہانہ زندگی بسر کرنے لگا۔ لیکن آہ وُہ اُس کے لئے تڑپ رہی تھی۔ وُہ اُس کی منتظر تھی ؛

پیکرِ حسن ہیلن کی خوبصورتی کا شہرہ تمام یونان۔ اور ایشیائی دیوتی ممالک میں پھیل چُکا تھا۔ وُہ اب شادی شُدہ تھی۔ شہزادے نے بھی اُس کے حسُن کی تعریف سُنی۔ اور اُس کی دید کا اشتیاق اُسے ہیلن تک لے گیا۔ دونوں نے ایک دُوسرے کو دیکھا۔ اور کیوپڈ نے مُسکراتے ہوئے اپنے نقرئی کمان میں دو آتشیں تیر یکدم نکالے اور اُس حسین جوڑے کی جانب پھینکتے ہُوئے اُن کے دِلوں میں پیوست کر دیئے ؛

ہیلن اپنے خاوند اور ننھّی بچی کو تنہا چھوڑ کر شہزادے کے ساتھ ٹرائے میں بھاگ آئی۔

یہ واقعہ کوئی معمولی نہ تھا۔ یونان کے کونے کونے میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ اور تمام یونان متحد ہوکر ٹرائے پر حملہ کرکے اُسے تباہ برباد کر دینے کے لئے تیار ہوگیا۔ یونانی بیڑا آخر ساحل ٹرائے پر آپہنچا۔ اور طرفین میں جنگ جاری ہوگئی۔ متواتر دس سال تک لاکھوں نوجوان ٹرائے کی زمین کو اپنے خون سے سینچتے رہے۔ مگر کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ دسویں سال ٹرائے کے مشہور تیر انداز شہزادے کا ہاتھ زہر آلود تیر سے زخمی ہوگیا۔ وہ شہزادہ جو ہیلن کو اغوا کرکے ٹرائے میں لے آیا تھا۔ وُہ شہزادہ [illegible] اپنے غار [illegible] چپکے چپکے آنسوؤں سے تر کرتی رہتی تھی۔ "نہیں اِس کا عِلاج کوئی طبیب نہ کر سکے گا۔ مجھے اینون کے پاس لے چلو۔" اُس نے کہا جب تمام طبیب اُس کے علاج سے قاصر آگئے۔ پالکی برداروں نے اُسے اینون کے غار کے باہر پہنچا دیا ؛

"دیوی —— اینون۔ باہر آؤ —!" وُہ کراہتے ہُوئے بولا۔

دیوی نے سُنا اور وہ وفورِ جذبات سے پاگل ہوگئی۔ بھاگتی ہُوئی غار کے دروازے پر آئی۔ سامنے اُس کی تمنّاؤں کا مرکز تھا۔ دیوی کی روشن آنکھیں اندھیرے میں ستاروں کی مانند چمک رہی تھیں۔ اور اُس کا مرمریں جسم تاریکی میں نور پیدا کر رہا تھا ؛

"محبت کی دیوی" شہزادہ حسرت بھری نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھتے ہُوئے بولا۔ "تمہارے مقدس قدموں میں تمہارا عاشق قریب المرگ پڑا ہے۔ مقدس اپالو کی قسم وُہ جان بوجھ کر تمہیں نہ چھوڑ گیا تھا۔ آہ صرف قسمت ہی اِس کی ذمّہ دار ہے۔ قسمت —— جس سے کسی کا چھٹکارا نہیں۔ یہی قسمت مجھے ہیلن کے پاس لے گئی۔ کاش کہ اُسے دیکھنے سے پیشتر ہی مَیں تمہارے زانو پر جان دے دیتا۔ مگر —— آہ اب جو ہونا تھا سو ہو چُکا۔ تم مقدس دیوتاؤں کے واسطے اور اپنی پرانی محبت کے لئے مُجھ پر رحم کرو۔ رحم کرو دیوی۔ اور میرے مہلک زخم کو اچھّا کر دو۔ اپالو نے تمہیں زخم اچھّا کرنے کی برکت دی ہے۔ صرف تم ہی میرے زخم کو اچھّا کر سکتی ہو —— یا پھر مجھے اپنے زریں اور پاک قدموں میں مر جانے دو۔ بولو دیوی۔ بولو ——" وُہ خاموش اُسے تکتی رہی ؛

"نہیں ——" وُہ شدت درد سے سمٹ گئی۔ "اب یہاں آئے ہو۔ برسوں کے بعد —— اپنا زخم اچھّا کرانے کے لئے۔ اب بھی جاؤ۔ اور اپنی ہیلن کے پہلو میں آرام کرو۔ اسی ہیلن کے پاس جو تمہیں اتنی پیاری ہے کہ اِسکی خاطر تم نے اِنسان کا خوُن خون نہ سمجھا اب وہی تمہارے درد کی چارہ گر ہو سکتی ہے۔ میں کچھ نہیں کر سکتی —— مَیں —— مَیں —— یہ الفاظ کہتے کہتے وُہ چپ ہوگئی۔ اُس کے رُخساروں پر سفید موتی چمک رہے تھے۔ وُہ دوبارہ غار میں چلی گئی۔ بیتاب ہوکر خاک پر جا لیٹی۔ اور روتی رہی۔ "کیوں وُہ مجھے چھوڑ کر گئے۔" عشق کا درد اُن کے زخم کے درد سے کہیں زیادہ تھا۔ مگر پھر بھی وُہ نہ آئے۔" مگر رحم —— ہاں وُہ اُس سے محبت کرتی ہے۔ اُسے اُس پر رحم کرنا ہوگا۔ اور یوں بھی اِس کا درد اِس کا اپنا درد ہے وُہ دیوانہ وار اُٹھی۔ اور دَوڑ کر غار کے باہر آئی۔ باہر آئی تاکہ اپنے محبُوب کا زخم اچھّا کرکے اُسے اپنے سینے سے لگالے۔ اور پھر کہیں نہ جانے دے مگر ——

شہزادہ وہاں موجود نہ تھا۔ وُہ جا چُکا تھا۔

تمام جنگل میں وُہ اُس کا نام پُکارتی۔ بیتابی کے عالم میں درختوں سے ٹکراتی۔ پتھروں سے ٹھوکریں کھاتی۔ آوارہ پھرتی رہی مگر سب بے سود ——

رفق پر شام کی سُرخیاں نمودار ہوگئیں۔ مگر وہ اُسے نہ پاسکی۔ "میں ڈھونڈ کر رہوں گی۔" وُہ بڑبڑاتی۔ اور ایک ٹیلے پر جا کھڑی ہوتی۔ مگر —— وُہ مرچکا تھا۔ وُہ اب اِس دُنیا میں موجود نہ تھا۔

دور ٹرائے میں شعلوں کا طوفان اُٹھ رہا تھا۔ کوئی مُردہ جلایا جا رہا تھا۔ اُس نے دیکھا۔ اور بھاگ کھڑی ہوئی۔ "زندگی میں اُنہوں نے مجھے چھوڑ دیا۔ مگر اب وُہ ہمیشہ میرے ہونگے۔ نہیں —— ہیلن اب اُنہیں نہ پکڑ سکے گی۔ وُہ میرے ہیں۔" وُہ بھاگی جا رہی تھی اور پاگلوں کی طرح بولتی جا رہی تھی۔ ماتم کرنے والے بہادروں اور عورتوں کی صفوں کو چیرتی ہوئی وُہ چتا کے پاس جا پہنچی۔ "مَیں نے اُنہیں جا کر نامراد نہیں

آثارِ قدیمہ

لاہور میں مغلیہ عہد کی مشہور عمارتیں

آگرہ، فتح پوری اور دہلی کی مغلی عمارتیں تمام دنیا میں مشہور ہیں لیکن لاہور کی نہیں - وجہ یہ ہے کہ لاہور کبھی مغل سلطنت کا ممتاز دارالخلافہ نہیں تھا، بلکہ آخری مغل بادشاہوں نے تو اسے بالکل ہی نظر انداز کر دیا تھا -

ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہان اور اورنگ زیب کا عہدِ حکومت تاریخِ لاہور کا زریں زمانہ تھا - اس وقت لاہور شاہی قیام گاہ تھا اور یہاں کے تمام تعمیری شاہکار اسی زمانے سے تعلق رکھتے ہیں - اس مضمون میں ہم صرف دو عمارتوں کا تذکرہ کریں گے -

قلعہ :- اس قلعہ کے دروازے اکبر کے بھاری بھرکم طرزِ تعمیر کا نمونہ ہیں - اندرونی عمارت کے ستون سرخ پتھر کے بنے ہوئے ہیں اور ہندوی اور اسلامی طرزِ تعمیر کے دلکش امتزاج کا مظہر ہیں - موتی مسجد، تخت کا کمرہ اور ثمن برج کی تعمیر میں ہندوی فن تعمیر کے ساتھ ساتھ مغل نادرہ کاری کے جوہر بھی نظر آتے ہیں -

قلعہ تقریباً مستطیل شکل کا ہے - جس کی لمبائی ۱۲۵۰ فٹ اور چوڑائی ۱۱۰۰ فٹ ہے - مرکزی دروازے مشرقی اور مغربی دیواروں میں ہیں - لیکن مغربی دروازے کا محل وقوع قلعہ کی عام ساخت کے مطابق نہیں ہے - غالباً یہ دروازہ یہاں حضوری باغ کی رعائت سے رکھا گیا ہوگا - حضوری باغ اورنگ زیب نے بادشاہی مسجد کے سلسلہ میں بنایا تھا - بعض مورخین کا خیال ہے کہ حضوری باغ کو رنجیت سنگھ نے بنایا - اس سے پیشتر یہ جگہ صرف ایک سرائے تھی - جہاں مغل سپاہی آکر ٹھہرا کرتے تھے -

اب مشرقی اور مغربی دونو دروازے بند کر دیئے گئے ہیں - اور قلعہ میں ایک پائیں دروازے سے داخل ہونا پڑتا ہے - جس کی پشت پر ایک بہت بڑا دروازہ ہے - جسے ہاتھی پول کہتے ہیں - آگے چل کر اکبر کا دیوان عام آتا ہے - کسی وقت اس کے چوطرفہ کمرے تھے، لیکن اب ان کا کوئی نشان نہیں ملتا - اس کے نزدیک ہی موتی مسجد ہے جسے اکبر نے غالباً اپنے حرم کی بیگمات کے لئے بنوایا تھا - بیان کیا جاتا ہے کہ یہ اولین موتی مسجد تھی - اپنے نام کی رعائت سے یہ سفید سنگ مرمر کی بنی ہوئی ہے اور اس کی چمک دمک امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں اب تک محفوظ ہے - لارڈ کرزن کے عہد تک برطانوی حکومت اسے بطور خزانہ استعمال کرتی رہی ہے - لیکن لارڈ کرزن کو جب حقیقتِ حال سے آگاہی ہوئی تو اس نے اس استعمال کو ترک کر دیا -

گو فنِ تعمیر کے اعتبار سے دیوان عام کسی خاص خصوصیت کا حامل نہیں، لیکن اس کی تاریخی اہمیت بہت زیادہ ہے - شاہجہان نے مشہور و معروف ایرانی انجنیئر علی مردان خاں سے ۱۶۳۱ء میں یہیں ملاقات کی تھی - علی مردان خاں کا کمال شالامار باغ کی شکل میں [illegible] اور آج بھی ہر کہ ومہ سے دادِ تحسین لے رہا ہے - جب سموگڑھ کی لڑائی کے بعد دارا شکوہ اپنے بھائی اورنگ زیب سے جان بچا کر بھاگا اور لاہور میں پناہ گزیں ہوا تو اطالوی سیاح منوچی نے اس سے دیوان عام میں ہی ملاقات کی تھی - منوچی کا بیان ہے کہ شاہجہان نے قلعہ میں بہت سا سونا دفن کر دیا تھا - لیکن پچھلے سالوں میں متعدد بار قلعہ میں کھدائی ہوئی ہے لیکن اس خزانہ کا کہیں پتہ نہیں چلا -

سکھوں کے زمانہ میں دیوان عام کا نام بدل کر "تخت کمرہ" رکھ دیا گیا تھا - لیکن اس تخت پر رنجیت سنگھ بیٹھا کبھی نہیں - یہ بات قابل غور ہے کہ گو ۱۷۹۷ء میں اسے شاہی اقتدار حاصل ہو گیا تھا - لیکن نہ تو اس نے شاہی لقب اختیار کیا اور نہ شاہی تزک و احتشام کی آرزو کی - یہاں تک کہ اس نے اپنے نام کا سکّہ بھی نہیں جاری کیا لیکن اس کی موت کے بعد اسے پوری پوری شاہانہ شان و شوکت کے ساتھ سپردِ آتش کیا گیا -

دیوان عام کی پشت پر ایک اور مربع عمارت ہے جو جہانگیر کی بنائی ہوئی بیان کی جاتی ہے۔ اس عمارت کے وسط میں ایک خوبصورت تالاب تھا جو سکھوں کے وقت تک موجود تھا۔ اس عمارت کے پہلو میں ایک اور بڑی عمارت ہے جو بڑی خواب گاہ کے نام سے موسوم ہے۔ شمال کی طرف ایک اور عمارت ہے جو چھوٹی خوابگاہ کہلاتی ہے۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ یہ عمارت مجلسِ مشاورت کے اجلاس کے لئے وقف تھی۔ اس کے قدموں میں ایک اور عمارت کے کھنڈرات ہیں۔ یہ عمارت غالباً عرض گاہ تھی۔ جہاں ہر صبح سلطنت کے عمائدین جمع ہوتے تھے۔ اور شاہی احکامات کے منتظر رہتے تھے۔ اس کے نزدیک ہی ایک اور عمارت ہے جسے خلعت خانہ کہتے تھے۔ یہاں بادشاہ کی طرف سے امراء و روٴسائے سلطنت کو خلعت عطا ہوتے تھے۔

مربع عمارت کے شمال کی طرف شیش محل ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں شاہجہان اور اس کا بیٹا اورنگ زیب اجلاس خاص منعقد کرتے تھے۔ یہیں بیٹھ کر پنجاب کا جنگی حکمران رنجیت سنگھ فتح کے منصوبے باندھا کرتا تھا۔ یہیں ۲۶ دسمبر ۱۸۴۶ء کی صلح ہوئی اور یہیں برطانوی حکومت نے ۱۸۴۶ء میں پنجاب کی عنانِ حکومت پہلی مرتبہ اپنے ہاتھوں میں لی۔

انارکلی کی قبر

انارکلی کی معروف قبر ہندوستانی تاریخ کا ایک اچھا خاصا معمہ بن گئی ہے۔

مغربی تاریخدانوں کا بیان ہے کہ یہ قبر اصفہان کی ایک لڑکی شرف النساء کی ہے۔ جس کا بعد میں انارکلی نام پڑ گیا۔ ان تاریخدانوں کے نزدیک جہانگیر اپنے عالمِ شہزادگی میں اس لڑکی پر عاشق ہو گیا تھا۔ اکبر اس بات کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اس لئے اس نے انصاف کو بالائے طاق رکھ کر اس لڑکی کو زندہ دیوار میں چنوا دیا اور اس طرح ایک معصوم جان کو اپنی سیاسی مصلحتوں پر قربان کر دیا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ شرف النساء غزنی کے بازار میں ایک کنیز کی حیثیت سے فروخت ہو رہی تھی کہ راجہ مان سنگھ نے اسے خرید لیا اور دیگر کنیزوں کے ہمراہ بادشاہ کی خدمت میں روانہ کر دیا۔ بادشاہ نے کسی محفل نے اسے انارکلی سے تشبیہ دی جو کلام الملوک ملوک الکلام کے مصداق اس کا نام ہی بن گئی اور شرف النساء کی قدر ہونے لگی۔

شہزادہ سلیم ان دنوں جوان ہو رہا تھا۔ اس کی نظر انارکلی پر پڑی تو جم کر رہ گئی اور اس داستان نے اسقدر طول پکڑا کہ سلیم نے اس کو تخت پر بیٹھنے کے بعد اپنی ملکہ بنانے کا وعدہ کر لیا۔

ایک مرتبہ انارکلی بادشاہ کی محفل میں رقص کر رہی تھی کہ سلیم اور اس کے درمیان اشارہ بازی ہونے لگی۔ بادشاہ کو یہ بات ناگوار گزری اور یوں بھی وہ نہیں چاہتا تھا کہ ہندوستان کا ہونے والا حکمران ایک معمولی عورت کے عشق میں پڑ کر اپنے دماغی توازن کو کھو بیٹھے لہٰذا اس نے راجہ بیربل کو اس واقعہ کی تحقیقات پر مامور کیا اور اس نے تحقیقات کے بعد حکم دیا کہ انارکلی کو زندہ دیوار میں چن دیا جائے۔

اکبر کی وفات کے بعد جہانگیر تخت پر بیٹھا اور اس کی نورجہاں سے شادی بھی ہو گئی۔ لیکن وہ انارکلی کی یاد کو فراموش نہ کر سکا۔ اپنی محبت کا اظہار کرنے کے لئے اس نے انارکلی کا شاندار مقبرہ بنوا دیا۔

کافی عرصہ تک لوگ اس داستان کو واقعی خیال کرتے رہے۔ لیکن اب مورخین نے تحقیقات کر کے اس کہانی کا تار و پود بکھیر دیا ہے اور ثابت کر دیا ہے کہ مغربی مصنفوں نے صرف اکبر اعظم کو بدنام کرنے کی غرض سے یہ واقعہ گھڑ لیا ہے۔ اس کی تکذیب کے لئے صرف یہی امر کافی ہے کہ جس سال سے اس واقعہ کا تعلق بتایا جاتا ہے۔ اُس سال اکبر لاہور میں تھا ہی نہیں۔ پھر سوال یہ ہے کہ اگر انارکلی کی داستان محض ایک گپ ہے۔ تو وہ قبر ہے کس کی۔ اس سوال کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ قبر زین خاں کوکہ کی لڑکی کی ہے جس کا سال وفات وہی ہے جو قبر کے کتبہ پر لکھا ہوا ہے۔

گوپال متل

شعر

وہ لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھو دئیے
ڈھونڈا تھا آسماں نے جنہیں خاک چھان کے

اخبارِ علمیّہ و تعلیمیّہ

حال ہی میں جموں اور کشمیر کی تعلیمی رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ اِس سے پتہ چلتا ہے کہ جہاں پچھلے سال مختلف سکولوں میں مُسلم طلبا کی تعداد ۴۶۹۲۵ تھی۔ وہاں اِس سال یہ تعداد ۴۹۷۱۳ تک پہنچ گئی۔ لڑکوں کے سکولوں کی تعداد ۱۱۰۸ تھی اور طلبا کی ۷۸۳۰۱۔ لڑکیوں کے سکولوں کی تعداد ۱۹۴ تھی اور طالبات کی تعداد ۱۲۳۷۵۔ پچھلے سال قابل تدریس آبادی کا صرف ۷ر۲۶ فیصدی حِصّہ سکول جاتا تھا۔ لیکن اس سال ۳۰ فیصدی حِصّہ تعلیم حاصِل کرنے لگا۔ مختلف مکتبوں اور پاٹ شالاؤں کو ۱۰۹۰۰۰ روپے بطور امداد دے گئے۔ لڑکوں کی تعلیم پر کل ۱۲۹۹۰۰۰ روپے خرچ ہوئے اور لڑکیوں کی تعلیم پر ۲۷۷۰۰۰ روپے ✤

دونو کالجوں میں تعلیم پانے والا طلبا کی تعداد ۱۴۷۹ تھی جن میں ۹۴۲ ہندو، ۴۴۷ مسلم، ۵۹ سِکھ اور ۳۱ دیگر اقوام کے تھے۔ سرینگر کالج میں مُسلم طلبا کو ۲۴۵۷ روپے کے خاص وضائف دئے گئے اور جموں میں ۱۹۰۶ روپے کے۔ پسماندہ اقوام کو بتدریج ۲۲۰ اور ۲۲۴ روپے کے وضائف دئے گئے ✤

لڑکیوں کی تعلیم کی طرف خاص توجہ دی گئی۔ اور اس مقصد کے لئے ۲۲۲۳۸ روپے بطور وضائف تقسیم کئے گئے۔ اِس کے علاوہ ریاست نے ۸ صنعتی سکولوں کے اخراجات بھی برداشت کئے۔ ان سکولوں میں طلبا کی تعداد ۴۵۸ تھی۔ اور ان پر کل ۵۱۲۲۷ خرچ ہوئے ✤

پانچ سال ہوئے کہ جامع ازہر کے علما کا ایک وفد چین گیا تھا۔ اِس وفد کا مقصد چین میں عربی زبان کی تعلیم اور اسلامی شریعت کے احیاء و ترویج کی کوشش کرنا تھا ✤

اِس وفد کے دو اراکین جو جامعہ ازہر کے نہایت ممتاز فارغ التحصیل علما میں شمار ہوتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں پانچ سال کے بعد واپس آئے ہیں۔ نامہ نگار البلاغ نے ان دونوں سے ملاقات کی۔ جس کے دوران میں انہوں نے فرمایا کہ چین میں ہمارا کام قدیم دار الحکومت پیکن کے مدرسہ دار العلوم میں عربی زبان اور اسلامی شریعت کی تعلیم و تدریس تھا۔ اِس مقصد کو وفد نے اِس خوبی سے انجام دِیا ہے کہ مدرسہ دار العلوم کے فارغ التحصل طلبا کا علمی مرتبہ کسی حالت میں مصر کے گریجویٹوں سے کم نہیں ہوتا۔ جب اس مدرسہ کے طلبا فارغ ہو کر نکلتے ہیں تو حکومت ان کے علم و فضل کے مطابق کام مہیا کر دیتی ہے۔ مصری وفد سے پڑھ کر ابتک صرف تین جماعتیں نکلیں ہیں۔ جن میں کل ۴۵ طلبا شریک تھے یہ سب کے سب اچھی طرح عربی لِکھنا اور پڑھنا جانتے ہیں۔ اور علم حدیث، علم کلام اور علم تفسیر میں خاصا درک رکھتے ہیں ✤

جاپان میں تعلیمی فلموں میں غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ ٹوکیو کی میونسپل کمیٹی نے آئندہ بجٹ میں ۳۴ ہزار روپے کی گنجائش اس مقصد کے لئے نکالی ہے کہ اس روپیہ سے ایسی متکلم فلمیں بنائی جائیں جو بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے مفید ہو سکیں۔ ان فلموں کو ٹوکیو میونسپل کمیٹی کے پرائمری سکولوں میں دکھایا جائے گا ✤

کچھ عرصہ سے اڑیسہ کے لوگ اس امر کے لئے پُر زور ایجی ٹیشن کر رہے تھے۔ کہ ان کے لئے ایک الگ یونیورسٹی بنائی جائے۔ لیکن مالی مشکلات کے باعث اس مطالبہ کو عملی جامہ نہ پہنایا جا سکا۔ اب یہ تجویز زیر غور ہے کہ اڑیسہ کے سکولوں اور کالجوں کا کلکتہ یونیورسٹی سے الحاق کر دِیا جائے اور کلکتہ کے میڈیکل کالج اور بنگالی انجنیئرنگ کالج میں بھی اڑیسہ کے طلبا کی ایک مخصوص تعداد لی جایا کرے۔ اُمید ہے کہ یہ تجویز بہت جلد عملی صُورت اختیار کر جائے گی ✤

واردھا میں مہاتما گاندھی کی تحریک پر جو آل اِنڈیا تعلیمی کانفرنس ہوئی تھی۔ اس نے ایک نصاب کمیٹی مقرر کی تھی۔ پچھلے دنوں اس کمیٹی کے دو اجلاس ڈاکٹر ذاکر حسین پروفیسر جامعہ ملیہ کی زیر صدارت ہوئے۔

کافی بحث مباحثے کے بعد کمیٹی نے پرائمری تعلیم کے بنیادی اصول طے کرلئے اور سات سالہ پرائمری تعلیم کی ایک سکیم مرتب کر لی اور ساتھ ہی پرائمری استادوں کی ٹریننگ کے لئے بھی کانفرنس کے پاس کردہ ریزولیشن کے تحت میں اپنی تجاویز تیار کرلیں۔ اب ان تجاویز کے متعلق مہاتما گاندھی سے مشورہ کیا جائے گا۔ جس کے بعد کمیٹی اپنی رپورٹ شائع کر دے گی ÷

دہلی میں ایک فارسٹری کانفرنس منعقد ہو رہی ہے۔ اس کانفرنس میں جو مسائل زیر بحث ہونگے۔ ان میں ایک اہم مسئلہ دہرہ دون فارسٹ کالج کے دوبارہ اجرا اور اس کو مزید ترقی اور وسعت دینے کا ہے۔ کوشش کی جارہی ہے کہ اس کے لئے صوبائی حکومتوں کی امداد حاصل کی جائے۔ تجویز یہ ہے کہ تمام صوبوں کے طلبا جنگلات کی تعلیم کیلئے دہرہ دون بھیجیں جائیں اور سبھی حکومتیں ادارہ کے مصارف کی حصہ دار بنیں ÷

فی الحال اس ادارہ کے لئے مزید عمارتوں کی ضرورت نہ ہوگی۔ بلکہ فارسٹ کالج کی پرانی عمارتوں سے ہی کام لیا جائے گا ÷

پچھلے دنوں بنارس ہندو یونیورسٹی کی کورٹ کا ۲۱ واں اجلاس ہوا جس کی صدارت یونیورسٹی کے وائس چانسلر پنڈت مدن موہن مالویہ نے کی۔ آپ نے ایک مختصر سی تقریر میں یونیورسٹی کی ترقیات پر تبصرہ فرمایا اور میزانیہ پیش کیا ÷

فنڈ کی کمی کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ نے یونیورسٹی کی مزید ترقی کے لئے دس کروڑ روپیہ کی اپیل کی اور اعلان کیا کہ عنقریب بمبئی کے ایک ٹرسٹ اور ریاست پنّا سے ایک ایک لاکھ کی رقمیں ملنے والی ہیں ÷

اس کے بعد مندرجہ ذیل انتخاب عمل میں آیا۔

ہز ہائینس مہاراجہ بیکانیر (چانسلر تین سال کے لئے) مہاراجہ جودھ پور اور مہاراجہ بنارس (پرو وائس چانسلر ایک سال کے لئے) پنڈت مدن موہن مالویہ (وائس چانسلر تین سال کے لئے)

حکومت صوبہ سرحد اس امر پر غور کر رہی ہے کہ صوبہ میں ابتدائی تعلیم کو مفت اور لازمی کر دیا جائے۔ چنانچہ وزیر تعلیم نے تجویز پیش کی ہے کہ ہر اس گاؤں میں ایک سکول جاری کر دیا جائے۔ جس میں پانچسو سے زیادہ گھر ہوں اور وہاں سے تین میل کے فاصلہ تک کوئی سکول نہ ہو۔ سکول کی عمارت کے اخراجات گاؤں والوں کو برداشت کرنے ہونگے ÷

اے افلاس

رحم اے افلاس اب تاب و تواں مفقود ہیں — ہند کے اجڑے چمن میں نزہتیں نابود ہیں

تیرے دم سے کتنے معصوموں کی لاشیں بے کفن — جاں بلب ہیں بھوک کے آزار سے سیمیں بدن

روندی جاتی ہیں ترے پاؤں تلے خودداریاں — تیرے سائے میں ہوئیں پل کر جواں غداریاں

تو نے اکسایا سروں کو جبہ سائی کیلئے — حسن کو مجبور کر ڈالا گدائی کے لئے

لے کے آتا ہے غریبوں کے لئے تیرا شباب — آہ، نالہ، ٹیس، آنسو، چیخ، سسکی، اضطراب

تیرے ہاتھوں بک رہی ہیں عصمتیں بازار میں — صورِ اسرافیل کی تلخی تری گفتار میں

آگ کے بادل برستے ہیں تری آواز سے — سوز کے چشمے ابلتے ہیں دہانِ ساز سے

تیری ہر جنبش سے پیدا ظلم کا طوفان ہے — بینواؤں کے لئے تو موت کا سامان ہے

آہ اے افلاس تو نے کر دیا ایسا نڈھال
ہو رہی ہے ہندیوں پر زندگانی تنگ و بال

الطاف مشہدی

سرت چندر چٹرجی

سرت چٹرجی! کتنے اردو داں اس نام سے واقف ہیں؟ خود بنگال میں بہت سے لوگ اس کی پرائیویٹ زندگی کا حال سوائے اس حقیقت کے اور کچھ نہیں جانتے کہ وہ منکسر المزاج اور بادی النظر میں ایک کم رُو سا انسان ہے۔ جس پر کبھی ایک مشہور اور ممتاز مصنف کا دھوکا نہیں ہوتا۔ مگر "پردۂ راز" میں رہنے کے باوجود بھی یہ شخص بنگال کا سب سے زیادہ ہردلعزیز ناول نگار ہے۔

اس مختصر سے مضمون میں اس کے سوانح حیات سے قطع نظر کر کے صرف اس کے آرٹ پر کچھ روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کی زندگی کے واقعات کا تذکرہ کرنے سے دیدہ و دانستہ احتراز کیا گیا ہے کیونکہ اس کی زندگی پر ایک پُر اسرار تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ جس میں سے ہماری متجسس نگاہیں پار نہیں ہو سکتیں۔ سرت کی حیا چونکہ اُسے منصۂ شہود پر آنے سے باز رکھتی ہے۔ اس لئے یہاں بھی صرف اُس کے فن سے بحث کی جاتی ہے۔

اس کی سب سے پہلی تصنیف "چندرا ہین"، "جمنا" نامی ایک ماہوار رسالہ میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے شائع ہوتے ہی لوگوں کو معلوم ہو گیا تھا۔ کہ ناول نگاری کے میدان میں ایک نیا شہسوار اُترا ہے۔ ایک ایسا ناول نویس جو سوسائٹی کے اُن تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے جن کا تذکرہ پہلے صریحاً ممنوع اور معیوب خیال کیا جاتا تھا!

اس وقت سے اس کے ناول اور مختصر افسانے برابر شائع ہو رہے ہیں۔

اس لئے "سماجی ناولوں" کی "پہنائی" اور بنگالی ناولوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے۔ اس کی وسعتِ نظر لامحدود ہے، اس کی فضائے تخیل بے پایاں۔ وہ پہلا شخص ہے جو اپنے ناولوں میں ان "افتادگانِ قسمت" کا تذکرہ کرتا ہے جن کو ہماری بے رحم سوسائٹی "ارذل ترین خلائق" کے نام سے یاد کرتی ہے۔ یہ لوگ اس کے قصوں میں صرف "زیبِ داستان" کیلئے داخل نہیں کئے جاتے۔ دراصل وہ ہی سرت کے ناولوں کی جان ہیں۔ وہ نہایت شفقت اور ہمدردی سے ان کی تصویریں کھینچتا ہے، ان کے خدوخال کو نمایاں کرتا ہے اور اپنے سحرکار قلم کی مدد سے ان کو حیاتِ جاودانی بخشتا ہے۔ سوسائٹی کے بلند ترین طبقہ سے لیکر اسفل ترین طبقہ تک کے لوگ اس کے "پردۂ تصویر" پر نظر آتے ہیں۔ اس کے کردار حد سے زیادہ متنوع اور اصل کے مطابق ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا اس کے ناول ایک قدِآدم آئینہ ہیں جس میں سوسائٹی کا عکس ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیا گیا ہے۔

بنگالی ناول میں "ریل ازم" (اصلیت) سب [illegible] ہی نے داخل کیا۔ اس سے پہلے بنگالی ناول زیادہ تر تاریخی ہوتے تھے سماجی نہیں۔ ان میں تخیل کی کارفرمائی زیادہ ہوتی تھی اور واقعیت یا اصلیت کا لحاظ بالکل نہیں کیا جاتا تھا۔ سرت نے سوسائٹی کی ہوبہو تصویر کھینچنے میں وہ ملکہ حاصل کیا ہے کہ اس کے کمال کو "ادبی فوٹوگرافی" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، پھر اس کے بلیغ اشارات تو گویا سونے پر سہاگہ ہیں۔

مگر اُسکی "اصلیت نگاری" (Realism)[۱] اُس قسم کی کردہ "اصلیت نگاری" نہیں جس کو دورِ حاضرہ کے یورپین مصنفین نے اپنا شعار بنا رکھا ہے۔ اور جن کے خیال کے مطابق "خللِ دماغ" بھی ایک فن ہے، نہ وہ مسٹر جیمز جائس[۲] کی طرح کا فنکار ہے، جو "اصلیت نگاری" کا عذر پیش کر کے بیہودہ گوئی کیا کرتا

---

۱ Realism

۲ Mr. James Joyce

نوٹ:- "Ulysses" جیمز جائس کا شاہکار مانا جاتا ہے۔ بڑے بڑے اہلِ دماغ اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ مگر سچ پوچھئے تو وہ ایک نہایت غیر دلچسپ کتاب ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ اوریجنل ہے۔ مگر یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ "اوریجنل زیادہ ہے اور آرٹسٹک کم"۔ سوائے اوریجنلٹی اور "کوفت" کے اس میں اور کچھ نہیں۔

ہے ۔ وُہ تو زندگی کا مطالعہ کرتا ہے ۔ اَور جس حالت کا مشاہدہ کرتا ہے ۔ اِس کی تصویر یہ الفاظ میں پیش کرتا ہے ۔ کہیں کہیں تو اس کا آرٹ میکسیم گورکی[1] کی یاد تازہ کر دیتا ہے ۔ فرق صرف اتنا باقی رہ جاتا ہے کہ سَرت کے کردار کیفیتِ شعری سے زیادہ مملو اَور بہ حیثیت اِنسان ہونے کے زیادہ کامل ہوتے ہیں ۔

اِس کا سب سے بڑا مایۂ کمال اُس کی "خصائص نگاری" (Characterisation) ہے اور اس فن میں کوئی دُوسرا بنگالی ("بنگالی کیوں کہیئے ؛ ہندوستانی") ناول نگار اُس سے ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا ۔

اُوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ اس کے کردار حد درجہ متنوع ہوتے ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی اصل نگاری ہی اس تنوع کا راز ہے — قدرت نے دو انسانوں کو یکساں پیدا نہیں کیا ۔ اس کے کردار پُرانے قصّوں اور کہانیوں کے اُن کٹھ پتلیوں جیسے افراد سے بالکل مختلف ہیں ۔ جن کا وجود صرف قصّہ گو یا قصّہ نویس کے ذہن ہی میں ہوتا ہے ۔ اَور جن کا خارجی دُنیا میں کہیں پتہ نہیں ملتا ۔ قصّہ گو یا نویس کی تخلیقی قوت اُن کو اپنے خیال کے مطابق صرف دو صفات — نیکی یا بدی — سے متصف کر دیتی ہے ۔ قصّہ میں جو شخص ایک بار نیک بنا کر پیش کر دیا گیا وہ ہمیشہ نیک ہی رہتا ہے ۔ اور بد کبھی اپنی فطرتِ زشت بدل نہیں سکتا ۔

سَرت نے زندگی، اس کے تلون اَور اس کے امکانات کا گہرا مطالعہ کیا ہے ۔ وہ جانتا ہے کہ اس دُنیا میں مثالی انسان ملنا ناممکن ہے ۔ یہاں کا قانون ہی "تغیر اَور تبدل" ہے یہاں کوئی چیز کبھی ایک حالت پر قائم نہیں رہتی ۔ زندگی جامد نہیں بلکہ متحرک ہے اَور ہر لحظہ نئے نئے رنگ بدلتی رہتی ہے ۔ نیک و بد جانچنے کا معیار بھی انفرادی ہے جو ہر شخص اَور ہر زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتا ہے ۔

سَرت کے کردار جیتے جاگتے انسان ہوتے ہیں — گوشت و پوست سے بنے ہوئے اِنسان — جن کی رگوں میں گرم گرم خون دوڑتا ہوتا ہے اَور جن کے پہلوؤں میں تڑپتے ہوئے دِل ہوتے ہیں ۔ وُہ ان پُرانے قصّوں اور ناولوں کی "خیالی مخلوق" سے بالکل مختلف ہوتے ہیں ۔ وُہ ہم کو اجنبی اور انوکھے نہیں معلوم ہوتے ۔ کیونکہ ہم اپنی روز مرّہ کی زندگی میں اُن سے اکثر دو چار ہوتے رہتے ہیں ۔ سَرت چیٹرجی ہم کو اُن کا نظارہ قریب سے کراتا ہے ۔ وُہ صرف ان کے خدوخال ہی پیش نہیں کرتا بلکہ ان کے خیالات اور احساسات، ان کی حسرتیں اور ارمان ان کی اُمیدیں اور خطرات، ان کی خوبیاں اور خامیاں — سب ہمارے سامنے پیش کر دیتا ہے ۔ نیک و بد کی تقسیم اِسے نہیں آتی ۔ وُہ جانتا ہے کہ نیکی اَور بدی کی طاقتیں زندگی کا جُزو لاینفک ہیں ۔ اَور علیحدہ علیحدہ اُن کا وجود ناممکن ہے ۔ ہر شخص کے اندر یزداں اور اہرمن دونو موجود ہوتے ہیں ، گو ہر شخص میں ان کی طاقت اور عظمت کا مظاہرہ یکساں طور پر نہیں ہوتا ۔ اَور یہی سبب ہے ۔ کہ ہر شخص دُوسرے سے مختلف ہوتا ہے ۔

اس کے ناول مزاح لطیف اور خوش طبعی کے بہترین نمونے پیش کرتے ہیں ۔ اس کی شروع شروع کی تصانیف میں یہ خوش طبعی بذلہ سنجی کی شکل میں نظر آتی ہے ۔ ہمیں بے اختیار اناطول فرانس[2] یاد آ جاتا ہے ۔ وہی آب و تاب موجود ہے، مگر اس تلخی سے معرا جو "پنگوئن آئی لینڈ"[3] میں پائی جاتی ہے ۔ چیٹرجی انسانوں کی حماقتوں اَور لغزشوں کا مشاہدہ کرتا ہے ، سوسائٹی کی تباہ کُن رسمیں اُس کی توجہ اپنی طرف منعطف کرتی ہیں ۔ بے رحم قسمت کی نت نئی جور و جفا ، انسان کے اندر والی متضاد اور باہم برسرِ پیکار طاقتوں کی ستم ظریفیاں اس کی حساس طبیعت پر کبھی نہ مٹنے والے نقوش چھوڑ جاتی ہیں ۔ مگر وُہ ان سب کا تذکرہ ایک ہمدردانہ تبسم کے ساتھ کرتا ہے — شاید اس لئے کہ وُہ خود بھی اپنے کسی حد تک بے عنوان دورِ شباب میں، ان سب کا شکار رہ چکا ہے ۔ اَور ہم کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے ۔ ہماری کمزوریوں اور لغزشوں پر خفگی کے بجائے اِس کے پاس یا تو ایک معنی خیز مگر طفلانہ تبسم ہوتا ہے یا ایک دبی ہوئی آہ جو باوجود کوشش ضبط کے اس کے مُنہ سے نکل جاتی ہے ۔ مگر اِس کا یہ عجیب و غریب تبسم جو بیک وقت ہمدردی اور تاسّف کا مجموعہ ہوتا ہے اس گھنٹی کی آواز سے مشابہ ہے ۔ جو طوفان سے پہلے بجائی جاتی ہے ۔

اِس کے ان ناولوں میں جو بعد کو لکھے گئے ہیں ۔ ہمیں وہ بے ساختہ ہنسی مفقود نظر آتی ہے ۔ گو اس پُرانی خوش مزاجی کا اثر کچھ کچھ باقی رہتا ہے ۔ مگر اب اس کا خندۂ زیرلب "زہرخند" ہو جاتا ہے ۔ اُس کی ہنسی "زبردستی کی

---

۱ Maxim Gorki.　۲ Anatole France.　۳ Penguine Island. اناطول فرانس کی ایک تصنیف کا نام ۔

ہنسی" بن جاتی ہے۔ اِس کے بھولے پن کی جگہ اب کسی اور چیز نے لے لی ہے جو زیادہ کرخت اَور تلخ ہے۔ اب اُس کی تصویریں اَور مرقعے اندوہگیں ہونے لگے ہیں۔ اس کے کردار دلی جوش سے گفتگو کرتے ہیں۔ مگر فضا میں سنجیدگی چھائی رہتی ہے۔ ہر چیز پر اب اندھیرا سا چھانے لگا ہے۔ زندگی بسر ہوتی ہے۔ دِن کٹ جاتے ہیں ...... مگر کس اُمید پر؟ "کسی اُمید پر نہیں"! وُہ خود ہی اپنے ناول "دیوداس"[1] میں اس کا جواب دیتا ہے، جو اس کی عظیم ترین ٹریجڈی (المیہ) ہے۔ "چوبی" میں کچھ اُمید کی جھلک نظر آتی ہے۔ "ازکشنیا" کا انجام ہنسی خوشی ہوتا ہے۔ "گرہ داہا"[2] (خانہ آتشیں) کا انجام موہوم رہتا ہے — یعنی ہم اِس کو اپنی مرضی اَور خیال کے مطابق جیسا چاہیں سمجھ سکتے ہیں — مگر "دیوداس؟" "دیوداس" اُمید سے سراسر خالی ہے۔ اس میں صرف دِل کی خلش ہے۔ اور آنسوؤں کی تلخی!

دیوداس جب اپنی "پارو" (پاربتی) کے گھر کے سامنے دم توڑتا ہوتا ہے تو اُس کے پاس ایک مُتنفس بھی نہیں ہوتا۔ جب صبح کو پارو کو اِس کی اِطلاع مِلتی ہے تو وہ پاگل ہو جاتی ہے ...... یہ ہے زندگی اَور اس کا اندازِ بے پروا۔

ہمیں زندگی کو پھُولوں کی سیج نہ سمجھنا چاہئے۔ گلہائے رنگ رنگ سے یہ خالی ہے۔ اس میں قدم قدم پر خار زار ہیں۔ "پھُول" — اگر زندگی میں پھُول ہو سکتے ہیں! — اُن نباتاتی پھُولوں سے بھی زیادہ عارضی ہوتے ہیں۔ جو ہماری دُنیا میں پائے جاتے ہیں۔ ہاں، کانٹے البتہ ہیں۔ جو ہمارے دِلوں میں ناسور ڈالتے رہتے ہیں۔ قِسمت رحم نا آشنا ہے۔ اَور ہم کمزور اور مجبور۔ ہم غلطیاں کرتے رہتے ہیں۔ اور حد سے زیادہ توقع رکھنے کے عادی ہیں .....

مگر اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ سرت چٹرجی میں کوئی ٹھوس فلسفہ ملنا دُشوار ہے اَور اس کے ناولوں میں کِسی ایک فلسفہ کی تلاش بھی حماقت کے مرادف ہے۔ وُہ تو شیکسپیئر[3] کی طرح "عام اور عالمگیر" ہے وُہ کوئی عقاید نہیں رکھتا۔ اس کے کردار محض کٹ پتلیاں نہیں۔ جن کے ذریعے کِسی فلسفہ کا اظہار کیا جا سکے۔ اس کے خیالات اور احساسات جگہ جگہ منتشر ہیں۔ مگر ان کے مجموعے سے کوئی ایک فلسفہ تیار نہیں کیا جا سکتا اس کے ہر کردار کا نقطۂ نظر نِرالا ہے۔ اَور خود اسی کردار کیلئے مخصوص ہے۔ سرت کے ناولوں میں "ہم خود اس کو کہیں نہیں پا سکتے۔" کہیں کہیں ہمیں دھوکا ہو جاتا ہے۔ اور ہم کہہ اُٹھتے ہیں: "یہاں، یہاں ہم نے تمہیں پکڑ لیا ہے۔" مگر نہیں، وُہ ہنستا ہے اور ہوا کی طرح ہماری گرفت سے آزاد ہو جاتا ہے۔ وُہ اس روشنی کی طرح جگہ جگہ بھاگا بھاگا پھرتا ہے۔ جو رات کو کسی قبرستان یا دلدل میں نظر آیا کرتی ہے۔ اَور جتنا زیادہ اس کا تعاقب کیا جائے اتنی ہی دور ہوتی جاتی ہے۔ ہم بھی سرت کا جگہ جگہ پیچھا کرتے ہیں۔ مگر باوجود اس امر کے کہ وُہ ہمیشہ ہمارے سامنے ہی رہتا ہے۔ ہم اُس سیماب وش ہستی کا کچھ حال نہیں جانتے۔

ہاں صرف اِتنا کہہ سکتے ہیں کہ اپنے آخری ناولوں میں وُہ پہلا فن کار اپنے شباب کی شوخی اَور ترنگ کھو بیٹھا ہے۔ خوش طبعی اب بھی کہیں کہیں — طویل وقفوں کے بعد — جھلک اُٹھتی ہے۔ مگر اب اِس کی روشنی دیرپا نہیں ہوتی۔ اس اعتبار سے بھی وُہ شیکسپیئر کا حریف ہے، جس کے اُوپر بھی فن کار کی حیثیت سے یہی مختلف دور گذرے تھے۔

اور شیکسپیئر ہی کی طرح اس کے تخلیق کئے ہوئے کردار بھی اپنے تنوع اَور رنگارنگی کے اعتبار سے آپ اپنی نظیر ہیں۔ اعلیٰ اور اسفل، سب ہی تو موجود ہیں — کہیں وہ بے فِکری سے گپ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کہیں محبّت کا دِلچسپ مگر خطرناک کھیل کھیلتے ہوئے، یا اپنے کسی نصب العین کا تعاقب کرتے ہوئے — سب اپنا اپنا غم غلط کرتے ہیں، اپنی اپنی فِکروں میں سرگرداں رہتے ہیں۔ اور اپنے اپنے مخصوص جذبوں کی پرورش کرتے ہیں — غرض سرت کی دُنیا اِتنی ہی دِلچسپ اَور آباد ہے

---

[1] اُردو دان طبقے پر "نیو تھیٹرز لمیٹڈ" (کلکتہ کی مشہور فلم کمپنی) نے "دیوداس" اَور "گرہ داہا" جیسے بے مثل ناولوں کو فلمی ڈراموں کی شکل میں پیش کر کے واقعی بہت بڑا احسان کیا ہے۔ اصغر حسین شور نے نہایت پاکیزہ اَور عام فہم زبان میں مکالمے لکھے ہیں۔ اَور جمنا اور سہگل نے دیوداس میں اداکاری کا حق ادا کر دیا ہے۔ ضرورت ہے کہ سرت کے ناول بھی اسی طرح ملک کے سامنے پیش کئے جائیں۔ [2] "گرہ داہا" کا نام "نیو تھیٹرز لمیٹڈ" نے بدل دیا ہے۔ اِس فلم کے آخری گیت کے ایک بول کی مناسبت سے اس کا نام "منزل" قرار دیا گیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ یہ لفظ نہایت بلیغ اشارات (Suggestions) کا حامل ہے۔ جمنا۔ پی۔ سی۔ بروا۔ اور پرتھوی راج ...... ان باکمال آرٹسٹوں کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے — ہندوستانی "گویا اور متحرک تصاویر" میں "منزل" ہر اعتبار سے درجۂ اوّل کی مستحق ہے۔ "عوام" شاید اس رائے سے اختلاف کریں، مگر عوام کی پسند کا کیا ٹھکانا۔ [3] Shakespeare.

جتنی خود زندگی! ہارڈی کی طرح اس نے بھی اپنے نسائی کردار زیادہ توجہ اور خوبصورتی سے پیش کئے ہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس کے یہاں عورتیں مردوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ عظیم الشان ہیں —— اچلا، ساوتری، کرن موئی، پاربتی، چندرمکھی —— یہ سب کی سب آپ اپنی نظیر ہیں۔ ہندوستانی ادب ابھی تک اُن سے روشناس نہ تھا۔ اور اب کہ پہلی بار یہ سب ہماری نگاہ کے سامنے بے نقاب ہو کر آئی ہیں تو ان کے کمالات اور روحانی اور جسمانی صفات کے اعتراف میں ہم سوائے "حیرت" کے اور کوئی خراج پیش نہیں کر سکتے! افسوس کا مقام ہے کہ اس کی جس تصنیف کو گورنمنٹ نے ضبط کر لیا وہی اس کا شاہکار تھی۔

اس کے شروع شروع کے کچھ افسانوں اور ناولوں میں ہمیں ایک ایسی دُنیا نظر آتی ہے۔ جو ہماری دُنیا سے مختلف ہے۔ وہاں ہر چیز پر "خواب" کا سا سماں چھایا رہتا ہے —— مثلاً "چوبی" جس میں برما کے ایک مصوّر اور اُس کی معشوقہ کی زندگی پیش کی گئی ہے۔ عام طور پر اس قسم کی چیز سرت سے منسوب کرتے ہوئے تامل ہوتا ہے۔ کیونکہ ہمارے نزدیک تو وہ "مصوّرِ حقیقت" ہے نہ کہ "مصوّرِ خواب" مگر اس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سرت دوسری اصنافِ ادب میں بھی کامیاب ہو سکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود اُس پر اِس [illegible] خیالی انشا پردازی بے سُود ہے۔ اُس کے حصّہ میں تو "زندگی کی عکاسی" ہی آئی ہے۔ اور وُہ اسی کے لئے موزوں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے اپنا طرزِ تحریر بدل دیا اور الفاظ کے پیکریں جیتے جاگتے انسانوں کو پیش کرنے کے لئے اُس نے وہ اسلوب نگارش اختیار کر لیا جس میں ہر لفظ حقیقت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

سرت چندر کی زبان میں ایک سحر آمیز خوبصورتی پائی جاتی ہے۔ اس کے سوائے کسی بنگالی مصنف نے کبھی ایسی پیاری اور بلیغ نثر نہیں لکھی —— کفایت شعاری —— الفاظ کی کفایت شعاری —— سدا سے اس کا شعار رہا ہے۔ اس کو پڑھ کر سنج (Synge) کی نثر یاد آجاتی ہے، گو سنج کے معائب بھی موجود ہیں یعنی حد سے زیادہ پُرمغزی اور اختصار! ان کی نثر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بعض اوقات معانی سے اتنے زیادہ گرانبار ہو جاتے ہیں کہ اُن کا سمجھنا دُشوار ہو جاتا ہے اور اُس کی پیچدار عبارت اُس "خم کاکل" کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ جس کی "آرائش" کو دیکھ کر ایک تخیّل پرست "اندیشہ ہائے دُور دراز" میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ یہ طرزِ انشا نامانوس سہی مگر حد درجہ نشاط انگیز اور حسین ہوتی ہے۔ بنکم اور ٹیگور کے بعد اگر کوئی اور بنگالی طرزِ بیان کا مالک ہونے کا دعوےٰ کر سکتا ہے۔ تو وُہ سرت ہی ہے۔

جوزف کونراڈ کے علاوہ کسی اور جگہ ایک طوفان کا بیان اتنا موثر نہیں ملتا جتنا "چہ ترا ہن" میں!

اس کی زبان میں ایک دقت اور بھی ہے۔ اس کا ترجمہ نہیں کیا جا سکتا۔ ایجازِ بیان ایسا ہے کہ اگر ترجمہ کیا بھی جائے تو اصل کی خوبی باقی نہیں رہتی۔ وُہ ایک لفظ میں ایک خیال ادا کر جاتا ہے۔ اس کا ایک جملہ ایک کردار کے بیان کے لئے کافی ہوتا ہے۔ ترجمہ میں سرت کی یہ امتیازی شان قائم نہیں رکھی جا سکتی۔ اگر کوئی "دل والا" اس کے ناولوں کا ترجمہ کر دے تو بنگال کی اصلی رُوح دُنیا پر ظاہر ہو جائیگی۔ تو ابھی تک کوئی دُوسرا بنگالی مصنّف صحیح طریقے پر پیش نہیں ہو سکا ہے۔

سرت کی دُور رس نگاہ انسانی کیریکٹر کی تہ تک پہنچتی ہے۔ اس کی قادر الکلامی باعثِ رشک ہے۔ وُہ نہایت بے باکی سے ان گورکھ دھندوں اور معمّوں کو دُنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ جن میں نوعِ انسانی ہمیشہ سے اُلجھی رہے گی۔ لاریب، سرت چیٹرجی کا شمار دُنیا کے عظیم ترین اور سب سے زیادہ اوریجنل ناول نگاروں میں ہو سکتا ہے۔

"ساقی" دہلی

ل Thomas. Hardy

جلوہ زار

شاہکار کی گزشتہ اشاعت میں ہم نے مسٹر اناجی راؤ کے ایک مضمون کا مخلص شائع کیا تھا جس میں مضمون نگار نے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ دورِ حاضر کی تمام سائنٹفک ترقیات ہند قدیم میں موجود تھیں۔ اب حال ہی میں ایک صاحب مسٹر بی۔ جی مہاتمے نے بمبئی کرانیکل میں اس مضمون کا جواب لکھا ہے۔ جس میں مسٹر راؤ کے نظریہ کی تکذیب کی گئی ہے۔

مسٹر مہاتمے کا خیال ہے کہ مسٹر اناجی راؤ نے اس بات کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے کہ موجودہ سائینٹفک ترقیات کسی انفرادی کوشش کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ صدیوں کی متحدہ و متفقہ کوششوں کا ماحصل ہیں۔ جب تک فطرت کے تمام راز ہائے سربستہ چشم انسانی پر منکشف نہ ہو جائیں اُس وقت تک یہ امر کس طرح ممکن ہے۔ کہ ہم ریڈیو، ہوائی جہاز اور ٹیلی وژن ایجاد کر لیں۔ کیا مسٹر اناجی یہ بات ثابت کر سکتے ہیں کہ پراچین ہند کے لوگ ان تمام سائینٹفک نظریوں سے واقف تھے، جو اس زمانہ کے سائنسدانوں نے قائم کئے ہیں۔ ان لوگوں کو تو تپسیا ہی سے فرصت نہ ملتی تھی، وہ اسرارِ فطرت کی نقاب کشائی کے لئے کہاں سے وقت نکالتے۔

آکاش بانی کو ریڈیو قرار دینا تو آسان ہے مگر اس امر کی وضاحت کرنا ذرا دشوار ہے کہ رشیوں نے اس ایجاد کو کنس اور دیگر ہندوستانیوں سے کس طرح مخفی رکھا کہ وہ اس کو آکاش بانی ہی سمجھتے رہے۔

پھر سب سے اہم بات یہ ہے کہ ریڈیو اور ٹیلی وژن کے لئے (Transmitting Station) نہایت ضروری ہے۔ مگر رامائن یا مہابھارت میں کہیں اس کا تذکرہ موجود نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ محض شاعرانہ نکتہ آرائیوں سے یہ نتیجہ نکال لینا کہ جن چیزوں کا تذکرہ موجود ہے وہ واقعی موجود ہونگی۔ صرف تخیل کی... بے اعتدالی ہے۔ موجودہ دور میں مسٹر ایچ جی ویلز اپنی تصانیف میں نہایت محیر العقول باتوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ مثلاً ان کے ایک ناول میں ایک غیر مرئی انسان کا تذکرہ موجود ہے۔ کیا ہم اس سے یہ نتیجہ نکالیں کہ بیسویں صدی میں واقعی غیر مرئی انسان ہیں۔ اگر یہ نہیں تو راماین کے حوالہ کو ہم ہوائی جہاز کس طرح قرار دے سکتے ہیں؟

مولانا عبدالاحد شرف الدین پوری نے رسالہ "ندیم" گیا میں اصلاح کے عنوان سے چند مضامین لکھے تھے۔ جن میں انہوں نے چند الفاظ کے غلط استعمال کی طرف اہلِ قلم کی توجہ مبذول کرائی تھی۔ اسی دوران میں انہوں نے تحریر کیا تھا کہ لفظ مشکور کا استعمال بمعنی شکر گزار غلط ہے۔

سید رضا قاسم مختار نے تحقیق اصلاح کے عنوان سے "کلیم" میں اس اعتراض کا جواب لکھا ہے۔ مضمون نگار اس امر کو تسلیم کرتا ہے کہ عربی میں لفظ مشکور پسندیدہ ستودہ اور شکر کیا گیا کے معنی میں ہی مستعمل ہے لیکن اس کا دعویٰ ہے کہ ایک زبان میں دوسری زبان کا کوئی لفظ جس تلفظ املا ترکیب کے ساتھ اور جس معنی میں رائج ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اس کا استعمال جائز سمجھا جاتا ہے۔ اس نظریہ کی حمایت میں مضمون نگار نے متعدد مثالیں دی ہیں۔ مثلاً عربی میں تواضع عاجزی اور فروتنی کے معنی میں آتا ہے، لیکن اردو میں دعوت مدارات مہمان نوازی اور ضیافت کے معنی میں مستعمل ہے۔ قارورہ عربی میں شیشے کے معنی میں مستعمل ہے، لیکن اردو میں کسی اور معنی میں۔ کیا ہمارے روزمرہ کو غلط ٹھہرا کر ان الفاظ کو ان کے اصل معنی میں استعمال کرنا جائز ہوگا۔ مضمون نگار اس سوال کا جواب نفی میں دیتا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ یہ الفاظ اپنے نئے معنی میں عربی زبان کے لفظ نہیں رہے۔ بلکہ اردو بن گئے ہیں۔ اس لئے ان کے غلط اور صحیح ہونے کا فیصلہ اردو روزمرہ کی رو سے ہی ہونا چاہیئے۔

رسالہ عصمت دہلی میں "چین میں تحریک نسواں" کے عنوان سے ایک پُر از معلومات مضمون شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں بتایا گیا ہے کہ گو تحریک نسواں چین میں صرف تیس سال پیشتر شروع ہوئی تھی۔ مگر اس مختصر عرصے میں ہی اس نے کامیابی کے تمام مدارج طے کر لئے ہیں۔ اس مختصر سے عرصے میں ہی اس تحریک نے دنیا کے سامنے تین ایسی عورتیں پیش کی ہیں جن پر ہر ملک و قوم کو ناز ہو سکتا ہے۔ یعنی ڈاکٹر میری چیانگ مادام سن یات سن اور مادام چیانگ کے شک جو تاریخ میں غرق

میں پہلی خاتون ہیں جنہیں اپنے ملک کی جنگی کونسل کا ممبر بننے کا رتبہ حاصل ہوا ہے۔

آج سے تیس سال پیشتر چینی عورت ایک عضوِ معطل سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی۔ چھوٹے چھوٹے موٹے اور بھدّے پاؤں خاندانی شرافت کا نشان سمجھے جاتے تھے۔ اس کا کام صرف گھر کا کام کرنا اور بچوں کی پرورش کرنا تھا۔ لیکن آج گھر میں بیٹھنے والی مجبور و معذور عورت کی بجائے چست و چالاک چینی عورت نظر آتی ہیں۔ جو دکان، دفتر، کارخانوں اور بنکوں میں کام کرتی ہے۔ جو بیرسٹر، ڈاکٹر اور اخبار نویس ہے۔ وہ موٹر خود چلاتی ہے۔ تقریریں کرتی ہے اور خیراتی کاموں اور کھیلوں میں مشرقی مردوں سے بھی بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتی ہے۔ آج اس کا ملک مصیبت میں مبتلا ہے اور ممکن ہے کہ اس ابتلا کا نتیجہ غلامی بھی ہو، لیکن جہاں تک تحریک نسواں کا تعلق ہے وہ ہر حالت میں جاری رہے گی۔

رسالہ آوازِ نسواں میں سیتا دیوی صاحبہ کا ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ جس میں جہیز کی رسم کے نقائص بیان کرکے اسے بند کر دینے کا مشورہ دیا گیا ہے۔

خاتون محترم کے نزدیک اِس رسم قبیح نے لڑکیوں کے ورثا کو [illegible] مصیبت [illegible] کا نتیجہ تھا کہ پُرانے زمانے میں والدین اپنی بچیوں کو پیدا ہوتے ہی ہلاک کر دیتے تھے۔ اب یہ رسم تو قانوناً بند ہو گئی ہے۔ لیکن جہیز کی مصیبت کی وجہ سے اب بھی بہت سی لڑکیاں زندہ درگور ہو رہی ہیں۔ پھر ستم بالائے ستم یہ ہے کہ بعض لڑکے بہت سا روپیہ لے کر منگنی تو کر لیتے ہیں۔ مگر بعد میں شادی سے انکار کر دیتے ہیں۔ بعض بدنیت لڑکے ایسے بھی ہیں۔ جو کمزور اور مریض لڑکیوں سے صرف اس وجہ سے شادی کر لیتے ہیں کہ ان کے والدین امیر ہیں لیکن شادی کے بعد جب جہیز وصول ہو چکتا ہے۔ تو غریب لڑکی کو نظر انداز کرکے دُوسری شادی رچا لیتے ہیں۔

مقالہ نگار قانون کے نزدیک جہیز کی وجہ سے شادی لڑکیوں کو سازو سامان سے آراستہ کرکے مقتل میں بھیج دینے کے مترادف ہو گئی ہے۔ ہماری لڑکیاں ہر حالت میں مبتلائے مصیبت رہتی ہیں۔ اور انہیں تعلیم بھی یہی دی جاتی ہے۔ کہ وہ بلاچون و چرا ان مظالم کو برداشت کریں شادی سے پہلے ان کو والدین کے مظالم برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ اور شادی کے بعد حریص شوہر کے۔

مقالہ نگار کے نزدیک اس صورت حالات کا واحد علاج یہی ہے کہ مرکزی مجلس قانون ساز میں ایک ایسا مسودۂ قانون پیش کیا جائے جس کی رو سے جہیز کا روپیہ صرف لڑکی کی ملکیت قرار دے دیا جائے۔ لڑکے والوں کا اس پر کوئی حق نہ ہو۔

"شاعر" آگرہ میں ایک عرصے سے یہ بحث جاری ہے۔ کہ لب ساحل کی ترکیب غلط ہے یا صحیح۔ اِس سلسلہ میں تازہ ترین مضمون برق صدیقی صاحب کا ہے۔ فاضل مضمون نگار کے نزدیک یہ ترکیب جائز ہے۔ ان کے خیال میں ساحل اس زمین کو کہتے ہیں۔ جو پانی کے کنارے واقع ہو اور ایسی زمین کے لئے ضروری ہے کہ لمبائی چوڑائی اور اونچائی رکھتی ہو۔ لب ساحل اس زمین کو کہیں گے۔ جس میں لمبائی اور اونچائی تو ہو مگر چوڑائی نہ ہو۔ یعنی وُہ حصّہ زمین جس سے پانی چھوا ہوا ہو۔ اس اعتبار سے ساحل اور لب ساحل کے مفاہیم جُدا جُدا ہیں۔ اور دونو ہی اپنی اپنی جگہ درست ہیں ۔

افکارِ تازہ

نہ سمجھنے کی یہ باتیں ہیں نہ سمجھانے کی
زندگی اچٹی ہوئی نیند ہے دیوانے کی
زندگی میں دلِ برباد کی ہولے بیچین
پھر ہوائے چمنِ عشق نہیں آنے کی
پردۂ یاس میں اُمید نے کروٹ بدلی
شبِ غم تجھ میں کمی تھی اسی افسانے کی

علی گڑھ میگزین

صیاد یہ تمام تصوّر کے تھے فریب
ہر شاخِ گل پہ ورنہ مرا آشیاں نہیں
میرے لئے ہے ذوقِ تماشا حجابِ دوست
ورنہ بجز نگاہ کوئی درمیاں نہیں

فرقت میں تری یاد ہے اور جوشِ تمنّا
الفت میں تری بے سروساماں تو نہیں ہم

ساقی دہلی

سجودِ شوق کی رعنائیاں پُوچھے کوئی ہم سے
کہ خود سنگِ حرم آتا ہے مشتاقِ جبیں ہوکر

بطلتے ہی بے دلوں سے وہ مُسکرا دیا ہے
غم کا حساب آنکھوں آنکھوں میں لے لیا ہے

"ندیم" گیا

ترے حسنِ دلکش کا ہے اِک ترانہ
مرے دردِ دل کی کہانی نہیں ہے
نگاہیں جو کہہ دیں تو کہہ دیں وگرنہ
مجھے حالتِ دل سنانی نہیں ہے

جامعہ دہلی

بے حقیقت جانتے تھے جس دلِ محزوں کو ہم
رونقِ ہنگامۂ دار و رسن ثابت ہوا

میرے تصوّرات کا سحر عجیب سحر ہے
دیکھ ذرا دلِ حزیں دیکھ وہ آگیا کوئی

ادبی دُنیا لاہور

ہاں مشغلۂ جام و سبو جاری ہے
اب تک وہی رسم ہاؤ ہو جاری ہے
کھائی ہے کچھ انسان سے ٹکر ایسی
ہر دین کے ماتھے سے لہو جاری ہے

کلیم دہلی

جینے کی آرزو میں کچھ ایسے تھے مبتلا
ہم لذت آشنائے فنا بھی نہ ہو سکے
اس نامرادِ عشق کی بیچارگی نہ پوچھ
جس کے شریکِ حال قضا بھی نہ ہو سکے

شاعر

جس جوشِ عاشقانہ سے پروانہ جل گیا
کیا تاب اس کا شمعِ فروزاں جواب دے
اس وقت دیکھ میرے سوالوں کا بانکپن
جب مجھ کو وُہ نگاہِ پشیماں جواب دے

ندیم بھوپال

بزمِ انتخاب

جدید شعری رجحانات

یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ موجودہ شاعر صداقت شعار ہے۔ اور صداقت شعاری اِس کے نزدیک اصُولِ فن کا درجہ رکھتی ہے۔ وُہ تھیٹر کے ایکٹروں کی طرح نمائش پسند نہیں اور نہ اخلاقیات اور پراپیگنڈے کا شیدا ہے۔ وُہ کسی خاص مقصد کو مدِنظر رکھکر شعر نہیں کہتا بلکہ اپنے ضمیر کی آواز سے مجبوُر ہوکر۔ اِس کے نزدیک سچائی اِس لئے قابلِ پرستش نہیں کہ وُہ خوبصُورت ہے بلکہ اِس لئے کہ وُہ سچائی ہے۔ وُہ صرف خیالات میں ہی نہیں بلکہ ادائے بیان میں بھی راستباز ہے۔ وُہ اوزان اور تراکیب کو اپنے خیالات کے سانچے میں ڈھال لیتا ہے۔ وہ زندگی کو اِس کی تمام اُلجھنوں اور پیچیدگیوں پر نظر رکھتے ہوئے دیکھنا [illegible] ہے۔ اِس کے نزدیک آرٹ ایک ایسی نشہ آور چیز نہیں جو اِنسانی زندگی کی المناکیوں کو فراموش کرنے میں مدد دے۔ وُہ نہایت اطمینان قلب کے ساتھ آپ کو موجودہ زندگی کی تنگ اور پرپیچ گلیوں میں لے جاتا ہے۔ جہاں آپ انسانیت کو سرگرم جدوجہد دیکھ سکتے ہیں۔ اِس کے نزدیک اِنسان شکست کھا کر کچلا نہیں گیا۔ لیکن وُہ تھکن سے ہانپ ضرور رہا ہے۔

یہ خیال کرنا زبردست غلطی ہے۔ کہ موجودہ شاعر کے جذبات ایک شکست خوردہ اِنسان کے جذبات ہیں۔ وُہ اِنسان کی الوہیت کا منکر نہیں۔ لیکن اِس کے خاکی ہونے کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔

موجودہ شاعر چھوٹی چھوٹی نظموں کا شائق ہے۔ بڑی بڑی جنگی نظمیں اگلے وقتوں میں لکھی جاتی تھیں۔ اِس کے علاوہ اِس کی نظمیں قدرے فلسفانہ ہوتی ہیں عشقیہ نہیں۔ عشقیہ نظموں کا دور گزر چکا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ موجودہ دور میں عشقیہ نظمیں بالکل لکھی ہی نہیں جاتیں۔ لکھی تو جاتی ہیں۔ لیکن اِن کی تعداد بہت قلیل ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ نسل کو محبت کی نسبت زیادہ سنجیدہ اور پیچیدہ مسائل درپیش ہیں۔ جب اِنسان کو زندگی کی تنگ و دو سے ہی فرصت نہ ملے تو محبت کے نورانی خواب کس طرح دیکھے۔ جب حقیقی زندگی میں محبت کا دھارا سست رفتار ہو گیا ہو تو لٹریچر میں اِس امر کا اظہار کیوں نہ ہو۔

شاعری کو اگر زندہ رہنا ہے تو وُہ زندگی کے حقائق سے قطع تعلق نہیں کرسکتی۔ میتھیو آرنلڈ کے الفاظ میں اسے "زندگی کی تنقید و تشریح" ہونا چاہئے۔ اگر اِس معیار سے جانچا جائے تو معلوم ہوگا کہ موجودہ شاعری عظیم اور سنجیدہ ہے جو نقاد اِس اوچھے پن کا الزام لگاتے ہیں۔ وُہ گمراہ ہیں۔

ماڈرن ریویو

نیکی اور جزا

اگر بارش صرف پاکیزہ افعال کسان کے کھیتوں پر ہی اور کشش ثقل صرف گنہگاروں کو ہی نقصان پہنچائے تو اخلاق صرف سودے کی چیز بن کر رہ جائے گا۔ حالانکہ صحیح اخلاقی عظمت اِس امر میں مضمر ہے۔ کہ نیکی نتائج سے بے پرواہ ہو کر کی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ قدرت کی کارفرمائیوں کا غیر یقینی ہونا اور عناصر فطرت کا بظاہر انسانی نیکی اور بدی سے بے پرواہ ہونا ہی اخلاقِ صالحہ کی بُنیاد اور اساس ہے۔ ایک ایسی دنیا جس میں نیکی کی جزا اور بدی کی سزا فوراً ہی مل جائے۔ حُسنِ اخلاق سے خالی دنیا ہوگی۔ اپنے ظاہری تضاد اور لاینحل مسائل کے باوجود موجودہ دُنیا ہی ایک ایسی دنیا ہے۔ جس میں حقیقی نیکی کا وجود ممکن ہے۔

فطرت ڈھیل تو دے دیتی ہے۔ لیکن بے انصافی کبھی نہیں کرتی۔ وقت کا فیصلہ غیر منصفانہ ہرگز نہیں ہوتا۔ شہرت کا معاملہ ہی لیجئے ایک دجال وقتی طور پر خواہ کامیابی اور شہرت کے کتنے ہی مدارج طے کر جائے لیکن آخرکار اس کی اصلیت ظاہر ہو کر ہی رہتی ہے۔

انیسویں صدی کے آغاز میں انگلستان میں دو شاعر تھے۔ ان میں سے ایک مشہور تھا اور دوسرے کو پبلک نے نظر انداز کر رکھا

دنیا کے بہت کم کسانوں میں مل سکے گی۔ کاش ہم ایسے کیرکٹر اپنی یونیورسٹی اور کالج کے طلبہ ہی میں پیدا کر سکتے۔

ایک ذہین اور کفایت شعار کسان اس قدر بوڑھا ہو گیا کہ اس کے لڑکے نے اُس سے کام چھوڑ کر باقی ماندہ عمر کے لئے آرام کرنے پر مجبور کیا۔ لیکن اس بڈھے نے اِصرار کیا کہ اس کو بدستور کام کرنے دیا جائے۔ مگر لڑکا نہ مانا۔ آخر کار اُس نے اپنے کھیت پر جانا چھوڑ دیا۔ لیکن اپنے بیٹے کی نگاہ بچا کر وہ روزانہ ایک دور کی پہاڑی پر جو بالکل بے ثمر اور ویران تھی جانے لگا۔ وہاں اس کے ڈھلان پر اُس نے آہستہ آہستہ ایک دیوار کھڑی کی اپنے کمزور ہاتھوں سے اُس نے اس ڈھلان پر مٹی ڈالنا شروع کی یہاں تک کہ وہاں ایک کھیت تیار ہو گیا۔ گو وہ صرف تیس مربع فٹ کی جگہ تھی۔ مگر اس بوڑھے کا دل ہی جانتا تھا کہ اُس نے کس قدر عرق ریزی کی تھی جب ایک دن اس لڑکے نے اس تیار شدہ اراضی کو دیکھا تو وہ بے ساختہ رونے لگا اور کہا کہ آپ نے خود کو کس لئے ہلکان کیا ہے آخر یہ کھیت کس کام آئے گا۔؟ اگر یہ گاؤں کے قریب ہوتا تو جوتا بویا جا سکتا تھا۔ مگر آبادی سے اتنی دور کون اس کو بو سکے گا؟

یہ سنکر بوڑھے نے اپنے پائپ سے تمباکو گراتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ اگر تم ٹوکیو جاؤ اور وہاں کے اوپما قبرستان کی سیر کرو تو تمہیں وہاں بڑے بڑے پتھر ملیں گے جن پر سپاہیوں اور افسروں کی یادگار میں وہ عبارتیں نقش ہیں کہ جنہوں نے اُن کو غیر فانی بنا دیا ہے لیکن ہم [illegible] ان بہادروں کا نام بھی نہیں سُنا۔ میرا خیال ہے کہ حیاتِ جاودانی کے لئے بڑے بڑے پتھروں کی ضرورت نہیں۔ میں شرط لگا کر کہتا ہوں کہ تم کو جاپان کے سب سے بڑے شاہ مردہ (Hero) کی قبر کا نشان تک معلوم نہیں۔ لیکن اُس کے باوجود تم اُس کو بھولے نہیں۔ بقائے غیر فانی مقبولیت زندگی کے کارناموں سے حاصل ہوتی ہے۔ سنگِ مرمر کے کتبوں سے نہیں۔ یہ مصنوعی یادگاریں مٹ جاتی ہیں۔ لیکن جن بہادروں کی قبریں بنی نوع انسان کے دلوں میں بنی ہوئی ہوتی ہیں وہ امرٹ ہو جاتی ہیں۔ ہم کسان بھی اپنے مخصوص انداز میں اپنی یادگاریں چھوڑ سکتے ہیں۔ اور وہ یادگاریں کونسی ہیں؟ بنجر پہاڑی کے ڈھلوان پر ایک نیا دھان کا کھیت تیار کرنا اور ایک باغ لگانا ہمارے بہترین کارنامے اور لازوال یادگاریں ہیں۔ مجھکو کس قدر ندامت اور افسوس ہوتا کہ میرے مر جانے کے بعد میرا نام فراموش کر دیا جاتا۔ اور اب جبکہ اس کھیت میں مٹھی بھر دھان بھی پیدا ہو گئے تو میرا نام زندہ رہ سکے گا۔ مجھے کس قدر مسرت اور اطمینان ہے۔ گویا میری زندگی بیکار نہیں نہیں گئی اور اب تو میں اس پر ایک جنگل لگانے والا ہوں۔

"حکیم"

سچائی کا عہد

ایک رات بیٹھے بیٹھے کچھ خیال جو آیا تو میں نے بلا سوچے سمجھے مصمم ارادہ کر لیا کہ کل صبح کے بعد سے جھوٹ نہ بولوں گا بلکہ ہمیشہ سچ بولنے کی کوشش کروں گا۔ ابھی ناشتہ ہی کر رہا تھا کہ بڑے بھائی صاحب جو مجھ سے بے حد محبت کرتے تھے حسب عادت مسکراتے ہوئے آئے۔ اور میرے کاندھے پر ہاتھ رکھکر کہنے لگے۔ "صبح بخیر رات کو کتنے بجے لوٹے"؟

میں:- دو بجے رات کو

بھائی صاحب:- دو بجے۔ بڑی دیر سے آئے۔ کہاں رہ گئے تھے

میں:- دوستوں کے ساتھ تھا۔

بھائی صاحب:- کیا کرتے تھے۔

میں:- شراب پی رہا تھا۔

بھائی صاحب:- (غصہ سے) شراب۔ کیا تم شراب پیتے ہو۔

میں:- ہاں میں بھی پیتا ہوں۔

بھائی صاحب:- (گھونسہ دکھا کر) خوب! خوب!! ابا کو آنے دو۔

میں:- آنے دو۔ میں بھی سچ سچ کہدوں گا۔

بھائی صاحب سخت جوش کی حالت میں بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے اور میں بھی باہر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ چھوٹی بہن نئی پوشاک بدلے چلی آ رہی ہے۔ اُس نے آتے ہی مجھ [illegible] پوچھا

بہن:- بھائی جان! میں کیسی معلوم ہو رہی ہوں؟

میں:- روز جیسی۔

بہن:- (تعجب سے) کیا میں اس جوڑے میں زیادہ خوبصورت نظر نہیں آتی

میں:- بالکل نہیں۔

بہن:- (شرمندہ ہو کر) تو پہلا ہی جوڑا اچھا تھا جس کی تم نے تعریف کی تھی۔

میں:- میں نے غلط تعریف کی تھی۔

بہن:- (غصے سے) تو کیا میں ہر حالت میں بدصورت ہوں۔

میں:- ہاں۔

یہ سننا تھا کہ اُس نے رونا شروع کر دیا۔ مگر میں نے کچھ پرواہ نہ کی اور باہر نکل گیا۔

اب میں سیدھا اسٹیشن پہونچا۔ کیونکہ مجھے نو بجے کی گاڑی سے غازی آباد جانا تھا۔ گاڑی کے چھوٹنے میں صرف چار منٹ باقی تھے۔ میں نہایت عجلت میں

پلیٹ فارم پر ٹکٹ لیکر پہنچا ہی تھا کہ گاڑی کی روانگی کی سیٹی ہوئی۔ اور اُس نے مستانہ وار چلنا شروع کیا۔ آخر دوڑ کر سوار ہونا پڑا۔ اس گھبراہٹ میں ایک لیڈی کا پاؤں کچل گیا۔ میرے خیال میں غلطی اسی کی تھی۔ اُس کو چاہیئے تھا کہ پاؤں سمیٹ کر بیٹھتی۔ میں نے کوئی معذرت نہیں کی لیڈی نے قہرآلود نگاہوں سے مجھے دیکھا اور کہا۔

لیڈی:۔ آپ کو معذرت کرنی چاہیئے۔

میں:۔ میرا قصور نہیں تمہارا ہے۔

لیڈی:۔ تمہیں عورتوں کی عزت کرنی چاہیئے۔

میں:۔ بدتمیز عورتوں کی عزت نہیں کرتا۔

یہ تکرار سنکر تمام مسافر مجھ پر بری طرح برس پڑے۔ میں اس افرا تفری میں موقع پاکر ایک سٹیشن پر ٹرین سے اُتر پڑا۔ اور ایک ہوٹل میں چہرے کا پسینہ پونچھتے ہوئے داخل ہوا۔ اتفاق سے ایک اخبار کے ایڈیٹر صاحب بھی وہیں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے مجھ سے دیرینہ ملاقات تھی بڑے تپاک سے اپنے پاس بلا کر بٹھایا اور کہنے لگے۔

ایڈیٹر:۔ آج کے اخبار میں میرا مضمون پڑھا

میں:۔ پڑھ چکا ہوں۔

ایڈیٹر:۔ کیسا مضمون ہے؟

میں:۔ نہایت لغو۔

ایڈیٹر:۔ (کھانے سے ہاتھ روک کر) کیا کہا؟ احمق تو کچھ سمجھتا بھی ہے؟

میں:۔ (ربنجیدگی سے) ممکن ہے کہ میں احمق ہی ہوں۔ مگر یہ امر واقعہ ہے کہ تمہارا مضمون مجھے نہایت ہی مہمل معلوم ہوا۔

ایڈیٹر:۔ (دانت پیسکر) بے ادب! مروت اور انسانیت بھی کوئی چیز ہے۔ خود میرے منہ پر اس طرح کہتا ہے۔

مجھے ڈر ہوا کہ کہیں معاملہ بڑھ نہ جائے۔ اور کسی پلیٹ سے یہ عزت میرے سر کی تواضع نہ کردیں خاموشی سے اُٹھا۔ اور گھر لوٹ آیا۔ مگر بہت اُداس تھا۔

ابھی اپنے کمرے میں بیٹھا ہی تھا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ پھر فوراً ایک ملاقاتی ہشاش بشاش داخل ہوا یہ شخص میری طبیعت پر ہمیشہ سے گراں تھا۔ آج کے واقعات نے اب مجھے اس قدر چڑچڑا بنا دیا تھا کہ ہمیشہ کی طرح بناوٹی محبت بھی نہ دکھا سکا

ملاقاتی:۔ (بیٹھتے ہوئے) میرے آنے سے کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔

میں:۔ ضرور ہوئی۔

ملاقاتی:۔ (دست پناتے ہوئے) کیا میری اس وقت کی موجودگی تمہارے لئے تکلیف دہ ہے۔

میں:۔ یقیناً اس وقت بھی اور آئندہ بھی تکلیف دہ رہے گی۔

ملاقاتی:۔ (غصہ ہو کر) تو پھر میں چلا جاؤں۔

میں:۔ ضرور! ضرور!!

اس پر وہ ہزاروں باتیں سناتا ہوا چلا گیا۔

اس وقت کے بعد میں گھر میں بہت رات گئے سیر و تفریح سے واپس آیا۔ تو کیا دیکھتا ہوں کہ والد صاحب کھڑے ہیں اور غصے سے کانپ رہے ہیں۔

والد:۔ بدمعاش! آوارہ!! .... اتنی رات تک کہاں رہا؟

میں:۔ (متانت سے) قہوہ خانے میں بیٹھا تھا۔

والد:۔ (غضبناک ہو کر) کوئی دور شراب بھی چلا۔

میں:۔ جی ہاں صرف دو جام پئے تھے۔

والد:۔ صرف دو جام؟ یہ کہتے ہی اُن کا طمانچہ میرے گلے پر اتنے زور سے پڑا کہ سر چکرا گیا۔ پھر گھونسوں۔ تھپیڑوں۔ ٹھوکروں اور لاتوں کی وہ مشق ہوئی کہ میں بدحواس دیوانہ وار ادھر اُدھر دوڑتا پھرتا تھا۔ آخر جب وہ مارتے مارتے تھک گئے تو یہ کہتے ہوئے کمرے سے چلے گئے۔ میرا گھر شرابیوں کے لئے نہیں ہے کل صبح تجھے اپنی راہ لینی ہوگی۔

میں رات بھر وہیں پڑا رہا۔ صبح جب ہوش آیا اور آنکھ کھلی تو بے اختیار میرے منہ سے یہ نکلا "کیا درحقیقت دُنیا میں سچائی کا کوئی قدردان ہی نہیں" یا زمانے کی حالت اس قدر ناگفتہ بہ ہو چکی ہے کہ جھوٹ کے بغیر کوئی خوش ہی نہیں ہو سکتا۔ ؟ مگر میرے دل نے کہا۔ "پروا نہ کر۔ سچ کا پھل ہمیشہ میٹھا ہوتا ہے۔ دیکھ اس نعمت کو ضائع نہ کر"۔

تسنیم محمد اسلم رضا رضوانی

خط و کتابت کرتے وقت چٹ نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ ورنہ عدم تعمیل کی شکایت معاف۔ (منیجر)

صفحۂ اطفال

"مس فلورا"

(گذشتہ سے پیوستہ)

جیک:- بدھو کے گھر والے میری غلامی پر تو افسوس کرتے ہیں۔ انہیں کبھی اپنی انوکھی آزادی پر بھی غور کرنے کا موقعہ ملا۔ گھر کے کبوتر جب کابک سے نکلتے ہیں۔ تو بلیوں سے رکھوالی ان کے سپرد ہوتی ہے۔ پرسوں چیل نے ایک کبوتر پر جھپٹا مارا۔ تو چیل سے لڑنے کے لئے دونوں پاؤں پر کھڑے ہوگئے۔ کبوتر پرندہ جانور ذات کا نہیں۔ غیر جنس اس کی غلامی سے فلورا کے ساتھ ہمدردی کرنا تو کہیں بہتر ہے۔

آیا بات یہ ہے۔ کلوا اگر ہرنی کا بچہ چیر پھاڑ کر کھا گیا۔ تو اس نے کوئی اچھا کام نہیں کیا۔ جس کا نمک کھائے اس کے ساتھ یہ خیانت، کوئی اچھی بات نہیں۔ اچھی نسل کا کتا ایسا کبھی نہیں کرسکتا۔ کتا وفادار جانور ہے۔ ہماری برادری کے اکثر ممبروں نے اپنے آقاؤں کو بچانے کے لئے جان تک کی قربانی کی ہے۔ نا بابا ہم سے یہ نہ ہوسکے گا کہ فلورا کو نقصان پہنچا کر اپنے آقا کو ناراض کریں۔

چمپا:- جا بھتیجے! تجھ سے کچھ نہیں ہوسکے گا۔ مراثی غلطا۔ غلامی کو وفاداری بتاتا ہے۔ انسانوں میں غلام آقا کی رسم سنا کرتے تھے۔ مگر بڑے جانوروں میں غلامی نہیں سُنی تھی۔ تو پہلا جانور ہے۔ جو غلامی پر ناز کرتا ہے۔ کلوا کو بُری نسل کا بتاتا ہے۔ اچھا ٹھہر تو غارتیئے اجا کر کلوا سے پوچھتی ہوں۔ دیکھ پھر تیری کیسی گت بناتا ہے۔

جیک:- ایک دفعہ نہیں ہزار دفعہ کلوا سے پوچھو۔ وہ میرا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ ہرنی کے بچے کو چیر پھاڑ کر اپنے کو بہادر سمجھ بیٹھا ہوگا۔ میری طرف رُخ بھی کیا تو ایسا بُرک ماروں گا کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔ ڈٹر بیری ہسپتال میں سے نکلنا بھی نصیب نہ ہوگا۔ اور تم نے زیادہ زبان درازی کی تو تمہاری بھی خیر نہیں۔ کسی دن چھری پھاڑی پڑی ہوگی۔ یہ جو چپڑ قینچی کی طرح چل رہی ہے۔ ہمیشہ کے لئے خاموش کردی جائے گی۔

چمپا:- وفان ہو! نٹ کھٹ کہیں کا۔ بہت منہ چڑھا ہے۔ کتا ذلیل ذات، میری شان میں تم سے تُو کا لفظ بھی کہا۔ تو مری لئے کی یہ پٹ بیجنا سی آنکھیں نکال لونگی۔ غلطا مراثی تجھے ڈھائی گھڑی کا ہیضہ آئے۔ پڑوس بھر کے کتے میری عزت کریں۔ خالہ جان خالہ جان کہتے ان کا منہ

سو کھے۔ اور تو جان ہار مجھ پر آنکھیں نکالتا ہے ۔ تیرے دیدے پھوٹ جائیں ۔ جیک چمپا کے یہ بھوگ سُن کر چمکا اور غرا کر اس کی طرف جھپٹا ۔ چمپا اس کے تیور دیکھتے ہی چھلانگیں لگاتی ہوئی کوٹھے پر جا چڑھی ۔ جیک نے بھونکنا شروع کر دیا ۔ اس کی آواز سُن کر کلوا بھونکتا ہوا اسلم میاں کے گھر کی طرف دوڑا ۔ جیک نے اُسے آتا دیکھا ۔ تو دوڑ کر اس کی تھوتھنی پر ایسا بُڑک مارا کہ سارے دانت اندر گھُس گئے ۔ کلوا نے حریف کے پہلے ہی وار پر ہار مان لی ۔ اور ٹیاؤں ٹیاؤں کرتا ہوا پتّہ توڑ ہو گیا ۔

چمپا روشن دان میں سے اس جنگ کا تماشا دیکھ رہی تھیں ۔ کلوا کے آنے پر اسے گمان تھا کہ جیک آج اس کے ہاتھوں اچھی طرح مار کھائے گا ۔ مگر کلوا قد میں گدھے کی برابر [illegible] پیں کا سار کھتا [illegible] سے [illegible] نہ ہوا کہ جیک سے کشتم کشتا ہو کر ایک آدھ بُڑک اس کے بھی لگا دے ۔ اب مُنہ سُوجھا پھرتا ہے ۔ راتب بھی نہیں کھا سکتا ۔

چمپا اس خُونی کھیل سے سہم سی گئی ۔ اور سمجھ گئی کہ اِن تلوں میں تیل نہیں ۔ یہ فلورا کی غلامی نہیں چھوڑ سکتا ۔

اب گھر میں اکیلی پھرتی ہے ۔ فلورا سے جلاپے کی وجہ سے کلام نہیں کرتی ۔ جیک سے چھیڑ خانی کا تماشا دیکھ چکی ۔ اس سے "منہ چٹا" لے کر پٹتے پٹتے بچی ۔ اس سے بھی بول چال بند ہے ۔ اس کی طرف سے پیٹھ پھیر کر نکلتی ہے ۔ دماغ پر بہت زور دیا ۔ مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا ۔ کئی دن کی سوچ بچار کے بعد یہ تدبیر ذہن میں آئی ۔ کہ فلورا سے صلح کی جائے ۔ اور اس سے لفڑا جوڑ کر اسے شیشے میں اُتارا جائے ۔ نامراد سیدھی سادی ہے ۔ جھانسے میں آ جائے گی ۔

یہ سوچ کر ایک دن صبح سویرے فلورا کے پاس آئی اور بولی ۔ فلورا اچھی ہو ۔

فلورا :۔ آپا سلام ۔

چمپا :۔ خدا جوانی پرانی کرے ۔ جنگل کا کوئی سردار بندر بیاہنے آئے ۔ انسانوں کی غلامی سے چھٹکارا ملے ۔ آزادی نصیب ہو ۔

فلورا :۔ (جھینپ کر) اوئی آپا نوج کوئی بندر مجھے بیاہنے آئے ۔ میں بیاہ کر کے کیا کروں گی ۔ جنگل جنگل خاک چھاننا مجھے تو گوارا نہیں ۔ اور یہ اگر غلامی ہے تو آزادی سے سو درجے اچھی ہے ۔ میرے آقا اور گھر کی بیوی کیسے پیار سے مجھے رکھتے ہیں ۔ ایسے کھانے تو بندروں کے سردار کیا بندروں کے بادشاہ کو بھی نصیب نہ ہوتے ہوں گے ۔ جو مجھے مل رہے ہیں ۔ البتہ خدا تمہیں کوئی جنگلی بلاؤ روزی کرے ۔ جنگلی بلیوں کی ملکہ بنائے ۔ جنگل کے پرندے کھانے کو ملیں ۔

چمپا :۔ اوئی بیاہ کے نام سے کیوں چڑتی ہے ۔ بیاہ کوئی گالی ہے ؟ کوسنا ہے ؟ چوری چھنالے کا نام ہے ؟

ماں باپ اور برادری کے پنچ جس کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیں وہی دولھا ۔ پنچ بھی راضی ۔ خدا بھی خوش اور دیوانی ان ہڑبونگ کھانوں کو تو آزادی کی قیمت سمجھتی ہے ۔ گدھی ہے بالکل گدھی ۔ گلے میں زنجیر ڈال کر یہ غلامی کی [illegible] ایک گھر سے دوسرے

گھر میں جانے کی مجال نہیں۔ تو تو انسانوں میں رہتے رہتے نری انسان ہی بن گئی۔ بہن! انسان برادری میں آقا اور غلام ہوا کرتے ہیں۔ خدا نہ کرے جانوروں میں یہ ذلیل رسم جاری ہو۔

چمپا ؛ - اوئی شادی بھی کوئی گالی ہے۔ جس سے بُرا مانتی ہو۔ اور میری جو پوچھتی ہو تو بہن شرع میں کیا شرم؛ میں کب تک اسلم میاں کے ٹکڑوں پر گزاروں گی ۔ جوان جان کو سو جوکھوں ۔ پاس پڑوس کے سارے بلّے بات بہانے آتے رہتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے چمپا تم اتنی خوبصورت کیوں ہو۔ چشم بد دور تمہارے حسن پر نگاہ نہیں ٹھیرتی۔ کوئی کہتا ہے تمہاری مستانہ چال جی دل کو بھا گئی ہے۔ اس غلامی پر تین حرف بھیجو۔ میرے ساتھ چلو۔ بلیوں کی ملکہ بنو! کل فجو بلّی شیرا بلاؤ کا پیغام لائی تھی۔ کہتی تھی کہ شیرا نے کہیں تمہیں دیکھ پایا ہے۔ بلبلایا پھرتا ہے۔ اچھے اچھے گھرانے کی بلیاں اس کا گھر بسانے کی خواہش مند ہیں۔ مگر اس نے سب کو دھتکار دیا۔ چمپا ہی چمپا کئے جاتا ہے۔ تمہارے نام کی ایسی رٹ لگی ہے۔ کہ آٹھ پہر کا وظیفہ بنا لیا۔ ایمان کی بات تو یہ ہے بہن البیلا رنگیلا کسیلا بلاؤ ہے بھی تمہارے ہی لائق۔ کمبخت ایسی چھلانگیں لگاتا ہے کہ دیکھنے والوں کو دھوکا ہوتا ہے کہ اُڑ رہا ہے۔ صحن سے چھلانگ لگائی دیوار پر، وہاں سے اُڑا تو چھت پر، چھت سے کودا نیم کے پیڑ پر، کیا بندر اُچھلے کودے گا جو شیرا اچھل کود دکھاتا ہے۔ شہر بھر کے بلّے اس سے کنیّ کاٹتے ہیں۔ کیا مجال کوئی بلّا اس کے محلے کا رُخ کرے۔ آئے دن شور پڑا رہتا ہے۔ آج دامو چمار کا گھاگس مرغا پکڑ لایا۔ کل فضلی تیلن کی مرغی، سب کے سامنے سے اُڑا لایا۔ یہ گیا وہ کودا۔ لیجو پکڑیو کا غل مچا رہتا ہے۔ بہن چمپا ایسا جیالا بلاؤ ہماری برادری بھر میں نہیں نکلے گا۔ دیکھنا اسے مایوس نہ کر دینا۔ جان ہار کہیں چوبارے پر سے کود کر جان نہ کھو لے۔" تو بہن فلو! آہیں تو اس گھر میں ہفتے دو ہفتے کی مہمان ہوں۔ جوان بلّی یا بندری اپنے گھر ہی اچھی۔ تم بھی کہیں اپنا دیکھنا کرو! جوانی پھر پھر کے نہیں آتی۔

اور بہن غلامی کی جو پوچھتی ہو۔ تو ہم تم غلام نہیں تو کیا آزاد ہیں۔ ہزار میاں حلوے پراٹھے کھلائیں۔ آخر ہم ان کے غلام کہلاتے ہیں۔ بہن تمہیں اس غلامی میں مگن دیکھ دیکھ کر بندروں اور بلیوں کی برادری ہم پر تھُڑی تھُڑی کر رہی ہے۔ آزادی کے سُوکھے ٹکڑے اس غلامی کے حلوے پراٹھے سے ہزار درجے بہتر ہیں۔ غلام نامراد کی بھی کوئی زندگی ہے۔ غلام جیا تو کیا جیا کچھ نہیں۔ نہ کھانا اپنی مرضی کا نہ جینا۔ انسان بڑا مطلبی اور بیوفا جانور ہے آج ہم تم اللہ رکھے جوان ہیں۔ اسلم میاں بھی ہمارے گاہک ہیں۔ چند سال کے بعد جب ذرا ہماری عمر ڈھلتی دیکھیں گے نکال باہر کریں گے۔ بہن بڑھاپے کا کوئی ساتھی نہیں۔ بس اپنا گھر اور اپنا شوہر اچھا ؛ ـــــ میری مانو تو کسی نیک بخت، کماؤ بندر سے دو بول پڑھا لو۔ فضلی بوا نے گھر کے لیوے لے رکھے ہیں۔ شیرا کا کہنا یہ ہے۔ کہ بیاہ کروں گا تو چمپا سے، نہیں تو عمر بھر کنوارا رہوں گا۔ مجھے اس کی جوانی کا بھی خیال ہے۔ نگوڑا کہیں سچ مچ میرے پیچھے جان نہ گنوا دے۔ ماں باپ کا اکلوتا ہے۔ خدا نہ کرے۔ مایوسی میں کچھ کھا کے سو رہا۔ یا کسی چوبارے سے

ہو کہ جان کھودی ۔ تو میری گردن پر خون ہوگا ۔ ساری برادری میں نکو بن جاؤگی اور بہن تم سے کیا چھپانا ۔ اس کی آن بان دیکھ کر مجھے بھی اس سے کچھ محبت سی ہوگئی ہے ۔ آٹھ پہر اسی کی یاد میں رہنے لگی ہوں ۔ کہیں کسی منڈیر یا دیوار پر اس سے مٹ بھیڑ ہو جاتی ہے ۔ تو جھینپ کر آنکھیں نیچی کر لیتی ہوں ۔ مگر موا جی نہیں مانتا ۔ کن انکھیوں سے اسے دیکھتی بھی رہتی ہوں ۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر اچھل کود بھول جاتا ہے ۔ ٹھنڈے ٹھنڈے سانس بھرنے لگتا ہے ۔ شام میں گھر کی منڈیر پر اسی کے دھیان میں بیٹھی تھی ۔ جانے اس کی پسلی پھڑکی ۔ دیکھتی کیا ہوں ۔ مستنا ہاتھی کی طرح جھومتا چلا آتا ہے ۔ میں تو شرم سے منڈیر ہی میں گڑ گئی ۔ بھلا مجھ سے بات کرنے کی جرأت تو کہاں سے پاتا ۔ یہ شعر گنگنایا ہوا سامنے سے نکل گیا ؎

جذبۂ عشق سلامت ہے تو انشاء اللہ
کچے دھاگے میں چلے آئینگے سرکار بندھے

سچ تو یہ ہے فلورا ہماری البیلی جوانی، مستانہ چال، ہماری سج دھج، ہماری نزاکت، کس کام کی ۔ اگر کوئی دیکھنے والا نہ ہو ۔ کوئی قدردان نہ ملے ۔ اسلم میاں اور بیوی میں جب لاڈ پیار اور چاؤ چونچلے ہوتے ہیں ۔ میری رگوں میں خون تیزی سے گردش کرنے لگتا ہے ۔

(باقی باقی)

(منقول از پریم) تاجور

کہکشاں

یہ چاند کی جوانی ‖ کیا رات ہے سہانی
کیا خوب کہکشاں ہے ‖ کیا رنگ آسماں ہے
چھٹکے ہوئے ہیں تارے ‖ بھٹکے ہوئے ہیں تارے
چاندی بکھر رہی ہے ‖ ہر شے نکھر رہی ہے
کیا وقت ہے سہانا ‖ چھیڑو کوئی ترانا
اک لہر نور کی ہے ‖ یا شکل حور کی ہے
کیا چاندنی کھلی ہے ‖ رحمت گلے ملی ہے
گل پوشیوں کو دیکھو ‖ ان شوخیوں کو دیکھو
یہ نو بہار منظر ‖ جادو نگار منظر
چشمہ ابل رہا ہے ‖ یا چاند چل رہا ہے

یہ نور کا سماں ہے
یا موج کہکشاں ہے

وفا فرخ آبادی
(منقول از پریم)

شاہکار لاہور

ایڈیٹر:- پروفیسر تاجور نجیب آبادی

ادارہ:- خواجہ محمود جاوید ایم۔ اے
گوپال متل۔ بی۔ اے

چندہ:- سالانہ:- چھ روپے۔ ششماہی: تین روپے آٹھ آنے۔ نمونہ آٹھ آنے

جلد (۷) فہرست مضامین بابت ماہ جون ۱۹۳۸ء نمبر (۳)

تصاویر:- سہ رنگی (۱) جاپان کی نہائے نسواں۔ ایک رنگی (۲) مسٹر طاہر غلام ناصر خاں (۳) مسٹر سوماناتھ نیّر ایم۔ اے (۴) دس کا مدفن

نمبر شمار	مضمون	صاحبِ مضمون	نمبر صفحہ
۱	تحفۂ سما	تاجور	۱۳۸
۲	سوال و جواب	تاجور	۱۴۳
۳	مسیح	تاجور	۱۴۶
۴	لبِ مبارک	پنڈت میلا رام صاحب وفاؔ	۱۵۳
۵	تنویرات	مولینا ابو محمد امام الدین رام نگری	۱۶۷
۶	تعلیمی ادارات	خواجہ محمود جاوید ایم۔ اے	۱۷۱
۷	آرٹ	جناب اثرؔ چکوالی بی۔ اے	۱۴۸
۸	افکارِ تازہ	ماخوذ	۱۹۵
۹	اخبارِ علمیہ و تعلیمیہ	ادارہ	۱۹۶
۱۰	حسابی معمّے	سید لشیر الدین احمد بی۔ اے	۱۹۰
۱۱	بزمِ انتخاب	تازہ اخبارات و رسائل سے اہم اور متنوع اقتباسات	۲۰۱
۱۲	صفحۂ اطفال	منقول از اخبار پریم لاہور	۱۹۷
۱۳	آہ اقبال	حکیم محمد رفیق اثرؔ (بنارس)	۱۸۱
۱۴	مختار	اس ماہ کا بہترین افسانہ	۱۷۹
	افسانے		
۱۵	گبڑا	سردار موہن سنگھ ایم۔ اے۔ پروفیسر خالصہ کالج امرتسر	۱۶۵
۱۶	منشی خیرات علی	شیخ عبادالله بی۔ اے پبلسٹی آفس این۔ ڈبلیو۔ آر۔ لاہور	۱۶۹
۱۷	بھائی بہن	مولانا ابو محمد امام الدین رام نگری	۱۸۵
۱۸	قسمت کی نیرنگیاں	جناب آسیؔ رام نگری	۱۹۳
۱۹	فسانہ کانفرنس	جناب ادیب شاہد	۱۷۳
	حصۂ نظم		
۲۰	غزل	امام المتغزلین حضرت مولانا حسرت موہانی	۱۴۷
۲۱	تاریخِ وفات و مرثیہ سر محمد اقبال	ناظم الملک حضرت مولینا اطہر ہاپوڑی	۱۷۷
۲۲	بانسری	جناب اثرؔ چکوالی	۱۵۰
۲۳	آہ اے اقبال	حضرت احسان دانش	۱۵۱
۲۴	غزل	جناب رام جوایا خنداں	۱۶۴
۲۵	مشاہدہ	سید آغا صادق حسین صاحب صادق منشی فاضل و ادیب فاضل	۱۶۴
۲۶	غزل	جناب نعیم صدیقی	
۲۷	طلسمِ گفتار	جناب اثرؔ چکوالی	۱۵۰

ایم ہادی حسن اختر پرنٹر و پبلشر نے آزاد ہند پریس ہسپتال روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر شاہکار واقع مکان میاں علی محمد میاں علی محمد سٹریٹ (۲۵ سی بیڈن) خواجہ دل محمد روڈ

مختصرات

بورڈ ٹیچرز تحریک

بورڈ ٹیچرز ایسوسی ایشنوں کی تحریک جس تنظیم کے ساتھ معرضِ ظہور میں آئی ہے اور جیسے مخلص اور پُرجوش رہنما اسے نصیب ہوئے ہیں۔ اسے دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ صوبے کے ۲۵ ہزار استادوں میں جو بورڈ سروس سے وابستہ ہیں۔ احساس بیداری جلد پیدا ہو جائے گا اور وہ اپنے جائز مطالبات محکمے سے ایک نہ ایک دن حاصل کر کے رہیں گے۔ تمام اضلاع میں بورڈ ٹیچرز ایسوسی ایشنوں کا قیام، ان کے جلسے، ان جلسوں کی منظور کردہ تجاویز کی مسلسل اشاعت سے افسرانِ تعلیم اس تحریک کی زندگی کا جواز تسلیم کرنے لگے ہیں۔ اس سلسلے میں چند افسرانِ تعلیم سے وقتاً فوقتاً میری جو گفتگو ہوئی اُس سے پتہ چلتا ہے کہ اب یہ ضروری مفید اور موزوں تحریک زندگی کے خطرناک حدود سے آگے نکل چکی ہے۔ اب ضرورت یہ ہے کہ ایک پروگرام کے تحت اس تحریک کے رہنما مختلف وفود کی صورت میں محکمۂ تعلیم پنجاب، پنجاب گورنمنٹ، بورڈ ز تا ریکٹس اور یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد سے ملاقات کر کے اپنے جائز مطالبات کی تائید کریں اور صوبے کے مرکزی مقامات میں مہینے میں ایک بار بورڈ ٹیچرز کے جلسے منعقد کر کے ان مطالبات کو تجاویز کی صورت میں ہر جلسے میں منظور کرائیں اور متعلقہ حضرات کی نظر سے گزارا جائے۔ کوئی وجہ نہیں کہ ان ادارات کے مالکانِ اقتدار مجوزہ مطالبات کو نظر انداز کر دیں۔ اگر ایسا ہو تو پھر مہاتما گاندھی کے سیاسی حربوں کو تعلیمی ایجی ٹیشن کی صورت دینے میں مطلق تامل نہ کیا جائے۔

صوبے کے اساتذہ کی اکثریت کو ٹھکرا دینے کی طاقت نہ افسرانِ تعلیم میں ہے نہ حکومت میں اور نہ گورنر اس مطلق العنانی کو جائز رکھ سکتے ہیں۔ اس کیلئے تھوڑے سے استقلال، جرأت اور ایثار کی ضرورت ہے۔ یہ یاد رہے کہ کشمیر کی ماسٹر عبد اللہ آج شیر کشمیر کے نام سے پکارا جاتا ہے اور کشمیر کی ۹۵ فی صدی آبادی اس کا کلمہ پڑھتی ہے۔ تعلیمی تحریکات کو بھی دو چار ماسٹر عبد اللہ ہوں کی ضرورت ہے۔ ایثار، پامردی اور جرأت کی طاقتیں باطل تحریکات کو کامیاب

بنا دیا کرتی ہیں پھر اپنے حقوق کے لئے سرفروشی کیوں کر ضائع ہو سکتی ہے۔

بس اتنی ضرورت ہے کہ اساتذہ صرف خدا سے ڈریں اور افسران کا بیجا ڈر دلوں سے نکال دیں۔

بورڈ ٹیچرز تحریک کے رہنماؤں سے

مجھے صدمات کے تواتر، ناسازیٔ صحت اور بجٹ کی تہی دامنی نے دو سال سے دورہ کرنے کی اجازت نہ دی۔ اس کا اثر شاہکار اور پریم کی اشاعتوں پر پڑ رہا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس وقت دونوں پرچے خسارے پر چل رہے ہیں۔

میرے پاس اردو مرکز کے تیس ۳۰ تیس مجلدات کے ڈیڑھ سو سیٹس موجود ہیں جو مجھے پبلشر سے رائلٹی کے طور پر ملے ہیں۔ ان تیس مجلدات پر ملک کے منتخب اٹھارہ مشہور انشا پردازوں نے کام کیا ہے اور کئی صدی کے قدیم و جدید لٹریچر کی چھان بین کر کے اس انبار بیکراں میں سے غیر فانی جاندار حصوں کا انتخاب تاریخی ترتیب سے ساتھ تیس مجلدات میں مرتب کیا ہے۔ ادب کے ہر شعبہ منتخبہ پر تاریخی مقدمات اور تنقیدی دیباچے لگائے گئے ہیں۔ ہر عہد کے مصنفین کے حالات، تصاویر، ان کے ادبی فتوحات، ان پر تنقید و تنقیح مختصر طور پر اردو ادب کی ایک انسائیکلو پیڈیا تیس مجلدات میں پیش کی گئی ہے۔ ملک کے اخبارات و رسائل، اہل قلم، عمائد و افسرانِ تعلیم نے ان مجلدات پر نہایت بلند الفاظ میں اظہار رائے کیا ہے۔ مدراس اور الہ آباد یونیورسٹی میں یہ مجلدات بطور نصاب پڑھائے جاتے ہیں۔ پنجاب اور صوبہ سرحد کے محکمہ تعلیم میں منظور شدہ ہیں۔ ہر تیس مجلدات کے ایک سیٹ کی منظور شدہ قیمت تیس روپے ہے۔

ان سیٹس کی فروخت سے جو روپیہ آتا ہے شاہکار و پریم کے نقصانات اس سے پورے کئے جاتے ہیں۔

دی جہلم بورڈ ٹیچرز ایسوسی ایشن کے گزشتہ یادگار اجلاس میں

بعض قدرشناس اساتذہ نے شاہکار و پریم کی اشاعت کی تجویز پیش کرکے منظور کرائی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اگر بورڈ ٹیچرز میری ناچیز خدمات کے پیشِ نظر میری دفتری مشکلات کو کم کرنا چاہتے ہیں تو ہر ایسوسی ایشن دو زحمتیں گوارا کرکے مجھے ممنون کرے۔

(۱) ہر ضلع میں بڑی۔ بی۔ ہائی اسکول اور ورنیکلر مڈل اسکول ہیں اُن کی لائبریریوں کے لئے حسب گنجائش ایک یا ایک سے زائد سیٹس کی خریداری کی تحریک کی جائے۔ نہ صرف تحریک بلکہ اس سلسلے میں ذاتی سعی کی ضرورت بھی ہے۔ تاکہ میں سیٹس کی خریداری کے رقوم سے اپنے پرچوں کے نقصانات پورے کرتا ہوں۔

(۲) تحریک کے مقتدر رہنما اسکولوں کو توجہ دلا کر شاہکار و پریم کے بلوں کی ادائیگی پر آمادہ فرمائیں۔

اگر موثر انداز میں یہ سعی کی گئی تو مجھے امید ہے کہ میں اطمینان اور زیادہ جرأت سے بورڈ ٹیچرز تحریک کی خدمت کرسکوں گا۔ میرے لئے اس مبارک تحریک کی خدمت غیر مشروط طور پر واجب ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مجھے پرچوں کے گراں بار اخراجات نے پریشان کر رکھا ہے۔ میں تو اس کے لئے بھی آمادہ ہوں۔ اگر مرکزی ایسوسی ایشن شاہکار کو اپنے طور پر جاری رکھ سکے۔ تو اگرچہ اس پر میرا ذاتی سرمایہ سات ہزار روپیہ صرف آچکا ہے، لیکن میں بہت کم قیمت پر مرکزی ایسوسی ایشن کے حوالے کر دوں گا۔ دو پرچوں کا انتظام میرے لئے دشوار ہو رہا ہے۔

میری تلخ نوائی کے مخاطب

میں نے شاہکار و پریم کی خریداری کے سلسلے میں بدمعاملہ استادوں کا ذکر ترش بلکہ تلخ لہجے میں کیا ہے اور زہرخند کے طور پر جبری ظرافت سے اس تلخی کو کم کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔

اس تلخ نوائی کے مخاطب صرف وہ اساتذہ ہیں جو شاہکار و پریم کو اسکول کی لائبریری کی بجائے فائل بنا کر ان فائلوں کو پرائیویٹ لائبریری کی زینت بنا رہے ہیں۔ یہ کوئی شاعری نہیں، افسانہ نہیں، دس سال کا تجربہ ہے جو میرے لئے موجبِ حیرت و اندوہ بن رہا ہے۔ جب اسکول سے بل کی ادائگی کا تقاضا کیا جاتا ہے تو یہ متدین حضرات صاف صاف لکھ دیتے ہیں کہ ہمارے اسکول میں یہ پرچے آتے ہی نہیں۔ کبھی کبھار ایک آدھ نمبر موصول ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے سالانہ چندہ کا تقاضا کرنا بے محل اور چندے کے لئے دفتر کا اصرار ناروا ہے۔"

دفتر کا طریقہ یہ رہا ہے کہ اسکول کی جانب سے پہلی مرتبہ خریداری کا آرڈر اور بل بھیج کر چندہ وصول کرنے کی ہدایت آتی ہے۔ پرچہ جاری کردیا جاتا ہے اور بل بھی بھیجدیا جاتا ہے۔ اسکول کے نام کی چٹ چھپوالی جاتی ہے۔ ہر نمبر بڑی احتیاط سے رجسٹر خریداری کو کئی بار چیک کرکے روانہ کیا جاتا ہے۔ سال میں دو تین بار یاد دہانی کی جاتی ہے۔ جب میعاد خریداری ختم ہونے میں ایک ماہ رہ جاتا ہے تو اگلے سال کے متعلق دفتر سے اطلاع دی جاتی ہے کہ فلاں تاریخ سے پرچہ آئندہ سال کی خریداری کے سلسلے میں جاری ہوگا۔ اگر خریداری منظور نہ ہو تو انکاری اطلاع دی جائے۔ یہ زحمت بھی گوارا نہ ہو تو پرچہ واپس کردیا جائے۔ جب پرچہ واپس نہیں آتا۔ تو اسکول کو دوسرے سال کے لئے خریدار تصور کرلیا جاتا ہے۔ اب پھر دو سال کے بلوں کی یاد دہانی پر یاد دہانی کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ خوش معاملہ اساتذہ یا تو دونوں سال کی رقم منی آرڈر کے ذریعے عنایت فرما دیتے ہیں یا ایک سال کا چندہ بھیج کر آئندہ کے لئے خریداری سے انکار کر دیتے ہیں۔ یہ کاروباری طریقہ ہے اور اس طریقے کو برتنے والے محترم استاد ہمارے دلی شکریہ کے مستحق ہیں۔ ہمیں تو شکایت اُن بزرگوں سے ہے جو یاد دہانیوں کے خطوط کو ردی کی ٹوکری کے حوالے کرتے رہتے ہیں اور پرچوں کو برابر وصول کئے جاتے ہیں۔ اب اگر وہ اسکول لائبریری تک پرچہ پہنچنے دیں تو چندے کی ادائگی کرنی پڑے۔ یہ پرچے تمام نمبر اسکول لائبریری کی ملکیت قرار پائیں۔ ان دو مصیبتوں سے چھٹکارے کی سبیل یہ نکالتے ہیں۔ کہ پرچوں کو اپنا حق بنا کر ان کے فائل اپنی گھریلو لائبریری میں محفوظ کردیتے ہیں۔ اور دفتر کو لکھ دیتے ہیں "ہمارے اسکول میں یہ پرچہ آتا ہی نہیں۔ ایک آدھ بار آیا تو اس کے لئے چندے کا مطالبہ نامناسب ہے۔"

لیجئے قصہ ختم یعنی دو سال پرچہ وصول کرتے رہے اور آخیر میں بہ یک جنبشِ قلم اس کی وصول یابی اور واجب الادا قیمت کی ادائگی سے انکار کر دیا۔

ان بے درد نادہندوں نے یہ شیوہ اختیار کر رکھا ہے۔ اب آپ ہی کہئے کہ یہ حضرات کسی احترام یا عزت کے مستحق قرار دئے جاسکتے ہیں؟ رسالہ ادبی دنیا، شاہکار اور پریم کا دس ہزار روپے کے لگ بھگ اسکولوں کی بقایا کی صورت میں زیادہ تر ان خوش معاملہ اساتذہ سے اس کے سوا کیا عرض کروں کہ سد

آپ ہی اپنے ذرا جور و ستم کو دیکھیں
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

مولینا اکبر شاہ خاں مرحوم

مولینا اکبر شاہ خاں مرحوم نجیب آبادی کے انتقال سے ایک عدیم النظیر اسلامی مؤرخ کی جگہ خالی ہوئی ہے۔ مولینا موصوف کی گرانمایہ تصانیف ہندوستان کے اہلِ نظر سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہیں۔ وہ تاریخ کے جس موضوع پر قلم اٹھاتے تھے زندگی کی تمام فرصتوں کو اُس کی تکمیل کے نذر کر دیا کرتے تھے۔ اسی لئے ہر تصنیف اپنے نوع کے لحاظ سے نہایت جامع، حاوی اور دلچسپ تسلیم کی جاتی ہے۔

مرحوم کا اندازِ تحریر اس قدر دلکش اور تحسین آفریں ہے کہ جذبۂ اختلاف کو ابھرنے نہیں دیتا۔ انہیں میں چند صاحبِ طرز نثاروں میں شمار کرتا ہوں۔ افسوس ہے کہ ان کی کئی بے بہا تصانیف بد معاملہ پبلشروں کے سر صدقے ہوگئیں۔ مرحوم قانونی چارہ جوئی اور عدالتی دوا دوش کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ اسی لئے پبلشروں کی بددیانتی کامیاب ہوگئی اور مصنف اپنی دماغ سوزی کا صلہ پانے سے محروم رہ گیا۔

مولینا مرحوم مشرقی صفات کا ایک نمونہ تھے۔ اپنے والدین کی اطاعت فرماں برداری اور خدمت گزاری کو اپنی زندگی سے عزیز تر خیال کرتے تھے۔ بڑے بڑے مشاہروں کی ملازمتوں سے انہوں نے صرف اس لئے انکار کیا کہ والدین کی خدمت خود کرنا چاہتے تھے۔ اس خانہ نشینی کے سبب عسرتِ حال کی بھی کبھی پروا نہ کی۔ خاندان کے درماندہ متعلقین کی پرورش اسی عسرت میں کرتے رہے۔

یوں تو ان کی تمام تصانیف اپنا جواب آپ ہیں۔ لیکن زیرِ تصنیف تاریخ اسلام پر انہوں نے بے انتہا محنت اور ملک کے کتبخانوں کی چھان بین کی تھی۔ افسوس ہے وہ اپنی زندگی میں اپنے اس کارنامے کو اشاعتی مرحلے سے نہ نکال سکے۔

میرے وہ صرف ہموطن ہی نہ تھے ہم قوم اور عزیز ترین اقارب میں سے بھی تھے۔ مجھے ان کی موت پر سہ گونہ صدمہ ہے۔ بہت کم حضرات کو یہ علم ہوگا کہ مولینا مرحوم اردو اور فارسی کے بہت بلیغ اور بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ ضلع بجنور اور نجیب آباد میں ادبی تحریکات کے بانی تھے۔ ان کا ایک فارسی شعر اس وقت ذہن میں ہے۔ اس سے ان کی نغز گفتاری کا اندازہ ہو سکے گا۔ شعر:

"درسِ شگفتگی ز دبستانِ ما مجو!
گُل غنچہ می شود ز نگاہِ ادیبِ ما"

مختصر یہ کہ تصنیف و تالیف، اخبار نویسی، مقالہ نگاری، شاعری، تقریر و تحریر میں یکساں کمال کے مالک تھے۔

افغان تھے اور افغانیت کے اس درجہ دلدادہ کہ شیر شاہ سوری اور دوسرے افغان سلاطین کے حکومتی کارناموں کو تاریخی لٹریچر کے بحرِ بیکراں میں پیر کر قعرِ بحر سے موتی نکال لاتے تھے۔ اس جامعیت کمال و صفات کے لوگ اب نظر نہیں آتے۔

اہلِ نظر ان کے تصنیفی کمالات کی قدر اسی صورت میں کر سکتے ہیں کہ عبرت بک ڈپو نجیب آباد (یو پی) سے ان کی تصانیف کی خریداری کریں۔

مولوی ایوب خاں صاحب جو مولینا مرحوم کے خواہر زادہ اور داماد بھی ہیں مرحوم کی تصانیف اور عبرت بک ڈپو کے مالک ہیں۔

شاہکار کی تاخیرِ اشاعت

شاہکار وقتِ اشاعت سے بہت پہلے شائع کیا جا رہا تھا۔ مگر میری دفتری روایات نے اُسے خلافِ وضع تصور کیا اور موسم کے ساتھ ساز باز کر کے میرے کارکنوں کو رہین بستر بنا دیا۔ میرے دستِ راست جناب گوپال متل بی۔ اے۔ کچھ ایسی بُری طرح بیمار پڑ گئے ہیں کہ قارئین کی مخلصانہ دعاؤں کے بغیر صرف ڈاکٹروں سے اُن کا تندرست ہونا دشوار نظر آ رہا ہے۔ خود میں بھی ہجومِ کار و فشارِ افکار سے درماندہ ہو رہا ہوں۔ سوچ رہا تھا کہ تھوڑی سی فرصت نکال کر آرام لینے کے لئے بیمار پڑ جاؤں۔ مگر متل صاحب نے پیش قدمی کر کے مجھے اس حق سے محروم کر دیا۔ پرچہ مدت سے تیار ہے۔ لیکن ادارے کے مستقل عنوانات کی خانہ پُری کے سبب رُکا پڑا ہے۔ کاپیوں کی تصحیح بھی باقی ہے۔ کاتب کے مسلسل احتجاج کے بغیر میں نے مختصرات کبھی نہیں لکھے۔ لیکن اب کے کاتب بھی جب آتا ہے متل صاحب ہی کی شکایات کا طومار لے کے آتا ہے۔ بھلا مانس یہ نہیں کہتا کہ آپ مختصرات کب لکھیں گے اور اب تک کیوں نہیں لکھے۔ میں متل صاحب کے متعلق اُس کی شکایات کی پُر جوش تائید کر دیتا ہوں اور وہ مجھ سے مختصرات کا تقاضا کئے بغیر

مطمئن ہو کر چلا جاتا ہے۔ مختصرات سے کاتب کی بے اعتنائی نے میری طاقتِ تحریر کو بھی مفلوج کر رکھا ہے۔ کم بخت اگر ذرا سنبھل کے مجھے بھی دو کلمۂ خیر سے یاد کر لیتا تو میں اپنے حصے کے مضامین لکھ کر اس فکر سے نجات پا سکتا۔

اب اُس کے تقاضے کے بغیر میں لکھوں تو کیا لکھوں اور کیوں کر لکھوں۔ اِدھر تاخیرِ اشاعت کا رنج الگ وبالِ احساس بن رہا ہے۔ خدا جانے اُسے اتنی توفیق کب ہو گی کہ مجھے بھی خوابِ فرصت سے بیدار کرے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ قارئین کی شاہکار کی جانب سے بے نیازی نے میرے حوصلے پست کر رکھے ہیں۔ ورنہ میں طغیانِ شوق کے زیرِ اثر شاہکار کو جاری کیا تھا۔ قارئین اپنی قدرشناسی کے فرض کا بھی احساس کرتے تو یہ طغیان کتنی ترقی کر کے ہنگامے میں تبدیل ہو سکتا اور اب تو سچ یہ ہے وضعداری کو نباہنے کی مجبوری کے سوا اور کوئی وجہِ تشویق و ترغیب نہیں۔ کام دل کی لگن کے ساتھ وقت سے پہلے کیا جائے تو کس حوصلے اور کس امید پر؟

دل و دماغ پر بے دلی چھائی ہوئی ہے۔ کوئی امنگ نہیں کوئی ولولہ نہیں۔ ہجوم نافہمی کو دیکھ دیکھ کر احساسات مشتعل ہیں اور ارادے کس باطل۔ دیکھ رہا ہوں کہ ستم ظریف تماشائی بدستور گرویدۂ تماشا ہیں۔ اہلِ نظر کے متعلق جگر فرماتے ہیں کہ

"وہ حالِ دل لبِ خاموش سے بھی سنتے ہیں"

سنتے ہوں گے۔ میں کیسے مان لوں کہ گوشِ شنوا رکھنے والے لبِ خاموش کو بھی زبانِ گفتار بنا لیتے ہیں کہ میرے اہلِ نظر تو نعرۂ فریاد و فغاں کو ساکت و صامت درختوں کی طرح سننے کے عادی ہیں۔ یہ بھی میرا حسنِ ظن ہے۔ ورنہ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ کچھ سنتے بھی ہیں کہ نہیں؟

مدارس کے اساتذہ میں سے اُن قابلِ احترام حضرات کو مستثنیٰ کر دیجئے۔ جو "با دوستاں مدارا" کے اصول پر کاربند ہیں زیادہ تعداد تو اُن ناآشنائے درد بزرگواروں کی نکل آتی ہے۔ جنہیں ستانے میں لطف آتا ہے۔ اس وقت مدارس کے ذمے دو ہزار سے زیادہ رقم پریم اور شاہکار کی باقی ہے۔ یاد دہانی پہ یاد دہانی کی جا رہی ہے مگر "صدائے برنخیزد" کا سماں ہے۔ ان حضرات کے بیدردانہ طرزِ عمل سے اس قدر نالاں ہوں۔ کہ اگر آنریبل وزیرِ تعلیم کچھ دنوں کے لئے قلمدانِ وزارت میرے سپرد فرما دیں تو اسکولوں پر بزن بول دوں کٹ، تخفیف، تنزّل، برخاستگی، تبادلے۔ ان سب ہتھیاروں سے کام لینا شروع کر دوں۔ ڈیرہ غازی خاں کے اُن علاقوں میں جہاں تالابوں کے دلدل کو بلو کر پینے کا پانی حاصل کیا جاتا ہے۔ بد معاملہ استادوں کی ایک نوآبادی بنا دوں۔

ڈسٹرکٹ انسپکٹروں میں شاہ پور اور ہوشیار پور کے بزرگوں کو محکمے کی بہبود کی تجاویز کے پیشِ نظر .... دور دراز علاقوں کے مڈل اسکولوں کی ہیڈ ماسٹری پر بھجوا دوں۔

غرضیکہ ان غیر معروف نام نہاد خدمتگزارانِ تعلیم پر ایسا خلفشار طاری کر دوں کہ خدا اور اس کے قانونِ جزا و سزا کو تسلیم کرنے لگیں۔

شاہکار اور پریم اپنے میرٹ کے اعتبار سے یہ حق رکھتے ہیں کہ مدارس اپنی ضرورت کی چیز سمجھ کر ان کی اشاعت میں حصہ لیتے اور اساتذہ اپنی بے کس جماعت کا نقیب ہم آہنگ خیال کر کے شاہکار کی خریداری کو فرض خیال کرتے مگر اس مقدس انبوہ میں کہاں [illegible] یہ جواب ہے کہ مدارس میں ایسے غاصب اساتذہ کی بھی کمی نہیں جو پرچوں کو سکول لائبریری تک نہیں پہنچنے دیتے اور اپنا ذاتی مال بنا کر گھر میں رکھ لیتے ہیں۔ پھر جب دفتر والے بل کی ادائگی کا تقاضا کرتے ہیں تو نہایت ڈھٹائی اور بے حمیتی سے جواب دیدیتے ہیں کہ کون تھا، کیا تھا، کب تھا۔ ہم نے تو دیکھا ہی نہیں۔"

مجبور ہو کر افسرانِ تعلیم سے جب شکایت کی جاتی ہے تو پرچے کی بدانتظامی کے شکوے لکھ لکھ کر انہیں پرچوں کی طرف سے بدظن کرنے کی نیکی سے دریغ نہیں کرتے۔

ایسے اخلاق باختہ حضرات قوم کے بچوں کے دل و دماغ پر اپنی درخشاں صفات کا جو اثر ڈالیں گے۔ اس کا اندازہ ہر فہمیدہ انسان کر سکتا ہے۔

انسپکٹران مدارس کی خدمت میں

ڈسٹرکٹ انسپکٹروں اور اے ڈی آئی صاحبان کی خدمت میں گزارش ہے کہ میں اپنی ناسازیٔ صحت، بجٹ کی تہی دامنی، گرمی کی آتش فشانی شدّت کے تواتر اور کچھ ہجومِ کار کے سبب دو سال سے دورہ نہیں کر سکا۔ اس سبب سے شاہکار اور پریم کی اشاعت گرتے گرتے اس حد تک آ چکی ہے کہ مجھے دونوں پرچوں میں ناقابلِ برداشت خسارہ ہو رہا ہے۔ پرچوں کو بند اس وجہ سے نہیں کر سکا کہ بو۔ گول

کا بقیہ روپیہ ادا کرنے کی کوئی سبیل نہیں اور جاری رکھنا اس لئے دشوار ہو رہا ہے کہ خسارے کی مقدار روز افزوں ہوتی جاتی ہے۔ اردو مرکز بک ڈپو کے سیٹس کی فروخت سے اس خسارے کو پورا کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اردو مرکز کی کتابوں سے شاہکار و پریم کو کوئی واسطہ نہ تھا۔ یہ کتابیں میرے متعلقین کا حصہ تھیں۔ اب ان کتابوں کی فروخت کی رفتار بھی مریض جاں بلب کی نبض کی طرح دھیمی پڑ گئی ہے۔

شاہکار و پریم کو جاری رکھنے کی صورت بھی دھندلی ہوتی جاتی ہے۔ اب یا تو وہ اپنی قدر شناس توجہ کو بیدار کریں اور معقول پرچوں کی خریداری کی کوئی سبیل نکالیں۔ یا "اردو مرکز" کے سیٹس کی خریداری کا کچھ انتظام فرمائیں اور جن جن اسکولوں میں فنڈز ہوں ایک ایک دو دو سیٹس کی خریداری کا انہیں مشورہ دیں۔ یہ امر بھی دشوار ہو تو جن جن لوکلوں کا روپیہ باقی ہے۔ ان کی جانب سے عدالتی چارہ جوئی کے خوف سے مجھے پناہ دیں تاکہ میں مفت کے خلفشار سے اپنی چند روزہ زندگی کے لئے مخلصی حاصل کروں۔ میں نے مدارس کی تعلیمی و ادبی ضروریات کے پیش نظر شاہکار کو خالص تعلیمی پرچہ بنا لیا ہے اور "ریش ادیب بدست استاداں افتادہ است" کی مضحکہ خیز مصیبت میں اپنے آپ کو گرفتار کر لیا ہے۔ میں انسپکٹران مدارس سے اپنی امداد کا طالب نہیں۔ کیونکہ میری معاش کا میری ادبی خدمت سے کوئی تعلق نہیں۔ میں یہ ناپسند کرتا ہوں کہ وہ میرے پرچوں کو اس لئے خریدیں کہ وہ میرے پرچے ہیں۔ میری جائز استدعا صرف یہ ہے کہ وہ ایک بار اپنے لمحات فرصت میں میرے پرچوں کا تمام ادبی و اطفالی پرچوں سے مقابلہ کریں۔ پھر اگر مدارس کی ضروریات کے مطابق شاہکار و پریم کو اپنے اپنے رنگ میں سب سے بہتر اور ممتاز تر پائیں تو ان کے میرٹ کا صلہ دینے میں دریغ نہ فرمائیں۔

میرے لئے یہ احساس سوہان روح کا باعث رہتا ہے کہ اکثر انسپکٹران مدارس اردو زبان و ادب سے ناآشنا ہونے کے سبب میری محنتوں کو نظر انداز کر رہے ہیں اور مجھے عام پبلشروں کے انبوہ میں شامل تصور کرتے ہیں۔ اس طوفان بے امتیازی سے میں نقصان اٹھا رہا ہوں لیکن اس سلسلے میں میرے گلے شکوے بڑھتے بڑھتے موجب اضمحلال و اشتعال بن گئے ہیں پبلشروں کی بے مغز و درندہ جماعت میں تو زندگی اور قوت معدوں کو اپنی ذلت خیال کرتا ہوں۔

اقبال مرحوم نے نوجوانوں کیلئے خدا سے جو دعا کی ہے میں افسران تعلیم کے حق میں اپنے لئے وہی دعا کرتا رہتا ہوں۔

خدا ان کو "سوز جگر بخش دے

مرا عشق، میری نظر بخش دے"

مگر جانتا ہوں کہ مرحوم کی مخلصانہ دعا قبولیت حاصل نہ کر سکی تو میری خود غرضانہ استدعا کو شرف پذیرائی کب حاصل ہو سکتا ہے۔

تاجور

خواجہ غلام السیدین کا نیا عہدہ

خواجہ غلام السیدین ایم۔ اے پرنسپل ٹریننگ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ریاست کشمیر میں ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشنز مقرر ہوئے اور اس تقرر کے لئے ریاست کے ارباب بست و کشاد مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اس عہدے کے لئے خواجہ صاحب سے بہتر آدمی ملنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا۔

خواجہ صاحب اپنے تعلیمی تجربے اور فکر و نظر کے اعتبار سے تمام ہندوستان میں مشہور ہیں۔ زمانہ طالب علمی میں ہی انہوں نے اپنی غیر معمولی ذہانت اور قابلیت کی بدولت تعلیمی حلقوں میں نام پیدا کر لیا تھا۔ چنانچہ ان دنوں بنارس یونیورسٹی میں خطابت کا جو آل انڈیا مقابلہ ہوا تھا اس میں آپ اول رہے تھے۔

تعلیمی مسائل میں آپ کو جو بصیرت حاصل ہے اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ مسئلہ تعلیم پر بہترین محققانہ مقالہ لکھنے کے صلے میں آپ کو برمنگھم یونیورسٹی کی طرف سے جارج کیڈبری کا انعام ملا تھا اور آپ پہلے ہندوستانی ہیں جن کو یہ اعزاز حاصل ہوا ہے۔ اس انعام کی قدر و منزلت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ انعام ملنے کی خوشی میں انگلستان کے بہترین ادبا اور اخبار نویسوں نے خواجہ صاحب کو پیغامات تہنیت ارسال کئے تھے۔

جس کمیٹی نے واردھا ایجوکیشن سکیم کے خاکے میں رنگ بھرا اس کے بھی آپ ایک اہم رکن تھے اور آپ کی اصابت رائے کا کمیٹی کے تمام ممبروں کو اعتراف تھا۔ ان تمام خوبیوں کے علاوہ آپ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ فرقہ وارانہ تنگ نظری سے بالکل مبرا ہیں۔ امید کی جانی چاہیئے کہ آپ کا تقرر ریاست کے محکمہ تعلیم کے لئے موجب سعادت ہو گیا۔ اور ریاست میں تعلیمی ترقیات کی رفتار تیز تر ہو جائیگی۔

سوال و جواب

سوالات

(۱) میرے دانتوں میں درد رہتا ہے۔ خون بھی نکلتا ہے۔ بہت سے مشہور انگریزی اور دیسی منجن برت چکا ہوں۔ فائدہ نہیں ہوا۔ دانتوں میں ہل بھی رہتی ہے۔ کرم فرما کر منجن کا کوئی مفید نسخہ مجھے بتلائیے یا شاہکار کے ناظرین میں کوئی صاحب کسی مجرب منجن سے آگاہ ہوں تو وہ مطلع فرمائیں۔

کریم الدین، اضطرار، امرتسر

(۲) آپ نے اپریل کے شاہکار میں جو محترمہ شرافت بیگم کا مضمون شائع کیا ہے۔ اُسے میں نے پڑھا۔ اندازِ بیان تو بے شک اس کا بہت شاندار اور دلکش ہے۔ مگر نفسِ مفہوم بڑا زہریلا ہے۔ تعلیم یافتہ خواتین اسے پڑھ کر مردوں کی دشمن ہو جائیں گی اور معاشرت میں بدنظمی پھیلنے کا خطرہ ہے۔ آپ اس نکتے پر غور فرماتے تو اس مضمون کو نہ شائع کرتے۔ یا اس کی اشاعت ایسی ہی ضروری تھی تو ایک تردیدی نوٹ شائع کرنا ضروری تھا۔

عبدالغنی منشی فاضل لدھیانہ

(۳) آپ نے کسی نمبر کے صفحۂ تصحیح میں "پرواہ" کے لفظ کو غلط بتایا ہے اور اس کی بجائے "پروا" کی تصحیح کی ہے۔ مجھے اس سے اختلاف ہے کیونکہ میں نے بہت سے مصنفین کی عبارتوں میں پرواہ لکھا دیکھا ہے۔ اچھے اچھے اخبار نویس پرواہ ہی لکھتے ہیں۔ آپ اس پر مزید روشنی ڈال کر ممنون فرمائیں۔

(۴) مُلّا۔ مولوی۔ مولانا۔ علامہ کا مفہوم کیا ہے۔ ان میں معنوی امتیاز کیا ہے۔ کن کن صفات کے لوگوں کے لئے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ تفصیلی آگاہی چاہتا ہوں۔

محمد اشرف بی۔ اے۔ ایل ایل بی۔
لکھنؤ جھنوائی ٹولہ

جوابات

(۱) جناب میں ماہر امراضِ دندان نہیں ہوں۔ بلکہ اس مصیبت میں خود مبتلا رہ چکا ہوں۔

پنجاب کے مشہور ڈینٹل سرجن ڈاکٹر احمد جلال الدین کی توجہات کریمانہ نے مجھے دانتوں کی بیماریوں اور ایک چوتھائی دانتوں سے بھی نجات دلائی ہے۔ اُن کا ممنون ہوں۔ آپ کو صحت اور زندگی کی خواہش ہے تو لاہور آئیے! ڈاکٹر صاحب سے آپ کا اور آپ کے دانتوں کا تعارف کرا دوں گا۔ خدا نے انہیں دانتوں کی مہلک بیماریوں کا مسیحا بنا کر لاہور میں بھیجا ہے۔

معلوم ہوتا ہے آپ پائیوریا کے موذی مرض میں مبتلا ہیں۔ اس مرض سے بے پروائی کا خمیازہ خمارموت کی صورت میں بھگتنا پڑتا ہے۔ پائیوریا کے سبب معدہ، جگر، دل کمزور ہو جاتے ہیں۔ وجع مفاصل (گنٹھیا) شب کوری (رتوندا) فساد خون کی بیماریاں پائیوریا کے زیرِ عاطفت نشوونما کا موقع پاتی ہیں۔ پائیوریا میں مبتلا ہونے سے پہلے مجھے خود اس کی خطرناکی کا صحیح اندازہ نہ تھا۔ جب اس میں مبتلا ہوا تو پتہ چلا کہ موت کا ایک نام پائیوریا بھی ہے۔ کئی مضبوط دانت جیتے جیتے نکلوانے پڑے۔ مہینوں ڈاکٹر جلال الدین نے علاج کیا۔ تب اس بلائے مبرم سے نجات پائی۔ آپ کے دانتوں سے خون کا نکلنا ظاہر کر رہا ہے کہ آپ پائیوریا کی زد میں آ چکے ہیں۔ اب اس سے غفلت آپ کو بہت مہنگی پڑے گی۔

یہ بھی واضح رہے کہ ہر سند یافتہ ڈاکٹر ہر دندان ساز بلکہ دانتوں کی بیماریوں کا ہر معالج "پائیوریا" وغیرہ کا صحیح معالج نہیں ہوتا۔ صوبے بھر میں ایک آدھ کوئی ماہر امراض دندان ہوا کرتا ہے۔ ڈاکٹر احمد جلال الدین کی کئی پشت سے یہ پیشہ ورانتہ چلا آتا ہے۔ اس سلسلے میں ولایت کے مختلف ہسپتالوں میں کام کا تجربہ بھی رکھتے ہیں۔ بلا مبالغہ اس فن میں اختصاصی اسپیشلسٹ ہیں۔ لاہور میں مال روڈ متصل ٹینپل ہوٹل ان کی کوٹھی ہے۔ آپ چاہیں تو لاہور آ کر اپنے دانتوں کا معائنہ کرا لیں۔

(۲) عزیزہ فاضلہ شرافت بیگم کا مضمون شائع کرتے ہوئے میں نے ایک نوٹ میں یہ ظاہر کر دیا تھا کہ ان کے نفسِ مضمون سے ہمیں اتفاق

نہیں۔ چونکہ مضمون کا اندازِ نگارش بہت شاندار ہے اور ایک ہونہار لڑکی کے قلم سے نکلا ہے۔ اس لئے ہم اسے شائع کر رہے ہیں۔

آپ تحریر فرماتے ہیں کہ "تعلیم یافتہ خواتین پر اس کا بُرا اثر ہوگا۔" بجا ہے۔ آپ کو ابھی تک نہیں محسوس ہوا کہ تعلیم یافتہ تو درکنار ان پڑھ عورتوں کے دماغ میں بھی صنفِ کرخت کے خلاف بغاوت کے جراثیم پرورش پا رہے ہیں۔ کچھ تو مردوں کے بیجا تسلط نے اور بہت کچھ نسوانی پرچوں نے صنفِ لطیف میں تمرّد و سرکشی کے جذبات پیدا کر دئے ہیں۔ نصف صدی پہلے کی شوہر پرست بیویاں اب جنت کی بیویاں بن چکی ہیں۔ اب وہ خواب دیکھنے چھوڑ دیجئے۔ پرانی تہذیب پرانے زمانے کے ساتھ سدھاری۔ اب نئی معاشرت، نئی سوسائٹی، نئی تعلیم، نئی روشنی اور نیا زمانہ آچکا ہے۔ مرد قبروں میں آسودۂ خواب ہیں۔

مغرب زدہ مردوں میں نسوانی خیالات رونما ہیں۔ عورت ترقی کرکے مرد کی حاکم مسلط بن چکی ہے اور ابھی تو ابتدائے عشق ہے۔

"اس مبتدا کی دیکھئے نکلے خبر کہاں؟"

وقت آرہا ہے کہ اپنی اکثریت کے بل پر حکومت کی باگ ڈور نگوڑے ہل چلانے والے ہاتھ میں ہوگی اور آپ کو نگوڑے کی رسّی ہاتھ میں لینی پڑے گی۔ اور اگر مردانہ غیرت اس تصور کو برداشت نہ کر سکے تو اس وحشتناک مستقبل کے حال بننے سے پہلے پڑ یا پھانک کر سو جائیے۔ پھر

"اپنی بلا سے بوم بسے یا ہُما رہے"

حافظ عبداللہ ایم۔ ایل۔ اے کے شریعت بل کی منظوری نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ اب ذرا بیگم صاحبہ کو "تمہے تو" کسی شوہر نے کہا اور انہوں نے دو سطری درخواست اور دو مغرب زدہ مرد گواہ پیش کرکے کسی عدالت سے طلاق حاصل کی اور یہ جا وہ جا۔ قبلہ بُرا زمانہ آرہا ہے۔ میں بھی آپ کا ہم خیال ہوں۔ مرنا آسان ہوتا تو اس دورِ نسواں گردی کی زندگی پر ترجیح دیتا۔ میرا مردانہ مشرب تو یہ ہے کہ کائنات اور عورت صرف مرد کی خدمت کیلئے پیدا کی گئی ہے۔ وہ صرف مرد خدا کی سرزمین پر اس کا خلیفۂ برحق ہے۔ مگر اس زن پرستی کے زمانے میں ہماری آپ کی کون سنتا ہے۔ ہماری گنوار ہٹ یا راج ہٹ کا وقت گیا۔ اب تو تریا ہٹ کا دَور دورہ ہے۔ مردوں کے لئے زندگی میں کوئی عزت باقی رہی ہے نہ لطف۔ آپ میری طرح مرنے سے ڈرتے ہوں تو یہ تماشائے نادیدنی دیکھنے کے لئے زندہ رہیئے! اور اگر حمیتِ مردانہ اس انقلاب کو برداشت نہ کر سکے تو بس ایک ہی علاج ہے۔ کلمۂ شہادت۔

(۳) پروا صحیح پرواہ غلط۔ جس نے پرواہ لکھا غلط لکھا۔ اس میں زید عمر و بکر کا امتیاز نہیں۔ فارسی نظم و نثر میں لفظ "ہائے ہوّز" کے بغیر استعمال ہوا ہے۔ کسی فارسی شاعر یا ادیب نے "پرواہ" نہیں لکھا۔ اردو کے مستند انشا پرداز جو الفاظ کے صحیح استعمال اور صحیح املا کا خیال رکھتے ہیں کبھی "پرواہ" نہیں لکھتے۔ ؎

خندۂ اہلِ جہاں کی مجھے پروا کیا تھی؟
تم بھی ہنستے ہو مرے حال پہ رونا ہے یہی
(مولانا حسرت موہانی)

اردو کے مستند شعراء نے زیبا اور بجا کے قافیے میں پروا کو استعمال کیا ہے۔ بجا کا قافیہ پرواہ کسی نے نہیں لکھا۔ آپ نے جن مستند مصنفین کی عبارتوں میں "پرواہ" لکھا دیکھا ہے وہ یا تو مستند نہیں ہوں گے یا ان سے سہوِ کتابت ہوا ہوگا۔ کاتب حضرات کی بیجا اصلاح بھی عموماً ایسے گل کترتی رہتی ہے۔

(۴) "مولیٰ" اضداد میں سے ہے۔ آقا اور غلام دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ غلاموں کو موالی بھی کہتے ہیں۔ مُلّا۔ مولوی اور مولینا اسی مولیٰ سے بنائے گئے ہیں۔ مولیٰ یعنی آقا اور سردار ہے۔ مولوی میرا آقا۔ مولینا ہمارے آقا۔ مولیٰ کثرتِ استعمال سے مُلّا ہو گیا۔ علامہ عالم کا مبالغہ ہے۔ بہت بڑے جامع حیثیت کے عالم کو علامہ کہتے ہیں۔ یہ تو ہے لغوی اور قدیم اصطلاحی استعمال۔

یہ سب الفاظ اُن علماء کے لئے بطور اعزاز استعمال ہوتے تھے جو امتیازی طور پر علم و فضل اور جامع معقول و منقول سمجھے جاتے تھے۔ جیسے علامہ قطب الدین رازی۔ علامہ تاج الدین سبکی۔ علامہ تفتازانی وغیرہ۔

جامی اور رومی کے لئے مولوی اور مولینا دونوں لفظ استعمال ہوتے ہیں۔ جامی کو عام طور پر مُلّا جامی کہتے ہیں۔

نئی روشنی میں ان الفاظ کی ایسی مٹی خراب ہوئی ہے کہ خدا کی پناہ۔ ہر بی۔ اے پاس مولینا، ہر ایڈیٹر خواہ کتنا ہی نالائق اور بے خبر ہو مولینا، ہر انجمن کا سیکرٹری، ہر لیڈر خواہ عربی سے کلی طور پر نابلد ہو مولینا۔ ہر شاعر کتنا ہی کم سواد یا بے سواد ہو۔ مولینا کے ناموزوں لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

ایک رسالے کا مالک جو خود بے علم تھا اپنے نام کے ساتھ مینجر کی حیثیت میں سرورق پر مولینا لکھوانا تھا اور مجھے کہ میں اُس

رسالے کا مدیر تھا۔ صرف احسان اللہ خاں لکھنے کی اجازت دیتا تھا۔ ایک دن بہت سخاوت پر اُترا تو منشی احسان اللہ خاں لکھ مارا اور پھر مجھ سے اپنی حاتمی کی داد طلب کرنے لگا۔۔۔

میرے نام کے ساتھ سب سے پہلے مولانا ظفر علی خاں صاحب قبلہ نے علامہ لکھنا شروع کیا۔ ان کی دیکھا دیکھی دوسرے اہلِ قلم بھی مجھے علامہ لکھنے لگے۔ اس پر میرا ایک ہمعصر ادیب بہت آتش زیر پا چلا آتا ہے۔ خود منشی فاضل اور روایا بھٹنڈہ بی۔ اے (ادنیٰ انگلش) ہے مگر دیرینہ ذاتی عناد کی بنا پر اپنے اخبار میں جب کوئی فقرہ مجھ پر کستا ہے طنزاً توسین میں علامہ لکھتا ہے۔ حالانکہ خود حضرت مولانا بنا ہوا ہے۔ اس مردِ خدا کو کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ اگر میں باایں ہمہ بے سوادی "حضرت مولانا" کہلانے کا مستحق ہوں تو میرا ایک معاصر جس نے علوم عربیہ کی تحصیل و تکمیل پر پندرہ سال صرف کئے ہیں۔ مقابلتہً "بحر العلوم" کہلائے جانے کا ضرور مستحق ہے۔

میں اپنے عندیے میں نہ مولوی کے لفظ کا صحیح مصداق ہوں۔ نہ مولانا اور علامہ کا۔ مگر ہر بے سواد کو مولوی اور مولانا ہر جہل مرکب کو علامہ دیکھ کہ میرا غرورِ علم موجودہ دورِ غلط بخشی میں مجھے علامگی کا حقدار تصور کرتا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مُلّا۔ مولوی اور مولانا کے الفاظ کے مستحق مشاہیر علماء میں بھی دو چار نکلیں گے۔ اس سے زیادہ نہیں اور علامہ کا لقب تو کچھ حضرت استاذ مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ ہی کا حق تھا۔

تاجور

بانسری

بانسری تیری صدا میں عشق کا اعجاز ہے　　　تیری لَے دنیائے غم کا ایک گہرا راز ہے
ناچتا ہے تیری لے پر سازِ الفت کا گداز　　　کھو گیا ہے تیری لَے میں مطلقاً فطرت کا ساز
تیرے نغموں سے جہانِ رنگ و بو مدہوش ہے　　　اور پپیہے کا ترانہ 'پی کہاں' خاموش ہے
پیکرِ صد زمزمہ تو ہے ترنم کا وقار
ہو رہے ہیں تجھ پہ دیپک بھیرویں ملکر نثار

سحر ہے، جادو ہے ہاں کیا ہے تری آواز میں؟　　　بیخودی یا مُتزج ہے شورشوں کے ساز میں؟
جنگلوں کی خامشی پر ہے مسلّط بانسری　　　بانسری جس کی ہر اک لے میں نہاں ہے زندگی
جھوم اُٹھا ہے تخیل، رقص میں ہے کائنات　　　مثلِ مکیش لڑکھڑاتی ہے۔ تری لَے پر حیات
بیخودی طاری ہے، ساکت ہے جہانِ شور و شر　　　ایک اک شے اپنی ہستی سے ہے یکسر بے خبر
التہاب انگیز ہے دریا مرے جذبات کا　　　اور فضا پر چھا گیا ہے اک فسوں نغمات کا
مضطرب ہے صورتِ سیماب رفتارِ چناب　　　ایک دیوانے کی صورت مست ہے موجِ شباب
قلب کی گہرائیوں کی ترجماں ہے بانسری　　　اہلِ عرفاں کے جنوں کی راز داں ہے بانسری
بانسری کی لَے میں سوزِ زندگی پاتا ہوں میں
اِک جہانِ سرمدی میں جھومتا جاتا ہوں میں

اثر چکوالی بی۔ اے

تصحیح

(مستقل عنوان)

اَقَلِّیَّت - اَکثَرِیَّت

ان الفاظ کے صحیح تلفظ کا تجزیہ حسب ذیل ہے:-

اَقَل لِی یت - اَکَث رِی یت

جو لوگ اَقَ لِیَت ، اکَث رِیَت تلفظ کرتے ہیں غلطی کرتے ہیں :

اَقَلِّیَّت - اَکثَرِیَّت

تاجور

غزل

عاشقی کا حوصلہ بیکار ہے تیرے بغیر
آرزو کی زندگی دشوار ہے تیرے بغیر

کاروبارِ شوق کی اب وہ تن آسانی کہاں
دل پہ ذوقِ شاعری اک بار ہے تیرے بغیر

شرکتِ بزمِ سخن سے بھی ہمیں، باوصفِ عزم
بر بنائے بیدلی انکار ہے تیرے بغیر

جس فراغت کا تمنّائی تھا میں تیرے لئے
اب وہ حاصل ہے تو اک آزار ہے تیرے بغیر

دردِ دل جو تھا کبھی وجہِ مباہات و شرف
بہرِ حسرت موجبِ صد عار ہے تیرے بغیر

حسرت موہانی

آرٹ

(میں نے اس مضمون کی تیاری کے لئے ٹالسٹائی کی کتاب "وٹ از آرٹ اینڈ الیسیز آن آرٹ" اور لارڈ ایوربری کی کتاب "دی پلیرآف لالف" سے بہت حد تک استفادہ کیا ہے۔)

آرٹ کے قدیم ترین نمونے جو آجکل دیکھنے میں آتے ہیں، وہ زیادہ تر جانوروں کی تصاویر پر مشتمل ہیں، دوسرے یہ نمونے بیشتر ہرن کی ہڈیوں پر کندہ کئے ہوئے ہیں، جو انگلستان، فرانس اور جرمنی کی نمائش گاہوں میں زینت و زیبائش کا کام دے رہے ہیں، ان کے علاوہ اور تصاویر بھی ہیں، جو مصری اور شامی مقبروں، معبدوں اور محلّات پر منقش ہیں۔ یہ تصاویر آرٹ کے فن، مناظر اور افسانہ نگاری کے لحاظ سے ایک عجیب جدّت کی مالک ہیں۔ گو یہ ضرور ہے، کہ ان میں بہت سی خامیاں بھی ہیں، مثلاً بعض تصاویر میں یہ دکھایا گیا ہے، کہ بادشاہ اپنے سپاہیوں سے طویل اور عریض ہے۔ حالانکہ یہ چیز بالکل غلط ہے، حکمراں ہونے کی حیثیت سے وہ اُن سے بڑا ہوسکتا ہے، لیکن اُس کا اپنے سپاہیوں سے قدامت اور ضخامت میں چوگنا ہونا بعید از عقل ہے، از منہ قدیم کے یہ جنگی مناظر افسانے کو صحیح اور صریح طور پر بیان کرنے میں موجودہ زمانے کی جنگی تصاویر سے کہیں زیادہ کامیاب ہیں، کیونکہ ایک نظر ڈالنے ہی سے، ہم پر یہ صاف واضح ہو جاتا ہے۔ کہ ان میں بادشاہ کون ہے؟ مصاحب کون ہیں؟ اور کونسی طرف فتح مند یا شکست یاب! زخمیوں کی تعداد کتنی ہے یا دشمن کی پسپائی وغیرہ، اس میں کچھ شک نہیں، کہ یہ تصاویر اپنے عہدِ حکومت کی شان و شوکت کی حقیقی علمبردار ہیں، گو یہ موجودہ زمانے کے آرٹ کی خوبصورتی اور دلکشی سے بالکل بے نیاز ہیں۔

عہد قدیم کے آرٹ میں اگر کسی آرٹ کو ہر زمانے میں کامیابی نصیب ہوئی ہے، تو وہ یونانی آرٹ ہے۔ جو ہر عہد میں زیادہ سے زیادہ تعریف و تحسین کا مستحق گردانا گیا ہے۔

آرٹ لامحالہ انسانی زندگی کی مسرتوں کا ایک بلند اور پاکیزہ عنصر ہے، جو دماغ کو آنکھ کی مدد سے درس دیتا ہے اور آنکھ دماغ کی مدد سے درس لیتی ہے، جس طرح دھوپ پھولوں میں رنگ بھر دیتی ہے، اسی طرح آرٹ زندگی کو رنگین بنا دیتا ہے، رسکن کہتا ہے کہ حقیقی آرٹ میں دل و دماغ اور ہاتھ ایک ساتھ ہو کر کام کرتے ہیں۔ آرٹ درس و تدریس کے زینے سے بہت بلند ہے اور صرف فرصت کے اوقات میں ہی لکھا جاسکتا ہے، آرٹ سازِ دل کا ایک نغمہ ہے، جس کو مخصوص بربطی کے سوا اور کوئی نہیں بجا سکتا۔ مطالعہ اور محنت کسی شخص کو فنِ کار نہیں بنا سکتے۔ گو یہ ضرور ہے کہ ہر حقیقی فنِ کار ان کے باوجود کامیاب فن کار نہیں کہلا سکتا، آرٹ کی دنیا میں دو اور دو مل کر چار نہیں ہوتے۔

یہ نظریہ اکثر نہایت وثوق کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے، کہ آرٹ کا مقصد محض خوش کرنا ہے، مگر میرے خیال میں آرٹ کے متعلق یہ نظریہ بالکل غلط خیالات پر مبنی ہے۔ کیونکہ یہ نظریہ بالکل اس خیال کے مطابق ہے، کہ کسی لائبریری کا قیام محض اس لئے وجود میں لایا گیا ہو کہ اس کا مقصد سوائے نمود و نمائش اور لوگوں کو خوش کرنے کے اور کچھ نہ ہو۔

جہاں تک آرٹ کا تعلق انسانی زندگی سے ہے، آرٹ فطرت کا دستِ راست ہے، بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کہ آرٹ کا کوئی پہلو فطرت سے بھی زیادہ بلند ہو جاتا ہے جیسا کہ حکیم افلاطون کہتا ہے "اگر تم آرٹ کی عظمت کو فطرت سے بلند دیکھنا چاہتے ہو، تو یوں کرو، کہ دو آدمیوں کا آپس میں مقابلہ کرو، جس میں سے ایک فطرت کا شاہکار ہو، اور دوسرا آرٹ کی موشگافی کا نتیجہ! تم دیکھو گے، کہ فطرت کا شاہکار، آرٹ کے شاہکار کے آگے ماند ہے۔ اور اوّل الذکر موخرالذکر سے زیادہ خوبصورت ہے، کیونکہ آرٹ فطرت کی نسبت صحیح اور زیادہ جاذبِ نظر ہے۔

یونانی شاعروں نے آرٹ کی عظمت کے متعلق ایک عجیب کہانی لکھی ہے۔ جس میں انہوں نے بتایا ہے کہ کس طرح پروٹیقس نے ایک خوبصورت مجسمہ بنایا اور کس طرح اس مجسمے کو دیکھ کر

منروا دیوی اس قدر مسرور ہوئی، کہ اُس نے "پرومیتھیس" کو اس بات کی اجازت دے دی - کہ وہ اس مجسمے کی تکمیل کے لئے رضواں سے جونسی چیز چاہے انتخاب کر کے لے آئے ، "پرومیتھیس" نے منروا کی اس بات کو پسند کیا - اور منروا کو بہشت میں لے جانے کے لئے کہا - تاکہ وہ اس مجسمے کی تکمیل کے لئے کوئی چیز خود انتخاب کر کے لائے ، "پرومیتھیس" نے دیکھا ، کہ بہشت میں تمام چیزیں آگ سے بنی ہوئی ہیں چنانچہ وہ بہشت سے اپنے ساتھ ایک "شعلہ" لایا - جس سے اس نے اپنے مجسمے کی تکمیل کی!

"اتباع" حقیقت میں آرٹ کی تکمیل تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے ، لیکن بذاتِ خود وہ انتہائے تکمیل نہیں ہے ، بعض "فن کار" فطرت کی ہو بہو نقاشی کو آرٹ کی تکمیل خیال کرتے ہیں ، لیکن اُن کا یہ نظریہ درست نہیں ہے - کیونکہ محض فطرت کی نقالی ایک کمزور سی چیز ہے - اگر اس میں انسانی تخیل کی چاشنی شامل نہ ہو ، "حقیقت اور تخیل کے امتزاج سے جو چیز پیدا ہو گی ، وہ محض حقیقت کی ترجمانی یا صرف تخیل سے بہت بلند ہو گی ، کیونکہ حُسن سراپا ایک تخیل ہے ، فطرت کا ہُو بہُو اتباع نہیں ہے ، مثلاً اگر کوئی آرٹسٹ اپنی کسی تصویر میں ایک جنگلی کوے کو ظاہر کرتا ہے ، تو اُس کیلئے ضروری ہے کہ وہ جنگلی کوے کے ساتھ گدھ کی ہڈیاں بھی ظاہر کرے ، حقیقتاً یہ چیز لازمی ہے ، لیکن اگر گدھ کی ہڈیاں ظاہر کرنے کی بجائے وہاں بجلی کی چمک ظاہر کی جائے گی ، تو تصویر ایک چیز نظر آئے گی - جیسا کہ "تنورٹ" نے اپنی ایک تصویر میں ایسا ہی ظاہر کیا ہے -

آرٹسٹ کے لئے یہ ضروری نہیں ہے ، کہ وہ جو کچھ آنکھ سے دیکھے ، اُس کو من وعن بغیر امتزاجِ تخیل کے صفحۂ قرطاس پر ظاہر کر دے - کیونکہ آرٹ کی بلندی آنکھ کی بجائے تخیل سے وابستہ ہے - آنکھ کسی منظر کا ظاہری مطالعہ کرتی ہے ، اور تخیل اس منظر کی اندرونی اور حقیقی حالت کی ترجمانی کرتا ہے -

خوبصورتی کوئی محدود شے نہیں ہے ، خوبصورتی کے پرستار اُس کو ہر جگہ اور ہر چیز میں دیکھ سکتے ہیں - اس میں کچھ شک نہیں ، کہ سوسن کو کسی اور رنگ میں رنگنا ، یا چنبیلی کو کسی اور خوشبو سے معطر کرنا ، یا قوسِ قزح میں ایک اور رنگ شامل کر دینا ایک نہایت نامعقول اور مضحکہ خیز "زیادتی" کے سوا اور کچھ نہیں مگر یہ بات ضرور ہے کہ ہر آرٹسٹ کا معیارِ حُسن جُدا جُدا ہوتا ہے

لیکن فطرت کے مناظر اس قدر وسیع اور لاتعداد ہیں کہ ہر آرٹسٹ اپنے معیار کے مطابق ان میں سے انتخاب کر سکتا ہے -

بعض اوقات یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ "منظر نگاری" فطرت کے مناظر کے عین مطابق نہیں ہو گی - لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "حقیقت" کسے کہتے ہیں - کیا معترضین کا مطلب یہ ہے ، کہ منظر نگاری فطرت کی ہُو بہُو نقالی ہے - یعنی اس میں تخیلی اثرات کا دخل نہ ہو - لیکن اگر کوئی آرٹسٹ اس نظریے کی ترجمانی کرے گا تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اُس کے پہاڑ حقیقی پہاڑوں سے کہیں زیادہ اونچے اور اُس کی وادیاں حقیقی وادیوں سے کہیں زیادہ گہری ہونگیں ، اس لئے یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی تصویر جو فنی نکتۂ نگاہ سے درست ہو ، فطرت کے مناظر کی ترجمانی سے قاصر ہو - جیسا کہ گوئٹے کہتا ہے :-

"آرٹ اس لئے آرٹ ہے ، کہ وہ فطرت کے منافی ہے"

آرٹسٹ کے لئے یہ چیز کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتی کہ وہ کسی حسین منظر کو ہی مصوری کے لئے منتخب کرے اور اس کو صفحۂ قرطاس پر مختلف رنگوں کے امتزاج سے ظاہر کرے ، آرٹسٹ کا یہ فعل محض نقالی ہے ، جو آرٹ کی تعریف کے منافی ہے ، آرٹسٹ کو اس سے کہیں زیادہ بلند نظر ہونا چاہیئے ، تاکہ اس کی منظر نگاری نقل کی بجائے جدت اور ندرت کی آئینہ دار ہو -

بعض اوقات آرٹ کسی اجنبی ملک کی چیزوں کو اس طرح صاف اور صحیح انداز میں پیش کرتا ہے - کہ جن کے آگے اُس ملک سے متعلق کتابی حالات ، ہیچ نظر آتے ہیں ، لٹریچر میں چٹان محض ایک چٹان ہے - لیکن فنِ مصوری کی رو سے ہم یہ جان سکتے ہیں کہ آیا یہ چٹان سخت چٹان ہے ، سلیٹ ہے یا کوئی اور خاص قسم کی چٹان -

آرٹ اپنے اندر ہزاروں خصوصیات اور فوائد رکھتا ہے - مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں آرٹ کے بعض فوائد مجمل طور پر بیان کر دئے جائیں ، آرٹ نہ صرف ہم کو غیر فانی مسرت بخشتا ہے بلکہ وہ ہمارے سامنے ایسے رازوں کو فاش کرتا ہے جن سے پہلے انسان نابلد ہوتا ہے -

کیرنے سچ کہتا ہے - کہ شاعر الفاظ کے ذریعے سے مصوری کرتا ہے - مگر آرٹسٹ مصوری کے ذریعے گفتگو کرتا ہے ہو خرالذکر کی یہ خصوصیت کس قدر قابلِ تعریف ہے ، اس کی کسی

تصویر یا مجسمے کو ایک نظر دیکھنے سے دل میں وہ "تاثرات" پیدا ہو جاتے ہیں جو فارسی کے دماغ میں ایک طویل اور لطیف نظم پڑھنے کے باوجود بھی پیدا نہیں ہو سکتے۔

آرٹ کی ایک اور بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اُس کو دنیا کی تمام تمدن یافتہ اقوام سمجھ سکتی ہیں۔ چاہے ہر ایک قوم کی زبان علیحدہ علیحدہ کیوں نہ ہو۔ تجارتی نظریے کی رو سے بھی آرٹ ایک خاص اہمیت کا مالک ہے۔ موجودہ زمانے میں جب کہ ہر فرد بشر "حوائجِ" کی تعلیم اور ...سے روشناس ہو رہا ہے، وہی ملک تجارتی لحاظ سے بھی زیادہ کامیاب ہو سکتا ہے جس کی اشیاء فنی لحاظ سے اور ڈیزائن کے حسن اور موزونیت کی رو سے زیادہ جاذب نظر ہونگی

سائنس اور آرٹ دو بہنیں ہیں، ممکن ہے اُن میں بھائی اور بہن کا رشتہ ہو۔ آرٹ کا فن بعض لحاظ سے بالکل عورت کی مانند ہے کیونکہ آرٹ اور عورت کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ دنیا کے حوادث کا سامنا کریں۔ یہی نہیں بلکہ دونوں کا کام دنیا کو خوبصورتی کا مرکز بنانا ہے اور مصائب کو مسرتوں میں تبدیل کرنا ہے۔

سائنس ہمیں ہر وقت ارتقا کا راستہ دکھاتا ہے مگر آرٹ کے ہاں یہ بات مفقود ہے، گو بعض ناقدانِ فن کا خیال ہے، کہ مستقبل قریب میں آرٹ اس سُرعت سے ترقی کرے گا کہ موجودہ زمانے میں ہم جن تصاویر کو "شاہکار" کہتے ہیں، وہ ہماری نگاہوں میں بچوں کی تصاویر کے سوا اور کچھ نہ ہونگیں، لیکن یہ بھی بہت ممکن ہے کہ آرٹ کو سمجھنے کا معیار اسی نسبت سے بڑھتا چلا جائے۔

اثر چکوالی بی۔اے

طلسمِ گفتار

ہیں زمین و آسماں کے امتحاں میرے لئے
یہ جہاں میرے لئے ہے، وہ جہاں میرے لئے

میں وہ رہرو ہوں کہ ہیں روندے ہوئے دو راستے
وادیٔ مہتاب و جوئے کہکشاں میرے لئے

عشق میری ابتدا ہے، عشق میری انتہا !
زندگی ہے عشرتِ سوزِ نہاں میرے لئے

اے فریبِ زندگی! کیوں اے فریبِ زندگی
اس قدر لا انتہا وہم و گماں میرے لئے

ڈالتا ہوں اک نظر اور پھول اُگل دیتے ہیں دشت
اپنی فطرت چھوڑ دیتی ہے خزاں میرے لئے

گو مرا ذوقِ محبت تشنۂ تکمیل ہے
شاعری رکھتی ہے عمرِ جاوداں میرے لئے

اثر چکوالی بی۔اے

آہ اے اقبال!

کہاں ہے آہ اے اقبال! اے ملّت کے شیدائی
ترستی ہے ترے دیدار کو چشمِ تمنائی

ملی تھی سرزمینِ شور تجھ کو پھول بونے کو
تری تقدیر تھی بربادیٔ ملّت پہ رونے کو

جگایا تُو نے اہلِ ہند کو خوابِ غلامی سے
بچایا رہروانِ زندگی کو خستہ گامی سے

دیا ذوقِ یقیں کا درس تُو نے بے دماغوں کو
سنبھالا آندھیوں میں روح کے بجھتے چراغوں کو

بدل دی عالمِ اسلام کی یکسر ہوا تُو نے
بھرا مستقبل کے جام میں آبِ بقا تُو نے

ترے نغموں کے قابل گرچہ یہ لبناں نہ تھا ہرگز
ترا ماحول تیرے ذوق کے شایاں نہ تھا ہرگز

مگر کی اس طرح پوری کمی بے اختیاری کی
کہ دن کو فکرِ فردا رات کو اختر شماری کی

نہ پایا گلشنِ پنجاب میں جب ہمنوا اپنا
سمجھ کر سوچ کر حاصل کیا یوں مدعا اپنا

مشامِ جاں نے تیرے مانگ لی بُو باغِ دہلی سے
لیا درسِ نوا پیرائی تُو نے داغِ دہلی سے

گداز ایسا بھرا پھر تُو نے اپنی داستانوں میں
کہ زندہ کر دئے جذباتِ آزادی جوانوں میں

ترے نغموں سے ہی فولاد کے دل میں لچک پیدا
تری تانوں سے ہستی کی نبضوں میں دھمک پیدا

بنائے خود فراموشوں کو اسرارِ خودی تُو نے
بنایا فی الحقیقت آدمی کو آدمی تُو نے

تمیزِ زندگی دی تُو نے درسِ زندگانی سے
چٹانوں کے جگر برما دئے آتش بیانی سے

مٹایا امتیازِ رنگ و نسلِ آدمی تُو نے　　حجابِ شاعری میں کی ہے اِک پیغمبری تُو نے

ہے تیرے زمزموں سے لوچ پیدا کوہساروں میں　　ہے تیرا شعلۂ آوازِ رقصاں برق پاروں میں

تری آتش نوائی سے ہے پتھر میں شرر پیدا　　نگاہوں سے ہے تیری سنگریزوں میں نظر پیدا

دکھائے تُو نے ناکاموں کو رستے کامرانی کے　　نکالے موت کے دریا سے ساحل زندگانی کے

سنوارا تُو نے گیسوئے عروسِ علم و حکمت کو　　پرِ پرواز بخشے تو نے ذوقِ آدمیت کو

تری نظروں میں قیمت ہی نہ تھی کچھ کجکلاہی کی　　حقیقت آشکارا تجھ پہ تھی دینِ الٰہی کی

مسلمانوں کو پیش اسلام کی توحید کی تُو نے　　خدا کے آخری پیغام کی تجدید کی تُو نے

کیا ہے پستیوں کو رفعتوں سے آشنا تُو نے　　سنائی گمرہوں کو پے بہ پے بانگِ درا تُو نے

ترا ثانی کوئی سارے جہاں میں ہو نہیں سکتا　　یہ سوزِ بے اماں سازِ بیاں میں ہو نہیں سکتا

ترے آتش فشاں پُر سوز نغموں سے جہاں جاگا
زمیں نے کروٹوں پر کروٹیں لیں آسماں جاگا

مگر پنجاب اب تک بے حس و مدہوش سوتا ہے　　زمانہ جاگ اُٹھا اور یہ غفلت کوش سوتا ہے

یہ بحرِ بیخودی میں سر بسر غرقاب ہے اب تک　　یہ میٹھی نیند کا ماتا اسیرِ خواب ہے اب تک

قیامت ہے سمندر میں بھی شورِ تشنہ کامی ہو
جہاں اقبال پیدا ہو وہاں مذہب غلامی ہو

احسان دانش

بسمارک ۸

جانشینوں سے جھڑپیں

روسی معاہدہ منسوخ

بسمارک کی برطرفی کے بعد جب قیصر نے اخبارات دیکھے۔ تو وہ یہ دیکھ کر بڑا خوش ہوا کہ رعایا کے ہر ایک طبقہ نے اس واقعہ پر دلی مسرت کا اظہار کیا ہے۔ ایک اخبار نے لکھا تھا کہ ملک کی اندرونی ترقی کے رستے سے سب سے بڑی رکاوٹ دور ہو گئی ہے۔ ایک اور اخبار نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ ۱۸ مارچ سنہ ۱۸۹۰ء کا دن جرمنی کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ اور اس کا شمار خوشی کے دنوں میں ہو گا۔ پارلیمنٹ پرشیا نے بسمارک کی برطرفی کے متعلق سرکاری اعلان کو اس طرح سنا۔ گویا یہ کوئی اہم واقعہ نہیں۔ درباریوں اور فوجی لیڈروں نے خوشی منائی کہ بسمارک چلا گیا ہے۔ ہوہنلوہ نے ایک جرنیل کے متعلق لکھا کہ وہ بےحد مسرور تھا اور کہتا تھا کہ اب میں کھل کر اپنے دل کی بات کہہ سکتا ہوں۔ ایک اخبار نے یہاں تک لکھا کہ قوم کو ایک صدی سے ——— فریڈرک اعظم کی موت سے لے کر ——— ایسے اطمینان کا سانس لینا نصیب نہیں ہوا تھا۔

لیکن اس عالمگیر مسرت کے پس پردہ کیا ہو رہا تھا؟ جس روز قیصر نے بسمارک کو برطرف کیا۔ اسی روز شام کو ہربرٹ نے جو ابھی تک وزیر خارجہ کے عہدہ پر متمکن تھا۔ قیصر کو تحریری اطلاع بھیجی کہ شہنشاہ روس نے خفیہ معاہدہ کی تجدید کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ ہربرٹ نے لکھا تھا۔

"کل جب کونٹ شوالوف کو معلوم ہوا کہ آنحضور نے پرنس بسمارک کو برطرف کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے تو زار الیگزینڈر کو اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ خفیہ معاہدہ کی تجدید سے ہاتھ کھینچ لے۔ کیونکہ اس کے خیال میں ایسے خفیہ معاملہ کی بات چیت نئے وزیر اعظم سے نہیں کی جا سکتی۔"

اس اطلاع کی بنا پر قیصر اور ہربرٹ کے درمیان تحریری تبادلہ خیالات کا طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ قیصر کی ان تحریروں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ بسمارک کا نام یورپ میں کتنی اہمیت کا حامل ہے۔ بہرحال معاملات نے جو صورت اختیار کر لی۔ اس سے وہ مشوش ہو گیا۔ اس نے رات کے ایک بجے اپنا خاص آدمی... کونٹ شوالوف کے پاس بھیجا جس نے کونٹ موصوف کو جگا کر یہ ضروری پیغام دیا۔ کہ آپ آٹھ بجے صبح قیصر سے ملاقات کریں۔ اس ملاقات میں قیصر نے روسی نمائندہ کو یقین دلایا کہ میں دل سے معاہدہ کی تجدید کا خواہشمند ہوں۔

اس پر شوالوف نے ازسرنو سینٹ پیٹرزبرگ سے گفت و شنید کے اختیارات حاصل کئے کہ بسمارک کی آخری خواہش پوری ہو جائے مگر پانچ روز کی گفت و شنید کے بعد اس کو معلوم ہوا کہ جرمن حکومت کا رویہ بالکل بدل گیا ہے۔ بسمارک نے ہربرٹ کے ذریعے اس بات کا انتظام کر لیا تھا کہ تجدید شدہ معاہدہ پر فریقین کے دستخط سینٹ پیٹرزبرگ میں ثبت ہوں۔ تاکہ یہ کارپرداز ان برلن کی سازشوں سے محفوظ رہے۔ مگر جب ہربرٹ اس معاہدہ کو خفیہ کاغذات کی الماریوں سے نکالنے کے لئے گیا۔ تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ معاہدہ گم ہے۔ بیرن ہولسٹین نے اسے وہاں سے کھسکا لیا تھا۔

ہولسٹین کو بسمارک سے بڑی نفرت تھی وہ کئی سال سے والڈرسی کے ساتھ بسمارک کے خلاف سازش کر رہا تھا۔ معاہدہ کو کھسکانے سے اس کا یہ مقصد تھا کہ بسمارک کے دوبارہ برسراقتدار آنے کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔

کیپروی نے جو بسمارک کے بعد وزیر اعظم مقرر ہوا۔ ہولسٹین کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے قیصر کو صلاح دی کہ اس معاہدہ کی تجدید سے سراسر روس ہی کو فائدہ ہے۔ جرمنی کی بین الاقوامی پوزیشن اس کے

انکشاف سے بڑی خراب ہوجائے گی ۔کیونکہ آسٹریا ہماری دوستی پرشُبہ کرنے لگے گا ۔ اس کے علاوہ روس کو مشرق میں من مانی... کارروائیاں کرنے کا موقع مل جائے گا ۔جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ فرانس فی الفور جرمنی پر حملہ کردے گا ۔ اس طرح قیصر اس معاہدہ کو جس کی تجدید کا وہ اتنا آرزومند تھا ۔ ترک کرنے پر مجبور ہوگیا ۔

قیصر نے اپنے محل کے ایک چھوٹے سے کمرے میں کہنے کو تو یہ کہہ دیا کہ بہت اچھا ۔میں اس معاہدہ کا خیال ترک کرتا ہوں ۔ لیکن ان چند الفاظ نے جن کے اثرات کو بسمارک کے سوا کوئی محسوس نہ کرتا تھا ۔سلطنت جرمن کی بنیادوں کو کھوکھلا کردیا ۔ ان الفاظ کا نتیجہ یہ ہوا کہ روس اور فرانس کا اتحاد عمل میں آگیا ۔ یہ وہ بات تھی جس کو ظہور پذیر ہونے سے روکنا بسمارک کے سیاسی جوڑ توڑ کا اولیں مقصد رہا ۔ مگر مشکل یہ تھی کہ بسمارک کی رائے پر کوئی کان نہ دھرتا تھا ۔خود قیصر کو بھی اس بات کا احساس نہ تھا کہ اس کے یہ الفاظ اسے تیس سال کے اندر اندر تخت و تاج سے محروم کرانے کا موجب ہوں گے ۔

اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ بسمارک کے جانشین کتنے کوتاہ اندیش ثابت ہوئے ۔ اس کے جانشینوں کو خود بھی اپنی کم استعدادی کا اعتراف تھا ۔چنانچہ مارشل لکھتا ہے ۔" بسمارک جیسا پیچیدہ آدمی اس کے ساتھ کام کرسکتا ہے ۔مگر میں جو ایک سادہ آدمی ہوں اس کا اہل نہیں ۔" جب بسمارک محل سے رخصت ہورہا تھا تو کپریوی کو اس سے دوچار ہونے کی جرأت نہ ہوتی تھی ۔ اس کے بعد جب وہ بسمارک کو باغ میں چہل قدمی کرتے ہوئے ملا اور بسمارک نے اس سے روسی معاہدہ سے متعلق دریافت کیا ۔ تو اس نے کہا ۔" آپ جیسا آدمی بیک وقت پانچ گولوں سے کھیل سکتا ہے ۔لیکن دوسرے لوگوں کے لئے یہی بہتر ہے کہ وہ ایک دو گولوں سے کھیلنے پر اکتفا کریں ۔"

زخمی شیر کا غصہ

محل سے رخصت ہوتے وقت بسمارک نے اپنی دلی ناراضی کو چھپانے کی کوشش نہ کی ۔چنانچہ جب بوشچر نے اس کے ہاتھ پر الوداعی بوسہ دیا ۔ تو اس نے کہا :" اس علیحدگی کے لئے جزواً تم ذمہ دار ہو ۔" اس کے سابق رفیقان وزارت نے اس کے اعزاز میں ایک ضیافت دینے کی تجویز کی ۔ مگر اس نے بآواز بلند اس میں شامل ہونے سے انکار کردیا اور کہا ،" شاہی عہدیداروں میں مجھے صرف مسکراتے ہوئے چہرے نظر آتے ہیں ۔ علاوہ بریں یہ آپ لوگوں کا قصور ہے کہ میں وزیر اعظم نہیں رہا ۔"

ممکن ہے بعض لوگ اسے بسمارک کی تنگدلی پر محمول کریں لیکن حقیقت میں یہ زخمی شیر کا اظہار غیظ و غضب تھا ۔

برطرفی کے بعد بسمارک نے واقعات پر پردہ ڈالنے کی ذرا بھی کوشش نہ کی ۔جو لوگ اس سے ملنے آتے تھے ۔ ان کے سامنے وہ صداقت کو ننگی شکل میں پیش کردیتا تھا ۔ آسٹریا کا سفیر اس کے نام شہنشاہ فرانس جوزف کا ایک خط لایا ۔ اس میں شہنشاہ نے اس امر کا اظہار افسوس کیا تھا کہ بسمارک کو خرابی صحت کے باعث مستعفی ہونا پڑا ہے بسمارک نے خط پڑھ کر کہا ۔ یہ بالکل غلط ہے ۔جب تک میں برسرعہدہ رہا ۔میری صحت نہایت اچھی رہی ۔ اس طرح اس نے سرکاری طور پر قیصر کے بیان کی تردید کردی ۔ سفیر ٹرکی کے ذریعے اس نے سلطان کو مطلع کیا کہ میں مستعفی نہیں ہوا ۔بلکہ مجھے برخاست کیا گیا ہے ۔ سفیر بویریا سے اس نے یہ کہا کہ " قیصر ولیم دوم بڑا سنگدل ہے اور یہ شخص یقیناً سلطنت کو برباد کردے گا ۔" جب وہ قیصر کو رسمی الوداع کہنے گیا اور قیصر نے اس کی صحت کا حال پوچھا ۔ تو اس نے کہا ۔" عالی حضور! میری صحت نہایت عمدہ ہے ۔" اس طرح اس نے قیصر پر ظاہر کردیا کہ میری برطرفی کے ذمہ دار آپ ہیں اور میں اس ذمہ داری سے آپ کو بچنے نہیں دوں گا ۔قیصر کی ماں وکٹوریہ نے جو بسمارک کی دشمن تھی ۔ الوداع کہتے وقت ملائم الفاظ سے اس کو خوش کرنے کی کوشش کی مگر اس نے اپنے رویہ سے یہی ظاہر کیا کہ مجھے تم سے سخت نفرت ہے ۔

روانگی سے ایک روز پہلے بسمارک ولیم اول کے مقبرہ پر گیا ۔ وہاں ایک شاعر کی طرح اس نے تین پھول چڑھائے اور اس طرح اپنے مرحوم آقا سے جو اس کی کوئی بات نہ ٹالتا تھا ۔اپنی بے پایاں عقیدت کا اظہار کیا ۔

دفتر وزارت سے رخصت ہوتے وقت اس نے جس شخص سے ہاتھ ملایا ۔ وہ کوئی وزیر نہ تھا ۔بلکہ لیور سٹروم نام ایک ہرکارہ تھا وہ اس کا خاص ہرکارہ تھا اور سیاہ پوش سوار کے لقب سے مشہور تھا ۔جب لیور سٹروم سے ملنے آیا ۔ تو اس نے فوراً اس کو شرف باریابی بخشا اور دیر تک اس کی " شاندار خدمات " کا اعتراف کرتا رہا ۔ اسے رخصت کرتے ہوئے اس نے چاندی کی ایک طشتری بطور تحفہ نذر کی ۔

ریٹائر ہونے کے بعد بسمارک نے اپنی دیہاتی رہائش گاہ فریڈرک سراھ میں سکونت اختیار کرلی۔ کیونکہ برلن سے اسے نفرت ہوگئی تھی۔ اس کی بیوی زندہ تھی۔ اس کے تمام بچے بھی زندہ تھے۔ اسے وہ فرصت بھی میسر تھی جس کی آرزو میں ہر بڑا مدبر اپنی مصروف زندگی کے ہنگامہ خیز ایام بسر کرتا ہے۔ مگر یہی فرصت اس کے لئے وبال جان ثابت ہو رہی تھی۔ وہ چھوٹے بڑے ہر قسم کے لوگوں سے ملتا تھا۔ کبھی کبھی اپنے علاقہ کے دیہاتی سکول میں بھی چلا جاتا تھا۔ مگر اس قسم کی زندگی سے اسے طبعی مناسبت نہ تھی۔ ایک فرانسیسی مورخ نے اس کے زوال کے فوراً بعد کی جو تصویر کھینچی ہے اس میں وہ لکھتا ہے: "بعض اوقات وہ اچانک اوپر نظر اٹھاتا ہے اور ایک ایسے آدمی کی طرح جو ابھی ابھی خواب سے بیدار ہوا ہو۔ کہتا ہے۔ مجھے یہ بات فراموش ہو رہی ہے کہ میرے پاس کوئی کام نہیں"

سرکاری حلقوں کی طرف سے بائیکاٹ

مختصر یہ کہ سیاسیات کی ولولہ خیز زندگی سے علیحدہ ہو کر وہ اپنے آپ کو ایک عضو معطل خیال کرتا تھا۔ وہ ساری عمر لڑتا اور سیاسی جوڑ توڑ کرتا رہا۔ مگر یہ کام اس سے دفعتہً چھن گیا۔ اب وہ بیکار تھا۔

سرکاری حلقوں نے بسمارک کا بائیکاٹ کردیا۔ شروع کے چند مہینوں میں یہ بائیکاٹ اتنا مکمل تھا کہ بہت کم غیر ملکی اس کے پاس مہمان کی حیثیت سے یا معلومات حاصل کرنے کی غرض سے آتے تھے۔ ایک بار ایک دولتمند امریکن اس کا مہمان ہوا۔ اسے ایک کمرہ دے دیا گیا۔ بسمارک اس کے پاس آبیٹھا اور کہنے لگا۔

"اس ہفتے صرف آپ میرے مہمان آئے ہیں۔ میرا بائیکاٹ کردیا گیا ہے۔ کوئی شخص مجھ سے کسی قسم کا تعلق نہیں رکھنا چاہتا۔ لوگوں کو ڈر ہے کہ ان کا نام میرے مہمان کی حیثیت سے اخباروں میں چھپے گا۔ تو نوجوان قیصر ان سے ناراض ہوجائے گا۔ ہر روز بیشمار لوگ فریڈرک سراھ سے گزرتے ہیں۔ لیکن کوئی مجھ سے ملنے نہیں آتا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ایک ماہ پہلے برلن کے بازاروں میں مجھے سلام کہے بغیر آگے نہ جاتے تھے۔ کتنے اہی لوگوں کے پیچھے چلتے ہیں۔ جو انہیں ردی ڈالتے ہیں۔"

بسمارک کے سابق رفیقان وزارت میں سے کوئی اس سے ملنے جانے کی جرأت نہ کرتا تھا۔ ایک دفعہ والڈرسی ہیمبرگ جانے لگا تو اس نے برلن میں دریافت کیا کہ کیا میں واپسی سفر میں بسمارک کو خراج تعظیم ادا کرسکتا ہوں۔ کپرلوی نے بسمارک کو کبھی خط تک نہ لکھا۔ اس نے صرف ایک مرتبہ کپرلوی کے دستخط دیکھے۔ یہ دستخط ایک نوٹس کے نیچے تھا۔ جس میں اس شخص سے جس نے چالیس سال تک پرشیا کی خدمت کی تھی اور جو سلطنت جرمنی کو وجود میں لایا تھا۔ یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ تم نے ۲۰ مارچ تا ۳۱ مارچ ۱۸۹۰ء جو تنخواہ لی ہے اسے واپس کرو کیونکہ اس عرصہ میں تم برسر ملازمت نہیں تھے۔ بلکہ تمہیں پنشن ملتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی کپرلوی نے جرمن سفیروں کی معرفت تمام غیر ملکی حکومتوں کو لکھ دیا تھا کہ پرنس بسمارک کے خیالات کو کوئی اہمیت نہ دی جائے۔

سیبل ایک تاریخ لکھ رہا تھا۔ مگر اس سے ضروری کاغذات چھین لئے گئے۔ کیونکہ اس کتاب میں وہ بسمارک کو ولیم دوم سے بڑھا چڑھا کر دکھا رہا تھا۔ گرانڈ ڈیوک آف بیڈن نے بیڈن ..... کے برگو ماسٹر کو اس بنا پر جھاڑ ڈالی کہ اس کا شہر پرنس بسمارک کو منتخب شہر کا اعزاز دینا چاہتا تھا۔ قیصر نے فریڈرک سراھ کے اردگرد اپنے جاسوس چھوڑ رکھے تھے۔ جو یہ دیکھتے رہتے تھے کہ کون کون لوگ بسمارک سے ملنے آتے ہیں۔ صرف وہی مسافران جاسوسوں کی نظر سے بچتے تھے۔ جو لوچن میں گاڑی بدل لیتے تھے اور کسی لوکل ٹرین میں سوار ہو کر بسمارک سے ملنے پہنچ جاتے تھے۔ اگرچہ بسمارک بلیک ایگل کا نائٹ تھا۔ لیکن اس آرڈر کی کسی تقریب پر اسے مدعو نہیں کیا جاتا تھا۔ قیصر کا حکم تھا کہ بسمارک کے نام جو خطوط ہوں انہیں پوسٹ آفس میں کھول لیا جائے۔

سرکاری حلقوں کے علاوہ امرا کے طبقہ نے بھی بسمارک کا مکمل طور پر بائیکاٹ کردیا۔ برلن کے بڑے بڑے لارڈوں نے عام مباحثہ کے بعد یہ طے کیا کہ بسمارک کے ساتھ سرد مہری کا سلوک کیا جائے اور اس کی شخصیت کا کوئی نوٹس نہ لیا جائے۔ صرف کارڈوف اور چند اور امرا نے اس فیصلہ سے اختلاف کیا۔ آگسٹ ڈون ہاف ہربرٹ سے بچنے کیلئے بازار چھوڑ جاتا تھا اور لمبا چکر کاٹ کر منزل مقصود پر پہنچتا تھا۔

بسمارک اس بائیکاٹ کا جواب اظہار نفرت سے دیتا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ یہی جذبہ نفرت اب اس کی زندگی کا سہارا تھا۔ وہ قیصر سے لے کر معمولی عہدیداروں تک کو احسان فراموش سمجھتا تھا۔ اسے ان کی روش پر غصہ آتا تھا اور یہ غصہ وقتاً فوقتاً اظہار نفرت کی شکل اختیار کرلیتا تھا۔ وہ ان لوگوں کی توہین کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔ اپنے جانشینوں کے متعلق وہ ہمیشہ طنزیہ پیرائے

میں اظہار رائے کرتا تھا۔ کپریوی اس کی جگہ پہلا وزیر اعظم مقرر ہوا تھا۔
اس لئے وہ حکومت کی غلطیوں کو کپریویانہ حماقتوں کا نام دیتا تھا وہ سمجھتا
تھا کہ کپریوی وزیر اعظم کے عہدہ کا اہل نہیں۔ اور اس خیال کا اظہار
بدیں الفاظ کرتا تھا کہ "وہ بہت اچھا جرنیل ہے۔"

اپنے دشمنوں کے زوال سے وہ بڑا خوش ہوتا تھا۔ چنانچہ
کپریوی۔ والڈرسی اور بوچر غرضیکہ ہر ایک کی برطرفی پر اس نے بڑی
مسرت کا اظہار کیا۔ اس کا ملکۂ ہتک انگیزی اس وقت خاص جوبن پر
آجاتا تھا۔ جب وہ کسی ضیافت یا جلسے کا چیئرمین ہو۔ چنانچہ ایک جلسہ
میں اس نے عینک نیچی کرکے اس میں سے مہمانوں پر نظر ڈالتے ہوئے
بڑی حقارت سے حاضرین کا جائزہ لیا اور دور کی ایک میز کی طرف
اشارہ کرکے پوچھا: "اس بڈھی سفیر کا نام کیا ہے؟" جن لوگوں نے
اس واقعہ کو دیکھا۔ ان کا قول ہے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا ایک شیر
ایک مکھی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

قیصر کی طرف سے صلح کی پیشکش

لیکن جہاں تک ظاہرداری کا تعلق ہے۔ وہ نوجوان قیصر کا احترام
مد نظر رکھتا تھا۔ ولیم دوم کی ایک قدآدم تصویر اس کے کمرے میں
لگی رہتی تھی۔ ولیم کی سالگرہ کے روز وہ باضابطہ طور پر اس کا جام صحت
نوش کرتا تھا۔ لیکن اس رسمی کارروائی کے وقت اس کا لب و لہجہ
بدرجہ غایت بے کیف ہوتا تھا اور اس سے نفرت و حقارت ٹپکتی
تھی۔ گفتگو کے دوران میں وہ قیصر کے متعلق اور اپنے زوال کے متعلق
بیدریغ تلخ حقائق کا اظہار کرتا تھا۔ اس میں اسے اس بات کی پرواہ
نہیں ہوتی تھی کہ سامع کوئی غیر ملکی سیاح ہے یا جرمن اخبار نویس۔ قیصر
کے متعلق اس کی بدترین رائے یہ تھی کہ "اس پر مستقل طور سے کوئی اثر
نہیں پڑتا۔ لیکن وقتاً فوقتاً اس کی طبیعت تمام اثرات کو قبول کرتی
رہتی ہے۔" بالفاظ دیگر وہ قیصر کو انتہا درجہ کا اور خطرناک حد تک
متلون مزاج سمجھتا تھا۔

آخر بسمارک کے سرکاری بائیکاٹ کا اثر رفتہ رفتہ زائل ہونے
لگا۔ اس کے فوری جانشین اپنی اپنی باری سے برطرف ہو چکے تھے۔
اور عوام محسوس کرنے لگے تھے کہ بسمارک واقعی اپنے زمانے کا سب سے
بڑا آدمی ہے۔ اور اس کی ذات جرمنی کے لئے باعث فخر ہے۔
نوجوان قیصر بھی اس بات سے آگاہ تھا کہ ملک میں بسمارک کے لئے
ہمدردی اور احترام کا جذبہ روز بروز زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ اس لئے اب
وہ بھی سابق وزیر اعظم کی دلدہی کرنے پر مائل ہو گیا۔ چنانچہ تین سال
کی معاندانہ روش کے بعد جب بسمارک بیمار پڑا۔ تو قیصر نے اس
موقع کو پرانے تعلقات کی تجدید کے لئے غنیمت سمجھا۔ اس نے
بسمارک کو ایام علالت بسر کرنے کے لئے ایک شاہی محل پیش کیا۔
مگر بسمارک نے اس پیشکش کو قبول کرنے سے بذریعہ تار انکار کر دیا۔
اس کے بعد قیصر نے اس کے لئے نہایت عمدہ پرانی شراب بھیجی۔
بسمارک نے یہ شراب قیصر کے بدترین دشمن ہارڈن کی معیت میں پی۔
وہ شراب پیتا جاتا تھا اور اپنے دوستوں سے کہتا جاتا تھا:۔

"شہنشاہ سلامت کو میری طاقتوں کا بہت کم اندازہ ہے۔ انہوں
نے مجھے مشورہ دیا ہے کہ میں ایک گلاس روزانہ پیوں۔ لیکن مجھے کم از
کم ایسی نصف درجن بوتلیں روزانہ پینے کی ضرورت ہے۔ جب کہیں
جا کر مجھے کچھ فائدہ ہو سکتا ہے۔"

تاہم قیصر کی طرف سے اس قسم کی دو پیشکشوں کے بعد بسمارک
کے لئے ناممکن ہو گیا کہ وہ ذاتی طور پر شکریہ ادا نہ کرے۔ اس کو خیال
ہوا کہ میری طرف دوستی کا جو ہاتھ بڑھایا جا رہا ہے۔ اس کو میں اگر اب
بھی جھٹک دوں گا۔ تو میری پوزیشن غلط ہو جائے گی۔ کیونکہ عوام کے
لئے قیصر اور سابق وزیر اعظم کے مابین کشیدگی کا جاری رہنا بہت
تکلیف دہ اور دلخراش ہوگا۔ وہ اس کشیدگی کے اسباب معلوم کرنے
اور ان اسباب کو مٹانے کے لئے ساعی ہونے کی بجائے یہ بہتر سمجھینگے
کہ اس جھگڑے کا نوٹس ہی نہ لیا جائے اور اسے دنیا کی نگاہوں
سے اوجھل رکھا جائے۔ مزید برآں بسمارک کی یہ بھی خواہش تھی کہ اپنے
برلنی دشمنوں کی چھاتی پر مونگ دلے۔ چنانچہ وہ ملاقات شکر گزاری
کے لئے برلن جانے کو تیار ہو گیا۔ لیکن اس موقع پر بھی اس نے اپنا
طنزیہ انداز نہ چھوڑا اور ایک افسر کو منگوا بھیجا۔ جو اسے تفصیل کے
ساتھ یہ بتائے کہ قیصر سے ملاقات کرنے کے لئے کس قسم کی یونیفارم
پہننا موزوں ہوگا۔ اس سلسلہ میں از راہ طنز اس نے یہ بھی دریافت
کیا کہ "نئی پالیسی کی تلوار کو پکڑنے کا فیشن ایبل طریقہ کیا ہے۔"

امر واقعہ یہ ہے کہ برلن میں یونیفارم اور تلوار پہننے کا رواج
عالمگیر تھا۔ قیصر اپنے آپ کو اور دوسروں کو یہ جتانا چاہتا تھا۔ کہ میں
ایک جرنیل کو شرف ملاقات بخش رہا ہوں۔ اس نے استقبال کے
جملہ انتظامات کو اس طریقے سے ترتیب دیا۔ گویا اس سے لڑ رہا

ہو نکلے ملاقات کرنے آرہا ہے۔ ملاقات کا نظارا بڑا موثر دلچسپ تھا۔ قیصر مجبور تھا کہ اس کے عظیم دشمن کی آمد پر جو نعرہ ہائے تحسین بلند ہو رہے ہیں۔ ان کو صبر سے سنے۔ خلقت کا بے پناہ ہجوم دیوانہ وار بسمارک کے ساتھ اپنی عقیدت کا اظہار کر رہا تھا۔ قیصر کو یہ پسند نہیں تھا۔ وہ دل ہی دل میں کڑھتا تھا۔ مگر برداشت کرنے کے سوا چارہ نہ تھا۔

دوسری طرف بسمارک اس عالمگیر اظہارِ مسرت سے ذرا بھی لطف اندوز نہیں ہو رہا تھا۔ جن لوگوں نے اس موقع پر اسے دیکھا۔ ان کا قول ہے کہ وہ گاڑی میں بیٹھا ہوا محض اپنا سایہ معلوم ہوتا تھا۔ لوگ اسے دیکھ دیکھ کر مسرت سے تالیاں بجاتے تھے۔ مگر اس کا طائرِ خیال کسی اور آسمان پر پرواز کر رہا تھا۔ اس کے جذبات طنز اور حقارت کا مرکب تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں اسے قیصر کی تعظیم بجا لانی تھی۔ اس قیصر کی جس سے اس کو دلی نفرت تھی۔ یہ صورتِ حالات اس کے غرورِ خودی کے لئے ناقابلِ برداشت تھی اور وہ اپنے دل کو یہی کہہ کر مطمئن کر سکتا تھا کہ میرا تعظیم بجا لانا تو محض رسمی کاروائی ہے۔ حقیقت میں شہنشاہ میری آؤ بھگت کر رہا ہے۔

دعوتِ طعام میں قیصر کا اضطراب

قیصر اور اس کے حواریوں سے اسے کتنی نفرت تھی۔ اس کا اندازہ اس ملاقات کے حالات سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ بسمارک بخلاف قرارداد ہربرٹ کو بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ جب اس کی سواری شاہی محل کی سیڑھیوں کے پاس پہنچی۔ تو قیصر کی طرف سے ایک کرنیل فرائضِ احترام ادا کرنے کے لئے محل سے باہر آیا۔ مگر بسمارک نے اسے محض یہ کہہ کر ٹال دیا۔ "کرنیل! مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم پہلے سے بہت چھوٹے ہو گئے ہو۔"

محل کے اندر کمرے میں ہر شخص نے ان الفاظ کو سنا۔ جو کچھ بسمارک نے کہا تھا۔ وہ ان سب کے لئے مقصود تھا۔ مگر سب خاموش رہے۔ وہ قیصر سے ملنے کے لئے اکیلا اندرونی کمرے میں گیا۔ قیصر کے سامنے جا کر وہ اتنا جھکا کہ قریب قریب فرش سے لگ گیا۔ قیصر نے اسے اٹھایا اور بوسہ دیا۔ یہ اس شخص کا بوسہ تھا جس سے اسے اتنا رنج پہنچا تھا اور جس کو وہ دل سے نفرت کرتا تھا۔ ایک دو منٹ اسی حالت میں گزر گئے۔ پھر ننھے شہزادے آ گئے اور ان کی طفلانہ آوازوں نے کشیدگی کی فضا کو توڑنے میں مدد دی۔

اس کے بعد بسمارک نے قیصر کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ شام کو ایک ڈنر پارٹی ہوئی۔ اس موقع پر اس کا دوسرا بیٹا بل بھی آ گیا جو ہربرٹ کی طرح بن بلایا مہمان تھا۔ دونوں بیٹوں کی موجودگی سے بسمارک لبناش ہو گیا اور وہ اپنے آپ کو نوجوان قیصر سے بھی بلند تر سمجھنے لگا۔ نفرت کی فضا اور بھی گہری ہو گئی۔ ہر شخص محسوس کر رہا ہے کہ محفل پر کشیدگی کا عالم طاری ہے۔ یہاں تک کہ جب بسمارک ایامِ گزشتہ کی میٹھی اور دلچسپ داستانیں سناتا تھا۔ اس وقت بھی ہر شخص کو یہی خطرہ تھا کہ کہیں وہ کوئی ایسی بات نہ کہہ دے جس سے بدمزگی پیدا ہونے کا احتمال ہو۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اِدھر بسمارک کی زبان سے کوئی تلخ بات نکلی۔ اُدھر قیصر نے تلوار کھینچ لی اور بسمارک کے بیٹے شاہی محافظوں سے گتھم گتھا ہو گئے۔ لیکن بسمارک خوب جانتا تھا کہ پرانی پالیسی کی تلوار کس طرح پکڑنی چاہیئے۔

بہر حال قیصر بڑی بے چینی کے ساتھ لمحہ شماری کر رہا تھا اور اس وقت کے انتظار میں تھا۔ جب اس کا نامطبوع مہمان اس کے محل اور اس کے دارالسلطنت سے رخصت ہو جائے گا۔ ڈنر کی میز پر ایسا کوئی شخص نہ تھا جو بسمارک سے خوفزدہ نہ ہو۔ یہ ان لوگوں کی حالت تھی۔ جو اس اچھوت کے مقابلے میں اپنے آپ کو برسرِ حکومت سمجھتے تھے۔

آخر ایک خادم نے آ کر اطلاع دی کہ معزز مہمان کی گاڑی تیار ہے۔ اب حاضرین نے اطمینان کا سانس لیا اور قیصر کی تو جان میں جان آئی۔ اس نے ظاہری تپاک کے ساتھ اپنے دشمن کو الوداع کہی اور خدا کا شکر کیا کہ وہ برلن سے چلا گیا ہے۔

اس کے بعد قیصر بسمارک سے ملاقات بازگشت کرنے کے لئے فریڈرک سرا گیا۔ اس ملاقات کا جو حال بسمارک کے اخبار میں شائع ہوا۔ اس کو پڑھ کر اہلِ جرمنی انگشت بدنداں رہ گئے۔ لکھا تھا:۔

"شہنشاہ نے پرنس بسمارک سے اس اہم سوال پر مشورہ کیا کہ میدانِ جنگ میں پیدل فوج کے سپاہیوں کا سامان ہلکا کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ اس موقع پر دو سپاہی پورے سامان کے ساتھ برائے ملاحظہ موجود تھے ——— اسی مقصد کے پیشِ نظر کالر میں تبدیلی کر دی گئی ہے۔ چنانچہ اب کالر نیچے کی طرف الٹا جا سکتا ہے۔"

یہ رپورٹ صاف طور پر بسمارک کی لکھوائی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس قسم کی رپورٹوں سے، جو بظاہر بے ضرر نظر آتی تھیں۔ بڑھا مدبّر نوجوان قیصر کو آدھے جرمن میں مذاق کا مضمون بناتا رہتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ قیصر اور اس کی حکومت کی پالیسی پر بڑی سخت اور تلخ نکتہ چینی کرتا رہتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا:-

"قیصر کے ساتھ میری عقیدت اتنی اندھی نہیں کہ میں صحیح رائے کا اظہار کرنے سے باز رہوں۔ چونکہ میرا عقیدہ ہے کہ گورنمنٹ کی موجودہ پالیسی جرمنی کو مشکلات کی دلدل میں لئے جا رہی ہے۔ اس لئے اگر میں اپنی زبان بند رکھوں تو یہ بات ملک سے میری غداری کے مترادف ہوگی۔ میرے عزیز دوست چاہتے ہیں کہ میں زندہ ہی مر جاؤں اور حرکت تک نہ کروں۔ لیکن میں ریٹائرڈ ہو کر بھی اپنے وطن کی خدمت کر سکتا ہوں۔ کئی پہلوؤں سے میرا ہاتھ اب زیادہ آزاد ہے۔ اب جبکہ مجھ پر سرکاری پابندیاں عائد نہیں۔ میں غیر ممالک میں امن کا پراپیگنڈا زیادہ اچھی طرح کر سکتا ہوں۔ اور دنیا میں امن پھیلانا بیس سال سے میری زندگی کا سب سے بڑا مقصد رہا ہے۔"

کپریوی کی سبک حرکتی

قیصر اور بسمارک کا رویہ ایک دوسرے کے متعلق کس حد تک غیر مصالحانہ تھا۔ اس کا اندازہ گزشتہ چار سال کے ان تغیّرات سے ہو سکتا ہے۔ جو دونوں کے تعلقات میں وقتاً فوقتاً رونما ہوتے رہے۔ بسمارک کی ۸۰ویں سالگرہ کے موقع پر قیصر بڑی دھوم دھام کے ساتھ فریڈرک سرا گیا۔ وہاں اس نے بسمارک کو سونے کی اعزازی تلوار پیش کرتے ہوئے بڑی شاندار تقریر کی۔ لیکن سابق وزیر اعظم جوابی تقریر کرنے کی بجائے بالکل خاموش رہا۔ جب نہر کیل کا باضابطہ افتتاح ہوا۔ اس وقت بسمارک کا ذکر تک نہ کیا گیا۔ حالانکہ یہ نہر کاٹنے کی تجویز بسمارک ہی کے دماغ کی اختراع تھی۔ پھر جب ۱۸۹۶ء میں سلطنت جرمنی کی پچیس سالہ جوبلی منائی گئی۔ تو اس موقع پر قیصر نے بسمارک کو کئی تار بھیجے۔ جن میں اس کی نہ مٹنے والی خدمات کا زوردار اور پرتپاک اعتراف کیا گیا۔ لیکن جب ۱۸۹۷ء میں مرحوم ولیم اوّل کی صد سالہ سالگرہ منائی گئی تو اس سلسلے میں ماتحت عہدیداروں کا تو بہت ذکر کیا گیا۔ مگر بسمارک کا نام بھی نہ آنے دیا گیا۔

ایک موقع پر بسمارک کو نئے جنگی جہازوں کے نمونے بھیجے جاتے ہیں۔ مگر دوسرے موقع پر قیصر ایک شادی میں شریک ہونے سے اس بنا پر انکار کر دیتا ہے کہ اس میں ہربرٹ کو بھی دعوتِ شرکت دی گئی ہے اور کہتا ہے کہ جب تک ہربرٹ کا دعوت نامہ منسوخ نہ کیا جائے گا اس وقت تک میں ہرگز ہرگز شریک نہ ہوں گا۔

حقیقت یہ ہے کہ بسمارک کے متعلق قیصر کے رویہ میں یہ تغیرات ان ضربات کے آئینہ دار ہوتے تھے۔ جو بسمارک کی تلخ نکتہ چینی سے وقتاً فوقتاً گورنمنٹ پر پڑتی رہتی تھیں۔

جون ۱۸۹۲ء میں بسمارک کے ایما سے ہربرٹ کی منگنی ایک آسٹروی شہزادی سے ہو گئی۔ بسمارک نے اس شادی کے موقع پر وائنا جانے کا خیال کیا اور شہنشاہ فرانس جوزف کو لکھا کہ مجھے ملاقات کا شرف بخشا جائے۔ وائنا سے جواب آیا کہ شہنشاہ سلامت آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔ اس پر قیصر اور درباری اراکین تلملا اٹھے۔ انہیں اندیشہ ہوا کہ بسمارک بُرے ارادے کے ساتھ شہنشاہ آسٹریا سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ انہیں سیاسی طوفان کا خطرہ نظر آیا۔ چنانچہ قیصر نے شہنشاہ فرانس جوزف کو لکھا:-

"اس ماہ کے اخیر میں بسمارک وائنا جا رہا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اس کا ایک کارنامہ روس کے ساتھ خفیہ معاہدہ تھا۔ جو آپ کی پیٹھ پیچھے مرتب کیا گیا اور جسے میں نے منسوخ کر دیا۔ جب سے وہ ریٹائرڈ ہوا ہے۔ اس وقت سے میرے اور میرے وزیر اعظم کپریوی کے خلاف بدترین قسم کا جہاد کر رہا ہے۔ . . . . وہ اپنی بے نظیر ہوشیاری اور چالاکی سے واقعات کو ایسے رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ جس سے دنیا یہ یقین کرنے لگے کہ میں اس سے صلح کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے آپ سے ملاقات کی درخواست کی ہے۔ اس لئے میں آپ سے یہ درخواست کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔ کہ آپ میری رعایا کے اس اکھڑ فرد کو اس سے پہلے کہ وہ اس معاملہ میں مجھ سے رجوع کرے۔ شرفِ ملاقات بخش کر میرے لئے میرے ملک میں پیچیدگی نہ پیدا کریں۔"

اس شرمناک خط کے ساتھ ہی ساتھ ایک اور خط جس کا مضمون ہولسٹین نے تیار کیا تھا۔ کپریوی کے دستخطوں سے وائنا بھیجا گیا۔ یہ خط پرنس رئیوس سفیر جرمنی متعینہ وائنا کے نام تھا۔ اس میں لکھا تھا۔

"اگر پرنس بسمارک یا اس کے خاندان کا کوئی فرد آپ کے مکان پر آئے۔ تو میری آپ سے یہ التماس ہے کہ آپ رسمی کارروائی سے آگے نہ بڑھیں اور شادی میں شریک ہونے کی دعوت منظور کرنے

سے محترز رہیں۔ آپ کی طرح عملہ سفارت کے دیگر اراکین کو بھی اسی ہدایت پر کاربند ہونا چاہیئے۔ ۔ ۔ ۔ میں یہ بھی کہہ دینا چاہتا ہوں کہ حضور شہنشاہ سلامت اس شادی کا کوئی نوٹس نہیں لیں گے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ کو یہ بھی ہدایت کی جاتی ہے کہ آپ جس طریق پر مناسب سمجھیں۔ اس امر سے کونٹ کالنوسکی وزیر خارجہ آسٹریا کو بھی آگاہ کر دیں۔"

جب بسمارک کو خفیہ طور پر اس خط کی اطلاع ملی۔ تو پہلے اس کا یہ خیال ہوا کہ کپرلوی کو پستول سے دوبدو لڑائی کا چیلنج دے۔ لیکن پھر اس نے یہ خیال بدل دیا اور اپنے اخبار میں ذیل کی سطور شائع کرائیں۔

"شہنشاہ آسٹریا کو پرنس بسمارک کے ساتھ ملاقات سے باز رکھنے کے لئے جو ذرائع اختیار کئے گئے ہیں۔ ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ پرنس کی سوشل پوزیشن کو نقصان پہنچانا مقصود ہے۔ ذاتی پہلو سے یہ کارروائی بڑی جارحانہ ہے۔ پرنس کی سابقہ زندگی سے ایسی کوئی بات نہیں ملتی جس کی بنا پر اس کو اس قسم کی شرمناک بدسلوکی کا مستحق سمجھا جا سکے۔"

یہ نوٹ بم کے گولے کی طرح پھٹا اور اس کے ٹکڑے اُڑ اُڑ کر جرمنی کی سرحدوں کے پار جا گرے۔ سارے پرشیا میں قیصر کے خلاف نفرت و ناراضگی کا عالمگیر طوفان برپا ہو گیا۔ ایسا طوفان جو اس سے پہلے اس ملک کے کسی بادشاہ کے خلاف برپا نہ ہوا تھا۔ آدھے جرمنی میں بغاوت کے شعلے بھڑکنے لگے۔ برلن میں بھی جو بسمارک کے مخالفوں کا گڑھ تھا۔ غم و غصہ کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا نظر آیا۔ چنانچہ جب وائنا جاتے ہوئے بسمارک برلن کے اسٹیشن سے گزرا۔ تو خلقت کا ہجوم اندر گھس گیا اور شور مچا مچا کر بوڑھے مدبر سے تقریر کی درخواست کرنے لگا۔ مگر بسمارک نے چپ ہی سادھے رکھی اور اس طرح دنیا پر ظاہر کر دیا کہ میرا اخلاق قیصر اور اس کے حواریوں سے مراتب بلند ہے۔ انتقام لینے کا یہ طریقہ بھی اسے بیحد مرغوب تھا۔

جب وہ وائنا پہنچا۔ تو اس نے دیکھا کہ امراء و رؤسا کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں وہ بسمارک کو دیکھتے تھے اور اپنی بے بسی کا اظہار کرنے کے لئے پیٹھ پھیر لیتے تھے۔ جرمن سفیر یہ ظاہر کر کے کہ میں بیمار ہوں۔ صاحب فراش ہو گیا۔ لیکن اس کی بیوی کو سابق وزیراعظم کی توہین کا بڑا صدمہ تھا۔ اور وہ بڑی جرأت کے ساتھ اس کی حمایت کا دم بھرتی رہی۔

بسمارک اور گورنمنٹ کی اخباری جنگ

دشمن کی گولیاں بسمارک کو آب حیات کا کام دیتی تھیں حریفوں کے حملوں سے اس کی طاقت مقابلہ بڑھتی تھی۔ اس نے نیوز فری پریس کے ایڈیٹر کو اپنے ساتھ انٹرویو کے لئے بلایا۔ اس انٹرویو کے ذریعے اس نے چالیس سال کے بعد پہلی مرتبہ گورنمنٹ پر کھلم کھلا حملہ کیا۔ چالیس سال پہلے اس نے شاہ ولیم اول پر الزام لگایا کہ آپ رعایا کے مقابلے میں بزدلی کا اظہار کرتے ہیں آج اس نے حکومت جرمنی پر حماقت کا الزام لگایا۔ اس نے کہا۔ "بلاشبہ آسٹریا کا تجارتی معاہدہ ہمارے نمائندوں کی کمزوری اور نااہلیت سے متاثر ہوا ہے۔ اس صورت حالات کو لامحالہ اس امر واقعہ پر محمول کرنا پڑتا ہے۔ کہ ہمارے ملک میں وہ لوگ برسرعہدہ آ گئے ہیں۔ جن کو میں نے پیچھے رکھا ہوا تھا۔ لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے مجھ پر اپنے جانشین یا ان لوگوں کے متعلق کوئی پابندی نہیں جو آجکل برسر حکومت ہیں۔ تعلقات کے تمام پُل توڑ دیئے گئے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ جو کڑی ہمیں روس سے ملائے رکھتی تھی۔ وہ الگ کر دی گئی ہے۔ آجکل برلن میں ذاتی اقتدار و اعتماد کا فقدان ہے۔"

اس انٹرویو کا شائع ہونا تھا کہ برلن کے ارباب اقتدار حواس باختہ ہو گئے۔ انہوں نے بسمارک کو بدنام کرنے پر کمر باندھ لی۔ جرمنی اس چپقلش سے پریشان تھا اور یورپ ایک طرف منہ کر کے قہقہے مار رہا تھا۔ گورنمنٹ کے وار اوچھے پڑتے تھے۔ مگر بسمارک کا کوئی جوابی وار خالی نہ جاتا تھا۔ کپرلوی کے اخبار میں یہ نوٹ شائع ہوا:۔

"جرمنی کا کہنا ہی کیا ہے۔ ہمیں دنیا کے کسی ملک کی تاریخ میں ایسی مثال نہیں ملتی کہ ایک ریٹائرڈ مدبر نے اس قسم کا رنگ اختیار کیا ہو۔ پرنس (بسمارک) کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو گورنمنٹ کے خلاف بداعتمادی پیدا کی جائے تاکہ سلطنت کی کشتی چلانا جو پہلے ہی بڑا مشکل کام ثابت ہو رہا ہے اور بھی زیادہ دشوار ہو جائے۔ کیا یہ طرز عمل ایک محب وطن کا طرز عمل ہے؟ اس (بسمارک) کی قوت یادداشت زائل ہو رہی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پرنس اپنے وطن کو جو نقصان پہنچانے کے لئے تیار ہے۔ اس کا اندازہ کوئی شخص نہیں کر سکتا۔"

اس کا جواب اگلے ہی روز بسمارک کے اخبار میں شائع ہوا۔ اس جواب سے بسمارک نے ثابت کر دیا کہ لاثانی مدبر ہونے کے علاوہ وہ قابل

اخبار نویس بھی ہے - جوابی آرٹیکل میں اس نے یہ فرض کرلیا کہ محولہ بالا نوٹ اخبار کے ایڈیٹر کا لکھا ہوا ہے اور یہ فرض کرکے بھگو بھگو کر گورنمنٹ کے لگانی شروع کردیں اس نے لکھا:-

"بلاشبہ یہ ناممکن ہے کہ ایسے قابل اور شریف النسل اشخاص جو بحالات موجودہ امور مملکت کی انجام دہی کررہے ہیں- ایسے ناتراشیدہ اخبار ی آرٹیکل کے ذمہ وار گردانے جائیں - ایسا فرض کرنا توہین کے مترادف ہوگا . . . . پرنس بسمارک کے لئے اس سے زیادہ خوشی کی کوئی بات نہ ہوگی کہ ان (پرنس بسمارک) کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے - انہیں اس بات میں کوئی اعتراض نہ ہوگا کہ ان کی پولٹیکل زندگی کا باب ایسے حیرت انگیز طریقہ سے بند ہو-"

اس جواب کے بعد معلوم ہوتا تھا کہ جرمنی کی پبلک کا غم وغصہ قہقہوں میں تحلیل ہورہا ہے- لیکن برلن کے ارباب اقتدار جوش غضب سے بھرے ہوئے تھے- اس جوش میں ان سے یہ حماقت ہوئی کہ انہوں نے اخبار ریش سنز بگر میں وہ خط شائع کرادیا- جو ہربرٹ کی شادی کے موقع پر سفیر جرمنی متعینہ وائنا کو لکھا گیا تھا ہر ایک جرمن نے اس خط کو پڑھا اور جان لیا کہ نیا وزیر اعظم اپنے پیشرو کو ذلیل کرنے کے لئے کتنا بیتاب ہے- قوم کا خون کھولنے لگا - پہلے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ بسمارک کی برطرفی سخت کارروائی تو ہے - لیکن اس کو عمل میں لاکر قیصر نے اپنی ذہانت اور سیاست دانی کا ثبوت دیا ہے- اب ہر ایک پر یہ بات روشن ہوگئی کہ ولیم دوم نہ ذہانت کا مالک ہے نہ اسے سیاست دانی سے کچھ مس ہے- اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں بسمارک کے خلاف جو جذبہ معاندت باقی رہ گیا تھا - وہ بھی مٹ گیا اور بسمارک کے نام پر تحسین وآفرین کے نعرے بلند ہونے لگے - جرمنی میں اتنی تحسین وآفرین اس سے پہلے کسی کو نصیب نہ ہوئی تھی -

وائنا سے واپسی پر شاہانہ استقبال

اس طرح اسی سال کی عمر کو پہنچ کر بسمارک جرمن قوم کا دل مسخر کرنے میں کامیاب ہوگیا - پارلیمنٹ پرشیا کے ممبر کی حیثیت میں وہ اہل جرمنی کا دشمن تھا - پرشیا کے وزیر اعظم کی حیثیت میں وہ ان کے خلاف جنگ کرتا رہا - سلطنت جرمنی کے وزیر اعظم کی حیثیت میں وہ پارلیمنٹ جرمنی کا دشمن تھا - اپنے گھر میں اور اپنی جاگیروں میں اس کا اٹھنا بیٹھنا ہمیشہ اپنے طبقہ کے لوگوں میں رہا - متوسط طبقہ کے لوگوں حتٰے کہ اہل علم سے بھی اس نے کبھی اختلاط پیدا نہ کیا - اس کے دوست آشناؤں میں نہ کوئی پروفیسر تھا - نہ آرٹسٹ - نہ کوئی کاروباری آدمی - ساٹھ سال تک اس نے صرف سیاست دانوں اور امیر طبقہ کے لوگوں میں زندگی بسر کی - البتہ دو سال سے یعنی ریٹائرڈ ہونے کے بعد وہ جنٹلمین کاشتکار کی حیثیت میں ان لوگوں کے درمیان رہنا سہنا تھا - جن کی فلاح وبہبود کے لئے وہ اٹھائیس سال تک کام کرتا رہا -

اب جب وہ وائنا سے واپس آرہا تھا تو رستے میں ہر شہر کے لوگ ہجوم در ہجوم اس کا خیر مقدم کرنے کے لئے بیتاب نظر آتے تھے - کوئی شہر ایسا نہ تھا جہاں پبلک طور پر اس کو خراج تعظیم ادا کرنے کی تیاریاں نہ کی گئیں - حکومت پرشیا نے میڈ برگ اور ہیل کے باشندوں کو اس کے خیر مقدم میں حصہ لینے کی ممانعت کردی - اس پر تمام یورپ میں بڑا برا منایا گیا - اسی طرح فوجی بینڈ کو جو اس کا خیر مقدم کرنے جارہا تھا - یکایک بارکوں میں واپس چلے جانے کا حکم موصول ہوا - لیکن جینا میں جو واقعات ہوئے ان پر سارے جرمن میں اظہار مسرت کیا گیا -

یہاں اہل شہر - یونیورسٹی کے اراکین - ٹیچر، مرد عورتیں اور بچے سب منڈی میں جمع ہوگئے - گردونواح کے دیہات سے کسان بھی بہ تعداد کثیر شامل ہوئے - جہاں تک نگاہ جاتی تھی انسانی سروں کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا دکھائی دیتا تھا - ہر شخص کا دل جذبات عقیدت سے لبریز تھا - یہاں بسمارک نے ۹ تقریریں کیں - جن میں سے کسی میں بھی کوئی بے جان فقرہ نہ تھا - جب وہ اپنی گاڑی میں واپس آیا - اس وقت ہزارہا اشخاص اس ہاتھ کی بلائیں لینے کے لئے بیتاب تھے - جس کی ضربات نے ایک نسل تک انہیں خائف رکھا تھا - بسمارک بھی ہر شخص سے ہاتھ ملانے کو تیار تھا - اب رہ رہ کر اس کے دل میں خیال پیدا ہوتا تھا کہ اگر وہ ایسے لوگوں کو زیادہ حقوق و اختیارات دے دیتا تو کیا ہی اچھا ہوتا - وہ اپنے دل میں سوال کرتا تھا کہ کیا یہ عوام میرے طبقہ کے لوگوں سے بدرجہا زیادہ صادق نہیں - میرے طبقہ کے لوگوں نے جب میں برسر اقتدار تھا - مجھ سے بیوفائی کی اور اخیر میں مجھے نیچے گرا دیا - مگر یہ عوام جن کے مفاد کا میں ہمیشہ مخالف رہا - اسقدر تپاک کے ساتھ میری عزت افزائی

کر رہے ہیں۔

غلطی کا احساس

ڈریسڈن سے لے کر میونخ تک سارے جنوبی جرمنی میں بسمارک کا استقبال ایسی ہی گرمجوشی سے کیا گیا۔ ہر جگہ لوگ ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں استقبال کے لئے جمع ہو گئے۔ ہر شہر میں اس کا شاہانہ جلوس نکالا گیا۔ بسمارک، جوں جوں گرمجوشی کے یہ موثر نظارے دیکھتا تھا۔ توں توں اسے محسوس ہوتا تھا کہ میں نے کیسے کیسے موقعے ہاتھ سے کھوئے۔ اگر حکومت کے مالک یہ عوام ہوتے۔ تو میرے اقتدار کو کبھی زوال نہ آتا۔ اپنے ان محسوسات کا اظہار اس نے ایک جگہ خیر مقدم کے ایڈریس کا جواب دیتے ہوئے اپنی تقریر میں بھی کیا اور کہا:۔

"آئینی بادشاہت کا اصل اصول یہ ہے کہ بادشاہ کی مرضی کو ان لوگوں کی تائید بھی حاصل ہو۔ جن پر حکومت کی جاتی ہے۔ شاید میں خود بھی نادانستہ طور پر پارلیمنٹ کے اقتدار کو کم کرنے کا موجب ہوا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ اس کا اقتدار مستقل طور پر اس حد تک کم رہے۔ جتنا کہ اس وقت ہے۔ میں یہ پسند کروں گا کہ پارلیمنٹ کو ایک مرتبہ پھر پائدار اکثریت حاصل ہو جائے۔ کیونکہ اس کے بغیر اسے وہ اقتدار حاصل نہیں ہو سکتا۔ جو ہونا چاہئیے۔ نمایندہ اسمبلی کا دائمی فرض یہ ہے کہ گورنمنٹ پر نکتہ چینی کرے۔ اس کی نگرانی کرے۔ اس کو تنبیہ دے اور بعض حالات میں اس کی رہنمائی کرے جب تک ملک میں ایسی پارلیمنٹ نہ ہوگی۔ اس وقت تک مجھے اپنی قومی ترقی کی پائیداری کے متعلق تشویش لاحق رہے گی۔ پہلے میری ساری کوشش اس مقصد پر مرکوز ہوتی تھی کہ عوام میں شاہ پرستی کے جذبہ کو تقویت دی جائے۔ اس پر سرکاری دنیا مجھے سر آنکھوں پر بٹھاتی تھی اور شاہی دربار احسان کے بوجھ تلے دبے جاتے تھے۔ مگر عوام مجھے سنگسار کرنا چاہتے تھے۔ آج عوام مجھے سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں اور سرکاری علاقوں کے لوگ مجھ سے کنیاتے ہیں۔ یہی میرے نزدیک تقدیر کی نیرنگی ہے۔"

بسمارک ساری عمر شاہی اقتدار کو تقویت دینے کیلئے جدوجہد کرتا رہا۔ اس جدوجہد میں اس نے عوام کے حقوق کو پامال کیا۔ اب جبکہ عوام اس کی حمایت کا دم بھرنے لگے۔ تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ سمجھا کرتا تھا کہ شاہی اقتدار کی تقویت سے میری پوزیشن مضبوط ہو رہی ہے۔ لیکن اب کہ بادشاہ کے ہاتھوں اس کا ستارہ اقبال معرض زوال میں آچکا تھا۔ وہی جذبہ جس کے زیر اثر وہ سابق میں بادشاہ کا وفادار رہتا تھا۔ اسے عوام کے حقوق کا علمبردار بنانے کا موجب ہو گیا۔ اب وہ کہا کرتا تھا:۔

"جب سٹیشن کے قریب پہنچ کر میری ٹرین کی رفتار کم ہو جاتی ہے اور میں منتظر ہجوم کو گاتے اور نعرے لگاتے سنتا ہوں تو میرا دل خوشی سے لبریز ہو جاتا ہے کہ مجھے جرمنی نے فراموش نہیں کیا۔"

قیصر کھسیانا ہو گیا

۱۸۹۵ء کے موسم خزاں میں اس کی بیوی یوحنا کا انتقال ہو گیا۔ اس سے اس کے دل کو بڑا صدمہ ہوا۔ اس زمانہ میں اس نے اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو جو خطوط لکھے۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اپنی رفیقہ حیات کی دائمی جدائی اس کے لئے کتنی اندوہ افزا تھی۔ یوحنا کی علالت کے ایام میں وہ اکثر کہا کرتا تھا۔ "میں اپنی بیوی سے پہلے مرنا پسند نہیں کرتا۔ لیکن اس کے بعد زندہ رہنا بھی مجھے پسند نہیں ہوگا۔"

یوحنا کی وفات کے بعد وہ عملی طور پر گوشہ نشین ہو گیا۔ لیکن کیا غم و حرماں کی اس تاریکی میں اس کے دل کی قوت کافور ہو گئی یا اس نے سلطنت کو فراموش کر دیا؟ نہیں ہرگز نہیں۔ اس نے اپنے دشمنوں یعنی جرمنی کے موجودہ حکمرانوں کو فراموش نہ کیا۔

۱۸۹۶ء کے موسم خزاں میں روس اور جرمنی کے خفیہ معاہدہ کی تجدید نہ ہونے کے نتائج نمایاں شکل میں سامنے آنے لگے۔ زار روس پیرس میں آیا ہوا تھا اور فرانس میں روس کی دوستی کا جذبہ بلند ہو رہا تھا۔ بسمارک نے اخبارات میں پڑھا کہ روس سے تعلقات کے انقطاع کی ذمہ داری بسمارک پر ہے۔ یہ پڑھ کر بسمارک بھڑک اٹھا۔ وہ جانتا تھا کہ قطع تعلق کا حقیقی ذمہ دار کون تھا اور جب تک اس کے جسم میں جان تھی وہ کبھی یہ گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ اس سلسلے میں کوئی اسے ملزم گردانے۔ اس نے پھر تلوار کھینچ لی اور اپنے مخالفوں سے دو دو ہاتھ کرنے کو تیار ہو گیا۔ چنانچہ اس کے اخبار میں ذیل کا نوٹ شائع ہوا:۔

"۱۸۹۰ء تک دونوں سلطنتیں اس پر پورے طور سے

متفق تھیں کہ اگر ان میں سے کسی ایک پر حملہ ہوا تو دوسری فریق ضامن نہ غیر جانبداری کا رویہ اختیار کرے۔ لیکن پرنس بسمارک کی علیحدگی کے بعد اس سمجھوتہ کی تجدید نہ ہوئی۔ جو کچھ برلن میں ہوا۔ اس کے متعلق اگر ہماری معلومات درست ہیں۔ تو روس اس امر کے باوجود کہ وزارت میں تبدیلی کی وجہ سے اس کا دل کھٹا ہو گیا تھا۔ باہمی ضمانت کے معاہدہ کو جاری رکھنے پر تیار تھا۔ لیکن کونٹ کیپریوی نے انکار کر دیا۔ . . . ہماری رائے میں مطلق العنان زار کا جمہوریت پسند فرانس کی طرف مائل ہونا محض کیپریوی کی غلط پالیسی کا نتیجہ تھا۔"

اس نوٹ سے یورپ کے کان کھڑے ہو گئے اور جرمنی میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ بڈھے جنگجو نے قیصر پر اس سے پہلے اتنی سخت ضرب کبھی نہ لگائی تھی۔ سرکاری اخبار رلیش سنزیگر میں اس کا جواب شائع ہوا۔ لکھا تھا:۔

"مذکورالصدر نوعیت کے سفارتی معاملات سفارتی راز ہیں۔ جو سختی کے ساتھ پوشیدہ رکھے جانے چاہئیں۔ ایسے معاملات میں رازداری کے اصول پر عمل پیرا ہونا بین الاقوامی اخلاقیات کا جزو اعظم ہے اور اس اصول کا احترام نہ کرنا ملک کے اہم مفاد کو ضرر پہنچانا ہے۔"

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ بسمارک کے مقابلہ میں یہ تحریر کتنی بودی ہے۔ قیصر تو بالکل کھسیانا ہو گیا۔ اس نے جھٹ شہنشاہ فرانس جوزف کو تار بھیجدیا:۔ "اب آپ کو اور دنیا کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ میں نے پرنس (بسمارک) کو کیوں برطرف کیا تھا۔"

قیصر اور بسمارک کی آخری ملاقات

لیکن اگلے ہی موسم گرما میں قیصر نے امیرالبحر ٹرپٹز کو بسمارک کے پاس بھیجا اور یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ جرمنی کی بحری فوج کے متعلق اپنے قیمتی خیالات کا اظہار کرے۔ مگر بسمارک نے اس کی بجائے خود قیصر کے متعلق کھری کھری سنانی شروع کر دیں۔ جب ٹرپٹز نے اپنی یونیفارم کی طرف اشارہ کر کے درخواست کی کہ آپ کم از کم اس کا تو پاس کریں۔ تو بسمارک نے کہا:۔

"آپ شہنشاہ سلامت سے کہہ دیں کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہتا کہ مجھے زندگی کے بقیہ ایام امن و امان سے بسر کرنے دئے جائیں۔"

لیکن نوجوان قیصر بسمارک کے ہاتھوں ذلتیں اٹھانے کے باوجود اسے اس کے حال پر چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ چنانچہ اس کی موت سے چھ ماہ پہلے وہ بلا دعوت اس سے ملنے گیا اور اپنے بہت سے مصاحبین کو بھی ساتھ لیتا گیا۔

اس ملاقات کی تفصیلی حالات بڑے دلچسپ ہیں۔ بوڑھا مدبر اپنے دروازے کے سامنے ایک پہیے دار کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ قیصر کے آدمی قطار در قطار آتے ہیں اور اس کے سامنے بیٹھتے جاتے ہیں۔ جب لوکالنس اپنا دہ ہاتھ پیش کرتا ہے جس سے اس نے بسمارک کو برطرفی کا پروانہ دیا تھا تو بسمارک بُت کی طرح ساکت رہتا ہے۔ لوکالنس شرمندہ ہو کر اُٹھ بیٹھتا ہے اور ایک طرف ہٹ جاتا ہے۔ اس کے بعد کھانا کھانے کے وقت بسمارک سوچتا ہے کہ اپنے مہمان دشمن کو جس سے پھر کبھی ملاقات نہیں ہو گی۔ آخری تنبیہ کس طرح کی جائے اس وقت اس کا روائتی غرور عود کر آتا ہے اور وہ سات سال کے بعد پہلی مرتبہ قیصر سے بین الاقوامی پالیسی کے متعلق گفتگو شروع کر دیتا ہے۔ قیصر بدمزگی سے بچنے کے لئے گفتگو کا رُخ بدلتا ہے۔ بسمارک پھر پہلے موضوع پر آجاتا ہے۔ قیصر پھر کوئی اور پہلو نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر درباری جرنیل بھی دہشت زدہ ہو جاتے ہیں جھوٹا مولتکے آہستہ سے کہتا ہے:۔ "یہ بڑا خوفناک سین ہے۔"

اب بسمارک کے سامنے مستقبل کا نقشہ پھرنے لگتا ہے۔ وہ دل میں کہتا ہے:۔ "وقت گزرتا جاتا ہے۔ زندگی ختم ہوتی جاتی ہے پھر مجھے اس نوجوان سے ملنے کا اتفاق نہیں ہو گا۔ جس نے میرے زندگی بھر کا کام ــــــ سلطنت کو مجھ سے چھین لیا ہے۔ جلدی یا بدیر شہنشاہ اپنے تاج اور اپنے ملک کو کھو بیٹھے گا۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ اسے خطرے سے آگاہ کر دیا جائے۔ شاید مرتے ہوئے آدمی کی آواز اسے خبردار کر دے۔ اور وہ راہِ راست پر آجائے۔"

یہ سوچ کر بسمارک اچانک مگر اتنے بلند لہجہ میں کہ میز پر بیٹھا ہوا ہر شخص سُن سکے۔ کہتا ہے:۔ "حضور عالی۔ جب تک فوج کے موجودہ افسر آپ کے پاس ہیں۔ آپ جو کچھ چاہیں کر سکتے ہیں۔ لیکن جب یہ نہ رہیں گے تو معاملہ دگرگوں ہو جائے گا۔" قیصر ان الفاظ کو سُنا اَن سُنا کر دیتا ہے اور رخصت ہو جاتا ہے۔

خوفناک پیشگوئی

بڈھا مدبر پرائیویٹ طور پر پھر اپنی پیشگوئی کو دہراتا ہے اور بطور

تنبیہ کہتا ہے :-

"اگر ملک پر اچھی طرح حکومت کی جائے - تو آنے والی جنگ ٹل سکتی ہے - اگر بُری طرح حکومت کی جائے - تو یہ جنگ ہفت سالہ جنگ ہو گی - مستقبل کی جنگ کا فیصلہ توپخانہ سے ہو گا - فوجوں کی جگہ ضرورت کے وقت پُر کی جا سکتی ہے - لیکن توپیں زمانہ امن میں تیار کر لینا ضروری ہے ..... روس میں جمہوری حکومت کا قیام اس سے بہت زیادہ قریب ہے - جتنا اکثر لوگ خیال کرتے ہیں ......
مزدوروں اور سرمایہ داروں کی جنگ میں زیادہ فتوحات مزدوروں کو حاصل ہوئی ہیں اور جب مزدوروں کو ووٹ کا حق مل جائے گا - تو ہر جگہ ان کی فتح ہو گی - جب آخری فتح ظہور پذیر ہو گی - تو یہ مزدوروں کی فتح ہو گی -"

دنیا جانتی ہے کہ یہ پیشگوئی حرف بحرف پوری ہوئی ہے -
بسمارک نے جرمنی کو جو وعظ کیا ہے - وہ بھی زور بلاغت کے لحاظ سے کچھ کم نہیں - اس وعظ میں وہ اپنے متعلق بھی فتوے صادر کرتا ہے اور کہتا ہے :-

"شاید میرے ہی مشکوک طرزِ عمل کا نتیجہ ہے کہ جرمنی ریڑھ کی ہڈی سے محروم ہے اور عہدوں کے بھوکے اور ابن الوقت لوگ حشرات الارض کی طرح پیدا ہو گئے ہیں ..... سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ پارلیمنٹ کو مضبوط کیا جائے - لیکن یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ ایسے لوگ منتخب ہوں جو آزادی کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کریں - بحالات موجودہ پارلیمنٹ نچلے درجے پر ہے ..... مجھے یقین ہو گیا ہے کہ انقلابات جسقدر دیر سے رونما ہوں - اسی قدر زیادہ خطرناک ہوتے ہیں .... میں ہمیشہ یہی بہتر سمجھتا رہا ہوں کہ دوسروں پر حکومت کرنے کی بجائے کسی کی متابعت نہ کروں - اگر آپ ایسا کہنا پسند کریں - تو میرا زاویہ نگاہ جمہوریت پسندانہ رہا ہے ..... شاید خدا جرمنی پر بربادی کا ایک دوسرا زمانہ لائے گا - جس کے بعد شوکت و عظمت کا نیا زمانہ آئیگا ...... یہ شوکت و عظمت لازماً جمہوریت کی بنیادوں پر ہو گی۔"

چنانچہ آج جرمنی میں شاہی حکومت نہیں - بلکہ اس کا شمار دنیا کے جمہوری ممالک میں ہوتا ہے - یہ صحیح ہے کہ اس کا موجودہ حکمران ہٹلر سوڈکٹیٹروں کا ایک ڈکٹیٹر ہے - لیکن جمہور کی رضامندی سے محروم نہیں -

(پنڈت) میلا رام وفا

غزل

گو تلخ تھا جینا غم میں ترے، بیزار بھی تھے گو جینے سے
پر دیکھ کے اپنی آنکھوں سے ہم زہر کا ساغر پی نہ سکے

سو چاک تھے جامۂ ہستی میں، ہر چاک پہ اپنی نظریں تھیں
تا عمر یہی تھا شغل مگر اک گوشۂ داماں سی نہ سکے

ہے خوب شرابِ حبِ وطن پر ہم وطنوں کو کیا کہئے
اس امرت کو بھی زہر سمجھ کر شیخ و برہمن پی نہ سکے

ہم سارے جہاں سے کہتے پھرے افسانۂ خضر و آبِ بقا
اور موت کے وقتِ معین سے اک لمحہ زیادہ جی نہ سکے

تو اپنے قفس کو دیکھ کبھی صیاد ہمیں بدنام نہ کر
تھا پاسِ وفا بے حد لیکن بے آب و دانہ جی نہ سکے

بیزار تھے جب ہم جینے سے تو موت بھی ڈھونڈے سے نہ ملی
اور وقت جب آیا ؎ کا تو جینے سے بھی جی نہ سکے

موہوم امیدوں پر خنداںؔ تا صبحِ قیامت ہم جیتے
احساس ہوا جب غم کا ہمیں اک لمحہ بھی پھر جی نہ سکے

رام جوایا خنداںؔ

مشاہدہ

مجھے بتا رہا ہے کیوں کہ دلفریب ہے سماں ؟ نجوم زرنگار سے سجی ہے بزمِ آسماں
قیامتِ نظارہ ہے خرامِ جوئے کہکشاں فروغِ حسن ہے عیاں تو کیا ضرورتِ بیاں
ہے کون اس سے بے خبر
مری بھی اس پہ ہے نظر
نہ پھونک مجھ پہ یہ فسوں ، میں آشنائے راز ہوں ، مجھے بتا رہا ہے کیوں کہ دلفریب ہے سماں ؟

حسین ہے منظرِ چمن — بجا بجا حسیں سہی حسیں ہے چہرۂ سمن — گماں نہیں یقیں سہی
عروسِ سُرخ پیرہن چمن کی سرزمیں سہی ہجومِ گل سے پُرشکن بہار کی جبیں سہی
یہ سب درست ہے مگر
نہیں دماغ شور و شر
نہیں سر چرا و چوں ، تجھے ہوا ہے کیا جنوں ، مجھے بتا رہا ہے کیوں کہ دلفریب ہے سماں ؟

یہ مجھ سے ذکر کس لئے کہ باغ گل بدوش ہے نسیم عطر بیز ہے ، بہار سُرخ پوش ہے
کلی سبو بدست ہے ، شگوفہ مے فروش ہے مجھے بھی کچھ تو عقل ہے ، مجھے بھی کچھ تو ہوش ہے
مجھے بھی ہے ملی نظر
نگاہِ غور سے تیز تر
اسیرِ گفتگو رہوں ؟ کروں مشاہدے کا خوں ، مجھے بتا رہا ہے کیوں کہ دلفریب ہے سماں ؟

تو صنعِ کردگار دیکھ ، دیکھ کر خموش رہ تبسمِ بہار دیکھ ، دیکھ کر خموش رہ
فروغِ لالہ زار دیکھ ، دیکھ کر خموش رہ قیامت آشکار دیکھ ، دیکھ کر خموش رہ
برنگِ کوکبِ سحر
خرابِ بادۂ نظر
مناظروں سے دور ہوں ، نہیں ہے مجھ کو یہ جنوں ، مجھے بتا رہا ہے کیوں کہ دلفریب ہے سماں ؟

آغا صادق حسین صادق

کُبڑا

ہماری گلی سے باہر نکلتے ہی ایک پھلوں کی دکان ہے جس کا مالک ایک کُبڑا ہے۔ پہلے پہل جب میں اُس کی دکان پر گیا تو دیکھتے ہی مجھے اُس سے نفرت سی ہو گئی۔ شاید اس لئے کہ اُس کی شکل بعید مکروہ تھی۔ شروع شروع میں یہ نفرت بالکل معمولی سی تھی اور میرے دل کی گہرائیوں میں کہیں دُور پڑی رہتی تھی۔ لیکن آہستہ آہستہ نہ جانے کیوں یہ معمولی سی نفرت شدید کراہت میں بدل گئی۔ پہلے میں اکثر اُس کی دکان کے سامنے سے بے دھیان گزر جایا کرتا تھا مگر اب اُس کی گھناؤنی ہستی کو محسوس کئے بغیر میرا وہاں سے گزرنا مشکل ہو گیا۔ اُس کی دکان کے نزدیک پہنچتے ہی میری ناک خود بخود سکڑ جاتی اور سانس لینے سے انکار سا کر دیتی۔ جیسے دکان کے ماحول میں زہر بھری ہوئی ہو۔ میں کئی بار اپنے خیالات میں محو یا اپنے احباب کی باتوں میں مستغرق وہاں سے گزرا تھا۔ لیکن کبھی بھی ایسا نہیں ہوا کہ کبڑے کی غیر معمولی شخصیت نے میری محویت کو پل بھر کے لئے ہی کیوں نہ ہو، نہ توڑ دیا ہو۔ میں یہ تجربہ کر کے بہت حیران تھا کہ جن سے ہم محبت کرتے ہیں اُن کی طرح جن سے ہم نفرت کرتے ہیں وہ بھی کس طرح ہمارے دل و دماغ پر چھائے رہنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

کبھی کبھی میرا ضمیر اس بے وجہ حقارت کے برخلاف جہاد کر دیتا اور میں اپنے پُرسکون لمحوں میں سوچتا کہ مان لیا یہ کبڑا ہے بدشکل ہے، حقیر ہے، لیکن آخر میری طرح انسان ہے۔ رات دن پسینہ بہاتا ہے۔ مجھ سے یا کسی اور سے کچھ نہیں مانگتا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ میں اس سے نفرت کرتا ہوں اور باوجود نزدیکی پڑوسی ہونے کے اس کی دکان کو راہ میں چھوڑ کر کسی دور کی دکان سے پھل وغیرہ خریدنے کی زحمت اٹھاتا ہوں۔ اس طرح کئی بار میں اپنے آپ کو کوس چکا تھا لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں اس کی دکان نزدیک آئی نہیں کہ میری ناک سکڑی۔

اسی طرح چار پانچ مہینے گزر گئے اور آہستہ آہستہ کبڑے کو بھی میری نفرت کا پتہ لگ گیا۔ میں حیران تھا کہ اسے اس امر کا کیسے پتہ چلا۔ شاید اسی وجہ سے کہ میں اُس کی دکان کو راہ میں چھوڑ کر اگلی دکان سے سودا سلف لیا کرتا تھا، نہیں یہ کوئی بیّن دلیل نہیں، کیونکہ گلی کے اور کئی لوگ بھی ایسا کرتے تھے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ کُبڑا کافی سمجھدار ہے اور انسان کے بُشرے سے اُس کے دلی راز کو بھانپ سکتا ہے۔ یہ سوچ کر میں خود کو ملامت کرتا کہ کم بخت کم سے کم اسی لئے نفرت چھوڑ دے کہ وہ سمجھدار ہے۔ کیا سمجھدار ہونے میں کوئی حسن نہیں؟ لیکن جلد ہی نفرت کا ہمہ گیر سیلاب میرے ضمیر کی ...... مہین مہین لہروں کو سمیٹ کر لے جاتا اور از سرِ نو کبڑے کی مکروہ شکل اپنی تمام حقارت انگیز بدصورتیوں کے ساتھ میرے سامنے جلوہ گر ہو جاتی۔

ایک دن میں دھوپ میں بیٹھا پڑھ رہا تھا کہ بابے کنگ نے (یہ میرے چھوٹے بھائی کا پیار کا نام ہے) ایک خوشنما سا پھول میرے کوٹ کے بٹن ہول میں ٹانک دیا۔ میں نے دزدیدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ پھول کا نمدے کا بنا ہوا تھا۔ مگر کمالِ صنعت سے حقیقی نظر آتا تھا۔ میں نے بابے کنگ کی ٹھوڑی کو پیار سے ہلا کر کہا۔ "ارے کہاں سے اُڑایا ایسا پھول"

"کبڑے نے دیا ہے۔" بابے کنگ نے طفلانہ شوخی سے اکڑ کر کہا "وہ خوبصورت پھول بناتا ہے، ہمیں ہر روز دیتا ہے۔" پھر کچھ سوچ کر" اور کہا کرتا ہے اپنے بھیّا کے کوٹ میں لگا دیا کرو۔"

یہ سُن کر میرے دل میں نزہت نوازی کے جذبے نے کروٹ بدل لی۔ میں نے پھول کو بٹن ہول سے نکال لیا اور شاطرانہ انہماک کے ساتھ اُس کی پنکھڑیوں کی لطافت اور رنگ آمیزی کا مطالعہ کرنے لگا۔ آخر فرطِ مسرت سے میرے منہ سے نکل گیا۔ "واہ میاں کبڑے واہ۔"

میرے پاس ہی میری والدہ بیٹھی چرخہ کات رہی تھیں، بول اُٹھیں: "ابھی تم نے کبڑے کا دیکھا ہی کیا ہے؟ اسے دیکھنا ہو تو بڑے گوردوارہ میں دیکھو دیواروں پر تو پھول، چھتوں پر تو پھل دروازوں پر تو پھول، ایک ایک سرو بناتا ہے دیکھو تو دانتوں پسینہ آجائے

یہ کبڑا کیا ہے ایک "چیچ" ہے۔"

یہ سن کر کچھ عرصے کے لئے میری کبڑے کے متعلق رائے بدل گئی۔ مگر جلد ہی نفرت کی ظلمت میں اس کی فنی لطافتیں گم ہو گئیں۔

اُسی شام کو گلی میں گزرتے وقت، نہ جانے کیوں، میری آنکھیں خود بخود کبڑے کی طرف مڑ گئیں، وہ پہلے ہی میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کی گھنی مونچھوں سے ایک پُراسرار مسکراہٹ نکل کر میری طرف لپکی جس پر سوچتا ہوا میں آگے گزر گیا۔

رات کو بجلی بجھا کر جب میں سونے کے لئے بستر پر لیٹا تو اندھیرے کی چادر میں پھر کبڑے کی وہی پُراسرار مسکراہٹ ناچنے لگی۔ میں نے بہتیرا اپنے دھیان کو اور... چیزوں کی طرف لگانے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر مسکراہٹ کو آنکھوں کے سامنے سے نہ ہٹنا تھا نہ ہٹی۔

اگلے دن بھی کبڑے کی مسکراہٹ ایک دو بار نمودار ہوئی۔ اسی طرح کافی مدت گزر گئی، مگر اس بیچ میں ایک دن بھی ایسا نہ گزرا تھا کہ جب کبڑے کی اس عجیب مسکراہٹ نے میرے اطمینان کو برہم نہ کیا ہو۔

گرمیوں میں میں احباب کے ساتھ کشمیر چلا گیا۔ وہاں جا کر جیسا کہ میری عادت ہے۔ میں تمام چیزوں کو بھول جایا کرتا ہوں۔ یہاں تک کہ اخبار اور کتابیں بھی نہیں پڑھتا۔ کیونکہ کچھ عرصہ کے لئے معمولی دنیا کی تمام چیزوں کو مکمل طور پر بھول جانا، آدمی کو دنیا کے کاموں کے لئے قابل تر بنا دیتا ہے۔ اس کے علاوہ نہر، مہرہ ندیوں، کنول جڑی جھیلوں، نیلے آسمانوں، چیل پوش پہاڑوں اور خواب آور آبشاروں جیسے جیتے جاگتے نظاروں کو چھوڑ کر بے جان کتابوں کی اوراق گردانی میں مجھے کوئی دانائی بھی نظر نہیں آتی۔ ہاں تو وہاں جا کر میں سب کچھ بھول گیا۔ مگر کبڑے کی ہمہ گیر مسکراہٹ وہاں بھی پہنچ چکی تھی۔ یہ دیکھ کر میں بہت سٹپٹایا اور آہستہ آہستہ میرا یہ سٹپٹانا خوف میں تبدیل ہونے لگا۔ وہ ہلکی کرن جیسی سنہری مسکراہٹ اب ناگن کی طرح تاریک اور پُرپیچ نظر آنے لگی۔ کچھ عرصہ کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ یہ مسکراہٹ مجھے ایک دن پاگل بنا کر رہے گی۔ یہ سوچ کر مجھے کبڑے سے اور بھی نفرت ہو گئی۔ پہلے وہ میرے لئے ایک مکروہ انسان ہی تھا مگر اب ایک بھیانک بھوت۔

دو ماہ کے بعد میں کشمیر سے گھر لوٹا اور رات کو سونے کے لئے کھلی چھت پر لیٹا۔ کوئی دس بجے کے قریب گھر کے تمام افراد مجھ سے کشمیر کی باتیں سنتے سنتے سو گئے۔ میری آنکھیں بھی کوفت راہ سے بھاری ہو کر بند ہونے والی ہی تھیں کہ کبڑے کے گانے کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ رات کی مکمل خاموشی میں بہاگ کی رسائی تانیں نیند کی راحت افزا تاریک لہروں کی طرح آسمانوں میں گھوم کر میرے سینہ پر اُتر رہی تھیں۔ بالاکنٹ جو ابھی کروٹیں لے رہا تھا بول اٹھا۔ "کبڑا آآآ! کبڑا آآ" مگر میں کبڑے کے گانے کو سراہتا اور اپنے بُرے سلوک پر لعن طعن کرتا جلد ہی نیند کی لپیٹ میں آ گیا۔

سوتے سوتے کیا دیکھتا ہوں کہ مجھے طاعون کی گلٹی نکلی ہوئی ہے اور چارپائی پر اکیلا پڑا کراہ رہا ہوں۔ سارا محلہ مرگھٹ کی طرح سنسان اور ویران پڑا ہے۔ انسان تو ایک طرف رہا حیوان اور پرندے تک کی شکل نظر نہیں آتی۔ ماں باپ، بہن بھائی، بیوی بچے تمام مجھے بے بسی کی حالت میں چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ صرف ایک آدمی میرے سرہانے بیٹھا ہے۔ جو تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد میرے منہ میں دوا کا چمچہ انڈیل دیتا ہے۔ میں اُسے پہچان نہیں سکتا کیونکہ میری آنکھیں بخار کے خمار سے بند ہیں۔ پر کبھی کبھی کسی کے پیار بھرے ہاتھ مجھے اپنی پیشانی پر پھرتے محسوس ہوتے ہیں۔ میرے نیم بیدار حواس اپنے غیبی محسن کے سجدۂ شکر میں جھکے جا رہے ہیں۔ کچھ دیر کے بعد بخار کا زور کم ہوتا ہے اور تھوڑی تھوڑی آنکھیں کھلی کھلتی ہیں۔ کیا دیکھتا ہوں کہ کبڑا سرہانے بیٹھا میرے ماتھے پر ہاتھ پھیر رہا ہے اور اس کی گھنی مونچھوں میں سے وہی پُراسرار مسکراہٹ چھن چھن کر میری طرف جھانک رہی ہے۔ پھر مجھے کبڑے کے ہونٹ دکھائی دیتے ہیں اور بڑی خفیف سی آواز میرے کانوں میں پڑتی ہے "اب بھگوان کی دیا ہے، دوست بھیا کوئی فکر نہ کرو۔ کل تک ضرور راضی ہو جاؤ گے۔"

میں شکر گزاری کے جوش میں کبڑے کی قدم بوسی کے لئے اُچھلتا ہوں۔ اتنے میں میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ نیلے آسمانوں میں ستارے خاموش چھٹکے ہوئے تھے۔ اور میں کبڑے کی زبردست شخصیت کا پچھاڑا اور لتاڑا اُن کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اب مجھے کبڑا ستاروں سے بھی زیادہ مقدس اور خوبصورت نظر آ رہا تھا۔

صبح ہوتے ہی میں کبڑے کی دکان پر گیا اور لجاتے لجاتے کچھ پھلواری کے لئے کہا۔ کبڑے کی آنکھیں، فتح مندانہ مسرت سے متکیف تھیں، اور اس کی گھنی مونچھوں سے چھن چھن کر آتی مسکراہٹ معمول سے زیادہ جاذب تھی۔

تنویرات

ہندوستان میں ہوائی جہاز

تمام برطانوی سلطنت میں اول درجے کی ڈاک ایک ملک سے دوسرے ملک میں ہوائی جہاز کے ذریعے سے لیجائی جائے گی - اور اس صورت میں بھی ڈاک کے محصول میں زیادہ اضافہ نہ کیا جائیگا

ہندوستان کے لئے پانچ سرویسیں ہوں گی - جن میں دو زمین پر اُترنے والے ہوائی جہازوں کی ہوں گی - یہ دونوں سرویسیں معمولی خشکی راستے سے جاری ہوں گی اور کلکتے میں جاکر ختم ہو جائیں گی - تین سرویسیں پانی پر اُترنے والے ہوائی جہازوں کی ہونگی - ان سروسوں کا راستہ بھی شمالی ہند کے اوپر سے تقریباً وہی ہوگا - لیکن درمیان میں دہلی چھوٹ جائے گی اور سنگاپور کی سروس جاری رہے گی - دو سرویسیں آسٹریلیا کو چلی جائیں گی - ان کے ذریعہ انگلستان سے کراچی کا سفر صرف ڈھائی روز میں اور انگلستان سے کلکتے کا رستہ ساڑھے تین دن میں طے ہو جایا کرے گا -

بری اور بحری راستے سے پرواز کرنے والے ہوائی جہازوں کی تعداد ۲۸ ہوگی - ان ہوائی جہازوں میں چار چار انجن ہوں گے جو ساڑھے تین ٹن کا بوجھ لے کر فی گھنٹہ ۱۶۵ میل کی رفتار سے پرواز کریں گے - ان میں بیٹھنے کے لئے ۲۴ مسافروں کی جگہ ہوگی اور جب اس جگہ کو سونے کے قابل بنایا جائے گا تو ۱۶ مسافر سو سکیں گے -

زمین پر اُترنے والے ۱۲ ہوائی جہاز ہوں گے - ان میں سے آٹھ ہندوستانی راستے سے پرواز کریں گے - ان میں بھی چار چار انجن ہوں گے - جو کل ۲۰۵۰ گھوڑوں کی طاقت کے ہوں گے - ان میں دن کو ۲۷ مسافر بیٹھ کر سفر کرسکیں گے - اور شب میں ان میں ۲۰ مسافروں کے سونے کی جگہ نکل سکے گی - یہ فی گھنٹہ دو سو میل کی رفتار سے پرواز کرسکیں گے -

تخمینہ کرنے سے معلوم ہوا ہے کہ ہندوستان سے جو ڈاک باہر جاتی ہے اس کا سالانہ وزن تقریباً ۲۱۱ ٹن ہوتا ہے - جو ہر سروس کے حصے ۸۰ ٹن پڑتا ہے - اس طرح سمجھا گیا ہے کہ ہوائی جہاز کے ذریعہ ڈاک بھیجنے میں بڑی حد تک خرچ کم ہو جائے گا -

جنوبی ہند میں ہوائی سروس کا کام ٹاٹا سنسی لمیٹڈ کے سپرد کیا گیا ہے جو ہفتے میں پانچ دفعہ ڈاک پہنچایا کرے گی - حکومت سیلون سے مفاہمت ہوچکی ہے، جس روز سے یہ سکیم زیر عمل آئیگی اسی روز سے ہوائی سروس کولمبو تک وسیع کردی جائے گی - فضائی راستے کی توسیع کا کام جس میں ترچنا پلی میں ایک ایروڈروم بنانا بھی شامل ہے - آغاز پذیر ہوچکا ہے - راستے کے شمالی حصے میں وائرلیس اسٹیشن، فضائی راستہ اور ایروڈروم میں روشنی کا انتظام ہو رہا ہے - اس سروس میں نئے ہوائی جہاز اڑائیں جائیں گے جن میں دو انجن والے جہاز بھی شامل ہیں - ان میں ریڈیو بھی ہوگا اور یہ کراچی بمبئی سیکشن میں پرواز کریں گے - نئے ہوائی جہازوں میں ڈاک کے علاوہ مسافروں کے بیٹھنے کے لئے بھی جگہ ہوگی -

کراچی کولمبو کے راستے سے سالانہ ۵ لاکھ پاؤنڈ ڈاک ڈھوئی جائے گی - جس کے لئے ٹاٹا سنسی لمیٹڈ کو سالانہ پندرہ لاکھ روپے دئے جائیں گے -

کراچی لاہور سروس کے لئے جو ٹھیکہ انڈین ایرویز کو دیا گیا ہے اس میں ہفتے میں پانچ سروسوں کا انتظام کیا گیا ہے - اس سروس میں جو ڈاک ڈھوئی جائے گی اس کا سالانہ تخمینہ ایک لاکھ ۳۰ ہزار کیا گیا ہے - اس کے لئے انڈین نیشنل ایرویز کو ۲۵ء۳ لاکھ روپے دئے جائیں گے -

کراچی جیکب آباد سیکشن میں ایروڈروم بنائے جا رہے ہیں اور ہوائی جہازوں کی پرواز میں آسانیاں پیدا کرنے کے لئے راستے میں روشنی کا بندوبست کیا جا رہا ہے - انڈین نیشنل ایرویز کی مال ڈھونے کی طاقت سالانہ ۳۰۰۰۰ ٹن میل سے ۹۴۰۰۰ ٹن ہو جائے گی -

۱۹۱۱ء میں پچاس گھوڑوں کی طاقت کا ہوائی جہاز ۲۳ پونڈ ڈاک پچاس میل فی گھنٹہ کے حساب سے لے جاتا تھا لیکن

اب تین سو گھوڑوں کی طاقت کے ہوائی جہاز ڈھائی ٹن ڈاک اور چند مسافروں کو ڈیڑھ سو میل فی گھنٹے کے حساب سے لے جا سکیں گے

ہوائی جہازوں پر کام کرنے والے ہندوستانیوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے - چنانچہ ۱۹۳۶ء کے آخر تک پائلٹ، گراؤنڈ انجینیر، وائرلیس - اپریٹر اور ایر نیوی گیڈ کا لائیسنس رکھنے والے ہندوستانیوں کی تعداد ساٹھ فیصدی کے قریب پہنچ گئی تھی - جن تجارتی ہوائی جہازوں کے ڈرائیوروں کو ۱۹۳۶ء میں لائیسنس ملا تھا ان میں سے فیصدی پچاس نے ہندوستان ہی میں تعلیم پائی تھی - سال ماسبق کے اعتبار سے یہ تعداد دگنی تھی -

گونگاپن اور بہرہ پن

۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان میں گونگوں کی تعداد ۲۳۰۸۹۵ ہے اور بہرے گونگوں سے کئی گنا زیادہ ہیں - جو بچے پیدائشی بہرے ہوتے ہیں یا جن کو ایک دو برس کی عمر میں یہ مرض لاحق ہو جاتا ہے وہ بھی اکثر گونگے ہو جاتے ہیں - اگر پانچ سال کا بچہ بھی بہرہ ہو جائے تو اندیشہ ہے کہ وہ بھی بولنا بھول کر گونگا ہو جائے -

گونگاپن ایک ایسا نامراد مرض ہے جس کے علاج میں ڈاکٹروں کی اب تک کی کوششیں قطعاً ناکام ثابت ہوئی ہیں - گویائی کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے اور جن کی امداد سے ہم بولتے ہیں - مثلاً ہونٹ، زبان، تالو، حلق وہ گونگوں کے بھی ہوتے ہیں - لیکن ہم بول سکتے ہیں اور گونگے گویائی کی استعداد سے محروم ہوتے ہیں - ہم میں اور گونگوں میں اس اختلاف حال کا سبب یہ ہے کہ ہم قوت سماعت سے بہرہ ور ہیں - اور گونگوں میں قوت سامعہ نہیں ہوتی - دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ بہراپن ایک سبب ہے اور گونگا پن اس کا نتیجہ -

اس حقیقت کو اور واضح طور پر سمجھنے کے لئے آپ اس واقعہ پر غور کر سکتے ہیں کہ آواز سے تو گونگے کبھی محروم نہیں ہوتے، وہ بھی بولتے ہیں - چیختے ہیں - چلاتے ہیں، روتے ہیں، ہنستے ہیں - لیکن ہماری طرح الفاظ اور فقرے ادا نہیں کر سکتے - اس کی وجہ کیا ہے؟ صرف یہ کہ وہ بہرے ہوتے ہیں - بہرے پن کی وجہ سے انہوں نے اس زبان کو سنا ہی نہیں جو ہم بولتے ہیں پھر وہ اس کو کیوں کر بول سکتے ہیں؟ ایک بچہ اپنے والدین اور گرد و پیش والوں کو جو زبان بولتے سنتا ہے وہی خود بھی بولنے لگتا ہے لیکن جس زبان کے سننے کا اس کو موقع نہیں ملتا اس کا ایک لفظ بھی اس کی زبان پر کبھی نہیں آتا - جیسے ایک دیہاتی کی زبان پر انگریزی اور عربی فارسی کے الفاظ، بالکل یہی حالت بہروں کی ہے - بہرے پن کی وجہ سے وہ بچپن ہی سے ہماری زبان سن نہیں سکتے - اس لئے وہ گونگے ہو جاتے ہیں - الحاصل گونگے پن کا باعث بہرہ پن ہے -

بعض بچوں کو خاندان کے اثر سے یہ مرض ہو جاتا ہے - پٹنے کے گونگوں بہروں کے اسکول میں دو مسلمان لڑکیاں پڑھتی ہیں، دونوں بہنیں ہیں - ان کے نانا نانی دونوں کو بہرے پن کا مرض تھا - دہلی میں ایک خاندان تھا جس کی کل لڑکیاں گونگی تھیں اور لڑکے گویا تھے - تحقیقات سے معلوم ہوا کہ ان بچوں کا باپ گویا تھا اور ماں گونگی تھی

قوت سامعہ کو مختلف صورتوں سے نقصان پہنچتا ہے - کبھی کبھی وضع حمل کے وقت دائی کی نادانی یا غفلت سے بچے کی قوت سامعہ کو صدمہ پہنچ جاتا ہے - بعض اوقات چیچک کے صدمے سے بھی قوت سماعت زائل ہو جاتی ہے - کبھی شدید بخار کے اثر سے انسان بہرہ ہو جاتا ہے - کمسن بچوں کو ایسا بخار آتا ہے جس سے ان کی قوت سامعہ خراب ہو جاتی ہے - اس نقصان کی وجہ سے وہ ہمارے الفاظ سن نہیں سکتے - اور رفتہ رفتہ یاد الفاظ بھی بھول جاتے ہیں - اس لئے وہ آخر میں گونگے ہو جاتے ہیں - مجھے دہلی کے ایک ایسے بچے کا حال معلوم ہے جو پانچ سال کی عمر میں شدید بخار میں مبتلا ہوا جس سے اس کی قوت سماعت بے کار ہو گئی - صحت کے بعد کچھ روز تک تو وہ اپنی کہہ لیتا لیکن دوسروں کی سن نہیں سکتا تھا - پھر رفتہ رفتہ وہ جو کچھ بول لیتا تھا اسے بھی بھول گیا اور بالکل گونگا ہو گیا۔

بعض بچوں کو کان بہنے کی بیماری ہوتی ہے - بعض کے کانوں میں درد ہوتا ہے - عام طور پر ان امراض کو کوئی اہمیت نہیں دیجاتی - حالانکہ بعض دفعہ انہیں بیماریوں کے اثر سے بچے بہرے ہو جاتے ہیں اور بہرے پن سے ان کو گونگے پن کا مرض لاحق ہو جاتا ہے - اس لئے والدین کو بچوں کی قوتِ سماعت کی کامل نگہداشت کرنی چاہیئے -

ابو محمد امام الدین رامنگری

منشی خیرات علی

بمبئی ایکسپریس پوری رفتار پر چل رہا تھا۔ تیسرے درجہ کے ایک سالم ڈبہ پر کالج کے طلبا نے قبضہ جما رکھا تھا۔ ہینڈ بیگ۔ سوٹ کیس۔ ہولڈ آل ربکٹ۔ انبار در انبار تھے۔ صرف ایک کونہ میں منشی خیرات علی اپنی مختصر سی بساط سنبھالے گٹھڑی بنے پڑے تھے۔ تیسرے درجہ میں شمالی ہند کے ان نونہالوں کا سفر کرنا، ایک شہزادہ منشی تھا، ورنہ کفالت کا خیال نہ تھا۔ اور نہ منشی جی ایسی کائنات کا وجود ان کے لئے چنداں قابلِ مضائقہ معاملہ تھا۔ یہ نوجوان ہندوستان کی بیسویں صدی کا نمونہ تھے۔ بلکہ ہر انداز اور ہر ادا سے دس بیس برس آئندہ کا پتہ دیتے تھے۔ لباس، سج دھج، شکل صورت، سب "سبحان اللہ" گفتگو اور اس کے موضوع سمندر پاری تھے۔

اس دور میں طلبا کا یہ رنگ، ان ایام کی یاد تازہ کرتا تھا جبکہ عمر خیام، حسن بن صباح اور نظام الملک طوسی، تین ہونہار طالب علموں نے امام موافق کی درسگاہ سے نکل کر دنیا میں اپنی اپنی راہ لی۔ البتہ ان کے حالات کی پستی اور دلوں میں بلند ارادوں کا وہ ہجوم کہ کیا کہنا ہر ایک اپنے آسمان کا آفتاب تھا جو ہمارے تاریک دور کو درخشاں بنا سکے" اسے لیا آرزو......"

ایکسپریس کی رفتار، گلابی جاڑہ، صبح کا وقت، منشی خیرات علی نے اپنی خستہ ملاگیری دلائی میں اندر ہی اندر سنبھل کر کروٹ لی۔ سر اٹھایا، ڈبہ اور مسافروں کا جائزہ لیا، برابر میں ایک نوجوان سے دلی کا پتہ پوچھا مگر یہ سُن کر کہ ابھی دور ہے پھر گٹھڑی ہو گئے۔

اٹھتی جوانیاں، شوخیلے مزاج، طالب علمی کا زمانہ، ریل کا سفر، نوجوان مسافروں نے باتوں ہی باتوں میں صبح کر دی۔ منشی جی بھی پہلی نیندیں لے چکے تھے۔ خیال کیا کہ سونے سے نماز اچھی ہے، اُٹھ بیٹھے گبرون کی شیروانی کا دامن سنبھالا۔ چکن کی ٹوپی پھونک مار کر کھڑی کی اور اوڑھ لی۔ پٹے جو فرقدان مبارک کا ساتھ چھوڑ کر رہ گئے تھے۔ درست کئے۔ ٹین کا لوٹا اٹھا، وضو کر، نماز پڑھ، فارغ ہو، دلائی اوڑھ، بقچی سنبھال، بیٹھ گئے۔

نوجوان طلبا اب تک مختلف مضامین پر بحث میں مشغول تھے۔ منشی جی کی کاغانی داڑھی دیکھ کر، ایک بولا "صبح محمڈ بیٹھی ہے"۔ دوسرے نے کہا "اللہ اکبر" تیسرے نے "بندے ماترم" چوتھے نے "ست سری اکال" یہ رنگا رنگ کی بولیاں سنکر منشی خیرات علی مسکرا سے دیئے۔ اس تبسم میں کچھ زندہ دلی اور کچھ تعارف کی چاشنی تھی۔ بس اب کیا تھا۔ سوالات کا تانتا بندھ گیا۔ کچھ شوخ اور بعض پُرحیا آنکھوں کا نشانہ بن گئے۔

ایک:۔ جناب کہاں کا قصد ہے؟

دوسرا:۔ کیا لوٹنے کا بھی ارادہ ہے؟

تیسرا:۔ صاحب کا گھونسلا؟

چوتھا:۔ حضرت روح القدس کا مزار؟

پانچواں:۔ حضور کی تعریف معہ چھپر؟

مگر واہ وا منشی خیرات علی کیا کہنا! ہر پھبتی کا مناسب جواب دیتے ہوئے باتوں باتوں میں گھل مل گئے۔ اتنے میں اسٹیشن آیا۔ گرم چائے اور خستہ بسکٹ کی آواز پر صبح سویرے سب کی طبیعت کھِر کھِرا گئی۔ منشی جی کو دعوت دی۔ انہوں نے معذرت کر کے کچھ اپنا ہی نسخہ استعمال کیا اور مگن ہو بیٹھے۔ ذرا گاڑی چلی۔ پھر ہنگامہ شروع ہو گیا۔ عجب پُرلطف منظر تھا۔ شیخ لونڈوں کے نرغے میں تھے۔ کچھ نوجوان منشی جی سے دل بہلا رہے تھے۔ کہیں سینما کا ذکر تھا۔ ایک گروہ ڈرامہ اور تھیئیٹر کی منزلوں سے غریب ہندوستان پر لے دے کر رہا تھا اور منشی خیرات علی بھی لڑکوں میں لڑکے بنے ہوئے تھے۔

ایک طالب علم:۔ تو جناب کا اسم گرامی؟۔

منشی جی:۔ خیرات علی۔

دوسرا:۔ اور تخلص؟۔

منشی جی:۔ سائل۔

کئی مل کر:۔ واہ وا۔ بلا کا تناسب ہے۔ قیامت کا شاعرانہ ذوق ہے۔

تیسرا:۔ کیا خوب۔ ڈرامائی "سلے" اور "دسے" کی جدّت ہے۔

چوتھا:۔ تو کیا آپ اہلِ کرم کا تماشا دیکھتے ہیں؟

منشی جی:۔ صاحبان۔ کیا نام اور کیا تخلص۔ کیا ڈرامہ اور کیا اس کی جدّت اب تو اپنے ہی تماشے کا "ڈراپ" ہونے کو ہے۔

ایک اور مشترکہ قہقہہ تحسین۔

ایک:۔ واہ بڑے میاں آپ نے تو خوب رنگین طبیعت پائی ہے۔

دوسرا:۔ کچھ ناٹک ڈرامے میں بھی دخل ہے۔

تیسرا:۔ پرانے گنہگار ہیں۔ مگر صاحب ڈرامہ تو یورپ اور امریکہ کا ہی حصّہ ہے۔ ہندوستانی تو خاکہ ہی اڑانا جانتے ہیں۔

چوتھا:۔ ہندوستانیوں کو اس آرٹ کا کہاں سلیقہ ہے۔ یہ کمال تو مغرب کا ہی امتیاز ہے۔

منشی جی:۔ مشرق نے اس طرف توجہ ہی نہیں کی۔

ایک:۔ توجہ کیا معنے۔ بہت کچھ جھک مارا۔ جہاں کہیں دیکھو یورپ والوں کا منہ چڑایا ہے۔

منشی جی:۔ نہیں صاحب، دراصل مشرق اور ہندوستان میں ڈرامہ بحیثیت ادب اور تمثیل قابلِ توجہ ہی نہیں سمجھا گیا۔

دوسرا:۔ خوب، کالیداس محض غلطی سے مشرقی شکسپیر کہلاتے ہیں۔ کیا یہ آرٹ کی داد نہیں؟

منشی جی:۔ ہاں یہ آرٹ کی وہ داد تھی۔ جو کبھی پروان نہ چڑھی اور اب بھی کیا ہے۔ ہندوستان میں ڈرامہ کا موجودہ انداز مغربی بخار کی مادہ پرستی ہے، برساتی روئیدگی سے زیادہ دیرپا نہیں۔

تیسرا:۔ واہ وا۔ بڑے میاں تو بڑی دُور کی کوڑی لاتے ہیں۔ دن چڑھتے ہی مادہ پرستی پر برسنے لگے۔ ارے صاحب ڈرامہ کی داد کے لئے دل چاہیئے۔

چوتھا:۔ اور اس آرٹ کا لطف اٹھانے کے لئے رُوح درکار ہے۔

منشی جی:۔ عزیزو! برہم نہ ہو جیئے گا۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ آپ جانتے ہیں۔ مغرب مغرب ہے اور مشرق مشرق۔ کبھی کبھی طوفان اٹھے اور حدِ فاصل غائب ہو گئی مگر پھر دونوں طبقے اپنی اپنی جگہ جا قائم ہوئے۔ ڈرامہ کی خوبیاں، اس کے اصلاحی مقاصد، اس کے لطیف اثرات مغرب کے لئے مبارک رہیں گے۔ مادہ پرست مغرب ہمیشہ روحانیت کی برکات سے محروم رہا۔ ایک بت پرستی کے بعد دوسری بُت پرستی رواج پاتی رہی۔ جب ذرا روحانی چاشنی کی ضرورت پڑی۔ اس وقت بھی مشرق کے آستانہ یعنی یروشلم پر جبہ سائی کی۔ مگر بُت پرستی کا چسکا کہاں جاتا۔ حضرت عیسیٰؑ کے روحانی تصرفات کو بدترین قسم کی آذر نوازی کا مسلک بنا لیا۔ اور معاشرتی اور تمدنی اصلاح کا ذریعہ اسی بت پرستی کو گردانا۔ مسیحی محبّت سے جو سرشار ہوئے تو مجازی عشق کے جوہر ہیں ایسے کہ دے کہ نظم، نثر، ڈرامہ تمثیل، راگ رنگ۔ سب لت پت ہو گئے۔

ایک:۔ بڑے میاں تو واقعی بڑے پتے کی باتیں کہتے ہیں۔

دوسرا:۔ مگر بڑے جی مشرق کی تو سنایئے۔ کچھ الف لیلہ۔ طلسم ہوشربا۔ کوئی واسوخت۔ کوئی ریختی۔

منشی جی:۔ اپنا اپنا خیال ہے۔ حقیقت حقیقت، اور باطل باطل۔ سوال ڈرامہ کا تھا۔ آیا ہندوستانی مشرق اسے اپنائیگا۔ ہمیں اس آرٹ کی ضرورت نہیں۔ مشرقی زندگی اور شعار روحانیت کی بنیادوں پر قائم ہے۔ ہر معاشرتی مصیبت اور تمدنی روگ کا علاج استادِ ازل نے بتا رکھا ہے۔ ہمیں اپنی مجلسی اور معاشرتی اصلاح کے لئے کسی تمثیل کی ضرورت نہیں۔ کسی ڈرامہ کی حاجت نہیں۔ صراطِ مستقیم پر ہمارا روزانہ عمل ہمیں نقل کی تقلید سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ روحانی تصرف جسمانی ذرائع سے میسر نہیں آسکتا۔ ہیرا ہیرے کو کاٹتا ہے۔ مقناطیس لوہا کھینچتا ہے۔ لوہا مقناطیس نہیں کھینچ سکتا ہے۔ مفروضہ فنونِ لطیفہ کا جنون روحانی جمود کو تحلیل نہیں کر سکتا۔ میں واقعی خوش ہوا جب سنا کہ ہندوستانیوں کو ڈرامہ نگاری کا سلیقہ نہیں۔ لیکن مجھے ازبس ملال ہوا۔ جب معلوم ہوا کہ آپ سے عزیزوں کو ڈرامہ نگاری اور اداکاری پر ناز ہے۔ خیر دہلی کا سٹیشن آرہا ہے اور اس پُر لطف سین کا خاتمہ ہے۔

سٹیشن آیا۔ گاڑی ٹھہری۔ منشی خیرات علی سائل اپنا بندھنا، بقچہ سنبھال، طلبا کے خاموش گروہ پر دعاوتشکر کی نگاہیں ڈال، گاڑی سے اترے اور مسافروں کے ہجوم میں غائب ہو گئے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ منشی جی کی معنویت نے نوجوانوں کی شوخیٔ طبع کو مغلوب کر لیا ہے اور اب ان کے دل استہزا سے خالی اور ادب سے معمور ہیں۔

(شیخ) عباد اللہ (پبلسٹی آفس این۔ ڈبلیو۔ آر لاہور)

تعلیمی ادارات

ڈی۔ اے۔ وی کالج۔ دہرہ دون

ڈی۔ اے۔ وی (دیانند اینگلو ویدک) کالج دہرہ دون ایک ممتاز اور مشہور تعلیمی ادارہ ہے جس سے نہ صرف ہندوستان کے مختلف اقطاع کے طالب العلم کسب فیض کر رہے ہیں۔ بلکہ نیپال، برما، فجی وغیرہ کے طلبا بھی مستفیض ہو رہے ہیں۔

اس ادارہ تعلیم کی بنا سنہ ۱۸۹۳ء میں بمقام میرٹھ پڑی۔ اس وقت اس کی حیثیت ایک معمولی سکول کی تھی اور ایک چھوٹی سی جماعت اس کے اہتمام و انصرام کے فرائض انجام دیتی تھی۔ دس برس تک یہ درسگاہ اسی حالت میں رہی۔

سنہ ۱۹۰۴ء میں یہ درسگاہ میرٹھ سے دہرہ دون منتقل کی گئی۔ اس مقام کی حیات پرور اور زندگی بخش آب و ہوا اس مختصر سے تعلیمی ادارہ کو ایسی راس آئی کہ وہ ترقی کر کے کالج کے درجے تک پہنچ گیا۔

چنڈی پرشاد ایم۔ اے ایل ایل بی دہرہ دون کے ممتاز وکیل تھے۔ انہوں نے اور اس درسگاہ کے مخلص ترین معلم کانتی پرشاد نے اس درسگاہ کو ترقی دینے اور مقبول عام بنانے میں ستائش آفریں کوششیں کیں۔ ان مخلصین کے علاوہ اس ادارہ کو ایک اولوالعزم اور بلند حوصلہ صاحب ثروت مل گیا۔ جس نے تین لاکھ روپے کے گراں قدر اور خطیر عطیہ سے اس کو کالج کے درجے تک ترقی حاصل کرنے کے قابل بنا دیا۔ چنانچہ دیانند اینگلو ویدک کالج دہرہ دون کے قیام و دوام میں کالج کے محسن اعظم پرسن سنگھ نیگی کا نمایاں اور خاص حصہ ہے۔

جن ہستیوں نے اس تعلیمی ادارہ کو ترقی و کامیابی کے موجودہ بلند مقام تک پہنچایا۔ ان میں کالج کے پرنسپل لچھمن پرشاد ایم۔ اے کا نام بھی ہمیشہ عزت و احترام کے ساتھ لیا جائے گا۔ یہ سنہ ۱۹۱۱ء میں اس درسگاہ میں آئے۔ اس وقت اس میں صرف ۱۹۲ طالبعلم تھے۔ ان کے درسگاہ میں آتے ہی طلبہ کی تعداد میں اضافہ شروع ہو گیا۔

سنہ ۱۹۲۲ء میں اس ادارۂ تعلیم کو انٹرمیڈیٹ کالج کے درجے تک ترقی دی گئی۔ اس وقت سے کالج کو برابر فروغ ہوتا جا رہا ہے اور اس کے طلبہ کی تعداد کم و بیش ایک ہزار تک پہنچ گئی ہے۔ جن میں برما، نیپال اور جزیرہ فجی جیسے دور دراز ممالک تک کے طلبا موجود ہیں۔

اس کالج کی عمارتوں پر دو لاکھ سے زیادہ روپے خرچ ہو چکے ہیں۔ ۲۴ سنگین کمروں میں طلبہ کو تعلیم دی جاتی ہے۔ دو کمرے سائنس کے تجربات و تحقیقات کے لئے وقف ہیں۔ ایک وسیع اور شاندار ہال ہے۔ سنہ ۱۹۳۳ء میں ایک جدید عمارت تعمیر ہوئی۔ جس میں نو کمرے ہیں اور جس پر گیارہ ہزار روپے صرف ہوئے ہیں۔

کالج سے متعلق دو دارالاقامے ہیں جن میں دو سو طلبہ کے رہنے کا انتظام ہے۔ دارالاقامہ کے سپرنٹنڈنٹ طلبہ ہی کے ساتھ رہتے ہیں۔ دارالاقامہ کے چہار جانب وسیع اور دلکش میدان ہے۔ جس کو "رسپنا" کہتے ہیں، یہ میدان طلبہ کے کھیل کود کے کام میں آتا ہے۔

اگرچہ ڈی۔ اے۔ وی کالج فطرت کی گود میں آباد ہے اور یہاں صحت و تندرستی کی آسمان سے بارش ہوتی ہے۔ پھر بھی طلبہ کی صحت کا کافی لحاظ رکھا جاتا ہے۔ طلبہ کی ڈاکٹری کے لئے باقاعدہ وقت مقرر ہے۔ چنانچہ وقت مقررہ پر ڈاکٹر طلبہ کی ڈاکٹری کرتے ہیں، اور ان کی رپورٹ کو ایک خاص رجسٹر میں درج کر لیا جاتا ہے ہر مہینے طلبہ کا وزن بھی کیا جاتا ہے جس کے نتیجے کا اندراج کالج کے رجسٹر میں بھی ہوتا ہے اور جس سے طلبہ کے ورثا کو بھی مطلع کر دیا جاتا ہے۔

لڑکوں کے کھیل تفریح کا انتظام بھی معقول ہے۔ یہاں کے

زاران روس کا مدفن

مسٹر طاہر غلام ناصر خان بی۔اے آنرز جنہوں نے ۱۹۳۶ء میں بی۔اے آنرز میں پنجاب یونیورسٹی میں دوست رہکر یونیورسٹی اسکالرشپ حاصل کیا تھا۔ اس سال تاریخ کے ایم۔اے میں بہت ممتاز درجہ پر کامیاب ہوئے ہیں۔
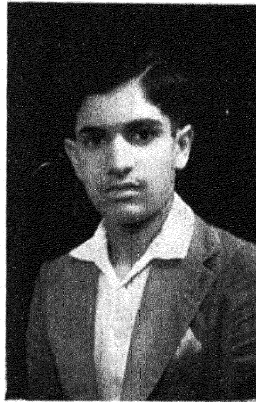
مسٹر سوم ناتھ نیر

جو اس سال میٹرک کے ۲۳ ہزار اُمیدواران امتحان میں ۷۴۸ نمبر لیکر صوبہ بھر میں اول آئے۔

فسانہ کانفرنس

(مزاحیہ)

ہمارے میر منے صاحب بھی نہایت ظرافت پسند واقع ہوئے ہیں۔ آپ کی شاعری اسقدر پُر مزاح ہوتی تھی کہ سننے والے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔

ایک روز میر صاحب کے فسانہ نگار دوست اکبر خاں صاحب آئے اور کہنے لگے "میر صاحب! چلئے گا؟"

"کہاں بھئی، کہیں دعوت ہے کیا؟" ـــــ میر صاحب نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"کیا آپ کو نہیں معلوم؟ ارے صاحب فسانہ کانفرنس ہیں۔" خاں صاحب نے کہا۔

"فسانہ کانفرنس یا فسانہ نگار کانفرنس؟"

"فسانہ کانفرنس"

"تو اس میں فسانوں کو جانا چاہیئے، نہ کہ مجھے اور آپ کو اور دوسرے فسانہ نگاروں کو؟"

"اجی حضرت اگر فسانہ نگار نہ جائیں گے تو فسانوں کو سنائیگا کون؟"

"اس کو تو وہ عقلمند جانیں جو فسانہ نگاروں کی کانفرنس کی بجائے فسانوں کی کانفرنس کر رہے ہیں، اگر ایسی ہی کانفرنسیں ہوتی رہیں تو ناول کانفرنس، تاریخ کانفرنس، ایڈیٹوریل کانفرنس افکار و حوادث کانفرنس اور شاید گیت کانفرنس بھی ہو۔ کیونکہ آجکل ہمارے بہت سے ادیب لبیب گیت بھی فرمانے لگے ہیں۔"

"جو کچھ ہوگا ہوگا، چلئے۔ فسانہ کانفرنس ہی تو ہو آئیں۔"

"آپ جائیے، اگر مشاعرہ ہوتا تو میں جاتا۔"

"فسانہ نگاروں کے سوا دوسروں پر کوئی پابندی تو نہیں، چلئے تفریح ہی رہے گی۔"

غرض خاں صاحب اس طرح در پے ہوئے کہ میر صاحب کو جانا ہی پڑا۔

کانفرنس میں کافی مجمع تھا، لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ان میں کتنے فسانہ نگار ہیں اور کتنے تماشائی اور سامعین۔

پہلے صدر مجلس استقبالیہ نے ایک مختصر سی تقریر کی جس میں فسانوں کے فوائد پر روشنی ڈالی۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ روشنی تیز تھی یا دھندلی، بعد ازاں صدر کانفرنس نے اپنا خطبہ ارشاد فرمایا۔ آپ نے پہلے فسانہ نگاری کی تاریخ بیان کی۔ پھر اس کے فوائد اور اوصاف و محاسن بیان کئے۔ میرے خیال میں صدر صاحب نے اس کوشش میں کوئی کوتاہی نہیں فرمائی کہ جو لوگ فسانہ نگار ہیں وہ تو ہیں ہی، جو فسانہ نگار نہیں ہیں وہ بھی ان کی تقریر سُن کر فسانہ نگار بن جائیں۔ یہی چاہیئے بھی تھا۔ اگر کانفرنس سے اتنا فائدہ بھی نہ ہو تو اس کا اور کیا حاصل ہے؟

تقریر صدارت کے بعد فسانہ خوانی شروع ہوئی۔ فسانہ خواں یا فسانہ نگار صاحب نے فسانہ کیا پڑھا۔ مولوی صاحب کو سبق سنایا بالکل متعلمانہ لہجہ میں۔ بیس منٹ میں انہوں نے فسانہ ختم کیا۔

دوسرے صاحب فسانہ پڑھنے بیٹھے جو پہلے صاحب کا پورا نعم البدل تھے۔ ایسے لحن اور ترنم میں پڑھا کہ فسانے اور گانے دونوں کا لطف آگیا۔ اپنے ہاتھوں اور آنکھوں کے اشارے اور سر کی حرکت سے ایکٹنگ بھی کرتے جاتے تھے۔ لوگوں نے اُنہیں کافی پسند کیا۔ مگر یہ معلوم نہیں کہ ان کا فسانہ بھی لوگوں کو پسند آیا، نہیں، مجھے تو کچھ یوں ہی سا معلوم ہوا۔

تیسرے صاحب نے فسانہ کہنا شروع کیا۔ فاسٹ ایکسپریس چھوڑ دی۔ کسی نے کہا۔ صاحب! ذرا آہستہ روی سے پڑھئے۔

فسانہ خواں صاحب نے فرمایا۔ فسانہ طویل ہے۔ آہستہ پڑھنے میں دیر لگ جائے گی۔

تاہم انہوں نے اپنی سپیڈ میں قدرے کمی کردی، میر صاحب کی بغل میں ایک صاحب فسانہ سنتے سنتے خراٹے لینے لگے ۔ میر صاحب نے شانہ پکڑ کر ہلایا اور کہا - جناب! آپ فسانے سننے آئے ہیں یا سونے؟ یہ کانفرنس ہے خواب گاہ نہیں ہے ۔

انہوں نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا - صاحب کیا کہوں - بچپن میں میں جب جلدی سوتا نہ تھا تو میری نانی مجھے کہانی سنا سنا کر سلاتی تھیں - اس وقت کی عادت پڑی ہوئی ہے - جہاں کسی نے کہانی شروع کی کہ نیند نے آدبایا -

میر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا - تو مضائقہ کیا ہے جہاں فسانہ کانفرنس ہوئی ایک پلنگ ساتھ لیتے گئے - رات بھر خوب مزے سے سوئے صبح پلنگ لیکر گھر چلے آئے ۔

وہ کچھ جھینپتے ہوئے بولے - میرے خیال میں تو اس کانفرنس سے زیادہ لطف مشاعرے میں آتا ہے۔ فسانہ تو لڑکوں کے سننے کی چیز ہے نہ کہ داڑھی مونچھ والوں کے سننے کی -

میر صاحب بولے - یہ تو اپنی اپنی رائے ہے - مجھے تو وہی چیز پسند ہے جس میں آرام ملے اور میٹھی نیند آئے - اتنے میں ایک اور صاحب اسٹیج پر نظر آئے اور فرمانے لگے —

حضرات! میں یہ معذرت کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں کہ مجھے کانفرنس کی اطلاع دیر میں ہوئی - اس لئے میں کوئی فسانہ نہ لکھ سکا ۔

ایک طرف سے آواز آئی - اگر نیا فسانہ نہیں ہے تو کوئی پرانی کہانی ہی سنا دیجئے -

بے فسانے کے فسانہ نگار صاحب نے کہا - جناب فسانہ غزل تو ہے نہیں جو زبانی یاد رہے، یہ تو دیکھ ہی کر پڑھنے کی چیز ہے -

دوسری طرف سے کوئی بولا - واہ جناب آپ یہ کیا فرماتے ہیں۔ آپ تو فسانہ لکھتے ہیں، جو عورتیں کچھ نہیں جانتیں وہ درجنوں کہانیاں یاد رکھتی ہیں -

تیسرے نے کہا - ہاں صاحب! اپنی کہانی یاد نہ ہو تو بڑی بوڑھیوں کی سنی سنائی سہی -

چوتھے نے آواز دی - خیر کیا ہوا - اگر کہانی یاد نہیں ہے فسانہ نگاری ہی پر کچھ فرما دیجئے -

انہوں نے تقریر شروع کی، چند ہی منٹ کے بعد ایک طرف سے آواز آئی - لمبی تقریر ختم فرمائیے اور آئندہ جب کسی ایسی کانفرنس میں جائیے تو کم از کم پرانے فسانوں کا دفتر تو ضرور بغل میں دبا تے جائیے - ورنہ فضول اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرنے سے کیا حاصل -

دوسری آواز سنائی دی - نہیں صاحب، اپنے دو ایک اچھے فسانے زبانی یاد کر لیجئے -

میر صاحب سے نہیں رہا گیا وہ بھی بول اٹھے - جی ہاں اور کیا، جب یہ فسانہ کانفرنس ہے تو فسانہ نگار صاحب نہ ہوں تو مضائقہ نہیں - لیکن یہ کیا کہ فسانہ نگار موجود اور فسانہ ندارد،

اتنے ہی فسانوں میں تین گھنٹے صرف ہو گئے، ایک شخص نے کہا بھئی اب تو طبیعت گھبرا گئی - فسانہ بھی کوئی سننے کی چیز ہے - اس کا لطف تو پڑھنے میں ہے چار پائی پر لیٹے لیٹے ۔

میر صاحب بولے - یہ آپ کیا فرماتے ہیں صاحب! کہانی تو سننے ہی میں اچھی معلوم ہوتی ہے -

"یہ اپنی اپنی پسند ہے - مجھے تو اسی میں مزہ آتا ہے کہ آرام سے پلنگ پہ لیٹے ہیں اور فسانہ دیکھ رہے ہیں -"

"تو آپ ایک تجویز پیش نہ کر دیجئے - کہ آئندہ سے فسانہ کانفرنس میں کرسیوں کی بجائے پلنگ کا انتظام ہونا چاہئے - اور فسانہ نگاروں کو چاہئیے کہ وہ اپنے فسانوں کی کاپیاں چھپوا کر لایا کریں جو حاضرین میں تقسیم کر دی جایا کریں - لوگ سننے کی بجائے پڑے پڑے فسانوں کا مطالعہ کیا کریں -"

"جناب! آپ تو مجھے بنا رہے ہیں -"

"یہ محض آپ کا حسنِ ظن ہے -"

اتنے میں ایک صاحب نے میر صاحب کے پاس آکر کہا - کچھ آپ بھی سنائیے -

میر صاحب بولے - میں فسانہ تو لکھتا نہیں - مشاعرہ ہوتا تو کوئی چیز پڑھ بھی دیتا -

"کچھ تو فرما دیجئے -" انہوں نے باصرار تمام کہا - اور کئی آدمیوں نے اسٹیج کے پاس سے آواز دی - "ہاں ہاں میر صاحب تشریف لائیے" "آئیے بھی" "اے جناب ایسا بھی کیا تکلف!" "تشریف لائیے میر صاحب دیر نہ کیجئے" "نہ پڑھئے گا - مگر آ تو جائیے اسٹیج

پر۔ "بھئی میر صاحب! آ بھی جاؤ۔"

آخر میر صاحب اسٹیج پر رونق افروز ہوئے اور کچھ دیر سوچ کر آپ نے کہنا شروع کیا۔

"حضرات! میں نے ابھی ایک فسانہ تصنیف کیا ہے جو سو فیصدی واقعات پر مبنی ہے۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔"

ایک تھے منشی جی جو بعد میں فسانہ نگار بن گئے یا خود کو فسانہ نگار سمجھنے لگے۔ خاصے پڑھے لکھے آدمی تھے۔ ورنیکلر مڈل تک تعلیم پائی تھی۔ دو تین کتابیں انگریزی کی بھی پڑھی تھیں۔ پہلے تو انہوں نے شاعر بننے کی کوشش کی، لیکن پھر نہ جانے کیوں شاعری سے برداشتہ خاطر ہو کر فسانہ نگار بن گئے۔ یہ نہ معلوم ہو سکا۔ کہ انہوں نے کتنے فسانے لکھے اور کیسے لکھے۔ اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ فسانہ لکھتے بھی تھے یا نہیں، لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ فسانہ نگار تھے۔ وہ اس طرح کہ انہوں نے اپنے لیٹر فارم پر اپنے نام کے ساتھ فسانہ نگار چھپوا رکھا تھا۔ اس تحریری ثبوت کے بعد ان کے فسانہ نگار ہونے میں کسے کلام ہو سکتا ہے؟

منشی جی کی شادی دیہات میں ہوئی تھی۔ اس لئے ان کی دھرم پتنی جی ساڑھے پندرہ آنے دیہاتن تھیں۔ لیکن چونکہ آپ کی بیوی تھیں۔ اس لئے دو پیسے بھر ان میں شہری پن بھی آ گیا تھا۔ [illegible] باہر نکلتی تھیں تو سلیپر پہن لیا کرتی تھیں۔ وہ پڑھی لکھی نہ تھیں، اور یہ بات فسانہ نگار صاحب کے لئے بیحد تکلیف دہ تھی۔ تکلیف دہ ہونی ہی چاہیئے۔ شوہر فسانہ نگار اور بیوی جاہل مطلق اور کندۂ ناتراش۔ آخر فسانہ نگار صاحب نے انہیں پڑھانا شروع کیا۔ لیکن وہ حیران تھے کہ بیوی صاحبہ پڑھنے سے اتنی ہی گھبراتی تھیں جتنا بچے کونین کھانے سے گھبراتے ہیں۔

دیہات میں شوہر بیوی کا نام نہیں لیتا۔ نہ بیوی شوہر کا نام لیتی ہے۔ اس لئے جب فسانہ نگار صاحب نے بیوی کو نام لے کر پکارا تو وہ بہت برہم ہوئیں اور بولیں۔ میں تمہاری بہن بیٹی ہوں کہ جو میرا نام لے کر پکارتے ہو۔ یہاں کا بھی کیسا دستور ہے۔

لیکن فسانہ نگار صاحب نے ان کے جز بز ہونے کی پروا نہیں کی۔ آخر بیوی صاحبہ بھی برداشت کر گئیں۔ لیکن وہ فسانہ نگار صاحب کو جب پکارتیں تو "ارے او" ہی کہتیں۔ فسانہ نگار صاحب نے ہر چند کوشش کی کہ بیوی صاحبہ آپ کا نام لے کر پکارا کریں لیکن انہوں نے قطعی انکار کر دیا۔ اور کہا۔ زبان کاٹ لو۔ لیکن میں تمہارا نام نہیں لے سکتی۔

فسانہ نگار صاحب نے فلموں میں ایکٹریسوں سے اپنے شوہروں اور عاشقوں کو پیارے کہتے ہوئے سنا تھا۔ انہیں اس کا بھی بہت شوق تھا کہ ان کی بیوی بھی انہیں اسی طرح پکارا کرے۔ انہوں نے سوچا کہ ان کی بیوی میں ایکٹریسوں کی سی لطافت و رنگینی کہاں ہے۔ لیکن ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی سوچا کہ فسانہ نگار تو اپنے تخئیل اور تصور کے زور سے پیکر حسن و جمال کی تخلیق کر لیا کرتے ہیں۔ پھر کیا وہ اپنے تخئیل کی مدد سے اپنی بدصورت بیوی کو حسین و جمیل نہیں بنا سکتے؟ علاوہ ازیں عورت بہر صورت عورت ہے۔ اگر وہ مرد کو پیارے کہہ کر پکارے گی تو کہاں تک اچھا نہ معلوم ہوگا۔

بیوی صاحبہ نے نام لے کر پکارنا منظور نہیں کیا تو فسانہ نگار صاحب نے پیارے کہہ کر پکارنے کی تجویز کی جسے بیوی صاحبہ نے طوعاً و کرہاً قبول کر لیا۔

بیوی صاحبہ کی تعلیم کا سلسلہ جاری تھا۔ انہوں نے بہزار دقت حروف تہجی تو یاد کر لئے، لیکن اس کے آگے ان کے ذہن نے جواب دیدیا۔ اس کے علاوہ بیچاری ایک بچے کی ماں بھی بن چکی تھی۔ اسے دیکھنا پڑتا تھا۔ بہوؤں کے آنے کے بعد ساسیں خانہ داری کے کاموں سے رٹائرڈ ہو جایا کرتی ہیں۔ اس لئے اس کو گھر کے سارے کام کاج کرنے پڑتے تھے۔ اس لئے وہ فرصت کے وقت کسی تفریحی مشغلے میں گزارنا چاہتی تھی۔ فسانہ نگار صاحب کا خیال تھا کہ پڑھنے سے زیادہ دلچسپ مشغلہ دوسرا ہو ہی نہیں سکتا۔ بیوی صاحبہ اس خیال سے متفق نہ ہوتی تھی۔ اس کی رائے میں دماغ کھپانے اور شوہر کی گھڑکی سننے کو کسی حالت میں بھی دلچسپ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اسی اختلاف رائے کے دوران میں تین دن گزر جانے کے باوجود بیوی صاحبہ کو سبق یاد نہیں ہوا۔ فسانہ نگار صاحب تھے تو بیوی کے پرستار، لیکن دماغ ہی تو ہے، گرم ہو گیا اور انہوں نے دو چار تھپڑ بیوی صاحبہ کو رسید کر دئے۔ بیوی صاحبہ بھی آپے سے باہر ہو گئیں۔ کتاب پھاڑ کر فسانہ نگار صاحب کے منہ پر دے ماری اور سسکتی آنسو بہاتی ساس کے پاس پہنچیں۔

ساس نے پوچھا۔ کیا ہوا۔ رو کیوں رہی ہے؟

روتی ہوئی بولیں۔ پیروا نے مارا ہے۔
ساس گھبرائیں کہ پیروا کون ہے جس نے اس کو مارا۔ انہوں نے پوچھا۔ پیروا کون رے؟
بہو نے کہا۔ وہی تمہارا پیروا اور کون؟
ساس:۔ کون، تیرا شوہر؟
بہو:۔ اور کون وہی تو۔
"تو اسے پیروا کیوں کہتی ہے؟"
"اسی نے کہا ہے کہ ہمیں پیارے کہہ کر پکارا کرو۔ پہلے کہتا تھا نام لے کر پکارا کرو۔ جب میں نے انکار کیا تو اس نے پیارے کہہ کر پکارنے کے لئے کہا۔
فسانہ نگار صاحب ساس اور بہو کی باتیں سن رہے تھے۔ اور دل ہی دل میں پشیمان و پریشان ہو رہے تھے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ "پیارے" جیسا لفظ کبھی اس قدر مکروہ بن جائے گا۔ انہوں نے طے کر لیا کہ اب کبھی بیوی کو پیارے کہہ کر نہ پکارنے دوں گا۔ بلکہ فسانوں میں بھی اس لفظ کا استعمال نہ کروں گا۔
غرض فسانہ نگار صاحب نے اس روز سے لفظ پیارے کا مکمل بائیکاٹ کر دیا۔ لیکن اس کی خبر نہیں کہ تعلیم اور مار پیٹ کا سلسلہ جاری ہے یا وہ بھی بند ہو گیا۔
اتنا کہہ کر میر صاحب اسٹیج سے اتر آئے، سامعین نے خوب تالیاں بجائیں، لیکن فسانہ نگاروں کا حلقہ منہ لٹکائے خاموش بیٹھا رہا۔ انہیں میں سے ایک صاحب کود کر سٹیج پر پہنچے اور صدر کی اجازت کے بغیر بولنے لگے۔ میر صاحب نے فسانہ نگاروں پر صریحاً ناجائز حملہ کیا ہے۔
میر صاحب نے پوچھا۔ "کیا آپ بھی فسانہ نگار ہیں؟"
"بے شک فسانہ نگار ہوں۔"
"ایسے ہی فسانہ نگار جن کا میں نے ذکر کیا ہے؟"
"آپ میری توہین کر رہے ہیں۔"
"میں آپ سے ایک سوال کر رہا ہوں۔"
سامعین میر صاحب کے حامی ہو گئے اور انہیں کی کثرت تھی۔ اس لئے کانفرنس میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اس گڑبڑ میں میر صاحب کو موقع مل گیا اور وہ آہستہ سے کانفرنس سے باہر نکل گئے۔ معلوم نہیں کانفرنس کی اختتامی اور صدر مجلس استقبالیہ کی شکریہ کی تقریر بھی ہوئی یا کانفرنس اسی طرح ختم ہو گئی۔

(اخذ و ترجمہ)

ایوب شاہد رامنگری

غزل

مری شبوں سے جو آنسو چرائے جاتے ہیں
انہی سے چرخ کے انجم بنائے جاتے ہیں

وہ بار جس کو یہ گردوں اٹھا نہیں سکتا
ہم اس کو روح امیں دیکھ! اٹھائے جاتے ہیں

کشش اسی کی فلک سیریوں میں تھی حائل
نشیمن آپ ہم اپنا جلائے جاتے ہیں

سمجھ رکھا ہے کھلونا ہمیں زمانے نے
اٹھائے جاتے ہیں اور پھر گرائے جاتے ہیں

ترے اشارے سے یہ نرگس ادھر ہیں کیسے ہیں
یہ راز کیا ہیں جو ہم سے چھپائے جاتے ہیں

کنارِ راہ نعیم! انتظار ہے کس کا؟
یہ کس کی یاد میں آنسو بہائے جاتے ہیں

نعیم صدیقی

تاریخ وفاتِ ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم

والمتقین فی جنّاتِ نعیم ؕ

۱۳۵۷ھ

مرثیہ ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم

(از ناظم الملک حضرت مولانا اظہر ہاپوڑی مدظلہ)

(۱)

کچھ نہیں دہر جز فریبِ نظر — اک طلسمِ فنا ہے سرتاسر
اس جہاں میں وجودِ انسانی — ہے سرِ راہ بادِ شمعِ سحر
فرصتِ عمرِ دہرِ فانی میں — طپشِ برق ہے کہ تابِ شرر
نفسے چند ہے قیام اس میں — ہے یہ دنیا سرائے رہگذر
تار و پودِ حیاتِ انسانی — رگِ گل سے سوا ہے نازک تر

استواری نہیں ثبات نہیں
خاک دنیا کی کائنات نہیں

(۲)

جی لگے خاک تیرہ زنداں میں — کہ نہیں شمع بزمِ دوداں میں
کوسِ رحلت ہے بانگِ خندۂ گل — سب مسافر ہیں اس گلستاں میں
روئیں اب عمرِ جاوداں کو خضر — مل گیا زہر آبِ حیواں میں
کیوں عناصر میں اختلال ہے آج — کیوں تغیر ہے چار ارکاں میں
حرکت ہے زمین میں پیدا — ہے سکوں دورِ چرخِ گرداں میں

کیا زمانہ میں انقلاب ہے آج
آب آتش ہے آتش آب ہے آج

(۳)

چشمِ عبرت سے اے تماشائی — دیکھ نیرنگِ چرخِ مینائی
صبح ہوتے ہی ہو گئی نابود — شب کے تاروں کی جلوہ آرائی
تھی جو گلشن میں صبحِ فصلِ بہار — وہ کہاں ہے خزاں میں رعنائی
اب کہاں ہے وہ بزمِ جمشیدی — اب کہاں ہے وہ بادہ پیمائی
ہو گئی خاک میں مل کر — شانِ اسکندری و دارائی

آج اقبال کا بھی ماتم ہے
یہ نیا حادثہ نیا غم ہے

(۴)

شاعرِ سحر کار تھا اقبال — اور معجز نگار تھا اقبال
اس کے زیرِ نگیں تھا ملکِ سخن — خسرو و تاجدار تھا اقبال
چمنستانِ حسنِ معنی میں — اک گلِ نوبہار تھا اقبال
دورِ حاضر میں ملک و ملت کا — سببِ افتخار تھا اقبال
سلطنت کیلئے بھی اک حد تک — مایۂ اعتبار تھا اقبال

وا دریغا کہ آں سخنداں مرد
فخرِ حسّان و رشکِ سحباں مرد

(۵)

کوئی بھی ایسا نکتہ داں نہ ہوا — نغز گفتار و خوش بیاں نہ ہوا
ایک عالم میں اس کی شہرت تھی — اس کا شہرہ کہاں کہاں نہ ہوا
کچھ خدا داد تھا قبولِ سخن — کونسا شعر حرزِ جاں نہ ہوا
تھی جُدا سب سے اس کی طرزِ بیاں — کوئی بھی اُس کا ہم زباں نہ ہوا
تھا وہ نازک خیال کچھ ایسا — دل پہ اس کا سخن گراں نہ ہوا

خاص حصّہ تھا اُس کا رنگینی
شاعری اُس کی تھی کہ گلُ چینی

(۶)

تھا وہ اک نقشِ بےمثال و نظیر — مایۂ نازِ خامۂ تقدیر
صدر آرائے بزمِ حالیؔ و داغؔ — شہرت افزائے نامِ ذوقؔ و نصیرؔ
کلۂ افتخارِ ملت و ملک — طرۂ اعتبارِ تاج و سریر
فلسفہ اور پھر زبانِ غزل — اور پھر یہ جزالتِ تحریر
شہد سے بھی زیادہ شیریں تھی — اس کی ہر بات اس کی ہر تقریر

شاعرِ دورِ انقلاب تھا وہ
نقطۂ فردِ انتخاب تھا وہ

(۷)

جائے اُو در جوارِ رحمت باد — مرقدش روضۂ زجنت باد
روزِ پرسش مغفرت بود ز خدا — بہرہ اش از نبی شفاعت باد
سایۂ رحمتِ خدائے کریم — بر سرش تا دمِ قیامت باد
حرزِ جاں ہا کلامِ اُو بادا — صیتِ نظمش بہر ولایت باد
از بیانش فروغِ دین بادا — شمعِ ایمان چراغِ تربت باد

اطہرؔ ایں نوحہ و دعا گفتم
آنچہ گفتم بصد بکا گفتم

اطہر

مختار

امتحان

جب ریاست دیوگڑھ کے دیوان سبحان سنگھ بوڑھے ہو گئے تب انہیں پرماتما کی یاد آئی - مہاراجہ کے یہاں جاکر انہوں نے عرض کی کہ "غریب پرور- غلام نے چالیس سال تک خدمت کی اب یادِ خدا میں زندگی بسر کرنے کی اجازت چاہتا ہوں - دوسرے اب میری عمر بھی ڈھل گئی - امورِ سلطنت کے انجام دینے کی طاقت نہیں رہی - کہیں بھول ہو جائے تو اس بڑھاپے میں بٹہ لگے اور پھر ساری زندگی کی نیک نامی مٹی میں مل جائے -"

راجہ صاحب اپنے تجربہ کار دیوان کی عزت کرتے تھے - انہوں نے بہتیرا سمجھایا لیکن جب دیوان صاحب نے نہ مانا تو اُن کی درخواست منظور کرلی اور یہ شرط لگادی کہ ریاست کے لئے نئے دیوان کی تلاش انہیں کو کرنا ہوگی -

دوسرے روز ریاست کے اخبارات میں یہ اعلان نکالا گیا -

کہ "دیوگڑھ کے لئے ایک قابل دیوان کی ضرورت ہے - جو صاحب اپنے کو اس خدمت کے اہل سمجھیں وہ دیوان سبحان سنگھ کی خدمت میں حاضر ہوں - یہ ضروری نہیں کہ وہ گریجوئیٹ ہوں مگر انہیں طاقتور ہونا چاہیئے - مریضوں کو یہاں تک زحمت اٹھانے کی ضرورت نہیں - ایک مہینہ تک امیدواروں کے چال چلن کی دیکھ بھال کی جائے گی - علم کے مقابل فرض شناسی کو زیادہ ترجیح دی جائے گی - جو صاحب اس امتحان میں پورے اتریں گے وہ اس اہم خدمت پر مامور ہوں گے -"

(۲)

اس اعلان نے سارے ملک میں ہل چل مچادی - ایسا اونچا عہدہ اور پھر کسی طرح کی قید نہیں، صرف تقدیر کی یاوری ہو - سیکڑوں آدمی اپنی قسمت آزمائی کے لئے چل کھڑے ہوئے - دیوگڑھ میں ہر قسم کے لوگ دکھائی دینے لگے - ہر ریل گاڑی سے امیدواروں کا ایک گروہ اُترتا - کوئی پنجاب سے چلا آتا تھا تو کوئی مدراس سے - کوئی نئی تہذیب کا دلدادہ تھا تو کوئی پرانی سادگی پر مٹا ہوا تھا - پنڈتوں اور مولویوں کو بھی اپنی قسمت آزمائی کا موقعہ ملا بیچارے سند کے نام کو رویا کرتے تھے یہاں اس کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی - رنگین عمامے، چغے، ٹوپیاں اور طرح طرح کے انگرکھے، دیوگڑھ میں اپنی شان دکھانے لگے، لیکن سب سے زیادہ تعداد گریجوئیٹوں کی تھی - کیونکہ سند کی قید نہ ہونے پر بھی سند سے پردا تو ڈھکا رہتا ہے -

سردار سبحان سنگھ نے ان لوگوں کی خاطر تواضع کا بڑا اچھا اہتمام کر دیا تھا - لوگ اپنے اپنے کمروں میں بیٹھے روزہ دار مسلمانوں کی طرح مہینے کے دن گنا کرتے تھے - ہر شخص اپنی زندگی کو اچھی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کرتا -

مسٹر الف، پہلے تو ۹ بجے دن تک سویا کرتے تھے - لیکن آج کل وہ باغ میں ٹہلتے ہوئے اوشا کا درشن کرتے تھے - مسٹر ب کو حقہ پینے کی لت تھی - لیکن آجکل بہت رات گئے کواڑ بند کرکے اندھیرے میں سگار پیتے تھے - مسٹر د، س، اور ج سے ان کے گھروں کے نوکروں کی ناک میں دم تھا - لیکن یہ آجکل آپ اور جناب کے بغیر نوکروں سے بات نہیں کرتے تھے - مہاشہ ک منکر تھے ہکسلے کے نام لیوا تھے - مگر آج کل اُن کی عقیدت دیکھ کر مندر کے پجاری حیران تھے - مسٹر ل کو کتابوں سے نفرت تھی - اب، مذہبی کتابوں کا بہت زیادہ مطالعہ کرتے رہتے - جس سے بات کیجئے وہ انکسار اور اخلاق کا پتلا معلوم ہوتا تھا - شرابی بڑی رات ہی سے وید منتر پڑھنے لگتے اور مولویوں کو تو نماز تلاوت کے سوا اور کوئی کام ہی نہ تھا - لوگ سمجھتے تھے کہ ایک مہینہ کسی نہ کسی طرح کاٹ ہی لیں گے - انسانوں کو پرکھنے والا بوڑھا جوہری آڑ میں بیٹھا دیکھ رہا تھا - کہ ان بگلوں میں ہنس کہاں چھپا ہوا ہے -

ایک دن نئی تہذیب والوں کو سوجھی کہ آپس میں ہاکی کا کھیل ہو جائے - یہ تجویز ہاکی کے منجھے ہوئے کھلاڑیوں نے پیش کی - یہ بھی تو آخر ایک فن ہے - اسے کیوں چھپا رکھیں کچھ ہاتھوں کی صفائی ہی کام کر جائے -

چلئے طے ہوگیا۔ میدان بن گئے کھیل شروع ہوگیا اور گیند کسی دفتر کے امیدوار کی طرح ٹھوکریں کھانے لگی۔ ریاست دلیگڑھ میں یہ کھیل بالکل نرالی بات تھی۔ پڑھے لکھے لوگ شطرنج اور تاش جیسے سنجیدہ کھیل کھیلتے تھے۔ اُچھل کود کے کھیل بچوں کے سمجھے جاتے تھے کھیل جاری تھا۔ لوگ جب گیند لیکر تیزی سے دوڑتے تو معلوم ہوتا کہ کوئی لہر بڑھتی چلی آتی ہے۔ لیکن دوسری طرف سے کھلاڑی اُس بڑھتی ہوئی لہر کو لوہے کی دیوار کی مانند روک لیتے۔ شام تک یہی دھوم دھام رہی۔ لوگ پسینہ میں تر ہو گئے۔ خون کی گرمی آنکھ اور چہرے سے جھلک رہی تھی۔ ہانپتے ہانپتے بیدم ہو گئے۔ لیکن ہار جیت کا فیصلہ نہ ہو سکا۔ اندھیرا ہو گیا تھا۔ اسی میدان سے دُور ہٹ کر ایک نالہ تھا اس پر کوئی پل نہ تھا۔ آنے والوں کو نالے میں سے چل کر آنا پڑتا تھا۔ کھیل ابھی بند ہوا تھا اور کھلاڑی بیٹھے دم لے رہے تھے کہ ایک کسان اناج سے بھری ہوئی گاڑی لئے اُس نالہ میں آیا۔ لیکن کچھ تو نالے میں کیچڑ تھا اور کچھ چڑھائی اتنی اُونچی تھی کہ گاڑی اوپر نہ چڑھ سکتی تھی۔ وہ کبھی بیلوں کو للکارتا، کبھی پہیئے کو ہاتھوں سے دھکیلتا، لیکن بوجھ زیادہ اور بیل کمزور تھے۔ گاڑی اوپر کو نہ چڑھتی اور چڑھتی بھی تو کچھ دُور چڑھ کر پھر پیچھے اُتر آتی۔ کسان بار بار زور لگاتا اور جھنجھلا کر بیلوں کو مارتا۔ لیکن گاڑی پار نہ ہوتی۔ بے چارہ مایوس ہو کر اِدھر اُدھر تاکتا مگر وہاں کوئی ہمدرد نظر نہ آتا تھا۔ گاڑی کو اکیلی چھوڑ کر کہیں جا بھی نہ سکتا تھا۔ بڑی مشکل میں تھا۔ اُدھر سے کھلاڑی ہاتھوں میں ڈنڈے لئے جھومتے آنکلے۔ کسان نے ان کی طرف سہمی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ لیکن کسی سے مدد مانگنے کی جرأت نہ ہوئی۔ کھلاڑیوں نے بھی اُس کو دیکھا مگر بند آنکھوں سے جن میں ہمدردی نام کو نہ تھی، وہاں کچھ تھا تو غرور اور تمکنت۔

(۴)

کھلاڑیوں میں ایک ایسا آدمی تھا جس میں رحم اور ہمدردی تھی۔ آج ہاکی کھیلتے ہوئے اس کے پیروں میں چوٹ لگی ہوئی تھی۔ لنگڑاتا ہوا آہستہ آہستہ چلا آتا تھا۔ یکا یک اُس کی آنکھ گاڑی پر پڑ گئی۔ وہ ٹھٹھک گیا۔ اُس نے کسان کو دیکھتے ہی ڈنڈا ایک طرف رکھ دیا۔ کوٹ اُتار ڈالا اور کسان کے پاس جا کر بولا "تمہاری گاڑی نکال دوں؟" کسان نے دیکھا کہ ایک گٹھے ہوئے بدن کا لانبا آدمی سامنے کھڑا ہے۔ ڈر کر بولا "حضور آپ سے کیسے کہوں"۔ نوجوان نے کہا "معلوم ہوتا ہے تم یہاں بڑی دیر سے پھنسے ہوئے ہو۔ اچھا تم گاڑی پر جا کر بیلوں کو بڑھاؤ۔ میں پہیوں کو دھکیلتا ہوں۔ ابھی گاڑی اُوپر آتی ہے۔"

کسان گاڑی پر جا بیٹھا۔ نوجوان نے پہیوں میں زور لگا کر کھسکایا کیچڑ بہت زیادہ تھی وہ گھٹنے تک زمین میں گڑ گیا۔ لیکن اُس نے ہمت نہ ہاری اور پھر زور کیا۔ ادھر کسان نے بیلوں کو للکارا۔ جانوروں کو سہارا ملا۔ اُن کی بھی ہمت بندھ گئی۔ انہوں نے کندھے جھکا کر ایک بار زور کیا۔ بس گاڑی نالے کے پار تھی۔ کسان نوجوان کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ بولا "مہاراج آپ نے آج مجھے بچا لیا، نہیں تو رات ساری یہیں بیٹھے رہنا پڑتا۔" نوجوان نے ہنس کر کہا "مجھے کچھ انعام دو گے؟" کسان نے کہا۔ "نارائن چاہیں گے تو دیوانی آپ کو ہی ملے گی۔"

نوجوان نے کسان کی طرف غور سے دیکھا۔ اُس کے دل میں شبہ ہوا کیا یہ سجان سنگھ تو نہیں ہے؟ آواز ملتی ہے۔ صورت شکل ملتی ہے۔ کسان نوجوان کی حالت دیکھ کر سمجھ گیا اور مسکرا کر بولا۔ "گہرے پانی میں ڈوبنے سے ہی موتی ملتا ہے۔"

(۵)

ایک مہینہ ختم ہوا۔ چناؤ کا دن آپہنچا۔ امیدوار بہت سویرے اپنی قسمت کا فیصلہ سننے کے لئے منتظر تھے۔ دن کاٹنا پہاڑ ہو گیا۔ ہر شخص کے چہرے پر امید و یاس کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ نہیں معلوم آج کس کے نصیب جاگیں گے۔ نہ جانے کس پر لکشمی کی کرپا ہو گی۔ شام کو راجہ صاحب کا دربار سجایا گیا۔ شہر کے رئیس، معززین، عہدہ دار اور دیوانی کے امیدوار سب دربار میں جمع ہو گئے، تب سردار سجان سنگھ نے کھڑے ہو کر دیوانی کے امیدواروں سے کہا۔ "میں نے آپ کو جس عہدے کیلئے زحمت دی ہے اُس کے لئے ایسے شخص کی ضرورت تھی جس کے دل میں رحم اور ساتھ ہی ہمت ہو۔ دل وہی ہے جو صاف ہو، ہمت وہی ہے جو بہادری کے ساتھ ہر مصیبت کا سامنا کرے۔ چنانچہ خوش نصیبی ہے کہ ریاست کے لئے ایسا آدمی مل گیا۔ ایسے لوگ دنیا میں بہت کم ہیں اور جو ہیں اُن تک ہماری پہنچ ہی نہیں۔ میں ریاست کو پنڈت جانکی ناتھ جیسا دیوان پانے پر مبارکباد دیتا ہوں۔" ریاست کے عہدہ داروں اور رئیسوں نے پنڈت جانکی ناتھ کی طرف دیکھا۔ امیدواروں کی آنکھیں بھی ادھر کو اٹھیں۔

سردار صاحب نے پھر کہا۔ "آپ لوگوں کو یہ قبول کرنے میں کوئی مشکل نہ ہو گی جو انسان خود زخمی ہونے پر ایک غریب کسان کی بھری ہوئی گاڑی کو کیچڑ سے نکال کر نالے کے اوپر چڑھائے اس کے دل میں رحم کرم اور ہمت ہے۔ ایسا آدمی غریبوں کو کبھی نہ ستائے گا۔ اُس کا عہدہ پکا ہے جو اس کی راہبری کرے گا۔ وہ چاہے دھوکا کھا جائے لیکن

"آہ اقبال"

ہُو بہُو کھینچیگا اب جذبات کی تصویر کون
اُٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون

ابھی منشی پریم چند اور اصغر گونڈوی کی جدائی کا صدمۂ جانکاہ دنیائے ادب کے دل سے فراموش نہ ہونے پایا تھا کہ سر محمد اقبال کی مفارقت کے تیر نے ایسا زخم کاری لگایا جس کا اندمال شاید بیسویں صدی میں تو ناممکن نظر آتا ہے۔ علامہ شبلی نعمانی کا وہ جملہ یاد آتا ہے جو آپ نے اقبال کے لئے فرمایا تھا۔ "جب آزاد اور حالی کی کرسیاں خالی ہونگی تو لوگ آپ کو ڈھونڈیں گے۔" یعنی حالی اور آزاد کے بعد اگر کسی شخص کو ادبی بیڑے کے ناخدا ہونے کا حق ہے تو اقبال کو۔ یہ ناخدائے سخن اوروں کی طرح ہوائے زمانہ کے سہارے اپنی کشتی کھینے والا نہ تھا۔ دنیا کے بہتے ہوئے دھارے میں اپنا بیڑا ڈال دینے والا نہ تھا۔ بلکہ قدرت کی طرف سے وہ طاقت لیکر آیا تھا۔ جو ہواؤں کا رخ اپنی خواہش کے مطابق بدل دیتی ہے۔ وہ زمانے کے بہتے ہوئے دھارے کو پلٹ سکتا تھا۔ وہ شاعر ضرور تھا مگر دنیا کے رنگ میں خود رنگ جانے والا نہیں بلکہ دنیا کو اپنے رنگ میں رنگ دینے والا تھا۔ بقول اصغر مرحوم ؎

جاہا جہاں سے منظر فطرت بدل دیا
سارا جہاں ہے تابع فرمان آرزو

اس نے فصیح الملک داغ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ مگر لکھنو کے بازاری رنگ سے قطعی متاثر نہ ہوا۔ زبان کی چاشنی۔ محاورات کی لطافت طرز ادا کی شوخی سے فیضیاب ہوا لیکن عریانی سے ناآشنا رہا۔ خیال آفرینی جدت پسندی اور بندش الفاظ میں غالب کا پیرو بنا مگر کلام کی پیچیدگی مضمون کے ابہام اور اغلاق سے ہمیشہ گریزاں رہا۔ حالی اور آزاد کی ہمہ دانی واقعہ نگاری اور سادگی کے سامنے سر تسلیم خم کیا۔ مگر ہمیشہ قوم کی شکایت ابتری اور بربادی ہی کا منظر کھینچ کر قوم کو ترقی کے راستے سے مایوس نہیں کیا بلکہ جہاں کہیں بھی قومی تباہی اور بربادی کا نقشہ کھینچا ہے وہیں قوم میں وہ نیا جوش اور جذبہ بھی پیدا کیا جس سے مردہ قوم بھی اپنے میں زندگی کے آثار محسوس کرنے لگتی ہے اور یہی ایک قومی شاعر کا کمال ہے۔

واقعہ نگاری کی ایک شاخ منظر نگاری بھی ہے۔ جس میں قریب قریب ہر دور کے شعراء نے طبع آزمائی کی ہے۔ متقدمین کی منظر نگاری کا سب سے بڑا نقص یہ تھا کہ جب وہ کسی غیر ذی روح کی زبانی کوئی واقعہ بیان کرتے تو وہ یہ خیال نہ کرتے کہ محض وہی چیزیں بیان کی جائیں جن کا تعلق مفروضہ متکلم سے ہو بلکہ ایسے ایسے معاملات کا تذکرہ کر جاتے جن سے متکلم سے دور کا بھی واسطہ نہ ہوتا۔ مثلاً شمع کی زبانی اگر کوئی شکایت پیش کرنی ہوتی تو شاعر محض محفل پروانہ شب وغیرہ کے بیاں ہی پر اکتفا نہ کر کے شمع کی زبانی قوم کی تباہی۔ انسانوں کے مظالم۔ آسمان کی فتنہ پردازی کا بھی ذکر چھیڑ دیتا۔ جس سے شمع کو قطعی تعلق نہیں ہوتا۔ مگر آپ اقبال کی منظر نگاری کو ان عیوب سے پاک پائیں گے۔ مثلاً "شبنم اور ستارے" کی نظم میں شبنم نے اپنے رونے کا سبب یہ نہیں بتایا کہ دنیا والوں سے علم و عمل مفقود ہے آپس میں نفاق، عناد، بغض، کینہ اور حسد کی گرم بازاری ہے بلکہ وہ محض گل و بلبل کی پریشانیوں سے قمری و شمشاد کی تباہیوں سے متاثر ہوتی ہے۔ اور باغ کی بربادی پر آنسو بہاتی ہے۔ اس سے یہ نہ خیال کرنا چاہیئے کہ اقبال کی نظم محض گل و بلبل ہی تک محدود رہجاتی ہے اور قومی ابھار کا آلۂ کار نہیں بنتی ہے۔ بلکہ اقبال نے قومی تباہی اور بربادی کا پورا نقشہ گل و بلبل ہی کے تشبیہ و استعارے کے پردے میں کھینچ دیا ہے۔

ایک زمانہ وہ تھا جب [illegible] عوام کا خیال یہ تھا کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو اور بگڑا گویا مرثیہ خواں ہوتا ہے۔ مگر انیس نے اس میں وہ کمال پیدا

کیا کہ مرثیہ کو اصنافِ شاعری میں محض مقبولیت ہی کا شرف نہیں بخشا
بلکہ جملہ اصناف سخن کا سرتاج بھی بنا دیا۔ بجنسہٖ یہی صورت غزل کے
مقابلہ میں نظم کی تھی۔ اساتذہ فن کی نگاہوں میں اس کی کوئی وقعت نہ
تھی۔ مگر اقبال کی سحر کاریوں نے اس صنف کو اس طرح چمکایا کہ
غزل کی روشنی ماند پڑ گئی۔ اس کے مقابلے میں لارڈ ٹینی سن اور
ورڈز ورتھ جیسے استادانِ فن کی شاعری میں جن پر یورپ ناز کرتا
ہے۔ نقص نظر آنے لگا۔ ورڈز ورتھ کے کھینچے ہوئے مناظر میں
ہمدردی سلوک اور رواداری کا جذبہ اس کمال تک پہنچ گیا ہے کہ
انسانی عظمت۔ وقار اور شان اسی میں جذب ہو کر معدوم ہو جاتی
ہے۔ اور معلوم ہونے لگتا ہے۔ کہ شاعر نسل انسانی کی عظمت و وقار
قائم کرنے کے لئے نہیں پیدا ہوا ہے بلکہ مناظر کی دلکشیوں پر علم و
یقین اور دین و ایمان نثار کرنے کے لئے آیا ہے۔ اپنی ایک نظم
میں ورڈز ورتھ سمندر چاند اور ہوا کی دلکشیوں کو بیان کرنے کے
بعد کہتا ہے:-

For this everything, we are out of Tune, It moves not- Great God I'd rather be, a pagan Suckled in a Creed out worn.

مگر دیکھئے اقبال نسل انسانی کا شرف و افتخار کسی حالت میں بھی
فراموش نہیں کرتا۔ وہ بھی چاند سے مخاطب ہوتا ہے۔ راز و نیاز کی
باتیں کرتا ہے۔ فنا و بقا کے مسائل پر روشنی ڈالتا ہے۔ مگر ساتھ ہی
ساتھ چاند سے یہ بھی کہہ دیتا ہے کہ:-

گرچہ میں ظلمت سراپا ہوں سراپا نور تو
سینکڑوں منزل ہے ذوقِ آگہی سے دور تو
جو مری ہستی کا مقصد ہے مجھے معلوم ہے
یہ چمک وہ ہے جبیں جس سے تری محروم ہے

یعنی اے چاند گو تجھ میں لاکھ دلکشی ہو لیکن تو کسی صورت سے
بھی مجھ سے افضل و برتر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ میں معرفت کا حامل ہوں
مگر جہاں تک مناظر کے ساتھ سبق آموزی اور حقیقت شناسی کا
تعلق ہے اقبال ورڈز ورتھ کا ہمنوا نظر آتا ہے۔ جو لوگ کتابوں کے
اوراق میں معرفت اور حق شناسی کی روشنی تلاش کرتے ہیں۔ انہیں
مخاطب کر کے ورڈز ورتھ کہتا ہے۔ "ہم کو ہرے بھرے جنگل
کے ایک جھونکے سے جو اخلاقی سبق حاصل ہو سکتے ہیں اور بھلائی کی تمیز
آ سکتی ہے وہ تمام دنیا کے عقلمند مل کر ہم کو نہیں سکھا سکتے۔"

One impulse from a vernal wood May teach you more of man of Moral evil and of good, Than all the sages can do.

اسی نظریہ کو اقبال نے اپنے الفاظ میں یوں ادا کیا ہے:-

علم کے حیرت کدے میں ہے کہاں اس کی نمود
گل کی پتی میں نظر آتا ہے رازِ ہست و بود

اسی طرح ٹینی سن چشمہ کی روانی کا نقشہ Brook کی نظم
میں پیش کرتا ہے۔

I slip, I slide, I gloom, I glance among my skimming swallows.

دیکھئے اقبال نے دریا کا ایک منظر پیش کیا ہے جو ٹینی سن کے
نظم سے کہیں زیادہ دلکش ہے۔

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
آغوش میں زمیں کے سویا ہوا ہو سبزہ
پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو
پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو

دونوں نظموں کے ملاحظہ سے حضرات اہل ذوق خود اندازہ لگا
سکتے ہیں کہ دونوں میں کس قدر فرق ہے۔ ہاں ٹینی سن کے یہاں صنائع
لفظی کا ذخیرہ ضرور ہے۔ مگر نفس مضمون جو روح شاعری ہے اقبال
ہی کے حصے میں قدرت نے ودیعت کی تھی۔

عوام میں ایک غلط خیال اور بھی رائج ہے کہ شاعر صرف اپنے
جذبات کا ترجمان ہے اسے اصل شے کی حقیقت اور اصلیت سے
کوئی تعلق نہیں وہ ہر شے کے حقیقی پہلو کو نظر انداز کر کے صرف
سطحی نمائش پر اپنی شاعری کی بنیاد قائم کرتا ہے۔ اس کے جزو اول
سے تو کسی کو بھی انکار نہیں۔ مگر دوسرا جزو قابل اعتراض ہے وہ اس
لئے کہ شاعر کو بحیثیت شاعر بھی اصول فطرت اور حقیقت کے خلاف
کچھ نہ کہنا چاہیئے عموماً شعرا آسمان اور سورج کو متحرک مانتے ہیں اور

زمین کو ساکت اسی لئے آسمان کو چرخ گرداں اور گنبد دوار سے تعبیر کرتے ہیں۔ آسمان کو شقف مانتے ہوئے ستاروں کو قندیل سے تشبیہ دیتے ہیں۔ چاند کے متعلق ان کا خیال ہے کہ سورج کی مانند اپنی ذاتی چمک سے چمکتا ہے۔ مگر اقبال عوام الناس کے اس خیال کے بالکل خلاف تھا۔ اس کا قول تھا کہ شاعری میں جذبہ نگاری ضروری ہے۔ مگر جہالت اور بے علمی کے پہلو سے احتراز بھی لازمی ہے۔ شاعری اور حقیقت کا تصادم نہ ہونا چاہیئے۔ اس معاملے میں وہ اپنے پیشواؤں کا پیرو نہیں۔ چاند کی گردش کے متعلق وہ کہتا ہے ؎

نادانی ہے یہ گرد زمیں طوف قمر کا
سمجھا ہے کہ درماں ہے وہاں داغ جگر کا

وہ جانتا ہے کہ چاند کی روشنی ذاتی نہیں بلکہ وہ سورج کے عکس سے چمکتا ہے اس لئے کہتا ہے ؎

آہ میں جلتا ہوں سوز اشتیاق دید سے
تو (چاند) سراپا سوز داغ منت خورشید ہے

سمندر کے مدوجزر کا انحصار چاند کی کشش پر ہے یہی وجہ ہے کہ چودھویں اور تیسویں تاریخ کو مدوجزر پیدا ہوا کرتے ہیں اسی کو اقبال کہتا ہے کہ لئے "چاند" ؎

میرے ویرانے سے کوسوں دور ہے تیرا وطن
ہے مگر دریائے دل تیری کشش سے موجزن

اس شعر میں بھی شاعر دریائے دل کی موجزنی کا سبب چاند کی کشش ہی قرار دیتا ہے۔

اقبال صرف فلسفۂ قدرت کی ترجمانی کرنے ہی میں ملٹن اور کیٹس کا ہم پلہ نہیں ہے بلکہ دنیائے روحانیت کے نمائندے ملٹن کے بھی دوش بدوش نظر آتا ہے۔ اخلاق و عادات سیرت و تعلیم میں تو دونوں ایک دوسرے کے ہم پلہ تھے۔ مگر جہاں تخئیل کی دنیا شروع ہوتی ہے۔ اقبال ایک قدم آگے نظر آتا ہے۔ ملٹن خدا کی شان کریمی کے سامنے محبت اور خلوص کے پھول چڑھاتا ہے مگر جہاں شان قہاری کا مظاہرہ دیکھتا ہے ڈر سے کانپنے لگتا ہے اس کا جذبۂ خلوص و محبت غلامانہ جذبۂ اطاعت سے بدل جاتا ہے جو شاعری کے شان کے خلاف ہے کیونکہ شاعر خلوص اور محبت ہی کا پیغامبر ہو کر آیا ہے۔ مگر اقبال کو دیکھئے تو خدا کی شان قہاری کی تشریح کرتے ہوئے بھی محبت کے پہلو کو نظر انداز نہیں کرتا۔ جہنم کے متعلق کہتا ہے ؎

کہا جہنم معصیت سوزی کی اک ترکیب ہے
آگ کے شعلوں میں پنہاں مقصد تادیب ہے

انتہائے محبت اور جذبۂ یگانگت میں اقبال کی آنکھوں کے سامنے سے دوئی کا پردہ اُٹھ جاتا ہے اور خدا سے دو بدو باتیں کرنے لگتا ہے۔ ایک ظاہر بیں نظر کو "میں اور تو" یا "شکوہ" کی نظم میں خلاف شان عبدیت باتیں نظر آسکتی ہیں۔ مگر حقیقت شناس نظریں ان میں شاعر کے انتہائے جذبۂ عبدیت و خلوص کا جلوہ دیکھتی ہیں۔ دیگر شعرا کے مقابلے میں اقبال کی ان نظموں میں عبودیت کی شان بھی ارفع و اعلیٰ نظر آتی ہے۔ "شکوہ اور جواب شکوہ" کی نظم میں جو جو شکوے امت کی جانب سے کئے گئے ہیں۔ حقیقت میں وہ شکوے نہیں بلکہ اسلامی عظمت و شان اور کارناموں کے بہترین نمونے ہیں۔ یہ بھی شاعر کی انتہائے فطرت شناسی ہے کہ خوابیدہ قوم کو بیدار کرنے کا یہ نیا پہلو اختیار کیا ہے یہی وہ نظم ہے جس میں شاعر کا رزمیہ رنگ اور زور کلام کا نمونہ واضح طور پر نظر آتا ہے۔ یہاں اقبال کے پردے میں انیس و فردوسی کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔

یوں تو اقبال کی شاعری میں ہر رنگ اور ہر صنف کا نمونہ نظر آئے گا۔ مگر حقیقت تو یہ ہے کہ اقبال قدرت کی طرف سے فلسفیانہ پیغام کا حامل ہو کر آیا تھا۔ جس زمانہ میں دنیا میں آیا شرق و غرب کا لعد غائب ہو چکا تھا۔ اس لئے اس کے فلسفے کا نظریہ بھی فلسفۂ قدیم سے نرالا تھا۔ اس کے فلسفے میں مشرق و مغرب دونوں کی روح کھنچ آئی تھی شعرا میں اسلامی فلسفہ کا سچا ترجمان شاید ہی کوئی دوسرا نظر آئے گا۔ حیات و ممات۔ فنا و بقا کے مسئلے پر اس طرح روشنی ڈالتا ہے ؎

اجل ہے لاکھوں ستاروں کی اک ولادت مہر
فنا کی نیند مئے زندگی کی مستی ہے
وداع غنچہ میں ہے راز آفرینش گل
عدم عدم ہے کہ آئینہ دار ہستی ہے
عین ہستی ہے ہستی کا فنا ہو جانا
حق دکھایا مجھے اس نکتے نے باطل ہو کر

انقلاب زمانہ کے متعلق وہ یوں کہتا ہے ؎

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

دنیا کے ساتھ غم کے تعلقات کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

بنیاد ہے کاشانۂ عالم کی ہوا پر
فریاد کی تصویر ہے قرطاسِ فضا پر

ہجر و فراق۔عشق و محبت کی تشریح سنئے ؎

کنجِ عزلت سے مجھے عشق نے کھینچا آخر
یہ وہی چیز ہے جس چیز پہ نازاں ہوں میں
ہے فروغِ دو جہاں داغِ محبت کی ضیا
چاند یہ وہ ہے جو گھٹتا نہیں کامل ہوکر
صدمۂ ہجر میں کیا لطف ہے اللہ اللہ
یہ بھی اِک ناز ہے تیرا نہ اٹھاؤں کیونکر

سب سے خاص بات ان کے اشعار میں یہ ہے کہ فلسفے کا دقیق مسئلہ اور روحانیت کا پیچیدہ سے پیچیدہ اصول نظم کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے۔مگر کہیں بھی شاعرانہ انداز ہاتھ سے نہیں جانے دیا کسی شعر میں بھی خالص فلسفی کا سا روکھا پن نہیں آیا ہے۔فنا و بقا۔رنج و غم محبت و نفرت سیکڑوں مسائل ہیں جو شاعرانہ انداز سے گُل و بلبل ہی کے پردے میں بیان کردئے گئے ہیں۔

جہاں اقبال کی اور نظمیں اس کی یاد تازہ کرتی رہیں گی وہاں ان کے قومی ترانے بھی فراموش نہیں کئے جاسکتے۔حب الوطنی۔جانثاری۔اتفاق اور اتحاد کا جذبہ اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔"سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کی نظم اسقدر مقبول ہوئی کہ کانگریس کے اسٹیج پر بندے ماترم کی نظم کا جزو لاینفک بن گئی۔سیوا سمتی بوائے اسکاوٹ ایسوسی ایشن نے اسے اپنے اسکاوٹ کے ترانوں میں شامل کرلیا۔ایسی اور بھی نظمیں ہیں جو حب الوطنی کے شریف ترین جذبے سے پُر ہیں۔

گو آجکل اقبال پر فرقہ پرستی کا جھوٹا الزام تراشا جارہا ہے مگر دیکھئے امن و امان کے پیامی نے "نیا شوالہ" کی نظم میں ہندو مسلم اتحاد کی کس طرح رلیں دلائی ہے۔وہ ہندو مسلم دونوں فرقوں کے مفسد مولوی اور پنڈت کو مخاطب کرکے کہتا ہے۔کہ آؤ ہم سب مل کر ایک نیا شوالہ بنائیں جس میں ہندو مسلم کی کوئی تفریق نہ رہ جائے۔فرقہ وارانہ تمام جھگڑوں کو آگ میں جلادیں۔اس مندر میں جو بُت بٹھائیں اُس کے ماتھے پر لفظ "ہندوستان" لکھ دیں۔اس کے قدموں پر بجائے گنگا جل چڑھانے کے آنسوؤں کی دھارا بہائیں۔یہی نہیں بلکہ وطن کے ساتھ اسے اس درجہ خلوص تھا کہ ذیل کے شعر سے خود واضح ہوجاتا ہے ؎

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے

جس طرح اقبال نفسِ شاعری کے لحاظ سے فطری شاعر ہے اسی طرح صنائع بدائع کی چاشنی سے بھی اس کا کلام خالی نہیں۔ہاں یہ ضرور ہے کہ اس نے نفسِ مضمون کے مقابلے میں صنائع بدائع کی خیالی الجھنوں سے پرہیز کیا۔مگر جہاں کہیں تشبیہ و استعارے سے کام لیا ایک نیا رنگ پیدا کردیا۔ذیل کی تشبیہات کی لطافت ملاحظہ ہو چاندنی میں ٹہلتے ہوئے شاعر کی کسقدر پاکیزہ اور انوکھی تشبیہ ہے

تاروں کے موتیوں کا شاید ہے جوہری تو
مچھلی ہے کوئی میرے (چاند کے) دریائے نور کی تو

جگنو کے متعلق کہتا ہے ؎

آیا ہے آسماں سے اُڑکر کوئی ستارہ
یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں
تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا
ذرّہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن میں
چھوٹے سے چاند میں ہے ظلمت بھی روشنی بھی
نکلا کبھی گہن سے آیا کبھی گہن میں

چاند اور شاعر کا مقابلہ ؎

یہ چاند آسماں کا شاعر کا دل ہے گویا
واں چاندنی ہے جو کچھ یاں درد کی کسک ہے

شبنم اور سحر کے متعلق ؎

رنگیں کیا سحر کو بانکی دلہن کی صورت
پہنا کے لال جوڑا شبنم کو آرسی دی

اقبال چونکہ عربی اور فارسی کا ماہر تھا۔اس لئے اس کے کلام میں عربی و فارسی کی بیشتر ترکیبیں پائی جاتی ہیں۔لیکن گرد و پیش کے الفاظ کی نشست اور موقع استعمال کی خوبی کی وجہ سے غرابت اور اجنبیت کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔جس طرح اقبال کو عربی و فارسی پر عبور حاصل تھا۔اسی طرح سنسکرت اور بھاشا سے بھی ناآشنا نہ تھا۔جس کی کھلی ہوئی مثال نیا شوالہ کی نظم ہے ؎

اپنوں سے بیر رکھنا تُو نے بتوں سے سیکھا : جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

بھائی بہن

پرمدا ایک کہنہ وشکستہ مکان کے ایک کمرے میں میلی سی چٹائی پر بیٹھی اشک آلود آنکھوں سے ایک تصویر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ امتدادِ زمانہ اور اس کے آنسوؤں نے تصویر کو پھیکا کر دیا تھا۔ مگر اسے مٹا نہ سکتے تھے۔ بڑی بڑی آنکھیں، ستواں ناک اور حسین ہونٹ اب بھی صاف نظر آ رہے تھے۔ پرمدا اس تصویر کے ساتھ تنہائی میں بیٹھ کر کتنا رو چکی تھی۔ کتنا ہنس چکی تھی۔ وہ بیٹھی اپنی باتوں کو سوچ رہی تھی کہ کسی نے باہر سے دروازہ کھٹکھٹایا، اس نے آنسو پونچھ کر دروازہ کھولا، سامنے رامیشوری کھڑی تھی، یہ اس کی نو آباد پڑوسن تھی جس سے حال ہی میں اس کی راہ و رسم ہوئی تھی۔

"آؤ بہن، بڑی مہربانی کی۔" پرمدا نے کہا۔

رامیشوری اندر چلی آئی، دونوں اسی پرانی چٹائی پر بیٹھ گئیں۔ تصویر اسی طرح چٹائی کے ایک کنارے پڑی رہ گئی تھی۔ رامیشوری نے تصویر اٹھائی اور بولی "یہ کس کی تصویر ہے بہن؟"

"میرے بھائی کی۔" پرمدا جواب دیا۔

"بہت پرانی معلوم ہوتی ہے، یہ آجکل کہاں ہیں؟"

"کیا بتاؤں بہن کہ کہاں ہیں؟ میں تو اتنا بھی نہیں کہہ سکتی کہ وہ ہیں بھی یا نہیں۔"

پرمدا کی آواز گلوگیر ہو گئی ——— "یہ آنکھیں پندرہ برس سے ان کی صورت کو ترس رہی ہیں۔"

"وہ گئے کہاں تھے؟" رامیشوری نے ہمدردانہ لہجے میں سوال کیا۔

"اگر یہی پتہ لگ جاتا تو بات ہی کیا تھی۔"

"کیا پوشیدہ طور پر کہیں چلے گئے ہیں؟"

"ہاں۔"

"آخر انہوں نے ایسا کیوں کیا؟"

"مجھ بدنصیب کی زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے۔ اس لئے کہ میری زندگی راحت و آسائش سے گزر سکے۔" کسی قدر طنزیہ لہجے میں پرمدا نے جواب دیا۔

"بھائی بہن میں کچھ ان بن ہو گئی تھی کیا؟"

"ان بن نہیں بہن۔ میری محبت میں انہوں نے ایسا کیا۔ اسی کا تو مجھے قلق ہے۔"

"محبت کا یہ طریقہ تو میری سمجھ میں نہیں آتا بہن۔"

پرمدا نے ایک سرد آہ بھر کر کہا "ہاں بہن یوں تمہاری سمجھ میں نہ آئے گا۔ لیکن اگر تم ہماری کہانی سن لو تو سب باتیں اچھی طرح تمہاری سمجھ میں آ جائیں۔"

پرمدا نے پرانی سی تپائی پر سے پڑے ہوئے جاپانی ٹائم پیس کی طرف دیکھا۔ دو بجے تھے۔ اس کے شوہر کے دفتر سے آنے میں کافی دیر تھی۔ اس نے کہا۔ "مضائقہ کون سا ہے بہن سنو! لوگ کہتے ہیں، بادل گرج رہے تھے۔ بجلی کڑک رہی تھی کہ ایک لیڈی ڈاکٹر اور دو نرسوں کی امداد سے ہم دونوں نے روتے ہوئے اس غم و اندوہ سے بھری ہوئی دنیا میں قدم رکھے، میں اپنے بھائی سے پندرہ بیس منٹ پہلے پیدا ہوئی تھی۔ میری ماں کو تو خبر ہی نہیں کیا ہو رہا تھا۔ سنتی ہوں والد صاحب پریشانی کے عالم میں برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ یہ خبر سنی تو بھاگے ہوئے اندر گئے۔ پھول کی طرح حسین و شگفتہ اپنے دو دو بچوں کو دیکھ کر ان کی خوشی کی حد نہ رہی، وہ پلنگ پر جھک کر ہمیں بار بار چومتے تھے۔ پھر بھی ان کی طبیعت سیر نہ ہوتی تھی۔

"اولاد کی پیدائش کا وقت بھی کتنا مسرت انگیز ہوتا ہے تمہارا مکان کہاں تھا؟" رامیشوری نے پوچھا۔

"ہا! میرا مکان! اب تو اس طرف سے گزرتے ہوئے بھی سینہ شق ہوتا ہے۔ اب اس کے آس پاس بہت سی عمارتیں بن گئی ہیں لیکن تمہیں کیا معلوم کس کا مکان ہے، فیروز پور روڈ کے ٹھیک سامنے ہے۔" پرمدا نے جواب دیا۔

"پہلی بڑی کوٹھی تو نہیں؟" رامیشوری بے ساختہ بول اٹھی۔

"ہاں وہی۔" پرمدا ٹھنڈی سانس لے کر کہنے لگی "والد صاحب نے وہ مکان بڑے شوق اور حوصلے سے بنوایا تھا، لیکن زمانے کی گردش نے اسے چند ہی روز میں ان کے ہاتھوں سے چھین لیا۔ اس زمانے میں والد صاحب ریلوے کے بہت بڑے ٹھیکہ دار تھے۔ اس وقت کی آمدنی اور خرچ دونوں کے لحاظ سے روپیہ پیسہ ہم لوگوں کے لئے کنکر پتھر سے زیادہ قیمت نہ رکھتا تھا۔ ہم بھائی بہن کے لئے علیحدہ علیحدہ آیا رکھی گئی تھیں باغ میں دونوں کے لئے دو جھولے پڑے رہتے تھے۔ صبح وشام ہوا کھانے کے لئے دو "بچہ گاڑیوں" کے علاوہ خاص ہمارے لئے ایک موٹر خریدی گئی۔ ہمارے کپڑے "پٹمین" اور "رنکن" کی دکان سے بنا کرتے تھے کھلونے ولایت سے آتے تھے۔ ہمارے لاڈ پیار میں کسی طرح کی کوتاہی نہ ہوتی تھی، اسی نازو نعم میں پل کر ہم دونوں بارہ برس کے ہو گئے۔ اس کے بعد یکایک ہم پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹا۔ اور ہماری امارت و ریاست سب خاک میں مل گئی۔

"مجھے اچھی طرح یاد ہے۔" پرمدا ذرا رک کر پھر کہنے لگی "سوموار کا دن تھا، گیارہ بجے تھے، میں اسکول سے واپس آئی اور موٹر سے اتر کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگی، بغل کے کمرے میں والد صاحب کی آواز سنائی دی۔ وہ پانچ بجے سے پہلے کبھی گھر نہیں آتے تھے۔ اس لئے بے وقت ان کی آواز سن کر مجھے تعجب ہوا اور میں سیدھے انہیں کے کمرے میں گھس گئی، میں نے وہاں جو منظر دیکھا وہ اور بھی حیرت انگیز اور پریشان کن تھا، والدہ کھڑی رو رہی تھیں اور والد صاحب گلوگیر آواز میں انہیں تسلی دے رہے تھے۔

"کیا ہے ماں؟" میں نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

"کچھ نہیں" ماں نے جلدی سے آنسو پونچھ ڈالے۔

"آپ رو کیوں رہی ہیں؟"

ماں نے کچھ جواب نہ دیا، والد صاحب کی طرف دیکھنے لگیں، گویا وہ کہہ رہی تھیں کہ میں اس لڑکی کو کیا جواب دوں؟ والد نے مسکراتے ہوئے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا اور فرضی ہنسی ہنس کر کہا۔ "دیوانی ہیں جو رو رہی ہیں، ارے اینٹ اور پتھر کے ڈھیر کے لئے رونا بھی کوئی عقل کی بات ہے؟" میں نے متردد ہو کر پوچھا "میری سمجھ میں نہیں آیا آخر بات کیا ہے؟"

"بات کچھ بھی نہیں ہے۔ ہم کل دوسرے مکان میں چلیں گے یہ مکان خالی کر دینا پڑے گا، تم صبح کی بھوکی ہو، جا کر کھاؤ پیو"۔ یہ کہتے ہوئے والد صاحب نے مجھے کمرے سے باہر کر دیا۔

میرے دل میں طرح طرح کے سوالات پیدا ہو رہے تھے وہ سب دل کے اندر ہی گھٹ کر رہ گئے۔ میں خاموش اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

رامیشوری درمیان ہی میں بول اٹھی "آخر آپ کے والد صاحب کو مکان کیوں چھوڑنا پڑا۔"

"متواتر نقصان ہونے کے باعث" پرمدا کہنے لگی "امید تھی کہ بگڑی ہوئی حالت سنبھل جائے گی۔ والد صاحب نے اپنی ظاہری وضع وشان میں فرق نہ آنے دیا کہ کاروبار کے اعتماد کو نقصان نہ پہنچے۔ لیکن اس طرح قرض کا بار گراں سے گراں تر ہوتا گیا۔ ایک روز یہاں تک نوبت پہنچی کہ قرض کی آگ میں ہمارا سب کچھ جل کر خاک ہو گیا۔"

رامیشوری بڑے غور سے پرمدا کی داستان مصیبت سن رہی تھی، اس کے منہ سے نکل گیا "زمانے کی گردش سے رشی منی کوئی بھی نہ بچ سکے"

پرمدا:- ایک ہفتے بعد ہمیں اپنا وہ مکان چھوڑ دینا پڑا۔ ہماری موٹریں بک گئیں، ہماری امارت و ریاست اور آرام و آسائش کے تمام سامان فروخت ہو گئے، ایک نوکر رکھ کر باقی تمام نوکروں کو علیحدہ کر دینا پڑا۔ ہمارے نئے مکان میں صرف دو چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ جن میں ہم سب بسر کرنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہم جنت سے نکال کر جہنم میں ڈال دئے گئے۔

کچھ روز تک تو ہم لوگوں کے رنج و افسوس اور اندوہ وغم کی انتہا نہیں رہی۔ لیکن والد صاحب شاید مرد ہونے کے باعث اور ہم بھائی بہن زیادہ سمجھدار نہ ہونے کی وجہ سے رفتہ رفتہ سب کچھ بھول گئے۔ البتہ والدہ کے دل کو جو صدمہ پہنچ گیا تھا۔ وہ کسی طرح دور نہ ہوا۔ وہ ہر وقت مغموم اور رنجیدہ رہتیں۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد انہیں ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا۔ ان کی بیماری نے ہماری حالت اور ناگفتہ بہ کر دی۔ اس چھوٹے سے کم حیثیت

مکان کے علاوہ ہمارے پاس اور جو کچھ بچ رہا تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔ جس سے ہماری گزر اوقات اور بھی مشکل ہو گئی، والد صاحب نے کئی بار چاہا کہ اس مکان کو بھی فروخت کر دیں مگر والدہ کسی طرح راضی نہ ہوئیں۔ اسی حالت میں ایک سال اور گزر گیا، اس درمیان میں ہماری حالت کسی قدر روبہ اصلاح ہو گئی، والد صاحب نے خرچ کی جو حد مقرر کی تھی۔ اس سے اُن کی آمدنی ٹکرانے لگی۔ اس لئے اب مکان علیحدہ کرنے کی ضرورت باقی نہ رہی۔"

"اور آپ کی والدہ کی صحت؟" رامیشوری بے صبری کے ساتھ پوچھ بیٹھی۔

"دل میں غم گھر کر لینے کے بعد بھی کہیں مریض کو صحت ہوتی ہے؟ مہینے میں ان سے آٹھ دس روز کے لئے چارپائی چھوٹ جاتی تھی۔ تو بعد میں اور شدت سے مرض کا حملہ ہوتا تھا۔ بس یہی حالت رہتی تھی۔" یہ کہتے کہتے پر مدا رک گئی اور اس کی نظر میں سامنے کی دیوار پر کچھ تلاش کرنے لگیں، جیسے وہ مٹی اور چونے کی میلی کچیلی دیوار پر اپنی باحمیت اور خود دار مغموم اور سنجیدہ ماں کی تصویر ڈھونڈ رہی ہو۔ وہ یکایک چونک کر پھر کہنے لگی "اس طرح چار سال اور گزر گئے۔ اس وقت میرا بھائی کالج کے پہلے سال میں پڑھ رہا تھا۔ انٹرنس تو ہم دونوں نے ساتھ ہی کیا تھا۔ اس کے بعد میرا پڑھنا چھوڑوا دیا گیا۔ کیونکہ گھر والوں کے خیال کے مطابق میری عمر شادی کے قابل ہو چکی تھی۔ میرے لئے شوہر کی تلاش ہونے لگی، والد صاحب مارے مارے پھرنے لگے۔ مہینے میں اُن کے کئی کئی روز اسی دوڑ دھوپ میں صرف ہو جاتے مگر کچھ حاصل نہ ہوتا، جاتے اور مایوس ہو کر واپس چلے آتے، کیونکہ جو لڑکے ملتے وہ کام کے نہ ہوتے اور جو لڑکے اچھے ہوتے ان کے باپ ماں انکا وہ مول تول کرتے کہ والد صاحب کو اپنا سا منہ لے کر چپ رہ جانے کے سوا کچھ چارہ ہی نہ رہتا۔

ایک روز والد صاحب کئی دن کے چکر کے بعد گھر واپس آئے تو والدہ نے تکیے پر سر رکھے رکھے مایوسانہ لہجے میں پوچھا۔ "کہو، کیا ہوا؟ ملا کوئی لڑکا؟"

والد صاحب نے حسرت آمیز ہنسی ہنستے ہوئے کہا "اب ہاتھ میں روپے کی تھیلی لے کر جاؤں گا جب ہی کام کا لڑکا ملے گا۔"

"یہ زمانہ روپیہ کا اتنا پجاری بن گیا ہے! روپے کے سامنے کوئی اور چیز چاہے وہ کتنی ہی قابلِ قدر ہو اس کی نظروں میں جچتی ہی نہیں۔" ضعف و نقاہت کے باوجود انہیں جوش سا آ گیا۔ ان کی افسردہ آنکھوں میں ہلکی سی سرخی دوڑ گئی۔ وہ تکیے سے سر اُٹھاتے ہوئے کہنے لگیں "اس کا مطلب تو یہ ہے کہ اعلیٰ قسم کا ہیرا بھی جب تک چاندی سونے کی ایک خاص قیمت کی ڈبیہ میں رکھ کر پیش نہ کیا جائے گا۔ وہ قابل قبول نہ ہو گا۔ واہ رے حماقت! واہ رے اندھیر!!"

"تو پھر کیا کیا جائے دنیا کی یہی حالت ہی ہو رہی ہے؟"

"اب کرو یہی کہ مکان بیچ ڈالو اور پھونس کی جھونپڑی ڈال کر رہو۔ آخر لڑکی کا تو کسی نہ کسی طرح ٹھکانا کرنا ہی ہے۔" ماں نے جوش کے ساتھ کہا۔

"ہم تو پھونس کی جھونپڑی میں بھی دن کاٹ لیں گے، لیکن لڑکا کیا کرے گا؟ دربدر مارا پھرے گا؟"

"لڑکا دربدر نہ مارا پھرے گا تو لڑکی گھر گھر چکی پیستی پھرے گی" ماں نے سخت ناگوار لہجے میں اتنا کہا اور تکیے پر سر رکھ کر سسکیاں بھرنے لگیں۔

ہم بہن بھائی بغل کے کمرے میں بیٹھے یہ تمام باتیں سُن رہے تھے۔ ماں کے آخری الفاظ نے ہم دونوں کو تڑپا دیا۔ بھائی اُٹھ کر بے چینی سے کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ اسی طرح پانچ منٹ تک ٹہلتا رہا۔ پھر اس نے کھڑے ہو کر میری طرف دیکھا اور گلوگیر مگر پُر استقلال لہجے میں کہا۔ "تمہاری محبت نے والد صاحب کو اس پریشانی میں مبتلا کر رکھا ہے۔ پر مدا تم مایوس نہ ہونا میں ایسے ایسے ایک نہیں دس مکان تم پر صدقے کر دوں گا۔"

میں کرسی پر سہمی اور سمٹی بیٹھی تھی، اس گورے اور نازک چہرے پر عزم و استقلال کو محسوس نہ کرنے کے باوجود میں کانپ اُٹھی۔ لیکن مجھے کچھ بولنے کی ہمت نہ ہوئی، غمگین اور بھرائی ہوئی آواز میں بڑی مشکل سے میری زبان سے صرف ایک بار "بھائی!" نکل سکا۔ وہ میری آواز سُن کر اپنے آنسو سنبھالتا ہوا میرے نزدیک آیا اور نہایت محبت سے میری پشت پر ہاتھ پھیرنے اور میرے بالوں کو سہلانے لگا، آہ! پندرہ برس ہو گئے مگر آج بھی جب آنکھ جھپکتی ہے تو اس محبت بھرے ہاتھ کو اسی طرح پیٹھ پر پھرتے اور بالوں سے مس کرتے ہوئے پاتی ہوں۔"

یہ کہتے کہتے پر مدا کی آنکھوں سے بے اختیار آنسوؤں کی

جھڑی لگ گئی۔ اور وہ زار زار رونے لگی۔ رامیشوری کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو گئے، اس نے بڑی مشکل سے پرمدا کو چپ کرایا۔

پرمدا کی طبیعت ذرا قابو میں آئی تو اس نے کہا "دوسرے روز وہ گھر سے غائب ہو گیا۔"

رامیشوری :۔ غائب ہو گئے؟ تم لوگوں سے کہے بغیر ہی چلے گئے؟

"ہاں، اور اپنی چارپائی پر کاغذ کا ایک ٹکڑا چھوڑ گیا جس پر صرف ایک لائن لکھی تھی۔"

"کیا لکھا تھا انہوں نے؟"

"لکھا تھا کہ میں آپ کے تذبذب کو دُور کرنے اور پرمدا کی زندگی کا راستہ صاف کرنے کے لئے گھر سے جا رہا ہوں۔" پرمدا کہنے لگی۔ والد صاحب ان الفاظ کو پڑھ کر گھبرا گئے۔

"کیا لکھا ہے؟" ماں نے دیوانگی کے لہجے میں پوچھا۔

والد نے کچھ جواب نہیں دیا۔ کاغذ کا ٹکڑا ان کے ہاتھ میں دے دیا۔ اور خود سر پکڑ کر پاس ہی پڑی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ ماں کاغذ پر لکھے ہوئے چند الفاظ کو جلدی سے پڑھ گئیں۔ پھر کمرے کے ایک گوشے میں کھڑی کانپتی ہوئی مجھ نصیب جلی کی طرف دیکھنے لگیں، معلوم نہیں اس وقت ان کے دل و دماغ کی کیا حالت تھی، انہوں نے یکایک میری طرف سے رُخ پھیر کر والد صاحب کے چہرے پر نگاہ ڈالی اور کہا "کیا سوچ رہے ہو؟"

"سوچ رہا ہوں پرمود نے پرمدا کے لئے کتنی قربانی کی اور کتنی دانائی۔" والد نے غمگین آواز میں کہا۔

"ہونہہ! تمہاری عقل کو کیا ہو گیا ہے جو قربانی کے ساتھ نادانی و دانائی کا حساب کتاب کرنے بیٹھے ہو؟ قربانی میں دانائی نہیں دیکھی جاتی، میں تمہیں کیا کہوں، میں نے پرمود کی ماں ہو کر آج تک نہیں سمجھا تھا کہ اس کے پہلو میں کتنا پاک، شریف اور بہادر دل ہے۔" یہ کہتے کہتے ان کی زبان لڑکھڑانے لگی، وہ بھی والد کے پاس چارپائی پر بیٹھ گئیں۔

اس وقت ہم سب کے ہونٹوں پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ابھی اچھی طرح دن نہیں نکلا تھا۔ والد صاحب یکایک چارپائی سے اُٹھے اور بولے۔ میں ذرا اسے تلاش کرنے جا رہا ہوں۔

"کہاں؟" میری ماں نے اندیشناک لہجے میں پوچھا۔

"گھبرانے کی ضرورت نہیں، میں کچھ دیوانہ نہیں ہوں۔ دس بجے تک واپس آجاؤں گا۔" اطمینان دلاتے ہوئے والد نے کہا۔

والد صاحب گئے اور اپنے وعدے سے ایک گھنٹہ قبل نو ہی بجے واپس آگئے۔

"کیا پتہ چل گیا؟" رامیشوری نے سوال کیا۔

"پتہ کیا چلتا؟ جو خود غائب ہو گیا ہو اس کا پتہ کون چلا سکتا ہے؟ ہم نے اخباروں میں اشتہار بھی دئے۔ لیکن کچھ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ آخر ہم لوگوں کو مایوس ہو کر خاموش ہو جانا پڑا۔ میرے باپ ماں کو بھائی کا خیال کچھ کم ہوا۔ تو انہیں پھر میری فکر ستانے لگی۔ تھوڑے دنوں کی دوڑ دھوپ کے بعد جہیز میں موٹر دینے کا وعدہ کر کے والد صاحب نے ایک نسبت طے کر لی۔ لڑکا ان دنوں بی۔ اے میں پڑھ رہا تھا اور اس کے باپ ایک سرکاری آفس میں ملازم تھے۔ ان کی تنخواہ شاید دو سو روپے سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن بالائی آمدنی بہت تھی، لوگ کہتے تھے وہ نہایت مالدار آدمی ہیں۔ اس لئے مکان فروخت ہوئے بغیر کام نہیں چل سکتا تھا۔ پھر بھی والد صاحب تیار ہو گئے۔ میں نے خود سنا تھا۔ وہ ماں سے کہتے تھے۔ بلا سے ہم مصیبتیں جھیلیں گے، لیکن پرمدا تو آرام سے رہے گی۔"

"اولاد کے لئے بھی باپ ماں کیا نہیں کرتے؟" رامیشوری درمیان ہی میں بول اُٹھی۔

"شادی کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ والد صاحب دھوکا کھا گئے۔" پرمدا نے پھر کہنا شروع کیا "میرے خسر کی بالائی آمدنی کی کوئی اصلیت نہ تھی، مجھے کہتے ہوئے شرم معلوم ہوتی ہے۔ لیکن درحقیقت وہ سب فسانہ سازی تھی۔ پہلے تو یہ معمہ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایک آدمی صرف دو سو روپے ماہوار میں ایسے اعلیٰ درجے کے مکان میں کیسے رہ سکتا ہے، دو تین ملازم اور گھوڑا گاڑی وغیرہ کیسے رکھ سکتا ہے، میں نے ہر چند کوشش کی کہ مجھے راز معلوم ہو جائے۔ میں نے موقع بموقع ان کے متعلق سوال بھی کئے، لیکن میں نے جس سے بھی پوچھا اس نے اِدھر اُدھر کی باتوں میں ٹال دیا۔ جیسے سب کو ہدایت کر دی گئی ہو کہ گھر کا ہر شخص مجھے اس معاملے کی طرف سے تاریکی میں رکھے۔ پھر بھی ایک روز کچہری کے ایک چپراسی کے ذریعہ یہ طلسم شکست ہو ہی گیا۔"

قسمت کی نیرنگیاں

ساون کی رات تھی، کائنات پر خوفناک تاریکی مسلط تھی۔ بادل گرج رہے تھے۔ بجلی چمک رہی تھی۔ کئی دن سے مسلسل جھڑی لگ رہی تھی۔

ٹوٹا ہوا مکان تھا۔ کونے میں ایک ٹوٹی چارپائی پڑی تھی۔ اوپر ایک چیتھڑا بچھا تھا۔ ٹوٹا ہوا گھڑا جس کی گردن غائب تھی پانی سے بھرا ہوا بغل میں رکھا تھا۔

چارپائی پر ایک بڑھی عورت سوئی ہوئی تھی ضعف و نقاہت سے سوکھ کر بستر سے لگ گئی تھی۔ بدن توے کی طرح جل رہا تھا۔ کروٹ بدلتی ہوئی بڑی مشکل سے بولی:۔

"بیٹی۔۔۔۔ پا۔۔۔۔ نی۔۔۔ پا۔۔۔۔ نی"

ایک چاند سی لڑکی، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں۔ کندن سا بدن، متوسط قامت۔ سیاہ گھونگھرالے بال۔ گیارہ برس کا سن۔ بدن پہ پھٹی میلی سی دھوتی، دوڑ کر آئی اور ایک ٹوٹے ہوئے الونیم کے گلاس میں پانی ڈال کر پیاری ماں کو پلا دیا۔ پانی پلا کر مریض ماں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور اپنی پیاری بیٹی بجلی پہ ایک حسرت بھری نگاہ ڈالی۔ اس ذومعنی نگاہ میں درد تھا۔ کسک تھی۔ تڑپ تھی اور ایک دُکھتے ہوئے دل کی خاموش فریاد تھی۔

* * *

ڈاکٹر برما شہر کے مایۂ ناز معالج تھے۔ آپ اپنے وقت کا بیشتر حصہ ملک و ملت کی خدمت میں صرف کرتے تھے، آپ کے پہلو میں ایک دردمند دل تھا۔ غریب دکھیوں کے ساتھ خاص محبت اور سلوک سے پیش آتے تھے۔ آپ کی غربا نوازی اور حسن اخلاق کا دُور دُور تک شہرہ تھا۔

بھادوں کی بھیانک رات تھی۔ ڈیڑھ دو کا وقت تھا۔ کائنات پر خوفناک تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ آسمان پہ سیاہ شامیانہ تنا ہوا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ بھی مشکل سے سوجھتا تھا۔

ایک لڑکی گرتی پڑتی آئی اور ڈاکٹر صاحب کا دروازہ کھٹکھٹانے لگی۔ رات کے وقت اور خاصکر ایسی تیرہ و تاریک رات میں فیس چوگنی بلکہ منہ مانگی ملا کرتی ہے۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب نے اس لقمۂ تر کا پُرتپاک خیر مقدم کرتے ہوئے بجلی کا بٹن دبایا اور ساتھ ہی اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے پھٹے چیتھڑے لپیٹے ہوئے ایک افلاس کی ماری لڑکی کھڑی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی صورت دیکھتے ہی اس نے گڑگڑا کر کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! میری بوڑھی ماں چارپائی پر پڑی ہوئی دم توڑ رہی ہے۔ آنکھیں پتھرا گئی ہیں۔ ذرا جلدی چلئے۔ اور میری پیاری ماں کو بچا لیجئے۔"

لڑکی گلوگیر آواز سے بمشکل اتنا کہہ کر سسک سسک کر رونے لگی۔ ڈاکٹر صاحب بغیر کچھ کہے منہ بنا کر بجلی بجھاتے ہوئے دروازہ بند کر کے اندر چلے گئے اور دودھ کی طرح سفید بستر پر لیٹ کر چند لمحوں میں گہری نیند میں غرق ہو گئے۔

کمرے کی چھت سے لگا ہوا برقی پنکھا اپنی انتہائی رفتار سے چکر کاٹ رہا تھا۔ صحن میں لگے ہوئے پھول کے پودوں سے بھینی بھینی خوشبو اُڑ اُڑ کر دل و دماغ کو معطر بنا رہی تھی۔

* * *

اس خوفناک اندھیری رات میں ایک شخص اپنے سر بفلک عالیشان مکان میں نرم و گداز بستر پہ پڑا جنت کے خواب دیکھ رہا تھا ———!

اور ایک غریب بڑھیا اپنی گری پڑی جھونپڑی کے ایک کونے میں گندے چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی دم توڑ رہی تھی ———!!

* * *

پل میں رائی کو پربت اور پربت کو رائی کر دینا قضا و قدر کا معمولی کھیل ہے۔ زلزلہ کی تباہ کاریوں کی خونچکاں داستان میں یوں تو کتنے ایسے جانگداز واقعات ہیں جنہیں سنکر سخت سے سخت دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ لیکن بوڑھے ڈاکٹر برما کے بھرے پُرے خاندان کا آن کی آن میں تباہ ہو جانا اور اس پر

خون کے آنسو رونے کے لئے ستر سالہ ڈاکٹر بسما کا حسنِ اتفاق یا سوئے اتفاق سے بچ رہنا، رونگٹے کھڑا کر دینے والا عبرتناک سانحہ ہے۔

غم و اندوہ کی کثرت و فراوانی سے بوڑھا ڈاکٹر دیوانوں کی طرح گلیوں میں دھاڑیں مار مار کر روتا کبھی کھل کھل کر ہنستا پھرتا ہے۔

* * *

کسی کے دن سدا ایک سے نہیں رہتے۔ ماں کے مرنے کے بعد بے یار و مددگار بجلی کو ایک دردمند ساہوکار نے اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔

بجلی ظاہری حسن و جمال کے ساتھ پاکیزہ سیرت اور اعلیٰ اخلاق کی مالک تھی اور حسنِ اتفاق سے ساہوکار کی ہم قوم بھی تھی۔ اس نے جہیز اور رشتے داروں کے طعنوں کی طرف سے آنکھیں بند کر کے اپنے بیٹے کو اس سے بیاہ دیا۔ ساہوکار کے دھن ناتے دار اس کی اس سادہ لوحی پر خوب ہنسے۔ لیکن اس نے سب سنی ان سنی کر دی۔

اب غریب بجلی لکھ پتی ساہوکار کی بہو تھی۔ سونے کے چمکتے دمکتے بھاری بھاری گہنوں سے اس کا سارا بدن ڈھک رہا تھا۔

*

مئی کی دوپہر تھی۔ بجلی اور اس کے تندرست و توانا ہنس مکھ پتی دیو بابو کیلاش بہاری اپنے خاص کمرے میں صوفے پر بیٹھے ہوئے تازہ اخبار دیکھ رہے تھے۔ سامنے ٹیبل پر برقی پنکھا چل رہا تھا۔

یکایک کھڑکی کے پاس ہی کسی بوڑھے آدمی کے رونے کی آواز کانوں میں آئی۔ بجلی نے کھڑکی سے گردن نکال کر دیکھا اگرچہ ڈاکٹر بسما کو دیکھے ہوئے ایک مدت گزر چکی تھی۔ پھر بھی اس صورت آشنا بوڑھے کو پہچاننے میں اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں ناکام نہ رہیں۔

بجلی کے پہلو میں ایک دردمند دل تھا۔ اس نے دوڑ کر دروازہ کھولا۔ اور چیتھڑے لپیٹے ہوئے بوڑھے پاگل کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں چلنے کے لئے کہنے لگی۔ بوڑھا ہاتھ جھٹک کر کھل کھلا کر ہنستا ہوا آگے بڑھ گیا۔ بجلی حیرت و استعجاب سے دیکھتی رہ گئی۔

کیلاش بہاری اور پڑوس کے دوسرے لوگ کبھی باہر نہ نکلنے والی بجلی کی یہ حرکت دیکھ کر فکرمند سے ہو گئے کہ کہیں یہ بھی تو پاگل نہیں ہو گئی ———؟

آسی رامنگری

عشق

عشق کیا ہے سازِ ہستی کا گداز　　عشق کیا ہے قلبِ شاعر کی نماز

عشق سے زندہ ہیں اقوامِ جہاں　　زندہ، پائندہ ہیں اقوامِ جہاں

عشق سے پیدا جہاں میں تازگی　　عشق کیا ہے؟ زندگی کی زندگی

عشق ربِّ دو جہاں کا نام ہے
لامحالہ سرمدی پیغام ہے

اختر چکوالی بی۔ اے

افکارِ تازہ

کوشش تری فریبِ مسرت فضول ہے — مانوس ہو چکے ہیں غمِ جاوداں سے ہم
اُس دل کو جو فشارِ حوادث سے مٹ چکا — بیگانہ اب بھی پاتے ہیں سود و زیاں سے ہم

"ساقی"

تجھے کیا فصلِ گُل ہے یا زمانِ خار ہے ساقی — تو خود اپنی جگہ اک دولتِ بیدار ہے ساقی
ذرا آہستہ لے چل کاروانِ کیف و مستی کو — کہ سطحِ ذہنِ عالم سخت ناہموار ہے ساقی
خدارا انتہائی لطف و نرمی سے مداوا کر — کہ عقلِ انساں کی اک عمر سے بیمار ہے ساقی
نظر کر جوشش پر اپنے کہ اتنی بے خودی پر بھی — یہ رندِ لااُبالی کس قدر ہشیار ہے ساقی

خوش نقابی کی اپنی خو نہ کریں — آپ توہینِ رنگ و بُو نہ کریں
خامشی بھی ہے ایک خلوتِ راز — نہ کریں مجھ سے گفتگو نہ کریں

"زمانہ"

سُن رہے ہیں تمہارا افسانہ — کہیں شاید ہمارا نام آئے
ابھی خاصانِ عشق باقی ہیں — کیوں نوید صلائے عام آئے

"سب رس"

اک ایسا گیت سنا کر ہو مائل پرواز — چمن کو پھر تری آمد کا انتظار رہے
ہمارے عالمِ بے رنگ سے نہ چھیڑ کرے — جہاں گئی ہے جوانی وہیں بہار رہے
جسے مآلِ چمن دیکھنے کی ہو برداشت — وہ آنکھ سرخوشِ نظارۂ بہار رہے

"شاعر"

رہرؤوں کو دُور سے پہچاننے کے واسطے — سعی کیجاتی ہے یوں دھندلی شبِ مہتاب میں
جس طرح انسان کی سیرت پرکھنے کے لئے — ٹھوکریں کھاتی ہیں نظریں ظاہری آداب میں

جھٹپٹے کے وقت کوندے کا لپکنا بار بار — ظلمتوں پر مارتا ہے جس طرح تھم تھم کے تیر
یونہیں وحشتناک عصیاں کی اندھیری رات میں — آدمی کے قلب کو رہ رہ کے ڈستا ہے ضمیر

"کلیم"

بے خودی جذبِ محبت کی الٰہی توبہ — درد کو درد نہ سمجھا تیرے شیدائی نے
پردۂ برق میں او ہوش اڑانے والے — اب نہ چھپ دیکھ لیا تجھ کو تماشائی نے

"دورِ جدید"

ظلم ہے صیاد ابھی تک مطمئن مجھ سے نہیں — وہ سمجھتا ہے کہ باقی طاقتِ پرواز ہے

"اردو"

اخبار علمیہ و تعلیمیہ

حکومت یوپی عنقریب ہی ایک کمیٹی مقرر کرے گی جو یہ تجویز کرے گی کہ ناخواندگی کو دور کرنے کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔ حکومت نے دیہاتی علاقوں میں رہنے والی لڑکیوں کو شہروں میں آکر ہائی اسکول تک کی تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دینے کی غرض سے یہ فیصلہ کیا ہے کہ لڑکیوں کے چار اینگلو ورنیکلر لوئر مڈل اسکولوں اور تین اپر مڈل اسکولوں کو کچھ وظیفے دیئے جائیں۔ جو لڑکیاں وظیفوں کے لئے درخواست دینگی ان کو یہ وعدہ کرنا پڑے گا کہ وہ ہائی اسکول پاس کرنے اور تربیت حاصل کرنے کے بعد اگر اس کی ضرورت ہوئی۔ کم از کم تین سال تک معلمہ کی حیثیت سے کسی تسلیم شدہ اسکول میں کام کریں گی اور اگر انہوں نے بحیثیت ایک معلمہ کے کام نہ کیا تو وظیفہ کی تمام رقم واپس کر دیں گی۔ وظیفے بریلی سیتاپور ہردوئی۔ سہارنپور۔ گورکھپور۔ متھرا اور غازی آباد کے گرلز اسکولوں کو دئے جائیں گے۔ جن کو حال ہی میں ہائی اسکول کے معیار پر پہنچایا گیا ہے۔

مرکزی مشاورتی تعلیمی بورڈ نے واردھا کے تعلیمی اسکیم پر غور و فکر کے لئے جو کمیٹی منتخب کی تھی۔ اس کا جلسہ شملہ میں ۲۸ جون ۱۹۳۸ء کو منعقد ہوگا۔

یاد ہوگا کہ یہ کمیٹی بورڈ نے اپنے تیسرے سالانہ جلسہ میں جو بمقام نئی دہلی ۲۸ جنوری ۱۹۳۸ء کو منعقد ہوا تھا۔ اس غرض سے مقرر کی تھی۔ کہ واردھا کی تعلیمی اسکیم پر وڈ ایبٹ رپورٹ کی سفارشات اور بعض صوبہ جاتی حکومتوں کی مقرر کردہ کمیٹیوں کی رپورٹ کی روشنی میں غور کرے اور سفارشات پیش کرے۔

اس کمیٹی کے ممبران حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ آنریبل مسٹر بی جی کھیر وزیر اعظم بمبئی۔
۲۔ 〃 ڈاکٹر سید محمود وزیر تعلیم بہار۔
۳۔ 〃 پنڈت آر۔ ایس شکلا وزیر تعلیم صوبہ جات متوسط
۴۔ لیڈی گرگ۔
۵۔ راجکماری امرت کور۔
۶۔ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد۔
۷۔ مسٹر جے۔ اے پارکنن ایجوکیشنل کمشنر حکومت ہند۔
۸۔ مسٹر آر۔ ایم اسٹاتھم سی۔ آئی۔ ای ناظم تعلیمات مدراس۔
۹۔ مسٹر ڈبلو ایچ۔ ایف آرمسٹرانگ 〃 〃 پنجاب۔
۱۰۔ مسٹر شیام پرشاد مکرجی۔ وائس چانسلر کلکتہ یونیورسٹی۔
۱۱۔ ڈاکٹر ذاکر حسین۔ پرنسپل جامعہ ملیہ دہلی
۱۲۔ خان فضل محمد خاں صاحب ناظم تعلیمات حیدرآباد دکن۔

حکومت حیدرآباد نے ایک اعلان شائع کیا ہے کہ آئندہ سے ریاست کی زبان ہندوستانی ہوگی۔ تمام محکموں کے لئے یہ امر لازمی ہے کہ وہ اپنی رپورٹوں کو ہندوستانی زبان میں شائع کریں۔

بمبئی یونیورسٹی کی سینٹ نے اس مطلب کا ایک ریزولیشن پاس کیا ہے کہ آئندہ سے کانووکیشن ایڈریس انگریزی کی بجائے کسی ہندوستانی زبان میں پڑھا جائے۔ اس ریزولیشن پر اسی سال سے عمل درآمد شروع ہو جائے گا۔

صوبہ مدراس میں ہندی زبان کو لازمی قرار دئے جانے کے خلاف پُر زور احتجاج کیا جا رہا ہے۔ عوام اس تجویز کے خلاف اسقدر برافروختہ ہیں کہ وہ سول نافرمانی کی دھمکیاں بھی دے رہے ہیں۔ دیوان بہادر سری نواس نے اس سلسلے میں مہاتما گاندھی کو تار دیا ہے۔ جس میں ان سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ مدراس کے وزیر اعظم کو مجبور کریں کہ ہندی کو لازمی کی بجائے اختیاری قرار دیا جائے۔

لاجپت رائے ہال میں لاہور کے پروفیسروں اور کالجی لڑکوں کی کانفرنس ہوئی جس میں اس امر پر غور کیا گیا کہ طلبا کو موسم گرما کی چھٹیاں کس طرح گزارنی چاہئیں۔ اس کانفرنس میں تقریباً تین صد طلبا اور پروفیسروں نے شرکت کی۔ اور کافی غور و خوض کے بعد طے پایا کہ طلبا کو یہ وقت ناخواندہ لوگوں کو پڑھانے میں صرف کرنا چاہیئے۔

ادارہ

صفحۂ اطفال

"مس فلورا"

گذشتہ سے پیوستہ

فلورا:۔ مجھے یہ سوچ کر شرمساری ہوتی ہے۔ کہ تمہاری ان مصیبتوں کا میں سبب بنی ہوں۔ نہ تم میرے لئے ماری ماری پھرتیں نہ زخمی ہوتیں۔

چمپا:۔ بہن تم کیا سبب بنتیں تقدیر کا لکھا یہی تھا۔

"پیش آتی ہے وہی جو کچھ کہ پیشانی میں ہے"

قدر میں یہ مصیبتیں آنی لابدی تھیں۔ اپنے کسی کام کو جاتی تو بھی آتیں۔ شکر ہے اُس کا۔ اس کا کوئی کام حکمت و دانائی سے خالی نہیں۔ نہ جانے اس حادثے میں اس کی کیا مصلحت تھی۔ میرے کسی گناہ کی سزا نہ دی گئی ہو۔ اگر ایسا ہے۔ تو میں خوش ہوں۔ کہ دنیا ہی میں سزا مل گئی۔ عاقبت کی باز پُرس سے بچ گئی۔

خیر جو کچھ ہونا تھا ہو چکا، ہو کے رہتا ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ اس کے تقاضے پر تقاضے آ رہے ہیں۔ بندروں کا تانتا بندھ رہا ہے صبح پیرو بندر یا بچے کو سینے سے چمٹائے ہوئے آئی تھی۔ یہ چنّو کی سگی خالہ کی بیٹی کی بہن ہے۔ کہتی تھیں بھائی جان نے بھیجا ہے۔ تمہیں سلام کہا ہے اور مزاج پوچھا ہے۔

میں جانتی ہوں۔ آخر تو اتنی بھولی تو نہیں کہ یہ قاصدوں کا سلسلہ اُس نے کیوں لگا رکھا ہے۔ تہذیب یافتہ بندر ہے۔ مزاج پرسی کے بہانے بندر پہ بندر بھیج رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم سوچ سمجھ کر کوئی تاریخ بند کر دو! اُسے اطلاع دے دی جائے۔ پانچ سات براتی ساتھ لے آئے۔ پیر پرمٹ شاہ کو میں بلوا بھیجوں گی۔ شبھ گھڑی عصر، مغرب کے درمیان نکاح پڑھاویں گے۔

اس وقت تم کھلی پھرا کرتی ہو۔ بس یہ کرنا کوٹھے پر چڑھ آنا۔ وہیں براتیوں کے سامنے پیر صاحب "آمنت باللّٰہ"[1] پڑھا دیں گے اور خیر سے اللّٰہ کا نام لے کر اپنے دولہا کے ساتھ چار باغ چلی جانا۔ مگر دیکھنا اس کلموئے جیک کو خبر نہ لگنے پائے! کہیں اس کے کان میں گن سُن پہنچ گئی۔ تو پھر تڑا کے کو کوٹھے پہ آ چڑھے گا۔ اور براتیوں میں بھاگڑ پڑ جائیگی

[1] نکاح کے وقت نکاح پڑھانے والا قاضی ایک دعا پڑھا کرتا ہے۔ اسے آمنت باللّٰہ کہتے ہیں۔

گھر کی بیوی کے کان الگ کھڑے ہو جائیں گے۔ محلّے بھر کے کتّے کتیاں بھوں بھوں کر کے آسمان سر پہ اُٹھا لیں گی۔ براتیوں کو چار باغ پکڑنا مشکل ہو جائے گا۔ یہ مراتی حاسد ہے۔ میں نے کچھ جھوٹ تو نہ کہا تھا۔ یہ مٹیا کسی کو آرام میں دیکھ ہی نہیں سکتا۔

فلورا:۔ اچھی بہن! میری تو رُوح ابھی سے کھروا کھیل رہی ہے۔ برات کے آنے پر میرا کیا حال ہوگا؟ میں کس دل سے براتیوں کے سامنے جاؤں گی اور اُن[1] کے ساتھ پنجے میں پنجہ ڈال کر مجھ سے تو کودتے اور درخت نہ پھلانگے جائیں گے۔

چمپا:۔ چل جروا! لال کپڑوں کی دیوانی۔ ہوش کی لے۔ ایسی چھوئی بنتی ہے۔ دودھ پیتی بچّی ہے جو شرمائے گی چار سال پہلے کسی بندر سے سمبندھ ہو گیا ہوتا۔ تو آج کو آدھی درجن بچّوں کی ماں بن چکی ہوتی۔ بڑی آئی شرم کی پُوٹلی۔ شرم چوری چھپانے میں ہے۔ چار پنچ جس کے پنجے میں پنجہ دے دیں۔ اُس سے شرمانے کی کیا بات ہے؟ شرم کی بھی ایک ہی کہی۔ جیوڑے کا تو یہ حال ہے کہ ابھی منگنی نہ بیاہ منگیتر کو "اُن اُن" کرتے منہ سُوکھا جاتا ہے۔ کل تک وہ مراتی جیوا بندر کہلاتا تھا۔ آج "اُن" ہو گیا۔ او ہو رے تیری شرم

فلورا:۔ تم تو طعنے تشنے دینے لگیں۔ اُنہیں "اُن" نہ کہوں تو کیا نام لوں۔ اور منگنی بیاہ کی جو کہتی ہو۔ وہ تو اُسی دن ہو چکا تھا۔ جب تم نے میرے منہ سے "ہاں" کہلوائی تھی۔ اب تو رسم پوری ہونی رہ گئی ہے۔ اب بھی ان کا نام لینے لگوں۔ تو پہلے تو تمہیں مجھے بدتمیز بتاؤ گی۔ ہماری ماں مرتے مر گئی۔ کبھی ابّا کا نام اس کے منہ سے نہ سُنا۔ ہمیشہ "فلورا کے ابّا" کہہ کر بات کیا کرتی تھی۔ بہن ہمارے گھرانے میں بلکہ بندر برادری میں کوئی بندری اپنے خاوند کا نام نہ لیا کرتی ہے۔ جو ایسا کرنے لگے۔ وہ بے شرم بھی کہلائے۔ اور بدتمیز بھی۔ رہی شرم تو یہ عورت ذات کا زیور ہے۔ نوج میں کبھی بے شرمی اختیار کروں۔ میں تو مرتے دم تک اللہ نے چاہا تو اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہ کروں گی۔ کرنا بھی چاہوں تو نہ کر سکوں گی۔ ماں باپ نے مجھے ایسا ہی اٹھایا ہے۔ دوسرے خدا نہ کرے میں بیوہ نہیں، رنڈیا نہیں کنواری ہوں۔ کنواریاں بھی بے شرم بن جائیں تو سمجھو قیامت آیا چاہتی ہے۔

چمپا:۔ فلورا یہ بیسویں صدی ہے بیسویں۔ تم پچاس برس پہلے کی باتیں کرتی ہو۔ اب تو مغربی تہذیب مشرق کے گوشے گوشے کو منور کر رہی ہے۔ اب

[1] اپنے منگیتر جیوا بندر کو "اُن" کہہ رہی ہے۔

اب وہ زمانہ گیا۔ جب نانیاں اور دادیاں کسی محفل میں جمع ہوتی تھیں اور وہیں اپنے پوتوں، نواسوں پوتیوں اور نواسیوں کی بات ٹھیرالیا کرتی تھیں۔ نہ لڑکی بے چاری کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ جس کے ساتھ مجھے ساری زندگی گزارنی ہے۔ وہ صورت، شکل، مزاج اور طبیعت کا کیسا ہے۔ بیماری آزاری تو نہیں۔ کوئی اور ڈھکا چھپا عیب تو نہیں رکھتا۔ نہ لڑکے کی یہ مجال تھی۔ کہ دادی اماں سے پوچھ سکے کہ میری منگیتر پڑھی لکھی بھی ہے یا نہیں۔ اس کی صورت یا سیرت میں کوئی کھوٹ تو نہیں۔

یہ نانیاں، دادیاں صرف یہ دیکھتی تھیں۔ ہم کفو ہو کُنبہ نہ ہو۔ اس کے ماں باپ کھاتے پیتے ہوں۔ جائداد کے مالک ہوں، لڑکی کھانے پکانے اور امور خانہ داری میں طاق ہو۔ بہت سا جہیز لائے۔ باقی دونوں کی عمریں ملتی جلتی ہیں یا نہیں۔ مذاق طبیعت یکساں ہے یا نہیں۔ کسی خاندانی یا ذاتی مرض میں تو مبتلا نہیں۔ تعلیم و تربیت کیسی ہے۔ ان ضروری باتوں کی پوچھ گچھ نہیں ہوتی تھی۔ اور اب ——؟ اب تو بہن آزادی اور تعلیم کا زور ہے۔ لڑکا لڑکی کی مرضی کے بغیر شادی ہو ہی نہیں سکتی۔ اس قدر آزادی ملی ہے کہ لڑکا لڑکی خود ہی اپنا جوڑا تلاش کر لیتے ہیں۔ کنواروں اور کنواریوں کو آپس میں میل جول، بات چیت، سیر و تفریح کی کھلی آزادی حاصل ہے۔ جس سے طبیعت میل کھا گئی۔ اسی سے دو بول پڑھا لئے! کورٹ شپ کا طریقہ نئی تہذیب کا تحفہ ہے۔ سال سال بھر تک لڑکا اور لڑکی آپس میں ملتے جلتے ہیں اور ایک دوسرے کی طبیعت اور مزاج کا اندازہ کرتے ہیں۔ جب انہیں اطمینان ہو جاتا ہے کہ ہماری آپس میں اچھی گزر سکے گی۔ پھر یہ نہیں دیکھتے کہ دونوں کے مذہب، خاندان، قوم، ذات ایک ہے۔ یا نہیں۔ "سول میرج ایکٹ" کے قانون کی رُو سے ایسی شادیاں کرنے کی آزادی حاصل ہے۔ اس سے فائدہ اُٹھا کر دو چار دوستوں کی موجودگی میں آپس میں شادی کا عہد و پیمان کر لیتے ہیں۔

فلورا تم غدر سے پہلے کی باتیں کرتی ہو سنو بہن غدر کو اسی سال گزر چکے ہیں۔ اسی سال سے دنیا آگے بڑھ آئی ہے۔ اس مدت میں ہماری معاشرت میں بیسیوں انقلاب آچکے ہیں۔ ہزاروں پرانی رسمیں مٹ مٹا گئیں۔ ان کی جگہ نئے نئے طریقے رائج ہو گئے۔ اب تو بہن بیاہ شادی کے معاملے میں

"جس نے کی شرم اُس کے پھوٹے کرم"

اب وہ شرم و حیا جو پہلے وقتوں کی کنواری لڑکیوں کے لئے ضروری سمجھی جاتی تھی۔ بے وقوفی اور جہالت گنی

جاتی ہے۔ چھوڑو اس شرم ورم کو۔ سوسائٹی کے قانون میں رہتے ہوئے جو آزادی ہمیں تمہیں مل رہی ہے۔ اِس سے فائدہ اٹھاؤ۔

دیکھو میری برادری کی ایک بلونٹی فضلو وہی جو ننھو دھنئے کے گھر کے چوہوں کو پریشان کئے ہوئے ہے۔ اس روز جسے ہماری دیوار پر پھلانگتے تم نے بھی دیکھا تھا۔ اس کی ایک بوڑھی دادی ہے۔ اتنی بوڑھی ہو چکی ہے کہ بدنصیب سے چلا پھرا بھی نہیں جاتا۔ فضلو ہی ایک آدھ چوہا پکڑ کے اسے دے آتی ہے۔ اس نے ننھیا بِلّی کے بلونٹے سے پوتی کی بات ٹھیرا دی تھی۔ فضلو کو جو پتہ لگا۔ آپے سے باہر ہو گئی۔ اور چیختی ہوئی دادی کے پاس پہنچی۔

فضلو:۔ کیوں ری بڑھیل! تجھے مجھ سے پوچھے بغیر میری منگنے کرنے کا کس نے حق دیا تھا۔ ننھیا کے بھینگے بلونٹے سے اپنا بیاہ رچایا ہوتا۔ تو کانی وہ بھینگا، اللہ ملائی جوڑی ٹھیک ہوتی ہے۔ میں نے کب تجھے اپنا وکیل بنایا تھا۔ اللہ اللہ!! میں اور ننھیا کا بلونٹا۔ کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگوا تیلی؟ تجھے شرم نہ آئی۔ اپنی کسی چہیتی نواسی کی اس سے منگنی کی ہوتی۔ بہتیری ڈار کی ڈار نواسیوں کی دیواریں پھلانگتی پھرتی ہیں۔ کوئی نامراد کانی۔ کوئی لنگری، کوئی نکٹی، کوئی لنڈوری، لنگوڑی چڑیلوں کی سی فوج ماری ماری پھرتی ہے۔ کوئی نہیں قبولتا۔

(باقی باقی)

(منقول از اخبار پریم) تاجور

محنت

نہ اپنا وقت اسے بچو گنواؤ
تم اس محنت کا پھل پاؤ گے اک دن
جو قیمت وقت کی پہچانتا ہے
جسے محنت کی عادت ہو گئی اچھی
جو وقت اپنا ہیں بیکاری میں کھوتے
سدا جو وقت کا پابند ہوگا
نتیجہ ہے اسی محنت کا راحت
ہوئی ہیں مشکلیں آساں اسی سے

سدا دل اپنا محنت میں لگاؤ
بڑے انسان بن جاؤ گے اک دن
وُہی گُر زندگی کا جانتا ہے
تو اُس کی کامیابی ہے یقینی
وہی نادان اور جاہل ہیں ہوتے
زمانے میں وہی خورسند ہوگا
اسی سے پاتے ہیں عزت مسرت
ہوئے ہیں عیش کے ساماں اسی سے

سنو فرزی کی اِن باتوں کو بچو!
انہیں پہ ہمیشہ تم سب کا عمل ہو!

(منقول از پریم) سلے خوش رشید فرزی جالندھری

بزمِ انتخاب

ہندوستانی کاشتکاروں کا افلاس

ہندوستان کے متعلق سرکاری یا نیم سرکاری تحقیقات کی بنا پر جو اَن گنت رپورٹیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اگر اُن کا سرسری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کی مفلسی کا علاج دراصل بہت ہی دشوار کام تھا۔ مگر چند باہمت انگریزوں نے جن کا اپنا کوئی فائدہ اس مسئلہ سے نہ تھا۔ بڑی تندہی اور محنت سے اس لاعلاج مرض کا ازالہ کرنے کی کوشش کی۔ اس جدوجہد میں انہیں ہندوستانی کسانوں کی فطری ضد، ناشائستگی اور جہالت پر بھی قابو پانے کی کوشش کرنی پڑی۔ مگر آخرکار انہوں نے مقصد کی تکمیل کر ہی لی اور اس کے لئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

لیکن جب سرکاری اعداد و شمار سامنے آتے ہیں۔ تو حقیقت بے نقاب ہو کر رہ جاتی ہے۔ غضب تو یہ ہے کہ سرکاری رپورٹوں کے مصنف مفلسی کے "اصل اسباب" اور اُن کے خطرناک نتائج کو پسِ پشت ڈال کر نہایت خندہ پیشانی سے ایسی ترقیوں اور اصلاحوں کا ذکر کرتے ہیں جو غالباً ان کے ذہن مقدس کے علاوہ اس آب و گِل کی دنیا میں کہیں دیکھنے میں بھی نہیں آتیں۔

سرکاری رپورٹیں زرعی زمین کی ٹکڑی دار تقسیم، مویشیوں کی کمزوری ذرائع آبپاشی کی کمی، علم کے فقدان اور کسان کی غفلت کو بڑی دیدہ دلیری سے ہندوستانی کسان کی مفلسی کا سبب ٹھہراتی ہیں۔ لیکن سرکاری اجارہ داری اور پچیس لاکھ پونڈ کی اس آمدنی کے متعلق جو غریب کسانوں سے وصول کر کے سرکار اپنے خزانوں میں بھر لیتی ہے۔ ایک لفظ نہیں کہتی — اس کے علاوہ زمیندار بھاری رقمیں کسانوں سے لیتے ہیں۔ مہاجن اپنے قرضوں پر خون آشام شرح سود وصول کرتے ہیں۔ برتنے کی چیزوں پر بھاری بھاری ٹیکس حکومت کی طرف سے عائد کئے جاتے ہیں۔ پانی کا محصول اور دوسرے مقامی مطالبے جو براہِ راست گاؤں کی مواشی زندگی پر اثر ڈالتے ہیں۔ اس پر مضاعف ہیں اور سرکاری رپورٹیں ان کا ذکر کرنا بھی گناہ سمجھتی ہیں۔

ہندوستان کی بڑھتی ہوئی مفلسی کا اصلی سبب اس کی محکومی ہے برطانوی راج نے ہندوستان کو ایک زرعی ملک قرار دے کر اپنے لئے خام پیداوار مہیا کرنے کا سستا ذریعہ بنا لیا ہے۔ اسی اصول کے ماتحت یہاں کی صنعتی ترقی کو جس طرح روکا گیا ہے۔ اُس کا اندازہ ۱۸۹۱ء سے ۱۹۲۱ء تک کی مردم شماری کے اعداد سے ہو سکتا ہے صاف معلوم ہوتا ہے کہ زراعت پر بسر کرنے والوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ آخری مردم شماری ۱۹۳۱ء میں ہوئی تھی۔ ۱۸۹۱ء کے مقابلہ میں اس دفعہ کسانوں کی تعداد میں ۵ فیصدی کا اضافہ نظر آتا ہے جنگ عظیم کے زمانے میں باوجود اس کے کہ ہندوستان میں صنعتی کارخانے جابجا قائم ہو رہے تھے۔ مگر گھریلو صنعتوں میں برابر کمی ہوتی چلی جا رہی تھی۔ چنانچہ ۱۹۲۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ بھی اس انحطاط پر پردہ نہ ڈال سکی۔ دس سال پہلے گھریلو صنعتوں پر بسر کرنے والوں کی تعداد ۱۷ر۵ تھی۔ ۱۹۲۱ء میں گھٹ کر یہ تعداد ۱۵ر۷ رہ گئی اور ۱۹۳۱ء میں ۱۵ر۴ نظر آتی ہے۔ جب زراعت پر بسر کرنے والوں کی تعداد میں اس طرح اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے تو کسانوں میں افلاس خود بخود بڑھ جانا چاہیئے تھا۔ ۱۹۱۱ء میں زمینداروں کی تعداد ۲ر۸ ملین تھی۔ ۱۹۳۱ء میں یہ تعداد بڑھ کر ۳ر۲۳ ملین ہو گئی۔ سرکاری مردم شماری کے مطابق کاشتکاروں، اجارہ داروں اور زمین کے مالکوں کی تعداد ۱۹۱۱ء میں ۷ر۱ ملین تھی۔ لیکن ۱۹۳۱ء میں گھٹ کر ۲ر۶۱ ملین رہ گئی جبکہ دوسری طرف ایسے کسانوں کی تعداد میں جن کے پاس کوئی زمین نہ تھی تقریباً دس ملین کا اضافہ ہوا۔

ان حقائق کے بعد بھی انگریز مصنفوں کا دعویٰ یہ ہے۔ کہ ہندوستان کی آبادی اسقدر زیادہ بڑھی ہے کہ معاشی ذرائع اسکی کفالت کرنے سے مجبور ہیں۔ ظاہر ہے اس بیان میں حقیقت کا شائبہ تک نہیں۔ سفید جھوٹ بول کر اس کو نبھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ورنہ صرف سرکاری مردم شماری یہ بتلا رہی ہے کہ پچھلے پچاس برسوں میں ہندوستان کی آبادی کے بڑھنے کا تناسب ۱۰ فیصدی سے زائد رہا ہے جو انگلستان اور ویلس کے اضافہ آبادی کی نسبت سے کم ہے۔

۱۹۰۱ء اور ۱۹۲۱ء میں علی الترتیب اضافہ کا تناسب نصف اور چوتھائی کے اعتبار سے گھٹا ہے۔ اس قسم کی تخفیف کی مثال ہندستان کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔

واقعہ یہ ہے کہ لوبھی زمینداروں کی لوٹ مار کے بعد جو کچھ زمین کاشتکاروں کو ملتی ہے اُس سے وہ اپنی روزی نہیں حاصل کر سکتے۔ ہندوستان میں زرعی زمینوں کا اندازہ کل رقبہ کے تیسرے حصہ سے کچھ زائد ہے جو ہندوستان کے وسیع رقبہ کے اعتبار سے کم ہے۔ لیکن اس میں سے ¼ سمراجیوں کے قبضہ میں ہے اور باقی تیسرے حصہ پر ۱۰ کروڑ کسانوں کی زندگی لبسر ہوتی ہے۔ زرعی رپورٹ کا اعتراض یہ ہے کہ کل رقبہ کا مزید چوتھائی حصہ "قابلِ کاشت ہے، مگر اس پر کاشت نہیں کی جاتی"۔ لیکن زرعی زمین میں جتنے رقبہ کا اضافہ ہوا ہے اس سے کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ اور مندرجہ ذیل اعداد و شمار بتلاتے ہیں کہ پچھلے دس برسوں میں حالات میں کوئی تبدیلی بھی نہیں ہوئی۔

زرعی پیمائش

(ایکڑ ملین میں)

	۱۹۲۲ء - ۱۹۲۳ء	۱۹۳۲ء - ۱۹۳۳ء
کل رقبہ	۶۶۷	۶۶۷
ناقابلِ کاشت زمین	۱۵۲	۱۴۵
جنگلات	۸۵٫۵	۸۸٫۴
بنجر زمین	۱۵۴	۱۵۴
قابلِ زراعت زمین		
جس پر کاشت نہیں ہوتی	۲۲۴٫۹	۲۲۸
بارانی رقبہ	۴۷٫۸	۴۹٫۶

مندرجہ بالا اعداد زراعت میں جمود دکھلا رہے ہیں ۱۹۳۱-۳۲ء کے اعداد و شمار سے حالت بالکل تنزل پذیر نظر آتی ہے۔ اگر ۱۹۳۱-۳۲ء کا اگلے برس سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ کل رقبہ کا ۴۴ فیصدی حصہ جوتا بویا گیا۔ مگر دوسرے سال اس زمین کے رقبہ میں جس پر غلوں کی فصل بوئی گئی تھی۔ تین لاکھ ایکڑ زمین کی کمی نظر آتی ہے۔ یہی حال چاول کی پیداوار کے اعداد و شمار کا بھی ہے۔ پچھلے سال نہ صرف رقبہ میں کمی ہوئی بلکہ ۱۹۲۲-۲۳ء کے مقابلہ میں فی ایکڑ پیداوار بھی گھٹی ہوئی نظر آتی ہے۔ اسی طرح گیہوں کی پیداوار میں بھی فی ایکڑ کمی ہوئی ہے۔ دوسری طرف جنگلات کا حال یہ ہے کہ ۸۸ ملین ایکڑ میں سے نصف تو حکومت کے قبضہ میں ہیں اور باقی نصف زمینداروں اور مالدار کسانوں کے۔ معمولی کسانوں کو نہ صرف لکڑی کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے بلکہ اُس گھاس پر مویشی چرانے کے پیسے بھی دینے پڑتے ہیں جو جنگلات میں ادھر ادھر اُگ آتی ہے۔

مزروعہ اور بنجر زمینوں کا کل رقبہ ۲۷۸ ملین ایکڑ ہے۔ اگر اس زمین کو کسانوں اور زمینداروں کے درمیان مساوی طور پر بانٹا جائے تو ہر ایک کے حصہ میں ½۲ ایکڑ سے کچھ زائد زمین آتی ہے۔ لیکن اس وقت زمیندار پچاس ایکڑ تک زمین پر قابض ہیں۔ ۱۹۲۸ء کی شاہی زرعی کمیشن کا بیان ہے:۔

"پنجاب کے اعداد و شمار دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۲٫۵ فی صدی کسان ایسے ہیں جو ایک ایکڑ یا اس سے کم زمین کے مالک ہیں۔ ۱۵٫۴ فیصدی ایک اور ½۲ ایکڑ کے درمیان، ۱۷٫۹ فی صدی ½۲ اور ۵ ایکڑ، ۲۰٫۵ فیصدی ۵ اور ۱۰ ایکڑ کے درمیان زمین پر کاشت کرتے ہیں۔ بمبئی کو جہاں کی حالت پنجاب سے کچھ ملتی جلتی ہے اور برما کو جہاں تناسب زیادہ بلند ہے چھوڑ کر باقی تمام صوبوں میں بہت چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاشت کے لئے ہیں۔"

زرعی پیداوار کی قیمتوں کی کمی اور ضروریات کی دوسری اشیاء کی قیمتوں کا جمود کسان کی حالت کو بد سے بدتر کرتا چلا جا رہا ہے۔ اور حکومت کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ البتہ جب کبھی کسانوں کو پنپتا دیکھتی ہے تو فوراً لگان کی مقدار میں اضافہ کر کے غریب کسانوں کو ان خونخوار مہاجنوں کے رحم پر زندگی لبسر کرنے کے لئے مجبور کر دیتی ہے جن کی اس شائستہ مردم خوری میں وہ بھی برابر کی حصہ دار ہوتی ہے۔ ۱۹۲۸ء کی زرعی کمیشن کا بیان ہے۔

"واقعہ یہ ہے کہ کوئی کسان کسی نفع یا بدلے کی خاطر زمین نہیں جوتتا۔ بلکہ جو کچھ کرتا ہے۔ اپنا پیٹ پالنے کے لئے کرتا ہے۔ زراعت پر لبسر کرنے والوں کی بڑھتی ہوئی تعداد، روزی حاصل کرنے کے مختلف النوع وسائل کی کمی مصیبت کی زندگی سے چھٹکارا نہ پا سکنا اور کم عمری میں ایک آدمی پر پورے خاندان کی پرورش کا بوجھ پڑ جانا۔ غریب کسانوں کو مجبور کرتا ہے کہ جہاں اور جن داموں پر بھی ملے وہ اپنی روزی کا سہارا ڈھونڈھے۔ جب اس کی زمین قرضے کے بدلے ظالم مہاجن کے قبضے میں چلی جاتی ہے تو کوئی آئین اس

کے درد کا مداوا نہیں کر سکتا - ملکیت کا کوئی قانون اُس کی حفاظت کے لئے تیار نہیں ہوتا - بہرصورت پیٹ پالنے کے لئے اُسے زمین کی ضرورت پڑتی ہے اور یہ ضرورت اُسے اُس حریص مہاجن کا دروازہ جھنکاتی ہے - جس سے وقت پڑنے پر پہلے ہی وہ اپنی کل ملکیت کی مجموعی قیمت سے بھی زیادہ رقم قرض لے چکا تھا - یہ مہاجن دوسری جاتی کا آدمی ہوتا ہے - کرایہ خوری اُس کا پیشہ ہے - زمینداری سے اس کا کوئی تاریخی تعلق نہیں ملتا - وہ زمین پر قبضہ پاتے ہی اُسے تباہ کر دیتا ہے -"

۱۹۳۵ء میں ایک طرف زرعی پیداوار کی قیمتوں کی کمی اور دوسری طرف لگان کی شرح میں تین پونڈ فی لاکھ کی زیادتی نے حالات اور بھی قابو سے باہر کر دیئے ہیں - خوش حال کسانوں نے اپنے سونے چاندی کے زیورات فروخت کر کے اپنا بھرم نبھانے کی خاطر تقریباً بیس کروڑ روپیہ حاصل کر لیا مگر معمولی کسان اِن حالات کا مقابلہ نہیں کر سکتا - اُس میں سود کی موٹی موٹی رقمیں ادا کرنے کی طاقت نہیں رہی زمینیں تو اُن پر موٹے بنیوں اور سود خوار مہاجنوں کا قبضہ ہوتا چلا جا رہا ہے -

مہاجنی لین دین کو سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل بیان سے بہت مدد ملتی ہے :-

"سود پر روپیہ چلانے والوں کا سب سے اہم طبقہ گاؤں کے دکاندار ہیں - یہ لوگ عام طور سے بنیے، بزاز، دلال اور غلہ فروش ہوتے ہیں - اپنے گاؤں کے کسانوں کو ضروریات کی چیزیں اور نقد روپیہ اُدھار دیتے ہیں - سود اور اصل زر کے بدلے غلہ وغیرہ قبول کر لیتے ہیں، جو کچھ کسان کو دیتے ہیں چالاکی سے اُس کی قیمت بہت زیادہ لگاتے ہیں اور بدلے میں جو کچھ اُن سے لیتے ہیں اُس کو بہت ہی گرے ہوئے داموں سے لیتے ہیں - سورت کے ایک تعلقہ دار کا بیان ہے -" اگر ایک من غلہ ادھار لیا جاتا ہے تو ۱½ من واپس کرنا پڑتا ہے - بیج ایک من کے بدلے دو من وصول کئے جاتے ہیں - تمباکو اور دوسری چیزوں کی قیمت بازار کے بھاؤ سے ۱۲ فیصدی زائد لگائی جاتی ہے - مثلاً جو تمباکو عہ رکا ہے بہی میں اُس کے دام ۲ھ لکھے جاتے ہیں -"

غرض کسانوں کی بیشتر تعداد زندگی بھر مہاجنوں اور بنیوں کی غلامی بنی رہتی ہے - حکومت ان موٹی آسامیوں کو دل کھول کر داد سخن دیتی ہے - جو چند ایک قانون کسانوں کی حفاظت کے لئے بن گئے ہیں - سرکاری اشاعتوں میں اُنہیں غیر مفید اور غیر موثر ثابت کر کے خوب قہقہے لگائے جاتے ہیں -

ہندوستانی اور برطانوی سرمایہ داروں کی نظروں میں بھی کسانوں کی یہ بدحالی کچھ اچھی بات نہیں ہے - ننگا بھوکا آدمی معقول خریدار نہیں ہو سکتا - اسی حقیقت نے ہندوستانی سرمایہ داروں کو اپنے بازار کی حالت پر توجہ کرنے پر مجبور کر دیا ہے ۳۴-۱۹۳۳ء کی سالانہ رپورٹ میں جو متحدہ برطانیہ کی طرف سے شائع ہوئی ہے - ہندوستان کی درآمد کی کمی کے اسباب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے :-

"ہندوستانیوں کی قوت خرید خواہ وہ شہری ہوں یا دیہاتی دن بدن گھٹتی چلی جا رہی ہے - یہ لوگ صرف بہت ہی موٹی ضروریات کی چیزیں خریدتے ہیں -"

بمبئی کی انجمن مالکان مِل کی ۱۹۳۳ء کی رپورٹ کا بیان ہے - "کپڑے اور سوت کی تجارت پر جس چیز نے اثر ڈالا ہے وہ لوگوں کی قوت خرید کی کمی ہے - فصلوں کی تباہی اور اُس پر اجناس کی قیمت گر جانے سے لوگ سخت مصیبت میں مبتلا ہیں -"

۲۸ / اگست ۱۹۳۳ء کے اخبار لبرٹی نے لکھا تھا کہ "وقت آنے والا ہے جب زمیندار کسانوں سے اُن کی ساری پیداوار لے لیا کریں گے - اور مفلس کسانوں کے پاس محاصل ادا کرنے اور فیکٹریوں کا سامان خریدنے کے لئے دمڑی تک نہ رہے گی - آگے چل کر کہتا ہے -" بنگال میں یہ صورت حال دیکھنے میں آ رہی ہے - اگر ایک بنگالی کسان کچھ خریدنا چاہتا ہے تو وہ زمیندار سے روپیہ مانگ کر خریدتا ہے - خود اُس کے پاس دھیلا نہیں ہوتا - صاف ظاہر ہے کہ بنگال معاشی پستی کے کنارے کھڑا ہوا ہے -"

ستمبر ۱۹۳۳ء میں پنڈت جواہر لال نہرو نے یونائیٹڈ پریس کے ایک نمائندے سے گفتگو کے دوران میں کہا تھا - "زمینداری نظام بہت پست ہو چکا ہے اور لوگوں میں سماج کی دوبارہ تنظیم کا احساس پیدا ہو چلا ہے -"

لیکن دیکھنا یہ ہے کہ پنڈت جی اور کانگریس کے دوسرے لوگ نیا سماجی نظام مرتب کرنے کے لئے کیا کر رہے ہیں ؟ کیا کانگریس کی دیہی صنعتوں کو ترقی دینے کی تدبیر سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ یہ نیا سماجی نظام قائم ہو جائے گا - اور وہ لوگ بغیر کسی کو نقصان

پہنچائے اپنی تحریک کو اُبھرنے میں مدد دے سکیں گے ؟

۱۹۳۰-۳۱ء کی ٹیکس نہ ادا کرنے کی تحریکیں بتاتی ہیں کہ ہندوستانیوں میں انقلابی خیالات نہایت سرعت کے ساتھ پھیل رہے ہیں اور لوگ سرمایہ داروں اور سامراجیوں سے بدظن ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ برطانیہ بہت ہشیار ہے وہ جانتی ہے کہ کہاں سختی کرنی چاہیئے - اور کہاں نرمی - لیکن کیا انگریز ہندوستانی بہادر بھی ایسے ہی چالاک ہو سکتے ہیں ؟ خیر وہ چالاک ہوں یا نہ ہوں - واقعہ یہ ہے کہ ۶۰ ملین کسانوں کو ان کے حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا - جو لوگ سرکاری رپورٹوں کے دل خوش کرنے والے بیانات پڑھنے کے بعد ہندوستان کی اصلی حالت کا مطالعہ کرتے ہیں - وہ حکومتِ ہند کو ایک دوسرے کی حالت سے بیخبر رکھنا چاہتے ہیں - مگر اس کے لئے وقت درکار ہے - زمینداری نظام کی سخت گیری اور کسانوں کی مسلسل غلامی اس ڈھونگ کا بھانڈا بہت جلد پھوڑ دیگی اور جب شہری کاریگروں اور دیہاتی کسانوں کو یقین ہو جائے گا کہ اب ان غلامی کی بیڑیوں کو اُتار پھینکنے کا وقت آگیا ہے تو وہ اُٹھیں گے اور اپنے جیون کا سوانگت کریں گے -

(جامعہ دہلی)

شہزادی بدر النساء

سولہویں صدی - پٹھانوں کی حکومت - رہتاس گڑھ کا قلعہ - وقت سہ پہر - شہزادی بدر النساء دلنواز باغ میں بیٹھی ہے - درختوں کے سرے ڈوبتے ہوئے آفتاب کی کرنوں سے جھلملا رہے ہیں - شاخوں پر بلبلیں چہک رہی ہیں - فواروں کے قطروں پر آفتاب کی کرنیں پڑ رہی ہیں - اور قوس و قزح کا سماں پیدا کر رہی ہیں - پھولوں کے چاروں طرف بھنورے منڈلا رہے ہیں - شہزادی کے ہاتھ میں رباب ہے - بجا بجا کر ترنم سے گا رہی ہے ؎

مطربِ خوش نوا بگو تازہ بہ تازہ نو بہ نو

اُس کا پیارا شہزادہ وفادار شیرا پاؤں کے پاس بیٹھا پنجوں سے تال دے رہا ہے اور شہزادی کی زرنگار سُرخ جوتیوں کو رہ رہ کر چاٹ رہا ہے -

یک بیک ایک مرد کی صورت دکھائی دی - گورا رنگ - گٹھا بدن - ٹیڑھی اور چڑھی ہوئی خوبصورت داڑھی - بیش قیمت پوشاک - کمر میں تلوار - یہ بادشاہ کا سپہ سالار اور اُن کا دست راست نوشیر خاں ہیں - بدر النساء نے چونک کر کہا - کون - نوشیر خاں ؟ تم یہاں کیسے آئے ؟ سپہ سالار نے جواب دیا - نازنین ! آج میں بہت نیست کرنے آیا ہوں - تم نے مجھے بہت دنوں تک انتظار میں رکھا آج زبان کھول کر صاف صاف کہو کہ تم میرے ساتھ شادی کرو گی کہ نہیں ؟

بدر النساء نے بھنویں تان کر کہا - بے وقوف ہوش میں آ جا نہیں کہ تو غلام تھا - آج بادشاہ کی مہربانیوں سے سپہ سالار ہوا ...... بس خبردار کچھ اور نہ بولنا - نگاہیں اوپر نہ اُٹھنے پائیں نوشیر خاں غصہ سے آگ بگولا ہو گیا - گرج کر بولا - شہزادی ! تمہارے باپ کو تخت پر کس نے بٹھایا ؟ مغلوں کے حملوں کو بار بار کس نے روکا ؟ کس کی مہربانی سے تمہیں یہ عیش و عشرت - یہ ہیرے جواہرات، یہ شان و امارت نصیب ہوئے ؟ یاد رکھو - ایک انگلی کے اشارے میں ان سب کو جلا کر خاک کر سکتا ہوں - سلطنت کا اصلی مالک کون ہے ؟ تمہارا کاہل باپ یا بہادر رستمِ ہند نوشیر خاں فتح جنگ ؟

بدر النساء نے کہا - کتا کبھی شیر نہیں ہو سکتا -

سپہ سالار نے کہا - آج اگر یہ بات کسی اور کی زبان سے نکلی ہوتی تو اس وقت اس کی لاش تڑپتی ہوتی - لیکن آہ تم نے تو میرے دل کو گرفتار کر لیا ہے - تمہیں معاف کرتا ہوں - اب بھی بولو کیا تمہیں میرے دل کی ملکہ بننا منظور نہیں ؟

بدر النساء :- نوشیر خاں ! کتا بار بار بھونکتا ہے - لیکن شیرنی ایک ہی بار گرجتی ہے -

اب نوشیر خاں کے لئے ضبط کا یارا نہ رہا - اُس نے بگڑ کر یہ کہتے ہوئے کہ بس اب خدا کے نام پر مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ - تلوار میان سے نکال لی -

شہزادی نے کوئی جنبش نہ کی صرف آہستہ سے یہ کہا نوشیر خاں کیا تم نے مجھے بزدل ہی سمجھ رکھا ہے ؟ ظالم نے یہ سنتے ہی تلوار کھینچی گویا کہ آسمان پر بجلی چمک اٹھی ...... لیکن معاً چشم زدن میں بہادر فتح جنگ کی لاش زمین پر لوٹ رہی تھی - اس کے بعد نزع کی گھڑگھڑاہٹ -

شام کی تاریکی بڑھ رہی ہے - تارے ایک ایک کر کے نکل رہے ہیں شہزادی اس وقت بھی گا رہی تھی ؎

مطربِ خوش نوا بگو ؛ تازہ بہ تازہ نو بہ نو

اس کا پالتو شیرا اپنی غذا ختم کر کے زبان چاٹ رہا تھا - اس کی بائیں طرف نوشیر خاں کی پگڑی - داہنی طرف تلوار اور سامنے کچھ ہڈیاں پڑی تھیں - ندیم گیا

"شاہکار" لاہور

ایڈیٹر:- پروفیسر تاجور نجیب آبادی

ادارہ:- خواجہ محمود جاوید ایم۔اے
گوپال مِتّل بی۔اے

چندہ:-
سالانہ:- چھ روپے ششماہی تین روپے آٹھ آنے۔ نمونہ آٹھ آنے

جلد (۷) — فہرست مضامین بابت ماہ جولائی سنہ ۱۹۳۸ء — نمبر (۴)

تصاویر:- (۱) سہ رنگی بہار جاپان۔ یک رنگی (۲) بزمِ معصومیت (۳) سفری یونیورسٹی (۴) سفری یونیورسٹی میں پروفیسر لیکچر دے رہا ہے۔

۱ مختصرات ... تاجور ۲۰۵
۲ پنجاب کی اخباری برادری ..... تاجور ۲۱۳
۳ تصحیح .... تاجور ۲۱۵
۴ سرسید کی شخصیت اُن کی تصانیف میں — جناب زین العابدین بی۔اے رعلیگ ۲۲۵
۵ اقبال اور ٹیگور ..... جناب اختر اورینوی ۲۴۸
۶ مختار .... اس ماہ کا بہترین مضمون ۲۵۵
۷ افکار تازہ ... ادارہ ۲۶۰
۸ آثار قدیمہ کشمیر کے دلچسپ حالات ۲۶۳
۹ اخبار علمیہ و تعلیمیہ ..... ادارہ ۲۶۱
۱۰ نغمہ سرمدی .... امیر سلطان عزیز نجیب آباد ۲۶۷
۱۱ بزمِ انتخاب ..... تازہ ترین اخبارات و رسائل سے اہم اور متنوع اقتباسات ۲۶۸
۱۲ صفوۃ اطفال ...... ماخوذ از "بریم" لاہور ۲۵۱

حصہ نظم

۱۳ عشق اور مجبوری کے دوراہے پر ایک حادثہ — حضرت احسان دانش ۲۲۸
۱۴ غزل .... مسٹر گوپال مِتّل بی۔اے مدیر معاون ۲۱۶
۱۵ حُسن و عشق ..... آغا صادق حسین صاحب صادق ۲۲۰
۱۶ آزادی ...... جناب اثر چکوالی ۲۲۴
۱۷ مشورہ ...... جناب شاد عارفی ۲۵۰
۱۸ غزل ...... جناب شبیر حسین صاحب ۲۵۹
۱۹ زندگی اور آرزو ..... آغا صادق حسین صاحب صادق ۲۴۷

افسانے

۲۰ موت .... جناب ابو محمد امام الدین صاحب مدیر ترجمان بنارس ۲۲۱
۲۱ تبتی حسینہ ..... جناب سریندر موہن صاحب ایم۔اے ۲۱۷
۲۲ سندری ..... حافظ عبدالوکیل صاحب حزبیزی ۲۴۴
۲۳ سوتیلے بھائی ...... جناب گُل سعید صاحب ۲۴۰
۲۴ میرا تجربہ ...... ایوب شاہد رامنگری ۲۶۵

ایم ہادی حسن احقر پرنٹر و پبلشر نے آزاد ہند پریس ہسپتال روڈ لاہور میں چھپا کر دفتر شاہکار لاہور سے شائع کیا

مختصرات

سر سکندر اور پنجاب کے اخبارات

پنجاب کا ہندو نیشنلسٹ پریس اپنی بے اصولیوں، غیر ذمہ داریوں اور فتنہ آرائیوں کے سبب بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکا ہے۔

بات کا بتنگڑ اور رائی کا پہاڑ بنانے میں یہاں کے ہر اخبار نویس کو ید طولیٰ حاصل ہے۔ جائز نکتہ چینی جو ایک اخبار کا فرض ہے اُس سے پنجاب کے اردو اخبارات کو کوئی واسطہ نہیں۔ اس میں زید و بکر کا امتیاز نہیں، بلکہ "ایں خانہ تمام آفتاب است"

یہ اخبارات اپنے متضاد فریقانہ سیاسی خیالات کو آسمانی الہام کے انداز میں پیش کرتے ہیں۔ پھر اس اصرار کے ساتھ کہ ہر شخص بے چون و چرا ان پر ایمان لائے۔ ورنہ اُسے زندگی کے حق سے محروم کر دیا جائے گا۔

یہ اخبارات کل تک تو اپنے ذوق فتنہ آرائی کی تسکین کے لئے یہ شور مچاتے رہے کہ انگریز کی حکومت بیرونی حکومت ہے۔ اسے ہمارے جذبات، ضروریات اور مطالبات سے کوئی ہمدردی نہیں۔ یہاں انگلستان کے مفاد کے لئے انگریز حکومت کر رہا ہے، لیکن آج کہ پنجاب پر صحیح معنی میں ایک جمہوری حکومت کی باگ ڈور ایک جمہوریت پسند پنجابی کے ہاتھ میں ہے۔ جس کے بدترین مخالف بھی اس کی ذاتی شرافت، رواداری، سیر چشمی کا بارہا اعتراف کر چکے ہیں۔ آج بھی پنجاب کے اکثر اخبارات اسی شر انگیزی، ہنگامہ آفرینی اور فتنہ آرائی میں منہمک ہیں جس کے سبب کل کی تاریخ صحافت شرمناک صحافت کا مرقع بن چکی ہے۔ آج سر سکندر کی حکومت کے خلاف جو طوفان فسق و فجور برپا ہو رہا ہے۔ کل کی برطانوی حکومت کے خلاف سرگرمیاں اس کے سامنے سرد پڑ جاتی ہیں۔

پنجاب پر ایک جمہوری حکومت کا خیر مقدم اور اس کی حمایت و تائید کرنے کی بجائے جس انہماک، تسلسل اور یلغار کے ساتھ اُس کی مخالفت کی جا رہی ہے۔ اسے بلیک میلنگ اور تخویف مجرمانہ کے سوا کوئی موزوں نام نہیں دیا جا سکتا۔

کوئی ذلیل سے ذلیل بہتان نہیں جو اتحاد پارٹی اور کابینۂ وزارت پر نہ باندھا جا رہا ہو۔ اخبارات کے دفتروں میں غلط اور شر انگیز خبریں گھڑی جاتی ہیں اور اُنہیں چار کالمی سرخیوں اور جدولوں میں جلی حروف میں شائع کیا جاتا ہے۔ کانگریس سے اختلاف رائے کا نام ملکی غداری پڑ گیا ہے۔ حکومت کے مفروضہ مظالم کی داستانوں کی نشر و اشاعت میں غیر انسانی طریقے برتے جا رہے ہیں۔ اتحاد پارٹی میں پھوٹ پڑ جانے کی ذلیل آرزوئیں پہلے پریشان خوابوں کی صورت اختیار کرتی ہیں پھر بہ یک جنبش قلم انہیں واقعات کا رنگ دے کر اخبارات کی "سنسنی خیز" خبروں میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔

فرقہ دار، فرقہ دارانہ اور فرقہ داری کے الفاظ ان اخبارات کی دل پسند گالیاں ہیں۔ جو حکومت کے وزراء اور اتحاد پارٹی کے ممبروں کے لئے خاص کر دی گئی ہیں۔ حالانکہ فریقانہ جنگ کے شعلے انہیں اخباروں کے آتشکدوں سے بلند ہو ہو کر صوبے کی فضا کو آتشیں بنا رہے ہیں۔

سر سکندر کی حد سے بڑھی ہوئی رواداری اور حدِ افراط تک پہنچی ہوئی سیر چشمی کو کمزوری پر محمول کر کے پنجاب کے کانگریسی اخباروں نے جو درحقیقت ساورکری ذہنیت کے ہندو سبھائی ہیں۔ اتحادی حکومت کے خلاف ایک طوفان بے تمیزی برپا کر رکھا ہے۔ اِن حالات سے مجبور ہو کر حکومت نے صوبے کے اخبارات کے لئے ایک نیا قانون جو مروجہ قانون سے ذرا سخت ہے پنجاب اسمبلی میں پیش کیا ہے۔ اس قانون میں اس کے سوا کوئی نقص نہیں کہ یہ ایک سال کی تاخیر سے پیش ہو رہا ہے۔ اس کے لئے موزوں وقت ۱۹۳۷ء تھا۔ اگر اپنے موزوں وقت میں یہ قانون نافذ ہو سکتا تو حکومت کو حکمرانی کے فرائض کی ادائگی میں موجودہ مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ نہ صوبے کی فضا فریقانہ ہنگاموں سے دوچار ہوتی۔

آج کے اخبارات کی اطلاع سے معلوم ہوتا ہے کہ سر سکندر اخبار نویسوں کے وفد سے ملاقات کے بعد پھر رواداری پر اُتر آئے ہیں۔ اور اُنھوں نے چندماہ کے لئے اس ضروری قانون کے نفاذ کو ملتوی کر دیا ہے۔ وزیر اعظم کی یہ رواداری ہرگز مثمر نہ ہوگی۔ چند روز زم

لہجہ اختیار کر کے یہ اخبارات اپنی روائتی فتنہ سازی کو پھر تازہ کرلیں گے۔ اور اس عارضی نرم گفتاری کی تلافی بہت جلد فحش نوائی اور معاندانہ سرگرمیوں سے کرنا شروع کردیں گے۔ ہماری رائے میں وزیر اعظم کے فطری رجحان رواداری نے عافیت اندیشی کے راستے سے انہیں ہٹادیا ہے۔ ایک بار تجربہ فرض۔ دوسری بار رواداری۔ اور بار بار ایک ہی تجربہ عاقبت نااندیشی بن جاتا ہے۔ اس صوبے کے ورنیکولر اخبارات کسی درگزر شمہ بھر رحم۔ اور ذراسی رواداری کے بھی مستحق نہیں۔ سر سکندر کو آئندہ چند ہفتے کے بعد محسوس ہوجائے گا کہ اُنہوں نے جدید قانون اخبارات کو معرضِ التوا میں ڈال کر صوبے کے امن پسندوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔

پنجاب کی اتحاد پارٹی اور مسلم لیگ

کانگریس پریس میں، ایک شور برپا ہے کہ پنجاب پر اب مسلم لیگ کی حکومت ہورہی ہے۔ کیوں کہ سر سکندر اور اتحاد پارٹی کے مسلم ممبران کی اکثریت نے مسلم لیگ کی ممبری قبول کر لی ہے۔

صورت واقعہ یہ ہے کہ اتحاد پارٹی مختلف سیاسی سبھاؤں، انجمنوں اور پارٹیوں سے تعلق رکھنے والے ممبروں کا مجموعہ ہے۔ سر سندر سنگھ اور اُن کے ساتھی اپنی خالصہ پارٹی کے ٹکٹ سے کامیاب ہوئے۔ راجہ نریندر ناتھ اور اُن کے رفیقان ہمنوا "ہندو الیکشن بورڈ" کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے۔ مسٹر سنگھا ہندوستانی عیسائیوں کی ایسوسی ایشن کی حمایت حاصل کرکے انتخاب میں کامیاب ہوئے۔ کچھ ممبر پنجاب سناتن دھرم پرتی ندی سبھا کی جدوجہد سے۔ اچھوت ممبر اپنی سیاسی سبھا کی امداد سے آئے۔ اسی طرح مسلمانوں میں بھی مختلف سیاسی پارٹیاں ہیں۔ ان میں کوئی اتحاد ملت کا نمائندہ بنا، کوئی مجلس احرار کا۔ کوئی مسلم لیگ کے ٹکٹ سے کامیاب ہوا۔ بہت سے مسلم اور کچھ غیر مسلم ممبر یونینسٹ پارٹی کی حمایت سے منتخب ہوئے۔

یونینسٹ پارٹی کے ممبروں کی اکثریت نے اقلیتوں کے نمائندوں سے افہام وتفہیم کرکے ایک وسیع تر مشترکہ پارٹی بنالی۔ یہی پارٹی پنجاب اسمبلی میں خالص اکثریت کی مالک بنی اور قدرتاً عنانِ حکومت اسی کے حصے میں آئی۔ دنیا بھر کی قانون ساز مجالس میں اسی نوعیت سے ملک کی مختلف سیاسی پارٹیوں کے نمائندے منتخب ہوتے ہیں۔ پھر ان میں جس پارٹی کا پروگرام دوسری پارٹیوں سے قریب تر ہوتا ہے وہ ان پارٹیوں سے باہمی افہام وتفہیم کے بعد ایک بڑی پارٹی بناکر اپنی اکثریت پیدا کرلیتے ہیں۔ اور یہ اکثریت کوئی متحدہ پروگرام تجویز کرکے حکومت کے فرائض سنبھال لیا کرتی ہے۔

جن پارٹیوں کی مشترکہ جماعت کو اکثریت حاصل نہیں ہوتی وہ حکومت کی حریف بن جاتی ہے۔ یہی حال یہاں کا ہے کہ مختلف جماعتوں کے ممبر مختلف راستوں سے آتے ہیں اور ایک وسیع شاہراہ بناکر اپنی ایک طاقتور جماعت بنا لیتے ہیں۔ اس اشتراکِ عمل کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ

(۱) حکومتی جماعت صحیح معنی میں ایک جمہوری جماعت بن جاتی ہے اور

(۲) جماعتوں کے افہام وتفہیم کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ انتہا پسند، قدامت پسند، بے پسند اور وہ پسند متحدہ اشتراکِ عمل کے لئے اپنے سیاسی پروگرام میں ترمیم وتبدیلی کرکے پروگرام کو دوسری حلیف پارٹیوں کے لئے قابلِ قبول بنا لیتے ہیں۔ اور اس مشترک جماعت میں رنگ اعتدال پیدا ہوجاتا ہے۔

(۳) حریف حکومت پارٹی حکومت کے کاموں پر حدودِ جواز میں رہتے ہوئے نکتہ چینی کا فرض اپنے ذمے لے لیتی ہے۔ اور موقعہ بہ موقعہ حکومت کو ٹوکتی رہتی ہے۔ اس نگرانی کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ حکومت راہ اعتدال سے تجاوز نہیں کرتی اور اس طرح مجلس قانون ساز کی دونوں بڑی بڑی پارٹیاں اپنے اپنے رنگ میں اپنے حلقہائے انتخاب کی قابلِ قدر خدمات انجام دیتی رہتی ہیں۔

صوبوں کو آزادی ملنے کے بعد پنجاب میں بھی یہی ہوا کہ یونینسٹ پارٹی کے ساتھ دوسری پارٹیوں نے سمجھوتہ کیا اور اس طرح یہ پارٹی اکثریت کی مالک بنی۔ اس پارٹی میں پنجاب کے ہر فرقے اور ہر قوم کے نمائندے شامل ہوگئے۔ اس لئے اسے صحیح معنی میں ہم صوبے کی سب سے بڑی جمہوری جماعت کہہ سکتے ہیں۔

سر سکندر مسلم لیگ کے ممبر بن جائیں یا کانگریس کے کریڈ پر دستخط کردیں، بہرحال پنجاب اسمبلی کی اکثریت حاصل کرنے والی جماعت میں شامل ہیں اور یونینسٹ پارٹی نے جن شرائط واصول پر دوسری سیاسی پارٹیوں سے معاہدہ کیا ہے اس کے پابند ہیں اور جب تک پابند ہیں جبھی تک دوسری پارٹیاں ان سے تعاون بھی کریں گی۔

لہٰذا ہندو سبھائی پریس کا شور وغوغا بے وقت کی شہنائی کی طرح اُس وقت تک بے اثر اور غیر مسموع رہے گا۔ جب تک وہ اپنی حلیف جماعتوں کے مجوزہ متحدہ پروگرام پر کاربند ہیں۔ البتہ جس دن وہ اس مشترکہ معاہدے کو توڑ کر اپنی پارٹی کا کوئی الگ دستور العمل بنائیں گے

اس دن دوسری حلیف جماعتیں اُن سے ٹوٹ جائیں گی۔ چاہے پنجاب کا تمام پریس متفقہ طور پر ان کی حمایت کرنے لگے۔ یہ حمایت ان کی قلیت کو اکثریت میں تبدیل نہیں کر سکے گی۔ اس حقیقت سے کانگریسی اور ہندو سبھائی پریس اچھی طرح واقف ہے۔ لیکن اپنی فتنہ پرورانہ روایات کو تازہ رکھنے کا خبط اُس کے سر پر قابلِ رحم حد تک سوار ہے۔ دیانت و اصول صحافت کے شریفانہ اصول کو نظر انداز کر کے جا و بیجا سکندر گورنمنٹ کو بدنام کر رہا ہے۔ دوسری تعاونی پارٹیوں کو غیرت دلا دلا کر اس پر اکسا رہا ہے کہ وہ یونینسٹ پارٹی سے الگ ہو جائیں اور اس طرح اس کی اکثریت اقلیت کی صورت اختیار کر لے اور انجام کار اس کے وہ خوابہائے پریشاں جو دماغ کی جانب انجرات کے صعود سے نظر آتے ہیں شرمندۂ تعبیر ہوں۔

کوئی ان بے اصولوں سے پوچھنے والا نہیں کہ خدا کے بندو ایک سال پہلے تک تو سر سکندر اور ان کی پارٹی مسلم لیگ میں شامل نہ تھی۔ اس وقت تم نے سر سکندر اور ان کی پارٹی کو بدنام کرنے میں کون سی کمی روا رکھی تھی۔ جیسے اب پیدا کر رہے ہو۔ اس وقت بھی تمہارے فحش نگار قلم نے ان کے خلاف سب و شتم اور معاندت و مخالفت کا طوفان برپا کر رکھا تھا۔ آج تمہیں مسلم لیگ کی ممبری قبول کرنے کا بہانہ اظہار معاندت کے لئے ہاتھ آ گیا کل تک انہیں تم ٹوڈی پارٹی، سرکار کے کاسہ لیس اور ساہوکاروں کے قاتل کا خطاب دے رہے تھے۔ تمہیں سر سکندر تو کیا آسمان کے فرشتے اور ہمالیہ کے دیوتا بھی خوش نہیں رکھ سکتے۔

اصل بات یہ ہے کہ اپنے دل کا چور ظاہر کرنے کی ان میں جرأت نہیں۔ اپنی بے اصولی اور فرقہ پرستی کو چھپانے کے لئے اصولی رنگ میں مخالفت کر رہے ہیں۔ ان میں جرأت کا شائبہ بھی ہوتا تو سیدھے سادھے عام فہم انداز میں اس حقیقت کا اعتراف کرتے کہ ہم سر سکندر اور ان کے مسلمان ساتھیوں کو اس لئے برسر اقتدار دیکھنے کی تاب نہیں رکھتے کہ وہ مسلمان ہیں۔ مسلمان کو خواہ وہ سر سکندر ہوں یا مولوی فضل حق یا کوئی دوسرا اس وقت تک ہندوستان میں زندگی کا کوئی حق نہیں جب تک وہ زیر سایۂ برطانیہ ہماری حکومت کے غلام نہ بن جائیں اور کانگریس کے مسلمان لیڈروں کی طرح ہماری ہر جنبشِ ابرو کے آگے سر تسلیم خم نہ کر دیں۔" یہ ہے تمہارے دل کی اصل بیماری جسے تم چھپانے کی ناکام کوشش میں لگے رہتے ہو۔ اور جو تمہارے دلوں کی حرکت کو غیر فطری بنائے ہوئے ہے۔

جناح و جواہر لال کی خط و کتابت

ہندو مسلم مفاہمت کے دوران میں کسی خبر رساں ایجنسی نے کسی رازدار مفاہمت کی اخلاقی کمزوری کا فائدہ اُٹھا کر اُس خط و کتابت کو شائع کر دیا جو اس سلسلے میں مسٹر جناح اور پنڈت جواہر لال نہرو کے درمیان ہو رہی تھی۔

اس خط و کتابت کو پڑھ کر ہر شخص یہ اندازہ کرے گا کہ رعونت اور تدبر کے درمیان جنگ ہو رہی ہے مسٹر جناح کا اندازِ مراسلت حد درجہ قابلِ اعتراض ہے اور پنڈت نہرو کا اسلوبِ تخاطب ضبط، سیر چشمی او تدبر پر مبنی نظر آتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کے کانگریس سے کچھ مطالبات ہیں، ان مطالبات کی صحت و جواز سے بھی انکار نہیں۔ یہ بھی غلط نہیں کہ کانگریس تنظیم کی یہ سعی کہ مسلمانوں کی اجتماعی حیثیت کو نظر انداز کر کے ان کے افراد کو مختلف ترغیبات سے خرید لیا جائے۔ دیانتداری کے خلاف ہے۔ لیکن یہ کیسا ظلم ہے کہ جو لیڈر مفاہمت کے لئے سات کروڑ مسلمانوں کی جانب سے نمائندگی کر رہا ہے وہ حریفانہ آداب کی رعایت سے بھی دریغ روا رکھ رہا ہے۔

جا بجا اس قسم کے ذلیل فقرات کہ "تمہاری درخواست اور تمہاری گزارش کو مابدولت نے نوٹ کر لیا ہے۔"

"تمہیں بتاؤ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے"

پیش کردہ مطالبات میں اکثر مطالبات اصولِ حق رسانی کے پیشِ نظر اہم ضروری اور قطعی طور پر واجبی ہیں۔ لیکن جس زبان و اندازِ بیان میں یہ مطالبات پیش کئے جا رہے ہیں۔ وہ یقیناً رعونت آمیز ہے۔ معاصرانہ رواداری کے خلاف ہے اور اسلامی طرزِ عمل سے متصادم۔

دوسری بات جو اس خط و کتابت سے مترشح ہوتی ہے یہ ہے کہ مسلم نمائندہ مفاہمت مفاہمت پکارتا ہے۔ مگر عملی طور پر مفاہمت سے دُور دُور رہتا ہے۔ اس کے خلاف پنڈت نہرو دل میں مطالبات سے کوئی ہمدردی نہ رکھتے ہوئے بھی مفاہمت سے خلوص کا اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اُن کے جوابات کے کسی جملے، جملے کے کسی لفظ سے یہ مترشح نہیں ہوتا کہ وہ مفاہمت کے متعلق گفتگو کرنے سے جان چراتے ہیں، بلکہ ان کا اندازِ نگارش ظاہر کر رہا ہے کہ وہ حریف کے غیر معاصرانہ طرزِ عمل کو نظر انداز کر کے بھی صلح جابین کے لئے ساعی ہیں۔

تیسری رونما کیفیت مسلم نمایندے کی سیماب وشی ہے ۔ اس کی گفتگو سے اضطراب، لا مکانیت، اور اپنے آپ سے بے اعتمادی کا اظہار ہو رہا ہے ۔

مختصر یہ کہ مسلم نمایندہ مقصدِ بحث میں حق بجانب ہونے کے باوجود اپنے اندازِ بحث سے دنیا کی نگاہوں میں ناحق کوش کی حیثیت اختیار کر رہا ہے ۔ ادھر پنڈت ہزدے نے اپنے بے مثال تدبّر سے یہ میدان جیت لیا ہے اور اس شاندار کامیابی سے کہ انصاف پسند اور غیر جانبدار حضرات بھی ان کی رواداری، سیرچشمی، صلح جوئی، اور قابلِ تحسین ضبط و تحمل کے قائل ہو گئے ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سیاسی جنگ دو دماغوں میں نہ تھی بلکہ ایک دل اور ایک دماغ کی معرکہ آرائی تھی ۔ جس میں حضرت دل شکست یاب ہو گئے ۔

آنریبل وزیرِ تعلیم پنجاب کی بیدار دماغی

صوبۂ پنجاب کیا بلکہ سارے ہندوستان میں ہماری تعلیمی پالیسی کا رجحان ابتدا ہی سے نوجوانوں کی جانب بڑھتا رہا ہے ۔ اس پہلو میں ڈیڑھ سو سال کی جدوجہد کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے مقابلے میں تعلیم یافتہ لڑکیوں کے اعداد و شمار کا تفاوت زمین و آسمان کے بُعدِ مسافت کا ہم آہنگ ہو گیا ہے ۔ ملک کا تعلیمی بجٹ بے دریغ نوجوانوں کی تعلیمی کفالت کرتا رہا ہے اور لڑکیوں کی تعلیم ضابطے کی خانہ پُری کے حدود تک محدود رہی ہے ۔

گورنمنٹ آف انڈیا کا ہر ایجوکیشن ممبر اور صوبوں کے ہر عہد کے وزرائے تعلیم اپنا تمام تر کارنامہ اسی کو خیال کرتے رہے کہ ہمارے عہد میں طالب علموں اور اُن کے مدارس کی تعداد ماسبق کی بہ نسبت اتنی بڑھی ۔ ملک اور صوبوں کی رفتارِ تعلیم کا ارتقاء و انحطاط طالب علموں کے اعداد و شمار پر منحصر سمجھا جاتا رہا ۔ اور غریب لڑکیوں کی تعلیم آٹے میں نمک کی نسبت سے کبھی آگے نہ بڑھی ۔ اس کا نتیجہ اس صورت میں رونما ہوا ہے کہ تعلیم یافتہ ماؤں سے ہماری موجودہ اور آئندہ نسل محروم ہو گئی اور سر پھر کر اس کا خمیازہ قومی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں ان پڑھ ماؤں کی گود میں پرورش پائے ہوئے بے تربیت بچّوں کو بھگتنا پڑے گا اور پڑ رہا ہے ۔

اس سلسلے میں ہمارے تاریک حال سے مستقبل تاریک تر نظر آ رہا ہے ۔ آنریبل وزیرِ تعلیم پنجاب پہلے وزیر ہیں جنہوں نے نظامِ تعلیم کی اس افسوسناک خامی کو محسوس کیا اور مسلسل غور و فکر کے بعد اسے دُور کرنے کا اعلان کیا ۔

آنریبل وزیرِ تعلیم کے زیرِ تجویز پروگرام کے مطابق آئندہ لڑکوں کے بے ضرورت مدارس بند کر دئے جائیں گے ۔ اور ان کی بجائے حسبِ ضرورت مختلف مقامات پر لڑکیوں کی تعلیم کے لئے مدارس کھولے جائیں گے ۔

اِس مفید اہم پروگرام پر عمل درآمد کیا گیا تو آئندہ لڑکیوں کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام ہو سکے گا اور اس طرح ہماری معاشرت کی گاڑی کے دونوں پہیے یکساں استواری کے ساتھ اس گاڑی کو جہالت کی گھٹا ٹوپ تاریکی سے صحیح و سالم نکال لے جائیں گے ۔ ہماری آئندہ نسل تربیت یافتہ ماؤں کے آغوشِ تربیت سے محروم نہ رہے گی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہمارے بچّوں کا پہلا گہوارۂ تربیت آغوشِ مادری صحیح معنی میں اُن کا پہلا مدرسہ بن سکے گا ۔

ہماری مروجہ تعلیم میں اسکولوں کے اساتذہ پر بچّوں کی تربیت کا سارا بوجھ ڈالا جا رہا ہے ۔ اساتذہ اس ذمہ داری سے پسے جاتے ہیں اور نتیجہ خاطر خواہ پھر بھی نہیں نکلتا ۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ بچّوں کے اسکول اور گھر کی فضائیں بالکل متضاد ہیں ۔ وہ اسکول میں جو کچھ تعلیم و تربیت سیکھتے ہیں گھروں کی چار دیواری کی تاریک فضا اُسے نسیاً منسیاً کر دیتی ہے ۔ آزاد ممالک میں بچّوں کی تربیت میں کامیابی اسی لئے ہو رہی ہے کہ تعلیم یافتہ ماؤں کی وجہ سے بچّوں کے لئے اُن کے گھر بھی اسکول بن گئے ہیں ۔ بچّوں کی تربیت کے سلسلے میں استادوں کو ان کے والدین کا تعاون حاصل ہے، استادوں کی محنت برباد نہیں جاتی وہ اسکولوں سے گھروں کو جاتے ہیں تو اپنی قسم کا ایک مدرسہ گھر کو بھی پاتے ہیں ۔ وہ اسکولوں میں جو کچھ سیکھ کر گھروں میں آتے ہیں تعلیم یافتہ ماؤں بہنوں کی نگرانی میں اُسے ذہن نشین کرنے کا موقعہ انہیں مل جاتا ہے ۔

آنریبل میاں عبدالحی وزیرِ تعلیم پنجاب تمام اہلِ پنجاب کے دلی شکریہ کے مستحق ہیں کہ ان کی بیدار دماغی اور کار آگہی نے مروجہ تعلیم کی دُکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھا ہے اور تعلیمات کی سب سے بڑی خامی کو محسوس کر کے اس کے ازالے پر اپنی تمام تر توجہ صرف کر رہے ہیں ۔

محکمۂ اطلاعات کا نیا ڈائرکٹر

سرکاری اعلان کی رو سے معلوم ہوا کہ محکمۂ اطلاعات پنجاب کے نئے ڈائرکٹر سید نور احمد بی ۔ اے بنائے گئے ہیں ۔ سید صاحب نے

امتحان مقابلہ میں کامیاب ہوکر یہ منصب رفیع حاصل کیا ہے۔ وہ مسلم یونیورسٹی کے گریجویٹ ہیں اور بی۔ اے کے امتحان میں یونیورسٹی بھر میں اول آئے تھے۔

پندرہ سال سے اخبار نویسی کی خدمت میں مصروف ہیں اور اس راہ کے تمام نشیب و فراز سے واقف ہیں۔ اخبار نویسی اور اخبار نویسوں کی مشکلات اور ذمہ داریوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اس موزوں تقرر پر ہم حکومت اور اخبارات دونوں کو مبارک باد دیتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ سید صاحب صوبے کے اخبار نویسوں کے ایک رہنما کے کاردان اور نگرانِ مشکلات آگاہ ثابت ہوں گے اور اُن کی قابلِ قدر ہمدردی اپنی اخبار نویس برادری کے ہمیشہ شاملِ حال رہے گی۔ چونکہ وہ بلند اور بااصول اخبارات سے وابستہ رہے ہیں۔ اس لئے اُن سے یہ توقع بھی بیجا نہیں کہ ان کے عہد میں بلیک میلر اور بے اصول اخبارات کو نشو و نما کا موقعہ نہیں ملے گا۔ اس سلسلے میں اُن کی ذرا سی چشم پوشی بھی صوبے کے امن و امان کے لئے ضرر رساں ثابت ہوسکتی ہے۔

صورت حال یہ ہے کہ دشنام طراز اخبارات نے اخبار بین پبلک کے ذوق سماعت کو تباہ کر دیا ہے۔ کوئی بااصول اور متین لہجہ اخبار پبلک کے بگڑے ہوئے ذوق سماعت کو تسکین نہیں دے سکتا۔ اس لئے ناکام و نامراد ہوکر یا اپنے مقروض مالک کو اپنا سوگوار بناکر پیوند عام ہوجاتا ہے۔

مدرسین کی تنظیمی مشکلات

قابلِ توجہ ڈائرکٹر محکمہ تعلیمات:-

یہ عہد تنظیم اور سنگٹھن کا عہد ہے۔ ہندوستان آزادی کے اس مرحلے پر ہے جب ہندوستانی قوموں اور برادریوں کی موت و حیات کا سوال باہمی تنظیم اور سنگٹھن سے وابستہ ہو رہا ہے۔ جو قومیں فرقے اور برادریاں آج بھی وقت کے اس ضروری اور اہم مسئلے سے بے نیازی برت رہی ہیں انہیں ایک باعزت زندگی کے خواب دیکھنے نہیں چاہئیں۔ تنظیم کا سوال کل تک زندگی کا ایک راز تھا۔ جسے کچھ جماعتوں نے پالیا اور اپنی قومی تنظیم کرکے اپنے جماعتی حقوق حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئیں۔ اچھوت جو کئی ہزار سال سے اپنے افتراق و تشتت کی سزا بھگتنے کے طور پر ہندوستان میں انتہائی ذلت کی زندگی بسر کر رہے تھے اور جنہیں ملک کی انسانی برادریوں نے اپنے دائرے سے خارج کرکے بہایم میں شمار کرنا شروع کر دیا تھا۔ آج اپنی تنظیم اور سنگٹھن کے طفیل ہندوستان کی بڑی بڑی قومیں انہیں اپنے ساتھ ملانے کے لئے سر توڑ کوششیں کر رہی ہیں۔ چوڑھے چماروں نے منظم ہوکر وہ طاقت حاصل کرلی ہے کہ برہمن بھی جو اپنے آپ کو دیوتاؤں کی اولاد سمجھتے ہیں اچھوتوں کو اپنے ساتھ ملانے کی خاطر ان کی عظمت قومی کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہیں۔ آج چمار اپنی تنظیمی طاقت کی وجہ سے چمار ہونے پر فخر کرتا نظر آتا ہے۔

ملک کی ہر برادری اور ہر جماعت کے لئے آج عزت کی زندگی کا یہ راز راز نہیں رہا بلکہ سورج سے زیادہ روشن سوال بن چکا ہے۔

تنظیم کا مسئلہ قانون کی پابندیوں سے بھی آزاد ہوچکا ہے۔ سرکاری محکموں کے ملازم بھی اپنی اپنی محکمانہ تنظیم کر رہے ہیں اور یونین ایسوسی ایشن اور سبھا بنا کر اپنے حقوق کا مطالبہ پیش کر رہے ہیں۔ ریلوے ملازموں کی یونین، پٹواریوں کی یونین، ڈاک خانہ جات کے چٹھی رسانوں کی یونین۔ سرکاری کارخانوں کے مزدوروں کی یونین۔ مختصر یہ کہ جن جماعتوں میں احساس زندگی باقی ہے وہ اپنی جماعتی تنظیم میں لگی ہوئی ہیں۔

لیکن یہ کیسا دردناک منظر ہے کہ چوڑھوں چماروں، اچھوتوں کسانوں ہر محکمے کے سرکاری ملازموں میں جماعتی تنظیم ہوچکی ہے مگر ملک کے استادوں کو جو ملک کی آئندہ نسل کو تعلیم و تربیت دے رہے ہیں اپنی برادری قائم کرنے میں مشکلات پیش آرہی ہیں۔ خدا خدا کرکے اس خواب بردہ جماعت میں بیداری پیدا ہوئی ہے تو اس جذبۂ مقدس کو کچلا جا رہا ہے۔

ہمارے پاس مختلف اضلاع سے اے ڈی آئیوں اور بعض ڈسٹرکٹ انسپکٹروں کے خلاف شکایات آرہی ہیں۔ ہم ذیل میں ایک مظلوم ہیڈ ماسٹر کا خط نقل کرتے ہیں جسے اس جرم میں کہ اُس نے اپنے حلقے میں بورڈ ٹیچرز یونین کیوں قائم کی ہے؟ مصیبتوں کا سامنا ہو رہا ہے۔ خط کی عبارت کے اقتباسات حسب ذیل ہیں:-

نقل خط

ڈسٹرکٹ کے اندر قیام یونین کے لئے دو دفعہ ناکامی حاصل کرنے کے بعد میں نے سنٹرل یونین کے وجود کو مبارک خیال کیا اور اس کا سہارا لیکر ڈسٹرکٹ کے اندر بھر سے تنظیم برادری کی کوشش کی۔ اپنے عیش و آرام کو چھوڑا۔ مالی اور ذہنی کوفتیں اٹھائیں۔ پیدل یا دشوار گذار گھاٹیوں کی خاک چھانی۔ اپنا تمام قیمتی وقت اسے مفید و کامیاب بنانے میں صرف کیا۔ اپنا پیٹ کاٹ کر تحریک کی کامیابی کے متعلق ایک ہزار کے قریب پمفلٹ تقسیم کیا۔ خدا نے اس کا ثمر دیا اور میں اپنی سرگرمیوں

بیں کامیاب ہوا - تعداد ممبران کی یکلخت سے متجاوز کر گئی - سنٹرل یونین سے باقاعدہ الحاق کئے جانے کے بعد ڈسٹرکٹ یونین کے عہدیداروں کے انتخاب کے لئے میں نے ۳/۲/۴۸ کے دن ورکنگ کمیٹی کے اجلاس کا اشتہار دیا - مدرسین کی بیداری کا عالم دیکھئے کہ ورکنگ کمیٹی کے اجلاس کے اشتہار میں حاضری ۲۰۰ کے قریب تھی - انتخاب مکمل ہوا - اور جلسہ بخیر و خوبی انجام پذیر ہوا - مگر میری اپنی ہی برادری میں سے چند ضمیر فروش احباب نے جن میں سے ...... سنگھ ہیڈ ماسٹر مڈل سکول کا نام نامی قابل ذکر ہے مبالغہ آمیز ڈائری سے افسران بالا کو پیش کیا - ڈی آئی صاحب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً کچھ دن بعد دو ماسٹران کو جنہوں نے یونین کے کام میں حصہ لیا تھا گھر سے دور دراز فاصلہ پر تبدیل کر دیا - باقیوں کو بلا کر ڈرایا دھمکایا اور انہیں یونین سے استعفا دینے پر مجبور کیا - نتیجہ کار تمام ممبران اس کے قہر سے خوفزدہ ہیں اور دھڑا دھڑ معافیاں مانگ رہے ہیں - ڈی آئی صاحب انتہائی تشدد پر اُترے ہوئے ہیں اور وہ یونین کو ضلع سے کالعدم کرنے کا حتمی عہد کر چکے ہیں ۳/۲/۴۸ کے اجلاس میں شامل ہونے والے ممبران سے جواب طلب کئے جا رہے ہیں کہ کیوں بلا اجازت اسٹیشن چھوڑا (حالانکہ اُس دن اتوار تھا) اور ایک غیر منظور شدہ انجمن میں کیوں حصہ لیا" میرے خلاف مدرسین سے واپسی چندہ کے لئے باضابطہ نوٹس دلوائے جا رہے ہیں - اور علیحدگی کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں اور یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ میرے خلاف جبکہ میں چندہ سال رواں واپس کرنے سے انکار کر چکا ہوں استغاثہ دائر کروایا جانے والا ہے - اور مدرسین اس اے ڈی آئی کے قہر سے ڈر کر سب کچھ کرنے پر آمادہ ہیں -

نیز یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ڈی آئی نے صاحب سینئر وائس چیئرمین سے یہ سرکلر نکلوا دیا ہے کہ یہ یونین غیر منظور شدہ ہے جو اس کا ممبر بنے گا یا اس میں دلچسپی لے گا جرم کا ارتکاب کریگا جس کی سزا علیحدگی تک دی جا سکے گی -

اس ضلع کے اندر اس تمام کارروائی کے لئے جو کہ آجکل مدرسین سے روا رکھی جاتی ہے چوہدری ...... سنگھ اے ڈی آئی صاحب کے سوا اور کوئی ذمہ دار نہیں - یہ بزرگ عرصہ نو سال سے اسی ضلع میں متعین ہیں - مدرسین کے ساتھ انہیں مخاصمت چلی آتی ہے - ان کی پوزیشن اس کی موجودگی میں نہایت خطرے میں ہے - ڈی آئی صاحب کو اس کا اعتماد حاصل ہے - چنانچہ یہ جو چاہتا ہے کرواتا ہے معمولی معمولی باتوں پر انتہائی سزائیں تجویز کی جا رہی ہیں اور ذاتی مخاصمت کی بنا پر بلا وجہ اس کی جانب سے نقصان پہنچائے جا رہے ہیں - اس حالت میں ہم غریب مدرسین کا اللہ ہی بیلی ہے - جب یہ ایک قاعدہ ہے کہ کوئی اے ڈی آئی عرصہ پانچ سال سے زائد کسی ضلع میں نہیں ٹھہر سکتا - تو کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ چوہدری ...... سنگھ ڈی آئی کو یہاں سے تبدیل کیوں نہیں کیا جاتا - اس کی موجودگی غریب مدرسین کے لئے تباہی کا موجب ہے - اس کی موجودگی میں ضلع کے اندر یونین قائم ہونی غیر ممکن ہے -

مجھے ڈسٹرکٹ کے سرکلر کی ایک کاپی ملی ہے - آپ کے ملاحظے کے لئے بھیجتا ہوں - اس سرکلر کا اثر یہ ہوا ہے کہ تمام کے تمام مدرسین اپنی سرگرمیوں کو موقوف کر چکے ہیں - جن اصحاب نے قیام یونین میں کچھ دلچسپی کا اظہار کیا تھا - انہیں گھر سے ۲۵ میل پر تبدیل کر دیا گیا ہے اور انہیں اب ناقابل برداشت تکالیف کا سامنا ہے - مجھے بھی گاؤں سے ۷۰ میل کے فاصلہ پر ایک غیر آباد اور ناخوشگوار علاقہ میں تبدیل کر کے میری سرگرمیوں کے تمام راستے مسدود کر دئے گئے ہیں -

اے ڈی آئی صاحب پستول لئے دورہ کر رہے ہیں اور مدرسین پر دہشت ڈال رہے ہیں - "میں جاٹ ہوں (میں جاٹ ہوں) کی رٹ ہر وقت ورد زباں ہے - براہ کرم اعانت فرماویں -"

نقل سرکلر

از سررشتہ تعلیم ضلع .....

بخدمت جملہ مدرسین ڈسٹرکٹ بورڈ ضلع .....

بورڈ ٹیچرز یونین ضلع ...... ایک نامنظور شدہ انجمن ہے، لہٰذا بحکم صاحب سینئر وائس چیئرمین بہادر ڈسٹرکٹ بورڈ ...... آپ کو مطلع کیا جاتا ہے کہ آپ اس انجمن کے ساتھ کسی قسم کا تعلق نہ رکھیں - نہ تو اس کے ممبر بنیں اور نہ ہی اس کے اجلاس میں شامل ہوا کریں - اگر آپ نے اس حکم کی خلاف ورزی کی تو آپ سزا کے مستوجب ہوں گے جو کہ ملازمت ڈسٹرکٹ بورڈ سے برطرفی ہو سکتی ہے -

ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس ضلع .....

اس خط اور سرکلر کو پڑھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ جس ضلع میں اساتذہ پر یہ ظلم توڑا جا رہا ہے وہاں کا ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس ایک حاکم جابر نہیں ہے - بورڈ ٹیچرز ایسوسی ایشن کا قیام اکثر اضلاع میں افسران تعلیم کی امداد سے ہوا ہے - جہلم، گورداسپور، امرتسر، لاہور، شیخوپورہ وغیرہ

اضلاع میں بورڈ ٹیچرز ایسوسی ایشنوں کو انسپکٹران مدارس کی اخلاقی امداد حاصل ہے۔ ڈپٹی کمشنر اپنے اپنے اضلاع کی ایسوسی ایشنوں سے اظہارِ ہمدردی کر چکے ہیں۔ لاہور کے گزشتہ اجلاس میں آنریبل وزیر تعلیم پنجاب ۔صدر دفتر محکمۂ تعلیم کے افسرانِ تعلیم شریک ہوتے رہے ہیں۔

ملک غلام رسول شوق ایم۔ اے ورنیکولر ایجوکیشن پنجاب نے لاہور بورڈ ٹیچرز ایسوسی ایشن کی کانفرنس میں کئی بار تقریریں کر کے کانفرنس کے اراکین کی رہنمائی کی ہے۔ مسٹر ایس پی سنگھا ایم ایل اے، سید افضال علی ایم ایل اے، کپتان سر شیر محمدؔ مختلف ایسوسی ایشنوں کی صدارت انجام دے چکے ہیں۔ مختصر یہ کہ صوبے کی ذمہ دار شخصیتوں اور ڈی آئی سے لے کر آنریبل وزیرِ تعلیم پنجاب تک بورڈ نے ٹیچرز ایسوسی ایشنوں کے اجلاس میں شرکت کی۔ ان کے مقاصد کی تعریف اور ان سے اظہارِ ہمدردی اور وعدۂ امداد فرمایا۔

کپتان سر شیر محمدؔ والئی ہیئرین جہلم بورڈ ٹیچرز ایسوسی ایشن کے صدر کی حیثیت میں اس ایسوسی ایشن کے مطالبات پورے کر رہے ہیں دوسرے لفظوں میں بورڈ ٹیچرز ایسوسی ایشن کا قیام نہ صرف یہ کہ محکمے کے قانون پر اثر انداز نہیں بلکہ سرکاری نقطۂ نگاہ سے بالکل جائز اور مستحق ہمدردی تسلیم کیا جا چکا ہے۔

ان حقائق کی موجودگی میں کسی ڈی آئی یا کسی اے ڈی آئی کا استادوں کی ان جائز بلکہ ضروری سرگرمیوں کے راستے میں دیوار حائل بن جانا صد درجہ ظالمانہ فعل ہے۔ ہم نے دانستہ اس ضلع اور اس ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس اور بے مغز اے ڈی آئی کا نام نہیں لیا ورنہ جو متواتر شکایات ان حضرات کی دراز دستیوں کی پہنچ رہی ہیں اس کا اقتضا یہ تھا کہ ہم ان حضرات کے مظالم کو اچھی طرح رسوا کرتے اور آئندہ نمبر میں ہم اگر اصلاحِ حال نہ ہوئی تو تمام حالات شائع کر دیں گے۔

جس ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس کے متعلق اس قسم کی شکایات آ رہی ہیں اُسے معلوم ہونا چاہیئے کہ اُس کا دفتری فائل بہت گھنونا ہو چکا ہے۔ اُس کے متعلق ایک افسرِ تعلیم نے ہمیں ایک واقعہ سنایا تھا جو اُنہیں کے لفظوں میں درج کیا جاتا ہے:۔

"میں چند ماہ کے لئے فلاں . . . . ڈویژن میں تعینات ہوا تھا۔ سارے ڈویژن والوں کو یہ علم تھا کہ میرا تقرر دو تین ماہ کے لئے ہے۔ پھر میں اپنے ڈویژن میں واپس ہو جاؤں گا۔

اس پست فطرت ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس ڈویژن میں میری تقرری عارضی ہے اپنی جبلّی خوشامد پرستی کا مظاہرہ کیا اور ایک دن میرے خیمے میں آیا اور سلام کے بعد اپنی جیب سے ایک سپید ریشمی رومال نکالا اور میرے بوٹ صاف کرنے شروع کر دئے۔ اس پر میں نے جھک کر کہا کہ "ہیں ہیں آپ یہ کیا کر رہے ہیں۔" ارشاد ہوا کہ "غلام ہیں آپ کے نوکر ہیں ہمارا یہی فرض ہے کہ افسروں کے بوٹ صاف کریں۔" میں نے جواب دیا "ہرگز نہیں آپ کا یہ فرض نہیں۔ میں اس حرکت کو سخت ناپسند کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے پاؤں کھینچ لیا اور ڈائرکٹر کو یہ تمام واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھا کہ یہ شخص انسپیکشن لائن میں کام کرنے کا ہرگز مستحق نہیں۔ ایسے ذلیل ذہنیت کے لوگوں کو اس لائن میں رکھنا اسکولوں کے لئے نقصان رساں ہوگا۔"

یہ واقعہ کوئی افسانہ نہیں ایک ذمہ دار افسرِ تعلیم کا بیان کردہ واقعہ ہے۔ اس واقعے سے اس شخص کی پست فطرت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

کیسا اندھیر ہے کہ ایسے خوشامدی تملق پرست شخص کو ایک پورے ضلع کی تعلیمی حکومت سپرد کر دی گئی ہے۔

جس اے ڈی آئی کا ذکر موصولہ شکایات میں متواتر آ رہا ہے ہم اُسے ایک موقعہ دیتے ہیں۔ اگر اُس نے اپنے جابرانہ رویے میں جلد تبدیلی نہ کی تو اُسے معلوم ہو جائے گا کہ پنجاب اسمبلی کا ہال اس کے خلاف آوازوں سے گونج رہا ہے۔

سنٹرل بورڈ ٹیچرز ایسوسی ایشن اور اس کی تمام شاخوں کو اس ضلع کے ڈسٹرکٹ انسپکٹر اور اے ڈی آئی کے طرزِ عمل کے خلاف مسلسل طور پر صدائے احتجاج بلند کرنی چاہیئے۔ سب سے پہلے مختلف شاخوں کا ایک نمائندہ وفد ترتیب دیا جائے۔ اور رائے بہادر مسٹر منموہن اے ڈی پی آئی، مسٹر آر مسٹر ارنگ۔ آنریبل وزیرِ تعلیم پنجاب کی خدمت میں پیش ہو کر اپنی تمام مشکلات عام طور اور اس واقعہ کو خصوصاً بیان کرے۔ تبھی اس قسم کے واقعات کا انسداد ہو سکے گا۔

شکایت بھیجنے والے ہیڈ ماسٹر کو چاہیئے کہ اپنی یونین کے تمام

ممبروں کے دستخطوں سے اپنی تمام شکایات دفتر شاہکار کو بھیجیں۔ میں شملہ جا رہا ہوں۔ ان شکایات کو افسران بالا کے سامنے خود پیش کروں گا"

حکیم خورشید علی خاں صاحب رامپوری

یوپی کے شاہی طبیب حکیم خورشید علی خاں صاحب رامپوری چوک لوہاری منڈی لاہور کی آب و ہوا سے دل برداشتہ ہو کر کراچی جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ اطلاع اہلِ لاہور کے لئے موجب تشویش ہو سکتی ہے۔

حکیم صاحب کے خاندان کے پنجاہ و شصد سالہ طبی تجربات سے اہلِ لاہور مستفید ہو رہے تھے اور انہوں نے یہاں بڑے معرکے کے کئی ایسے کامیاب علاج کئے جو ڈاکٹروں کے بس کے نہیں رہے تھے۔ ایسے خاندانی صاحب استعداد اور حاذق طبیب کا لاہور سے بد دل ہو کر کسی دوسری جگہ مطب تبدیل کرنا اہلِ لاہور کی بڑی محرومی ہے۔

لاہور کی ساڑھے پانچ لاکھ کی آبادی میں بہت سے خاندان اور بہت سے افراد ایسے موجود ہیں جو ڈاکٹری علاج پر یقین نہیں رکھتے اور ضرورت کے وقت یونانی طریقۂ علاج کی جانب رجوع کرتے ہیں۔ یہاں بہت سے اچھے تجربہ کار ذی علم یونانی طبیبوں کی ضرورت ہے۔ امید ہے کہ اہلِ لاہور حکیم صاحب موصوف کو کراچی نقل وطن کرنے سے روکیں گے۔ ذی اثر حضرات کی درخواستوں کو حکیم صاحب رد نہیں کر سکتے۔

تاجور

نام نہاد کالے بل

پنجاب کے مہاسبھائی اخبارات میں اراضیات مرہونہ کی واگذاری اور بنامی انتقالات کی منسوخی کے بلوں پر غیر معمولی غوغا آرائی کی جا رہی ہے اور انہیں "کالے" اور "ہندو کش" بلوں کا نام دیا جا رہا ہے۔ مزید یہ کہا جا رہا ہے کہ یہ بل سر سکندر کے مسلم لیگی رجحانات کے آئینہ دار ہیں اور سر چھوٹو رام اور سر سندر سنگھ مجیٹھیہ ان بلوں کی حمایت صرف اس لئے کر رہے ہیں کہ وہ سر سکندر کے ہاتھوں پر سیاسی بیعت کر سکنے کے ساتھ ساتھ اگر پورے مسلمان نہیں تو نیم مسلم ضرور ہو چکے ہیں۔

قابل غور یہ امر ہے کہ اس غوغا آرائی میں تھوڑی بہت صداقت بھی ہے یا یہ بالکل ہی بے بنیاد ہے۔ اس امر میں کوئی شک نہیں کہ ان بلوں کے نفاذ سے ہندوؤں کے ایک مخصوص طبقے کے مفاد پر زد پڑے گی اور انہیں اپنی دیرینہ لوٹ کھسوٹ کی عادت کو ترک کرنا پڑیگا جو بعض حالات میں جرائم پیشگی کی حد تک پہنچی تھی۔ اب انہیں ان اراضیات سے دست بردار ہونا پڑے گا جو انہوں نے چند روپوں کے عوض سادہ لوح دیہاتیوں کو سود در سود کے چکر میں پھنسا کر اپنے قبضہ میں کر لی تھیں۔ اب وہ فرضی انتقالات کے ذریعے قانون اور انصاف کی زد سے بچ نہ سکیں گے۔ لیکن خدارا انہیں یہ تو بتایا جائے کہ کیا پنجاب کی تمام ہندو آبادی انہی سود خوروں پر مشتمل ہے؟ کیا دیہات میں بسنے والے جاٹ ہندو نہیں اور کیا ان بلوں کے نفاذ سے ان کے حقوق پر بھی کوئی زد پڑے گی۔ کیا شہری پنجاب میں بسنے والا تمام ہندو بھی سود خور رہی ہیں۔ اگر نہیں تو بتایا جائے کہ ان پر ان بلوں کے نفاذ سے کیا تباہی نازل ہو جائے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ آجکل ہندو مہاسبھا پر سرمایہ داروں کا قبضہ ہے اور ان کے نزدیک ہندو صرف وہی لوگ جو سرمایہ دار ہیں۔ جن کے گھر ٹھناٹھن کی آواز سے محروم ہیں۔ انہیں ہندو کہلانے کا کوئی حق نہیں اور نہ ان کے مفاد سے ہندو سبھا کو کوئی علاقہ ہے۔ ہاں اگر کہیں پنجاب کے سرمایہ داروں اور سود خوروں پر کوئی زد پڑے تو ہندو سبھائی ہندو مفاد کا واسطہ دیکر رونا شروع کر دیتے ہیں۔ اور اس طرح عام ہندوؤں کو اپنا آلۂ کار بنا کر اپنے سرمایہ دارانہ مفاد کو محفوظ کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ پنجاب کے عام ہندو اس روش کو کب تک برداشت کریں گے۔ اور کب تک سرمایہ دار مقاصد کی تکمیل کے لئے آلۂ کار بنے رہیں گے۔

اسمبلی کی کانگریس پارٹی نے بھی ان بلوں کے متعلق جو رویہ اختیار کر رکھا ہے۔ اسے کسی صورت مستحسن نہیں کہا جا سکتا۔ کانگریس غریبوں کی سب سے زیادہ حمایتی ہے اور بزعم خود سرمایہ داری کو ختم کر دینا چاہتی ہے۔ اس صورت میں اس کے نمائندوں کا ان مفید بلوں کے متعلق چپ سادھ لینا ایک ایسا فعل ہے جس کی مناسب مذمت نہیں ہو سکتی۔ اس رویہ نے ثابت کر دیا ہے کہ کانگریس کا غریبوں کی حمایت میں آنسو بہانا مگرمچھ کے آنسوؤں سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ اور ان کی مقہور اتحاد پارٹی ان سے کہیں زیادہ عملی ہمدردی کا ثبوت دے سکتی ہے۔

محمود جاوید ایم۔اے

پنجاب کی اخبار نویس برادری

(از تاجور مدیر شاہکار)

ملک یوسف العزیز :-

ملک یوسف العزیز اُن بدقسمت نوجوانوں میں سے ایک ہیں جو ترک موالات کر کے کالجوں سے نکل آئے تھے - ان نوجوانوں کے لئے ترک تعلیم کرنے کے بعد اخبار نویسی کے سوا کوئی مشغلۂ معاش نہ تھا - چنانچہ یوسف العزیز بھی اخبار بندے ماترم کے اسٹاف میں شامل کئے گئے - پندرہ سال تک مختلف روزنامجات میں مشق اخبار نویسی کرنے کے بعد اب وہ روزنامہ انقلاب کے اسٹاف میں کام کر رہے ہیں - ملک موصوف نے سیاسیات کا بغور مطالعہ کیا ہے اور پندرہ سال اخبار نویسانہ جدوجہد نے انہیں اس راستے کے خارزاروں سے واقف بنا دیا ہے - طبیعت میں جدت طریفانہ جودت اور اخبار نویسانہ نکتہ رسی پیدا ہو گئی ہے - بندے ماترم موجودہ غیر مسلم اخبارات میں بہت حد تک قوم پرور اخبار نویسی کا علم بردار رہا ہے - ملک یوسف اپنی سیاسی آزادی کے جوہر اس کے صفحات پر بکھیرتے رہے - بندے ماترم بند ہوا تو ملک صاحب کے لئے کوئی غیر مسلم اخبار جاذبِ توجہ نہ بن سکا - سبھائی ذہنیت سے انہیں خدا واسطے کا بیر ہے - اس لئے ملاپ اور پرتاب اُن کے لئے کشش کا باعث نہ ہو سکے - مجبوراً انہیں روزنامہ انقلاب کو انتخاب کرنا پڑا - اگرچہ اپنی آزاد منشی و حریت پرستی کے سبب وہ انقلاب کی بوقلموں پالیسی کو پسند نہیں کرتے - مگر شکر نام ہے مجبوری کا - معاشی ضرورتوں نے انہیں دو مصیبتوں میں سے ایک آسان مصیبت کو اختیار کرنے پر مجبور کر دیا - اور اس طرح یہ نوجوان مفاد ملی کے خلاف ہنگامہ آرائی کے گناہ سے محفوظ ہو گیا - اگرچہ اس کا موجودہ ماحول اسے ملت کے لئے فائدہ رساں کبھی نہیں بنا سکتا -

وقار انبالوی :-

حضرت وقار انبالوی ایک ذہین و فطین اخبار نویس اور ارتجالی شاعر ہیں - ان کی جوانی ادھیڑ پن سے ہاتھ ملا رہی ہے - انگریزی پڑھے ہوئے ہوتے تو کسی بلند روزنامے کے چیف ایڈیٹر [illegible] - مگر انہوں نے انگریزی سے ناآشنا ہونے کے باوجود اپنی جودت طبع سے اخبارات کے لئے اپنے وجود کو ایک ضروری لعنت بنانے میں کامیابی حاصل کر لی ہے -

مسلم روزنامجات کے مغرور مالکوں اور ایڈیٹروں نے ان کی خدمات کو شائستہ اعتنا نہ سمجھا، اس کا خمیازہ قوم مسلم کو بھگتنا پڑ رہا ہے - وقار کی رواں اور برجستہ ہنگامی شاعری، دل پذیر ظرافت اور نکتہ آرا اخبار نویسی سبھائی اخبارات کے لئے باعثِ زینت بن رہی ہے - اور چونکہ عموماً مفاد ملی کے خلاف یا اس پر ایک حملے کے رنگ میں ہوتی ہے - اس لئے مسلم سیاست اس سے نقصان اٹھا رہی ہے - روزنامجات زمیندار، احسان، زمزم اور انقلاب کے مالک اور مدیر اگر اس نقصان کا احساس کریں تو وقار کو ملت کی مخالفت اور اپنے آپ کو بے اعتنائی کے گناہ سے بچا سکتے ہیں -

حضرت مولینا ظفر علیخاں قبلہ کی سحر کار ہنگامی شاعری کا جواب وقار کے فرضی "بھارتی" یا "علامہ ہندی" کے ناموں سے دیکھ کر بعض اوقات بہت صدمہ ہوتا ہے - وقار صرف ہنگامی شاعری ہی کا مرد میدان نہیں بلکہ اس کی نیچرل اور رومانٹک نظمیں بھی رنگینی، شادابی اور دل آویزی سے معمور ہوتی ہیں - تازہ انداز میں رزمیہ شاعری تو اس کا حصہ بن گئی ہے -

گورکھا ہیٹر سگر چیدی - اے اردو صحافت میں گورکھا کے نام سے مشہور ہیں - ان کی جسمانی ساخت نسوانی سانچے میں ڈھلی ہے - انہیں وجاہتِ ظاہری بخشنے میں قدرت نے دریا دلی سے کام لیا ہے - چہرے کے نقوش درست کرتے ہوئے فطرت نے کسی گڈھوالی آرٹسٹ سے مشورہ لینا ضروری سمجھا ہے -

آنکھوں کا حجاب، پیشانی کی تابانی، صورت کا بھولا پن، آواز کی موسیقی اور اعضاء کی لچک نے انہیں افسانۂ ہر انجمن بنا رکھا ہے -

خداداد ذہانت، طباعی، استعداد اور اخباری بصیرت میں اکثر معاصرین کے لئے قابلِ رشک سمجھے جاتے ہیں - اور یہ واقعیت ناقابل انکار ہے کہ گورکھا کی اخباری ظرافت کے آگے آج تمام اردو اخبارات

کے ظریفانہ کالم بھی بھرتے ہیں۔ گورکھا پنجاب کی برسرِ حکومت پارٹی کا سب سے بڑا نقاد ہے۔ مگر اس پارٹی پر اس کی ظریفانہ تنقید دل آزاری اور پھکڑپن سے آلودہ نہیں ہوتی۔ وہ مہاجن برادری کا ممبر ہے اور مہاجن عموماً ساہوکارہ کرتے ہیں۔ ساہوکاروں نے اپنی بیماری کا نام چھوٹو رام رکھ لیا ہے۔ اس لئے گورکھا کبھی سر چھوٹو رام کے ذکر پر ورکنگ آرڈر میں نہیں رہ سکتا۔ ان کے خلاف جب کچھ لکھتا ہے عموماً ظرافت کے حدود میں سما نہیں سکتا۔

نواب دولتانہ اس صوبے کے بہت بڑے زمیندار رہنما ہیں۔ یہ ظریف مہاجن ان پر مشقِ ظرافت کرتے ہوئے وجد کرنے لگتا ہے۔ وہ چونکہ ایک بلند مذاق ادیب اور شاعر بھی ہیں۔ اس لئے اپنے خلاف گورکھا کی ظریفانہ تنقید سے تلخ ہونے کی بجائے اسے داد و تحسین دینے میں حریفانہ بخل روا نہیں رکھتے۔

مختصر یہ کہ گورکھا اس وقت اردو صحافت کے مغتنمات میں سے ہے۔ افکارِ معاش سے اسے اطمینان کا موقعہ مل جائے تو اردو زبان کے لئے اس کا ادبی مذاق کام کی چیزیں مہیا کر سکتا ہے۔

نارومنی:-

روزنامہ ملاپ لاہور کا "نارومنی" مہاشہ نانک چند ناز ایک پرانا اخبار نویس ہے۔ قد و قامت کی ساخت لکھنوی ہے۔ بلکہ لکھنوی نزاکت یہاں آکر مجنوں کی عاشقانہ نحافت بن گئی ہے۔ مگر اس بخل کی تلافی میں قدرت نے نارومنی کو سرحدی اعصاب بخش دیئے ہیں۔ چہرے پر خفیہ امراض کی بے رونقی چھائی ہوئی۔ خط و خال پر تبت کے دلائی لامہ کی روحانی روشنی پڑ رہی ہے۔ گاندھی ٹوپی نے ابوالکلام اور آصف علی جیسے وجیہہ رہنماؤں کو بھی نگاہوں کیلئے بارِ نظارہ بنا دیا ہے۔ اس سے اندازہ کیجئے کہ اس ٹوپی نے نارومنی کو کس حد تک باعثِ خراش بنا دیا

مہاتما گاندھی لیڈروں میں سب سے زیادہ وبالِ بصارت واقع ہوئے ہیں۔ اور نارومنی اخبار نویسوں میں نمونے کی چیز بن گئے ہیں۔ اس ٹوپی نے رہی سہی کسر پوری کر دی ہے۔ اب یہ دونوں بچوں کے لئے دن کی بیچا اور ہیرو نوجوانوں کے واسطے رات کا ہوا ہیں۔ اور راقم الحروف تو ان صورتوں کے تصور سے آٹھ پہر ترساں رہتا ہے۔

ہاں تو نارومنی کا ذکر تھا۔ اس کی اخبار نویسانہ قابلیت نے پرتاپ کو تمام اخبارات کا رہنما بنا دیا تھا۔ اس کا دماغ اخباری کامیابی کے لئے نت نئی ترکیبیں سوچتا رہتا ہے۔ پرتاپ نے اس کی دماغی اپج سے بہت ہردلعزیزی حاصل کی تھی۔ مگر مہاشہ کرشن کی نگاہ اس نے

قدر شناس نہ بن سکی اور اس بے نظیر اخبار نویس کو بارہ سال کی جد و جہد پر خاک ڈال کر پرتاپ سے رخصت ہونا پڑا۔ ظالم بلا کا محنتی ہے۔ پرتاپ کی آدھی ضخامت روزانہ نانک چند ناز کی دماغی کاوشوں سے معمور ہوتی تھی۔ ہر نمبر میں ناز کے قلم سے نکلی ہوئی تازہ ہنگامی نظمیں بھی زینتِ اشاعت بنتی تھیں۔ اور اس کی پانچ پہر کی مسلسل مصروفیت کے باوجود فرصت کے دو چار گھنٹے آرام لینے کی بجائے تین چار دوسرے ہفتہ وار اخبارات کے ایڈیٹ کرنے میں صرف کر دیا کرتا تھا۔ نانک چند ناز کو اگر اخبار نویسی کی زندہ فولادی مشین کہا جائے تو اس میں کوئی شاعرانہ مبالغہ نہیں

نانک چند کا تخلص ادب سوز ضرور ہے۔ مگر ان کی شاعری قابلِ تحسین و آفرین ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ ناز شاعری کی بھی ایک مشین ہے۔ اگرچہ عموماً ہر شاعر کی زیادہ گوئی یاوہ گوئی بن جاتی ہے اور اس وجہ سے ناز کی نظموں میں فن کی غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ مگر مسلم اخبارات کے نقادوں کے علی الرغم ناز کی شاعری کے بعض نمونے اردو ادب کے غیر فانی حصے ہیں۔ مولانا ظفر علیخاں صاحب قبلہ کی نظموں کا انہیں سنگین زمینوں میں اور پھر ارتجالی طور پر جواب دینا ناز نے اپنا فریضۂ صحافت بنا لیا ہے۔

اگرچہ ظفر علی کا اندازِ نگارش ظفر علی سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہو جائے گا۔ اور اس خصوصیت میں ناز اور دوسرے تمام مسلم و غیر مسلم اخباری شعراء ان کے ہمرتبہ حریف نہیں بن سکتے۔ لیکن ناز کی ہمت شاعرانہ داد و تحسین سے محروم نہیں کی جا سکتی۔ بعض اوقات جب طبیعت بحال ہوتی ہے ناز کی شاعری کا نرم و شیریں سیلاب دیدنی ہوتا ہے۔ ملاپ میں وہ تھوڑے سے وقت کے لئے کام کرتا ہے مگر اپنی اخبار نویسانہ جودت سے اس نے ملاپ کو پرتاپ کا کامیاب حریف بنا دیا ہے۔ اگر مسلم پریس گورکھا اور ناز کو حاصل کر سکے تو اس میں تازگی، شگفتگی اور اخباری افادیت زیادہ پیدا ہو سکتی ہے۔ اسی کے ساتھ ہندو مسلم پریس کے لہجۂ نگارش میں اتحاد کے زیر اثر اخباری برادری میں ہم آہنگی پیدا ہونے کے بہت سے امکانات بھی صورت پذیر ہو سکیں گے۔

آئندہ نمبروں میں میسرز ویندر، ورنبیر، گوپال متل، لالہ گیان، دینا ناتھ، آتش و کرم چند، مہاشہ گیان کرشن و خوشحال چند خورسند، غیر معروف جرنلسٹ۔ ہری چند اختر، میلارام وفا، مہر، دین دیال بھاٹیہ، شانتی نراین، مولانا ظفر علیخاں قبلہ، ملک نصر اللہ خاں عزیز، قاضی احسان اللہ، مولانا میکش اور مہر و امر سنگھ کے متعلق اظہار خیال کیا جائے گا۔

تاجور

تصحیح

(مستقل عنوان ہے)

جھاڑ ڈالنا

پنجاب کے اچھے ادیب بھی اِس غلط محاورے کے استعمال کو بے دریغ روا رکھتے ہیں۔ حالانکہ بُرا بھلا کہنا، ڈپٹنا اور ملامت کرنا کی بجائے جھاڑ ڈالنا صحیح نہیں۔

گھریلو زبان میں اس کی بجائے جھاڑنا اور جھاڑ بتانا استعمال ہوا کرتا ہے مثلاً

اُسے بہت جھاڑا۔ زید نے اُسے خوب جھاڑ بتائی۔

بُرا بھلا کہنا، بکنا ڈپٹنا، ملامت کرنا، جھاڑنا، جھاڑ بتانا۔

تاجور

غزل

دورِ فلک کے شکوے گِلے روزگار کے
ہیں مشغلے یہی دلِ ناکردہ کار کے

یوں دل کو چھیڑ کر نگہِ ناز جھک گئی
چھپ جائے کوئی جیسے کسی کو پکار کے

سینے کو اپنے، اپنا گریباں بنا کہ ہم
قائل نہیں ہیں پیرہنِ تارتار کے

کیا کیجئے کشش ہے کچھ ایسی گناہ میں
ہیں ورنہ یوں فریب میں آتا بہار کے

اک دل اور اس پہ حسرت وارماں کا یہ ہجوم
کیا کیا کرم ہیں مجھ پہ مرے کردگار کے

ہم کو تو روزِ حشر کا بھی کچھ یقیں نہیں
کیا منتظر ہوں وعدۂ فردائے یار کے

کس دل سے تیرا شکوۂ بیداد کر سکیں
مارے ہوئے ہیں ہم نگہِ شرمسار کے

گوپال مِتّل

بہار جاپان

تبتی حسینہ

اس چھوٹی سی کوہستانی آبادی میں آج چاروں طرف چہل پہل تھی۔ بستی کے قریبی جنگل میں اہل تبت کے خیمے نصب تھے۔ گاؤں کے بچے غول کے غول ان کے خیموں کو دیکھنے چلے جا رہے تھے۔ نو وارد ہونے کی وجہ سے میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ لیکن ایک دفعہ میرا دل بھی وہ تماشا دیکھنے کے لئے للچا گیا۔ میں جس پہاڑی شخص کے ہاں مقیم تھا اس سے میں نے اپنے ساتھ چلنے کے لئے کہا۔ نہ جانے کیوں میرے اس سوال سے اس کے شگفتہ چہرے پر پژمردگی طاری ہو گئی۔ اس روز میں نے اس کے چہرے پر جو اداسی دیکھی وہ مجھے اب تک یاد ہے۔

بہت دیر کی خاموشی کے بعد اس نے کہا۔ بھائی! میں کیا کروں، اب وہاں جا کر مجھے کسی چیز کے دیکھنے کا شوق باقی نہیں رہا۔ جوانی کے وہ دن رخصت ہو گئے۔ جب میں بھی انہی کے خیموں کے درمیان پڑا رہتا تھا اور تبتیوں کی گھریلو زندگی کے تماشے دیکھا کرتا تھا۔ انسان کی زندگی ہی کیا ہے؟ متواتر انقلاب، میری زندگی بھی ہمیشہ انقلاب کا مرکز رہی، لیکن اب میں اس حالت کو پہنچ چکا ہوں۔ جب انسان کے اندر نہ کوئی شوق باقی رہتا ہے، نہ حوصلہ، نہ تمنا باقی رہتی ہے نہ آرزو، دل کی وہ شباب پرستیاں بھی باقی نہ رہیں جو نشاط انگیز اور پُر کیف کروٹیں بدلا کرتی تھیں۔

خیر میری ماتم گساریوں کو چھوڑو۔ جاؤ تم گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ دیکھ آؤ۔ میں جانے سے قاصر ہوں۔ تم میرے مہمان ہو۔ تمہاری خاطر داری میرا اخلاقی فرض ہے، لیکن میں اپنے دل کو کیا کروں، وہ کسی طرح جانے پر رضامند نہ ہو سکے گا۔

وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ اگر میں جانتا کہ میرے اس سوال سے اس کے جذبات کو اس قدر صدمہ پہنچے گا تو میں ہرگز لب کشائی کی جرأت نہ کرتا۔ میں اس کو چھوڑ کر باہر نکلا اور لڑکوں کی ایک ٹولی کے ساتھ ہو لیا۔ پہاڑ کے چاروں طرف کھیتوں میں گیہوں کی سنہری بالیاں جھوم رہی تھیں۔ چیل کے درختوں کی قطاروں کے درمیان چھپی ہوئی پہاڑی کوئل کوک رہی تھی۔ ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیاں جن سے ہو کر ہم جا رہے تھے۔ لگن اور رینگل کی ہریالی سے ڈھنکی ہوئی اس کی خوشبو سے بس رہی تھیں۔

دوشیزۂ فطرت کے حسن و جمال سے نشاط اندوز ہوتے ہوئے ہم تبتیوں کے خیموں کے پاس پہنچ گئے۔ تبتی عورتیں اپنے بچوں کو جو خوبصورت اور دلفریب پوشاکوں سے چھپے ہوئے تھے لوریاں سنا سنا کر سلا رہی تھیں۔ توانا و تندرست لڑکیاں تھلیے، جھکّے، آسن وغیرہ بنا رہی تھیں۔ مرد بھی رنگ تیار کرنے میں اور رسّی بٹنے میں مصروف تھے۔ لڑکے جمع تھے۔ بعض تبتی کندھے میں جھولی ڈال کر جمبو، گندرینی اور رمونگا وغیرہ بیچنے کے لئے جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ یہ سب دیکھ کر شام کو میں وہاں سے واپس لوٹا۔ میرا پہاڑی بوڑھا میزبان میرے لئے ایک کٹورے میں دودھ اور مڑوے کی روٹی لئے میرا انتظار کر رہا تھا۔

چاندنی رات تھی، میں باہر بیٹھ گیا، چیڑ اور دیودار کے اونچے اونچے درختوں سے چاندنی چھن چھن کر ہم پر پڑ رہی تھی۔ پاس ہی کی پہاڑی آبشار کے ہنگامے اور سرسر کرتی ہوئی ہوا کے جھونکے میرے سلسلۂ خیال میں مداخلت کر رہے تھے۔ میں روٹی کے ٹکڑے دودھ میں ڈبو ڈبو کر منہ میں ڈال رہا تھا۔ لیکن میری آنکھیں وہی رنگین تماشا دیکھ رہی تھیں جو تبتیوں کے خیموں میں دیکھ چکی تھیں۔ ان لوگوں کی زندگی میرے لئے ایک طلسم بن رہی تھی۔ بوڑھے میزبان نے مجھے خواب سے بیدار کرتے ہوئے کہا۔

"کہو بھائی! لامہ کا پڑاؤ دیکھ آئے؟"

وہ میرے پاس ہی بیٹھ گیا۔

میں نے کہا۔ جی ہاں دیکھ آیا۔ سب کے سب اپنی دھن میں مست تھے۔ میں نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ بوڑھا میزبان کسی اور عالم میں پہنچ گیا ہے۔ اس پر ایک عجیب خود فراموشی سی نظر آنے لگی تھی۔ جیسے ماضی کی کسی عمیق اور دیرپا اثر یاد نے اس کو ڈھک لیا ہو۔ اس کی محویت اور خود فراموشی پر میں چپ نہ رہ سکا۔ میں نے کہا، معاف کیجئے گا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان تبتیوں کی

زندگی سے آپ کا کوئی خاص تعلق رہ چکا ہے۔

اس کے بعد مجھے مناسب الفاظ نہیں ملے۔ اور میں چُپ ہو گیا۔ بوڑھے نے میری طرف دیکھا۔ چاند کی روشنی میں، بوڑھے کی بلند پیشانی، دودھ کی طرح سفید ریش، متین و باوقار صورت کسی قدیم زمانے کے مہرشی کی یاد دلا رہی تھی۔ اس کی شکل و شباہت سے بآسانی اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ کہ وہ جوانی میں ایک خوبصورت اور ذی وجاہت آدمی رہا ہوگا۔

اس نے کھانستے ہوئے کہا۔ تم اس کو سننا چاہتے ہو تو سنو۔ میں بھی اس داستانِ درد کو پوشیدہ رکھنا نہیں چاہتا، لیکن نہیں، میں نے غلطی کی اور انسان تو قدم قدم پر غلطیاں کرتا ہے۔ خیر سنو۔ چند روزہ زندگانی ہے، نہ ہمیشہ مجھے رہنا ہے نہ تمہیں۔ لیکن میری کہانی باقی رہ جائے گی۔

اس کی آواز گلوگیر ہو گئی۔

اس نے کہنا شروع کیا۔ ساٹھ سال پہلے کا واقعہ ہے۔ اس وقت میری عمر بیس برس کی تھی۔ میں گاؤں کے رئیس کا بیٹا تھا۔ مجھے کسی بات کی فکر نہ تھی۔ ہر طرح کا آرام و اطمینان تھا۔ میں نے پہاڑی نوجوانوں کی ایک ٹولی بنا رکھی تھی جو مجھے اپنے سردار کی طرح مانتے تھے۔ ہم جنگلوں اور پہاڑوں میں فضول گھومتے پھرتے تھے، لیکن موسم سرما میں جب تبتی لوگ آ جاتے تھے۔ ہماری یہ بے کیف آوارہ گردی ختم ہو جاتی تھی۔ اور ہماری دلچسپیوں اور نشاط انگیزیوں کا کافی سامان مہیا ہو جاتا تھا۔ ہم سب تمام دن ان کے خیمے کے باہر پڑے رہتے، ان کی زبان سیکھنے کی کوشش کرتے، ان کے فوٹو اتارتے، ان کے عشقیہ گیت نقل کرتے۔ دو تین مہینے تک یہی نشاط انگیز اور پُرکیف مشغلہ رہتا۔ حسبِ معمول اُس برس بھی تبتی لوگ آئے اور ہماری ٹولی وہاں پہنچی۔

ایک بوڑھے تبتی کے ساتھ پانچ حسین و جمیل لڑکیاں آئی ہوئی تھیں۔ یوں تو پانچوں بہنیں حُسن و جمال کا مجسمہ تھیں۔ اور ان کی چمپئی رنگت اور ان کے رخساروں کی سرخی ہر دیکھنے والے کو اپنی جانب متوجہ کر لیتی تھی۔ لیکن ان میں سب سے بڑی رُملا کے حُسن میں کچھ اور ہی کشش و جاذبیت تھی۔ حسین و جمیل ہونے کے ساتھ وہ متین و سنجیدہ اور شرمیلی اور باحیا بھی تھی۔ اس لئے وہ تو بہت کم بولتی تھی، لیکن اس کی باقی چاروں بہنوں کے پُرشور قہقہوں سے ہر وقت پہاڑیاں گونجتی رہتی تھیں۔

میں اپنے وقت کا زیادہ حصّہ انہی کے خیمے کے سامنے گزارا کرتا تھا۔ وہ لڑکیاں بھی مجھ سے ہِل مِل گئی تھیں۔ میں انہیں کہانیاں سناتا۔ کبھی کبھی مٹھائیاں بھی کھلاتا۔ وہ مٹھائیاں پا کر خوشی سے ناچنے لگتیں۔ مجھے ان کا گیت "لامالا ما سلام ہسلام" بہت پسند تھا۔

ان کے خاندان میں مجھے خاص رسوخ حاصل ہو گیا تھا۔ بوڑھا لامہ بھی مجھے محبت کرتا تھا اور بغیر چائے پلائے واپس آنے نہیں دیتا تھا۔ وہ لوگ اپنی چائے میں مکھن، ستو اور شراب ملاتے ہیں، ایسی چائے مجھے پسند نہ تھی، لیکن محبت سے زہر بھی دیا جائے تو وہ آبحیات معلوم ہوتا ہے۔

ہمارے گاؤں میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ بسنت پنچمی کی تقریب منائی جا رہی تھی۔ لیکن موسم بہار کے شروع ہوتے ہی تبتی لوگ گھاٹیوں سے لوٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس لئے اس دفعہ کی بہار میرے لئے خزاں سے زیادہ بے لطف اور تکلیف دہ تھی، میں ہر وقت یہی سوچتا رہتا تھا کہ اپنے خاندان والوں کے ساتھ رُملا بھی چلی جائے گی۔ اور میرے دل کی رنگین اور پُرکیف دنیا یکسر ویران اور برباد ہو جائے گی۔

میں بسنت پنچمی کے روز اپنے مکان کے اندر پڑا یہی سب کچھ سوچ رہا تھا کہ باہر کسی نے آواز دی۔ دوست! اے دوست!

میں نے کھڑکی سے دیکھا تو گلے میں جھولی ڈالے رُملا کھڑی تھی۔ میں جلدی سے نیچے چلا آیا۔ وہ گھبرائی ہوئی سی معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے کہا۔ کیا تم میرے ساتھ چلو گے؟ والد صاحب کو سخت بخار ہو گیا ہے۔ میں تمام جڑی بوٹیاں دے کر ہار گئی۔ لیکن کچھ نتیجہ نہیں نکلا۔ ہم یہاں پردیسی ہیں، ہمارے ساتھ والے بھی چلے گئے۔ تمہارے سوا یہاں کسی سے ہماری راہ و رسم نہیں ہے۔

میں نے کہا۔ چلو۔

میں نے راستے میں اس کی چاروں بہنوں کے بارے میں دریافت کیا۔ اس نے کچھ منہ بنا کر کہا۔ ان کی نہ پوچھو، ان کو کچھ فکر نہیں ہے۔ دن بھر ہنستی کھیلتی اور ناچتی رہتی ہیں، چلو یہ بھی اچھا ہی ہے، وہ بچیاں ہیں کسی طرح بہلی رہتی ہیں۔ یہی کیا بُرا ہے؟

میں نے کہا۔ حقیقی بہنوں میں بھی اتنا فرق ہوتا ہے، تم نے کب سے خاندان کا سارا بوجھ تنہا اپنے سر لے رکھا ہے؟

کچھ دیر کے سکوت کے بعد اس نے کہا۔ جس زمانے میں ماں کا انتقال ہوا یہ چاروں بہنیں بہت چھوٹی تھیں، والد صاحب بھی بیمار رہنے لگے۔ اس وقت سے گھر کا تمام بار میرے ہی اوپر ہے۔

یہاں کیا، تبت میں تو اس سے زیادہ کام کرنا پڑتا ہے، زندگی میں کام کے سوا اور رکھا ہی کیا ہے۔

ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے خیمے کے پاس پہنچ گئے، چاروں بہنیں باہر درخت کے سائے میں سو رہی تھیں۔ بوڑھی کتّے روما کو دیکھ کر اس کے استقبال کے لئے آگے بڑھے۔ بوڑھا تکلیف سے کراہ رہا تھا، ہم دونوں تمام رات اس کے سرہانے بیٹھے رہے، صبح اس کا انتقال ہو گیا، چاروں بہنیں روما سے لپٹ کر رونے لگیں، بڑا دردناک منظر تھا، آخر طے پایا کہ میں ان کے ساتھ تبت تک جاؤں میں سمجھتا تھا کہ میرے گھر والوں کو معلوم ہو گیا تو وہ ہرگز جانے نہ دیں گے کیونکہ تبت کے بارے میں ہمارے ہاں عام طور پر مشہور ہے کہ وہاں جا کر شاید ہی کوئی واپس آتا ہے، روما وغیرہ مجھ سے چار پانچ روز پہلے روانہ ہوئیں۔ بعد ازاں میں بھی چپکے سے آگے بڑھ کر ان کے ساتھ ہو لیا۔ ایک مہینے کے دشوار گزار سفر کے بعد کتنے پہاڑوں اور گھاٹیوں کو طے کر کے ہم تبت پہنچے، روما کے گاؤں میں سترہ اٹھارہ گھر تھے۔ وہ لوگ ایک اجنبی کو روما کے ساتھ دیکھ کر بہت برہم ہوئے۔ لیکن روما نے ان کو یہ کہہ کر اطمینان دلایا کہ میں انہیں صرف پہنچانے آیا ہوں۔ چند روز ٹھہر کر میں واپس چلا جاؤں گا، اسی دوران میں مجھے بخار آنے لگا۔ اور میں اسقدر نحیف و نزار ہو گیا کہ میرا بستر سے اٹھنا دشوار تھا، بے چاری روما میری حالت دیکھ کر گھبرا گئی۔ وہ رات دن میرے سرہانے بیٹھی میری صحت کی دعائیں مانگتی رہتی تھی۔ ایک روز کا ذکر ہے، بخار کا زور بڑھ رہا تھا اور مجھے گھر کی یاد آ رہی تھی۔ میں زور سے چلایا۔ روما۔ میں پردیس میں مروں گا۔ میرا یہاں کون ہے؟

میں بچوں کی طرح رونے لگا۔

روما نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ یہ کیا کہتے ہو کہ میرا یہاں کون ہے؟ میں تمہاری کوئی نہیں ہوں؟

میرا دل جذبۂ تشکر سے لبریز ہو گیا، نہ جانے کیوں ہم ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے۔ ملک اور قوم کا اختلاف بھی ہم دونوں کو محبت سے باز نہ رکھ سکا۔ ہم دونوں کو ایک آن کے لئے بھی آپس میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوا۔ میں نے جواب دیا۔ روما! اگر تم میری ہو تو میں گھر سے ہزاروں میل اور دنیا کے کسی گوشے میں بھی مروں اطمینان سے مر سکتا ہوں۔

روما کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں، اس کی محبت اور اس کی پُر خلوص خدمت و تیمارداری کی بدولت میری زندگی بچ گئی۔

ایک روز کا واقعہ ہے۔ رات اندھیری تھی، طوفان کے آثار نظر آ رہے تھے، روما ابھی تک جنگل سے واپس نہیں آئی تھی۔ میں مشعل لے کر اس کی تلاش میں نکلا، میں ابھی پہاڑ کی ٹیکری پر چڑھ رہا تھا کہ روما گھوڑا دوڑاتی ہوئی آ پہنچی۔ روتے روتے اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ اس نے کہا۔ جلدی سے گھوڑے پر سوار ہو جاؤ۔ جان کا خطرہ ہے۔

میری سمجھ میں نہ آیا کہ معاملہ کیا ہے، وہ بے حد گھبرائی ہوئی تھی۔ اس نے راستے میں کہا۔ تبتی میری جان کے درپے ہو رہے ہیں۔ ان کو یہ گوارا نہیں ہے کہ تم پردیسی ہو کر مجھ سے محبت کرو۔ مجھے اپنی جان کی تو پروا نہیں ہے۔ لیکن میرے لئے تم کیوں مارے جاؤ۔

وہ رونے لگی۔ ہائے، میں تمہیں اپنی جان سے بھی زیادہ محبت کرتی ہوں، تم اپنے ملک کو چلے جاؤ۔ اگر میں زندہ رہی تو اسی زندگی میں ملوں گی۔ ورنہ آئندہ زندگی میں سہی۔

اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ میں نے کہا۔ روما! یہ ناممکن ہے کہ میں تمہیں موت کے منہ میں چھوڑ کر چلا جاؤں۔ ہم دونوں ساتھ ہی مریں گے۔

اس نے کہا۔ اگر تم کو مجھ سے محبت ہے تو چلے جاؤ۔ میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتی۔ وہ میری بہنوں کو مار ڈالیں گے۔ جاؤ دیر نہ کرو۔ مجھے اپنی بہنوں کی حفاظت کرنی ہے۔

جب میں کسی طرح اس سے متفق نہ ہوا تو اس نے چمکتی ہوئی کٹار نکال کر کہا۔ تمہیں کس کی محبت روک رہی ہے؟ دیکھو میں موت سے ذرا بھی نہیں ڈرتی، میں اس طرح جان دے سکتی ہوں۔ وہ اپنے سینے میں کٹار بھونکنا ہی چاہتی تھی کہ میں نے کٹار چھین کر پھینک دی۔ اس نے میرے پاؤں سے لپٹ کر کہا۔ تم جاؤ۔ میں اپنی بہنوں کو بچا کر آتی ہوں۔

میں آگے بڑھا۔ وہ تاریکی میں بجلی کی طرح گم ہو گئی۔

میں ایک مہینے کے بعد گاؤں پہنچا۔ جاڑا آیا۔ تمام لاماؤں کے ڈیرے آ گئے۔ لیکن روما کا پتہ نہ چلا۔ میں دیوانہ سا ہو رہا تھا۔ برسوں گزر گئے، ایک روز کسی نے باہر سے جانی پہچانی آواز میں پکارا۔ دوست! اے دوست!

میں چونک پڑا، ہائے روما! اتنے دنوں کے بعد تم نے مجھ کو یاد کیا ہے، دوڑ کر باہر نکلا - کانوں نے تو دھوکہ کھایا ہی تھا - آنکھوں نے بھی دھوکہ کھایا - میں نے جس کو روما سمجھا تھا وہ اُس کی چھوٹی بہن تھی، وہ مجھ کو دیکھ کر رونے لگی - جیب سے کچھ نکال کر میرے ہاتھ پر رکھ دیا - کاغذ کی ایک پڑیا تھی، اس میں روما کی زلفوں کے سنہرے بال تھے - جن کو میں بہت پیار کیا کرتا تھا -

روما کی بہن سے معلوم ہوا کہ ان وحشیوں نے اسے مار ڈالا، وہ مرتے وقت اپنی بہن کو وصیت کر گئی تھی کہ وہ اس کی زلفیں کاٹ کر میرے پاس پہنچا دے - اس نے اپنی بہنوں کی حفاظت میں اپنے کو قربان کر دیا، معلوم ہوا اُس کی تمام بہنیں آرام و راحت سے زندگی گزار رہی ہیں -

اس روز سے میں تبتیوں کے خیموں کی طرف نہیں گیا -

بوڑھا یہاں تک بیان کرنے کے بعد خاموش ہو گیا، اُس نے اپنے گلے میں بندھا ہوا ایک تعویذ کھولا - اُس کے جھری دار ہاتھ میں سنہرے بالوں کی ایک لٹ تھی - جس پر اُس کی آنکھ سے آنسو کا ایک قطرہ ٹپک پڑا - برسوں کا مندمل زخم یک بیک ہرا ہو گیا، میں نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، وہ پتھر کے مجسمے کی طرح بے حس و حرکت تھا، ہوا کے سائیں سائیں کے جھونکوں میں ایک پکار سنائی دی - اس پکار کا مطلب کون بیان کر سکتا ہے؟

(اخذ و ترجمہ)

سرنیدر موہن ایم - اے

حُسن و عشق

آئینے میں جلوہ فرما کون ہے؟ بے خودِ ذوقِ تماشا کون ہے؟

کون ہے محوِ تغافل ہائے ناز؟ اور سرگرمِ تقاضا کون ہے؟

ہاں بتا آسودۂ محمل ہے کون؟ دست پیما، آبلہ پا کون ہے؟

گوشہ گیرِ خلوتِ ناموس کون؟ آہ بازاروں میں رسوا کون ہے؟

بسترِ گل پر ہے محوِ خوابِ کون؟ میہمانِ خارِ صحرا کون ہے؟

کون ہے مجلس فروزِ کبر و ناز؟ آستاں پر ناصیہ سا کون ہے؟

کون ہے گنجِ صدف کی آبرو؟ اضطرابِ موجِ دریا کون ہے؟

کون میخانے میں ہے ساغر بدست؟ تشنہ کام جامِ صہبا کون ہے؟

کون ہے عنوانِ مضمونِ نشاط؟ سُرخیٔ خونِ تمنّا کون ہے؟

بے نیازی میں ہے صادقؔ فرد کون؟
ناز برداری میں یکتا کون ہے؟

(آغا) صادق حسین صادقؔ

سرسیّد کی شخصیت اُن کی تصانیف میں

تحریر انسان کے جذبات کی تصویر ہوتی ہے مصنف جب اپنے جذبات کو الفاظ کا جامہ پہنا کر صفحات پر پیش کرتا ہے تو غیر شعوری طور پر اس کے ذہن اور جذبات کی خود بخود تشریح ہو جاتی ہے۔ اِسی لئے ہر مصنف کی تصنیف اس کی شخصیت کی بہترین ترجمان ہوتی ہے اور جتنا بلند پایہ مصنف ہوگا اتنی ہی اس کی تصنیف اس کی سچی تصویر ہوگی۔ کیونکہ وہ زیادہ تر اپنے ہی جذبات کا اظہار کریگا اس کے برخلاف کمتر درجہ کے مصنفین دوسروں کے دماغی نتائج پر اپنی تصانیف کی بنیاد قائم کرتے ہیں۔ ان میں جذبات جو تصنیف و تالیف کی جان ہوتے ہیں کم ملیں گے۔ تصنیف ایک آلہ ہے۔ جس کے ذریعہ ہم دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر سکتے ہیں۔ مثلاً تاج محل پر مختلف طبائع کے لوگ اظہار خیال کریں، ایک شخص کہے کہ "یہ حسین ترین عمارت دنیا کی حسین ترین عورت کو اپنے آغوش میں سلائے ہوئے ہے۔" اس خیال سے ظاہر ہے کہ یہ شخص شاعرانہ طبیعت رکھتا ہے۔ دوسرا شخص یوں کہے کہ "محبت غیر فانی ہے اور یہ عمارت اس کی دلیل ہے۔" اس طرزِ خیال میں فلسفیانہ رنگ ہے۔ اور بلیساختہ اس کو کسی فلسفی کا خیال کہا جاسکتا ہے۔

خیالات کے علاوہ طرزِ نگارش سے بھی مصنف کی شخصیت پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ ہر مصنف کو خاص تراکیب اور بندشوں کا شوق ہوتا ہے، بعض کو محاورات کا استعمال دلپسند تو بعض کو بعذرہ بھاتا ہے، کسی کو رنگینیٔ تحریر مرغوب ہوتی ہے تو کسی کو سادگی، کوئی رائج الوقت طرز کو اختیار کرتا ہے تو کوئی اپنی نئی طرز ایجاد کرتا ہے، غرض طرزِ تحریر سے بھی انسان کا رجحانِ طبع معلوم ہو سکتا ہے۔ بلکہ جب جوں انسان اپنی منزلِ حقیقی کی طرف پہنچتا ہے تو اس کی زندگی کا ہر رُخ اس کی تصانیف میں نظر آنے لگتا ہے۔

کسی شخصیت کو تصانیف سے معلوم کرنے کے لئے اس کی کل تصنیفات و تالیفات کو ادوار میں تقسیم کرنا چاہیئے اور ہر تصنیف میں شروع سے آخر تک یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس کے خیالات کس نوع کے ہیں۔ اِس کے دلائل کتنے پختہ ہیں، اس کی تفسیر زندگی کتنی صحیح ہے اور پھر بحیثیت مصنف اس کا کیا درجہ ہے؟

سرسیّد کے زمانے میں شاعری کا بہت چرچا تھا[1]۔ اِس لئے انہوں نے بھی عام دستور کے مطابق شاعری شروع کی۔ لیکن طبیعت اس کے لئے موزوں نہیں تھی۔ اس لئے ایک مثنوی کہہ کر چھوڑ دی۔ "ان کی سب سے پہلی تالیف "جامِ جم" ہے جو ۱۸۴۰ء میں شائع ہوئی۔ اس میں تیمور سے لے کر ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ تک مختلف خاندانوں کے تینتالیس[43] بادشاہوں کا سترہ سترہ خانوں میں حال لکھا ہے، اسی زمانے میں انہوں نے قوانینِ دیوانی کا خلاصہ کیا۔ تاکہ منصفی کا عہدہ مل جائے۔ اس کا نام "انتخاب الاخوین" رکھا۔

۱۸۴۲ء میں انہوں نے مسائلِ مذہبی لکھنے شروع کئے۔ اس سلسلہ کی سب سے پہلی کڑی رسالہ "جلاء القلوب بذکر المحبوب" ہے۔ جس میں آنحضرتؐ کی ولادت، وفات، معجزات وغیرہ کا بیان ہے۔ اس کی تصنیف کی وجہ یہ تھی کہ میلاد میں مولوی لوگ جو غلط روایات بیان کرتے تھے ان کی تصحیح ہو جائے۔

۱۸۴۳ء میں "تسہیل فی جر الثقیل" لکھا۔ یہ اردو ترجمہ ہے "معیار العقول" کا، اس کے علاوہ اور بھی رسائل لکھے۔ لیکن ان کی سب سے پہلی باقاعدہ تصنیف وہ ہے جو انہوں نے ضلع دہلی کی قدیم عمارتوں کے متعلق ۱۸۴۶ء میں لکھی۔ انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ وہ بزرگوں کے کارناموں سے بہت اثر پذیر ہوتی ہے۔ اسی کو مدِنظر رکھتے ہوئے سرسیّد نے دہلی اور اس کے اطراف کی عمارتوں کو مع تاریخ اور مقام لکھا تاکہ ہندوستانیوں کے دلوں میں ان کی گذشتہ شان و شوکت تازہ ہو۔ یہ کتاب جب رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں آر تھر ابرٹسن نے پیش کی تو اس کی کماحقہ قدر ہوئی۔ اس پر سرسیّد نے اس میں اور اضافے کئے اور ۱۸۵۴ء میں یہ "آثار الصنادید" ہو کر نکلی۔ اس کی تالیف میں بہت سے قدیم مخطوطات اور تذکروں سے مدد لی گئی ہے۔ اس میں لفظ

[1] مقالات شبلی۔

ہند کے مختلف معنی اور ہندوستان کی سب سے پہلی آبادی کا سن مقرر کیا ہے - ان کا خیال ہے کہ ہندوستان کی آبادی طوفان نوح کے بعد شروع ہوئی، یعنی دو ہزار تین سو اڑتالیس سال قبل مسیح، اس کے علاوہ لفظ دہلی کی تاریخ اور اس کے معنی مختلف زبانوں کی قدیم کتابوں سے بتائے ہیں، دہلی اور اس کے اطراف کی عمارات کے علاوہ زبان اردو کی تاریخ پر بھی کافی روشنی ڈالی ہے کتاب میں عمارتوں کے کتبے اور نقشے بھی درج ہیں اور مشاہیر دہلی کا بھی ذکر ہے -

آثار الصنادید سے ظاہر ہے کہ نوعیت مضمون کے لحاظ سے انہوں نے قدامت کے خلاف قدم اٹھایا - ان سے قبل تصنیف و تالیف میں تحقیق و اجتہاد کو دخل نہیں تھا - بلکہ دوسروں کے ماخذ یا غیروں کے خیالات پر اکتفا کی جاتی تھی - ہندوستان اور دہلی دونوں الفاظ پر مدلل بحث ، طوفان نوح کے بعد ہندوستان کا آباد ہونا ایسے مضامین ہیں جن پر متقدمین یا متاخرین میں سے کسی نے قلم نہیں اٹھایا، اس سے ثابت ہے کہ اس ہونہار ہستی کی ابتدا کتنی پختگی کے ساتھ ہوئی تھی اور بالغ نظری کے نشانات پہلی ہی تصنیف میں چمکنے لگے تھے - لیکن انسان پھر بھی انسان ہے - یہ نا ممکن ہے کہ اپنے قالب کو فوراً بدل دے - اس کی مثال ہمیں اسی آثار الصنادید میں ملتی ہے - اس میں سرسید نے اکثر جگہ نظیری اور بیدل کا طرز اختیار کیا ہے، اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی صحبت زیادہ تر مولانا صہبائی کے ساتھ رہتی تھی - جو خود بیدل کی طرز کے دلدادہ تھے بلکہ آثار الصنادید کا بعض حصہ صہبائی کا لکھا ہوا ہے - غرض اس تصنیف میں قدامت کی مخالفت ضرور ہے لیکن پھر بھی طرز نگارش میں وہی مغلق عبارت اور فارسی تراکیب موجود ہیں - حقیقت یہ ہے کہ ابتدائی تصانیف میں ماحول سے مکمل بغاوت نہیں ہو سکتی - چنانچہ دنیا کے ہر بڑے مصنف میں یہ بات پائی جاتی ہے -

سرسید کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ جس مضمون پر قلم اٹھاتے ہیں اس میں تحقیق و جستجو کا دامن کہیں نہیں چھوڑتے اور ان کی تحقیقات ہمیشہ غائر مطالعہ کا نتیجہ ہوتی ہیں، ان میں کہیں تعصب یا جانبداری نہیں بلکہ جو چیز وہ پیش کرتے ہیں وہ بہت قاطع دلائل کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ دلائل ایک نہایت سنجیدہ دماغ سے نکلی ہیں -

آثار الصنادید کے بعد سرسید نے "سلسلۃ الملوک" لکھی - جس میں پانچ ہزار برس پہلے تک کے راجاؤں کا تذکرہ جمع کیا اور اس سلسلے میں طوفان نوح کی تاریخ تحقیق کی کیونکہ ہندو اپنے زمانے کو اس سے بھی قدیم سمجھتے ہیں اور اس سے بھی پرانی کتابوں کا ذکر کرتے ہیں، ان کے برخلاف اہل کتاب اقوام کا یہ عقیدہ ہے کہ جو کچھ سلسلہ اب عالم میں ہے - وہ سب طوفان نوح کے بعد کا ہے، وہ قومیں جو طوفان نوح کی قائل نہیں چار ہیں - ایک ہندو، دوسرے چینی، تیسرے پارسی اور چوتھے اگلے زمانے کے ترک، پارسیوں کا عقیدہ ہے کہ یہ طوفان سارے عالم میں نہیں آیا - بلکہ صرف بابل اور اس کے قرب و جوار میں آیا تھا - لیکن سرسید نے توریت سے ثابت کیا کہ یہ طوفان سارے عالم میں آیا تھا، ان دونوں تصنیفات سے ظاہر ہے کہ سرسید کو تاریخ سے بہت دلچسپی تھی - ان کے علاوہ انہوں نے "تاریخ بجنور" لکھی — "آئین اکبری" کی تصحیح کی اور "تاریخ فیروز شاہی" کی اغلاط کو درست کیا -

سرسید کے زمانے میں مسلمان انتہائی قدامت پسند تھے — بزرگوں کے خلاف آواز بلند کرنا کفر سمجھا جاتا تھا - علوم و فنون کے علاوہ مذہب بھی محض تقلید کا نام تھا - معاشرت اور تہذیب میں دوسرے عناصر اس قدر داخل ہو گئے تھے کہ اسلامی خلوص کا شائبہ بھی نہیں رہا تھا - جس کے باعث معترضین نے ہر طرف سے اعتراضات کی بوچھار شروع کر دی تھی - سرسید نے اس کفر کو توڑا - اور تحقیق و اجتہاد کو فروغ دیا - بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مذہب پر سرسید کا حملہ بالعموم سخت ہوا کرتا تھا - یہ اعتراض سرسید کی تفسیر القرآن پر ہوتا ہے جس کے متعلق مولانا حالی اپنے ایک مضمون "سرسید کی مذہبی خدمات" میں یوں لکھتے ہیں - " اگرچہ ان کو اس تفسیر کے اکثر مقامات میں توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی جس سے ایک عجیب و غریب مذہبی قابلیت ان کے دماغ میں ثابت ہوتی ہے - مگر اس کے ساتھ بہت سے مقامات ان کی تفسیر میں ایسے بھی موجود ہیں جن کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ایسے عالی دماغ شخص کو کیونکر ایسی تاویلات پر اطمینان ہو گیا اور کیونکر ایسی فاش غلطیاں ان کے قلم سے سرزد ہوئیں؟ لیکن یہ درحقیقت کوئی تعجب کی بات نہیں - جن لوگوں نے تقلید کی بندشوں کو توڑ کر تحقیق کے میدان میں قدم رکھا اور قدما کے علم میں کچھ اضافہ کرنا چاہا ہے - ان سب کی رایوں میں اس قسم کی شتر گربگی پائی گئی ہے [1] - ان کی بعض باتوں پر الہامی ہونے کا گمان ہوتا ہے اور بعض انتہا درجہ کی رکیک اور پست معلوم ہوتی ہیں -"

[1] مقالات حالی

سرسید اس تفسیر کو پوری نہ کر سکے۔ سات جلدیں لکھیں۔ جن میں تقریباً نصف قرآن کی تفسیر ہے، جدید تعلیم نے ہر مذہب کے لوگوں میں دہریت پھیلا دی تھی۔ ہندو، مسلمان، عیسائی سب مذہب سے برگشتہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہونے لگے اور خود مسلمانوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ اسلام فطری مذہب نہیں ہے۔ سرسید نے اپنی تفسیر میں ہر جگہ اسلام کو فطری ثابت کیا اور بہت سی آیات کی تفسیر میں قدما سے اختلاف کیا، اس باب میں ان کا ذاتی عقیدہ یہ تھا کہ کوئی مذہب اگر دنیاوی ترقی کے مانع ہو یا ترقی یافتہ ممالک کی تہذیب سے ہم آہنگ نہ ہو تو وہ مذہب سچا نہیں ہو سکتا، دراصل ان کا زمانہ اقتصادی ترقی کا زمانہ تھا۔ صنعت و حرفت کے ماہرین نے ایسی چیزیں ایجاد کیں جو ایک حد تک انسان کے عقائد کو تزلزل میں ڈال دیتی ہیں اور مذہب کے بعض شعائر کمزور ہو گئے، سرسید نے اسلام کو اس کسوٹی پر پرکھا اور اس کو صحیح کر کے دکھایا۔ مگر انہوں نے مذہب کی کمزوری ثابت نہیں ہونے دی۔

سرسید کی معمولی قابلیت کا ثبوت "خطبات احمدیہ" میں ملتا ہے، یہ ان کے بارہ خطبوں کا مجموعہ ہے۔ جو انہوں نے سر ولیم میور کی "لائف آف محمدؐ" کے جواب میں لکھے۔ سر ولیم میور صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ کے لفٹننٹ گورنر تھے۔ اس کتاب کے متعلق عیسائیوں کا یہ خیال تھا کہ اسلام کو رد کرنے کے لئے کوئی کتاب اس سے زیادہ قاطع نہیں لکھی گئی، سرسید سے قبل مسلمان علماء اسلام کی صداقت کو ثابت کرنے کے لئے حدیث، فقہ، تفسیر اور علمائے سلف کی تصانیف کو کام میں لاتے تھے، قرآن مجید کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ یہ صرف تلاوت کے لئے ہے اور تفسیر لکھتے وقت یہ عقیدہ ہوتا تھا کہ مذہبی امور میں عقل کو مطلق استعمال نہیں کرنا چاہیئے۔ گویا اسلام کو محض دینی خوبیوں سے معمور ثابت کرتے تھے۔ دنیاوی خوبیوں کو اس میں دخل نہیں دیتے تھے۔ حالانکہ اسلام دونوں محاسن کا مجموعہ ہے، خطبات احمدیہ سرسید نے جس پیرایہ میں لکھے وہ بالکل نرالا ہے۔ انہوں نے عقل کی مدد لی اور علوم جدیدہ کی روشنی میں معترض کو جواب دیئے، یہ خطبات سرسید کی معرکتہ الآرا تصنیف سمجھے جاتے ہیں، ان میں اسلام کے اصول و عقاید پر نہایت مدلل بحث ہے۔ فدیہ، آزادیٔ رائے، غلامی، احادیث، فقہ، قرآن، معراج، آنحضرتؐ کا نسب وغیرہ کوئی چیز ایسی نہ تھی جس پر معترض نے جھوٹے الزام نہ لگائے ہوں، سرسید نے ان سب کا شافی جواب دیا اور یہ ثابت کیا کہ اسلام ہی صرف ایسا مذہب ہے جس نے انسانیت کو دینی اور دنیاوی فوائد پہنچائے، ان خطبات کی بدولت تعلیم یافتہ نوجوان عیسائیت کے دام سے بچ گئے، ان خطبات کو غیر جانبدار عیسائیوں نے بہت سراہا، ایک بہت بڑے عیسائی عالم ریورنڈ ہوپر نے جو ایک زمانے میں لاہور ڈیوانٹی کالج کے پرنسپل تھے کہا، "خطبات احمدیہ لکھنے سے سرسید احمد خاں نے اسلام کی ایک ایسی خدمت کی ہے جو تیرہ سو برس میں کسی مسلمان سے نہیں بن آئی۔" اسی طرح کرنل گریہم نے بھی سرسید کی زبردست علمی قابلیت اور صداقت کا اعتراف کیا۔

سرسید کے زمانے میں دعا مانگنے کا مسئلہ خوب چھڑا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ جو چیز مقدر ہے اس کے لئے دعا مانگنے کی کیا ضرورت ہے۔ انہوں نے اس کے جواب میں ۱۸۹۲ء میں ایک مختصر رسالہ "الدعا والاستجابتہ" مطبوعہ مفید عام آگرہ ہے۔ میں دعا اور اس کے مقبول ہونے کے باب میں جو اختلاف تھا اس پر بہت فاضلانہ بحث کی ہے اور 'دعا' اور 'ندا' کے لفظی اور معنوی اختلاف اور مماثلت کو سمجھایا ہے۔ "دعا[1] کا مفہوم یہ ہے کہ خدا سے کوئی چیز عاجزی سے مانگی جائے اور دعا کی ضرورت ہر انسان کو ہوتی ہے۔ کیونکہ کسی کو یہ علم نہیں ہوتا کہ فلاں چیز اس کے مقدر میں ہے یا نہیں۔ اس لئے دعا مانگنے کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ اگر وہ چیز اس کے مقدر میں ہے تو اللہ پاک استجابت دعا کے ذریعہ اس کو دے سکتا ہے۔"

سرسید جیسا پیش بیں شخص آج تک ہندوستان کے مسلمانوں میں نہیں ہوا۔ غدر کے بعد انگریز ہندوستانیوں کے بالعموم اور مسلمانوں کے بالخصوص دشمن ہو گئے تھے۔ ہر عیسائی کا یہ عقیدہ تھا کہ جب تک ہندوستانی مسلمانوں کو کچل نہیں دیا جائے گا اس وقت تک انگریز ہندوستان پر آرام سے حکومت نہیں کر سکیں گے۔ سرسید نے اس کا بہترین حل یہ سوچا کہ مسلمانوں کو انگریزوں سے دوستی کرنی چاہیئے اور چونکہ وہ اہل کتاب ہیں۔ اس لئے ان کے عقائد کا احترام اور ان کی معاشرت کی تحسین کرنی چاہیئے، انہوں نے اسلامی اصول کی روشنی میں ثابت کیا کہ مسلمان انگریز کا دشمن کسی طرح نہیں ہو سکتا اور یہ دشمنی محض غلط فہمی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ ہر مسلمان کو چاہیئے کہ عیسائیوں کے ساتھ میل جول رکھے، ان کی دعوتوں میں

[1] الدعا والاستجابتہ

شامل ہو، ان کو اپنے یہاں مدعو کرے اور اس طرح بغض و عناد کی اس خلیج کو پاٹ دیا جائے - اس کے برخلاف مسلمانوں میں اس وقت یہ عقیدہ پھیلا تھا کہ جو مسلمان عیسائیوں کے ساتھ کھانا کھا لیتا ہے وہ اسلامی گروہ سے خارج ہو جاتا ہے، سرسید نے اس بدگمانی کو دور کرنے کے لئے "احکام طعام اہل کتاب" مطبوعہ نولکشور ۱۸۶۸ء لکھی، اس میں ثابت کیا کہ طعام اہل کتاب بشرطیکہ محرمات شرعیہ میں نہ ہو مسلمانوں کو کھانا جائز ہے - خواہ ان کا بھیجا ہوا ہو یا پکا ہوا، اس کے ثبوت میں کلام پاک سے اقتباس کیا ہے اور مطالب المومنین کے حوالہ سے یہ بھی بتایا ہے کہ مسلمان اور مشرک بھی چہ جائیکہ اہل کتاب ایک جگہ بیٹھ کر کھا سکتے ہیں اور حلال چیز کو مسلمان، اہل کتاب یا کافر ایک رکابی میں کھائیں یا ایک کا جھوٹا دوسرا کھائے - بشرطیکہ کھانے کے وقت ان کا ہاتھ یا منہ کسی حرام چیز سے آلودہ نہ ہو، مسلمانوں کے مذہب میں یہ مسئلہ ہے کہ "جھوٹا آدمی کا پاک ہے"۔

ایک اعتراض مسلمانوں کا یہ تھا کہ عیسائیوں کا ذبیحہ جائز نہیں - اس کو سرسید نے فقہا کے حوالہ سے ثابت کیا کہ اگر نصاریٰ ذبح کے وقت "بسم اللہ الذی ثالث ثلاثہ" کہیں تو وہ ذبیحہ حرام ہوگا - ورنہ حلال، ایک اور مسئلہ بحث طلب تھا وہ یہ کہ جو گوشت ایک نصاری کے گھر سے مسلمان کے سامنے آجائے تو یہ کس طرح معلوم ہو کہ وہ مسلمان کا ذبح کیا ہوا ہے یا کسی کتابی نے مذکی کیا ہے یا کسی مشرک نے مارا ہے - کیونکہ انگریز مشرک کے مارے ہوئے جانور کو بھی کھاتے ہیں - اس کا جواب انہوں نے یہ دیا کہ جب اہل کتاب کے ساتھ یا ان کے یہاں طعام جائز ہے تو اس بات کی تفتیش کی کیا ضرورت ہے کہ یہ کس نے ذبح کیا ہے - لیکن چونکہ مشرک کے ہاتھ کا ذبیحہ ناجائز ہے - اس لئے میزبان سے پوچھ لیا جائے اور اگر وہ مشرک کا ذبیحہ ہے تو بموجب مذہب اہل سنت و الجماعت کے مشرکین میں کوئی نجاست ظاہری نہیں (شرح ہدایہ) اور جبکہ ہم ہندوؤں کے ہاتھ کا بلا تامل کھا لیتے ہیں - تو انگریزوں کے ہاں اگر مشرک کے ہاتھ کا بھی پکا ہوا ہو تو کھانے میں کیا حرج ہے - اس کے متعلق شاہ عبدالعزیز رح کا فتویٰ پیش کیا، جنہوں نے اس کے جواز کو مانا ہے، غرض مشرکوں سے محبت کرنا، اہل کتاب سے شادی کرنا، ان کی مجلسوں میں شریک ہونا بشرطیکہ وہ رسول خدا یا دین پر طعن نہ کریں جائز ہے - "ماں باپ کی تعظیم، ان سے محبت اور ان کی خدمت ہم پر واجب ہے اگرچہ وہ کافر ہوں -" ایسی مجلس میں جہاں مسلمان کا برتن اور کھانا تو پاک ہو لیکن دوسرے لوگ خنزیر اور شراب استعمال کر رہے ہوں تو وہاں کھانا ہی حرام نہیں - بلکہ اس مجلس کی شرکت بھی حرام ہے۔

مذہب انسان کے لئے بہترین رہنما اور مصلح زندگی ہوتا ہے لیکن مسلمانوں میں مذہب برائے نام تھا، اصل مذہب کی جگہ توہمات اور غیر عناصر نے لے لی تھی - خود علما کی یہ حالت تھی کہ لکیر کے فقیر بنے ہوئے تھے، تفسیر اور روایت میں بزرگوں کے اقوال سے ایک ذرہ پیچھے ہٹنا کفر سمجھتے تھے - اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی غلط روایات اور قصص مذہبی تصور کئے جانے لگے - مثلاً یاجوج ماجوج کی نسبت جو قصہ آج تک مشہور ہے اور جس کا ذکر قرآن شریف میں بھی ہے - سرسید نے اس کے متعلق ایک رسالہ "ازالۃ الغین عن ذوالقرنین" مطبوعہ مفید عام آگرہ ۱۳۰۷ھ لکھا، اس میں تاریخی نقطہ نظر سے یاجوج ماجوج پر روشنی ڈالی - اور اس کے بارے میں جو غلط تفاسیر ہیں ان کی تردید کی ہے - اس سلسلہ میں لفظ ذوالقرنین کی مورخانہ تحقیق کی اور آیات، احادیث اور تواریخ کے ذریعہ ذوالقرنین اور سکندر کا ایک ہونا غلط ثابت کیا، چین کی تاریخوں کے حوالے سے بتایا کہ چی، وانگ ٹی جو ۲۴۷ ق م میں تخت پر بیٹھا - اس نے وہ سد بنائی اور وہی ذوالقرنین تھا - اس کے علاوہ رسالہ میں یاجوج ماجوج کی اصلیت پر بھی بحث موجود ہے۔

اسی طرح اصحاب کہف کے متعلق مسلمانوں میں غلط اور بے بنیاد روایات مشہور تھیں - اس کی تردید کے لئے سرسید نے "تحریر فی قصہ اصحاب الکہف والرقیم" مطبوعہ مفید عام آگرہ ۱۳۰۷ھ لکھا - اصحاب کہف کے بارے میں مفسرین نے بھی بہت سی غلطیاں کیں - دراصل یہ قصہ آنحضرت صلعم کی بعثت کے قبل ایشیا اور روم کے عربوں اور عیسائیوں میں مشہور تھا - اس رسالہ میں لفظ رقیم پر مدلل بحث ہے اور ثابت کیا کہ اصحاب کہف عیسائی تھے جو ایک ظالم اور بت پرست بادشاہ کے ڈر سے جان بچا کر بھاگ گئے تھے لیکن اصحاب کہف دوسرے عیسائیوں کی طرح تثلیث کے قائل نہ تھے - بلکہ وہ خدا کو واحد اور عیسیٰ ع کو پیغمبر برحق مانتے تھے اور اس خیال کی بھی تردید کی ہے کہ اصحاب کہف پھر زندہ ہوئے، بطور ضمیمہ اس کے ساتھ "کیورس متعلق آف دی مڈل ایجز" مولفہ ایس

سرسیّد کی شخصیت اُنکی تصانیف میں

تحریر انسان کے جذبات کی تصویر ہوتی ہے۔ مصنف جب اپنے جذبات کو الفاظ کا جامہ پہنا کر صفحات پر پیش کرتا ہے تو غیر شعوری طور پر اس کے ذہن اور جذبات کی خود بخود تشریح ہو جاتی ہے۔ اسی لئے ہر مصنف کی تصنیف اس کی شخصیت کی بہترین ترجمان ہوتی ہے اور جتنا بلند پایہ مصنف ہوگا اتنی ہی اس کی تصنیف اس کی سچی تصویر ہوگی۔ کیونکہ وہ زیادہ تر اپنے ہی جذبات کا اظہار کریگا اس کے برخلاف کمتر درجہ کے مصنفین دوسروں کے دماغی نتائج پر اپنی تصانیف کی بنیاد قائم کرتے ہیں۔ ان میں جذبات جو تصنیف و تالیف کی جان ہوتے ہیں کم ملیں گے، تصنیف ایک آلہ ہے۔ جس کے ذریعہ ہم دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر سکتے ہیں۔ مثلاً تاج محل پر مختلف طبائع کے لوگ اظہار خیال کریں، ایک شخص کہے کہ "یہ حسین ترین عمارت دنیا کی حسین ترین عورت کو اپنے آغوش میں سلائے ہوئے ہے۔" اس خیال سے ظاہر ہے کہ یہ شخص شاعرانہ طبیعت رکھتا ہے۔ دوسرا شخص یوں کہے کہ "محبت غیر فانی ہے اور یہ عمارت اس کی دلیل ہے۔" اس طرزِ خیال میں فلسفیانہ رنگ ہے۔ اور بیساختہ اس کو کسی فلسفی کا خیال کہا جا سکتا ہے۔

خیالات کے علاوہ طرزِ نگارش سے بھی مصنف کی شخصیت پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ ہر مصنف کو خاص تراکیب اور بندشوں کا شوق ہوتا ہے، بعض کو محاورات کا استعمال دلپسند تو بعض کو بعذ بھاتا ہے، کسی کو رنگینیٔ تحریر مرغوب ہوتی ہے تو کسی کو سادگی، کوئی رائج الوقت طرز کو اختیار کرتا ہے تو کوئی اپنی نئی طرز ایجاد کرتا ہے غرض طرزِ تحریر سے بھی انسان کا رجحانِ طبع معلوم ہو سکتا ہے۔ بلکہ جوں جوں انسان اپنی منزلِ حقیقی کی طرف پہنچتا ہے تو اس کی زندگی کا ہر رُخ اس کی تصانیف میں نظر آنے لگتا ہے۔

کسی شخصیت کو تصانیف سے معلوم کرنے کے لئے اس کی کل تصنیفات و تالیفات کو ادوار میں تقسیم کرنا چاہئیے اور ہر تصنیف میں شروع سے آخر تک یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس کے خیالات کس نوع کے ہیں۔ اس کے دلائل کتنے پختہ ہیں، اس کی تفسیر زندگی کتنی صحیح ہے اور پھر بحیثیت مصنف اس کا کیا درجہ ہے؟[1]

سرسیّد کے زمانے میں شاعری کا بہت چرچا[2] تھا۔ اس لئے انہوں نے بھی عام دستور کے مطابق شاعری شروع کی۔ لیکن طبیعت اس کے لئے موزوں نہیں تھی۔ اس لئے ایک مثنوی کہہ کر چھوڑ دی۔ "ان کی سب سے پہلی تالیف" جامِ جم" ہے جو ۱۸۴۰ء میں شائع ہوئی۔ اس میں تیمور سے لے کر ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ تک مختلف خاندانوں کے تینتالیس[3] بادشاہوں کا ستره ستره خانوں میں حال لکھا ہے، اسی زمانے میں انہوں نے قوانینِ دیوانی کا خلاصہ کیا۔ تاکہ منصفی کا عہدہ مل جائے۔ اس کا نام "انتخاب الاخوین" رکھا۔

۱۸۴۲ء میں انہوں نے مسائلِ مذہبی لکھنے شروع کیے۔ اس سلسلہ کی سب سے پہلی کڑی رسالہ "جلاء القلوب بذکر المحبوب" ہے۔ جس میں آنحضرتؐ کی ولادت، وفات، معجزات وغیرہ کا بیان ہے۔ اس کی تصنیف کی وجہ یہ تھی کہ میلاد میں مولوی لوگ جو غلط روایات بیان کرتے تھے ان کی تصحیح ہو جائے۔

۱۸۴۳ء میں "تسہیل فی جر الثقیل" لکھا۔ یہ اردو ترجمہ ہے "معیار العقول" کا، اس کے علاوہ اور بھی رسائل لکھے۔ لیکن ان کی سب سے پہلی باقاعدہ تصنیف وہ ہے جو انہوں نے ضلع دہلی کی قدیم عمارتوں کے متعلق ۱۸۴۶ء میں لکھی۔ انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ وہ بزرگوں کے کارناموں سے بہت اثر پذیر ہوتی ہے۔ اسی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سرسیّد نے دہلی اور اس کے اطراف کی عمارتوں کو مع تاریخ اور مقام لکھا تاکہ ہندوستانیوں کے دلوں میں ان کی گذشتہ شان و شوکت تازہ ہو۔ یہ کتاب جب رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں آرتھر ابرٹسن نے پیش کی تو اس کی کما حقہ قدر ہوئی۔ اس پر سرسیّد نے اس میں اور اضافے کیے اور ۱۸۵۴ء میں یہ آثار الصنادید ہو کر نکلی۔ اس کی تالیف میں بہت سے قدیم مخطوطات اور تذکروں سے مدد لی گئی ہے۔ اس میں لفظ

[1] مقالات شبلی۔

ہند کے مختلف معنی اور ہندوستان کی سب سے پہلی آبادی کا سن مقرر کیا ہے۔ ان کا خیال ہے۔ کہ ہندوستان کی آبادی طوفان نوحؑ کے بعد شروع ہوئی، یعنی دو ہزار تین سو اڑتالیس سال قبل مسیح؛ اس کے علاوہ لفظ دہلی کی تاریخ اور اس کے معنی مختلف زبانوں کی قدیم کتابوں سے بتائے ہیں، دہلی اور اس کے اطراف کی عمارات کے علاوہ زبان اردو کی تاریخ پر بھی کافی روشنی ڈالی ہے۔ کتاب میں عمارتوں کے کتبے اور نقشے بھی درج ہیں اور مشاہیر دہلی کا بھی ذکر ہے۔

آثار الصنادید سے ظاہر ہے کہ نوعیت مضمون کے لحاظ سے انہوں نے قدامت کے خلاف قدم اٹھایا۔ ان سے قبل تصنیف و تالیف میں تحقیق و اجتہاد کو دخل نہیں تھا۔ بلکہ دوسروں کے ماخذ یا غیر وزنی خیالات پر اکتفا کی جاتی تھی۔ ہندوستان اور دہلی دونوں الفاظ پر مدلل بحث، طوفان نوحؑ کے بعد ہندوستان کا آباد ہونا ایسے مضامین ہیں جن پر متقدمین یا متاخرین میں سے کسی نے قلم نہیں اٹھایا۔ اس سے ثابت ہے کہ اس ہونہار ہستی کی ابتدا کتنی پختگی کے ساتھ ہو رہی تھی اور بالغ نظری کے نشانات پہلی ہی تصنیف میں چمکنے لگے تھے۔ لیکن انسان پھر بھی انسان ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ اپنے قالب کو فوراً بدل دے۔ اس کی مثال ہمیں اسی آثار الصنادید میں ملتی ہے۔ اس میں سرسید نے اکثر جگہ نظیری اور بیدل کا طرز اختیار کیا ہے، اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی صحبت زیادہ تر مولانا صہبائی کے ساتھ رہتی تھی۔ جو خود بیدل کی طرز کے دلدادہ تھے بلکہ آثار الصنادید کا بعض حصہ صہبائی کا لکھا ہوا ہے۔ غرض اس تصنیف میں قدامت کی مخالفت ضرور ہے لیکن پھر بھی طرز نگارش میں وہی مغلق عبارت اور فارسی تراکیب موجود ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ابتدائی تصانیف میں ماحول سے مکمل بغاوت نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ دنیا کے ہر بڑے مصنف میں یہ بات پائی جاتی ہے۔

سرسید کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ جس مضمون پر قلم اٹھاتے ہیں اس میں تحقیق و جستجو کا دامن کہیں نہیں چھوڑتے اور ان کی تحقیقات ہمیشہ غائر مطالعہ کا نتیجہ ہوتی ہیں، ان میں کہیں تعصب یا جانبداری نہیں بلکہ جو چیز وہ پیش کرتے ہیں وہ بہت قاطع دلائل کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ دلائل ایک نہایت سنجیدہ دماغ سے نکلی ہیں۔

آثار الصنادید کے بعد سرسید نے "الملوک" لکھی۔ جس میں پانچ ہزار برس پہلے تک کے راجاؤں کا تذکرہ جمع کیا اور اسی سلسلے میں طوفان نوحؑ کی تاریخ تحقیق کی کیونکہ ہندو اپنے زمانے کو اس سے بھی قدیم سمجھتے ہیں اور اس سے بھی پرانی کتابوں کا ذکر کرتے ہیں، ان کے برخلاف اہل کتاب اقوام کا یہ عقیدہ ہے کہ جو کچھ سلسلہ اب عالم میں ہے۔ وہ سب طوفان نوحؑ کے بعد کا ہے، وہ قومیں جو طوفان نوحؑ کی قائل نہیں چار ہیں۔ ایک ہندو، دوسرے چینی، تیسرے پارسی اور چوتھے اگلے زمانے کے ترک، پارسیوں کا عقیدہ ہے کہ یہ طوفان سارے عالم میں نہیں آیا۔ بلکہ صرف بابل اور اس کے قرب و جوار میں آیا تھا۔ لیکن سرسید نے توریت سے ثابت کیا کہ یہ طوفان سارے عالم میں آیا تھا، ان دونوں تصنیفات سے ظاہر ہے کہ سرسید کو تاریخ سے بہت دلچسپی تھی۔ ان کے علاوہ انہوں نے "تاریخ بجنور" لکھی۔ "آئین اکبری" کی تصحیح کی اور "تاریخ فیروز شاہی" کی اغلاط کو درست کیا۔

سرسید کے زمانے میں مسلمان انتہائی قدامت پسند تھے۔ بزرگوں کے خلاف آواز بلند کرنا کفر سمجھا جاتا تھا۔ علوم و فنون کے علاوہ مذہب بھی محض تقلید کا نام تھا۔ معاشرت اور تہذیب میں دوسرے عناصر اس قدر داخل ہو گئے تھے کہ اسلامی خلوص کا شائبہ بھی نہیں رہا تھا۔ جس کے باعث معترضین نے ہر طرف سے اعتراضات کی بوچھاڑ شروع کر دی تھی۔ سرسید نے اس کفر کو توڑا۔ اور تحقیق و اجتہاد کو فروغ دیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مذہب پر سرسید کا حملہ بالعموم سخت ہوا کرتا تھا۔ یہ اعتراض سرسید کی تفسیر القرآن پر ہوتا ہے جس کے متعلق مولانا حالی اپنے ایک مضمون "سرسید کی مذہبی خدمات" میں یوں لکھتے ہیں۔ "اگرچہ[1] ان کو اس تفسیر کے اکثر مقامات میں توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی جس سے ایک عجیب و غریب مذہبی قابلیت ان کے دماغ میں ثابت ہوتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ بہت سے مقامات ان کی تفسیر میں ایسے بھی موجود ہیں جن کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ایسے عالی دماغ شخص کو کیونکر ایسی تاویلات پر اطمینان ہو گیا اور کیونکر ایسی فاش غلطیاں ان کے قلم سے سرزد ہوئیں؟ لیکن یہ درحقیقت کوئی تعجب کی بات نہیں۔ جن لوگوں نے تقلید کی بندشوں کو توڑ کر تحقیق کے میدان میں قدم رکھا اور قدما کے علم میں کچھ اضافہ کرنا چاہا ہے۔ ان سب کی رایوں میں اس قسم کی شترگربگی پائی گئی ہے۔ ان کی بعض باتوں پر الہامی ہونے کا گمان ہوتا ہے اور بعض انتہا درجہ کی رکیک اور پست معلوم ہوتی ہیں۔"

[1] مقالات حالی

سرسید اس تفسیر کو پوری نہ کر سکے۔ سات جلدیں لکھیں۔ جن میں تقریباً نصف قرآن کی تفسیر ہے، جدید تعلیم نے ہر مذہب کے لوگوں میں دہریت پھیلا دی تھی۔ ہندو، مسلمان، عیسائی سب مذہب سے برگشتہ ۔۔۔۔ ہونے لگے اور خود مسلمانوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ اسلام فطری مذہب نہیں ہے۔ سرسید نے اپنی تفسیر میں ہر جگہ اسلام کو فطری ثابت کیا اور بہت سی آیات کی تفسیر میں قدما سے اختلاف کیا، اس باب میں ان کا ذاتی عقیدہ یہ تھا کہ کوئی مذہب اگر دنیاوی ترقی کے مانع ہو یا ترقی یافتہ ممالک کی تہذیب سے ہم آہنگ نہ ہو تو وہ مذہب سچا نہیں ہو سکتا، دراصل ان کا زمانہ اقتصادی ترقی کا زمانہ تھا۔ صنعت و حرفت کے ماہرین نے ایسی چیزیں ایجاد کیں جو ایک حد تک انسان کے عقائد کو متزلزل بنا دینے والی ہیں اور مذہب کے بعض شعائر کمزور ہو گئے، سرسید نے اسلام کو اس کسوٹی پر پرکھا اور اس کو صحیح کر کے دکھایا۔ مگر انہوں نے مذہب کی کمزوری ثابت نہیں ہونے دی۔

سرسید کی معمولی قابلیت کا ثبوت "خطبات احمدیہ" میں ملتا ہے، یہ ان کے بارہ خطبوں کا مجموعہ ہے۔ جو انہوں نے سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمدؐ" کے جواب میں لکھے۔ سر ولیم میور صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ کے لفٹنٹ گورنر تھے۔ اس کتاب کے متعلق عیسائیوں کا یہ خیال تھا کہ اسلام کو رد کرنے کے لئے کوئی کتاب اس سے زیادہ قاطع نہیں لکھی گئی، سرسید سے قبل مسلمان علما اسلام کی صداقت کو ثابت کرنے کے لئے حدیث، فقہ، تفسیر اور علمائے سلف کی تصانیف کو کام میں لاتے تھے، قرآن مجید کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ یہ صرف تلاوت کے لئے ہے اور تفسیر لکھتے وقت یہ عقیدہ ہوتا تھا کہ مذہبی امور میں عقل کو مطلق استعمال نہیں کرنا چاہئیے۔ گویا اسلام کو محض دینی خوبیوں سے معمور ثابت کرتے تھے۔ دنیاوی خوبیوں کو اس میں دخل نہیں دیتے تھے۔ حالانکہ اسلام دونوں محاسن کا مجموعہ ہے۔ خطبات احمدیہ سرسید نے جس پیرایہ میں لکھے وہ بالکل نرالا ہے۔ انہوں نے عقل کی مدد لی اور علوم جدیدہ کی روشنی میں معترض کو جواب دیئے، یہ خطبات سرسید کی معرکۃ الآرا تصنیف سمجھے جاتے ہیں، ان میں اسلام کے اصول و عقاید پر نہایت مدلل بحث ہے۔ قدریہ، آزادئ رائے، غلامی، احادیث، فقہ، قرآن، معراج، آنحضرتؐ کا نسب وغیرہ کوئی چیز ایسی نہ تھی جس پر معترض نے جھوٹے الزام نہ لگائے ہوں، سرسید نے ان سب کا شافی جواب دیا اور یہ ثابت کیا کہ اسلام ہی صرف ایسا مذہب ہے جس نے انسانیت کو دینی اور دنیاوی فوائد پہنچائے۔ ان خطبات کی بدولت تعلیم یافتہ نوجوان عیسائیت کے دام سے بچ گئے، ان خطبات کو غیر جانبدار عیسائیوں نے بہت سراہا، ایک بہت بڑے عیسائی عالم ریورنڈ ہوپر نے جو ایک زمانے میں لاہور ڈیوائنٹی کالج کے پرنسپل تھے کہا۔ "خطبات احمدیہ لکھنے سے سرسید احمد خاں نے اسلام کی ایک ایسی خدمت کی ہے جو تیرہ سو برس میں کسی مسلمان سے نہیں بن آئی۔" اسی طرح کرنل گریہم نے بھی سرسید کی زبردست علمی قابلیت اور صداقت کا اعتراف کیا۔

سرسید کے زمانے میں دعا مانگنے کا مسئلہ خوب چھڑا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ جو چیز مقدر ہے اس کے لئے دعا مانگنے کی کیا ضرورت ہے۔ انہوں نے اس کے جواب میں ۱۸۹۲ء میں ایک مختصر رسالہ[1] "الدعا والاستجابۃ" مطبوعہ مفید عام آگرہ۔ میں دعا اور اس کے مقبول ہونے کے باب میں جو اختلاف تھا اس پر بہت فاضلانہ بحث کی ہے اور 'دعا' اور 'ندا' کے لفظی اور معنوی اختلاف اور مماثلت کو سمجھایا ہے۔ "دعا کا مفہوم یہ ہے کہ خدا سے کوئی چیز عاجزی سے مانگی جائے اور دعا کی ضرورت ہر انسان کو ہوتی ہے۔ کیونکہ کسی کو یہ علم نہیں ہوتا کہ فلاں چیز اس کے مقدر میں ہے یا نہیں۔ اس لئے دعا مانگنے کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ اگر وہ چیز اس کے مقدر میں ہے تو اللہ پاک استجابت دعا کے ذریعہ اس کو دے سکتا ہے۔"

سرسید جیسا پیش بین شخص آج تک ہندوستان کے مسلمانوں میں نہیں ہوا۔ غدر کے بعد انگریز ہندوستانیوں کے بالعموم اور مسلمانوں کے بالخصوص دشمن ہو گئے تھے۔ ہر عیسائی کا یہ عقیدہ تھا کہ جبتک ہندوستانی مسلمانوں کو کچل نہیں دیا جائے گا اس وقت تک انگریز ہندوستان پر آرام سے حکومت نہیں کر سکیں گے۔ سرسید نے اس کا بہترین حل یہ سوچا کہ مسلمانوں کو انگریزوں سے دوستی کرنی چاہئیے اور چونکہ وہ اہل کتاب ہیں۔ اس لئے ان کے عقائد کا احترام اور ان کی معاشرت کی تحسین کرنی چاہئیے، انہوں نے اسلامی اصول کی روشنی میں ثابت کیا کہ مسلمان انگریز کا دشمن کسی طرح نہیں ہو سکتا اور یہ دشمنی محض غلط فہمی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ ہر مسلمان کو چاہئیے کہ عیسائیوں کے ساتھ میل جول رکھے، ان کی دعوتوں میں

[1] الدعا والاستجابۃ

شامل ہو، ان کو اپنے یہاں مدعو کرے اور اس طرح بغض و عناد کی اس خلیج کو پاٹ دیا جائے۔ اس کے برخلاف مسلمانوں میں اس وقت یہ عقیدہ پھیلا تھا کہ جو مسلمان عیسائیوں کے ساتھ کھانا کھا لیتا ہے۔ وہ اسلامی گروہ سے خارج ہو جاتا ہے، سر سید نے اس بدگمانی کو دور کرنے کے لئے "احکام طعام اہلِ کتاب" مطبوعہ نولکشور ۱۸۶۸ء لکھی، اس میں ثابت کیا کہ طعام اہلِ کتاب بشرطیکہ محرمات شرعیہ میں نہ ہو، مسلمانوں کو کھانا جائز ہے۔ خواہ ان کا بھیجا ہوا ہو یا پکا ہوا، اس کے ثبوت میں کلام پاک سے اقتباس کیا ہے اور مطالب المومنین کے حوالہ سے یہ بھی بتایا ہے کہ مسلمان اور مشرک بھی چہ جائیکہ اہلِ کتاب ایک جگہ بیٹھ کر کھا سکتے ہیں اور حلال چیز کو مسلمان، اہلِ کتاب یا کافر ایک رکابی میں کھائیں یا ایک کا جھوٹا دوسرا کھائے۔ بشرطیکہ کھانے کے وقت ان کا ہاتھ یا منہ کسی حرام چیز سے آلودہ نہ ہو، مسلمانوں کے مذہب میں یہ مسئلہ ہے کہ "جھوٹا آدمی کا پاک ہے"۔

ایک اعتراض مسلمانوں کا یہ تھا کہ عیسائیوں کا ذبیحہ جائز نہیں۔ اس کو سر سید نے فقہا کے حوالہ سے ثابت کیا کہ اگر نصاریٰ ذبح کے وقت "بسم اللہ الذی ثالث ثلاثہ" کہیں تو وہ ذبیحہ حرام ہوگا ورنہ حلال، ایک اور مسئلہ بحث طلب تھا وہ یہ کہ جو گوشت ایک نصاریٰ کے گھر سے مسلمان کے سامنے آئے تو یہ کس طرح معلوم ہو کہ وہ مسلمان کا ذبح کیا ہوا ہے یا کسی کتابی نے مزکی کیا ہے یا کسی مشرک نے مارا ہے۔ کیونکہ انگریز مشرک کے مارے ہوئے جانور کو بھی کھا لیتے ہیں۔ اس کا جواب انہوں نے یہ دیا کہ جب اہلِ کتاب کے ساتھ یا ان کے یہاں طعام جائز ہے تو اس بات کی تفتیش کی کیا ضرورت ہے کہ یہ کس نے ذبح کیا ہے۔ لیکن چونکہ مشرک کے ہاتھ کا ذبیحہ ناجائز ہے۔ اس لئے میزبان سے پوچھ لیا جائے اور اگر وہ مشرک کا ذبیحہ ہے تو بموجب مذہب اہل سنت والجماعت کے مشرکین میں کوئی نجاست ظاہری نہیں (شرح ہدایہ) اور جبکہ ہم ہندوؤں کے ہاتھ کا بلا تامل کھا لیتے ہیں۔ تو انگریزوں کے ہاں اگر مشرک کے ہاتھ کا بھی پکا ہوا ہو تو کھانے میں کیا حرج ہے۔ اس کے متعلق شاہ عبد العزیزؒ کا فتویٰ پیش کیا، جنہوں نے اس کے جواز کو مانا ہے، غرض مشرکوں سے محبت کرنا، اہلِ کتاب سے شادی کرنا، ان کی مجلسوں میں شریک ہونا بشرطیکہ وہ رسولِ خدا یا دین پر طعن نہ کریں جائز ہے۔ "ماں باپ کی تعظیم، ان سے محبت اور ان کی خدمت ہم پر واجب ہے اگرچہ وہ کافر ہوں۔" ایسی مجلس میں جہاں مسلمان کا برتن اور کھانا تو پاک ہو لیکن دوسرے لوگ خنزیر اور شراب استعمال کر رہے ہوں تو وہاں کھانا ہی حرام نہیں۔ بلکہ اس مجلس کی شرکت بھی حرام ہے۔

مذہب انسان کے لئے بہترین رہنما اور مصلح زندگی ہوتا ہے لیکن مسلمانوں میں مذہب برائے نام تھا، اصل مذہب کی جگہ توہمات اور غیر عناصر نے لے لی تھی۔ خود علما کی یہ حالت تھی کہ لکیر کے فقیر بنے ہوئے تھے، تفسیر اور روایت میں بزرگوں کے اقوال سے ایک ذرہ پیچھے ہٹنا کفر سمجھتے تھے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی غلط روایات اور قصص مذہبی تصور کئے جانے لگے۔ مثلاً یاجوج ماجوج کی نسبت جو قصہ آج تک مشہور ہے اور جس کا ذکر قرآن شریف میں بھی ہے۔ سر سید نے اس کے متعلق ایک رسالہ "ازالۃ الغین عن ذو القرنین" مطبوعہ مفید عام آگرہ ۱۳۰۷ھ لکھا، اس میں تاریخی نقطۂ نظر سے یاجوج ماجوج پر روشنی ڈالی۔ اور اس کے بارے میں جو غلط تفاسیر ہیں ان کی تردید کی۔ اس سلسلہ میں لفظ ذوالقرنین کی مورخانہ تحقیق کی اور آیات، احادیث اور تواریخ کے ذریعہ ذوالقرنین اور سکندر کا ایک ہونا غلط ثابت کیا، چین کی تاریخوں کے حوالے سے بتایا کہ چی وانگ ٹی جو ۲۴۷ ق م میں تخت پر بیٹھا۔ اس نے وہ سد بنائی اور وہی ذوالقرنین تھا۔ اس کے علاوہ رسالہ میں یاجوج ماجوج کی اصلیت پر بھی بحث موجود ہے۔

اسی طرح اصحاب کہف کے متعلق مسلمانوں میں غلط اور بے بنیاد روایات مشہور تھیں۔ اس کی تردید کے لئے سر سید نے "ترقیم فی قصہ اصحاب الکہف والرقیم" مطبوعہ مفید عام آگرہ ۱۳۰۷ھ لکھا۔ اصحاب کہف کے بارے میں مفسرین نے بھی بہت سی غلطیاں کیں۔ دراصل یہ قصہ آنحضرتؐ کی بعثت کے قبل الشیا اور تمام کے عربوں اور عیسائیوں میں مشہور تھا۔ اس رسالہ میں لفظ رقیم پر مدلل بحث ہے اور ثابت کیا کہ اصحاب کہف عیسائی تھے جو ایک ظالم اور بت پرست بادشاہ کے ڈر سے جان بچا کر بھاگ گئے تھے لیکن اصحاب کہف دوسرے عیسائیوں کی طرح تثلیث کے قائل نہ تھے۔ بلکہ وہ خدا کو واحد اور عیسیٰؑ کو پیغمبر برحق مانتے تھے اور اس خیال کی بھی تردید کی ہے کہ اصحاب کہف پھر زندہ ہوئے، بطور ضمیمہ اس کے ساتھ "کیورس متھس آف دی مڈل ایجز" مؤلفہ ایس

بورنگ گولڈ کا ترجمہ بھی شامل ہے ۔

مسلمانوں میں اب تک ایک مخلوق کا وجود مانا جاتا ہے جو آتشی کہلاتی ہے ، سرسید نے اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے "تفسیر الجن والجان علی مافی القرآن" لکھی ۔ جو مفید عام آگرہ ۱۳۰۹ھ میں طبع ہوئی ۔ انہوں نے کلام مجید میں جو اجنّا کا ذکر ہے اس کو بھی وضاحت سے بیان کیا ، ان کے نزدیک اجنا سے وہ لوگ مراد ہیں جو عرب کے وحشی مطلق تھے اور پہاڑوں میں رہتے تھے ۔ اپنے دعوے کی تصدیق کے لئے انہوں نے بہت سی قدیم کتابوں کے حوالے دئے ہیں ۔

غرض سرسید نے اسلام کو عقاید باطلہ سے پاک کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا ۔ اور متعصب اور مشکل .... انسانوں پر یہ واضح کر دیا کہ اسلام ہر ملک اور ہر زمانے کے لئے بہترین ترقی پسند مذہب ہے ، اس باب میں سرسید کا خود نظریہ یہ تھا کہ جو مذہب شخصی یا ملکی ترقی میں مانع ہو وہ صحیح مذہب نہیں ہو سکتا ۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ ان معترضین نے سرسید کو سمجھنے میں غلطی کی ، سرسید سے تفسیر القرآن میں جو لغزشیں ہوئی ہیں ان کی نوعیت دیکھنی چاہیئے مثلاً انہوں نے تعداد ازدواج کی مخالفت کی ۔ حالانکہ اسلام نے اس چیز کو بضرورت جائز رکھا ہے ، انہوں نے دراصل اس کی مخالفت نہیں کی ۔ بلکہ اس مخالفت کو سمجھایا جو خود مذہب نے کی ہے ، انہوں نے اس کی حمایت میں عیسائی معترضین کو دندان شکن جواب دئیے ۔

سرسید بہت ہی زمانہ شناس اور دور اندیش تھے ۔ غدر کے بعد کوئی انگریز ہندوستان یا انگلستان میں ایسا نہ تھا جو مسلمانوں کو اپنا دشمن نہ سمجھتا ہو بلکہ غدر کے ذمہ دار ایک حد تک مسلمان ہی قرار پائے ، سرسید فوراً تاڑ گئے کہ اگر یہ غلط فہمی جلد دور نہ کی گئی تو مسلمانوں کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا ۔ حالانکہ انکا ذاتی نظریہ یہ تھا کہ اہل کتاب اقوام میں دشمنی نہیں ہو سکتی ۔ کیونکہ ہر اہل کتاب توحید کے معاملہ میں متفق ہے اس لئے مذہبی بنا پر ان میں تفرقہ نہیں ہو سکتا ۔ لیکن چونکہ گمراہ کن پروپیگنڈے کا اثر ہو چکا تھا اس لئے اس کے دور کرنے کے لئے انہوں نے "تبئین الکلام" لکھی ۔ جو مکمل نہیں ہو سکی ۔ اس میں عیسائیت ، یہودیت اور آسمانی کتب کی تطبیق کی گئی ہے ۔ تاکہ تفرقہ کی یہ خلیج حائل نہ رہے ، اسی طرح مسلمانوں کو تعصب سے نکالنے کے لئے انہوں نے انجیل کا ترجمہ کیا جسکے ساتھ تفسیر بھی شامل تھی ۔ اس کی صرف دو جلدیں شائع ہوئیں ، مالی مشکلات باقی جلدوں کی اشاعت میں مانع ہوئیں ، اس تفسیر کے متعلق گارساں دی تاسی اپنے ایک خطبہ اردو لٹریچر میں کہتا ہے " میں اپنے آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ یہ کتاب ایسی زبان میں لکھی گئی ہے جس کا سکھانا میرا فرض ہے ۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ یہ پہلا ہی موقع ہے کہ کسی مسلمان نے صرف اردو میں ہی نہیں بلکہ ایشیا کی کسی زبان میں اس قسم کے مضمون پر ایسی بسیط اور مکمل بحث کی ہو " اس کے ترجمے انگریزی میں ہوئے تاکہ انگریز مسلمانوں کے خیالات انجیل کے متعلق جانیں اور حاکم و محکوم کے دلوں میں صفائی ہو جائے ۔ چنانچہ ان تمام تصانیف کا وہی اثر ہوا جو سرسید چاہتے تھے ۔ انگریزوں کی غلط فہمی بڑی حد تک دور ہو گئی ۔

سرسید پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ وہ بیحد سرکار پرست تھے اور انہوں نے ملک کی جنگ آزادی سے مسلمانوں کو الگ کر کے رخنہ ڈالا ، اس میں شک نہیں کہ وہ سرکار پرست تھے ۔ لیکن ان کی سرکار پرستی اس لئے تھی کہ اس وقت ہندوستانیوں کی جہالت کو درست کرنے کے لئے ایک مہذب حکومت کی ضرورت تھی اور اسی سرکار پرستی میں انہوں نے ہندوستانیوں کو وہ فوائد پہنچائے جس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں کم ملے گی ۔ وہ حکومت کے غلام نہیں تھے ۔ بلکہ دوست تھے اور وہ یہ چاہتے تھے کہ حاکم و محکوم میں دوستی ہو تاکہ حکمران کسی مغالطہ کے سبب رعایا پر ظلم نہ کر سکیں ، یہ اس کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے " اسباب سرکشی ہند" کا جواب لکھا ۔ ایسے موقع پر جبکہ حکومت کے خلاف ایک لفظ نکالنا بھی جرم عظیم سمجھا جاتا تھا ، بغاوت کے اسباب اتنی ہمت اور صداقت کے ساتھ لکھنا کسی معمولی شخصیت کا کام نہیں ، انگریزوں نے جو بغاوت کے اسباب مقرر کئے تھے ۔ سرسید نے ان کو باطل کیا اور صحیح اسباب پیش کئے ۔ مثلاً سب سے پہلے انہوں نے سرکشی کے معنی بتلائے اور تحریر کیا کہ سرکشی کیوں ہوتی ہے ۔ انہوں نے ثابت کیا کہ غدر سرکشی نہیں ہوتی ہے ۔ اس کے علاوہ انگریزوں کا خیال تھا کہ اس بغاوت میں روس اور ایران بھی شامل تھے ۔ اس کی بھی انہوں نے تردید کی ، اور اس اشتہار کو جو شاہزادۂ ایران کے خیمہ میں نکلا اس کو بغاوت سے غیر متعلق ثابت کیا ، انہوں نے بغاوت کے اسباب حسب ذیل بتلائے ۔ دلّی میں جو جہاد کا فتویٰ دیا گیا تھا اس کو بغاوت سے کوئی سروکار نہیں تھا ، بغاوت کی پہلی وجہ یہ تھی کہ حکومت نے ہندوستانیوں کو مجالس قوانین ساز میں کوئی جگہ نہیں دی تھی ۔ دوسرا یہ کہ حکومت غیر معلوم طریقے سے مذہب میں مداخلت کرنے لگی تھی ۔ مثلاً سکندر سے

بلیں کم عمر بچوں کو عیسائی بنا لیا گیا اور خود حکام نے باقاعدہ تبلیغ شروع کر دی تھی، حکومت نے ہندوستانیوں کی تعلیم کے لئے دیہاتوں میں مکاتیب قائم کئے۔ لیکن ہندوستانی یہ سمجھے کہ پڑھ کر یہ ہمارے بچے عیسائی ہو جائیں گے۔ حکومت نے تعلیم نسواں کے ادارے بھی کھولے ان کے متعلق ہندوستانی سمجھے کہ عورتیں بھی پڑھ کر عیسائی ہو جائیں گی۔ بڑے کالجوں کے طریقہ تعلیم میں تبدیلی ہوئی۔ جیلخانوں میں اختلاط اکل و شرب شروع ہوا، پادری ایڈمنڈ کے خطوط ہندوستانی افسروں کے نام کہ ہندوستان کا مذہب ایک کر دیا جائے۔ ۱۸۵۰ء کے ایکٹ کے ذریعے مجالس قوانین ساز سے مذہب میں دخل اندازی ہوئی۔ عورتوں کو حق آزادی دیا گیا، معافی کی زمین کا ضبط ہونا، قانون اشامپ کا رائج ہونا جس کی مخالفت انگلستان میں لارڈ بروم اور مل کر چکے تھے۔ مفلسی علی الخصوص مسلمانوں کی، خیراتی پنشن اور انعام کا بند ہو جانا، کمپنی لمیٹڈ سے ملک کی زبوں حالی، ہندوستانیوں سے نفرت کرنا، حکام ضلع کی بدمزاجی و بد زبانی، ہندو اور مسلمانوں کی مخلوط پلٹنیں وغیرہ۔

سرسید نے جو اسباب بغاوت ظاہر کئے۔ ان میں کہیں انگریزوں کو ظالم قرار نہیں دیا۔ بلکہ جو صداقت تھی پیش کر دی۔ اس سے ان کی اخلاقی جرأت اور ہندوستانیوں سے محبت ثابت ہوتی ہے۔ گو وہ خود حکومت کے ایک عہدے پر فائز تھے۔ لیکن ان کے دل نے یہ گوارا نہیں کیا کہ ہندوستانیوں کے سر سے اس الزام کو نہ ہٹائیں۔ بلکہ بےخوف ہو کر وہ تمام واقعات حکومت کے سامنے پیش کر دئے۔ جس کی اس زمانے میں کسی کو ہمت نہیں ہو سکتی تھی۔

سرسید ہندوستان کے بہت ہی دور اندیش ماہر تعلیم تھے۔ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ قومی ترقی اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ قومی زندگی کے ہر شعبہ کو آلودگیوں سے پاک نہ کر دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے مذہب، تعلیم، معاشرت، تاریخ، ادب اور اقتصادی حالت وغیرہ سب پر لکھا، مذہب کے متعلق جو گرانمایہ تصانیف ان کی قلم سے نکلیں۔ ان کا خلاصہ اوپر بیان ہو چکا، اب ہم تعلیمی مسئلہ میں ان کی شخصیت کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس راہ میں انہوں نے جو خدمت اور قربانی کی وہ شہرہ آفاق ہیں۔ لیکن مختصر طریقے سے ہم ان کے خیالات بیان کئے دیتے ہیں۔

مسلمانوں کی قومی ترقی کے لئے اعلیٰ تعلیم، قومی ہمدردی اور عمدہ تربیت کی ضرورت تھی، ان تین مقاصد کی تکمیل کے لئے سرسید کی رائے تھی کہ مسلمانوں کی ایک اعلیٰ درسگاہ ہو جہاں یورپین اور ہندوستانی پروفیسر ہوں اور اس سے ساتھ وسیع دارالاقامہ بھی ہوں، ابتدا میں وہ عام تعلیم کے خلاف تھے۔ اس مسئلہ میں ان کی یہ رائے تھی کہ اول اعلیٰ طبقوں میں تعلیم ہو۔ اس کے بعد چھوٹے طبقوں میں تعلیم خود بخود پھیل جائے گی۔ اس لئے وہ متفرق اسکول اور مدارس کھولنے کے مخالف تھے۔ کیونکہ قدرت کا قاعدہ ہے کہ ادنیٰ اعلیٰ کی پیروی کرتا ہے نہ کہ اعلیٰ ادنیٰ کی۔ ان کو یقین تھا کہ اگر مسلمان متفرق اسکول کھولیں گے تو ان میں کا ہر اسکول ہائی اسکول نہیں ہو سکے گا۔ بعض مڈل اسکول ہی رہیں گے۔ لہذا ایک مڈل اسکول کے طالب علم کا دماغ اتنا وسیع نہیں ہو گا جتنا کہ مڈل کلاس کے اس لڑکے کا جو ہائی اسکول میں تعلیم پاتا ہو، اس کے علاوہ ایک واحد قومی درسگاہ کا یہ فائدہ ہو گا کہ مسلمان طلبا ایک جگہ رہیں گے اور ان کے قومی جذبات وہاں کسی طرح دب نہیں سکیں گے۔ لیکن اگر مسلمان طلبا مختصر تعداد میں متفرق مشن یا گورنمنٹ اسکولوں میں ہونگے تو وہاں ان کے قومی جذبات ترقی نہیں کریں گے۔ کیونکہ دوسرے اسکولوں میں بہت سے مواقع پر اظہار خیال میں آزادی نہیں ہو گی۔ دوسرے یہ کہ بعض مسائل ایسے ہوتے ہیں جو دوسری قوموں سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ اس لئے ان پر محض مسلمان طلبا کی وجہ سے کوئی توجہ نہیں دی جائیگی۔ اس لئے مسلمانوں کے لئے ایک واحد درسگاہ کا ہونا ضروری ہے تاکہ وہاں مسلمان لڑکوں کو اسلامی تہذیب و تمدن سے دلچسپی ہو اور وہ اجتماعی زندگی کا اصول سیکھیں۔ یہ خیالات انہوں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسہ میں ظاہر کئے۔

سرسید نے مسلمانوں کی تعلیم کے لئے جو قربانیاں کیں۔ آج اس کا پھل ہندوستان کی ہر قوم کو بالعموم اور مسلمانوں کو بالخصوص مل رہا ہے، تعلیم کے بارے انہوں نے جو رائے قائم کی، اس کے بعد اسی پر عمل ہوا، اس سے ثابت ہے کہ وہ کس قدر صائب الرائے تھے۔ انہوں نے جس استقلال اور ہمت و صبر سے کام لیا اس کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہے کہ جب انہوں نے انگلستان کے نظام تعلیم کے مطالعہ کے لئے وہاں جانے کا قصد کیا تو مالی حالت نے عرصہ تک اجازت نہ دی۔ اتفاق سے حکومت نے چھ وظائف کا انگلستان میں اعلیٰ تعلیم کے لئے اعلان کیا، ان میں سے ایک سید محمود کو مل گیا۔ اس سے انہیں بہت تقویت ہوئی اور کچھ اپنی لائبریری اور فرنیچر فروخت کر کے انگلستان گئے اور وہاں اٹھارہ مہینہ تک نظام

تعلیم کا بغور مطالعہ کیا اور واپس آکر آکسفورڈ کی طرز پر مدرسۃ العلوم کی بنیاد ڈالی، پختگیٔ ارادہ، بلند ہمتی، ایثار، اخوت اور قربانی کی ایسی مثال دنیا میں کم ملے گی، ان کے مذہبی تخیل اور مدرسۃ العلوم کی بنیاد نے ایک وقت ان پر کفر کا فتویٰ لگوایا، لیکن آج مسلم یونیورسٹی کے اس عظیم الشان بانی کا تصور قلوب میں ایک بے انتہا جذبۂ تشکر پیدا کر دیتا ہے۔

سرسید نے ایک رسالہ "قول متین در ابطال حرکت زمین" مطبوعہ سید الاخبار ۱۲۶۵ھ لکھا۔ اس میں انہوں نے اس قدیم نظریہ کی کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے، تردید کی اور یونانیوں کے جتنے نظریے تھے ان کو باطل قرار دیا۔ انہوں نے منطقیانہ دلائل سے ثابت کیا کہ زمین نہیں گھومتی ہے۔ مثلاً ایک دلیل یہ ہے کہ زمین کے لئے ارادہ نہیں ہے اور جس چیز کے لئے ارادہ نہ ہو وہ حرکت مستدیرہ نہیں کیا کرتی۔ کیونکہ حرکت مستدیرہ بغیر ارادے کے نہیں ہو سکتی۔ زمین کی حرکت سالانہ کا بھی ابطال کیا، اس کی دلیل یہ پیش کی کہ سالانہ حرکت غیر متناہی حرکت ہے۔ وہ جسمانی قاسر سے صادر نہیں ہو سکتی۔

زمین کی حرکت علم جغرافیہ کی رو سے مسلمہ ہے، اس باب میں سرسید سے ضرور لغزش ہوئی اور انہوں نے اس کا اعتراف بھی کیا۔

مسلمانوں کی وضعداری اور خاندانی نفاق نے انہیں بہت تباہ کیا، غدر کے بعد آمدنی کم ہو گئی تھی، لیکن وضعداری کے خیال سے اخراجات اسی پیمانہ پر تھے، جائدادیں فروخت ہو رہی تھیں اور ریاستیں یا تو قرضہ کی نذر ہو رہی تھیں یا ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ان کی قیمت میں کمی ہو رہی تھی، سرسید نے مسلمانوں کی جائداد اور ریاست کو فروختگی اور ہاتھ سے نہ نکلنے کا یہ ذریعہ سوچا کہ وصیت، وراثت اور وقف کے مسائل کو درست کیا جائے اور وہ بھی اس طرح کہ شیعہ اور سنی دونوں کے فقہ کے مطابق ہو کیونکہ وقف علی الاولاد کا طریقہ مسلمانوں میں جہالت اور رسم و رواج کی وجہ سے بہت غلط ہو گیا تھا۔ اس کے لئے انہوں نے ایک قانون بنایا اور صاحب جائداد اور زمینداروں کے پاس ان کی رائے دریافت کرنے کے لئے بھیجا، وہ اس کو مجلس قانون ساز میں بھی پیش کرنا چاہتے تھے۔ لیکن بعض وجوہ مانع ہوئے۔

سرسید کی "سیرت فریدیہ" علم النفس کے ماہرین کے لئے ایک بے بہا چیز ہے۔ فریدالدین ان کے نانا تھے۔ جو آخر عمر میں اکبر شاہ ثانی کے وزیر اعظم تھے، اس سیرت میں انہوں نے اپنے خاندان کی کل تاریخ اور ہندوستان آنے کا سبب لکھا ہے۔ یہ محض خاندانی تاریخ نہیں بلکہ اس سے اس زمانے کی سیاسی پستی اور مسلمانوں کی کمزوری بھی آشکارا ہے، سب سے زیادہ اہم چیز اس سیرت میں سرسید کی والدہ ماجدہ عزیز النسا کے حالات ہیں۔ جو بہت ہی مفصل طریقہ سے لکھے گئے ہیں۔ ان کی فطرت اور ذہنیت، وسعت نظری اور بلند خیالی، فیاضی و دینداری، غربا پروری و خوش اخلاقی اسی کتاب سے اچھی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ تعجب ہے کہ سرسید کی والدہ ماجدہ نے اپنے بچے کی پرورش ان اصولوں پر کی جو امام غزالی نے اپنی نادر کتاب "احیاء العلوم" میں بیان کئے ہیں۔

سرسید کی والدہ گو زیادہ تعلیم یافتہ نہ تھیں، لیکن قدرت نے انہیں ایک بلند دماغ اور حساس دل عطا کیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے بچہ کی پرورش نہایت احتیاط سے کی، نہ تو سرسید کو عام طور سے جس کے ساتھ چاہتے کھیلنے کی اجازت تھی اور نہ زیادہ پابندی تھی۔ البتہ والدہ کا یہ حکم تھا کہ کوئی کھیل کھیلو لیکن چھپ کر نہ کھیلو۔

سرسید بچپن میں بہت شریر تھے اور اپنے ہم عمر لڑکوں میں ظرافت کے لئے مشہور تھے۔ ایک روز گلی میں محلے کے کوئی صاحب پیشاب کر رہے تھے، لڑکوں نے دیکھا اور رائے ہوئی کہ انہیں چت کر دیا جائے، سرسید خود تیار ہوئے اور پیچھے سے جا کر ان کے کاندھے پکڑ کر چت کر دیا اور بھاگ گئے۔ وہ اپنی بچپن کی تربیت پر ناز کیا کرتے اور یہ شعر پڑھا کیا کرتے ؎

طفلی و دامان مادر خوش بہشتے بودہ ام
چوں بپائے خود رواں گشتیم سرگرداں شدیم

سرسید نے ملک کی سیاست میں بھی حصہ لیا۔ وہ کبھی فرقہ پرست نہیں ہوئے۔ بلکہ بلا تفریق مذہب سب کی خدمت کرتے رہے البتہ بعد میں کچھ ناخوشگوار واقعات پیش آئے۔ کہ انہیں مسلمانوں ہی کی طرف جھکنا پڑا، اس کی تائید ان کے قول سے ہوتی ہے، فرماتے ہیں۔

"انہیں دنوں میں جبکہ یہ چرچا بنارس میں پھیلا۔ ایک روز مسٹر شیکسپیر سے جو اس وقت بنارس کے کمشنر تھے میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کر رہا تھا، وہ متعجب ہو کر میری گفتگو سن رہے تھے۔ آخر انہوں نے کہا کہ "آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے، اس سے پہلے تم عام ہندوستانیوں

کی بھلائی کا ذکر کرتے تھے۔ سرسید نے کہا: "اب مجھے یقین ہوگیا ہے کہ دو قومیں یعنی ہندو اور مسلمان کسی کام میں دل سے شریک نہیں ہونگی۔ ابھی تو بہت کم ہے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے جو زندہ رہے گا۔ دیکھے گا مسٹر شکسپیئر نے کہا: "اگر ایسا ہو تو نہایت افسوس ہے۔ سرسید نے کہا: "مجھے بھی نہایت افسوس ہے۔ مگر مجھے اپنی پیشگوئی پر پورا یقین ہے۔"

یہ پیشگوئی سرسید نے اس وقت کی تھی جب ۱۸۶۷ء میں بنارس میں اردو ہندی کا جھگڑا پہلی دفعہ شروع ہوا، سرسید کے اس بیان سے ثابت ہے کہ وہ کسقدر وطن پرور اور آزاد خیال تھے۔ ان کے بیان کا ہر ہر لفظ حبِ وطن میں ڈوبا ہے۔ لیکن مایوسی سے مجبور ہوکر انہوں نے ۱۸۸۸ء میں پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کی بنیاد ڈالی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اس کا ہر ممبر حکومت کا خیر خواہ اور فرمانبردار ہوگا۔ دسمبر ۱۸۹۳ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل ڈیفنس ایسوسی ایشن قائم کی اور مسلمانوں کو کانگریس میں حصہ لینے سے روکا، اس بنا پر لوگ انہیں حکومت پرست کہتے ہیں۔ لیکن ان کی حبِ وطن کا صرف اس ایک تحریر سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ پہلے ہندوستانی تھے، جنہوں نے "انڈیا نائزیشن آف آرمی" (فوج میں اعلیٰ مناصب پر ہندوستانیوں کا تقرر) کی طرف حکومت کو توجہ دلائی اور مجالس قوانین ساز میں ہندوستانیوں کا حصہ بھی سب سے پہلے انہوں نے ہی مانگا، غرض وہ جمہوری تنظیم اور قومی ترقی کے مجموعی طور پر خواہاں تھے۔ لیکن بعد میں صرف مسلمانوں کی فلاح ان کا مقصود نظر بن گئی۔ لیکن کسی کو نقصان پہنچا کر نہیں۔

1 سرسید کی تصانیف پر ہم نے بہت اجمالی نظر ڈالی ہے۔ اور بعض کا ذکر بھی چھوڑ دیا گیا۔ لیکن جتنی تصانیف ہیں سب میں اصلاح کا جذبہ ہر جگہ نمایاں ہے اور وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اردو ادب پر مجتہدانہ رنگ چڑھایا اور "تہذیب اخلاق" کے اجرا سے ملک میں انشا پردازوں کی ایک نئی نسل پیدا کی، انہوں نے اردو زبان کی خدمت مختلف طریقوں سے کی، سب سے پہلے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان کی تصانیف میں کہیں گل و بلبل کی پرانی داستان یا غزلیات و قصائد نہیں وہ اردو زبان کو اس محدود کوچہ سے نکال کر علوم و فنون کی شاہراہ پر لائے اور اس کم مایہ زبان میں مختلف زبانوں کے علمی خزانے منتقل کئے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ انہوں نے دانستہ اردو زبان کی کوئی خدمت نہیں کی۔ بلکہ اردو زبان کو انہوں نے اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے ایک آلہ بنایا جس سے اردو زبان ترقی پاگئی۔ یہ ایک حد درست ہے کیونکہ سرسید سے پہلے ایسی ہستیاں وجود میں آچکی تھیں۔ جنہوں نے قدیم مرصع اور مقفیٰ طرز کی نثر کو خیرباد کہہ کر سادگی اختیار کی۔ اس زمرے میں مولانا اسمٰعیل شہیدؒ اور ان کے ساتھی پہلے سے ہی پیش پیش ہیں۔ لیکن سرسید نے باقاعدہ سائنٹفک سوسائٹی قائم کی جس کا مقصد یہ تھا کہ غیر زبانوں سے اردو زبان میں تراجم کئے جائیں۔ تاکہ ہندوستانی اپنی زبان میں دوسرے علوم سیکھیں اور علوم قدیمہ کی عظمت ان کے دلوں سے کم ہو۔ لیکن سرسید نے جو سادگی اختیار کی وہ اس سادگی سے نرالی ہے جو مولانا اسمٰعیل شہید، غالبؔ نواب شمس الامرا و غیرہ نے اختیار کی، ان حضرات نے انفرادی طور پر اپنے مخصوص موضوع میں سادگی اختیار کی، لیکن سرسید نے ہر موضوع کو سادہ پیرایہ میں بیان کیا، ان کا بڑا کمال یہ ہے کہ وہ مشکل ترین مضمون کو ایسے سلیس پیرایہ میں لکھتے ہیں۔ کہ ان کی قدرت زبان کا لوہا ماننا پڑتا ہے اور یہی ایک چیز ہے جو ان کو دیگر مصنفین سے ممتاز کرتی ہے۔ مثلاً تہذیب اخلاق کے ایک مضمون میں آدم کی سرگزشت ایک قصہ کے پیرایہ میں بیان کی ہے۔ اس میں جو تصویر آدم کی کھینچی وہ ہو بہو ہے۔

ان کی تمام تصانیف میں قوت استدلال بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ گو ان کی عبارت میں رنگینی، فارسی تراکیب اور الفاظ کی تراش خراش نہیں، لیکن پھر بھی ان کی طرز میں وہ تمام محاسن موجود ہیں جو تصنیف کو ادب العالیہ کا درجہ بخشتے ہیں۔ البتہ ایک چیز قابلِ اعتراض ہے جو ہر نقاد کو بار بار معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ انہوں نے جابجا انگریزی الفاظ بلا ضرورت استعمال کئے، سرسید تقلید کے لئے بدنام ہیں اور انگریزی الفاظ کا یہ بے محابا استعمال اس کی تصدیق بھی کرتا ہے لیکن اس کے باوجود انہوں نے تیس پینتیس سال کے عرصہ میں اردو زبان کی وہ خدمت کی کہ ادبی، علمی، سیاسی ہر طریقہ سے اس کا درجہ بلند کردیا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ انہی کی ذات کے طفیل میں، حالی، نذیر احمد، شبلی، محسن الملک، وقار الملک جیسی بے مثل ہستیاں اردو ادب کے لئے مایہ ناز ہوئیں۔

سرسید کے زمانے میں تعلیم نسواں کا مسئلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔ لیکن ان کی تصنیف میں اس کا مذکور نہیں۔ بلکہ مولانا ممتاز حسین مرحوم نے جب انہیں تعلیم نسواں کے متعلق اپنا مسودہ دکھایا۔ تو انہوں نے اس کو پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا، کاش

سرسید مولانا ممتاز علی مرحوم سے کہدیتے کہ تم بھی اپنا بیڑہ اٹھاؤ اور ان کی ہمت میں استواری پیدا کرتے تو قوم کی ترقی دوگنی ہو چکی ہوتی، تعلیم نسواں کے بارے میں سرسید کی رائے غلط تھی۔ اور یہ ان کی ہمت میں کمزوری تھی کہ انہوں نے تعلیم نسواں کی مخالفت کی۔ پردے کے متعلق سرسید چہرہ اور ہاتھ کھلے رکھنے کے قائل تھے۔ لیکن انگریزی یا ایسا لباس جس سے عریانی ہو۔ ان کے خیال میں اسلامی نقطۂ نظر سے جائز نہیں تھا۔

بہرحال سرسید کی تصانیف سے ایک ایسی شخصیت ظاہر ہوتی ہے جو صبر و استقلال، بلند حوصلگی و اولوالعزمی، غیرت اور دلیری میں بےمثال ہے، جس نے زمانے کی مخالفت کو خدا کی مخالفت سمجھا اور اپنے آپ کو زمانے کے رُخ پر پھیر دیا، جس نے زوال پذیر قوم کے لئے یہ نظریہ بنایا کہ اگر تم عمدہ حاکم بننے کی اہلیت نہیں رکھتے ہو تو عمدہ رعایا بنو تاکہ ایک عمدگی نہ ہونے سے دوسری عمدگی بھی ہاتھ سے نہ جائے۔ وہ ایک ایسی شخصیت ہے جس نے محکوم ہو کر حکومت میں زبردست اقتدار حاصل کیا اور کبھی اپنی خودداری کو مجروح نہیں کیا، وہ بتاتے ہیں کہ قومی تنزل مذہب کے لئے کس طرح سم قاتل ہوتا ہے۔ اور مذہب کے کھونے سے قوم کیونکر تباہ ہو جاتی ہے، ان کی تمام تصانیف شاہد ہیں کہ اس شخصیت نے قوم اور وطن کی محبت کو جزو ایمان جانا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ قوم کی ترقی کے لئے بسا اوقات اس کی دلآزاری کرنی پڑتی ہے اور بہت سے کام عوام کی عقل کے خلاف کرنے پڑتے ہیں۔

ان کی کسی تصنیف میں تعصب کا شائبہ نہیں، ہم ان کی بے تعصبی کی صرف ایک مثال پیش کرتے ہیں ۱۸۶۰ء میں جبکہ اضلاع شمال و مغرب میں قحط پڑا اس وقت سرسید مراد آباد میں صدر الصدور تھے۔ چنانچہ قحط کا انتظام وہاں سرسید کے سپرد ہوا۔ انہوں نے اس خوبی سے انتظام کیا کہ چودہ ہزار فاقہ کشوں کو ایک گھنٹہ میں کھانا تقسیم ہو جاتا تھا، مسلمانوں کے لئے مسلمان اور ہندوؤں کے لئے ہندو کھانا پکاتے تھے۔ جو ہندو اپنے سوا دوسرے کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا نہیں کھاتے تھے ان کے لئے علیحدہ چولہے بنے ہوئے تھے۔ پردہ نشین اور عزت دار عورتیں جو محتاج خانہ میں نہیں آسکتی تھیں۔ ان کو روئی کاتنے کے لئے بھیج دی جاتی تھی اور اس کی اجرت ان کے گھروں پر پہنچا دی جاتی تھی۔ وہ خود بیماروں اور کنگلوں کو جن کے کپڑے گرد و غبار میں لتھڑے ہوتے۔ بھی اپنی گود میں اٹھا کر جگہ بدلواتے، ہاتھ منہ دھلواتے اور دوا پلاتے۔

مدرسۃ العلوم کے لئے جس طرح چندہ جمع کیا وہ دنیا کی تاریخ میں حیرت انگیز ہے، چندے کے لئے علیگڑھ کی نمائش میں گلے میں جھولی ڈال کر پھرتے۔ پینی ریڈنگ کے جلسے ہوتے لاٹری ڈالتے اور لاٹری کے معترضین کو یہ جواب دیتے کہ جہاں ہم اپنی ذات کے لئے سینکڑوں ناجائز کام کرتے ہیں۔ وہاں ایک ناجائز کام قوم کی بھلائی کے لئے سہی۔ نمائش میں کتابوں کی دکان لگاتے اور خود کتابیں بیچنے بیٹھتے۔ طوائفوں اور سازندوں کے چندے کو بھی بڑی خوشی سے قبول کرتے۔ حیدر آباد گئے تو نواب محسن الملک نے عصرانہ دینا چاہا۔ سرسید نے انکار کیا اور کہا نقد دلوائیے۔ محسن الملک نے کہا کہ نقد بھی لیجئے اور عصرانہ بھی ہونے دیجئے۔ انہوں نے ہرگز نہ مانا اور کہا کہ پارٹی میں جس قدر خرچ ہو وہ بھی چندے میں دیدو، بڑی رقمیں تو الگ، وہ دو چار آنہ کا چندہ بھی بسر و چشم قبول کرتے۔

زین العابدین بی۔ اے۔ آنرز (علیگ)

سُندری

نوٹ:۔ اندنوں ہندوستان میں ایک نئی تحریک نے جنم لیا ہے جس کا نام "اردو ہندی" تحریک ہے۔ اور یہاں کی ایک کثیر آبادی اس اہم لیکن "بے ہنگام" تحریک میں کافی سے زیادہ حصّہ لے رہی ہے۔ ایک طرف ساہتیہ سمیلن پرشد کے روحِ رواں گاندھی جی "ہندی ہندوستانی" کا جھنڈا ہاتھ میں لئے دیوتاؤں کی اس زبان کے پرچار میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے ہیں۔ دوسری طرف اسلامی ہند کے جیّد ادیب علامہ سید سلیمان ندوی ہندوستان کی عالمگیر زبان "ہندوستانی" کا علم بلند کر رہے ہیں۔ اور اگر گاندھی جی مہاراج "ساہتیہ سمیلن پرشد" کے اجلاسوں میں دیوتاؤں کی زبان کے پروپیگنڈا کے لئے لائحہ عمل اور پروگرام مرتب کر رہے ہیں تو سید صاحب بھی علیگڈھ ایجوکیشنل کانفرنس میں "ہماری زبان" کا نام کے عنوان سے مقالہ پڑھ کر حامیان اردو کو عموماً اور مسلمانانِ ہند کو خصوصاً "ہندوستانی" زبان کی ترویج و اشاعت میں حصّہ لینے کی ترغیب دلا رہے ہیں۔

لیکن اس وقت جبکہ کچھ دنوں سے ہندوستان کی سیاسی فضا میں امن و سکون کی ہوا چل رہی ہے اور نفاق و کینہ کے بادل چھٹ رہے ہیں اور یہاں کے باشندے بھارت ماتا کے "شترنت" کرنے کی عملی جدوجہد میں مشغول ہیں۔ "اردو ہندی" کا شوشہ چھوڑ کر یہاں کی پُرامن فضا کو مکدّر کرنا اور یہاں کے لوگوں میں افتراق و انتشار پیدا کرنا کہاں کی عقلمندی ہے؟ یہ میری سمجھ سے باہر ہے ـــــ ان حرکات کا ذمہ دار کون ہے؟ گاندھی یا سید سلیمان ندوی؟ اس کا فیصلہ میں ہندوستان کے عوام ...... پر چھوڑتا ہوں، تاکہ وہ عصبیت کی عینک اُتار کر ٹھنڈے دل سے اس پر غور کریں۔

آج کی صحبت میں، میں گاندھی جی کی "دیوتاؤں کی زبان" "ہندی ہندوستانی" کے خلاف کوئی مقالہ قارئین "شاہکار" کے سامنے نہیں پیش کر رہا ہوں۔ بلکہ ہندی کے ایک جریدہ سے گاندھی جی کی "ہندی ہندوستانی" زبان کی ایک تمثیل اردو رسم الخط میں نقل کر کے پیش کر رہا ہوں تاکہ آپ فیصلہ کریں کہ زیرِ نظر ڈرامہ کی زبان بسوائے چند الفاظ کے۔ گاندھی جی کی "ہندی ہندوستانی" ہے یا سید سلیمان ندوی صاحب کی "ہندوستانی" اور یہاں کی ایک کثیر آبادی "ایکان کی ناٹک، انتھ پور، نو یو بکت، سینما چھتر، کلا، پربش کرنا، دوراچاری، کودی اشٹمی، نین، اتیلیک اور شیریں، ابھی پٹرول، کھٹ کھٹ پٹ، جیسے الفاظ کو آسانی سے سمجھ سکتی ہے یا وہ ایک ایکٹ کا ڈرامہ، زنانہ حویلی نوجوان۔ سینما کمپنی، آرٹ، داخل ہونا، غنڈہ، بُری نظر، نیا، خراب، اچھا۔ ایکٹرلیسوں، شریف جیسے الفاظ کو، اور کیا جس زبان میں یہ ڈرامہ لکھا گیا ہے ـــــ چند الفاظ کے ماسوا۔ اس کو "ہندی ہندوستانی" کہنا صحیح ہے۔ یا اگر "اردو ہندوستانی" نہیں تو صرف ہندوستانی کہنا؟ اور کیا ساہتیہ سمیلن پرشد ـــــ اور اسی قبیل کی دوسری جماعتوں کے اربابِ حل و عقد اور گاندھی جی جیسے "غیر متعصب" لیڈروں کا یہ ظلم نہیں ہے کہ پیشِ نظر ڈرامہ کی زبان پر صاد کرتے ہوئے ہندوستان میں ایک ایسی زبان رائج کرنا چاہتے ہیں جسے صرف دیوتا یا گاندھی جی جیسے "مہاتما" ہی سمجھ سکتے ہیں؟

حافظ عبدالوکیل عزیزی

استھان۔ نریندر کا انتھ پور۔ ایکان کی ناٹک

(فوریوبک نریندر اور اس کی دھرم پتنی چندر مکھی آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھے باتیں کر رہے ہیں، بیچ میں میز ہے)

چندر مکھی:۔ میں تمہیں منع نہیں کرتی، کیونکہ وے (آپ) تمہاری بہن ہے اور تم ان کے بھائی ہو، پر یہ یاد رکھو کہ سینما چھتر جا کر کوئی لڑکی پاک دامن نہیں رہ سکتی۔

نریندر:۔ تمہارا خیال غلط ہے، میری بہن کلا کی پجارن ہے، ساتھ ہی ساتھ وہ شک چھپتا ہے، تمہاری طرح "کالا اکھچر بھینس برابر" نہیں۔

چندر مکھی:۔ تو آج ہی سمجھ لو، پر یہ یاد رکھو کہ شک چھپتا گیا چاہے کچھ بھی ہو، پیاسے پرس کے سن سرگ سے بڑی بڑی ستیوں کے من بھی ڈانواڈول ہو جاتا ہے، میری سمجھ میں تو آگ اور گھی کا میل اچھا نہیں ہے۔

(اس بیچ نریندر کی چنچل بہن سندری دوڑتی ہوئی کمرہ میں پرویش کرتی ہے اور ایک چھلانگ میں میز پر جا بیٹھتی ہے، میز پر بیٹھ کر وہ ایک ہاتھ بھائی کے گلے میں اور دوسرا ہاتھ بھوجائی کے گلے میں ڈال کر ٹھہاکا مار کر زور سے ہنستی ہے، یہ دیکھ کر چندر مکھی غصہ میں اس کا ہاتھ الگ کر دیتی ہے، کلاتو نریندر اس کا یہ حال دیکھ مسکراتا ہے)

سندری:۔ بھیا! آج کی تاریخ سے میں بھابھی جی سے نہ بولوں گی۔

نریندر:۔ کیوں بہن؟ ان کا کیا اپرادھ ہے؟

سندری:۔ کچھ نہیں، یہ میرا ہی اپرادھ ہے جو ان سے اتنا پریم کرتی ہوں۔

نریندر:۔ بھولی بہن، پریم جھڑکی کی پرواہ نہیں کرتا ہے، دیکھو میں بھی تمہاری ہی طرح ان سے پریم کرتا ہوں، پر مجھے تو ان کی جھڑکیاں بھی اچھی لگتی ہیں۔

چندر مکھی:۔ (نریندر سے) پریم کا سچا انوبھو بواہ بعد ہوتا ہے، اس لئے میری سمجھ میں تو اب ان کا . . . .

سندری:۔ (بگڑ کر) دیکھو بھیا! اگر تم لوگ پھر میرے سامنے بواہ کا نام لوگے تو میں پستول سے آتم ہتیا کروں گی، میرے جیون کا ادیش پرش کی غلامی نہیں، بلکہ پرشوں کے اتیاچار سے استریوں کو چھڑانا ہے، میں استریوں کا سنگٹھن کروں گی۔ پھر دیکھوں گی کہ وہاں پرشوں کی من مانی کیسے چلتی ہے۔

نریندر:۔ تمہارے وچار گنگا کی دھار کے سمان نرمل اور پوتر ہے تمہاری جیسی بہن پا کر میں اپنے کو دھنی سمجھتا ہوں، جاؤ پرماتما تمہاری مدد کرے۔

سندری:۔ میں سینما چھتر کا بانا برن بدل کر چھوڑوں گی اور یدی کوئی دوراچاری پرش استریوں پر کودرشٹی ڈالے گا تو میں اس کی قلعی کھول کر دم لوں گی۔

چندر مکھی:۔ (دھیرے سے) باپ رے، دیکھنا کہیں تمہاری ہی قلعی نہ کھل جائے۔

(سب اٹھ کر جاتے ہیں۔)

(۲)

استھان:۔ فلم اسٹوڈیو

اڈائریکٹر کے سامنے ایکٹر ایکٹرسیوں کے بیچ میں سندری کھڑی ہے تھوڑی دور پر ایک پرم سندر نویوبک بھی کھڑا ہے

ڈائرکٹر:۔ نویوبک سے) مسٹر موہن! آپ ایم۔ اے پاس ہیں، اس لئے آپ کے لئے ایکٹری بھی آسان ہے، مگر پھر بھی کچھ دن سیکھنا تو ضرور پڑے گا، کیا تب تک آپ فری کام کر سکتے ہیں؟

موہن:۔ جی ہاں! جب تک میں سیکھ نہ لوں، تب تک تنخواہ نہ لونگا۔

ڈائرکٹر:۔ شاباش! مجھے آپ جیسے ہونہار یوبکوں کی سخت ضرورت ہے (سندری سے) سندری اب میں تم سے بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ ہیروئن بننے کے لئے اس بھیڑ بھڑ کے میں نہیں بلکہ الگ ٹریننگ کی ضرورت ہے، جہاں صرف تم اور ہم رہیں، اسی ارادے سے کل رات کو ہم نے تمہیں گھر پر بلایا تھا، مگر افسوس! تم نے میرا کہنا نہ مانا، خیر اب وہی کام تمہیں یہاں سب کے سامنے کرنا پڑے گا، بولو! تیار ہو نا؟

سندری:۔ جی ہاں! میں تیار ہوں۔

ڈائرکٹر:۔ اچھا دیکھو، اس تماشے میں میں ہیرو ہوں۔ اور تم میری بیاہتا ہیروئن ہو، ابھی میں تمہیں دھکا دیکر غصہ میں بھاگ چلونگا۔ تم دوڑ کر میرے سینہ سے لپٹ جانا اور رو کر کہنا۔ "نہیں نہیں، پیارے! مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ، میں تمہارے بنا تڑپ

تڑپ کر مر جاؤنگی۔" تب میں کہوں گا کہ ——— نہیں نہیں، مجھے چھوڑ دو" اس پر تم مجھے اپنے باہوپاش میں کسکر باندھ لینا اور اپنا گال میرے منہ پر رکھ کر اپنی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں بند کر لینا، ٹھیک اسی سمے میرے غصہ کا پارہ اُتر کر زیرو ڈگری پر آجائے گا اور میں بھی تمہیں اپنی بھجاؤں میں کس کر خوب پیار کرنے لگوں گا۔ خبردار! چپ چاپ رہنا نہیں تو تماشہ کا سارا مزا کافور ہو جائے گا۔

سندری:- (کچھ سوچ کر) اس سے تو یہ اچھا ہوگا کہ جب آپ جانے لگیں تو میں دوڑ کر آپ کے پاؤں سے لپٹ جاؤں اور روتے ہوئے آپ سے پرارتھنا کروں کہ ——— "پران ناتھ! مجھ دکھی پر دیا کیجیے، اتنے کٹھور نہ بنئے۔" تب آپ بگڑ کر کہیں کہ ——— "نہیں نہیں، مجھے چھوڑ دو، چھوڑ دو۔" اس پر میں پھر گڑگڑاتی ہوئی کہوں ——— "اچھا ناتھ! جاتے ہیں تو جائیے، لیکن پہلے اس پستول سے مجھے ختم کر دیجیے۔" تب آپ پچکارتے ہوئے بغیر میرے سر پر ہاتھ لگائے مجھے اٹھنے کے لئے کہیے اور جب میں آہستہ آہستہ اُٹھنے لگوں تب سین کٹ کر دیا جائے۔

ڈائرکٹر:- (منہ بنا کر) ہوں، مگر پبلک کو اس میں کچھ بھی مزا نہ آئیگا

موہن:- پبلک کو مزا آئے یا نہ آئے۔ پر آپ کا تو یہاں سارا مزا ہی کرکرا ہو گیا۔

ڈائرکٹر:- یکایک بگڑ کر) گیٹ آوٹ یو (Get out you)

(موہن کمرہ سے نکل جاتا ہے، ڈائرکٹر صاحب اپنی لال لال آنکھیں چار کرتے اور کھسیاتے ہیں)

ڈائرکٹر:- (سندری سے) اگر فلم میں کام کرنا ہے تو ڈائرکٹر کو اپریشن نہ دو، تم لوگ اسکول اور کالج سے نکل کر یہاں سدھار کرنے آتی ہو۔ مگر سدھار کے سین دکھلانے پر پبلک پیسے کے بدلے انگوٹھا دکھلاتی ہے۔ یہاں تو نئین سبھیتا کے انوسار کام کرنے پر بھی تماشہ کے فیل ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے، اخباروں میں سب ہی لوگ سدھار سدھار چلاتے ہیں، پر ننگے ناچ کا سین دیکھنے سب سے پہلے جاتے ہیں۔

سندری:- جی نہیں، سب لوگ ایسے نہیں ہیں، اور اگر ہیں بھی تو وہ کیا کر سکتے ہیں؟ یہی آپ لوگ سنگھٹ ہو کر اشلیل فلم تیار کرنا چھوڑ دیں۔ تو پبلک مجبور ہو کر اوچ شریف کے فلموں کو دیکھنے لگے گی۔

ڈائرکٹر:- بھولی مس، تمہیں دنیا میں رہ کر بھی دنیا کی باتیں معلوم نہیں ہیں جب تک پبلک کی رچی بدلے گی تب تک کروڑوں روپیوں کا وارنیارا ہو جائے گا۔ کتنی کمپنیوں کا دیوالہ نکل جائیگا۔ خیر آؤ میرے ساتھ اس کمرہ میں، میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔

(ڈائرکٹر صاحب وہ اور ابھی نیترلوں کو اشارے کچھ سمجھاتے ہیں اور وہاں سے چل دیتے ہیں پیچھے پیچھے سندری اور اس کے پیچھے دونوں ابھی نیتریاں جاتی ہیں، ایک کمرہ کے اندر چل ہی ڈائرکٹر صاحب کے ساتھ سندری جاتی ہے۔ دونوں میں دروازہ باہر سے بند کر دیتی ہیں جس پر موٹے موٹے اکچھروں میں لکھا ہوا ہے۔ "نو اڈمیشن")

(۳)

استھان:- ڈائرکٹر کا پرائیویٹ کمرہ۔

(ڈائرکٹر کے سامنے سندری بیٹھی ہے)

سندری:- دروازہ کیوں بند ہو گیا؟

ڈائرکٹر:- ابھی کھل جاتا ہے۔ آؤ بیٹھو۔

سندری:- نہیں جلدی آپ اپنا مطلب کہیے۔

ڈائرکٹر:- لو سنو، جیسا تم چاہتی ہو ویسا ہی وہ سین بدل دیا جائیگا۔ مگر ہیروئن کا پارٹ مفت میں نہیں ملا کرتا۔

سندری:- تو جو آپ چاہتے ہیں، میری تنخواہ سے کاٹ لیجئے۔

ڈائرکٹر:- مجھے تنخواہ نہیں، صرف تمہاری مہربانی چاہیئے۔" بولو۔

سندری:- آپ کا مطلب؟

ڈائرکٹر:- اتنی بڑی ہو کر بھی مطلب پوچھتی ہو؟ یہاں پر بیٹھو تمہیں سمجھا دیتا ہوں۔

سندری:- خبردار۔

ڈائرکٹر:- ڈرو نہیں کسی کو معلوم نہ ہوگا۔

(ڈائرکٹر صاحب سندری کو آگے بڑھ کر زبردستی پکڑتے ہیں، وہ الگ ہو کر پیچھے ہٹ جاتی ہے۔ اور پستول تان کر کھڑی ہو جاتی ہے، ڈائرکٹر صاحب ہکّے بکّے ہو جاتے ہیں، ٹھیک اسی سمے کمرہ کا دروازہ

کھلتا ہے اور کمپنی کا مالک، موہن اور دو تین ابھی نیتریوں کے ساتھ کمرہ میں پرویش کرتا ہے)

ابھی نیتریاں:۔ (چلا کر) یہ دیکھئے اپنے ڈائرکٹر صاحب کے کرتوت۔ ہم لوگ بھی قبل آرٹ کے لئے بھرتی ہوئے تھے۔ اس کمینے نے ہیروئن بنانے کا لالچ دیکر ہمیں بھی برباد کیا ہے۔

مالک:۔ بس بیٹی، اب یہ اپنی کرتوت کو پہنچ گیا ہے۔

سندری:۔ نہیں نہیں، ابھی نہیں پہنچا ہے، میں اسے پستول سے پہنچاتی ہوں۔

ڈائرکٹر:۔ (مالک کے پاؤں پر گر کر) بچائیے بچائیے۔ مجھے معاف کیجئے۔

مالک:۔ جا کر اس سے معافی مانگو۔

ڈائرکٹر:۔ معاف کرو بہن، اب کبھی ایسی غلطی نہ ہوگی۔

ابھی نیتریاں:۔ معاف کرو؟ دیکھو ہم تیرے باپ کا بھانڈہ بنا چھوڑے نہ رہیں گے۔

سندری:۔ خیر اب بہن کہتا ہے تو چھوڑ دیتی ہوں، مگر تیرے جیسے پاپی کو کچھ نہ کچھ سزا ضرور ملنی چاہئیے۔

ابھی نیتریاں:۔ کل ہی ہم لوگ کلکتہ کے جنمت کے ایڈیٹر کو اس کی ساری پول لکھ دیں گے۔

مالک:۔ (ڈائرکٹر سے) ابھی یہاں سے نکل جا۔ (ڈائرکٹر صاحب چلے جاتے ہیں)

ابھی نیتریاں:۔ (سندری سے) بہن، تم نے بڑے ساہس کا کام کیا۔

مالک:۔ بیٹی سندری! تم نے آج ناری جیت کی مان رکھی ہے۔ اس لئے میں تم سے بہت خوش ہوں، آج سے ہماری کمپنی کا بانا بران شدھ ہو گیا۔

سندری:۔ مگر اس دشٹ کے کارناموں کی رپورٹ تو اخبار میں دینا ہی پڑے گی۔

مالک:۔ کیا ضرورت ہے؟ اب یہ پھر یہاں منہ نہ دکھائے گا۔

موہن:۔ مگر اخبار کے سمپارک تو بھیس بدل کر اب تک یہیں کھڑے تھے۔ وہ بغیر کچھ لکھے تھوڑے ہی مانیں گے۔

مالک:۔ ارررا یہ تو برا ہوا، خیر جو ہونا تھا سو ہو گیا۔

(۴)

استھان:۔ نریندر کا مکان۔

(نریندر اور چندر مکھی بیٹھے باتیں کر رہے ہیں اتنے میں سندری کمرہ میں آتی ہے)

نریندر:۔ (سندری سے) تم نے بہت اچھا پارٹ کیا ہے۔ اس لئے تماشہ کئی ہفتوں سے چل رہا ہے۔

سندری:۔ تم نے بھی دیکھا ہے۔

نریندر:۔ لو اسٹوری (Love Story) ہے مگر اسیلتا کا کہیں نام نہیں۔

سندری:۔ وہاں کا سارا سٹاف ہی بدل گیا ہے۔ سب لوگ بھدر اور شسک جھپت ہیں۔

نریندر:۔ اور اب مجھے نسچے ہو گیا کہ تم شا جیلا نسے کے لئے اسیلتا کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ (نریندر جاتا ہے)

چندر مکھی:۔ ایک بات بتاؤگی؟

سندری:۔ ہاں، ضرور۔

چندر مکھی:۔ وہ جو ماسٹر موہن تمہارے نقلی پتی بنتے ہیں، کیا انہیں تم اصلی پتی بھی بنانا چاہتی ہو؟

سندری:۔ (شرما کر) مجھ سے ایسی باتیں نہ کرو۔

چندر مکھی:۔ تم آرٹ آرٹ کرتی ہو، مگر مجھے تو دال میں کچھ کالا نظر آتا ہے۔

سندری:۔ کیا؟

چندر مکھی:۔ یہی کہ تم دونوں ایک دوسرے سے سچا پریم کرتے ہو۔

سندری:۔ لیکن ہم لوگ کھیل کے سوا کبھی دوسری جگہ ملتے ہی نہیں اور نہ کسی کو ملنے کا حکم ہی ہے۔

چندر مکھی:۔ مگر ماسٹر موہن نے تو تمہارے ہی ساتھ بیاہ کی درخواست کی ہے، اور تمہارے بھیا نے منظور بھی کر لی ہے۔ کل شادی ہے۔ اب تو قلعی بھی کھل گئی نا؟

(سندری شرما جاتی ہے، چندر مکھی اسے گلے لگاتی ہے۔)

حافظ عبدالوکیل عزیزی
بہار شریف

عشق اور مجبوری کے دوراہے پر ایک حادثہ

نہ پوچھ اے دوست تیری جانب میں کس تجمل سے آ رہا تھا
زمیں خزانے اُگل رہی تھی فلک ستارے لُٹا رہا تھا

قدم قدم پر حیاتِ نَو کے جہان تعمیر ہو رہے تھے
جو خواب دیکھے تھے حسرتوں نے تمام تعبیر ہو رہے تھے

نفس نفس پر تھی بوئے عنبر دماغِ ہستی مہک رہا تھا
فروغِ پاکیزگی سے عشق و وفا کا چہرہ دمک رہا تھا

نسیمِ راحت کے رود باروں میں نشے بہہ بہہ کے آ رہے تھے
نوائے نغماتِ کہکشاں پر سروش بر لبط بجا رہے تھے

جمالِ شمس و قمر کی کرنیں غبار تھیں وادیِ نظر میں
ریاضِ جنت کی نزہتیں بیقرار تھیں وادیِ نظر میں

ترے تصور سے میرے قلب و جگر کو تسکین مل رہی تھی
سکون تھا اضطرابیوں میں نظر کو تسکین مل رہی تھی

زمانہ معصومیت میں ڈوبا ہوا نظر آ رہا تھا مجھ کو
حجابِ رازِ حیات اُٹھتا ہوا نظر آ رہا تھا مجھ کو

لبوں پہ غنچوں کے تھا تبسم صبا میں نکہت فشانیاں تھیں
جوانیوں پر بشاشتیں تھیں بشاشتوں پر جوانیاں تھیں

یہ عشق کی سر زمیں پہ تھا فرش میرے سجدوں کی روشنی کا
خودی کی محراب میں تھا روشن چراغِ تکمیل بیخودی کا

وہ کیف طاری تھا مجھ کو اپنا مقام معلوم ہی نہیں تھا
دماغ میں انبساط و آسودگی کا مفہوم ہی نہیں تھا

(۲)

یہ حال تھا میں ابھی زمیں پر ہوں اور ابھی آسماں پہ پہنچا
غرض اسی کیف درد انجام میں ترے آستاں پہ پہنچا

کیا مگر میرا خیر مقدم زبوں خیالی سے میزباں نے
بنا دیئے اور بھی کئی بدگمان اس ایک بدگماں نے

جو ان کے پیشِ نگاہ تھا وہ ہی ان کا آئینۂ نظر تھا
نگاہ بدبیں میں ان کی ہر ایک نیک اطوار بدگہر تھا

یہ بدنصیبِ مذاقِ اُلفت وفا پرستی سے بے خبر تھے
یہ پستیوں کے مکین اے دوست اوجِ ہستی سے بے خبر تھے

گناہ بے لذت آج تھی آہ لذتِ بے گناہ میری
تھا سوئے ظن بے اساس لیکن جھکی ہوئی تھی نگاہ میری

مجھے پرکھتے وہ کیا کہ جب اُن میں جوہرِ آب و گِل نہیں تھے
ستم شعاروں کے تنگ سینوں میں سنگ پارے تھے دل نہیں تھے

مرے خیابانِ آرزو کے گلوں کو پامال کر رہے تھے
خموشیوں میں پلے ہوئے زمزموں کو پامال کر رہے تھے

میں دیکھتا تھا کہ ان کی فطرت میں نورِ صدق و صفا نہیں ہے
ہے منکرانِ خدا کا مجمع یہاں کوئی باخدا نہیں ہے

کچل رہے تھے مری محبت کو مل کے حرص وہوا کے بندے　　ترے حریم حیا کے بندے بھی تھے سراپا جفا کے بندے
میں کس طرح ان جفا سرشتوں کے دل سے پستی نکال دیتا　　میں کیسے ان آہنی چٹانوں کو دل کے سانچے میں ڈھال دیتا
مقامِ حیرت ہے کیوں یہ آخر خلوصِ نیّت سے بے خبر تھے　　یہ جانور زاد آدمی تھے کہ آدمی زاد جانور تھے
تجھے مری خوں شدہ امیدوں نے آخری وقت تک پکارا　　مگر کہاں سے جواب ملتا کہ سازِ جرأت تھا پارا پارا

(۳)

چلا ہوں لے لے نگارِ رو پوش دل میں بنیادِ مرگ ڈالے　　تجھے خدا کے سپرد کرتا ہوں اور محبت ترے حوالے
زبان کو چپ سی لگ گئی ہے فغاں نگاہوں میں آرہی ہے　　فلک ہٹا جا رہا ہے سر سے، زمین دامن چھڑا رہی ہے
فضا سے آواز آرہی ہے وہ پاؤں اُکھڑے ذرا سنبھلنا　　یہ ذرّے ذرّے کی سرزنش ہے کہ دیکھنا مجھ سو بچ کے چلنا
چُھڑا کے مجھ سے تجھے ہے اب اپنی کامیابی پہ شاد دنیا　　یہ شعلہ پرور ذلیل دُنیا، یہ فتنہ خُو نامراد دُنیا
مگر یہ زخمِ جگر جو تیری نگاہِ اوّل کی ہے نشانی　　مری حیاتِ معاشقہ کو بنا دیا اس نے غیر فانی
تری محبت کو چھین سکتا نہیں کوئی مجھ سے دوجہاں میں　　نہ ظرف یہ کاسۂ زمیں کا نہ تاب و طاقت یہ آسماں میں

(۴)

سمجھ رہا ہوں کہ میرا شکوہ ترے لئے وجہِ غم بنے گا　　مرا خموشی سے آہ کرنا بھی تیرے حق میں ستم بنے گا
خموش مجبوریوں کی تعمیل ضبطِ تقدیرِ دل بنے گی　　قدم قدم پر محافظوں کی نگاہ زنجیرِ دل بنے گی
تری سرشتِ جمیل کی تابناکیوں پر یہ شک کریں گے　　یہ تیرہ باطن ہیں بدگمانی کریں گے و رسبے جھجک کریں گے
یہ تیرے بیتاب شوق کی دردناک کہانی سے بے خبر ہیں　　یہ تیری رعنائیوں کی اندوہگیں جوانی سے بے خبر ہیں
ہزار چاہا کہ ضبطِ غم ہو زباں کو نالوں سے باز رکھوں　　جلوں میں خود اپنی آگ میں آپ راز کو تیرے راز رکھوں
مگر خدا جانتا ہے مجھ کو نہیں رہا اختیار دل پر　　برس رہی ہیں ہزارہا بجلیاں مرے بیقرار دل پر
مجھے تری زندگی کی مجبوریوں نے غمناک کر دیا ہے　　ندامتِ بے خطا کے احساس نے جگر چاک کر دیا ہے

گِلا فزا سا یہ میری حسرت کو ہے ترے حُسنِ عشق خُو سے
بڑھا دیئے تُو نے اپنے آداب بزمِ آدابِ آرزو سے

— احسان دانش

سوتیلے بھائی

میری والدہ نے دو مرتبہ شادی کی - مگر اُس نے اپنے پہلے خاوند کا کبھی تذکرہ نہ کیا - یہ تھوڑی بہت واقفیت جو میں اس کے بارے میں حاصل کر سکا ہوں - صرف دوسرے لوگوں کی زبانی ہے - میرا خیال ہے کہ جب والدہ کی پہلی ..... شادی ہوئی تو بمشکل وہ سترہ سال کی تھی اور میرا والد صرف اکیس سال کا - اس نے کمبرلینڈ کے بالائی حصّہ میں ساحل سمندر کے قریب ایک قطعۂ زمین ٹھیکہ پر لے لیا تھا - مگر شاید کم عمر اور ناتجربہ کار ہونے کے باعث وہ زمینوں کی دیکھ بھال اچھی طرح نہ کر سکتا تھا - کچھ بھی ہو اُس کی مالی حالت میں کوئی نمایاں ترقی نہ ہو سکی - اور اُس کی صحت دن بدن خراب ہوتی چلی گئی - نتیجہ یہ ہوا کہ شادی کے تیسرے سال ہی وہ سِل کے مہلک مرض میں مبتلا ہو کر راہیٔ ملک عدم ہوا - اور میری ماں ایک ایسے بچّے کے ساتھ جو ابھی چلنے کے قابل ہی ہوا تھا - بیوہ رہ گئی - قطعہ زمین چار سال کے زاید ٹھیکہ کے باعث اُس کے قبضہ میں تو آ گئی - مگر فارم کے نصف جانور اور غلّہ تباہ و برباد ہو چکا تھا - اور کچھ رقم قرضوں کو بے باق کرنے میں اُٹھ چکی تھی - باقی جو کچھ پسماندہ تھا - وہ روزانہ ضروریات زندگی کے پورا کرنے کے لئے بھی کافی نہ تھا - اور پھر دوسرا بچّہ بھی اُس کی گود بھرنے والا تھا - میرا خیال ہے کہ غم و افسوس سے اُسے اس کے بارے میں بھی سوچنا پڑا - یہی نہیں بلکہ اسے بھیانک موسم سرما میں ایک ایسے تن تنہا مسکن میں رہائش پذیر ہونا پڑا - جس کے قرب و جوار میلوں تک کوئی گھر نہ تھا - مگر اُس کی بہن اُس کے ہمراہ زندگی کے دن کاٹنے کے لئے آ گئی - اور دونوں نے باہم مل کر تجویز و صلاح کر لی کہ کس طرح اپنے قلیل سرمائے سے بسر اوقات کریں -

میں نہیں کہہ سکتا کہ کس طرح میری ننھی بہن جسے میں نے کبھی نہ دیکھا - بیمار ہوئی اور اس سرائے فانی سے کوچ کر گئی - سنا ہے کہ وہ گریگری کی پیدائش سے دو ہفتے پہلے سُرخ بخار میں مبتلا ہوئی اور ایک ہی ہفتہ کے عرصہ میں مر گئی - مجھے یقین واثق ہے کہ اِس آخری حادثہ نے میری والدہ کو بالکل مسّن کر دیا - میری خالہ نے مجھ سے بیان کیا کہ اس واقعہ پر والدہ نے بالکل گریہ وزاری نہ کی - اور اگر وہ چار آنسو بہا لیتی تو خالہ خداوند کی نہایت ہی شکر گزار ہوتی - مگر وہ معصوم ننھی کا ہاتھ پکڑے - بغیر ایک آنسو بہائے اُس کے حسین - زرد اور مردہ چہرے کو تکتی رہی - اس نے بچّی کو بوسہ دیا - جنازہ لے جانے والوں کو دیکھنے کے لئے کھڑکی میں بیٹھ گئی -

جب خالہ رسمِ تدفین کے بعد واپس گھر پہنچی - تو اُس نے والدہ کو اُسی جگہ بیٹھے دیکھا - اُس کی آنکھیں اب بھی ویسے ہی خشک تھیں جیسے کہ پہلے - گریگری کی پیدائش تک اُس کی اِس حالت میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہو سکی - مگر اُس کی آمد نے اُس کے آنسوؤں کو آزاد کر دیا اور وہ دن رات گریہ وزاری میں محو رہنے لگی - میری خالہ اور ہمسائے اس پر حیران تھے کہ وہ کیوں اتنا روتی رہتی ہے - اگر اُن کے پاس اس کی اس مرض کا کوئی علاج ہوتا تو وہ اُسے روک دیتے - مگر وہ ہمیشہ اپنے آپ کو تنہا چھوڑ دینے اور اپنی بابت کوئی فکر نہ کرنے کی درخواست کرتی رہتی کیونکہ ہر قطرۂ اشک جو وہ بہاتی تھی اُس کے دماغ کے لئے باعثِ تسکین و راحت تھا - جو پہلے گریہ وزاری نہ کرنے کے سبب نہایت ہی کربناک حال میں رہا تھا - اس کے بعد اُس نے اپنے ننھے بچّے کی ہستی کے سوا کبھی کچھ نہ سوچا - اور اپنے مرحوم خاوند اور ننھی تک کو فراموش کر دیا جو برنگھم چرچ یارڈ میں محوِ خواب تھے - یہ خالہ نینی کا پیش کردہ نظریہ تھا - مگر وہ بڑبولی تھی اور والدہ خاموش طبع اور کم گو واقع ہوئی تھی - جس سے میرا خیال ہے کہ خالہ کو غلط فہمی ہو گئی ہو گی - کہ والدہ اگر اپنے مرحوم خاوند اور ننھی لڑکی کا کبھی ذکر نہیں کرتی تو وہ انہیں فراموش ہی کر بیٹھی ہے -

خالہ نینی والدہ سے معمّر تھی - اور اُس سے بچّوں کا سا سلوک روا رکھتی تھی - مگر اس پر بھی - وہ ایک پُر محبت ، گرمجوش اور مہربان دل کی مالک تھی - جو اپنی بہن کی بہتری اپنی ذات سے زیادہ چاہتی تھی اور یہ صرف اُس کی قلیل پونجی تھی کہ جس پر اُن کی بسر اوقات ہوتی جا رہی تھی یا کچھ اُس پر جو وہ گلاسگو کے تاجروں کا سلائی کا کام کر کے پیدا کر سکتیں - آہستہ آہستہ والدہ کی بصیرت کمزور ہوتی گئی - یہ تو نہیں کہ

اُس کی نظر بالکل ہی بےکار ہوگئی تھی۔ کیونکہ وہ گھر میں چلنے پھرنے اور دیگر امورِ خانہ داری کے سرانجام دینے پر ابھی قادر تھی۔ ہاں البتہ اتنا ضرور ہوگیا تھا کہ وہ اعلےٰ سلائی کا کام کرکے پیسہ کمانے سے ضرور معذور ہوگئی تھی۔ اور یہ صرف اُس کی شب و روز کی گریہ زاری کا نتیجہ تھا ورنہ اُس وقت جیسا کہ میں نے عوام کی زبانی سُنا ہے وہ تمام علاقے میں نوجوان اور حسین ترین خاتون تھی۔ اس بات لے کہ اب وہ اپنے بچے کی حیات کو برقرار رکھنے کے لئے کچھ پیدا نہیں کرسکتی۔ اُس کے قلبِ نازک کو اور بھی مجروح کر دیا۔ خالہ نینی تو اپنی تمام قوت سے بخوشی اُسے اس طرف رجوع کر رہی تھی کہ گھر کا کام کاج اور بچے کی پرورش ہی اُس کے لئے کافی ہیں۔ مگر اماں باعلم تھی کہ اُن کی حالت تنزّل کی طرف گامزن ہے اور اس پر یہ بھی کہ خالہ نینی کے پاس خود اتنا اثاثہ نہیں کہ وہ اپنی ذات ہی کی کفیل ہوسکے۔ اور نہ گریگری کے بارے میں۔ وہ ایک تندرست اور طاقتور لڑکا نہ تھا۔ اس لئے اگرچہ اُسے زیادہ خوراک کی ضرورت تو نہ تھی۔ تاہم جس شے کی کمی تھی وہ اُس کی نشوونما کو برقرار رکھنے کے لئے مکھن و گوشت تھا جو اس کے لئے نہایت ضروری تھا۔

والدہ کی وفات کے عرصہ بعد خالہ نینی نے مجھ سے ذکر کیا کہ ایک دن جب وہ دونوں بہنیں اکھٹی بیٹھی ہوئی تھیں۔ خالہ نینی کام کر رہی تھی۔ اور والدہ گریگری کو سُلانے کے لئے تھپک رہی تھی۔ تو ڈیم پرلیئن جو بعد میں میرا والد بنا۔ ان کے پاس آیا۔ وہ ایک معمّر کنوارا گنا جاتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اُس وقت اُس کی عمر چالیس سے متجاوز کرچکی تھی۔ وہ قرب و جوار میں ایک امیر ترین زمیندار مانا جاتا تھا۔ میری والدہ اور خالہ نینی سے ان کے ایامِ آسودگی کا واقف تھا۔ وہ آکر بیٹھ گیا۔ پھر اُس نے غیر شعوری طور پر اپنی ٹوپی کو انگلی پر گھمانا شروع کر دیا۔ خالہ نینی اُس سے گفتگو کرتی رہی۔ اور وہ والدہ پر نظریں جمائے ہمہ تن گوش اُس کی باتیں سنتا رہا۔ اس موقعہ پر اُس نے معمولی گفتگو کی۔ ایک اتوار خالہ نینی بچے کی دیکھ بھال کے لئے گھر پر ٹھہر گئی۔ اور اکیلی والدہ ہی گرجے چلی گئی۔ واپسی پر وہ بغیر خالہ نینی سے کلام کئے اور بچے کو دیکھے سیدھی بالائی منزل پر جا چڑھی۔ خالہ نینی نے اُس کے رونے کی آواز سنی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت ہی شکستہ دل ہوگئی ہے۔ اس پر وہ بھی اوپر جا چڑھی اور سیڑھی چڑھتے ہوئے دروازے کے باہر ہی سے اُسے سلواتیں سنانے لگی حتےٰ کہ والدہ کو دروازہ کھولنے پر مجبور ہونا پڑا۔ جونہی کہ دروازہ کھلا اُس نے اپنے آپ کو اُس کی گود میں گرا دیا اور سسکیاں لیتے ہوئے بیان کرنے لگی کہ ویم نے پرلیئن نے اُس سے شادی کی درخواست کی تھی۔ اور یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ وہ اس کے بچے کی بہترین تعلیم و تربیت کا ذمہ لے گا۔ جس پر اُس نے شادی کے لئے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا ہے۔ خالہ نینی نے اس کا بدترین احساس کیا۔ اور اُسے بہت رنج ہوا۔ کیونکہ جیسا کہ میں پیشتر بیان کرچکا ہوں۔ اُس نے بارہا اس امر کا احساس کیا تھا کہ والدہ اپنے مرحوم خاوند کو فراموش کر بیٹھی ہے۔ اور اب اگر وہ اتنی جلدی شادی کے لئے تیار ہوگئی تھی۔ تو یہ اُس کے احساس کا مسلّم ثبوت تھا۔ علاوہ ازیں جیسے کہ خالہ نینی کہتی تھی وہ پرلیئن جیسے کی عمر کے مالک انسان کے لئے خود بہترین جوڑا ہوسکتی تھی۔ کیونکہ والدہ اگرچہ ایک بیوہ تھی۔ تاہم اس نے اپنی عمر کی چوبیس مکمل بہاریں بھی ابھی نہ دیکھی تھیں۔ کچھ بھی ہو خالہ نینی کے قول کے مطابق انہوں نے اس کی رائے کبھی نہ لی۔ حالانکہ سوال کا دوسرا رُخ کئی غور طلب امور کا حامل تھا۔ والدہ کی نظر اب اچھی نہ ہوسکتی تھی۔ مگر دوسری طرف ڈیم پرلیئن کی اہلیہ حیات بن کر اُسے کسی کام کو ہاتھ لگانے کی ضرورت نہ تھی۔ سوائے اس کے کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہے اور ایک بچے کی غور و پرداخت۔ بیوہ والدہ کے لئے کافی تکلیف دہ تھی مگر اب اُس کی دیکھ بھال کے لئے اُسے ایک نہایت ہی موزوں ہستی مل رہی تھی۔ آہستہ آہستہ خالہ نینی نے میری ماں سے بھی بڑھ کر شادی کے روشن پہلو کو زیرِ نظر رکھنا شروع کر دیا۔ مگر والدہ نے یومِ اقرار کے بعد کبھی اپنی نظریں اونچی نہ کیں۔ اور نہ ہی کبھی تبسم اُس کے لبوں پر رقصاں ہوا۔ مگر گریگری کو پیشتر سے بھی زیادہ پیار و محبت کرنے لگی۔ جب وہ دونوں تنہا ہوتے تو مسلسل وہ اُس سے کلام کرتی رہا کرتی۔ اگرچہ وہ اتنا باعمر نہ تھا کہ اُس کے حزنیہ الفاظ کو سمجھ سکے۔ یا سوائے اپنی معصوم محبت کے اُسے کوئی تسکین و راحت پہنچا سکے۔

آخر ویم پرلیئن اور وہ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوگئے اور والدہ خالہ نینی کے سکونتی مقام سے کوئی آدھ گھنٹے کے راستہ پر اُس کے مزیّن گھر کی مالکہ بننے کے لئے چلی گئی۔ مجھے یقین ہے کہ اُس نے والدہ کو خوش رکھنے کے لئے ہر وہ کام کیا جو اُس کی طاقت میں تھا اور میں نے والد کی زبانی خود یہ سنا ہے۔ کہ "اُس سے بڑھ کر قدر شناس بیوی کوئی نہ ہوسکتی تھی۔ مگر اُسے والد سے محبت نہ تھی۔ شاید

اگر وہ صبر کرتا تو ممکن تھا کہ وقت ہی محبت اُس کے دل میں عود کر آتی۔ مگر اِس منظر نے اُسے سخت اور ترش بنا دیا کہ اُس ننھے بچے کو دیکھتے ہی کیسے اُس کی آنکھوں میں نور اور چہرے پر مسرت کی رنگین لہر دوڑ جاتی تھی۔ مگر اُس شخص کے لئے جس نے اسے اتنا کچھ دیا۔ اُس کے پاس صرف نرم و سرد الفاظ ہی تھے اور ایسے سرد جیسے کہ برف۔ اس لئے والد نے اس کے اِس روکھے پھیکے رویہ کیلئے اُسے طعن و تشنیع کرنا شروع کر دیا۔ جیسے کہ اِس سے اُس کے دل میں اُس کے لئے محبت پیدا ہو جائے گی۔ اور ساتھ ہی ساتھ اُس نے گریگری کو بھی نفرت کی نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیا۔ کیونکہ وہ اُس محبت کے لئے جو گریگری کو دیکھتے ہی والدہ کے دل سے چشمہ کے صاف و شفاف آب کی مانند پھوٹ پڑتی تھی حاسد بنتا چلا جاتا تھا۔ وہ والدہ سے اپنے لئے زیادہ محبت و الفت کا متمنی تھا اور شاید یہ سب کچھ مناسب بھی تھا۔ مگر وہ ساتھ ہی یہ بھی تو چاہتا تھا کہ وہ اپنے بچے کو کم محبت کرے اور یہی ایک بدترین تمنا تھی جو اُس کے حصولِ مقصد میں مانع رہی۔ ایک دن وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ اور گریگری کو جو کسی شرارت کا مورد الزام ہوا سخت بُرا بھلا کہا۔ والدہ نے اس کی حمایت کی۔ اب تو اُس نے بے نقط سنانی شروع کر دیں اور کہنے لگا کہ اِس طرح تو کسی دوسرے کے بچے کو قابو میں رکھنا امرِ محال ہے۔ جبکہ فرداً فرداً اس کی ماں بھی اُسے شرارتوں سے باز رکھنے کے لئے نہ ٹوکے۔ اِس طرح اس معمولی سی بات نے دلوں کو زیادہ مکدر بنا دیا اور رنجش زیادہ بڑھ گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وقت سے پیشتر ہی والدہ پلنگ پر جا پڑی۔ اور میں اُسی دن تولد ہو گیا۔

اِس واقعہ سے والد ایک ہی وقت میں مسرور بھی ہوا اور افسوس زدہ بھی۔ مسرور اس لئے کہ خداوند تعالیٰ نے اسے ایک فرزند عطا فرمایا اور افسوس زدہ اس لئے کہ اِس سے اس کی اہلیہ کی حالت نازک ہو گئی۔ مگر وہ اِس قماش کا انسان تھا جو افسوس زدہ ہونے کی بجائے غصہ پرور ہونا بہتر پسند کرتا تھا۔ اس لئے اس واقعہ کو صرف گریگری کی ذات سے وابستہ کرتے ہوئے اُس نے تمام قصور کا ذمہ دار اُسے ہی ٹھہرا دیا۔ اور میری پیدائش کے قبل از وقت ہو جانے سے وہ اُسے پیشتر سے زیادہ مکروہ گرداننے لگا۔

میری پیدائش کے دن سے والدہ کی حالت دن بدن خراب ہوتی چلی گئی۔ والد نے کارسکی سے طبیب اور ڈاکٹر بھی بلائے۔ اور وہ یہاں تک بھی تیار تھا۔ کہ اپنے خونِ دل کو طلائی سکوں میں تبدیل کر دے۔ صرف والدہ کی زندگی کو بچانے کے لئے۔ مگر یہ ناممکن تھا۔ کبھی کبھی خالہ نینتی نے تذکرۃً مجھ سے یہ بھی بیان کیا کہ والدہ کو زندہ رہنے کی کوئی تمنا نہ رہی تھی۔ گو میرے استفسار پر اُس نے اقرار کر لیا کہ اُس نے ڈاکٹروں کے ہر حکم اور ہر ہدایت کی بلا چون چرا اپنے غیر شاکیانہ رویہ کو جس پر عالمِ حیات میں وہ کاربند رہی تھی قائم رکھتے ہوئے تعمیل کی۔ اُس کی آخری التجا گریگری کو اُس کے پہلو میں میرے ساتھ لٹا دینے کی تھی جب وہ ہمیں دیکھنے میں مشغول تھی۔ اُس کا رفیقِ حیات اُس کی حالت دریافت کرنے کے لئے کمرے میں داخل ہوا۔ جب اس نے ہم دونوں بھائیوں پر رحم پرور نظریں ڈالیں تو وہ اُس کی طرف دیکھ کر خزاں کے آخری پھول کی طرح مسکرا دی۔ اور شاید والد کے لئے یہ اُس کا اولین اور آخری تبسم تھا اور شیریں ترین تبسم۔ اس کے بعد ایک گھنٹہ کے اندر ہی وہ اِس دارِ فانی کو خیرباد کہہ گئی۔ اب خالہ نینتی ہمارے ہاں چلی آئی اور شاید یہ بہترین مصلحت تھی۔ کیونکہ اگرچہ والد اپنی قدیم کنوارے پن کی زندگی کو دوبارہ بخوشی قبول کر لینے کے لئے تیار تھا۔ لیکن وہ دو بچوں کا کیا کرتا۔ یعنی اسے اُس وقت ایک عورت کی سخت ترین ضرورت تھی اور اُس کی اہلیہ کی بڑی ہمشیرہ سے زیادہ موزوں کون ہستی ہو سکتی تھی؟ لہٰذا عہدِ طفولیت سے ہی خالہ نے میری پرورش کو اپنے ذمہ لے لیا۔ کچھ عرصہ تو قدرتاً میں کمزور رہا۔ اِس دوران میں دن رات سایہ کی طرح وہ میرے ساتھ رہتی رہی۔ والد بھی اس سے کم خیال نہ رکھتا تھا۔ کیونکہ اُس کی زمین جو اسے تین صد سال سے ورثہ بہ ورثہ آباؤ اجداد سے ملتی چلی آئی تھی اُس کا اصلی وارث میں ہی تھا۔ اور پھر اُس کے خون و گوشت کا ایک حصّہ بھی ــــــ اور پھر وہ کسی سے محبت بھی کرنا چاہتا تھا۔ جس کے لئے بہت انسانوں کے بارے میں تو وہ بالکل کورا تھا۔ اور میرا قیاس ہے کہ وہ اسی لئے مجھ سے اتنی محبت کرتا تھا۔ میں تو سبھی سے محبت کرتا تھا۔ جیسا کہ میرا خیال ہے کیونکہ ہر انسان مجھ سے نرمی اور محبت سے پیش آتا۔ آہستہ آہستہ میں اپنی پیدائشی کمزوری پر غالب آ گیا اور ایک حسین اور طاقتور لڑکا بن گیا۔ جب میں والد کے ساتھ سیر کے لئے جاتا تو ہر راہرو مجھے محبت سے گھور گھور کر دیکھا کرتا۔

گھر میں خالہ کا پیارا۔ والد کا محبوب اور خادموں کا مرغوب میں

کھلونا تھا۔ اور باہر کھیتوں میں کسانوں کا "ننھا مالک" ان کے سامنے میں نہایت ہی امیرانہ حرکتیں کیا کرتا اور غیر معمولی طور پر عجیب و غریب۔ اس وقت ان کے متعلق میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ آیا یہ میری عمر کے بچے کے لئے زیبا ہیں۔ یا نہیں۔

گریگری عمر میں مجھ سے تین سال بڑا تھا۔ خالہ نینی گو عملاً... اس کا خیال ضرور رکھتی۔ مگر وہ اس کے خیالوں کا مکین نہ تھا۔ کیونکہ بچپن سے ہی خالہ میری پرورش کرتے رہنے کے باعث مجھے زیادہ اُنس کرنے لگی تھی۔ والد بھی اپنے سوتیلے بیٹے کو جس نے میری والدہ کا دل حاصل کرنے کے لئے اُس سے ایک معصومانہ جنگ لڑی تھی حاسدانہ نظروں سے دیکھنے پر کبھی فتح حاصل نہ کر سکا۔ اور مجھے یقین ہے کہ وہ ہمیشہ اسے میری کمزوری اور والدہ کی موت کا سبب گردانتا رہا۔ یہ کہنا غیر موزوں نہ ہوگا کہ اس نے گریگری کے لئے اپنے احساسِ محبت کو ہی کھو دیا تھا۔ مگر ہر وہ شے جو کہ دولت مہیّا کر سکتی تھی اس سے کبھی احتراز نہ کر سکتا تھا۔ کہ گریگری کو نہ ملے۔ کیونکہ والدہ کی شادی کے اقرار نامے پر یہ ایک شرط تھی۔

گریگری ایک بھاری بھرکم۔ بھدا۔ قبیح صورت اور بدشکل انسان تھا۔ جو جس کام میں بھی ہاتھ ڈالتا خراب کر دیتا۔ کسان تک بھی اسے گالیاں نکال لیتے۔ اور پھر والد کے سامنے ہی۔ مجھے تاسف ہے کہ میں بھی گھرانے کی نقل کرتا ہوا کیسے اپنے غریب سوتیلے بھائی کو بُرا بھلا کہنے لگا؟۔ میرا خیال نہیں کہ میں نے اپنی طرف سے کبھی اسے کبری نظروں سے دیکھا ہو یا بُرا بھلا کہا ہو۔ مگر آہ اس امر نے کہ ہر جگہ میری عزت کی جاتی تھی اور سبھی غیر معمولی طور پر مجھے بڑا تصور کرتے تھے۔ مجھے سرکش۔ اور شوخ و شنگ بنا دیا اور اس طرح میں گریگری سے وہ سلوک کرنے لگا جسے برداشت کرنے کے لئے وہ ہمیشہ تیار نہ ہو سکتا تھا۔ یعنی پھر—— جب کبھی میں ناراض اور برافروختہ ہو جاتا تو وہی الفاظ دہرایا کرتا۔ جو دوسرے اس کی مذمت کے لئے استعمال میں لائے تھے۔ گو اُن کے معانی تک کو بھی میں اچھی طرح نہ سمجھ سکتا—— اور وہ —— وہ ہمیشہ خاموش اور خشمگین ہو جاتا۔ والد اُس کی خاموشی کو اُس کی برہم مزاجی اور ناخوشی سے اور خالہ نینی بےوقوفی سے تعبیر کرتی۔ ہر ایک اس کو کاہل اور بیوقوف کا خطاب دیتا اور آہستہ آہستہ عوام کے قول کے مطابق کاہلی اور بیوقوفی اُس پر مسلط بھی ہوتی گئی۔ بعض اوقات وہ گھنٹوں ایک ہی جگہ چُپ چاپ اور ساکت بیٹھا رہتا۔ والد دیکھ لیتا تو فوراً اُسے کسی نہ کسی کام کی سرانجام دہی کا حکم سُنا دیتا۔ جانے سے پیشتر ایک بات کو اُسے ذہن نشین کرانے کے لئے کم از کم دو تین مرتبہ کہنا پڑتا تھا۔ سکول میں داخل ہونے کے بعد بھی اُس کی حالت میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہو سکی۔ سبق تو اُسے کسی طرح بھی یاد نہ ہوتا تھا۔ اس لئے سکول ماسٹر بھی اُس سے اُکتا گیا۔ اور جب بُرا بھلا کہتے کہتے بھی تنگ آ گیا تو اُس نے والد کو اسے زمینداری میں ڈال دینے کا مشورہ دے دیا۔ یہ کام شاید اُس کی قوّت سے باہر نہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس واقعہ کے بعد وہ اَور بھی کند ذہن اور غمگین ہو تا گیا۔ مگر وہ جھگڑالو نہ تھا۔ بلکہ صابر اور نرم مزاج تھا اور پھر ایسا نیکدل کہ ہر ایک کا کام کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتا تھا۔ چاہے دوسرا چند منٹ پیشتر اُسے بُرا بھلا ہی کہہ چکا ہو۔ یہ کہ اُس کی نیکدلی بعض اوقات دوسروں کے لئے نقصان دہ ثابت ہوتی۔ اس میں اُس کا کوئی قصور نہ تھا۔ بلکہ اُس کے غیر معقول طریقِ عمل کا۔

میں ایک ہوشیار لڑکا تھا۔ خواہ کوئی وجہ بھی ہو ہمیشہ میری تعریف ہی کی جاتی تھی۔ سکول میں بھی...... میں بہترین طالبعلم گردانا جاتا تھا۔ استاد کہا کرتے تھے کہ جو کچھ میں سیکھنا چاہوں حاصل کر سکتا ہوں۔ مگر والد چونکہ خود زیادہ تعلیم یافتہ نہ تھا۔ لہذا اُسے میری اعلیٰ تعلیم میں کوئی فائدہ نظر نہ آیا۔ چنانچہ وقت سے پیشتر ہی مجھے اسکول سے اُٹھا کر اُس نے اپنے ساتھ کھیتوں کے کام میں شریک کر لیا۔

گریگری کو بوڑھے آدم کے پاس جو اب کام کاج سے قریب قریب معذور ہو چکا تھا گڈریا بنا دیا گیا اور بوڑھا آدم پہلا شخص تھا۔ جس نے گریگری کے بارے میں اپنی پسندیدگی کی رائے کو شدید طور پر پیش کیا۔ اور اس پر ثابت قدم رہا۔ کہ گریگری اوصافِ حمیدہ کا حامل ہے۔ اگرچہ اُن اوصاف کو استعمال کرنے کی اس میں صلاحیت نہیں۔ دیگر پہاڑی گھاٹیوں کے پیچ و خم کی جتنی وسیع واقفیت اسے ہے شاید ہی کسی دوسرے کو ہو۔ جب والد اُسے گریگری کی خامیوں کی طرف متوجہ کرتا تو یہ معلوم کرتے ہوئے کہ اُس کا اصلی مقصد و مدعا کیا ہے وہ پیشتر سے بھی زیادہ گریگری کی تعریف میں رطب اللسان بن جاتا۔

(۲)

ایک مرتبہ موسم سرما میں جب میں سولہ سال اور گریگری انیس

سال کا تھا والد نے مجھے ایک جگہ جو سڑک پر سے سات میل اور پہاڑی گھاٹیوں میں سے صرف چار میل تھی۔ کہیں ضروری کام کے لئے بھیجا۔ اور ہدایت کر دی کہ لوٹتا ہوا بھی سڑک پر سے آؤں۔ یعنی جس راہ سے جاؤں اُسی سے واپس آؤں۔ یعنی سڑک پر سے۔ چونکہ شام جلد ہی پڑ جاتی تھی اور جھٹ پٹے کے فوراً بعد ہی کہر اور دھند فضا پر مسلط ہو جاتی تھی۔ اِس کے علاوہ بوڑھے آدم نے بھی جواب بستر پر آلڑوں لیٹ گیا تھا۔ یہ پیشگوئی کر دی تھی کہ برف باری جلد ہی شروع ہو جائیگی۔

میں نے اپنی مسافت جلد ہی طے کر لی اور منزلِ مقصود پر پہنچ کر والد کے تخمینۂ وقت سے ایک گھنٹہ قبل ہی اپنے کام کو سرانجام دے لیا۔ لیکن لوٹنے کے راستہ کے فیصلہ کو خود اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے۔ میں گھاٹیوں پر سے واپس گھر چل پڑا۔ اب تک سیاہی کافی پھیل چکی تھی۔ مگر ماحول اتنا بے خطر تھا کہ میں نے خیال کیا کہ برف باری سے پیشتر ہی گھر پہنچ جاؤں گا۔

میں نے قدم تیز کر دیا۔ مگر تاریکیٔ شب بہ سرعت پھیلتی گئی۔ دن کے وقت تو صحیح راستہ بخوبی صاف دیکھا جا سکتا تھا۔ اگرچہ بہت سے مقامات سے ملتے جلتے کئی راستے اِدھر اُدھر نکلتے تھے لیکن دن کی روشنی میں مسافر کئی ایک نشانیوں سے راستہ کا پتہ چلا سکتا تھا۔ مثلاً لکڑ، چٹان۔ نشیب زمین —— مگر اب مجھے ان میں سے ایک بھی نشانی نظر نہ آتی تھی۔ تاہم میں دل کڑا کرتے ہوئے اُسی شاہراہ پر ہو لیا۔ جو میرے خیال میں صحیح تھی۔ مگر یہ راستہ غلط نکلا اور مجھے وہاں لے گیا۔ جس جگہ سے میں بالکل واقف نہ تھا —— ایک دلدلی قطعہ زمین میں جہاں کا سکوت ہلاک آفریں اور بھیانک تھا۔ جیسے کہ وہاں انسانی قدم نے کبھی خلل اندازی ہی نہ کی تھی ——

میں نے ایک معمولی سی امید پر اپنے آپ کو یقین دلانے کے لئے چلانے کی کوشش کی۔ مگر آواز دھیمی اور گلوگیر نکلی جس سے مجھے نا امیدی ہو گئی۔ اور پھر اُس سیاہ و تاریک فضا میں یہ کچھ عجیب طرح بدل سی گئی۔ ہوا جلد ہی برف کے گالوں سے بوجھل ہو گئی۔ میرے ہاتھ اور چہرہ دونوں برف سے تر بتر ہو گئے۔ اور اب میں اُس معمولی سی علمیت سے بھی بے بہرہ ہو گیا۔ کہ میں کدھر سے آیا تھا۔ اِس لئے انہیں قدموں پر واپس کبھی نہ لوٹ سکتا تھا۔ برف نے بُری طرح مجھے اپنے اندر گھیر لیا۔ اور دمبدم اُس کی رفتارِ نزول تیز ہوتی چلی گئی۔ اندھیرا بھی غضبناک ہو گیا تھا۔ دلدلی زمین اگر میں ایک ہی جگہ زیادہ دیر ٹھیرا رہتا تو نیچے دبنی شروع ہو جاتی۔ مگر ایسے ماحول میں بھی مجھ میں سرکنے کی قوت کام نہ کرتی۔ کیونکہ شباب کی تمام مضبوطیاں مجھے خیرباد کہتی معلوم ہو رہی تھیں۔ اور میں قریب رونے والا ہی ہو گیا تھا۔ مگر صرف شرم ہی ابتک اِس فعل کی ممانعت کر رہی تھی۔ آخر میں نے زور زور سے چلانا شروع کر دیا۔ اور میری چیخیں ایسی تھیں جو خود مجھے نہایت ہی بھیانک اور ڈراؤنی معلوم دیتی تھیں جب میں جواب کے حصول کے لئے رُکا تو میری حالت غیر ہو چکی تھی۔ اور سوائے اپنی ہی صدائے بازگشت کے میرے کان کچھ نہیں سن سکے۔ یا صرف بے رحم برف زیادہ تندی و تیزی اور گہرائی سے پڑتی رہی۔ اب میں سُن ہو گیا تھا۔ اور نیند مجھ پر غلبہ حاصل کر رہی تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر ہلنا چاہا۔ کہ خون کی حرکت جاری ہو جائے۔ مگر متعدد گھاٹیوں اور گہرائیوں کے خوف کے باعث جن کا علم مجھے پہلے ہی سے تھا۔ کہ پہاڑیوں میں جگہ بہ جگہ واقعہ ہیں۔ میں اِس کی بھی جرأت نہ کر سکا۔ گاہے بگاہے دقفہ کی خاموشی کے بعد میں دوبارہ پیشتر کی طرح پکارنے لگتا۔ مگر آواز آنسوؤں کے سیلابِ بے پناہ کے باعث جو اِس خیال کے زیر اثر اُمنڈتا چلا آ رہا تھا کہ میں کیسی ڈراؤنی اور وحشیانہ موت کا شکار بنوں گا۔ اور گھر پر جو گرم و روشن آتش کے اردگرد بیٹھ رہے ہیں۔ اُن کو اِس انجام کی کتنی کم خبر ہو گی اور پھر میرا غریب باپ کیسے اِس صدمہ کو برداشت و محسوس کر سکے گا —— یقیناً یہ اُس کی موت کا باعث ہو گا۔ یہ اُس کے دلِ حزیں کو چُور چُور کر دے گا۔ آہ غریب بوڑھا —— اور خالہ نینی بھی۔ کیا اُس کی محبت کا یہی انجام لکھا تھا؟ شکستہ دل ہو جائے گی۔

اب میں نے اپنی حیاتِ گزشتہ پر ایک عجیب و غریب اور واضح خواب کی مانند تبصرہ آزمائی شروع کر دی۔ میرے عہدِ طفولیت کے چند سال کے واقعات و مناظر میری نظروں کے آگے سے فلم کی مانند گزر گئے۔ اِس کربیہ حالت میں جو اِس قلیل سی زندگی کے مناظر کی یاد سے پیدا ہو گئی تھی۔ میں اپنی تمام طاقت کو مجتمع کرتے ہوئے ایک مرتبہ اور زور زور سے چیخا —— حزنیہ۔ لمبی اور امید کو شکستہ کر دینے والی چیخ جس کے جواب کی سوائے اِس کے کہ اُس کی صدا بھیگی ہوئی ہوا کی شکستہ آواز کی مانند بے نیل و مرام مجھ تک واپس لوٹ آئے مجھے اب کوئی امید نہ رہی تھی۔ مگر یہ انتہائی تعجب تھا کہ خود میرے سر ہی جیسی لمبی اور بھیانک آواز جواب میں سنائی دی۔ اتنی بھیانک کہ میں نے اسے

کسی بدروح کی آواز سمجھا جو اِن پہاڑیوں میں سرگرداں اور آوارہ پھرتی رہتی تھیں۔ اِس سے یکایک میرے قلب کی حرکت میں تیزی واقع ہو گئی اور میری آواز بھی بالکل بند ہو گئی۔ ایک یا دو منٹ تک میں کوئی جواب نہ دے سکا۔ میں نے خیال کیا کہ میری قوتِ گویائی صلب ہو گئی ہے۔ مگر اُسی لمحے ایک کتّے کے بھونکنے کی آواز آئی۔ کیا یہ میرے بھائی کی کُتیا کی آواز تھی۔۔۔؟ لیسی کی جو سفید بھیانک اور قبیح چہرے کی مالکہ تھی؟ جسے میرا باپ جہاں بھی دیکھ لیتا لات جما دیتا۔ کچھ اُس کے اپنے عیوب کی وجہ سے۔ اور کچھ اِس لئے کہ وہ گریگری کی مقبوضہ تھی۔ ایسے موقعوں پر گریگری اُسے سیٹی سے بُلا کر باہر لے جاتا اور وہیں اُس کے ساتھ بیٹھا رہتا۔ والد کو اُس کے اِس فعل پر جب ایک دو مرتبہ لیسی شدّتِ درد سے کراہ اُٹھی ندامت بھی ہوئی۔ مگر وہ تمام الزام گریگری کے سر تھوپ دیتا۔ جیسے اُس کے نزدیک کتّے پالنے کی تمیز ہی نہ تھی اور دنیا کے ہر کتّے کو اپنی بُری عادتوں سے باورچی خانہ کی آگ کے نزدیک بٹھا بٹھا کر خراب کر دیتا تھا۔ گریگری اُس کا کوئی جواب نہ دیتا۔ اور نہ ہی اس پر کان دھرتا۔ بلکہ خاموش اور ساکت دیکھتا رہتا۔

ایک مرتبہ اور لیسی کی آواز آئی! یا تحنت یا تختہ میں نے دل میں کہا۔ اور اپنی انتہائی طاقت سے چلّایا۔ لیسی۔ لیسی۔ خدا کے لئے لیسی۔! دوسرے لمحے بھیانک سفید چہرے والی لیسی میرے پاؤں کے ارد گرد چکّر کاٹ رہی تھی۔ اور ساتھ ہی ساتھ اپنی ہوشیار اور خوفزدہ آنکھوں سے کہ میں اُسے بارہا پیشتر کی مانند شاید اب بھی ماروں گا۔ میرے چہرے کی طرف دیکھتی جا رہی تھی۔ میں اُسے تھپکنے کے لئے بیٹھا تو خود بخود میرے منہ سے ایک مسرت انگیز چیخ نکل گئی۔ اب میرا دماغ میرے جسم کی کمزوری میں شریک ہوتا جا رہا تھا۔ اِس لئے میں کچھ سوچ نہ سکتا تھا۔ ہاں اتنا ضرور جانتا تھا کہ مدد آ پہنچی ہے۔ گھٹتی ہوئی تیرہ و تار سیاہی میں ایک بھورا سا سایہ لمحہ بہ لمحہ ہمارے قریب چلا آ رہا تھا۔ یہ گریگری تھا جو اپنے فرغل میں لپٹا ہوا تھا۔

"گریگری" میں نے کہا۔ اور زیادہ بولنے سے معذور ہوتے ہوئے اپنے آپ کو اُس کے شانوں پر گرا دیا۔ وہ کبھی زیادہ کلام نہ کرتا تھا اِس لئے چند منٹ تک اُس نے کوئی جواب نہ دیا "ہمیں یہاں سے ہلنا چاہیئے۔" وہ آہستہ سے متکلم ہوا "ہمیں اپنی پیاری جان کی حفاظت کے لئے یہاں سے ہلنا چاہیئے۔ ممکن ہے ہم گھر کا راستہ معلوم کر لیں۔ مگر یہاں سے ہلنا ہمارے لئے ضروری ہے۔ ورنہ سُن ہو کر ہم یہیں ڈھیر ہو جائیں گے۔"

"کیا تم گھر کے راستے سے باعلم ہو۔" میں نے استفسار کیا۔

"ہاں جب گھر سے آیا تھا تو یاد تھا۔ مگر اب مجھے شک سا ہے۔ برف مجھے اندھا کئے دے رہی ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ اب میں گھر کا صحیح راستہ کھو چکا ہوں۔"

اس کے پاس اُس کا گڈریوں والا عصا تھا۔ جس کو ہر قدم اٹھانے سے پیشتر کھڑکاتے ہوئے ہم ایک دوسرے سے چمٹے اور گہری گھاٹیوں سے بچتے ہوئے آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ مگر چال بہت ہی سُست تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ گریگری لیسی کی راہبری پر اعتماد کرتے ہوئے اسی کے اختیار کردہ راستہ پر چل رہا تھا۔ کیونکہ تاریکی کی وجہ سے دُور تک سامنے نظر دوڑانا مشکل امر تھا۔ گریگری لیسی کو بار بار واپس بلاتے ہوئے اُس کے راستے کو بھانپتا جاتا تھا۔ اور اپنے قدموں کو اُسی راہ پر محدود کئے جاتا تھا۔ مگر یہ تکلیف وہ چال بمشکل ہی میرے خون کو منجمد ہونے سے بچا رہی تھی۔ میرے جسم کی ہڈی ہڈی اور ریشے ریشے نے درد محسوس کرنا شروع کیا۔ مگر پھر سوچ کر سخت ترین سردی کے باعث بالکل سُن ہو گئے۔ گریگری مجھ سے زیادہ جانفشانی سے اس کا مقابلہ کر رہا تھا۔ کیونکہ شاید وہ اکثر پہاڑیوں پر پھرتے رہنے کا عادی ہو چکا تھا۔ سوائے لیسی کو واپس بلانے کے وہ اَور کچھ نہ بولتا تھا۔ میں نے اپنے جسم کو جنبش دیکر قوت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ مگر بے سود۔ کیونکہ اب میں ابدی اور بھیانک نیند کو اپنے اوپر غلبہ پذیر ہوتے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔

"میں آگے نہیں بڑھ سکتا۔" میں نے خمار آلود لہجہ میں کہا۔ مجھے یاد ہے کہ اِس کے بعد فوراً ہی میں بے بس حالت میں ہو گیا۔ میں سونا چاہتا تھا۔ چاہے پانچ منٹ ہی کیوں نہ سو سکتا اور چاہے اس کا انجام موت ہی کیوں نہ ہوتا۔ میں صرف سونا چاہتا تھا۔ گریگری ٹھٹھر گیا۔ میرا خیال ہے کہ اُس نے میری اس کربیہ حالت کو جو مجھ پر سردی سے طاری ہو گئی تھی بھانپ لیا تھا۔ "یہ سودمند نہیں۔" اُس نے کہا جیسے خود کو مخاطب کر رہا ہو۔ "جہاں تک میرا خیال ہے ہم نے اب تک نصف راستہ طے کیا ہے۔ اب ہمارے بچاؤ کا انحصار صرف لیسی پر ہے۔ دیکھو تم اپنے آپ کو میرے فرغل میں لپیٹ کر اس چٹان کی معمولی سی پناہ میں لیٹ جاؤ۔ ذرا اِس کے اندر سرک جاؤ۔ میں بھی تمہارے ساتھ ہی لیٹ کر تمہیں گرمانے کی کوشش کروں گا۔

ٹھیرو۔ کوئی ایسی شے ہے تمہارے پاس جسے وہ گھر پر پہچان سکیں؟"

نیند سے باز رکھنے کے باعث وہ مجھے نہایت بے رحم معلوم دے رہا تھا۔ مگر اُس کے دہرانے پر میں نے ایک شوخ سا رومال جو خالہ نینی نے میرے لئے کاڑھا تھا جیب سے نکالا اور گریگری نے لیتے ہوئے اسے لیسیؔ کی گردن کے گرد باندھ دیا۔

"جاؤ لیسیؔ گھر جاؤ —" اُس نے کہا اور سفید چہرے والی وحشی لیسی گولی کی مانند اندھیرے میں غائب ہو گئی۔ اب میں لیٹ کر آرام کر سکتا تھا۔ میں نے خمار میں محسوس کیا کہ کھائی مجھے نہایت حفاظت سے ڈھانپ رہا ہے۔ مگر میں نے اِس کے جاننے کی چنداں پرواہ نہ کی۔ کیونکہ یہ سب کچھ معلوم کرنے کے لئے میں بالکل بے خبر۔ خود غرض اور سرد ہو چکا تھا۔ ورنہ یہ میں جان سکتا تھا کہ اِس تن تنہا جگہ میں مجھے ڈھانپنے کے لئے سوائے کھائی کے کپڑوں کے کوئی اور شے نہ تھی۔ خاموش رہتے ہوئے اُس نے مجھے لٹا دیا۔ اب میں تسکین محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"تم یاد نہیں کر سکتے عزیز بچے کہ کیسے ہم اپنی جان بلب والدہ کے پہلو میں بھی ایسے ہی لیٹے ہوئے تھے۔ اُس نے تمہارے نرم و نازک اور ننھے ہاتھ کو میرے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اب وہ ہمیں دیکھ رہی ہے۔ شاید ہم جلد ہی اُس کے پاس پہنچ جائیں۔ خیر خدا کی رضا پوری ہو جائے گی۔"

"عزیز گریگری" میں بڑبڑایا۔ اور سرک کر حرارت حاصل کرنے کے لئے اُس کے ساتھ لگ گیا۔ وہ اب بھی جبکہ نیند مجھ پر مکمل طور سے مسلط ہو چکی تھی والدہ کے متعلق کچھ کہہ رہا تھا۔ ایک لمحہ میں — یا اتنی ہی دیر میں — جیسے کہ مجھے معلوم دیا۔ میرے ارد گرد کئی آوازیں آ رہی تھیں۔ اور نئے چہرے میرے ارد گرد چکر کاٹ رہے تھے۔ حرارت کی شیرینی میرے تمام حصہ جات بدن میں سرایت کر رہی تھی۔

میں گھر میں اپنے ننھے پلنگ پہ دراز تھا اور میں شکر گزار ہوں کہ سب سے پہلا لفظ میری زبان سے جو نکلا وہ گریگری تھا۔

میری ایک ہی نگاہ نے ہر ایک کا جائزہ لے لیا۔ میرے والد کا اداس اور تکلیف زدہ چہرہ اپنی سختی کو قائم رکھنے کی بے سود کوشش کر رہا تھا۔ اُس کے لبوں کو جنبش ہوئی اور اس کی آنکھیں غیر شعوری طور پر آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔

میں اُسے اپنی نصف شفقت عنایت کرتا۔ میں اُسے اپنے بیٹے کی طرح بابرکت بناتا۔ خدایا — ! میں اُس کے قدموں پہ سرنگوں ہو جاتا اور پھر اُس سے اپنے دل کی سختی کو معاف کر دینے کی درخواست کرتا۔" والد نہایت ہی کربیہ اور دلخراش لہجے میں بڑبڑا رہا تھا۔ گریگری کے بارے میں۔ مگر آہ اب یہ سب کچھ بے سود تھا۔

میں اِس سے زیادہ اور کچھ نہ سُن سکا۔ دماغ میں ایک جھونکا سا آیا اور دوبارہ مجھے خوابِ بیہوشی کی جانب دھکیل کر لے گیا۔

کئی ہفتوں کے بعد جا کر کہیں مجھے مکمل ہوش آئی اور جب میں رو بصحت ہوا تو والد کے سر کے بال سفید ہو چکے تھے۔ جب وہ میری جانب دیکھتا تو اُس کے ہاتھوں میں کپکپی پیدا ہو جاتی۔

اِس کے بعد ہم نے گریگری کے متعلق کوئی تذکرہ نہ کیا۔ ہم اُس کی ہستی کے بارے میں اب بولتے بھی کیا — مگر پھر بھی وہ ہمارے خیالات کا مرکز تھا۔ اب لیسیؔ بھی بغیر ٹھیکار کے اندر باہر بے تابانہ دوڑی پھرتی تھی۔ نہیں — والد اب اُسے مارنا نہ چاہتا تھا۔ مگر پھر بھی وہ بچتی ہوئی باہر بھاگ جاتی۔ والد جیسے غریب جانور اسے ملامت کر رہا ہو۔ سرد آہ بھر کر دیر تک ایک ہی جگہ خاموش بیٹھا رہتا۔

خالہ نینیؔ چونکہ ہمیشہ سے زیادہ کلام کرنے کی عادی تھی۔ اس لئے یہ تمام واقعہ بیان کئے بغیر بھی وہ نہ رہ سکی۔ اُس نے بتایا کہ کیسے اُس شب میرا والد میری غیر حاضری سے تکلیف محسوس کر رہا تھا — شاید جتنا کہ وہ ظاہر کر رہا تھا۔ اُس سے زیادہ اُسے احساس تھا — اور کس طرح اپنے آپ میں نہ رہتے ہوئے اُس نے گریگری کی کم عقلی اور بیوقوفی پر اُسے اور اُس کے والد کو اُس کی غربت کی وجہ سے بُرا بھلا کہا — آہ۔ حالانکہ بوڑھے گڈریے نے ہمیشہ گریگری کی تعریف ہی کی — آخر گریگری اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور لیسیؔ کو جو ڈر کے مارے اُس کی کرسی تلے دبکی بیٹھی تھی سیٹی سے اپنے ساتھ باہر لے گیا۔ چونکہ خالہ نینیؔ اور والد میں کچھ دیر پیشتر میری آمد کی دیری پر گفتگو ہو چکی تھی۔ اِس لئے خالہ نینیؔ نے سمجھا۔ کہ گریگریؔ طوفان کا اندازہ کرتے ہوئے مجھے ڈھونڈنے کے لئے چلا گیا ہوگا۔ تین گھنٹہ بعد جب سب اسی انتظار میں تھے کہ میری تلاش کریں اور کچھ گریگریؔ کا بھی پتہ لگائیں۔ غریب۔ غریب لیسیؔ میرے رومال کو گردن کے گرد لپیٹے گھر آئی۔ انہوں نے دیکھا اور سمجھ لیا۔ بس کھیتوں کے تمام مزارعان۔ اس کے پیچھے ہو لئے۔ برانڈی۔ کمبلوں۔ فرغلوں اور ہر اُس شے کے ساتھ جس کا اس وقت خیال آ سکتا تھا۔

آخر لیسی کے ساتھ وہ چٹان تلے پہنچ گئے۔ میں نیند میں بے خبر پڑا تھا۔ اور اپنے بھائی کے اونی دوشالہ میں لپٹا ہوا تھا۔ اس کا گدڑیلے والا موٹا کوٹ میری ٹانگوں کے اردگرد لپٹا ہوا تھا۔ اور وہ خود صرف ایک قمیض میں ہی ملبوس تھا۔ اس کا ایک بازو میرے اوپر دھرا تھا — اور اُس کے سرد چہرے پر ایک اداس اور خاموش تبسم رقصاں تھا۔ — آہ زندگی میں بمشکل ہی کبھی وہ مسکرایا تھا۔

والد کے آخری الفاظ یہ تھے۔ "خدایا میری سختی کو جو میں نے اُس یتیم بچے کے ساتھ روا رکھی معاف فرمائیو!۔"

والد کے افسوس کی گہرائیوں پر شاید سب سے زیادہ چرکہ لگانیوالی بات یہ تھی کہ گریگری والدہ کو کتنی معصوم محبت کرتا تھا۔ جس کا اندازہ اِس سے ہو سکتا ہے کہ اُس کی وفات کے بعد ہمیں ایک وصیت کا پُرزہ ملا۔ جس میں اُس نے اپنی یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ اُسے اُس کی والدہ کے قدموں میں دفن کیا جائے۔

اور غریب گریگری اب ہماری والدہ کے ساتھ محوِ خواب ہے

(مسز گاسکل) مترجمہ گل سعید

زندگی اور آرزو

کس طرح جیوں گا میں، آرزو کو چھوڑ کر
زندگی عزیز ہے، آرزو عزیز تر

جا رہے ہیں پے بہ پے، قافلوں پہ قافلے
میں بھی در پئے سفر، تو بھی در پئے سفر

آئے ہیں کدھر سے ہم؟ جائیں گے کدھر کو ہم؟
میں بھی اس سے بے خبر، تو بھی اس سے بے خبر

یہ جہاں مرا نہیں، یہ مکاں ترا نہیں
برگ و ساز اس قدر، کبر و ناز اس قدر

آرزوئے جام ہے؟ آرزوئے خام ہے!
میکدہ نہیں ہے یہ، رہگذر ہے رہگذر!

آرزوئے جام چھوڑ، آرزوئے خام چھوڑ
لا کہیں سے ڈھونڈ کر، آرزوئے پختہ تر!

آرزو ہے زندگی، زندگی عزیز ہے
زندگی ہے چیز کیا، آرزو ہی چیز ہے

صادق حسین صادق

اقبالؔ اور ٹیگورؔ

(میں نے یہ مختصر مقالہ اس وقت لکھا تھا۔ جب ڈاکٹر اقبالؔ کا انتقال نہیں ہوا تھا۔ اب تو حالت ہی دگرگوں ہے۔ شعر و ادب کا پیغمبر اُٹھ گیا۔ فضائے شعر جبریلِ شاعری کے شہپروں کے نغمہ سے سے محروم ہو گئی۔ اب کس پر "زبورِ عجم" اترے گی؟ کون "ضربِ کلیمی" کے معجزے دکھلائے گا؟ اور اب کون "پیامِ مشرق" اہلِ عالم کو سنائے گا؟ انا للہ وانا الیہ راجعون —— ہاں مرحوم کی پیمبرانہ شاعری کا پیام ایک ابدی ماہِ کامل کی طرح رخشندہ و پایندہ رہے گا اور یہی ہم تیرہ بختوں کی تسکین کا باعث ہے۔)

اختر

دورِ حاضر ایشیار کے لئے دورِ نہضت ہے۔ جس طرح اسلامی فتوحات کے سلسلہ میں یونان کا علم دیرینہ سارے یورپ میں پھیل گیا تھا قریباً اسی طرح مغربی تسلط کے بعد ایشیا پر بھی ایک علمی بیداری طاری ہوئی۔ یورپ کا دورِ نہضت دو اثرات کا رہینِ منت تھا۔ اول تو وہ خالص یونانی و رومی تمدن کا اثر، جس نے یورپ کے اجتماعی احساسِ خودی کو چھیڑا اور دوسرے جدید عربی ثقافت کا جس سے رُوح و ذہن پر خیالات اور بیدار احساسات کی جلا ہوئی۔ ایشیا میں بھی قدیم علم و تمدن کی احیار کے ساتھ ساتھ جدید فلسفہ و سائنس کی بھی اشاعت ہوئی۔ ان دونوں اثرات نے مل کر موجودہ ایشیائی تہذیب کی تاسیس میں حصہ لیا ہے۔

اس ایشیائی نہضت الثانیہ کے جلوے سب سے زیادہ جاپان کے اُفق پر نظر آتے ہیں اور اس کے بعد ترکی کی شفق سامانیاں نظاروں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ ان ممالک کے علاوہ ایشیار کے اور ملکوں نے بھی اپنی انفرادی حیثیت کے ساتھ احیار العلوم کی طرف قدم بڑھایا ہے۔ ہرچند کہ ہندوستان پنجۂ غلامی میں گرفتار ہے، تاریخ اس ملک کے اندر بھی احیار اور نہضت کی رُوح ایک جلیل قوت کے ساتھ بیدار ہو رہی ہے۔ فطرت کا یہ اصول ہے کہ زیادہ دبائی جانے والی چیز زیادہ تیز قوت کے ساتھ اُبھرتی ہے۔ بشرطیکہ اس کے اندر لچک اور رُوح موجود ہو۔ اور ہندوستان کی رُوح ایک ازلی، زندہ و پایندہ قوت ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہندوستان میں نہضت کی تکمیل اس طرح ہو گی جیسے بہار کی ایک روشن صبح کو آفتاب جلال و جبروت کے ساتھ افقِ مشرق سے طلوع ہوتا ہے۔ ہندوستان کا نشاط اپنی وسعت اور ہمہ گیری کے لحاظ سے سارے ایشیار کی روحِ احیار کا نمایندہ ہے۔ ہندوستان وہ ملک ہے جہاں عظیم و جلیل تمدن آکر گلے ملے ہیں۔ ہندو دھرم، بودھ مت اور مذہب اسلام نے اپنے اپنے فلسفۂ حیات سے ہندوستان کی روحِ ثقافت کی تخلیق کی ہے۔ میں اس مقالہ میں ہندوستانی نہضت کے صرف ادبی پہلو سے بحث کروں گا۔ اور میرا مرکزِ گفتگو وہ دو عظیم ہستیاں ہوں گی جنہوں نے مشرق و مغرب میں ہندوستان کا نام اونچا کیا ہے۔

اقبالؔ اور ٹیگورؔ کی شاعری اس دورِ نہضت کا اہم ترین نغمہ ہے جو روحوں کو پیغامِ بیداری سناتا ہے۔ ان کی شاعری کائنات اور ماورائے کائنات کا جائزہ لیتی ہے اور عالمِ سرمستی میں ان پر تبصرہ کرتی ہوئی انسانو کے وجدان و رُوح سے ہمکلام ہوتی ہے۔ مگر چونکہ شاعری زندگی کی طرح الماسِ صد پہلو ہے۔ لہٰذا ہندوستان کی رُوح سے نکلنے والے یہ دو خوبصورت اور جلیل نغمے صرف حسن و جلال اور وجہِ تخلیق کے لحاظ سے ایک جیسے ہیں، ورنہ دوسرے امور میں یہ مختلف ہیں۔

ٹیگورؔ کے تخلیق کا پس منظر وہ شاندار تمدن ہے جو ہندِ قدیم میں برسرِ عروج تھا۔ ہندوستان کے دونوں قدیم تمدن یعنی برہمن اور بودھ تمدن انفرادی ترقی اور انفرادی نجات کے قائل ہیں۔ بودھ اور برہمن تمدن خواہ کتنے ہی مختلف ہوں، لیکن اس امر میں متحد ہیں کہ ان کے فلسفہ کی روح انفرادی نروان ہے۔ ویدک تمدن نے انفرادی ارتقا کے رُوح پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔ اس فلسفہ کا اثر ہندو

معاشرت کے مختلف شعبوں پر بھی پڑا ہے۔ موجودہ دور میں گاندھی کا عمرانی و معاشی فلسفہ بھی انفرادیت ہی کی تعبیر ہے۔ ٹیگور کی شاعری میں بھی انفرادی نجات کی آرزوئیں تڑپ رہی ہیں۔ گیتانجلی کی ساری نظمیں ایک خاص شخصی عرضِ نغمہ ہیں جو حضورِ حسن میں پیش کیا گیا ہے۔ مذکورہ بالا پس منظر کے اثر سے ٹیگور کی شاعری میں خیالات کی جدت اور اپج نسبتاً بہت زیادہ ہے۔ اقبال کی شاعری کا پس منظر اسلامی ہے جس کی رُوح قطعی اجتماعی ہے۔ اسلام صرف شخصی نجات کا قائل نہیں۔ بلکہ اس کا مقصد فلاحِ جماعت ہے۔ "گیتانجلی" کے برخلاف "زبورِ عجم" کے نغمہ زار میں ایک بیتاب دل ساری جماعت کی طرف سے حُسن کے سامنے نالہ کناں ہے۔ اجتماعیت کے جلوے اسلامی معاشرت میں بھی ہر جگہ نظر آتے ہیں۔

ایسے ماحول میں فلسفہ و تخیل کو بہت زیادہ انفرادی جدت اور اپج کا موقعہ نہیں ملتا۔ اگر ہم تاریخ فلسفۂ ہند اور تاریخ فلسفۂ اسلام پر نظر ڈالیں تو ہمیں پتہ چلے گا کہ اوّل الذکر نسبتاً کسقدر مختلف النوع ہے اور ثانی الذکر کتنا یکساں، غزالی، بوعلی سینا، فارابی اور ابن عربی و رومی میں کوئی نمایاں فرق نہیں مگر چانکیہ، منو، مصنفین، پران اور جینا کے فلسفے بنیادی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ غرض ہندو تمدن انسان کی انفرادی خصوصیات کو بہت زیادہ نمایاں کرتا ہے اور اسلامی معاشرت اجتماعی رجحانات کو مہمیز کرتی ہے۔ گویا جس تمدن کی پیداوار اقبال ہے اس میں کسی قابل الذکر جدت و بدعت کی گنجائش نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کا تخیل اتنا پرُ کار نظر نہیں آتا جتنا ٹیگور کا ہے۔ اقبال "بتکدۂ صفات" کا تصوّر تو کر سکتا ہے۔ مگر وہ صنم خانۂ لات و منات کی تعمیر کا ذوق نہیں رکھتا۔

مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ اقبال میں اوریجنلٹی (Originality) کا فقدان ہے۔ جہاں تک تخلیقی شاعری کا تعلق ہے اقبال اور ٹیگور میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں نے اپنی شاعرانہ انفرادیت کا سکہ پورے طور پر جمایا ہے۔ "پیامِ شاعری" کے لحاظ سے دونوں شاعرانِ عظام کی نوعِ انفرادیت میں فرق ہے، مگر "لوازم شاعری" کے نقطۂ نگاہ سے ہر دو کی اوریجنلٹی ایک طرح کی ہے۔ گو اس میدان میں بھی لوازم کے استعمال میں تباین ہے جس کا لازمی نتیجہ دونوں کی شاعری میں ساخت کا اختلاف ہے۔

شاعرانہ انفرادیت کے اظہار کے دو طریقے ہیں۔ اول خیالات میں بدعت اور تنوع پیدا کرنا اور دوئم کسی خیال کو اس زور و قوت اور اس ندرت و جدت کے ساتھ پیش کرنا کہ اس سے قبل کسی نے اس طرح پیش نہ کیا ہو۔ اثر خیزی روحِ انفرادیت کی وہ چمک ہے جو دوسری روحوں کو بھی منور کر دیتی ہے۔ وحدانیت کا مسئلہ کہنہ ترین مسئلہ ہے۔ مگر اس قدیم راگ کو حضرت کرشن نے اپنی بانسری سے اس طرح پیدا کیا کہ دنیا بدل گئی۔ حضرت محمدؐ صلعم نے اسی عقیدے کا قرنہ پھونکا۔ مگر اس جلال و جبروت کے ساتھ کہ عصیاں آلودہ دنیا میں قیامت آ گئی اور ایک نئے آسمان اور ایک نئی زمین کی تخلیق ہوئی۔ غرض تخلیق اور احیاء دونوں ایک جیسی اہمیت کے امور ہیں۔ زندہ وہی کر سکتا ہے جو پیدا بھی کر سکے یعنی حیثیت سے تخلیق اور احیاء میں کوئی فرق نہیں۔ جو دماغ و دل کسی قدیم خیال و جذبہ کو زندگی بخش سکتے ہیں، وہ نئے خیالات اور نئے جذبات کے پیدا کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ اقبال کی انفرادیت اور جدت اسی احیائے خیال و جذبات میں ہے۔ ٹیگور کو بھی قطعی اوریجنل نہیں کہہ سکتے۔ ٹیگور پر فلسفۂ ویدانت اور متصوفین ہند قدیم کا بہت گہرا اثر ہے۔ بڑے سے بڑے نابغہ کے لئے بھی سو فی صدی جدید ہونا ناممکن ہے۔ مقالہ ہذا میں اس امر پر جو بحث ہوئی ہے وہ اضافی ہے۔

میں سطورِ بالا میں عرض کر چکا ہوں۔ کہ اقبال اور ٹیگور دونوں نے اپنی اپنی شاعری کی طرز و اسلوب کی تخلیق کی ہے۔ اقبال نے بھی لوازم کے استعمال میں کسی پرانے نمونے کو اپنایا نہیں ہے بلکہ ایک نیا نمونہ پیدا کیا ہے۔ یہ دونوں جدید نمونے آپس میں مختلف ہیں۔ ٹیگور کی شاعری کی ساخت نرم و نازک، لچیلی اور رسیلی ہے۔ اس شاعری میں شیرینی ہے۔ ٹیگور کا نغمہ "شام کلیان" اور "اساوری" راگنی کی طرح کومل ہے۔ مگر شاعری صرف شہد و شبنم نہیں بلکہ شعلہ اور تیغِ براں بھی ہے اور رُوح الامین کی پُرشوکت آواز بھی۔ ٹیگور کی شاعری شہد و شبنم ہے، رُوح کو تسکین دینے والی اور اُس کی صلاحیتوں میں ایک پُرامن بیداری پیدا کرنے والی۔ وہ ایک نرم خرام ندی کی طرح ہے، دھیرے دھیرے شانتی سے بھری ہوئی زندگی کے گیت گانے والی۔ جوش اور نذر الاسلام کا فن شعلہ بداماں اور تیغ بدست ہے اور اقبال کی شاعری بلاشبہ جبریلِ امین کی آواز ہے، پُرقوت و پُراثر۔ اس شاعری میں استواری اور استحکام ہے، جلال و جبروت ہے۔ یہ ہیرے کی طرح شفاف اور سخت ہے۔ یہ نازک بیلوں کی مانند نہیں بلکہ ایک شاندار اور مضبوط درخت کی مثال ہے۔ یہ پہاڑی ندی کی طرح گرم

جولاں ہے، جو رواں دواں زندگی کے راگ الاپتی ہے۔ اقبالؔ کا نغمہ فوجی بینڈ کے "مارچ" کے زیر و بم سے لبریز ہے۔ ٹیگورؔ کی شاعری میں تمنائے سپردگی کی بیقراریاں ہیں۔ اور اقبالؔ کی شاعری میں آزارِ جستجو کی جنوں خیزیاں۔ ٹیگورؔ کے لہجۂ تخاطب میں بھی نسائیت ہے اور اقبالؔ کا ہر انداز مردانہ اور مجاہدانہ ہے۔ اقبال ایک سرجن کی طرح زخم پر نشتر لگاتا ہے اور ٹیگورؔ ایک نرس کی مثال اس پر مرہم رکھتا ہے۔

ہر چند کہ اقبالؔ ٹیگورؔ جتنا پرکار نہیں، مگر اس کی سادگی میں قوت اور شوکت ہے۔ اقبالؔ کی شاعری صورِ اسرافیل ہے۔ جو مردوں کو جگاتی ہے۔ مجموعی طور پر جلال و اثر اقبالؔ کی "اور یجنیلٹی" اور انفرادیت کا لوہا منوا لیتے ہیں۔

اختر اورینوی ایم۔ اے

مشورہ

غفلت کے منہ پر ٹھوکر دے۔ بیداری کا متوالا بن
اے دنیا میں رہنے والے مضبوط ارادے والا بن

منزل کی جانب جاری رہ۔ خودداری میں ہر صدمہ سہہ
پستی میں بہتا پانی بن۔ رفعت پر جا کے ہمالہ بن

قدرت نے عقل عطا کی ہے۔ اک "شمع راہ نما" دی ہے
رستہ میں ٹھہرنا بے جا ہے۔ یا ادنیٰ بن یا اعلیٰ بن

وادی سے دشمن تکتے ہیں۔ جو دل میں آئے بکتے ہیں
بدبیں کی نظر میں بجلی بن۔ بدگو کی زبان پر تالا بن

اُٹھ اور وطن کی خدمت میں تمیزِ نسل و قوم مٹا
ہاں اے بھارت کے پیارے بالک بھارت کی گود کا پالا بن

زمزم کی موجیں کام میں لا قشقہ کا چندن گھسنے میں
تسبیحِ مسلماں مسجد میں۔ مندر کے اندر مالا بن

نقطہ کی حفاظت کرنے میں۔ پرکار کے حلقے پیدا کر
مہتاب فلک ہے آزادی۔ تو آزادی کا ہالا بن

غیروں کی سخت مزاجی کو اپنی نرمی سے پگھلا لے
جو کانٹوں کو شاداب کرے وہ پائے عمل میں چھالا بن

کچھ مقصد حاصل کرنا ہے اے شادؔ اگر میخواری سے
ساقیٔ شجاعت کی نظروں سے پی کر ہمت والا بن

شادؔ عارفی

صفحۂ اطفال

"مس فلورا"

(گزشتہ سے پیوستہ)

اسی گچپا گچپی میں للو بندر آ گیا!

للو:۔ چمپا بہن سلام!

چمپا:۔ سلام بھیا اچھے ہو۔ تمہارے چودھری چنوا کا کیا حال ہے؟۔

للو:۔ تمہاری دعا سے میں بھی اچھا ہوں۔ اور چودھری صاحب کا تو کیا پوچھنا ہے۔ دن عید۔ رات شب برات بنا رکھی ہے یہ کون ہیں بھابی جان؟ آداب عرض ہے؟

چمپا:۔ جھینپ گئی اور کھسیانی ہو کر بولی۔ دیکھو بہن مجھے یہ چھیڑ چھاڑ اچھی نہیں لگتی۔ ابھی شادی نہ بیاہ لوگ رشتے جتانے لگے۔

چمپا:۔ اور کیا تمہیں فلورا کہے۔ تمہارا نام لینے لگے۔ تم نے اچھی داد دی للو بھائی کی تہذیب کی۔ دیوانی تو چنوا کی منگیتر نہیں ہے۔ پھر چنوا کی برادری والے تجھے بھابی جان نہ کہیں تو کیا ممی جان کہہ کر پکاریں؟

وہی بات "گڑ کھاؤں گلگلوں سے پرہیز" چنوا تو تمہاری شادی سے پہلے "ان" بن گئے۔ پھر ان کے بھائی بند بھابی جان کیوں نہ کہیں۔ نہیں بھیا خوب کہو یہ تمہاری بھابی جان ہیں۔ بات یہ ہے نئی نویلی ہیں جھینپتی ہیں جب خیر سے چار باغ چلی جائیں گی۔ سب جھینپ وینپ اٹھا کر گولر کی شاخ پر رکھ دیں گی۔ جب دیوروں جیٹھوں کے پرے میں چھلانگتی پھلانگتی پھرنے لگیں گی اس وقت تمہاری چھیڑ چھاڑ۔ لگاوٹ بجھاوٹ ہنسی دل لگی میں انہیں زندگی کا لطف آنے لگے گا۔ صبر کرو۔ دو چار دن انہیں صبر کی بو بو بن لینے دو۔ پھر جہاں تم سے کھل گئیں باتوں سے تمہارے کان کھا جائیں گی۔ بڑی باتونی ہیں زبان میرٹھ کی قینچی کی طرح چلتی ہے۔

للو:۔ بہن بات یہ ہے۔ خدا خدا کر کے یہ دن نصیب ہوا ہے کہ چودھری صاحب کا گھر وا بسے۔ وہ ہماری برادری کے چودھری۔ ہم ان کے چھوٹے۔ ان کی بیگم صاحبہ ہماری بھابی جان بنیں گی۔ اور نہیں گی کیا بن بھی چکیں۔ صرف بندر دکھاوے کی رسم ہی رہ گئی ہے۔ وہ بھی بندر بادشاہ نے چاہا۔ دو چار دن میں پوری ہو جائے گی۔ پھر ہم دیکھیں گے ہمیں بھابی جان بھابی کہنے سے کیسے روکتی ہیں۔ ہم تو ہزار بندروں میں کہنے سے نہ چوکیں گے۔ کہ یہ ہماری بھابی جان ہیں

اچھا یہ جھگڑا تو دو چار دن کا ہے۔ ہوتا ہی رہے گا۔ یہ بتاؤ کہ
قاضی تمہارا ہوگا یا ہم بندر شاہ پیر کو ساتھ لائیں۔

چمپا:۔ نہیں بھیا میں پہلے کہہ چکی ہوں۔ قاضی ہمارا ہوگا۔ اس علاقے
کے تمام نکاح جو سدا سے پڑھاتے چلے آئے ہیں وہی پڑھائیں
گے۔ دوسرا کون ہوتا ہے نکاح پڑھانے والا

للو:۔ مگر تمہارے قاضی تو بلاؤ برادری کے ہیں۔ بندروں کا نکاح
تو بندر شاہ پیر پڑھاتے ہیں۔

چمپا:۔ یہ بھی ایک ہی کہی۔ نکاح تو ایک رسم ہے۔ اس رسم کو بلاؤ ادا
کردے یا بندر۔ خدا بہشت نصیب کرے ہماری ماں کا نکاح پیر
گگڑوں کوں نے پڑھایا تھا۔ بلی مرغے کا پیر سب جانتے ہیں۔
لیکن پیر گگڑوں کوں اپنی دینداری کے سبب بلاؤ برادری میں
اچھی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ آبا مرحوم نے خدا انہیں بلیوں
کی بہشت کا سردار بنائے کئی دفعہ پیر گگڑوں کوں کی دعوت
کی تھی۔ سبحان اللہ کیا پاکیزہ چہرہ پایا تھا لمبی داڑھی اونچی
کلغی۔ شربتی آنکھیں چہرے پر ایسا جلال برستا تھا کہ بڑے
بڑے درندے بلاؤ ان سے آنکھ ملانے کی تاب نہ رکھتے تھے
پھر نکاح کوئی زنجیر یا رسی سے دولہا دلہن کو باندھنے کا
نام تو نہیں ہے صرف اس بات کا عام اعلان کرنے کا نام نکاح
ہے۔ کہ یہ دونوں میاں بیوی بنکر رہنے پر رضامند ہیں۔
یہ اعلان پیر گگڑوں کوں کی زبان سے ہو یا بندر شاہ پیر کردیں
برابر ہے۔ تو جنوا سے کہدینا کہ نکاح ہمارا قاضی پڑھائے گا۔
یوں آنے کو بندر شاہ پیر بھی آئیں۔ جم جم آئیں۔ مگر اس علاقے کے
جانوروں کا نکاح علاقے کا مقررہ قاضی ہی پڑھا سکتا ہے۔
اور ہاں۔ جنوا سے یہ بھی کہدینا کہ سہرا باندھ کر آئے اور ذرا
ہوش میں رہے۔ شادی کے نشے میں کوئی ایسی بات منہ سے
نہ بک بیٹھے جس سے برادری میں تھڑی تھڑی ہو۔ منچلا بہت ہے۔

للو:۔ بہت اچھا۔ تمہارے قاضی صاحب ہی نکاح پڑھائیں گے۔ مگر
بندر برادری کے دکھانے کو ہم چار باغ میں جا کر پیر بندر شاہ
سے بھی نکاح پڑھوائیں گے۔

چمپا:۔ وہاں کا تمہیں اختیار ہے۔ پیر بندر سے پڑھواؤ یا شاہ قلندر سے
میں تو یہاں کی بات کرتی ہوں۔

للو یہ کہہ سن کر ذرا خاموش ہوا۔ تو بی فلورا چہکیں:۔

فلورا:۔ اے بوا تم یہاں کے قاضی کی شرط پر کیوں زور دے رہی ہو انہیں کا
کہنا مان لیتیں۔

چمپا:۔ ہوں۔ شرم کی بربو۔ بھابی جان کہنے سے تو کھسیانے لگی تھیں
اب نکاح پیر بندر سے پڑھوانے پر راضی ہو گئیں بنو۔۔۔۔۔
بیاہ کی خوشی میں عقل بھی کھو بیٹھیں۔ یہ نہیں سوچتیں کہ یہاں کے
قاضی سے نکاح نہ پڑھوایا تو وہ ساری برادری میں پھونک
دے گا کہ دلہن بے نکاحی رخصت کی گئی ہے پھر اس
علاقے کے جانور گلی کوچے بدنام کرتے پھریں گے۔ تجھے کوئی
بندر کچھ کہے یا نہ کہے۔ مجھے تو بلاؤ برادری مرغا برادری۔ کتا
برادری۔ یہ برادریوں کی یلغار جینا دوبھر کردے گی۔
دو پرائے نکاحانہ ہے۔ اتنی سی کفایت شعاری کر کے ہم
بدنامی کی مصیبت کیوں سہیڑیں؟

تابا بالکاح وہی پڑھائے گا جو سدا سے پڑھاتا چلا آتا ہے۔ پیر بندروں اور پیر قلندروں سے نکاح کو دوہرا کرا لینا۔ یہاں کی ریت یہاں کے ساتھ ہے۔ دوسری برادریوں کی ہم کیوں ریس کریں۔

فلورا:۔ بہن یہ بھی تو کہدو کہ کسی قسم کا شور و غل کرتے نہ آئیں۔ نہ ایک ساتھ آئیں۔ اس محلے میں کتوں کا زور۔ کلوا کتا اس ٹوہ میں لگا رہتا ہے۔ مراتی نے تمہیں کن حالوں کو پہنچا دیا ہے۔

للو:۔ نہیں بھابی جان۔ کلوا کی کیا مجال جو ہنکار ابھی بھرے چمپا بہن کو اکیلا دیکھ کر اُسے یہ دلیری ہو گئی ہے کہ ان کی بقچیا چھین لی۔ اور انہیں زخمی کر دیا۔ بندروں سے اسے کبھی واسطہ نہیں پڑا۔ ہم تو اس کی فکر میں ہیں۔ چودھری چنوا نے تو قسم کھائی ہے کہ اس سے چمپا بہن کا بدلہ ضرور لیں گے

فلورا:۔ دیکھو بہن چمپا یہ چھیڑ خانی اچھی نہیں۔ ابھی کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ مجھے بھابی جان کہہ کر بلائے۔ جبتک ساری رسمیں ادا نہ ہو جائیں۔ اُس وقت تک میں کسی کی بھابی جان نہیں۔

چمپا:۔ اچھا بھائی للو جب تک یہ چار باغ خیر سے نہ سدھار لیں انہیں آپا فلورا کہو۔ بھابی جان وہاں جا کر کہہ لینا اور ہاں بھائی اس کلموے کلوا کی مزاج پُرسی ایسی کرنا کہ اُسے چھٹی کا دودھ یاد آ جائے۔ فلورا تو ڈرپوک ہیں۔ اس معاملے میں تم ان کی نہ سننا۔

فلورا:۔ بہن کیا پٹی پڑھا رہی ہو۔ کلوا کچھ اکیلا تو نہیں۔ اس محلے میں کتوں کی دھاڑ پھرتی ہے۔ ایسے موقعے پر سر پھٹول کا کوئی نتیجہ نہیں۔ پس مصلحت اسی میں ہے کہ چُپ چُپاتے آئیں۔ اور چُپ چُپاتے چلے جائیں۔

للو:۔ اچھا آپا وقت پر جیسا مناسب ہو گا وہ کر لیں گے۔ کتوں کی دھاڑ سے بندروں کو کوئی خطرہ نہیں۔ بلیوں پر حملہ کر کے وہ شیر بنے پھرتے ہیں۔ اب کے اُنہیں ایسا سبق دیا جائے گا کہ عمر بھر یاد رکھیں گے۔

اچھا اب اجازت چاہتا ہوں۔ برات کا سارا انتظام میرے ہی سپرد ہے۔ چودھری چنوا تو بیاہ کی خوشی میں پھولے نہیں سماتے پیڑوں پر کبڈی کھیلتے پھرتے ہیں۔ آداب عرض ہے للو بندہ سلام کر کے چلا گیا۔ تو چمپا نے فلورا کو آڑے ہاتھوں لیا۔

چمپا:۔ جُرو! تجھے ہو کیا گیا ہے۔ بھابی جان کے نام سے کیوں چڑتی ہے۔ یہ سب سامان دُلہن جان اور بھابی جان بننے ہی کے ہو رہے ہیں۔ پھر گھڑی گھڑی کا چڑنا کیا؟ للو کیا کہتا ہو گا اپنے جی میں۔ کہ عجب جانگلیوں سے پالا پڑا ہے۔ تہذیب سے بات چیت کرو تو بُرا مانتے ہیں۔ اب وہ چار باغ میں اس کا ذکر کرے گا تو بندریاں تمہارے متعلق کیا رائے قایم کریں گی۔

فلورا:۔ بہن کوئی جانگلی سمجھے یا شہری مجھے تو شادی سے پہلے بھابی جان کہلانا منظور نہیں۔ نہ چار باغ کی نگوڑی بندریوں کی مجھے پروا نہ بندروں کا ڈر۔ میں اُسی نانی کی نواسی ہوں جس کے خاوند کے بھانجے نے منگنی کے دن انہیں ممانی جان کہدیا تھا۔ اور اُنہوں نے بھری بندر برادری میں اپنا منہ پیٹ لیا تھا جب تک پیر کلکڑوں کو مل یا قاضی بن بلاؤ دو بول نہ پڑھا دیں

میں نہ کسی کی بھابی جان کہلانا پسند کرتی ہوں اور نہ دُلہن
جان۔

اور ہاں یہ تم نے اِس مرے کو اور اُکسا دیا۔ کہ کلوا سے بدلہ لو
تمہاری سمجھ پر پتھر پڑیں۔ اس دن بیاہ ہوگا۔ یا میدانِ جنگ
میں بندروں اور کتوں کی لڑائی۔ دیکھو بہن یہ بہت بُری بات
ہے۔ ہر بات کا ایک موقع ہوتا ہے۔ اور ہر موقعے کا ایک وقت
وہ موئے آئیں گے براتی بن کر اور تم انہیں فوجیوں کی رجمنٹ
بنانے کی فکر کر رہی ہو۔ یہ نامناسب ہے۔ زمانے کی رسّی
دراز ہے۔ ان سے بدلہ لینے کے اور بہت سے موقعے
ملیں گے۔ جب دیکھا جائے گا۔

چمپا:۔ ہائے ہائے تیرا بھلا ہو۔ بہن بندی پر یہ کچھ بیت گئی اور تیرے
دل پر کچھ اثر نہ ہوا۔ میں تیرا گھر بسانے کے لئے رات دن غم ول
میں گُھلی جاتی ہوں اور تیرے ہی کارن ان حالوں کو پہنچی۔ کہ
دُم اور کان کٹا کر لنڈوری اور کن کٹی میرا نام پڑ گیا۔ میری
جوانی کا جوبن مار دھاڑ میں لُٹا۔ صورت سے بے صورت ہو گئی۔
برادری کی بلیاں مجھ پر ہنستی ہیں۔ موئی نیں مجھے لنڈوری خالہ اور
کن کٹی نانی کہہ کر چھیڑتی ہیں۔ اور تو ایسی خود غرضی کا اظہار کر
رہی ہے۔ تیری یہ باتیں سن سن کر میرا دل بیٹھا جاتا ہے۔ نوج
ایسی کوئی خود مطلب بنے۔

فلورا:۔ بہن بندر بادشاہ کی قسم کھاتی ہوں ــــ جان مار کلوا نے
تمہاری جو یہ دُرگت کی ہے مجھے اس کا بڑا رنج ہے۔ میرے
بس میں ہو تو مٹے کو زمین کا پیوند بنا دوں۔ مگر کیا کروں بندری
ہوں۔ یہ گدھے کی برابر نچے اونچے کتے میرے بس کے
نہیں۔ میں تو اس لئے کہہ رہی ہوں کہ بندروں کی برادری بڑی
جھگڑالو ہے۔ تم یہ کام جیک اور گھر کی بیوی سے چوری چوری
کر رہی ہو۔ اگر براتی بندر آ کر۔ کتوں سے گتھم گتھا ہو گئے۔ تو
محلے بھر میں ہاہاکار مچ جائے گی۔ .... محلے کے
لڑکے کندھوں پر غلیلیں ڈالے پھرتے ہیں۔ پاس ہی پڑوس
میں شب قدر شکاری کا گھر ہے۔ اس کے گھر میں آٹھ پہر بندوق
بھری رکھی رہتی ہے۔ یہ غل غپاڑہ سُن کر اگر کسی لڑکے نے
غلیل سنبھال لی اور کوئی غلہ تاک کر مار دیا۔ یا شب قدر نے
کوئی فیر کر دیا۔ خدا نہ کرے گولی بیٹھ گئی اور کسی براتی کی جان
جاتی رہی۔ یا آنکھ پھوٹ گئی۔ تو پھر تمہیں کہو بندر برادری میں
تمہاری میری کیسی تھکا فضیحتی ہوگی۔ ساری برادری تھوڑی
تھوڑی کرے گی۔ اس لئے میں کہتی ہوں کہ یہ موقع سر پھٹول کا
نہیں۔ خیریت سے میں چار باغ چلی جاؤں اور اُن سے میرا
نباہ ہونے لگے۔ تو میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ کلوا کی پیڑ
اس محلے میں جمنے نہ دوں گی۔ مجھے اس خدا واسطے کا بیر
پڑ گیا ہے۔

بات معقول تھی چمپا مان گئی۔ اور بیاہ کے سامان درست
کرنے میں لگ گئی۔

(باقی باقی)

منقول از اخبار پریم — تاجور

مختار

اقبال کا اثر اردو شاعری پر

اقبال ایک عہد آفریں شاعر ہیں۔ اُن کے کلام سے اردو شاعری کا متاثر ہونا لازمی ہے۔ لیکن ہم سے زیادہ ہمارے بعد آنے والی نسلیں اس اثر کو ٹھیک ٹھیک طور پر متعین کرسکیں گی۔ کسی شاعر یا ادیب کی زندگی میں اس کی خدمت کا کامل اندازہ مشکل سے کیا جاسکتا ہے۔ خاص کر اقبال جیسے شاعر کی خدمات کا، جس کی ذہنی دنیا میں اب تک کئی انقلاب آئے اور جس کا ہر نیا کارنامہ ایک نئے رنگ میں رنگا ہوا منظرِ عام پر آتا رہا۔

اقبال کی شاعری ان کے قلب و دماغ کی کشمکشوں کی آئینہ دار ہے انہوں نے اپنے جدید مجموعۂ کلام میں اپنی نسبت بالکل ٹھیک لکھا ہے۔

اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومی کبھی پیچ و تاب رازی

مگر یہ اردو شاعری کی خوش قسمتی ہے کہ اس کے شاعرِ اعظم کا سوز و ساز اور پیچ و تاب بیکار ثابت نہیں ہوا۔ اقبال کی شاعری کا ہر دور ایک نئی بہار اپنے ساتھ لارہا ہے۔ ان کی فطرت پرستی، ان کی وطن دوستی، ان کا فلسفہ، مولانائے روم سے ان کی والہانہ عقیدت، ان کا ذوق آگہی، ان کی تہذیب مغرب سے بیزاری، ان کی جرأت رندانہ ان کی فقیری و قلندری۔ غرض ان کے ذہنی ارتقا کا ہر پہلو ایک نئی شان سے ان کے کلام میں جلوہ گر ہے وہ جو چاہیں موضوع اختیار کریں۔ ان کا کمالِ شاعری ہر جگہ نمایاں ہے۔ ان کے قلب و دماغ کی غیر معمولی وسعتیں اور بے پناہ گہرائیاں ان کے ہر طرز کے کلام پر اثر انداز ہیں۔ وہ جس رنگ کا جامہ پہن لیں۔ ان کا اندازِ قد چھپ نہیں سکتا۔

اقبال کی شاعری کے مختلف دور، ان کے کلام کی اہم خصوصیتیں اور اردو شاعروں میں ان کا درجہ، یہ سب ایسے موضوع ہیں جن پر اطمینان کے ساتھ کچھ نہ کچھ کہا جاسکتا ہے، لیکن ان کے کارنامے اردو شاعری کو کس طرح متاثر کررہے ہیں۔ اور اردو کے جو شاعر اُن سے متاثر ہورہے ہیں وہ ہندوستان کی جدید سیاسی فضا میں اس اثر کو کس حد تک باقی رکھیں گے اور مستقبل کی ضرورتوں کے لحاظ سے اس رنگ میں کس طرح کی تبدیلیاں کریں گے۔ اس کا صحیح اور کامل اندازہ مستقبل ہی میں ہوسکے گا۔ اس وقت تو یہ بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔ کہ خود اقبال اپنے اس مسلسل سوز و ساز اور پیہم پیچ و تاب کی وجہ سے کس منزل پر جاکر ٹھہریں گے؟ اور ان کی شاعری ابھی کس کس طرح کی فن کاریوں سے مزین اور کیسے کیسے کمالات سے بہرہ ور ہونے والی ہے؟ تاہم "زرہِ امتثال امر" اس موضوع پر کچھ نہ کچھ کہنا ضروری ہے۔ اس لئے اردو شاعری کی تاریخ پر آئندہ کے متعلق جو نتائج اخذ کئے جاسکتے ہیں۔ انہی کے بل بوتے پر اظہار خیال کرنے کی جرأت کی جاتی ہے۔

اردو زبان و ادب کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے اچھی طرح واقف ہیں کہ ہماری شاعری اب تک جو مدارج طے کرتی آئی ہے اور جس طرح مختلف زمانوں میں مختلف رجحانات کی حامل رہی ہے وہ زیادہ تر اقبال جیسے عظیم الشان شاعروں ہی کی عہد آفرینیوں کا نتیجہ ہیں۔ ابتدا میں اردو شاعری مذہبی خیالات کی تبلیغ اور عقاید کی اشاعت کے لئے استعمال کی گئی۔ چنانچہ بزرگانِ دین نے عوام کی خاطر اردو میں شعر لکھے جو عام مجالس سماع میں گائے جانے کے علاوہ شرفا کی محفلوں میں بھی مثنوی مولانا روم کی طرح پڑھ کر سنائے جاتے تھے۔

یہ اردو کا ابتدائی دور تھا۔ اس کے بعد ایک زمانہ آیا کہ ہندوستان میں اسلامی حکومت استوار ہوگئی۔ اور استحکام سلطنت کے ساتھ ہی رزم آرائیاں بزم آرائیوں میں منتقل ہونے لگیں۔ ایسے وقت میں گولکنڈہ

[1] یہ مضمون اس وقت لکھا گیا تھا جب ڈاکٹر اقبال بقیدِ حیات تھا۔

کے ایک اہلِ ذوق تاجدار و سلطان محمدؐ قلی قطب شاہ نے اردو شاعری کے ابتدائی مذہبی رجحان کو ادبی رنگ سے بدل دیا - وہ پہلا عظیم الشان اردو شاعر ہے جس نے ہماری شاعری کو جملہ فن کارانہ خصوصیتوں سے مالامال کر دیا - اس کا نام نہ صرف شہر حیدرآباد کا بانی ہونے کی حیثیت سے تاریخ میں زندہ رہے گا بلکہ اردو شاعری کو فارسی کے پہلو بہلو لاکھڑا کرنے کے سبب اور جملہ اصناف سخن میں پہلا اردو دیوان مرتب کرنے کی وجہ سے بھی ہر اردو داں سے خراج عقیدت حاصل کرتا رہیگا -

یہ پہلا استاد سخن تھا جس کے اثر سے ہماری شاعری مذہبی رنگ اور محدود اصناف سخن کی قیود سے آزاد ہو گئی - اور ایک نئے دور کا آغاز ہوا -

محمدؐ قلی قطب شاہ کے بعد دوسرا عظیم الشان اردو شاعر جس نے ہماری شاعری کو متاثر کیا ولیؔ اورنگ آبادی ہے - جس کو بابائے ریختہ کہا جاتا ہے - اور جس کی عہد آفرینی کی یاد میں گذشتہ سال اسی فرخندہ بنیاد میں دو صد سالہ جشن منایا گیا تھا -

ولیؔ ایک ایسے زمانہ میں پیدا ہوا جب سلطان محمدؐ قلی کی سلطنت کے ساتھ ساتھ اس کا پیدا کیا ہوا دورِ شاعری بھی ختم ہو رہا تھا - ایسے نازک وقت میں اردو کو سنبھالنا اور اردو شاعری کا بول بالا کرنا ولیؔ ہی کی کرامت تھی - چنانچہ ولیؔ نے فاتحین کے روزمرے اور دہلی کے لشکر یا اردوئے معلیٰ کی زبان سے مفتوحین کی زبان یعنی دکنی اردو کا امتزاج کیا اور اس طرح اردو دکن کے علاوہ شمال میں بھی شعر و شاعری کے لئے رواج پا گئی، ورنہ اس سے قبل وہاں کی علمی و ادبی زبان فارسی تھی اور اگر اس وقت تک وہاں اردو میں کچھ لکھا بھی گیا تھا تو اس کی حیثیت ویسی ہی تھی جیسی دکن میں محمدؐ قلی کی عہد آفرینی سے قبل کے اردو کارناموں کی تھی - ولیؔ کا اثر اتنا ہمہ گیر تھا - کہ دہلی کے تمام فارسی گو شاعروں نے ولیؔ کی تقلید میں اردو میں شعر کہنا شروع کر دیا - اور یہ زبان جو اس وقت تک بازاروں میں بولی جاتی تھی - اور عوام کے اظہار خیال کا ذریعہ تھی خواص کی محفلوں اور ادبی مجلسوں میں باریاب ہو گئی -

ولیؔ کے بعد مرزا مظہر جان جاناں کی ایسی ہستی تھی جس نے پھر اردو شاعری کو متاثر کیا اور اس کا رُخ بدل دیا - مرزا مظہر نے یہ تحریک شروع کی کہ ”ولیؔ کی زبان میں شعر کہنے کی بجائے دہلی کے شعراء کو خالص اردوئے معلیٰ کی زبان میں شاعری کرنی چاہیئے - کیونکہ ایک دوسرے ملک کی زبان اور محاورہ کی تقلید میں کامیابی حاصل کرنا غیر فطری امر ہے“ - حضرت جان جاناں کی یہ تحریک آسانی سے کامیاب نہ ہو جاتی اگر میرؔ و سوداؔ جیسے رفیع المرتبت شعراء ان کے خیال پر عمل پیرا نہ ہوتے - ان دو اساتذۂ سخن کا اردو شاعری پر اتنا اثر پڑا کہ اردو زبان سے دکنی عنصر کم ہونے لگا اور چونکہ دکنی الفاظ کو کم کر کے مغلیہ لشکر یا اردوئے معلیٰ کے الفاظ اور محاورے رائج کئے گئے تھے - اس لئے اس زبان کا نام ہندوستانی باقی نہ رہا بلکہ زبان اردو قرار پایا -

اس دور سے پہلے ہماری زبان کا نام اردو نہیں تھا - بلکہ ہر جگہ کے لوگ اس کو اپنے مقام کی ہندوستانی یا ہندی کہتے تھے - مثلاً دکن کے عہد قطب شاہیہ کے شعراء یا مصنفین نے اپنی زبان کو یا تو ہندوستانی کہا یا دکنی - غرض میرؔ و سوداؔ کی وجہ سے مغلیہ لشکر یا اردو کے الفاظ کا ہماری زبان پر قبضہ ہو گیا -

میرؔ و سوداؔ کے بعد لکھنؤ میں ناسخؔ و آتشؔ نے اس زبان اور شاعری کو متاثر کیا جس کی وجہ سے اردو میں ہمہ گیری پیدا ہو گئی اور ایک ایسی باضابطہ اور منضبط زبان بن گئی - کہ اب تک ہمارے شاعر لکھنؤ ہی کی معیّن کی ہوئی زبان میں شاعری کرتے ہیں -

ناسخؔ و آتشؔ کے بعد آزادؔ و حالیؔ نے پھر اردو شاعری پر اثر ڈالا - اس دفعہ زبان سے زیادہ خیالات متاثر ہوئے - کیونکہ لکھنؤی شعراء نے زبان پر اتنا زور دیا تھا - کہ اس کا ردِ عمل ہونا ضروری تھا - مطالب و معانی کی خوبیوں کا اتنا خون ہوا تھا کہ اس کا رنگ لانا لازمی تھا - اس کے علاوہ چونکہ اس دور کی اردو شاعری اپنے عہد کی زوال پذیر معاشرت کی ترجمان تھی - اس لئے اس میں وہ تمام عناصر راہ پا گئے جو قوموں کو ترقی سے زیادہ تنزل کی طرف مائل کرتے ہیں - یہی وجہ تھی کہ حالیؔ اور آزادؔ نے اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور اپنی اپنی حد تک اپنے مقصد میں کامگار رہے - لیکن جس طرح مرزا مظہر جان جاناں کی تحریک میرؔ و سوداؔ کی وجہ سے کامیاب ہوئی اور اردو شاعری کی شکل بدل گئی بالکل اسی طرح حالیؔ اور آزادؔ کی اصلاحی کوششیں آج کلام اقبالؔ کی وجہ سے تکمیل کو پہنچ رہی ہیں -

اقبالؔ نے تخیل کی جولانیوں کے لئے ایسے ایسے میدان کھول دئیے ہیں جن کی طرف اس سے قبل اردو شاعروں کی توجہ کبھی منعطف ہی نہیں ہوئی تھی - انہوں نے خیالی اور مصنوعی شاعری کو نظروں سے گرا دیا - اردو شاعروں کا فرضی معشوق اپنی کمر کی طرح اب خود بھی عنقا ہو تا

جا رہا ہے۔ مصنوعی عشق بازی اور جھوٹی معاملہ بندی اب ہماری شاعری کی جان نہیں رہی۔ قصیدوں کی مبالغہ آمیزیاں اور مثنویوں کے فوق الفطری قصے جنوں اور پریوں کی طرح آہستہ آہستہ غائب ہوتے جا رہے ہیں۔ اقبالؔ نے لفظی چٹکلوں اور دور از کار محاورہ بندیوں کی جگہ حقائق کی تلمیح اور سیاسیات حاضرا کے ناگفتہ بہ مسائل کو اس خوبی سے شاعری میں داخل کر دیا ہے کہ اب اردو شاعری کے موضوع ہی بدل گئے اور شاعری واقعی ساحری بن گئی۔ اقبالؔ نے صاف صاف اعلان کر دیا ؎

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

بیگانے تو ناخوش رہتے ہیں، لیکن اقبالؔ سے اپنوں کا خفا ہونا بھی ضروری تھا۔ کیونکہ انہوں نے غالبؔ کی طرح قدیم ڈگر کو چھوڑ کر نئی روش اختیار کی اور خیالی معاشقے یا فرضی بادہ و ساغر کے بیانات سے اپنے کلام کو آلود نہیں کیا۔ وہ کہتے ہیں ؎

حدیث بادہ و مینا و جام آتی نہیں مجھ کو
نہ کر خارا شگافوں سے تقاضہ شیشہ سازی کا

ایک اور جگہ لکھا ہے ؎

عزیز تر ہے متاع امیر و سلطاں سے
وہ شعر جس میں ہو بجلی کا سوز و براقی
میری مینائے غزل میں تھی ذرا سی باقی
شیخ کہتا ہے کہ ہے وہ بھی حرام اے ساقی

اقبالؔ پر ایک بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے۔ کہ انہوں نے لوازم غزل کی پابندی نہیں کی اور ایسے نامانوس اور خشک مضامین باندھے جن کی ہماری شاعری متحمل نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ زبان اور محاورہ کا بھی خیال نہیں رکھا۔ اس کا جواب خود اقبالؔ نے اپنی مختلف نظموں میں اس طرح دیا ہے :-

نہ زباں کوئی غزل کی، نہ زباں سے باخبر میں
کوئی دلکشا صدا ہو عجمی ہو یا کہ تازی
مری نوا میں نہیں ہے ادائے محبوبی
کہ بانگ صورِ سرافیل دلنواز نہیں

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرم رازِ درونِ مے خانہ
تھا ضبط بہت مشکل اس سیلِ معانی کا
کہہ ڈالے قلندر نے اسرارِ کتاب آخر
خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے

غرض اقبالؔ نے شاعری کا اسلوب ہی بدل دیا۔ آزادہ روی حقیقت نگاری، شاعری کے لوازم ہوتے جا رہے ہیں۔ معاملہ بندی آسمان یا معشوق کے ظلم و ستم کا ماتم، رقیب روسیاہ کے رشک و حسد کا گلہ، غزل کی زبان کا لحاظ، دلی یا لکھنو کے محاوروں یا روزمروں کی پابندی غرض طرح طرح کی قید و بند سے ہماری شاعری آزاد ہوتی جا رہی ہے۔ مولوی حالیؔ نے پھر بھی قدیم مشرقی مروت سے کام لیا تھا اور شعر لئے نازک خیال کے تکلفات یعنی ..... لوازم شعری کی مدافعت اس مہذب پیرایہ میں کی تھی کہ ؎

اہل معنی کو ہے لازم سخن آرائی بھی
بزم میں اہلِ نظر بھی ہیں تماشائی بھی

لیکن اقبالؔ ضروریات زمانہ کے پیش نظر سخن آرائی کے قائل ہی نہیں ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اسی سخن آرائی کے لحاظ نے حد سے زیادہ ہمارے شاعروں کو گمراہ کر کے معانی و مطالب کی گہرائیوں سے بے پروا کر دیا اور اردو شاعری یا تو قافیہ پیمائی یا محاورہ بندی کے لئے وقف ہو گئی یا چند موضوعوں کے لئے محدود کر دی گئی۔ اقبالؔ اسلوب سے زیادہ مطالب و معانی کے قائل ہیں۔ وہ اس نظریہ کی تبلیغ کرتے ہیں کہ اگر خیال اچھا ہے تو اس کو پیرایۂ بیان بھی خود بخود اچھا ہی مل جائے گا اور بغیر مشاطگی یا پروپیگنڈے کے اس کے سننے اور سمجھنے والے بھی پیدا ہو جائیں گے ایک جگہ وہ کہتے ہیں ؎

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسن معنی کو
کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالہ کی حنا بندی
میں شاخ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر
مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر

دوسرے شعرا کی طرح اقبالؔ اپنے کلام کو جام مے بنا کر گردش میں لانا نہیں چاہتے۔ بلکہ وہ اہل محفل کو دعوت عمل دیتے ہیں کہ اس

تمرسے وہ خود سے لا الہ فام نکال لیں اور جو اس دعوت پر لبیک کہنا نہیں چاہتے اور ذوقِ خودی نہیں رکھتے ان سے تو وہ مخاطب بھی نہیں ہیں۔ ان کا شعر ہے ؎

نظر نہیں تو مرے حلقۂ سخن میں نہ بیٹھ
کہ نکتہ ہائے خودی ہیں مثالِ تیغِ اصیل

یہی وجہ ہے کہ ابھی تک ہندوستان کی محفل ان کے کلام کو سمجھنے اور اس سے کماحقہٗ محظوظ ہونے کے قابل نہیں ہوئی۔ ان کا تخیل دور نکل گیا ہے اور ان کے ساتھی بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ اس کا خود ان کو بھی احساس ہے وہ کہتے ہیں ؎

کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا
مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں

شعرا تو کجا اہلِ مدرسہ و اہلِ خانقاہ بھی اس ذوق سے بے بہرہ نظر آتے ہیں اور اسی محرومی کی وجہ سے اب تک ملک و قوم کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ اقبال کا شعر ہے ؎

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے
فقیہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

اس خیال کو ایک اور جگہ اس طرح ظاہر کیا ہے ؎

جلوتیانِ مدرسہ کور نگاہ و مردہ ذوق
خلوتیانِ میکدہ کم طلب و تہی کدو
میں کہ مری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

ان کے خیال میں اضطراب و اثر اور خونِ جگر کے بغیر سخن بے فیض ہے اور شاعر ساحر نہیں بن سکتا ؎

سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عینِ حیات
ہو نہ روشن تو سخن مرگِ دوام اے ساقی
نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

اقبال نے ہمارے شاعروں کے سب سے بڑے نقص یعنی اظہارِ بوالہوسی اور زلف و کاکل خد و خال اور جوبن و کمر کے مضامین باندھنے کی کیا اچھی توضیح کی ہے کہ ؎

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا
ان کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزار

چشمِ آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند
کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار
ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

یہ مصرعہ کہ آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار جتنا اردو کے شاعروں اور خاص کر غزل گو شعرا پر صادق آتا ہے۔ دنیا کے کسی اور فن کار پر منطبق نہیں ہوتا۔

عشق عاشقی اور معاملہ بندی کی جگہ اقبال چاہتے ہیں کہ ہمارے شاعر حقیقت نگاری سے آشنا ہوں اور اپنی خودی کی حفاظت کریں جب تک ادیبوں اور شاعروں میں یہ احساس پیدا نہ ہوگا کوئی شاعری ملک و قوم کے لئے وجہ حیات اور باعثِ وقار ثابت نہیں ہو سکتی۔

سرود و شعر و سیاست کتاب و دین و ہنر
گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عینِ حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ
ہوئی ہے زیرِ فلک امتوں کی رسوائی
خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

جو کلام حقیقت پر مبنی نہ ہو اور زندگی کے سبق نہ سکھلائے وہ بیکار ہے۔ وہ بادِ سحر ہی کیا جس کے جھونکے چمن کی افسردگی کو شگفتگی میں نہ بدل سکیں۔ اقبال کہتے ہیں ؎

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

اسی خیال کو ایک اور نظم میں اس طرح واضح کیا ہے ؎

ہے شعرِ عجم گرچہ طربناک و دل آویز
اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیرِ خودی تیز
افسردہ اگر اس کی نوا سے ہے گلستاں
بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغِ سحر خیز

اقبال یہ ہے خارہ تراشی کا زمانہ ؛ از ہر چہ بآئینہ نمایند بہ پرہیز

آخر میں ہم اقبالؔ کی اس نظم کے چند شعر بھی سنائے دیتے ہیں، جو ہمارے نوجوان شاعروں کے لئے لائحۂ عمل کا کام دے رہے ہیں اور جن میں اقبالؔ شاعروں سے مخاطب ہیں :-

مشرق کے نیستاں میں ہے محتاج نفس نے
شاعر ترے سینے میں نفس ہے کہ نہیں ہے
تاثیر غلامی سے خودی جس کی ہوئی نرم
اچھی نہیں اس قوم کے حق میں عجمی لے
شیشے کی صراحی ہو کہ مٹی کا سبو ہو
شمشیر کے مانند ہو تیزی میں تری مے
ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

یہ ہے وہ وسعت نظر اور مرحلۂ شوق کی گوناگونی جو اردو شاعری کو متاثر کر رہی ہے۔ اقبالؔ کی تلخ نوائیوں نے نہ صرف نوجوانوں بلکہ سیمابؔ و سیمابؔ اور جوشؔ و ساغرؔ جیسے پختہ مشق.... شاعروں کو بھی متاثر کر دیا۔ اقبالؔ کے اثر سے رفتہ رفتہ قدیم طرز کی شاعری متروک ہوتی جا رہی ہے۔ ایک زمانہ میں ناسخؔ و آتشؔ کے اثر سے الفاظ و محاورات اور اسالیب بیان متروک ہو گئے تھے۔ اور آج اقبالؔ کے اثر سے بہت سے فرسودہ خیالات لایعنی اور غیر ضروری لوازم شعر متروک ہوتے جا رہے ہیں۔ اور جہاں تک مطالب و معانی کا تعلق ہے اردو شاعری اقبالؔ کے کلام سے متاثر رہے گی اور اہلِ اردو میں زندگی اور زندہ دلی قائم رکھنے کا باعث ہوگی۔

(از مجلۂ عثمانیہ)　(سید محی الدین قادری زورؔ)

غزل

نقشۂ نیرنگیٔ عالم بدلتا ہی رہا　اپنا اِن تبدیلیوں سے غم بہلتا ہی رہا
تھا جہاں دشوار چلنا مجھ کو راہِ عشق میں　مجھ سے آگے آگے میرا شوق چلتا ہی رہا
عالمِ ایجاد بھی اک بازیٔ شطرنج ہے　جس کا ہر ساعت یہاں نقشہ بدلتا ہی رہا
عاشقِ ناشاد ہوتا ہے بہت مرگ آشنا　عمر بھر جس کا لبوں پر دم نکلتا ہی رہا

ساتھ والے جا چکے ہیں منزلِ مقصود پر
اور میں پیچھے کفِ افسوس ملتا ہی رہا

(شبیر حسن دہرہ دون)

افکارِ تازہ

پھرتے ہیں دور دور بہت شادماں سے کیا — واقف نہیں ابھی وہ غمِ ناگہاں سے کیا
غم کیا ملا کہ دولتِ کونین مل گئی — ہٹتے ہیں اب یہ ہاتھ دلِ ناتواں سے کیا
چہرہ بھی زرد زرد نظر بھی اداس اداس — یہ حال ہو تو فائدہ ضبطِ فغاں سے کیا
صیاد و برق ہی کی توجہ نہیں تو پھر — مجھ کو حصولِ خار و خسِ آشیاں سے کیا

"جامعہ"

اے مرگِ ناگہاں تری غیرت کو کیا ہوا — کیوں انتظارِ تیغِ ستم کر رہا ہوں میں
ہوتا ہے حشر دیکھئے ہنگامِ نزع کیا — امید و یاس دونو بہم کر رہا ہوں میں

نہ کر اے دوست اپنی آرزو کے ذوق کو ارزاں — غمِ اُلفت غمِ ایام کا حاصل نہ بن جائے

وہ لطف بھی گیا وہ مدارات بھی گئی — یعنی کبھی کبھی کی ملاقات بھی گئی
ہم چاہتے تھے اور فزوں لطفِ یار کو — تقدیر کا بُرا ہوا کہ وہ بات بھی گئی

"ادبی دنیا"

ہائے وہ پہلی نظروں میں ہر موج کا ساحل بن جانا — بحرِ بے پایانِ محبت کی پایابی کیا کہئے
اگلے برس کے پھولوں کا یہ کیا حال انہیں معلوم نہیں — پھولوں کا طرزِ تبسم یہ شادابی کیا کہئے

بیداد پہ کہئے اُف نہ کریں کہئے تو تڑپ کر جاں دیں دے — کچھ شغل ہمیں بھی آتے ہیں سرکار کا دل بہلانے کے

مجھ پہ اک اور شبِ غم یہ قیامت ٹوٹی — مُسکراتے ہوئے تاروں نے ہنسانا چاہا
برمحل ان کی نگاہوں میں تبسم دیکھا — ہم نے جب درد کا احساس چھپانا چاہا

"مجلۂ عثمانیہ"

حُسنِ گریہ ہے نہ ضبطِ درد کا انداز ہے — آج سازِ دل کی پھر بہکی ہوئی آواز ہے
یوں تو اچھی محفلیں ہیں حشر بھی فردوس بھی — تیری بزمِ ناز لیکن تیری بزمِ ناز ہے

"تیج ویکلی"

ہم اپنی تجلّی سے بے خود ہوئے جاتے ہیں — اب دل کی جگہ تیرے جلوے نظر آتے ہیں
یاد آ گئی کعبے میں بتخانے کی رنگینی — بہکے ہوئے آئے تھے بہکے ہوئے جاتے ہیں

آثارِ قدیمہ

کشمیر

کشمیر جنت نظیر قدیم زمانے سے عروس الممالک ہے، اگر مشرق اس دلفریب وادی کا شیدا ہے تو مغرب بھی اس کی شگفتگی و رعنائی کا گرویدہ ہو گیا ہے۔ سیاحانِ جہاں گرد اس فردوسِ ارضی کی جستجو میں بنی اسرائیل کی طرح سرگرداں رہتے ہیں۔ اور جب تک یہاں کے پرشکوہ نظارے نہ دیکھ لیں سکون نہیں پاتے۔ واقعی بزمِ دنیا میں کشمیر وہ شمع فروزاں ہے جس کی تجلیات پر قربان ہونے کے لئے ہر اہلِ ذوق پروانہ وار چلا آتا ہے، کشمیر بساطِ ہستی پر وہ منور قندیل ہے، جس کے حسن و تجمل کو دیکھ کر ہر اہلِ دل مستانہ وار وجد میں آجاتا ہے، یہ خوبصورت وادی ہمالیہ کے زمردین دامن پر ایک گوہرِ عالم افروز کی صفت واقع ہوئی ہے۔ گویا زمرد کی زمین پر ہیرا جڑا ہے۔ اس حسین و جمیل کوہستان کی تاریخ حکایت اور روایت کے پردوں میں مستور ہے۔ اس کے قدرتی مناظر کی تعریف و ثنا میں شاعروں نے اس حقیقت کا بیان کیا ہے، جو الف لیلہ کے بعض مقامات میں محض انسانی تخیل کی فسانہ آفرینی کا نتیجہ ہے۔ کوہستانِ کشمیر کا جو پہلو دیکھئے اور اس کے جس انداز کو لیجئے، ہر بار اس کے حسنِ مکتوم کی نئی جھلک دکھائی دے گی۔ دیکھنے والے پر فضائے کشمیر جادو کا اثر رکھتی ہے اور مناظر کی دلفریبی دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ حقیقت ہے یا خواب۔ یہ سب قدرت کے ہاتھ کی کارفرمائی ہے۔

نسیمِ کشمیر اس مسکراتی ہوئی وادی سے نکلی اور وسط ایشیا کے ویرانوں اور یونان کے مرغزاروں کو معطر کر گئی۔ آریہ لوگ بھارت ورش میں پہنچنے سے پہلے وادی کشمیر سے ضرور روشناس ہوئے ہونگے۔ سکندر اعظم تو اسی پرفضا وادی سے ہوتا ہوا ہندوستان میں پہنچا۔ پھر تبتی، تاتاری، ایرانی، افغان، پٹھان اور مغل غرض سب ادھر ہی سے گزرے اور کشمیر کے لالہ زاروں میں اپنے اپنے نشان چھوڑ گئے۔ ان قوموں کی یادگاریں مٹ گئیں۔ جو باقی ہیں ان پر روزگار کی دستبرد جاری ہے۔ مگر کشمیر کے معصوم شباب کی لازوال دلفریبی بدستور قائم ہے۔

کشمیر کو ایشیا کا سوئٹزرلینڈ کہتے ہیں۔ یہ درست ہے۔ مگر اس نسبت میں صرف اتنا فرق ہے۔ جسقدر ہمالیہ کی بلندی اور ایلپس پستی میں، سوئٹزرلینڈ اگر مغرب کا دل ہے تو کشمیر مشرق کا قلب ہے۔ کشمیر میں مشرقی رنگ، دلبری کی فراوانی، دلگداز نظاروں کی بوقلمی، سبزہ زاروں کی طراوت، گل کا حجاب، بلبل کی بیتابی، وہ خوبیاں ہیں جو مشرقی فضا کا خاص حصہ ہیں۔ مگر شمالی ممالک کی سرد ہوائیں قدرے کمیاب ہیں۔ کشمیر میں جابجا گلپوش وادیوں کے بہارین نظارے۔ قدم قدم پر شفاف چشمے اور جگہ جگہ آبشاریں، پھولوں میں بسی ہوئی مشکبار اور معطر بیز ہوائیں۔ لالہ زاروں کی گلکار و جلوہ ریز فضائیں ہر باغ و راغ میں حسن قدرت کے حسین و معصوم کرشمے، یہ سب انسان کے دل و دماغ کو جذباتِ لطیف سے آسودہ کر دیتے ہیں۔ ایسے کیف آور نظاروں کی فرحت بخش ملائمت دنیا میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔

کشمیر ہمالیہ کے آغوش میں واقع ہے۔ کشمیر کے نظاروں کی پرسکون خوبصورتی اور کوہساروں کے پرتجمل شکوہ کا موزوں اختلاط کسی دوسرے کوہستان میں ملنا ناممکن ہے، اس پربہار وادی میں قدم رکھتے ہی یوں محسوس ہوتا ہے۔ گویا انسان کسی ایسے گلستان میں آنکلا ہے، جس کی خزاں پر ہزاروں بہاریں نثار ہیں۔ دریائے جہلم زلفِ دوتا کی طرح بل کھاتا ہوا یا دلِ ناخواستہ کوہساروں اور لالہ زاروں میں سے یوں جا رہا ہے، گویا منزلِ کشمیر سے جدا ہونا نہیں چاہتا۔ اس کی بلوریں سطح پر آفتاب عالمتاب کی ضیا پاشی سے ایک دریائے سیماب کی کیفیت پیدا ہے، جہاں بیشمار شکارے اور کشتیاں موجوں سے اٹکھیلیاں کرتی ہوئی محوِ خرام ہیں، کہیں کہیں گاؤں اور بستیاں ہیں۔ آڑو اور ناشپاتی کے گلابی اور سفید پھولوں میں چھوٹے چھوٹے گھر اور رنگین جھونپڑیاں نظر آ رہی ہیں۔ کنارِ دریا بید مجنوں کے جھنڈ ہیں۔ ان کے ساتھ کہیں کہیں نگاہ کسی سارس پر پڑ جاتی ہے۔ جو عابد شب بیدار کی طرح ایک ٹانگ

سکے سہارے کسی جسمانی طلب کی کشمکش میں منہمک ہے - بلند ہمت چنار کی قطاریں پہاڑوں پر بڑھے چلی جا رہی ہیں شاید اسی کی آمد ہے کہ ہمالیہ کی برف پوش چوٹیاں نیلگوں آسمان سے مصروفِ غمازی ہیں - نظارے کی ایسی ہمہ گیر دلگدازی کشمیر کے سوا کہیں نظر نہیں آتی -

شاہانِ ہند کشمیر کے شیدائی تھے جنہیں پھولوں کی دلستان وادی سے خاص عشق تھا - موسم گرما میں یہی سرزمین ان کی مرغوب ترین آرام گاہ اور سیر گاہ تھی - اور کیوں نہ ہوتی؟ کشمیر کے باغات، زعفران زار خوبصورت جھیلیں - آبجہات کے چشمے، سرسبز جنگل - فسانہ آفریں گھاٹیاں پُر رونق مقامات - لذیذ میوے، خوشبودار پھول - یہاں کا رنگ روپ عجیب و غریب نعمتیں ہیں اور ان کا اُس دل و دماغ کو متاثر کرنا لازم تھا - جہاں وسط ایشیا کے لق و دق صحراؤں، بے رونق بستیوں اور بیابانک ویرانوں کی یاد باقی تھی کشمیر فی الحقیقت "فردوس بر روئے زمین" ہے - جہاں آبشاروں کے شیریں نغمے آسمانی الہام کی طرح دل کو نور و سرور سے معمور کر دیتے ہیں - درختوں میں مرغانِ چمن کی ترنم ریزی نہروں کے کنارے ٹھنڈے پانی کی روانگی کا لطف - چنار کا سایہ - ترانہ آفریں اور معطر ہوا - پھل پھول وغیرہ بہشتی کیفیت پیش کرتے ہیں - اور کشمیر کے ہر گوشے میں ان چیزوں کی افراط ہے -

کشمیر کی جھیلوں کی نظارہ آفریں خوبصورتی مشہور ہے - ان میں جھیل وُلر سب سے بڑی ہے - وُلر دراصل دریائے جہلم ہے - جو یہاں وادی کے تنگ آغوش سے نکل کر آسودہ وسعت ہو جاتا ہے سرینگر اور وُلر کے درمیان جھیل مانسل ہے - اس کی آئینہ پوش سطح حاشیہ کے نظارے کو دو گونہ کر دیتی ہے - جھیل کے کنارے پر باغات - پھولوں میں چھپے ہوئے درخت، چنار کی قطاریں فاصلہ پر برفانی پہاڑوں کی چوٹیاں - شفاف پانی میں ان کا عکس عجیب بہار دیتا ہے - گویا بیرونِ آب اور درونِ آب نظارے کی ایسی کیفیت پیدا ہوتی ہے جسے دیکھ کر مصور محوِ تماشا ہو جاتا ہے - ڈل (جھیل) تمام دنیا میں مشہور ہے - اس کے قریب ہی سرینگر واقع ہے جولائی اور اگست میں ڈل کی رونق دیکھنے کے قابل ہے - اس موسم میں ڈل کا منظر نہایت شگفتہ کیفیت پیش کرتا ہے - سطحِ آب پر کھلے ہوئے کنول کی بہار ہوتی ہے - گویا پانی میں آگ لگی ہے اور انگارے اچھل پڑے ہیں - ڈل کے کنارے سلاطینِ مغلیہ کے باغ ہیں: شالامار، نسیم باغ اور نشاط باغ ان بادشاہوں کے ذوقِ رنگ و بو کا خاکہ ہیں - ان باغوں کو دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے - کہ ان عالیشان ہستیوں کو کشمیر سے کس درجہ الفت تھی - ان سب سے اوپر جھیل گنگابل ہے - جہاں برف کے تودے گلتے ہیں - اس جگہ تنہائی سکوت - خاموشی اور سنسان کی ایک ہیبتناک کیفیت ہے - سرینگر کشمیر کا صدر مقام ہے اور دریائے جہلم کے دونوں کناروں پر واقع ہے - جہاں آمد و رفت پلوں یا کشتیوں کے ذریعہ سے ہوتی ہے اس اعتبار سے سرینگر کو وینس سے تشبیہ دی جاتی ہے - یہ مناسبت موزوں ہوتی اگر وینس ساحل سمندر پر واقع ہونے کے بجائے سوئٹزرلینڈ میں ہوتا - سرینگر ایک خوبصورت اور دلچسپ شہر ہے - اکثر مکانات لکڑی کے بنے ہوئے ہیں - ڈل کا قرب اس کی رونق کو بڑھاتا ہے - سرینگر کشمیر کی صنعت اور فنونِ لطیفہ کا مرکز ہے - وادیٔ کشمیر کی فضا میں ایک خاص ملائمت - لطافت اور دلگدازی ہے اور اس کی ہوا میں ایک لطیف اور خواب آور موسیقی کی کیفیت ہے - چنانچہ ایسی کیفیت کا اثر کشمیر کی صنعت و حرفت کے حصے میں بھی آیا ہے - کشمیری شال کی اگرچہ بیل بوٹوں کو ذرا غور سے دیکھا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ نقاش پھول پتیوں میں کس لطیف راگ کے زیر و بم کا تناسب دکھا رہا ہے - یہی کیفیت نقاشی - مصوری وغیرہ میں ہے - کشمیری نقاشی میں خیال کی نزاکت کو نہایت سلیقے سے نبھایا گیا ہے *

خط و کتابت کرتے وقت اپنا پورا پتہ اور چٹ نمبر کا حوالہ ضرور دیا کریں -

مینیجر شاہکار لاہور

میرا تجربہ

مجھے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس کی عمر کتنی تھی۔ اور نہ اس کے معلوم کرنے کی ضرورت تھی۔ وہ خود بخود جو کچھ بڑبڑایا کرتی تھی میں اسی کو سننے گیا تھا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ میں اس کی باتیں سن کر دنگ رہ گیا۔

میں بیس برس کا نوجوان نہیں ہوں۔ اور نہ تیس سال کا جوان ہی ہوں۔ میری عمر اس دورِ جنون خیز سے گزر چکی ہے جب مرد ایک عورت کی گفتگو اور اس کے مطالب سے زیادہ اس کے گفتگو کے انداز۔ اس کے ہونٹوں کے تبسم اور اس کی پتلیوں کی حرکت کو قابل توجہ سمجھتا ہے اور اس کے کلام کا مقصد اس کے الفاظ نہیں بلکہ انہی چیزوں سے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر اپنی نسبت میرا یہ بیان مبالغہ آمیز بھی سمجھا جائے تو اتنا تو میں ضرور سے کہوں گا کہ اس وقت میری پیش نظر اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ میں اس کی مجنونانہ بڑ سنوں اور یہ سمجھنے کی کوشش کروں کہ وہ کہتی کیا ہے۔

وہ بک رہی تھی۔ "تم اپنے کو اہل فن سمجھتے ہو۔ صنعت گر! واہ! ایسی بے بنیاد، ایسی زوال پذیر، ایسی برباد کن صنعت کو بھی صنعت کہتے ہیں؟ اور اس کے صناع کو صناع؟ — کیا تعداد ہی صنعت کا کوئی معیار ہے؟ — کیا لاکھوں، ہزاروں چیزوں کے بنا دینے سے، غیر معتدل تمناؤں اور نامناسب آرزوؤں کو طرح طرح کی صورتوں میں مصور کر دینے سے تم صنعتگر ہو گئے؟ — میرے صناع! تو نے مجھے بنا تو دیا، لیکن تجھے میری طرف ایک نظر دیکھنے کی بھی فرصت نہیں، میں بے زیب و زینت ہو رہی ہوں۔ بے رنگ و جمال ہو رہی ہوں۔ اور تو زیب و زینت اور آرائش و جمال کے خالق! تو کیوں اپنے کو اس طرح رسوا کر رہا ہے؟ بنانے میرا نہیں تو اپنا پاس تو کرنا تھا، او صنعتگر! او غلط کار صنعتگر!"

وہ چیخ پڑی اور آخری الفاظ کو بار بار دہرانے لگی۔

کمرے کا دروازہ بند تھا۔ میں نے باہر سے اس کی باتیں سنیں اور کھڑکی سے اسے دیکھا وہ بڑی تیزی سے چکر لگا رہی تھی۔ اس چھوٹے سے کمرے میں کبھی وہ اپنا منہ چھپائے ہوئے تھی۔ اور میرے دل میں کبھی اس کے دیکھنے کی رغبت پیدا نہیں ہوئی۔

میں نے اپنے دوست کی طرف رُخ کر کے کہا۔ چلو، اب چلیں۔

وہ بولے۔ واہ! ابھی؟ ابھی تو اس نے اپنے بارے میں کچھ کہا ہی نہیں، وہ رفتہ رفتہ اپنا حال بیان کرتی ہے۔ تم ٹھہر کر اسے سنو۔

وہ بکے جا رہی تھی۔ "اور تم نے! ایک عظیم الشان کائنات بنائی ہے جس میں شہوانیت ہے، ہوس ہے، اشک ہے، رشک ہے، رقابت ہے، بغض ہے، عناد ہے، — واہ وا! کیسی حسین صنعت ہے! قربان جائیے آپ کی صنعت کے۔ صدقے آپ کی صنعتگری کے۔

"اور یہ دیکھیے، گونگوں کا بولنا ناممکن سمجھا جاتا تھا۔ لیکن یہ ناممکن ممکن ہو گیا اور گونگی گویا ہو گئی۔"

میری حیرانی اور بھی بڑھ گئی، میں نے اپنے دوست سے سوال کیا۔ کیا یہ پہلے گونگی تھی؟

دوست نے جواب دیا۔ اس کی پہلی حالت تو کچھ معلوم نہیں ہے۔ ممکن ہے گونگی رہی ہو، یا مجملہ اور باتوں کے یہ بھی اس کی ایک بڑ ہو۔

وہ کہہ رہی تھی: "یہ بھی کیا طلسم کاری ہے۔ گونگے کو پڑھا لکھا دیا اور اسے گویا بھی کر دیا۔ او! اتنے زمانے تک مجھ کو گونگا رکھنے والے! صناع تو کہاں ہے؟"

وہ اس دفعہ بجائے چلانے کے رونے لگی، میں نے اپنے دوست سے کہا۔ اب یہاں سے جلد ہی چلو۔

وہاں سے دور آ کر میں نے اپنے دوست سے کہا۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ میں قسمت کا قائل ہوں۔ لیکن میرا عقیدہ اس بارے میں کچھ عجیب واقع ہوا ہے۔ میرا یقین ہے کہ انسان کے ہر کام اور خیال سے لہریں اٹھتی ہیں۔ جن کا پھر لوٹ کر آنا لازم ہے یہی میرے نزدیک تقدیر ہے۔ کب کون لہر لوٹے گی اور کس طرح لوٹے گی یہ میں نہیں جانتا، لیکن یہ یقین کے ساتھ جانتا ہوں کہ جو لہریں نکل کر گئی ہیں وہ لوٹیں گی ضرور۔ اور ایک روز تمام سائنسدانوں کو اس پر یقین لانا پڑے گا۔ مجھے اس حقیقت پر بھی یقین ہے کہ اعمال صالحہ کی لہریں بداعمالیوں کی لہروں پر اثر انداز ہو سکتی ہیں۔"

دوست:- ان حقائق گوئیوں سے مجھے معاف رکھو، میں نہ ان کو سمجھ سکتا ہوں۔ اور نہ سمجھنا چاہتا ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ کون کام کیسا ہے۔ کیونکہ میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ جو کام ایک جگہ اچھا سمجھا جاتا ہے وہی دوسرے موقع پر بُرا بن جاتا ہے۔ خیر اس بحث کو چھوڑو۔ میں تو اس پگلی کو دکھا کر اس کے محبوب کی تحقیقات و تفتیش میں تمہاری امداد چاہتا ہوں۔"

میں:- اگر ایسا ہے تو پہلے میری بات سمجھ لو۔ اس دنیا پر ایک مضبوط قانون کارفرما ہے اور جو شخص جیسا کرتا ہے۔ اس قانون کے ماتحت اس کا پھل پاتا ہے کسی حقیقت آشنا نے کیا خوب کہا ہے ؎

گندم از گندم بروید جو ز جو
از مکافاتِ عمل غافل مشو

برائیاں بہرحال برائیاں ہیں اور جلد یا بدیر انسان پر ان کے نتائج ضرور وارد ہوتے ہیں، لیکن اس کے باوجود میں مہر و محبت کو دنیا کی تمام چیزوں سے بالاتر سمجھتا ہوں۔ بس تم یہی بات اس پگلی کو سمجھا دو۔"

میرے دوست ہنس پڑے۔ انہوں نے کہا۔ تمہیں کیوں نہیں جا کر سمجھا دیتے؟ اگر دو چار تھپڑ اور دس پانچ گھونسے مل جائیں تو ان کو اپنی قابلیت کا صلہ سمجھ کر برداشتہ خاطر نہ ہونا۔ کیونکہ اگر وہ عورت ایسی نہ ہوتی تو اس طرح قید نہ کی جاتی۔"

میرے دوست تو ہنس رہے تھے۔ لیکن مجھے رونا آ رہا تھا۔ کسی آرٹسٹ نے اس کے ساتھ ایسی سنگدلی برتی؟ وہ کیسا ہے؟ کون ہے؟ شاعر ہے، مصور ہے، مغنی ہے، اس نے کیوں اس کو نظر انداز کر رکھا ہے؟ وہ اپنی ہی صنعت کو کیوں اس طرح برباد کر رہا ہے؟

میں نے اپنے دوست سے سوالات کی بھرمار کر دی۔ میرا دل بے اختیار ہو گیا۔ میں نے کہا۔ میں پھر اسی کے پاس چلنا چاہتا ہوں، چلو پھر وہیں چلو۔

میں نے وہاں پہنچ کر اس کی آواز نہیں سُنی۔ کھڑکی سے دیکھا وہ چُپ چاپ ایک چارپائی پر پڑی خاص محویت کے عالم میں ایک تصویر دیکھ رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی میں نے پکارا۔ "کملا!"

"ایں! یہ کملا کو پکارنے والا کون ہے؟" اس نے جلدی سے اُٹھ کر مجھے دیکھا اور ساتھ ہی غش کھا کر گر پڑی۔

میرے منہ سے نکل گیا۔ یہ تو وہی کملا ہے جو میری گونگوں کی تعلیمگاہ میں رہتی تھی۔ دو سال کے قریب ہوئے ایک روز وہاں سے غائب ہو گئی تھی۔ یہ بولنے کیسے لگی۔ اس کو تو میری تعلیمگاہ میں صرف پڑھنا لکھنا سکھایا گیا تھا۔"

کمرے کا دروازہ کھول دیا گیا۔ کملا چارپائی پر سر رکھ کر رونے لگی اور کہنے لگی۔ آپ آ گئے۔ آخر آپ اپنی کملا کے پاس آئے بغیر نہ رہ سکے۔ میں نے تو سمجھ لیا تھا کہ آپ کو گونگوں کی تعلیم و تربیت سے کبھی اتنی فرصت نہ ملے گی کہ آپ اپنی کملا کی خبر لے سکیں گے۔"

ابھی تک کملا کے ہاتھ میں وہ تصویر تھی اور وہ میری ہی تصویر تھی۔

میں نے کہا۔ یہ کیونکر ممکن تھا کہ میں تمہیں بھول جاتا؟ لیکن یہ تو بتاؤ تمہیں گویائی کیونکر حاصل ہو گئی؟

وہ ہنس پڑی۔ بولی۔ محبت کے طفیل، میں پیدائشی گونگی نہ تھی۔ لہٰذا علاج سے میرا گونگا پن دور ہو گیا۔

میں:- تم ایک مرض کے پنجے سے چھوٹیں تو دوسرے کے پنجے میں کیوں کر پھنس گئیں؟

اس نے جواب نہیں دیا۔

میرے دوست نے کہا۔ کیا اس بات کے دریافت کرنے کی بھی ضرورت ہے؟ لیکن یہ تو بتاؤ گونگوں کی تعلیمگاہ سے تمہارا کیا تعلق تھا؟ کیا تم وہاں جایا آیا کرتے تھے؟

میں اس سوال کا جواب دیتا؟ لیکن میرے چہرے نے ضرور میرے راز کی غمازی کر دی ہو گی، اور حقیقت بے پردہ ہو گئی ہو گی انسان کے نیک و بد ہر عمل سے لہریں پیدا ہوتی ہیں اور وہ جلد یا بدیر یقیناً لوٹتی ہیں۔ میرے اس نظریہ نے اسقدر جلد عملی صورت اختیار کر لی؟ اور یہ گونگی لڑکی اس طرح گویا ہو کر میرے راز کو طشت از بام کر رہی ہے! یہ کسقدر ہولناک تجربہ ہے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ اسقدر جلد تجربے میں آ جائے گا۔

(ماخوذ و ترجمہ)

ایوب شاہد رامنگری

(۱)

میرے ٹوٹے ہوئے دل کے شکستہ تار سے نغمے بلند ہو رہے ہیں جگمگاتے تاروں کے رسیلے گیت اُن نغموں سے ہم آہنگ ہو گئے ہیں - ماہتاب کی خنک اور شیریں کرنیں اس درد فشاں موسیقی کو روشنی میں تبدیل کر رہی ہیں - ماہتاب کے دامن زریں میں میرے فضا تاب نغمے جگمگا اُٹھے ہیں -

(۲)

تیرے آقا میرے نغماتِ حزیں تیرے گدازِ محبت سے روشن ہیں - تیری ملکوتی یاد میرے دل کے عمکدے کو منور کئے ہوئے ہے - ہاں میری موسیقی تیرے درد میں ڈوبی ہوئی ہے - میرے دل کے تارِ شکستہ کے لئے تیرا غم جدائی زخمہ بن رہا ہے - اس تار کا ہر نغمہ فضائے قدس میں تیری تلاش کر رہا ہے - تیری جستجو میں آوارہ ہے -

(۳)

تو کہاں ہے میرے آقا!

"کان مشتاق ہیں آنکھوں کی طرح مدت سے
دید سے آواز کہ اِس پردے کے اندر ہم ہیں"

مجھے تیری تلاش ہے - تیری یاد میں میری طویل راتیں بسر ہوتی ہیں - اے حسینِ ازل - ازل کی پہنائیاں بھی مجھے تیرا پتہ نہیں بتاتیں - اے جمیلِ ابدی! ابد کی وسعتیں بھی میری طرح تیرا انتظار کر رہی ہیں -

اے آقائے ازل و ابد تیرا حُسنِ بیکراں ازل و ابد کے دامنوں میں نہیں سما سکتا تو اِن حدودِ لامتناہی سے بھی بے نیاز ہے -

(۴)

پھر تُو کہاں ہے میرے آقا!

سنتی ہوں کہ میری شہ رگ سے بھی تُو قریب تر ہے - کیا یہ سچ ہے؟ کیا سچ مچ اے منزلِ ہر راہِ محبت! تو ہی میری بزمِ جاں میں انجمن آرائی کر رہا ہے - کیا واقعی میں تیری راہِ جستجو میں تجھی کو چراغِ راہ بنائے ہوئے ہوں -

اگر یہ سچ ہے تو پھر اپنے پامال جستجو سے یہ دل لگی کیسی؟ دل میں رہتے ہوئے آنکھوں سے پردہ؟ یہ کیوں؟ میری حیات وممات کے مالک! عالمِ خیال سے عالمِ حال میں آ کہ نگاہِ عشق صورت پرست واقع ہوئی ہے ؎

یہ سچا کہ خلوتِ دل میں تو - ہے ہزار رنگ سے جلوہ گر
مگر آ کے سامنے بیٹھ جا کہ نظر کو خوئے مجاز ہے

امیر سلطان عزیز نجیب آباد
(یو پی)

بزمِ انتخاب

عالمی نظم و ضبط کے متعلق اقبال کا تصور

آج ہم اُس شخص کی ذہنی عظمت و بلندی کی تحسین و ستائش کرنے لگے ہیں ---------- جس نے اپنی ساری زندگی مشرقی تہذیب کے بعض ان روائتی خصوصیات سے اپنی شاعری کو آراستہ کرنے کے لئے وقف کر دی ہے، جن کی وجہ سے مشرقی تہذیب ممتاز ہے۔ یہ مشرقی تہذیب ہر روحانی تہذیب کا گہوارہ رہی ہے۔ اس نے ہر دور میں انسانی زندگی کو عزت و توقیر بخشنے کا فرض ادا کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آج ہم شاعر اقبال کی عزت کیا کر رہے گویا اپنی نظروں میں آپ وقیع و ممتاز ہو رہے ہیں۔

اقبال بہت بڑے شاعر ہی نہیں بلکہ ایک زبردست فلسفی بھی ہیں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ میں ان کی کون سی حیثیت پہ زیادہ زور دے سکتا ہوں۔ ایک زمانہ تھا کہ میں اقبال کی شاعری کی علت غائی کو سمجھنے، ان کے جذبات و احساسات کی گہرائیوں اور ان کے تصور کی بلند پروازی تک پہنچنے کی کوشش کرتا تھا۔ لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ان کی شاعری اولین دور میں تھی۔ زمانہ گزرتا گیا اور اس دلچسپی کو جو زندگی کے شاعرانہ اعتبار سے متعلق ہے۔ صرف حُسن و رعنائی کے اطمینان بخش اندازِ بیان سے کچھ اور زیادہ طلب کرنے کی ضرورت ہوئی، بعض اوقات میں نے ان کے فلسفہ کے منتہائے مقصود تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس دنیا پہ اس کی تاریخ پر اس کے مسائل پہ اور سب سے زیادہ یہ کہ اس کے مستقبل قریب پہ ایک وجدانی تصور کے ذریعہ نظر ڈالنے کی کوشش کی ہے اور یہ تصور اقبال کے فلسفہ کا مہیا کردہ ہے۔

اس شاعری کو میں اب تک میں محسوس کرتا اور فلسفہ کی اس آواز کو اب تک سنتا ہوں۔ لیکن یہ میرے بس کی بات نہیں کہ ان دونوں پہلوؤں میں سے کسی ایک کو منتخب کر کے اقبال تک پہنچنے کی کوشش کروں، ان دونوں نے اس طرح ترکیب پائی ہے کہ میرے نزدیک ان کا کلام نہ تو خالص شاعری کا روپ رکھتا ہے اور نہ نرے فلسفہ کا رنگ۔ یوں کہئے کہ گویا ان دونوں نے عرفانِ عمرانی کے مرکب کی شکل پائی ہے اور اپنا اپنا حق ادا کرتے ہیں۔

اقبال نے جو اثر مجھ پر چھوڑا ہے اس کو واضح کرنے کے لئے میں نے عرفانِ عمرانی کا لفظ استعمال کیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اقبال نے عالمی تصور کے سلسلہ میں اپنے پاس سے جو چیز پیش کی ہے وہ اس سے نمایاں ہو جاتی ہے، وہ زندگی کے اس پیامِ جاوید کی طرف اشارا کرتا ہے جو ہمیشہ سے روحِ فطرت میں کارفرما نظر آیا ہے اور نبی نوع انسان کی حیاتِ مدنی کے لئے ایک ایسے مطمحِ نظر کو متعین کرتا ہے۔ جس کو اس وقت ہر جگہ فراموش کیا جا رہا ہے۔ اقبال کی قوم پرستی کی یہ داستان اس زمانہ کی ہے جب کہ ان کا عالمِ شباب تھا اور فطرت کا اقتضا یہی تھا کہ اس وقت جب کہ ہندوستان کے ایک بیدار اور ترقی یافتہ طبقہ کے دلوں کو نام نہاد قوم پرستی کا مضراب آہستہ آہستہ چھیڑ رہا تھا۔ اقبال بھی مست ہو کر ایسے ہی نغمے الاپنے لگے۔ لیکن جب وہ یورپ گئے اور ان کی نظر نے دنیا کے حوادث، اقوامِ عالم کے رجحانات اور انسانیت کی بے بسی اور مجبوری کا بہت قریب سے مطالعہ کیا اور زندگی کے تجربات نے جب ان کی پروازِ نظر کو مزید تقویت بخشی تو قومیت کا محدود تصور بہت پیچھے رہ گیا، اور وہ ایک پاکیزہ اور بلند و بالا مطمحِ نظر کے حامی ہو گئے یہی وہ مطمحِ نظر ہے جو انسانیت کی نجات کا باعث ہے۔

(سب رس)

ہم دو لڑکے

ہردم ساتھ اکٹھے رہتے۔
ہم دونوں آپس میں لپٹتے۔
نئے نئے رستوں پر چلتے، پورب پچھم آتے جاتے۔
اپنے بازوؤں کو پھیلاتے۔

ملک کے تمام محکمہائے تعلیم، افسرانِ تعلیم و ماہرینِ تعلیم کا
یہ متفقہ فیصلہ ہے
کہ ہندوستانی بچّوں، بچّیوں کے مطالعہ کیلئے باتصویر ہفتہ وار
اخبار "پریم" لاہور
اخبار پریم کے ذریعہ بچّوں کے دل میں خدا، مذہب، وطن اور بنی نوع انسان کے واسطے عزّت، محبّت اور ہمدردی کے جذبات پیدا کئے جاتے ہیں:
اخبار پریم کا مطالعہ کرنے والے بچّے اپنے مذہب کے پابند اور دوسرے مذہبوں سے رواداری اور تمام مذہبی پیشواؤں کی عزت کرنے والے بن جاتے ہیں:
اخبار پریم کو لگاتار پڑھنے والے بچّے دنیا کے تازہ حالات و ترقیات سے واقف زندگی کے آداب کے مالک اور مغربی و مشرقی تہذیب کی خوبیوں کے جامع ہوتے ہیں:
اخبار پریم لاہور کے ایڈیٹر ہندوستان کے مشہور ادیب اور نقّاد علّامہ تاجور اور پروفیسر چرنجی لال ماتھر دہلوی ایم۔اے ہیں:
اخبار پریم کے متعلق سر جوفرے ڈی مونٹ مورنسی سابق گورنر پنجاب۔ آنریبل سر عبدالقادر۔ ڈاکٹر خان وزیر اعظم صوبہ سرحد۔ رائے بہادر [illegible]
آئی۔سی۔ایس اسسٹنٹ ڈائرکٹر محکمہ تعلیم پنجاب اور خان بہادر شیخ نور الٰہی پرنسپل ٹریننگ کالج لاہور اور تمام افسرانِ تعلیم ہیڈ ماسٹر [illegible]
صاحبان نہایت اعلیٰ رائے رکھتے ہیں:
اخبار پریم کے ایڈیٹروں کا دعویٰ ہے کہ ایک سال لگاتار پریم کو پڑھنے والے بچّے کی اردو ادب کے متعلق استعداد و لیاقت اور [illegible]
کی بابت اس کی معلومات انٹرنس میں پڑھنے والے طالب علم سے زیادہ ہو جاتی ہیں:
اخبار پریم کو پڑھنے کے بعد بچّوں کو اردو کے مروجہ خشک کورسوں اور درسی کتابوں کے پڑھنے کی ضرورت نہیں رہتی:
اخبار "پریم"
لاہور کا نہایت خوبصورت سرورق (ٹائیٹل) تین رنگ کے بلاک کا ہے۔ بچّوں کے عام پرچوں سے اس کے صفحات [illegible]
ہوتے ہیں:
سالانہ چندہ چھ روپے۔ نمونہ مفت طلب کیجئے۔ محصول ڈاک چار آنے
دفتر اخبار پریم خواجہ دل محمد روڈ لاہور

شاہکار لاہور

ایڈیٹر:- پروفیسر تاجور نجیب آبادی

ادارہ:- خواجہ محمود جاوید ایم۔ اے
گوپال متل بی۔ اے

چندہ:- سالانہ چھ روپے۔ ششماہی ساڑھے تین روپے۔ نمونہ آٹھ آنے

جلد (۷) | نمبر (۵)

فہرست مضامین ماہ اگست ۱۹۳۸ء

تصاویر:- (۱) محفلِ رقص (۲) گوئٹے (۳) ایلن پو (۴) شانتی نکیتن -

نمبر	مضمون	مصنف	صفحہ
۱	مختصرات	تاجور	۲۷۵
۲	پنجاب کی اخبار نویس برادری	تاجور	۲۸۰
۳	تنویرات	مولینا ابو محمد امام الدین رامنگری	۲۹۱
۴	خود نوشت سوانح عمری	خواجہ محمود جاوید ایم۔ اے	۲۹۳
۵	تعلیمات	جناب احمد سعید صاحب ایم۔ اے	۳۰۱
۶	صفحۂ اطفال	منقول از اخبار پریم	۳۱۷
۷	مختار	اس ماہ کا بہترین مضمون (ماخوذ)	۳۰۸
۸	بزمِ انتخاب	تازہ ترین اخبارات و رسائل سے اہم اور متنوع مضامین	۳۳۰
۹	افکارِ تازہ	(ماخوذ)	۳۱۶

افسانے

نمبر	مضمون	مصنف	صفحہ
۱۰	سچی ستی	محترمہ شورانی دیوی صاحبہ اہلیہ منشی پریم چند مرحوم	۲۸۵
۱۱	سوتیلا بیٹا	جناب سریندر موہن ایم۔ اے	۲۹۵
۱۲	سچا مکالمہ	حضرت ایوب شاہد رام نگری	۳۰۵
۱۳	اچھوت اور برہمن	جناب اے پی جین بی۔ اے	۳۱۲
۱۴	پنجہ کالستان	جناب عنایت اللہ انبالوی بی۔ اے	۳۱۴
۱۵	راجکماری شیلا	جناب رفیع الزمان خاں صاحب بی۔ اے (آنرز) جالندھری	۳۲۱

حصہ نظم

نمبر	مضمون	مصنف	صفحہ
۱۶	نگارے لبِ جوئبارے	حضرت احسان دانش	۲۷۹
۱۷	غزل	منشی پیارے لال شاکر میرٹھی	۲۸۴
۱۸	بادۂ شیرانہ	مولینا ماہر القادری	۲۹۰
۱۹	شانِ وطن:- جناب گلشن نادونی منشی فاضل		۳۰۰
۲۰	غزل:- گوپال متل		۳۰۷
۲۱	کیا کیا لکھوں:- حضرت شباد عارفی		۳۱۳
۲۲	غزل:- جناب اختر حکوالی۔ بی۔ اے		

ایم نادی حسن اختر پرنٹر و پبلشر نے آزاد ہند پریس ہسپتال روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر شاہکار واقع مکان میاں علی محمد اسٹریٹ میاں علی محمد (۲۵ سی بیڈن) خواجہ دل محمد روڈ لاہور سے شائع کیا۔

مختصرات

سکندر گورنمنٹ کے تازہ پانچ قانون

اس حقیقت نفس الامری سے شاید ہی کسی کو انکار ہو کہ پنجاب کا زمیندار اور کسان طبقہ بُری طرح تباہ حال اور پامال ہے اور کسی غیر محسوس ذریعے سے تمام دولت سمٹ سمٹا کر پنجاب کے تجارت پیشہ اصحاب کی جیب میں آگئی ہے۔ اس کی وجہ کچھ تو کسان کی سادہ لوحی ہے۔ اور کچھ تجارت پیشہ طبقے کی حد سے بڑھی ہوئی چالاکی اس پر ستم بالائے ستم یہ کہ دیوانی قانون بھی اس کی ضروریات کے مطابق تھا۔ ان حالات میں وہ اگر کھل کھیلا اور اس نے قانون کی خامیوں اور اپنے تمول کے بل بوتے پر زمیندار اور کسان کے لئے عرصۂ حیات تنگ کر دیا تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔

کسان انسانیت کا عظیم ترین محسن سہی، ان داتا سہی، مگر یہ اُس وقت ہے اگر اسے اور اس کے بیوی بچوں کو حلقۂ انسانیت سے خارج کر دیا جائے۔ کیونکہ جہاں تک ان مظلوموں کا تعلق ہے انہیں نہ پیٹ بھر کر روٹی نصیب ہے نہ تن ڈھانکنے کو کپڑا۔ حیرت ہے کہ جو شخص دوسروں کے گھروں میں گھی کے چراغ جلائے اس کا اپنا گھر تیل کے دئے سے بھی محروم رہے۔ یہ حالت کب تک قائم رہ سکتی تھی۔ آخر کبھی تو اس کا خون چوسنے والوں کا طلسم سامری ٹوٹنا تھا۔ ظلم کی رسی دراز سہی مگر یہ سلسلہ لامتناہی نہیں ہوتا۔

موجودہ اصلاحات نے عوام کو یہ حق دیکر کہ وہ اپنے پسند کی حکومت منتخب کریں۔ گویا حقوق طلبی کے لئے میدان تیار کر دیا۔ اب ہر برسر اقتدار حکومت صرف اسی وقت تک قائم ہے جب تک اس کی پشت پر عوام کی طاقت ہے۔ جونہی عوام اسے اپنی پشت پناہی سے محروم کر دیں وہ قائم نہیں رہ سکتی۔ یہ خطرہ حکومتوں کو مجبور کرتا ہے کہ عوام کی خواہشات کے مطابق حکومت کریں۔ پنجاب کے عوام نے اپنی عنان سر سکندر کے ہاتھ میں دی تھی اور اس امید میں انہیں اپنا سرگروہ بنایا تھا کہ وہ ان کی تکالیف کو دور کریں گے اور ان بے انصافیوں کا ازالہ کریں گے۔ جو ایک مدت سے ان کے ساتھ ہو رہی تھیں۔ اگر سر سکندر ایسا نہ کرتے تو یہ اپنے وعدوں سے انحراف ہوتا اور عوام کے حقوق سے غداری۔ ہم خوش ہیں کہ سر سکندر اس گناہِ عظیم کے مرتکب نہیں ہوئے۔ اس کے برعکس انہوں نے اپنے فرائض کو نہایت خوش اسلوبی سے نبھایا ہے۔ موجودہ پانچ قانون جو پنجاب کی زمیندار اور کسان آبادی کے لئے آبِ حیات کا حکم رکھتے ہیں۔ ان کے اسی احساس فرض کا نتیجہ ہیں۔ ان بلوں کی پشت پر کیا جذبہ کام کر رہا ہے۔ یہ انہی کے الفاظ میں سنئے۔

"پنجاب کا غریب کسان دن رات محنت کرنے کے باوجود بھوکا اور ننگا رہے۔ پنجاب کا غریب کاشتکار دھوپ اور جاڑے کی سختیاں سہہ کر ایک عزت مندانہ زندگی بسر نہ کر سکے۔ اس کی اپنی زمین اس کے قبضے میں نہ ہو۔ اس کی گاڑھی کمائی میں خود اسی کو حصہ نہ ملے۔ اس کی محنت سے کمایا ہوا دھن اس کے بچوں کا پیٹ پالنے کی بجائے ساہوکاروں کے خزانے بھرے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے احساس سے کسی بہی خواہ وطن، کسی فرض شناس انسان اور کسی ذمہ دار حکومت کو اطمینان نہیں ہو سکتا۔ ۱۹۳۷ء کے ماہ اپریل سے آجتک میں اور میری وزارت کے اراکین اسی فکر میں غلطاں اور اسی مصیبت کو دور کرنے کی کوشش میں سرگرم رہے ہیں۔ ہمارا مقصد صرف یہی ہے کہ کوئی ایسی منصفانہ تدابیر اختیار کیجائیں۔ جن سے کسی فریق کے جائز حقوق کو پامال کرنے کے بغیر پنجاب کے غریب زمینداروں کاشتکاروں اور کسانوں کو عزت مندانہ زندگی بسر کرنے کا موقع ایک بار پھر میسر آجائے۔"

اس کے بعد ان قوانین کی تصریحات بھی انہی کے الفاظ میں سنئے:-

"یہ قوانین محض اقتصادی قوانین ہیں اور ان کا اثر براہِ راست ہمارے صوبے کی غریب آبادی پر پڑتا ہے ان کا منشا ہرگز یہ نہیں کہ کسی خاص قوم یا فرقے کو نقصان پہنچے یا جائز قرض کی ادائیگی نہ ہو یا زراعت پیشہ اقوام

کو دوسری اقوام کی جائداد کا قبضہ مل جائے یا ساہوکاروں کا کاروبار بند ہو جائے۔ ان قوانین کا منشا صرف یہ ہے کہ غریب زمینداروں کی جو زمینیں اور جائدادیں غیر زراعت پیشہ اقوام کے سرمایہ دار افراد کے پاس مکفول ہیں۔ ان کو ان کے مالکوں کو واپس دلانے کا انتظام کیا جائے۔ اور یہ انتظام ایسا ہو جو انصاف اور عدل کے مسلمہ اصول پر مبنی ہو اور آئندہ اس صوبے میں لین دین کا جو کاروبار ہو۔ وہ باضابطہ ہو۔ دیانتدارانہ ہو اور خاص شرح سود اور منصفانہ شرائط کے تحت ہو۔"

ان تصریحات کے باوجود اگر کوئی طبقہ اپنی ناروا اغراض کی تسکین اور مفاد مستقلہ کی حفاظت کے پیش نظر غوغا آرائی اور ہنگامہ آفرینی پر کمربستہ ہو جائے تو یہ اس کا اپنا قصور ہے۔ جب بھی کسی طبقے کے ناجائز حقوق پر زد پڑی ہے۔ ایسا ہی ہوا ہے۔ حکومت اور پنجاب کے اہل الرائے طبقے کو اس شور و شر سے گھبرانا نہیں چاہیئے۔ وقت آنے پر یہ خود ہی فنا ہو جائے گا۔

اس شور بے ہنگام کی جسے ساہوکاروں کا طبقہ غیر زراعت پیشہ ایجی ٹیشن کہتا ہے غرض و غایت اس کے سوائے اور کچھ نہیں کہ حکومت پنجاب اس سے مرعوب ہو کر مظلوم طبقوں کی امداد سے دستکش ہو جائے اور انہیں غیر منصفانہ اور ناجائز لوٹ کھسوٹ کا بدستور لائسنس ملا رہے۔

اس ایجی ٹیشن کی بے بضاعتی کا اس سے زیادہ ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کی تمام تر بنیاد دروغ گوئی اور بہتان تراشی پر ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ ان بلوں سے سب سے زیادہ فائدہ خود وزرا کو پہنچے گا۔ حالانکہ اس کے برعکس حقیقت حال یہ ہے کہ نئے قوانین کے نفاذ سے آنریبل میجر خضر حیات خاں کو پچاس ہزار اور سر سکندر کے خاندان کو تقریباً ساڑھے پانچ لاکھ کا نقصان ہوگا۔ دوسری دروغ گوئی یہ کی جاتی ہے کہ یہ قانون فرقہ وارانہ نوعیت کے ہیں اور ان کا مقصد صرف اسی قدر ہے کہ پنجاب کے ہندوؤں کو تباہ کر دیا جائے۔ گویا ان لوگوں کے نزدیک ہندو کہلانے کا حق صرف چند سرمایہ داروں کو ہے۔ پنجاب کے پندرہ لاکھ اچھوت اور پینتیس لاکھ زراعت پیشہ ہندو آبادی ہندو دھرم کے دائرے سے خارج ہے۔ کاش یہ لوگ غور کریں کہ کسی ایجی ٹیشن کو جھوٹ اور بہتان تراشی کی بدولت زیادہ دیر زندہ نہیں رکھا جا سکتا۔ کچھ لوگوں کو کچھ وقت کے لئے دھوکا دیا جا سکتا ہے۔ مگر تمام پبلک کو ہمیشہ کے لئے گمراہ کرنا آسان نہیں۔ جھوٹ کا پردہ کبھی نہ کبھی چاک ہو کر ہی رہتا ہے اور وہ وقت دروغ گو کے لئے بڑا عبرتناک ہوتا ہے۔

خیر یہ ایجی ٹیشن تو اپنی موت مر ہی جائے گی۔ مگر سر سکندر کی حکومت کو اپنے زریں کارناموں کی بدولت ثبتِ دوام مل جائے گا اور پنجاب کی آنے والی نسلیں اس امر واقعی پر ناز کریں گی کہ غریب نوازی میں ان کے صوبہ نے ہندوستان کے دیگر صوبوں کی رہنمائی کی تھی اور انہیں بتایا تھا کہ ہندوستان کے مفلسوں کی تالیف قلوب، بندے ماترم کے گیتوں سے نہیں بلکہ ان کی اقتصادی مشکلات کے ازالے سے ہی ہو سکتی ہے۔

محمود احمد

بورڈ ٹیچرز ایسوسی ایشن کی تحریک

پنجاب میں بورڈ ٹیچرز کی تنظیم کی تحریک ایک نہایت بے ضرر اور آئینی تحریک ہے۔ اس تحریک سے دلچسپی رکھنے والے اساتذہ بھی عام استادوں کی طرح حکومت کے پرستار، یونین جیک کے سلامی، محکمے کے وفادار اور افسران بالادست کے مجرائی ہیں۔ ہاں وہ اپنے جائز اور واجبی حقوق کی حمایت کے لئے اپنی تنظیم کے خواہشمند ہیں۔

آنریبل وزیر تعلیم پنجاب۔ محکمہ تعلیم کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر اور ڈائرکٹر۔ افسران تعلیم، پنجاب اسمبلی کے ذمہ دار ممبران اُن کی جاری کردہ بورڈ ٹیچرز تحریک کے اغراض و مقاصد کا احترام اور ان سے اپنی ہمدردی کا اظہار کر چکے ہیں۔ مختصر یہ کہ اہم اور مناسب تحریک اپنے قیام و بقا کا آئینی جواز حاصل کر چکی ہے۔

لیکن بعض اضلاع کے افسرانِ تعلیم اس بے ضرر تحریک کو اپنے اقتدار کا حریف سمجھ کر اس کی اشاعت کو روک رہے ہیں۔ چنانچہ ایک ضلع میں بورڈ ٹیچرز ایسوسی ایشن قائم ہوئی۔ اس کے دو تین جلسے بھی ہوئے۔ کسی جلسے کی بابت پنجاب کی خفیہ پولیس نے کوئی ایسی رپورٹ بھی نہیں کی۔ کہ اس ایسوسی ایشن کے ممبران بم بناتے ہیں، یا ببر اکالی تحریک کو نئے سرے سے زندہ کرنے کی سعی کر رہے ہیں۔ یا محکمۂ تعلیم پر مورچہ لگانے کی سازباز میں مصروف ہیں۔ یا ضلع کے افسرانِ معائنہ کے نام سرخ چٹھیاں بھیج رہے ہیں۔ یا ڈسٹرکٹ بورڈ پر انہوں نے کوئی مسلح پہرہ لگا رکھا ہے۔ اس کے برعکس خفیہ پولیس مطمئن ہے۔ حکومت مطمئن ہے، محکمے کی آخری

طاقتیں مطمئن ہیں۔ مگر ضلع کا افسر معائنہ کسی صورت سے مطمئن نہیں ہوتا۔ کیونکہ تحریک کے کچھ شرانگیز مخالفین نے اس تحریک کے خلاف غلط بیانات سے اُس کے کان بھر دئے ہیں اور اُسے اس غلط یقین میں مبتلا کر دیا ہے۔ کہ بورڈ ٹیچرز کی تحریک غیر آئینی ہے۔ اِس بنا پر افسر مذکور نے اپنے رقبۂ اقتدار میں اسے نشو و نما سے محروم کر دیا ہے۔

ہمارے دفتر میں جو اطلاعات پہنچ رہی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ تحریک کے کارپردازوں پر سخت گیری کی جا رہی ہے۔ اگر یہ اطلاعات صحیح ہیں تو افسرانِ معائنہ کو اپنے طرزِ عمل کی فوری اصلاح کر لینی چاہئیے۔ مبادا یہ معاملہ اپنی اہمیت کے مطابق طول پکڑ جائے۔ ابھی تک ہم افسر مذکور کے نام کی اشاعت سے دانستہ اس توقع پر پہلوتہی کر رہے ہیں۔ کہ وہ اپنے روّیے پر نظرِ ثانی کر کے سخت گیری کی پالیسی سے دست بردار ہو جائے گا۔ اگر بلبینہ گیر و دار کا سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو استادوں کے حقوق کی حفاظت کا فرض ادا کرتے ہوئے ہم معاملات کو بے نقاب کر دیں گے۔

اس تصویر کا دوسرا رُخ :۔

اسی ضلع سے کچھ استادوں کے خطوط اس مطلب کے بھی موصول ہو رہے ہیں کہ "آپ کو گمراہ کیا جا رہا ہے۔ کام سے جی چرانے والے بعض استاد افسر تعلیم کی تنبیہ سے چڑ کر اُسے بے جا طور پر بدنام کرنا چاہتے ہیں۔ ورنہ ہمارے ڈی آئی اور اے ڈی آئی استادوں میں بہت ہر دلعزیز ہیں اور استادوں کے حقوق سے دلی ہمدردی رکھتے ہیں۔

اگر یہ اطلاعات واقعات کی چہرہ نما ہیں تو ہمیں اُن استادوں کے طریق عمل پر افسوس ہے کہ وہ اپنے فرائض منصبی کو ادا کر کے افسر تعلیم سے تعاون کرنے کی بجائے اپنی کمزوریوں کو اُس کے دامنِ رسوائی میں چھپانا چاہتے ہیں۔

ضرورت ہے کہ مرکزی بورڈ ٹیچرز ایسوسی ایشن کے نمایندے اُس ضلع میں پہنچ کر تحقیق حال کریں۔ پھر اگر اس ضلع کے افسرانِ معائنہ کسی غلط فہمی کی بنا پر اس تحریک سے متعلق شبہات رکھتے ہوں تو ان کو تحریک کے اغراض و مقاصد سے صحیح طور پر آگاہ کر کے اپنا ہمنوا بنائیں اور اس سلسلے میں ان کی سخت گیری کے نتائج سے اُنہیں متنبہ کر دیں۔ اور اس کے برعکس اگر یہ معلوم ہو کہ کچھ استاد بے جا طور پر افسرانِ معائنہ کے خلاف شورش برپا کرنا چاہتے ہیں۔ تو اُنہیں تحریک کی پناہ میں افسروں کو بدنام کرنے کی حرکت سے روکیں۔ کہ اس سے تحریک کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے۔

اِس سِلسلے کی تازہ اطلاعات :۔

آج کئی خطوط ضلع معہودہ سے موصول ہوئے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ دُور دراز اور مضرِ صحت مقامات پر تبادلوں کی سزائیں کافی خیال نہیں کی گئیں۔ بلکہ ایک غریب استاد کو اس شبہ پر معطل بھی کر دیا گیا ہے کہ اُس نے مدیر شاہکار کو ضلع کے تعلیمی حادثات سے مطلع کیا ہے۔

اس ناکردہ گناہ استاد کا خط بھی ہمارے نام پہنچا ہے۔ جس میں وہ مطالبہ کرتا ہے کہ "اگر میں نے کوئی تحریر آپ کو اپنے افسرانِ تعلیم کی شکایت سے متعلق بھیجی ہو تو آپ مہربانی کر کے وہ تحریر ہمارے ضلع کے ڈی آئی صاحب کی خدمت میں بھیج دیں۔ کیونکہ مجھ پر شبہ کیا جا رہا ہے۔"

جواباً گزارش ہے کہ اگر ایسی کوئی تحریر آپ کی بالفرض موصول بھی ہوتی تو ہم اس گناہ کے مرتکب کبھی نہ ہوتے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ اس غریب کی کوئی تحریر ہمیں نہیں پہنچی۔

باقی جو اساتذہ اس خوف کا اظہار کر رہے ہیں کہ ہم اُن کے خطوط افسرانِ محکمہ کو دکھائیں گے۔ انہوں نے ہمارا غلط اندازہ کیا ہے۔ انہیں مطمئن ہونا چاہئیے کہ انشاء اللہ ایسا کبھی نہ ہوگا۔ **تاجور**

ایک غلطی کی تصحیح

گزشتہ نمبر میں "کشمیر" کے نام سے ایک بہت دلچسپ مضمون شائع ہوا تھا۔ پروف ریڈر کی غلطی سے محترم مضمون نگار کا نام شائع ہونے سے رہ گیا ہے۔ اس کا ہمیں افسوس ہے۔ یہ مضمون مشہور انشا پرداز و افسانہ نگار شیخ عباد اللہ صاحب بی۔ اے (این۔ ڈبلیو ریلوے پبلسٹی آفس) کے رشحاتِ قلم سے تھا۔

شیخ صاحب ممدوح جس دلکش زبان اور دلربا اندازِ بیان میں مقالہ نگاری کرتے ہیں۔ قابلِ صد تحسین و آفرین ہے۔ اُن کا ایک تازہ اور حد درجہ دلچسپ افسانہ مسلسل طور پر آئندہ نمبر سے صفحاتِ شاہکار کی زینت بنا کریگا۔

(ادارہ)

قانون کرایہ

پنجاب کے ہر مرکزی شہر میں زیادہ تر غیر شہری لوگ بود و باش رکھتے ہیں۔ لاہور ہی کی ساڑھے پانچ لاکھ آبادی کی اگر چھان بین کی جائے تو اصل لاہوری خاندان گنتے کے نکلیں گے۔ ورنہ یہاں زیادہ تر پنجاب کے ہر حصے کے باشندے آباد ہیں۔ کسی کا یہاں تجارتی کاروبا

ہے۔ کوئی کسی سرکاری یا پرائیویٹ دفتر میں ملازمت کی وجہ سے یہاں رہنے پر مجبور ہے۔ دیہات میں بد اقتصادی و بدحالی کے سبب آئے دن ڈاکے کی نت نئی واردات کے سبب بے شمار دیہاتیوں نے پنجاب کے عام شہروں خصوصاً لاہور میں سکونت اختیار کر لی ہے۔

یہ بیرونی حضرات عموماً کرایہ کے مکانوں میں رہتے سہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام اضلاع پنجاب خصوصاً امرتسر، ملتان، راولپنڈی اور لاہور میں کرایہ داروں کے لئے مکانات کی تعمیر کا کاروبار روز افزوں ترقی پر ہے۔ اس پہلو میں لاہور حکومت کا دارالسلطنت ہونے کے سبب سب شہروں سے بازی لے گیا ہے۔ مگر یہاں سب سے زیادہ اقامتی مصائب کرایہ داروں کو برداشت کرنے پڑ رہے ہیں۔ مالکان مکانات کی رعونت، سخت گیری اور لبیار گیری کی دیرینہ شکایات بڑھتے بڑھتے اب عام ہو چکی ہیں۔ کسی کرایہ دار سے بھی معلوم کیا جائے تو وہ بے ضغطۂ زبان اس بپتا کو آپ بیتی کے رنگ میں سنا دے گا۔ پھر مکانات کے کرایے کا کوئی معیار نہیں۔ کرایہ دار کی ضرورت اور مجبوری کے مطابق کرایہ بڑھتا اور گھٹتا رہتا ہے۔ آج ایک مکان اگر بیس روپے ماہانہ کرایہ پر چڑھا ہوا ہے تو کل کو یہی مکان کسی دوسرے کرایہ دار کی بے خبری یا ضرورت کو دیکھ کر تیس روپے پر بھی چڑھا دیا جاتا ہے۔ اور عموماً یہی ہو بھی رہا ہے۔ کرایہ داروں کے آرام و راحت کے خیال کا ذکر تو درکنار مالکان مکانات کو کرایہ بڑھانے یا کسی زیادہ کرایہ ادا کرنے والے کی فکر رہتی ہے۔ عموماً ان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ کرایہ دار ہی اپنی جیب سے مکان کی مرمت ٹوٹ پھوٹ کی درستی اور اس میں سفیدی بھی کرائے۔

بمبئی اور کلکتہ وغیرہ میں مکانات کے کرایے سرکاری طور پر مقرر کر دیئے جاتے ہیں۔ پھر کسی مکان کے خالی ہو جانے پر مالک مکان مقرر کرایہ سے زیادہ کرایہ لینے کا مجاز نہیں۔ اس قانون کا فائدہ کرایہ دار اور مالکان مکانات دونوں کو پہنچتا ہے۔ کرایہ دار کو یہ خلش نہیں رہتی کہ اس سے زیادہ کرایہ وصول کیا جا رہا ہے۔ اس لئے وہ جم کر رہتا ہے اور مالک مکان کو یہ فائدہ پہنچتا ہے کہ اس کا مکان خالی نہیں رہتا۔

پنجاب کے بڑے بڑے شہروں میں ایک تو مکانات کی بہت قلت ہے۔ کرایہ دار جس حصۂ شہر میں اپنی کاروباری یا ملازمتی ضرورت سے مکان لینا چاہتا ہے۔ عموماً نہیں لے سکتا۔ کبھی تو اس وجہ سے کہ اس حصے میں مکانات کی قلت کی وجہ سے اس کی گوں کا کوئی مکان نہیں اور یا اس لئے کہ مکانات تو ملتے ہیں مگر اُن کے کرائے بڑھے چڑھے ہیں۔ مجبوراً وہ شہر کے دوسرے حصوں میں جو اس کے کاروبار یا دفتر سے بہت فاصلے پر واقع ہیں اور نسبتۃً کم کرایے کے ہیں رہنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور اس طرح مکان سے دکان یا دفتر تک آنے جانے کی مشکلات میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

پنجاب اسمبلی کے اکثر ارکان ذاتی طور پر کرایہ داروں کی مشکلات سے آگاہ ہوں گے۔ حکومت بھی کرایہ داروں کے مصائب سے بے خبر نہ ہوگی۔ ضرورت ہے کہ پنجاب کی مجلس قانون ساز کے ممبر شہری معاشرت کی تکالیف کو دور کرنے کی خاطر "قانون کرایہ" کا کوئی بل اسمبلی میں پیش کریں۔ اگر کسی درد آشنا رکن نے یہ زحمت گوارا کی تو امید ہے کہ انہیں دوسرے ممبران کی تائید اور کابینۂ وزارت کی پذیرائی حاصل ہوگی۔

تاجور

اعتذار

ہم قارئین شاہکار سے معذرت خواہ ہیں کہ اس مرتبہ بھی پرچہ دیر سے شائع ہو رہا ہے۔ ہم نے انتہائی کوشش کی کہ اس دفعہ دیر نہ ہو مگر بعض امور ایسے ہوتے ہیں جو انسان کے حیطۂ اختیار سے باہر ہوتے ہیں اور انسان ہزار کوشش کے باوجود ان پر قابو نہیں پا سکتا۔

رسالہ کے چیف ایڈیٹر اور مالک حضرت علامہ تاجور اپنے وطن مالوف تشریف لے گئے ہیں اور وہاں سے انہوں نے جلد واپس آجانا تھا مگر وہ ناگہاں طور پر بیمار ہو کر رہین بستر ہو گئے اور یہ سلسلہ کئی ہفتوں تک جاری رہا۔ ان حالات میں قارئین کرام خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہم بالکل معذور تھے۔ کافی دیر تک پرچہ صرف ان کے مضامین کی وجہ سے رکا رہا۔

اب بھی پرچہ سہ رنگی تصویر کے بغیر ہی جا رہا ہے۔ مولانا تصویر کے معاملے میں نہایت محتاط ہیں اور آرٹ کے پردے میں تحریک عریانی کو فروغ دینے کے سخت خلاف۔ ان کے مشورہ کے بغیر سہ رنگی تصویر کا انتخاب کرنے کی ہمیں ہمت نہ ہوئی۔ امید ہے کہ آئندہ پرچے میں ایک جاذب توجہ تصویر شائع ہوگی۔ جسے ہر لحاظ سے شاہکار فن کہا جا سکے گا۔

ادارہ

نگارِ لبِ جُوبارے

فلک پہ مشرق کے آئینوں میں سحر کھڑی مسکرا رہی ہے
جماہیاں لے رہی ہیں کلیاں، صبا کرشمے دکھا رہی ہے
کھُلا ہوا ہے قدم قدم پہ تجلیوں کا نگارخانہ
اُٹھی ہے ہنستی ہوئی بشاشت غنودگی دم چرا رہی ہے
فلک کے ڈوبے ہوئے ستارے زمیں پہ شبنم بنے ہوئے ہیں
زمیں سے اُٹھی ہوئی حرارت فضا میں بادل بنا رہی ہے،

(۲)

اسی ہجومِ جمال و بُو میں کنارِ جُو اِک حسین دیوی
سحر کی خاموش ساعتوں کو کلام کرنا سکھا رہی ہے
شباب ادراک کا سفینہ چلا ہے لیکر لجاجتوں میں
خنک ہوا سے شگفتگی سی سیاہ پلکوں میں آ رہی ہے
مچل رہا ہے نظر میں جادو بسی ہوئی ہے نفس میں خوشبو
حسین باہوں کی جاذبیت دلوں کو کافر بنا رہی ہے
صبیح چہرہ، کشیدہ ابرُو جبیں کشادہ، دراز گیسُو
حیا کی تصویر بن رہی ہے قضا کے نقشے بنا رہی ہے،
ڈھلک رہا ہے جو نرم آنچل، گداز شانے جھلک رہے ہیں
اُٹھی ہوئی ہے جو چشم میگوں نقاب محشر اُٹھا رہی ہے
بھرے ہوئے مرمریں بدن میں حیا کی شمعوں سی ہے اُجالا
نفیس اعضا کی جنبشوں سے نظر میں غنچے کھلا رہی ہے،

حریمِ دل میں یہ کہہ رہا ہے کوئی گُر احسان سجدہ کر لے!!
یہ کس کی آواز سُن رہا ہوں، یہ کس کی آواز آ رہی ہے

احسان دانش

پنجاب کی اخبار نویسی ادری

ظفر علیخاں اور اردو صحافت کا دورِ جدید

اخبار زمیندار نے لاہور آنے سے پہلے یہ اخبار ہفتہ وار زمیندار کی صورت میں مولوی سراج الدین خاں مرحوم کی ادارت میں جہلم سے شائع ہوتا تھا۔ مولوی صاحب مرحوم مولینا ظفر علیخاں صاحب قبلہ کے والد ماجد تھے۔ پنجاب کی زمیندار برادری کی اصلاح و بہبودی اس کا مقصدِ اشاعت تھا۔

اُن دنوں مولینا ظفر علیخاں دکن کے دارالانشاء میں تصنیف و تالیف کی خدمات انجام دے رہے تھے۔ وہاں دکن ریویو کے نام سے ایک ماہنامہ حیدر آباد سے جاری کر کے انہوں نے اپنی صحافتی و ادبی قابلیت کی جانب اہلِ نظر کو متوجہ کر لیا۔ مولینا کے قلم سے مد قولہ بھر ریڈیم "کا ترجمہ ظریفانہ افسانہ دکن ریویو میں اس وقت شائع ہوا تھا جب اردو افسانہ نگاری مَیتوں مَیتوں چلنا سیکھ رہی تھی۔ اس افسانے کو پڑھ کر ظفر علی کی حیرت انگیز ترجمانی لیاقت کا اعتراف آج بھی جبکہ صنفِ افسانہ نگاری بہت سی منزلیں طے کر چکی ہے ہر صاحبِ نظر کرے گا۔

حیدر آباد کو الوداع کہنے کے بعد مولینا ظفر علیخاں قبلہ نے اپنے وطن پنجاب کا رُخ کیا اور ہفتہ وار زمیندار کو جہلم سے لاہور لا کر روزنامے کی صورت میں جاری کیا۔

پنجاب میں اردو اخبار نویسی کے جدید دور کا آغاز ظفر علیخاں کے روزنامۂ زمیندار سے ہوتا ہے۔

روزنامہ زمیندار سے پہلے لاہور میں پیسہ اخبار، وطن۔ ہندوستان اور اخبار عام ایوانِ صحافت کے ستون خیال کئے جاتے تھے۔

پیسہ اخبار ہم عصر جرائد کا پیش رَو اور سن و سال میں سب کا بزرگ تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس اخبار کے بانی مولوی محبوب عالم مرحوم تھے۔ مولوی صاحب نے اپنے برادر خرد مولوی عبدالعزیز مرحوم کی معیت میں پیسہ اخبار جاری کیا۔ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے اخبار کی قیمت ایک پیسہ تھی۔

اس عہد کے اکثر ہندو مسلمان اخبار نویس مولوی محبوب عالم کے تربیت یافتہ تھے۔ اسی بنا پر مولوی صاحب کو ایڈیٹر گر کا خطاب حاصل ہوا۔ لالہ دینا ناتھ آنجہانی جو ہندو اخبار نویسوں میں سب سے زیادہ کامیاب سمجھے جاتے تھے۔ پیشہ اخبار ہی کی زمین سے پیدا ہوئے تھے۔

مولوی محبوب عالم اپنی مادری زبان کے علاوہ اردو، فارسی، عربی، ترکی اور انگریزی زبانوں سے واقف اور فنِ صحافت کے ماہر تھے۔ اس کے ساتھ یہ دونوں بھائی حد درجہ جفاکش اور کثیر کار بھی تھے۔ ان کے عملے میں کام کرنے والے بھی سر کھجانے کی فرصت سے محروم رکھے جاتے تھے۔ ان کا دماغ کاروباری لائن پر کام کرنے کے طریقوں سے باخبر تھا۔ وہ کام کرنے کے برابر ہی کام لینے کی قابلیت بھی رکھتے تھے۔ ان تمام قابلیتوں اور اہلیتوں سے انہوں نے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔

انارکلی کی "پیسہ اخبار اسٹریٹ" میں نشاندار قطار در قطار "پیسہ اخبار بلڈنگ" پیسہ اخبار کے عہدِ عروج کی یادگار ہے۔ انتخابِ لاجواب، بچوں کا اخبار، شریف بی بی، ایک عظیم الشان تجارتی کتبخانہ اور ایک بہت بڑا پریس پیسہ اخبار ہی کے بطن سے پیدا ہو کر پروان چڑھے۔

پیسہ اخبار کے ذریعہ مولوی محبوب عالم نے ملک و ملت کی گرانقدر سیاسی، تعلیمی، صحافتی اور قومی خدمات انجام دیں۔

مولینا حالیؔ دہلوی روزنامۂ پیسہ اخبار کے مدیر مسئول تھے۔

مدت دراز تک پیسہ اخبار کی ادارتی ذمہ داریاں ان سے متعلق رہیں۔

اخبار وطن:- اخبار وطن کے بانی مولوی انشاء اللہ مرحوم تھے۔ حجاز ریلوے اور حمیدیہ ایجنسی کی ہر دلعزیز تحریکات کے زیر سایہ اخبار وطن ہفتہ وار سے روزنامہ بنا اور ہندوستان بھر میں مقبولیت حاصل کی۔

مولوی انشاء اللہ کا اندازِ تحریر نسبتہً شگفتہ اور زور دار تھا۔ ہنگامی مسائل پر ان کی رائے عموماً صحیح سمجھی جاتی تھی۔ اخبار وطن کا امتیازی پہلو یہ تھا کہ وہ بین الاسلامی اور خصوصاً ترکی سیاسیات کے مسائل پر زیادہ مقالات شائع کرتا تھا۔ بین الاسلامی سیاسیات سے ہندی مسلمانوں کی دلچسپی کی باقاعدہ ابتدا وطن اخبار سے ہوئی۔

مولوی انشاء اللہ نے حجاز ریلوے اور حمیدیہ کمپنی کی تحریک کو کامیاب بنا کر اسلامی ہند میں خاص وقعت حاصل کر لی تھی۔

ملت:- روزنامہ ملت مولوی شجاع اللہ برادر مولوی انشاء اللہ نے اخبار زمیندار کی معاصرانہ جنگ کے ایام میں روزنامہ وطن کے حلیف کی حیثیت میں جاری کیا تھا۔ اس اخبار کے صفحات میں زیادہ تر زمیندار اور ظفر علی کی مخالفت اور مدافعت کے متعلق مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس جنگ میں زمیندار کی فتح یابی کا ایک نشان اخبار ملت کی موت کی صورت میں لہرایا۔

آفتاب:- روزنامہ آفتاب مولوی وجاہت حسین جھنجانوی نے زمیندار کے بند ہونے کے بعد جاری کیا تھا۔ مولوی صاحب مرحوم جھنجانہ ضلع مظفر نگر کے باشندے تھے۔ داغ دہلوی کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے۔ اُن کی قدیم شاعری اپنے استاد کے رنگ کی ہے اور جدید ہنگامی نظموں کا انداز مولینا ظفر علیخاں کی قافیہ آرائی سے ملتا جلتا ہے۔ تن تنہا پردیس میں بغیر کسی سرمائے کے ایک روزنامہ جاری کرنا اور کئی سال تک اسے جاری رکھنا یہ صرف وجاہت حسین ہی کی ہمت کا کام تھا۔ مولوی وجاہت ابتداء سے روزنامہ زمیندار کے عملۂ ادارت سے متعلق رہے۔ ترکی سیاسیات کے بڑے ماہر تھے۔ جنگِ عظیم کے دوران میں میدانِ جنگ سے جو خبریں آتی تھیں ان پر نہایت صحیح مبصرانہ تنقید کرنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ کسی نامکمل خبر کے موصول ہونے پر اس کے تکملے کے متعلق صحیح پیش گوئی کرنے میں انہیں بڑا کمال تھا۔ کسی خبر کے متعلق جس کی آئندہ تردید ہو جاتی پہلے ہی سے یہ فرما دیا کرتے کہ اس کی یقیناً تردید ہو جائے گی۔ اس پہلو میں ان کی اکثر پیشن گوئیاں صحیح ثابت ہوتی تھیں۔

مولوی صاحب مرحوم کی زبان زمیندار میں بھی اپنی صحت و صفائی اور سلاست و روانی میں ممتاز تھی۔

الصبّاح:- روزنامہ الصبّاح خان بہادر حبیب اللہ خاں کے سرمائے سے علامہ عبداللہ العمادی کی ادارت میں جاری ہوا تھا۔ علامہ موصوف زمیندار کے عہد عروج کے سب سے ممتاز رئیس الادارۃ تھے۔ ان کے مقالات کا ہر پیشِ منظر کسی تاریخی واقعے پر مبنی ہوتا تھا۔ ملک کے اُن چند فضلاء میں ان کا شمار ہے جو قدیم طرز کی جامعیت اور جدید انداز کی باخبری سے متصف نہیں ہیں۔ عربی زبان کا مشہور رسالہ البیان آپ ہی نے جاری کیا تھا جو اپنی فصیح و بلیغ زبان اور انشاء پردازی کے سبب عالم اسلام کے ممتاز رسالوں میں شمار ہوتا تھا۔ وہ عربی فارسی اور اردو زبان کے بے پناہ ادیب اور شاعر ہیں۔ زمیندار میں انہوں نے اپنی سیاسی و ادبی قابلیتوں کا لوہا منوایا۔ "الصباح" پہلے "کسان" کے نام سے جاری ہوا تھا۔ کسان رواج نہ پا سکا۔ بند ہو گیا۔ تو یہی کسان پھر الصباح کے نام سے جاری ہوا۔ مگر زمیندار نے جدید طرز کی جس چٹخارے دار اردو سے اخبار بین طبقے کو مانوس کر دیا تھا۔ الصباح اپنی متانت لہجہ کے سبب اس طبقے میں قبولیت نہ پا سکا۔ مولینا ظفر علیخاں صاحب نے حسب روایات سابقہ الصباح اور علامہ عمادی سے معرکہ آرائی شروع کر دی۔ دونوں جانب چوٹیں برابر کی چلنے لگیں۔ آخر کار مولینا کی قدرشناسی نے علامہ موصوف کو زمیندار کے لئے حاصل کر لیا۔ اور اس طرح الصباح کی اشاعت ختم ہو گئی۔

العصر:- روزنامہ العصر لاہور کی احمدی جماعت کی در پردہ سرپرستی میں مولوی مصطفےٰ خاں بی۔ اے نے جاری کیا تھا۔ عام مسلمان اس سے بے خبر رکھے گئے کہ یہ اخبار احمدی جماعت کا ہے۔ راقم السطور کی طالبعلمانہ زندگی ختم ہوئی تھی کہ ایڈیٹر کی غیر حاضری میں العصر کی ادارتی ذمہ داری اس کے سپرد کی گئی۔ مشہور ادیب لالہ تیرتھ رام فیروزپوری العصر کے اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے۔ حضرت استاد شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ کی گرفتاری پر میں نے مقالہ لکھا تو احمدی جماعت کے کارپردازوں نے اس مقالے کی اشاعت سے انکار کر دیا۔ اس وقت مجھے یہ معلوم ہوا کہ یہ اخبار احمدی حضرات کی ملکیت ہے اور ان کے مخصوص مقاصد کے پیش نظر جاری کیا گیا ہے۔ میں نے اس انکشاف کے بعد اس اخبار سے قطع تعلق کر لیا۔

العصر روزنامے سے ہفتہ وار ہوا اور چند ماہ کے بعد ہفتہ وار العصر بھی بند ہو گیا - اس اخبار میں کوئی خاص انداز موجب امتیاز نہ تھا -

اخبار وکیل:- سہ روزہ اخبار امرتسر سے شیخ غلام محمد مرحوم نے جاری کیا تھا - اسے یہ فخر حاصل ہے کہ مولانا ابوالکلام اور علامہ عمادی اپنے اپنے وقت میں اس کے عملۂ ادارت سے وابستہ رہے ہے - ہفتہ وار اور سہ روزہ اخبارات میں ملک بھر کے جرائد سے متانت لہجہ، اصابت رائے اور رفعت انداز میں ممتاز تھا - اخیر ایام میں مدت تک مولانا عبداللہ منہاس اس کے ادارتی فرائض انجام دیتے رہے - یہ اخبار اخبار نویسی کی مقدس روایات کا حامل تھا - اخبار تہذیب نسواں نے ذاتی وجوہ کی بنا پر اخبار شریف بی بی کی مدیرہ پر ناروا ذاتی حملہ شروع کیا تو سب سے پہلا یہ اخبار تھا جس نے مولوی سید ممتاز علی مرحوم مالک تہذیب نسواں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی -

دیش:- اس نام کا روزنامہ لالہ دینا ناتھ آنجہانی کی ملکیت و ادارت میں مدت تک جاری رہا - ہفتہ وار ہندوستان کی جگہ ہفتہ وار سماچار نے جو لالہ صاحب کی ادارت میں نکلا حاصل کی مگر ہندوستان کا سا فروغ حاصل نہ کر سکا -

بولٹین و کیسری:- یہ روزنامجات یکے بعد دیگرے لالہ شام لال کپور کی ایڈیٹری میں شائع ہوتے رہے - بولٹین میں ایڈیٹر کے قلم سے ایک مضمون شائع ہوا جس میں "نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی" کا مشہور محاورہ اس ترمیم کے ساتھ شائع ہوا کہ رادھا کی جگہ زلیخا کا نام تھا - اس وقت اخبارات میں فرقہ وارانہ جنگ چھڑی ہوئی تھی - مسلمانوں میں ایڈیٹر کی اس ترمیم کے خلاف بہت اشتعال پیدا ہوا - گورنر کو تار دئے گئے - لاہور کے برکت علی محمڈن ہال میں اخبار اور ایڈیٹر کے خلاف بہت بڑا احتجاجی جلسہ ہوا - اس پر حکومت نے بولٹین سے ایک ہزار روپے کی ضمانت طلب کر لی - ایڈیٹر کی معذرت پذیرانہ ہوئی - اخبار کیسری لالہ شام لال کپور کے ادارتی عروج کا نقیب تھا - بہت پھولا پھلا - دس ہزار سے زیادہ شائع ہوتا تھا -

لالہ شام لال کپور ذاتی طور پر بہت غیر متعصب ہیں اور ان کے مخلص احباب میں بہت سے مسلمان بھی شامل ہیں - لیکن جماعتی جنگ میں انہیں اخبار کو اپنی قوم میں مقبول بنانے کے لئے وہی حربے استعمال کرنے پڑے جو ایسے نازک وقت میں سرزمین اور تجربہ کار جرنیل غنیم کو زچ کرنے کے لئے استعمال کیا کرتا ہے - شام لال کے انداز تحریر میں شگفتگی اور زور ہے - دوسرے درجے کی رواں اردو بے تکان لکھتے ہیں - کسی اخبار کو کاروباری لائن پر کامیاب بنانے کی سمجھ بوجھ رکھتے ہیں - ہر فریقانہ جنگ میں ان کا اخبار راہ ترقی میں تیز گامی اور معاصرانہ مسابقت حاصل کرتا رہا -

سیاست:- روزنامۂ سیاست مولانا سید حبیب شاہ صاحب جلال پوری کی ایڈیٹری میں جاری ہوا - اس سے پہلے سید صاحب موصوف کلکتے سے روزنامہ رسالت جاری کرکے اسے مقبول بنا چکے تھے - وہاں جب حکومت نے ان کی تلخ نوائی پر سخت گیری اختیار کی تو انہوں نے پنجاب کا رخ کیا اور روزنامۂ رسالت کی قائم کردہ شہرت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لاہور سے روزنامۂ سیاست جاری کیا -

سیاست ہی ایک ایسا اخبار ہے جو زمیندار کی معاصرانہ جنگ میں اخیر دم تک ڈٹا رہا - زمیندار کی پہلی شکست کا سہرا سیاست ہی کے سر رہا - ظفر علیخاں کی معاصرانہ چشمک استعارات و تشبیہات کے نقاب زیر نقاب ایسی چٹخارے دار پھبتیوں میں ہوتی ہے کہ پبلک اخبار کے باقی مضامین سے پہلے اسی کو تفریح مطالعہ کے طور پر پڑھنا ضروری سمجھتی ہے، لیکن سید حبیب نے اس نقاب کو غیر ضروری خیال کرکے عریاں لعنت نگاری سے زمیندار کا مقابلہ کیا - ظفر علیخاں اس میدان کے مرد نہ تھے - ان کی ادیبانہ ہجو نگاری سیاست پر اثر انداز نہ ہو سکی - اور زمیندار نے سیاست کے مقابلے میں مستقل خاموشی اختیار کرکے اپنی شکست کا اعتراف کیا -

ظفر علیخاں نے اپنے فطری توہّب اقبال مرحوم کے مخالف تصوف خیالات اور جذبۂ ہنگامہ آرائی سے متاثر ہونے کے سبب خانقاہوں، سجادہ نشینوں اور تصوف کے خلاف علم جہاد بلند کیا اور اس اپج سے کارواں در کارواں مخالفین بنا لئے - سید حبیب نے ان مخالفین کی جماعتوں کو اخبار سیاست کا حامی بنا یا -

سیاسی اسٹیج پر ان دونوں اخبار نویسوں کی جنگ برابر کی چوٹ بنی رہی - اخبار پارس نے بھی سید حبیب کی پیروی میں ظفر علی سے ٹکر لی - پارس کے صفحات میں غیر معروف جرنلسٹ اور سری چند اختر کا ادیبانہ انداز جنگ سید حبیب کے حریفانہ ہتھکنڈوں سے بلند

اور شگفتہ تھا۔ ان کی پھبتیاں بھی اریجنل ہوتی تھیں۔ ظفر علی کے خلاف پارس کی نظموں میں البتہ ابتذال اور تیسرے درجے کی ظرافت کا رنگ نمایاں تھا۔ پارس ہفتہ وار ہونے کے باوجود اس جنگ میں ناکام نہیں رہا۔

انقلاب:۔ روزنامۂ انقلاب کی تشکیل زمیندار کے عملۂ ادارۃ و ادارۂ انتظام میں ایک کامیاب بغاوت سے وابستہ ہے۔

زمیندار کے عملۂ ادارۃ میں حضرت سالک بٹالوی اور مولینا غلام رسول مہر دو ذہین محنتی، کاردان رکن تھے۔ یہ دونوں ظفر علی اسکول کے ہونہار طالب علم کہے جا سکتے ہیں۔

سالک کو ظفر علیخاں پھول کے دفتر سے لے گئے۔ ان کی تربیت نے اسے کامیاب مترجم اور زمیندار کے لئے قابلِ برداشت اسسٹنٹ ایڈیٹر بنایا اور ان کی غلط بخشیوں نے اسے بر خود غلط بنا کر اپنے حریف غیر مخاطب کی حیثیت بخشی۔

سالک ایک ذہین قوم کا ذہین ترین ممبر ہے۔ اپنی محدود قابلیت کو غیر محدود انداز میں پیش کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اردو زبان کا درمیانہ درجے اور فارسی کا تیسرے درجے کا شاعر بھی ہے۔

اقبال کے کلام میں سے اقبال کی معجزانہ رنگینی، تغزل، جدتِ بیان، ندرت، تراکیب اور جزالتِ خیال کو منہا کر لیا جائے تو سالک کی نظم نگاری کا انداز نمایاں ہو جاتا ہے۔

سالک کی۔۔۔ قوت آخذہ کی خوبی یہ ہے کہ بچوں کے اخبار میں پرائمری کے طلبہ کے لئے مضامین لکھتے لکھتے زمیندار میں پہنچا تو ظفر علی خاں کے مخصوص اور مخترعہ الفاظ کے صحیح استعمال پر بہت جلد حاوی ہو گیا۔

مگر اقبال کی پیروی نے اس کی شاعری کو اور ظفر علیخاں کی اقتدار نے اس کی نثر کو بے کیف بنا دیا ہے۔ کیونکہ ظفر علی کی نثر اور اقبال کی شاعری ظفر علی اور اقبال ہی کے قلم سے نکلے تو پڑھنے والوں کے دل و دماغ پر بیخودی طاری کرنے کی طاقت رکھتی ہے۔ اس سے انیس ۱۹ بھی ہو تو عام نظم و نثر کا نمونہ بن جاتی ہے۔

سالک اسقدر ذہانت کا مالک ہے کہ اگر اپنا رنگ الگ قائم کرنے کی جرأت کرتا تو یہ جرأت کامیاب ہوتی۔ مگر غلط پیروی نے اس کے ذکر کو اردو ادب کی تاریخ کے لئے غیر ضروری بنا دیا ہے۔

اور اب وہ ظرافت کے نام پر صرف پھکڑ بازی کے لائق رہ گیا ہے۔ دوستوں کی مجلس میں اس کی بے تکلفانہ گفتگو اس کی نظم و نثر اور نام نہاد ظرافت نگاری سے کہیں زیادہ شگفتہ، دلکش اور ظریفانہ ہوتی ہے۔

مہر:۔ چودھری غلام رسول مہر بی۔ اے پر ایک علیحدہ نوٹ بشرطِ گنجائش اِسی نمبر میں کہیں درج کیا جائے گا۔

مہر اردو فارسی، عربی اور انگریزی میں درک وافر رکھتا ہے۔ اردو زبان کے اچھے شعراء میں شامل ہے۔ سلجھے ہوئے دماغ کا انسان ہے۔ اگرچہ اخبار نویسی میں ظفر علی اسکول کا طالب علم ہے۔ مگر اس کا اندازِ نگارش اپنا ہے۔ اس کی تحریر میں بلند درجے کی ادبیت اور اس کے طنزیات میں رفعت و متانت ہے۔ اس کے اسلوبِ بیان میں زور، جوش اور رنگ استدلال ہے۔ مقالہ نگاری میں صاحبِ طرز ہے۔ کسی مسئلے کے روشن اور ضروری پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کرتا۔ رطب و یابس، حشو و زوائد اور ابتذال سے اس کی تحریر عموماً منزہ ہوتی ہے۔

مدت تک زمیندار کی عنانِ ادارت مہر کے ہاتھ میں رہی اور اس کے عہد میں "افکار و حوادث" کے عنوان کے سوا زمیندار میں کوئی تحریر یہ ساقط الاعتبار اور عامیانہ انداز کی شائع نہیں ہوئی۔ مخالفت معاصرین کے لئے ایک شریف دشمن ہے کہ اس کی مخالفت میں چھچھورپن اور فسق و فجور نہیں ہوتا۔

ہمدرد دہلی:۔ رئیس الاحرار مولینا محمد علی مرحوم نے کامریڈ کو بند کرنے کے بعد دہلی سے اردو میں روزنامہ ہمدرد جاری کیا۔ اس کے عملۂ ادارت میں مولینا عبدالحلیم شرر لکھنوی شامل کئے گئے اور ظریفانہ کالم کے لئے مشہور ظرافت نگار مولوی محفوظ علی بدایونی کی خدمات حاصل کی گئیں۔ مولوی صاحب مرحوم اپنے عہد میں سب سے بلند رتبہ ظرافت نگار مانے جاتے تھے۔ ہمدرد کے ظریفانہ کالموں میں "حاجی لغلول" کے فرضی نام سے ان کے مضاحیہ مضامین شائع ہو کر قبولیت عامہ حاصل کرتے رہے۔

مولینا محمد علی مسائل حاضرہ میں سے جس مسئلے پر بھی قلم اٹھاتے تھے اپنے دامن دراز قسط در قسط مقالات سے اس مسئلے پر کسی دوسرے کے لئے کچھ لکھنے کی گنجائش نہیں چھوڑتے تھے۔ وہ بہت حد تک با اصول اخبار نویس تھے۔ چنانچہ شراب اور خفیہ امراض سے متعلق اشتہارات سے ہمدرد کے دامن کو انہوں نے آلودہ نہ ہونے دیا۔ پنجاب ہیکورٹ کے چیف جج نے ایک مقدمے کے دوران سماعت میں محمد علی کی غیر معمولی صحافتی

موقابلیت کا اعتراف اپنے ایک فیصلے میں کیا ہے۔ خواجہ حسن نظامی کو سرکاری جاسوس ثابت کرنے کے سلسلے میں مولینا محمد علی نے جو محاذِ جنگ قائم کیا دیدنی تھا۔ ایک جانب خواجہ [illegible] کے تمام اخبارات تھے۔ دوسری طرف محمد علی کا ہمدرد تنہا [illegible]

غزل

ایک دن چین سے بسر نہ ہوئی　　عمر سی عمر، عمر بھر نہ ہوئی
ہاتھ مل مل کر رہ گئی تقدیر　　کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی
اب کے صدمے جو عشق میں جھیلے　　ایسی تکلیف عمر بھر نہ ہوئی
دل میں دل کی طرح ہے درد ترا　　یہ امانت اِدھر اُدھر نہ ہوئی
خون بہتا رہا ہے آنکھوں سے　　آستیں کب لہو سے تر نہ ہوئی
ساتھ پیری میں سب نے چھوڑ دیا　　عمرِ رفتہ بھی ہمسفر نہ ہوئی
تجھ کو دیکھا تو دیکھتے نہ بنا　　چشم بینا ہوئی مگر نہ ہوئی
لے گئے دل وہ باتوں باتوں میں　　لُٹ گیا گھر مجھے خبر نہ ہوئی
لاکھ آنسو بہائے آنکھوں نے　　کم میری سوزشِ جگر نہ ہوئی
یہ بھی میرے نصیب کی ہے کجی　　کبھی سیدھی تری نظر نہ ہوئی
مل گئیں خاک میں تمنّائیں　　نگہِ لطفِ یار اِدھر نہ ہوئی
بے حمیّت ہے اور بے غیرت ہے　　آہ منت کشِ اثر نہ ہوئی
کون ہوں کیا ہوں، اور کیوں ہوں میں　　اس کی بھی مجھ کو خود خبر نہ ہوئی
سب پہ وہ مہرباں رہے، لیکن　　چشمِ رحمت کبھی اِدھر نہ ہوئی
خونِ دل سے بھی آبپاشی کی　　شاخِ اُمید بارور نہ ہوئی
آسماں بن گئی زمینِ مزار　　موت بھی اپنی چارہ گر نہ ہوئی
دل میں بیٹھی تھی جو نگاہ تری　　وہ نگہ پھر اِدھر اُدھر نہ ہوئی
وعدے کے بعد کارگر تدبیر　　ہونے والی تو تھی مگر نہ ہوئی

آئے ہیں میکدے میں پھر شاکر
کہیں حضرت کی جب بسر نہ ہوئی

(منشی پیارے لال شاکر میرٹھی)

سچی ستی

رام شنکر اور ان کی بیوی روپ کماری میں بڑی گہری محبت تھی۔ ان کی شادی ہوئے تین برس ہو چکے تھے۔ لیکن دونوں میں ایک روز کے لئے بھی جدائی نہ ہوئی تھی۔ روپ کماری کے میکے والے اسے بار بار لینے آتے لیکن وہ شوہر کو چھوڑ کر نہیں جا سکتی تھی، وہ جانتی تھی کہ یہ میرے بغیر ایک روز بھی سکون سے نہیں رہ سکتے۔

شام کا وقت تھا، روپ کماری بیٹھی کچھ سی رہی تھی کہ رام شنکر گھر میں آئے، چہرہ اُترا ہوا تھا، چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔ "سمجھ میں نہیں آتا زندگی کیسے گزرے گی۔ مہینوں دوڑتے ہو گیا، کہیں کام ہی نہیں ملتا۔ میں سچ کہہ رہا ہوں تمہیں اور نندو کو کام کرتے دیکھ کر مجھے جسقدر صدمہ ہوتا ہے بیان نہیں کر سکتا۔"

روپ کماری نے ہاتھ منہ دھونے کے لئے لوٹے میں پانی لا کر رکھ دیا۔ اور بولی "اس میں صدمے کی کون سی بات ہے آخر ہم لوگ دن بھر بیٹھے ہی تو رہتے ہیں۔ بیل بوٹے بنانا بھی کوئی کام ہے۔"

"میں بوٹے نہ بنتے ہوتے تو نہ جانے اب تک کیا حالت ہو گئی ہوتی۔ میں اسقدر بدقسمت ہوں کہ مجھ سے کسی کو آرام نہیں۔ بھلا میں اپنے کو آدمی کہہ سکتا ہوں۔ تمہارے سارے گہنے بیچ کر کھا گیا۔ اور ابھی تک مصیبت کا کہیں کنارہ نظر نہیں آتا۔ روزانہ کا خرچ تو تھا ہی۔ اس پر نندو کا گونا اور بھی "مرے پر سو درہ" ہو گیا، کچھ نہیں تو دو سو تو لگ ہی جائیں گے۔"

روپ کماری نے ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔ "منہ ہاتھ دھو کر کچھ ناشتہ تو کر لو۔ پھر افسوس کرنا بیٹھ کر۔ تمہاری نظر میں گہنے کی کچھ حقیقت ہو تو ہو میں تو انہیں کچھ نہیں سمجھتی۔ تم اچھی طرح رہو، میں اسی کو اپنی سب سے بڑی خوش قسمتی سمجھتی ہوں۔ نندو بہن کے گونے کے لئے کوئی فکر نہ کرو۔ میں سب کر لوں گی۔"

"ایک کنگن باقی ہے اسی کے سر یہ بلا جائے گی۔"

"صندوق میں پڑا ہوا ہے۔ اس سے فائدہ ہی کیا ہے۔"

"پیاری تم نے مجھ سے پیار کر کے مجھ کو نکما بنا دیا۔ اب میں اکیلا کہیں جا بھی نہیں سکتا۔ اگر شروع سے تم نے میری عادت نہ بگاڑی ہوتی تو آج یہ حالت نہ ہوتی۔ تم مجھے ڈانٹتی کیوں نہیں؟"

"جب مجھے کوئی تکلیف ہو تب تو کچھ کہوں، پیارے! اگر مجھے دنیا کی تمام دولت مل جائے، تو بھی میں اس کو تم پر نثار کر دوں گی۔ اگر ایشور "ویمان" لے کر آئیں اور مجھے سورگ میں چلنے کے لئے کہیں جب بھی میں تمہیں چھوڑ کر نہ جاؤں گی۔"

"تو ایشور سے کیا کہو گی۔"

"کہہ دوں گی میرے لئے یہی سورگ ہے۔ ہاں اگر تم سچے ایشور ہو تو میرے سوامی کو "امر" بنا دو۔ مجھے اور کچھ نہ چاہیئے۔"

(۲)

نندو رانی کا گونا ہو گیا۔ کئی مہینے گزر گئے۔ روپ کماری اب اکیلے ہی گھر کا تمام کام کرتی ہے۔ چوکا، برتن، جھاڑو، کھانا پکانا، یہ سارے کام اسی کے سر آ پڑے ہیں۔ اس کی ساس لیلا دیوی بہت چاہتی ہے کہ بہو کا ہاتھ بٹائے لیکن بہو اسے کسی کام میں ہاتھ نہیں لگانے دیتی۔ گھر کے کام سے جب فرصت ملتی ہے تو بیل بوٹے بناتی ہے۔ صبح سے لیکر گیارہ بجے رات تک اسے سر اٹھانے کی مہلت نہیں ملتی۔ لیکن وہ اس حال میں بھی خوش ہے۔ حقیقی خوشی کا چشمہ کہاں ہے، اسے وہ بخوبی سمجھتی ہے۔ ادھر مہینے بھر سے وہ ایک میز پوش بنا رہی تھی۔ آج اس کے پندرہ روپے ملے ہیں۔ ساس اور بہو میں جھگڑا ہو رہا ہے کہ کپڑے کی زیادہ ضرورت کس کو ہے۔ اس قسم کے جھگڑے آئے دن گھروں میں ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن ان جھگڑوں اور اس میں فرق صرف یہ ہے کہ ساس اپنی وکالت نہیں بلکہ بہو کی وکالت کر رہی ہے اور بہو ساس کی۔

روپ کماری بولی۔ "میری ساریاں تو ابھی کام کے لائق ہیں۔ اماں جی آپ ہی منگا لیں اور نندو رانی کو تیج بھی بھیج دیں، تیج کا جانا تو لازمی ہی ہے۔"

لیلا کو اپنے شوہر کا زمانہ یاد آ گیا۔ جس کے گھر پر پانچ نوکر تھے۔

گھوڑے تھے، گاڑیاں تھیں، مہینہ میں سینکڑوں روپے دان وغیرہ میں خرچ ہو جاتے تھے۔ آج اسی کے بچے روٹی کپڑے کے محتاج ہیں۔ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ "تمہاری قسمت ہی میں نہیں تھا بیٹی! نہیں تو کیا تمہارے سسر اتنی جلدی مر جاتے۔ یہ زمانے کی خوبی ہے کہ جس بہو کی آرزو لئے ہوئے وہ پرلوک سدھارے آج اس کا یہ حال؟"

روپ کماری بولی۔ "اماں میں آپ سے سچ کہتی ہوں، میں بھول کر بھی یہ خیال نہیں کرتی کہ مجھے تکلیف ہے، میں تو اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتی ہوں اور ایشور کو دھن باد کہتی ہوں۔ کہ آپ جیسی دیوی کے چرنوں کی سیوا کر رہی ہوں۔"

"بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ پیسے پیسے کے لئے ترسنا پڑتا ہے۔"

"کیا خوشی دولت پر موقوف ہے، اماں جی! میں تو کتنی ہی بہنوں کو دیکھتی ہوں جو دولتمند ہو کر بھی قسمت کو رویا کرتی ہیں۔ سکھ پریم ہی میں ہے۔ جہاں پریم نہیں وہاں سکھ کیسا؟"

اسی وقت رام شنکر آئے اور خوش خوش بولے — اماں مٹھائی کھلاؤ، مجھے پچاس روپے کی ایک جگہ مل گئی ہے۔ اور اسی ہفتے سیتا پور جا کر مجھے چارج لینا ہے۔"

طے کیا گیا پہلے رام شنکر سیتا پور جا کر مکان ٹھیک کر آئیں اور پھر سب کو سیتا پور لے چلیں۔ لیکن روپ کماری شوہر کی جدائی برداشت نہ کر سکتی تھی۔

لیلا نے کہا — "کیا کریگی ابھی سے جا کر۔ ابھی وہاں نئی گرہستی درست کرنے میں بہت وقت صرف ہوگا۔ سیتا پور کون دور ہے۔ رام شنکر ہر سنیچر کو آ سکتے ہیں۔"

روپ کماری سر جھکا کر بولی۔ میں کیا کروں اماں؟ اکیلے ایک روز بھی میرا جی نہ لگے گا۔ مجھے تو یہی دو تین دن پہاڑ معلوم ہو رہے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ بھی کبھی اکیلے نہیں رہے، کیا کھائیں گے؟ کیسے رہینگے؟ نہیں اماں جی وہاں مکان ٹھیک ہوتے ہی چلی چلئے۔"

ایک منٹ ٹھہر کر بولی۔ "اب نند و رانی کو جلدی سے بلا لیجئے گا۔"

لیلا نے مخالفت کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں اور کیا اب تو سارے محلے کو دعوت دوں گی۔"

"نہیں اماں انہیں گئے کئی مہینے ہو گئے۔ ان کا جی گھبراتا ہوگا۔"

"ابھی اُسے بلانے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

پھر دونوں آئندہ کے خواب دیکھنے لگیں۔

مہری رکھنے کی تو کوئی ایسی ضرورت ہے نہیں، گھر میں ایسا کام ہی کون سا ہے۔ مکان ہوادار ہونا چاہیئے۔ کبھی کبھی وہاں شہر سے باہر چلے جایا کریں گے۔ اور کسی درخت کے نیچے کھانا پکا کر کھائیں گے۔ روپ کماری محلے کی غریب عورتوں کے کپڑے سل دیا کرے گی۔

لیلا دیوی نے کہا — "سب سے پہلے مجھے تیرے لئے دو ایک چیزیں بنوانی ہیں، چھاگل تک تو ہاتھ میں نہیں رہا۔"

"آپ کے پاس اننت نہیں ہے پچاس روپیہ میں اننت بن جائے گا۔"

"رہنے دے مجھے اننت کا کوئی ایسا شوق نہیں ہے، تیرا بوچا بوچا ہاتھ مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا۔"

من کی مٹھائی میں وہ رس اور مزہ ہے کہ جتنا ہی کھاؤ اس سے جی نہیں اوبتا۔ ہماری تمام عمر اسی کے مزہ میں گزر جاتی ہے۔ یہاں تک کہ مرتے وقت بھی ہماری آرزو باقی ہی رہتی ہے۔ دونوں دیویاں وہی مٹھائی کھا رہی تھیں۔

(۳)

تیسرے روز رام شنکر چلنے کے لئے تیار ہوئے۔ روپ کماری رات ہی سے رو رہی تھی۔ چلتے وقت بولی — "نہ جانے کب تمہیں گھر ملے اور کب تم آؤ۔ یہاں تو ایک دن بھی شاق معلوم ہو رہا ہے؟"

رام شنکر نے افسردہ لہجہ میں کہا۔ "وہی حال تو میرا بھی ہے۔ مگر کیا کروں چوتھے روز ضرور آ جاؤں گا۔ مجھے ایک منٹ بھی تمہاری یاد نہ بھولے گی۔"

"آپ تو کام میں لگ جائیں گے۔ مجھے البتہ دن کاٹنا مشکل ہو جائے گا۔"

روپ کماری کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ رام شنکر کا دل بیٹھا جاتا تھا۔ ان کی آنکھیں بھی اشک آلود ہو گئیں۔ بیوی کو گلے لگا کر کہا۔ "کیا کروں پیاری! اگر تمہیں لیتا چلوں تو ماں خیال کریں گی بیوی کو چھوڑ کر وہ ایک روز بھی نہیں رہ سکتا۔ میرا پہلا کام مکان ٹھیک کرنا ہوگا، میں چوتھے روز ضرور آ جاؤں گا۔"

لیلا نے پکارا۔ "بیٹا! یکہ والا جلدی کر رہا ہے، کہتا ہے گاڑی چھوٹ جائے گی۔"

رام شنکر نے کہا۔ "اچھا ابھی آتا ہوں۔"

پھر بیوی سے بولے — "پیاری مجھے خوش خوش رخصت کرو۔"

روپ کماری نے شوہر کے پیروں پر سر رکھ دیا اور انہیں آنسوؤں سے دھوتی ہوئی بولی۔ "پیارے میری جان آپ کے ساتھ جا رہی ہے صرف میرا جسم یہاں رہے گا۔"

رام شنکر نے جوشِ محبت میں روپ کماری کو زور سے سینہ سے لگا لیا اور بولے۔ "جی تو چاہتا ہے تمہیں کلیجے میں رکھ لوں (منہ چوم کر) روؤ نہیں پیاری۔"

لیلا نے پھر پکارا۔ "دیر نہ کرو بیٹا اب وقت نہیں ہے۔"

رام شنکر نے کہا۔ ذرا پانی دیدو پیاری۔ نہیں تو اماں کہینگی دیوانہ ہو گیا ہے۔

روپ کماری نے لوٹے میں پانی رکھتے ہوئے کہا "کہنے دو۔ میں تو سچ مچ پاگل ہو گئی ہوں۔ تمام جسم سن سن کر رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ میں غرق ہوئی جا رہی ہوں۔ جو سکھ پاگل ہونے میں ہے وہ ہوش میں کہاں۔"

رام شنکر نے منہ دھویا۔ پان لیا۔ روپ کماری کو پھر گلے لگایا اور باہر چلے گئے۔

(۴)

رام شنکر نے چارج لینے کے بعد بڑے بابو سے مکان کے لئے...... کہا۔ چھوٹے شہروں میں مکان مشکل سے ملتے ہیں۔ رہنے والے کم ہوتے ہیں۔ تو مکان بنوانے والے اور بھی کم ہوتے ہیں۔ بڑے بابو رام شنکر سے واقف تھے۔ کہا "ابھی اتنی جلدی کیا ہے۔ آج میرے گھر رہو۔ کل آرام سے مکان تلاش کریں گے۔ آپ کی بیوی جی بھی گھر پر اکیلی نہیں ہیں۔ آپ کی والدہ تو ضرور ہی ہوں گی۔"

رام شنکر نے سادگی سے کہا۔ "ہاں اماں تو ہیں۔ لیکن بیوی صاحبہ گھبرا رہی ہوں گی۔"

درحقیقت رام شنکر خود بےچین تھے، لیکن ایک دوست سے اپنی بےچینی کا کیسے اظہار کرتے؟ ضبط و تحمل میں بٹہ لگتا تھا۔

بڑے بابو نے مذاق کیا۔ "یہ کیوں نہیں کہتے کہ میں ہی گھبرا رہا ہوں۔ ٹھیک ہی ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ بیوی ساتھ نہ ہو، اکیلے کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔"

رام شنکر نے شرمندہ ہو کر کہا۔ "بھئی میرا تو یہی خیال ہے۔ آپ کی نہیں کہتا۔ میں ان کا رونا یاد کرتا ہوں تو مجھے تعجب ہوتا ہے کہ میں انہیں روتا چھوڑ کر کیسے چلا آیا، اماں جی نہ ہوتیں تو میں اکیلے کبھی نہ آتا۔"

"چلو کھانا تو کھا لو۔ آپ کی بیوی صاحبہ میرے سامنے آئیں گی یا مفت کی بیگار ہی رہے گی۔"

دوسرے دن دونوں مکان دیکھنے چلے۔ نہ جانے مکان بنانے والے کیا سمجھ کر مکان بناتے ہیں، اس میں آدمی رہیں گے یا جانور؟ کسی میں مودی خانہ ہے تو رسوئی خانہ نہیں۔ کسی میں آنگن چھوٹا ہے۔ کوئی ہوادار نہیں ہے۔ کسی میں نہانے کی جگہ نہیں ہے۔

بمشکل تمام گلیوں کی خاک چھاننے کے بعد ایک مکان ٹھیک کیا گیا۔ تو یہ بھی بےڈھنگا۔ کھلی چھت کہیں نہ تھی۔ مگر چھجا ذرا چوڑا تھا۔ رام شنکر نے سوچا چک کا پردہ کر کے اسی سے کھلی چھت کا کام لیں گے۔

بڑے بابو بولے "تو بس کل اس کی صفائی ہو جائے۔ اور آپ جا کر بلا لائیے۔"

رام شنکر نے کہا "میں تو رات کو اسی گھر میں رہوں گا"

"جاؤ گے تو کل رات کو یہاں اکیلے پڑے کیا کرو گے شام ہو ہی گئی ہے۔"

"کچھ صفائی کروں گا۔ نوکرانی ڈھونڈوں گا۔ اور چھجے پر پردے کا انتظام کرنا ہو گا۔ دو ایک گھڑے۔ چولھا۔ دو ایک چارپائی سب کچھ تو جمع کرنا ہے۔"

"تو یہ کہو کہ بیوی کے بغیر تم ایک روز بھی نہیں رہ سکتے۔"

"ہاں صاحب وہ آج ہی سے راہ دیکھ رہی ہوں گی۔"

"تمہارا سامان بھجوا دوں۔"

"واہ نیکی اور پوچھ پاچھ۔"

(۵)

بڑے بابو چلے گئے تو رام شنکر ایک جھاڑو لائے اور مکان کی صفائی شروع کر دی۔ سب سے اچھا کمرہ جو چھجے پر تھا، وہ روپ کماری کے لئے رکھا۔ روپے ہاتھ آتے ہی وہ اس کمرے کو ہرے رنگ سے رنگوا دیں گے۔ کون بڑا خرچ ہے۔

تصویریں لائیں گے۔ روپا کو "کرشن کی راس لیلا" والی تصویر بہت پسند ہے۔ "رام کا بن باس" بھی لائیں گے "شکنتلا پریم لیکھن"

کہ وہ کسقدر پسند کرتی ہیں وہ بھی لائیں گے۔ کچھ پُرانے کپڑے ضرور ہونگے اُنہیں گلابی رنگ میں رنگوا کر پردے کا کام لیں گے۔ ایک سفید "جاجم" کی ضرورت ہوگی۔ اُس مہینے میں "جاجم" بھی بنوا لیں گے۔ گھر میں چار پائیاں ہیں، نیلوں لیتے آئیں گے۔ مگر سب سے ضروری چیز چک ہے۔ آخر روپا چھجے پر کھڑی کیسے ہوگی وہ اسی وقت چکیں لائے۔ سوچا اس وقت لگالیں۔ کل سویرے چکیں لگا کر آٹھ بجے کی گاڑی سے چل دیں گے۔ کھانے کی کچھ ایسی خواہش نہ تھی اس خوشی میں بھوک بھی نہ لگی، اتنے میں بڑے بابو کا آدمی ان کا سامان لیکر آگیا۔ گرم گرم پوریاں بھی لایا تھا۔ رام شنکر نے تھالی لے کر رکھ لی اور صاف ستھری زمین پر کمبل بچھا کر لیٹے کہ ذرا کمر سیدھی کرلیں تو کھائیں۔

دن بھر کے تھکے تو تھے ہی کمبل پر لیٹے تو نیند آگئی۔ کمرے میں چراغ جل رہا تھا۔ تھالی سامنے رکھی ہوئی تھی، لوٹا گلاس بھی تھالی کے پاس ہی رکھا ہوا تھا۔ لیکن اس خوشی میں پیٹ بھرا ہوا تھا۔ دل میں اتنا اشتیاق تھا کہ نہ پوچھو، خواب میں بھی روپا ہی کو دیکھ رہا تھا۔ جیسے وہ گھر گئے ہیں اور روپا چلنے کی تیاری کر رہی ہے۔

نہ جانے کب ان کی نیند کھلی چراغ جل رہا تھا، لیکن بھوک اب بھی نہ تھی۔ سوچنے لگے سویرے چک لگانے لگوں گا۔ تو شاید دیر ہوجائے پھر گاڑی نہ ملے، کیوں نہ اسی وقت لگا دوں۔ چھجے کے کھمبوں میں ایک ایک کیل گاڑ کر چک لٹکا دوں۔

آدھی رات ہوگئی تھی، چاروں طرف سناٹا تھا، باہر چاندنی چھٹکی ہوئی ہے۔ رام شنکر نے ایک کیل اُٹھائی اور اینٹ کے ٹکڑے سے اسے ٹھوکنے کے لئے کارنس پر ایک پاؤں رکھا۔ لیکن ہائے کارنس پاؤں رکھتے ہی نیچے آرہا۔ اور اس کے ساتھ رام شنکر بھی نیچے آگرے۔ اور گرتے ہی بیہوش ہوگئے۔ نیچے سڑک تھی۔ سر پھٹ گیا۔ منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ دھماکا ہوا ہوگا، لیکن اس سناٹے میں وہ آواز بھی کسی نے نہ سنی۔ صبح جھاڑو دینے والے مہتر نے دیکھا تو چلایا "یہ کون مرا پڑا ہے۔" دم بھر میں سارا محلہ جمع ہوگیا۔

(۶)

روپ کماری دو دن تک بیہوش سی پڑی رہی۔ نہ ہنسنا نہ بولنا نہ کھانا پینا۔ بس یہی دل چاہتا تھا کہ کیسے شوہر کے پاس پہنچ جاؤں۔ نہ جانے کیوں اسے بار بار رونا آتا تھا۔ سفر کی تیاری کرنی تھی۔ لیکن اسے رونے کی فرصت نہ ملتی تھی۔ کئی بار دھوکا ہوا کہ رام شنکر آ گئے۔ دوڑ کر دروازے تک گئی وہاں سے نا امید لوٹ آئی۔ پھر دل کو سمجھایا گھبرانے کی کونسی بات ہے، وہاں پہنچے ہوں گے۔ پہلے روز تو موقع ہی نہ ملا ہوگا۔ دوسرے روز مکان دیکھنے گئے ہوں گے۔ کل آئیں گے۔ لیکن اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہیں گئے مہینوں ہو گئے۔ صبح وہ ان کے لئے ناشتہ لا کر رکھ دیتی تھی۔ وہ منہ ہاتھ دھو کر آتے تھے اور ناشتہ کرتے تھے۔ پھر وہ محبت سے کھانا پکاتی تھی اور انہیں بلا کر پریم کے ساتھ کھانا کھلاتی تھی۔ اب کیا تھا۔ کھانے پکانے میں کوئی مزہ نہیں۔ کسی بات میں ذرا بھی دلچسپی نہیں۔ وہ ایک بار جھنجھلائی بھی کہ وہ کیوں مجھے کوئی بات نہیں کہتے۔ کیوں نہیں ڈانٹتے۔ اگر اسقدر محبت نہ بڑھاتے تو آج یہ حالت کیسے ہوتی؟ اسے وہ واقعہ یاد آیا جب اس نے ان کی نظموں کی کاپی پر تیل گرا دیا تھا وہ کسقدر ڈر رہی تھی۔ کہ ضرور ناراض ہوں گے۔ لیکن انہوں نے اس کے بدلے اسے گلے لگا لیا اور کہا۔ پیاری میں تمہیں بہت سخت سزا دوں گا۔ اور وہ سزا کیا تھی۔ بوسہ۔ اس بوسے کا مزہ وہ اب تک نہ بھولی تھی۔ تیسرے روز سویرے ہی سے وہ گھڑیاں باندھنے لگی۔ آج وہ ضرور آتے ہوں گے۔ برتن وغیرہ صاف کرکے رکھے، کپڑے تہ کرکے صندوقوں میں بند کئے۔ اس کے بعد پوریاں پکانے لگی۔ وہ آئیں گے تو کھانے کی کیسے سوجھے گی۔ سیتا پور ہی میں چل کر وہ کھانا کھائے گی۔ کھانا پکانے کے بعد اس نے نہایا۔ بال سنوارے۔ ایک ریشمی ساری نکال کر پہنی۔ مگر ابھی تک رام شنکر نہیں آئے۔ گاڑی کا تو وقت ہوگیا۔ گیارہ بج گئے۔

یکایک کسی کی آہٹ پاکر وہ چونکی۔ آگئے۔ فوراً آئینہ اٹھا کر رکھ دیا اور آنگن میں آکھڑی ہوئی۔ ارے یہ تو پڑوسن بنئے کا لڑکا ہے۔

لیلا نے پوچھا۔ کیا ہے بیٹی؟

لڑکے سے معلوم ہوا کہ سیتا پور سے انہیں لینے کے ایک آدمی آیا ہے۔ لیلا نے اسے اندر بلایا۔ یہ اس کی نند کا لڑکا تھا جو سیتا پور میں کپڑے کی دکان کرتا تھا۔ اس کا نام راج ناتھ تھا۔ اندر جانے کی اس کو ہمت نہ ہوتی تھی کہ سوالوں کا کیا جواب دیگا۔

لیلا نے پوچھا۔ وہ کیوں نہیں آئے؟

راج ناتھ نے سر جھکا کر کہا۔ کام کرنے میں پھنسے تھے۔ مجھ سے کہا تم جا کر لے آؤ۔

"مکان ٹھیک ہوگیا؟"

"ہاں"

"تو گاڑی کب جاتی ہے؟"

"ایک گاڑی تو تین بجے جاتی ہے دوسری سات بجے۔ اسی گاڑی سے چلیئے۔"

"اتنی جلدی کیسے سامان ہو جائے گا بیٹا؟"

"میں تانگہ لیتا آیا ہوں آپ لوگ بیٹھ کر چلیں۔ اسباب پیچھے سے بھیّا آکر لے جائیں گے۔"

"ارے کھانا تو کھا لو بھیا؟"

"نہیں ماما جی! مجھے بڑی جلدی ہے۔"

"بھیّا اچھی طرح ہے نا؟"

راج ناتھ نے کوئی جواب نہ دیا، ماں نے سنا ہی نہیں۔ کوئی خوشی کی بات ہو تو ہم سب اس کے سننے کے خواہشمند ہوتے۔ تکلیف کی بات تو کہتے ہوئے جی کانپتا ہے۔ ایشور یہ تمہارا کیا کھیل ہے۔ بچوں کے کھلونے ٹوٹ جاتے ہیں تو وہ روتے ہیں، لیکن آپ جن کھلونوں کو بناتے ہیں، انہیں کو توڑ ڈالتے ہیں، کیا تمہیں ذرا بھی تکلیف نہیں ہوتی تمہیں ہم کیا کہیں کھلاڑی یا دیوانہ؟

آدھ گھنٹے کے بعد سب سامان درست ہوگیا۔ اور سب تانگے پر بیٹھ کر اسٹیشن کی طرف چلے۔

(۷)

دونوں عورتوں نے سیتا پور پہنچ کر جب اس بدقسمت گھر میں قدم رکھا تو شام ہوگئی تھی، محلے کے کئی آدمی آنگن میں لاش کے پاس بیٹھے تھے۔ عورتوں کے پہنچتے ہی رونے کی بہت سی آوازوں نے ان کا استقبال کیا۔ روپ کماری بہت خوش تھی، شوہر کو الاہنا دونگی کہ ایک روز کا وعدہ کرکے گئے۔ تین روز لگا دیئے اس پر بھی آپ نہ گئے۔ دوسرے کو بھیج دیا، گھر میں قدم رکھتے ہی جب رونے کی آواز سنی تو جیسے اسے چکر آگیا۔ گھبرائی ہوئی نظروں سے آنگن کی طرف دیکھا اور دوڑ کر شوہر سے لپٹ گئی۔ لیلا سینہ پیٹنے لگی اور ہائے کرکے بولی۔ "ہائے ایشور؟ یہ مجھے کس پاپ کا تو نے بدلہ دیا۔"

یکایک روپ کماری نے تیج بھرے چہرے سے کہا۔ "دیکھتی ہو اماں یہ ان کی بے مروتی، میں انہیں چھوڑ کر ایک دن کے لئے بھی کہیں نہیں گئی اور یہ مجھ کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر چلے گئے۔ ہائے میں کیا جانتی تھی کہ یہ مجھے دغا دیئے جا رہے ہیں، نہیں تو میں ساتھ ہی آتی۔ بتاؤ اماں؟ میں نے ان کے ساتھ کیا برائی کی؟ میں نے انہیں جھوٹ کو بھی کچھ نہیں کہا۔ پھر یہ مجھ سے کیوں روٹھ گئے؟"

اس نے زور سے سینہ پیٹ لیا اور ایک منٹ تک جیسے بیہوش سی پڑی رہی، پھر اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا۔ اس کے چہرے سے جوش و خروش ظاہر ہو رہا تھا۔ وہ کہنے لگی "تو اماں میں بھی انہیں نہ جانے دوں گی مجھے وہ دغا دیکر نہیں جا سکتے۔ کہاں جائیں گے مجھ سے بھاگ کر، میں دیکھتی ہوں کیسے بھاگتے ہو، بھاگو تم، سوامی! میں تمہارے پیروں پڑتی ہوں، مجھے بھی ساتھ لے چلو۔ مجھے یہاں کس پر چھوڑے جاتے ہو؟ کس لئے؟ ہائے اب میں رہ کر کیا کروں گی؟"

لیلا اس کے آگے اپنا صدمہ بھول گئی۔ روپا سے کبھی اسے اسقدر محبت نہ ہوئی تھی۔ ابھی تک اس کا روپا سے بہو کا تعلق تھا۔ اس تعلق کا سبب اس کا بیٹا تھا! اب وہ تعلق اندوہ و غم کا تھا جس چوٹ سے وہ زخمی بیٹھی ہوئی تھی۔ اسی چوٹ سے روپا بھی مجروح ہو رہی تھی۔ لیلا نے بہو کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"بیٹی اپنے کو سنبھال، صبر کر، مجھے دیکھ جس کے شوہر اور بیٹے دونوں موت کی بھینٹ ہو گئے۔"

روپا بولی۔ "میں تمہاری جیسی کلیجے والی نہیں ہوں۔ میں تم سے بھی کہتی ہوں خوب رو لو۔ ورنہ کلیجے میں ناسور پڑ جائیں گے۔ بیٹے کے پیدا ہونے پر خوشی منائی تھی، مرنے پر خوب رو لو، آج بیٹے سے رشتہ ٹوٹتا ہے۔ آج سے تم بغیر بیٹے کے ہو جاؤ گی۔ میں نہیں روؤنگی، انہوں نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ میری زندگی کے ٹھیکیدار بنے تھے۔ مجھے ان سے دریافت کرنا ہے، اب مجھ کو کس پر چھوڑے جاتے ہو، میرے بغیر ایک دن بھی تم سے نہیں رہا جاتا تھا۔ اب کیسے رہ ہو گے کیا اس تمام محبت کا یہی نتیجہ ہے۔"

بڑے بابو نے آکر کہا۔ "دیوی! تم الگ ہو جاؤ۔ تو ہم لاش کو باہر لیجائیں۔ بڑی دیر ہو رہی ہے۔"

روپ کماری لاش سے لپٹ کر بولی۔ "کیوں دوں، نہیں دیتی، میرے ماں باپ نے انہیں مجھ کو دیا تھا اور کہا تھا ان کے ساتھ اپنی زندگی گذارنا اور تم انہیں مجھ سے مانگتے ہو، ہٹ جاؤ۔ میرے سامنے سے۔"

دیوی کی گریہ و زاری سن کر بڑے بابو رونے لگے۔ بولے۔

"ہُو میں نے بہت آدمی دیکھے لیکن ایسا پریمی نہیں دیکھا، برابر تمہارے ہی نام کی رٹ تھی۔ تمہارے ہی لئے مجھے پر چک مانگتے گئے تھے۔ کارنس ٹوٹ گیا۔"

روپا نے بڑے بابو کی طرف اشک آلود نظروں سے دیکھ کر کہا۔

"بابوجی! یہ میرے نام کی پوجا کرتے گئے ہیں، تو میں بھی ان کا نام جپتے جپتے مر جاؤں گی۔ آپ دونوں ارتھیاں ساتھ ہی اٹھا لیجے گا۔"

اس نے شوہر کے قدموں پر سر رکھ کر کہا۔ "ہائے سوامی! مجھے کیوں چھوڑے جا رہے ہو؟ مجھے بھی ساتھ لے چلئے۔"

اس نے ایک منٹ کے لئے شوہر کے سینہ پر سر رکھ دیا اور خاموش ہو گئی۔

لوگوں نے دیکھا تو اس کا چہرہ کنول کی مانند کھلا تھا اور کندن کی طرح دمک رہا تھا۔ ایک بار گھر میں شور ہوا اور چراغ جلتے جلتے دونوں ارتھیاں ساتھ ہی نکلیں۔

تمام لوگ رو رہے تھے، لیلا نے رو کر کہا "ہائے لیلا! تم ہی سچی ستی ہو۔"

شورانی دیوی (اہلیہ منشی پریم چند)

بادۂ شیراز

این فرصتِ ہستی است کہ شمعِ سرِ راہے　　حیف است بر آناں کہ نہ کردند گناہے

در میکدۂ عشق تمنا بفروشند　　پیمانہ بہ پیمانہ، نگاہے بہ نگاہے

عشق است بہ ہر لحظہ طلبگارِ تمنا　　در انجمنِ شوق، کجا فرصتِ آہے

در فکرِ تو بیگانہ گذشتیم ز عالم　　ہر چند کہ ہر ذرّہ طلب کرد نگاہے

عالم ہمہ لبریزِ تمنائے تماشا　　بے عشقِ تو در دہر سپیدے نہ سیاہے

در صومعہ افشاں نتواں شد ز ریاضت　　کاں راز بہ میخانہ عیاں کرد نگاہے

خواہی کہ شود منظرِ فردوس میسّر　　دریاب بہ نظارہ، لبِ جوئے شبِ ماہے

اے دیدۂ بے تاب ادب کن، ادب آموز　　در جلوہ گہِ یار گناہ است نگاہے

دیروز سرِ راہِ چمن یک بتِ اوزنگ　　خندید بصد غمزہ و کج کرد کلاہے

گفتم کہ چرا خندہ کنی از رہِ مستی　ق　گفتا، کہ ایں عالم ہمہ مستی و گناہے

ماہر نفروشم بہ تمنائے دو عالم
آں دولتِ دیدار کہ یابم سرِ راہے

ماہر القادری

تنویرات

برقی آنکھ

"برقی آنکھ" ایک آلۂ برق ہے جسے "فوٹو الیکٹرک سیل" بھی کہتے ہیں، جس طرح ہماری آنکھوں پر روشنی پڑنے سے دُنیا کی طرح طرح کی چیزیں دکھائی دینے لگتی ہیں۔ اسی طرح بجلی کے اس چھوٹے سے آلہ پہ روشنی پڑنے سے انواع واقسام کے کام ہونے لگتے ہیں۔ اس پر تھوڑی سی روشنی ڈال دیجئے یا تھوڑی سی روشنی ہٹا دیجئے۔ پھر دیکھئے اس کی کرامت اور تجربہ کاری۔

یہ مختصر سا آلہ برقی لیمپ یا یوں کہئے کہ وائرلیس کے لیمپ کی صورت کا ہوتا ہے، اس لیمپ کے اندر کی تمام ہوا نکال لی جاتی ہے، اور شیشے کے اندرونی حصے میں آئینے کی طرح پالش کر کے تھوڑا سا پوٹاشیم لگا دیتے ہیں۔ بعد ازاں لیمپ کے دونوں کناروں پہ دھات کے تار لگا کر اسے بند کر دیتے ہیں۔

اس آلہ کا وصف یہ ہے کہ اگر اس کے تاروں کے سرے کسی بیٹری سے جوڑ دئے جائیں اور اس آلہ کو اندھیرے میں رکھدیا جائے تو اس میں بجلی کی رو نہ ہوگی۔ لیکن اگر اس پہ روشنی ڈال دی جائے تو اس میں برقی رو پیدا ہو جائے گی۔ اس پہ روشنی پڑتے ہی اس کے اندر کا پوٹاشیم باریک باریک ذرات میں تبدیل ہو کر لیمپ کے دونوں سروں کو جوڑ دیتا ہے۔ جس سے بجلی کی رو پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اپنا کام کرنے لگتی ہے۔ اسی طرح اگر اس آلہ پہ کسی چیز کا سایہ پڑے اور روشنی ہٹ جائے تو بجلی کا راستہ درہم وبرہم ہو جاتا ہے۔ جس سے برقی رو موقوف ہو جاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ آلہ اپنا کام بند کر دیتا ہے۔

جو لوگ لندن جا چکے ہیں انہوں نے ساؤتھ کینسنگٹن کے عجائب خانے میں دیکھا ہوگا کہ ایک گلی میں ایک دروازہ ہے جس کے قریب جانے سے وہ خود بخود کھل جاتا ہے اور جب آدمی اندر چلا جاتا ہے تو وہ آپ ہی آپ بند بھی ہو جاتا ہے۔ اس دروازے کے باہر کے راستے میں سورج کی شعاعیں پڑتی ہیں اور ان شعاعوں کے سامنے "فوٹو الیکٹرک سیل" لگا ہوا ہے۔ اس آلہ پہ جب تک روشنی پڑتی رہتی ہے بجلی کی لہروں کا دورہ ہوتا رہتا ہے اور بجلی اپنی طاقت سے دروازے کو بند رکھتی ہے۔ لیکن جیسے ہی کوئی شخص سامنے آجاتا ہے اور اس کا سایہ ان شعاعوں کو کاٹ دیتا ہے۔ بجلی کی لہروں کا دورہ موقوف ہو جاتا ہے اور دروازے کا پیچ اسے اپنی قوت سے کھول دیتا ہے۔

کچھ عرصہ ہوا۔ پیرس میں نمائش ہوئی تھی جس میں ایران کے بیش قیمت جواہرات رکھے گئے تھے۔ ان جواہرات کی حفاظت کرنے کے لئے جواہرات کے سامنے "آلۂ چشم برق" لگا دیا گیا تھا۔ جس کے ساتھ بجلی کی گھنٹی بھی تھی۔ جیسے ہی کسی شخص کا ہاتھ جواہرات کے قریب آتا اور ہاتھ کا عکس "آلۂ چشم برق" کی شعاعوں کے سامنے پڑتا ہے۔ بجلی کا دورہ موقوف ہو جاتا اور گھنٹی میں بجلی دوڑنے لگتی۔ جس سے گھنٹی بجنا شروع ہو جاتی۔ اس طرح جواہرات کے محافظ ہوشیار ہو جاتے۔ اور کسی کو جرأت نہ ہوتی کہ جواہرات پر ہاتھ ڈال سکے۔

اسی طرح بڑے بڑے بینکوں کی تجوریوں کے سامنے آتے ہی گھنٹی بجنے لگتی ہے۔ اور چوکیدار ہوشیار ہو کر چور کو گرفتار کر لیتا ہے۔ اس آلہ پہ ایسی روشنی بھی ڈالی جا سکتی ہے جسے انسانی آنکھیں دیکھ نہ سکیں اور چور کو پتہ نہ چل سکے کہ اس کی گرفتاری کے لئے کوئی کارروائی کی گئی ہے اور اول اس "فوٹو الیکٹرک سیل" کا استعمال لندن کی ایک بجلی کی کمپنی نے سڑکوں پر بجلی کے لیمپوں کے جلانے کے سلسلے میں کیا تھا، جیسے ہی سڑکوں پہ اندھیرا ہونے لگتا۔ اس آلہ کے ذریعہ سیورچ بند ہو جاتی اور تمام لیمپ جل جاتے۔ اس آلہ کے استعمال سے ایک خاص فائدہ یہ ہوتا کہ بادل یا کہر کے باعث دن میں جب بھی اندھیرا ہو جاتا ہے بجلی جل اٹھتی ہے اور روشنی ہو جاتی ہے۔

فوٹو الیکٹرک سیل کا سب سے زیادہ استعمال فوٹو کے کیمرہ کے ذریعہ فوٹو لینے وقت ہوتا ہے۔ ہماری نگاہ کو صحیح پتہ نہیں چلتا۔ کہ عمدہ فوٹو لینے کے لئے کتنی روشنی کی ضرورت ہے۔ اس لئے اس آلہ کو کیمرہ کے روشنی کھولنے اور بند کرنے کے دروازے سے لگا دیتے ہیں۔ وہ آلہ اتنی ہی روشنی آنے پہ دروازے کو کھولتا ہے جتنی روشنی کی اچھے فوٹو کے لئے ضرورت ہوتی ہے۔

کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی انگلیاں اکثر مشینوں سے کٹ جایا کرتی ہیں۔ ان نقصانات و تکالیف سے مزدوروں کو بچانے کے لئے یورپ کے کارخانوں میں اس آلہ کا استعمال ہونے لگا ہے، ہاتھ یا دوسرے اعضاء کے مشین کے پاس جاتے ہی گھنٹیاں بجنے لگتی ہیں اور آدمی ہوشیار ہو جاتا ہے۔

نیویارک میں دریائے ہڈسن کے نیچے اور انگلستان میں دریائے ٹیمس کے نیچے موٹر گاڑیوں کے لئے لمبی لمبی سرنگیں بنی ہوئی ہیں۔ ان کے منہ پر ایک خاص بلندی پر "آلہ فوٹو الیکٹرک سیل" نصب کر دئے گئے ہیں۔ جب کوئی ایسی موٹر گاڑی آتی ہے جس کی اونچائی سرنگ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اور موٹر کے سرنگ سے ٹکرا کر ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے تو اس وقت یہی آلہ موٹر کو تباہی سے بچاتا ہے، موٹر سرنگ کے پاس پہنچتی ہے تو اس کا عکس روشنی کے سلسلے کو منقطع کر دیتا ہے جس سے بجلی کی رو بند ہو جاتی ہے اور گھنٹی بجنے لگتی ہے، اس طرح متنبہ ہو کر ڈرائیور موٹر واپس کر لیتا ہے۔

جہازوں کے تہ خانے اتنے گہرے اور تاریک ہوتے ہیں۔ کہ ان میں آگ لگنے کے بعد دیر تک آتشزدگی کا پتہ نہیں چلتا اور پتہ چلنے تک بہت کچھ نقصان ہو چکا ہوتا ہے اور بعض اوقات تو جہاز تباہ ہی ہو جاتا ہے، اس تہ خانے کی چھت پر ہوا جانے کے نل میں آلہ فوٹو الیکٹرک سیل نصب کر دیتے ہیں۔ جب جہاز میں آگ لگتی ہے اور جہاز والے آتشزدگی سے مطلع ہو کر آگ بجھا دیتے ہیں۔

کارخانوں کی چمنیوں سے جو سیاہ دھواں نکلتا ہے وہ صحت کے لئے مضر ہوتا ہے اس لئے ترقی یافتہ ممالک میں ایسے دھوئیں کا نکلنا قانوناً منع ہے۔ جس کارخانہ میں اس قانون کی خلاف ورزی ہوتی ہے اس کے مالک کو سزا دی جاتی ہے۔ کارخانے کے مالک اس سزا سے بچنے کے لئے چمنی کے اوپر آلہ چشم برق رکھ دیتے ہیں۔ جس کے ساتھ تیز بجنے والی گھنٹی لگی رہتی ہے۔ جب تک چمنی سے سفید دھواں خارج ہوتا رہتا ہے مسکون رہتا ہے۔ لیکن جیسے ہی کچھ کوئلے کا سیاہ دھواں نکلتا ہے گھنٹی میں بجلی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ زور زور سے بولنے لگتی ہے۔ گھنٹی سن کر کارخانے کا انجنیئر ہوشیار ہو جاتا ہے اور بوائلر کی مرمت کر دیتا ہے۔ جس سے دھوئیں کے ساتھ کوئلے کا اڑنا موقوف ہو جاتا ہے۔

کچھ عرصہ قبل کی بات ہے، یورپ کے ایک شہر کے متعلق یہ جاننے کی ضرورت ہوئی کہ ۲۴ گھنٹے کے اندر فلاں سڑک سے کتنی موٹریں گزرتی ہیں۔ جو لوگ یورپ کے شہروں کو دیکھ چکے ہیں انہیں معلوم ہے کہ وہاں کی سڑکوں پر اتنی کثرت سے موٹروں کی آمدورفت ہوتی ہے کہ ان کا شمار ناممکن ہے۔ لیکن آلہ چشم برق کی مدد سے موٹروں کا شمار بالکل کھیل ہے، سڑک کی دونوں جانب آلہ چشم برق لگا کر اس پر روشنی ڈالتے ہیں۔ آلہ کے ساتھ ایک مشین لگی رہتی ہے جس پر کاغذ کا فیتہ لپٹا رہتا ہے، اس فیتے کو برابر گھماتے رہتے ہیں۔ جیسے جیسے گزرتے ہوئے موٹروں کا عکس آلہ چشم برق پر پڑتا جاتا ہے۔ کاغذ کے فیتے پر ایک ایک نشان بنتا جاتا ہے۔ اس طرح ۲۴ گھنٹے کے بعد کاغذ کے نشان گن کر معلوم کر سکتے ہیں کہ کتنی گاڑیاں گزریں۔

آلہ چشم برق یا فوٹو الیکٹرک سیل سے اور بہت سے کام لئے جاتے ہیں۔ لیکن اس مختصر مضمون میں ان کے ذکر کی گنجائش نہیں ہے۔

(ترجمہ) ابو محمد امام الدین

رباعی

حیراں ہوں تھلوں کی دیکھ کے تشنہ لبی
فطرت کا گلہ کروں تو ہے بے ادبی
پیاسے تو ہیں جاں بلب مگر ابر کرم
دریا پہ برستا ہے یہ ہے بوالعجبی

یاس عظیم آبادی

خود نوشت سوانح عمری

سوانح عمری لکھنا نہایت مشکل کام ہے اور خود نوشت سوانح عمری لکھنا مشکل تر، انگلستان میں خود نوشت سوانح عمری لکھنے کی ابتدا آٹھویں صدی کے اختتام سے کچھ پہلے ہوئی۔ لیکن آٹو بائیو گرافی (خود نوشت سوانح عمری) کے عنوان کا استعمال ۱۸۰۹ء سے شروع ہوا۔ اس سے پہلے اس کے ہم معنی اور عنوانات استعمال کئے جاتے تھے۔ مثلاً "حالاتِ زندگی خود مصنف کے ذریعہ لکھے ہوئے" "خود نوشت تاریخ"، وغیرہ۔ پہلے انگریزی ادب میں سوانح عمری کو بھی تاریخ کا ایک جزو سمجھا جاتا تھا لیکن انیسویں صدی سے اس موضوع کو تاریخ سے جدا ایک مستقل عنوان قرار دیا گیا۔

خود نوشت سوانح عمری لکھنے میں ہر ہر قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور وہ مشکلات ایسی نہیں ہوتیں جن پر ہر کس و ناکس قابو پا سکے۔ خود نوشت سوانح عمری لکھنے والے کے سامنے پہلے ہی قدم پر یہ دشواری پیش آتی ہے کہ وہ اپنے متعلق کیا لکھے اور کیا چھوڑ دے۔ انسان محاسن و معائب کا مجموعہ ہے، یہ ممکن نہیں کہ ایک انسان میں خوبیاں ہی خوبیاں ہوں۔ اور یہ بھی ناممکن ہے کہ وہ از سرتا پا عیب ہی عیب ہو۔ برک نے بہت صحیح کہا ہے کہ "کسی کے نقائص کے باعث اس سے لڑنا خدا کی صنعت پر حرف رکھنا ہے۔" اسی طرح سی وکنس نے بھی اپنی ایک نظم میں بہت خوب کہا ہے کہ "ہم میں جو بُرے سے بُرے ہیں ان میں بھی اتنی خوبیاں ہیں اور جو ہم میں اچھے سے اچھے ہیں ان میں بھی اتنی برائیاں ہیں کہ ہم میں سے یہ کسی کو مناسب نہیں ہے کہ مذکر تمام لوگوں کے خلاف لب کشائی کریں۔"

بہر حال خود نوشت سوانح عمری لکھنے والے کے لئے پہلی مصیبت یہ ہے کہ اگر وہ اپنی خوبیوں کو قلمبند کرتا ہے تو خود ستائی کا مجرم قرار پاتا ہے اور اگر اپنی زندگی کے ان حصص کو ترک کر دیتا ہے تو تصویر کا ایک ہی رُخ نقش و نگار میں آتا ہے اور اس کی قابلیت مجروح ہوتی ہے۔

سوانح عمری خود نوشت ہو یا دوسرے کی لکھی ہوئی بہر حال ایسی ہونی چاہیئے جو صاحب سیرت کے حقیقی خط و خال کی مظہر ہو اور اس کی اصلی تصویر ارباب نظر کے سامنے آجائے، ورنہ اگر سوانح عمری میں صاحب سوانح کے صرف محاسن ہی دکھائے گئے تو وہ انسان کے بجائے فرشتہ بن جائے گا اور اگر اس کے معائب ہی روشنی میں لائے گئے تو اس میں اور شیطان میں کیا فرق باقی رہے گا؟

خود نوشت سوانح عمری کے قلمبند کرنے میں دوسرا مشکل مرحلہ چھوٹے چھوٹے واقعات کے ضبط و تحریر کا ہوتا ہے۔ سوانح نگار ایسے واقعات کو ہیچ سمجھ کر قلم انداز کر دیتا ہے، لیکن درحقیقت زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات ہیچ نہیں ہوتے۔ بلکہ صاحبِ سیرت کے حقیقی خط و خال کا انہی واقعات سے صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ ایک تصویر میں باریک ترین خطوط و نقوش کو کیا اہمیت حاصل ہوتی ہے؟ جس طرح ایک تصویر جلی و خفی دونوں ہی طرح کے نقش و نگار سے مکمل ہوتی ہے اسی طرح انسان کی زندگی بھی تو ہر طرح کے واقعات کے اشتراک و امتزاج سے تکمیل پذیر ہوتی ہے۔ پھر جس سوانح حیات سے چھوٹے چھوٹے واقعات جدا ہو جائیں اسے کامل سوانح عمری کیونکر کہہ سکتے ہیں؟ لیکن اس کے یہ معنی بھی نہیں ہیں کہ آپ اپنی سوانح عمری میں ایسے لاحاصل واقعات بھی لکھ ڈالئے کہ "میں میل ٹرین سے گھر واپس آیا، گرمی سے طبیعت پریشان تھی۔ کہیں گھنٹے بھر کے بعد مزاج صحیح ہوا" ایسی باتیں لکھنے سے کسی کو کچھ فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔

یہاں خود نوشت سوانح عمری کی ایک اور دشواری آپ کے سامنے آ گئی، یعنی انتخاب سوانح، اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ زندگی کا کونسا واقعہ کیا حیثیت رکھتا ہے؟ کس واقعہ کا اندراج سوانح حیات کے فضول طوالت کے باعث ہوگا؟ کن سوانح کے ترک سے سوانح عمری کی افادیت میں کمی ہو جائے گی؟ کس چیز کو کس طرح لکھا جائے کہ پڑھنے والوں کو اس کی نوعیت کے بارے میں دھوکا نہ ہو؟ یہ اور اسی طرح کے اور کتنے مسائل ہیں جن پر ہر شخص کو عبور حاصل نہیں ہو سکتا۔

لیکن ان مشکلات کے باوجود میری رائے یہ ہے کہ خود نوشت سوانح عمری لکھنی چاہیئے۔ اس سے پڑھنے والوں کو بہت فائدہ پہنچتا ہے اور وہ دوسروں کے تجربات سے بآسانی زندگی کے نشیب و فراز اور مشکل مراحل سے آگاہ ہو جاتے ہیں۔ اگر خود نوشت وقائع زندگی لکھنے والا انشا پردازی سے بہرہ ور ہو تو بہتر ہے ورنہ اس کے لئے کچھ زیادہ ادبی قابلیت کی ضرورت نہیں ہے۔ رنگ و روغن تو اصلیت و حقیقت کے لئے ایک طرح کا حجاب اور پردہ ہی ہے۔

خود نوشت سوانح عمری کے ضبط و ترتیب کے سلسلے میں ایک سوال یہ بھی پیش آتا ہے کہ طرز تحریر کیسا ہو؟ اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ ایک اہل قلم کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ ایسا پیرایہ اور ایسے الفاظ استعمال کرے کہ اس کی تحریر سے اس کے مقصد کے خلاف کوئی مطلب پیدا نہ کیا جا سکے۔ انسان کے معمولی سے معمولی کام میں بھی اس کی سیرت کی جھلک موجود ہوتی ہے اور اسی سے اس کی سیرت کی مخفی کیفیت پر روشنی پڑتی ہے۔ کتنے لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے ظاہر و باطن میں کامل تفاوت و تضاد ہوتا ہے، ہم ایک شخص کے ظاہر کو دیکھ کر رائے قائم کر لیتے ہیں کہ وہ نہایت خشک مزاج ہے، لیکن اگر کبھی اتفاق سے ہمارے سامنے اس کے دل کا دریچہ باز ہو جاتا ہے تو ہمیں اپنی غلط فہمی کا پتہ چلتا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے خیال کے بالکل خلاف وہ شخص انتہائی طور پر نرم دل واقع ہوا ہے۔ اسی طرح بعض اشخاص کو ہم نہایت خلیق اور کریم الطبع سمجھے ہوتے ہیں، لیکن جب ہم پر ان کی حقیقت بے نقاب ہوتی ہے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتنے بداخلاق اور . . . شقیق القلب ہیں۔ سیرت کے یہ باریک خطوط و نقوش اور اصلی خط و خال اسی وقت منظر عام پر آتے ہیں جب انسان اپنی فطری اور حقیقی حالت میں ہوتا ہے، ورنہ عام طور پر یہ حقیقتیں تصنع اور تکلف کے ستر و حجاب میں مستور و محجوب ہوتی ہیں۔

خود نوشت سرگزشت لکھنے کے تین طریقے ہو سکتے ہیں اور اب تک یہی تین طریقے کام میں لائے گئے ہیں۔

(۱) صاحب سوانح اپنی پیدائش کے وقت سے سوانح عمری کا آغاز کرتا ہے اور اس کا اختتام دوسرے کے ہاتھ سے ہوتا ہے۔ جس میں بتایا جاتا ہے کہ صاحب سیرت نے کس بیماری میں انتقال کیا۔ لیکن اب اس طریقے میں بھی تبدیلی ہو رہی ہے اور صرف اتنا بتا دینا کافی سمجھا جانے لگا ہے کہ فلاں سنہ میں انتقال ہوا۔

(۲) اس کو یادداشت یا روزنامچہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا، اس طریقے کی تحریر میں سیدھے سادے فطری پیرائے میں روزمرہ کے حالات لکھے جاتے ہیں، "پیپی" کی ڈائری کئی جلدوں میں شائع ہوئی ہے اور وہ ان کی خود نوشت سوانح عمری کا کام دیتی ہے۔ ان کی ڈائری میں ایسی باتوں کی کمی نہیں ہے جو خلاف واقعہ معلوم ہوتی ہیں۔ پھر بھی ان میں بیشتر واقعات مبنی بر حقیقت معلوم ہوتے ہیں۔

انسان کے تجربات انسان کے لئے بیحد سبق آموز ہوتے ہیں، خواہ وہ تجربات انسان کی کامیابی و کامرانی سے تعلق رکھتے ہوں۔ خواہ نامرادی و ناکامی سے، لیکن ہمارے ملک میں ابھی روزنامچہ یا خود نوشت سوانح عمری کے لکھنے کا بہت کم رواج ہے۔ اس کے برعکس ترقی یافتہ ممالک میں ایک رقاصہ اور ایک ایکٹرس بھی اپنا روزنامچہ لکھتی ہے اور اپنے بعد دوسروں کے لئے درس و عبرت کا ایک ذخیرہ چھوڑ جاتی ہے۔

(۳) تیسرا طریقہ خط و کتابت کے ذریعہ اپنے وقائع اور خیالات کے اظہار کا ہے۔ اس طریقے سے اپنی جو سرگزشت قلمبند کی جاتی ہے اس میں روزمرہ کے واقعات و کوائف نہیں ہوتے۔ پھر بھی ایک انسان کے اہم ترین حالات زندگی اور خیالات و رجحانات ضبط تحریر میں آ جاتے ہیں۔ انگریزوں میں ایسے متعدد اہل قلم گزرے ہیں جن میں چیسٹر فیلڈ کا نام خصوصیت کے ساتھ مشہور ہے۔ اس نے اپنے بیٹے کے نام خطوط لکھے ہیں۔ بہت اچھی اچھی ہدایتیں ہیں۔ آجکل ایسی سوانح عمریاں خاص وقعت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں جو صاحب سوانح کے روزنامچے اور خطوط سے مرتب کی گئی ہوں۔

خواجہ محمود جاوید ایم۔ اے

سوتیلا بیٹا

ویلیا کی ماں کو مرے زمانہ گزر چکا تھا، گذشتہ سال اس کے سر سے باپ کا سایہ بھی اُٹھ گیا - اس کی سوتیلی ماں آنا تھی اور سوتیلی بہن میلوچکا۔ سوتیلا بیٹا اور سوتیلا بھائی ٹوینا تھا میلوچکا اسکول میں پڑھتی تھی، کرسمس کا تہوار منانے گھر آئی تھی - اس کا باپ ایک خوش حال و فارغ البال آدمی تھا۔ اس لیے ہمیشہ ناز و نعم میں پرورش پائی تھی، اس کی کوئی فرمائش کبھی تشنۂ تکمیل نہیں رہی تھی - اسے کیا معلوم کہ باپ کے مرنے کے بعد اس کے گھر کی کیا حالت ہو گئی ہے -

میلوچکا کی ایک سہیلی تھی ٹلینیا، یہ دونوں آپس میں اکثر باتیں کیا کرتی تھیں کہ جب وہ اوّل اوّل جوانی کی سرحد میں قدم رکھیں گی اور پہلی بار بال ڈانس میں شرکت کریں گی تو وہ سفید لباس میں ہو گی اور ٹلینیا گلابی پوشاک میں، اور اس مرتبہ میلوچکا اسکول سے کرسمس منانے گھر آئی تھی تو دل میں یہی شوق و ولولہ لئے ہوئے آئی تھی کہ وہ سفید لباس میں بال میں شریک ہو گی -

لیکن میلوچکا کی ماں آنا نے صاف جواب دیدیا کہ اس کے پاس بال ڈانس کے واسطے کپڑے بنوانے کے لئے پیسے نہیں ہیں اور وہ خود بھی بال ڈانس میں شرکت نہیں کر سکتی - اس لئے کہ اس کے پاس بھی بال ڈانس کے لائق کپڑے نہیں ہیں، اس کے جتنے اچھے گاؤن تھے اس نے سب فروخت کر ڈالے -

میلوچکا کو نہیں معلوم تھا کہ باپ کے انتقال کے ساتھ ہی اس کے گھر کی ساری خوش حالی اور آسائش کا بھی خاتمہ ہو گیا - زندگی میں ایسی مایوسی اور خاطر شکنی کا اسے کبھی سامنا نہیں ہوا تھا، وہ اپنا حسین گلابی چہرہ تکیے میں چھپا کر سسکنے لگی -

گھر میں کرسمس کا سامان ہو رہا تھا - لیکن میلوچکا کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی، وہ نگاہ اُٹھا کر اس طرف دیکھتی بھی نہ تھی - اسی حالت میں اس کا انیس برس کا خوبصورت نوجوان بھائی ویلیا اس کے سامنے آ گیا - میلوچکا کا دل بھائی کو دیکھ کر بھر آیا - اس کی آنکھوں میں اور آنسو امنڈ آئے، اس نے بڑی اندوہگین آواز میں کہا - ویلیا! تم جانتے ہو میں کتنے روز سے آج کے دن کا خواب دیکھ رہی تھی اور میرا وہ خواب کتنا رنگین اور دلکش تھا؟ تم ٹلینیا سے تو واقف ہو نا؟

ویلیا نے اثبات میں سر ہلایا -

میلوچکا کہنے لگی - اس موقع کے لئے ہم دونوں میں کیسی کیسی باتیں ہوا کرتی تھیں - ہم نے کس شوق اور چاؤ چلے سے طے کیا تھا کہ بال ڈانس کی پہلی شرکت میں میری پوشاک سفید ہو گی اور اس کی گلابی - لیکن میری تمام آرزوؤں پر پانی پھر گیا، میری تمام تمنائیں خاک میں مل گئیں - میرے لئے سفید پوشاک بنوانے کو ماں کے پاس روپے نہیں تھے - اور ماں نے کہہ دیا کہ ان کے پاس بھی اچھے کپڑے نہیں ہیں - اس لئے وہ بھی بال میں نہ جائیں گی - ایسی صورت میں سرے سے بال ڈانس میں میری شرکت ہی نہیں ہو سکتی -

میلوچکا پھر تکیے میں منہ چھپا کر سسکنے لگی -

ویلیا خاموش بہن کی باتیں سنتا رہا، اس کی زبان سے تسکین و تشفی کا ایک لفظ بھی نہ نکل سکا - وہ اپنے قلبی تاثرات کو چھپانے کے لئے برامدے میں جا کر ٹہلنے لگا - وہ چاہتا تھا کہ کوئی اسے دیکھنے نہ پائے - اور وہ ماں کے کمرے کے دروازے کے سامنے سے باہر نکل جائے - وہ اسی غرض سے جلدی جلدی کوٹ پہننے لگا -

جس کمرے میں پڑی میلوچکا رو رہی تھی اس میں کسی ضرورت سے آنا آ نکلی، اس نے میلوچکا کو روتے ہوئے دیکھ کر بگڑنا شروع کیا - میں تم سے کتنی بار کہہ چکی ہوں کہ میں اس سال "کرسمس درخت" (ایک مصنوعی درخت جس میں مٹھائیوں کے پھل لگے ہوتے ہیں اور ان کو توڑ کے کھاتے ہیں) کا سامان نہیں کر سکتی - اگر تم رونا دھونا بند نہ کرو گی تو میں تمہیں کمرے سے باہر نکال دوں گی -

لیکن آنا کی ان جھڑکیوں کا کچھ اثر نہیں ہوا - اس لئے اس نے پھر چیخنا شروع کیا - ہاں اسی طرح ماں کی بات مانی جاتی ہے؟ جاؤ - باغ میں جاؤ -

یہ کہتی ہوئی آنا کمرے کے دروازے پر گئی اور ایک نیچسانہ نعمتی

سی لڑکی کو باہر ڈھکیلنے لگی۔ اُس پر وہ لڑکی اَور زور زور سے چلّانے لگی۔ جیسے کوئی اُس کو ہلاک ہی کر رہا ہو۔

اتنے میں انّا کی نظر وینیا پر پڑ گئی اور وہ اُس پر برسنے لگی۔ "اور تم کہاں چلے؟"

وینیا کوٹ پہن چکا تھا اور ہاتھ میں ٹوپی لے کر باہر جانا ہی چاہتا تھا کہ انّا نے دیکھ لیا۔ وینیا نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں۔ میں جلد ہی واپس آ جاؤں گا۔"

وینیا کو اوپر نگاہ اٹھانے کی جرأت نہیں ہوئی۔ اُس نے نظر جھکائے ہی جھکائے جواب دیا۔

انّا آنکھوں سے شعلے برساتی ہوئی بولی "مجھے تمہارا اس طرح گھر سے باہر رہنا پسند نہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم دن بھر کہاں غائب رہتے ہو۔ دو مہینے سے تم صرف کھانے کے وقت گھر آتے ہو۔ اس کے علاوہ تمہارا پتہ نہیں رہتا۔ تم اپنے آنے جانے کے بارے میں مجھ سے کہنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ تمہاری ساری ذمہ داری میرے سر ہے۔ آخر لوگ کیا کہینگے کہ اس کی ماں کتنی ناکارہ عورت ہے۔"

وینیا نے ڈرتے ہوئے کہا۔ "میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ میں بُرے کاموں میں نہیں رہتا، پڑھنے لکھنے میں ہی وقت صرف کرتا ہوں۔"

"لیکن کم سے کم آج تو گھر پر رہ کر تمہیں میرا ہاتھ بٹانا چاہیئے تھا۔ دیکھتے نہیں کاموں کی کتنی بھرمار ہے اور ہاں، یہ بتاؤ، تم آجکل اپنا کمرہ کیوں بند رکھتے ہو؟"

وینیا کچھ پریشان اور کچھ محجوب سا ہو گیا، اس نے کہا۔ "کچھ نہیں ماں، صرف اس خیال سے بند رکھتا ہوں کہ سونیا اور میٹیا میرے کاغذ وغیرہ اِدھر اُدھر نہ کر دیں۔"

انّا نے طنز کے ساتھ کہا۔ "اوہو! تمہیں کاغذ وغیرہ کی اتنی فکر کب سے پیدا ہو گئی؟" یہ کہتے ہوئے وہ باغ چلی گئی۔

مبلو چیکا ابھی تک اپنے ڈرائینگ روم میں پڑی آنسو بہا رہی تھی اور سونیا اور میٹیا دونوں باغ میں دائی سے گزشتہ "کرسمس درخت" کے متعلق باتیں کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ پہلے کی طرح کرسمس درخت کا سامان نہیں ہو سکتا۔

اور بوڑھی دائی ان دونوں کو حضرت مسیحؑ کی پیدائش کی کہانی سنا کر بہلا رہی تھی۔ وہ کہانی اتنی اچھی تھی اور دائی اتنے اچھے ڈھنگ سے کہہ رہی تھی کہ بچوں کو اپنا رنج و غم بھول گیا اور وہ کھسک کر دائی کے اور قریب آ گئے۔

انّا اپنے پلنگ پر سر جھکائے بیٹھی تھی، پلنگ کا سامان بے ترتیبی سے اِدھر اُدھر پھیلا ہوا تھا۔ انّا خیالات کے ہجوم میں گھری ہوئی تھی۔ اسے اپنی زندگی کے تمام واقعات ایک ایک کر کے یاد آتے چلے جا رہے تھے۔ اسے اپنا بچپن یاد آیا۔ وہ بھرے پرے گھر میں کس طرح خوش و خرم پھدکتی پھرتی تھی۔ اس کی کالج کی زندگی کتنی پُر لطف اور دلفریب تھی۔ پھر اس نے جوانی کے میدان میں قدم رکھا۔ وہ میدان کتنا رنگین اور کتنا دلکش تھا۔ پھر سترہ سال کی عمر میں اس کی شادی ہوئی۔ اس کے شوہر کی پہلی بیوی مر چکی تھی اور اپنی یادگار میں ایک بیٹا چھوڑ گئی تھی۔

انّا کو یاد آیا کہ اس کا شوہر اسے کتنا چاہتا تھا اور وہ بھی اس سے کسقدر محبت کرتی تھی۔ اگر ان دونوں کی محبت میں کوئی دخیل ہونے والا تھا تو یہی وینیا۔ اس کا باپ اسے کتنا پیار کرتا تھا۔ اسی سے تو وہ وینیا سے بُرا مانتی تھی۔

شوہر کی زندگی میں اُسے کتنا آرام تھا۔ کتنا اطمینان تھا، کتنی راحت و آسائش حاصل تھی، کتنے عیش و آرام سے زندگی بسر ہوتی تھی۔ لیکن اب تو اس کا تمام کا تمام وقت بچوں ہی کی پرورش و پرداخت اور حفاظت و نگرانی میں گزر جاتا ہے۔ اس کی زندگی کی تمام مسرتیں اور خوشیاں شوہر کے ساتھ پیوند خاک ہو گئیں۔ اب اس کی زندگی میں نہ کوئی لذت ہے نہ شیرینی، نہ جاذبیت ہے نہ رنگینی، اگرچہ اس کی عمر ابھی ۳۵ سال سے زیادہ کی نہیں ہے۔ پھر بھی اس کا شباب اب بھی قائم اور برقرار ہے۔ لیکن شوہر کی موت نے شباب کا سارا جوش و ولولہ ختم کر دیا۔ جوانی کی ساری امنگیں معدوم ہو گئیں۔ اب اس میں اور ایک بوڑھی عورت میں کوئی فرق نہیں ہے۔

انّا انہیں خیالات میں غرق بہت دیر تک آنسو بہاتی رہی۔ اس کے بعد اس نے اپنی آنکھیں صاف کیں اور پلنگ سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ شام ہو چکی تھی۔ کہیں کہیں تارے بھی نظر آنے لگے تھے۔ کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ انّا کھانے کے کمرے میں گئی۔ سونیا اور میٹیا وہاں پہلے سے موجود تھے۔ مبلو چیکا بھی سر جھکائے ایک طرف بیٹھی تھی۔ روتے روتے اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔

آنا نے بچوں کو کھانا دیتے ہوئے کہا۔ "وینیا کا پھر پتہ نہیں ہے۔ جب دیکھو باہر، گھر میں تو وہ ٹکتا ہی نہیں۔"

لڑکے ماں کو غصے میں دیکھ کر چپ چاپ کھانا کھانے لگے۔ کمرے میں بالکل سکوت تھا، صرف چمچے کی آواز کبھی کبھی سنائی دے جاتی تھی۔ تھوڑی دیر میں وہ بھی بند ہو گئی۔ سب اپنے اپنے خیال میں گم تھے۔ صرف سٹیپا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ جیسے کوئی چیز تلاش کر رہا ہو، آخر اس نے اپنی بوڑھی دائی سے جو کرسی پر بیٹھی تھی پوچھا۔ "نینیا! کیا پریاں آ چکی ہیں؟"

دائی نے جواب دیا۔ "ہاں میرے پیارے بچے! پریاں آ چکی ہیں۔ تمہیں ہمیشہ اچھا اور نیک بچہ بن کر رہنا چاہیئے، ورنہ پریاں اُڑ جائیں گی اور اپنے ساتھ تمہارے کرسمس کی کہانی بھی اُڑا لے جائیں گی۔"

آنا یہ سن کر بہت خفا ہوئی۔ اس نے کہا "میں تم سے کہے دیتی ہوں نینیا! کہ کھانے کے وقت کہانی کی بات کرنے کی ضرورت نہیں اس کے لئے تو سارا وقت ہی پڑا ہے۔"

"میں نے کہانی کی بات اس لئے یاد دلائی ہے محترمہ کہ یہ اچھے بچے بننے کی کوشش کریں۔ ورنہ انہیں کرسمس درخت نہ ملے گا۔"

"یہ دیکھنا کہ انہیں کرسمس درخت ملتا ہے یا نہیں میرا کام ہے نہ کہ پریوں کا، پریوں سے کیا واسطہ؟"

بوڑھی دائی نے ناراض ہو کر کہا "یہ کیسی بات؟ پریوں سے کیوں واسطہ نہیں۔ دنیا جانتی ہے کہ کرسمس کی شام کو پریاں زمین پر اترتی ہیں اور نیک لوگوں کو تحفے دیتی ہیں۔"

اتنے میں سونیا نے اپنے بھائی کو برآمدے میں دیکھ کر جوش مسرت میں کہا۔ "ماں! ماں!! آ گیا، وہ دیکھو آ گیا۔"

"تو چلاتی کیوں ہے؟" آنا نے لڑکی کو ڈانٹتے ہوئے سوتیلے بیٹے کی طرف رخ کر کے کہا "کہاں تھے تم؟ کم سے کم کپڑے تو بدل لیتے۔ مان لیا کہ ہمارے گھر کوئی آنے جانے والا نہیں، لیکن صاف ستھرے کپڑے پہن لینے میں حرج ہی کیا ہے۔ ذرا اپنی حالت دیکھو" اس نے وینیا کے گرد سے اٹے ہوئے کوٹ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ نوجوان کا چہرہ سرخ ہو گیا "میرے پاس اچھا کپڑا ہے کہاں؟ تمام کپڑے پھٹ گئے اور تمہاری پڑھائی؟ بیس روبل ماہوار جو تمہیں مل جاتے ہیں؟"

لڑکے نے سوتیلی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "وہ تو سب کا سب میں تمہیں دے دیتا ہوں۔"

اس جواب نے آنا کو خاموش کر دیا۔ وہ اس بات کو چھوڑ کر بچوں کی فکر میں لگ گئی۔ خاموشی کو شکست کرتی ہوئی یکایک سونیا بول اٹھی "میں نے وینیا کے کمرے میں بڑی پیاری تصویر دیکھی ہے۔ وہ فرش پر پڑی تھی اور وینیا رنگین پنسل سے اس پر کچھ بنا رہا تھا۔ اتنی بڑی تصویر۔" پھر ننھی سی لڑکی نے اپنے ہونٹ چبا کے سے آگے کہا۔ "وینیا مجھے دیکھتے ہی دروازہ بند کر لیتا ہے اور مجھے اندر جانے نہیں دیتا۔ لیکن میں نے دیکھ لیا ہے۔"

آنا بولی۔ "یہ کیا کہہ رہی ہے وینیا! کیا تم ڈرائنگ سیکھ رہے ہو؟ تمہارا شوق جس طرح کا امتحان سر پر ہے اس کے لئے اس سے بہتر مشغلہ اور کیا ہو سکتا ہے۔"

وینیا نے کچھ کہا نہیں۔ شرم سے سر جھکا لیا۔

اگرچہ وینیا کو سوتیلی ماں کے طعن و طنز سہنے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔ تاہم اس کے دل کو صدمہ پہنچے بغیر نہ رہا۔ جس جوش و ولولے کے ساتھ وہ گھر واپس آیا تھا وہ سب زائل ہو گیا۔ اس کے دماغ میں ماضی کی تصویریں بننے اور بگڑنے لگیں۔ اس کی ماں تو اسے اس قدر کم سن چھوڑ کر مری کہ وہ جانتا ہی نہیں کہ ماں کی شفقت بھری نظریں اور پیار بھری پکار کیسی ہوتی ہے۔ وہ اس گھر میں ہمیشہ لاوارث کی طرح رہا۔ اس کا باپ اس سے شدید محبت کرتا تھا۔ لیکن اسے اپنی سول انجینیری کی مشغولیتوں سے فرصت ہی کہاں تھی۔ اسے اپنے کاموں کے فکر و انہماک سے اتنا وقت ہی کہاں ملتا تھا کہ وہ اپنے بچوں کو لاڈ پیار کرے۔ تاہم جب اس کی سوتیلی ماں اس کے ساتھ سختی کرتی اُسے ڈانٹتی ڈپٹتی تو وہ کس طرح اس کو پیار و محبت سے سمجھاتا بجھاتا اور اسے تسلی و تشفی دیتا۔

لیکن یہ حالت بہت عرصے تک قائم نہیں رہی۔ وہ جوان ہو گیا۔ اور سمجھنے لگا کہ خاندان میں اس کی حیثیت کیا ہے۔ سوتیلی ماں کا خیال اس کی طرف سے بدستور خراب رہا۔ حالانکہ وہ ہمیشہ اسی کی کوشش کرتا رہا کہ اس کی ماں اس سے خوش رہے۔ وہ بڑے صبر و تحمل کے ساتھ اپنی ماں کی سختیوں کو برداشت کرتا رہا۔

لیکن ناگہاں اس کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ جس کے ساتھ ہی ساری مسرتیں اور خوشیاں، تمام راحتیں اور خوش حالیاں ——— اور ان کی محبتیں سب جادو کے کارخانے کی طرح نیست و نابود

ہوگئیں۔ باپ نے جو کمایا سب خرچ کر دیا تھا۔ پنشن کی معمولی سی رقم تھی جو اتنے بڑے خاندان کے لئے نہیں کے برابر تھی۔ اس مصیبت میں اس کے خاندان کو اپنا عالیشان مکان چھوڑ کر اس گھر میں آنا پڑا۔ ونیا کی عمر اٹھارہ سال کی تھی۔ اسے خاندان کی حالت دیکھ کر ایک جگہ کام شروع کرنا پڑا۔ جس سے اس کی تعلیم کا خرچ اور کمرے کا کرایہ نکل آتا تھا۔ اناّ پہلے تو اس کو منظور ہی نہیں کرتی تھی لیکن پھر رضامند ہو گئی۔

ونیا اپنے چھوٹے بھائی اور بہنوں سے محبت کرتا تھا۔ اور پڑھنے لکھنے میں بہت تیز تھا۔ وہ بڑی بے چینی کے ساتھ ٹیکنیکل اسکول میں داخل ہونے کے دن کا انتظار کرتا تھا، اس کی بڑی خواہش تھی کہ وہ بھی اپنے باپ کا کام سیکھے اور اس کے مرنے سے خاندان جس مصیبت میں مبتلا ہو گیا ہے اسے دُور کر کے پھر اس کو ایک خوشحال و فارغ البال خاندان بنا دے۔ تاکہ اس کی سوتیلی ماں جو اس سے ہمیشہ ناخوش رہتی ہے خوش ہو جائے۔

بہرحال ماں کی طعنہ زنی پر ونیا کو بہت صدمہ ہوا۔ لیکن ہمیشہ کی طرح اس صدمے کو اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ کھانے کے بعد معمول کے مطابق ماں کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اناّ نے اُسے جاتے دیکھ کر گردن ہلائی اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ وہاں جا کر وہ پھر رنج و غم میں ڈوب گئی اور اسے پھر زندگی کے گذشتہ دن یاد آنے لگے۔

وہ رہتے تو تھے اپنے کام میں بہت مشغول، لیکن کتنے خندہ اور خوش مزاج تھے۔ کہ اپنی مصروفیت اور انہماک کے باوجود سب کو خوش رکھتے تھے۔

"اور ونیا کو تو جیسے اپنے باپ کی خوش مزاجی اور نیکدلی کی ہوا بھی نہیں لگی ہے۔ نہ یہ کسی سے ملتا جلتا ہے۔ نہ کسی سے راہ و رسم رکھتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس کا مزاج اپنی ماں سے ملتا جلتا ہے"

یہ خیال آتے ہی وہ رشک و حسد سے جل گئی۔ اور اُٹھ کر اپنے کمرے میں جا رہی تھی کہ اس کے کانوں میں ونیا کی آواز آئی۔ "ماں اور میلو چکا، میرے کمرے میں آؤ۔ میں نے ایک ایسا کام کیا ہے جسے دیکھ کر بچے حیران رہ جائیں گے۔ سونیا اور ڈیٹیا کو بھی بلا لو۔ سب تعجب میں پڑ جائیں گے۔ میں نے ان سب کے لئے کرسمس درخت تیار کر لیا ہے اور بتی بھی جلا دی ہے۔"

"تم نے بچوں کے لئے کرسمس درخت تیار کر لیا ہے؟" اس نے بڑی حیرت سے اس کی جانب رُخ کر کے کہا۔ اسے اپنے کانوں پر اعتبار نہیں ہوا۔

"جی ہاں ماں! لیکن میں نے اس لئے آپ سے چھپا رکھا تھا کہ لڑکے اس کو یکایک دیکھ کر تعجب میں پڑ جائیں۔"

اناّ کو بڑی مشکل سے ونیا کی بات پر یقین آیا۔ وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ خاندان سے اسقدر بے پروا رہنے والا نوجوان ایسا کام کر سکتا ہے۔"

وہ اسی طرح حیرت میں ڈوبی کھڑی تھی کہ ونیا چلاتا ہوا اپنے کمرے سے نکلا۔ "میلوچکا! سونیا! خدا نے ایک خوبصورت کرسمس درخت بھیجا ہے۔ دوڑو! میرے کمرے میں آؤ۔" اور ساتھ ہی ماں اور بہن کو بھی کھینچ کر اپنے کمرے میں لے گیا۔

ونیا نے اپنے کمرے کی خوب صفائی کی تھی۔ میز اور کرسیوں کو علیحدہ دیوار سے لگا کر رکھ دیا تھا اور بیچ میں ایک چھوٹا سا خوبصورت کرسمس درخت سجایا تھا۔ بچے اُسے دیکھتے ہی خوشی سے اچھل پڑے اور تالی بجا بجا کر کہنے لگے۔ خدا نے ہمارے لئے کرسمس درخت بھیجا۔ وہ کتنے اچھے ہیں۔

میلوچکا اپنے تمام رنج و غم کو بھول گئی اور بھائی کے نزدیک جا کر کہنے لگی۔ "تم نے یہ سب کیسے کر لیا بھائی؟"

ونیا بولا "میں تمہارے واسطے بھی کچھ لایا ہوں ماں۔ اور بہنا تیرے واسطے بھی۔" پھر ایک لمبے بالوں والی گڑیا کو سونیا کی گود میں رکھتے ہوئے بولا "سونیا ڈارلنگ! یہ تیرے لئے ہے۔" سونیا خوشی سے اچھل پڑی۔

"اور یہ تمہارے لئے ہے میتیا" یہ کہہ کر ونیا نے اس کے سامنے ایک گھوڑا رکھ دیا جس پر میتیا فوراً چڑھ گیا اور بڑی شان سے سونیا کی طرف دیکھ کر گھوڑے کو کوڑے مارنے لگا۔

"دیکھو سونیا! گھوڑے سے اتنا نزدیک نہ چلی آ، ورنہ دب جائے گی۔" یہ کہتے ہوئے ونیا اس طرح دیوار سے جا لگا جیسے خود بھی گھوڑے سے ڈر رہا ہو۔

اناّ نے محبت آمیز نگاہوں سے ونیا کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے خوشی کا چشمہ اُبل رہا تھا۔ اناّ کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ اس میں اور اس کے باپ میں کسقدر مطابقت پائی جا رہی تھی۔

"مجھے یہ چیز پہلے کیوں نظر نہ آئی؟" آنا خود اپنے کو ملامت کرنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں اور بھی پیار اُمنڈ آیا۔ جس طرح سورج کی تیز دھوپ برف کی تہہ کو پگھلا دیتی ہے اور اس کے اندر سے پانی کی دھارا پھوٹ نکلتی ہے۔ اسی طرح آنا کے دل میں سوتیلے بیٹے کے لئے بغض و عناد کے جتنے جذبات تھے سب دور ہو گئے۔ اور اس سے محبت کا چشمہ جاری ہو گیا۔

"یہ تمہارے لئے ہے ماں۔" یہ کہتے ہوئے ونیا نے مخمل کا ایک چھوٹا سا ڈبہ آنا کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے فوراً اس ڈبے کو کھولا۔ خوشی سے اس کا دل اچھلنے لگا۔ ڈبے کے اندر سونے کا بروچ تھا جس میں اس کے شوہر کی ایک چھوٹی سی تصویر نصب تھی۔

آج اٹھارہ سال کے بعد آنا نے اس نوجوان کے جھکے ہوئے سر کو بوسہ دیا۔ ونیا کو تو اور بھی خوشی ہوئی۔ اس نے ماں کے ہاتھوں کو اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ پھر جلدی سے میز کے پاس جا کر ایک پیکٹ کھولا۔

"آہاہا!" میلوچکا خوشی سے اچھل پڑی۔ اعلیٰ درجے کے سفید ملبوس کا جوڑا اس کے ہاتھ میں لہرا رہا تھا۔ میلوچکا کو تو اپنی آنکھوں پر اعتبار ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ونیا اس قیمتی پوشاک کا کیسے بندوبست کر سکا۔

"اور ماں کے بھی کپڑے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے ونیا نے دوسرا پیکٹ کھول کر ماں کے ریشمی کپڑے نکالے۔

"اب تو ماں کے ساتھ تو ناچ میں جا سکتی ہے۔" ونیا نے بہن کے بشاش چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "کیوں؟ اب تو نہیں روئے گی؟"

"بھائی ڈارلنگ!" میلوچکا نے دوڑ کر بھائی کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ "بھائی تم کتنے اچھے ہو۔ اور میں تمہیں کس قدر پیار کرتی ہوں۔" کپڑا نیچے گر پڑا۔ لیکن اس نے اس کی پروا نہیں کی اور اپنے ہاتھوں کی گرفت کو اور مضبوط کرتے ہوئے بولی "بھائی میں تمہیں کتنا چاہتی ہوں۔ تم سے کتنی محبت کرتی ہوں۔"

اتنے میں آنا بھی اس کے پاس پہنچ گئی اور ہنس کر کہنے لگی۔ "اے خود غرض لڑکی! کیا تجھے یہ نہیں معلوم کہ مجھ کو بھی اس کا شکریہ ادا کرنا ہے۔ مجھے بھی اس کو پیار کرنا ہے۔ اس نے ہم لوگوں کے تہوار کو کتنا خوش آئند اور مسرت انگیز بنا دیا ہے۔"

یہ کہتے ہوئے آنا نے میلوچکا کو الگ کر دیا اور ونیا کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے محبت آمیز لہجے میں کہا۔ "تمہاری وجہ سے آج ہم لوگوں کو کتنی خوشی حاصل ہوئی، میں تمہیں مرحبا کہتی ہوں۔ اور تمہیں پیار کرتی ہوں۔ میرے سب سے پیارے بچے۔"

آنا نے آج پہلی مرتبہ ونیا کو سب سے پیارا بچہ کہا۔ اور دل سے پیار کیا۔ آج ونیا کو پہلی دفعہ آنا کی آواز میں محبت کی شیرینی محسوس ہوئی۔ آج اس نے پہلی بار آنا کی آنکھوں میں محبت کی جھلک دیکھی۔ اس مادری محبت کے سائے میں ونیا سوتیلی ماں کی ہمیشہ کی بدسلوکیوں کو بھول گیا۔ وہ جس محبت کے لئے بچپن سے ترس رہا تھا وہ محبت آج اسے حاصل ہو گئی۔ اس نے آنا کی آنکھوں کو دیکھا۔ جن سے ماں کی سچی محبت کا چشمہ اُبل رہا تھا۔

ماں بیٹے دونوں دیر تک اسی طرح کھڑے رہے۔ جب سے باپ مرا تھا ونیا کس مپرس اور لاوارث تھا۔ آج پہلی بار اسے محسوس ہوا کہ اس کے سر پر بھی کوئی ہاتھ رکھنے والا ہے۔ اس کے سر پر بھی کسی کی شفقت کا دامن ہے۔

سونیا اور میشا دونوں کرسمس درخت میں لٹکی ہوئی مٹھائیوں کو لالچ بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے اور خوش ہو رہے تھے اور میلوچکا بھی اپنے خوبصورت تحفے کی طرف دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ دائی جو دروازے پر کھڑی تھی بچوں کی خوشی دیکھ کر بولی۔ "خدا نے کتنا خوبصورت کرسمس درخت بھیجا ہے۔ اس کی شان بھی عجیب ہے۔"

آنا نے ونیا کو زبردستی اپنی بغل میں بٹھاتے ہوئے کہا۔ "آخر یہ تو بتاؤ بیٹا! تم نے اتنے قیمتی تحفے خریدے کیسے؟ تمہیں بچوں کے لئے کرسمس درخت کی فکر کیسے پیدا ہوئی؟ اور ان سب کے لئے تمہیں پیسے کہاں سے ملے؟"

ونیا نے ایک لمبی سانس لے کر کہا۔ "میں بہت روز سے اس کی فکر میں تھا۔ قریب قریب سال بھر سے دیکھتا تھا کہ تمہیں معمولی اخراجات کا پورا کرنا دشوار ہو رہا ہے اور تمہاری دقتیں روز بروز بڑھتی جا رہی ہیں۔ اس لئے میں نے سوچا کہ پڑھنے لکھنے کے علاوہ مجھے کچھ اور کام بھی کرنا چاہیئے۔ ایک افسر سے جو والد کے دوست ہیں کچھ کام مل گیا۔"

آنا نے درمیان ہی میں کہا۔ "شاید اسی کو سونیا کہتی تھی؟"

"ہاں" - ونیا نے پھر کہنا شروع کیا۔ "میں تین مہینے سے ساری

ساری رات جاگ کر کام کرتا رہا۔ میرا خیال تھا کہ میں اتنا کام کر لوں کہ لڑکوں کے لئے ضروری سامان بھی خرید لوں اور کچھ پیسے بچا کر تمہیں بھی دیدوں۔ لیکن میں نے آج میاں چپکا کو روتے دیکھا تو مجھ سے نہیں رہا گیا۔ میں جا کر اس افسر سے اور روپے مانگ لایا، کام کر کے اس کا قرضہ ادا کر دونگا۔"

آنا نے سسکتے ہوئے کہا۔ "اتنا کام تو تمہاری طاقت سے باہر ہے بیٹا، میں تمہیں اتنی مشقت ہرگز نہ کرنے دوں گی۔"

ویلیا درمیان ہی میں بول اٹھا۔ "یہ تو کچھ ایسی محنت نہیں ہے ماں، تمہیں میرے لئے کسی طرح کی فکر نہ کرنی چاہیئے۔ میں والد ہی کی طرح ہوں۔ میں تو چاہتا ہوں کہ میں جب تک گریجویٹ نہیں ہو جاتا تم کسی طرح بچوں کی پرورش و پرداخت کرو۔ پھر تو میں والد ہی کے وقت کی طرح گھر کو خوش حال و فارغ البال بنا دوں گا۔"

اس نے اپنے گھنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "کیوں میلو چپکا!" پھر جھٹکے سے کرسی سے اٹھ کر اپنی ننھی سی بہن کو اپنے کندھے پر اٹھا لیا اور کرسمس درخت کے گرد گھومنے لگا۔ میلیا اپنے گھوڑے پر بیٹھا گھوڑے کے ہنہنانے کی نقل کر رہا تھا۔

"بالکل اپنے باپ ہی کی طرح تو ہے۔" آنا اپنے دل میں سوچ رہی تھی کہ جیسے اس کے کانوں میں یہ آواز گونج اٹھی "میں بہت زیادہ کام کر سکتا ہوں ماں، میں بالکل والد کی طرح ہوں۔"

آنا مسرت آگیں تصورات میں کھو گئی۔ نہ اس میں پہلے کا سا بغض و عناد تھا۔ اور نہ پہلی سی بے اعتمادی و بدگمانی، نہ وہ یاس نہ ناامیدی، جس طرح سورج نکلنے پر کہر اور سحاب۔۔۔ دور ہو جاتی ہے اسی طرح اپنے بچوں کے مستقبل سے متعلق اس کی تمام فکر و تشویش دور ہو گئی۔ اس کے سامنے توانا و تندرست نیک و سعادتمند ویلیا موجود تھا جو اپنے باپ کے نقش قدم پر چلنے کا وعدہ کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ میں مضبوط و طاقتور ہوں۔ اور بالکل اپنے باپ کی طرح ہوں۔"

(ترجمہ)

مسز شنیدہ محسن ایم۔اے

شانِ وطن

بلائے بد ہے نفاقِ جگر گدازِ وطن
اسی کے ہاتوں مٹی شانِ امتیازِ وطن

کہاں وہ رفعتِ شانِ فلک نوازِ وطن
جو تھی جہاں میں طغرائی امتیازِ وطن

سمجھ لو خوب یہ اے ساکنانِ کشورِ ہند
ہے بڑھ کے دیر و حرم سے حریم نازِ وطن

جہاں میں اُس کا وجود و عدم برابر ہے
نہیں ہے جسے خبرِ دردِ جاں گدازِ وطن

وہ داغِ دامنِ ہستی ہے ننگِ انساں ہے
وطن میں رہتا ہے ہو کر جو بے نیازِ وطن

سرِ نیاز تہ خنجرِ جفا جھک جائے
اگر ادا ہو تو ہو اس طرح نمازِ وطن

جچے نہ اُس کی نگاہوں میں حورِ جنت بھی
جو ہو چکا ہو شہیدِ نگاہِ نازِ وطن

خرید لے اسے ارزاں سمجھ کر اے گلشن
ملے جو نقدِ دو عالم سے جنسِ نازِ وطن

گلشن ناودلوی

تعلیمات

تجدید نظام تعلیم

ہندوستان پر ہولناک جہالت مسلط ہے۔ انگلستان، فرانس، جرمنی، امریکہ، جاپان، کناڈا، آسٹریلیا وغیرہ ممالک میں ساٹھ ستر سال قبل خواندہ اشخاص کی تعداد ۶ فیصدی سے زیادہ نہ تھی، لیکن اب ان ملکوں کے ناخواندہ لوگوں کی تعداد دو تین فیصدی سے زیادہ نہیں ہے۔ گویا وہاں زمین و آسمان کا تغیر و تبدل ہو گیا، لیکن ہمارا بدقسمت اور حرماں نصیب ملک سو ڈیڑھ سو سال میں بھی فیصدی ۵ ۲/ سے زیادہ تعلیمی ترقی نہ کر سکا۔

یو۔پی میں سترہ برس سے ابتدائی تعلیم قانوناً لازمی ہے، پھر بھی اسکولوں میں تعلیم پانے والے ہر بچے کے پیچھے چار بچے ایسے ہیں جن کی تعلیم کا کوئی بندوبست نہیں ہے۔ اس کے برعکس دوسرے ملکوں کی حکومتیں ابتدائی تعلیم کے اہتمام و بندوبست کو اپنا سب سے بڑا فریضہ خیال کرتی ہیں، اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان سے جہالت و ناخواندگی دور ہو، ہمارا ملک تعلیم و تہذیب میں دوسرے ممالک سے پیچھے نہ رہے تو ہمیں موجودہ نظام تعلیم میں زبردست انقلاب کرنا ہوگا۔ اور ایسے طریقوں پر کاربند ہونا پڑے گا کہ ملک سے جہالت کا جنازہ نکل جائے۔

ابتدائی تعلیم کی ترویج کے لئے ترقی یافتہ ممالک نے جو طریقے استعمال کئے ہیں۔ ان میں ایک تو دوہرے اسکول کا طریقہ ہے یعنی ایک ہی اسکول میں ایک ہی معلم دن کے نصف اول میں جتنے لڑکوں کو پڑھا سکتا ہے ان کی ایک جماعت کو پڑھائے اور دن کے نصف دوم میں اتنے ہی لڑکوں کی دوسری جماعت کو تعلیم دے۔ دوسرا طریقہ تعلیم کے دنوں کی تقسیم ہے، یعنی اگر ایک مقام پر اتنے لڑکے نہیں ہیں جتنے ایک معلم کے پاس ہونے چاہئیں تو معلم ہفتے میں دو یا تین مقام پر دو دو یا تین تین روز پڑھائے۔ اس نظام تعلیم کے مطابق کسی خاص تعلیمی نقصان کے بغیر تعلیم کا تقریباً نصف خرچ کم کیا جا سکتا ہے یا اتنے ہی خرچ میں دگنے لڑکوں کو تعلیم دی جا سکتی ہے۔

دیہات میں جہاں ۲۰ سے ۳۰ تک لڑکے جمع ہو سکتے ہیں۔ دوسرے، تیسرے یا چوتھے روز کا اسکول کھولا جا سکتا ہے اور درمیان کے دنوں میں معلم اسی طرح کے دوسرے گاؤں میں جا کر تعلیم دے سکتا ہے، ہندوستان کے جن خطوں میں دیہات کی آبادیاں قریب قریب ہیں مدرس دن کے نصف اول میں ایک گاؤں میں پڑھا سکتا ہے۔ اور نصف دوم میں دوسرے گاؤں میں، اس نظام تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ مدرس کے ذمے تقریباً ساٹھ پینسٹھ بچوں کی تعلیم کا اوسط پڑ جائے۔ ممکن ہے آج یہ اسکیم مشکل نظر آئے لیکن جب طریقہ تعلیم آسان ہو جائے گا اور نصاب تعلیم میں بھی مفید تبدیلی ہو جائے گی تو کورس کی تکمیل دشوار نہ ہوگی۔

ممکن ہے کہ آپ کے نزدیک یہ اسکیم زیادہ بلند پایہ نہ ہو۔ لیکن اس کے کارآمد اور فائدہ مند ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ ناخواندگی کے دور کرنے کے لئے یہ بہترین اسکیم ہے۔ چنانچہ اکثر ترقی یافتہ ممالک نے اس اسکیم سے کام لیا ہے اور ہندوستان کے بعض حصص میں بھی اس پر عمل کیا جا رہا ہے جس کے اچھے نتائج ظہور پذیر ہو رہے ہیں

جرمن پبلک میں تحصیل علم کا ذوق عام ہوا تو ابتدائی درجوں میں طلبہ کی اتنی کثرت ہوئی کہ ان کے لئے اسکولوں اور ماسٹروں کا انتظام دشوار ہو گیا۔ اس دشواری پر عبور حاصل کرنے کے لئے وہاں نصف دن کی تعلیم کے طریقے پر عمل کیا گیا۔ چنانچہ سب سے پہلے سیکسنی اور پرشیا میں (جو جرمنی کی دو ریاستیں ہیں) اس طریقے کی آزمائش کی گئی۔ اس طریقے پر کاربند ہونے سے تعلیم کے موجودہ .... بندوبست سے ہی دگنے طلبہ کی تعلیم کی گنجائش نکل آئی۔ آجکل جدید نظم کے ماتحت جو درسگاہیں جاری ہیں ان میں فی ہفتہ ۱۸ گھنٹے سے زیادہ تعلیم نہیں ہوتی۔

تقریباً ۱۹۰۰ء میں فرانس میں صیغۂ تعلیمات کے انسپکٹر کی تجویز کے مطابق تعلیمی کونسل کو درسگاہوں کے رو سے یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ میونسپل کمیٹی کی اجازت سے کسی کمیون یا میونسپلٹی یا اس

کے کسی حصے میں آدھے دن کا سکول قائم کر دے۔ ایسی حالت میں سکول کا ڈائرکٹر طلبہ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتا تھا جن میں سے ایک حصہ صبح ۸ بجے سے ۱۱ بجے دن تک تعلیم پاتا تھا اور دوسرا حصہ ایک بجے سے ۴ بجے تک۔

سنہ ۱۹۰۳ء میں سویڈن کے بہت سے مقامات میں اسکولی حلقے کو دو یا دو سے زیادہ حصوں میں تقسیم کر دیا گیا، اسی طرح تعلیمی سال کو دو یا اس سے زائد حصوں میں تقسیم کر کے اسکول کو ایک مقام سے دوسرے مقام میں منتقل کر دیا جاتا تھا۔ اور ہر مقرر شدہ وقت میں یا ہفتے میں ہر تیسرے روز طلبہ کی ایک جماعت کو تعلیم دی جاتی تھی۔ اس صورت سے سویڈش بچے سال میں چار مہینے تعلیم پاتے تھے۔

ڈنمارک میں سنہ ۱۹۱۲ء تک نصف روزہ اسکولوں کا قیام عمل میں نہیں آیا تھا۔ پھر بھی بڑی عمر کے طلبہ موسم گرما میں پورے اوقات کے بجائے ہفتے میں تین روز پورے اور دو نصف روز تعلیم پاتے تھے۔ اور موسم سرما میں چھوٹے بچوں کو اسی نظام اوقات کے مطابق تعلیم دی جاتی تھی۔

سنہ ۱۹۰۰ء میں ناروے میں ان اسکولوں کی حاضری جن میں جبری تعلیم دی جاتی تھی سالانہ تقریباً ۱۲ ہفتے تھی۔ ایسے اسکولی حلقوں میں جہاں طلبہ کی تعداد ۲۰ سے کم تھی طلبہ ہی کے گھروں میں کسی مناسب مقام پر اسکول جاری کر دیا جاتا تھا۔ اس طریقے سے تعلیمی ترقی میں بہت مدد ملی۔

سنہ ۱۹۰۵ء میں پرتگال میں جگہ کی قلت کے باعث طلبہ کی نصف تعداد کو صبح تعلیم دی جاتی تھی اور نصف کو دوپہر کے بعد۔

سنہ ۱۹۱۲ء میں ریاستہائے متحدہ امریکہ میں مختلف حصص ملک کے اسکولوں کے طلبہ کی سالانہ حاضری سو روز سے لے کر دو سو روز تک تھی۔ جس کا اوسط تقریباً ۱۵۷ دن ہوتا تھا، اس سے ظاہر ہے کہ امریکہ میں ابتدائی اسکولوں کے طلبہ کی سالانہ حاضری کا اوسط نصف دنوں سے کچھ ہی زیادہ تھا۔

ارجنٹائن ریپبلک میں سنہ ۱۹۲۵ء میں صبح اور دوپہر بعد اسکول کھلتے تھے اور ان دونوں وقتوں میں طلبہ کی مختلف جماعتیں تعلیم پاتی تھیں۔

آسٹریلیا ایک زراعتی ملک ہے اور اس کی آبادی بکھری ہوئی ہے۔ اس لئے اس کو ترقی تعلیم کی خاص صورتیں اختیار کرنی پڑیں اس نے نصف دن کے اسکول قائم کئے جن میں سے بعض صبح یا شام کچھ وقت کے لئے روزانہ کھلتے تھے۔ کچھ تیسرے روز، کچھ کا نظام اوقات اور تھا لیکن وہ بھی ہفتے میں پانچ روز سے کم ہی کھلتے تھے۔ یہ اسکول لوگوں کے گھروں پر کھولے گئے تھے جو ایک ماسٹر کے سپرد دو یا اس سے زیادہ تعداد میں رہتے تھے۔

کوئنس لینڈ کے مدارس کے متعلق سنہ ۱۹۱۶ء میں ایک رپورٹ شائع ہوئی تھی جس میں درج تھا۔

"اس نظام تعلیم سے متعلق سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ اساتذہ جدا جدا مقامات میں جا کر ان بچوں کو تعلیم دیتے تھے جو جماعتی انتظام کرنے پر سواری کے ذریعہ بھی باقاعدہ اسکولوں میں نہیں پہنچائے جا سکتے تھے۔ اس طرح کی تعلیم مختلف طریقوں سے مثلاً گشتی ماسٹروں کے ذریعے ہنیچر کے اسکول، ہفتہ وار اسکول، خانہ وار اسکول اور اسی عنوان کے دوسرے اسکولوں کے ذریعہ دی جاتی تھی۔

جاپان نے سنہ ۱۸۷۹ء میں جدید نظام تعلیم جاری کیا جس کے رو سے ابتدائی اسکولوں کا نصاب تعلیم بالکل سہل کر دیا گیا اور ۶ سال سے ۱۴ سال تک کی عمر کے درمیان بچوں کو جتنے وقت تک تعلیم دی جاتی تھی اس کا اوسط ۱۶ مہینہ ہوتا تھا۔ گویا بچے سال بھر میں دو مہینے تعلیم پاتے تھے۔ ایک ماسٹر کو دیہات کے کئی کئی اسکولوں میں جا کر تعلیم دینا پڑتا تھا۔ سنہ ۱۸۸۶ء میں تعلیمی کوششیں اور تیز کر دی گئیں۔ چنانچہ جن بچوں کے والدین اور ورثا غریب تھے، ان کی تعلیم کے لئے درسگاہوں کا مخصوص انتظام کیا گیا، ان درسگاہوں کا نصاب تین سال کا تھا۔ اور ان میں روزانہ دو گھنٹے تعلیم ہوتی تھی۔ اگر اس سے زیادہ ہوتی جب بھی تین گھنٹے کے اندر ہی اندر رہتی۔ سنہ ۱۹۰۳ء میں بہت سے ابتدائی اسکولوں میں تقسیم شدہ نظام اوقات کا اصول جاری کر دیا گیا۔

ترکی، مصر اور روس میں اسی جدید نظام تعلیم پر عمل ہو رہا ہے مصر میں کوشش کی جا رہی ہے کہ بچوں کے اسکول نصف روز کے کر دئے جائیں۔ تاکہ اساتذہ کی موجودہ تعداد بچے اور بچیوں دونوں کی تعلیم کے لئے کافی ہو۔ ایک وقت بچوں کو تعلیم دی جائے، دوسرے وقت بچیوں کو۔ آجکل ترکی میں اسکولوں میں داخل ہونے والے بچوں کی تعداد ۵ لاکھ ہے۔ حالانکہ سنہ ۱۹۲۳ء میں ان کی تعداد ۳ لاکھ سے کچھ ہی زیادہ تھی۔ ترکی طلبہ کی اس روز افزوں ترقی کے پیش نظر وہاں بھی آدھے دن کے اسکول جاری کر دئے گئے ہیں۔

سوویٹ روس میں یکم ستمبر ۱۹۳۷ء کو جب وہاں کا تعلیمی سال شروع ہوتا ہے طلبہ کی تعداد ۲ کروڑ ستر لاکھ سے زیادہ تھی۔ طلبہ کی اس سیلابی ترقی کو مدِّنظر رکھ کر وہاں بھی جدید طریقوں پر عمل کئے بغیر کام نہیں چل سکتا تھا اور یقیناً کوئی نئی صورت اختیار کی گئی ہوگی۔

اٹلی میں بھی جب طلبہ کی تعداد ساٹھ سے متجاوز ہو جاتی ہے تو ان کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصے کو سال کے نصف اوّل میں تعلیم دی جاتی ہے۔ اور دوسرے حصے کو نصف دوم میں۔

ہم سے بہت قریب سیلون (لنکا) میں بھی اسی نظامِ تعلیم پر عمل کیا جا رہا ہے اور کامیابی ہو رہی ہے۔ یہاں کے اسکول جو دہرے نظامِ اوقاتِ تعلیم پر عمل کر رہے ہیں دہرے اسکول یا نصف وقت کے اسکول کہلاتے ہیں۔ ان اسکولوں میں روزانہ انفینٹ کلاس کو دو گھنٹے، دوسرے درجے کو تین گھنٹے اور باقی درجوں کو چار گھنٹے تعلیم دی جاتی ہے۔

سیلون کے اکثر اسکولوں میں چھوٹے بچوں کی تعداد اونچے درجے کے طلبہ کی مجموعی تعداد کے تقریباً برابر ہے، وہاں جو اساتذہ چھوٹے بچوں کو تعلیم دیتے ہیں وہی ان سے فارغ ہو کر تین گھنٹے اونچے درجے کے طلبہ کو بھی پڑھا دیتے ہیں۔

ہندوستان بھی اس نظامِ تعلیم سے بالکل ناآشنا نہیں ہے۔ بمبئی پریسیڈنسی کے کچھ حصص ہیں جن میں شہر بمبئی بھی داخل ہے یہ نظامِ تعلیم مروّج ہے اور کامیاب ثابت ہو رہا ہے۔ امید ہے کہ کلکتہ کارپوریشن بھی جلد ہی اس پر عمل شروع کر دے گا۔ حکومت بنگال اس کی تائید بھی کر چکی ہے۔

۱۹۲۵ء میں کلکتہ کارپوریشن نے شیفٹ طریقے کو رائج کر دیا تھا لیکن افسوس کہ اس وقت طلبہ کے ورثاء نے اس کے فوائد کو نہیں سمجھا اور اس کا بائیکاٹ کر دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آٹھ مہینے کے بعد اس طریقے کو موقوف کر دینا پڑا۔ اس وقت کے مقابلے میں اب پبلک بہت حد تک بصیرت مند ہو چکی ہے۔ اس لئے کلکتہ کارپوریشن کے افسرِ تعلیم کے۔ پی۔ چٹوپادھیا نے ایک اسکیم پیش کر کے زور دیا ہے کہ شہر میں شیفٹ طریقہ رائج کر دیا جائے۔ علاوہ ازیں دو سال قبل حکومت بنگال نے بھی اسکولی تعلیم کی تنظیمِ جدید سے متعلق ایک ریزولیوشن پاس کر کے صاف و صریح اعلان کے ذریعہ ابتدائی تعلیم کے دو ابتدائی درجوں میں شیفٹ طریقے کے اجراء پر زور دیا تھا۔

شہر بمبئی میں یہ اسکیم کافی حد تک کامیاب ہوئی ہے اور حیرت انگیز کامیابی کے ساتھ اس پر عملدرآمد ہو رہا ہے۔ بمبئی کے قصبوں اور بعض دیہات میں بھی اس کے مطابق تعلیم دی جا رہی ہے۔ یو پی کی طرح بمبئی پریسیڈنسی میں بھی ابتدائی تعلیم پانچ برس میں پوری ہوتی ہے اور اسی صوبے کی طرح پانچ درجے قائم ہیں۔ آجکل شیفٹ طریقہ انفینٹ کلاس اور پہلے درجے میں مروج ہے اور کوشش کی جا رہی ہے کہ بتدریج ایک یا دو اونچے درجوں میں بھی اس کو رائج کر دیا جائے۔

۱۹۳۲ء میں شہر بمبئی میں جبری تعلیم رائج ہوئی، وہاں کے مشہور افسرِ تعلیم مسٹر آر۔ پی۔ پیرو کے زیرِ اہتمام کارپوریشن کے اسکولوں میں شیفٹ طریقۂ تعلیم جاری ہوا۔ سب سے اوّل انفینٹ درجے میں اس پر عمل کیا گیا، اس وقت کارپوریشن کے اسکولوں کے انفینٹ درجے میں ۲۴ ہزار طلبہ تھے اور تیس طلبہ کے واسطے ایک معلم کے حساب سے آٹھ سو معلمین کی ضرورت تھی۔ لیکن شیفٹ طریقۂ تعلیم کے مطابق ایک معلم روزانہ گیارہ بجے سے پانچ بجے دن تک اتنے ہی لڑکوں کی دوسری جماعت کو تعلیم دینے لگا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آٹھ سو کی بجائے صرف چار سو معلمین ۲۴ ہزار طلبہ کے لئے کافی ہو گئے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ بارہ ہزار بچوں کی تعلیم کا مفت انتظام ہو گیا۔

بدقسمتی سے شہر بمبئی میں تعلیم کا خرچ اسقدر زیادہ ہے کہ فی متعلم چالیس روپے پڑ جاتے ہیں۔ اس اعتبار سے جدید نظمِ تعلیم کی بدولت جو بچت ہوئی وہ پانچ لاکھ روپے تک پہنچ جاتی ہے۔ اس بچت سے کام لے کر وہاں کے ابتدائی اسکولوں میں سالانہ چار پانچ ہزار بچوں کا اضافہ کیا جا رہا ہے اور کامیابی کے ساتھ ان کے مصارف پورے کئے جا رہے ہیں۔

یہاں یہ بتا دینا بے محل نہ ہوگا کہ اس نظمِ تعلیم کے آغاز پر ذرا تدریج میں بمبئی کی پبلک نیز کچھ حد تک معلمین نے اس کی مخالفت کی تھی لیکن مالی مجبوری نیز ابتدائی تعلیم کی ترقی کی آرزو نے اسکول کمیٹی کو اس نظمِ تعلیم کی حمایت پر ثابت قدم رکھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ مخالفتوں کا جوش فرو ہو گیا۔ اور اس سے زیادہ تسلی بخش امر یہ ہے کہ نتائجِ امتحان کے اعتبار سے جدید نظمِ تعلیم سابق نظم کے مقابلے میں کچھ کم فائدہ مند نہیں ہے۔

بمبئی کے ماہرین تعلیم شیفٹ طرز تعلیم کے صرف دو ایک مقام پر رائج ہو جانے سے مطمئن نہیں ہو گئے ہیں بلکہ وہ اس کے رواج عام کے لئے مسلسل جد و جہد کر رہے ہیں۔ چنانچہ وہ تحریر و تقریر کے ذریعہ اس کے لئے برابر پراپیگنڈا کرتے رہتے ہیں۔

یو۔پی میں بھی تعلیمی کمیٹیوں کے چیئرمینوں کی کانفرنس میں جو ۱۱ و ۱۲ جنوری ۱۹۳۵ء کو لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ دہرے اسکول کے نظم تعلیم کی ترویج کے مسئلہ پر غور و خوض کیا گیا تھا۔ نیز یو۔پی کی کانگریسی حکومت کے وزیر تعلیم مسٹر پیارے لال شرما نے بھی ابتدائی تعلیم کی از سر نو تنظیم کے سلسلے میں ڈبل شیفٹ طریقۂ تعلیم کے کام میں لانے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یو۔پی میں اس نظم تعلیم کو کیونکر رائج کیا جا سکتا ہے؟ اس کی صورت یہ ہے کہ انفینٹ کلاس میں نیز دو یا زیادہ سے زیادہ تین سال کے تجربے کے بعد اوّل اور دوم درجوں میں یا ان کے مثل اور درجوں میں جن کو خواہ کسی نام سے پکارا جائے اس تنظیم تعلیم کو جاری کر دینا چاہیئے۔ بعد ازاں اتنے ہی عرصے کے بعد باقی درجوں میں رائج کر دیا جائے۔ تعین اوقات کو مقامی افسروں اور سرکل افسروں کے سپرد کر دینا چاہیئے۔ تاکہ وہ مقامی احوال و کوائف کے مطابق ایک موسم سے دوسرے موسم تک نصف گھنٹے سے لے کر ایک گھنٹے تک کا وقفہ رکھ کر اوقات مقرر کر لیں۔

مثال کے طور پر وقت کا تعین، بہ تفصیل ذیل ہو سکتا ہے:۔

(۱) موسم گرما میں صبح ½۶ بجے سے ۹ بجے تک اور دوپہر بعد ۳ بجے سے ½۵ بجے تک۔

(۲) موسم سرما میں صبح ½۷ بجے سے ۱۰ بجے تک اور دوپہر بعد ۲ بجے سے ½۴ بجے تک۔

ہمیں یقین ہے کہ اس نظم تعلیم کی ترویج اور نظام اوقات کی تبدیلی میں محکمۂ تعلیمات کو کوئی قانونی دقت نہیں ہو سکتی، کیونکہ یہاں کے تعلیمی ایکٹ اور اس سے متعلقہ قوانین کے رو سے صرف نصاب تعلیم کی پابندی ضروری ہے نہ کہ نظام اوقات کی۔ ایک معلم دو درجوں کو تعلیم دے سکتا ہے۔ ایک کو دوپہر سے پہلے اور دوسرے کو دوپہر کے بعد۔ اور دونوں کو ملا کر ½۵ گھنٹے وقت ہونا چاہیئے۔ یہ صحیح ہے کہ معلمین کو جن کی حالت آج بھی بہتر نہیں ہے موجودہ وقت کے اعتبار سے کچھ زیادہ کام کرنا پڑے گا۔ لیکن ملک کی جہالت کے ازالہ اور تعلیم کی ترقی کے لئے انہیں ایثار سے کام لینا چاہیئے۔ ملازمت پیشہ اور دفتروں میں کام کرنے والوں کا وقت بھی تقریباً اتنا ہی ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اگر معلمین کو وقت سے کچھ زیادہ کام کرنا پڑے تو انہیں زیادہ کام کا کچھ الاؤنس دینا بھی بے جا نہ ہوگا۔ جو بجٹ کے مقابلے میں بہت قلیل ہوگا۔

اس سکیم پر شہر میں بھی عمل ہو سکتا ہے اور دیہات میں بھی۔ اس سکیم کے اجراء سے یہی فائدہ نہ ہوگا کہ معلمین کی موجودہ تعداد اب سے تقریباً دگنے طلبہ کے لئے کافی ہوگی۔ بلکہ اس کے اور فوائد بھی برآمد ہوں گے۔ معلمین اور متعلمین کی صحت کو فائدہ پہنچے گا۔ حکام اور منتظمین کو انتظامی اور مالی آسانیاں حاصل ہوں گی۔ اسکولوں کی عمارتوں کی تعمیر پر سالانہ جو رقم صرف ہوتی ہے وہ بچ جائے گی۔ اسکولوں کے لئے کرائے پر جو مکان لئے جاتے ہیں اور جو آبادی کے درمیان ہونے کے باعث مضر صحت ہوتے ہیں ان کی ضرورت نہ ہوگی۔ یہ اور اس قسم کے کتنے فوائد ہو سکتے ہیں۔

آجکل ہمارے ابتدائی اسکولوں میں موسم گرما میں تعلیم کا وقت صبح ½۶ بجے سے ۱۱ بجے تک ہے اور موسم سرما میں ½۱۰ بجے سے ۳ بجے تک۔ اتنے وقت تک تعلیم دینا نہ ضروری ہے اور نہ مناسب۔ بچوں کو زیادہ دیر تک نوشت و خواند میں مشغول رکھنا دماغی اور جسمانی دونوں حیثیت سے مضر ہے۔ تعلیم کے اسقدر طویل وقت ہونے کی حالت میں ضروری ہے کہ بچے اسکول میں کچھ کھائیں پئیں، علاوہ ازیں معمولی حیثیت کے خاندانوں میں موسم سرما میں اسکول کے وقت سے پہلے دوپہر کا کھانا تیار نہیں ہو سکتا۔ اس لئے بچوں کو یا تو باسی کھا کر اسکول جانا پڑتا ہے یا بغیر کھانا کھائے۔ اور جو چیزیں بچے اسکول میں خوانچہ والوں سے خرید کر کھاتے ہیں وہ ان کی صحت کے لئے کسی طرح مناسب نہیں ہوتیں۔ اس اسکیم کے اجراء کی صورت میں طلبہ کے وارثوں کو خواہ وہ کسی طبقے اور حیثیت کے ہوں، اپنی آسانی اور سہولت کے مطابق بچوں کو اسکول بھیجنے کا موقع حاصل ہو جائے گا، اس اسکیم کی بدولت دیہات کے چار جھونپڑوں کی بستی میں بھی تعلیم کی روشنی پہنچ جائے گی۔ دو یا تین ایسے مواضع جن میں طلبہ کی تعداد کم ہو ایک میں شامل کئے جا سکتے ہیں۔ ان کے لئے ایک معلم کافی ہوگا جو ہر موضع میں فی ہفتہ دو یا تین روز جا کر پڑھائے گا۔ اس طرح میونسپل بورڈ، ڈسٹرکٹ بورڈ اور دوسرے سرکاری ادارے اس اسکیم

سچّا مکالمہ

"کیوں؟ کیا آج کوئی نیا بھوت سوار ہے؟" میں اپنے خیال میں محو تھا، اس بلند آواز سے کئے ہوئے سوال کو سُن کر چونک پڑا۔ "کیا آج روٹی نہیں چاہیئے؟"

میں نے ہوشیار ہو کر سامنے دیکھا، میری بیوی نے پوچھا۔ آج کون سا نیا خبط پک رہا ہے؟

"بیوی" کے لفظ پر کسی قدر تبصرے کی ضرورت ہے، فنِ لغت کے اب تک کے کسی لامعلوم اصول کے مطابق "دا لفٹ" کا لفظ "بیوی" کی نسبت زیادہ عام فہم سمجھا جاتا ہے، لیکن جب سے گاندھی جی نے زبان کے معاملے سے دلچسپی لینی شروع کی ہے اس سے قبل سے میری بیوی نے اپنی حدودِ حکومت خصوصاً رسوئی گھر میں صرف گجراتی بولنے کا آرڈر جاری کر رکھا ہے اور وہ بھی ایسی گجراتی جسے وہ سمجھ سکے۔ اس کا اثر اتنا زبردست ہوا ہے کہ میں بھی گجراتی بولنے لگا ہوں اور میرے احباب بھی اس کے آرڈر سے متاثر ہو کر گجراتی استعمال کرنے لگے ہیں۔

میں اپنے دل میں عورتوں کے متعلق بہت کچھ جذبۂ احترام رکھنے کے باوجود بیوی کے لئے جمع کا صیغہ استعمال نہیں کرتا۔ اس کا سبب بھی اسی کا ایک فرمان ہے۔

قبل اس کے کہ میں اس کے سوال کا جواب دوں ایک اور سوال جڑ دیا گیا۔

"کیوں، آج کہاں ہو آئے؟"

میں جسقدر جلد جلد کھاتا ہوں اس سے زیادہ عجلت کے ساتھ میری بیوی میری تھالی میں روٹی ڈالتی جاتی ہے اور جس تیزی سے جواب دیتا ہوں اس سے زیادہ تیزی سے دوسرا سوال کر دیتی ہے۔

میں نے کہا۔ کہیں بھی نہیں ہو آیا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"پرسوں تعلیم نسواں کے جلسے میں گیا تھا، وہاں مسٹر پہ ماتنگ نے کہا ہماری عورتوں میں ہزار میں ایک بھی پڑھی لکھی نہیں۔ اور میں غور کر رہا تھا۔"

ابھی تک میں نے نہیں پڑھا، اب تمہیں زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں، میں سب سمجھ گئی۔ ہر سال کی طرح انہوں نے مسٹر براؤننگ اور مسز براؤننگ کی مثال دی تھی یا نہیں؟"

اس بارے میں کچھ مزید کہے بغیر میں نیچے نظر کر کے دال مانگنے لگا۔

اس نے دال دیتے ہوئے کہا۔ مرد ہماری نسبت کون سی بات زیادہ جانتے ہیں۔ جو آتے ہیں ہمیں تعلیم دینے، میری تو یہی سمجھ میں نہیں آتا۔

میں نے کہا۔ تو مرد کیا نہیں جانتے یہ بتا؟

"کیوں تمہیں کھانا پکانا آتا ہے؟"

"یہ کام تو سیکھنے کا ہے، اگر رفتہ رفتہ سیکھیں تو کیوں نہ آجائے؟"

"ہمارے ہندو گھروں کے دستور کے مطابق کھانا پکانے کا کام تمہارے ذمے ہے۔ اتنے زمانے سے سیکھنے کے باوجود تمہیں اب تک پورن پولی رایک طرح کی میٹھی روٹی) پکانی نہیں آتی۔ جب عاجز آجاتے ہو تو آزادی اور پرانے رواج کے ترک کر دینے کی باتیں کرنے لگتے ہو۔ مگر سچی بات کا اعتراف نہیں کرتے کہ تمہیں پکانے کا سلیقہ ہی نہیں۔"

میں نے کہا۔ یہ سب تو معمولی باتیں ہیں۔ لیکن تو مطالعہ نہیں کرتی اس لئے تجھ میں سمجھ کا مادہ پیدا نہیں ہوتا۔"

"خواہ کچھ ہو۔ لیکن تعلیم و تربیت کے متعلق بہت کچھ مطالعہ کے باوجود تم منّا کو کھلا نہیں سکتے اور وہ روتا ہو تو اسے چُپ نہیں کرا سکتے۔"

میں یہ نہیں کہتا، تو مطالعہ نہیں کرتی۔ اس لئے تیری زندگی ناقص اور کھوکھلی رہتی ہے، تجھے دنیا کی کچھ خبر نہیں رہتی۔"

"یہی تو غلطی ہے، تمہارا کتابی علم لچر ہوتا ہے۔ تمہیں سفر کرنا تو آتا نہیں، تمہیں دنیا کا کیا علم ہوگا! بولو تم گٹھڑی باندھنا جانتے ہو؟ تمہیں بوری کا منہ بند کرنا آتا ہے؟ کپڑے کیسے باندھے جاتے ہیں؟ کیا تم ان میں سے کوئی کام جانتے ہو! یہ کام سفر کرنے کے لئے

اور دنیا کو جاننے کے لئے ضروری ہے یا نہیں ؟"

"تو کیا ہم تیرے بغیر سفر بھی نہیں کر سکتے ؟"

"مجھ سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں ہے کہ تم کیسے سفر کرتے ہو، ایک دفعہ میں ساتھ تھی، تم نے اپنی گٹھڑی کی بجائے کسی بڑھئی کی گٹھڑی اُٹھالی تھی، یاد ہے نا؟ گٹھڑی کے اندر سے اوزار کھڑ کھڑائے جب بھی تمہیں پتہ نہ چلا کہ یہ گٹھڑی ہماری نہیں ہو سکتی۔"

"یہ سب عام باتیں ہیں، میں کہہ رہا ہوں کہ تم سب کو ہنر نہیں آتا۔"

"عورت تو سر سے پاؤں تک ہنر ہے۔ کھانے میں نمک کم پڑا ہو تو تمہیں اس کی بھی تمیز نہیں اور پہننا اوڑھنا تو خاص عورتوں کا ہنر ہے، اس بات کو ایک روز تم خود کہہ رہے تھے۔"

"تو چونکہ اَن پڑھ ہے۔ اِس لئے ایسی باتیں کر رہی ہے۔ ہُنر سے میری مراد فنونِ لطیفہ سے ہے، کھانا پکانا بھی کوئی ہنر ہے؟"

"فنونِ لطیفہ میں رقص تو شامل ہی ہے، ہم عورتیں اکثر مواقع پر گا لیتی ہیں، چاندنی رات میں گربا (ایک مشہور گجراتی رقص) گاتی ہیں۔ مجھے تو کوئی نہ ملے تو میں دیہاتی لڑکیوں کے ساتھ بھی گربا گا سکتی ہوں۔ لیکن تم اپنے دوستوں کے ساتھ ناچ گا نہیں سکتے اور دیہاتی آدمیوں کے ساتھ تو بات بھی نہیں کر سکتے۔"

میں نے موضوع بدلنے کی غرض سے کہا۔ اچھا یہی سہی، تُو بہت لائق ہے۔ لیکن تجھ پر میری حکومت تو ہے نا، اس سے زیادہ مجھے اور کیا چاہیئے ؟"

"مگر تم تو اسے بھی برقرار نہیں رکھ سکتے اور عورتوں کو آزاد کر رہے ہو۔"

"یہ ہماری فراخدلی ہے۔"

"نہیں یہ فراخدلی نہیں، نااہلیت ہے، فراخدلی سے کوئی آزادی نہیں دیتا، تم خود محکوم ہو تو ہمیں کیا آزاد کرو گے۔"

"کیوں نہیں ؟ تیرے کپڑے، زیور، رسم و رواج، بود و باش کسی چیز میں بھی میں دخل دیتا ہوں ؟"

"اس کا سبب اور ہے۔ پرانے زمانے کے مردوں کو عورتوں کے زیور، کپڑے اور ان کے رنگ و اقسام سے واقفیت رہتی تھی۔ ان میں اچھا، بُرا، خوشنما، بدنما، پسند ناپسند قرار دینے کا ملکہ تھا اور اس لئے وہ اپنی پسند مطابق سب چیزیں لایا کرتے تھے۔ تمہیں ان چیزوں کی خبر ہی نہیں، اِس لئے آزادی دئے بغیر تمہارے لئے چارہ ہی کیا تھا۔ یہ ہے تمہاری فراخدلی کی حقیقت!

تمہاری زندگی ہی خشک اور بے مزہ ہے۔ میں جب اوّل اوّل بیاہ کر آئی تو مجھے یہ خیال رہتا تھا کہ تمہیں جو چیز پسند ہو وہی پکا کر کھلاؤں۔ میں تم سے پوچھتی کیا پکاؤں ؟ لیکن تم کبھی جواب ہی نہ دیتے، میں اپنے دل میں بہت کڑھتی۔ میں اب سمجھی کہ تم اس بارے میں کچھ جانتے ہی نہ تھے۔"

"ہم ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے بلند تر ہو کر رہتے ہیں۔"

"یہ بھی غلط ہے، میں اچھا کھانا پکاتی ہوں تو تم صاف خوش نظر آتے ہو، اور کھاتے بھی زیادہ ہو، ہاں یہ اور بات ہے کہ بغیر سمجھے بوجھے کھاتے ہو۔ بالکل مُنّا کی طرح۔"

"لیکن تُو اس بات کو تو تسلیم کر لے گی کہ میری محبت کا انحصار تیرے لباس و پوشاک پر نہیں ہے ؟"

"محبت کیا ہے ؟ اسے تو تم پڑھو اور سمجھو، لیکن میں اسے نہیں مانتی کہ تم پر لباس و پوشاک کا اثر نہیں ہوتا۔ اب اور نہ کہلاؤ۔"

"نہیں، وہ بھی کہہ دے۔ اتنے کے لئے بات ادھوری کیوں رہے ؟"

"تمہیں یاد ہے، ایک روز تم بڑے جوش کے ساتھ مجھے کچھ کہنے کے لئے جلد جلد آ رہے تھے۔ نزدیک آ کر میری طرف دیکھا، کچھ دیر تک خاموش دیکھتے رہے، پھر گھر میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ کتابوں کی جلدیں دیکھیں، پھر میری جانب دیکھتے رہے اور الٹے مجھ سے پوچھنے لگے۔ "آج کیوں جی نہیں لگ رہا ہے، آج میں تجھے ایک بہت اچھی بات بتانے آیا تھا مگر بھول گیا، آج کیوں کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا ؟"

"ہاں، تو نے مجھے اس کا بہت سخت جواب دیا تھا۔"

"سخت تو نہیں، ہاں ایک سیدھا سا جواب دیا تھا کہ تمہارا جی نہ لگے تو میں اس کا سبب کیسے بتاؤں ؟"

"اُس واقعہ کا اس بات سے کیا تعلق ہے ؟"

"اس بات سے اس کا تعلق یہ ہے کہ میرے لباس و پوشاک کا تمہارے دل پر اثر ہوتا ہے، اس روز میں نے قصداً پیلوسن کی ساری پہن لی تھی۔ جسے دیکھ کر تم اتنے افسردہ خاطر ہو گئے تھے، پھر میں کیسے کہوں کہ لباس و پوشاک کا تم پر اثر نہیں ہوتا ؟"

"تو میرا اس طرح امتحان کیوں کیا کرتی ہے؟"

"کیوں نہ کیا کروں؟ اس سے ایک روز پہلے میں رنبیک لال کے ہاں ملنے جا رہی تھی۔ اس روز میں نے ذرا اچھے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اس وقت تم نے محبت اور لباس نیز خوش قسمتی اور زینت پر ایک طویل لیکچر دیا تھا۔ یاد ہے نا؟ مجھے دیکھنا تھا کہ اس میں کتنی حقیقت ہے۔

"اچھی بات ہے۔ مجھے خوش رہنا آئے، تو روئے اور مجھے کھانا آئے تب تو روئے۔ یہ بہت اچھی سکیم ہے۔

"نہیں، تمہیں کھانا بھی نہیں آتا۔ کبھی کبھی پہلی ہی روٹی سے سو رج میں پڑ جاتے ہو۔ اس وقت مجھے یاد دلانا پڑتا ہے۔ اور کبھی کبھی باتوں میں یہ بھی بھول جاتے ہو۔"

بات درست تھی۔ پیٹ پر ہاتھ پھیر کر دیکھا تو معلوم ہوا آج بہت کھا گیا۔ میں چاول کھانے کا خیال کئے بغیر اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنے کمرے میں لیمپ جلا کر بیٹھا۔ آج کی بات چیت پر غور کر کے مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ اس کے بعد میں نے اس گفتگو کو لکھنا شروع کیا۔ لکھ کر فارغ ہوا تو اس نے آ کر کہا: "اکیلے اکیلے کیا ہنس رہے تھے؟"

میں نے اسے پاس بٹھا کر سب پڑھوایا، وہ کھلی ہنس پڑی، پھر بولی: "میں آج تک سمجھتی تھی کہ تمہیں کچھ نہیں آتا۔ صرف پڑھنا لکھنا آتا ہے تم پڑھتے تو ہو انگریزی۔ اس لئے اس کے متعلق تو میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔ مگر اس مضمون کو دیکھتے ہوئے تو معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں لکھنا بھی نہیں آتا۔ لہٰذا اس گفتگو کے ساتھ اب اسے بھی لکھو۔"

میں نے کہا: "اس کے لکھنے کی ضرورت نہیں۔ اسے تو میں بہت زمانے سے جانتا ہوں کہ مجھے پڑھنا لکھنا نہیں آتا۔ اس لئے یہ کوئی نئی بات نہیں۔ اوپر کی باتیں البتہ نئی ہیں اس لئے ان کو لکھا ہے۔ اب بتا اس کا عنوان کیا رکھا جائے؟"

"اس سے پہلے کے ایک مضمون کا جو عنوان تھا وہی رکھو "سچا ملکہ"۔

"بہتر ہے۔"

"تم بات بھی تمام میری لکھو اور عنوان بھی میرا ہی بتایا ہوا رکھو۔ تو اس میں تمہارا کیا ہوا؟"

"تو جو عنوان سوجھتی ہے اس کے معنی میں اس کے برعکس لیتا ہوں۔"

(دودی الیھنکی ایک گجراتی کہانی)

ایوب شاہد راجگری

غزل

آج پروازِ تخیل کا نیا انداز ہے
ان کا ہلکا سا تبسم شہپرِ پرواز ہے

ڈھب لگاوٹ کا یہ کیسا ہے؟ یہ کیا انداز ہے
حُسن اپنے عکس سے محوِ نیاز و ناز ہے

ہے جبینِ شوق کس کے آستانے پر کہ آج
آسماں میری نظر میں فرشِ پا انداز ہے

مطمئن کیوں ہے قفس کی تیلیوں کو توڑ کر
یہ نشیمن بھی تو آخر حائلِ پرواز ہے

اُف یہ بیتابی کا عالم ابتدائے عشق میں
جانے کیا انجام ہو گا جس کا یہ آغاز ہے

سازِ حُسن اور اس پہ مضرابِ محبت واہ واہ
ہر ادا اُس شوخ کی اب اک طلسمِ ناز ہے

خیر یہ بزمِ عدو تو ایک قصّہ ہے مگر
یہ نظر بہکی ہوئی کس راز کی غماز ہے

گوپال متل

مختار

بچہ اور اُس کی اخلاقی تربیّت

اگر بچّے کی اخلاقی تربیت صرف چند کاموں کے کرنے یا نہ کرنے کا نام ہوتا تو یہ بڑا آسان کام تھا کہ ایسے کاموں کی فہرست بنا کر دے دی جاتی اور سارا معاملہ حل ہو جاتا۔ لیکن اخلاقی تربیت اور بچّے کی ساری زندگی میں اتنا گہرا تعلق ہے کہ جب تک بچّے کے میلانات اور اس کی زندگی کے دوسرے اثرات کو پیشِ نظر نہ رکھا جائے۔ اس کی تربیت صحیح طور پر نہیں کی جا سکتی ہے۔

ایک زمانہ تھا جب صحبت کے اثر کا اخلاق کے بننے یا بگڑنے میں بڑا دخل سمجھا جاتا تھا اور کہا جاتا تھا کہ خربوزہ خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے۔ لیکن آج ایسا ضروری نہیں کہ بچّہ بُروں کی صحبت میں بُرا ہی ہو۔ اور اچھوں کی سنگت میں اچھا ہی ہو جائے بلکہ اور بہت سے عوامل خود اس کی زندگی کے اندر اور اس سے خارج ایسے ہیں جو اس کو بُرا یا بھلا بناتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک صحت کے معاملے کو لیجئے۔ ایک بچّہ جس کی صحت اچھی نہ ہو، اس کی قوتِ ارادہ بھی کمزور ہوگی۔ اور وہ بُرے میلانات کا شکار صحت ور بچّے کے مقابلہ میں آسانی سے ہو جائے گا۔

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اس قسم کے اثرات قابو میں لائے جا سکتے ہیں اور انہیں صحیح راہ پر لگایا جا سکتا ہے۔ اس قسم کے اثرات میں سے ایک بہت موثر اثر علم اور واقفیت ہے۔ بعض وقت بچّے غلط راہ پر لگ جاتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ صحیح راستہ نہیں جانتے۔ لیکن جدید نفسیات سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ صرف صحیح علم کافی نہیں ہے۔ بلکہ صحیح میلان بھی ہونا چاہیئے۔ جب تک بچّہ خود بہتر نہ بننا چاہے اس کے سامنے ہزار انبیاء اور مصلحین کی سیرت کا خاکہ پیش کیجئے۔ بے سود ہوگا۔ اب سوال یہ ہے کہ بچّہ ایسا ہونا کیوں نہیں چاہتا؟ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس کے دل میں اس سے کوئی قوی تر جذبہ کام کر رہا ہے۔ ایسی صورت میں نتیجہ یہ ہوگا کہ اسی جذبے کی کارفرمائی ہوگی جس کے اظہار کا سب سے زیادہ موقع ہوگا۔ لہٰذا عادت کو بھی سیرت کی تعمیر میں بڑا دخل ہے لیکن ان میں سے کسی ایک کو تنہا اس کی سیرت کے بنانے یا بگاڑنے کا اختیار نہیں ہے۔

اسی طرح صحتِ جسمانی کو بھی بچّے کے اخلاق میں دخل ہے۔ بچّے اگر تھکے ماندے ہوں تو اُن سے ہمدردی کے اظہار کی کم توقع رکھنی چاہیئے۔ آج کل تمام اچھے اچھے مدرسوں میں اس کا خیال رکھا جاتا ہے کہ بچّوں پر زیادہ زور نہ پڑے۔ بعض وقت ہم کسی بچّے کے متعلق یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ کاہل ہے۔ حالانکہ بہت ممکن ہے اس غریب کو پیٹ بھر کر کھانا نہ ملا ہو۔ آجکل دنیا کے تمام مہذب ملکوں میں بچّوں کی عدالتیں ان پر فوراً قرار داد جرم لگا دینے کی بجائے طبیب اور ڈاکٹر رکھتی ہیں، جو ان کی جسمانی صحت کا حال معلوم کرنے کے بعد انہیں مجرم یا غیر مجرم قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح لڑکوں کے جنسی اخلاق کے متعلق فوری فیصلہ کرنے کی بجائے اگر ہم یہ دیکھیں کہ کہاں تک اس کی عام صحت، اس کی غذا، اس کے سونے جاگنے کے اوقات اور اس کے کھیل کود کو اس میں دخل ہے تو شاید ہم اپنے فیصلے میں زیادہ صحیح ہوں۔ تربیتِ اخلاق جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے، بچّے کی عام زندگی کو صحیح طور پر نشو و نما دینے سے علیحدہ کوئی شے نہیں ہے۔

اس بنا پر تربیتِ اخلاق کے تین طریقے ہو سکتے ہیں:۔

(۱) ایسی باتیں جن سے بچّے میں بُری چیزوں سے نفرت اور اچھی چیزوں سے الفت پیدا ہو، ہمیں اختیار کرنی چاہئیں۔

(۲) ایسی تمام واقفیتیں جن سے انسانی زندگی کے سمجھنے میں مدد ملے۔ بچّے کے لئے مفید ہو سکتی ہیں۔

(۳) ایسی تربیت جس سے بچّے اپنی معقول اغراض پوری کر سکیں۔ زندگی کے بنانے میں بہت مدد دے سکتی ہیں۔

قبل اس کے کہ ہم بچّوں کی سیرت میں اخلاقِ حسنہ پیدا کرنے کی کوشش کریں، پہلے یہ دیکھیں کہ ان کے غلط میلانات کو کس طرح راہِ راست پر لایا جا سکتا ہے۔ بعض بچّوں کی عادت یہ ہوتی ہے کہ وہ [illegible] تخریب [illegible] کرتے ہیں لیکن انہیں ان معصوم حالو

کے لینے پر ضد افسوس نہیں ہوتا - ان بچوں کے لئے اس سے کوئی فائدہ نہیں کہ انہیں معصوم جانوں کے لینے کے گناہ سے ڈرایا جائے، یا انہیں زجر و توبیخ کی جائے - بلکہ بہترین صورت یہ ہے کہ ان کے اس شوق کو پرندوں کی تصویریں بنانے اُن کے رہنے سہنے کے متعلق حالات معلوم کرنے اور پھر انہیں دوسروں کے سامنے پیش کرنے کی طرف مائل کیا جائے - اس میں نہ صرف یہ کہ ایک جذبے کو دوسرے سے بدلنے کی کوشش کی گئی ہے - بلکہ اس کے جماعتی احساس کو اُبھار کر اسے قریب قریب بالکل زندگی دبا گیا ہے -

اسی طرح بعض صحیح جذبات سے کام لے کر ہم اخلاق کی تربیت بھی کر سکتے ہیں - مثلاً ایک بچے کو سگریٹ یا بیڑی پینے کی عادت پڑ گئی ہے اور وہ کسی طرح نہیں چھوٹتی ہے - آپ ہزار سگریٹ کی برائیاں بتائیں، لیکن وہ ہے کہ اس لت سے باز نہیں آتا - یہی بچہ اگر کھیل کود کا عاشق ہے اور آپ اُسے ذرا یہ سمجھائیں کہ اس سے ٹیم میں تمہارا درجہ بہت کم ہو جائے گا، اس لئے کہ اس سے سینہ کمزور ہو جاتا ہے - پھر دیکھیئے کہ وہ کبھی اس کے قریب بھی نہ جائے گا۔

بچے کی زندگی میں ایک بڑی موثر چیز شخصی مثال ہوتی ہے - ہزار وعظ و پند کے مقابلہ میں شخصی مثال کہیں زیادہ موثر ثابت ہوتی ہے - بچے شروع شروع میں تو ایسے شخصوں کی مثال سے اثر لیتے ہیں، جنہوں نے دلیری، بہادری اور جانبازی کے کارنامے کئے ہیں - آگے چل کر بڑے بڑے مصلحین اور پیمبروں کے حالات سے اثر لیتے ہیں - والدین اور استادوں کو چاہئے کہ بچوں کو شروع ہی سے نہ صرف ایسے لوگوں کے حالات زندگی پڑھانے پر اکتفا کریں بلکہ ممکن ہو تو انہیں زندہ مختلف قسم کی بڑی شخصیتوں سے براہ راست ملنے جلنے کے مواقع بہم پہنچائیں تاکہ وہ ان میں سے اپنے نمونے کا انتخاب کر سکیں۔

بچوں میں ایک بڑا جذبہ امتیاز حاصل کرنے اور نمایاں ہونے کا ہوتا ہے - کھیل کے میدان میں اگلی صف کے کھلاڑیوں میں ہر ایک یہ کوشش کرتا ہے کہ گیند کو گول میں پہنچائے - لیکن ہر ایک کو برابر کا موقع نہیں رہتا - ایسی صورت میں کھلاڑی کو یہ چاہیئے کہ وہ ٹیم کی خاطر شخصی امتیاز کو قربان کر دے اور گیند دوسرے ساتھی کو دیدے جس کو اس سے بہتر موقع حاصل ہو۔

بچوں میں اسی طرح ایک جماعتی جذبہ بھی بہت قوی ہوتا ہے - اکثر آپ نے دیکھا ہوگا کہ اُن کی ٹولیاں ہوتی ہیں اور یہی ٹولیاں بعض وقت ناپسندیدہ مشاغل میں شہرت حاصل کر لیتی ہیں - لڑکوں کے اس جذبے کی بنا پر ان کی اچھی اچھی مجلس اور انجمنیں بنائی جا سکتی ہیں جو نہایت مفید کام انجام دے سکتی ہیں - اسی طرح ان میں ٹیم اور اسکول کی محبت کا جذبہ بھی موجود ہوتا ہے جو آگے چل کر قوم اور وطن کے جذبے میں تبدیل کیا جا سکتا ہے - یہی تربیت ہوتی ہے جو وقت آنے پر انسان سے بڑی بڑی قربانیاں کرا لیتی ہے -

ہمدردی اور رحم کا بھی ایک جذبہ بچے میں شروع ہی سے ہوتا ہے، اب سوال محض عادت کا رہ جاتا ہے کہ بچے میں اس جذبے کے ماتحت اس سے کام لیا جائے - بچوں کی زندگی میں قدم قدم پر ایسے مواقع پیش آتے ہیں، مثلاً ایک کے پاس کئی کھلونے ہیں اور دوسرے کے پاس ایک بھی نہیں - وہ اپنے ان کھلونوں میں سے دوسرے کو دے سکتا ہے - یا ایک مٹھائیوں سے بھرا ڈبہ ہاتھ میں لئے ہوئے ہے، اور دوسرا اسے تک رہا ہے - نہایت آسانی سے اُسے اس پر آمادہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ دوسرے کو بھی شریک کر لے -

اب ان کے علاوہ کچھ اور مواقع آتے ہیں جہاں اخلاق پر ناگوار اثر پڑنے کا اندیشہ ہوتا ہے - ہمیں چاہیئے کہ بچوں کی زندگی میں اُن سے پرہیز کریں تاکہ اخلاقی قوت اور مضبوط ہو - مثلاً اکثر بچے کسی نیک کام کے اس بنا پر عادی ہوتے ہیں کہ انہیں والدین یا استاد کی طرف سے شاباشی ملے گی - نیک کام خود اپنا اجر ہے اور بچے بھی شروع سے اسے محسوس کرتے ہیں - ہمیں چاہیئے کہ ان کے اس احساس کو اور قوی کریں - بجائے اس کے کہ انہیں تحسین و آفرین کا عادی بنائیں -

اسی طرح اکثر وہ کسی کام سے اس لئے باز رکھے جاتے ہیں کہ انہیں مار پیٹے گی یا اُن کا ناشتہ بند ہو جائے گا - بچوں کے اندر اسی عمر سے اعتماد اور عزت نفس کے شریف جذبات بھی موجود ہوتے ہیں کیوں نہ ان جذبات سے اپیل کی جائے؟ بہت کم امکان ہے کہ وہ نہ سنیں، اور اگر ایک بار نہ سنیں تو دوسری بار کوشش کی جائے - کوئی بچہ اپنے لئے ذلیل اور رسوا ہونا پسند نہ کرے گا -

سیرت دراصل عادت سے پختہ ہوئی ہے - ایک بات کا کرنا اور بار بار کرنا سیرت کو پختہ کرتا ہے - پابندیٔ وقت، ایفائے وعدہ - ذمہ داری کا احساس، ہمت اور استقلال کون نہیں جانتا کہ یہ سب اچھی خصلتیں ہیں، لیکن سیرت کے اندر ان کا جم جانا صرف عادت سے

ہوسکتا ہے۔ عادت ہر صفت کی اور ہر حالت میں ہونی چاہیئے۔ ممکن ہے ایک بچہ مدرسے سے تو وقت پر آئے لیکن جب اپنے کسی ساتھی کے ہاں وعدہ کرے تو آدھ گھنٹہ دیر کر کے آئے یا اگر کسی دوست کی کتاب واپس کرنی ہے، وہ تو کر دیتا ہے لیکن جلسے کے سلسلے میں ایک کام اپنے ذمے لیا ہے اور اُسے پورا کرنے سے بھاگتا ہے۔ لہٰذا بچوں کے اندر ان تمام اخلاق حسنہ کی ہر حالت میں عادت ڈالنے کی کوشش کرنی چاہیئے کہ صرف ان کا علم ہونا کافی نہیں ہے۔

ایک اور خرابی تربیت اخلاق کے سلسلے میں یہ ہے کہ وہ تعلیم سے علیحدہ کوئی جداگانہ شے سمجھ لی گئی ہے۔ اب تک تعلیم ایک اور چیز تھی اور تربیت ایک دوسری شے سمجھی جاتی تھی۔ تعلیم کا کام ذہن اور علم سے تھا اور تربیت کا تعلق دل اور عمل سے، لیکن اب جدید تعلیم میں یہ تصور بالکل بدل گیا ہے۔ بچوں کو بیشتر کام مدرسے کے اندر ہاتھ سے کرنے پڑتے ہیں۔ مثلاً باغبانی کے سلسلے میں پھولوں کو پانی دینا۔ کیاریاں بنانا، ڈرامے کے لئے اسٹیج تیار کرنا، قطب کی سیر کا پورا اہتمام کرنا وغیرہ وغیرہ۔ ان میں محنت کرنے کی عادت، محنت کرنے والوں کی قدر، اشتراک عمل، ذمہ داری اور بہت سی اخلاقی خوبیوں کی تعلیم ہو جاتی ہے۔

بعض اچھے مدرسے اور ایک قدم اس سے آگے جاتے ہیں۔ وہ مدرسے کا پورا انتظام اُن کے ہاتھ میں چھوڑ دیتے ہیں اور اُس کے بُرے بھلے کی ذمہ داری سب اُن کے سر ڈال دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں بچے نہ صرف مدرسے کو اپنا مدرسہ سمجھنے لگتے ہیں بلکہ وہ ایک پورے ادارے کا بار بھی اپنے کندھوں پر اٹھا لیتے ہیں اور وہ نہ صرف اشتراک عمل کا سبق اس سے سیکھتے ہیں۔ بلکہ ایک ذمہ داری کا احساس بھی ان کے اندر ترقی پاتا ہے۔

لیکن اس قسم کے اجتماعی کاموں میں ایک کمزوری ہوتی ہے اور وہ یہ کہ اُن کی پشت پر کوئی نہ کوئی قوت ہوتی ہے جو ناکامی کے وقت اُن کا سہارا بن جاتی ہے۔ بچوں کو انفرادی اور اجتماعی دونوں طریقوں پر ایسے تجربات کا عادی بنایا جائے جب اُن کے خطرے کا کوئی سہارا نہ ہو بلکہ اس خطرے سے ایک یا دو بار گزر بھی جائیں۔ کہتے ہیں کہ اچھا تیراک وہ ہوتا ہے جو ایک دو دفعہ غوطے کھا چکا ہو۔ مثال کے طور پر بچوں کے پیسے کوڑی کا معاملہ لیجیئے۔ والدین بچے کے ہاتھ میں روپیہ پیسہ دیتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ وہ نہ صرف اڑا ڈالے گا بلکہ کہیں بد عادت بھی نہ ہو جائے۔ لیکن ایسے ہی بچے ہوتے ہیں جب بڑے ہونے پر یا والدین کے مر جانے پر جہاں دولت اُن کے ہاتھ میں پڑی آناً فاناً غائب ہو گئی اور وہ خود بھی اس کے ساتھ تباہ ہوئے۔ والدین کو چاہیئے کہ وہ شروع ہی سے بچوں پر اعتماد کریں اور پیسہ کوڑی سب کچھ ان کے ہاتھ میں دیں۔ تاکہ وہ ضائع کر ہی کہ اُن کی قدر کرنا سیکھیں۔

اسی طرح ہمارے اجتماعی کاموں کا حال بھی ہوتا ہے۔ مدرسے کی پوری ذمہ داری گو وہ اپنے سر لیتے ہیں، لیکن وہ اسے بگاڑ نہیں سکتے۔ ہمیں چاہیئے کہ انہیں ایسے کام دیں جنہیں وہ چاہیں تو بگاڑ بھی سکیں اور اس کی ذمہ داری اپنے سر لیں۔ مثلاً کوئی رسالہ نکالنا جلسہ منعقد کرنا، ڈراما کرنا، اس میں انہیں پورا اختیار ہو کہ وہ خواہ بنائیں یا بگاڑیں۔ اور اگر بگاڑ بھی دیں تو کوئی روک ٹوک کرنے والا نہ ہو۔ اور سچ پوچھیئے تو جو کام وہ بگاڑ کر بنانا سیکھتے ہیں اس کے اعتماد اور قوت کا کیا کہنا؟

اخلاق کی تربیت میں ہم کو چند باتوں کا اور بھی خیال رکھنا چاہیئے ایک تو یہ کہ جن اوصاف حسنہ کی ہم بچے کو تلقین کرنا چاہتے ہیں، وہ اُن کی اہمیت اور ضرورت کو سمجھتا بھی ہو۔ صرف اطاعت مطلق کی عادت ڈالنا کافی نہیں۔ اس سے اس کے اعمال میں جو زندگی اور اس کی روح میں جو تازگی پیدا ہو گی وہ اطاعت مطلق سے ہرگز نہیں ہو سکتی۔ جو بچہ جانتا ہے کہ کس طرح اس کے دیر میں آنے سے ساری جماعت کا نقصان ہوگا، اس پابندیٔ وقت اور اس کی جو صرف تعمیل حکم کے خیال سے وقت پر آتا ہے، بہت فرق ہوگا۔

اسی طرح تلقین حسنہ کے سلسلے میں اگر عمومی نصائح کی بجائے مخصوص ہدایت کی جائے تو اس کا بہت اثر پڑتا ہے۔ مثلاً سچ بولنا نہایت اچھی بات ہے۔ اس کی بجائے اگر ہم یہ تلقین کریں کہ جب تم اپنا کام گھر سے کر کے نہ لاؤ تو جو وجہ ہو، سچ سچ استاد کے سامنے بیان کر دو، تو غالباً اس کا زیادہ اثر پڑے گا۔

اسی طرح اخلاق کی تعلیم میں ہمیشہ نہی مفید پڑتی ہے۔ آپ نے کبھی سردی سے دانت بجتے دیکھے ہیں، اگر آپ اس سے ہزار کہیں کہ دانت مت بجاؤ، بُرا لگتا ہے، لیکن وہ نہیں باز رہ سکتا ہے پر اگر یہ کہیں دانت دبا لو، تو دانتوں کا بجنا فوراً بند ہو جائے گا۔ یہی حال بعض وقت بچوں کا ہوتا ہے۔ انہیں کسی کام سے منع کیجئے وہ نہیں رکیں گے۔ لیکن اگر کوئی اور بات کرنے کو کہیئے تو وہ فوراً اس سے باز آ جائیں گے۔

علاوہ اس کے بچوں کے سامنے ایک اچھی زندگی کا یہ تصور آجاتا ہے کہ فلاں بات نہ کرو، فلاں سے پرہیز کرو۔ ایسی زندگی کا تصور انسان کی سیرت کو بہت کمزور بنا دیتا ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ ابتدا ہی سے ایک اچھی زندگی کا یہ تخیل پیش کریں جس میں فلاں فلاں باتیں کرنی ہیں۔ مثلاً جھوٹ سے نفرت دلانے کی بجائے سچ کی خوبیوں پہ زور دیا جائے وغیرہ وغیرہ۔

تربیت اخلاق کے سلسلے میں دو باتوں کا خیال رکھنا اور ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ کہنے والا کون ہے اور دوسرے یہ کہ باتیں کس وقت کہی جاتی ہیں۔ بعض وقت اچھی سے اچھی باتیں، اگر کہنے والے کی عزت بچے کے دل میں نہیں ہے تو بالکل بے اثر رہتی ہیں۔ پھر اس طرح کہنے کا وقت بھی ہوتا ہے۔ دن کے ہنگامے میں جبکہ دماغ مختلف خیالات کے اندر مصروف رہتا ہے، بہت ممکن ہے کہنے کا اثر نہ ہو۔ لیکن رات کو سوتے وقت یا اور ایسے وقت جب طبیعت میں یکسوئی ہو نصیحت کا بہترین موقع ہوتا ہے۔

اسی طرح کہنے کے طریقے میں بھی ایک بات پیش نظر رکھنی چاہیئے اور وہ یہ کہ باتیں اشارۃً کہی جائیں۔ براہ راست کہنے کا نہ صرف بُرا اثر بلکہ بعض وقت اُلٹا اثر ہوتا ہے۔ مثلاً سگریٹ پینے پر یوں کتنا سخت سست کہو لیکن کھیل کے وقت اس کی خرابی کا احساس ہوتا ہے۔ اگر ہم اس احساس سے ذرا کام لیں تو بعض وقت وہ کام نکل سکتا ہے جو براہ راست پند و نصائح سے شاید ممکن نہ ہو۔

اب سوال یہ ہے کہ اخلاق کی تعلیم مدرسوں کے اندر دینی چاہیئے یا نہیں؟ اس کا جواب ہاں اور نہیں دونوں میں ہو سکتا ہے۔ اخلاقی تعلیم سچ پوچھئے تو سب مضمونوں میں آسکتی ہے۔ زبان و ادب کو لیجئے اس میں ایسے قصے اور افسانے لے سکتے ہیں جن کا اثر بچوں کی سیرت پر بہت اچھا پڑ سکتا ہے۔ اس طرح تاریخ میں علاوہ اس کے کہ وہ انسانی کارنامہ ہے۔ اس سے بچوں کے دلوں میں ہمت اور بہادری، عزم اور استقلال، ایثار اور قربانی وغیرہ کے جذبات کی پرورش کی جا سکتی ہے۔ بڑے اشخاص کی سوانح عمریوں سے تو بہت کچھ سبق براہ راست حاصل کیا جا سکتا ہے۔ جغرافیہ اور سائنس سے بھی انسانوں کی خدمت اور راحت رسانی اور اس طرح کے دوسرے سبق مل سکتے ہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ آیا اخلاق کی تعلیم علیحدہ ہو یا یوں ہی محض ضمنی طور پر رکھی جائے، اس میں خرابی اور اچھائی دونوں ہیں۔ علیحدہ مضمون کے طور پر رکھنے میں یہ اگر کسی ایسے استاد کے ہاتھ میں پڑ گئی جو اس کے لوچ لچک سے واقف نہیں تو پھر یہ ایک بے روح مضمون ہو کر رہ جائے گی اور اس سے بجائے فائدہ کے الٹا نقصان ہوگا۔

اخلاق کی تعلیم میں ایک بڑا کام تیوہاروں اور قومی اجتماعوں سے لیا جا سکتا ہے جبکہ بچوں کے جذبات قبولِ اثر کے لئے آمادہ ہوتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر عید کی خوشی میں دوسروں کا غم بھی یاد دلایا جا سکتا ہے۔ محرم میں امام حسینؑ کی شہادت جہاں حق کی فتح کا وہاں دسہرے میں رام چندر کی لنکا پر چڑھائی ناحق کی مغلوبیت کا سبق دیتی ہے۔ قومی اجتماعوں سے شہدائے وطن کی یاد تازہ کی جا سکتی ہے اور یہ سب اخلاق کی تربیت و تعلیم کا بہترین ذریعہ ہیں۔

ماخوذ جامعہ دہلی

اچھوت اور برہمن

رات کا وقت تھا۔ تقریباً آٹھ بجے تھے۔ کلو بھنگی دن بھر کام کرنے کے بعد پوجا پاٹھ کا سامان لیکر مندر کی طرف چلا جا رہا تھا جب وہ مندر کے پاس پہنچا۔ تو اس نے اندر جانے کے لئے زینہ کی پہلی ہی سیڑھی پر قدم رکھا تھا کہ سوہن لال شرما نے جو اس مندر کا پوجاری تھا اس کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ چیخ کر بولا۔ او کمینے۔ بدذات نیچ کہیں کے۔ تو یہاں کس کی اجازت سے آیا ہے۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ یہ مندر ہے اور اس میں شری کرشن بھگوان کی مورتی ہے۔ چل دور ہو ورنہ ابھی مار مار کر حلیہ بگاڑ دوں گا۔

کلو بھنگی :۔ پنڈت جی۔ میں بھی مندر میں کرشن بھگوان کا نام لینے کے لئے ہی آیا ہوں۔ اور......

پنڈت :۔ (اس کی بات کاٹ کر) پاگل کہیں کا۔ کیا یہ مندر اچھوتوں کے لئے ہے ؟ چل بھاگ یہاں سے۔ زیادہ بک بک نہ لگا۔

پنڈت جی کے ان سخت الفاظ سے اس غریب بھنگی کے دل پر ایک زبردست چوٹ لگی اور وہ دل ہی دل میں اس کو کچھ برا بھلا کہتا ہوا وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔

اب تقریباً دس بج چکے تھے۔ کلو البشور کا سچا پجاری پوجا پاٹھ کا سامان لیکر دریا کی طرف چل دیا۔ اور کنارے پر پہنچ کر اس نے ایک جگہ سامان رکھ دیا اور تھوڑی سی جگہ صاف کر لی۔ اب وہ کرشن بھگوان کی مورتی تلاش کرنے لگا۔ لیکن اس بیابان میں مورتی کہاں۔ آخر اس کی نگاہ ایک پاس ہی پڑے ہوئے پتھر پر پڑی۔ اس نے اس کو ہی اٹھا لیا۔ اور اس پر سندور سے شری کرشن جی کی فوٹو بنا لی۔ اور اسے ہی دیوتا مان کر پوجا شروع کر دی۔

سردی کا موسم تھا۔ ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ دریا کے دوسری طرف . ایک بہت گھنا جنگل تھا۔ جہاں سے کبھی کبھی خوفناک درندوں کی دل ہلا دینے والی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ ہوا کے سرد جھونکے جسم کے ساتھ ٹکراتے تھے اور چیرتے ہوئے گزر جاتے تھے۔ امیر لوگ رضائیوں میں منہ چھپائے خواب غفلت کے مزے لے رہے تھے۔ غریب سردی سے بچنے کے لئے آگ تاپ کر ہی گزارہ کر رہے تھے۔ لیکن یہ اچھوت ایسے وقت میں پانی کے قریب آنکھیں بند کئے دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر بیٹھے کرشن کی عبادت میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایسا جان پڑتا تھا کہ دنیا کی کوئی بھی چیز اس کی توجہ کو اپنی طرف مبذول نہیں کر سکتی۔ تمام رات کلو نے اسی عبادت میں گزار دی۔ آخر چاند کی جگہ سورج نے لی۔

اب صبح کا وقت تھا۔ اور صبح کے خوش الحان پرندے ادھر اُدھر اپنے اپنے راگ الاپتے پھر رہے تھے۔ امیر لوگ اوورکوٹ پہنے سروں پر گلوبند باندھے اور ہاتھوں میں دستانے اوڑھے ہوئے تھے۔ غریب لوگ جو سردی سے ٹھٹھر رہے تھے۔ اس انتظار میں تھے کہ کب سورج دیوتا اپنی کرنوں سے انہیں گرم کرے۔ ایشور کے بھگت ہاتھوں میں لمبی لمبی مالائیں لئے مندروں کی طرف جلدی جلدی لمبے لمبے قدم بڑھا رہے تھے۔ بعض لمبے لمبے ٹیکے ماتھوں پر لگائے ایک ہاتھ میں گڑوی اور دوسرے میں مالا پکڑے اپنے گھروں کو واپس آ رہے تھے اور کچھ ہمارے جیسے سست اور کاہل الوجود ابھی بستروں میں ہی پڑے کروٹیں بدل رہے تھے۔ آخر جوں توں کر کے بستر کو خیرباد کہہ کر میں بھی اپنے ہمراہیوں کے ساتھ دریا کی طرف چلا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد پنڈت سوہن لال بھی جن کو آپ بھولے نہ ہوں گے۔ ایک ہاتھ میں بڑی سی ٹلیوٹی لئے وہاں آ پہنچے۔ جب پانی لینے کی غرض سے دریا میں داخل ہونے لگے تو کلو جو کہ وہاں ہی بیٹھا ہوا تھا ان کے ساتھ چھو گیا۔ بس پھر کیا تھا۔ لال پیلے ہو گئے۔ اس بیچارے غریب کا تمام سامان فوراً ایک ہی پاؤں کی ٹھوکر سے دریا میں بہا دیا۔ قریب ہی ایک چھڑی بھی پڑی تھی۔ اسے اٹھا کر خوب زدوکوب کیا۔ بے بس اور کمزور اچھوت وہاں سے اٹھا اور خدا تیرا بھلا کرے کہہ کر جنگل کی طرف چل دیا۔

پنڈت جی بھی پانی لے کر مندر میں واپس آ گئے۔ اور پانی لیکر

شری کرشن جی مہاراج کو اشنان کرانے کے لئے اندر داخل ہو گئے۔ انہوں نے مورتی کو نہلانے کے لئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ دھم سے ان کا پاؤں پھسل گیا اور وہیں ڈھیر ہو گئے۔ اب غیب سے آواز آئی "تو نے ناحق ایک غریب اچھوت سے بے انصافی کی ہے۔ خواہ مخواہ اسے پیٹا ہے۔ اس کو مندر میں آنے سے روکا ہے۔ تو اپنے آپ کو بڑا اور اسے نیچ سمجھ رہا ہے۔ تو اس مندر کا پجاری ہونے کے قابل نہیں ہے۔ تیری سزا یہی ہے کہ تو تڑپ تڑپ کر اس جہانِ فانی سے رخصت ہو۔ آج سے چار ماہ بعد تو یہاں نہ ہوگا۔"

اب کیا تھا۔ پنڈت کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس کے لڑکے اس کے اردگرد کھڑے ہو گئے۔ اور وہ حسرت بھری نگاہوں سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے لڑکے یہ سن کر فوراً ہی کلّو کی تلاش میں روانہ ہو گئے۔ جا بجا جنگلوں میں مارے مارے پھرنے لگے۔ آخر کئی روز کی متواتر کوشش کے بعد ان کو کلّو مل گیا۔ لیکن اب وہ بالکل فقیر ہو چکا تھا۔ دنیا سے کنارہ کشی کر چکا تھا۔ ہر چند انہوں نے واپس چلنے کے لئے کہا۔ لیکن جواب بالکل نفی میں تھا۔ آخر وہ مایوس ہو کر واپس آ گئے۔

پورے چار ماہ بعد پنڈت جی اس دنیا کو خیرباد کہہ گئے۔ اب ان کے لڑکے کسی بھی اچھوت کو مندر میں آنے سے نہیں روکتے۔

اے۔ پی۔ جین

کیا کیا لکھوں

کچھ یہ سمجھاتے ہیں تو نظمیں مناظر ہی پہ لکھ
کوئی کہتا ہے ہمیشہ "کانگریس" کے گیت گا

اتحادی راگ لکھنے پر تقاضا دس کا ہے
جو ہیں اسراروں سے واقف وہ فرماتے ہیں آہ

جس میں ہوں بلبل وجہ "صیاد و چمن" وہ شعر کیا؟
طبع موزوں کو یہ ترغیبِ رُخِ احساس ہے

شاعرِ مشرق یونہی بنتا ہے۔ ثابت بھی تو کر
نظم کے پرتو سے دہقاں کی مصیبت ٹال دے

سایۂ تخئیل میں ناچار معذوروں کو لے
کچھ سُجھاتے ہیں سیاسیاتِ حاضر ہی پہ لکھ

کوئی کہتا ہے کہ "مسلم لیگ" کی تانیں اُڑا
دس یہ کہتے ہیں کہ سب کچھ شاعروں کے بس کا ہے

تُو نے فنِ شعر کو اے شادؔ کر ڈالا تباہ
جس کے پہلو میں نہ ہو حبِّ وطن وہ شعر کیا

انقلاب آور نہیں تو شاعری بکواس ہے
پیش کر اشعار میں پیغام "آزادی" اثر ہو

دل میں سرمائے کے تیغِ بقا یا ڈال دے
دامنِ تنظیم میں نادار مزدوروں کو لے

بعض لمساتے ہیں۔ نقلی صوفیوں کی ہجو پر
ایک فرمائش۔ شبابیات پر لکھتا رہوں

تیسرا اصرار۔ تنقیصِ حکومت نظم کر
شخصِ رابع رائے دیتا ہے قصیدوں کے لئے

دلیش کے "لیگلا بھگت" یا کو فیوں کی ہجو پر
دوسری خواہش۔ حسین جذبات پر لکھتا رہوں

"منصۂ بزمِ ادب کو عرصہ گاہِ رزم کر"
"زمزمِ افکار کے چھینٹے پلیدوں کے لئے"

اب بتائیں شادؔ اربابِ ہُنر کیا کیا لکھوں
مشورے معقول ہیں اکثر۔ مگر کیا کیا لکھوں

شادؔ عارفی

پنجے کا نشان

بھوتوں پریتوں کا تو میں قائل نہیں۔ لیکن کیا کروں آنکھوں دیکھی بات سے کیونکر انکار کر سکتا ہوں۔ اور پھر یہ نہیں کہ کوئی خواب کا واقعہ ہو۔ اپنی جیتی جاگتی آنکھوں سے میں نے ایک ایسی روح کو دیکھا ہے جسے زمین میں دفن ہوئے ایک عرصہ ہو چکا تھا اور جس کی غالباً ہڈیاں تک مٹی بن چکی ہوں گی

جاڑے کی ایک شام ابھی سورج غروب ہو ہی رہا تھا کہ میں اور میرا ایک دوست ضلع انبالہ کے ایک پرانے قصبے میں پہنچے۔ کچھ تو یہ قصبہ اجڑ اجڑا کر یونہی مختصر سا رہ گیا تھا اور کچھ پرانا ہونے کی وجہ سے اور بھی غیر آباد اور ڈراؤنا سا معلوم ہوتا تھا۔ جگہ جگہ کھنڈرات۔ پرانی بوسیدہ دیواریں اور تہہ خانے اس کی ویرانی کو اور بھی بھیانک بنا رہے تھے۔ اور آبادی کے باوجود ہر طرف بے حسی چھائی ہوئی تھی۔

جس گھر میں ہم داخل ہوئے۔ یہ ہماری بوڑھی پھوپی کا تھا۔ جو ہمیں عرصے سے خطوں میں متواتر لکھتی رہتی تھیں کہ منگل کی رات کو کوئی ہمارے دروازے پر خون سے لتھڑے ہوئے ہاتھ سے پنجے کا نشان بنا جاتا ہے اسمیں صرف تین انگلیوں اور ایک انگوٹھے کا نشان ہوتا ہے اور بیچ کی انگلی غائب ہوتی ہے۔ پہلے پہل تو ہم عرصے تک یہی سمجھتے رہے کہ یہ کسی دشمن کا کام ہے۔ لیکن جب انہوں نے کئی خطوں میں یہ لکھوایا کہ میں تمام رات خود جاگتی رہتی ہوں اور میں نے اس شخص کو دیکھا ہے۔ لیکن وہ کوئی جیتا جاگتا انسان نہیں۔ بلکہ کوئی روح ہے۔ کیونکہ تھوڑی ہی دور جا کر وہ غائب ہو جاتی ہے۔ حالانکہ ہمارے مکان کے سامنے نہ کوئی درخت ہے۔ نہ مکان نہ دیوار۔ نہ کوئی آڑ۔ پھوپی کے اس قسم کے خطوط سے ہم لوگ بہت پریشان تھے۔ اور اس انتظار میں تھے کہ فرصت ملے تو ہم وہاں جا کر اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ یہ تمام ماجرا کیا ہے۔

اس دوران میں میں نے اس معمہ کو حل کرنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن ذرہ برابر بھی کامیابی نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ میں اپنے دوست کو لیکر وہیں جا پہونچا۔ اتفاق کی بات جب ہم گھر سے چلے تو جلدی میں پھوپی کو اپنے آنے کی اطلاع بھی نہ دے سکے۔ اب جو دروازے پر جا کر دستک دی تو آواز ندارد۔ دل میں سوچا کہیں مکان تو نہیں بھول گیا۔ ادھر دیکھ ادھر دیکھ آخر یقین ہو گیا کہ مکان تو یہی ہے۔ لیکن اب یہ کیسے معلوم ہو کہ اندر کوئی ہے بھی یا نہیں۔ پھوپی بچاری بوڑھی تو تھیں ہی۔ جوان بچوں کی آئے دن کی موت اور خاوند کے صدمے نے اور بھی نحیف کر دیا تھا۔ کانوں سے بھی اونچا سنتی تھیں۔ خیر بہ ہزار وقت کہیں ہماری آواز اس کے کان میں پڑی۔ میں نے دروازے کی جھریوں میں سے دیکھا تو ایک چھوٹا سا ٹمٹماتا دیا لئے کنداؔ ہی کھولنے آرہی تھی۔ دروازے کے پاس آکر بولی کون ہے؟

میں نے اپنا نام اور جگہ کا پتہ دیا۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔ مگر اُف۔ توبہ کمرے میں گھستے ہی وہ بدبو آئی کہ گویا مدتوں سے کسی نے وہاں جھاڑو تک نہ دی تھی اور دری بھی کس نے ہو گی۔ پھوپی کو تو اپنا ہی ہوش نہ تھا۔ اور جانن شروع ہی سے کام چور تھی۔ اس نے دروازہ کھول کر ہماری طرف گھور کر دیکھا۔ پہچان کر بولی آئیے۔ ہم اس کے پیچھے پیچھے ہو لئے ڈیوڑھی سے نکل کر اندر صحن میں داخل ہوئے۔ چاروں طرف اندھیرا گھپ۔ کمرے خالی کوٹھریاں ویران۔ سرسبز درختوں کی جگہ جھاڑیاں اور ہر ہر قدم پر ٹوٹی ہوئی دیواروں کی اینٹیں چاروں طرف خاموش سایہ کئے ہوئے تھیں۔ اور ہر چیز پر سکتہ کا سا عالم طاری تھا۔ مگر کبھی کبھی کسی چمگادڑ کی آواز اس سکوت کو ایک لمحے کے لئے توڑ دیتی تھی۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ ایسی اجڑی اور ویران جگہ میں روحوں کا بسیرا نہ ہو گا تو اور کہاں ہو گا۔ اتنا بڑا مکان اور اس میں صرف دو ذی روح اور وہ بھی ایسے کہ جن کی شمع حیات ٹمٹما رہی ہے رکھلا رونق ہو تو کیسے۔ قریب پہنچکر ہم نے پھوپی جان کو سلام کیا۔ کچھ دیر بیٹھے۔ کھانے پینے سے فراغت حاصل کی تو جانن ہمیں ایک ایسے کمرے میں لے گئی جس کی دیواروں کی سفیدی جھڑ جھڑ کر طرح طرح کی بھیانک شکلیں بنی ہوئی تھیں۔ چھت کی کئی کڑیاں ٹوٹی ہوئی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چھت اب نیچے آئی۔ کمرے کی پچھلی طرف ایک دریچہ تھا جس میں کواڑوں کا نشان نہ تھا البتہ لوہے کی موٹی موٹی سلاخیں ضرور اسے بھاری بھرکم بنائے ہوئے تھیں۔ باہر تھوڑے ہی فاصلے پر ایک پرانے قبرستان کی اونچی نیچی قبریں ستاروں کی ہلکی ہلکی روشنی میں نظر آرہی تھیں۔

ہم دونوں نے اپنے اپنے بستر درست کئے اور لیٹ گئے مگر نیند کہاں۔ وہی پنجے کا نشان۔ روح کی آمد۔ جگہ کی ویرانی۔ اونچی نیچی قبریں سینما کی تصاویر کی طرح ایک ایک کر کے سامنے سے گزر رہی تھیں۔ لیکن نیند تو سو

؎ ملازمہ کا نام

پر بھی آ جاتی ہے۔ کچھ دیر کے بعد غنودگی سی طاری ہوئی۔ اور مجھے اپنی سدھ بدھ نہ رہی۔

رات کے کوئی ایک بجے کا عمل ہوگا۔ جب میری آنکھ کتوں کے رونے اور چمگادڑوں کے شور سے کھل گئی۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی کمرے میں گھس آیا ہے۔ میں اپنے لحاف میں دبک گیا۔ کچھ دیر کے بعد مجھے ایک ہاتھ لحاف کے اوپر محسوس ہوا۔ ڈر کے مارے چیخ نکلا چاہتی تھی۔ کہ مجھے ایک آواز یہ کہتی سنائی دی۔ احمد بیٹا جلد اُٹھو۔ اب اس کے آنے کا وقت ہے یہ آواز میری پھوپی کی تھی۔ میں جھٹ سے اُٹھ بیٹھا اور ناصر کو بھی جگا لیا۔ پھوپی نے ہم دونوں کو لیجا کر بالاخانے کی ایک کھڑکی میں بٹھا دیا۔ اور خود کہیں اور چلی گئی۔ ہم دونوں سہمے ہوئے کبوتر کی طرح بیٹھے رہے اور دل ہی دل میں آیاتِ قرآنی کا ورد کرتے رہے۔ اُف وہ ہیبتناک نظارہ میں کبھی نہ بھولوں گا جب میں نے دیکھا کہ ہمارے عین سامنے اسی قبرستان میں ایک نیلے رنگ کا چمکدار شعلہ بلند ہوا۔ یہانتک کہ وہ درختوں سے بھی اونچا ہو گیا اور قبروں کے گرد اس طرح پھرنے لگا جیسے کوئی بدنصیب بیوہ اپنے گم شدہ کمسن بچے کو ڈھونڈھ رہی ہو۔ میں نے ڈر کے مارے آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن اب جو کھولیں تو اس سے بھی زیادہ وحشت خیز منظر دیکھا۔ گھوبتے گھومتے اب وہ شعلہ ہماری طرف بڑھنے لگا اور دروازے سے کوئی سو گز کے فاصلے پر آ کر رکا دیکھتے ہی دیکھتے اس میں سے ایک جسیم اور بھونڈی صورت نمودار ہوئی اور پھر اُس کا باقی جسم بھی نظر آنے لگا۔ اس کے ہاتھ میں ایک خون آلود خنجر تھا اس نے آہستہ آہستہ اسے اوپر اٹھایا اور اُٹھاتے ہی اُس کی آنکھیں انگاروں کی طرح چمکنے لگیں۔ وہ بجلی کی طرح دوڑتا ہوا ہمارے قریب سے گزر گیا۔ ذرا سی دیر میں کچھ دھماکا ہوا اور آس پاس کی چمگادڑیں شور مچاتی ہوئی اُڑ گئیں۔ ہم کافی دیر تک وہیں بیٹھے رہے۔ خوف کے مارے رگوں میں خون خشک ہو رہا تھا۔ اور بات تک کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ یہانتک کہ میری پھوپی پھر آئیں اور ہم دونوں کو اپنے ساتھ نیچے لے گئیں۔ باقی رات جس حالت میں اُس کا اندازہ ناظرین خود ہی لگا سکتے ہیں۔ صبح ہوتے ہی میں نے اس کے متعلق تحقیق کرنا شروع کی۔ ہوتے ہوتے معلوم ہوا کہ اس شخص کو کسی نے آج سے اسّی برس پہلے اسی کوٹھری میں قتل کر ڈالا تھا۔ چنانچہ اس وقت سے آجتک یہ اپنے قاتل کی تلاش میں نکلتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کوٹھری میں سونے والے ہمیشہ صبح کو قتل کئے ہوئے پائے گئے۔ اب نہ کوئی اس میں سوتا ہے اور نہ کوئی ایسی واردات سننے میں آئی ہے۔ رہا پنجے کا نشان سو سنا ہے کہ جب اُسے قتل کیا گیا تھا تو اُس کی ایک انگلی کٹ گئی تھی اور قاتل کے ساتھ کشمکش کرتے وقت اُس کا وہی خون آلودہ ہاتھ دروازے پر جا پڑا تھا۔ سو یہ نشان آجتک اسی طرح دیکھنے میں آتا ہے۔

عنایت اللہ (بی۔ اے)

غزل

ساقی نفس نفس ہے تیرا شراب خانہ ۔۔۔ تیرا وجود رنگیں خوشیوں کا ہے خزانہ

پھر رقص میں زمیں ہے، اور وجد میں فلک ہے ۔۔۔ پھر سُن رہا ہوں اُن سے میں جاں فزا ترانہ

پھر آ گیا ہے موسم طوفانِ رنگ و بُو کا ۔۔۔ ہر چیز بن گئی ہے بہکا ہوا فسانہ

میرے غریب دل کو لے پائمال کر دے ۔۔۔ اے گردشِ زمانہ، اے گردشِ زمانہ!

کیا پوچھتے ہو مجھ سے رودادِ قلبِ محزوں ۔۔۔ دُکھ درد سے بھرا ہے اے دوست یہ فسانہ

آؤ پئیں پلائیں، آؤ پئیں پلائیں ۔۔۔ ہلکی سی چاندنی ہے، اور محفلِ مغانہ

میں تم سے عشق کر کے برباد ہو گیا ہوں ۔۔۔ میری تباہیاں بھی بن بن گئیں فسانہ

میری ہر اک نوا میں پیغامِ زندگی ہے ۔۔۔ بخشا گیا ہے مجھ کو نطقِ پیمبرانہ

اثر چکوالی بی۔ اے

افکارِ تازہ

ہوش جنھیں دل بنکر آیا اُن کی تڑپ کا کیا کہنا غم نے جنھیں بیدار کیا ان کی بے خوابی کیا کہیے

حسن بنکر ہی رہی چاک گریباں کی ادا جوشِ وحشت نے بہت عیب لگانا چاہا

"مجلہ عثمانیہ"

یوں تو سب کچھ ہے زبانِ شمع پر کہتی ہے جو بے زبانی اور ہے
کیا کہوں مر مر کے جینے کا مزہ اے خضر یہ زندگانی اور ہے

آفت رسیدہ دوست بھی آفت سے کم نہیں اے دوست الحذر کہ میں آفت رسیدہ ہوں

اپنے وعدوں کی حیاتِ مختصر پر غور کر میرے دل کا اضطرابِ جاودانی بھول جا

اک نتیجے پر پہنچنی تھی قفس کی زندگی کیوں طبیعت مائلِ پرواز ہو کر رہ گئی

"عالمگیر اشاعت خاص"

میں آہیں بھر نہیں سکتا کہ نغمے گا نہیں سکتا سکوں لیکن مرے دل کو میسر آ نہیں سکتا
متاعِ سوز و سازِ زندگی پیمانہ و بربط میں خود کو ان کھلونوں سے بھی اب بہلا نہیں سکتا
وہ بادل سر پہ چھائے ہیں کہ سر سے ہٹ نہیں سکتے ملا ہے درد وہ دل کو کہ دل سے جا نہیں سکتا

"رومان"

رہے گی اب یہ دنیا رو کشِ خلدِ بریں ہو کر نگاہیں اس رخِ رنگیں سے پلٹی ہیں حسیں ہو کر
ہماری خاک کا ہر ذرہ اب دوشِ صبا پر ہے شہیدانِ وفا رہتے نہیں بارِ زمیں ہو کر

"ندیم"

نیرنگیِ حیات نے دیوانہ کر دیا بس چھوڑ دیجئے مرا داماں، نہ پوچھیے
اب لے اُڑا ہے شوقِ دیارِ حبیب کو ہم سے نزاعِ گبر و مسلماں، نہ پوچھیے

"زمانہ"

حال یہ ہے کہ مجھے خود نہ رہی یاد اپنی پھر گلہ کیا ہے اگر بھول گئے تم مجھکو

کیا دامنِ صد چاک بھی سِل سکتا ہے کیا غنچۂ امید بھی کھل سکتا ہے
امید کچھ ہم بھی جمع کریں گے ضرور سکوں سے اگر سکون مل سکتا ہے

ہے حیف دل پہ بھی گمانِ وفا کیسے نادیدۂ وفا ہیں ہم "مجذوب س"

صفحۂ اطفال

مس فلورا

(گذشتہ سے پیوستہ)

چمپا:۔ فلورا ذرا کوٹھے پر چلو۔ براتیوں کے لئے جو مٹھائی وٹھائی رکھی ہے۔ اُسے اُنہیں دو تین پٹلیوں میں باندھ دو۔ نان حلوا بھی مَیں نے پہنچا دیا ہے۔ اسے بھی ایک پوٹلی میں باندھ دو۔ کیونکہ کوٹھے سے ایک ایک دانہ نیم پر پہنچانا دشوار ہو گا۔

فلورا چمپا کے ساتھ ہو لی۔ کوٹھے پر جا کے دیکھتی کیا ہے کہ چمپا نے نیاز کے سارے پیڑے اوپر پہنچا رکھے ہیں۔ پیڑوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ ایک طرف پندرہ بیس نان رکھے ہیں۔ ایک طرف حلوا پڑا ہے۔ گھر کی دو چادریں پڑی ہیں۔ نئی چادریں پھاڑ پھاڑ کر فلورا نے سب چیزوں کی پٹلیاں باندھ دیں۔ یہ اتنا سامان تھا۔ کہ اگر پندرہ بندر بھی آجائیں تو سب کے لئے کافی ہو۔

فلورا:۔ اے بہن۔ گھر کی بیوی آکر سر پیٹ لیں۔ پیڑا تو تم نے گھر میں قسم کھانے کو بھی نہ چھوڑا۔

چمپا:۔ دیکھی جائے گی۔ باراتی اگر زیادہ آگئے۔ تو شرمندگی تو نہ ہو گی۔ تمہارا نام ہو جائے گا۔ میرے اوپر جو کچھ گزرے گی دیکھ لوں گی۔ آج بارات آئیگی۔ بس اب تم چلو۔ نلکے کے نیچے چل کر نہا لو۔ میں بالوں میں کنگھی کر دوں۔ کل کی آندھی سے تمہارے بال گرد و غبار میں اٹے پڑے ہیں۔ چیکٹ گئے ہوں گے۔

فلورا:۔ اوئی، اب مجھے نہلاؤ گی بھی۔ ٹھنڈا پانی ہے۔ زکام نہ ہو جائے۔ بیوی تو گرم پانی سے نہلایا کرتی ہے۔

چمپا:۔ اب بیوی کو کہاں سے پیدا کروں۔ بھابھی کی شادی کی خوشی میں مگن ہو رہی ہوں گی۔ لو بہت نزاکت نہ بگھارو۔ زکام وکام کا اندیشہ نہ کرو۔ دھوپ میں بیٹھ کر دو جھرجھریاں لو گی تو بال سوکھ جائیں گے۔

فلورا کوٹھے سے اُتری اور نلکے کا پیچ کھول کر نہانے لگی۔ چمپا نے بیوی کا صابن لا کر خوب اس کے بدن پر ملا۔ نہا چکی تو دھوپ میں بال سکھانے بیٹھ گئی۔ چمپا بیوی کے سر میں لگانے

کاسندری سہاگ تیل لے آئی اور بال سُوکھ گئے تو بالوں
کو تیل لگایا۔ چار بجے تو جا کر پیر ککڑوں کوں کو بلا لائی۔
پیرین بلاؤ کو بھی دعوت دے آئی تھی۔ وہ بھی
تسبیح ہاتھ میں لئے آموجود ہوئے۔ پانچ چھ
بلیاں جنہیں بلاوا گیا تھا۔ ایک ایک کر کے کوٹھے
پر جمع ہو گئیں۔ فلورا اور چمپا بھی اوپر پہنچ گئیں۔ اتنے
میں محلے کے کتوں کے بھونکنے کی آواز سنی۔

چمپا بولی بارات آرہی ہے۔ جبھی تو مراتی کتے
بھونک رہے ہیں۔ یہ بات ابھی ختم بھی نہ ہوئی تھی۔
کہ چار باغ کے دس پندرہ بندر پیڑوں اور چھتوں کو
پھلانگتے ہوئے نازل ہو گئے۔ سلاموں کی بھرمار
ہونے لگی۔ چمپا اور پیرین بلاؤ نے باراتیوں کا استقبال
کیا۔ اپنی طرف کے مہمانوں کا سب سے تعارف
کرایا۔ فلورا منہ پھیرے شرمائی لجائی بیٹھی تھی۔ للّو
نے آتے ہی فقرہ کسا۔

للّو:۔ دلھن بھابی کیوں سب سے الگ منہ پھیرے
بیٹھی ہیں۔

چمپا:۔ دلھن کو مت چھیڑو۔ نہیں منہ کھسوٹ لے گی۔
اسے گھر چھوڑنے کا بڑا رنج ہے۔ سارا دن روتے
گزرا ہے۔

چمپا:۔ جانور کو انسانوں سے دل نہ لگانا چاہئیے ۔
انسانوں کی برادری بیوفائی میں مشہور ہے۔ ان سے جی
لگانے میں عقلمندی نہیں۔ جانوروں کو اپنا دل بہلانے
اور خدمت لینے کے لئے پالتے ہیں۔ جب وہ بیچارے
بوڑھے یا بیمار ہو جاتے ہیں۔ گھر سے نکال دیتے ہیں۔
بڑی بیوفا اور بے درد برادری ہے۔ خدا ہر جانور
کو اس کے پڑوس سے بچائے۔

پیر ککڑوں کوں:۔ سچ کہتے ہو۔ خیر اور جانوروں کو تو
گھر سے نکالنے ہی پر بس کرتے ہیں۔ مگر میری برادری
تو ان سے بڑی دکھی ہے۔ جہاں کوئی مہمان آیا اور
گھر میں مرغا برادری پر آفت ٹوٹ پڑی۔ ہنستے کھیلتے
چوزوں کو پکڑ پکڑ کر حلال کر دیتے ہیں۔ ہر برادری
میں مادینوں کی عزت کی جاتی ہے۔ مگر انسانی برادری
بہت غیر مہذب ہے اور حد درجے کی درندہ۔ میری سولہ
بیویاں چھری کے نیچے دم توڑ چکی ہیں۔ جس دن قصائی
گوشت کا ناغہ کرتے ہیں ہماری جان پر بن جاتی ہے۔
گھر میں بچے بچے کی زبان پر یہی فقرہ ہوتا ہے چتکبری
مرغی کاٹ لو۔ کلغی والا چوزہ حلال کر لو۔ کالی پھٹو بڑی
موٹی ہو رہی ہے۔ اس کا پلاؤ پکواؤ۔ میں اب تک
اس مصلحت سے زندہ رکھا گیا ہوں۔ کہ گھر کا میاں کہتا
ہے۔ اصیل مرغ ہے۔ اسے ابھی حلال نہ کرنا۔ بس
اس سے اچھی نسل کے بچے لئے جاؤ۔"

اور یہ بھی کب تک کسی دن کوئی بڑا مہمان آگیا تو مجھے کلمۂ شہادت پڑھنا پڑ جائے گا۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے میری نسل کے ستّر اسّی چوزے بیٹھوریں ۔ مرغے ۔ مرغیاں ان دو سال میں شہید ہو چکے ہیں ۔

پیر بن بلاؤ: ۔ انسان اپنے منہ سے اشرف المخلوقات بننے کا دعویٰ کرتا ہے ۔ جانور کا لفظ گالی کی جگہ استعمال کرتا ہے ۔ کسی آدمی کو جانور کہہ دو ۔ تو وہ لڑنے مرنے کو تیار ہو جائے گا ۔ اِس سے اندازہ کیجئے کہ انسان انسانیت کے غرور میں جانوروں کو کس درجے ذلیل سمجھتا ہے ۔ انسان کا دعویٰ ہے کہ وہ جہاں کی کل مخلوقات سے افضل اور اشرف ہے ۔ لیکن اشرف المخلوقات کے عادات و اطوار ایسے ہیں ۔ کہ تمام جانور برادریاں ان عادتوں سے پناہ مانگتی ہیں تم نے کسی جانور کو جھوٹ بولتے ، کسی کی غیبت (پیٹھ پیچھے برائی) کرتے کسی پر بہتان باندھتے کسی کو رشوت لیتے کبھی نہ دیکھا ہو گا ۔ لیکن حضرت انسان ان سب گنوں میں پورے ہیں ۔ اور پھر بھی اپنے آپ کو اشرف المخلوقات کہتے ہیں ۔

اکثر جانور برادریاں ہزاروں برس سے انسانی برادری کی خدمت کر رہی ہیں ۔ بیل کڑاکے کی سردی اور چلچلاتی دھوپ میں ان کا ہل چلاتے ہیں ۔ تیس تیس من بوجھ کی گاڑیاں کھینچتے کھینچتے ان کے کندھے زخمی ہو جاتے ہیں ۔ گائیں بھینسیں اور بکریاں اپنے خون سے بنے ہوئے دودھ ، دہی ، گھی ، مکھن سے ان کے عیش و آرام کا سامان کرتے ہیں ۔ بکریوں ، بھیڑوں اور دنبوں کا اُون ، ان کی پوشاک کے کام آتا ہے ۔ مگر جب وہ بوڑھے ہو جاتے ہیں تو انہیں قصائی کی چھری کے حوالے کر دیا جاتا ہے ۔ ہاتھی ، گھوڑے ، خچر ، گدھے ، اونٹ روز اوّل سے انسان کی خدمت کر رہے ہیں ۔ مرغیاں انڈے دیتی دیتی تھک جاتی ہیں ۔ مگر یہ انڈوں کا آملیٹ (حلوا) جتنا کھاتا ہے ۔ زیادہ درندہ بنتا جاتا ہے ۔ دل پر بیٹھے بٹھائے کوئی لہر آئی اور اس نے غریب مرغی کی گردن پر چھری پھیر دی ۔ اپنے خدمت گزار ، بے زبان اور وفادار جانوروں کے ساتھ اس کا یہ بے رحمانہ سلوک اور ظالمانہ برتاؤ دیکھتے ہوئے کون انصاف پسند انسان کو ساری مخلوقات سے افضل اور اشرف مان سکتا ہے ۔

عزیز فلورا انسانوں سے بھلائی کی توقع رکھنا اور ان سے محبّت بڑھانا بڑی بھول ہے ۔ یہ کسی کے میت نہیں ہوتے ۔ ہزاروں بندر ایک باغ میں رہتے ہیں ۔ میل ملاپ اور پیار محبت سے رہتے

سہنتے ہیں۔کبھی آپس میں سر پھٹول نہیں کرتے۔مگر یہ انسان برادری کے لوگ ذرا ذرا سی بات پر کٹم کٹوا کھیلنے لگتے ہیں۔دو آدمی کہیں مل کر نہیں بیٹھ سکتے۔پھر سب سے بڑی برائی اس برادری میں یہ ہے کہ جانوروں کو اپنا غلام سمجھتے ہیں۔آپس میں بھی طاقتور انسان کمزور انسانوں کو اپنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رکھتا ہے۔کبھی تم نے کسی جانور کو خواہ وہ کیسا ہی کمزور ہو کسی دوسرے جانور کی غلامی کرتے دیکھا ہے؟ جانور تو غلامی کی زندگی سے موت کو کہیں زیادہ اچھا سمجھتے ہیں۔

لیکن اس نام نہاد اشرف المخلوقات انسان برادری میں آقا و غلام کا امتیاز جاری رہتا ہے۔تعجب ہے کہ تم بندر برادری کی ممبر ہوتے ہوئے بھی اسلم میاں کی غلامی میں زندگی بسر کر رہی ہو۔یاد رکھو فلورا! انسان مطلب کا یار ہے۔مطلب نکلا اور پھر تو کون اور میں کون؟ اس کی ظالمانہ حرکات اور وحشیانہ صفات سے آسمان کے فرشتے بھی پناہ مانگتے ہیں۔ تمہاری زندگی کا سب سے مبارک دن آج کا دن ہے کہ انسان کی غلامی سے آزادی پا رہی ہو۔

(باقی باقی) (منقول از "پریم") تاجور

(نظم)

چاند

بھولیں گے کہاں چاند کے یہ شوخ نظارے	آغوش میں اپنی لئے بیٹھا ہے ستارے
تاریک فضاؤں میں ضیا بار ہمیشہ	پُر نور ہوئی اس سے شب تار ہمیشہ
جو راہ بھٹک جائیں انہیں راہ دکھائے	ہر دشت کو ہر باغ کو پُر نور بنائے
اے چاند تری گود میں آجاؤں اگر میں	دکھلاؤں تری طرح محبت کا اثر میں
اِک مژدۂ جاں بخش سنانا ہے مجھے بھی	اس طرح چمک اپنی دکھانا ہے مجھے بھی
جس طرح چمکتی ہوئی بجلی کی چمک ہو	آنکھوں میں چکا چوند دماغوں میں دھمک ہو

دنیا میں چمکتی ہوئی شمشیر بنوں میں
رنگینیٔ اعجاز کی تصویر بنوں میں

(منقول از پریم) وفا فرخ آبادی

راجکماری شیلا

غروب آفتاب کا سماں تھا اور افق مغرب پر ابھی تک سرخی باقی تھی - جنوب مشرقی کونے سے جو شاہراہ متھرا کو جاتی ہے اس پر تین یاتری آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے - یاتری بہت فاصلہ طے کر کے آئے تھے - اس لئے بیحد تھکے ماندے معلوم ہوتے تھے - ان میں سے ایک بوڑھا، ایک نوجوان اور ایک بچہ تھا - آخر الذکر کم سن تھا - جس کی عمر بمشکل چودہ برس ہو گی - نوجوان نے بوڑھے کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا — لّلی! متھرا تو آ گئی اب تو ضرور آرام ملے گا - کیا تمہیں یقین ہے کہ سیٹھ صاحب ہمیں آرام کرنے کے لئے جگہ دیں گے؟ کیا وہ ہمیں پہچان لیں گے اور ہمارا راز مخفی رکھیں گے؟ -

ہاں ضرور، کیونکہ سیٹھ دھنگپت، مہاراج کے گہرے دوست اور ان کے خیر خواہ خادم ہیں -

کم عمر بچہ نے گھبرا کر کہا — ابھی اور کتنا فاصلہ باقی ہے - اب تو مجھ سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا جاتا - دیکھو تو میرے پاؤں بھی متورم ہو گئے ہیں -

لّلی نے ایک لمحہ کے لئے مڑ کر بچے کو دیکھا - اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے - اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے - لیکن ذرا مسکرا کر کہا — بس اب تو پہنچ ہی گئے، صرف تھوڑا صبر اور -

"اب اور نہیں" — یہ کہہ کر بچہ سڑک کے کنارے بیٹھ گیا - دوسرے نوجوان نے پیار سے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا — یہاں دیر کرنے سے فائدہ؟ سورج غروب ہو چکا ہے - شہر کے دروازے بند ہو گئے تو تمام رات باہر ہی کاٹنی پڑے گی اور پھر لّلی کو جنگلی جانور سونے نہ دیں گے — بچہ پھر روانہ ہو گیا - لّلی بھی آگے بڑھا - جنوبی دروازے پر محافظ شہر رات کیلئے پہریداروں کا انتخاب کر رہا تھا - تینوں یاتری چپ چاپ دروازہ سے داخل ہوئے - کسی نے ان غریب یاتریوں کی جانب توجہ نہ دی - لّلی نے نہایت نرم آواز سے نوجوان کو مخاطب کر کے کہا - اگر آپ حکم دیں تو رات کسی مہمان سرائے میں کاٹ لی جائے اور پھر صبح اٹھ کر سیٹھ صاحب کے گھر کا پتہ لگا لیا جائے - اب اس وقت کہاں بھٹکتے پھریں؟ اتنا کہہ کر اس نے بچے پر نگاہ ڈالی اور نوجوان کے حکم کا منتظر رہا - نوجوان نے کہا — ہاں مناسب تو یہی ہے کہ رات کسی مہمان سرائے ہی میں بسر کریں -

تینوں یاتری سڑک پر آگے بڑھے -

(۲)

کیا سیٹھ دھنگپت جی کا مکان یہی ہے؟

ہاں شریمان یہی ہے - آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟

آئیے اندر تشریف لے آئیے - جب لّلی کو ایک خوبصورت نوجوان نے ایسے نرم و شیریں الفاظ میں مخاطب کیا تو وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس نوجوان اور سامنے والے مکان کو دیکھنے لگا -

کیا آپ دھنگپت صاحب کو جانتے ہیں؟

شریمان! یہ داس انہی کا بیٹا ہے -

آپ؟ سیٹھ دھنگپت صاحب کے لڑکے؟ اور یہ ان کا گھر؟ آپ کا اسم شریف؟ -

میرا نام اگپت ہے -

اگپت! اگپت!! کیا سچ مچ آپ....... لیکن سیٹھ صاحب کہاں ہیں؟ -

پتا جی کو سورگباشی ہوئے تو آٹھ برس ہو گئے ہیں -

سورگباشی! لّلی نے حیرانی سے منہ کھول کر کہا -

شریمان میں اپنے پتا کا فرماں بردار ہوں، میرا سلام قبول فرمائیے -

سیٹھ اگپت صاحب! اتنا کہہ کر لّلی نوجوان سے بغلگیر ہو گیا - پھر تھوڑے سے توقف کے بعد بولا — اب سمجھا - پتا کے دھن دولت نے بھی بیٹے کا ساتھ چھوڑ دیا ہے - واہ ری موت!! جس کے بیوپار سے سمندر پٹے رہتے تھے اور جس کا چین تک کا سکہ رواں تھا، اس کا لاڈلا ننگے پاؤں سڑک پر کھڑا اپنے مہمانوں کا استقبال کر رہا ہے - اور جس کے دروازے پر فوج اور ہاتھیوں کی صفیں ہوتی تھیں وہاں اب یہ معمولی سا گھر آباد ہے - یہ کہہ کر لّلی رونے لگا - اور اس

نے دوبارہ نوجوان کو سینے سے لگا لیا۔

اگنیت نے کہا:۔ براہِ مہربانی مجھ سے اپنا تعارف کرائیں۔ اتنا تو میں جان گیا ہوں کہ آپ میرے معزز مہمان ہیں۔ آج مجھے آپ کی خدمت کر کے بہت خوشی حاصل ہوگی۔

سیٹھ اگنیت صاحب! ایشور کا احسان ہے کہ سیٹھ دھننگپت کا حلم، ان کی شرافت اور مہمان نوازی آپ میں بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ یہ سیٹھ صاحب کی جائیداد میں سب سے قیمتی چیزیں ہیں۔ اب تعارف کی ضرورت نہیں۔ اچھا ایشور آپ کا بھلا کرے۔

اتنا کہہ کر لَل چلنے کو تیار ہوا۔ اگنیت نے نہایت غمگین لہجے میں کہا۔ کیا آپ مجھے میری مفلسی کے سبب چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ ایسا کبھی نہ ہوگا۔ شریمان اگر آپ میری خواہش پوری نہ کریں گے تو میں جان دینے سے بھی دریغ نہ کروں گا۔ اور میں کبھی جھوٹ نہیں بولا کرتا۔

لَل ایک لمحہ کے لئے مبہوت کھڑا رہا اور پھر کہنے لگا سیٹھ صاحب! میرے ساتھ وہ دو اشخاص بھی ہیں۔

"اوہو! آپ نے پہلے اس کا ذکر نہیں کیا۔" یہ کہہ کر اگنیت اُدھر دوڑے۔

لَل نے روکتے ہوئے کہا سیٹھ صاحب ٹھہریئے۔ بلاشبہ ہم آپ کے پتا کا ہی آسرا ڈھونڈنے یہاں آئے تھے۔ لیکن اب ہم یہاں ٹھہر کر آپ کو کسی قسم کی مصیبت میں مبتلا کرنا نہیں چاہتے۔ ایشور آپ کا بھلا کرے۔

"تو پھر میں ضرور ہی جان پر کھیل جاؤں گا۔"

نہیں جناب! اس حالت میں آپ کو ہماری اتنی قدر و منزلت نہیں کرنی چاہیئے۔ کیونکہ اس سے اندیشہ ہے کہ آپ پر کوئی مصیبت نہ آ جائے۔

جناب مجھے تو آپ پر جان قربان کر کے بھی عین راحت ہوگی۔ میں نے آج تک اپنے افلاس کی وجہ سے شرمندگی نہیں اُٹھائی۔ کیا اب آپ اس رویے سے مجھے اپنی مفلسی کا احساس کرانا چاہتے ہیں؟

نہیں مہاراج! بات تو اس کے علاوہ کچھ اور ہے۔ خیر، پہلے مجھے اپنے سوامی کا ارادہ معلوم کرنا چاہیئے۔

نہیں میں خود ہی سب ماجرا ان سے کہہ دوں گا۔" یہ کہہ کر اگنیت دُور کھڑے نوجوانوں کے قریب جا کر ان کے قدموں پر جھکا۔

اگنیت نے اجمالاً سب کیفیت بیان کر کے انہیں گھر لے چلنے پر اصرار کیا۔

سب کو جگہ دے کر اگنیت نے کہا۔ جناب اب آپ مجھے ان اصحاب سے متعارف کرائیں۔

مہاراج! یہ کالنگا کی مہارانی چندر لیکھا اور یہ راجکماری شیلا ہیں۔ مگدھ کے شہنشاہ اشوک نے کالنگا کی راجدھانی کو تباہ کر دیا ہے۔ کالنگا کے ایک لاکھ بہادر میدانِ کارزار میں کام آئے اور خود مہاراج بھی میدانِ جنگ سے واپس نہیں لوٹے اور نہ ان کی لاش ہی ملی ہے۔ مہاراجکمار ہردوار میں سوامی چدآنند کے پاس تحصیل علم کے سلسلہ میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اور میں ان کا خادم مہانائک لَل ہوں۔ غرضیکہ شاہی خاندان اس وقت نہایت مصیبت میں مبتلا تھا۔ میں ان مہارانیوں کو آپ کے پتا کے سہارے لیکر چل پڑا۔ مہاراج دھننگپت کے سوا دوسرا کون ہے جو ان شاہی مہمانوں کو اپنی پناہ میں لے سکے۔ خونخوار اشوک نے ہر جگہ سراغرساں مقرر کر رکھے ہیں اور ساتھ ہی یہ اعلان کر رکھا ہے کہ جو شخص شاہی خاندان اور راجکمار جیتیندر کو گرفتار کرا دے گا۔ اُسے دس ہزار سونے کی مُہریں انعام میں دی جائیں گی اور جو کوئی شاہی خاندان کو پناہ دے گا اس کی سزا موت ہوگی۔ سیٹھ صاحب! اسی وجہ سے ہم آپ کے پاس ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھتے۔

اگنیت نے سب کچھ سُن کر کہا:۔ مہارانی اور راجکماری نے اس گھر کو شرف بخشا ہے۔ اب میں ان کی سیوا کر کے روحانی تسکین حاصل کروں گا۔

لَل نے کہا:۔ اچھا تو آپ اپنی بیوی سے یہ راز مخفی ہی رکھیں۔ اور انہیں مرد ہی ظاہر کریں۔

اگنیت نے منظور کر لیا۔

(۳)

مہمانوں کے آرام کا انتظام کر کے اگنیت نے اپنی بیوی سے کہا:۔ کُند! میرے پتا کے دوست آئے ہیں۔ ان کی خاطر تواضع جیسے بھی بن پڑے کرنی چاہیئے۔ کُند نے غمگین لہجہ میں کہا سوامی! گھر میں تو کچھ سامان نہیں بھلا مہمان کھائیں گے کیا؟

اگنیت چپ چاپ اپنی بیوی کی جانب دیکھنے لگا۔ اور تھوڑے وقفے کے بعد بولا۔ کُند! کیا تم کسی طرح بھی ان کے کھانے کا انتظام نہیں کر سکتیں؟ کیا تیرے پاس کوئی زیور بھی نہیں۔

نہیں۔

تب کوئی برتن گروی رکھ کر ہی گذر ہو سکتی ہے۔
اس کے سوا تو کوئی اور طریقہ نہیں۔

اگنیپت نے گھبرا کر کہا:۔ کنندا! تم ہی اس کا کوئی ایسا انتظام کرو جس سے ہمارا نام ظاہر نہ ہو اور کام بھی بن جائے۔ کنند کچھ کہنا چاہتی تھی کہ باہر سے کسی نے سیٹھ صاحب کو پکارا۔

اس نے باہر آ کر دیکھا تو اس کے مہاجن کے ہمراہ آٹھ دس شاہی اہلکار تھے۔ اس کے قرضخواہ نے نہایت سخت لہجہ میں کہا:۔ سیٹھ اگنیپت! ہمارا حساب بیباق کرو ورنہ قید خانے جانا قبول کرو۔

سیٹھ صاحب نے گھبرا کر عاجزی سے کہا:۔ دوست تم جانتے ہو کہ میں اس وقت کتنا پریشان حال ہوں۔ اس پر مستزاد یہ کہ اس وقت میرے ہاں چند مہمان مقیم ہیں۔ سیٹھ صاحب کچھ عرصہ اور صبر کرو ورنہ مجھ پر آفت آ جائے گی۔

مہاجن نے نہایت لاپرواہی سے ہنس کر کہا:۔ میں بے وقوف نہیں ہوں۔ رقم بھی تو کچھ کم نہیں۔ اب اور صبر کس توقع پر کروں۔ دس ہزار ابھی ادا کرو۔ ورنہ اجازت دو کہ یہ سپاہی تمہیں گرفتار کر لیں۔

اگنیپت نے مجبور ہو کر کہا:۔ مجھے کچھ مہلت دیجئے تاکہ میں اپنی بیوی اور مہمانوں کا کچھ انتظام کر لوں۔

ایک افسر نے آگے بڑھتے ہوئے کہا:۔ حضور! ہم مجبور ہیں کیا آپ ابھی یہ قرضہ ادا کر دیں گے؟

نہیں، اس وقت میرے پاس کچھ نہیں۔

تو انہیں گرفتار کر لو۔

ایک لمحہ میں سپاہیوں نے اسے باندھ لیا۔ یہ شور و غل سن کر للّی اور راجکماری بھی باہر آ گئے تھے۔ کنند بھی یہ سب ماجرا دیکھ رہی تھی اور سب مبہوت کھڑے تھے۔ وہ سیٹھ صاحب کو باندھ کر لے گئے اور کنند بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑی۔

راجکماری شیلا نے دوڑ کر اسے اٹھایا، پھر للّی کو بلا کر آہستہ سے کہا۔ "مہاناٹک! اس وقت سیٹھ صاحب کی مدد کرنا ہمارا فرض ہے۔" کنند کو بستر پر لٹا کر راجکماری للّی سے مشورہ کرنے لگی۔

راجکماری کی بات سن کر للّی چونک پڑا اور کہنے لگا:۔ یہ تو بہت خطرناک ہے۔

"خیر کچھ بھی ہو۔"

"نہیں کماری، ایسا کبھی نہ ہوگا۔"

"یہی ہوگا۔ مہاناٹک!"

"کماری! خوب سمجھ سوچ لو۔ مہارانی صاحبہ اسے کبھی نہ منظور کریں گی۔"

"یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم انہیں اپنا ہم خیال بنائیں۔"

"یہ تو تمہاری بے جا ضد ہے۔"

"میں نے ایسا ہی کرنے کا عہد کیا ہے۔ انہیں رہا کرانے کا اور کوئی طریقہ اس وقت سمجھ میں نہیں آتا۔ جس وقت سپاہی انہیں گرفتار کر رہے تھے یہ ترکیب مجھے اسی وقت سوجھی تھی۔"

مہاناٹک کسی گہرے خیال میں مستغرق ہو گیا۔

(۴)

یہ تمام واقعات سن کر مہارانی نے کہا۔ مہاناٹک! ہمیں سیٹھ صاحب کو اپنی جان پر کھیل کر بھی رہا کرانا چاہیئے۔

ماتا! یہ میں کر سکتی ہوں۔ راجکماری بولی۔

تو کیا کر سکتی ہے؟ رانی نے راجکماری پر نظر گاڑ کر کہا۔

بھائی صاحب سے میری شکل بالکل ملتی ہے! کیوں مہاناٹک؟

پھر؟

اور مردانہ لباس میں تو میں بالکل بھیا ہی معلوم ہوتی ہوں۔ یہ تو آپ ہی نے مجھے بتایا تھا۔ کیوں اماں!

ہاں تو اس سے کیا؟

بھیا کو زندہ یا مردہ پکڑنے والے کا انعام دس ہزار مہریں ہیں اور سیٹھ صاحب کا قرض بھی اسی کے لگ بھگ ہے۔ میں اپنے آپ کو بھائی صاحب کی جگہ گرفتار کرا لوں گی اور اس نقدی سے سیٹھ صاحب رہا کرا لئے جائیں گے۔

اتنا کہہ کر شیلا کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

رانی کو سخت صدمہ پہنچا اور وہ بیکل ہو کر بول اٹھی ——— واہ! یہ کیا؟

کیوں؟ کماری نے متانت سے کہا۔

تو پگلی ہو گئی ہے کیا؟

نہیں ماں! میں نے سب کچھ سوچ سمجھ لیا ہے!

کیا سوچ لیا ہے؟

یہ کہ اس سے دو فائدے ہونگے۔ ایک تو سیٹھ صاحب رہا ہو جائیں اور دوسرے بھائی صاحب کی تلاش نہ ہوگی اور وہ

محفوظ رہیں گے۔

لیکن یہ ظالم فوجی بادشاہ کی خدمت میں لیجانے سے پیشتر ہی تجھے نہایت سفاکی سے قتل کر دیں گے اور اگر تو بادشاہ تک زندہ وسلامت پہنچ بھی گئی تو کیا خود بادشاہ تجھے زندہ چھوڑ دیگا؟

نہ جانے کیوں بادشاہ کا نام سنکر شیلا کا چہرہ تمتما اٹھا۔ اور اس نے کہا۔ ماتا! شہنشاہ کا حکم تو بھیا کو زندہ پکڑنے کا ہے اس لئے زندہ پکڑ کر یہ سپاہی مجھے قتل نہیں کریں گے۔ اور جب میں بادشاہ کے سامنے پہنچ جاؤں گی تو باقی معاملات خود بخود طے ہو جائیں گے۔

نہیں شیلا! میں تجھے اتنی جرأت کرنے کی کبھی اجازت نہ دوں گی۔ چلو یہاں سے کسی دوسری جگہ چلے چلیں۔

شیلا نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا:۔ تو کیا اب کالنگا کی مہارانی اتنی خود غرض ہو گئی ہے کہ مصیبت کے وقت اپنے محسن کو بھی چھوڑنے پر آمادہ ہے؟

للّی جواب تک خاموش تھا بولا۔ ماتا! شیلا کی بات ہی بنی رہنے دو۔ مصیبت کے وقت بڑے آدمی ہمیشہ اپنی عظمت اور قربانی کا مظاہرہ کیا کرتے ہیں۔ شیلا کی قربانی بھی اس کے خاندان کے شایانِ شان ہو گی۔ اب جیسے بھی بن پڑے سیٹھ صاحب کو رہا کرانا ہم پر لازم ہے۔

تو کیا اب اس کے علاوہ اور کوئی ذریعہ نہیں؟

نہیں مہارانی!

مہارانی کسی گہری سوچ میں پڑ گئی۔

شیلا نے کہا:۔ ماتا! میں کالنگا کی راجکماری ہوں۔ نشانہ بازی اور گھوڑے کی سواری میں کافی مہارت رکھتی ہوں۔ پتا جی نے مجھے تعلیم بھی کافی دی ہے۔ اس لئے میں ایک بار بادشاہ کے حضور جا کر اس کے ظلم کے خلاف آواز بلند کرنا چاہتی ہوں۔ اس سے ضرور ہمارا کچھ بھلا ہوگا۔

آخرکار مہارانی نے اسے بادلِ ناخواستہ اجازت دیدی۔

شیلا نے کہا۔ مہا ناٹک! تم کندن کو اطلاع دیدو کہ اس کے ہاں کالنگا کا راجکمار چھپا ہوا ہے۔ اسے گرفتار کروا کر سیٹھ صاحب کو رہا کروالو۔

للّی نے کہا:۔ کیا یہ فرض مجھے ہی انجام دینا پڑے گا؟ اگر تم خود اتنا حوصلہ کر لیتیں تو بہتر تھا۔ کماری نے کہا۔ نہیں، تم خود ہی اس پر یہ سب کچھ واضح کر دو۔

للّی کی باتیں سنکر کندن خوف، حیرانی اور غم کی وجہ سے بُت بنی کھڑی رہی اور کچھ دیر بعد بولی:۔ کالنگا کا راجکمار؟ — یہاں؟

جی ہاں، وہ نوجوان وہی کالنگا کا راجکمار ہے جس کے سر کا انعام دس ہزار روپے ہے۔ بس، اتنے ہی روپے میں تو سیٹھ صاحب رہا ہو سکتے ہیں۔

تو کیا میں انہیں گرفتار کرا دوں؟ اپنے مہمانوں کو جو میرے پتی کے باپ کے دوست ہیں انہیں پکڑوا دوں؟ مجھے آپ سے ایسی ذلیل حرکت سرزد ہونے کی قطعی امید نہ تھی۔ کیا آپ اپنے سوامی کو دغا سے قتل کرا دینا چاہتے ہیں؟

نہیں راجکمار کی اپنی بھی یہی خواہش ہے۔

تو کیا مہاراج خود گرفتار ہونا چاہتے ہیں؟

جی ہاں! یہ انہیں کا پیغام ہے جو میں آپ تک پہنچا رہا ہوں۔

کماری کی قربانی قابلِ صد ستائش ہے، ان کی خدمت میں میرا سلام عرض کیجئے اور کہئے کہ مجھ سے یہ قابلِ نفریں کام کبھی نہ ہو سکے گا۔ آہ! مجھے اپنے مہمانوں سے دغا کرنے کی ترغیب دی جا رہی ہے۔

دغا کیسا؟

نہیں نہیں میں کبھی ایسا نہیں کر سکتی۔

اس وقت شیلا نے قریب آ کر کہا۔ دیوی! میری یہ حقیر سی نذر آپ کو بہرصورت قبول کرنی پڑے گی۔ آپ اپنے پتی کی فرمانبردار بیوی اور بڑی دھرما تما ہیں۔ آپ کا سہاگ ہمیشہ قائم رہے۔ مجھے اس سے حقیقی مسرت ہوگی۔ اگر میری جان میرے عزیز دوست کے کام آئے۔

کندن نے روتے ہوئے کہا۔ راجکمار! آپ ایسی بات میرے منہ سے نہ نکلوائیے۔

دیوی! یہ کوئی پاپ نہیں ہے۔ میں تو خود بادشاہ کے حضور جانا چاہتا ہوں۔

لیکن میں یہ کبھی نہیں کر سکتی۔

تو پھر سیٹھ صاحب کیسے رہا ہوں گے؟

جیسی ایشور کی رضا ویسی میری رضا۔

ایشور نے ہی تو ایک موقع دیا تھا جسے آپ گنوا رہی ہیں۔

نہیں نہیں، کبھی نہیں۔

تو کیا یہ کام بھی مجھے ہی انجام دینا پڑے گا۔

نہیں راجکمار! مجھے اس طرح ذلیل نہ کیجئے۔

دیوی! اس کے سوا دوسرا کوئی ذریعہ ہی نہیں سیٹھ صاحب رہا ہو کر میری رہائی کا ضرور کوئی نہ کوئی طریقہ سوچیں گے۔ ذرا خیال تو کرو سیٹھ صاحب وہاں کتنی تکلیف میں ہوں گے۔

کُند غم سے نڈھال راجکماری کی جانب دیکھتی رہی۔

کماری نے کہا:۔ لَلّی! جاؤ یہ پیغام شہر کے کوتوال کے پاس لے جاؤ اور اسے اپنے ہمراہ لے آؤ۔

لَلّی روانہ ہو گیا۔

کُند بے فائدہ اُس کی راہ میں　　حائل ہوئی۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد کوتوال اور چند سپاہیوں نے آکر کماری کو گرفتار کر لیا اور دس ہزار مہریں کُند کو دیکر کماری کو اپنے ہمراہ لے گئے۔

کُند اور مہارانی بیہوش ہو کر گر پڑیں۔

(۵)

کُند! میرا محسن کون تھا؟ آفریں ہے اس پر ــــ اُن معزز مہمانوں کی رہائش کا تو خاطر خواہ انتظام ہو گیا ہو گا۔ تمہارا چہرہ سفید کیوں ہوتا جا رہا ہے کُند؟ تم اسقدر غمگین کیوں ہو؟ یہ کیا! تم رونے لگ گئیں۔

کُند اپنے پتی کے قدموں پر گر کر زار زار رونے لگی۔ اگپت نے کہا:۔ آخر تم اتنی غمزدہ کیوں ہو؟ تم مجھے اُس محسن کا نام کیوں نہیں بتاتیں تاکہ میں جا کر اس کا شکریہ ادا کر دوں۔ کُند نے روتے روتے اجمالاً تمام واقعات سیٹھ اگپت کے گوشگزار کر دیئے۔

یہ سُن کر اگپت نے ایسا محسوس کیا جیسے دس ہزار بچھوؤں نے ایک ساتھ اسے کاٹ کھایا ہو۔ اس نے تڑپ کر کہا۔ کیا کہا؟ کمار کو گرفتار کروا کر یہ رقم ہاتھ لگی تھی؟

کُند ساکت کھڑی رہی۔

کُند! کُند!! کیا یہ قابلِ نفریں کام تجھ سے سرزد ہوا ہے؟ آہ! تم نے میرا جنم، میری زندگی، میری عزت، میرا دھرم ــــ غرضیکہ سبھی کچھ ڈبو دیا۔ کُند کیا تم ایسی تھیں؟ مجھے تو تم سے ایسی توقع نہ تھی ــ ہائے کتنا بڑا پاپ ہوا ہے۔ اُف اتنی بے عزتی؟

یہ کہہ کر سیٹھ صاحب ذہنی کشمکش میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگے۔

لَلّی نے آہستہ سے داخل ہوتے ہوئے کہا: سیٹھ صاحب!

اس میں کُند کا کچھ قصور نہیں، یہ سب کچھ کماری کی اپنی مرضی سے ہوا ہے۔ یہ تو آخری لمحے تک رضامند نہ ہوئی تھیں۔

اگپت نے روتے ہوئے کہا:۔ اب کیا ہوگا؟ اس کا ازالہ کیسے ہوگا؟ وہ کیسے رہا ہوں گے؟ آپ ایسے بزرگوں کے ہوتے ہوئے ایسا کیوں ہوا؟ کُند! شاید اسی وجہ سے تو گیانی عورتوں سے متنفر ہیں۔ کیا عورتیں بھی اسقدر ذلیل اور اتنی خود غرض ہو سکتی ہیں؟ آہ کُند! تم تو سب عورتوں سے ذلیل نکلیں۔ تم نے اپنی غرض کے لئے ــــ اپنے پتی کی محبت کے لئے اپنے معزز مہمانوں کو........

اتنا کہتے کہتے سیٹھ صاحب زمین پر گر پڑے۔

پھر رانی صاحبہ اندر داخل ہوئیں اور کہنے لگیں سیٹھ صاحب! کیا آپ کو ابھی تک اتنا یقین نہیں آیا کہ ہم کو اس کا ذرا بھر بھی افسوس نہیں۔ کیونکہ یہ سب کچھ کماری کی اپنی مرضی کے مطابق طے پایا ہے۔ وہ تو خود شہنشاہ کے پاس جانا چاہتی تھی۔ کُند ایسے سلوک کے قابل نہیں کیونکہ جس طرح آپ پاکباز، نیک طینت اور معزز ہیں ویسے ہی آپ کی بیوی بھی نیک شعار اور پاک باطن ہے۔ سیٹھ صاحب! اب ہمیں بے فائدہ تاسف چھوڑ کر اپنے فرض کی ادائیگی کی طرف رجوع ہونا چاہیئے۔

اس پر اگپت اُٹھ بیٹھے اور بولے:۔ بتائیے میں کماری کو کیسے واپس لا سکتا ہوں؟

تینوں اشخاص مشورہ کرنے لگے اور فیصلہ اس پر ٹھہرا کہ وہ بھی اُن سپاہیوں کے ہمراہ جو کماری کو لئے جا رہے ہیں۔ چپیں اور راجدھانی میں پہنچ کر کماری کے رہا کرانے کی کوئی تدبیر سوچیں۔ یہ سُن کر اگپت نے کُند کی جانب دیکھ کر خوشامدانہ لہجہ میں کہا:۔ کُند! آؤ ہم ان معزز مہمانوں کے روبرو ایک عہد کر لیں۔ یہ تو تم دیکھ ہی چکی ہو کہ یہ دھن دولت کتنی گمراہی اور بے عزتی کا باعث ہوتے ہیں۔ آؤ ہم تہ دل سے اسے تیاگ دینے کا عہد کر لیں۔ میں اپنا موجودہ مرتبہ چھوڑ کر مفلسی میں بسر اوقات کرونگا۔ اور آج سے میں سونے چاندی کو لوہے کے ٹکڑوں کے برابر بھی اہمیت نہیں دوں گا۔ کیوں کُند؟

کُند نے چُپ چاپ یہ عہد کر لیا۔

"آج سے ہم مال و دولت اور دنیوی حرص ذرا نہ کریں گے۔ اس کے علاوہ میری ایک بات اور سنو۔ کُند! یہ گہرا تعلق جو میرے اور تمہارے درمیان ہے کئی دکھوں کی جڑ ہے۔ دیکھو اس واقعے نے ہمیں کتنی مشکلات میں ڈالا ہے۔ آؤ ہم اس تعلق کو بھی توڑ دیں۔

آج سے ہم میاں بیوی نہیں۔ ایشور تمہاری نجات کا سبب پیدا کرے۔ جاؤ تمام دنیا میں پھرو اور اہلِ دنیا کی خدمت میں زندگی بسر کرو میں بھی کماری کی رہائی کے بعد ایسا ہی کروں گا۔"

یہ سُن کر کنتدزمین پر گر گئی۔ لیکن اپگیت نے اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ وہ کسی گہرے خیال میں مستغرق تھے اور اسی حالت میں باہر چلے گئے۔

(۶)

موسم گرما کی جلتی ہوئی لُو اور دھوپ کی ذرا بھی پرواہ نہ کرتے ہوئے ایک سوار پہاڑ کے دامن میں گھوڑا دوڑائے جا رہا تھا۔ اس کے آگے آگے ایک ہرن جان کے خوف سے بھاگا جا رہا تھا۔ نوعمر سوار نے چلّہ چڑھایا اور کمان کو کان تک کھینچ کر چھوڑ دیا۔ تیر ہرن کے پاؤں میں لگا۔ ہرن خوفزدہ ہو کر گرم گرم خون کے قطرے ٹپکاتا وادی کے ایک طرف بھاگ گیا۔ ہرن کو سامنے نہ پا کر سوار گھوڑے سے اُتر پڑا۔ اور خون کے نشانات کو دیکھتا ہوا آگے بڑھا۔

آگے جا کر ایک پیپل کے سائے میں ایک بھکشو کو بیٹھے دیکھا۔ اس کی گود میں وہی ہرن تھا اور وہ اس کے پاؤں سے تیر نکال کر زخم پر پٹی باندھ رہا تھا۔

اس نوجوان نے اس کے نزدیک جا کر نہایت تند لہجہ میں کہا۔

او فریبی! تو کون ہے؟

ایشور تمہارا بھلا کرے۔ بوڑھے بھکشو نے سر اٹھا کر کہا۔

آخر تو ہے کون؟

میں بھکشو ہوں۔

او بھکشو! کیا تیرا حوصلہ اتنا بڑھ گیا ہے کہ اب میرے شکار کو بھی ہاتھ لگاتا ہے؟ چھوڑ اسے!

کیوں؟

کیونکہ یہ میرا شکار ہے۔

وہ کیسے؟

میں نے اسے مارا ہے۔

مارنے والا کسی کا سوامی نہیں ہو سکتا، وہ دشمن ہوا کرتا ہے۔ اور دشمن کا کوئی حق نہیں ہوتا۔ سوامی بنانے والا ہوتا ہے بگاڑنے والا نہیں۔ اور اسی کا حق ہوتا ہے۔

تو بڑا بدتمیز ہے۔

بھلا غریب سادھو اصول اور تمیز کو کیا جانے؟

اسے چھوڑ دے یہ میرا شکار ہے۔

نہیں یہ میرا اپنا پالا ہوا حیوان ہے۔

"میں نے اسے مارا ہے۔"

"اور اس کی حفاظت میں نے کی ہے۔"

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس سوار کا غصہ ضائع ہوتا جا رہا تھا۔ بھلا وہ ایسی گستاخ گفتگو کب سُن سکتا تھا۔ مگر باوجود اس کے وہ بوڑھے سادھو کی باتوں سے متاثر ہو رہا تھا۔ یکایک وہ بولا:۔ تو اسے کیا کریگا؟

میں اس کا زخم مندمل ہونے پر اسے چھوڑ دوں گا اور یہ آزاد پھرے گا۔

"نہیں تو ضرور اس کا گوشت کھائے گا۔ تو مکار ہے اور میرا شکار ہڑپ کر جانا چاہتا ہے۔"

"نوجوان سوار! صبر کر، قاتل سے محافظ بہتر ہے۔ جو شخص ایک معمولی کیڑا بھی بنانے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اسے اتنا بڑا حیوان مارنے کا کیا حق ہے؟ ہم لوگ گوشت خور نہیں بلکہ محافظ ہیں۔ نزدیک ہی ہمارا وہار (بھکشوؤں کے رہنے کی جگہ) ہے۔ وہاں بہت سے بدھ بھکشو رہتے ہیں جو جانداروں کے محافظ ہیں اور وہاں بیمار اور مجروح جانداروں کا علاج بھی کیا جاتا ہے۔ ہمارا دھرم پریم اور دیا ہے۔"

نوجوان خاموش کھڑا رہا۔ پھر یکایک بول اُٹھا:۔ میں تمہارا وہار دیکھنا چاہتا ہوں۔

بوڑھے نے اشارے سے اسے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ اس کے پاس کئی بیمار اور زخمی حیوان تھے۔ ان سب کو اس نے اٹھا لیا۔ نوجوان نے کہا:۔ تم اتنا بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔ لاؤ یہ ہرن میں لے چلوں۔

نوجوان کے چھوتے ہی ہرن تلملانے لگا۔

بھکشو نے کہا:۔ اسے مت چھوؤ۔ اسے تم سے نفرت ہے۔ بھکشو نے اسے گود میں اُٹھا لیا اور وہ بچّہ کی مانند اس کی گود میں سو گیا۔

دونوں روانہ ہوئے۔ نوجوان کو اب شکستِ غرور کا احساس ہو چکا تھا۔ اس وقت وہ سوچ رہا تھا ــ میں سمجھتا تھا کہ روئے زمین کے تمام حکمران میرے قدموں میں جھکتے اور میری عزت کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک معمولی سا حیوان بھی مجھ سے سخت متنفر ہے۔ آخر اس بوڑھے بھکشو میں کیا جادو ہے۔ جس کے سبب یہ بے زبان بھی اس پر بھروسہ کرتا ہے اور محبت سے اپنے آپ کو اس

کے حوالے کئے ہوئے ہے - آہ کیا میں اسقدر قابلِ نفرت ہوں؟ — اس نے ایک نگاہ اپنے خون آلودہ کپڑوں پر ڈالی اور ایک گہرا سانس لیا اور سر جھکا کر سادھو کے پیچھے پیچھے روانہ ہوگیا۔

(۷)

جنگل میں داخل ہوتے ہی درختوں کے جھنڈ کے درمیان وہ وہار واقع تھا - وہاں چاروں طرف امن وامان اور خوشی کا دَور دورہ تھا - غروب ہوتے ہوئے سورج کی کرنیں ان گھنے درختوں کو پار نہ کر سکتی تھیں - اس ٹھنڈی جگہ میں بہت سی تپسیوں کی کٹیاں بنی ہوئی تھیں - جن میں مختلف عمروں کے بدھ سادھو ترکِ دنیا کئے تپسیا میں محو تھے - بیمار اور زخمی جانداروں کا علاج ہو رہا تھا - ہزاروں چارپائے اور پرندے بیخوف ادھر ادھر پھر رہے تھے - بوڑھے کے پہنچتے ہی دو سادھوؤں نے دوڑ کر اس کا بوجھ اٹھا لیا اور ان کے علاج معالجے میں مشغول ہوگئے - نوجوان سوار مبہوت کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا - ایسا امن وامان اس نے کہیں نہ پایا تھا - اس کے دل میں ہزاروں خیالات آرہے تھے - اس کی آنکھوں میں ایک نئی چمک تھی -

نعرہ بلند ہوا — "موگلی پتر تشّے کی جے" — نوجوان نے نظر اٹھا کر دیکھا کہ سامنے سے ایک شخص چلا آرہا ہے - پُرامن چہرہ تیز نظر اور زبردست شخصیت - نوجوان سوچنے لگا کیا یہی بھگوان … موگلی پتر ہیں جن کی بابت سنا ہے کہ ان کے درشن ہونے سخت مشکل ہیں اور جسے ان کے درشن نصیب ہو جائیں وہ ایک مبارک ہستی خیال کیا جاتا ہے - نوجوان ٹکٹکی باندھے اس مبارک شخصیت کو دیکھتا رہا -

بھگوان تشّے نے نوجوان کے قریب آکر کہا: "شہنشاہِ اعظم کی جے (فتح) ہو۔"

کسی ناقابلِ تسخیر طاقت کے زیرِ اثر شہنشاہ نے سادھو کے قدموں میں سر جھکا دیا - تمام بھکشو حیران رہ گئے - بھگوان تشّے نے کہا - بادشاہ سلامت! اس بوڑھے بھکشو کے منہ سے اگر کوئی نازیبا کلمات نکل گئے ہوں تو آپ اسے معاف کریں - وہ آپ سے واقف نہ تھا -

شہنشاہ نے کہا: "بھگوان! آج میں کامران ہوں - مجھے تمام شاہی اعزازات اور درباری شان وشوکت ایسی تسکین عطا کرنے سے قاصر رہے ہیں - جو میں نے اس جنگل میں حاصل کی ہے میں نہایت خوش نصیب ہوں کہ مجھے بھگوان کے درشن ہوئے - پربھو! میں نے کالنگا کی لڑائی میں ایک لاکھ بہادروں کا ناحق خون بہایا ہے - اب میں دیکھتا ہوں کہ قتل سے حفاظت کرنا بہتر ہے - میں سمجھتا تھا - کہ روئے زمین کے تمام فرمانروا میری عزت کرتے ہیں - مگر آج ایک معمولی حیوان کا رویہ دیکھ کر میرے دل میں اپنے لئے سخت نفرت پیدا ہوگئی ہے - ایشور میرا محافظ ہو - یہ غلام آپ کی پناہ میں آیا ہے -

بھگوان تشّے نے کہا: - یہ بہت اچھا ہوا کہ آپ کو اس مذہب میں اطمینانِ قلب ملا - بھگوان بدھ کو بھی اسی طرح اچانک گیان حاصل ہوا تھا - طاقت اور حکومت سے دوسروں کو مطیع کرنے کی نسبت پریم اور دیا سے فتح حاصل کرنا بہت بہتر ہے - جسم پر قابو پانے کی نسبت نفس کو مسخر کرنا حقیقی فتح ہے - بے شک آپ روئے زمین کے بادشاہ ہیں - لیکن آپ کی ابدی فتح صرف وہی ہوگی جب آپ دوسروں کی روحوں پر حکمراں ہوں گے - اسی وقت آپ حیاتِ جاوید پائیں گے -

بادشاہ نے سر جھکا کر کہا: - بھگوان مجھے معرفت کا درس دیجئے - میں پریم اور رحم سے دوسروں پر فتح حاصل کروں گا - جُود وکرم میرا ہتھیار، دیا میری ڈھال اور ایثار میری حکومت ہوگی -

آمین — اب آپ کا نام خونخوار اشوک کی بجائے "حبیبِ خدا" ہوگا - آپ کی نجات ہو - آج سے آپ دیوتاؤں کے حبیب ہیں - کہو —

میں بدھ کی پناہ میں جاتا ہوں -

میں دھرم کی پناہ میں جاتا ہوں -

بادشاہ نے دو زانو ہو کر ان سطور کو دہرایا اور موگلی پتر تشّے نے مقدس پانی چھڑک کر کہا: "حبیبِ خدا شہنشاہ اشوک کی جے ہو - آؤ بادشاہ سلامت اب میں آپ کو تمہارے گرو سے متعارف کراؤں - آپ کو ان سے گروؤں کا سا سلوک کرنا ہوگا - وہ مہاتما بدھ کے اوتار ہیں - وہ ہمیشہ آپ کے ساتھ رہ کر آپ کو راہِ نجات دکھائیں گے اور آپ کو روحانی تعلیم دیں گے - ان کے حکم کے مطابق عمل پیرا ہو کر آپ دنیوی اور اُخروی نجات حاصل کرلیں گے -

اچاریہ تشّے اتنا کہہ کر واپس لوٹے اور ایک گھنے کنج میں چھوٹی سی کٹیا کے دروازہ پر جا کر پکارا: —

اچاریہ اپگپت! بادشاہ سلامت آپ کی خدمت میں حاضر ہیں۔
اچاریہ اپگپت ـــــ وہی سیٹھ اپگپت ـــــ لباس تبدیل کئے سر منڈائے اور نظر نیچی کئے برآمد ہوئے۔ بادشاہ نے زمین بوس ہو کر کہا۔ اچاریہ! مجھ گمراہ کو راہ راست دکھاؤ۔

اچاریہ اپگپت کی تپسیا نہ ٹوٹی اور نہ انہوں نے نظر ہی اٹھائی۔ ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار بہہ نکلی۔ اچاریہ تشئے نے کہا۔ بادشاہ سلامت آپ کے اعتقادات کا دنیا میں پرچار کریں گے۔ آپ ہی ان کو راہ راست دکھانے کے قابل ہیں۔ بادشاہ سلامت کا سلام قبول فرمائیے۔

اچاریہ اپگپت نے نحیف و نزار آواز میں کہا:۔ حبیب خدا شہنشاہ کی جے ہو۔ اچاریہ! آپ بادشاہ سلامت کی نجات کا بوجھ میرے کندھوں پر نہ ڈالیں۔ اعلیحضرت! اچاریہ تشئے کے ہوتے ہوئے آپکو راہ نجات اور کون بتا سکتا ہے۔

بھگوان تشئے نے کہا:۔ اچاریہ! روح پر ہمیشہ نادانی کا پردہ پڑا رہتا ہے۔ جسے دور کرنے کے لئے کسی مرشد کامل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس وقت آپ ہی راہ طریقت سے واقف ہیں۔ اب آپ ہی ان کے لئے کوئی ذریعۂ نجات سوچیں ـــــ بس میرا کام تو اتنا ہی تھا۔ یہ کہہ کر موگلی پتر تشئے تپسیا میں محو ہو گئے۔ اب اچاریہ اپگپت نے آنکھ اٹھا کر کہا ـــــ چکرورتی! اندر تشریف لے آئیے۔

وہ دونوں کٹیا میں داخل ہو گئے۔

(۸)

شام کا وقت تھا اور شہنشاہ اشوک ادھر ادھر ٹہل رہے تھے۔ ہندوستان کا شہنشاہ کبھی اتنا متفکر نہ ہوا تھا۔ اس کے خیالات کی رو کالنگا کے مہاراج کی جانب بہہ رہی تھی۔ وہ سوچ رہے تھے کہ میں نے بیفائدہ ایک وسیع سلطنت کو تہ و بالا کیا۔ نہ جانے کالنگا کے مہاراج کہاں اور کیسے مرے ہوں گے۔ ان کے ولیعہد بھی لاپتہ ہیں۔ اور ان کا خاندان بھی معلوم نہیں کس حالت میں ہو گا۔ میں اس پاپ سے کیسے رہائی پا سکتا ہوں؟

بادشاہ کی باطنی آنکھیں کھل گئیں اور ان پر رحم اور پریم کی حقیقت واضح ہو گئی۔ وہ اس پاپ کے ازالے کی کوئی ترکیب سوچ رہے تھے۔

اس وقت ایک شاہی خدمتگار نے سلام کر کے کہا:۔ پربھو! کالنگا کے مہاراجکمار کو لیکر مہانائک آئے ہیں۔ اشوک نے خوش ہو کر کہا:۔ انہیں بھی یہیں لے آؤ۔

ایک ہی لمحہ بعد مہانائک کالنگا کے مہاراجکمار کو ساتھ لئے آیا اور سلام کر کے راجکمار سے کہا ـــــ کمار! بادشاہ سلامت کو پرنام کرو۔

کمار نے ہنس کر کہا:۔ مہانائک آپ کے اس حکم کی مجھے ضرورت نہیں۔ میں آپ کے نیک سلوک کا جو آپ نے راہ میں میرے ساتھ کیا ہے بے حد شکرگزار ہوں۔ اب مجھے بادشاہ سلامت سے کیسے پیش آنا چاہئیے۔ یہ میں خود ہی سوچ لوں گا۔ آپ بادشاہ سلامت کی اجازت پا کر جا سکتے ہیں۔

مہانائک راجکمار کی یہ گفتگو سن کر مبہوت کھڑا رہا۔ بادشاہ بھی حیران تھے اور کمار کو بغور دیکھ رہے تھے۔ کمار نے ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر سر جھکا لیا اور کہا:۔ حضور! مہانائک کو جانے کی اجازت دیں تو میں آپ کے چرنوں کو چھوؤں۔

شہنشاہ نے مہانائک کو چلے جانے کا اشارہ کیا اور پھر نزدیک آ کر کہا:۔ کالنگا کے راجکمار! تمہیں میرے چرنوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے تم سے درازدستی کی ہے۔ تمہارے پتا کی بھی کوئی خبر نہیں میں نے تمہیں اس لئے طلب کیا ہے کہ اگر تم چاہو تو مجھے اس قصور کی سزا دو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے اب اپنا دشمن نہ سمجھو۔ میرے عزیز راجکمار! کیا تم اب بھی مجھے اپنا دشمن سمجھتے ہو؟ راجکمار انہیں مشتبہ نظروں سے دیکھ کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے دوزانو ہو کر بادشاہ کو سلام کیا۔ اور کہا:۔ چکرورتی کی جے ہو۔ حکمرانوں میں جنگ ہوا ہی کرتی ہے اور اس میں فتح و شکست بھی ہوتی ہے۔ آپ کو ایک مفتوح سلطنت کے نظر بند شہزادے کی اتنی قدر و منزلت نہیں کرنی چاہئیے۔

نہیں راجکمار! میں نے فضول ہی اتنے ترقی یافتہ ملک کو تباہ کیا۔ اب بھی بغیر کسی سبب کے میرے دل میں تمہارے لئے ایک انوکھا پریم امڈ رہا ہے۔ آخر یہ بات کیا ہے؟ اچھا اپنا ہاتھ تو مجھے دو۔ میرے عزیز راجکمار!

کمار نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا:۔ نہیں شریمان! یہ غلام اتنی عزت کے لائق نہیں۔ آپ کو اپنے دشمن سے ایسا سلوک نہیں کرنا چاہئیے۔

دشمن نہیں کمار! میں نے دل میں ٹھان رکھا ہے کہ تم کو تمہارے پتا کی سلطنت مع تاوان جنگ واپس کر دوں۔ اس کے علاوہ اور بھی جو کچھ مانگو گے دوں گا۔

کیا آپ پختہ وعدہ کرتے ہیں؟

ہاں! کمار!! میں پختہ وعدہ کرتا ہوں۔

کیا آپ جو کچھ میں طلب کروں گا۔ دوگے؟

ضرور! چاہے وہ شاہی تاج ہی کیوں نہ ہو۔

صرف شاہی تاج ہی؟ راجکمار نے کہا۔

جسم اور جان بھی پیارے کمار! تمہاری چتون کتنی پیاری ہے لاؤ مجھے اپنا ہاتھ تو دو۔

تو اب آپ کے جسم اور جان کا مالک میں ہوا؟ ایک بار پھر سوچ لیں۔ لیجئے یہ ہاتھ حاضر ہے۔

بادشاہ اس کا ہاتھ پکڑنے کو لپکے۔ اسی وقت اچاریہ اپگپت نے بآواز بلند پکار کر کہا —— چکرورتی! ذرا صبر۔

اشوک نے دیکھا کہ اچاریہ دو شخصوں کی معیت میں اس طرف آرہے تھے۔ وہ دونوں اشخاص دور کھڑے رہے۔ اور اچاریہ آگے بڑھے۔ بادشاہ نے اچاریہ کے چرنوں میں جھک کر کہا۔ —— اچاریہ کالنگا کے راجکمار جیتندر حاضر ہیں۔ میں نے ان کی سلطنت مع تاوانِ جنگ واپس کر دی ہے اور اب میرے جسم وجان کے سوامی بھی یہی ہیں۔ کمار! اچاریہ کی قدمبوسی کرو۔

کمار آگے بڑھا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ اچاریہ نے بڑھ کر کمار کی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور کہا:۔ نجات ہو! نجات ہو!!

کمار کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اس کے منہ سے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں صرف اتنا نکل سکا —— سیٹھ.... صا.... ح.... ب؟ اچاریہ نے بادشاہ کے قریب پہنچ کر نہایت خندہ پیشانی سے کہا —— آپ نے واقعی عقلمندی کی کہ اپنا جسم وجان ایک پاکباز شخص کے حوالے کر دیا۔ اب اس مقدس ہاتھ کو قبول فرمائیے۔

یہ کہہ کر اچاریہ نے بادشاہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔

بادشاہ حیران رہ گئے۔ کمار کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اچاریہ نے کہا:۔ کالنگا کی راجکماری شیلا! تم نے خود ہی تو یہ سودا کیا تھا۔ اب خوفزدہ کیوں ہو گئیں؟

بادشاہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا —— کالنگا کی راجکماری شیلا دیوی؟ اچاریہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔

اچاریہ نے ان کی بات کو دھیان میں نہ لا کر کہا:۔

مہاراجکماری! اپنا لباس تبدیل کر کے ذرا نزدیک آجائیے۔

یہ کہہ کر اس نے کماری کا ہاتھ بادشاہ کے ہاتھ میں دے دیا۔ ایک لمحے کے لئے اُن کے دل ساکن ہو گئے۔ آخر کار بادشاہ نے حواس مجتمع کر کے کہا۔ اچاریہ! بدی کا ایسا نیک انجام کیوں؟

اچاریہ نے کہا:۔

"بادشاہ سلامت یہ نیکی کا پھل ہے۔ وہ دیکھئے کالنگا کا مہاراج اور راجکمار کھڑے ہیں۔ ان کا استقبال کیجئے۔"

بادشاہ دوڑ کر کالنگا کے راجہ کے آگے جھکے۔ کالنگا کے مہاراج جیتندر نے انہیں گلے لگا لیا۔ اس کے بعد اچاریہ نے راجکماری کی قربانی اور جرأت کا تمام ماجرا ان سے من وعن بیان کر دیا۔ پتا نے بیٹی کو گلے لگا لیا اور اسے بادشاہ کو سونپتے ہوئے کہا:۔

"اگرچہ آپ اسے پیشتر ہی لے چکے ہیں۔ مگر پھر بھی اسے ایک بار میری طرف سے قبول کیجئے۔"

بادشاہ نے سر جھکا کر راجکماری شیلا کا ہاتھ پکڑ لیا۔

تمام سلطنت کے طول و عرض میں خوشیاں منائی گئیں۔ کالنگا کے مہاراج بن باسی ہوئے اور راجکمار جیتندر تخت نشین ہوئے۔

* *

(شری چترسین شاستری)

مترجمہ:۔

رفیع الزمان خاں بی۔ اے (آنرز)
(جالندھر)

خط وکتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیا کریں۔ ورنہ عدم شکایت کی تعمیل معاف۔
مینجر

بزمِ انتخاب

زاڈگ

ایک دن زاڈگ ایک چھوٹے سے جنگل کے کنارے چہل قدمی کر رہا تھا کہ اُس نے دیکھا کہ ملکہ کے کئی اہل کار اس کی جانب دوڑے ہوئے آرہے ہیں، یہ لوگ کچھ مضطرب سے معلوم ہو رہے تھے اور ان کی متجسس نگاہیں اس بات کا پتہ دے رہی تھیں کہ وہ کسی گم شدہ چیز کی تلاش میں سرگرداں ہیں، جو اچانک طور پر کھوگئی ہے۔ جب وہ زاڈگ کے قریب پہنچے تو خواجہ سرا نے آگے بڑھ کر دریافت کیا "آپ نے ملکہ کے لاڈلے کتے کو دیکھا ہے؟"

"ایک چھوٹی سی کتیا کہئے۔" زاڈگ نے جواب دیا۔

"درست۔ آپ سچ کہتے ہیں۔" خواجہ سرا نے سنبھل کر کہا۔

"ایک چھوٹی سی شکاری کتیا کہئے جس نے حال میں بچے دئے ہیں۔ اور جس کا سامنے کا بایاں پیر لنگڑا ہے اور کان لمبے ہیں۔" زاڈگ بولا۔

"بالکل ٹھیک۔ پھر آپ نے اُسے کہاں دیکھا؟" خواجہ سرا نے خوش ہو کر دریافت کیا۔

"جی نہیں۔ میں نے اُسے کبھی نہیں دیکھا اور مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ملکہ کے ہاں ایسی کتیا موجود ہے۔" زاڈگ نے جواب دیا۔

عین اسی موقعہ پر ایک عجیب اتفاق پیش آیا۔ بادشاہ کے اصطبل کا حسین ترین گھوڑا دفعتہً بھاگ گیا اور سائیسوں کے قبضے سے نکل کر بابل کے میدانوں کی طرف سرپٹ بھاگا۔ وزیر اعظم اور دربار کے تمام مصاحب گھوڑے کے تعاقب میں اسی اضطراب و بےچینی کے ساتھ نکل پڑے تھے جس طرح کہ ملکہ کے خدام کتیا کے تعاقب میں دوڑے ہوئے آرہے تھے، جب یہ لوگ زاڈگ کے قریب پہنچے تو وزیر اعظم نے آگے بڑھ کر گھوڑے کے متعلق دریافت کیا۔ زاڈگ نے جواب دیا۔ "گھوڑا بہترین انداز سے پوپہ (G a ll o p.) جاتا ہے۔ وہ پانچ قدم اونچا ہے اور اُس کے کھر چھوٹے ہیں۔ دم ساڑھے تین بالشت طویل ہے۔ لگام ۲۳ کیرٹ سونے کی اور نعل چاندی کے ہیں۔

وزیر نے بےچینی سے استفسار کیا "تو وہ کون سے راستے پر جا رہا تھا اور کس سمت؟"

لیکن زاڈگ نے اطمینان کے ساتھ جواب دیا "میں نے اُسے کبھی نہیں دیکھا اور اس کے متعلق سنا بھی نہیں۔"

وزیر اعظم اور خواجہ سرا کو اب یقین ہو گیا۔ کہ زاڈگ نے بادشاہ کا گھوڑا اور ملکہ کی کتیا چرائی ہے۔ چنانچہ انہوں نے زاڈگ کو چوری کے الزام میں عدالت عالیہ کے روبرو پیش کیا۔ عدالت نے زاڈگ کے لئے کچھ جسمانی سزا اور پھر عمر بھر کے لئے سائبیریا کے دشت میں جلاوطنی تجویز کی۔ لیکن ججوں نے اپنا فیصلہ سنایا ہی تھا کہ عدالت میں کتیا اور گھوڑے کے واپس آجانے کی اطلاع پہنچی۔ اب ججوں کو افسوس اور مجبوری کے ساتھ فیصلہ پر نظر ثانی کرنی پڑی۔ لہذا اُنہوں نے زاڈگ پر جھوٹ کا الزام برقرار رکھا۔ کیونکہ گھوڑے اور کتیا کو دیکھنے کے باوجود اُس نے لاعلمی کا اظہار کیا تھا، اور یہ تجویز پیش کی کہ وہ چار سو اونس سونا بطور جرمانہ ادا کرے اور اس کے بعد چاہے تو صفائی پیش کرے۔

صفائی کے بیان میں ملزم نے کہا "جب میں جنگل کے کنارے چہل قدمی کر رہا تھا۔ تو بزرگ خواجہ سرا اور محترم وزیر اعظم سے ملاقات ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ سڑک پر مجھے کسی چھوٹے سے جانور کے چھوٹے چھوٹے نقشِ قدم نظر آئے۔ اور یہ سمجھنے میں دقت نہیں ہوئی کہ یہ کسی کتے کے نقشِ قدم ہوں گے۔ دونوں پاؤں کے نقوش کے درمیان کی واضح لکیر سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ کتیا ہو گی۔ جس نے حال ہی میں بچے دئے ہیں۔ اس کے علاوہ نقوش کے پاس ہر جگہ مٹی کی سطح کا کچھ کچھ اُبھرا ہوا نظر آنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ کتیا کے کان لمبے ہوں گے اور چونکہ پاؤں کے ہر چار نقوش میں آگے کا بایاں نقش بالکل ہلکا نظر آرہا تھا، میں کہہ سکتا ہوں کہ ہماری قابلِ احترام ملکہ کی کتیا ـــــ مجھے معاف کیا جائے ـــــ ضرور لنگڑی ہو گی۔ اب رہا بادشاہ کا گھوڑا۔ سڑک پر مجھے کھر کے نشانات نظر آئے۔ جن کا درمیانی فاصلہ ہر جگہ

مساوی تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ گھوڑا بہترین انداز سے پویہ جاتا ہے۔
پھر میں نے سڑک کے آزو بازو درختوں پر نظر دوڑائی تو دونوں جانب
درختوں کے نچلے حصے مٹی اور گرد سے صاف نظر آ رہے تھے۔ لہذا یہ
نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ گھوڑے کی دُم ساڑھے تین ہاتھ لمبی ہو گی۔ کیونکہ
سڑک کی چوڑان سات قدم ہے۔ سڑک کے وسط میں درختوں کے تازہ
پتے جھڑ کر بکھر گئے تھے اور چونکہ دونوں طرف کے درختوں کی شاخیں سڑک
کے عین وسط میں، سڑک کی سطح سے ساڑھے پانچ قدم اوپر باہم گتھ گئی
تھیں۔ یہ کہنا آسان ہے کہ گھوڑا ازیادہ سے زیادہ پانچ قدم اونچا ہو گا۔
لگام ضرور ۲۳ کیرٹ سونے کی ہو گی۔ کیونکہ سڑک کے کنارے ایک اونچے
سے پتھر پر ۲۳ کیرٹ سونے کی رگڑ کا نشان موجود تھا جس کا میں نے
بغور معائنہ کیا۔ پھر سڑک کی کنکریوں پر جابجا چاندی کی رگڑ کے نشانات
موجود تھے اور مجھے یقین ہو گیا کہ گھوڑے کے نعل چاندی کے ہوں گے۔"

ملزم کے بیان پر ججوں کو بڑی حیرت ہوئی اور انہوں نے اس
بیان کی ایک نقل بادشاہ اور ملکہ کو روانہ کی، دربار، محل، عدالت اور ہر
مقام پر جہاں دو آدمی اکٹھے ہوتے زاڈگ کے متعلق چہ میگوئیوں کا سلسلہ
چھڑ جاتا۔ ماغیوں (مجوسی مذہبی پیشواؤں) کا خیال تھا کہ زاڈگ ساحر ہے۔
اور اسے زندہ جلا دینا چاہیئے۔ لیکن بادشاہ کی رائے اس کے برعکس
تھی۔ اس نے ملزم کا جرمانہ معاف کیا اور رہائی کا حکم صادر فرمایا۔

اس کے بعد عدالت کے محافظ، دفتر، وکیل، امین، ناظر وغیرہ سب
نے مل کر زاڈگ کے مکان پر اس سے ملاقات کی اور عدالت کی جانب
سے رقم جرمانہ کی واپسی پر مبارکباد پیش کی۔ لیکن چونکہ اس مقدمے میں
عدالت کا خرچ ۳۹۸ اونس سونا بتایا گیا اور پھر اس پر عدالت
کے چپراسی بخشش کا مطالبہ کر رہے تھے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں
کہ زاڈگ کو کیا واپس ملا ہو گا۔

بہر حال زاڈگ نے اچھی طرح محسوس کیا کہ بعض اوقات اپنی
معلومات کا اظہار کرنا کس قدر خطرناک ہوتا ہے۔ اور یہ عزم کر لیا کہ آئندہ
وہ ایسے معاملات میں کبھی لب کشائی نہ کرے گا۔

لیکن بہت جلد اس کو ایک ایسے ہی معاملے سے دوچار ہونا
پڑا۔ ایک دن زاڈگ اپنے مکان کی کھڑکی کے پاس کھڑا ہوا تھا۔
کھڑکی کے نیچے سے ایک مفرور شاہی قیدی کسی طرف نکل گیا۔ اور
کچھ دیر میں شاہی سپاہی قیدی کی تلاش میں نکلے۔ چاروں طرف دیکھنے
کے بعد انہوں نے زاڈگ سے قیدی کے متعلق دریافت کیا۔ زاڈگ
نے کوئی جواب نہ دیا۔ چنانچہ انہوں نے زاڈگ کو عدالت میں کھینچا اور یہ
ثابت کیا کہ قیدی کے فرار کے وقت زاڈگ کا سر کھڑکی کے باہر تھا۔
لہذا ججوں نے ملزم کے لئے پانسو پاؤنڈ سونا بطور جرمانہ سزا تجویز کی۔
اور بابل کے رسوم کے مطابق ملزم نے اس مہربانی پر ججوں کا شکریہ ادا کیا۔

زاڈگ نے خود سے مخاطب ہو کر کہا "چہل قدمی کے لئے جنگل
کی طرف جانا، جہاں سے بادشاہ کا گھوڑا اور ملکہ کی کتیا گزرے ہوں، ایک
مصیبت عظیم کا باعث ہوتا ہے، کھڑکی کے باہر سر نکالنا، ایک آفت
کا پیش خیمہ ہوتا ہے! اس دنیا میں خوش رہنا بھی کسقدر دشوار ہے۔"

آج کل کی سوسائٹی

"کلیم"

نیا زمانہ اور اس کی تہذیب سراسر مسخرہ پن نہیں تو کیا ہے؟ میں تو
یہ کہوں گی کہ انسان اس تہذیب میں گرفتار ہو کر انسانیت سے خارج
ہو جاتا ہے۔ اس زمانے میں پڑھے لکھے لوگوں کا زیادہ چرچا ہے۔
اور ان لوگوں کی ہر وقت یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ ہر شعبے میں ترقی اور
کمال پیدا کریں۔ لیکن غور سے دیکھئے تو اس جنون کے پیچھے اعتدال، امتیاز،
خودداری، غرض سب کچھ ملیامیٹ ہو رہا ہے۔ اور خود فراموشی کا یہ
عالم ہے کہ بُرے بھلے کی تمیز باقی نہیں رہی۔ ورزشی خبط اور صحت کے
اصولوں کے نام سے جو بے عنوانیاں ہو رہی ہیں وہ سب پر عیاں ہیں۔
عزت جوانی کا جوہر ہے۔ اور اس کے بغیر زندگی عیب دار ہو جاتی ہے۔
جب یہ بہترین جوہر ہی قربان ہو گیا تو میری رائے میں تو انسان پھر انسان
کہلانے اور منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ لوگ
باگ بے باکی اور بے غیرتی ہی کو معاشرتی ترقی سمجھتے ہیں۔ یہ بھی غنیمت
تھا مگر افسوس اس کا ہے کہ ان کے زیر اثر دوسری کمزور طبیعتیں بھی ان
"ترقی یافتہ" خوبیوں پر مائل ہو جاتی ہیں۔ اس طرح دن بدن زیادہ سے
زیادہ بے عنوانیاں پھیلتی جا رہی ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے۔ صحت یابی کے
لئے سب سے بڑا اصول برہنگی سمجھا جاتا ہے۔ سمندری مخلوط غسل، انگریزی
ناچ، مخلوط ورزش، ایک بھانڈ اور بے غیرتی کے سبق دینے والے
سینما، یہ سب چیزیں تہذیب جدید کے اہم کارنامے ہیں۔ لیکن سچ
پوچھئے تو یہ اخلاق کا قتل عام ہے۔ ہمارے ہاں تو شریف آدمی
وہ ہے جو اپنے خاندان کا پاس رکھتا ہو جس نے اپنے اجداد کی روش
کو فخر سے اختیار کیا ہو۔ وہ ان ہی کا دم بھرتا ہو۔ لیکن یہ جدید تہذیب
ایسے لوگوں کو حیرت سے دیکھتی ہے۔ آج کل کی سوسائٹی میں ان

کی خاص وقعت نہیں ہوتی۔ ہاں جن کے پاس روپیہ ہے، چاہے وہ کسی طرح بھی حاصل ہوا ہو، ان کے سچ مچ کے عیوب بھی چھپ جاتے ہیں۔ جب تک ان کی دولت سے سوسائٹی والوں کا مطلب نکلتا رہتا ہے۔ لوگ شہد کی مکھی کی طرح ان کے ساتھ رہتے ہیں اور ان کی خوب جھوٹی تعریفیں کرتے ہیں۔ گویا سوسائٹی کے نزدیک جو کل تک غریب تھے وہ اوچھے تھے اور ان میں ہزاروں عیب تھے۔ لیکن آج نصیب نے یاوری کی تو وہ بے شمار خوبیوں کا منبع ہیں۔ واہ ری سوسائٹی! اور جو واقعی شریف ہیں اور کسی حال میں شرافت کو نہیں چھوڑتے۔ ان کے پاس جب روپیہ نہیں ہوتا تو سب اُن سے گریز کرتے ہیں اور اُنہیں بُرا بھلا کہتے ہیں۔ یہ ہیں آج کل کی سوسائٹی کے کرشمے!

علاوہ ازیں ایک مضحکہ خیز چیز اور سامنے آ رہی ہے۔ یعنی لوگ بلا امتیاز مذہب محض قانون کی رو سے شادیاں کر رہے ہیں۔ اس کو بھی چھوڑیئے، رونا اس کا ہے کہ مسلمان اپنے مذہب سے بیگانہ ہوتے جا رہے ہیں، میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ مذہب اسلام جس میں تمام دنیاوی و دینوی خوبیاں، بہترین تہذیب و تمدن، معاشرت اور صحت کے اصول موجود ہیں۔ اس پاک دین میں پیدا ہونے کے بعد کس طرح لامذہبی اختیار کی جا سکتی ہے۔ اس گمراہی کے انجام کا خیال کر کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ نہ جانے وہ ارحم الراحمین اپنے گمراہ بندوں کو کیسے معاف کرے گا۔ افسوس ایسے لوگ صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ فَھُمْ لَا یَرْجِعُوْن ہو کر رہ گئے ہیں۔

آج کل طلاق کا بھی بہت زیادہ زور شور ہے کسی نے دیکھا کہ فلاں مرد یا عورت اچھی ہے یا اس کے ساتھ اچھی گزرے گی۔ بس اس سے شادی کی ٹھان لی۔ تھوڑے دن تو خیر ذرا آرام سے گزری کیونکہ شادی پسند کی کی تھی۔ مگر بعد میں نتیجہ افسوسناک ہوا۔ یعنی جب طبیعت بھر جاتی ہے تو علیحدگی اختیار کر لی جاتی ہے۔ یہ ہوا عام ہو رہی ہے اور قریب قریب سب ہی قوموں میں ہو رہا ہے۔ نہ مذہب کا خیال ہے اور نہ شرافت و عزت کا۔ کم حیثیت اور رذیل جگہ ابھی رشتہ کر لیا جاتا ہے۔ اور پھر بعد میں جو نتیجہ برآمد ہوتی ہے۔ دوسروں کے متعلق تو میں یہ کہونگی کہ وہ اسلام جیسے پاک مذہب سے محروم ہیں لیکن جو مسلمان ہیں ان پر نہ جانے یہ کیا افتاد پڑتی ہے کہ وہ بھی زمانے کے ساتھ لغویات میں بہے چلے جاتے ہیں۔ بات صرف یہ ہے کہ ان کی نظر میں ان کے مذہب کی کوئی وقعت ہی نہیں۔ برخلاف اس کے اگر ان کا ایمان مضبوط

ہو تو وہ گم گشتہ راہ ہرگز نہ ہونے پائیں۔

"عصمت"

حُسنِ فطرت

مہذب دُنیا کے لوگ اپنے محبوب کو سونے اور جواہر کے زیور تحفہ میں دیتے ہیں اور اونچے نیچے سر بفلک ایوان میں لے جاتے ہیں.....

شام کو تماشا گاہوں میں رقص و سرود کی محفلیں گرم ہوتی ہیں اور ان سے لطف زندگی اُٹھاتے ہیں۔ رات کو بجلی کی روشنی سے اپنے ایوانوں کو بقعہ نور اور رشک جناں بناتے ہیں۔

لیکن اے میری تخئیلی دنیا کے معبود! میں تجھ کو دور......
انسانوں کی بستی سے بہت دُور۔

قدرت کے بنائے ہوئے خوبصورت گھر میں لے جاؤں گا۔
جو انسانوں کے بنائے ہوئے گھروں سے زیادہ خوبصورت ہے خوبصورت وادی!

اونچے اونچے پہاڑ اس مکان کے ستون ہیں۔ جس پر ہری گھاس کی ایسی نقاشی ہے جس سے قدرت کی گلکاریاں نمایاں ہیں۔ بڑے بڑے تناور درخت اور ان کی سبز پتیوں سے اس کی منقش چھتیں قائم ہیں۔ کنج تنہائی ہوگی —— میں —— تم —— اور رات کو چاند کی صاف و شفاف روشنی.....

ہاں صاف اور سفید روشنی ——

آہ اس روشنی میں تم کتنی پیاری معلوم ہوگی!......

چھوٹے چھوٹے منتشر ستارے —— اور ان کی تڑپ زمرد اور نیلم سے کہیں بڑھ کر ہوگی۔

وہ منظر تمہیں کتنا بھلا معلوم ہوگا!.....

رات کی چاندنی میں تم خودرو پھولوں کے تختوں پر محوِ گلگشت رہوگی۔

پھول! تمہارے قدموں پر نثار ہوں گے۔

دن کو تم چشمہ کے پاس جا کر بیٹھ جاؤگی......

سنہرا پانی تمہارے قدموں کو چوم کر چلا جائے گا!.....

آفتاب کے نیلے عکس پانی پر پڑیں گے!.....

پانی نیلا معلوم ہوگا!.....

ساری دنیا اس وقت نیلی معلوم ہوگی۔
اور تم ——— اس وقت نیلم پری۔
چڑیاں ایک شاخ سے دوسری پر چہچہا رہی ہوں گی! اور اپنے گانے میں محو!

اُف! یہ نغمہ انسانوں کے رقص و سرود سے کتنا بلند ہوگا!
میں اسے سنوں گا!
اور تمہاری آنکھوں میں آنکھیں ملا کر تمہیں دیکھوں گا۔
تم مسکرا دو گی!۔۔۔ تم اس کیف انگیز نغمہ کو سنو گی۔۔۔۔
میری طرف دیکھو گی!۔۔۔۔ میں ہنس دوں گا۔۔۔۔
فطرت ہوگی ——— اور اس کا لاثانی حسن۔۔۔۔
ساری فضا میں سکوت چھایا ہوگا۔۔۔۔ اس سکوت میں صرف آبشار کے گرنے۔ چڑیوں کے نغموں سے۔ پانی کی روانی سے — خلل ہو گا۔

آہ ——— وہ کتنا دلفریب شاعرانہ کیف ہوگا۔
یہ ساری فضا ——— آبشار ——— میں اور ——— تم۔

"نایم"

چینی صحافت

چین کی موجودہ قومی بیداری، ملی عصبیت، اشاعت تعلیم اہل قلم کی کثرت اور اس قسم کے دوسرے اسباب و عوامل ہیں۔ جن سے توقع ہوتی ہے کہ یہاں کی صحافت کا مستقبل نہایت شاندار ہوگا موجودہ صورت حال بھی ایک گونہ اطمینان بخش ہے۔ فی الحال کئی کئی بلند پایہ اور کثیر الاشاعت روز نامے چین کے اکثر بڑے بڑے شہروں مثلاً شنگھائی، ٹائنٹسین، پیکن، کینٹن، اور ہنکاؤ سے نکل رہے ہیں۔ سنگھائی میں مذکورہ بالا ہر سہ جرائد کے علاوہ دس اور اخبار شائع ہوتے ہیں۔ اسی طرح ٹائنٹسین سے بارہ یا تیرہ۔ پیکن سے ۷ سے زائد کینٹن سے ۳۰ یا ۴۰ اور ہنکاؤ سے ۱۴ یا ۱۵ جرائد نکلتے ہیں۔ ان کے علاوہ اور صوبوں کے بڑے بڑے شہروں میں شائع ہوتے ہیں۔ لیکن بارہ صفحوں پر چھپنے والوں کی تعداد بہت قلیل ہے

ان کثیر التعداد جرائد میں تھوڑے ہی ایسے ہیں جو مقتدر اور با اثر کہے جا سکتے ہیں۔ بیسیوں اخبارات کسی نہ کسی سیاسی جماعت یا فرد کے دامن سے وابستہ ہیں۔ ان میں سے معدودے چند اخبارات ہیں۔ جن کا ملک پر خاص اثر ہے اور لوگوں میں مخصوص وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

اس سلسلے میں چند مشہور و معروف اخبارات و رسائل کی فہرست معہ قیمت اور دیگر ضروری تشریحات کے ذیل میں درج کی جاتی ہے۔ جس سے حاجتمندوں کو استفادہ کرنے کا موقع مل سکے گا۔

برٹش چیمبر آف کامرس جرنل: - یہ پرچہ مہینہ میں ایک بار سنگھائی سے شائع ہوتا ہے۔ اس کا سالانہ چندہ بیرون ملک کے خریداروں کیلئے ایک شلنگ ہے۔

چائنا کریٹک: - یہ ہفتہ وار اخبار ہے۔ اور شنگھائی سے نکلتا ہے۔ سالانہ چندہ ایک پاؤنڈ ہے۔

چائنا میل: - یہ روزنامہ ہے اور ہانگ کانگ سے نکلتا ہے۔ سالانہ چندہ ۴ پاؤنڈ ۴ شلنگ ہے۔ اس کا ایک ہفتہ وار ایڈیشن بھی شائع ہوتا ہے۔ جس کا سالانہ چندہ ایک پاؤنڈ ۸ شلنگ ہے۔

چائنا کوارٹرلی: - یہ پرچہ ہر تین ماہ پر سنگھائی سے نکلتا ہے سالانہ چندہ ۱۲ شلنگ ہے۔

چائنا ویکلی ریویو: - یہ اخبار ہفتہ میں ایک بار شنگھائی سے نکلتا ہے۔ سالانہ چندہ ایک پاؤنڈ ۱۵ شلنگ ہے۔

چائنیز ایکونومک جرنل اینڈ بلیٹن: - یہ ماہنامہ ہے اور سنگھائی سے نکلتا ہے۔ سالانہ چندہ ایک پاؤنڈ ایک شلنگ ہے۔

چائنیز جرنل آف فیزیولوجی: - یہ ایک سہ ماہی رسالہ ہے اور پیکن سے شائع ہوتا ہے۔ سالانہ چندہ ایک پاؤنڈ ایک شلنگ ہے۔

چائنیز میڈیکل جرنل: - یہ ماہوار رسالہ ہے اور پیکن سے شائع ہوتا ہے۔ سالانہ چندہ ایک پاؤنڈ ۵ شلنگ ہے۔

چائنیز ریکارڈر: - یہ ماہوار پرچہ سنگھائی سے نکلتا ہے سالانہ چندہ ۱۴ شلنگ ہے۔

چائنیز سوشل اینڈ پالیٹیکل سائنس ریویو: - یہ رسالہ ہر تین ماہ پر پیکن سے شائع ہوتا ہے۔ سالانہ قیمت ۱۰ شلنگ ہے

فار ایسٹرن ریویو: - یہ پرچہ ہر ماہ سنگھائی سے نکلتا ہے سالانہ چندہ ایک پاؤنڈ ۱۴ شلنگ ہے۔

(عالمگیر)

جامع ازہر

" جامع ازہر" مسلمانوں کی قدیم ترین یونیورسٹی ہے۔ جس نے گزشتہ دس صدیوں میں اکنافِ عالم کے لاکھوں انسانوں کو زیورِ علم سے منور کیا عنقریب اس کی عمر ایک ہزار برس ہو جائے گی چنانچہ اس کے ہزار سالہ جشن کی تیاریاں بڑے زور سے شروع ہیں۔ گزشتہ سال مصری علماء کا ایک وفد اسی سلسلے میں ہندوستان بھی آیا تھا؛

تاریخ " جامع ازہر" مسلمانوں کی ابتدائی درسگاہوں کی طرح شروع میں ایک مسجد تھی جس کی بنیاد ۲۔ جمادی الاول ۳۵۹ھ کو بروز ہفتہ معزالدین باللہ فاطمی کے سپہ سالار جوہر صقلی نے رکھی اور یہ عمارت ۹ رمضان المبارک ۳۶۱ھ کو پایۂ تکمیل تک پہنچی ؛

تاسیس ازہر کی غرض یہ تھی کہ فاطمیین کے مذہب یعنی شیعیت کی تبلیغ و اشاعت کے لئے ایک عظیم الشان درسگاہ قایم کی جائے۔ چنانچہ شیعہ مذہب کے بڑے بڑے متقدر علماء دنیائے اسلام کے کناروں سے بڑے بڑے مشاہرں پر بلائے گئے اور اس طرح پر ازہر تمام ممالک عربیہ میں شیعیت اور اس کی اشاعت کا واحد مرکز بن گیا۔

جب فاطمی کمزور ہو گئے تو مصر میں سنی المذہب ایوبیہ حکومت کا دور آیا اور سنی مذہب کی تعلیم شروع ہو گئی۔

جامع ازہر دنیا کی بہترین یونیورسٹیوں میں شمار ہوتی ہے۔ اور مصریوں کا دعوےٰ ہے کہ پیرس یونیورسٹی کو چھوڑ کر ازہر سے علم حاصل کرنے والوں کی تعداد دُنیا بھر کی یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل طلباء سے زیادہ ہے اور مصر بجا طور پر اس پر ناز کر سکتا ہے ؛

ہوسٹل جامع ازہر کے طلباء کے لئے اس ہوسٹل میں طلباء کی تعداد بیس ہزار ہے ؛

شاخیں ازہر کی چھ شاخیں ہیں جن کے نام حسب ذیل ہیں۔
(۱) معہد الاسکندریہ (۲) معہد طنطا (۳) معہد اسیوط۔
(۴) معہد زقازیق (۵) معہد وسوق (۶) معہد دمیاط

ان میں سے ہر شاخ کا ہیڈ شیخ المعہد کہلاتا ہے۔ اور سب معہدوں کا رئیس شیخ الازہر و رئیس مجلس الاعلیٰ کہلاتا ہے ؛

انتظام ازہر کا انتظام علماء کی ایک مجلس کرتی ہے جسے ہیئت کبار العلماء کہتے ہیں۔ اس مجلس کے تیس ارکان ہوتے ہیں۔

کتب خانہ جامع ازہر کے ساتھ ایک عظیم الشان کتب خانہ ہے جس میں بڑی بڑی نادر کتب کا ذخیرہ مہیا گیا ہے اس میں شیخ محمد عبدہ (مصلح یونیورسٹی) کا میز اور قلمدان بھی رکھا ہوا ہے۔ اس میں کل کتابوں کی تعداد بیس ہزار سے زیادہ ہے۔

اس کے سوا حسب ذیل بورڈنگ کے کتب خانے ہیں

کتب خانے	کتابوں کی تعداد	کتب خانے	کتابوں کی تعداد
(۱) معاریہ	(۸۱۵۷)	(۳) شوآم	(۶۴۳۳)
(۲) اتراک	(۵۴۶۶)	(۴) حنفیہ	(۱۳۰۶)
....		(۵) صعایدہ	(۱۸۸۰)

دروازے جامع ازہر کے چھ دروازے ہیں۔ باب الصعایدہ۔ باب الشام۔ باب المغربیہ۔ باب المزینین باب الجوہریہ۔ باب الثوریہ

آخری دروازے کی وجہ تسمیہ یہ تھی۔ کہ اس راستے سے لوگ کھانا لینے آتے تھے ؛

میزانیہ حسب مستنداتِ حکومی ۱۹۳۶ء کا یونیورسٹی بجٹ ۱۳۱،۷۹۸ پونڈ تھا اور اخراجات خورد و نوش ۱۸۲۵۰ پونڈ علاوہ ازیں تھے۔ پرانا طریق یہ تھا کہ طلباء اور اساتذہ کو کھانا بھی ازہر سے ملتا تھا لیکن اب اس طریق کو بدلکر وظائف نقدی کی صورت میں دیئے جاتے ہیں۔

شیخ الازہر جامع کے موجودہ شیخ۔ شیخ محمد مصطفیٰ المراغی ہیں۔ آپ نہایت بلند اخلاق۔ بلند خیال اور بلند پایہ انسان ہیں علوم مروجہ میں کافی دسترس رکھتے ہیں۔ فرانسیسی اور انگریزی بھی کسی حد تک جانتے ہیں۔ سیاسیاتِ عالم میں آپکو کافی عبور ہے ؛

آپ ازہر کو دُنیا کی بلند پایہ یونیورسٹیوں کے ہم پلہ بنانے کے از حد خواہشمند ہیں۔ میں ذاتی علم اور ذاتی واقفیت کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ موجودہ شیخ پرانے زمانے کے ملاں نہیں ہیں۔ بلکہ علوم قدیمہ و جدیدہ کے بلند پایہ جید عالم ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی زندگی میں برکت دے تاکہ ازہر اور عالم اسلامی میں اتحاد اور اشاعتِ علوم کے متعلق آپ کے جو ارادے ہیں اُن کی تکمیل ہو سکے ؛

جامع مصری جامع ازہر کے علاوہ مصری یونیورسٹی ۱۹۰۸ء میں قایم کی گئی تھی۔ جو یورپ کی بہترین یونیورسٹیوں کے پایہ کی ہے۔ اس یونیورسٹی کے ماتحت تین کالج ہیں۔ کلیۃ الادب والعلوم۔ کلیۃ الطب۔ کلیۃ الحقوق مصر کے آثار قدیمہ کی کھدائی کا کام بھی جامع مصر ہی کے سپرد ہے۔ اس کے علاوہ امریکن یونیورسٹی اور مدرسہ برٹش بھی مشہور ادارے ہیں اور مدارس عامہ کا تو کوئی حساب ہی نہیں ؛

(نیرنگ خیال)

بیوی عشق کرنے کے لئے نہیں ہے؟

"میرا شوہر مجھ سے عشق نہیں کرتا۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ مجھ سے محبت میں ڈوبے ہوئے جذبات کا اظہار کرے لیکن میں ہمیشہ اُسے سرد مزاج پاتی ہوں" یہ عام شکایت ہے جو میں نے ایک دو نہیں متعدد عورتوں کی زبانی سنی ہے۔ تقریباً ہر عورت کو میں نے شوہر کی محبت کا شکوہ کرتے سنا ہے۔ مگر اِن غریب عورتوں کو کیا معلوم کہ بیویاں عشق کرنے کے لئے نہیں ہیں۔ بلکہ اُن کا مقصد اِس سے بہت بلند و بالا ہے،

شوہر کے عشق کرنے کا خیال معلوم نہیں کہ عورتوں کے دِل میں کہاں سے پیدا ہوا۔ میری سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہیں آئی کہ ایک شوہر کے فرائض میں بیوی کے ساتھ عشق کرنا کیوں ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ کیونکہ میاں بیوی کا رشتہ عشق اور محبت کا رشتہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک معاشرتی رشتہ ہے جس کا عشق اور محبت سے دور کا بھی تعلق نہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ عورتوں کے دلوں میں مرد کے عشق کرنے کا خیال اُن غیر ذمہ دار نوجوانوں کی غیر مآل اندیشی کا نتیجہ ہے جو شادی کے ابتدائی ایام میں اور کورٹ شپ کے زمانے میں غلط اور جھوٹی محبت کا اظہار کرکے عورتوں کو مغالطہ میں ڈال دیتے ہیں اور یہی مغالطہ آخر میں جاکر میاں بیوی کی کشیدگی کا باعث ہوتا ہے،

یقین جانیئے کہ ہم ایک عورت کو کبھی اس لئے بیوی نہیں بناتے کہ ہم کو اس سے محبت ہے۔ بلکہ ایک عورت کو ہم اِس لئے شریکِ زندگی بناتے ہیں تاکہ وہ اُن ذمہ داریوں کو اپنے سر لے جس کے لئے عورت بنائی گئی ہے۔ عورت کا کام فقط یہ ہے کہ وہ ہماری خانگی زندگی کو باقاعدہ اور خوشگوار بنائے۔ ایک لائق منیجر کی طرح ہمارے گھربار کا انتظام کرے اور اُس کے ساتھ ہی نسلیں پیدا کرے۔ اِن سب چیزوں کے لئے نہ عشق کی ضرورت ہے اور نہ محبت کی۔ بلکہ اس کے لئے ہوشمند اور سلیقہ شعار ہونے کی ضرورت ہے

بعض ایسے حضرات جنہوں نے عشق و محبت میں مبتلا ہونے کے بعد شادی کی ہے۔ وہ شاید میرے اِن خیالات پر اعتراض کریں گے۔ لیکن میں اُنکو بتانا چاہتا ہوں کہ وہ مغالطہ میں ہیں۔ ابھی جوانی کا جذبہ باقی ہے۔ اِس لئے وہ عاشقانہ شادیوں کی خرابی کو محسوس نہیں کر رہے جب جوانی کا خمار اُتر جائے گا جب جذبات کے طوفان میں مصلحت بینی کا مادہ پیدا ہوگا اُس وقت اُن کو معلوم ہو جائے گا کہ عاشقانہ شادی رسمی شادی کے مقابلہ میں ہمیشہ ناکام رہتی ہے عاشقانہ شادی ہمیشہ ایک جذبہ کے ماتحت ہوتی ہے۔ فریقین محبت اور جذبات سے اندھے ہوکر نتائج کی پروا کئے بغیر ازدواجی رشتہ میں منسلک ہو جاتے ہیں۔ اِس نازک مرحلے پر عقل ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ بس وہ شرابی ہوتے ہیں جو شراب کے نشہ میں نکاح پڑھوا لیتے ہیں۔ جب یہ نشہ اُترتا ہے تو اُنکو اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے۔

رسمی شادی میں کیونکہ محبت کا اندھا جذبہ شامل نہیں ہوتا۔ اِس لئے مرد اور عورت دونوں سوچ سمجھکر قدم اُٹھاتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُن کی زندگی یکساں اور خوشگوار طریقہ پر گذر جاتی ہے۔

جو عورتیں شوہروں سے عشق کی توقع رکھتی ہیں۔ درحقیقت وہ مغالطہ میں مبتلا ہیں۔ کوئی ہوشمند اور عقلمند شوہر اپنی بیوی سے دیوانہ وار عشق نہیں کرتا۔ بلکہ وہ اِس بات کی کوشش کرتا ہے کہ اس کی زندگی معتدل حالت میں گزرتی چلی جائے عشق ایک بیکار اور احمقانہ حرکت ہے جس سے معقولیت پسند طبقہ ہمیشہ علیحدہ رہا ہے۔

امریکہ کا مشہور رہنما ابراہیم لنکن کہا کرتا تھا کہ "وہی شادی کامیاب کہی جاسکتی ہے جو عشق کے بغیر عمل میں آئے۔ کیونکہ عشق کی شادی یا شادی کے بعد عشق نظامِ حیات کو درہم برہم کر دیتا ہے" ابراہیم لنکن کے علاوہ دُنیا کے تمام مدبرین کی یہی رائے ہے کہ شادی اور عشق دو متضاد چیزیں ہیں۔

اگر سچ پوچھا جائے تو میاں بیوی کا رشتہ ایک کاروباری رشتہ ہے جس طرح دو لایق کارکن کسی بڑی فرم کو ملکر چلاتے ہیں۔ حالانکہ اُن میں عشق نہیں ہوتا اسی طرح دو میاں بیوی بھی ازدواجی زندگی کو بغیر عشق کے کامیاب بنا سکتے ہیں۔

عورتوں کو چاہیئے کہ وہ شوہروں کے عشق نہ کرنے کا شکوہ چھوڑ دیں۔ بلکہ وہ یہ محسوس کریں کہ آیا اُن کا شوہر فرائض شوہریت کو صحیح طور پر ادا کر رہا ہے یا نہیں وہ بچوں کی تعلیم سے غافل تو نہیں ہے۔ وہ بیوی کی ضروریات کا کس حد تک خیال رکھتا ہے۔ اِس سے زیادہ اگر کوئی بیوی سوچتی ہے تو وہ بیوی نہیں ہے۔ بلکہ ایک شاعرہ ہے جو تخیل اور فریب کی دُنیا میں رہنا چاہتی ہے۔

(مدینہ)

سنگتراش کا آخری مجسمہ

سنگتراش نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ قلبی احساسات۔ درد افزا احساسات کو مجسم سنگین پر منقش کرے گا۔ سنگتراش ہندوستانی تھا۔ اُسے وطن کی غلامی کا گہرا رنج اور قوم کی مفلوک الحالی کا انتہائی افسوس تھا۔ وہ اپنے فن کا بہترین اُستاد تھا اعجوبہ روزگار سنگین مجسموں میں اُس کی صناعی کے کئی نمونے شامل تھے۔ اس کا ہر

شاہکار بے مثل تھا لیکن یہ سب کچھ اُس کے اپنے نام سے نہیں۔ بلکہ اُس کے ایک غیر ملکی شاگرد کے نام سے منسوب تھا جس کو اُس نے اپنی سالہا سال کی مسلسل عرقریزی اور محنت و کاوش سے حاصل کردہ انمول نمونے دیدیئے تھے ـــــ خوشی سے نہیں۔ حسرت واندوہ سے قیمتاً نہیں مفت ـ کیوں؟ اس لئے کہ اس کے تمام نوادر جب تک اُس کے اپنے نام سے متعلق رہے ناقدری کی رو میں بہا دیئے گئے۔ ـــ جیسے گندگی کے ڈھیر میں پڑے ہوئے ہیروں کی چمک دمک کو دیکھ کر بھی راہرو کانچ سمجھ کر نظرانداز کر دیتے ہیں ـــ اسی طرح لعینہٖ اسی طرح اس یکتائے روزگار سنگتراش کے مایۂ ناز مجسموں کی آب و تاب بھی غلامی کی [illegible] کشش نہ ہو سکی۔ اُس نے بددل ہو کر اپنا سب کچھ ایک غیر ملکی شاگرد کو دیدیا۔ اب اُس کے وہی مجسمے ایوانِ شاہی میں موجود ہیں۔ اُس کے اپنے نام سے نہیں۔ اُس کے شاگرد کے نام کی تختیاں گلے میں ڈالے ہوئے۔

خاص سنگتراش نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ دیکھ کر ارادہ کر لیا کہ وہ غلامی کا ایک بھیانک مجسمہ بنائے گا۔ ایوان میں رکھنے کے لئے نہیں منظرِ عام پر نصب کرنے کے لئے۔ ستائش کے لئے نہیں درسِ عبرت کے لئے۔

ہمالہ کی ایک صاف وسیع مگر اُبھری ہوئی چٹان پر سنگتراش نے اپنی آہنی کیل اور ہتھوڑوں کی امداد سے اپنا عمل شروع کیا اور زندگی کے ایک حصے کے لئے نہیں، بلکہ آخری دم تک اُس میں منہمک رہا۔ اُس نے چٹان کے سینے پر ایک مجسمہ تیار کیا ـ "ایک عورت" حسین و نوجوان عورت کی شکل لیکن ایسے خدوخال کے ساتھ جن سے اس کے شباب کی خستہ حالی اور پریشانی نمایاں تھی چہرے پر بےشمار جھریاں تھیں۔ چند آنسو رخساروں پر متمکن تھے۔ اور چند دامن میں گرے ہوئے۔ ایک آنکھ بند تھی۔ جیسے رو رو کر بصارت جا چکی ہو ایک چند ھیائی ہوئی۔ لب کچھ ایسے بگڑے تھے جیسے حالتِ نزع کی آخری ہچکیوں میں ہے گلے اور پاؤں میں آہنی حلقے تھے۔ اور اُن سے منسلک آہنی زنجیر۔ بال لچھے دار تھے لیکن ایسے جیسے اُن میں سے بیشتر کسی نے نوچ لئے ہوں۔ اُس کے اردگرد چند ایستادہ بچوں کے مجسمے تھے اور سامنے ایک قوی ہیکل دیوزاد انسان کھڑا تھا۔ جس کے ایک ہاتھ میں تلوار تھی اور دوسرے میں آہنی حلقہ سے منسلک زنجیر کا سرا۔ دیوزاد انسان کے اردگرد چند کھلونے تھے جیسے وہ اُن بچوں میں تقسیم کر رہا ہے۔ بہت سے بچے ماں کی حالتِ زار سے غافل ہو کر کھلونوں کی طرف متوجہ تھے بعض ایسی حالت میں لپکے کھڑے تھے جیسے کھلونوں کے مشتاق ہوں چند بچے ماں کی طرف منہ کئے سرنگوں تھے پُرملال اور پژمردہ اور زبان حال [illegible] کہہ رہے تھے "ماں! ہمیں تیرے درد کا احساس ہے تیرے درد سے ہم دکھی ہیں لیکن یہاں ہماری کوئی نہیں سنتا" عورت کی پیشانی پر "ہندوستان"

منقش تھا۔

یہ تھی اس وطن دوست سنگ تراش کے آخری ایام کی روداد جس میں وہ عمر کے ایک حصہ کے لئے نہیں بلکہ آخری لمحہ تک منہمک رہا۔ اُس کے نکتہ نگاہ سے یہ مجسمہ مکمل ہو چکا تھا یا نہیں۔ یہ ایک راز ہے!

"رُومان"

بھکارن

سڑک کے کنارے بیٹھی ہوئی بھکارن نے اپنے نادان اور معصوم بچوں کی طرف دیکھا اور ایک ٹھنڈی سانس بھر کے گردن جھکا لی۔ اُس وقت اُس کے نیلے ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔

"بدنصیب بچو! تم میری کوکھ سے کیوں پیدا ہوئے۔؟ کیا دُنیا میں تمہارے لئے کوئی اور ماں نہ تھی؟"

"لوگ بڑے ہو کر کیا [illegible] تے ہیں [illegible] تے ہیں۔ تم بڑے ہو کر بھکاری ہو گے اور ذلیل ہو گے۔ تمہارے لئے اس پُرسکون دُنیا میں کوئی اُمید نہیں۔ آسمان تمہیں زمین پر رینگتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہے۔ جیسا کہ بچارے کیڑے رینگتے ہیں"۔

"تم ان کچی سڑکوں پر سونے کے لئے پیدا ہوئے ہو۔ جن پر عورتوں کی گاڑیاں بھی نہیں چل سکتیں۔ تمہاری قسمت میں پہننے کے لئے وہ چیتھڑے لکھے ہیں جنہیں کنگال بیکار سمجھ کر اپنے گھروں سے باہر پھینک دیتے ہیں۔ دُنیا کی نعمتوں میں تمہارا کوئی حصہ نہیں ہے۔ تمہاری دولت تمہاری ماں کی دعائیں ہیں۔ مگر وہ دعائیں بھی دُنیا سے پیسہ مانگنے میں اکارت ہو جاتی ہیں"

میرے بدنصیب بچو! تمہارے لئے تمہاری ماں کی دُعائیں بھی نہیں بچتیں۔ اُس کے پاس فقط ٹھنڈی آہیں اور گرم آنسو ہیں اور وہ بھی بے اثر"

یہی بھکارن کے بچوں کی دولت ہے

"سرب رس"

جنگ کی ہولناکیاں

ہفتہ وار انگریزی اخبار "ادر سینٹ" نے دُنیا کی چند مشہور لڑائیوں کے مالی اور جانی نقصانات کے دلچسپ اعداد و شمار پیش کئے ہیں جسے دیکھ کر اندازہ ہو سکتا ہے کہ دُنیا نے مختلف اوقات میں اس خونی دیوتا پر کیا بھینٹ چڑھائی۔ اس مضمون کا ترجمہ ہدیۂ قارئین کیا جاتا ہے۔

انقلابِ فرانس:۔ جس قدر لڑائیاں نپولین کے زیرِ قیادت لڑی گئیں اُن میں دو ملین افراد کے اتلاف جان اور مزید دو کروڑ

مجروح اور بیکار ہو جانے کا اندازہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ نپولین کی ان دیگر لڑائیوں میں جو جنگ واٹرلو تک جاری رہی تھیں فوج میں کل ۱۹۰۹۰۰۰ آدمی شریک ہوئے۔ جن میں ۰۰۰۰۶۸۰۳ ہلاک اور مجروح ہوئے

موبائی لڑائی میں پچاس ہزار انگریزی سپاہی مارے گئے اور اس کے مقابل فرانس کے تقریباً چوتھائی ملین فرزندوں کا جانی نقصان ہوا۔ اب ذرا مصارفِ جنگ بھی ملاحظہ فرمائیے۔ نپولین نے ۰۰۰۰۰۰۲۰۵ پونڈ اور انگریزوں نے ۰۰۰۰۰۰۱۳۸ پونڈ کی گرانقدر رقم خرچ کر ڈالی

امریکہ کی خانہ جنگی:- جنگِ امریکہ میں ۰۰۰۰۰۶ افراد ۴ سال کے عرصے میں موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے اور کل مصارفِ جنگ ۰۰۰۰۰۱۲۱ پونڈ ہوئے۔ ہر ہفتہ ۰۰۰۰۶۱ کا تخمینہ تھا۔

فرانس اور جرمنی:- کی لڑائی میں سات ماہ کے قلیل دوران میں ۳۷۱۰۰۰ آدمی کام آئے۔ جنگ میں ایک ملین جرمن اور تقریباً ۰۰۰۱۷ فرانسیسیوں نے حصہ لیا۔ اور فرانس کو تاوانِ جنگ کے مصارف ۰۰۰۰۰۰۶۳۱ پونڈ برداشت کرنے پڑے۔

ہندوستان:- اسی طرح تاریخ ہند کے اوراق بھی اپنی خونچکانی کے زبردست اعداد پیش کر رہے ہیں۔ سکندر اور پورس کے مقابلہ میں صرف ایک دن میں ۰۰۰۱۲۱ آدمی مارے گئے۔ کالنگا کی لڑائی میں اشوک کی فاتح فوج نے ۰۰۰۰۰۱۱ آدمی قتل کر دیئے اور ۰۰۰۵۱ گرفتار کئے اور ایک بڑی تعداد مضرتِ ایذا رسانی کے نتیجہ میں ویسے ہی نیست و نابود ہو گئی۔ اب ذرا اور قریب ترین زمانہ پر نظر دوڑائیے تو پانی پت کا میدان اپنی خون آشامی میں سب پر سبقت لے جائے گا۔ اس میدان کی پہلی لڑائی میں جو سلطان ابراہیم لودھی اور بابر کے مابین ہوئی تھی۔ ہندوستانی فوج میں ۰۰۰۰۰۴ افراد تھے۔ جن میں ۱۵۰۰۰ مع اپنے سرداروں کے صرف نصف یوم میں مار ڈالے گئے۔ اسی طرح پانی پت کی تیسری لڑائی مرگِ ناگہانی کا ایک ہیبتناک منظر پیش کرتی ہے مرہٹوں کی فوج میں ۰۰۰۰۰۳ سپاہی تھے۔ جن میں صرف ایک دن میں ۰۰۰۰۰۲ مار ڈالے گئے اور بقیہ بہت سے قید و بند کی مصیبت میں مبتلا کئے گئے۔

روس اور جاپان کی لڑائی:- ۱۸۷۷ء میں روس و ترکی کے مابین جو لڑائی ہوئی اور وہ صرف ایک سال تک جاری رہی دونوں جماعتوں کے ہلاک شدگان کی مجموعی تعداد ۰۰۰۰۰۳ تھی اور اسی لڑائی میں ایک دن میں پلونا کے قریب ۰۰۰۰۸ روسی سپاہیوں میں سے ۰۰۰۰۱ کام آئے اور ترکی کا بھی شدید نقصان ہوا۔ جاپان و روس کی جنگ بھی خون آشامی میں اپنی نظیر آپ ہے دورانِ جنگ میں لیویانگ کے مقام پر بیس ہزار روسی اور اٹھارہ ہزار جاپانی مارے گئے۔ شاہو کے مقام پر جاپان کے ۱۶ ہزار اور روس کے ساٹھ ہزار آدمی غارت ہوئے۔ میکڈن کے مقام پر جبکہ شرکاء کی تعداد ایک ملین تھی۔ ہر دو فریق کا نقصانِ جان مساوی ہوا لیکن روس کا جنگی خرچہ ۲۰۰۰۹۵۱ پونڈ رہا۔

جنگِ عظیم:- یہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ جنگِ عظیم سب سے زیادہ مہلک اور تخریبی لڑائی تھی یہ لڑائی مدت دراز تک جاری رہی۔ اور مجروحین و ہلاک شدگان کی تعداد یادگاری نقوش مرتسم کر گئی۔ ابتدائی تین ماہ میں مجروحین۔ ہلاک شدگان اور قیدیوں کی تعداد تقریباً ۰۰۰۶۶ تک پہنچ چکی تھی جن میں سے فرانس کے ۰۰۰۴۸۵، جرمن ۰۰۰۷۶، اور برطانیہ کے ۰۰۰۰۳۳ فرانس کے ۰۰۰۸۵۴ افراد نقصان صرف ایک ہفتہ میں ہوا تھا۔

جنگِ عظیم میں مارے جانے والوں کی تعداد ۰۰۸۳۵۰۸ اور زخمیوں کی ۰۰۰۷۶۵۹۱ ہے۔ اس میں جرمن اور روسی نقصانات سب سے زیادہ ہوئے ہم ذیل میں ہر سلطنت کے نقصانات کا جداگانہ خاکہ پیش کرتے ہیں۔

نام ملک	ہلاک شدگان	زخمی
جرمن	۲۰۰۰۰۰۰	۴۳۴۶۰۰۰
روس	۱۹۰۰۰۰۰	۴۹۵۰۰۰۰
برطانیہ	۱۱۵۴۰۰۰	۲۴۰۰۰۰۰
فرانس	۱۳۰۱۰۰۰	۳۰۱۰۰۰۰
آسٹریا	۱۲۰۰۰۰۰	۳۶۰۰۰۰۰
ممالک متحدہ امریکہ و اٹلی (یکجائی)	۵۴۷۰۰۰	۱۱۵۵۰۰۰

اب مصارفِ جنگ ملاحظہ فرمائیے جرمنی کو یومیہ ۰۰۰۰۰۰۵ پونڈ صرف کرنے پڑتے تھے۔ اسی طرح برطانیہ کو عظیم الشان مصارف برداشت کرنا پڑے۔

۱۹۱۷ء میں اسے کم و بیش تخمیناً ۰۰۰۰۰۰۹۴ پونڈ ہر ہفتہ خرچ کرنے پڑے۔ اختتامِ جنگ پر برطانیہ کے کل مصارف کا تخمینہ ۰۰۰۰۰۰۶۷۰۱۱ پونڈ ظاہر کیا گیا۔ اور مجموعی میزان تمام سلطنتوں کے مصارف کی ۰۰۰۰۰۰۲۲۱۶۵ پونڈ ہوئی۔ جن میں علاوہ جرمنی کے بقیہ سلطنتوں کے مجموعی مصارف ۰۰۰۰۰۰۰۰۱۴ پونڈ ہوئے۔

یہ ہے مختصر سا نمونہ اُن نقصانات کا جو ملک گیری اور ہوس رانی کی خاطر سلطنتوں کو برداشت کرنا پڑا۔ اور اس جنگ کے دیوتا پر اس قدر عظیم الشان قربانیاں چڑھانی پڑیں لیکن یہ تو چند ہی واقعات ہیں۔ ایسے ایسے نہ جانے کتنے نقصانات اس دنیا کو برداشت کرنے پڑے ہیں۔ جن کے اعداد و شمار کا پتہ ہی نہیں۔

"شاہکار" لاہور

ایڈیٹر:-
پروفیسر تاجور نجیب آبادی

ادارہ:-
خواجہ محمود جاوید ایم۔ اے
گوپال متل بی۔ اے

چندہ:-
سالانہ چھ روپے۔ ششماہی تین روپے آٹھ آنے۔ نمونہ آٹھ آنے

جلد (۷) | فہرست مضامین بابت ماہ ستمبر ۱۹۳۸ء | نمبر (۶)

تصاویر:- (۱) انگلستان کی ایک فراخدل خاتون۔ (۲) محفلِ پرواز۔ (۳) مفلسی محبت کے پر کتر رہی ہے۔

نمبر	مضمون	مصنف	صفحہ
۱	مختصرات	تاجور	۳۴۰
۲	سوال و جواب	تاجور	۳۴۵
۳	پنجاب کی اخبار نویس برادری	تاجور	۳۵۲
۴	آثارِ قدیمہ	جناب مولانا ابو محمد امام الدین صاحب رام نگری	۳۵۸
۵	پردۂ سیمیں کے بدنما داغ	"تماشائی"	۳۹۱
۶	بین الاقوامی کاروبار کا طریقہ	خواجہ محمود جاوید ایم۔ اے	۳۹۳
۷	مومن کی شاعری میں خمریاتی عنصر	جناب تسکین عابدی حیدرآباد	۳۹۶
۸	تعلیمات	جناب مولانا ابو محمد امام الدین صاحب رام نگری	۳۸۱
۹	مختار	اس ماہ کا بہترین مضمون	۳۸۵
۱۰	بزمِ انتخاب	تازہ ترین اخبارات و رسائل سے اہم اور متنوع اقتباسات	۴۰۰
۱۱	صفحۂ اطفال	منقول از اخبار پریم	۳۷۶

افسانے

نمبر	مضمون	مصنف	صفحہ
۱۲	تلاش	جناب کرشن چندر ایم۔ اے۔	۳۵۵
۱۳	لکڑی کے چار کھونٹے	جناب ایم عنایت اللہ انبالوی	۳۶۱
۱۴	جلّاد	جناب وحشی آروی صاحب	۳۷۰
۱۵	ایک مکالمہ	سید امداد احمد صاحب صمدنی	۳۶۸

حصۂ نظم

نمبر	مضمون	مصنف	صفحہ
۱۶	گزارش	جناب محمد یونس سلیم (جامعہ عثمانیہ) حیدرآباد	۳۵۰
۱۷	محسوسات	مسٹر گوپال متل بی۔ اے	۳۵۴
۱۸	غزل	آغا صادق حسین صاحب صادق منشی فاضل	۳۶۷
۱۹	غزل	جناب حکیم نور احمد صاحب گلچیں	۳۷۵
۲۰	غزل	جناب میرزا خادم صاحب منشی فاضل	۳۹۵
۲۱	غزل	جناب سیف اکبرآبادی صاحب	۳۹۹

ایم۔ ہادی حسن احقر پرنٹر و پبلشر نے آزاد ہند پریس ہسپتال روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر شاہکار برمکان میاں علی محمد - علی محمد سٹریٹ خواجہ دل محمد روڈ (۲۵-اے بیڈن روڈ)
لاہور سے شائع کیا

مختصرات

سرسکندر اور پنجاب کے نام نہاد کانگریسی

صوبہ بہار کی کسان سبھا کے ایجی ٹیشن پر کانگریسی لیڈر بابو راجندر پرشاد نے گزشتہ سال پٹنہ کے ایک جلسے میں فرمایا تھا کہ:-

"کسان لوگ جوتی لات کے خوگر ہو چکے ہیں۔ اس لئے سیدھی باتوں سے ماننے والے نہیں، ڈنڈا ہی انہیں سیدھا کر سکتا ہے۔"

کانگریس ہائی کمانڈ کے ایک رکن رکین کی یہ رائے پڑھ کر ہر سمجھدار شخص یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ کانگریس لیڈر مظلوم کسانوں کے کس درجہ مخلص و ہمدرد ہیں۔

کانپور ملز کے مزدوروں پر کانگریسی افسران فائرنگ کا حکم دے کر مزدوروں کے متعلق کانگریسی ہمدردی کا بھی بھانڈا پھوڑ چکے ہیں اور اب مہاتما گاندھی کی یہ آکاش بانی کہ "کارخانوں پر مزدوروں کا پکٹنگ کرنا اہنسا کے خلاف ہے۔" مہاتما جی کی بابت گزشتہ شردھا رکھنے والوں کو بھی عرصۂ حیرت بنائے ہوئے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک انگریز کی حکومت رہی اسی وقت تک کسانوں اور مزدوروں کو کانگریسی ایجی ٹیشن کی رونق بڑھانے کے لئے استعمال کیا جاتا رہا اور جب تک کانگریسی بر سر اقتدار نہ آئے اس وقت تک کانگریس اور کانگریسی رہنماؤں کے لئے کسان اور مزدور ضرورت کی چیز بنے رہے۔

جب اُن کی طاقت لے کر کانگریس کو حکومت نصیب ہو چکی تو غریب مزدوروں اور بے کس کسانوں سے کانگریسی حکومتوں نے

"کیسی آنکھیں پھیر لیں مطلب نکل جانے کے بعد"

بات یہ ہے کہ مہاتما گاندھی ایک سیٹھ خاندان میں پیدا ہوئے، مدتوں تک سیٹھ کرمچند گاندھی کہلاتے رہے۔ آج تک تقریروں میں اپنے آپ کو "بنیا" ظاہر کرتے ہیں۔ اُن کے دستِ راست سیٹھ جمنا لال بجاج اور وزارتی کے رکن ہیں۔ پھر سیٹھ برلا کا طلائی حصار شروع سے کانگریس اور کانگریس ہائی کمانڈ کو صرف وسعتِ زنجیر تک ہی مجال جہل قدمی دے رہا ہے۔ اس حصار سے آگے نہ پٹیل کو جرأتِ قدم زنی ہو سکتی ہے نہ بابو راجندر کو اور مہاتما کے ملن برتوں کے لئے تو یہ حصار ہمیشہ سے حصارِ عافیت بنا ہوا ہے۔

یہ حضرات جو سات اور اب آٹھ صوبوں پر انگریز سرمایہ دار کو نکال کر لکھشمی دیوی کے پجاریوں کو بر سرِ حکومت لائے ہیں۔ ان کی آتشیں تقریروں سے مزدوروں اور کسانوں کو مغالطے میں نہ پڑنا چاہیئے۔ حالات کی رفتار اور کانگریسی رہنماؤں کی ملی بھگت سے ہر شخص جان چکا ہے کہ کانگریس کا منتہائے مقصود انگریز گورنر کے زیرِ سایہ کانگریسی حکومت ہے۔ آگے آیت۔ غریب کسانوں اور مزدوروں سے یہ وعدے کر کے ووٹ لئے گئے کہ جدید دستور حکومت کو ناکام بنانے کے لئے ہم مجالسِ قانون ساز پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن جب ان کی طاقت لے کر صوبوں کی حکومت پر کانگریسی قبضہ ہو گیا تو اب راج پاٹ سنبھال کر کسانوں کا جوتی لات اور مزدوروں کا گولیوں سے استقبال کیا جا رہا ہے۔ اس ابتدائے عشق کے ساتھ فیڈریشن کو قبول کرنے کی ساز باز انتہائے عشق کی بھی خبر دے رہی ہے۔ بس پھر

"ملک برطانیہ کا اور حکومت کانگریسی سیٹھوں کی"

یہ تو حال ہے بزرگانِ کانگریس کا جن کی سبھا کے سبھاپتی "باپوجی" ہیں۔ پنجاب کے برخورداران کانگریس تو اپنی سرمایہ پرستانہ چالوں سے بالکل بے نقاب ہو گئے ہیں۔

دوسرے صوبوں کے کانگریسی وزراء کی زبان پر تو ابھی تک فیشن کے طور پر کسانوں اور مزدوروں کا نام آ بھی رہا ہے۔ اگرچہ وہ کسانوں کا کچھ بھلا نہ کر سکے۔ لیکن پنجاب کانگریس تو کھل کھیلی ہے۔ ایک اس فقرے کی آڑ پکڑ کر کہ

"سکندر حکومت کے کالے بل کاشتکاروں کے بھلے کے لئے نہیں بلکہ زمینداروں کی بھلائی کے لئے ہیں۔"

ساہوکاروں کی در پردہ حمایت کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کسان کانفرنس کا نام رکھ کر جو ڈھونگ بھی کہیں رچاتے ہیں اس میں زیادہ تعداد غیر زراعت پیشہ بنیوں اور ساہوکاروں کی ہوتی ہے۔

پنجاب پارلیمنٹری کانگریس کمیٹی کا چیف وہپ جو خود ایک بڑا سرمایہ دار نوجوان ہے۔ اور جو ہر موسم گرما ولایت میں گزارتا ہے اور صرف لیڈری کی نمائش کے لئے کھدر کی دھوتی اور گاندھی ٹوپی پہنے پھرتا ہے

حافظ آباد کی غیر زراعت پیشہ کانفرنس میں خطبہ صدارت دیتا ہوا کھلے بندوں ساہوکارہ سسٹم اور ساہوکاروں کی حمایت کر چکا ہے۔

پنجاب کانگریس کے ممبران میں زیادہ تعداد مہاجنوں اگروالوں اور اروڑوں کی ہے۔ وہ بھلا کس دل سے کسانوں کے حقوق کی حمایت کر سکتے ہیں۔ کوئی دیوانہ ہی ہو گا جو اپنی پیشہ ورانہ زندگی کی بنیاد کو زیروزبر کرنے کا ایثار کرے۔

"ملاپ" "پرتاپ" کے مالک مہاشگان کرشن و خوشحال چند بھی اگر کانگریسی کہلائے جانے کے لائق ہیں تو سمجھ لو ہندوستان کے تمام ساہوکار اور سرمایہ دار کانگریسی ہیں۔ پھر سر گروڑی مل اور سر لکھمی شاہ ہندوستان میں کانگریسی ہی کہلایا جانا چاہیئے!۔

انہیں کانگریس سے دور کی بھی نسبت نہیں بلکہ خالص کاروباری لوگ ہیں۔ آج کانگریس کا زور ہے تو یہ کانگریسی بن کر کانگریس کے نام پہ روپیہ بٹور رہے ہیں۔ کل ہندو سبھا طاقت پکڑ جائے تو بھائی پرمانند کے شردھالو ہو کر ہندو سبھا کے نام پہ دولت سمیٹنے لگیں گے۔

ورنہ سچ یہ ہے کہ یہ نہ قوم پرست ہیں نہ وطن پرست۔ پیسے کے پجاری ہیں۔ پیسہ ہی ان کی دنیا اور عاقبت ہے۔

آج شام محکمۂ اطلاعات ان کانگریس کے علمبرداروں کے مستقل طور پہ دو دو تین تین ہزار پرچوں کی خریداری کا آرڈر بھیج دے تو کل صبح کے کانگریسی پرچوں کے سرورق پہ "سر سکندر زندہ باد" "سر چھوٹو رام زندہ باد" نواب دولتانہ پائندہ باد" کی چار کالمی سرخیاں نظر آئیں گی۔

ملاپ و پرتاپ اور ان کے ساتھ تمام کانگریسی پرچوں کے کسی نمبر کو اٹھا کر دیکھ لیجئے فیشن کے طور پر کانگریس کا پرچار بھی نظر آئے گا اور مہاجنوں، ساہوکاروں کی مظلومیت کی حمایت میں کالم کے کالم سیاہ دکھائی دیں گے۔

ان ایمانداروں سے کوئی یہ پوچھنے والا نہیں کہ بھئی اگر تم کانگریسی ہو تو مہاجنوں اور سود خواروں کی حمایت کیوں کر رہے ہو؟ کانگریس تو کھلے پکار سے کسانوں کی پامالی اور ساہوکاروں کے ظلم و ستم کا اعلان کر رہی ہے اور اگر تم دراصل ساہوکاروں کے حامی کار ہو تو کانگریس کو تیاگ پتر دے کر الگ ہو جاؤ۔ یہ کیا ایک ہی سانس میں کسانوں سے نمائشی ہمدردی کا اظہار بھی کیا جا رہا ہے اور اُسی سانس میں ساہوکاروں کے مٹتے ہوئے جبر و غصب کا سوگ بھی منایا جاتا ہے۔ بقول شخصے

"یک سجدہ و دو محراب"

کیا اس شتر مرغانہ دو پہلو پالیسی سے کب تک یہ لوگ دنیا کو فریب دے سکتے ہیں۔

دوسری حقیقت جو پنجاب بلکہ ہندوستان بھر کی کانگریسی فریاد و فغاں کی تہ میں صاف نظر آتی ہے۔ وہ کانگریسیوں کی پست سبھائی ذہنیت ہے کہ پنجاب اور بنگال میں؟ ان حکومت سکندر حیات اور فضل حق کے ہاتھ میں کیوں ہے۔ کسی گروڑی مل اور دولت رام کو یہ منصب بلند کیوں نہ مل سکا۔

آج اگر کوئی سکھ پنجاب میں اور غیر مسلم بنگال میں غیر ان حکومت سنبھالنے میں کامیاب ہو جائے تو سبھائی گلے کی چیخ پکار پھر بھی بند نہ ہو گی۔ اس کی بجائے بالفرض سر گوکل چند اگر اس ہلڑ میں کامیاب ہو کر وزارت کی گدی پر براجمان ہو جائیں تو مہاشہ گان کرشن و خوشحال چند کے گھروں میں گھی کے چراغ جلائیں جائیں گے اور پھر یہ انہیں سوچنے اور دوسروں کو بتانے کی ضرورت نہ رہے گی کہ سر گوکل چند ساہوکار، سرمایہ دار کانگریس کے مخالف اور ہندو سبھا کے پریزیڈنٹ ہیں۔ پھر ستیہ پال اور گوپی چند کی ہنگامہ آرائیاں بھی کانگریسی ضابطے کی خانہ پری کے لئے صرف نمائشی رہ جائیں گی۔

پنجاب سے باہر کے رہنے والے اس صوبے اور خصوصاً لاہور کے اخبارات اور ان کی تحریروں اور تقریروں سے مغالطے میں پڑے ہوئے ہیں۔ لیکن پنجاب کے باشندے ان اخبارات کی قوم پرستی اور یہاں کے کانگریسی لیڈروں کی نام نہاد حریت پرستی سے اچھی طرح واقف ہیں لاہور کے جو روزنامے کانگریس کا شور مچا کر سکندر گورنمنٹ کے خلاف دہشت انگیزی کا پرچار کر رہے ہیں۔ اُن میں کوئی ایک بھی تو ایسا نہیں جو کانگریسی تحریک کا مخلص ہو یا جس نے کبھی کانگریس سے غداری نہ کی ہو۔ یہی حال کانگریسی لیڈروں کا ہے۔

یہی ڈاکٹر گوپی چند تھے جو لالہ لاجپت رائے اور پنڈت مالویہ کی کانگریس کے خلاف غداری میں اُن کے دست و بازو بنے ہوئے تھے۔ آج پنجاب کانگریس کے ناخدا سمجھے جاتے ہیں اور کل جب ہوا کا رخ بدلے گا پھر کانگریس سے دامن جھاڑ کر نکل آئیں گے۔

ڈسٹرکٹ بورڈوں کے رسائل و اخبارات

(افسران تعلیم کی توجہ کے لئے)

مسٹر برین کمشنر اصلاحات دیہات کی یہ تجویز کہ ہر ڈسٹرکٹ بورڈ سے ایک اخبار یا رسالہ جاری کیا جائے۔ تعلیمی مدارس کو بڑی مہنگی پڑی ہے۔

ان پرچوں میں اس کے سوا کہ بورڈ کے افسران کے دوروں کا پروگرام شائع ہوتا ہے۔ یا محکمہ زراعت کے میگزینوں میں سے کوئی باسی تباسی مضمون درج کر دیا جاتا ہے اور کچھ نہیں ہوتا۔ پھر یہ تلخ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ ہندی کے حامیوں کی تخریبی کوششیں اردو زبان کے لئے اتنی ضرر رساں ثابت نہیں ہو سکیں۔ جتنی ڈسٹرکٹ بورڈوں کے ان نام نہاد رسائل و اخبارات کی غلط نگاری اُسے نقصان پہنچا رہی ہے۔

غلط سلط اردو۔ غلط املاء ـــ ژولیدہ اندازِ تحریر، سطحی اور غیر دلچسپ مضامین۔ بس ان پرچوں کی امتیازی خوبیاں یہی ہیں۔

مدارس کے طلبہ اور اساتذہ ان پرچوں کی چٹ کھولنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ مگر ہر اسکول کو جبری طور پر ان کی خریداری کرنی پڑتی ہے۔ اور کبھی افسرانِ تعلیم کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ یہ پرچے ڈسٹرکٹ بورڈ کی جبری امانت کے طور پر جیسے دفتر سے روانہ ہوتے ہیں اُسی طرح کنورے ہیں بند اسکولوں کی لائبریری میں رکھے رہتے ہیں۔ استاد اس جبری تجارت سے نالاں، طلبہ ان پرچوں کی صورت سے بیزار۔ پھر خدا جانے کس قانونِ تعلیم اور آئینِ اخلاق کے پیشِ نظر بورڈ کے کارپرداز انہیں مدارس کے سر تھوپ رہے ہیں۔

بعض ڈویژنل انسپکٹران مدارس نے اپنی سالانہ تعلیمی رپورٹ میں بورڈوں کے اخبارات و رسائل کو طلبہ کے لئے ناکارہ بتاتے ہوئے ان کی جبری خریداری کے خلاف رائے دی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان پرچوں کے اصل مخاطب دیہات کے نمبردار، سفید پوش، ذیلدار، اور پٹواری ہو سکتے ہیں۔ مدارس میں ان کی جبری خریداری اسکول کے فنڈ کا غلط استعمال اور طلبہ و اساتذہ کے ذوقِ مطالعہ پر ناقابلِ برداشت بار ہے۔

مدارس کے طلبہ و اساتذہ کی ادبی و تعلیمی ضروریات ان دیہاتی پرچوں سے کبھی پوری نہیں کی جا سکتیں۔ ملک کے ادبی و تعلیمی رسائل جو قابل اور تجربہ کار ایڈیٹروں کے ہاتھوں میں ہیں اور جن میں تعلیمی انداز کے شگفتہ اور ذہن افروز تازہ ترین علمی، ادبی، تعلیمی، تنقیدی، اصلاحی مضامین معلومات عامہ پر مشتمل مقالات، ترقی یافتہ زبانوں کے بلند اور مفید ادبیات کے تراجم شائع ہوتے رہتے ہیں۔ جن کے مطالعے سے طلبہ کی معلومات میں مفید اضافہ ان میں ادبی استعداد، اُن کے عادات و اطوار میں نشوونما۔ ان کے اساتذہ کے مطالعے کے لئے بلند تنقیدات اور اقوامِ عالم کے جدید تعلیمی نظریات بھی شائع کئے جاتے ہیں۔ یہ رسالے درحقیقت مدارس کی لائبریریوں کے واسطے ضرورت کی چیزیں ہیں۔

یہ واقعہ ہے کہ طلبہ اردو کورس کو تو استاد کے خوف اور امتحان کے ڈر سے بیدلانہ طور پر پڑھتے ہیں اور زیادہ فائدہ نہیں اُٹھاتے۔ لیکن ادبی رسالوں کو اپنے شوق اور ذاتی دلچسپی سے مطالعہ کرتے ہیں اور اس طرح غیر محسوس طور پر ان کے معلومات میں مفید اضافے کے ساتھ ان میں ادبی لیاقت و استعداد پیدا ہوتی ہے۔ لیکن ان کی بجائے مدارس کو جبراً وہ کوڑا کرکٹ خریدنا پڑتا ہے جو ردی فروشوں کی دکان کے سوا اور کہیں نظر نہ آنا چاہیئے۔

امسال محکمۂ تعلیم پنجاب نے ایک سرکلر کے ذریعہ اضلاع کے افسرانِ تعلیم کو ہدایت کی ہے کہ ہر بورڈ کو جو ایک ہزار روپے کی گرانٹ کتب و رسائل کی خریداری کے لئے دی جا رہی ہے اس میں سے صرف ۲۵۰ روپیہ رسالوں کی خریداری پر صرف کیا جائے۔ اور ۷۵۰ روپے کی کتابیں خریدی جائیں۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہر بورڈ اس گرانٹ میں سے ۲۵۰ روپے جو رسائل کی خریداری کے ہیں اپنے جاری کردہ پرچے کے لئے ہتیا لیتا ہے۔ اور جو کام کے ادبی رسالے بورڈوں میں مدارس کے لئے خریدے جا رہے تھے اُن کی خریداری بند ہو گئی ہے۔ اِس طرزِ عمل سے اگر ایک جانب مدارس کے طلبہ و اساتذہ مفید اور کام کے لٹریچر کے مطالعے سے محروم کر دیئے گئے ہیں تو دوسری جانب کام کا لٹریچر فراہم کرنے والے ادبی رسائل قدرناشناسی کا شکار ہو رہے ہیں۔

بورڈ ٹیچرز تحریک پر پہلی قربانی

ہوشیارپور میں بورڈ ٹیچرز ایسوسی ایشن قائم ہوئی تو وہاں کی تعلیمات کے کارپردازوں میں ہلچل مچ گئی۔

اگر وہ یہ سوچنے کی زحمت گوارا کرتے کہ مدارس کے اساتذہ ملک معظم اور یونین جیک کے سب سے بڑے وفادار ہیں۔ سیاسیات سے کنارہ کش اور کانگریسی تحریک سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔ محکمے کے ہر قانون کو آئینِ آسمانی خیال کرتے ہیں۔ اس لئے اپنی تنظیم کا حق ان کا ایک قدرتی حق ہے اور اس سلسلے میں ان کی حوصلہ افزائی کرنے کی ضرورت ہے۔ تو افسرانِ تعلیم کا یہ خیال مدبرانہ اور شریفانہ کہا جا سکتا تھا۔ لیکن انہوں نے اس نہایت بے ضرر اور حد درجہ مفید تحریک کو اپنے حکومتی اقتدار کا حریف سمجھ کر اس کے استیصال کو ضروری سمجھا۔ اور بورڈ ٹیچرز ایسوسی ایشن کو حکماً بند کرا دیا۔

کارپرداز استادوں اور ایسوسی ایشن کے ممبران کو دُور دراز مقامات پر تبدیل کر دیا۔ اور اسی پر بس نہیں کی بلکہ ایسوسی ایشن کے سیکرٹری کو صرف اس شبہ پر کہ اُس نے رسالہ شاہکار کو اس استبداد ناروا کی اطلاع دی۔ کچھ دنوں معطل کر کے آخر کار برخاست کر دیا۔

پنڈت بنارسی داس کا یہ سیکرٹری بورڈ ٹیچرز ایسوسی ایشن اس وقت برخاستگی اور بے کاری کی مصیبت جھیل رہے ہیں۔ ان کی برخاستگی درحقیقت اس مفید تحریک پہ پہلی قربانی ہے۔

اب اگر پنڈت صاحب موصوف کے اس حادثۂ پُرالم کو دوسرے استادوں نے ایک تماشائی کی نظر سے دیکھا تو سمجھ لو کہ یہ تحریک کے لئے ایک ضرب کاری ہوگی۔ ہوشیارپور میں یہ تحریک مر جائے گی اور دوسرے اضلاع کے لئے پنڈت بنارسی داس کی قربانی باعث تشویق و موجب پیروی بننے کی بجائے عبرت آموز بن جائے گی۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ باقی اضلاع کی ٹیچرز ایسوسی ایشنیں خاموشی سے یہ تماشائے ستم دیکھ رہی ہیں۔ اُن میں اِس حادثے نے کوئی زندگی پیدا نہیں کی۔ مرکزی ایسوسی ایشن کو اس واقعے کے بعد جو قدم اُٹھانا چاہیئے تھا وہ اُس نے نہیں اُٹھایا۔ بنارسی داس کا صرف یہی جرم تھا کہ وہ اپنی برادری کی تنظیم چاہتا تھا۔ اس جُرم کی پاداش میں اس کی روزی اُس سے چھین لی گئی ہے۔

بورڈ ٹیچرز تحریک اب پنجاب گیری حاصل کر رہی ہے۔ نو دس اضلاع میں بورڈ ٹیچرز ایسوسی ایشنیں قائم ہو چکی ہیں۔ آنریبل وزیر تعلیم و دیگر افسران تعلیم اس تحریک سے اظہار ہمدردی کر چکے ہیں۔ بہت سے اضلاع میں سینکڑوں استاد اس تحریک کے حامی اور اس کی کامیابی میں ساعی ہیں۔ قانون محکمہ اور قانون حکومت اس کے خلاف نہیں۔ اس صورت میں بھی اگر پنڈت بنارسی داس کو تن تنہا اُس کے انجام کے سپرد کر دیا گیا تو تماشائی حضرات کو معلوم ہونا چاہیئے کہ

"آج ہم کل تمہاری باری ہے"

ضرورت کا اقتضا تو یہ ہے کہ ہوشیارپور میں آئندہ دسہرے کی تعطیل پر مرکزی بورڈ ٹیچرز ایسوسی ایشن کے رہنما اور مختلف اضلاع کے سکرٹری جمع ہو کر ضلع کی ایسوسی ایشن کو پھر زندہ کریں اور سارے ضلع کے بورڈ ٹیچر بے خوفِ انجام اس اجلاس میں شریک ہوں۔ افسران ضلع سارے استادوں کو برخاست کرنے کی قدرت اور ہمت نہیں رکھتے۔ اگر ایسا کریں گے تو استادوں کا تو کچھ نہ بگڑے گا۔ خود ہی وہاں سے تبدیل کر دیئے جائیں گے

اس اجلاس میں پُرزور اور متحدہ مطالبہ کیا جائے کہ پنڈت بنارسی داس کو بحال اور سرکلر کو واپس لیا جائے۔ اسی کے ساتھ رہنماؤں کا ایک وفد کسی ذی اثر ایم۔ ایل۔ اے کی سرکردگی میں افسران تعلیم اور آنریبل وزیر تعلیم سے ملاقات کر کے عرض و معروض کرے۔

ایسا کیا گیا تو اس تحریک میں برق رفتاری پیدا ہو سکے گی۔ ورنہ آج ہوشیارپور میں یہ حادثہ ہوا ہے۔ کل کو دوسرے اضلاع کے افسران تعلیم بھی اس مثال کی پیروی کریں گے ؂

یہ ہے انتقام ستمگری کہ ستم پذیر نہ بن کبھی
جو مٹے تو پیکرِ پائمال کو یادگارِ ستم بنا

حکیم خورشید علی خاں رامپوری

یو۔ پی کے شاہی طبیب حکیم خورشید علی خاں صاحب کے متعلق کسی گزشتہ نمبر میں لکھا گیا تھا کہ اُنہیں لاہور کی آب و ہوا راس نہیں۔ اس لئے کراچی تشریف لے جانے کا عزم کر رہے ہیں۔ اسی ذیل میں لاہور کے ذی اثر حضرات کو توجہ دلائی گئی تھی کہ ایسے خاندانی اور حاذق طبیب کا لاہور سے چلا جانا اُن حضرات کے لئے ایک بڑی محرومی ہے جو یونانی علاج کے عادی ہیں۔ اس لئے کسی طرح کہہ سُن کر حکیم صاحب کو روک لینا چاہیئے۔

ہمیں یہ سُن کر مسرت ہوئی کہ ایک متحدہ اصرار کے ذریعہ اُنہیں کراچی جانے سے روک لیا گیا ہے اور اب وہ بدستور چوک، لوہاری منڈی لاہور میں مطب کر رہے ہیں۔ حکیم صاحب کے گھرانے میں ڈیڑھ سو سال سے پشتینی طبابت چلا آتا ہے۔ بڑے بڑے نامور طبیب اس خاندان میں پیدا ہوئے۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم اسی طبی خاندان کے شاگرد تھے اس خاندان کے طبی مجربات بہت قابلِ قدر ہیں اور خود حکیم صاحب امراض کی تشخیص اور طریقۂ علاج میں کمال مہارت رکھتے ہیں۔

کاتب کی اصلاحات

حکومت کی عطا کردہ اصلاحات جس درجے ملک کو مہنگی پڑ رہی ہیں اپنے رنگ میں کاتبوں کی اصلاحیں ایڈیٹروں، مصنفوں اور مضمون نگاروں کے لئے اس سے کم پریشان کن نہیں۔

مجھے شاہکار کے ایک دو مطبوعہ نمبر دیکھنے کا اتفاق ہوا تو کاتبوں کی اصلاحیں دیکھتے دیکھتے میرے سر میں درد ہونے لگا۔

اگست کے شاہکار میں "پنجاب کی اخبار نویس برادری" کے مضمون
کو کاتب نے درست کرتے ہوئے ایک جگہ مزاحیہ کو مضاحیہ بنا دیا ہے۔
صفحہ "اطفال میں" "فلورا" کا مسلسل مضمون تو مسلسل طور پر غلط شائع ہو رہا
ہے۔

بعض مقامات پر تو کاتب اور پروف ریڈر کی متفقہ سازشوں نے
اپنی سمجھ کے مطابق تبدیلی کر کے مضحکہ انگیز بنا دیا ہے۔ جن حضرات کی
مادری زبان اردو ہے۔ وہ جب اس مضمون کی غلط اردو پڑھتے ہوں گے تو
صاحب مضمون کو اس کا ذمہ دار ٹھہرا کر لعن و طعن شروع کر دیتے ہوں گے۔

آغا برق کوہاٹی

آغا محمد شاہ برق کوہاٹی صدر بزم سخن پشاور صوبہ سرحد میں اردو زبان
کی ترویج و اشاعت میں مدت مدید سے کوشاں ہیں۔ ان کی رہنمائی سے
صوبہ سرحد میں اچھے اچھے ادیب اور شگفتہ بیان شعراء کی ایک جماعت
تیار ہو چکی ہے۔

آغا برق بہت ذی استعداد، ذہین اور نغز گفتار شاعر اور ادیب
ہیں۔ آپ آجکل سرحدی شعراء کا ایک مفید تذکرہ لکھ رہے ہیں۔ امید
ہے یہ تذکرہ اردو ادب پر ایک کارآمد اضافہ ثابت ہوگا۔

نجیب آباد میونسپل بورڈ کا نیا چیئرمین

نجیب آباد (یو پی) کا میونسپل بورڈ ہمیشہ سے شہر کی مختلف پارٹیوں
کی جنگ باہمی کا میدان بنا رہا ہے۔ امسال بورڈ کے ممبران نے پہلی بار یک
دلی یکجہتی کا ثبوت دیا ہے کہ مولوی احمد عبداللہ خاں صاحب رستانی کو
بلا مقابلہ چیئرمین بنایا ہے۔ مولوی صاحب اپنی نیک دلی، ہمہ آمیزی
اور مرنجاں مرنج پالیسی کے سبب شہر بھر میں ہر دلعزیز ہیں۔

نئے چیئرمین مدیر شاہکار کے برادر حقیقی ہیں۔ اس لئے ہمیں گونہ
مسرت ہے۔ اس بورڈ میں ہمارے محترم ماموں امجد علی خاں صاحب
اور حقیقی ہمشیرہ آنسہ احمدی بیگم صاحبہ بھی ممبر ہیں۔ ہم بورڈ کے ہندو
مسلم ممبران کی اس صلح پسندی اور جذبۂ اتحاد پر انہیں مبارکباد پیش
کرتے ہیں۔

آل انڈیا ریڈیو

آئندہ نمبر سے آل انڈیا ریڈیو اور اس کی چند شاخوں کے پروگرام
پر ایک سلسلۂ مضامین شائع ہونا شروع ہوگا۔ پروفیسر عابد علی
نے اس بارے میں مدیر شاہکار کو مسلسل قلمی امداد دینے پر آمادگی کا اظہار
کیا ہے۔

تاجور

صادق نیوز ایجنسی

اردو اخبارات و رسائل کی بربادی میں ملک کے بد دیانت اور بد معاملہ
ایجنٹوں کی نادھندگی کو بہت زیادہ دخل ہے۔ یہ حضرات بُعد مسافت کا
ناروا فائدہ اٹھا کر جرائد و رسائل کی فروخت کو ہضم کر لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں
کہ کسی اخبار یا رسالے کا کوئی دفتر مطلوبہ رقم کیلئے قانونی چارہ جوئی کی زحمت
نہیں اٹھا سکتا۔

اس سلسلے میں ایجنٹوں کی ظالمانہ عیاریوں کے رنگ برنگ تجربات
ناگفتنی ہیں۔ کبھی اردو رسائل کی ناکامی کے اسباب پر کوئی مضمون لکھا
تو بیان کروں گا۔

"ادبی دنیا" اور "شاہکار" کے ہزاروں روپے ایجنٹوں نے دبا رکھے
ہیں۔ ضرورت ہے کہ تمام رسائل و اخبارات بد معاملہ ایجنسیوں کی نادھندگی
کو نام بنام شائع کر کے ان کا متحدہ مقاطعہ کریں۔

اس گروہ میں بعض ایماندار اور خوش معاملہ ایجنسیاں بھی
ہیں جو اخبارات و رسائل کی ہمت افزائی اور امداد کی مستحق ہیں۔ ان
میں صادق نیوز ایجنسی پشاور اور ملک محمد امین نیوز ایجنسی جالندھر کا نام خصوصیت سے
قابل ذکر ہے۔ ان ایجنسیوں کی دیانتداری اور معاملات کی صفائی کا بارہا
تجربہ ہو چکا ہے۔ ہمیشہ انہوں نے اپنی خوش معاملگی کا ثبوت دیا ہے۔

لاہور سے باہر کے معاصرین کو ان دو ایجنسیوں سے کاروباری
تعلق پیدا کرنے میں مطلق اندیشہ نہیں کرنا چاہئیے۔

ہم آئندہ تمام بد معاملہ اور غاصب ایجنسیوں کے ناموں کی مفصل
فہرست شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

سبھی اخبارات اور رسالے نادھند ایجنٹوں کی بد معاملگی سے
نقصان اٹھا رہے ہیں۔ اگر یہ ایکا کر کے اس قماش کے بد دیانت ایجنٹوں
کا مستقل طور پر بائیکاٹ کر دیں۔ تو ان بد شعاروں کے حواس ٹھکانے
لگ جائیں۔

مینیجر شاہکار

جواب و سوال

سوالات

محترمی مولانا تسلیم!

جولائی کے شاہکار میں بسلسلۂ عنوان پنجاب کی اخبار نویس برادری آپنے جناب وقار انبالوی کے متعلق جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس سے لاہور کی ادبی مجلسوں میں غلط فہمی پیدا ہو رہی ہے آپکی مروت اور رواداری سے بہت سے احباب کی طرح چونکہ کچھ نہ کچھ میں بھی واقف ہوں اور میرا دیانت داری سے یہ خیال ہے کہ آپ نے تنقیدی غیر جانبداری کی بجائے استادانہ حوصلہ افزائی سے کام لیا ہے۔ اگرچہ کئی صحبتوں میں وقار صاحب آپکی استادی کا انکار کر چکے ہیں، لیکن یہاں کے اکثر ادیبوں کو اس امر واقعہ کا علم ہے کہ وقار صاحب آپ سے برسوں اصلاح لیتے رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں، میں جناب سے ذیل کے سوالات پر روشنی ڈالنے کی درخواست کرتا ہوں۔ اور اس گستاخی کیلئے عفو کا طالب ہوں۔ کہ آپ کو حلفیہ بیان دینے پر مجبور کروں۔ مجھے امید ہے کہ آپ صحیح حالات کے اظہار میں صداقت سے انحراف نہیں فرمائینگے۔

(۱) وقار صاحب کے متعلق آپ کی جو رائے شاہکار بابت ماہ جولائی میں شائع ہوئی ہے کیا آپکے ضمیر کی آواز اس کی ہمنوا ہے؟

(۲) کیا وقار صاحب نے آپ سے اصلاح لی ہے تو کتنی مدت تک؟

(۳) کیا یہ امر واقعہ ہے کہ وقار صاحب کے ساتھ آپنے کبھی شغلِ جام و مینا کیا ہے کیونکہ وقار صاحب کو اسکا دعویٰ ہے۔

نوٹ میں خدا کے عظمت و جلال کی آپکو قسم دیتا ہوں کہ آپ من و عن حالات پر روشنی ڈالیں ان سوالات کیلیے اپنی گستاخانہ جرات کیواسطے طالب عفو ہوں۔

خاکسار سیف اکبر آبادی

(۲)

حضرۃ العلامۃ المفضال السلام علیکم ورحمۃ اللہ

اگست کے پرچے میں صفحہ ۲۴۳ کے آخر یعنی ایک نیچے والی سطر میں قلم فصاحت رقم سے "محاذِ جنگ" نکلا ہے۔ میں نے بھی تاریخ الہ آباد میں ایک فقرہ لکھا ہے "تاہم چار مختلف الوضع عمارتوں کا ایک سیدھی لائن اور ایک ہی محاذ میں بہ یک نظر نظر آنا ایک کیفیت خاص پیدا کر دیتا اور عجیب دلکشی رکھتا ہے"۔ ایک قابل دوست نے اعتراض فرمایا کہ "محاذ" صحیح نہیں ہے "محاذی" ہونا چاہیے۔ میں نے عرض کیا کہ حذو کا ظرف مکانی سمجھتا ہوں اور تمام مستند صحائف نگار "محاذ" کو صحیح مانتے اور بے تکلف لکھتے ہیں۔ یہ جواب بھی پذیرا نہ ہوا فرمایا کہ لغت میں محاذ کا لفظ دکھا دیجئے یا کسی مستند شاعر کے کلام میں۔ شاہکار میں اس کے متعلق ارشاد فرمایا جائے۔

(مولینا) سید مقبول احمد مدنی

الہ آباد

جوابات

(۱) حیران ہوں کہ اسکا کیا جواب دوں، کیونکہ اس سوال سے بھی عجیب تر جواب ہوگا۔ بات یہ ہے کہ وقار صاحب کو میری شاگردی سے انکار ہے تو مجھے اصرار نہیں، اصرار کیا معنی خفیف سا مطالبہ بھی نہیں اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ کسی شاگرد نے کبھی کسی تحریر میں اپنے آپکو تلمیذ تاجور لکھا ہے تو میں نے اس مرکب اضافی کو قلم زد کر دیا ہے۔ حد یہ ہے کہ خان صاحب ابوالاثر حضرت حفیظ جالندھری نے شاگردی کا اعتراف نو در کنار اپنے فوجی اخبار کارزار میں مجھے اپنا شاگرد لکھ دیا میں نے اسکی تردید بھی ضروری نہیں سمجھی۔

ورنہ نقل واقعہ کے طور پر میں یہ کہہ سکتا تھا کہ حفیظ صاحب نے اپنی بیس نظموں پر جو انہوں نے خان بہادر شیخ نور الہٰی صاحب آئی۔ ای۔ ایس کے لیے میری تجویز پر کہیں تھیں اُن پر مجھ سے اصلاح لی تھی۔ جب یہ نظمیں انہوں نے شیخ صاحب کے پاس کوہ مری بھیجیں تو لکھا تھا کہ "ان نظموں کو درج کتاب کرنے سے پہلے مولینا تاجور کو ضرور دکھا لیجیے"۔ اس پر شیخ صاحب نے وہ نظمیں میرے حوالے کیں اور میں نے اصلاح کر کے حفیظ صاحب کے پاس مری سے لاہور بھیجدیں۔ اس کے جواب میں انہوں نے میری اصلاح

کا شکریہ ادا کیا۔ البتہ ایک لفظ کے متعلق یہ لکھا کہ پنجاب میں رہٹ چلانے والے کی نشست کو "گادی" کہتے ہیں اور میں اسی لفظ کو استعمال کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے "گادی" کی بجائے اصل اردو لفظ "گدی" بنا دیا تھا۔ شیخ نور الٰہی صاحب قبلہ بفضلہ بقید حیات ہیں اس واقعے کی تصدیق یا تردید فرما سکتے ہیں۔ یہ وہ وقت تھا کہ جب حفیظ صاحب کو اپنی شہرت کے مستقبل کا اندازہ نہ تھا جب انہیں عروج نصیب ہوا تو انہوں نے میری تخریب کو اپنی تعمیر کا وسیلہ بناتے ہوئے اپنے اخبار میں مجھے اپنا شاگرد ظاہر کیا۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جب میں شاعری سے بیزار ہو کر اسے ترک کر رہا تھا اُس وقت حفیظ صاحب شاعری کی "ابجد" سیکھ رہے تھے۔

میں اس بارے میں اس قدر بے اعتنا واقع ہوا ہوں کہ میں نے ان کی ... کے جواب کے ساتھ اس واقعے کا اظہار بھی غیر ضروری سمجھا اسی ... میں ایک اور خندہ خیز واقعے کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

ایک صاحب ایک سفارش کے ذریعہ میرے شاگرد بنے، انہیں شاگرد بنانے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ شاعری ان کے بس کا روگ نہیں، غریب نے ہزار کوشش کی مگر آسان سے آسان وزن میں بھی کوئی مصرعہ موزوں نہ کر سکا۔ مگر شوقِ شہرت نے ان پر خواب و خور حرام کر رکھا تھا۔ روئے مروت سیاہ کہ اس شوقِ بیقرار کی تسکین کیلیے شاعرانہ بیگار کی مصیبت مجھے جھیلنی پڑتی تھی۔ یہ بزرگ موزوں دماغ نہ تھے مگر موزوں آواز ضرورت سے زیادہ تھے۔ مجالس مشاعرہ میں موسیقی کی آڑ لے کر ایک شاعر کی حیثیت سے چمک اٹھے۔ کالجوں کے بے ذوق نوجوانوں کی داد و تحسین نے انہیں یہاں تک برخود غلط بنا دیا کہ مجھ سے جو اشعار لکھوا کر لے جاتے یہ کہہ کر مجھی کو سنایا کرتے کہ ہر ایک کی زبان پر دل محمد کا نام آ رہا ہے آپ ہی کہیے مولینا میں کسی سے کم ہوں دیکھئے میری اس غزل کی ٹکر کی بھی غزل کوئی کہہ سکتا ہے؟ اور پھر اس تعلی کے بعد میرے ہی کہے ہوئے اشعار مجھے سنانے لگتے۔ میں کہ عادتاً داد دینے میں بہت بدنام ہوں ان کے عاریتی ... خوب داد دیا کرتا۔

نہ مروت نے مجھے یہ کہنے کی اجازت دی کہ تم خود فریبی میں مبتلا ہو کر مجھے بھی اپنا سہیم قسمت بنانا چاہتے ہو نہ اُن قبلہ کو یہ سوچنے کی کبھی توفیق ملی کہ میرے مخاطب کا حافظہ اس قدر کمزور نہیں ہو سکتا کہ اپنے رائگاں اشعار کو بھول جائے۔ اس مصیبت سے دونوں کو چھٹکارا اس وقت تک نہ ملا جب تک وہ اپنی معاشی مصروفیتوں کے سبب اپنی لائن میں منتقل ہو کر اس گناہ سے تائب نہ ہو گئے۔

طول کلام کا خوف نہ ہوتا تو اس سلسلے میں زندگی کے اور بہت سے تلخ تجربات بھی گفتنی تھے۔

مختصر یہ کہ ابھی تک بفضلہ اتنے ہوش و حواس زائل نہیں ہوئے کہ شاگردوں کی جتھہ داری حاصل کرنے کو اپنے لیے فخر تصور کرنے لگوں ورنہ میرے لیے ہزاروں شاگردوں کی فوج مرتب کر لینا کچھ دشوار نہ تھا کہ زندگی کے ۲۵ سال صوبے کے بہترین ادبی رسائل کی ایڈیٹری میں ضائع کر چکا ہوں۔ مدیران رسائل کو اس امر کا تجربہ ہے کہ آئے دن نومشقوں کے مضامین نظم و نثر انبار در انبار اس مودبانہ درخواست کے ساتھ موصول ہوتے رہتے ہیں کہ

"آج تک کوئی رہنمائے کامل نہ ملا کہ ادب و شاعری کی راہ میں صحیح رہنمائی کرتا آپ کو اس راہ کا خضر سمجھتا ہوں اور اس امید کے ساتھ اپنی کج مج زبان میں کہے ہوئے یہ چند اشعار بھیجتا ہوں کہ آپ اپنی اصلاح سے ان میں جان ڈال کر اپنے معزز رسالے میں شائع ہونے کے قابل بنا دینگے۔"

ان بے تکی درخواستوں کا جو حشر دوسرے رسالوں کے دفتر میں ہوتا ہے میں کہ زحمت اصلاح کو اپنے لیے ایک دماغی عذاب خیال کرتا ہوں اُن کے ساتھ کچھ مختلف سلوک نہیں کرتا۔ پھر ایک ایسے کالج میں ہوں جہاں بارہ سو طلبہ ہر سال فراہم رہتے ہیں اور بہت سے ادب دوست نو کالج کے پراسپکٹس میں میرا نام پڑھ کر دوسرے کالجوں سے رخ پھیرتے ہوئے میرے کالج میں اس درخشاں توقع کے ساتھ داخل ہوتے رہتے ہیں کہ ایف۔ اے، بی۔ اے میں پاس ہوں یا نہوں مولینا تاجور کے طفیل شاعر غرا ضرور بن جائینگے۔ اگر مجھے شاگرد سازی کا جنون ہوتا تو ۲۰ سال کی میعاد ملازمت میں پندرہ ہزار شاگردوں کا ایک لشکر جرار تیار کر سکتا تھا۔ لیکن عموماً ہوتا یہی ہے کہ جہاں کسی طالبعلم نے اس جنوں کا اظہار کیا چند نشتریں فقروں سے اسکا نشہ ہرن کر دیا۔

اختر شیرانی نے ٹونک سے اس اظہار شوق میں کئی شوق نامے لکھے تھے مگر میں نے کسی کا جواب بھی نہیں دیا تھا۔ میرے ایک عزیز مکرم مولینا صدیق احمد خانصاحب ٹونکی نے جو لاہور امتحان دینے آئے تھے اس سلسلے میں بہت سفارش کی تب میں نے اس زحمت کو منظور کیا اور اب دل سے نادم ہوں کہ میری دہ سالہ زحمت رائیگاں گئی۔ اگر میرے مشورے کے مطابق اختر شاعری کی رو میں بہہ جانے کی بجائے تعلیم میں ترقی کرتا تو اپنے خاندان، قوم اور ملک کے لیے بہت مفید ثابت ہوتا۔ اسکے لیے شاعری بہت ناسازگار ثابت ہوئی، اسی جنوں نے اُسے اُس

بے منزل راہ میں گم کردیا جسکے اختیار کرنے والے یہی کہتے سنے گئے کہ

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
خود ہماری خبر نہیں آتی

ورنہ نگاہِ عام میں اختر جیسا حسین گفتار شاعر ایسا نہیں کہ اسکی رہنمائی پر کوئی فخر نہ کرسکے مگر میں چونکہ اردو شاعری ہی کو سرے سے غیر ضروری بلکہ بعض حالات میں مضرت رساں خیال کرتا ہوں اس لئے اس راہ کی رہنمائی اور رہ نوردی کو بھی انسانی فخر میں شمار نہیں کرتا۔

اس اظہار حقیقت کے بعد وقار صاحب کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے۔ وقار صاحب انبالوی پہلے "غاضنف ملانوی" کے نام سے تھرڈ اخبارات میں ہنگامی شاعری کیا کرتے تھے اور یہی انکا وسیلۂ معاش آج تک قائم ہے۔

میں نے غاضنف اور "ملانوی کی سامعہ پاش ترکیب کو پڑھکر اس کے تحت میں مندرجہ اشعار کو کبھی پڑھنا گوارا ہی نہیں کیا تھا۔ ملک یوسف العزیز جائنٹ ایڈیٹر روزنامۂ انقلاب انہیں میرے پاس لائے اور اصرار کیا کہ اپنے دفتر میں انہیں کوئی ملازمت دیں۔ میرے دفتر میں مطلق گنجائش نہ تھی گنجائش کیا معنی مروت زدگی کے سبب کئی زائد از ضرورت لوگ دفتر میں انگرائیاں لیتے رہتے تھے میں نے معذرت کا اظہار کیا وہ نہ مانے اور بیحد مصر ہوئے میں نے کہا فی الحال چٹیں لکھنے اور رجسٹر کے پنے خوشخط لکھوانے کا کام دے سکتا ہوں وہ اس پر راضی ہو گئے یہ جگہ دس بارہ روپے کی تھی نگران کے گلوگیر اصرار نے بیس روپے ماہانہ پر انہیں رکھوا دیا۔ یہ کام کرنے لگے تو انہیں ادبی دنیا میں نظمیں چھپوانے کا شوق بیقرار رکھنے لگا۔ میں نے کہا غاضنف ملانوی کے نام سے تو میں آکاش بانی کو بھی رسالے میں شائع کرنے پر تیار نہیں چنانچہ میرے مشورے سے یہ وقار انبالوی بنے۔ پھر جب تک یہ رہے ان کی ہر نظم میری اصلاح سویم و چہارم کے بعد شائع ہوتی رہی۔ انکی کسی نظم کا پہلا مسودہ میری اصلاح سے پڑھنے کے قابل نہیں رہتا تھا۔ کچھ ماہ کے بعد انہیں میں اپنے ڈھب پر لاسکا۔ کسی دوسرے رسالے میں بھی جب کبھی یہ اپنی کوئی نظم بھیجا کرتے تو میری اصلاح سے پہلے نہیں بھیجتے تھے۔ آدمی ذہین ہیں رفتہ رفتہ اپنی مشق کردہ غلطیوں سے اجتناب کرنے لگے انکی نثر بھی میری اصلاح کے بغیر جب کبھی چھپی غلطیوں سے پاک نہ رہ سکی۔

کچھ دنوں کے بعد انہیں پریم کی اسسٹنٹ ایڈیٹری اور ادبی دنیا کی پروف ریڈی سپرد کر دی گئی۔ زبان کی غلطیاں پریم میں بڑھنے لگیں تو آنریبل سر چھوٹو رام نے مجھے ایک پرائیویٹ خط میں ان غلطیوں کی جانب توجہ دلائی۔ اس وقت انکی تنخواہ ۵۰ تک بڑھائی جاچکی تھی۔ تنخواہ کے بڑھانے میں ایک کارفرما کی خوشنودی کی بجائے استاد کی ہمدردی کو زیادہ دخل تھا۔

جب پرتاپ میں انہیں جگہ مل گئی تو یہ میری اجازت بلکہ تائید رائے سے وہاں چلے گئے کیونکہ میرا یہ دیرینہ رویہ ہے کہ اپنے ملازم کی بہبودی کو اپنے دفتری کاموں پر مقدم رکھتا ہوں بعض اوقات میرے علم میں کوئی اچھی ملازمت کسی ملازم کے مناسب نظر آتی ہے تو چاہے اپنے کام میں ابتری پیدا ہو جائے، اسے اپنا سارا رسوخ استعمال کرکے وہ جگہ دلانے کی سعی کیا کرتا ہوں۔ اس میں جذبۂ ایثار کو دخل نہیں بلکہ اپنی افتادِ طبع سے مجبور ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ میرے دفتر کی روایتی بدنظمی اور کارکنوں کے مسلسل تبادلہ کے باوجود میرا کاروبار خدائے تعالیٰ کے فضل سے اب تک جاری ہے۔ اگرچہ خیانتی ملازم میرے دفتر سے رخصت ہونے کے بعد فقر و فاقہ کشی کے مصائب میں ایسے گرفتار رہے کہ کوئی صورت مخلصی کی انہیں نصیب نہیں ہوتی۔

یہ ہیں مختصر حالات وقار صاحب کی اصلاح گیری کے۔

اب رہا یہ سوال کہ "پنجاب کی اخبار نویس برادری" کے زیر عنوان جو وقار صاحب کے متعلق اظہار رائے کیا گیا؟ اس کے متعلق دیانتداری سے عرض کرتا ہوں کہ میں کئی دوستوں کی زبانی یہ سن رہا تھا کہ پرتاپ والے وقار صاحب کے کام سے مطمئن نہیں بہت ممکن ہے یہ افواہ ان کے دشمنوں نے اڑائی ہو لیکن مجھ تک یہ خبریں پہونچ رہی تھیں ادہر پرتاپ میں ایک اسسٹنٹ ایڈیٹر کی ضرورت شائع ہوئی تو مجھے یقین ہو گیا کہ اس افواہ میں صداقت ہے۔ میرے لیے یہ یقین تکلیف دہ تھا اس لیے میں نے وقار صاحب کی مدح میں ہر بلند لفظ جو میرے ذہن میں محفوظ تھا صرف کر دیا اور مہاشہ کرشن و مسٹر ویریندر کو یہ بتانے کے لیے کہ آپکے اخبار میں کام کرنے کے سبب وقار صاحب مسلمانوں میں بڑی شہرت کے حصہ دار بن رہے ہیں چند ایسے فقرے بھی لکھ دئیے جو ان حضرات کی نگاہوں میں وقار کی منزلت اور ایثار کی قدر بڑھا دیں یہ ہے اس مدح کی اصلیت۔

میری صحیح رائے ان کے متعلق یہ ہے کہ پرتاپ کے بہرۂ نظم اور

چٹکلوں کے زیر عنوان جو وہ خامہ فرسائی کرتے رہتے ہیں پرتاپ کے لیے دبا غنیمت ہے۔ پرتاپ کے مالک اردو پروری کیلیے اخبار شائع نہیں کر رہے ہیں کہ صحیح، فصیح اور دہلی لکھنؤ کی ٹکسالی زبان کو اپنے اخبار کیلیے ضروری خیال کریں۔ وقار کی نظم ونثر پرتاپ کی عام نظم ونثر سے بہر حال بلند ہوتی ہے۔ ہاں اُس مندرجہ رائے میں یہ حصہ بالکل ناقابلِ ترمیم ہے کہ رزمیہ شاعری میں جدید انداز کی نظم نگاری کی ابتدا وقار نے کی ہے ایک اور امتیاز وقار کو یہ حاصل ہے کہ وہ تقریباً فی البدیہہ شاعری کرتا ہے خود میرے لیے یہ ناممکن ہے کہ وقار کی طرح ارتجالاً شاعری کروں۔ وقار کی تعلیم اگرچہ بہت محدود ہے کہ وہ اردو زبان کی کسی غیر علمی کتاب کے سوا دنیا کی کسی زبان کی کسی کتاب کو نہیں پڑھ سکتا لیکن اس کی ذہانت نے اس کمی کی اس حد تک تلافی کر دی ہے۔ کہ وہ کسی تعلیمیافتہ اسٹاف میں اوپرا نہیں معلوم ہوتا۔

کوئی نظم جی لگا کر کہتا ہے تو عموماً اچھی ہوتی ہے البتہ اسکی اچھی نظم میں بھی دو چار شعر کے بعد ایک آدھ شعر یا کسی شعر کا مصرعہ ایسا بے تکا ضرور آ جاتا ہے جس سے نظم کی خوبی مجروح ہو جاتی ہے۔ جب وقت قلم تھام کر کوئی نثر لکھتا ہے تو وہ بھی فصیح الفاظ و فقرات سے مملو ہوتی ہے۔ کاش اسے کسی اچھے ماحول میں تربیت پانے کا بھی موقعہ ملتا۔ وقار کی نظم و نثر پر میری دیانتدارانہ رائے یہ ہے۔

میری خواہش ہے کہ وہ اپنی معاشی و مجلسی حیثیت ملبند کرنے میں کامیاب ہو۔ روایت مندرجہ سوال کے بعد بھی میرے دل میں کسی کدورت کی بجائے اسکے لیے ہمدردی کا جذبہ موجزن ہے۔

مسٹر ویر مندر منیجنگ ایڈیٹر پرتاپ اور لالہ وزیر چند بی۔ اے ایڈیٹر پرتاپ کو میں یقین دلاتا ہوں کہ وقار کی حیثیت کا ادیب اتنے کم معاوضہ پر اُنہیں نہیں مل سکیگا۔

اس حصۂ جواب کے خاتمہ پر یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جس ادب و شاعری نے خود میری علمی حیثیت کو گھن لگا رکھا ہے وقار یا کوئی دوسرا شاگرد مجھ سے اس فن کا استفادہ کر کے تخت سلطنت حاصل نہیں کر سکتا اس لئے اگر وہ یا کوئی اور میری شاگردی سے انکار کرتا ہے تو بخدا مجھے اُس سے اعتراف کا خفیف سا مطالبہ بھی نہیں۔ نیز مجھے کسی شاگرد کے انکار استفادہ سے چونکہ شمہ بھر نقصان بھی نہیں پہونچتا اس لیے مجھے اس انکار سے ملال بھی نہیں۔

اب لیجیے سوال کے آخری اور دلچسپ پہلو کو یعنی "شغلِ جام و مینا" اسے پڑھ کر مجھے مولینا حالیؔ اور مرزا غالبؔ کا وہ واقعہ یاد آ گیا جو حالی نے یادگار غالب میں درج کیا ہے۔

جنہوں نے اس واقعے کو نہیں پڑھا ان کے لیے نقل واقعہ مناسب ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جب مرزا غالب نے مرزا قتیلؔ کی "برہان قاطع" پر فن لغت کے اعتبار سے اعتراضات کتابی صورت میں "قاطع برہان" کے نام سے شائع کئے تو مرزا قتیل کے ارادتمندوں میں ایک حشر مخالفت برپا ہو گیا۔ ان میں جو صاحب قلم تھے انہوں نے "قاطع برہان" کی تردید میں کتابیں لکھیں اور جو تصنیف و تالیف کے اہل نہ تھے انہوں نے خطوط کے ذریعہ فحش گالیاں دینی شروع کر دیں اس دشنام رسانی کے ایام میں ایک دن مولینا حالی مرزا غالب کی خدمت میں موجود تھے کہ ڈاک آئی۔ اس میں بدستور گالیوں کے خطوط تھے۔ ایک بدتمیز نے خط میں مرزا کو ماں کی گالی لکھ رکھی تھی، مرزا نے اس خط کو پڑھا اور مولینا حالی کی طرف خط بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ

"دیکھو اس قرمساق کو گالیاں دینے کی تمیز بھی نہیں
مجھ ستر سال کے بوڑھے کو ماں کی گالی دے رہا ہے
حالانکہ بوڑھے آدمی کو بیٹی کی، جوان کو بیوی کی، اور
بچے کو ماں کی گالی دی جا سکتی ہے" وغیرہ وغیرہ۔

سیفؔ صاحب کی روایت اگر صحیح ہے تو وقارؔ صاحب کی تہمت تراشی پر میں "عفاک اللہ نکو گفتی" کے بعد اتنا ضرور عرض کرونگا کہ آپ نے اس تہمت کی تعبیر میں ذہانت سے مطلق کام نہیں لیا بھلا جس شخص کو قوت لا یموت کی فراہمی بھی دشوار ہو اُسے "شغلِ جام و مینا" کی مقدرت کیسے حاصل ہو سکتی ہے؟۔ مے نوشی تو ایک امیرانہ نشہ ہے جس کے لوازمات کیلیے مسٹر برلا کا خزانہ چاہیے! ولایتی شراب نہ سہی آپکی بے نقل ٹھرّا آشامی بھی روپے کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ میرے بجٹ کی تہی دامنی سے آپ اور آپ کی طرح میرے لاہوری معاصر بھی کچھ نہ کچھ واقف ہیں پھر "شغل جام و مینا" کی پھبتی تو بڑے بے تکی بات بن جاتی ہے۔ آپ اس بہتان کو تراشنے سے پہلے اگر معاملہ اندیشی سے کام لیتے تو شغل جام و مینا کی بجائے بھنگ نوشی کا الزام آسانی سے گھڑ سکتے تھے۔ راوی کے کنارے بھنگ کا جنگل لہرا رہا ہے۔ یہ نشہ بڑا مفلس نواز نشہ ہے۔ آپ کا الزام میرے سو رحال پر

منطبق بھی ہو جاتا اور آپ کو مسٹر سراج الدین ظفر وکیل لاہور کی ہشت مشت بھی نہ سننی پڑتی۔ اب کے تو آپ چوک گئے آئندہ اس نیک کام کے لیے کبھی آپ کی طبیعت چکبلائے تو میری مالی حالت کو ضرور پیش رکھیں۔

"وہ ہم بتائیں جو تمہیں طرز ستم یاد نہ ہو"

وقار صاحب! آپ ہی اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کے بتائیں کہ طفیلی کی پوزیشن کے علاوہ کبھی آپ اپنے طور پر بھی اس رنگین گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں؟

کیا کروں؟ اگر آپ کی قسموں کا اعتبار ہوتا تو میں اس سلسلے میں آپ سے حلفیہ پوچھتا کہ میرے متعلق آپ کو شغل جام و مینا تو درکنار پان کے سوا کسی اور نشے کا شبہ بھی ہے؟ حیران ہوں کہ جس بات کو آدمی خود جھوٹ سمجھتا ہو اُسے ایک واقعے کی صورت میں کیوں کر بیان کر سکتا ہے۔ آئیے ہم دونوں صدق دل سے خدا کے اس وعید کو دوہرائیں کہ "لعنۃ اللہ علے الکاذبین"۔

میری شبانہ روز زندگی کے تفصیلی یومیہ نظام الاوقات سے احباب کے علاوہ شاگردوں میں حضرات فاخر ہریانوی) اور احسان دانش بھی واقف ہیں۔ فاخر میرے ساتھ ایک ہی مکان میں کئی ماہ تک قیام بھی کر چکے ہیں۔ خطرناک حد تک صاف گو اور راست بیان واقع ہوئے ہیں۔ اور احسان دانش اپنی شاگردی کے گذشتہ پانچ سال میں عموماً میرے پاس آتے جاتے رہے ہیں اور پچھلے تین ماہ تو (چونکہ میرے اہل و عیال رامپور رہتے تھے) وہ رات کے ایک ایک بجے تک میرے پاس تازہ نظموں کی تعمیر و اصلاح کے سلسلے میں بیٹھے رہتے ہیں۔ وہ میرے بے باک، بے حجاب اور حد درجہ بے تکلف شاگردوں میں ہیں۔ ان دونوں حضرات کو میری اجازت ہے کہ اگر کبھی انہیں منشیات میں سے کسی نشہ آور چیز کے استعمال کا مجھ پر شبہ بھی ہو تو بیان کر دیں۔ یہ دونوں وقار صاحب کے دوستوں میں ہیں ان سے وہ حلفاً اس امر کی تصدیق طلب کر سکتے ہیں۔

لاہور کے ادیبوں میں اکثر حضرات جانتے ہیں کہ میں نے اپنے ایک ایسے نامور اور مقبول انام شاگرد سے جسکی شاعرانہ شہرت ہندوستان گیر ہے۔ صرف اس وجہ سے ترک تعلق کر رکھا ہے کہ وہ بدقسمتی سے اس جنوں خیز نشے میں مبتلا ہو چکا ہے۔

(۲)

مولینا قبلہ!

اپنے دوست کو آپ کا یہ جواب کہ

تمام مستند صحائف نگار "مجاز" کو صحیح مانتے اور بے تکلف لکھتے ہیں"

بالکل صحیح ہے ہر زبان میں کسی لفظ کے متعلق اہل زبان کا استعمال ہی سند ہے بلکہ مجاز کی بجائے "مجازی" کی صحت میں مجھے کلام ہے۔ زیادہ سے زیادہ اسکا استعمال اباحت و جواز کے درجے میں آسکتا ہے۔ عربی زبان میں کچھ لکھتے ہوئے مجازی ہی استعمال ہوگا، لیکن اردو میں جو لفظ (خواہ وہ اپنے ماخذ کے اعتبار سے کیسا ہی مختلف المعنی واللہجہ ہو) جس طرح اور جس معنی میں اہل زبان کے روزمرہ میں آگیا ہے اسی طرح اور اسی معنی میں اسکا استعمال فصیح ہوگا۔ میر انشاء نے "انشائے لطافت" میں اسی اصول کی تبلیغ کی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

تاجور

گذارش

نقوشِ اُلفت کے دھندھلے پڑ گئے ہیں رنگ بھرنا ہے — مجھے اب حُسن کی سرکار میں کچھ عرض کرنا ہے

گراں گر طبعِ نازک پر نہ گذرے مدعا دل کا — تو سُن لو دل میں اب چبھنے لگا ہے ماجرا دل کا

وہ آغازِ محبت کا زمانہ یاد ہے تم کو؟؟ — نیاز و ناز کا رنگیں فسانہ یاد ہے تم کو

شرابِ عشق سے جب تم مجھے سرشار کرتے تھے — نگاہوں سے تمناؤں کو جب بیدار کرتے تھے

رسا تھے میرے نالے جب اثر تھا میری آہوں میں — پلاتے تھے وہ مے تم جو کھچا کرتی ہے آنکھوں میں

اگر تم کو ستانے کیلئے میں روٹھ جاتا تھا — بتاؤ کون پہروں بیٹھ کر آنسو بہاتا تھا

تمہیں وہ چاندنی راتیں ابھی بھولی نہیں ہوں گی — وہ راتیں وہ ملاقاتیں ابھی بھولی نہیں ہوں گی

کیا کرتے تھے جب عہدِ وفا چھاؤں میں تاروں کی — ہوائیں کھیلتی تھیں زلفِ مشکیں سے بہاروں کی

وہ کیا دن تھے کہ جب چھپ چھپ کے تم ملتے تھے راتوں میں
وہ کیا "راتیں" تھیں کٹ جاتی تھیں جو باتوں ہی باتوں میں

وہ راتیں آہ جو ہمدوش تھیں طورِ محبت سے — وہ باتیں آہ جو معمور تھیں نورِ محبت سے

وہ راتیں آہ جن راتوں میں تم سے گفتگو ہوتی — وہ باتیں آہ جن باتوں میں شرحِ آرزو ہوتی

وہ راتیں جو مجھے سارے جہاں سے دور کرتی تھیں — وہ باتیں جو محبت کیلئے مجبور کرتی تھیں

وہ راتیں جنکی خاموشی میں تھیں جادو کی تاثیریں — وہ باتیں جنکی شیرینی میں تھیں الفت کی تفسیریں

وہ راتیں جو جواں تھیں اور جوانی ساتھ لاتی تھیں — وہ باتیں جو حیاتِ جاودانی ساتھ لاتی تھیں

وہ راتیں آہ جو بدمستیاں برساتی آتی تھیں — وہ باتیں آہ جو مینوشیاں ہمراہ لاتی تھیں

وہ راتیں آہ جو بھاری تھیں ساری زندگانی پر — وہ باتیں خندہ زن تھیں جو صدائے لن ترانی پر

وہ راتیں جنکے دامن میں تمنائیں مچلتی تھیں — وہ باتیں آرزوئیں جنکی آغوشوں میں پلتی تھیں

وہ راتیں جنکی رنگینی مجھے بے خواب کرتی تھی
وہ باتیں جنکی شیرینی مجھے بے تاب کرتی تھی

مگر افسوس وہ باتیں رہیں باقی نہ وہ راتیں
وہ راتیں وہ ملاقاتیں ہوئیں سب خواب کی باتیں

ہوئے ایّامِ راحت ختم، عہدِ اضطراب آیا
مری دنیائے الفت میں غضب کا انقلاب آیا

بسی ہے دیدۂ مہجور میں تصویر راتوں کی
ابھی تک گونجتی ہے کان میں آواز باتوں کی

سمجھ ہی میں نہیں آتا ہے کچھ بھولا ہوا سا ہوں
نہ جانے ہو گیا ہے کیا مجھے کھویا ہوا سا ہوں

یہ آخر برہمی کیوں ہے؟ یہ آخر ماجرا کیا ہے
یہ جورِ بے سبب کیسا؟ یہ ظلمِ ناروا کیا ہے

تمہیں آزادیاں ہیں قلب میں ناوک لگانیکی
مجھے تم سے نہیں کچھ بھی شکایت بھول جانیکی

بلا سے گر نہیں ہے لطف کے قابل وفا میری
مجھے اقرار ہے اس کا کہ تھی یہ بھی خطا میری

تم اور الزام بد عہدی الٰہی کیا کہا میں نے
چلو یوں ہی سہی وعدہ نہ خود پورا کیا میں نے

یہ سب سچ ہے مجھے احساس ہے اپنی خطاؤں کا
تمہارے لطفِ شوق انگیز کا اپنی جفاؤں کا

کوئی ٹکڑا مگر ایسا نہ رہ جائے فسانے میں
تمہارا نام بھی بدنام ہو جائے زمانے میں

یہ میں کیونکر کہوں مرتا ہوں تم مجھ تک چلے آؤ
محبت سرمدی ہے یوں مگر اس کو نہ ٹھکراؤ

محمد یونس سلیم (جامعہ عثمانیہ)
حیدر آباد دکن

رباعی

شاعر ہے تو دل جو زباں رکھتا ہے
عیبا و حیات جاوداں رکھتا ہے
جذبات صحیح پیش کرو ے اپنے
زینتی ہمت کوئی کہاں رکھتا ہے

خنجر آفندی

پنجاب کی اخبار نویس برادری

ظفر علیخاں، "زمیندار" اور اردو صحافت کا دورِ جدید

(گذشتہ سے پیوستہ)

مولینا ظفر علی خاں اپنی آتش نگاریوں کے صدقے میں پانچ سال کے لئے منٹگمری جیل میں پابندِ سلاسل کر دئیے گئے۔ تو ادارتی خود مختاری مہر و سالک کے حصے میں آئی۔ ان دونوں حضرات نے "زمیندار" کی قبولیتِ عامہ میں فرق نہیں آنے دیا۔ لیکن آخر یہ دونوں مزدور کی حیثیت میں کام کرتے تھے۔ جسم و جان میں ربط قائم رکھنے کے لئے انہیں قوت لایموت کی بھی ضرورت تھی۔ ان کی تنخواہ ظفر علی کی قدر شناسی کے پیشِ نظر دو سو روپے ماہانہ مقرر تھی۔ مگر زمیندار کے عملۂ انتظام کی بے راہ روی اور افسوسناک بد انتظامی کے سبب سارے عملۂ ادارت و انتظام کے ساتھ مہر و سالک بھی مالی مشکلات سے پریشان رہے۔ دفتر میں پیسہ نہ ہو نہ آئے تو تعلیم یافتہ کارکن راضی برضا ہو کر صبر و خموشی اختیار کر سکتے ہیں۔ مگر روپیہ آئے کارکن فاقہ کشی کی مصیبت میں مبتلا ہوں۔ یہ صورت کیسے برداشت کی جا سکتی ہے؟ نتیجہ یہ ہوا کہ کارفرما اور کارکنوں میں کشمکش شروع ہو گئی۔ یہ کشمکش بڑھتے بڑھتے بغاوت پر منتج ہوئی۔ مولینا ظفر علیخاں جیل سے رہا ہو کر تشریف لائے تو دفتری کارفرماؤں کو راہ پر نہ لا سکے۔ اصل یہ ہے کہ قلمکار حضرات عموماً انتظامی خرخشوں کو دور کرنے کی اہلیت سے معرّیٰ ہوا کرتے ہیں۔ ظفر علیخاں سے آپ صبح و شام تک مضامین لکھوا سکتے ہیں۔ لیکن انتظامی پہلو میں اُن کے لئے اپنی میز کے کاغذات کی ترتیب بھی دشوار ہے۔ پھر اخبار کے شاخ در شاخ شعبوں کا انتظام ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے محدود ذاتی اخراجات کے لئے بھی دوسرے کارکنوں کے ساتھ ہی دفتر کے کارفرماؤں کے دستِ نگر رہتے ہیں۔

مختصر یہ کہ ان کی پنجسالہ قید کے بعد رہائی بھی زمیندار کی بد انتظامی کو دور نہ کر سکی۔ تنگ آ کر سارے عملہ ادارہ و انتظام نے مہر و سالک کی قیادت میں بغاوت کا اعلان کر دیا۔ زمیندار کے کاتب، منشی، کلرک، مترجم سب کے سب ہم آہنگ و ہمرنگ انداز میں زمیندار کے دفتر سے رخصت ہو گئے

اِس بغاوت کے سرغنہ حضرات مہر و سالک تھے۔ انہوں نے زمیندار کے باقی کارکنوں کو اپنا ہم رائے بنا کر ایک طرف تو زمیندار کے دفتر تک کسی نئے کارکن کے پہنچنے کی تمام راہیں بند کر دیں۔ دوسری طرف باہمی عہد و پیمان کے بعد اس بغاوت کو کامیاب بنا کر انقلاب کی صورت دینے کے لئے زمیندار کے مقابلے میں روزنامہ انقلاب کے نام سے ایک جدید روزنامے کے اجراء کا اعلان کر دیا۔

روزنامہ انقلاب کے پہلے نمبر کے سرورق پر اقبال مرحوم کی نظم "انقلاب" شائع ہوئی۔ "انقلاب" کے کاتب زمیندار ہی کے کاتب تھے۔ زمیندار میں کاتب ہمیشہ سے شہر کے منتخب خوشنویس رہتے ہیں۔ قدرۃً انقلاب کی کتابت دیدہ زیب، طباعت دیدہ زیب، مہر و سالک اور عملے کی مشاقانہ روزکارکردگی کے سبب اس کے مضامین میں افادی پہلو نمایاں تھا۔ ابتدا میں "زمیندار" ہی کی پالیسی "انقلاب" کی بھی پالیسی رہی۔ ان خصوصیات کے سبب انقلاب چمک اٹھا۔ اور اگرچہ موسم کی ہر تبدیلی کے ساتھ اس کی پالیسی بھی بدلتی رہی۔ لیکن آج تک جاری ہے۔

روزنامہ انقلاب کے معرضِ وجود میں آنے کی یہ مختصر سی داستان ہے۔ انقلاب کا ذکر اس بیانیہ میں ضمناً اس لئے لانا پڑا کہ اس افسانے سے ظفر علیخاں کی ایک مدبرانہ کرامت کا ذکر مقصود ہے۔ وہ یہ کہ زمیندار کی دفتری بدعنوانیوں سے زچ ہو کر جب زمیندار کے کارکنوں نے مقاطعہ کیا تو یہ مقاطعہ ہر پہلو سے مکمل تھا۔ کوئی کاتب، کوئی کلرک، کوئی چپراسی، کوئی مترجم اور کوئی مقالہ نگار بھی ایسا نہ تھا جو دفتر زمیندار سے رخصت نہ ہو گیا ہو۔ پھر کاتبوں نے اپنے رہنماؤں کی انگیخت پر ناکے بندی کر لئے تھے۔ کسی کاتب کو دفتر زمیندار میں قدم رکھنے کی مجال نہ تھی۔ مقاطعہ بالکل اچانک اور ایسے وقت ہوا کہ مضامین تیار نہ تھے۔ زمیندار کے ہوا خواہوں کو خطرہ ہو گیا کہ اب زمیندار کبھی شائع بھی ہو سکے گا یا نہیں؟ اور اس خطرے کے واقعہ بننے میں تو کسی کے لئے شک کی گنجائش ہی نہ تھی کہ یہ حشر برپا کم از کم ایک ہفتے تک زمیندار کو مجال طباعت و اشاعت نہ دے گا۔ مگر ہوا یہ کہ ادھر تو مولینا اختر علیخاں موٹر پر سوار ہو گئے اور ساٹھ ستر میل کی مسافت طے کر کے وہاں سے چند کاتب لائے ادھر

اِدھر مولانا ظفر علیخاں قبلہ نے اپنے رفیق ادارۂ (حقہ) کی "بڑھے چلو" پر لبیک کہتے ہوئے بائے بسم اللہ سے تائے تمت تک آٹھ جہازی صفحوں کا اخبار لکھ کر کاتبوں کے حوالے کر دیا۔ اور پھر اخباری برادری اور عام اخبار بین پبلک یہ دیکھ کر عرصۂ حیرت بن گئی کہ ایک منٹ کی تاخیر کے بغیر زمیندار ہاکروں کے ہاتھ میں تھا۔

عام زمیندار اور اس کے عجالۂ ادارۂ زمیندار میں اگر کچھ فرق تھا تو یہ تھا کہ
(۱) کہ اس پرچے کی کتابت زمیندار کی کتابتی خصوصیات کی حامل نہ تھی۔
(۲) اور یہ پرچہ تمام کا تمام ظفر علیخاں کی ماہرانہ جولانیوں کا رزمگاہ ہونے کے سبب زمیندار کے اُن عام نمبروں سے بہت زیادہ دلچسپ تھا۔ جن میں ظفر علیخاں کبھی ایک آدھ کالم کا کوئی نوٹ دیدیا کرتے تھے اور باقی پرچہ عملۂ ادارہ کے ترجمات اور شذرات سے معمور ہوا کرتا تھا۔

اس مکمّل اور فجائی مقاطعے سے ملک کا کوئی دوسرا اخبار نویس ہوتا تو اسقدر بدحواس ہو سکتا تھا۔ کہ اس کے لئے مقالہ نگاری تو بہت بڑی بات ہے۔ دو سطری خط بھی لکھنا دشوار ہو جاتا۔ قدرۃً ظفر علی خاں کے دل و دماغ پر بھی اس سراسیمگی کی یلغار ہوئی ہوگی، مگر قلمکار قدرت ظفر علی نے اپنے اعجاز نگارش کو قدرت کا حریف بنا دیا۔ اور حالات ناساز گار کو "باش کہ برسیم" کی ڈانٹ سے للکار بتائی۔ پھر یہی ہوا کہ حالات رام ہوگئے۔ قدرت حلیف بن گئی اور آسمان نے اپنی تمام چھوٹی بڑی مصیبتیں اپنے دامن میں سمیٹ لیں۔

گزشتہ نمبر میں ایک قابلِ ذکر اخبار نویس اور اس کے اخبار کا نام سہواً رہ گیا۔ میری مراد مرزا حیرت دہلوی اور ان کے اخبار "کرزن گزٹ" سے ہے۔

مرزا حیرت مرحوم کی مدبرانہ شخصیت اپنی بہت سی خصوصیات کے اعتبار سے ظفر علی خاں کی شخصیت سے ملتی جُلتی ہے۔ حیرت کے اندازِ نگارش میں تخریبی زور و جوش بے پایاں ہے۔ مرزا غالب کی طرح وہ بھی

"نمی رویم براہے کہ کارواں رفت است"

کے اصول پر سختی سے کاربند ہے۔ اور شخصیت کے پرستاروں کے لئے خدائی فوجدار بنا رہتا ہے۔ متوسط درجے کا عالم ہے مگر اظہارِ علمیت کے غیر محدود طریقوں سے آگاہ ہے۔ جدید تعلیم یافتہ جن کے دماغ عموماً علم راسخ سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ اس کی تحریریں پڑھ کر اسے ڈاکٹر نذیر احمد اور علامہ شبلی کا ہم پایہ خیال کریں گے۔ دلّی کی چٹخارے دار زبان میں جب مسلمات عامہ یا مقبول انام شخصیتوں کے خلاف کچھ لکھنے بیٹھتا ہے

قارئین کو کشاں کشاں اپنے ساتھ لے چلنے کی قدرت کا اظہار کرتا ہے۔

جب پبلک میں کوئی تحریک پیش کرتا ہے تو لوگوں کے دماغوں کو کچھ سوچنے سمجھنے کی مہلت نہیں دیتا وہ اس کے پیش کردہ جبر بے اختیار کو رضاکارانہ طور پر اپنے اوپر مسلط کر لیتے ہیں۔

بوڑھا ہے مگر جواں ہمت و جواں کار، دشمنوں کی جماعت قاہرہ کو بے اندیشۂ انجام للکارتا ہے۔

پبلشنگ کمپنی کے قیام کی اسکیم کا اعلان کرتا ہے تو اس کے ساحرانہ جال میں ہزاروں معصوم بے اختیارانہ انداز میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور لاکھوں روپیہ اس کے قدموں پر ڈال دیتے ہیں۔

حکیم اجمل خاں مرحوم لیڈر بننے سے پہلے بھی دہلی کے عوام و خاص میں حد درجہ محبوب تھے۔ حکومت کی طاقت بھی ان کے جلو میں تھی مگر مرزا حیرت نے جب ان کے خلاف معاندانہ ہنگامے برپا کئے ہیں تو اس طغیان بے پناہ کی وہ بھی تاب نہ لا سکے۔

اس کے خلاف ان کی خلوتوں میں جو تدابیر زیر غور ہوتی تھیں عالم خدا جانے کس کرامت کا مالک تھا کہ اُن پردہ در پردہ خلوتی مشوروں اور تجویزوں کو دوسرے دن لفظاً بہ لفظاً اپنے اخبار میں شائع کر دیتا تھا۔

شیعہ اخباروں سے جنگ چھیڑی تو اُن کے لئے زندگی اجیرن کر دی جوشِ مخالفت میں سیدنا امام حسین علیہ السلام کے حادثۂ شہادت اور واقعہ کربلا ہی کا سرے سے منکر ہو گیا۔

واقعات کربلا و شہادت حسینؓ کے انکار پر ایک ضخیم کتاب "کتاب الشہادۃ" کے نام سے شائع کرنے کا اعلان کیا اور چار ہزار صفحے کا ایک مقدمہ بطور تمہید کتاب لکھ ڈالا۔

شیعہ پرچے کرزن گزٹ کے سامنے پانی بھرنے لگے اور آخر کار گالیوں پر اُتر آئے۔

جب پبلشنگ کمپنی لُٹ گئی تو حکیم اجمل خاں صاحب کے حامیوں نے "دہلی پنچ" کے نام سے ایک اخبار جاری کیا۔ اور کمپنی کے حصہ داروں کو مرزا حیرت کی مفروضہ خیانتوں کے خلاف منظم کر کے عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔ اس مقدمے میں میرزا صاحب مرحوم کو تین سال کی سزا اور ایک ہزار روپیہ جرمانہ ہوا۔ مگر خوش قسمتی سے عدالت عالیہ نے عدالت ماتحت کے فیصلے سے اختلاف کرتے ہوئے انہیں بری کر دیا۔ مرزا حیرت نے عدالت سے رستگاری پائی تو اپنے حریفوں کو اسی طنطنے سے پھر للکارا۔ حریفوں کے حوصلے پست ہو چکے تھے۔ میدان سے عزت نداراً پسپائی پر مجبور ہو گئے۔

حکیم صاحب مرحوم اپنی ہمہ گیر طاقتوں کے باوجود مرزا حیرت کے بے پناہ تعاقب سے پریشان ہی رہے۔

حیرت اپنے وقت کا بہت کمال اخبار نویس تھا۔ اُس کی کوثر سے دھلی ہوئی زبان۔ اُس کا دلفریب اندازِ بیان، اُس کی ستم ظریفانہ طنزیات اُس کی زُود نگاری، بسیار نگاری، اُس کی ادبی موشگافیاں ان امتیازات نے میرزا حیرت کو حلیفوں اور حریفوں سب کے لئے مرکز حیرت بنا دیا تھا۔

(رباقی باقی)

تاجور

محسوسات

دماغ و دل پر لطیف سی بیخودی نشہ بن کے چھا رہی ہے
نہ چھیڑ اس وقت مجھ کو ہمدم کسی کی آواز آ رہی ہے

کہاں کی شبنم، کہاں کے موتی، جو مجھ سے پوچھے کوئی تو فطرت
زمین والوں کی پستیوں پر فلک سے آنسو بہا رہی ہے

ترانۂ غم نہ چھیڑ بلبل یہاں کوئی ہمنفس نہیں ہے
یہاں تو بیگانگی ہے اتنی کہ ہر کلی مسکرا رہی ہے

یہ داغِ لالہ نہیں ہے داغِ جگر کسی بدنصیب کا ہے
کسی کے خونِ جگر کی سُرخی ہے گُل میں جو جھلملا رہی ہے

اثر نہیں ہے تو ایک دل پر انہی کے کوئی اثر نہیں ہے
وگرنہ رودادِ غم مری موم پتھروں کو بنا رہی ہے

وہ دیکھئے آسمان پر چاند بدلیوں سے نکل رہا ہے
کوئی حسینہ رخِ حسیں سے سیاہ زلفیں ہٹا رہی ہے

گوپال متل

تلاش

وہ مصور تھا، اُسے ایک معصوم کی تلاش تھی، اس کی تلاش میں وہ سرسبز وادیوں اور بے آب و گیاہ میدانوں میں گھومتا رہا، اُس نے بڑے بڑے شہروں، چھوٹے چھوٹے قصبوں اور دُور دُور اُکّے دُکّے گاؤں میں اُس کی تلاش کی لیکن اُسے نہ پا سکا۔ ایک دفعہ ایک کھیت کے قریب سے گزرتے ہوئے اُس نے ایک گلاب کے حسین پھول کو دیکھا، کہ باڑھ سے باہر جھکی ہوئی شاخ پر بیٹھا ہوا اُس کی طرف دیکھ دیکھ کر ہنس رہا تھا، لیکن بیشتر اس کے کہ مصور اُس کی ایک پتی کا ہلکا سا نقش ہی اُتار سکتا، ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا آیا اور گلاب کی نازک پتیاں اٹھلاتی ہوئی ہوا کے دوش پر بکھر گئیں۔

ایک دفعہ جھیل کی نیلی خاموش سطح پر اُس نے کنول کے نو زائیدہ پھول کو دیکھا، کہ سر جھکائے پانی میں اپنا چہرہ دیکھ رہا ہے خوبصورت نازک، زرد اور سپید اور برف کی طرح پاک و صاف، مصور نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اپنا رنگوں والا ڈبا کھولا، یکا یک جھیل کی خاموش سطح پر چھوٹی چھوٹی لہریں اٹھیں، اور کنول کے پھول کی طرف بڑھتی گئیں۔ انہوں نے اُسے اپنی آغوش میں لے لیا اور پھر موت کے دلکش راگ گاتی ہوئیں آگے بڑھ گئیں۔

کبھی کبھی "اوں اوں" کرتے ہوئے کنویں کے قریب گزرتے ہوئے مصور کو گمان ہوتا، کہ اُس نے پانی بھرتی ہوئی حسینہ کی آنکھوں میں اُسے دیکھ لیا ہے۔ وہ آہستہ سے اپنی متجسس نگاہیں حسینہ کے چہرے کی طرف پھیر دیتا اور عین اُس وقت کہ جب پیتل کی گاگر میں پانی رقص کرتا ہوا باہر چھلک پڑتا حسینہ مصور کی طرف دیکھ کر مسکرا پڑتی، ایسی مسکراہٹ جو گویا مصور کو کہہ رہی تھی "میں تجھے صدیوں سے جانتی پہچانتی ہوں۔" اور کبھی ایسا بھی ہوا کہ کسی بڑے شہر میں چلتے چلتے مصور نے سڑک کے کنارے ایک خوبصورت بچے کو کھیلتے ہوئے دیکھا، اور ٹھٹھک گیا اور اُس نے بچے کو پیار سے بلایا۔

شریر بچے نے مصور کی طرف ایک پتھر کا ٹکڑا کھینچ مارا اور پھر اپنی شرارت پر خود ہی ہنسنے لگا۔

مصور کا دل پریشان ہو گیا، لیکن اُس نے اپنی تلاش کو جاری رکھا۔

وہ ایک وحشی ہرنی کی طرح وحشی تھی اور آسمان پر اُڑتی ہوئی ابابیل کی طرح نغمہ ریز، وہ ہر روز جنگل میں اپنا ریوڑ چرانے جاتی تھی، وہ جنگل میں ایک چٹان پر جو سبز سبز کائی سے ڈھکی ہوئی تھی، بیٹھ جاتی ...... گہرے سیاہ اور ریشم کی تاروں کی طرح نرم و نازک بال اپنے شانوں پر بکھیر دیتی اور بھیڑ بکریوں کے ننھے ننھے بچوں سے کھیلتی رہتی جنگل کے گھنے سایوں میں کہیں کہیں سورج کی کرنیں جھلملاتی رہتی تھیں اور کہیں کہیں دھوپ کے بڑے بڑے ہالوں میں چیڑ کے نکیلے جھومر کسی نامعلوم مسرت کے زیر اثر تھرتھراتے رہتے تھے، کبھی مشرقی ہواؤں کے لطیف جھونکے اپنی محبوبہ کو میں بیٹھ کر دلکش گیت سناتے تھے اور کبھی ایک گیت سناتے سناتے ختم جاتے، کیونکہ اب وہ چٹان پر بیٹھی ہوئی گا رہی تھی، وہ مسرت زا نغمے ننھے بھیڑ کے بچوں اور بکروٹوں کے لئے میٹھی میٹھی لوریاں تھے، لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا کہ گیت سنتے سنتے ہوا تھم جاتی۔ پھول غنودگی میں آ کر اونگھ اونگھ جاتے اور سارا جنگل کسی نامعلوم سپنے میں کھو جاتا۔

ایک دن دوپہر کے وقت مصور کا گزر اُس جنگل سے ہوا۔ وہ چٹان پر بیٹھی تھی اور اپنی گود میں ایک بھیڑ کے بچے کو لئے ہوئے اُس سے کھیل رہی تھی، وہ کبھی اُسے دُور اوپر ہوا میں پھینک دیتی اور پھر بانہیں پھیلا کر مسکراتے ہوئے بچے کو اپنی آغوش میں لے لیتی اور اُسے زور سے اپنی چھاتی سے لگا لیتی اور کھلکھلا کر ہنس پڑتی۔

مصور نے لڑکی کو دیکھا اور ٹھہر گیا، اور بہت دیر تک اُسے دیکھتا رہا۔

پھر کہنے لگا "ادھر ـــــــ میرے قریب آ کر بیٹھ جاؤ۔ میں تمہارے لئے ایک نہایت خوبصورت تصویر بناؤں گا۔"

وحشی لڑکی نے حیران نگاہوں سے مصور کی طرف دیکھا، پھر اُس نے ایک خفیف سی جنبش کے ساتھ سر کو جھٹک دیا۔ اور مصور کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔

دن گزرتے گئے۔ مصور بہت خوش تھا، تصویر آدھی سے زیادہ مکمل ہو چکی تھی۔ چند دنوں میں وہ اسے مکمل کر لے گا، اور پھر مصوری دنیا میں اس لافانی شاہکار کو پیش کر کے شہرت دوام حاصل کر لے گا۔

اور گاؤں میں لڑکی ناچ ناچ کر اپنی سہیلیوں سے کہتی "وہ میرے لئے ایک تصویر بنا رہا ہے۔ ایک نہایت اچھی، خوبصورت تصویر۔ آہا ہا کتنی اچھی تصویر ہو گی"۔ اور پھر وہ باہیں پھیلا کر اپنے ناچتے ہوئے قدموں پر گھوم گھوم جاتی۔ "آہاہا آہاہا"، اس پر گاؤں کی بڑی بوڑھی عورتیں ایک معنی خیز انداز میں مسکرا دیتیں اور نوجوان چرواہے کنکھیوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر چپ ہو رہتے۔

ایک دن جب وہ صبح کے وقت ریوڑ کو گلے سے باہر نکال رہی تھی۔ ایک نوجوان چرواہے نے اس سے پوچھا "کیا تمہیں پتہ ہے۔ لیلےٰ، کہ وہ تمہاری ہی تصویر بنا رہا ہے؟ کیا تمہیں پتہ نہیں؟

نہیں تو —— لیکن اگر تم چاہو تو میں اس سے پوچھ سکتی ہوں۔

لیکن چرواہے نے پھر سوال کیا "اور کیا تمہیں یہ پتہ بھی نہیں کہ وہ تمہاری تصویر کیوں بنا رہا ہے"؟

نہیں —— لیکن اس نے مجھ سے کہا ہے کہ وہ تصویر بنا کر مجھے دے دیگا۔ ... کیوں ... کیا بات ہے؟"

نوجوان چرواہا ہنستے ہنستے دہرا ہو گیا۔ آہ .... اوہ ...... اوہ ... تمہیں یہ بھی پتہ نہیں کہ وہ تمہاری ہی تصویر ہے .... اوہ ..... بیوقوف معصوم لڑکی .... اوہو .... اوہو ہو .... تم کسقدر بھولی بھالی ہو، اور تم یہ بھی نہیں جانتی کہ وہ تمہاری تصویر کیوں بنا رہا ہے؟ کیوں؟ اوہو ہو!

لڑکی پریشان ہو گئی اور آج اپنی عمر میں پہلی مرتبہ وہ کسی دوسرے آدمی کو ہنستے دیکھ کر خود نہ ہنسی۔ پھر ریوڑ کو لے کر وہ آہستہ آہستہ جنگل کی طرف چلی گئی۔

مصور نے اس کی طرف دیکھ کر رک رک کر کہا۔ تم آج دیر سے آئی ہو۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ کچھ سوچ بھی رہی ہو۔

ہاں، مجھے آج دیر ہی ہو گئی۔ لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ مصور کی موجودگی میں ہمیشہ خوشی محسوس کیا کرتی تھی۔ راستے میں مجھے حسن ملا تھا، اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا وہ تمہاری ہی تصویر بنا رہا ہے، میں نے جواب دیا۔ مجھے پتہ نہیں۔ کیا یہ میری تصویر ہے؟ کیا میں اس تصویر میں ہوں؟

ہاں، لیکن تم ایسا کیوں پوچھتی ہو؟

اوہ —— یونہی —— لیکن میں صرف یہ جاننا چاہتی ہوں، کہ تم میری تصویر کیوں بنا رہے ہو؟

مصور بے چین ہو گیا، اس نے لیلےٰ کی طرف دیکھا اور پھر چپ ہو رہا۔ اس نے محسوس کیا کہ آج اس کے ہاتھ تصویر پر جمتے ہی نہ تھے!

شام کے بڑھتے ہوئے سایوں میں، گاؤں جاتے ہوئے راستے میں اسے حسن مل گیا۔

"کیا تم نے اس سے پوچھا تھا؟"

"ہاں .... اس نے کہا وہ میری ہی تصویر تھی۔"

"لیکن ..... کیوں؟"

"اس نے اور کچھ نہیں کہا"

آہ، میں جانتا ہوں، میں جانتا ہوں" حسن نے لیلےٰ کا ہاتھ پکڑ کر کہا "اسے تم سے محبت ہے، لیلےٰ، اسے تم سے محبت ہے۔ تم بہت حسین ہو، لیلےٰ، کیا تم نہیں جانتی ہو کہ تم کسقدر حسین ہو؟ مجھے تم سے بے انداز محبت ہے۔ میری معصوم لیلےٰ، محبت! کیا تمہیں پتہ ہے کہ محبت کسے کہتے ہیں؟"

جیسے لیلےٰ کی روح کا ذرہ ذرہ صدیوں کی نیند سے جاگ اٹھا، کوئی اس کے دل کے دروازے پر زور زور سے کھٹکھٹا رہا تھا اور چلا چلا کر کہہ رہا تھا، اٹھ بھکارن، دروازہ کھول دے۔ کہ یہ معبد تیرے بغیر سونا پڑا ہے۔ کوئی اس کی آنکھوں کے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

یکایک اس کی آنکھوں میں آنسو ابھر آئے، اور پھر اسے ایسا معلوم ہوا گویا معبد کے دروازے کھل گئے اور لاکھوں کروڑوں پجاری سمندر کی لہروں کی طرح ہچکولے لیتے ہوئے اندر داخل ہو گئے، طوفان، بادل کی گرج بجلی کے چمکتے ہوئے تیز دھارے اور لاکھوں گھنٹیوں کا پرشور آواز، لیلےٰ یکلخت ڈر گئی، ایک عجیب خوف و ہراس سے اس کا سارا بدن کانپنے لگا۔

اس نے تیزی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور بھاگ گئی۔

رات کو بستر پر لیٹے لیٹے اس کی آنکھوں میں آنسو بار بار آئے۔ لیکن نیند ایک دفعہ بھی نہیں۔

دوسرے دن صبح اٹھ کر وہ جھیل کے کنارے گئی اور دیر تک اپنا چہرہ دیکھتی رہی۔ پھر اس نے اپنے بالوں کو دیر تک سنوارا اور دیر تک

اپنی نرم نرم اور سونے کی طرح حسین باہوں کو صاف کرتی رہی۔ جب وہ جھیل کے کنارے سے اُٹھی، تو اُس نے اپنی باہیں پھیلا دیں اور ایک انگڑائی لے کر ہنسی، ایک عجیب ہنسی، صبح کی پہلی کرنوں میں اس کے دانت موتیوں کی طرح چمک اُٹھے۔

جنگل کی طرف جاتے ہوئے راستے میں اُس نے بنفشہ کے پھولوں کا ایک گچھا دیکھا، اُس نے اُسے توڑ کر اپنے بالوں میں لٹکا لیا، اب اُس کی نگاہوں میں ایک نئی چمک تھی اور لبوں پر ایک نئی مسکراہٹ۔

جب مصوّر نے اُسے دیکھا تو حیران رہ گیا۔ اُس نے متوحش اور دردناک لہجہ میں اُس سے کہا، "تم اُسے کہاں چھوڑ آئیں؟"

لیکن لڑکی کچھ نہ سمجھی۔

مصوّر اپنی جگہ سے اُٹھ کر لڑکی کے قریب گیا اور اس کے شانے زور سے ہلا کر کہنے لگا۔ آہ، یہ تم نے کیا کر دیا، تم نے اُسے کہاں چھوڑ دیا؟

لڑکی کچھ نہ سمجھی، لیکن مسکرا دی۔

مصوّر گلوگیر لہجہ میں چلایا، وہ کہاں ہے؟ سچ بتاؤ وہ کہاں ہے؟ میری لیلےٰ ...... کمبخت لڑکی! .....

پھر یکلخت مصوّر نے اس کے شانے چھوڑ دیئے، اُس نے حزیں اور شاید خشمگیں نگاہوں سے لڑکی کی نامکمل تصویر کی طرف دیکھا، آہستہ سے اس نے اپنا ہاتھ اُس کی طرف بڑھایا اور اسے چوکھٹے سے باہر کھینچ لیا۔ اور پھر اُس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ آہستہ سے اُس نے چوکھٹے کو تہہ کیا، رنگوں اور برشوں کے ڈبے کو سنبھالا۔ اور لڑکی کی طرف ایک نگاہ ڈالے بغیر مغرب کی طرف مُڑ گیا۔ وہ آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔

چند لمحے گزر گئے، لڑکی سہمی ہوئی بیٹھی رہی۔ پھر یکایک رونے لگی اور روتے روتے ہاتھ پھیلا کر کہنے لگی۔ "مت جاؤ، آہ! - اجنبی مصوّر مت جاؤ! .....

لیکن مصوّر نے ایک مرتبہ بھی پیچھے مُڑ کر نہ دیکھا، وہ آہستہ آہستہ سر جھکائے ہوئے جنگل کی مغربی سمت جا رہا تھا۔

لڑکی پریشان نگاہوں سے کبھی آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہوئے مصوّر کی طرف، کبھی اپنی نامکمل تصویر کے ٹکڑوں کی طرف دیکھ لیتی تھی۔ لیکن وہ کچھ نہ سمجھ سکی۔

ہوا چیڑھ کے نکیلے پتوں میں گزرتی ہوئی سسکیاں بھر رہی تھی۔ کہیں دُور جنگل میں کوئی بھیڑ کا بچھڑا ہوا بچہ چلّا رہا تھا۔ بنفشے کے پھولوں کا گچھا لیلےٰ کے پاؤں میں گر گیا تھا۔

✣ ✣ ✣ ✣

کرشن چندر ایم - اے

آثارِ قدیمہ

قنوج

قدیم آثار کے اعتبار سے قنوج کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ سنسکرت کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ تقریباً ساتویں صدی مسیحی تک قنوج سنسکرت علوم و فنون کا مرکز تھا۔

قنوج قدیم ترین ایام سے فرمانروایان وقت کا مرکز حکومت و ریاست رہا ہے۔ شمالی ہندوستان کے متعدد راجاؤں نے اسی شہر کو اپنا دارالحکومت قرار دیا تھا۔ جن میں گادھ، وین، ہرش اور جے چند خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔

جے چند کے بعد قنوج کی حکومت و اقبال کا آفتاب تو ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ لیکن کاروباری حیثیت سے اب بھی اس کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ یہاں روزانہ منوں عطر تیل اور عرق تیار ہوتا ہے اور دور دور ممالک کو جاتا ہے۔ ان چیزوں کو تیار کرنے والی تقریباً چار سو فیکٹریاں یہاں موجود ہیں اور یہاں کے بازار میں یا تو عطر و تیل اور عرق کی دکانیں ہیں یا ان سے تعلق رکھنے والی اشیاء شیشی، کنٹر، عطر دان وغیرہ کی۔

یوں تو قنوج میں عطر اور تیل کے کئی سو کارخانے ہیں۔ لیکن بارہ فیکٹریاں ایسی ہیں جو یورپ اور امریکہ تک مشہور ہیں اور انہیں ہندوستان کے گورنروں، نوابوں، راجاؤں کے علاوہ انگلستان، جرمنی فرانس اور امریکہ سے تعریفی تمغے اور اسناد حاصل ہیں۔

یہاں صندل کا ایک کارخانہ ہے۔ جس کا تیار کیا ہوا مال ہندوستان بھر میں اور ہندوستان کے باہر تک جاتا ہے۔ چار پانچ سال قبل اس کارخانے میں پرانے ڈھنگ سے "زمین صندل" اور "تیل صندل" تیار کئے جاتے تھے لیکن جب سے ریاست میسور نے صندل فیکٹری قائم کی ہے مقابلے کی غرض سے اس کارخانے کو بھی معقول ترقی دی گئی ہے اور اب تمام کام جدید اصولوں پر مشین کے ذریعہ انجام دیئے جاتے ہیں۔ اس کارخانے میں ایک سو چھتر ٹن صندل کی لکڑی مالابار، کرگ، ٹراونکور، وغیرہ سے منگائی جاتی ہے۔ اور اس سے تقریباً ۲۰ - ۲۵ ہزار پونڈ صندل تیار کر کے قنوج کی فیکٹریوں اور غیر ملکوں کو بھیجا جاتا ہے۔ اس مل کے مالک پنڈت سورج پرشاد ہیں جو اپنے کاروبار کے سلسلے میں کئی بار یورپ کا سفر کر چکے ہیں۔

قنوج کے قدیم آثار زیادہ تر شہر کی مشرقی جانب ہیں۔ قنوج سے کوئی پانچ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں دائی پور ہے۔ اسی مقام پر شیر شاہ سوری نے ہمایوں کو شکست دی تھی۔ اور یادگار فتح کے طور پر شیر گڑھ کے نام سے ایک قلعہ تعمیر کرایا تھا۔ جس کے ساتھ ایک مسجد بھی بنوائی تھی۔ وہ مسجد اب تک باقی ہے۔ لیکن قلعہ پیوند زمین ہو چکا ہے۔

دائی پور سے تین میل کے فاصلے پر "رجگیری" کا ٹیلہ ہے۔ یہاں راجہ جے چند کا محل تھا۔ مہوبے کے نامور بہادر "الھا اودل" جن کی شمشیر زنی اور معرکہ آرائی کے گیت مرزا پور، بنارس اور اطراف و جوار کے علاقوں میں گائے جاتے ہیں۔ راجہ جے چند کے ہاں ملازم ہوئے تو اسی محل میں انہیں رہنے کو جگہ دی گئی تھی۔ ٹیلے کے اوپر املی کا ایک درخت ہے جس کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ اودل کے ہاتھ کا لگایا ہوا ہے۔ اسی ٹیلے کے نیچے شمال کی جانب پیپل کا ایک درخت ہے۔ اس کی نسبت مشہور ہے کہ راجہ جے چند اٹاوے میں غوری کی فوج سے شکست یاب ہونے کے بعد اسی درخت سے گنگا میں کود پڑا تھا۔ اب یہاں سے گنگا دو میل ہٹ گیا ہے۔ لیکن اس زمانے میں اسی جگہ بہتا تھا۔ اب یہ جگہ کالی ندی کی ترائی بن گئی ہے۔

اسی پیپل کے پاس ایک نالہ ہے جس سے دو تین سال قبل کچھ ٹوٹی پھوٹی مورتیں نکلی تھیں۔ ان میں درگا کی مورت نہایت خوبصورت اور فن کے اعتبار سے قابلِ دید ہے۔ "ہرجگیری" میں ایک چبوترے پر کوئی بیس گاڑی ٹوٹی پھوٹی مورتیں پڑی ہیں جو سنگ تراشی کا بہترین نمونہ ہیں۔ یہ تمام مورتیں وقتاً بوقتاً اسی ٹیلے سے برآمد ہوئی ہیں۔ ان مورتوں میں شیو اور وشنو کی مورتیں ایسی ہیں جن میں سے بعض کے چار ہاتھ ہیں اور بعض کے آٹھ۔

یہاں سے مغرب کی جانب آم کے ایک باغ میں مٹی کے ایک چبوترے پر ایک قابلِ دید مورت ہے۔ یہ مورت گنیش کی ہے اور کالے چمکدار پتھر سے بنائی گئی ہے۔ اس مورت کے دس ہاتھ ہیں، اور

اس کو رقص کی حالت میں دکھایا گیا ہے۔ اس مورت کے نیچے ایک قطار میں آٹھ اور دوسری قطار میں دس عورتیں انواع و اقسام کے ساز اور باجے بجاتے دکھائی گئی ہیں۔ سامنے "شنکر" کی مورت ہے جو "اوما" کے زانو پر بیٹھے ہوئے "گنیش" کی طرف اشارہ کر رہے ہیں اور مسکرا رہے ہیں "اوما" بھی ٹکٹکی باندھے گنیش کی طرف دیکھ رہی ہیں اور مسکرا رہی ہیں۔ "شیو" کے بیل اور "دیوی" کے شیر کو بھی نہایت موزونیت سے دکھلایا گیا ہے۔ اس مورت میں اتنی زندگی اور کشش ہے کہ دیکھنے والے اسے دیکھنے میں کچھ دیر کے لئے اپنے کو بھول جاتے ہیں۔

رنگ محل سے چار سو گز کے فاصلے پر ایک دیرینہ سال پختہ کنواں ہے جس کو لوگ "بلوامن کا سنگم" کہتے ہیں۔ اس کی قطار میں اکیاون کنوئیں اور بھی ہیں جن میں سے دو چار کے سوا باقی سب پٹ گئے ہیں۔ راجہ لوگ اس کنوئیں کو بہت مبارک سمجھتے ہیں اور اس کی اینٹ منگا کر اپنے خزانے میں رکھتے ہیں۔

اس کنوئیں کے نیچے ایک برساتی نالہ ہے۔ نالے کے پار ایک ٹیلا ہے۔ جسے "الو کالا" کہتے ہیں، یہاں کسی زمانے میں ایک شاندار محل تھا۔ جس کے ادھر ادھر بکھرے ہوئے پتھر اب بھی محل کی شوکت و عظمت کی کہانی سنا رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ یہ محل فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ اور اس کے بام و در پر کبھی اوج و اقبال کا آفتاب ضیا پاشی کیا کرتا تھا۔ اس مقام پر ایک خوبصورت مسجد بھی ہے۔ یہ جگہ قنوج سے دو میل کی دوری پر مغرب کی طرف ہے۔

اگر آپ مشرقی سمت سے قنوج میں داخل ہوں تو سب سے پہلے آپ کو ایک عظیم الشان عمارت ملے گی۔ جو ایک بلند ترین مقام پر بنی ہوئی ہے۔ اس عمارت کو "مخدوم جہانیاں" کہتے ہیں، اس عمارت کی جنوبی سمت تین دروازے ہیں۔ جن کی سنگتراشی قابل دید ہے۔ بیرونی دیوار دہلی کے لال قلعہ کی وضع کی برج نما ہے۔ بہلول لودھی کے عہد میں حضرت شیخ مخدوم جلال الدین ایک خدا رسیدہ بزرگ تھے جو ہمیشہ سیر و سیاحت میں رہتے تھے اور پیادہ پا سفر کرتے تھے۔ اسی سے بادشاہ نے ان کو "مخدوم جہانیانِ جہاں گشت" کا خطاب دیا تھا۔ یہ عمارت حضرت مخدوم رحمتہ اللہ علیہ کی خوابگاہ ہے اور خوبصورتی اور شان و شوکت میں ہمایوں کے مقبرے (واقع دہلی) کے مقابلے کی ہے۔

"مخدوم جہاں" کے پچھم گنگا کے قدیم گھاٹ کے کنارے راجہ جے چندر کا قلعہ زمین بوس ہو رہا ہے۔ سنہ ۱۲۴۰ء فصلی تک اس قلعہ کا کچھ حصہ کھڑا تھا اور اس میں سرکاری تحصیل کی کچہری ہوتی تھی۔ اسی سال تحصیل کے لئے جدید عمارت تعمیر ہوئی اور قلعہ چھ سو روپے میں نیلام کر دیا گیا۔

زمانے کا انقلاب دیکھئے، کہاں قنوج کے راجہ جے چند کا قلعہ اور کہاں چھ سو روپیہ۔ جو چند ٹوٹے پھوٹے مکان قلعہ کی یادگار رہ گئے تھے۔ قلعہ کے جدید مالک نے ان کو بھی گرا دیا اور اس کے اینٹ پتھر فروخت کر ڈالے۔ اب قلعہ کی جگہ مٹی کا تودہ باقی رہ گیا ہے، لیکن تلاش کرنے والوں کو مٹی کے اس تودے سے بھی ہزاروں لاکھوں روپے کی رقم مل چکی ہے

اس دیار کے لوگوں کا عام خیال ہے کہ اگر کوئی محتاج صبح سے شام تک اس ٹیلے پر چل پھر کر تلاش کرتا رہے تو اسے کھانے کے لئے ضرور کچھ مل جائے گا۔ سنہ ۱۸۳۲ء میں ایک مسلمان کو جس کا نام خورشید علی تھا سونے کی ۲۲ اینٹیں ملی تھیں۔ جن میں سے ہر اینٹ تقریباً پچاس تولے کی تھی۔ ان اینٹوں کا ایک ایک کونہ ٹوٹا ہوا تھا اور قدیم خط میں ان پر "گادھ" لکھا ہوا تھا۔ "گادھ" ہندو قوم کے مشہور منی "وشومتر" کے باپ کا نام تھا۔ ۲۲ اینٹوں میں سات اینٹیں حکومت کے خزانے میں داخل ہو گئیں اور باقی پانے والی کو ملیں۔

سنہ ۱۸۲۳ء میں ایک کسان کو کھیت میں کام کرتے ہوئے جواہرات کی ایک مالا ملی تھی۔ سونے کے دس دس تولے کے ٹکڑے لوگوں کو اکثر مل چکے ہیں۔ ایک ہزار سے زیادہ کی مالیت کے سکے یہاں کے بعض آثار قدیمہ سے دلچسپی رکھنے والوں کے پاس موجود ہیں۔ ان میں سے سونے کے سکے سکندر اور مورج راجاؤں کے عہد کے ہیں اور چاندی کے سکے ہرش بردھن، بھوج، گپت اور مسلمان سلاطین کے زمانے کے ہیں۔ دہلی اور جون پور کے بادشاہوں میں شاید ہی کوئی بادشاہ ہو جس کے سکے ان سکوں میں نہ ہوں۔ ان میں ایسے سکے بھی ہیں جو نہ لنڈن کے "انڈیا ہاؤس" میں ہیں۔ اور نہ ہندوستان کے کسی "میوزیم" میں، ماہرین آثار قدیمہ ان سکوں کے ذریعہ تاریخ ہند کے بہت سے گمنام صفحات کا پتہ لگا سکتے ہیں۔

یہاں تانبے اور پتھر کے کتبے بھی درجنوں کی تعداد میں دستیاب ہو چکے ہیں۔ جن کا تذکرہ ڈاکٹر رام شنکر ترپاٹھی نے "ہسٹری آف قنوج" میں کیا ہے۔ اس ٹیلے پر کاشت خوب ہوتی ہے اور کھیتی کی در چالیس روپے بیگھے تک ہے۔

قلعہ پر پختہ سرنگ کے دو دروازے اب تک موجود ہیں۔ عام

قیاس ہے کہ یہ وہی سرنگ ہے جو کمپلا سے بنارس تک گئی ہے قلعہ کے شمال مشرقی گوشے پر "چھیم کلی" دیوی کا مندر ہے۔ یہ راجہ جے چندر کے راج محل کی دیوی تھی۔ "راسو" میں لکھا ہے کہ "سنیکتا" اسی دیوی کی پوجا کر کے پرتھوی راج کی محبت کا "بردان" مانگا کرتی تھی۔

قلعہ سے مغرب کی جانب اتنی ہی بلندی پر "بالا پیر" ہے۔ اس میں سنگ سرخ کے دو روضے ہیں۔ حضرت بالا پیر رحمتہ اللہ علیہ حضرت قاسم سلیمان قدس سرۃ العزیز کے فرزند تھے۔ جو چنار گڑھ ضلع مرزا پور میں آسودہ ہیں۔

روضے کے دروازے پر یہ کتبہ لگا ہوا ہے۔

"عنوانِ فیض بد تو لاش ؛ آدم کہ شد حبیب ہم اسم محمدی
کرد اختیار یوم احد ر احسا سفر ؛ تاریخ ختم یافت سخنتم محمدی
بعہد سلطنت ابوالمظفر شہاب الدین صاحبقران ثانی تعمیر یافت"

یہ عمارت ۱۰۵۷ھ میں بنا پذیر ہوئی تھی۔ اس کے پچھم میں ایک مسجد جامع ہے۔ جو شان و شوکت میں حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے روضے سے دوسرے نمبر پر ہے۔ اس مسجد میں ۵۶ ستون ہیں۔ اور پوری عمارت سنگ سفید کی ہے۔ یہ مسجد یکم ذی قعد ۱۰۷۹ھ میں تعمیر ہوئی۔ چنانچہ باب مسجد پر یہ تاریخ کندہ ہے :-

"شکر اللہ کہ بتوفیقِ خداوند کریم ؛ بوالمظفر شہ شاہانِ جہاں ابراہیم
ہمدم عیسیٰ ہم نام خلیل الرحمان ؛ نہ آنکہ بنمود جہاں را ید بیضا چو کلیم
مسجدے ساخت مرتب کہ بدیں رفعت و اوج ؛ چہ اساس ست معلّی چہ بنا است عظیم
سلخ ذیقعد سنِ ہفت صد و لہ ؛ سرفراز ہمہ زیر قدمش گشت مقیم"

اس مسجد کے مغرب میں "میر بنگالہ کی حویلی ہے" میر بنگالہ سے مراد میر شرف الدین ہیں جو سرفراز خاں کے رسالدار اور نواب علی وردی خاں کے مصاحب تھے۔ ایک زمانے میں یہ قنوج کے "چکلے دار" یعنی گورنر تھے۔ آئین اکبری میں قنوج کو "حویلی قنوج" لکھا ہے۔ اس لئے کہ جس شہر میں گورنر رہتا تھا اسے "حویلی" کہتے تھے۔ "سرائے میراں" انہی میر صاحب نے تعمیر کرائی تھی۔ "میر بنگالہ کی حویلی" کی صرف شمالی دیوار باقی ہے باقی ساری عمارت برباد ہو چکی ہے۔

قنوج کے شمالی محلوں میں کئی مقبرے اور مزارات ہیں جن میں حضرت میر سید محمد اور "چندن پیر" کے مقبرے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ حضرت میر صاحب قدس سرۃ العزیز غازی اورنگ زیب رحمتہ اللہ کے استاد تھے اور حضرت چندن پیر قدس سرۃ العزیز بابر کے پیر تھے۔ دونوں روضے عالیشان ہیں۔ اور سنگ سفید کے گنبد دار بنے ہوئے ہیں۔

حضرت میر صاحب کے روضے کے پاس ہی اجیپال کا مندر ہے۔ جو راجہ جے چندر کا بنوایا ہوا ہے۔ اس میں اجیپال دیو کی مورت ہے جو سرخ پتھر سے بنائی گئی ہے۔ اجیپال دیو جے چندر کے گرو تھے۔ ساون کے مہینے میں ہندو اس پر شربت بتاشے چڑھاتے ہیں۔

تین ٹوٹے پھوٹے بودھ مندروں کے سوا جو اب برہمنوں کے قبضہ میں ہیں بودھوں کے زمانے کی یہاں کوئی یادگار نہیں ہے۔

قنوج کے "گٹے" بہت مشہور ہیں اور چھ آنے سیر سے دو روپے سیر تک ملتے ہیں۔ یہ گٹے انگریزوں کو بھی پسند ہیں اور بڑے دن کے موقع پر بطور تحفہ ان کو ولایت بھیجتے ہیں۔ یہاں گٹے کی متعدد بڑی بڑی دکانیں ہیں

(اخذ و ترجمہ)

ابو محمد امام الدین
رامنگری

خط و کتابت کرتے وقت چٹ نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
ورنہ عدم تعمیل کی شکایت معاف۔

مینجر شاہکار لاہور

لکڑی کے چار کھونٹے

یہ تحریر جس کے الفاظ اس قدر سادہ مگر تذبذب آمیز اور عبارت ایک گونہ اہمیت لئے ہوئے تھی، میرے سامنے کی چھوٹی میز پر پڑی تھی۔

جیک!

پرانی دوستی کا واسطہ جلد چلے آؤ۔ میں تن تنہا ہوں۔ مفصل حالات یہاں پہنچنے پر معلوم ہوں گے۔

ایمس

گذشتہ تین ہفتوں کی مسلسل تگ و دو کے بعد میں نے ایک ایسے مقدمے کو کامیاب طریق سے ختم کیا جس نے پولیس اور شہر کے دو بہترین سراغ رسانوں کو دیر سے پریشان کر رکھا تھا۔ اس کے بعد میں نے سوچا کہ اب مجھے آرام کرنا چاہیئے۔ پس میں نے اپنا سامان دو سوٹ کیسوں میں بند کرایا اور خود ٹائم ٹیبل کی تلاش میں نکلا۔ ایمس ہولرائڈ سے ملے مجھے کئی سال ہو گئے تھے۔ درحقیقت ہم دونوں نے کالج سے ایک ساتھ میٹرک پاس کیا تھا اور اس کے بعد میں نے اُسے نہ دیکھا۔ اب اس کی اس موعودہ پُراسرار تفریح کا خیال کئے بغیر ہی میں اس تجسس میں تھا کہ وہ کیونکر زندگی بسر کر رہا ہے۔

اسی شام میں چیرنگ نام ایک قصبہ میں پہنچ گیا۔ جس کی آبادی تقریباً پندرہ سو تھی۔ ایمس کا گھر یہاں سے دس میل کے فاصلے پر تھا۔ میں ایک گاڑی بان کی طرف بڑھا اور پوچھا "کیا تم مجھے ہولرائڈ جاگیر میں لے چلو گے؟" اُس نے دونوں ہاتھ جوڑ لئے گویا وہ خاموشی سے دعا مانگ رہا تھا۔ پھر خفیف سا تھرتھرایا اور مجھے شبہ آمیز حیرت سے دیکھ کر بولا:

"میں نہیں جانتا تم وہاں کس لئے جانا چاہتے ہو۔ تعجب ہے۔ لیکن اگر تم ایک خداترس آدمی کی نصیحت مانو تو جہاں سے آئے ہو وہیں چلے جاؤ۔ اس جگہ کے متعلق چاروں طرف خوفناک واقعات کی خبریں پھیلی ہوئی ہیں۔ اور اس کے آس پاس کئی ایک سیاح ڈر اور خون نکل جانے کی وجہ سے اسقدر کمزور دیکھے گئے ہیں کہ گھٹنوں کے بل بھی مشکل سے چل سکتے تھے۔ آدمی ہے یا جانور۔ یہ مجھے معلوم نہیں۔ مگر وہاں ہے کوئی نہ کوئی ضرور اور میں ...... میں تو تمہیں سو ڈالر میں بھی وہاں نہ لے چلوں گا۔

یہ باتیں قطعاً حوصلہ افزا نہ تھیں۔ لیکن مجھ پر ایک توہم پرست بوڑھے گیّی کی باتوں کا مطلق اثر نہ ہوا۔ اور میں نے ایک ایسے گاڑی والے کی تلاش شروع کی جو اس قسم کی باتوں کا قائل نہ ہو اور مجھے منزل پر لے جانے کے عوض معقول زرِ کثیر حاصل کرنے کے لئے تیار ہو۔ لیکن جب ہر ایک نے وہی جواب دیا جو پہلے نے۔ تو مجھے بڑی خفت ہوئی۔ ان میں سے بعض لوگ تو جوش میں آکر ایک دوسرے کی ہی مخالفت شروع کر دی۔ بعض نے مجھے وحشیانہ نظروں سے دیکھا۔ اور اس طرح بھاگ گئے۔ گویا میں بھی کسی بھوت کا ساتھی تھا۔

لیکن اب میرا اشتیاق پورے طور پر بڑھ گیا تھا۔ اور میں نے پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ اس تمام واقعہ کو پوری طرح دیکھوں گا۔ خواہ اس میں میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ پس ان بیچارے گمراہ لوگوں پر حقارت سے آخری نظر ڈالتے ہوئے میں تیزی سے اس طرف چل نکلا۔ جو مجھے اشارے سے بتائی گئی تھی۔ مگر مشکل سے دو میل ہی چلا تھا کہ سوٹ کیسوں کا بوجھ ناقابل برداشت ہونے لگا۔ اور میرے قدم سست پڑ گئے۔

جب میں نے اس پرانے گھر کو پہلی مرتبہ دیکھا تو سورج درختوں کی چوٹیوں سے نیچے غروب ہو رہا تھا۔ اسے سوائے ایک متنفس کے باقی سب نے چھوڑ دیا تھا۔ اور زمانے اور عناصر کا اس پر پورا پورا اثر ہو چکا تھا۔ اس میں ایک کھڑکی بھی ایسی نہ تھی جس میں تمام کے تمام شیشے لگے ہوئے ہوں اور کھلیاں اس زور سے بند ہوتیں اور ایسی چرچراہٹ پیدا کرتی تھیں جو دلیر سے دلیر انسان کو بھی خوف زدہ کرنے کے لئے کافی تھی۔

اس سے تقریباً سو گز پیچھے میں نے خاکستری پتھر کی ایک چھوٹی سی عمارت دیکھی۔ جس کے چاروں طرف اُنہی پتھروں کے ٹکڑے پڑے تھے۔ اور تمام اس علاقے کی سبزی سے کسی قدر ڈھکے ہوئے تھے۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہ عمارت ایک مقبرہ کی تھی اور وہ جنہیں میں اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے ٹکڑے سمجھا تھا۔ دراصل قبروں کے پتھر تھے۔ بظاہر یہ کسی ایک کنبے کا قبرستان تھا۔ لیکن یہ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ بعض خاص ممبروں کو ایک مقبرے میں اور باقی سب کو حسب معمول زمین میں کیوں دفنایا گیا تھا۔

اتنا کچھ دیکھ لینے کے بعد میں نے اپنے قدم گھر کی طرف اٹھائے۔

کیونکہ میرا قطعی یہ ارادہ نہ تھا کہ میں ایک ایسی جگہ رات بسر کروں۔ جہاں سوائے مُردوں کے اور کوئی ساتھی نہ تھا۔ بلاشبہ میں نے محسوس کرنا شروع کیا کہ اُن سادہ لوح دیہاتی لوگوں نے مجھے مدد دینے سے بجا طور پر انکار کر دیا تھا۔ اور یہ کہ جب میں ساحل سمندر یا کسی دیہاتی کلب میں زندگی کا پورا پورا لطف اٹھا سکتا تھا میرے یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی۔ ان تمام امور کے متعلق ایک تذبذب آمیز اندیشہ مجھ پر غلبہ پانے لگا۔

اب سورج پورے طور پر نظر سے اوجھل ہو چکا تھا۔ اور ہلکے ہلکے اندھیرے میں یہ جگہ پہلے سے بھی زیادہ بھیانک منظر پیش کر رہی تھی۔ انتہائی جرأت کا ثبوت دیتے ہوئے میں نے برآمدے کی طرف قدم اُٹھایا اور اپنے سوٹ کیس ایک ایسی کرسی پر رکھے جو کثرت استعمال کے باعث بہت بُری حالت میں تھی۔ میں نے نہایت بیتابی سے دروازے کے گول دستے کو اپنی طرف کھینچا۔ گھر بھر سے ٹناٹن! ٹناٹن کی آوازیں آرہی تھیں۔ اور ان سے ایک ایک کمرے میں گونج پیدا ہو رہی تھی۔ یہانتک کہ تمام عمارت ایک مجسم گونج بن گئی۔ پھر سراسر خاموشی چھاگئی۔ اور جھلملیوں کی چرچراہٹ اور ہوا کی سائیں سائیں کے سوا اور کوئی آواز نہ آئی۔ چند منٹ گزرنے پر کسی کے قدموں کی چاپ دروازے کے قریب تر ہوتی ہوئی سنائی دی۔ دوسرے ہی لمحے دروازہ نہایت احتیاط سے چند انچ کھلا اور کسی کا اندھیرے میں لپٹا ہوا سر مجھے غور سے جانچنے لگا۔ پھر دروازہ ایک دم کھل گیا۔ اور ایمسن جو اسقدر بدل گیا تھا کہ میں اسے پہچان نہ سکا۔ تیزی سے میری طرف آیا اور اپنے بازو میرے گلے میں ڈال کر بار بار میرے آنے کا شکریہ ادا کرنے لگا۔ یہانتک کہ میں نے سوچا کہ یہ دیوانہ ہو گیا ہے۔ پس میں نے اس سے سنبھلنے کے لئے التجا کی اور اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ اس نے مجوبانہ انداز سے معافی چاہی اور مجھے ساتھ لئے کشادہ ہال میں سے چلا۔ وہ ڈر بیٹھک میں آگ خوشنما انداز سے جل رہی تھی۔ لیکن اسقدر طویل سفر کے بعد بھوک کے مارے جان نکلی جا رہی تھی۔ پس آگ کے سامنے بیٹھنے سے پہلے میں نے خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور پھر ایمسن کی طرف منہ کر کے اس کی داستان سننے کے لئے ہمہ تن گوش ہو بیٹھا۔

جیک! اس نے کہنا شروع کیا۔ میں ابتدا سے لوں گا اور کوشش کروں گا کہ واقعات کو ان کی مناسب ترتیب کے لحاظ سے پیش کروں۔ پانچ سال گزرے میرا کنبہ پانچ افراد پر مشتمل تھا۔ میرے دادا، والد صاحب، دو بھائی اور میں جو کنبے میں سب سے چھوٹا تھا۔ امّاں جان تمہیں معلوم ہے بچپن ہی میں انتقال فرماگئی تھیں اور اب . . . . . یہاں اس کی آواز گم ہو گئی اور وہ ایک لمحے کے لئے سلسلۂ گفتگو جاری نہ رکھ سکا . . . . . . صرف میں ہی میں رہ گیا ہوں۔ اور خدا رحم کرے سوائے اس کے کہ تم اس لعنتی معمہ کو جو اس گھر سے وابستہ ہے حل کرو اور اس چیز کا خاتمہ کرو جس نے میرے عزیزوں کی جان لی ہے اور رفتہ رفتہ میری بھی لے رہی ہے۔ میرے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔

پہلے دادا مرے۔ انہوں نے زندگی کے آخری چند سال جنوبی امریکہ میں گزارے۔ اس جگہ کو چھوڑنے سے کچھ ہی پہلے نیند کی حالت میں اُن پر ایک بہت بڑی چمگادڑ نے حملہ کیا۔ اگلی ہی صبح وہ اتنے کمزور ہو گئے کہ چل بھی نہ سکے۔ اس خوفناک جانور نے ان کا زندگی بخش خون چوس لیا تھا۔ وہ یہاں آئے کچھ عرصہ بیمار رہے۔ اور چند ہفتے بعد چل بسے۔ ڈاکٹر مرض الموت کے متعلق متفق الرائے نہ ہو سکے۔ پس انہوں نے بڑھاپے کو موت کا سبب قرار دیا اور اسے ہی برقرار رکھا۔ لیکن میں ان سے بہتر جانتا تھا۔ اُن کی جان لینے کا سبب اُن کے وہ تجربات تھے جو انہوں نے جنوبی علاقے میں کئے تھے۔ انہوں نے اپنی وصیت میں لکھا کہ فوراً ایک مقبرہ تیار کیا جائے اور میری لاش وہیں دفن کی جائے۔ ان کی وصیت پر عمل کر دیا گیا اور اب ان کی ہڈیاں اس خاکستری مقبرے میں ہیں جو اگر تم گھر کی پچھلی طرف سے ہو کر آئے ہو تو تم نے دیکھ لیا ہو گا۔ پھر والد صاحب کی حالت خراب ہونے لگی۔ وہ بھی سوکھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ مر گئے۔ ڈاکٹروں کو حیرانی اس بات سے تھی کہ عین آخری لمحے تک وہ اتنی کافی خوراک کھاتے رہے جو تین آدمیوں کو زندہ رکھ سکتی تھی اور اس پر بھی وہ اتنے کمزور تھے کہ اپنی ٹانگیں فرش پر گھسیٹنے کی طاقت بھی نہ رکھتے تھے۔ انہیں بھی دادا جان کے پاس ہی دفنا دیا گیا۔ یہی علامات جارج اور فریڈ کی صورت میں دیکھی گئیں۔ اور وہ دونوں بھی اسی مقبرے میں لیٹے ہوئے ہیں۔ اور اب جیک! اب میں بھی جانے کو ہوں۔ کیونکہ عرصے سے میری بھوک بھی ہوش ربا نسبت سے بڑھ رہی ہے۔ اور اس پر بھی میں اتنا کمزور ہوں جتنا کہ بلّی کا بچہ۔

واہیات۔ میں نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ہم کچھ عرصے کے لئے اس جگہ کو چھوڑ دیں گے اور تفریحاً کسی اور جگہ چلے جائیں گے۔ اور جب تم واپس آؤ گے تو اپنی اس خوف زدگی پر ہنسو گے۔ یہ سب کچھ اعصابی کمزوری کا نتیجہ ہے اور جن اموات کا تم نے ذکر کیا ہے۔ ان میں کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ غالباً کسی خاندانی مرض کا نتیجہ ہیں۔ کئی ایک کنبے اسی طرح جلد جلد چل بسے۔

جیک! میں تو چاہتا ہی یہی ہوں کہ اس طرح سوچ سکوں۔ مگر ہیں

جگہ کو چھوڑنے کے متعلق۔ فی الحال میں نہیں چھوڑ سکتا۔ سمجھ لو کہ میں اس جگہ سے نفرت کرتا ہوں۔ اس سے کبشیدہ خاطر رہتا ہوں لیکن اسے چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ اس جگہ میں حزن انگیز فریفتگی ہے اور وہی مجھ پر قابو پائے ہوئے ہے۔ اگر تم میرے حقیقی دوست بننا چاہتے ہو تو چند دن تک میرے ساتھ یہاں ٹھہرو۔ اور اگر تم کوئی بات نہ دیکھو تو مجھے یقین ہے کہ تمہاری موجودگی اور تمہاری باتیں مجھ پر تعجب خیز اثر ڈالیں گی۔ اس کے صریحاً بے بنیاد خوف پر میں اپنی مسکراہٹ مشکل سے روک سکا۔ تاہم میں اپنی سی کوشش کرنے پر رضامند ہو گیا۔

چند گھنٹے تک ہم دوسری چیزوں کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ پھر میں نے یہ کہتے ہوئے کہ میں اپنے سفر اور اس کے بعد پیدل چلنے کی وجہ سے بہت تھکا ہوا ہوں۔ سونے کی خواہش ظاہر کی۔ ایمسن مجھے خوابگاہ میں لے گیا اور یہ دیکھ لینے کے بعد کہ ہر شے پوری پوری آرام دہ تھی۔ مجھے شب بخیر کہا۔ جب وہ کمرے سے باہر جانے کے لئے پلٹا تو لیمپ کی ٹمٹماتی روشنی اس کی گردن پر پڑی۔ اور وہاں دو سوراخ نظر آئے۔ میں نے اس سے ان کے متعلق دریافت کیا تو اس نے جواب دیا "کوئی پھنسی پھوٹ گئی ہوگی مجھے تو اس کا کبھی خیال نہیں آیا۔ اس نے پھر شب بخیر کہا اور کمرے سے چلا گیا۔

میں نے کپڑے اتارے اور بستر میں جا کودا۔ رات بھر مجھے دم گھٹنے کی غالب قوت کا احساس رہا اور ایسا معلوم ہوا گویا کوئی بہت بھاری بوجھ میری چھاتی پر رکھا ہے جسے میں اتار نہ سکتا تھا۔ صبح کو جب میں اٹھا تو کمزوری کا ایک عجیب احساس میرے تجربے میں آیا۔ کوشش کر کے اٹھ بیٹھا اور ملبوس شب خوابی تبدیل کرنے لگا۔ لیکن جب میں نے کرتے کو تہ کیا تو کالر پر خون کی پتلی سی لکیر دیکھی۔ میں نے اپنی گردن کو چھوا اور مجھ پر خوفناک دہشت غالب آ گئی۔ چھونے سے مجھے ذرا تکلیف محسوس ہوئی۔ اور میں اسے آئینے میں دیکھنے کے لئے بھاگا۔ دو چھوٹے سوراخ خون سے لبالب بھرے تھے۔ میرا خون .... میری گردن پر....

اب اس کے بعد میں ایمسن کی خوف زدگی پر نہ کھکھلایا۔ کیونکہ اسی جانور نے سوتے وقت مجھ پر بھی حملہ کر دیا تھا۔

جتنی جلدی میری حالت مجھے اجازت دے سکی۔ میں نے کپڑے پہنے اور اپنے دوست کو دیکھنے کے خیال سے زیریں منزل میں گیا لیکن وہ وہاں نہ تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا۔ لیکن وہ نظر نہ آیا۔ ہر جگہ میرے سوال کا جواب نفی میں تھا۔ اب نو بج چکے تھے۔ اس لئے میں نے سوچا کہ اسے ضرور جگا دینا چاہیئے۔

اس کی خوابگاہ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے میں لاحاصل تلاش میں کمرہ در کمرہ داخل ہوتا رہا۔ تمام کے تمام بے ترتیبی کے مختلف مدارج میں تھے اور فرنیچر پر پڑی ہوئی گرد کی موٹی تہ یہ ظاہر کر رہی تھی کہ وہ کچھ عرصے سے کسی کے استعمال میں نہ آئے تھے۔ آخر کار تیسری منزل کی ایک شمالی خوابگاہ میں میں نے اسے دیکھ لیا۔ وہ بستر پر پاؤں پسارے سو رہا تھا۔ اور شب خوابی کا لباس پہنے ہوئے تھا۔ جب میں اسے ہلانے کے لئے آگے جھکا تو میری نظر خون کے اُن دو قطروں پر پڑی جو غلاف پر پھیلے پڑے تھے۔ میں نے چیخنے کی ایک وحشیانہ خواہش کو بمشکل ضبط کیا اور ایمسن کو اکھڑ طریق سے جھنجھوڑا۔ اس کا سر ایک طرف کو لڑھک گیا اور اس کے گلے کے جہنمی چھید مجھے صاف طور پر نظر آئے۔ وہ تازے اور نئے معلوم ہو رہے تھے۔ اور پہلے سے کہیں زیادہ بڑے ہوئے تھے۔ میں نے اسے اور زور سے ہلایا۔ آخر کار اس نے احمقانہ طور پر آنکھیں کھولیں اور چاروں طرف دیکھا۔ پھر مجھے دیکھ کر اس نے پُر درد، مایوس کن اور صبر بھری آواز میں کہا۔

"جیک! وہی جانور پھر آیا تھا اور اب میں زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور اگر رہوں تو خدا میری جان لے لے۔ یہ کہہ کر وہ انتہائی کمزوری کے باعث پھر لیٹ گیا۔ میں نے اُسے چھوڑ دیا۔ اور ناشتے کی تیاری کے لئے ادھر اُدھر پھرنے لگا۔ میں نے یہی بہتر سمجھا کہ اسے یہ نہ بتاؤں کہ اس کے جلاد نے مجھے بھی تکلیف پہنچائی ہے اور اس طرح سے وہ پھر وسوسہ جو وہ مجھ پر رکھتا ہے۔ قائم رکھوں۔

کچھ دیر سیر کرنے سے میری طبیعت ٹھیک ہو گئی لیکن اس راز کا عقدہ نہ کھلا اور دوپہر کے قریب جب میں واپس آیا تو ایمسن بھی ٹھیک ہو بیٹھا تھا۔ ہم دونوں نے مل کر نہایت عمدہ کھانا تیار کیا۔ میں بھوکا تو تھا ہی خوب پیٹ بھر کر کھایا۔ لیکن جب میں نے ختم کر دیا تو میرا دوست کھاتا رہا۔ یہاں تک کہ میں نے سوچا کہ یہ ضرور یا تو تھک کر گر پڑے گا یا اس کا پیٹ پھٹ جائے گا۔ اس کے بعد چیزیں ٹھکانے سے رکھ کر ہم ہال میں روغنی رنگین تصاویر کو دیکھتے ہوئے ٹہلتے رہے۔ ان میں سے بہت سی قابل قدر اور جاذب توجہ تھیں۔

ہال کے ایک سرے پر میں نے ایک شخص کی شبیہ دیکھی۔ بظاہر یہ اس کے ایام جوانی کی تھی۔ اس کے بال پُرانے دستوروں کے رواج کے مطابق لمبے اور لہراتے ہوئے، مونچھیں احتیاط سے کتری ہوئی اور

ڈاڑھی فرانسیسی قطع کی تھی۔ ایمسن یہ دیکھ کر کہ میں اس تصویر میں دلچسپی لے رہا تھا۔ آگے آیا اور بولا۔

جیک! مجھے یہ دیکھ کر بالکل حیرانی نہیں کہ تم اس شبیہ میں دلچسپی لے رہے ہو۔ یہ مجھے بھی بہت لبھاتی ہے۔ بعض اوقات میں گھنٹوں بیٹھا اس کے چہرے کے اثرات کا مطالعہ کرتا رہتا ہوں۔ بسا اوقات میں یہ خیال کرتا ہوں کہ یہ مجھے کچھ بتانا چاہتا ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ سب باتیں فضول ہیں۔ مگر ہاں۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ میں نے ابھی تک اس شخص کا تم سے تعارف نہیں کرایا۔ کیا میں نے کرا دیا ہے؟ یہ میرے دادا ہیں۔ یہ اپنے زمانے کے بہت طاقتور لڑکوں میں سے تھے۔ اور اگر وہ منحوس جانور خون نہ چوستا تو یہ اب بھی زندہ ہوتے۔ شاید ایسا ہی کوئی جانور ہے جو میری جان لے رہا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟۔

میں نے کہا "ایمسن میں کوئی رائے دینے کی جرأت نہیں کرتا۔ تاہم آج رات ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ تم حسب معمول سو جانا اور میں پوری طرح سے نگہبانی کرونگا۔ اس طرح سے ہم یا تو اس معتے کو حل کریں گے یا اسی کوشش میں ختم ہو جائیں گے۔

ایمسن فدا نہ بولا۔ لیکن خاموشی سے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے بھی پُرجوش طریق سے اس کے ساتھ ہاتھ ملایا اور ہم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مکمل طور پر سمجھوتہ کر لیا۔

خیالات کی رو بدلنے کے لئے میں نے اس سے نوکر رکھنے کے متعلق پوچھا۔ اس نے جواب دیا۔ "میں نے بار بار ایسے نوکر رکھنے کی کوشش کی ہے جو یہاں ٹھہریں، لیکن تیسرے ہی دن وہ عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔ اور پھر بستر بوریا اٹھا کر بھاگ جاتے ہیں۔

اس رات میں اپنے دوست کے ساتھ اس کے کمرے تک گیا اور جب تک وہ کپڑے اتار کر سونے کے لئے تیار نہ ہو گیا۔ وہیں رہا۔ کھڑکیوں کے کئی شیشوں میں درزیں آئی ہوئی تھیں۔ اور ایک تو بالکل ہی غائب تھا۔ میں نے اسے خالی جگہ میں تختہ لگا لینے کی رائے دی۔ لیکن اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ مجھے رات کی ہوا بھلی معلوم ہوتی ہے پس میں نے یہ [illegible] وہیں چھوڑ دی۔ چونکہ رات ابھی کچھ زیادہ نہ گزری تھی میں ایک [illegible] کے سامنے بیٹھ گیا اور وہ ایک گھنٹے تک پڑھتا رہا۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ جب کوئی نئی آواز میرے کانوں تک پہنچی میرا خیال چھپے ہوئے صفحے پر سے اٹھ کر ادھر ادھر گھومتا رہا اور کپکپی کی ایک لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں سے دوڑتی رہی۔ ہوا کی تیزی بڑھ

گئی تھی اور اس کی سائیں سائیں درختوں میں ایک عجیب قسم کی گنگناہٹ پیدا کر رہی تھی۔ جھلملیوں کی چرچراہٹ اس اثر میں اور بھی اضافہ کر رہی تھی اور دور فاصلے سے بےشمار الوؤں کی ہوک اور اس کے ساتھ ہی رات کے متفرق پرندوں اور دوسرے شب بیدار جانوروں کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔

موم بتی ہاتھ میں تھامے جب میں نے سیڑھیوں پر دو قدم لئے اور اس کی روشنی نے دیواروں اور چھت پر بیڈھنگے سائے بنائے تو میں اپنے کام سے بہت متنفر ہو۔ اپنے فرض کی انجام دہی کے دوران میں کئی بار مجھے دلیری سے کام لینا پڑا۔ لیکن اب اُسے پورا کرنے کے لئے محض دلیری کسی کام کی نہ تھی۔ پس میں نے موم بتی بجھائی اور چُپ چاپ ایمسن کے کمرے کی طرف بڑھا۔ اس کا دروازہ بند تھا۔ میں یہ احتیاط رکھتے ہوئے کہ کوئی آواز نہ ہو دوزانو ہو گیا اور ایک سوراخ میں اندر دیکھا۔ اس میں سے چارپائی اور سامنے کی دو کھڑکیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔

رفتہ رفتہ میری آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو گئیں۔ اور میں نے ایک کھڑکی کے باہر سرخی مائل مدھم چمک دیکھی۔ بظاہر یہ کہیں سے پیدا نہ ہو رہی تھی۔ مگر اس جگہ جہاں روشنی تھی۔ سینکڑوں ذرات ناچ اور گردش کر رہے تھے۔ اور جب میں محویت کے عالم میں انہیں دیکھ رہا تھا تو وہ انسانی شکل اختیار کرتے ہوئے نظر آئے۔ اس کے خدوخال مردانہ تھے۔ اور بالوں کی ترتیب بھی ایسی ہی تھی۔ پھر وہ پراسرار چمک غائب ہو گئی۔

اگرچہ رات بالکل ٹھنڈی تھی۔ لیکن مجھ پر دباؤ اس قدر زیادہ پڑا کہ میں پسینے سے تر ہو گیا۔ ایک لمحے تک میں یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ کمرے میں داخل ہوں یا جہاں ہوں وہیں ٹھہروں۔ اور سوراخ کو اپنے مشاہدے کا ذریعہ بنائے رکھوں۔ آخر کار میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہی بہتر ہے کہ اپنی جگہ پر ٹھہرا رہوں۔ پس میں نے پھر سوراخ میں سے دیکھنا شروع کر دیا۔

دفعتہً اسی جگہ جہاں روشنی تھی مجھے کوئی شے حرکت کرتی دکھائی دی۔ پہلے پہل کم روشنی ہونے کی وجہ سے میں اس کی صورت اور بیرونی حدود کو نہ پہچان سکا۔ لیکن پھر میں نے دیکھ لیا کہ یہ کسی آدمی کا سر ہے۔ بجنسہ ہو بہو اس تصویر جیسا تھا جو میں نے اسی صبح ہال میں دیکھی تھی۔ موتی سے سفید دانتوں کی دو قطاریں کھلی ہوئی اور کچلیاں بہت زیادہ بڑھی ہوئی اور نہایت تیز تھیں۔ آنکھیں جن کا رنگ زمردیں تھا حقارت آمیز نظروں سے گھور رہی تھیں۔ بال حزن انگیز طور سے بکھرے ہوئے تھے اور ڈاڑھی پر ایک بڑا گنگھل تھا جو منجمد خون معلوم ہوتا تھا۔

میں نے اتنا ہی دیکھا کہ سر میری نظروں سے غائب ہو گیا۔ اور میں نے اپنی توجہ ایک بہت بڑی چمگادڑ کی طرف پھرائی جو چاروں طرف چکّر کاٹ رہی تھی۔ اور اس کے بڑے بڑے پر کھڑکی کے شیشوں پر نقارے کی سی آواز پیدا کر رہے تھے۔ بالآخر اس نے ٹوٹے ہوئے شیشے کے گرد چکّر لگایا۔ اور اس سوراخ میں سے جو شیشے کی عدم موجودگی نے پیدا کر دیا تھا سیدھی اندر آ ئی۔ چند لمحوں کے لئے وہ میری نظروں سے اوجھل رہی پھر دوبارہ دکھائی دی اور میرے دوست کے چاروں طرف چکّر لگانے شروع کئے اور قریب ہی قریب ہوتی گئی۔ پھر نیچے کی طرف جھپٹی اور ٹمسن کے گلے پر شہ رگ کے عین اوپر جا چمٹی۔

اس پر میں تیزی سے کمرے میں گیا اور اس چمگادڑ پر جو سرات میرے دوست کے خون سے اپنا پیٹ بھرنے آتی تھی وحشیانہ حملہ کیا۔ لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ وہ کھڑکی میں سے اُڑ گئی اور دُور نکل گئی۔ اب میں نے اپنی توجہ سونے والے کی طرف مبذول کی۔

"ٹمسن! دوست اٹھو۔"

وہ گولی کی طرح اُٹھ بیٹھا۔

کیا بات ہے جیک! کیا وہ جانور یہاں آیا تھا؟"

میں نے جواب دیا ابھی تم اس کی پرواہ نہ کرو اور جتنی جلدی ہو سکے کپڑے پہنو آج ہم نے کچھ کام کرنا ہے۔

اس نے استفہامیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔ لیکن بغیر کسی حجّت کے میرے حکم کی تعمیل کی۔ میں نے پلٹ کر کسی موزوں ہتھیار کی تلاش میں اپنی نظریں کمرے کے چاروں طرف دوڑائیں۔ کونے میں ایک مضبوط ڈنڈا دکھائی دیا۔ اور میں اس کی طرف لپکا۔

جیک!

میں گھوم گیا۔

"یہ کیا ہے۔ لعنت بھیجو۔ تمہیں کچھ عقل بھی ہے۔ ڈر کے مارے میری جان نکال رہے ہو۔"

اس نے کانپتی ہوئی انگلی سے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

وہاں، خدا کی قسم وہاں میں نے اسے دیکھا ہے۔ یہ میرے دادا تھے۔ لیکن اُف کس قدر بگڑی ہوئی شکل میں۔

وہ دھڑام سے بستر پر گر پڑا۔ اور سسکیاں لینے لگا۔ صدمے نے اس کے اعصاب پر پورا پورا اثر ڈالا۔

"دوست" میں نے منت بھری آواز میں کہا۔ مجھے معاف کرو میں نے بہت جلدی کی۔ تم اپنے آپ کو سنبھال لو۔ ہم نے آج رات ابھی اس معاملے کی تہ کو پہنچنا ہے۔

میں نے اپنی شراب اسے پکڑائی۔ اُس نے خوب ہی پی اور ٹھیک ہو بیٹھا۔ جب اس نے کپڑے پہن لئے تو ہم گھر سے باہر نکلے۔ چاند غائب ہو چکا تھا۔ اور اندھیرا گھپ تھا۔ میں آگے آگے چلا۔ جلد ہی ہم اس چھوٹے خاکستری تہ خانے سے دس قدم رہ گئے۔ میں نے ٹمسن کو آنکھوں سے کام لینے کی ہدایت دی اور ایک درخت کے پیچھے کھڑا کر دیا۔ اور خود یہ اطمینان کر کے کہ تہ خانہ کا دروازہ بند اور مقفّل ہے۔ اس کی دوسری طرف کھڑا ہو گیا۔ آدھ گھنٹے سے زیادہ عرصے تک ہم یونہی انتظار کرتے رہے اور کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ لیکن جب میں چلنے کے لئے تیار ہوا تو پچاس فٹ پرے۔ ایک سفید شکل درختوں میں سے پرواز کرتی ہوئی نظر آئی۔

یہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی اور سیدھی ہماری طرف آ رہی تھی۔ جب نزدیک آئی تو میں نے اُسے دیکھا اور آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ حالانکہ ہوا تیز چل رہی تھی۔ لیکن اس پر بھی لمبے کفن کی ایک تہ تک تھرتھرا نہ رہی تھی۔ مقبرے کے عین باہر یہ رُکی۔ اور چاروں طرف دیکھا۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ اب کیا ہونے کو تھا۔ لیکن جب میں نے بوڑھے ہولرائڈ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تو مجھے یقینی صدمہ پہنچا اور ساتھ ہی میں نے دم کھینچنے کی سی آواز سُنی۔ اور سمجھ گیا کہ ٹمسن نے بھی اسے دیکھ اور پہچان لیا تھا۔ پھر وہ رُوح، بھوت یا جو کچھ بھی تھا دروازے کے پہلو اور کواڑ کی درز میں سے جو ایک انچ کا سولھواں حصّہ بھی نہ تھی۔ تہ خانے میں داخل ہو گیا۔

جونہی یہ غائب ہوا ٹمسن دوڑتا ہوا آیا۔ اس کا چہرہ بالکل سفید پڑ گیا تھا اور آواز مشکل سے نکل رہی تھی۔ جیک! اس نے پوچھا۔ کیا تھا۔ یہ کیا تھا۔ اس کی شکل دادا سے ملتی جلتی تھی۔ مگر یہ وہ نہیں ہو سکتے۔ انہیں مرے ہوئے پانچ برس ہو گئے ہیں۔

میں نے جواب دیا۔ آؤ گھر واپس چلیں اور میں اپنی پوری قابلیت سے اس کی تشریح کرنے کی انتہائی کوشش کروں گا۔ البتہ ممکن ہے میں غلطی پر ہوں۔ لیکن میرے طریق مدافعت پر عمل کرنے کی کوشش سے کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔ ٹمسن جس چیز کا ہم مقابلہ کر رہے ہیں۔ وہ ویمپائر یعنی خون آشام جن ہے۔ یہ وہ نسوانی قسم نہیں جس کا عام طور پر ذکر کیا جاتا ہے۔ بلکہ اصل چیز ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمہارے پاس ایک پرانی انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا تھی اگر تم اس کی پچیسویں جلد لے آؤ تو میں اس لفظ کی تشریح زیادہ اچھی طرح کر سکوں گا۔

وہ کمرے سے چلا گیا اور مطلوبہ کتاب لئے ہوئے واپس آیا۔ میں نے یادن صفحہ کھول کر پڑھا:۔

ویمپائر۔ یہ لفظ بظاہر سرویا زبان کا ہے اور پہلے پہل مشرقی یورپ میں خون پینے والے بھوتوں کے لئے استعمال کیا جاتا تھا لیکن اب جنوبی امریکہ کی خون چوسنے والی چمگادڑوں کے لئے بولا جاتا ہے۔ اول الذکر معنوں میں ویمپائر اس مردہ شخص کی روح کو سمجھا جاتا ہے جو رات کے وقت زندہ لوگوں کا خون چوسنے کے لئے اپنے مدفون جسم کو چھوڑ دیتی ہے۔ اسی لئے جب ویمپائر کی قبر کو کھولا جاتا ہے تو اس کی لاش خون پینے کی وجہ سے تازہ اور سرخی مائل نکلتی ہے۔ یہ بھی یقین کیا جاتا ہے کہ وہ جو شکل چاہیں تبدیل کر سکتے ہیں اور اکثر ریت کے ذرات یا گھاس پھونس کے تنکوں کی طرح ادھر ادھر اڑتے رہتے ہیں۔

اس کی تباہ کاریوں کا خاتمہ کرنے کے لئے اس کے جسم میں ایک کھونٹا گاڑا جاتا ہے، یا اس کا سر قلم کر دیا جاتا ہے۔ یا دل کے ٹکڑے کئے جاتے ہیں۔ یا قبر پر سرکہ اور ابلتا ہوا پانی ڈالا جاتا ہے۔ ویمپائر بننے والے وہ لوگ ہوتے ہیں جو جادوگری یا خودکشی کرتے ہیں یا وہ جن کا انجام ناگہانی ہوتا ہے۔ نیز مردہ شخص بھی جو ویمپائر کے ہاتھ سے مرے ان کے جہنمی گروہ میں داخل ہو جاتا ہے . . . .

دیکھو . . . . . . کیلوتیت کا مضمون "ہنگری کے خون آشام"

جن . . . نے امیتن کی طرف دیکھا وہ سیدھا آگ کی طرف گھور رہا تھا میں جان گیا کہ وہ سمجھ گیا ہے کہ ہم نے کیا کرنا ہے اور اپنے آپ کو اس کام کے لئے فولاد کی طرح مضبوط بنا رہا ہے۔ پھر وہ میری طرف متوجہ ہوا۔

ٹھیک ہے! ہم صبح تک یہیں ٹھہرے رہیں گے۔

فقط اتنی ہی بات ہوئی۔ میں سمجھ گیا اور اس نے جان لیا۔ ہم وہیں بیٹھے رہے اور ہر ایک اپنے خیالات کے ساتھ کشمکش کرتا رہا۔ یہاں تک کہ مدھم روشنی کی پہلی کرنیں درختوں میں سے چھنتی ہوئی آئیں اور ہمیں آگاہ کر دیا کہ صبح ہوا چاہتی ہے۔

امیتن ایک بڑا ہتھوڑا اور ایک ایسا چاقو لینے چلا گیا جس کی دھار استرے سے . . . تھی۔ اور میں . . . . لکڑی کے چار کھونٹے بنانے میں مصروف ہو گیا۔ وہ ان مہیب ہتھیاروں کو لیکر جب واپس آ گیا تو ہم نے تہ خانے کا راستہ لیا۔ ہم دونوں تیزی سے چل رہے تھے۔ کیونکہ ہم میں سے کوئی بھی اگر ایک لمحے کے لئے جھجکتا تو مجھے بلاشبہ یقین تھا کہ ہم دونوں بلا توقف بھاگ جاتے۔ البتہ ہمارا فرض صاف طور پر ہمارے سامنے تھا۔ پس امیتن نے دروازے کا قفل کھولا اور کواڑ زور سے باہر کی طرف مارے اور ہم دعائیں پڑھتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔

ہم دونو بائیں ہاتھ کے ایک تابوت کی طرف اس طرح پھرے گویا باہمی سمجھوتہ کیا ہوا تھا۔ یہ تابوت دادا کا تھا۔ ہم نے ڈھکنا اتارا تو بوڑھا ہولبرائنڈ اسی میں لیٹا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ سو رہا ہے اس کے چہرے پر تازگی تھی اور مردے کی سی کوئی اکڑ نہ تھی۔ بال جمے ہوئے اور مونچھیں ناتراشیدہ تھیں۔ اور داڑھی پر ہلکے بھورے رنگ کے جمے ہوئے دھبے تھے۔ لیکن میری توجہ کا مرکز اس کی آنکھیں تھیں۔ جن کا رنگ سبزی مائل تھا اور جو شیطانی بغض کے اثرات لئے اس طرح چمک رہی تھیں کہ میں نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی تھیں۔ قہر کا وہ فریب وہ اظہار جو اس کے چہرے پر تھا دوزخ میں کسی شیطان کے خدوخال کی زیبائش کے لئے بہت موزوں تھا۔

امیتن کو غش آیا اور وہ گر پڑتا اگر میں . . . اسے کچھ شراب نہ پلاتا۔ اس کے بعد وہ سنبھل گیا اور ایک کھونٹا عین اس کے دل پر رکھا۔ پھر آنکھیں بند کیں اور دعا مانگی کہ اے بزرگ و برتر خدا تو اس کی روح کو جو تیری طرف بھیجی جا رہی ہے اپنے ہاں جگہ دے۔

میں نے ایک قدم پیچھے لیا اور احتیاط سے نشانہ باندھ کر اپنی پوری طاقت سے ہتھوڑے کو گھما کر مارا۔ یہ ٹھیک کھونٹے پر بیٹھا اور ایک دہشت خیز چیخ نے فضا میں گونج پیدا کر دی۔ کھلے ہوئے زخم میں سے خون پھوٹ پھوٹ کر ہمارے اوپر آ رہا تھا ہمارے کپڑوں اور دیواروں کو آلودہ کر دیا۔ میں نے بغیر کسی تذبذب کے بار بار ہتھوڑا گھما کر ضربیں لگائیں اور اس نے اس خوفناک آواز سے نجات حاصل کرنے کی بے فائدہ کوشش کی۔ ایک چوٹ اور پڑی اور کھونٹا دل کے پار ہو گیا۔

اس نے تابوت کی اس تنگ محدود جگہ میں ٹکڑے کئے ہوئے کیچوے کی طرح بل کھائے اور امیتن سر جدا کرنے کے لئے آگے بڑھا تاکہ اسے بے ڈھنگے مگر پورے طور پر ختم کر دے۔ جب چاقو کے آخری وار نے سر اور تن کا تعلق قطع کر دیا تو اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور تمام کی تمام لاش اچھل کر گرد میں جا پڑی۔ اور ہڈیوں کے فرش پر محض لکڑی کا ایک کھونٹا رہ گیا۔

اسے ختم کر کے ہم نے دوسرے تین کو بھی لیا اور ایک ہی خیال کے ماتحت ہم نے باری باری اپنے گلے چھوئے۔ میرے گلے کا ہلکا ہلکا درد دور ہو گیا تھا۔ اور میرے دوست کے زخم بھی بالکل اچھے ہو گئے تھے۔

اور اُن کا نشان تک باقی نہ تھا۔ میری خواہش تھی کہ میں ان تمام واقعات کو جن کا انحصار اس راز اور اس کے حل پر تھا۔ دنیا کے سامنے پیش کروں۔ لیکن ایمسن مجھے خاموش رکھنے میں غالب رہا۔

چند سال بعد ایمسن سیدھی سادھی طرح مرگیا اور اس کے ساتھ ہی داستان کی تصدیق محض بھی جاتی رہی۔ تاہم چیرنگ کے چھوٹے قصبہ سے دس میل کے فاصلہ پر ایک پرانا گھر واقع ہے جو اتنے عرصہ سے غیر آباد پڑا ہے۔ اور اس کے نزدیک ہی ایک چھوٹا خاکستری تہ خانہ ہے۔ اس میں چار تابوت ہیں اور ان میں سے ہر ایک میں لکڑی کا ایک کھونٹا کھور رنگ سے آلودہ متوفی ایمسن ہو لرائڈ کی انگلیوں کے نشانات لئے پڑا ہے۔

ایم عنایت اللہ بی۔ اے انبالوی

غزل

یا رازِ دل گداز ہوں خلوت گزیدہ ہوں
یا آہِ سینہ سوز بہ لب نارسیدہ ہوں

دم بھر نصیب ہو نہ سکی صحبتِ چمن
بوئے رمیدہ ہوں کہ مَیں رنگِ پریدہ ہوں

ہیں اہلِ بزم میری خموشی کے شکوہ سنج
یعنی بہار ہوں کہ چمن نارسیدہ ہوں

عشرت میں بھی رہا مجھے اندیشۂ الم
ہوں صبحِ عید بھی تو گریباں دریدہ ہوں

افسردہ ہوں خیالِ فنائے نشاط سے
ہوں گرمِ ناؤ نوش مگر آبدیدہ ہوں

ہرگز مجھے سکوں نہ ملا اک مقام میں
مضطر برنگِ قطرہ لبِ ساغر چکیدہ ہوں

ہستی ہے میری مظہرِ تکمیلِ دردِ عشق
آہ کشیدہ، نالہ گردوں رسیدہ ہوں

پستی میں بھی ہے شوق مرا، مائلِ نشاط
شبنم بھی ہوں تو سوئے گلستاں رمیدہ ہوں

زیبا نہیں گہر کو تنک ظرفیِ حباب
مَیں قعرِ بحر میں تہِ موج آرمیدہ ہوں

صادق بہارِ باغ سے دامن کشاں رہا
منت کشِ نسیمِ بیاباں وزیدہ ہوں

آغا صادق حسین صادق
منشی فاضل و ادیب فاضل

ایک مکالمہ

(یہ اور وہ، موسم پر)

یہ : موسم کیسا ہے؟

وہ : آج تو موسم اچھا ہے۔

موسم سدھر رہا ہے۔ ہمارا دن اچھا ہوگا۔

یہ : یہ تو بہت بہتر ہے، کیونکہ کل تو بے کٹھور ٹھیک تھا بدل تا رہا۔

وہ : میں اس کو خوب ہی جانتا تھا، اچھی طرح سے بھی زیادہ۔ بارش کی ایک زبردست جھڑی نے آکر مجھے داب لیا، اور میں خوب بھیگ گیا تھا۔ جلد تک تر ہو گئی تھی۔

یہ : تو اس وقت آپ کے پاس نہ چھتری ہوگی نہ "پیلے لی ٹوٹ" Paletot (پلاٹو کا فرانسیسی اوورکوٹ)؟

وہ : آسمان اسقدر صاف اور روشن تھا کہ میں نے چلتے وقت کوئی بھی احتیاط نہیں کی۔

یہ : ہاں، مگر ہوا تو بند تھی، گرمی بہت زیادہ دبا رہی تھی، اور کچھ چھوٹے چھوٹے لال لال لکتے ابر کے آسمان پر موجود تھے۔ جو طوفان آنے کی پیشگی خبر دے رہے تھے۔

وہ : میں نے سمجھا تھا کہ یہ اُڑ جائیں گے۔

یہ : آپ نے اپنے مہاندار بغیر کیسے شمار کر لیا؟

وہ : افسوس! میں نے کیا۔ ناگہاں فوراً ہوا اُٹھ کھڑی ہوئی، آسمان کو بھاری بھاری بادلوں نے ڈھانپ لیا اور تیز پڑکر نے والا پانی اُولوں کے ساتھ آگیا۔ مجھ پر ٹوٹنے لگا۔

یہ : میرے بیچارے دوست! اور تب تھے آپ کہاں؟

وہ : شہر سے آدھے لیگ (دو ہزار گز) کے قریب ایک کھلے میدان میں۔

یہ : تو وہاں آپ ابر کے نیچے نہیں پہنچ سکتے تھے؟

وہ : یہ تو ناممکن تھا۔ کھیتوں میں چند اخروٹ کے درخت ضرور تھے، مگر آپ جانتے ہیں کہ طوفان کی حالت میں کسی درخت کے نیچے پناہ لینا کتنا پُرخطر ہوتا ہے۔

یہ : کیوں، پھر ساری بارش آپ نے اپنے ہی پر لے لی۔

وہ : بیشک، ضرور لی، اس پر یہ بھی اضافہ کر لیجئے کہ بجلی کی تڑپ اور گرج کا زور شور پیہم مسلسل تھا۔ ہوا کے جھونکوں نے میری ٹوپی کو بھی اُڑا دیا تھا۔

یہ : مصیبتیں کبھی یک و تنہا نہیں آتیں۔

وہ : میں اس کے پیچھے دوڑا اور خوش نصیبی جو پیش آئی کہ اس کو روک بھی لیا۔ مگر اپنا پاؤں رکھ دینا پڑا تھا۔

یہ : کتنا نفیس ذریعہ ہے کہ کسی کی ٹوپی، اصلی ہیئت میں کر دی جائے!

وہ : آپ ہنستے ہیں۔ مگر میں نہیں ہنسا تھا۔ میری صورت چور کی سی ہو گئی تھی: میرے جوتے میرے پاؤں کا ساتھ نہیں دیتے تھے۔ میرے سپید پتلون پر گھٹنوں تک مٹی کا لیس چڑھ گیا تھا۔ میرے بال اینٹھ کر سیدھے سیدھے لٹک رہے تھے جیسی موم بتیاں ہوتی ہیں، اور بارش کا پانی میری ٹوپی سے نکل نکل کر ٹونٹی کی طرح گر رہا تھا۔

یہ : آپ کا نظارہ کیسا خوب رہا ہوگا؟

وہ : اتنا ہی نہیں تھا۔

یہ : کیا، کوئی اور سوء اتفاق بھی؟

وہ : مجھے گھر پہنچنا ضروری تھا۔

یہ : بالکل صحیح۔

وہ : اور کسی گاڑی کا مل جانا ناممکن تھا!

یہ : اس کو میں بھی سمجھ سکتا ہوں۔

وہ : ایک دم سے سارا طوفان ختم گیا۔ جیسے کسی نے جادو کر دیا ہو۔

یہ : خوب!

وہ : بادل غائب ہو جاتے ہیں۔ سورج نکل آتا ہے، پانی دھواں بن کر اُڑ جاتا ہے یا حباب بن کر اُڑ جاتا ہے۔

یہ : اور اس طرح آپ بچ کر نکلے!

وہ : آپ ایسا ہی خیال کریں؟ خود کو دھوکے میں نہ رکھئے۔

ل یہ ہماری زبان اور بول چال نہیں ہے۔ فرانسیسی سے لفظی ترجمہ کر دیا گیا ہے تاکہ اصلی رنگ نظر آجائے۔

مشکل سے طوفان گزر چکا ہوگا کہ بستی سے لوگ جوق درجوق نکل پڑے اور میدان میں سیر گشت کے لئے پھیل گئے ۔

یہ : اس سے زیادہ کیا لطف انگیز ہوسکتا ہے کہ طوفان کے بعد سیر و تفریح کی جائے ۔

وہ : ٹھیک ہے ، مگر اس سے زیادہ ناگوار کیا ہوتا کہ اپنے ہی احباب و شناسا کسی کو اس حال میں دیکھتے ، جو میرا ہو رہا تھا ۔

یہ : لیکن تب بھی ، آپ نے چھتری کیوں نہیں لے لی تھی ؟

وہ : اس لئے کہ میں یہ نہیں چاہتا کہ گاؤں کے اسکول ماسٹر کی طرح دکھائی پڑوں ۔

یہ : آپ اپنے بازو پہ ایک ہلکا سا گرمی کا اوورکوٹ ہی ڈال لیں ۔ اگر ہم لوگ ابھی باہر چلنے کے لئے نکلیں ؟

وہ : نہیں ۔ یہ بھی حد سے زیادہ نامعقول ہوتا ہے ۔

یہ : مختصر یہ کہ میرے دوست ، آپ نا اصلاح پذیر ہیں ۔

وہ : کیا آج سردی ہے ؟

یہ : پندرہ ڈگری (درجہ) صفر سے نیچے ہے ۔

وہ : کیا دریا منجمد ہے ؟

یہ : اسکیٹرس (Skaters) (کھڑاؤں پہن کر برف پہ چلنے والوں) سے ڈھنکا ہوا ہے ۔

وہ : کیا وہاں کہر ہے ؟

یہ : ٹھنڈ تو کسی قدر سخت ہے ، مگر آسمان صاف ہے ۔

وہ : اتنا تو اچھا ہے ۔ (غنیمت ہے)

یہ : اگر آپ کو باہر جانا ہو ، تو اپنا لبادہ لے لیجئے گا ۔ وہ بہت سخت جم جاتا ہے ۔

یہ : کیا وہ شیشہ جڑا ہوا پالا ہے ؟

وہ : نہیں ، وہ پھسلتا نہیں ہے ۔

یہ : کیا برف بہت گرا ہے ؟

وہ : ساری رات برف گرتا رہا ہے ۔

یہ : تب تو موسم کو زیادہ نرم (معتدل) ہونا چاہیئے ۔

وہ : ہاں ہے تو ، کل شام تھرمامیٹر (مقیاس حرارت) نیچے گر گیا اور بیس دقیقہ پہ پہنچا تھا ۔

یہ : بیس ڈگری ! کیا یہ ممکن ہے ؟ واقعی ، میں خیال کرنے لگا ہوں کہ ہمارا کرۂ ارض سرد ہوتا جاتا ہے ۔

وہ : کیا کر لیجئے گا ؟ وہ بوڑھا بھی تو ہوتا جاتا ہے ۔

یہ : ہر حالت میں ، میں تو سرد و خشک کو نمکین غیر صحت بخش موسم پر ترجیح دیتا ہوں ۔

وہ : میں بھی آپ کی رائے سے متفق ہوں ، لیکن جب تکلف پیش آجائے تو ہم کو برداشت کرنا چاہیئے ۔

یہ : اس کا تو ذکر ہی نہ کیجئے ، میں تھکن سے ، پگھلنے والے برف سے ، بارش سے ، کہرے سے ، اور اس کے تمام مرکبات و مصنوعات سے نفرت کرتا ہوں ۔

وہ : آپ کے لئے دائمی بہار رہنا چاہیئے ؟

یہ : میں تو اس کو بہت اچھی طرح پسند کروں گا ۔

وہ : تو اس کرۂ زمین کو چھوڑ دیجئے اور ایلیزین فیلڈ میں[1] Elysian Fields کو چلے جائیے ۔

یہ : آپ کے اس مشورہ کا کمال درجہ ممنون ہوں ، وقت آئے گا تو اس پر عمل کروں گا ۔

(فرانسیسی سے ترجمہ)　(سید) اولاد احمد (صمدانی)

---

[1] ایلیزیم سے منسوب ہے ۔ وہ جگہ جہاں ارواح طیبہ مرنے کے بعد تفویض کر دی جاتی ہیں ۔ مقصود ، وہ مقامات جو نفیس سے نفیس و فرحت بخش ہیں ۔ بہشت ۔

جلّاد

ابھی ابھی شہر مینڈا کے گھنٹہ گھر کی گھڑی نے رات کے بارہ بجائے تھے - قلعہ کی چھت پر دیوار کا سہارا لئے ہوئے جو فرانسیسی سپاہی کھڑا تھا وہ غیر معمولی طور پر متفکر سا معلوم ہو رہا تھا - اس کے آس پاس کی فضا میں بھی سکوت کا عالم طاری تھا -

اگرچہ اسپین کا تاروں بھرا آسمان اس کے سر پر تھا - مگر وہ نیچے کی جانب چھوٹے چھوٹے درختوں کی ایک قطار کو دیکھ رہا تھا جو سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی اوپر چڑھ آئی تھی - چاند کی روشنی سے یہ کوہستانی خطہ جگمگا رہا تھا - اور دور ـــ اونچے اونچے پہاڑوں پر جمی ہوئی برف چاندی کی طرح چمک رہی تھی - یہ سپاہی کبھی کبھی نیچے بسے ہوئے شہر مینڈا کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا - جو باد جنوب کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہنے کے لئے دامن کوہ میں چھپا ہوا تھا اور اسی شہر کے کنارے والے پہاڑ کی چوٹی پر یہ قلعہ تھا جہاں سپاہی کھڑا ہوا فطرت کے رنگین مناظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا - تھوڑی دیر کے بعد جب سپاہی نے گردن پھیری تو اس کی نظر سطح سمندر پر پہنچی - قلعہ کے جھروکے سے اندر کی روشنی دکھائی دے رہی تھی - وہاں کے رقص و سرود کی آواز سمندر کی کل کل کے ساتھ مل کر فضائے بسیط میں لہرا رہی تھی - ٹھنڈی ہوا دن بھر کی محنت کی ماندگی کو سپاہی کے جسم سے دور کر رہی تھی -

مینڈا کا قلعہ اسپین کے ایک معزز خاندان کی ملکیت تھا - اس خاندان کے تمام افراد اب تک اسی قلعہ میں رہتے تھے - آج شام کو اسی قلعہ کی ایک دوشیزہ اس فرانسیسی سپاہی کی جانب ایسی عجیب آنکھوں سے دیکھ رہی تھی کہ نوجوان سپاہی اپنے دل میں نہ جانے کیا کیا مسرت آگیں خواب دیکھنے لگا تھا - اگرچہ وہ لڑکی اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد نہیں تھی - پھر بھی سپاہی سوچ رہا تھا کہ اس لڑکی کی شادی کا جہیز معمولی نہیں ہوگا - اس کے باپ مارکس کی جائداد کی دھاک ملک بھر میں پھیلی ہوئی تھی - لیکن رہ رہ کر اس کے دل میں یہ خیال بھی پیدا ہو جاتا تھا کہ جو مارکس عزت اور دولت کے لئے سارے اسپین میں مشہور ہے - جس کے مقابلہ کا اس ملک میں ایک بھی خاندان نہیں ہے - وہ اپنی لڑکی کو پیرس کے ایک معمولی سپاہی کے ہاتھ کیسے سپرد کر سکتا ہے - اوّل تو خاندانی فضیلت کا احساس پھر اس ملک میں کسی فرانسیسی کو کوئی بھی فرد بشر اچھی نظر سے نہیں دیکھتا تھا -

اسپین کے تقریباً تمام لوگ فرانسیسیوں کے خلاف تھے - فرانسیسی سپہ سالار کو معلوم تھا کہ مارکس اپنے ملک کے آدمیوں کو اسپین کے سابق بادشاہ . . . فارڈینینٹ ہفتم کے حق میں ابھار رہا ہے - یہی وجہ تھی کہ ہکٹر کی فوج نے مینڈا میں آکر ڈیرا جمایا تھا - ان کا خیال تھا کہ اس طرح مینڈا اور اس کے قرب و جوار کے لوگ خوف سے مغلوب رہیں گے - سپہ سالار اعظم نے یہ خبر بھی بھیجی تھی کہ حکومت برطانیہ جلد ہی اسپین کی بندرگاہ پر اپنی فوج اتارنے کی کوشش کرے گی اور اس کام میں مارکس ان کی امداد کرے گا -

اگرچہ اسپین کے باشندوں نے اس فرانسیسی فوج کی بڑی خاطر مدارات کی تھی - مگر پھر بھی ہکٹر اور اس کی فوج ان کے اس فعل کو شبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے - چھت پر گھومتا ہوا ہکٹر اپنے دل میں خیال آرائی کر رہا تھا - "مارکس کے اس دوستانہ رویہ کا کیا مطلب ہو سکتا ہے - ملک کی صورت حالات کافی بہتر ہے اور فضا میں انتشار پیدا ہونے کا کوئی خطرہ نہیں ہے - پھر سپہ سالار اعظم اسقدر کیوں گھبرا رہے ہیں ؟" معاً اس کی توجہ شہر مینڈا کی جانب مبذول ہوئی - سینٹ جیمس کی تقریب کا وقت ہوتے ہوئے بھی ہکٹر نے یہ حکم جاری کر رکھا تھا کہ آئین عسکریت کے مطابق جتنی دیر تک روشنی رہ سکتی ہے اس سے ایک لمحہ بھی زیادہ شمع نہیں جلائی جائے - صرف قلعہ کی چہار دیواری کے اندر رہنے والوں کے لئے اس قانون کی پابندی ضروری نہیں تھی - اس کے اس حکم پر عمل درآمد ہو رہا ہے یا نہیں ؟ یہ دیکھنے کے لئے فوجی سپاہی شہر بھر میں گشت لگا رہے تھے - ان گشت لگانے والوں کی سنگینوں کی نوک مختلف مقامات پر چمکتی ہوئی نظر آ رہی تھی - شہر میں ہولناک خاموشی چھائی ہوئی تھی - اس کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے کہ شہر کے باشندے اس وقت تقریب میں مست ہوں گے - تھوڑی دیر تک ہکٹر خود بھی اس امر کو سوچتا رہا - کہ آج میرا حکم کیوں نہیں مانا گیا - لیکن وہ کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکا - ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے چند سپاہیوں کو حکم دیا تھا کہ گھوم کر شہر کی صورت حال کا پتہ لگاؤ اور یہ کہ کون کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے -

نوجوانی کے جوش میں ہکٹر کی یہ خواہش ہوئی کہ وہ قلعہ کی ٹوٹی ہوئی دیوار سے نیچے کود جائے - پہاڑ کے برابر برابر جانے سے وہ جلد ہی اس گھاٹی کے قریب پہنچ سکتا تھا جو شہر میں داخل ہونے کے راستہ سے ملحق تھی - سیدھے راستہ سے وہاں تک جانے میں کافی وقت صرف ہوتا تھا - لیکن دفعتاً اس

کے کان میں کوئی آواز آئی۔ اور وہ رک گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ قلعہ میں جو کنکریٹ بچھا ہوا راستہ ہے۔ اس پر کوئی عورت آہستہ آہستہ قدم رکھتی ہوئی آ رہی ہے۔ مگر جب ہکٹر نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو کچھ بھی نہیں تھا۔

پہلے تو ہکٹر کی آنکھیں چاند کی تیز شعاعوں سے خیرہ ہو گئیں لیکن دوسرے ہی لمحہ اس نے جو کچھ دیکھا اس سے وہ حیرت میں پڑ گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اسے فریبِ نظر تو نہیں ہو رہا ہے۔ نکھری ہوئی چاندنی میں بہت دُور دور کی اشیا بھی صاف معلوم ہو رہی تھیں۔ اس نے بہت فاصلے پر جہازوں کے مستول دیکھے اور اس کے جسم میں ارتعاش پیدا ہو گیا۔ وہ اپنے دل کو یہ سمجھانے کی کوشش کرنے لگا کہ سمندر کی لہروں پر چاند کی روشنی پڑنے سے یہ سب کچھ معلوم ہو رہا ہے۔ اچانک اس نے محسوس کیا کہ کوئی بہت نحیف آواز میں اس کا نام لیکر پکار رہا ہے۔ ہکٹر نے ٹوٹی ہوئی دیوار کی جانب نظر اُٹھا کر دیکھا۔ ایک سپاہی آہستہ آہستہ اس کی طرف آ رہا تھا۔ بغور دیکھنے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ یہ آدمی اسی کی فوج کا ایک گولا انداز ہے۔

"کیا آپ ہی سپہ سالار ہیں؟"

ہکٹر نے جواب دیا۔ "میں ہی ہوں۔ معاملہ کیا ہے؟"

وہ یہ سمجھ کر ہوشیار ہو گیا کہ جلد ہی کوئی آفت آنے والی ہے۔

"شہر کے رہنے والے سانپ کی طرح اِدھر اُدھر گھوم رہے ہیں۔ میں اطلاع دینے کے لئے آپ کے پاس آیا تھا کہ میں نے کیا دیکھا۔"

"ہاں کہو۔"

"ایک آدمی ہاتھ میں لالٹین لئے ہوئے قلعہ سے نکل کر ادھر آ رہا تھا۔ میں اس کے تعاقب میں لگ گیا۔ لالٹین دیکھتے ہی مجھے شبہ ہو گیا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے کچھ دُور جانے کے بعد میں نے دیکھا کہ لکڑیوں کا بہت بڑا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ ...."

اچانک نیچے شہر میں کچھ شور سا بلند ہوا سپہ سالار ہکٹر کی آنکھوں میں ایک سفید روشنی کی جھلک دکھائی دی۔ چند قدموں کے فاصلہ پر دھائیں دھائیں کر کے آگ جل اٹھی اور وہ گولا انداز بندوق کی گولی سے مجروح ہو کر زمین پر گر پڑا۔ رقص و سرود کی آواز ایک دم بند ہو گئی۔ اس کی جگہ شہر سے مجروحین کی چیخ و پکار کی آواز آ آ کر کانوں کے پردے پھاڑنے لگی۔ اس کے بعد سمندر کی سفید لہروں کے آگے سے توپوں کی ہولناک گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ نوجوان سپہ سالار کے جسم سے موت کا سا پسینہ بہنے لگا۔ وہ آج اپنی تلوار بھی ساتھ نہیں لایا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کے سارے سپاہی مارے گئے ہیں اور انگریزی فوج ساحلِ سمندر پر اُترنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اگر وہ بچ گیا تو اسے بڑی بدنامی اور رسوائی کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ اسی خیال کے ماتحت وہ اپنے آپ کو فوجی عدالت کے سامنے کھڑا ہوا محسوس کرنے لگا۔ اس توہین آمیز مستقبل کے خطرے کے پیش نظر مر جانا بہتر سمجھ کر وہ پہاڑ سے کود جانا ہی چاہتا تھا کہ کلارا کے ہاتھ نے اسے روک لیا۔

"یہاں سے فوراً بھاگ جاؤ" کلارا نے کہا "میرے بھائی میرے پیچھے پیچھے تمہیں ہلاک کرنے کے لئے آ رہے ہیں۔ اس پہاڑ کے نیچے میرے بھائی کا ایک گھوڑا بندھا ہوا ہے۔ اس پر سوار ہو کر چلے جاؤ۔"

ہکٹر جانا نہیں چاہتا تھا۔ مگر کلارا نے اُسے زبردستی آگے بڑھا دیا۔ تھوڑی دیر تک ہکٹر خاموش نگاہوں سے کلارا کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اچانک حفظِ جان کا خیال آیا اور وہ کلارا کے بتائے ہوئے راستہ سے نیچے اُتر گیا۔

وہ پہاڑ کے بڑے بڑے پتھروں پر پیر رکھتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ یہ راستہ جنگلی جانوروں کے سوا کسی کے استعمال میں نہیں تھا۔ تھوڑی دُور جانے کے بعد اس نے سنا کہ کلارا فرانسیسی سپہ سالار کو پکڑنے کے لئے آواز دے رہی ہے۔ اس کے کانوں میں دشمنوں کے قدموں کی آواز آنے لگی۔ کئی مرتبہ اس کے کانوں کے پاس سے بندوق کی گولیاں سنسناتی ہوئی نکل گئیں۔ لیکن وہ گرتے پڑتے کسی طرح گھوڑے کے پاس پہنچ گیا اور اس پر سوار ہو کر فرار ہو گیا۔

کئی گھنٹے کے بعد نوجوان ہکٹر سپہ سالارِ اعظم کے پاس کیمپ میں پہنچا۔ سپہ سالارِ اعظم اس وقت چھوٹے چھوٹے حکام کے ساتھ کوچ کی تیاری کر رہا تھا۔

میز کا کے جھکتے ہوئے اس سپہ سالار نے کہا:۔

"میں آپ کو اپنی زندگی حوالے کرتا ہوں۔"

اس کے بعد اس نے میز کی ہولناک کہانی شروع سے آخر تک سنائی اور کیمپ کی خوشگوار فضا میں حیرت انگیز خاموشی طاری ہو گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد سپہ سالارِ اعظم نے کہا:۔

"میرا خیال ہے کہ تمہیں سزا دینے کے بجائے تم پر رحم کرنے کی ضرورت ہے۔ اسپینیوں کی اس فریب کاری کے تم ذمہ دار نہیں ہو۔ اگر مارشل کو کچھ نقصان نہ پہنچا تو تمہیں چھوڑ دیا جائے گا۔"

"جب ہز مجسٹی کو یہ واقعہ معلوم ہوگا تو کیا ہوگا؟"

"وہ تمہیں گولی سے اڑا دینے کا حکم دیں گے۔" سپہ سالار اعظم نے جواب دیا۔ "مگر اس وقت کی بات اسی وقت ہو گی۔ ابھی تو مینڈا پر توجہ مرکوز کرنی چاہیئے۔ ہمیں انتقام لینے کی ایسی ترکیب زیر عمل لانی ہو گی جس سے اس ملک کے باشندے کچھ روز تک پھر سر اٹھانے کی ہمت نہ کر سکیں۔ اسپینی باشندے نہایت غیر مہذب اور وحشی ہیں۔"

ایک گھنٹے کے اندر پیدل اور گھوڑ سوار افواج توپوں کے ساتھ سپہ سالار اعظم اور ہکٹر کی قیادت میں مینڈا کی جانب روانہ ہوئیں۔ فوج کے تمام افراد غصہ میں دیوانے ہو رہے تھے۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ اسپینیوں نے ان کے ساتھیوں کے ساتھ کیسا بے رحمانہ سلوک کیا ہے۔

افواج نے اپنے کیمپ سے مینڈا تک کا راستہ اس عجلت کے ساتھ طے کیا کہ سپہ سالار اعظم بھی حیرت میں پڑ گئے۔ اس راستہ میں جو موضوعات جنگ کے لئے تیار ملے انہیں محصور کر کے ان کے باشندوں کو بندوق اور تلوار کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

مینڈا پہنچنے پر یہ دیکھا گیا کہ انگریزوں کے وہ جہاز ابھی تک سمندر میں تھے۔ اور ان کے آدمی ساحل پر نہیں اترے ہیں۔ پہلے تو ان لوگوں نے اس کا مطلب ہی نہیں سمجھا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ ان جہازوں پر فوج نہیں ہے۔ بلکہ اسلحہ جات ہیں۔ فوج کو لیکر جو جہاز آ رہے تھے وہ انہیں پیچھے چھوڑ کر پہلے آ پہنچے تھے۔ چنانچہ مینڈا کے باشندوں کو امداد نہیں مل سکی۔ اور ان کے لڑنے کے لئے تیار ہونے سے پہلے ہی فرانسیسی فوج نے ان کا محاصرہ کر لیا۔

مینڈا کے باشندوں نے خوف و ہراس میں آ کر ان کی اطاعت قبول کر لی۔ جنہوں نے ہکٹر کی فوج کے آدمیوں کو ہلاک کیا تھا۔ انہوں نے بھی شہر کو مزید خون ریزی سے محفوظ رکھنے کے لئے معافی مانگ لی۔ سپہ سالار اعظم کے سخت گیر رویہ کو سب لوگ جانتے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ شہر میں آگ لگانے اور وہاں کے باشندوں کو قتل کرنے کا حکم جاری کیا جائے گا۔ مگر خوش نصیبی سے سپہ سالار اعظم نے اس قسم کے حکم کا اجرا نہیں کیا۔ وہ شہر مینڈا کو اس شرط پر معاف کرنے کے لئے تیار ہوئے کہ محل میں رہنے والے جتنے آدمی ہیں۔ مالک سے لیکر نوکر تک ہمارے قبضہ میں کر دئے جائیں۔ اسپینی لوگ اس پر راضی ہو گئے۔ سپہ سالار اعظم نے اس بات کا سخت حکم دیدیا۔ کہ فوج شہر میں لوٹ مار نہ کرے اور نہ آگ لگائے۔ لیکن باشندگان مینڈا پر زبردست جرمانہ کیا گیا۔ چوبیس گھنٹے کے اندر جرمانہ کی رقم وصول کرنے کے لئے شہر کے بڑے بڑے دولتمندوں کو قید میں رکھا گیا۔

سپہ سالار اعظم نے اس مرتبہ اس بات پر خاص طور سے توجہ رکھی کہ پہلے جیسا ہنگامہ پھر نہ ہو جائے۔ شہر کی حفاظت کا کافی انتظام کیا گیا۔ اور یہ بھی حکم جاری کیا گیا کہ کوئی سپاہی کسی شہری باشندے کے گھر کھانا نہ کھائے۔ اس طرح تمام انتظامات از سر نو مکمل کر کے فاتح عسکری کی طرح سپہ سالار اعظم قلعہ میں پہنچے۔ مارکس کے خاندان کے تمام افراد ہاتھ پیر باندھ کر رقص خانہ میں قید کر دئے گئے تھے۔ باہر بہت سخت پہرے کا انتظام تھا۔

اسی وقت فرانسیسیوں کی ایک غیر معمولی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں اس امر پر غور کیا گیا کہ انگریزی جہاز ساحل پر آنے سے کس طرح روکے جائیں اور انہیں آئندہ کیا کرنا چاہیئے۔ اس کے بعد منظور شدہ قرارداد کے مطابق ساحل سمندر پر توپوں کی قطاریں لگا دی گئیں۔ اس کام سے فراغت پانے پر سپہ سالار اعظم نے قیدیوں کی جانب توجہ مبذول کی۔ اور شہر کا جلاد بلایا گیا۔ اس درمیان میں ہکٹر محل میں جا کر قیدیوں سے مل آیا تھا۔ اس نے سپہ سالار اعظم سے کہا:-

"میں آپ سے کچھ رحم کی التجا کرنا چاہتا ہوں۔"

سپہ سالار اعظم نے حیرت اور استعجاب کے ساتھ کہا "تم ——؟"

"ہاں!" ہکٹر نے کہا "بہت زیادہ نہیں۔ مارکس نے پھانسی تیار ہوتے دیکھی ہے۔ وہ التجا کرتے ہیں کہ مارکس کے خاندان کو پھانسی کے بجائے ذبح کرنے کا حکم دیا جائے۔"

"خیر ایسا ہی ہو گا" سپہ سالار اعظم نے کہا۔

"وہ اور بھی کچھ رعایت چاہتے ہیں۔" ہکٹر نے کہا۔ "وہ چاہتے ہیں کہ انہیں ہلاک کرنے سے پہلے مذہبی پیشوا کو بلا دیا جائے اور ہاتھ پیر کی بندش کھول دی جائے۔ وہ یقین دلاتے ہیں کہ فرار ہونے کی کوشش نہیں کی جائے گی۔"

سپہ سالار اعظم نے کہا "اچھا! ان سب کے لئے تم ذمہ دار ہو۔"

"بوڑھے مارکس اپنی ساری جائداد دینے کو تیار ہیں اگر ان کے چھوٹے لڑکے کو قتل نہ کیا جائے۔"

"ایسی بات ہے! مگر افسوس کہ ان کی ساری جائداد پہلے ہی ضبط ہو چکی ہے۔"

تھوڑی دیر کے توقف کے بعد سپہ سالار اعظم نے پھر کہا:-

"مارکس جتنی رعایت چاہتے ہیں میں اس سے بھی زیادہ دینے کو تیار ہوں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ عقلمند مارکس ایک لڑکے کی زندگی

کے لئے کیوں بھیک مانگ رہے ہیں۔ وہ اپنی نسل کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ خیر میں ایسا انتظام کروں گا۔ کہ جہاں بھی کوئی مارکس کا نام سنے گا ان کی فریب کاری اور انتقام کی تصویر سامنے آجائے گی۔ مارکس کا جو لڑکا جلادی کا کام کرے گا۔ اسے جائداد اور معافی دونوں ملے گی۔ جاؤ اس کے متعلق اب میں کچھ اور سننا نہیں چاہتا۔"

شام کو کھانے کے وقت ہکٹر موجود نہیں تھا۔ وہ ادھر ادھر گھوم پھر کر رقص خانہ میں پہنچا۔ وہ چاروں طرف یاس انگیز نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ صرف ایک دن پہلے اسی کمرے میں اس نے خاندان مارکس کو ہنستے کھیلتے اور ناچتے گاتے دیکھا تھا۔ اب چند گھنٹوں میں یہ خوبصورت لڑکی اور خوبصورت جسم والے نوجوان جلاد کے تیشے سے ہلاک کئے جائیں گے۔ ہکٹر یہ خیال کرکے کانپ گیا۔ ان قیدیوں کے سامنے ہی ان کے آٹھ نوکر بھی بندھے ہوئے تھے۔ سزائے موت پاتے ہوئے قربانی کے یہ بکرے ایک دوسرے کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اگرچہ ان کی نظروں سے دل کی کیفیت کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ مگر یہ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ مادر وطن کو آزاد کرنے میں ناکامیاب ہو جانے کا سب سے بڑا غم ان قیدیوں کے دل میں موجود ہے۔

جو سپاہی ان کے پہرے پر معین تھے وہ بھی اپنے دشمن کی ہولناک حالت دیکھ کر کانپ اٹھے اور زبانِ خاموشی سے سپہ سالار اعظم کے حکم کے خلاف احتجاج کرنے لگے۔

ہکٹر کے اندر داخل ہوتے ہی سپاہیوں پر ایک رعب سا طاری ہو گیا۔ اس نے آتے ہی حکم دیا کہ قیدیوں کو کھول دو۔ کلارا کے ہاتھ اس نے خود کھولے۔ کلارا نے حسرت بھری نگاہوں سے ہکٹر کو دیکھا۔ ہکٹر اس کے چھوٹے چھوٹے نازک اور دودھ سے زیادہ سفید ہاتھوں کو مس کرنے کی خواہش کو نہیں روک سکا کیسی خوبصورت لڑکی ہے۔ اس کے بال اور آنکھیں گہری کالی تھیں۔ قد بھی ذرا مست دلربا تھا۔

کلارا نے پوچھا:۔ "کیا آپ کامیاب ہوئے؟"

ہکٹر کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ ایک بار کلارا کی جانب دیکھ کر پھر اس کے بھائیوں کو دیکھنے لگا۔ بڑے بھائی کی عمر تیس کے قریب تھی۔ وہ نہ تو زیادہ لمبا تھا اور نہ اس کے جسم کا ڈھانچہ ہی کچھ بہتر تھا۔ اس کا نام جووانیرا تھا۔ دوسرے بھائی کا نام فلپ تھا۔ وہ اپنی بہن کلارا کی طرح خوبصورت تھا۔ ان سب کی طرف دیکھ کر ہکٹر کا دل ناامیدی سے بھر گیا۔ ان لوگوں کے سامنے سپہ سالار اعظم کی تجویز کس طرح رکھی جائے؟ خیر! کچھ غور و خوض کرنے کے بعد ہکٹر نے کلارا کے سامنے یہ اندوہناک تجویز رکھی۔ سنتے ہی کلارا کی روح اور دل میں ارتعاش پیدا ہو گیا۔ پھر اس نے کچھ سوچا اور آہستہ آہستہ اپنے آپ کو قربانی کے لئے تیار کرکے باپ کے قدموں پر گھٹنے ٹیک کر جھک گئی اور بولی:۔

"پاپا! جووانیرا سے یہ عہد کرنے کے لئے کہئے۔ آپ کا حکم چاہے کیسا ہی خطرناک کیوں نہ ہو وہ انکار نہیں کر سکتا۔ اور پھر ایسی حالت میں ہمیں موت بھی آرام کے ساتھ آئے گی۔"

کلارا کی بات سن کر بڈھے مارکس کے چہرے پر امید کے آثار رونما ہوئے۔ لیکن سپہ سالار اعظم کی تجویز سن کر وہ بے ہوش ہو گئی۔ جووانیرا بھی سمجھ گیا کہ آج اس کا امتحان ہونے والا ہے۔ وہ پنجرے میں مقید شیر کی طرح ایک بار اچھل پڑا۔ مارکس کے حکم کی پابندی کی منظوری لیکر ہکٹر نے پہرہ داروں کو ہٹا دیا۔ مارکس کے نوکر پھانسی پر لٹکانے کے لئے باہر لے جائے گئے۔ اب وہاں صرف ہکٹر رہ گیا تھا۔ مارکس نے کھڑے ہو کر آواز دی:۔

"جووانیرا!"

جووانیرا نے صاف کہہ دیا کہ وہ اس شرط پر راضی نہیں ہے۔ وہ کچھ عجیب آنکھوں سے اپنے ماں باپ کی جانب دیکھنے لگا۔ کلارا اس کے پاس جا کر اس سے لپٹ گئی اور اس کی آنکھوں کا بوسہ لے کر بولی:۔

"بھائی! شاید تمہیں معلوم نہیں کہ تمہارے ہاتھوں سے ہماری موت کتنی پیاری اور شیریں ہو گی اور ہم فرانسیسی جلاد کی سخت گیری سے بھی بچ جائیں گے۔ اس کے علاوہ مستقبل میں آنے والی تمام مصیبتوں کا کانٹا بھی دور ہو جائے گا۔ بھائی! تم تو مجھے بہت پیار کرتے تھے۔ آج تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

اتنا کہہ کر کلارا نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے آتش بار نظروں سے ہکٹر کی جانب دیکھا۔ وہ اپنے بھائی جووانیرا کے دل میں فرانسیسیوں کے خلاف جذبۂ منافرت ابھار دینا چاہتی تھی۔

فلپ نے کہا:۔ بھائی ہمت سے کام لو۔ ورنہ ہمارے اتنے بڑے خاندان کا جو شاہی خاندان سے کسی حالت میں بھی کم نہیں ہے خاتمہ ہو جائے گا۔"

فوراً ہی کلارا اٹھ کھڑی ہوئی۔ جووانیرا کے قریب سے سب لوگ ہٹ گئے۔ مارکس نے اس کے پاس آکر کہا:۔

"جوواتیرا! میں تمہیں حکم دیتا ہوں۔"

کاؤنٹ جوونیرا نے کچھ جواب نہیں دیا۔ مارکس اُس کے سامنے دوزانو ہوکر بیٹھ گیا۔ دوسرے افراد نے بھی اُس کا ساتھ دیا۔ یعنی سب لوگ جوواتیرا سے درخواست کرنے لگے کہ خاندانی تحفظ تمہارا فرض ہے۔

مارکس نے کہا: "بیٹا! کیا تم میں اسپینیوں سی شجاعت اور ہمت بالکل ہی نہیں ہے؟ کیا تم مجھے فقیروں کی طرح گھٹنا ٹیک کر بیٹھا ہوا دیکھنا چاہتے ہو؟ تمہیں اپنی زندگی اور خوشی کے متعلق سوچنے کا کیا حق ہے؟"

پھر اپنی بیوی کی جانب دیکھ کر بولا: "کیا سچ مچ یہ میرا لڑکا ہے؟"

ماں نے بیٹے کی کمزوری کو محسوس کیا اور اسے مشتعل کرنے کے لئے بولی: "ضرور یہ راضی ہوگا۔ اور اپنے فرائض کی تکمیل کرے گا۔"

جوواتیرا نے ایک مرتبہ چاروں طرف دیکھا۔ اُس کی بے پناہ نظروں کا مطلب اُس کی ماں کے سوا اور کوئی نہیں سمجھ سکا۔

کلارا کی چھوٹی بہن ماں سے لپٹی ہوئی رو رہی تھی اور چھوٹا بھائی میئوئل اُسے تسلی دے رہا تھا۔ اسی وقت خاندان مارکس کے پیشوا آپہنچے۔ ہکٹر اس منظر کو نہیں دیکھ سکا۔ وہ کلارا سے اشاروں میں کچھ گفتگو کر کے ان لوگوں کی زندگیوں کی حفاظت کرنے کے لئے مزید کوشش کے پیش نظر باہر چلا گیا۔ ہکٹر جب سپہ سالار اعظم کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ وہ بہت مسرور ہیں اور وہاں بوتل کی سُرخ پری حلق میں اتاری جا رہی ہے۔

ایک گھنٹے کے بعد سپہ سالار اعظم نے باشندگان مینڈا کو اس غرض سے بلایا کہ وہ لوگ خاندان مارکس کی ہلاکت کا عبرت انگیز تماشہ دیکھیں۔ فوج شہر میں پہرا دینے لگی اور وہاں کے باشندوں کو گھما پھرا کر وہیں لایا گیا جہاں مارکس کے نوکروں کو پھانسی دی گئی تھی۔ قریب ہی ایک قربان گاہ تھی۔ اُس کے پاس ایک جلاد اس غرض سے تیشہ لئے ہوئے کھڑا تھا کہ اگر جوواتیرا نے آخر دم تک انکار کیا تو یہ ان سب کا کام تمام کر دے۔

چاروں طرف انتہائی سکوت کا عالم تھا۔ لیکن کچھ وقفہ کے بعد سپاہیوں کے پیروں کی چاپ سے فضا میں انتشار پیدا ہوگیا۔ ان کے اسلحہ جات کی جھنکار اور بوٹ کی کرخت آواز کے ساتھ فرانسیسی فوجی افسروں کے ہنسنے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔

سب لوگوں نے محل کی جانب دیکھا۔ خاندان مارکس آہستہ آہستہ آگے بڑھا آ رہا تھا۔ سارے خاندان کا منہ متفکر اور ساکن تھا۔ لیکن ایک آدمی کا نپتا ہوا پادری کا سہارا لئے ہوئے آ رہا تھا اور پادری اس کے کان میں کچھ کہہ رہا تھا۔ اُس کو اپنی جان بچانی ہی پڑے گی۔ سب لوگ سمجھ گئے کہ جوواتیرا اس نفرت انگیز کام کے لئے تیار ہوگیا ہے۔ مارکس، لیڈی مارکس۔ دونوں لڑکے اور دونوں لڑکیاں قربان گاہ سے کچھ فاصلہ پر بیٹھ گئیں۔ جوواتیرا کو اس کام کی تعلیم دینے کے لئے جلاد اُسے ایک طرف لے گیا۔ پادری نے مارکس کے خاندان کو اس طریقہ سے سمجھایا کہ ان میں سے کوئی کسی کو مرتے ہوئے نہ دیکھ سکے۔ وہ تمام کے تمام سچے اسپینیوں کی طرح ہمت کے ساتھ غرور سے سر اونچا کئے ہوئے تھے۔

کلارا سب سے پہلے جوواتیرا کے پاس جا کر بولی:-

"جوواتیرا! مجھ میں ہمت کم ہے اس لئے پہلے مجھے قتل کرو۔"

اس وقت کسی کے دوڑ کر آنے کی آواز سنائی دی اور فوراً ہی ہکٹر آموجود ہوا۔ کلارا اُس وقت قربان گاہ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ہکٹر کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ وہ مشکل سے لڑکھڑاتا ہوا کلارا کے پاس پہنچا اور مرتعش آواز میں بولا:-

"میری محسنہ! سپہ سالار اعظم نے تمہیں اس شرط پر رہا کرنا منظور کیا ہے کہ تم میرے ساتھ شادی کرنے کا وعدہ کرو۔"

کلارا نے ایک مرتبہ ہکٹر کو محبت اور پھر ناراضمندی کی نظروں سے دیکھا اور جوواتیرا سے کہا:-

"جوواتیرا! میں تیار ہوں۔"

کلارا کا سر تن سے جدا ہو کر ہکٹر کے قدموں پر گر پڑا۔ لیڈی مارکس کے منہ سے ایک خفیف سی چیخ نکلی۔ مگر وہ فوراً ہی سنبھل گئی۔

نوعمر میئوئل نے آگے بڑھ کر اپنے بھائی سے پوچھا:-

"جوواتیرا! کیا میں یہیں کھڑا رہوں گا؟"

دوسرے لمحہ اُس کا سر بھی ایک طرف پڑا ہوا تھا۔

"ہاں! جوواتیرا میری توجہ تمہاری طرف ہے۔" ہمت کے ساتھ اس کی دوسری بہن نے کہا۔

اس کی لاش بھی فرش زمین پر تڑپ رہی تھی۔

اب بوڑھا مارکس آگے بڑھا اور اُس نے قربان گاہ کی طرف دیکھا جو اُس کے خاندان کے خون سے سرخ ہو رہی تھی۔ اُس نے عوام کو مخاطب کرتے ہوئے بلند آواز میں کہا:-

"اسپین کے باشندو! تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ میں اپنے بیٹے کو دعائیں دیکر جا رہا ہوں۔ جوواتیرا! وار کرو۔ تم بے قصور ہو۔"

اس کے باپ کا خون بھی خاندان کے دیگر افراد کے خون کے

ساتھ شامل ہو گیا۔

لیڈی مارکس جب پادری کا سہارا لئے ہوئے اس کے پاس پہنچی تو جوواتیرا نے چلّا کر کہا:۔

"ماں! تم نے مجھے اپنا دودھ پلا کر آدمی بنایا ہے۔ مجھے معاف کرو۔"

وہ سمجھ گئی کہ اس کا لڑکا ماں کو قتل نہیں کر سکتا۔ اس کے دل میں اتنی ہمّت پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ وہ دوڑ کر قلعہ کی دیوار سے نیچے کود پڑی اور اس طرح اس خاندان کی سنہری شمع بھی گل ہو گئی۔ مجمع سے "شاباس اور زندہ باد" کی آوازیں آئیں اور خاندان مارکس کا جلّاد بے ہوش ہو کر مدہوش زمین پر گر پڑا۔

نئے مارکس کو باشندگان اسپین بہت عقیدت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن کسی اندرونی صدمہ کے باعث جوواتیرا کی زندگی سوکھتی جا رہی ہے۔ وہ تنہائی میں رہتا ہے اور ہر ممکن طریقہ سے لوگوں کی نظروں سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس گناہ عظیم کے بوجھ نے سنگِ گراں کی طرح اس کی زندگی کو دبا رکھا ہے۔ بقائے نسل کے لئے ہی وہ ابھی تک زندہ ہے اس نے فیصلہ کیا ہے کہ ایک بچّہ ہوتے ہی وہ اپنے خاندان کی ان دھندلی تصویروں میں مل جائے گا جو اس کے ارد گرد گھومتی رہتی ہیں

(بالزک)

مترجمہ:۔ وحشی آروی

غزل

کیا زندگی نظارۂ خوباں کئے بغیر ۔۔۔ کیوں جی رہے ہیں زیست کا ساماں کئے بغیر

گو لاکھ ہو تقاضۂ غیرت مگر وہاں ۔۔۔ بنتی نہیں ہے منّتِ درباں کئے بغیر

آئینۂ خیال میں ہے جنّتِ جمال ۔۔۔ لیتا ہوں لطفِ سیرِ گلستاں کئے بغیر

آغوشِ ہر گناہ میں ہے تیغِ بے نیام ۔۔۔ کرتے ہیں ذبح قتل کا ساماں کئے بغیر

کیفیت اِک نگاہ میں سب اُن پہ کھل گئی ۔۔۔ اظہارِ کاوشِ غمِ پنہاں کئے بغیر

کرتا ہوں چھُپ کے دُور سے نظّارۂ جمال ۔۔۔ خود کو رہینِ منّتِ جاناں کئے بغیر

کیونکر گزر سکے گی محبّت میں زندگی ۔۔۔ دل کو شہیدِ جنبشِ مژگاں کئے بغیر

ضبطِ غمِ فراق کی یہ شان دیکھئے

جیتے ہیں ان کی دید کا ساماں کئے بغیر

حکیم نور احمد گلچیں

صفحۂ اطفال

مِس فلورا

(گذشتہ سے پیوستہ)

فلورا:- بات یہ ہے کہ میں انسان کو بُرا نہیں کہہ سکتی ۔
میرے ساتھ اسلم میاں اور ان کی بیگم کا سلوک
اتنا اچھا رہا ہے ۔کہ میں اسے زندگی بھر نہیں
بھولوں گی ۔ انہوں نے مجھے اولاد کی طرح پیار
محبت سے پالا ہے ۔ جو خود کھاتے تھے
مجھے کھلایا۔ اچھے سے اچھے کھانے، پھل پھلار
دودھ، مکھن، غرض دنیا بھر کی نعمتیں جو گھر میں
آتی تھیں ۔میرا حصہ ان میں ضرور ہوتا تھا ۔

یہی چمپا بہن جب زخمی ہو کر گھر میں گھُسیں ہیں
تو گھر کی بیوی انہیں دیکھ کر تڑپ گئیں تھیں ۔
فوراً انہیں نوکر کے ہاتھ وٹرنری ہسپتال بھجوایا۔
تھانے میں کتے والے کی رپٹ درج کرائی ۔
نوکر کو گھڑی گھڑی ان کی خبر کے لئے بھجواتی
رہیں ۔یہ گھر میں آئیں تو ڈیڑھ سیر دودھ روز
کا مقرر کر دیا گیا ۔جیک کے لئے راتب بندھا
ہوا ہے ۔ جاڑوں میں روئی دار جھول اس کے
اور میرے لئے بنوائی جاتی ہے ۔ گرمی سردی
میں سارا خیال رکھا جاتا ہے ۔ میں کیسے کہہ سکتی
ہوں ۔کہ انسان درندہ اور بے وفا ہے اور یوں
تو اچھے بُرے ہر صنف اور ہر قوم میں ہوتے
ہیں ۔ سارے بندر معصوم ہی نہیں ہو سکتے ۔ تمام
بلیاں نیک نہیں ہیں ۔ ایسے ہی انسانوں میں بھی
کچھ لوگ بُرے ہوں گے ۔ ان کی وجہ سے تمام
انسانوں کو بُرا نہیں کہا جا سکتا ۔

لالو:- مگر جانور ذات کی آزادی جانوروں میں رہنے
سے ہوتی ہے ۔ انسانوں کی زنجیر اور رسی میں
اسے آزاد نہیں کہہ سکتے ۔ زنجیر اگر سونے کی بھی
ہو اور رسی ریشمی بھی ہو ۔ آخر زنجیر اور رسی ہی ہے ۔
غلامی اور قید کی نشانی ۔

اپنی قوم میں رہ کر سُوکھے ٹکڑے بھی کھانے کو
ملیں تو وہ انسان کا غلام بن کر مرغن کھانوں سے
ہزار درجہ بہتر ہیں ۔

زندگی آزادی کا دوسرا نام ہے ۔ زندگی کا تصوّر
آزادی کے بغیر کیا ہی نہیں جا سکتا ۔ غلامی کی عمر
جاوداں سے آزادی کی ایک گھڑی بہتر ہے ۔ غلامی
کی زندگی سے آزادی کی موت اچھی ۔ اِس لعنت

میں انسان گرفتار ہیں۔ جانور برادری اس سے پاک
ہے۔ جانوروں کی چھوٹی سے چھوٹی اور کمزور
سے کمزور برادری اور اس کا ہر ممبر آزاد زندگی بسر
کرتا ہے۔ ہم میں کوئی کسی کا غلام نہیں۔
انسان اشرف المخلوقات بنتا ہے۔ مگر "جس
کی لاٹھی اُس کی بھینس" اس کی زندگی کا اصول
ہے۔ کمزور انسان طاقتور انسانوں کے غلام ہیں
اگر اشرف المخلوقات بن کر غلامی اور آقائی کا امتیاز
باقی رہے۔ تو ہم ایسے اشرف المخلوقات کو دور
ہی سے سلام کرتے ہیں۔

چمپا:۔ پھر یہی نہیں کہ اپنی برادری کے افراد کو غلام بنائیں
انسان ہم جانوروں کو بھی غلام بناتے ہیں۔ جس گھر
کو دیکھو۔ گائے، بھینس، بکری، ہرنی، بندر یا کسی
زنجیر سے بندھی نظر آئے گی۔ مرغیوں کے ڈربے
طوطوں کے پنجرے ہر انسانی گھر میں دکھائی دیتے
ہیں۔

لالو:۔ اچھا چھوڑو اب اس ذکر کو، برات کی رخصتی کا فکر
کرو۔ شام ہو چلی ہے۔

چمپا:۔ پیر اودہ بلاؤ شاہ صاحب۔ بسم اللہ کر کے نکاح
پڑھائیے!

لالو:۔ تم تو کہتی تھیں۔ پیر گگڑوں کوں نکاح پڑھائیں گے

چمپا:۔ میرا مطلب یہ تھا کہ اگر پیر اودہ بلاؤ شاہ تشریف
نہ لا سکیں۔ تو پیر ککڑوں کوں شاہ موجود ہیں۔

ککڑوں کوں:۔ مگر چمپا بہن اس علاقے کا قاضی میں
ہوں۔ ہر جانور برادری نکاح کے لئے مجھے
بلاتی ہے

لالو:۔ نکاح پیر ککڑوں کوں شاہ پڑھائیں اور پیر اودہ
بلاؤ شاہ کو بھی نکاحانہ دے دیا جائے۔ اس طرح
جھگڑا مٹ جائے گا۔

چمپا:۔ یہ ٹھیک ہے۔ اچھا پھر پیر صاحب کام شروع
کریں۔ پیر ککڑوں شاہ نے فلورا کا پنجہ چنوا کے
پنجے میں دے کر کہنا شروع کیا۔

"گاجر کی پلیدی، گلچیزو کے بھول
بول میاں چنوا تجھے فلورا قبول"

چنوا:۔ قبول۔ ہزار جان سے قبول۔

ککڑوں کوں:۔ مبارک۔ مبارک۔

سامنے چھوہارے رکھے تھے۔ وہ سب نے
مل کر لوٹ لئے۔

پیر ککڑوں شاہ نے نکاح کا خطبہ پڑھا اور
دعا مانگنی شروع کی۔

"اے صبح کی پہلی اذان دینے والے آسمانی
مرغے تو ہمارا سب سے بڑا مذہبی پیشوا ہے۔

اور خدا کا محبوب ہے - ہم سب پر مہربانی کی نظر رکھ! اس نکاح میں برکت دے - فلورا اور چنوا کا جوڑا صحیح سلامت رہے - پھولے پھلے - اور ان کی اولاد میں ایسے نیک نہاد نیدر پیدا کر - جو شاہ مانو رحمتہ اللہ علیہ کو ماننے والے اور ان کے حکموں کی پیروی کرنے والے ہوں - اس دعا پر سب نے آمین کہی اور رسم نکاح ختم ہو گئی - اس کے بعد چمپا نے مٹھائی اور نان حلوا پیش کیا - سارے براتیوں نے مل جل کر کھایا - پیر لکڑ ووں کوں کہنے لگے -

چمپا بہن نصیبن کی والدہ آجکل انڈے سہہ رہی ہیں - انہوں نے مجھ سے چلتے ہوئے آواز دے کر کہا تھا کہ چمپا بہن سے میرا حصّہ ضرور لانا - نہیں تو تمہیں وڑبے میں گھسنے نہ دوں گی - تو بہن نصیبن کی ماں کا حصّہ مجھے دے دینا - نہیں آج ہمارا وڑبا میدان جنگ بن جائے گا - تم اس کے مزاج سے واقف ہی ہو - پچھلے سال کا واقعہ تمہیں معلوم ہی ہے -

میں نے ایک دن کسی شرارت پر نصیبن کے دو پنجے مار دئے تھے - کمبخت نے اتنی سی بات پر میری کلغی زخمی کر دی اور سارے انڈے چھوڑ کر وڑبے سے باہر نکل آئی - محلّے بھر کی مرغیاں مرغے جمع ہو گئے - میں نے دونوں پنجے جوڑ کر معافی مانگی - تب جا کر وڑبے میں گھسی - تو میں اس سے بہت ڈرتا ہوں بہن - بھئی اس کا حصّہ میرے پہنچنے سے پہلے پہنچا دینا - نہیں میری کلغی اُدھڑی رکھی ہے - خدا ایسی بد مزاج مرغی سے ہر دوست دشمن مرغے کو بچائے - ایسی کمبخت ہے - اور تو اور مجھے اذان نہیں دینے دیتی - جہاں میں نے پر پھڑپھڑائے - اور اس نے ٹانگ لی - اُچھل اُچھل کر میری کلغی پر چونچیں مارنا شروع کر دیتی ہے - دیکھتی نہیں میری کلغی چھلنی ہوئی پڑی ہے - ایک دن تو شطارہ میری آنکھ ہی پھوڑنے پر تل گئی تھی - وہ تو سندھلی مرغی کا خدا بھلا کرے وہ بیچ میں آ گئی اور اس نے لعنت ملامت کر کے اسے وڑبے میں بٹھایا - محلّے کے مرغے مجھے طعنے دیتے ہیں کہ زن مرید ہو - سوئے پڑے رہتے ہو - اذان تک نہیں دیتے - کس کس سے کہتا پھروں کہ میرے وڑبے میں مرغی کے بھیس میں ایک خبیث رُوح گھسی رہتی ہے -

لالو :- پیر صاحب دوسروں ہی کی بیویوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ شوہروں کی خدمت کرو - ان کا حکم

مالو۔ اپنی جورو کو اتنا سر تیز بنا رکھا ہے۔ کہ اذان
بھی دینے نہیں دیتی۔ کل کو کہے گی کہ انڈے
بھی تمہیں سے لو۔ مجھ سے یہ جھنجھٹ نہیں
ہوتا۔ تو آپ کو انڈے بھی بیلنے پڑیں گے۔

پیر ککڑوں کوں:۔ کل کو کیا وہ تو مہینوں سے یہ کہہ رہی
ہے۔ اور کہہ کیا رہی ہے۔ دو بار انڈوں پر مجھے
بٹھا بھی چکی ہے۔ پچھلا جھول چودہ انڈوں کا
میں نے نکالا تھا۔ پھر دھمکی یہ تھی کہ ایک بھی انڈا
گندا ہوا تو کھال پر ایک پَر نہ چھوڑوں گی۔ میں
اس ڈر سے سارے انڈوں پر پَر پھیلائے بیس
دن تک پڑا رہا۔ راتوں کی نیند اور دنوں کی
سیر انڈوں کے سر صدقے کر دی۔ تب خدا خدا
کر کے چودہ کے چودہ بچے نکالے۔ دو دو وقت
بھوکا وڑبے میں انڈے سیتا رہا۔

بھئی لالو۔ یہ کل جگ ہے کل جگ۔ اب
تو نئی تعلیم یافتہ بیویاں خصم ہی بن کر رہنا پسند
کرتی ہیں۔ وہ دن گئے جب خلیل خاں فاختہ
اُڑاتے تھے۔ اب تو بھیّا بُرا وقت آگیا ہے۔
دیکھتے نہیں ہو۔ انسانی برادری میں پڑھی لکھی
عورتیں خاوندوں کو ترنگی کا ناچ نچا رہی ہیں۔
کسی مرد وے کو دم مارنے کی مجال نہیں۔
سینما جائے تو میم صاحب کو ساتھ لے کر جائے۔
سیر سپاٹا کرے۔ تو ان کا ہاتھ بغل میں لے کر۔
اب کوئی دن جاتے ہیں کہ دنیا میں عورتیں حکومت
کریں۔ مرد گھروں کی چار دیواری میں بند رہیں گے۔
بچے پالیں گے۔ مسالا پیسیں گے۔ روٹی ہنڈیا
کریں گے اور جو ناک بھوں چڑھائے گا۔ اونچی
ایڑی کی گرگابیوں سے بازار کے بھاؤ پٹے گا۔
میری مرغی ایک نئی روشنی کے گھرانے کی پلی
ہوئی ہے۔ نئی تہذیب کے سارے ایٹی کیٹ
جانتی ہے۔ بات بات پر آنکھیں نکال کر کہتی
ہے۔ "کیسے گنوار ہو لیڈیز کا احترام کرنا نہیں
جانتے۔ ایسے گاؤدی تھے تو مجھے بیاہنے کیوں
چلے تھے" اور تم دوستوں سے کیا چوری چڑیل
کئی دفعہ پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ چکی ہے۔
اس کی چونچ کو لقوہ مارے میرے بدن کے
پر کھسوٹ کھسوٹ کر مجھے ننگا کر دیا ہے۔
یہ کڑاکے کی سردی میں نے کانپتے گزاری ہے۔
بدن زخمی ہوا پڑا ہے۔

لالو:۔ خدا کا شکر ہے۔ ہماری بندریوں میں نئی
تہذیب کی ہوا نہیں پہنچی۔ ہم بندریوں کو جائز
حد سے آگے آزادی دینے کے حق میں نہیں ہیں

فلورا:۔ تو کیا تمہارے ہاں پیڑوں، شاخوں سے بندریاں بندھی رہتی ہیں۔

لالو:۔ نہیں ہم اپنی بیویوں کو پیڑوں پر قید بھی نہیں رکھتے اس کے ساتھ ہماری بندریوں کی یہ مجال بھی نہیں کہ ہماری آزادی میں خلل انداز ہوں۔ جس باغ میں جی چاہتا ہے جاتے ہیں۔ جس پیڑ پر چاہتے ہیں بسرام کرتے ہیں۔ گھر کی بیوی کی یہ ہمت نہیں کہ ہم سے پوچھ کچھ کرے۔

پیر لکڑ ڈول کول:۔ بھئی کب تک یہی نئی روشنی ہے تو ایک دن اس کی کرنیں تمہارے چار باغ کو بھی روشن کریں گی اور بندریاں تم سے بچے پلوائیں گی۔

فلورا:۔ بچے پلوانے میں قباحت ہی کیا ہے۔ آخر بندر بچوں کے باپ نہیں ہوتے۔ پھر اگر وہ اپنے بچے پالنے لگیں۔ تو برائی کون سی ہے۔

پیرا اُود بلاؤ:۔ فلورا ابھی خیر سے نئی روشنی کے گھر میں پروان چڑھی ہیں۔ خدا نے چاہا تو چار باغ کی بندریوں میں اس روشنی کی شعاعیں ان کے ساتھ جائیں گی

فلورا:۔ ہاں ہاں تو وہی برتاؤ کروں گی جو میں نے اسلم میاں کی بیگم کا دیکھا ہے۔ میں بیگم بن کے جا رہی ہوں۔ جہیز کی لونڈی باندی نہیں ہوں۔ کہ گولر کی بندی وان بن کے رہوں۔

چنوا:۔ نہیں بیگم تم گولر کی قیدی کیوں ہونے لگیں۔ لیکن خدارا پیر لکڑوں شاہ کا سا حال ہمارا نہ بنانا۔

(باقی پھر)

(منقول از اخبار پریم)

تاجور

نظم:۔

پابندیٔ وقت

وقت پہ کرنا ہر اک کام ۔ تاکہ جہاں میں پاؤ نام
وقت کا جو پابند ہوا ۔ جگ میں وہ خورسند ہوا
وقت پہ لکھنا اور پڑھنا ۔ اونچے رتبے پہ چڑھنا
وقت پہ کھانا اور سونا ۔ وقت نہ اپنا تم کھونا

جس نے کیا لڑکو ایسا ۔ بس ہے وہی لڑکا اچھا
وقت پہ اپنا اپنا کام ۔ کرتے رہنا، صبح و شام
عمر میں راحت پاؤ گے ۔ کبھی نہ کلفت پاؤ گے
وقت پہ جو کرتا ہے کام ۔ جوہر پاتا ہے آرام

(منقول از اخبار پریم)

جوہر چاندوڑی

تعلیمات

امتحان

ششماہی امتحان کا وقت آ گیا - افسر صاحبان خود امتحان لینے والے تھے - ان کو امتحان سے بڑی دلچسپی تھی - میں نے اپنے اصول اور قاعدے کے مطابق اپنے درجے کو تیار کیا تھا اور افسروں سے دو باتیں پہلے سے منظور کرا لی تھیں - اوّل یہ کہ سکول کے تمام درجوں کے امتحان کے بعد میرے درجے کا امتحان ہو - دوم یہ کہ امتحان کے وقت تمام مدرسین، ہیڈ ماسٹر اور ہر درجے کے پانچ پانچ لڑکے موجود ہوں -

امتحان کے روز مجھے کامل سکون و اطمینان تھا - اس لئے کہ کامیابی و ناکامی کی جس کے لئے مدرسین کو فکر و تشویش ہوتی ہے - میرے سامنے کوئی حیثیت نہ تھی، میں نے اپنے طلبہ سے کہہ دیا تھا کہ ہم جو کچھ ہمیشہ کرتے ہیں وہی ہمیں آج بھی کرنا ہے، امتحان میں تو ہم کامیاب ہیں ہی، ہم نے تو صرف اپنا کام دکھانے کے لئے لوگوں کو مدعو کیا ہے -

میں نے ڈرامے کی طرح امتحان کا سارا انتظام پردے کی آڑ میں کیا تھا - تمام لوگوں کو اگلے حصے میں بٹھا کر میں نے پردہ اُٹھا دیا - دوسرے درجوں کے جو لڑکے آئے تھے ان کو میں نے ٹکڑیوں کی صورت میں بٹھا دیا تھا اور ہر ٹکڑے کو میرے درجے کا ایک لڑکا کہانی سُنا رہا تھا، تمام لڑکے باری باری کہانی سُنا رہے تھے - کہانیوں کا انتخاب لڑکوں نے اپنی اپنی پسند کے مطابق کیا تھا - ہر لڑکے کی کتاب اس کے پاس تھی تاکہ کہانی کہتے کہتے کہیں بھول جائے تو کتاب میں دیکھ لے - ہر لڑکا اپنے مذاق اور لہجے کے مطابق کہانی کہہ رہا تھا اور سننے والوں کے ساتھ خود بھی محظوظ اور لطف اندوز ہو رہا تھا - ہر لڑکے کے لب و لہجے اور طرز ادا سے ظاہر ہو رہا تھا کہ لڑکا کہانی کہنے کے ڈھنگ سے واقف ہے اور وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اسے بخوبی سمجھ بھی رہا ہے -

کہانی کا سلسلہ ختم ہوا، مدرسین ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے میں نے کہا - یہ میرے درجے کا پہلا امتحان تھا، میں نے سُنا اور جواب دیا - یہ امتحان تھا زبان پر قابو حاصل کرنے کا - فسانہ گوئی کا، مذاق کا، حافظے کی نشوونما کا - طرز ادا کا اور پارٹ کا -

تمام معلمین دوسرے امتحان کا انتظار کرنے لگے -

پردہ اُٹھا سب لڑکے حلقہ باندھ کر بیٹھے تھے، سامنے تختے پر لکھا تھا "بیت بازی" - ایک لڑکے نے ایک شعر پڑھا - دوسرے لڑکے نے دوسرا شعر پڑھا جو پہلے لڑکے کے شعر کے آخری حرف سے شروع ہوا تھا - اسی طرح باری باری سب لڑکوں نے شعر پڑھے، اور ہر لڑکے کا شعر اس سے پہلے کے لڑکے کے شعر کے آخری حرف سے شروع ہوتا تھا -

صاحب نے سوال کیا - لڑکوں کو آمنے سامنے کیوں نہیں بٹھایا؟ دو فریق بنا کر بٹھانا تھا؟ میں نے کہا - جی ہاں قدیم طریقہ تو یہی ہے، لیکن میں نے اسے ترک کر دیا - بات یہ ہے - کہ اس طریقے سے لڑکوں میں ہار جیت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور اس کے زیر اثر رشک و رقابت، بغض و عناد وغیرہ بہت سے بُرے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں - اس لئے قدیم طریقے کا ترک کر دینا ہی صحیح ہے - اس صورت میں یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک لڑکے کو شعر یاد نہیں آتا - تو اس کے بعد والا لڑکا پڑھ دیتا ہے اور کام کا سلسلہ رُکتا نہیں - اور یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر ایک بار کسی لڑکے کو شعر یاد نہ آیا تو دوسرے دور میں وہ پھر شریک ہو جاتا ہے -

میں نے لڑکوں کو کچھ دیر تفریح کے لئے بٹھایا تھا - لیکن انہیں اتنی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی کہ گھنٹی بجنے کے بعد بھی ان کا دل اُٹھنے کو نہیں چاہتا تھا - میں نے چند منٹ اور دیئے - پھر پردہ گرا دیا -

میں نے باہر آ کر کہا - آپ نے دیکھا، لڑکوں کو نصاب تعلیم کے کتنے اشعار کس صحت کے ساتھ یاد ہیں؟ منظومات کے سلسلے میں روزانہ یہی کھیل کھیلا جاتا ہے -

صاحب نے کہا - ہیئر ہیئر!!

پردہ اُٹھا - سب لڑکے حلقے کی صورت میں بیٹھے ہوئے پہیلیاں بُجھا رہے تھے - صاحب بول اُٹھے - اوہو یہ تو لڑکے پہیلیاں بجھا رہے ہیں، ہم نے بھی بچپن میں یہ کھیل کھیلا ہے - لیکن نصاب تعلیم میں تو یہ نہیں ہے -

میں نے کہا - جی ہاں، لیکن پھر بھی میں نے ان کو سلسلۂ تعلیم میں داخل کر لیا ہے اور امید ہے کہ آئندہ سال سے آپ بھی ان کو شریک نصاب کر دیں گے - آپ دیکھیں گے کہ پہیلیوں میں کیسی کیسی عقل و دانش کی باتیں ہیں

اور کیسے دلچسپ اور انوکھے انداز میں بیان کی گئی ہیں - لڑکے تو اس کھیل کے شیدائی ہیں -

اس کا بعد لفظوں کا کھیل شروع ہوا - ایک لڑکا ایک لفظ بولتا تھا دوسرا لڑکا اس لفظ کا آخری حرف سے شروع ہونے والا دوسرا لفظ بولتا تھا - اسی طرح باری باری سب لڑکے اس میں حصّہ لے رہے تھے -

پہلے تو یہ کھیل معمولی معلوم ہوا - لیکن جب چھوٹے چھوٹے لڑکوں سے لوگوں نے جغرافیہ، تاریخ اور دوسرے علوم و فنون کے بڑے بڑے الفاظ سُنے تو انہیں اس کھیل کی اہمیت کا اندازہ ہوا اور سب کو اس کے فائدے کا اعتراف کرنا پڑا -

میں نے معلمین بھائیوں سے کہا - اس کھیل کے واسطے زیادہ سے زیادہ الفاظ کا سرمایہ جمع کرنے کے لئے میں لڑکوں کو ہدایت کرتا ہوں کہ اگر تم نقشے اور لغات وغیرہ کی کتابوں کو دیکھتے رہو گے تو تمہیں بہت نئے نئے الفاظ یاد ہو جائیں گے - لڑکوں کو اس کھیل سے بھی خاصی دلچسپی ہو گئی ہے - وہ خود بھی نئے نئے الفاظ کی تلاش میں رہتے ہیں اور دوسرے لڑکوں کو بھی شوق دلاتے رہتے ہیں، بہت سے لڑکوں کو تو اتنی دلچسپی ہے کہ وہ الفاظ نوٹ کر لیتے ہیں -

صاحب بولے - یہ کھیل بہت مفید معلوم ہوتا ہے، ایسے سارے کھیل تمام درجوں میں داخل کرنے چاہئیں - جن سے لڑکوں کی معلومات میں اضافہ ہو اور ان کی فہم و فراست ترقی کرے اور ان کی نشو و نما کا موجب ہو -

پھر میری طرف مخاطب ہو کر کہا - بے شک تم نے بہت اچھی اچھی باتیں جاری کی ہیں - میں تمہارے دماغ کی تعریف کرتا ہوں -

ایک مدرس نے اپنے پاس کے مدرس سے اس طرح کہا جو صاحب کو سنائی دے سکے "انہوں نے ایسا کون سا کمال کیا ہے - ان کاموں میں کھیل کے سوا رکھا ہی کیا ہے؟ ہم لوگوں کا پڑھانے پڑھانے سے دماغ پناہ مانگنے لگتا ہے - یہ تو بیٹھے اسی طرح کھیل تفریح کیا کرتے ہیں -"

دوسرے ماسٹر صاحب بولے "جی ہاں - اب کھیل اور تفریح کا ہی زمانہ ہے، پڑھنے پڑھانے کے دن گئے - اور چند روز کے بعد دیکھئے گا تعلیم کی کیا گت بنتی ہے -"

میں لڑکوں کو کام بتانے میں مصروف تھا، میں نے ماسٹروں کو باتیں کرتے نہیں سنا - بعد میں معلوم ہوا کہ ماسٹر صاحبان اس طرح باتیں کر رہے تھے -

میں نے سیٹی بجائی اور تمام لڑکے ہاتھ میں جھاڑو لئے صف بستہ کھڑے ہو گئے - میں نے پہلے ان سے قواعد کرائی - پھر حکم دیا کہ چاروں طرف جھاڑو دے ڈالیں - لڑکے پھیل گئے اور انہوں نے جھاڑو دے کر صفائی کر دی، یہ میرے درجے کے طلبہ کا امتحان تھا -

صاحب نے پوچھا - یہ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ جھاڑو کے ساتھ لڑکوں کو قواعد کیوں کرائی گئی - میں نے کہا - آجکل کے اہم ملکی مسائل میں گندگی کا مسئلہ بھی خاص اہمیت رکھتا ہے - گندگی سے اہلِ ملک کو کافی نقصان پہنچ رہا ہے - اس لئے اس کا انسداد و ازالہ ضروری ہے - جھاڑو کے ساتھ قواعد کا مطلب یہ ہے کہ لڑکوں میں گندگی سے جنگ کرنے کے لئے آمادگی اور جرأت پیدا ہو جائے - اس تعلیم کا اثر یہ ہوا ہے کہ لڑکے صفائی کے خوگر ہو گئے ہیں - وہ جب تک اپنا کمرہ صاف نہیں کر لیتے انہیں دوسرا کام اچھا نہیں معلوم ہوتا -

یہاں یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ لڑکے ہاتھ پاؤں دھو کر آ گئے اور میں نے دوسری سیٹی بجائی، لڑکے دوڑ کر باہر چلے گئے - اور اسکول کے آس پاس جو درخت ہیں ان پر چڑھ گئے - دوسری سیٹی بجانے پر وہ درخت سے کود کود کر نیچے آ گئے - تیسری سیٹی پر پھر درختوں پر چڑھ گئے - چوتھی سیٹی پر پھر اُتر پڑے -

ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا - ارے بھئی ان باتوں کا تعلیم سے کیا تعلق ہے؟ اور یہ کام تو بغیر بتائے خود ہی لڑکوں کو آ جاتے ہیں؟

میں نے کہا - آجکل یہ باتیں بھی تعلیم کے بغیر نہیں آتیں - اور ہم ان باتوں کی تعلیم دیتے ہی کب ہیں؟

ہیڈ ماسٹر صاحب - نہیں ایسا تو نہیں ہے -

میں :- آپ کے اسکول کے دوسرے درجوں کے لڑکے موجود ہیں - ان سے کہئے درخت پر اسی طرح چڑھیں اُتریں - دیکھئے چڑھ اُتر سکتے ہیں؟

صاحب نے لڑکوں کو حکم دیا - لیکن دو تین لڑکوں کے سوا سب منہ دیکھتے رہ گئے اور وہ دو تین بھی مشکل سے چڑھ اُتر سکے -

میں نے کہا - صاحب! میں نے اسی طرح کی بہت سی باتوں کی تعلیم دی ہے، میری تعلیم و تربیت کے یہی سب عنوانات ہیں -

پھر میں نے ذرا ہنس کر کہا - پرچۂ امتحان میں ان سب کھیلوں کے نام ہیں - ان کے مارکس دینے ہوں گے -

صاحب نے بھی مذاق ہی میں جواب دیا ۔ ہاں آپ بھی مارکس مانگ رہتے ہیں ؟

میں نے پھر سیٹی بجائی اور لڑکے اسکول میں سے لٹو اور ڈور لاکر لٹو پھرانے لگے ، لیکن اس طرح نہیں جیسے بازاری لڑکے کھیلتے ہیں اور شور و غل کرتے ہیں ، کھیل کی جگہ مقرر تھی اور سب لڑکے ایک نگراں کے ماتحت نہایت تہذیب و شائستگی کے ساتھ کھیل رہے تھے ۔ یہ کھیل بچپن میں تقریباً سب ہی کھیل چکے تھے ۔ اس لئے اس سے سب کو دلچسپی ہوئی ۔

صاحب نے پوچھا :- لڑکوں نے یہ کھیل کب سیکھا ؟ کیا وہ باقاعدہ یہ کھیل کھیلتے ہیں ؟

میں نے کہا " میں دریا کنارے تفریح کو جاتا ہوں اور وہیں سب کھیل سکھاتا ہوں ۔ واقعہ یہ ہے کہ کھیل ہی کھیل میں لڑکوں کو بہت کچھ آجاتا ہے "

صاحب نے فرمایا " تم بہت صحیح کہتے ہو ۔ میں نے آج ہی پڑھا ہے کہ لڑکے کھیل کے ذریعے سب کچھ سیکھ سکتے ہیں "

پھر ہیڈ ماسٹر صاحب کی طرف دیکھ کر پوچھا ۔ اب آپ اسکول میں یہ سب کھیل کب شروع کیجئے گا ؟

ہیڈ ماسٹر صاحب بولے :- صاحب ہم یہ سب کرنے لگیں گے تو نصاب تعلیم کیسے پورا ہوگا ۔ ان بھائی صاحب کے سر ذمہ داری ہی کونسی ہے ۔ یہ تو سال بھر تک جو کچھ کر سکیں گے کریں گے اور کہہ دیں گے کہ یہ تو تجربہ تھا جتنا ہو سکا ہوا ، لیکن ہم تو نصاب کے ساتھ مقید ہیں ۔ آپ ہی لکھ بھیجتے ہیں کہ " کام پورا کیوں نہیں ہوا ؟ ، نتیجہ کیوں اچھا نہیں ؟ نصاب تعلیم کی تکمیل کیوں نہیں ہوئی ؟ "

صاحب کچھ ہنسے اور کچھ کھسیانے ہو کر چپ رہ گئے ۔

میں نے سیٹی بجائی اور لڑکے اپنے کرتے اتار کر قطار میں کھڑے ہو گئے ۔ سب لڑکے سینے تان کر نہایت قاعدے سے کھڑے تھے ۔ اور سب کے سب صاف ستھرے تھے ۔

صاحب نے ہنس کر کہا ۔ کتنے دنوں سے تیاری ہو رہی تھی اس صفائی کی ؟ اس کام پر تو میرا خیال ہے کافی محنت صرف کرنی پڑی ہوگی ۔

میں نے کہا ۔ جی ہاں پورے چھ مہینے سے تیاری ہو رہی ہے ، آپ سے کوئی بات پوشیدہ تو ہے نہیں ۔ میری محنت میرے کاموں سے ہی ظاہر ہے ۔

میں نے پھر سیٹی بجائی اور لڑکے کپڑے پہن کر صف بستہ کھڑے ہو گئے ۔ اور پھر سلام کر کے چلے گئے ۔

ہیڈ ماسٹر نے کسی قدر طنز سے کہا ۔ امتحان ختم ہو گیا ؟

میں نے کہا ۔ ابھی نہیں ۔ آپ حضرات اس کمرے میں تشریف لے چلئے ۔

ہیڈ ماسٹر :- ہاں ۔ ہاں ۔ کچھ روز سے آپ نے اس کمرے کو لے رکھا تھا ۔ اور آپ اس میں کسی کو جانے نہیں دیتے تھے ۔ کیا اس میں بھی آپ نے کچھ سامان جمع کر رکھا ہے ؟

میں : چلئے تو ،

ہم سب کمرے میں گئے ۔

صاحب :- اوہو ، یہ تو چھوٹا سا میوزیم ہے ۔

ہیڈ ماسٹر :- میرا بھی یہی خیال تھا ۔ لڑکے چیزیں لانے اور سجانے میں مشغول تھے ۔

میں :- لڑکوں نے بڑے شوق اور حوصلے سے اس کام کو سر انجام دیا ہے ۔ میں نے ان سے صاف کہہ دیا تھا کہ تم اسے جس طرح چاہو سجاؤ ۔ میں اس کے متعلق تمہیں کسی طرح کی رائے اور مدد نہ دوں گا ۔

صاحب :- تو کیا ان چیزوں کو صرف طلبہ نے سجایا اور ترتیب دیا ہے ! ۔

میں :- جی ہاں ۔

صاحب :- لیکن یہ تو ممکن معلوم نہیں ہوتا ۔ ان لڑکوں کو اتنا سلیقہ کہاں ! ۔

میں خاموش تھا ، میرا کام خود اپنی خوبیوں کا اعتراف کرا رہا تھا ۔

صاحب نے پوچھا :- یہ تمام چیزیں جمع کیسے ہوئیں ؟ یہ تو قدرتی پیداوار کا بہترین ذخیرہ ہے ! ۔

ہیڈ ماسٹر :- صاحب ! یہ لڑکوں کو باہر لے جاتے ہیں ۔ وہیں سے لائے ہوں گے ۔

صاحب :- یہ تو بہت بڑا کام انجام پا گیا ۔ اس میوزیم کو توڑنے کی ضرورت نہیں ہے ۔ اس سے لڑکوں کو بہت فائدہ پہنچے گا ۔ لہٰذا میں مدرسین کو مشورہ دوں گا کہ وہ اس میوزیم کو زیادہ سے زیادہ ترقی دیں ۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے لنگنا کر کہا ۔ ہاں ! لیکن پھر وہ لڑکوں کو پڑھائیں گے کب ؟

میوزیم کی ایک فہرست بھی لڑکوں نے مرتب کی تھی جسے دیکھتے

ہوئے صاحب نے فرمایا۔ یہ لڑکے انعام کے قابل ہیں"

میں نے کہا۔ صاحب! اس ذخیرے کی فراہمی میں لڑکوں کو جو خوشی حاصل ہوئی ہے۔ وہی ان کا انعام ہے اور یہ میوزیم خود۔ ان کی محنت کا بہترین صلہ ہے۔

صاحب:۔ تاہم.......

میں نے کچھ نہیں کہا۔

ایک گوشے میں مٹی کے کھلونے رکھے تھے۔

صاحب:۔ یہ کس نے بنائے؟

میں۔ لڑکوں نے، اس کمرے میں باہر کی کوئی چیز نہیں ہے۔

صاحب: لیکن اتنے کھلونے کب بنائے اور کہاں پکائے ہوں گے؟

میں:۔ ہفتہ وار دریا کے کنارے بنایا کرتے تھے اور وہیں آوا لگا کر ان کو پکا بھی لیتے تھے۔

صاحب: تم نے بھی عجیب دماغ پایا ہے اور تمہاری تربیت بھی عجیب ہے۔ تمہیں کسی سامان کی بھی ضرورت نہیں۔ دریا کے کنارے اور کھیت سے تم ساری چیزیں تیار اور مہیا کر لیتے ہو۔ واہ! میں تمہاری قابلیت اور اعلیٰ دماغی.......

میں نے صاحب کو آگے بولنے نہ دیا اور درمیان ہی میں بول اٹھا۔ اب آپ تھوڑی دیر اس کمرے میں اطمینان سے تشریف رکھئے میں بچوں کے کچھ اور کام دکھاؤں۔

میں نے سب کو بٹھایا۔ ہیڈ ماسٹر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ صاحب یہ سب کام کر تو ہم بھی سکتے ہیں۔ لیکن اگر ہم ان کاموں میں مصروف ہو جائیں تو تعلیم کا کام کیسے ہو؟

میں بورڈ کے کچھ ٹکڑے لایا۔ ایک تختے پر لڑکوں کے حروف کے اس وقت کے نمونے تھے جب لڑکوں نے لکھنا شروع کیا تھا۔ دوسرے تختے پر ان کے تازہ خط کے نمونے تھے اور پشت پر لکھا تھا۔ "رفتار تحریر بتانے والا تختہ۔"

لڑکوں کی تحریری ترقی دیکھ کر سب لوگ بہت خوش ہوئے۔

ایک مدرس نے دوسرے کے کان میں کہا۔ خاص خاص لڑکوں سے لکھوائے ہوں گے۔

مجھے یہ بات بہت ذلیل معلوم ہوئی، مگر میں نے اس کی کچھ پروا نہیں کی۔

صاحب:۔ تم یہ ردوبدل اور اصلاح کیسے کرتے ہو؟

میں:۔ مختلف طریقوں سے۔

صاحب:۔ ان طریقوں کو تمام سکول میں رائج کیا جائے تو؟

میں:۔ ہاں رائج کئے جا سکتے ہیں۔

میں ایک رجسٹر اٹھا لایا۔ چھ مہینے میں لڑکوں نے جتنی کتابیں پڑھی تھیں۔ اس رجسٹر میں ان سب کی فہرست تھی۔ رجسٹر کے ہر ورق پر کتابوں کا نام تھا۔ کتابیں ختم کرنے کے بعد طلبہ نے خود اپنے ہاتھ سے اس میں کتابوں کا نام لکھ دیا تھا۔

رجسٹر کے آخر میں میں نے اعداد و شمار کا ایک نقشہ تیار کیا تھا۔ جس کے دیکھنے سے پتہ چلتا تھا کہ کتنے طلبہ نے کل کتنی کتابیں پڑھیں کس لڑکے نے سب سے زیادہ کتابیں پڑھیں، کس نے سب سے کم۔ کن لڑکوں نے اوسط درجے تک۔ اس نقشے میں یہ بھی دکھایا گیا تھا کہ کس موضوع کو لڑکوں نے سب سے زیادہ دلچسپی کے ساتھ پڑھا۔

نقشے کی کتابوں کو دیکھ کر صاحب کو بہت تعجب ہوا۔ انہوں نے کہا اتنی کتابیں پڑھی گئیں اور اسقدر مختلف مضامین کی؟

میں:۔ جی ہاں، اور میرے سامنے پڑھی گئیں۔

صاحب نے پوچھا۔ اور ہیڈ ماسٹر صاحب! آپ کے ساتویں درجے کے طلبہ نے سال بھر میں کتنی کتابیں پڑھی ہوں گی؟

ہیڈ ماسٹر نے کہا:۔ صاحب! پڑھیں کیسے؟ پڑھنے میں لگ جائیں تو تاریخ جغرافیہ اور حساب وغیرہ کب یاد کریں؟

صاحب بولے نہیں لیکن کچھ سوچ ضرور رہے تھے۔

ابو محمد امام الدین رامنگری

مختار

اردو شاعری میں ہندو کلچر اور ہندوستان کے طبعی اور جغرافی اثرات

اردو شاعری کا موضوع جس قدر وسیع ہے، اتنا ہی اس قدر پامال ہو چکا ہے کہ اس کے متعلق مشکل سے کوئی نئی بات کہی جا سکتی ہے۔ زیر بحث موضوع بھی کوئی نیا موضوع نہیں ہے، لیکن اس کی جانب بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ اس لئے نسبتاً اس پر گفتگو کی گنجائش باقی ہے۔ آئندہ سطروں میں اس کے متعلق جو کچھ عرض کرنا ہے۔ اس سے اردو شاعری پر بعض سطحی اعتراضوں کی حقیقت بھی واضح ہو جائے گی۔

یہ ایک تمدنی اصول ہے کہ ہر ملک اور ہر قوم کی زبان اس ملک کے جغرافی حالات کی تصویر اور اس قوم کی تہذیب و معاشرت کا آئینہ ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے اردو شاعری کو ہندوستان کے جغرافی حالات اور یہاں کی تہذیب و معاشرت کا آئینہ دار ہونا چاہیئے۔

لیکن اس پر من جملہ اور اعتراضات کے ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ یہ ہندی نژاد ہونے کے باوجود ہندوستانی رنگ روپ سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی۔ اس کے سارے خط و خال ایرانی ہیں۔ اس کے باغوں میں سرو و صنوبر اُگتے ہیں۔ اس کی بہار لالہ و گل کھلاتی ہے۔ اس کے چمن میں قمری و بلبل نغمہ سنجی کرتے ہیں۔ اس کی نہروں میں دجلہ و فرات کی روانی ہے۔ اس کے افسانہائے محبت میں شیریں و فرہاد کی داستانیں ہیں۔ اس کی رزمیات میں رستم و سہراب کے معرکے ہیں۔ اس کے محبوب کی آنکھیں نرگس شہلا۔ رخسار گل، زلف سنبل، قامت سرو رعنا، غرض اس کی تمثیلات، تشبیہات، استعارے اور شاعری کے تمام عناصر عجمی ہیں۔ آئندہ سطروں میں اس اعتراض سے قطع نظر کر کے ہم کو دکھانا ہے کہ اردو شاعری میں ہندی خیالات، ہندو مذہب، ہندی تہذیب و معاشرت، آداب و رسوم اور ہندوستان کے طبعی اور جغرافی اثرات کہاں تک نمایاں ہیں؟ اس سے ضمناً مذکورہ بالا اعتراض کی حقیقت بھی واضح ہو جائے گی۔

یہ موضوع اتنا وسیع ہے کہ اس کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کے لئے ایک مستقل کتاب چاہیئے۔ اس لئے اس مضمون میں بعض اہم پہلوؤں کو صرف اس حد تک دکھایا جائے گا کہ اس سے یہ اندازہ ہو جائے کہ اردو شاعری قدیم ملکی تہذیب و معاشرت اور اپنے جنم بھوم کے جغرافی حالات سے کہاں تک متاثر ہوئی اور اس میں اس کے کیا کیا اثرات پائے جاتے ہیں۔

ہندوستان میں ہندو اور مسلمانوں کے میل جول سے جس مشترک تہذیب کی بنیاد پڑی، اس میں دونوں قوموں کے بعض نسلی اور مذہبی خصوصیات کے علاوہ دونوں تہذیبوں کے عناصر یکساں پائے جاتے ہیں۔ بلکہ میں یہاں تک کہنے کی جرأت کروں گا کہ مذہب کا بلند کنگرہ بھی اس کی کمند سے محفوظ نہ رہ سکا۔ آج ہندی مسلمانوں کے رائج مذہب میں مذہب کے نام سے جسقدر ہندوانہ رسمیں داخل ہو گئی ہیں، اُس کا اندازہ بہتوں کو ہوگا۔ خصوصاً معاشرت میں یہ رنگ اتنا گہرا ہو گیا ہے کہ آج خالص اسلامی معاشرت اور رسوم کی شکل پہچاننا مشکل ہے۔ اسی طرح ہندو مذہب اور ہندو تہذیب بھی اسلامی تہذیب بلکہ مذہب اسلام سے متاثر ہوئی ہے۔ ہندوؤں کی مذہبی اور معاشرتی اصلاحیں اور ترقی یافتہ کائستھ اور کشمیری برہمن خاندانوں کی معاشرت اس کی شاہد ہے۔ اور یہ عین اصولِ فطرت ہے۔ اردو شاعری بھی اسی مشترک تہذیب کا آئینہ اور دونوں قوموں کی مشترک ادبی کوششوں کا ثمرہ ہے۔ اس لئے وہ کس طرح ان اثرات سے محفوظ رہ سکتی تھی؟

اس موقع پر ایک ضروری پہلو کی جانب توجہ دلانا ہے۔ یہ عجیب حیرت انگیز امر ہے کہ جو لوگ اردو شاعری پر فارسی کی تقلید اور نقالی کا الزام قائم کرتے ہیں وہ اس اصول کو بھول جاتے ہیں! اردو تو اسلامی یا ایرانی اور ہندی تہذیب کے میل جول کا نتیجہ ہے۔ اس لئے فطرت اور انصاف دونوں کا تقاضا یہ ہے کہ اس میں دونوں کا اثر ہو۔ اردو شاعری نے جن درباروں کے زیر سایہ پرورش پائی گو وہ ہندوستان میں ہونے کی وجہ سے ہندی ہو گئے تھے لیکن تھے وہ عجمی نژاد۔ اس لئے وہ اپنے نسلی اور موروثی اثرات کو اس حد تک کس طرح مٹا سکتے تھے

کہ اُن کا کوئی نشان اُن کی پیدا کردہ زبان اور شاعری میں نہ مل سکتا؟ یہ اثرات تو بالکل طبعی اور فطری ہیں۔

لطیفہ یہ ہے کہ انہیں معترضین میں بعض بامذاق حضرات، اردو شاعری میں انگریزی زبان کی شاعری کے نمونے ڈھونڈتے ہیں۔ اُس وقت وہ اس اصول کو بھول جاتے ہیں کہ ہر قوم و ملک کی شاعری، اس کی قومی اور ملکی خصوصیات، اُس کے جذبات و میلانات اور مقامی حالات کی مظہر ہوتی ہے۔ اس لئے ایک ہندوستانی شاعر یورپ کا رنگ اور مذاق کہاں سے پیدا کر سکتا ہے؟ اگر کرے گا تو محض آورد اور نقالی ہوگی۔ بہرحال یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ اب میں اصل موضوع کی جانب متوجہ ہوتا ہوں۔

جیساکہ اوپر عرض کیا گیا، اردو شاعری ایرانی اور ہندی تہذیب اور ان کی شاعری سے مل کر پیدا ہوئی۔ اس لئے اس کو دونوں کے اثرات وراثت میں پہنچے۔ اس مضمون میں اُس کے صرف ایک پہلو یعنی ہندو کلچر کے اثرات کو دکھانا ہے۔ ہندو کلچر کا کوئی ایسا پہلو نہیں ہے جس کے اثرات اردو شاعری میں نہ ملتے ہوں۔ ہندو مذہب و معاشرت، آداب و رسوم، زبان و خیالات وغیرہ جملہ عناصر اردو شاعری کے دامن میں موجود ہیں۔ اب ان سب کو علیحدہ علیحدہ پیش کیا جاتا ہے۔

زبان کے اثرات سب سے پہلے زبان کو لیجئے۔ اردو شاعری مختلف دوروں سے گذری ہے۔ ابتدائی دور میں اس پر ہندی الفاظ اور خیالات کا اس قدر غلبہ تھا کہ اُس میں اور ہندی شاعری میں فرق کرنا مشکل ہے۔ یہ اردو زبان کا تکوینی دور تھا، جس میں اُس نے مستقل زبان کی حیثیت حاصل نہیں کی تھی۔ اس لئے ہم اس کو چھوڑ کر صرف اُس دور کو لیتے ہیں۔ جب ریختہ نے اردو زبان کا قالب اختیار کر لیا تھا۔ اور فارسی کو شاعری کی مسند سے اٹھا کر خود اس کی جگہ حاصل کر لی تھی اور فارسی کے بجائے اردو اظہار کمال کا ذریعہ بن گئی تھی۔ اس میں بھی ہم ان الفاظ کو قلم انداز کریں گے جنہوں نے اردو میں جذب ہو کر ہندی کی تخصیص کھودی ہے، بلکہ خالص ہندی اور ہندوانہ الفاظ پیش کریں گے۔ ان دونوں میں وہی فرق ہے جو "عربی زبان" اور "اسلامی مصطلحات" میں ہے۔ ہندی ایک وسیع لغت ہے جس میں مذہبی اور غیر مذہبی سب طرح کے الفاظ داخل ہیں لیکن ہم کو صرف وہ الفاظ پیش کرنا ہے جن کا تعلق ہندو مذہب اور ہندو تہذیب و معاشرت سے ہے، کہ یہ تخصیص ہمارا مدعا ثابت کرنے کے لئے اور زیادہ موثر ہے۔

اس قسم کے بہت سے الفاظ فارسی کے وسیلے سے آئے اور اس طرح اردو شاعری کا جزو بن گئے کہ اب ان کی حیثیت مصطلحات کی ہوگئی ہے مثلاً دیر و حرم، مسجد و بتکدہ، شیخ و برہمن، ناقوس و اذان، تسبیح و زنار وغیرہ

میرؔ:-

میرؔ کے دین و مذہب کو، اب پوچھتے کیا ہو اُن نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

ہم یہ کہتے تھے کہ مت دیر و حرم کی راہ چل
اب یہ جھگڑا حشر تک شیخ و برہمن میں رہا

کفر کچھ چاہیئے، اسلام کی رونق کے لئے
حسن زنار ہے، تسبیح سلیمانی کا

نامعلوم:-

اذاں دی کعبے میں، ناقوس دیر میں پھونکا
کہاں کہاں ترا عاشق، تجھے پکار آیا

گو یہ الفاظ فارسی شاعری کی راہ سے آئے، لیکن ہندوستانی اثرات نے انہیں پائیدار بنا دیا۔ خالص ہندوانہ الفاظ جن سے ہندو کلچر کے مختلف اثرات کا اندازہ ہوتا ہے، یہ ہیں۔

انشاؔ:-

سانولے پن پر، غضب دھج ہے، بسنتی شال کی
جی میں ہے کہہ بیٹھے اب، جے کنہیا لال کی

شیو کے گلے سے، پاربتی جی، لپٹ گئیں
کیا ہی بہار آج ہے، برہما کے رند پہ

لگے کہنے بھیم کسل اسے جوگی کے دھیان کے بیچ ہے
تورے دکھ دلدر کہ جلنے سے گئے بھاگ آپ کے بھاگ سے

شیر کی کھال بچھا اور ملے تن پہ بھبھوت
گاہ جوگی کی طرح رہتے ہیں آسن مارے

انشاءاللہ خاں کے یہاں اس قسم کے الفاظ بکثرت ملتے ہیں ہم نے صرف چند مثالیں دی ہیں۔ دوسرے شعراء کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

امانت :-

سانولے تن پہ قبا ہے جو ترے، بھاری ہے
لالہ کہتا ہے چمن میں کہ یہ گردھاری ہے

دیا ہے کوچے میں قاتل نے لاش کو لٹکا
نہ مجھ پہ گور کا احسان ہوا، نہ مرگھٹ کا

آہوں کا دھواں ہے طرفِ چشمِ تر اے مست
گنگا پہ یہ مردہ کسی ہندو کا جلا ہے

سودا :-

ترکش الہٰذ سینۂ عالم کا چھان مارا
مژگاں نے تیرے پیارے ارجن کا بان مارا

منیر :-

کب تلک دھونی رمائے جوگیوں کی سی رہوں
بیٹھے بیٹھے در پہ تیرے میرا آسن جل گیا

امیر :-

ڈر کے میری شب جدائی سے
کالکا رام رام کرتی ہے

سانولی دیکھ کے مورت کسی متوالی کی
ہو کے مسلمان مگر بول اٹھوں جے کالی کی

جرأت :-

دردِ دل اُس بُتِ بے درد سے کہئے تو کہے
جا کے یہ رام کہانی تو سُنا اور کہیں

شاہ حاتم :-

خط نکلے پہ بوسہ رُخِ پُر نور کا پایا
خیرات برہمن کو ملی چاند گہن سے

عورتوں کی زبان پر ہندی الفاظ بکثرت ہیں، اس لئے ریختی تو سراسر ہندی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

جان صاحب :-

سوتن کے گھر میں میاں کی دال بھی گلتی نہیں
بوم راکسن جان لے گا، آنکھ لے گی کالکا

گو شگن میری اچھی ہے پر کیا کروں پھپھی
تقدیر تو بد تر ہے مری بھاگ بھری سے

نام کیا لنکا میں کرتی سامری سے میں سوا
مجھ سی جادوگر نہاں ہو میں اگر راون کے ساتھ

ایک ایک نقطے پہ موئے لڑتے ہیں مردوے
محفل شاعروں کی اکھاڑا ہے بھیم کا

کیونکر قدم رسولوں، جا کر بھروں نہ چوکی
رکھے جو آسرا تو، ایسے مہا بلی کا

تم تو کیا ہو بیگما! ڈنڈوت کرتے ہیں یہاں
سب مہاراجوں کے راجہ جی بڑے ہیں جو کہ منڈ

اِس موقع پر ہم نے قصداً اُن نظموں کو نقل نہیں کیا ہے جو ہندوانہ مصطلحات کے ساتھ ٹھیٹھ ہندوانہ لب و لہجے میں کہی گئی ہیں۔ نظیر اکبر آبادی نے اس قسم کی متعدد نظمیں کہی ہیں۔ زمانہ حال میں اکبر کے یہاں اس قسم کے الفاظ و مصطلحات بکثرت ملتے ہیں۔ ہندوانہ الفاظ کی ہمہ گیری کے [illegible] خالص مذہبی شاعری بھی خالی نہیں ہے۔ مشہور نعت گو محسن کاکوروی کے مشہور نعتیہ قصیدے کی تشبیب سراسر اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اُس کے بعض اشعار یہ ہیں ؎

سمت کاشی سے چلا، جانب متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ہے، صبا گنگا جل
گھر میں اشنان کریں، سرو قدانِ گوکل
جا کے جمنا پہ نہانا بھی ہے، اِک طولِ امل

خبر اُڑتی ہوئی آئی ہے مہابن میں ابھی
کہ چلے آتے ہیں تیرتھ کو ہوا پر بادل
دھر کا ترسا بچہ ہے، برق، لئے جل میں آگ
ابر، جوتی کا برہمن ہے، لئے آگ میں جل
دیکھئے، ہوگا سری کرشن کا، کیونکر درشن
سینۂ تنگ میں دل، گوپیوں کا ہے بے کل
راکھیاں لے کے سلونوں کی، برہمن نکلیں
تار بارش کا تو ٹوٹے، کوئی ساعت، کوئی پل
اب کی میلا تھا ہنڈولے کا بھی گرداب بلا
نہ بچا کوئی محافہ، نہ کوئی رتھ، نہ بہل
ڈوبنے جاتے ہیں گنگا میں، بنارس والے
نوجوانوں کا سنیچر ہے یہ بڑھوا منگل
تہ و بالا کئے دیتے ہیں، ہوا کے جھونکے
بیڑے بھادوں کے نکلتے ہیں بھرے گنگا جل
خوب چھایا ہے سر گوکل و متھرا بادل
رنگ میں آج کنہیا کے ہے ڈوبا بادل

الفاظ کی بحث میں صرف انہیں مثالوں پر اکتفا کی جاتی ہے۔ آئندہ مختلف سلسلوں میں جسقدر اشعار آئیں گے ان سب سے اس کا مزید ثبوت ملتا جائے گا۔

تشبیہ و استعارہ

شاعری کی ایک اہم صنعت تشبیہ و استعارہ ہے۔ شاعر اپنے گرد و پیش جو کچھ دیکھتا ہے اسی کو تشبیہ اور استعارے کے کام میں لاتا ہے۔ اس لحاظ سے اردو شعراء نے بکثرت ہندی تشبیہیں استعمال کی ہیں۔ بلکہ یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ شاید ہی خالص ہندی شاعری کی کوئی تشبیہ ایسی مل سکے جسے اردو شعراء نے استعمال نہ کیا ہو۔ ہم نے اس سلسلے میں اتنی تشبیہیں جمع کی ہیں کہ ان پر علیحدہ ایک مستقل مضمون لکھا جا سکتا ہے۔ ان میں سے چند یہاں پیش کی جاتی ہیں۔

قد کی تشبیہ بوٹے اور کونپل سے۔

ناسخ:۔

کڑھ گئے گلبن تیرے بوٹا سے قد کو دیکھ کر
تھا کفِ گل میں جو زر گویا دفینہ ہو گیا

امانت:۔

قد جو بوٹا سا ترا سروِ رواں یاد آیا
غش پہ غش مجھ کو چمن میں تہِ شمشاد آیا

امیر:۔

ہر چند لڑکپن میں ہے بوٹا سا قد ان کا
ہونے دو جواں سرو صنوبر سے بڑھیں گے

ابھی اُس نونہال پہ عالم
باغباں، ہے نکلتی کونپل کا

زلفوں کی تشبیہ گھٹا سے:۔

فلک کے زلفیں جو آپڑی ہیں، مگر کسی کی لچک رہی ہے
بلا کی آئی ہیں وہ گھٹائیں، غضب کی بجلی چمک رہی ہے

آتش:۔

خوش نما ہے چہرۂ محبوب پر زلفِ سیاہ
عالم اک مرد کھلاتی ہے کالی گھٹا گلنار پہ
زلف کی گھٹا سے اور سرخیٔ رخسار کی شفق سے
پھولے شفق تو زرد ہو گالوں کے سامنے
پانی بھرے گھٹا ترے بالوں کے سامنے

ایک اور تشبیہ:۔

ہے یادِ زلف میں دل پُر داغ منتشر
کالی گھٹا کے شوق میں، کھولے ہے مور پر

بعض مرکب تشبیہیں:۔

سیاہ گیسو ہیں رُخ پہ بکھرے، وہ بیٹھے سر پر لگا رہے ہیں
اِدھر تو مہتاب ہے گہن میں، اُدھر وہ جادو جگا رہے ہیں

امانت:۔

کبھی کاجل کبھی آنکھوں میں لگایا سرمہ
رات تھا کون سا جادو، جو جگایا نہ گیا

ان تشبیہوں کی ہندیت ظاہر ہے۔

برسات میں دکھلاؤ کبھی رُخ کبھی گیسو
دو چار گھڑی سایہ ہو، دو چار گھڑی دھوپ

زُلف کی تشبیہ سانپ اور ناگن سے۔

امانت:۔ دیدۂ تر میں سرے چھوٹی ہیں زلفیں یار کی
دیکھ لو پانی میں لہراتا ہے جوڑا سانپ کا

ما جو کی اُس نازنیں نے زلف پرفن آب میں
آشنا بولے کہ لہراتی ہے ناگن آب میں

آتش:-

چھوا جو گیسوئے عنبریں کو، تو سانپ کھیلا فسوں سے گویا
لیا جو چشمِ سیہ کا بوسہ، شکار میں نے کیا ہرن کا

آتش:-

یہ نہیں زُلف، اُڑیا ناگن ہے
ہر خم و پیچ میں جدا من ہے

ناگن اور سانپ کی تشبیہ میں شعرا کی پوری پوری غزلیں موجود ہیں۔
(امانت و امیر)

زلف کی تشبیہ جمنا کی موج سے۔

وفی:-

زلف ہے تیری، موج جمنا کی
تل نزدیک اُس کے اک سناسی ہے

زُلف کی سیاہی کی تشبیہ بھونرا سے:۔

جبیں چاند سی، زلفِ نگار بھونرا سی
کنول سے پائے نگاریں ہیں، پھول سے رخسار

جوڑے کی تشبیہ بس کی گانٹھ سے۔

اثر:-

تو وہ طوفان قہر ہے جوڑا
گانٹھ بس کی ہے، زہر ہے جوڑا

سیندور بھری مانگ کی تشبیہ دھنک سے۔

قلق:-

سیندور اُس کی مانگ میں دیتا ہے یوں بہار
جیسے دھنک نکلتا ہے ابر سیاہ سے

موتی بھری مانگ کی تشبیہ بدلی میں بگلوں کی قطار سے۔

اثر:-

مانگ موتی بھری، وہ دے ہے بہار
جیسے بگلوں کی بدلی میں ہو قطار

انتہا یہ ہے کہ زلف، گیسو، کاکل سب ہندو کے معنی میں ہو گئے۔

ذوق:-

خط بڑھا، کاکل بڑھے، زُلفیں بڑھیں، گیسو بڑھے
حُسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے

زُلف کے بعد پیشانی پُر نور کی صندلی بہار ملاحظہ فرمائیے۔

اثر:-

لُطف، گر یہ ہے بتاں صندلی پیشانی کا
حُسن کیا صبح کے پھر چہرۂ نورانی کا

منیر:-

صبح چمن کا جلوہ ہندی بتوں میں دیکھا
صندل بھری جبیں میں، ہونٹوں کی لالیاں میں

آنکھ کی تشبیہ کنول سے۔

آتش:-

آئینے میں عکس چشم یار کا عالم نہ پوچھ
دیکھئے آتش کنول پھولے ہوئے تالاب میں

کنول اور بھنورے سے۔

نیلوفر آنکھ ہے مرے دریائے حُسن کی
شبرنگ مردمک نہیں، بھونرا کنول میں ہے

مرزا شوق:-

آنکھیں بھونروں کی طرح کالی
قد لوچ میں ناروں کی ڈالی

ممولے کی اچھلاہٹ سے۔

شوخی اُن کی عجب تماشا ہے
چلبلاتی ممولے کی کیا ہے

آنکھ کی ایک بے مثل مرکب تشبیہ۔

مزا برسات کا چاہو تو ان آنکھوں میں آ بیٹھو
سپیدی بھی، سیاہی بھی، شفق بھی، ابر باراں بھی

خون آلود مژگاں کی تشبیہ پھولے ہوئے ڈھاک سے جو خاص ہندوستان کی صحرائی بہار ہے۔

محمد امان نثار:-

خونِ جگر سے مژگاں، یوں سرخ ہو رہے ہیں
جنگل میں جیسے یارو، پھولا ہوا ہو ڈھاکا

اس بہار کے سلسلے میں آتش کا وہ مشہور شعر یاد آگیا۔

آتش:-

صحرا کو کبھی نہ پایا رشک و حسد سے خالی
کیا کیا جلا ہے ساکھو، پھولا جو ڈھاک بن میں

ناک کی تشبیہ طوطے کی چونچ سے ۔

آتش :۔

ناک ہے یا کہ ایک طوطا ہے
چونچ اب شہد میں ڈبوتا ہے

لب کی گلنار کی کلیوں سے ۔

امان نثار :۔

آتشیں لب کی ترے باتیں جو ہیں چلبلیاں[1]
گریباں چاک جوں شعلہ ہوئیں گلنار کی کلیاں

رخسار کی تشبیہ شفق سے ۔ ع

پھوٹے شفق تو زرد ہو گالوں کے سامنے

رخسار کی لالہ سے اور خال رخ کی سویدا سے ۔

برق :۔

تیرہ بختوں نے بڑھایا، حسن دونا یار کا
تل سے کاجل کے ، گل رخسار لالہ ہو گیا

تل کی تشبیہ پر ایک اور شعر یاد آ گیا جو خالص ہندوانہ تشبیہ ہے ۔

جان صاحب :۔

تل نہیں مانگ میں زناخی کے
یہ کنھیا کھڑا ہے گوکل میں

دانت کی ہیرے کی کنی سے ۔

لب ہیں وہ لب کہ عقیق یمنی خون کرے
دانت وہ دانت کہ ہیرے کی کنی خون کرے

دنداں، مسی مالیدہ لب کی مختلف تشبیہیں ۔

مسی مالیدہ دنداں پیارے پیارے
چمکتے تھے شب یلدا میں تارے

مسی مالیدہ لب پر رنگ پاں ہے
تماشا ہے، تہ آتش دھواں ہے

وہ ہنستے ہیں ہماری چشم تر پر مسی ملتے ہیں
شب تاریک میں بجلی چمکتی ہے سمندر میں

ہندوستان میں مختلف آب و ہوا کے اثر سے مختلف مقامات کا رنگ جدا ہوتا ہے، سرخ، سپید، کندنی، چمپئی، سانولا، اس لئے یہ تمام رنگ ہندوستان میں مرغوب ہیں، اردو شعرا نے ان سب کو سراہا ہے۔ سرخ و سپید رنگ ۔

آتش :۔

سرخ و سپید رنگ سے ہوتا ہے آشکار
وہ جسم نازنیں ہے عبیر و گلال کا

لیکن ہندوستان کا عام رنگ کندنی اور سانولا ہے ۔

ٹلک، اچپلاہٹ، شرارت، اُمنگ
دمکتا وہ کندن سا چہرے کا رنگ

امانت :۔

رنگ رخسار کا شعلہ جو بھڑک جاتا ہے
آتش حسن پہ کندن سا دمک جاتا ہے

میر :۔

ایسی پیدا کرے ہے رنگ جھلک
جیسے کندن پہ خوش نما ہو جھلک

امانت :۔

رنگ رخ وہ ہے طلائی کہ نہیں جس کا نظیر
ہے بجا خاک عناصر کو جو کہیئے اکسیر

ان سب رنگوں میں سانولے رنگ کو خاص مقبولیت اور محبوبیت حاصل ہے ۔ چنانچہ "سانولا" معشوق کا مرادف ہو گیا ۔

امیر :۔

دور دورہ ہو ترا سانولی صورت والے
تجھ کو دیتے ہیں دعائیں یہ ترے متوالے

گندمی رنگ ۔

امانت :۔ ہوا ہے دل پہ رنگ سبزہ، لطف زندگانی ہے
مرے محبوب گندم گوں کی جو پوشاک دھانی ہے

مرزا شوق :۔

سبزۂ خط نے بڑھا دی ترے عارض کی بہار
تھا جو لالہ کا چمن کھیت ہے اب دھانوں کا

اتنی مثالیں اردو شاعری میں ہندی تشبیہوں کے ثبوت کے لئے کافی ہیں ۔

"ہندوستانی"

---

[1] یہ مصرع موزوں نہیں ہے ۔ (ادارہ)

بین الاقوامی کاروبار کا طریقہ

روپیہ ہندوستان کا قانونی سکّہ ہے، اسی کے ذریعہ ہم جس حصہ ملک میں چاہیں مطلوبہ اشیاء خرید سکتے ہیں۔ لیکن ہندوستان سے باہر اس روپے سے کوئی چیز خریدی نہیں جاسکتی، اس کا سبب کیا ہے ؟ سبب یہ ہے کہ ہر ملک کا سکّہ جدا ہوتا ہے، انگلستان میں پونڈ چلتا ہے، فرانس میں فرینک، اٹلی میں لیرا، روس میں روبل، جرمنی میں مارک، اور امریکہ میں ڈالر،

اب سوال یہ ہے کہ جب ہر ملک کا سکّہ جدا جدا ہے تو بین الاقوامی کاروبار کیسے ہوتا ہے ؟ انگریز تاجر ہندوستانی مارواڑی سے کپڑا فروخت کریگا۔ وہ پونڈ میں قیمت طلب کریگا۔ مارواڑی پونڈ کہاں سے دیگا؟ ہندوستان میں تو روپیہ چلتا ہے، امریکن ٹائپ رائٹر کمپنیاں ہندوستان میں مشینیں فروخت کریں اور قیمت میں روپے پائیں تو وہ روپیہ لیکر کیا کرینگی؟ امریکہ میں تو روپے کا چلن ہی نہیں ہے، وہاں ڈالر کی ضرورت ہے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہندوستانی تاجر غیر ممالک سے جو اشیاء خریدتا ہے ان کی قیمت میں روپے دیتا ہے، پھر کیا روپے لدکر غیر ممالک کو جاتے ہیں اور وہاں گلا دئے جاتے ہیں ؟

درآمد برآمد

بین الاقوامی کاروبار عجیب طریقے سے چلتا ہے، جو مال غیر ممالک سے خریدا جاتا ہے اسے "درآمد" کہتے ہیں اور جو مال غیر ممالک میں فروخت کیا جاتا ہے اسے "برآمد" کہا جاتا ہے، مثلاً ہندوستان نے ۱۹۳۰-۳۱ء میں دو ارب روپے کا مال غیر ممالک سے خریدا تھا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہندوستان کی داخلی تجارت یا درآمد دو ارب روپے کی تھی اسی دوران میں ہندوستان نے دو ارب ۲۶ کروڑ روپے کا مال غیر ممالک کے ہاتھ فروخت کیا، یہ اس کی خارجی تجارت یا "برآمد" ہوئی۔

اگر درآمد کی مالیت برابر ہوتی تو لین دین برابر ہو جاتا ہے، مثلاً ہندوستان نے پچاس کروڑ کا کپڑا انگلستان سے خریدا اور پچاس کروڑ کا گیہوں ہندوستان سے انگلستان نے تو اب اسکی ضرورت نہیں ہے کہ ہندوستان کی رقم انگلستان جائے یا انگلستان کوئی رقم ہندوستان بھیجے، صرف کاغذی حساب کتاب کافی ہوگا، لیکن اگر ہندوستان نے کسی ملک سے مال فروخت کیا زیادہ قیمت کا، اور خریداری کی کم قیمت کی تو باقی رقم سونے کی صورت میں ہندوستان دیگا۔

اعتباری درآمد برآمد

ایک بات اور بھی سمجھ لینی چاہیے، ایک درآمد برآمد تو وہ ہے جسکی تفصیل اوپر گذر چکی، اس کے علاوہ درآمد برآمد کی ایک اور قسم بھی ہے جسے اعتباری درآمد و برآمد یا غیر ظاہر درآمد و برآمد کہہ سکتے ہیں۔

ظاہری درآمد تو وہ ہے جو واقعی مال کی صورت میں ہوتی ہے، جیسے کپڑا، مشین، موٹر وغیرہ اور اعتباری درآمد وہ ہے کہ بظاہر کوئی چیز آتی نہیں لیکن اسکی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ اسی طرح ظاہری برآمد وہ ہے جسے ہم جہاز پر لاد کر بھیجتے ہیں۔ جیسے گیہوں چاول وغیرہ اور اعتباری یا غیر ظاہر برآمد میں ہم اس طرح کی کوئی چیز نہیں بھیجتے مگر اس کی قیمت ہمیں ملجاتی ہے، یہ کیا معمّہ ہے ؟

اعتباری برآمد وہ نقد رقم ہے جو ملک میں سرمایہ کے طور پر آتی ہے اور کاروبار میں لگائی جاتی ہے، غیر ممالک میں لگے ہوئے سرمایہ کے منافع یا سود سے جو نقد رقم آتی ہے وہ غیر ظاہر برآمد ہے، جو روپیہ مسافر لوگ کسی ملک میں جاکر خرچ کر آتے ہیں وہ اس ملک کی برآمد میں شمار ہوتی ہے، غیر ظاہر یا اعتباری درآمد وہ رقم ہے جسے کوئی ملک اپنے یہاں لگے ہوئے غیر ملکی سرمائے کی مد میں سود یا منافع کے کھاتے میں ادا کرتا ہے، جو پنشنیں غیر ملکی ملازمین کو دی جاتی ہیں ان کی رقم غیر ظاہر درآمد میں محسوب ہوتی ہے۔

غیر ظاہر یا اعتباری برآمد و درآمد کی وضاحت کے طور پر یوں سمجھ لینا چاہئے کہ ہندوستان کی ریلوے اور دوسری کمپنیوں میں غیر ملک کے کروڑوں روپے لگے ہوئے ہیں، ریلوے میں جو منافع ہوتا ہے وہ سالانہ غیر ملکی سرمایہ داروں کو دیا جاتا ہے۔ اس رقم کو غیر ظاہر برآمد کہا جائیگا اسلیے کہ اس رقم کے عوض ہمیں کوئی مال نہیں ملتا، ہر سال رقم ہی ادا کرنی پڑتی

ہے - جو انگریز ہندوستانی حکومت کی چاکری کر چکے ہیں اور پنشن لے رہے ہیں، بہت سے انگریز ملازم اپنی تنخواہوں سے بچا کر کروڑوں روپے ہر سال انگلستان بھیج رہے ہیں یہ سب غیر ظاہر درآمد ہے، کیونکہ اس رقم کے بدلے جو چیز ہندوستان کو ملتی ہے وہ غیر ظاہر ہے اسی سے غیر ظاہر برآمد کو بھی سمجھ لیجئے -

ہندوستان کی غیر ظاہر برآمد بہت کم ہے، کیونکہ ہندوستان کا سرمایہ کسی غیر ملک میں نہیں لگا ہے، نہ ہندوستانی غیر ممالک میں ایسی بڑی جگہوں پر مامور ہیں کہ وہ اپنی تنخواہوں سے پس انداز کر کے ہندوستان کو روپے بھیجیں، اس ملک کی غیر ظاہر درآمد بہت زیادہ ہے ہندوستان کے اوپر قرض ہے، وہ پنشنیں دیتا ہے، کروڑوں روپے بدیسی ملازمین تنخواہوں سے پس انداز کر کے باہر بھیجتے ہیں، صرف قرض کی ادائیگی کی صورت میں ہندوستان پچاس سے ساٹھ کروڑ روپے سالانہ تک باہر بھیجتا ہے -

۳۱ مارچ ۱۹۳۱ء کو حکومت ہند پر انگلستان کا حسب ذیل قرض تھا -

مدیں	لاکھ پونڈ	کروڑ روپیہ
۳۱ مارچ ۱۹۳۱ء تک پرانا قرض	۲۹۲۷	۳۹۰۲۶
جنگ عظیم کی اعانت کے مدمیں	۱۶۱۳	
ریلوے کی اینوئی	۵۱۸۶	
انڈیا بل	۶۰	
پراویڈنٹ فنڈ	۲۶۶	
کل	۱۰۲۲ =	کروڑ ۷۶۶۰۵

سوال یہ تھا کہ بین الاقوامی کاروبار کیسے ہوتا ہے ؟ اس کا قاعدہ یہ ہے کہ پہلے درآمد کی قیمت خواہ وہ ظاہر ہو یا غیر ظاہر برآمد کی صورت میں چاہے وہ ظاہر ہو یا غیر ظاہر ادا کی جاتی ہے اور اگر برآمد سے درآمد زیادہ ہوئی تو اسے خلاف بیلنس آف ٹریڈ مانا جاتا ہے، اگر درآمد کم ہے اور برآمد زیادہ تو بیلنس آف ٹریڈ موافق کہا جاتا ہے،

سونے کا اخراج

اوپر کی تفصیلات سے معلوم ہو چکا ہے کہ ہندوستان غیر ممالک سے جو چیزیں خریدتا ہے ان کی قیمت اپنی پیدا کردہ اشیاء کی صورت، میں ادا کرتا ہے، غیر ظاہر برآمد کے عوض بھی اسے اپنی پیداوار باہر بھیجنی پڑتی ہے، یعنی قرض کے سوا اور پنشنوں کی صورت میں ہندوستان کو جو روپیہ دینا پڑتا ہے اسکے عوض وہ گیہوں، چاول، جو وغیرہ دیتا ہے، اگر درآمد اتنی ہے جو اس طرح ادا ہو جاتی ہے تو خیر ورنہ باقی کے بدلے سونا باہر بھیجنا پڑتا ہے، آجکل ہندوستان کو یہی کرنا پڑتا ہے اربوں کا سونا باہر چلا گیا اور برابر چلا جا رہا ہے، اس کا سبب صرف یہ ہے کہ ہم غیر ممالک میں برآمد کو اتنی ترقی نہیں دے سکتے کہ درآمد کی قیمت ادا کر سکیں، اسکی کمی ہمیں سونا باہر بھیجکر پوری کرنی پڑتی ہے، اس طرح درآمد، برآمد اور سونا، ان تینوں کے ذریعہ بین الاقوامی کاروبار چل رہا ہے - اگر کسی ملک کی برآمد درآمد سے کم ہوتی ہے تو اسے سونا باہر بھیجنا پڑتا ہے اور اگر درآمد سے برآمد بڑھ گئی تو سونا باہر سے ملتا ہے -

ایک بات اور ہوتی ہے، اگر ہندوستان میں برآمد کے مقابلے میں درآمد زیادہ ہوئی تو ہندوستان کے اوپر غیر ملکی تاجروں کی ہنڈی زیادہ ہوگی ایسی حالت میں ہندوستان کے سکّے کی قیمت یعنی روپے کی قیمت میں بٹہ لگنے لگیگا، روپے کی قیمت گھٹ.. جائے گی -

شرح تبادلہ

اگر حکومتیں ملکی اور غیر ملکی سکّوں کے باہمی تعلقات میں دست اندازی نہ کریں تو اقتصادی طاقتیں بطور خود اس کا توازن درست کرلیں لیکن دنیا کی تمام حکومتیں ملکی اور غیر ملکی سکّوں کی صرافی میں دخل انداز ہوتی ہیں اور قانون کے ذریعہ ان کی شرح قیمت طے کرتی ہیں - مثلاً حکومت ہند نے ۱۹۲۷ء میں طے کر دیا ہے کہ ایک روپے کی قیمت ایک شلنگ چھ پینس ہو، جس نرخ پر ایک ملک کا سکّہ دوسرے ملک کے سکّے کی صورت میں تبدیل ہوتا ہے ماہرین اقتصادیات کی اصطلاح میں اسے شرح تبادلہ کہتے ہیں -

شرح تبادلہ کا تجارت پر اثر

شرح تبادلہ کا ملک کی تجارت پر کافی اثر پڑتا ہے، اگر آج حکومت ہند شرح تبادلہ بدل دے یعنی روپے کی قیمت ایک شلنگ چھ پینس کی بجائے زیادہ یا کم کر دے تو ہندوستان کی داخلی و خارجی تجارت پر اس کا زبردست اثر پڑ سکتا ہے، اگر آج روپیہ کی قیمت ایک

شلنگ چھ پنس کی بجائے ایک شلنگ آٹھ پنس ہوجائے تو ہماری خارجی تجارت کو سخت نقصان پہونچے، آج انگریزی تاجر ایک شلنگ چھ پنس دے کر دس سیر گیہوں ہندوستان سے خرید سکتا ہے لیکن شرح تبادلہ بدل جانے کے بعد اسی دس سیر گیہوں کیلئے اسے ایک شلنگ ۸ پنس دینا پڑینگے یعنی دو پنس زیادہ، لہذا وہ ہندوستان کی بجائے کسی اور ملک سے گیہوں خریدے گا اور اپنے دو پنس کو بچائیگا اس طرح گیہوں کا باہر جانا بند ہوجائیگا - کاروباری لوگ گیہوں کی خریداری بند کر دینگے، گیہوں کا نرخ گرجائیگا، دس سیر کی بجائے گیارہ سیر بکنے لگے گا - کسانوں کی مالی حالت بد سے بدتر ہوجائے گی، کیونکہ آجکل وہ من بھر گیہوں فروخت کر کے چار روپے پاتا تھا، اس وقت صرف ۳ روپے پائیگا - اس تبدیلی کا دوسرا اثر یہ ہوگا کہ غیر ملکی مال ہندوستان میں سستا پڑیگا، آج جب شرح تبادلہ ۱۸ پنس ہے ایک شلنگ چھ پنس (ایک روپیہ) دے کر ہم لنکا شائر کی پانچ گز مارکین خرید لیتے ہیں، کیونکہ ۱۸ پنس میں ۵ گز مارکین فروخت کرنے میں برطانوی تاجر کا پرتہ پڑ جاتا ہے۔ اگر تبادلہ کی شرح بدل دی جائے اور ایک روپیہ بیس پنس کا ہوجائے تو برطانوی تاجر بیس پنس ۵ گز ۲ گرہ مارکین پرتے کے مطابق دے سکے گا، لوگ ۵ گز کی بجائے ۶ گز مارکین خریدنے لگینگے۔

ایک اور مثال کے ذریعہ سمجھ لیجئے، آپ کو ایک برطانوی کار خریدنی ہے، اس کی قیمت ۲۴۰ پونڈ ہے، تبادلہ کی در ۱۸ پنس ہونے کی وجہ سے اس کار کے ۳۲۰۰ دینے پڑینگے، لیکن اگر تبادلہ کی در ۲۰ پنس ہوجائے تو وہی کار آپ کو ۲۸۸۰ روپے میں مل جائے گی، اور آپ ۳۲۰ روپے کی بچت میں رہینگے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوستان میں موٹروں کی خریداری ترقی کر جائے گی۔

اسی اصول کے پیش نظر اٹلی، فرانس، سوئٹزرلینڈ وغیرہ ملکوں نے اپنے سکوں کی قیمت کم کر دی ہے

خواجہ محمود جاوید
ایم - اے

غزل

ناخداؤں پہ بھروسہ ہے، خدا سے پہلے
ورنہ کرتے نہ دوا لوگ دعا سے پہلے

آج تو میسد سے بیٹھے ہیں خدا خیر کرے
وہی احباب جو دیتے تھے دلا سے پہلے

ڈوب جانے کا نہیں کشتئ امید کے غم
میں ڈرا کرتا تھا گرداب بلا سے پہلے

کیوں مکلف کیا مجبور بنا کر ہم کو
حشر میں ہم یہی پوچھینگے خدا سے پہلے

میں سزاوار سزا ہوں یہ بجا ہے لیکن
کیا ندامت کی سزا کم ہے سزا سے پہلے

موت کیا ان کا بگاڑیگی بھلا اے خادم
خود کو جو نیست سمجھتے ہیں فنا سے پہلے

میرزا خادم منشی فاضل
ہوشیارپوری

مومن کی شاعری میں خمریاتی عنصر

حکیم مومن خان مومن اردو کے ان شاعروں میں سے ہیں جنہوں نے اردو شاعری کو حقیقی معنیٰ میں عظیم بنایا، اگر آپ شاعری میں تنوع، جدت، شوخی اسلوب بیان، ندرت الفاظ، بیساختگی اور جذبات نگاری کو اوج کمال پر دیکھنا چاہیں تو میر، درد اور اسکے بعد مومن کے پاس ہی دیکھینگے، دوسروں کو تو اسکی ہوا بھی نہیں لگی، غالب البتہ بعض مقامات پر مومن کے ہمردیف ہو جاتے ہیں مگر شریک غالب نہیں،

آج ہم مومن کی رندانہ شاعری اور انکے کلام کے خمریاتی پہلو سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں، مومن اگرچہ آزاد منش، عاشق مزاج اور رند طینت تھے مگر مے نوشی کی عادت انہیں نہ تھی اس دور کے شرفاء میں شراب کا استعمال نہایت معیوب سمجھا جاتا تھا، شاید شرفاء دہلی میں مرزا نوشہ ہی رند شراب خوار تھے ورنہ متوسطین کا دامن اس سے آلودہ نہیں ہوا۔

شاعری میں منجملہ اور چیزوں کے ایک شراب بھی داخل ہوگئی ہے۔ ہر شاعر جو بڑے سے بڑا متقی تھا خمریاتی شعر کہتا گیا، چنانچہ عرب اور ایرانی شعراء کے قصائد اور غزلیات موجود ہیں، سعدی شیرازی، مولنا جامی وغیرہ جیسے متقی شعراء نے بلا تکلف اور نہایت مزے سے شراب کا ذکر کیا ہے خواجہ حافظ کا سارا دیوان مے و ساغر کے تذکرہ سے بھرا پڑا ہے اور ایک خوش عقیدہ گروہ یہ ثابت کرنیکو تیار ہے کہ خواجہ حافظ نے کبھی شراب نہیں پی، اسی طرح شعراء اردو نے بھی ساغر و شراب کا تذکرہ کیا ہے۔ بعضوں نے انکا استعمال صوفیانہ انداز میں کیا ہے اور بعضوں نے رندانہ طریق پر۔ میر تقی میر، مومن اور غالب شراب اور اسکے لوازماتی الفاظ جب کبھی استعمال کرتے ہیں تو حقیقی معنی میں استعمال کرتے ہیں، بخلاف اسکے خواجہ میر درد کی شراب مئے وحدت اور جام ساغر ابد ہوتا ہے۔ بہرحال خمریاتی انداز اردو شاعری کا نہ صرف جزو اعظم بلکہ اسکی جان ہے۔

میرا جہاں تک خیال ہے مومن کی خمریاتی شاعری پر آج تک کسی نے نظر نہیں ڈالی مگر غالب اور انکی شراب خواری اور خمریاتی شاعری پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے جسکی وجہ سے عام طور پر یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ غالب مئے و ساغر کے مضامین باندھنے میں ذوق اور مومن دونوں پر فوقیت رکھتے ہیں۔

استاد ذوق نہ تو عاشق مزاج تھے نہ رند منش اسی وجہ سے انکے خمریاتی شعر کچھ اچھے نہ ہو سکے، غالب گو عاشق مزاج نہ تھے مگر رند لاوبالی اور بادہ پرست ضرور تھے، اسی لئے انہوں نے خمریاتی شعر بڑے اچھے کہے ہیں، مگر مومن نے باوجود اسکے کہ کبھی شراب کو منہ نہیں لگایا، خمریاتی مضامین اس عمدگی سے ادا کئے ہیں کہ بعض جگہ انکا پلہ غالب سے بھاری نظر آتا ہے۔

شراب کے مضامین اردو شاعری میں صرف چند طریقوں سے باندھے جاتے ہیں یا تو شاعر اپنی شراب خواری کا تذکرہ کرتا ہے یا معشوق اور رقیب کی- یا محتسب اور واعظ پر الزام لگاتا ہے یا شراب کی عام تعریف کرتا ہے۔ چنانچہ یہ پورے لوازمات مومن کے یہاں موجود ہیں۔

محبوب شراب پیتا ہے تو لب ساغر کو لب محبوب سے وصل ہوتے دیکھ کر خم صہبا کے منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ بات بالکل معمولی ہے مگر مومن نے اس مضمون کو بڑی عمدگی سے ادا کیا ہے۔

منہ میں کیا خم صہبا کے بھر آیا پانی
تیرے لب سے جو لب ساغر سرشار لگا

اسی مضمون کو دوسری طرح بھی بڑی عمدگی سے باندھا ہے اور رشک کا ایک نہایت نازک مرقع پیش کیا ہے۔ بزم مے ہے محبوب شراب کا جام اٹھا کر منہ سے لگاتا ہے اور آہستہ آہستہ، ٹھہر ٹھہر کر جرعہ، جرعہ پیتا ہے یہ مومن سے دیکھا نہیں جاتا، جام کو محبوب کے ہونٹوں کے بوسے لیتا دیکھ کر زہر پینے کیلیے تیار ہو جاتے ہیں۔

میں اسکی بزم مے میں زہر پی کیونکر نہ مرجاتا
کہ میرے سامنے اس لب کے بوسے جام لیتا تھا

محبوب کسی بزم شراب سے سیاہ مستی کے عالم میں اٹھ کر آتا ہے آنکھیں انگارے کی طرح سرخ ہیں، چہرہ تمتمایا ہوا ہے۔ اسے دیکھکر مومن کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں، انہیں اپنے معصوم محبوب پر شراب نوشی کا گمان کہاں ہے کو ہوتا! گمان قہر سے رنگت زرد ہو جاتی ہے۔

گمان قہر سے اپنا تو رنگ زرد ہے اور
سیاہ مستیٔ مے سے ہے چشم جاناں سرخ

مومن کبھی شیشۂ شراب کو کبوتر بھی بناتے ہیں اور بدمستیٔ غم کا حال لکھ کر شیشۂ صہبا کے گلے میں باندھ دیتے ہیں "تاکہ وہ میکش پڑھ لے"

نکھ کے بدمستیٔ غم تاکہ وہ میکش پڑھ لے
باندھ دیتا ہوں سرِ شیشۂ صہبا کاغذ

ایک شعر اس غضب کا کہا ہے کہ داد نہیں دیجا سکتی کہتے ہیں۔

جب وہ بدمست ادھر آیا۔ عدو کے گھر سے
اپنی قسمت میں بجز دردِ مئے ناب نہیں

یہ شعر مومن نے خاص انداز میں کہا ہے اس میں ایک طویل داستان ہے جو چھوڑ دی گئی ہے۔ مومن کی بدنصیبی دیکھیئے انکا محبوب جب کبھی انکے گھر آتا ہے تو کہاں سے آتا ہے ؟ اپنے گھر سے انکے ہاں جانے کیلیئے نہیں آتا بلکہ رقیب کے گھر جا کے واپس لوٹتے ہوئے مومن کے پاس ہوتا ہوا جاتا ہے اسی لیے کہتے ہیں اپنی قسمت میں تلچھٹ ہی ہے۔ مئے ناب نہیں، وہ تو عدو ہی کا حصہ ہے۔ ہائے پھر پڑھیئے۔

جب وہ بدمست ادھر آیا۔ عدو کے گھر سے
اپنی قسمت میں بجز دُردِ مئے ناب نہیں

بدنصیبی اور رشک کا کس قدر لطیف پیرایہ میں اظہار کیا ہے۔ معشوق کا آنا عاشق کیلیے معراج سے کم نہیں مگر مومن کی خودداری اور غیرت اسے پسند نہیں کرتی کہ وہ عدو کے گھر جا کے گلہ ٹالنے کیلیے انکے پاس آئے گویا کہ عدو عید منائے اور ٹرکا میلہ مومن کے حصہ میں آئے، یہیں مومن اور غالب کی حدیں باہم مل جاتی ہیں، غالب کہتے ہیں۔

رات کے وقت مے پیئے ساتھ رقیب کو لیے
آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

غالب بھی اسی مضمون کو بالکل اسی انداز میں باندھتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ محبوب انکے گھر آئے مگر خدا نہ کرے کہ رات کے وقت شراب پیکر رقیب کو ساتھ لیکر آئے بلکہ وہ بھی بلاشرکتِ غیرے تنہا ملاقات چاہتے ہیں،

مومن نے محبوب کی مے نوشی سے متعلق بہت سے شعر کہے ہیں جنمیں سے چند نقل کیے جاتے ہیں۔

شاید کبھی وہ میکش بدمست منہ لگائے ؛ خاک اپنی کاش دُردِ تہ خم نشستہ ہو

~~~~~~~~

کیا قہر ہے کب تک کوئی رہجائے آنسو پی کے یوں
ہنس ہنس کے میرے آگے تم دستِ عدو سے جام لو

~~~~~~~~

وہم میخواری سے ہمکو نشۂ بنگ آگیا ؛ ہوش جاتے ہیں تری بہکی ہوئی تقریر سے

آخری شعر کسقدر معصوم ہے۔ محبوب بہکی ہوئی تقریر کرتا ہے تو آپ کو اسکی میخواری کا وہم ہونے لگتا ہے۔ یقین نہیں ہوتا کیونکہ انکا معصوم محبوب شراب خواری سے بہت دور نظر آتا ہے۔

مومن نے اپنی شراب نوشی سے متعلق بھی بہت سے شعر کہے ہیں، اس پر انکو خود بھی افسوس ہے۔

رات دن بادہ و صنم مومن ؛ کچھ تو پرہیزگار ہو ناتھا

بلا نوشی ایک پامال مضمون ہے ہر ایک شاعر نے اسکو مختلف طریقوں سے ادا کیا ہے۔ مومن نے بھی اس مضمون کو بڑی عمدگی سے باندھا ہے۔ کہتے ہیں۔

دیکھنا کثرتِ بلانوشی ؛ ؛ ؛ کاسۂ آسماں ہے جام مرا

~~~~~~~~

حوضِ میخانہ پیے سے بھی مرا جی نہ بھرا ؛ کیا تنک ظرف ہیں جو خم سے سبو بھرتے ہیں

~~~~~~~~

وہ رندِ خم کدہ کش ہوں کہ زہر دیتے ہیں ؛ بتنگ آ کے حریفانِ بادہ خوار مجھے

~~~~~~~~

روزِ محشر بھی ہوش گر آیا ؛ ؛ ؛ ؛ جائینگے ہم شراب خانے کو

چوتھا شعر خصوصیت سے بڑا اچھا کہا ہے۔ ایک رندِ میکش جب عرصۂ حشر میں اٹھایا جائیگا تو وہ شراب کے سوا اور کیا مانگے گا اسی لئے مومن اٹھتے ہی شراب خانہ کو جانا چاہتے ہیں، اب رہا یہ سوال کہ ہوش سے مراد کیا ہے۔ اب چاہے اسے بارشِ انوار سے بے ہوشی کے بعد آنے والے ہوش سے تعبیر کیجیے یا زندگیٔ حشر سے۔ مگر مومن عرصۂ محشر میں کسی مسجد یا خانقاہ کا ارادہ نہیں کرینگے بلکہ سیدھے میخانہ کا راستہ لینگے۔

اسی مضمون کو حکیم عابد علی غیور نے بھی ادا کیا ہے۔ اور بڑی عمدگی سے ادا کیا ہے۔

میں جبرئیل سے محشر میں پوچھتا ہوں غیور
میاں فرشتے یہاں ہے شراب خانہ کہاں

یہ ہوسِ شراب اتنی بڑھتی ہے کہ شراب یا خم و ساغر تو دور رہے شیشے کی تصویر ہی نظر آتی ہے تو مومن بیخود ہو جاتے ہیں۔

بھلا کیا اعتبار اے مومن ایسی پارسائی کا ؛ کہ بیخود ہو گئے تم دیکھکر تصویر شیشہ کی

شراب سے ہمدردی اور اسکے ضائع ہو جانے کا افسوس یہ بھی ایک پامال مضمون ہے مگر مومن اسکو بھی نہایت سلیقہ سے ادا کرتے ہیں۔
~~~~~~~~

محتسب وہم ہے تو پہلے پلا دیکھ مجھے
نہ لنڈھا، پی لے، مئے ناب ہے، زہراب نہیں

~~~

خاک میں حیف یہ شراب ملے ؛ محتسب بادہ خوار ہونا تھا
محتسب اور زاہد چونکہ دونوں ہی شراب خواری کے دشمن ہوتے ہیں اسلیئے خمریاتی شاعری میں فارسی اور اردو کے شعرا نے بڑی بے تکلفی سے ان دونوں کی مذمت کی ہے۔ مومن بھی اس مضمون کو ادا کرتے ہیں مگر بہت رکھ رکھاؤ کے ساتھ رکاکت اور بیہودگی کی جھلک تک نہیں آنے پاتی۔

معشوق و مے سے زاہد مفلس کو یاس ہے ؛ قطع تعلقات کس امید پر نہ ہو
ظاہر ہے کہ میاں زاہد مفلس ہیں اور بے زر عشق "ٹین، ٹین" بغیر روپے کے نہ تو شراب مل سکتی ہے اور نہ کوئی معشوق منہ لگاتا ہے اسی لیے اس نے قطع تعلقات کر لیا ہے۔ ورنہ کوئی امید ہوتی تو قطع تعلق نہ کرتے، محتسب آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ نہ صرف شراب پھنکوا دیگا بلکہ خم و ساغر بھی توڑ دیگا، غالب کہتے ہیں۔

مجھ سے میکش کی طرف محتسب آتا ہے تو آئے ؛ ایک قطرہ بھی سبو و خم و ساغر میں نہیں
غالب مطمئن ہیں کہ میں نے شراب تو پی لی ہے خم و ساغر خالی پڑے ہوئے ہیں محتسب آکر توڑ دے تو توڑنے دو" اور بازار سے لے آئینگے گر ٹوٹ گیا"، مگر مومن اسے بھی پسند نہیں کرتے کہ محتسب انکا شیشۂ مے توڑے۔

سوا اے محتسب اس کے کہ اپنے دل کی صورت ہے
سزاوارِ شکستن کونسی تقصیر شیشہ کی
مگر اس پر بھی محتسب توڑ دیتا ہے اور مومن کہتے ہیں کہ اب کیا کروگے تم نے شیشہ تو خاک میں ملا دیا مگر اسکی توقیر کہیں کم ہو سکتی ہے۔

یہ کیا طاقت کہ اب بھی محتسب پامال کر ڈالے
ملا تو خاک میں پر ہے وہی توقیر شیشہ کی
مذہب اور صحفِ سماوی میں شراب کی مذمت یا اسکا تذکرہ دیکھ کر مختلف لوگوں کو مختلف خیالات پیدا ہوتے ہیں، قرآن جسقدر متبرک اور پاک چیز ہے مومن اس سے واقف ہیں ایسی کتاب میں شراب اور حور کا ذکر دیکھ کر کچھ عجیب بدخیالی پیدا ہوتی ہے کہتے ہیں۔

ذکرِ شراب و حور کلامِ خدا میں دیکھ ؛ مومن میں کیا کہوں مجھے کیا یاد آگیا
مگر اسی کلامِ خدا کی شراب کا ذکر واعظ غالب کے سامنے کرتا ہے تو وہ بپھر جاتے ہیں اور کہتے ہیں۔

واعظ نہ تم پیئو نہ کسی کو پلا سکو ؛ کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی
اور جب پی جاتے ہیں تو پھر قطب صاحب بھی گھونگچی برابر نظر آتا ہے کہتے ہیں۔

گر یہی بیخودی ہے صہبا میں ؛ کون مشتاقِ سلسبیل ہوا
شراب کے عام مضمون بھی مومن نے نہایت بلند خیالی کے ساتھ ادا کیئے ہیں، یار دوست شراب پلاتے ہیں مگر شراب پیتے ہوئے جو سرور حاصل ہوتا ہے تو مومن کا ذہن فوراً چشمِ یار کی طرف منتقل ہوتا ہے اور اسی یاد میں مر جاتے ہیں۔

میں مر گیا وہ چشم جو یاد آئی، اور یار ؛ حیران ہیں کہ مے تھی پیالہ میں سم نہ تھا
شیشہ سے شراب گرتی ہے تو اسکی قہ قہ سنکر مومن کو اپنے محبوب کی بدمستی اور اسکا ہکلانا یاد آجاتا ہے۔

بیان کرتا ہے ہکلانیکا اس بدمست کے عالم ؛ دے کب سمجھے پیچیدہ ہے تقریر شیشہ کی
اسی مضمون کو ایک اور طرح ادا کرتے ہیں۔

وہ گردن دیکھ یہ حالت ہوئی تغیرِ شیشہ کی ؛ کہ تھمتی ہی نہیں ہچکی، ہوئی ہے دیر شیشہ کی
ایک شعر اپنے خاص رنگ میں اور نہایت بلند کہا ہے۔

کیا جلوہ یاد آئے کہ اپنی خبر نہیں ؛ بے بادہ مست ہوں میں شبِ ماہتاب میں
یہی وہ رندی و سرمستی ہے جو شعرا کو مست اور بیخود بنائے رکھتی ہے وہ جلوے جو یاد آگئے کیا تھے انکی تفصیل بھی سُن لیجیے۔

جاں لوٹتی ہے پھر کہ وہی عیش ہو نصیب
ہم ہیں وہ مستِ ناز ہے اور دورِ جام ہے
میخانہ، مغ، یعنی پیرِ مغان اور مغبچہ، یعنی طفلانِ میخانہ، لوازماتِ مے نوشی میں شمار ہوتے ہیں، مومن کی شاعری میں جو خصوصیت سب سے زیادہ اہم ہے وہ یہ ہے کہ مومن نے امرد پرستی نہیں کی سارے دیوان میں تین چار شعر ایسے ملینگے جنمیں طفلِ برہمن یا مغبچہ وغیرہ آگیا ہے۔ چنانچہ محض مضمون کی خاطر اپنے ایک خمریاتی شعر میں مغبچہ کا تذکرہ کیا ہے مگر اسکو للچائی ہوئی نظروں سے نہیں دیکھا بلکہ ساقی کو مغبچوں کی چشمِ میگوں کا پرستار ٹھہرایا ہے۔

اگر گردش یہی ہے مغبچوں کی چشمِ میگوں کی
کفِ ساقی میں جامِ بادۂ گلگوں نہ ٹھہرے گا
ایک اور شعر مومن نے نہایت مستانہ کہا ہے۔ کہتے ہیں۔

فکرِ مآل سے مئے و شاہد رہے عزیز ؛ پیری میں موت یاد تھی پیری شباب میں
مآل کی فکر یہ تھی کہ انجام کار فنا ہونا ہے اور وہاں کچھ نہ ملیگا، اسی
~~~

لیے جوانی میں بڑھاپے کی یاد رہی اور بڑھاپے میں موت کی یاد آتی رہی اور شراب و شاہد ہمیشہ عزیز رہے، اسی مضمون کو ایک اور جگہ بھی نہایت عمدگی سے باندھا ہے۔

جلتا ہوں ہجرِ شاہد و یادِ شراب میں ؛ شوقِ شراب نے مجھے ڈالا عذاب میں

ثوابِ دارین کی فکر میں مئے و معشوق چھوڑ دیتے ہیں مگر یہ فکرِ ثواب خود ایک عذاب بنجاتی ہے اور ہجرِ شاہد و یادِ شراب میں جلنے لگتے ہیں۔ یہ تھا مومن کی شاعری کا خمریاتی پہلو جو مومن کی شاعری کا ایک اضافی پہلو ہے ورنہ انکی شاعری کے حقیقی پہلو اس سے کہیں بہتر اور نہایت زیادہ واضح ہیں، انشاء اللہ آئندہ کسی فرصت میں اور پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی جائیگی۔

تسکین عابدی

غزل

تری نگاہ سے حاصل قرار ہو نہ سکا ؛ خمار بھی تو بقدرِ خمار ہو نہ سکا

میں ہوں وہ پھول جو اپنی خزاں نصیبی سے ؛ چمن میں رہ کے شریکِ بہار ہو نہ سکا

تمہارے عہدِ محبت سے فائدہ کہ مجھے ؛ یقین آ نہ سکا، اعتبار ہو نہ سکا

وہ چاہتے تھے بہت مختصر کہانی ہو ؛ بیاں کے وقت مگر اختصار ہو نہ سکا

خراب حال تھا قسمت خراب تھی میری ؛ حریفِ گردشِ لیل و نہار ہو نہ سکا

کسی نے نیم نگاہی سے بارہا دیکھا ؛ مگر یہ تیر کلیجے کے پار ہو نہ سکا

طبیب آئے، ہوئے شور سے، مگر اب تک ؛ علاجِ دردِ غمِ انتظار ہو نہ سکا

عجیب کشمکشِ جبر و اختیار رہی ؛ قرار پا نہ سکا، بیقرار ہو نہ سکا

کسی کا رازِ محبت ارے معاذ اللہ ؛ امینِ راز بھی خود پردہ دار ہو نہ سکا

بھر آئے آنکھ میں طوفاں شکستہ حالی پر ؛ اسیرِ ضبط، مگر اشکبار ہو نہ سکا

بھلا دیا مجھے اہلِ وطن نے سیفؔ مگر ؛ وطن کی یاد سے میں رستگار ہو نہ سکا

سیف اکبر آبادی

بزمِ انتخاب

بیزاری

رات اور یہ چاند تاروں کے نشاں   جس میں لنگڑا ہوا ہے آسماں
ہے بھیانک زندگی کی داستاں!
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

موت کا مضبوط لیکن سرد ہات   چھو رہا ہے دیکھ نبضِ کائنات
آہ مت دہرا گذشتہ واقعات
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

ہو سکی دنیا نہ مجھ سے مستفید   آج یہ احساس ہے کہ سو ل بعید
مجھ سے وابستہ تھی کس کس کی امید
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

غیر کا انصاف، اپنوں کا فساد   دوست کا شک دشمنوں کا اعتماد
تلخ ہے گزری ہوئی گھڑیوں کی یاد
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

دل تو دل ہستی مٹا بیٹھا ہوں میں   گھر تو گھر دُنیا لٹا بیٹھا ہوں میں
اب تو "اُن" کو بھی بھلا بیٹھا ہوں میں
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

صبر، صحت، عقل سب کچھ کھو چکا   چھوڑ، اب جو ہو چکا سو ہو چکا
جس قدر رونا تھا مجھ کو رو چکا
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

مدتیں جھوٹی مسرت کے لئے   میں نے دل کو سینکڑوں دھوکے دئیے
جی ٹھہر سکتا نہیں اب بے پئے
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

قابلِ نفرت ہے دُنیا کی زمیں تو   اس سے بڑھکر یہ ستارہ ہے حسین
میرے ہاتھوں سے بھرا ساغر نہ چھین
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

دیکھ تاروں کی نظر بکھرا گئی   رات کی چوٹی کمر تک آ گئی
رُوح پچھلی یاد سے گھبرا گئی
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

یہ ستارے یہ کفن کے سرد پھول   آسماں جیسے چلی لاشوں کی دھول
چاند گویا ایک بے امت رسول!
دوسب سب کچھ بھول جانے دے مجھے

رات کی چادر میں مجرم ہر طرف   تیرگی میں خودکشی خنجر بکف
زندگی ہے یاں گناہوں میں تلف
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

آہ یہ دنیا ہے دولت کی غلام   زندگی ہے یاں غریبوں پر حرام
لے نہ میرے سامنے دنیا کا نام
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

رسم میں جکڑی ہوئی ہے زندگی   قید ہے یاں فلسفہ میں عشق بھی
اس جگہ جینا ہے گویا خودکشی!
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

عشق کیا ہے؟ ایک ذہنی اضطراب   حُسن کیا ہے جاگتی آنکھوں کا خواب
علم کیا ہے؟ اک سوال بے جواب
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

سلطنت اک ظلم، مذہب اک بلا تو   مفلسی اک جرم، محنت اک سزا
ہے جہاں چنگیز کا حامی خدا
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

ہر طرف بغض و عداوت، قتل و جنگ   کھا چکی انصاف کی میزان زنگ
لٹ چکا انسانیت کا نام و ننگ
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

یہ زمیں تو آسماں یہ صبح و شام تو   ہے گراں یہ حلقۂ وقت و مقام
چھوڑ بھرنے دے مجھے اک اور جام
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

اب کہاں وہ ہم نوایانِ سخن تو   وہ علی گڑھ وہ علی گڑھ کا چمن
مت دلا اب یاد بھولی انجمن
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

شاعری کا خبط، شہرت کا خیال   عافیت کی فکر، عزت کا سوال تو تو
اُن کا غم، بے روزگاری کا ملال
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

چاند کا چہرہ ہے بے حد مضمحل   صبح ہوتی ہے بجھا جاتا ہے دل
لا پلا اک اور جام مشتعل
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

(ساقی)   جاں نثار اختر (علیگ)

اقبال اور فنونِ لطیفہ

اقبال کی نظر میں ماحول کے خلاف بغاوت کرنا اسے اپنے سانچہ میں ڈھالنا، رکاوٹوں کو اپنے وجودِ معنوی میں جذب کر کے آگے بڑھنا، نت نئی آرزوؤں، نت نئے معیاروں کو سامنے رکھنا زندگی ہے اور جس کی زندگی اس معیار پر پوری اترتی ہے۔ اس کی خودی بیدار ہے۔ اس کے سوا ہر چیز موت ہے، فسانہ و فسوں۔

زندگی کے اس معیار کے حصول میں جو آرٹ مدد دے وہی مشعلِ راہ ہے۔ اور جو زندگی کی حقیقتوں سے گریز کرنا سکھائے وہ اُمتوں کی رسوائی کا سامان ہے۔ اس بحث کو جانے دیجئے کہ آرٹ کا یہ تصور جمالیات کے خود ساختہ اصول کے مطابق ہے یا نہیں۔ ذرا یہ سوچئے کہ مٹی ہوئی قوموں کے لئے جن کے تمام قوائے معنوی مفلوج ہو چکے ہیں، جن کا ملی اور سیاسی شیرازہ بکھر چکا ہے، جن کی نیند موت سے مشابہ ہے۔ خیام کی رباعیاں زیادہ موزوں ہیں۔ یا اقبال کے حیات آفریں نغمے۔

خود اقبال نے کہا ہے کہ ایک زوال پذیر شاعر کا ایک شعر قوموں کے لئے چنگیز کی غارت گری سے زیادہ مہلک ہو سکتا ہے۔ یہ تماشہ پچھلے دنوں میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ایک مقامی مشاعرے میں جہاں ہندوستان کے ایک شاعرِ اعظم کو دعوت دی گئی تھی۔ سننے والوں پر اس کے زوال پذیر کلام کا یہ اثر ہوا کہ بعض نوجوانوں نے ایک خاص وضع اختیار کرنے کی ٹھان لی ہے۔ جس کے سیاسی اجزاء رندی اور ریا کی ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ان نوجوانوں میں چند ایسے خوش گو شعرا بھی شامل ہیں۔ جن کی مخلوقاتِ ہنر میں مجھے صحت مندی اور توانائی کے آثار نظر آتے تھے۔

ذرا اس نقطۂ نظر سے ہندوستان کے فنونِ لطیفہ پر نظر ڈالئے۔ شاعری کی حالت دیکھئے۔ اول تو غزل کے سوا گویا کوئی اور چیز پنپتی ہی نہیں اور غزل کی جو حالت ہے اس کے متعلق یہ کہہ دینا کافی ہے کہ تصوف اور مجوسیت کا پھیلا ہوا زہر اس کی رگ رگ میں سرایت کر چکا ہے۔ اردو غزل کی موجودہ شکل ہندوستانیوں کے فکر و سوز کا عکس نہیں ہے بلکہ زندگی کے عجمی تصور کے عکس کا عکس ہے اور ان میلانات کا بے روح خاکہ ہے۔ غیروں کی محسوسات کا بے رنگ عکس ہے۔ تلخ حقیقتوں سے روگردانی، دنیائے فانی کی کہانی، گوشہ گیری اور خلوت گزینی کے روگ، فرسودہ معرفتی رجحانات کے عکس، یہی آجکل کی غزل کے عناصر ہیں۔ آجکل غزل میں ایک انقلاب پیدا کرنے کی جو سعی کی جا رہی ہے کہ غزل ایک مسلسل خیال کا اظہار کرے اس سعی کا ظاہرا نتیجہ صرف یہ ہے کہ پہلے عجمیت کی سست روی اور پست ہمتی کے آثار بیشتر نظر آتے تھے۔ اب مسلسل غزلوں کے ذریعہ سے ساقی، گلبانگ، سرود و نغمہ، موجِ بادہ سے خوب ہولی کھیلی جاتی ہے۔ مان لیا کہ غزل شاعر کی داخلی دنیا کی واردات کی تصویر ہے۔ لیکن یہ کیا ستم ہے کہ غزل گو کو نہ کبھی بھوک لگتی ہے۔ نہ وہ کمبخت بوڑھا ہوتا ہے۔ نہ اس بیچارے کو سوچ بچار کرنے کی عادت پڑتی ہے۔ فرسودہ سروں میں حسن اور عشق کا راگ الاپا جاتا ہے۔ اور ہوس کاری کی ایک خیالی حسین دنیا بیدار کر کے خارجی دنیا اور خدا کی کائنات کی باقی تمام توانا سرمستیوں سے دل کو محروم رکھنا ہے۔

اردو غزل کے خیام اور حافظ ذرا سوچیں تو سہی کہ خیام اور حافظ اپنے بیان میں سچے تھے۔ آجکل کے غزل گویوں کو وہ تن آسانیاں، اندھی جوانیوں کے لئے عشرت کوشی کے موقعے۔ وہ تربیتِ علم و فن، وہ بادشاہانہ نوازشیں اور مجالس رنگیں کہاں میسر آئیں؟ آرٹ زوال پذیر ہوا۔ خیر ہو، کم از کم خلوص پر تو قائم ہو۔ ان بزرگواروں کے متعلق اقبال کا فیصلہ ہے ؎

ہے یہ فردوسِ نظر اہلِ ہنر کی تعمیر
فاش ہے چشمِ تماشہ پہ نہاں خانۂ ذات
نہ خودی ہے نہ جہانِ سحر و شام کے دور
زندگانی کی حریفانہ کشاکش سے نجات
آہ وہ کافر بیچارہ کہ ہیں اس کے صنم
عصرِ رفتہ کے وہی ٹوٹے ہوئے لات و منات
تو ہے میت یہ ہنر تیرے جنازے کا امام
نظر آئی جسے مرقد کے شبستاں میں حیات

ہندوستان کی کلاسیکی موسیقی کی حالت اس سے بھی زیادہ دردناک ہے۔ دراصل ہندوستان کی موسیقی جزوِ عبادت تھی اور عبادت کا آسیائی تصور (خصوصاً ہندوستانی) دیوتاؤں کے سامنے مسکنت اور عبودیت کا اظہار ہے۔ تقویتِ نفس کا ذریعہ نہیں ہے۔ اس لئے کلاسیکی موسیقی کے تمام رموز و اسرار اسی محور کے گرد گھومتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانی کلاسیکی موسیقی بھی عہدِ قدیم کی روح کی ترجمان ہے۔ جب انسان دیوی دیوتاؤں سے زیادہ قریب

تھا اس وقت انسان کے لئے دیوی دیوتا وہ تحریری حیثیت نہیں رکھتے تھے جو آجکل کے انسان نے انہیں بخش رکھی ہے - فطرت کے مظاہر، دھوپ، چھاؤں بجلی، بادل آگ کو وہ پُراسرار سمجھنے پر مجبور تھا - کیونکہ ابھی تک انسانی ذہن ان پر حکمران نہ ہو سکا تھا - انہی قوتوں کی پُراسرار حرکت کے ساتھ ان کا تصور وابستہ تھا - اس وقت کا انسان مجبور تھا کہ اپنی موسیقی میں ان قوتوں کے سامنے عجز کا اظہار اور مسکنت کا اعتراف کرے - ہندوستان کی تمام کلاسیکی موسیقی اور قدیم فن رقص دیومالا کے ساتھ "دست و گریبان" ہے - اس کے تمام رموز خفی، اس لئے تمام پُراسرار اشارے اس کے بھاؤ عموماً انسانی بے بسی شکست اور عاجزی، یا دیوی دیوتا کے روپ کی دلکشی کا اظہار کرتے ہیں - اس موسیقی میں انسان خود ایک جزو حقیر ہے - راگ اور راگنی کی شکلیں دیکھئے ایک قسم کا لطیف جمال تو ہے - لیکن جلال کا کہیں نشان بھی نہیں ہے - کہیں کوئی نازنین چمپا کے پھولوں کا ہار پہنے بین بجا رہی ہے - کہیں کوئی جٹا دھاری جوگی گلے میں سانپ لپیٹے گیان دھیان میں مگن ہے - خود ان راگنیوں کا اثر دیکھئے کھماج کی ایک خاص قسم کی شوخی، بھاگ کا سوز، کدارے کی رعنائی، پہاڑی کی درد انگیز مٹھاس، سارنگ کا تیکھا پن سب کچھ ہے، نہیں ہے تو توانائی اور عالی حوصلگی نہیں ہے - عارفوں کے لئے یہ موسیقی محویت پیدا کرنے کا اچھا خوبصورت ذریعہ ہے - لیکن اب کلاسیکی خرافات کے رموز اور اشارے ہماری زندگی . . . . . سے اسقدر دُور ہو چکے ہیں کہ جب تک ہم خود اس ماضی کے گڑھے مُردے کی طرح اپنی زندگی سے بیگانہ نہ ہو جائیں جن کی زندگی کی یہ موسیقی ترجمانی کرتی ہے اس وقت تک ہمیں کوئی لطف حاصل نہیں ہو سکتا - کہیں کہیں عالمگیر اثرات کے اشارے کلاسیکی موسیقی میں موجود ہیں لیکن ان کے اظہار کے لئے باکمال مغنّی کی ضرورت ہے - اور آجکل کی فضا میں ایسے مغنیوں کی موجودگی دشوار ہوتی جا رہی ہے -

یہ موسیقی زندگی کی کشمکش میں خودی کی تکمیل میں ذہن اور قلب کی بیداری میں تو کیا مفید ہو گی - البتہ غلاموں کو ایک خیالی دنیا کی خیالی مسرتوں کی افیون ضرور پلاتی ہے - اس قوم کی رجعت پسندانہ موسیقی کے متعلق اقبالؔ کا فتویٰ ہے ؎

ناتوان و نزار مے سازد ترا
از جہاں بیزار مے سازد ترا
سوزِ دل از دل برد غم مے دہد
زہر اندر ساغرِ جم مے دہد

لیکن اس کے برخلاف اقبالؔ اس موسیقی کا خریدار ہو فصل کاٹتے وقت کسان کی درانتی کی حرکت کو جانباز سپاہی کی تلوار کی طرح تیز کر دے، جو پوشیدہ قوتوں کو اُبھار کر آوازوں کے آثار چڑھاؤ سے ایک نئی دُنیا کے وجود کی خبر دے اور اس کی فتح کا مژدہ بھی سنائے -

"صور اسرافیل"

اردو ہندی کا تنازعہ

اردو برطانوی سایۂ تربیت میں :-

لاؤ تو قتل نامہ ذرا میں بھی دیکھ لوں
کس کس کی مُہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی

اردو کے دورِ متوسط ہی میں برطانوی حکومت مستقل طور پر ہند میں قائم ہو گئی - ۱۸۵۷ء میں لکھنؤ و دہلی کے ایوانِ حکومت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی - یہی دو مقام اردو کے مرکز تھے - شعر و ادب کے ارباب کمال کس مپرسی کے عالم میں منتشر ہو گئے - لیکن چونکہ ملک میں اردو نے ایک مشترکہ بین الملکی زبان کی شکل اختیار کر لی تھی اور برطانیہ کی ایک اجنبی اور بالکل غیر مانوس انگریزی زبان تھی جس سے عوام بالکل ناواقف تھے - اس لئے اربابِ حکومت کو عوام پر حکومت کرنے ان سے ربط و ضبط اور تعلق پیدا کرنے میں مشکلات کا سامنا ہوا اگر دفاتر و حکومت کی زبان انگریزی رکھی جاتی ہے تو حکومت کی گاڑی کا چلنا دشوار تھا - لہذا مجبوراً برطانوی اربابِ حکومت کے پیشِ نظر کسی ایسی ویسی زبان کے انتخاب کا مسئلہ آیا جس کو دفتری زبان قرار دیا جا سکے - اس وقت تک دفتری زبان فارسی تھی - مگر حالاتِ موجودہ کا اقتضاء ہی تھا جو بالآخر مجبوراً انگریزوں کو کرنا پڑا یعنی انگریزی حکومت کی نظرِ انتخاب اردو ہی پر پڑی - یہاں یہ امر فراموش کر دینے کے قابل نہیں ہے - کہ انگریزوں نے ابتدا میں جو تھوڑی بہت اردو کی سرپرستی کی اور اس کو دفتری زبان قرار دیا وہ کسی ہمدردی کی بنا پر نہ تھا بلکہ سراسر اپنی سیاسی و ملکی مشکلات اور مجبوریوں پر مبنی تھا - کیونکہ بغیر اس کے ملک پر حکومت کرنا آسان نہ تھا - لیکن اسی کے ساتھ ساتھ برطانوی اربابِ حکومت کی دور بین اور پرکار نظروں نے ایک ایسی سیاسی چال چلی جس کا خمیازہ برطانوی . . . شہنشاہیت اور غلامی کی بندشوں کو مضبوط تر کرنے کی شکل میں ہندوستان کو آج تک بھگتنا پڑ رہا ہے - یعنی اس وقت کے برطانوی ہند کے صدر مقام کلکتہ کے قلعۂ فورٹ ولیم میں جان گلگرسٹ صاحب نے اردو کی تربیت و نشو و نما کی ذمہ داری قبول کر کے بظاہر اردو پر احسان کیا - میر امنؔ دہلوی وغیرہ

محبّت کی مجبوری

گردشِ دوراں کو کب خاطر میں لاسکتا ہوں میں　　بارِ غم کیا ہے اسے ہنسکر اُٹھا سکتا ہوں میں

کھیل ہے سیلِ بلا سے کھیلنا میرے لئے　　شدّتِ آلام میں بھی مُسکرا سکتا ہوں میں

یورشِ آفات سے دل میرا گھبراتا نہیں　　رنج میں بھی عیش کی تانیں اُڑا سکتا ہوں میں

فطرتِ محکم میں میری آ نہیں سکتی لچک　　سر کٹا سکتا ہوں لیکن کب جھکا سکتا ہوں میں

موت کیا ہے لفظِ مہمل کے سوا کچھ بھی نہیں　　تُو اگر چاہے تو مرکر بھی دکھا سکتا ہوں میں

ناموافق ہے جو یہ دنیا تو کچھ پروا نہیں　　اِک نئی دنیا تخیّل سے بنا سکتا ہوں میں

اِک جہاں قائل ہے میری رفعتِ تخیّل کا　　آسمانوں تک زمینوں کو اُٹھا سکتا ہوں میں

وُسعتیں مجھ سے مرے قلبِ پریشاں کی نہ پوچھ　　ایک طوفاں کی طرح عالم پہ چھا سکتا ہوں میں

لیکن اے جانِ تمنّا اے مرے دل کی نشاط　　آہ اس رازِ عیاں کو کب چھپا سکتا ہوں میں

تجھ سے اُلفت تجھ سے حد درجہ محبّت ہے مجھے　　مَیں جو چاہوں بھی تو کب تجھ کو بھلا سکتا ہوں میں

تیرے آگے اِدعا خود داریوں کا ہے فضول　　ناز تو کیا جور بھی تیرے اُٹھا سکتا ہوں میں

رُوح میری تیرے اندازِ تکلّم پر نثار　　سچ بتا تجھ کو بھی کیا اپنا بنا سکتا ہوں میں

کیا کبھی ہوگا ترے دل پر محبّت کا اثر　　کیا ترے دل پہ کبھی پیاری فتح پا سکتا ہوں میں

زندگی افروز ہوگا یہ یقیں میرے لئے
اِس یقیں پر اپنے جان و دل لُٹا سکتا ہوں میں

گوپال مِتّل

آخری چکر

ڈرائیور یہ سوچ کر کہ آج رات فقط ایک چکر اور لگانا ہے دل ہی دل میں خوش ہوا۔ اس وقت جب وہ اپنی موٹر لاری لپیفک سٹریٹ کے بس سٹیشن پہ لایا تو گیارہ بج کر تیس منٹ ہوئے تھے۔ یہاں اس نے مسافروں کو اُتار دیا۔ اور دل میں کہا جب میں بس واپس پہنچونگا۔ تو کہیں سونا ملے گا۔ مگر دیر کافی ہو گئی ہے۔

سیڑھی کے موڑ پر چند آدمیوں کا ایک گروہ انتظار میں تھا۔ جونہی بس خالی ہوئی۔ وہ اُس میں بیٹھ گئے۔ ڈرائیور کے ساتھی نے چاروں طرف دیکھا۔ آٹھوں آدمی لاری کی پچھلی نشستوں پر بیٹھ گئے تھے۔

اس نے سوچا۔ ایک سواری اور آجائے تو ہم چل پڑیں گے۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ نواں آدمی موٹر پر آیا اور جھٹ سے اس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔

کرایہ لیتے لیتے اس نے اپنے دل میں کہا۔ سواریاں یوں ایا کرتے ہیں۔ تعداد بھی پوری پوری اور انتظار بھی نہ کرنا پڑے۔ یہ ایک ایسی بات تھی جو بہ حیثیت ڈرائیور اس کے دیرینہ تجربے میں کبھی نہ آئی تھی۔

اسے آئے ہوئے ابھی ایک منٹ بھی نہ ہوا تھا کہ وہ بھری بھری ہوئی لاری کو بھیڑ میں سے ہچکولے دیتا لئے جارہا تھا۔ اس نے لاری بیچ سٹریٹ کی پہاڑی پر چڑھا دی۔ لیور پورا دبا دیا اور قبضے کو پھیرے بغیر رفتار حد سے زیادہ تیز کر دی۔

رات پُرسکون اور تاریک تھی اور سوائے اس جگہ کے جہاں موٹر کی روشنی پڑ رہی تھی اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ آٹھوں مسافر اندھیرے میں بُت بنے بیٹھے تھے۔ البتہ لاری کی حرکت سے کبھی کبھی ان کے سر آگے پیچھے ہلنے لگتے تھے۔ ڈرائیور کے پاس بیٹھا ہوا نواں آدمی خاموشی سے اندھیرے میں ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ ٹیلر تنگ آگیا۔ اس نے سوچا کوئی سمجھے گا میں انہیں جہنم میں لئے جا رہا ہوں۔ شہر کے آخری گھر کی روشنی پاس سے گزر گئی اور وہ صنوبر کے چھوٹے چھوٹے درختوں کی قطاروں میں سے تیزی کے ساتھ بڑھتے چلے گئے اور ابھی تک مسافروں میں سے کوئی بھی ایک لفظ تک نہ بولا۔

اس نے دل ہی دل میں کہا۔ "کیسی عجیب سواریاں ہیں۔"

اچانک ہی گھنٹی کی ٹناٹن نے سکوت کو توڑ دیا اور ڈرائیور چوکنا ہو گیا۔ لاری کے پچھلے تاریک حصے میں سے کسی نے کہا۔ "ڈرائیور میں یہاں اُترنا چاہتا ہوں۔" بلا چون و چرا ڈرائیور نے اپنے پاؤں پیڈلوں پر رکھ دیئے اور بریک لگا کر لاری کو بالکل ساکن کر دیا۔ کوئی شخص نیچے اُترا اور اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

ڈرائیور نے گاڑی چلاتے وقت دل میں کہا۔ "ملعون میں نے یہاں کبھی چوراہا نہیں دیکھا۔"

لاری پھر گھوں گھوں کرتی پوری رفتار سے چلنے لگی اور سوائے اُس شخص کے جو باہر نکلا تھا کسی نے ایک لفظ تک نہ کہا۔ "عجیب آدمی ہیں۔"

تین منٹ بعد گھنٹی کی آواز نے پھر خاموشی کو توڑ دیا۔

"ڈرائیور!"

اس کے پاؤں پھر پیڈلوں پر پہنچے۔

"میں یہاں اُترنا چاہتا ہوں۔"

لاری ٹھہر گئی۔ کوئی شخص نیچے اُترا اور دروازہ بند کر دیا۔ وہ پھر چل پڑے۔

ٹیلر نے متعجب ہو کر کہا۔ "یہاں یہ شخص کہاں جا سکتا ہے؟ اور کچھ نہ سہی یہاں اندھیرا اتنا زیادہ ہے کہ اس کے لئے یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ ہم کہاں ہیں۔"

ایک چھوٹی سی موٹر تیزی سے بھنبھناتی ہوئی گزر گئی۔ ڈرائیور کو کسی نہ کسی طرح تسکین ہوئی۔ اس نے پیچھے نظر ڈالی اور روشنی کے دوران میں باقی ماندہ چھ سواریوں کو سائے کی طرح خاموش بیٹھے اور موٹر کی حرکت کے ساتھ آگے پیچھے ہلتے دیکھا۔ جب دوسری موٹر گزر گئی۔ تو رات اور سڑک پہلے سے بھی زیادہ تاریک اور بھیانک نظر آنے لگی۔

ابھی ایک منٹ بھی نہ ہوا تھا کہ گھنٹی کی کرخت آواز نے اسے پھر چوکنا کر دیا۔

"ڈرائیور میں یہاں اُترنا چاہتا ہوں۔"

پھر وہی آواز اور وہی صنوبر کے چھوٹے چھوٹے درختوں کی سیاہ

جب وہ اُترا تو ڈرائیور نے اندھیرے میں سر باہر نکالا۔ اور اِدھر اُدھر دیکھا کہ ممکن ہے جنگل میں کہیں قدموں کے نشانات ہوں۔ ممکن ہے نہ ہوں، لیکن اسے کچھ نظر نہ آیا۔

اس نے ——— ہارن بجایا اور اپنے دل میں کہا ممکن ہے یہ کسی شکار کے پیچھے ہوں۔ لیکن اگر یہ مجھے لُوٹنا چاہتے ہیں تو یہ اپنے کرایہ کا پورا پورا فائدہ اٹھائے بغیر کیوں اُتر جاتے ہیں۔ اب لاری ہوا کو چیرتی ہوئی جارہی تھی۔

"آدھ ہی گھنٹہ میں ہم ———"

"ٹررررر! گھنٹی کی آواز پھر آئی:۔

"ڈرائیور مجھے یہاں اُترنا ہے۔"

اب ڈرائیور نے بار بار سر نکال کر نہ دیکھا اور اپنی سلامتی اسی میں سمجھی۔ علاوہ ازیں اسے یہ بھی معلوم تھا۔ کہ یہاں کوئی چور راہ نہیں ہے۔ البتہ اس نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص کو ترچھی نظر سے دیکھا۔ اور متعجب ہو کر کہا "کیا یہ بھی انہیں کا ساتھی ہے؟ یہ کیوں نہیں کچھ بولتا"

لیکن وہ اب بھی اسی طرح اندھیرے کی طرف دیکھ رہا تھا اور بالکل بےحس و حرکت بیٹھا تھا۔

ڈرائیور دل ہی دل میں بڑبڑایا "کیسی منحوس سیاہ سڑک ہے" گھنٹی پھر گڑگڑائی اور وہ بُری طرح سے چونکا۔ کیونکہ اب وہ پوری توجہ سے سُن رہا تھا۔

اُس نے خود ہی منہ چڑاتے ہوئے کہا "ڈرائیور میں یہاں اُترنا چاہتا ہوں۔" اور جب موٹر کے پچھلے حصے میں سے بعینہ اسی لہجے میں وہی الفاظ دہرائے گئے تو اسے ایسا محسوس ہوا گویا اُس کے تمام جسم میں سوئیاں چبھ رہی ہیں۔

پانچواں آدمی اُتر گیا۔ ڈرائیور نے موٹر چلا دی اور اِدھر اُدھر نہ دیکھا اب اسے اس امر کا پورا پورا احساس نہ تھا کہ آج وہ موٹر اتنی تیز لئے جارہا ہے کہ اس سے پہلے کبھی نہ لے گیا تھا۔ ہلکی ہونے کی وجہ سے اب لاری سڑک پہ ہچکولے کھاتی چل رہی تھی۔

اس نے حیرانی سے کہا "یہ کیا وجہ ہے کہ جوں جوں یہ کم ہوتے جاتے ہیں۔ مجھے ڈر لگتا جاتا ہے۔"

اب اس کے کان گھنٹی کی آواز پر لگے ہوئے تھے اور پہلی ہی کرخت آواز پر وہ اپنی جگہ پہ اُچھل پڑا۔

"ڈرائیور میں یہاں اُترنا چاہتا ہوں۔"

چھٹا شخص بھی صنوبر کے درختوں کی تاریکی میں غائب ہوگیا۔ وہاں جہاں نہ کوئی مکان تھا نہ راستے کا نشان۔

پچھلی نشستوں کے باقی دو آدمی سائے کی طرح لگے بیٹھے تھے۔ ڈرائیور کے قریب بیٹھا ہوا شخص نہ ابتک ہلا تھا اور نہ اس نے سر پھرایا تھا۔ ڈرائیور نے سوچا "کاش کوئی اور لاری ہمارے پاس سے گزرے" گھنٹی کی آواز پر اس نے پھر بریکیں کس دیں۔

"ڈرائیور میں یہاں اُترنا چاہتا ہوں۔"

یہ الفاظ اور گھنٹی کی مکرر ٹن ٹن جنوں خیز تھی۔ تاریکی کی دو بدنما دیواروں کے درمیان وہ پھر رک گیا۔ اور ساتویں آدمی کو اُترنے کی مہلت دی۔ اُس نے اپنے دل میں کہا "نو میں سے سات گئے۔ دو باقی۔" لاری پھر بھوں بھوں کرنے لگی۔ "اگر انہوں نے کوئی بات کی تو میں ان دونوں کو سمجھ لوں گا۔ اور اگر میرے ساتھ والا میری طرف پھرا یا چلا گیا، یا کچھ کہا تو......

لمبی لاری اب اندھیرے میں ہچکولے کھاتی ہوا کی طرح جارہی تھی۔ اور اس میں صرف تین آدمی بیٹھے تھے۔ ایک ڈرائیور، ایک وہ جو پچھلے حصے میں سائے کی طرح خاموش بیٹھا تھا اور ایک ڈرائیور کا ساتھی جو نہایت غور سے صنوبر کے درختوں کو رات کی تاریکی میں دیکھ رہا تھا۔

ڈرائیور نے ہینڈل مضبوطی سے پکڑا اور اسے محسوس ہوا کہ اس کے سر میں سوئیاں سی چبھ رہی ہیں۔ پچھلے آدمی نے اِدھر اُدھر حرکت کی۔ شاید گھنٹی تک پہنچنے کے لئے۔

ٹررر ———!

اس نے ایسا محسوس کیا۔ گویا گھنٹی اس کی رگوں سے وابستہ ہے۔ اور اپنی کرخت تھرتھراہٹ سے اسے سخت تکلیف پہنچا رہی ہے۔

"ڈرائیور میں یہاں اُترنا چاہتا ہوں۔"

یہ الفاظ بھی اسی لہجے میں ادا ہوئے جس میں کہ اس سے پہلے دوسروں نے ادا کئے تھے۔ یہ الفاظ بار بار دہرائے جانے کی وجہ سے مکروہ اور احمقانہ معلوم ہوتے تھے۔

اُس نے آٹھویں آدمی کو بھی اُتار دیا۔

"خدا حافظ!"

ڈرائیور نے کہا "ہیں!" ان دو الفاظ نے اسے بیحد چونکا کر

دیا تھا۔ جونہی کہ پچھلے خالی حصے کا دروازہ بند ہوا لاری پھر چل پڑی۔ اس نے اپنے دل سے پوچھا۔ جب اس شخص نے خدا حافظ کہا تو میں اس طرح کیوں چل پڑا؟۔

آخری کے منہ سے یہ الفاظ کچھ عجیب معنی رکھتے ہیں۔

لاری کی رفتار تیز کرتے ہوئے اس نے کہا "نو میں سے آٹھ گئے۔ ایک رہا۔ لیکن یہ ایک کون ہے۔ اور کیا چاہتا ہے۔

اس کے جواب میں ڈرائیور کے قریب بیٹھے ہوئے آدمی نے گہرا سانس لیا۔ اس طرح جیسے آہ بھرتے ہیں۔ اور اندھیرے کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ ڈرائیور نے پہلے کبھی اس کی شکل نہ دیکھی تھی۔ اس کا چہرہ صاف زردی مائل سیاہ اور آنکھیں روشن و چمکدار تھیں۔ اس نے اپنے ہاتھ چھاتی پر رکھے اور پہلی بات یہ کی کہ یہاں سے وڈلینڈ قبرستان کتنی دور ہے۔

ڈرائیور ایک دم چونک پڑا اور کچھ دیر بعد بولا" پانچ میل۔ ہم کافی تیز جا رہے ہیں۔ کیوں نہیں؟"

مسافر ہنس پڑا۔

"ہاہا۔ مسٹر ٹیلر آپ تیز چلا رہے ہیں۔"

لاری چلنے اور ہنسی کی ملی جلی جادو اثر آواز سے وہ سمٹ گیا اور اپنا نام سن کر کانپنے لگا۔ کیونکہ اس نے محسوس کیا کہ یہ ضرور یا تو کچھ کریگا۔ یا کچھ کہے گا۔" خوب۔ چونکہ ہم اکٹھے سفر کر رہے ہیں آؤ آپس میں تعارف کر لیں۔"

اس نے نہایت متانت سے جواب دیا۔ اگر آپ یہی چاہتے ہیں تو میرا نام موت ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"موت!"

لاری والے نے اپنے پاؤں پیڈلوں پر رکھے۔

اس نے سوچا کہ اس کی رفتار بہت تیز ہو گئی ہے۔

اگر سلامتی چاہتے ہو تو ایسا مت کرو۔ ساتھ والے آدمی نے کہا۔ "کیا تمہیں کوئی چیز میری کہنی کے نیچے نظر آتی ہے؟۔

ہلکی ہلکی روشنی میں اسے ایک خود بخود بھرنے والے پستول کی نالی نظر آئی۔ جو اس کے لپٹے ہوئے بازوؤں میں سے باہر نکلی ہوئی تھی۔

"جو آپ کی مرضی" وہ رضامند ہو گیا۔ ہم کہاں ہیں؟ مجھے یقین ہے کہ آپ کا نام موت ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسی لئے آپ قبرستان جا رہے ہیں۔

بالکل ٹھیک۔ اسی لئے ہم قبرستان جا رہے ہیں۔

ڈرائیور نے محسوس کیا کہ اس کے جسم میں خوفناک کپکپاہٹ پیدا ہو رہی ہے۔

ہم؟ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں بھی وہاں مدعو ہوں۔

جب میں نے اس سفر کی تجویز کی تھی۔ تو تمہیں بھی دعوت دی گئی تھی۔

خوب۔ تو آپ نے اس سفر کی تجویز کی تھی۔ اور یہ بھی کہ دوسرے لوگ سڑک کے ساتھ ساتھ اترتے جائیں۔

"بالکل ٹھیک۔ اسی لئے تاکہ ہم اکیلے جا سکیں۔"

مسافر اپنے پاؤں سے فرش پر ٹپ ٹپ کر کے گاڑی کے ہچکولوں کے ساتھ تھاپ دینے لگا۔

ٹیلر نے پہیے کو کس کر پکڑ لیا اور پنجرے میں قید کئے ہوئے جانور کی طرح کانپنے اور پھڑکنے لگا۔

اگر آپ موت ہیں تو آپ کا قبرستان یہ ہے لیکن مجھے یہ بتا دیجئے کہ مجھے ساتھ لیجانے سے آپ کا کیا مطلب ہے۔ خدا کی قسم اس نے تیزی سے کہا۔ اگر آپ پستول کی بجائے درانتی لیکر گئے جیسا کہ میرا خیال ہے آپ کریں گے۔ تو اس صورت میں کہ ہم دونوں جائیں آپ کو موقع دینا پڑے گا کہ میں اسے دیکھ لوں۔

موت نے لوگوں کو پہلے بھی دھوکا دیا ہے اور کیا تم ایک لمحے کے لئے سوچ کر یہ نہیں جان سکتے کہ تمہارے وہاں جانے کی وجہ کیا ہے"

"یہ آپ کہاں پہنچ رہے ہیں۔ میں نے کیا کیا ہے؟"

"یاد کر لو۔"

"کیا یاد کر لوں۔"

ڈرائیور کا دل اتنے زور سے دھڑک رہا تھا کہ وہ اسے موٹر کے شور سے بھی اونچا سن سکتا تھا اور لاری جو اتنی تیز چل رہی تھی۔ اندھیرے میں بے حس و حرکت کھڑی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔

"ہاں تو تمہیں یاد نہیں پڑتا۔"

نہیں ــــــ بات کیا ہے؟

اب قبرستان کتنی دور ہے؟

"تقریباً تین میل۔ کیوں؟۔

ابھی بھی تمہیں یاد نہیں آتا۔

"نہیں۔ آپ ہیں کون بلا؟"

مسافر نے چلا کر کہا۔ "تم بھول گئے ہو" اور اس کی آنکھیں بلی کی طرح چمک اٹھیں۔ پروردگار! کاش میں بھی اسے بھول سکتا۔ کیا تمہیں ذرا بھی یاد نہیں۔"

"لیکن وہ کونسی بات ہے جو مجھے یاد نہیں؟"

سنہ ۱۹۱۸ء میں جب تم یہاں ایک بس ڈرائیور تھے۔ تم نے ایک عورت کی موٹر دھکیل کر خندق میں گرا دی تھی۔

"تمہیں اس سے کیا مطلب؟"

"لیکن تم نے ایسا کیا تو۔"

"ہاں" ڈرائیور نے غمگین انداز سے کہا۔ "لیکن تمہیں اس سے کیا؟"

"عورت کا کیا حشر ہوا؟"

"موٹر الٹ گئی اور وہ مر گئی۔ لیکن کون ——— وہ تمہاری کیا لگتی تھی؟"

"سب کچھ۔"

مسافر نے دیوانہ وار اسکی طرف دیکھا۔ اور پھر کہنے لگا۔

"اگر وہ نہ ہوتی تو میں کبھی کا مر جاتا۔ میرے ایک گولا لگا تھا اور میری ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ لیکن میں نہ مرا۔ اور جب میں گھر آنے کے لئے تیار ہوا تو مجھے معلوم ہوا کہ تم نے اسے ہلاک کر دیا ہے۔"

"لیکن یہ میرا قصور نہ تھا۔ مجھے وقت پر پہنچنا تھا۔ اسی دن ——"

اس نے مسافر کی آنکھوں میں وحشیانہ اور غیر فطری چمک دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ اور اس کے سامنے وہ نظارہ آیا جس کے متعلق اس نے آجتک کبھی نہ سوچا تھا۔

لدی ہوئی لاری وقت پر پہنچنے کے لئے ہوا کو چیرتی ہو جا رہی تھی اور بھاری لاری نے ایک چھوٹی سی موٹر کو خندق کے کنارے کی طرف دھکیل دیا۔ مسافروں کا سانس جہاں تھا وہیں رہ گیا اور اس کے ساتھ ہی جب موٹر الٹ کر چر مر ہو گئی تو ایک چیخ سنائی دی جو بلند ہی بلند ہوتی گئی۔ بس گھسٹتی ہوئی ٹھہر گئی اور اس کے بریکوں میں سے دھواں نکلنے لگا۔ نازک اور افسردہ چہرے والی لڑکی کے گرد گورے گورے مسافروں کی بھیڑ لگ گئی۔ اور خون۔ خون سے اس کا سفید لباس تر ہو گیا تھا۔ ڈرائیور نے موٹر کی رفتار کو انتہائی تیز کر دیا۔ تاکہ وہ اس ہیبتناک نظارے سے دور چلا جائے۔

"اس طرح تم نے ہم دونوں کو مار دیا۔ مجھ میں اس صدمہ کو برداشت کرنے کی طاقت نہ تھی۔ خیر علیا کیسا میں تھا یہاں لایا گیا اور چھوڑ دیا گیا۔ میں آج رات تک موقع کی تلاش میں رہا۔ اور آج تمہیں پا لیا۔"

وہ نظارا ابھی تک اس کی آنکھوں کے سامنے تھا اور چیخیں اسے کاٹ کاٹ کر کھا رہی تھیں اور یہ دیوانہ شخص یا بھوت اسے مجبور کر رہا تھا کہ وہ اس کی ایک ایک تفصیل یاد کرے۔

"اب قبرستان کتنی دور ہے؟"

مسافر نے کہا "ایک میل۔" اب اس کے دانت آپس میں بج رہے تھے۔

خوب۔ ہم وقت پر پہنچیں گے۔

موٹر گھر گھر کرتی پہاڑی سے نیچے اتری اور وادی میں سے ہوتی ہوئی پھر زور شور سے اونچائی پر چڑھنے لگی۔ مسافر اس کی آواز کے ساتھ ساتھ پاؤں سے تھاپ دے رہا تھا۔

جب وہ چوٹی کے قریب پہنچا تو اس نے آسمان میں ایک مدھم روشنی دیکھی۔ ہم جلد ہی قبرستان کے سامنے ایک کھلے میدان میں پہنچ جائیں گے۔

"جلدی کرو۔ ابھی کتنی دور ہے۔"

"دو فرلانگ۔"

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی گھورتی ہوئی آنکھیں پھٹنے والی ہیں۔ اور اس کے سر کے بال اوپر کو اٹھ رہے تھے۔ افسردہ چہرہ خون آلودہ سفید لباس اور چیخیں اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگیں۔

اس نے اپنے دل میں کہا "اگر میں بغیر رکے ہی چلا جاؤں ———"

لوہے کا سیاہ جنگلا نظر آنے لگا اور قبروں کے پتھر مدھم روشنی میں بھوتوں کی طرح پاس سے گزرتے ہوئے معلوم ہوئے۔ ذرا اور آگے سڑک کے موڑ پر قبرستان کا سیاہ پھاٹک ہوا میں بلند کھڑا تھا۔ اس نے سوچا اگر میں موڑ پر سڑک سے آگے نہ جاؤں تو شہر کی بجلیاں سامنے ہونے کی وجہ سے محفوظ رہوں گا۔

جب لاری نے اونچی نیچی سڑک پر ہچکولے کھائے تو ٹیلر خوف کے مارے جھجکا۔ اسے ایسا معلوم ہوا۔ کہ پھاٹک کی سیاہ محراب اس کی نظروں کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔

مسافر نے اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر کہا۔ بس ہم پہنچ گئے ہیں۔
پہیہ ڈرائیور کے ہاتھوں میں گھوم گیا اور لاری چوں چرا کرتی ہوئی جا۔ ٹھہر گئی۔ پھر ایک جھٹکے کے ساتھ قبرستان کی طرف چلی۔ جہاں قبروں کے سفید سفید پتھر بھوتوں کی طرح قطار در قطار انہیں خوش آمدید کہنے کے لئے منتظر تھے۔
منگلاخ دروازے کا ایک سرا لاری کے سامنے آگیا اور اس وقت جب لاری نے ٹکر کھائی اور اس کے ٹوٹنے کی آواز آسمان تک پہنچی ایک وحشیانہ دفاتحانہ خوشی کا نعرہ بلند ہوا۔ لیکن یہ معلوم نہ ہوا کہ یہ اس پاگل مسافر نے لگایا یا اُن مردوں نے جو انتظار میں کھڑے تھے۔

عنایت انبالوی بی۔ اے

محسوساتِ ماہرؔ

اُس کی پہلی نظر کو کیا کہئے
عشرتِ مختصر کو کیا کہئے

درد ہی اب ہے زندگی دل کی
زحمتِ چارہ گر کو کیا کہئے

اُن کے آنے کا ہے یقیں لیکن
حسرتِ بام و در کو کیا کہئے

ہر طرف درد کی خدائی تھی
شامِ غم کی سحر کو کیا کہئے

ایک عالم کو کر دیا مغرور
سعیِ آئینہ گر کو کیا کہئے

درد کا نام رکھ دیا درماں
اُس بُتِ عشوہ گر کو کیا کہئے

عشق کی موت کس کو ملتی ہے!
فطرتِ نوحہ گر کو کیا کہئے

دل کو ہے آرزو تڑپنے کی
وسعتِ بحر و بر کو کیا کہئے

چاند سورج بھی بے حقیقت ہیں
دل کے نقد و نظر کو کیا کہئے

سرزمینِ دکن ہے اور ماہرؔ
قدرِ اہلِ ہنر کو کیا کہئے

ماہر القادری

اقبال کی اُردو شاعری

اُردو ادب میں آج تک ایک بڑی خامی رہی ہے۔ شعرا کی تعریف ہُوا کرتی تھی۔ مگر تنقید ادبی کا نام مفقود تھا۔ یہ امر حوصلہ افزا ہے کہ چند سال سے مشاہیر ادب نے تنقید کی طرف بھی توجہ کی ہے۔ تنقید بھی ادب کا ضروری شعبہ ہے۔ اور معیار ادب کو بلند کرنے میں کمال دسترس رکھتی ہے لیکن یہ کہہ دینا تنقید نہیں ہو جاتا۔ کہ اقبال نے اُردو کے میدان نظم میں وہ کیا۔ جو کسی نے آج تک نہ کیا۔ خواہ یہ درست بھی ہو۔ لیکن کافی نہیں۔ تنقید کے چند مسلمات ہیں۔ اور یہ مسلمات براہ راست تنقید طلب ادب سے اخذ ہوتے ہیں۔ اعلیٰ ترین شاعری مصوری۔ موسیقی۔ بُت تراشی جنہیں کہ ہم فنون لطیفہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ان سب میں چند مشترکہ صفات نظر آئیں گی۔ جو کہ ان کے کمال کی شاہد ہیں۔ ایک نہایت عیاں اور درست مواخذہ جو کہ ہم ان فنون لطیفہ سے اخذ کر سکتے ہیں "تخلیق حسن" ہے۔ فن کار زندگی کی گذرگاہوں میں بھی حسن ڈھونڈھتا ہے۔ اور تخیل کی مدد سے بھی اس کی تخلیق کرتا ہے ✣

موسیقی مصوری اور بُت تراشی میں Form یعنی صورت تخلیق حسن کا موجب بنتی ہے مگر شاعری میں اس کی وجہ دوگانہ ہے۔ Form اور Subject یا طرز بیان اور نفس مضمون۔ شعر کی صورت تخیل شاعر کے فنی کمال پر منحصر ہے اور یہ شعر میں موجبِ حسن بنتی ہے۔ شاعری میں جذب و تاثر نفس مضمون سے تعلق رکھتا ہے۔ کئی مضامین قدرتی طور پر اہم مانے جائیں گے۔ مثلاً زندگی موت حُسن عشق۔ ان کے متعلق جو شاعری عمل میں آئے گی۔ وہ نفس مضمون کی بدولت عظیم ہوگی۔ اور جذب و تاثر کی حامل ✣

دوسری اہم بات جو ہم اس طور پر اخذ کرتے ہیں۔ وہ ہے جستجوئے حق۔ شاعر ایک معراجِ حق کا متلاشی ہے یہ حقیقت حسین بھی ہے اور شاعر تخیل کی امداد سے اس معراج کی تشکیل کرتا ہے۔ غالب نے کہا ہے ؎

کوہکن نقاش یک تمثالِ شیریں تھا اسدؔ

یہی تمثال ہے جس کا جویا شاعر ہوتا ہے۔ اسی تمثال کا ذکر کرتے ہوئے ورڈزورتھ نے کہا ہے۔

The light that never was on sea or land
The consecration and a poet's dream

وہ ضو کہ بحر پہ۔ بر پہ۔ فلک پہ ہے نایاب
نیاز شعر ہے۔ خواب حسینِ شاعر ہے

اقبال نے خود اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے ؎

ہر تقاضا عشق کی فطرت کا ہو جس سے خموش
آہ وہ کامل تجلّی مدّعا رکھتا ہوں میں

یہ تمثال نفس شاعر کے لئے حقیقت و جمال کی انتہا ہے۔ اور جمال اور حق دو مختلف معیار نہیں بلکہ اصل میں ایک ہیں۔ اسی لئے "تلاش حق تخلیق حسن میں مضمر ہے۔ لیکن یہ دونو تخیل کی محتاج ہیں اور تخیل شاعری کے محاسن میں ایک نہایت اہم درجہ رکھتی ہے ✣

مضمون پیشتر اس کے کہ وہ صورت شعری کا اعلیٰ لباس زیب تن کرے تخیل کا دست نگر ہوتا ہے۔ جب کوئی مضمون شاعر کے جذبات کو مرتعش کرتا ہے اور شاعر کے ذہن میں ایک حسین صورت اختیار کرنے لگتا ہے تو اس مضمون کو ایک نقش جمیل بنانے کیلئے تخیل کی ضرورت ہوتی ہے یوں سمجھ لیجئے۔ کہ جب تک کوئی مضمون تخیل کی بھٹی سے گزر نہ لے۔ اس میں آب و تاب نہیں ہوتی۔ اور وہ کندن بن کر نہیں دمکتا ✣

شاعر حساس ہوتا ہے اور اپنے فن کے ذریعے سے ہمارے جذبات میں ہیجان پیدا کرتا ہے۔ اسی لئے شاعری انسان کے اعلیٰ عمیق اور خوبصورت ترین محسوسات کا نکھار ہے اور ہمیں زندگی کی "بالاتر آگاہی" کی طرف لے جاتی ہے لیکن یہ گداز تب ہی اعلیٰ ہو سکتا ہے۔ جب کہ Universal یعنی ہمہ گیر بھی ہو۔ ہمہ گیری معیار شعر کا ضروری امتحان ہے۔ ہمہ گیری سے میری مراد یہ ہے کہ ہمہ گیر شاعری وقت اور جگہ کی بندش سے آزاد ہوتی ہے۔ غالب کی بہترین شاعری آج بھی اسی تاثر کی مالک ہے جس کی کہ آج سے اسّی سال پیشتر تھی۔ اور جب تک کہ اُردو زبان صفحۂ ہستی سے محو نہ ہو جائے۔ رہے گی۔ شاعری کا وہ حصہ جو ہنگامی ہوتا ہے۔ محو ہو جاتا ہے۔ مگر ہمہ گیری شعر کو تا ابد زندہ رکھتی ہے اسی لئے یہ کہنا کہ اقبال اسلام

کا شاعر ہے۔ اقبال کو ایک تنگ دائرے میں محدود کر کے اُس سے ہمہ گیری چھین لینے کے مترادف ہوگا +

اس مضمون میں ہمیں اقبال کو بطور شاعر کے جانچنا ہے۔ اور اُس کی اردو شاعری کو تنقید شعری کے مسلمات کی روشنی میں پرکھنا ہے۔ اس لئے یہ سوالات ہمارے سامنے درپیش ہونگے۔ کہ اقبال کہاں تک نقاشیٔ حسن و حق میں کامیاب رہا ہے۔ کیا اقبال کی بصیرت و تخیل نے اُن نقوش کو جنہیں ہم اقبال کی شاعری کہتے ہیں وہ نور بخشا ہے جو شاعری کے لئے باعث ثبات و دوام ہے۔ کہاں تک اقبال کی شاعری ہمہ گیر ہے اور وہ معراج کمال کو پا سکا ہے اور کہاں صورت یا مضمون یا تخیل کی خامی کی وجہ سے وُہ درجۂ کمال سے اِدھر اُدھر رہ گیا ہے +

یہ تنقید اقبال کی اردو شاعری پر مبنی ہے اور اقبال کی اُردو شاعری نہایت آسانی سے تین حصوں میں بغیر کسی تصنع کے منقسم ہو سکتی ہے بانگ درا۔ بالِ جبریل اور ضرب کلیم۔ پہلے بانگ درا کو لیجئے۔ بانگ درا کے شروع شروع ہی میں ایک نظم ہے عشق اور موت۔ اس کے پہلے آٹھ شعر ملاحظہ کیجئے ؎

سہانی نمودِ جہاں کی گھڑی تھی — تبسم فشاں زندگی کی کلی تھی
کبھی مہر کو تاجِ زر مل رہا تھا — عطا چاند کو چاندنی ہو رہی تھی
سیہ پیرہن شام کو دے رہے تھے — ستاروں کو تعلیم تابندگی تھی
کہیں شاخِ ہستی کو لگتے تھے پتّے — کہیں زندگی کی کلی پھوٹتی تھی
فرشتے سکھاتے تھے شبنم کو رونا — ہنسی گُل کو پہلے پہل آ رہی تھی
عطا درد ہوتا تھا شاعر کے دل کو — خودی تشنہ کام مے بیخودی تھی
اُٹھی اوّل اوّل گھٹا کالی کالی — کوئی حُور چوٹی کو کھولے کھڑی تھی

زمیں کو تھا دعویٰ کہ میں آسماں ہوں
مکاں کہہ رہا تھا کہ میں لامکاں ہوں

زباں کی سلاست اور روانی اور صورتِ شعر کا کمال شاعر کے جمیل تخیل کا صحیح اعادہ کر رہے ہیں۔ اور حسین تصاویر بے محابا آپ کی نظروں کے سامنے کھنچتی چلی جاتی ہیں۔ صورتِ مضمون اور تخیل کچھ ایسے گھُل مِل گئے ہیں کہ بس حُسن کا ایک احساس ہے۔ جو آپ کے ذہن میں رہ جاتا ہے اور کتنا ہمہ گیر حُسن ہے یہ ایک جامع نقش ہے اور آپ اپنے لئے حیات کا باعث ہے۔

اقبال کے اس زمانہ کی شاعری میں ایک تو شاعر اپنے گرد و پیش کی دُنیا میں حُسن دیکھتا ہے اور اس حُسن سے متاثر ہوتا ہے۔ اور وہ اس گلزارِ ہست و بود کی حسین تصاویر ہی نہیں کھینچ دیتا۔ بلکہ تخیل کی مدد سے اس حُسن کی تجدید کرتا ہے۔ ایک نظم دیکھئے۔

حُسن و عشق

جس طرح ڈوبتی ہے کشتیٔ سیمینِ قمر — نورِ خورشید کے طوفان میں ہنگامِ سحر
جیسے ہو جاتا ہے گم نور کا لے کر آنچل — چاندنی رات میں مہتاب کا ہمرنگ کنول
جلوۂ طور میں جیسے یدِ بیضائے کلیم — موجۂ نکہتِ گلزار میں غنچے کی شمیم

ہے ترے سیلِ محبت میں یونہی دل میرا

تو جو محفل ہے تو ہنگامۂ محفل ہوں میں — حُسن کی برق ہے تو، عشق کا حاصل ہوں میں
تو سحر ہے تو مرے اشک ہیں شبنم تیری — شامِ غربت ہوں اگر میں تو شفق تو میری
میرے دل میں تری زلفوں کی پریشانی ہے — تری تصویر سے پیدا مری حیرانی ہے

حسن کامل ہے ترا عشق ہے کامل میرا

ہے مرے باغِ سخن کیلئے تُو بادِ بہار — میرے بیتاب تخیل کو دیا تو نے قرار
جب سے آباد ترا عشق ہوا سینے میں — نئے جوہر ہوئے پیدا مرے آئینے میں
حُسن سے عشق کی فطرت کو ہے تحریکِ کمال — تجھ سے سرسبز ہوئے میری اُمیدوں کے نہال

قافلہ ہو گیا آسودۂ منزل میرا

کتنی خوبصورت تشبیہات ہیں۔

دُوسرے حُسن کے اس کیف پرور احساس کے علاوہ چند محسوسات حق ہیں۔ جو فکر شاعر پیہم پے پے نازل ہوتے ہیں۔ لیکن یہ خیالات و تفکرات شاعر کے بیان کو منظوم فلسفہ نہیں بنا دیتے۔ بلکہ شاعر ان خیالات کو بھی حسین تصاویر و تماثیل کی صورت میں بیان کرتا ہے۔ اقبال کی شاعری متفکر بھی ہے اور متخیل بھی +

کوششِ ناتمام

فرقتِ آفتاب میں کھاتی ہے پیچ و تاب صبح
چشمِ شفق ہے خوں فشاں اخترِ شام کے لئے
رہتی ہے قیسِ روز کو لیلیٔ شام کی ہوس
اخترِ صبح مضطرب تابِ دوام کے لئے
کہتا تھا قطبِ آسماں قافلۂ نجوم سے
ہمرہو، میں ترس گیا لُطفِ خرام کے لئے
سوتوں کو ندیوں کا شوق، بحر کا ندیوں کو عشق
موجۂ بحر کو تپش ماہِ تمام کے لئے
حُسنِ ازل کہ پردۂ لالہ و گل میں ہے نہاں

کہتے ہیں بے قرار ہے جلوۂ عام کے لئے
رازِ حیات پوچھ لے خضرِ خجستہ گام سے
زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ ناتمام سے

گورستانِ شاہی کے چند اشعار لیجئے:۔

سلسلہ ہستی کا ہے اک بحرِ ناپیدا کنار
اور اس دریائے بے پایاں کی موجیں ہیں مزار
اے ہوس خوں رو کہ ہے یہ زندگی بے اعتبار
یہ شرارے کا تبسم یہ خسِ آتش سوار
یہ قمر جو ناظمِ عالم کا اِک اعجاز ہے
پہنے سونے کی قبا محوِ خرامِ ناز ہے
چرخِ بے انجم کی دہشتناک وسعت میں مگر
بے کسی اس کی کوئی دیکھے ذرا وقتِ سحر
اِک ذرا سا ابر کا ٹکڑا ہے جو مہتاب تھا
آخری آنسو ٹپک جانے سے ہو جس کی فنا

اب بانگ درا کی ایک لمبی نظم کو لیجئے۔ "شمع اور شاعر" چھیاسی اشعار کی ایک مسلسل نظم ہے اور اس نظم میں ایک شعر بھی ایسا نظر نہ آئیگا جہاں حسنِ تمثیل وتخیل نے تفکرات شاعر کو خوبصورت نہ بنا دیا ہو۔ ایک ایسا تسلسل کیف آور وضیا بار ہے کہ آپ کے جذبات کو متاثر کرتا ہوا چلا جاتا ہے۔ ایک اور لمبی نظم لیجئے۔ "والدہ مرحومہ کی یاد میں" یہ نظم بیاسی اشعار پر مشتمل ہے۔ حیات اور موت۔ غم اور انبساط انسان کے عمیق ترین جذبات سے وابستہ ہیں۔ لیکن اس نظم کا جذب وگداز اس سے ہی نہیں کہ ہماری رُوح کی گہرائیوں کو ٹٹولتی ہے۔ بلکہ اس لئے بھی کہ اس کی افسردگی میں شاعر کے تخیل نے وہ حُسن پیدا کر دیا ہے جو کہ آپ کو شاید غالب کے اشعار میں ہی مل سکے +

ان اقتباسات کے بعد صورت شعر کے دو ضروری صفات کا ذکر کرنا غیر موزوں نہ ہوگا۔ یہ Rhyme اور Rythem یعنی قافیہ اور الفاظ کا زیر وبم ہیں۔ خوبیٔ قوافی کی تو اردو شاعری میں ہرگز کمی نہیں۔ بلکہ قافیہ و ردیف کی ضروریات کی خاطر اردو شعرا شعریت تک کو قربان کر چھوڑتے ہیں۔ اور یہ ایک امید پرور تبدیلی ہے۔ کہ اُردو شعرا نے قافیہ وغیرہ کی بندش کو ڈھیلا کر دیا ہے۔ مگر الفاظ کا لطیف زیر وبم اعلیٰ شاعری کی جان ہے۔ اس زیر وبم سے میری مراد وہ عیاں موسیقی نہیں۔ جو کہ اقبال نے بھی کامیابی سے کئی نظموں میں پیدا کی ہے۔ مثلاً اقبال کی وہ نظم لیجئے۔ جو اس طرح شروع ہوتی ہے ؎

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا
میں ہلاکِ جادوئے سامری تو قتیلِ شیوۂ آذری

بلکہ میری مراد اُس لطیف زیر وبم سے ہے جو کہ زیادہ نمایاں طور پر آپ کو غالب کے ان دو اشعار میں نظر آئیگا۔

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز   میں ہوں اپنی شکست کی آواز
تو اور آرائشِ خمِ کاکل   میں اور اندیشہائے دُور دراز

یہ زیر وبم ہے جو شعر کے الفاظ کو ایک دوسرے کے ساتھ اس خوبی سے جوڑ دیتا ہے جس خوبی سے کہ مصور اپنے رنگوں کو صفحۂ قرطاس پر ملاتا ہے۔ اور بجائے اس کے کہ ہمیں یہ احساس ہو۔ کہ یہاں اودی رنگ ہے اور یہاں پیلا ہمیں ایک مسلسل حُسن کا احساس ہوتا ہے اگر آپ نے اقبال کا شکوہ پڑھا ہے تو یقیناً آپ کو یہ احساس ہؤا ہوگا۔ یہ صفت بال جبریل کے بیشتر حصہ میں اقبال کی اوائل کی شاعری سے کہیں زیادہ موجود ہے۔ یہی دو اشعار لیجئے:۔

عقل گو آستاں سے دور نہیں   اس کی تقدیر میں حضور نہیں
علم میں بھی سرور ہے لیکن   یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں

اس زیر وبم کی لطافت سے شعر میں ایک مختلف حُسن پیدا ہو جاتا ہے۔ یعنی وہ تخیل ومعانی کا ہی نہیں۔ بلکہ صورت کا بھی ایک نقشِ حسین بن جاتا ہے۔ اسی لئے آپ نے دیکھا ہوگا۔ کہ کئی اشعار اُونچا پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ اور میں تو اقبال کی بیشتر نظمیں زیر لب پڑھنے سے قاصر ہوں۔

بانگ درا کی ایک نظم "رات اور شاعر" کے تین اشعار سُنئے۔ شاعر رات سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے ؎

میں ترے چاند کی کھیتی میں گہر بوتا ہوں
چھُپ کے انسانوں سے مانند سحر روتا ہوں
دن کی شورش میں نکلتے ہوئے شرماتے ہیں
عزلتِ شب میں مرے اشک ٹپک جاتے ہیں
صفتِ شمع لحد مُردہ ہے محفل میری
آہ اے رات بڑی دُور ہے منزل میری

بانگ درا کا بیشتر حصہ پاکیزہ۔ جمیل اور ہمہ گیر شاعری سے پُر ہے۔ اور اقبال کا درجہ اُردو زبان کے گزرے ہوئے اور زندہ

شعرا میں سب سے بڑے شاعر غالب کے دوش بدوش ہے۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا۔ کہ بلحاظ حجم اقبال کی اعلیٰ ترین شاعری غالب کی اعلیٰ ترین شاعری سے کہیں زیادہ ہے ٭

اقبال کے دوسرے دور یعنی بال جبریل کی شاعری میں کئی ایسے اجزا آ گئے ہیں جو کہ اس نقاش حُسن کو اس اعلیٰ معیار سے جو کہ اُس نے بانگِ درا میں قائم کیا ہے کہیں اُوپر کھینچ لائے ہیں۔ بانگ درا میں ہی آپ کو اس کی مثالیں کہیں کہیں مل جائیں گی۔ خضر راہ کو لیجئے۔ اس نظم میں جوابِ خضر کے تحت میں جو چوبیس اشعار صحرا نوردی اور زندگی کے متعلق کہے گئے ہیں۔ اُن میں شعریت کے تمام اجزا موجود ہیں۔ اور یہ ہی نہیں بلکہ زبان میں ایک پختگی آ چکی ہے۔ "شمع اور شاعر" "والدہ مرحومہ کی یاد"۔ "خضر راہ" وغیرہ نظموں میں اقبال کی زبان کمال کی مظہر ہے۔ پختگی کے علاوہ اقبال کی زبان میں ایک نیا عنصر بھی داخل ہو چکا ہے اور وہ الفاظ کی شان و شکوہ ہے۔ مگر یہ شکوہِ الفاظ یہاں تخیل کے سدِ راہ نہیں ہوتا۔ لیکن ان چوبیس اشعار کے مابعد کے اشعار میں صرف دوسرے درجے کی شاعری نظر آئیگی۔ اس شاعری میں تخیل کم ہے۔ اور شکوہِ الفاظ اور بارِ خیالات زیادہ۔ شاعر تصاویر و تماثیل کی حسین زبان بھلا بیٹھا ہے اور اُس کی شاعری تخلیقِ حُسن نہیں کرتی۔ بلکہ ایک نقطۂ نظر کی تبلیغ کر رہی ہے ٭

بانگِ درا کے مابعد کی شاعری میں خصوصاً "ضرب کلیم" میں یہ روش جو بانگ درا میں صرف کہیں کہیں نظر آتی ہے۔ عام ہو گئی ہے۔ "بال جبریل" میں اس سے کم ہے۔ شاعر یہاں بھی ایک غیر معمولی جذب و گداز کا مالک ہے۔ لیکن یہ گداز اُتنا لطیف و جمیل نہیں جتنا کہ بانگ درا کے بیشتر حصہ میں ہے۔ بانگ درا کے اشعار سلاست۔ روانی۔ جمال۔ اور لطافت کے مالک ہیں۔ اور اُن کا حُسن شکوہِ الفاظ اور خیالات کی رَو میں نہیں بہ جاتا۔ شاعر کا تخیل اس دور میں کمال کا ضوبار ہے مابعد کی شاعری میں یہ ضو جدّت میں بدل جاتی ہے۔ اس جدّت کی ایک مثال بانگ درا سے ہی پیش کرتا ہوں :-

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی
حیاتِ شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز
سرشت اس کی ہے مشکل کشی جفا طلبی

ایسے اشعار میں کئی جگہ حسنِ عریاں کی جمیل جھلک موجود ہے۔ مگر شکوہِ الفاظ اور بارِ تفکر کے نیچے دب کر رہ گئی ہے۔ اسی دور کی شاعری نے ایک نقطۂ نظر کو اپنا لیا ہے۔ اور شاعر سرحدِ یقین کے ایک بلند مینار پر بیٹھا اپنے نظریہ کو لباسِ شعر میں ملبوس کر رہا ہے۔ اس لئے اس دور کی شاعری ہرگز ہمہ گیر نہیں۔ وہ اقبال جو نقاشِ حُسن تھا۔ ایک مبلغ بن کر رہ گیا ہے جس شاعری کے متعلق خود اقبال نے کہا تھا۔

پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

اب شاہ پروں کی مالک ہو کر بھی طاقتِ پرواز کھو بیٹھی ہے۔

مگر اس دور کی شاعری میں تخیل و حُسن ہمہ تن مفقود نہیں ہو گئے جہاں جہاں آپ کو حسین اشعار نظر آئیں گے وہاں آپ کو اقبال کی زبان اور بیان میں ایک نئی خوبی نظر آئیگی۔ یہ خوبی ہے اختصار یعنی کم سے کم الفاظ سے زیادہ سے زیادہ معانی کا اعادہ۔ الفاظ کی موزونیت اور اور تصاویر تخیل کی ساخت کا کمال۔ زبان باوجود کمال درجہ کی فصیح و بلیغ ہونے کے آسان ہو گئی ہے۔ اور شکوہِ الفاظ اور بارِ خیالات سے معرّا۔ مثال کے طور پر یہ دو اشعار اور ایک قطعہ لیجئے۔

۱۔ علم میں بھی سرور ہے لیکن
یہ وہ جنت ہے جس میں حُور نہیں

۲۔ دریا میں ہوتی ہے موج بے باک
ساحل کی سوغات خار و خس و خاک

۳۔ تری دُنیا جہانِ مُرغ و ماہی
مری دُنیا فغانِ صبحگاہی
تری دُنیا میں محکوم و مجبور
مری دُنیا میں تیری بادشاہی

"بال جبریل" میں "مسجد قرطبہ" ایک نہایت خوبصورت نظم ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

سلسلۂ روز و شب سازِ ازل کی فغاں
جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بم ممکنات
تجھ کو پرکھتا ہے یہ۔ مجھ کو پرکھتا ہے
سلسلۂ روز و شب صیرفیِ کائنات
تو ہو اگر کم عیار میں ہوں اگر کم عیار
موت ہے تیری برات موت ہے میری برات
آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر
کارِ جہاں بے ثبات کارِ جہاں بے ثبات

دیکھئے اس بحر کی تہ سے اُچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

وادیٔ کہسار میں غرقِ شفق ہے سحاب   لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب
سادہ و پُرسوز ہے دخترِ دہقاں کا گیت   کشتیٔ دل کیلئے سیل ہے عہدِ شباب
آبِ رواںِ چناب تیرے کنارے کوئی   دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب

اب چند اور اشعار دیکھئے :-

یا رب یہ جہانِ گذراں خوب ہے لیکن
کیوں خوار ہیں مردانِ صفا کیش و ہنرمند
گو اس کی خدائی میں مہاجن کا بھی ہے ہاتھ
دُنیا تو سمجھتی ہے فرنگی کو خداوند
تو برگِ گیا ہے ندہی اہلِ خرد را
او کشتِ گُل و لالہ بہ بخشد بہ خرے چند

اوائل کی شاعری کے بالمقابل ان اشعار سے روشن ہو جائیگا کہ کس طرح تخیل کی جگہ الفاظ نے لے لی ہے اور حسن چند ہنگامی خیالات میں محو ہو گیا ہے۔ جس شاعری میں ہم عمیق اور رُوح گداز جذبات ڈھونڈا کرتے تھے۔ وہاں اب صرف خیالات کا ادراک باقی رہ گیا ہے۔

بالِ جبریل میں کئی چھوٹی چھوٹی نظموں اور قطعات کے علاوہ ساقی نامہ بھی ایک اعلیٰ نظم ہے۔

اب "ضربِ کلیم" کو لیجئے۔ ضربِ کلیم میں یہ خامیاں عیوب کی حد میں داخل ہو چکی ہیں۔ مضامین ہنگامی ہیں تخیل مفقود ہے۔ حسن کا نام تک نہیں۔ لے دے کر دو چار ایسی نظمیں نظر آتی ہیں جنہیں شاعری کے نام سے موسوم کر سکیں۔ فہرست مضامین دیکھنے سے ہی معلوم ہو جائیگا کہ اس کتاب کا بیشتر حصہ جرنلسٹک ہے مضامین ملاحظہ کیجئے۔ "لاہور و کراچی"۔ "مکّہ اور جینوا"۔ "پنجابی مسلمان"۔ "اشاعتِ اسلام"۔ "فرنگستان میں"۔ "سلطان ٹیپو کی وصیّت"۔ "پردہ"۔ "یورپ اور یہود"۔ "مسولینی" وغیرہ

ایک نظم بعنوان "آزادیٔ نسواں" بھی دیکھئے :-

اس بحث کا میں فیصلہ کچھ کر نہیں سکتا
گو خوب سمجھتا ہوں کہ یہ زہر ہے وہ قند
کیا فائدہ کچھ کہہ کے بنوں اور بھی معتوب
پہلے ہی خفا مجھ سے ہیں تہذیب کے فرزند
اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش
مجبور ہیں معذور ہیں مردانِ خردمند
کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ
آزادیٔ نسواں کہ زمرد کا گلوبند

شاعر کسی حد تک یقیناً اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔ شعراکی شاعری اپنے ماحول کی پیداوار ہوتی ہے۔ لیکن یہ تسلیم کر لینا کہ وہ اسی لئے اعلیٰ و ارفع بھی ہوتی ہے۔ غلط ہوگا۔ شاعری اگر ہنگامی مضامین کو بھی ثبات و دوام بخش سکے۔ تو وہ یقیناً اعلیٰ ہو جاتی ہے۔ مگر یہ ماحول کا تاثر نہیں ہوتا بلکہ تخیل کا ہوتا ہے۔ اقبال کا اپنا ہی قول ہے اور خود اس پر صادق آتا ہے ؎

عجم کے خیالات میں کھو گیا
یہ سالک مقامات میں کھو گیا

باوجود اس کے بھی اگر اقبال کی ساری اُردو شاعری کا بہ حیثیت مجموعی اندازہ کیا جائے۔ تو اقبال کا درجہ مشاہیر ادب میں بہت بلند ہے۔ غالب کے بعد اقبال اُردو ادب کا سب سے بڑا شاعر ہے نقاد کا یہ فرض ہوتا ہے۔ کہ وہ کسی شاعر کی عظمت بیان کرتے ہوئے اس کی خامیوں کو بھول نہ جائے۔ مگر اقبال کی خامیاں اُس کی عظمت کا عشرِ عشیر بھی محو نہیں کر سکتیں۔ اقبال نے اُردو ادب کو وہ خزینۂ حُسن و حق عطا کیا ہے۔ کہ جس کی بدولت اُس کا نام ادبی دُنیا میں تا قیامت روشن رہیگا ۔

واسدیو واشش (ایم - اے)

رباعی

ذہنوں کی بلندی سے اتر جائیگی
مانندِ عذاب دردِ سر جائیگی
باقی رہ جائے گا مرا عہدِ سخن
دُنیا سے حکومتیں گذر جائینگی

نجم آفندی

شکستِ خودی

نظر کے سوز میں ساز خودی بھی شامل تھا — زمانہ اُف وُہ زمانہ کہ میں خود اک دِل تھا
ہزار جلوے مبارز طلب تھے نظروں سے — وفورِ ناز سے اپنا ہی میں مقابل تھا
کچھ ایسا معنوی ہستی پہ ناز تھا مجھ کو — کہ آپ آئینہ اور آپ دیدہ و دِل تھا
تصورات حسیں، دِل حسیں، نگاہ حسیں — یہ سارا حسن مری زندگی کا حاصِل تھا
کبھی حجاب اُٹھاتا تھا، چھوڑتا تھا کبھی — میں اپنے آپ ہی لیلیٰ تھا آپ محمل تھا
کِسی کی آنکھ کا احسان نہ تھا نظر پہ مری — میں اپنا آپ ہی قاتل تھا آپ بسمل تھا
مرے وجود سے روشن تھی کائنات مری — ہر ایک ذرہ حسیں تھا حسین کا دِل تھا
مرا ہی عکس تھا بس میرا کعبۂ مقصود — کبھی تھا رہرو منزل کبھی میں منزل تھا
تصوّر اپنا خیال اپنا آنکھ بھی اپنی — نفس نفس میں خودی کا خمار شامل تھا
نظر نے سینکڑوں دھوکے دیئے تصوّر کو — مگر فریب میں آنا ہنوز مشکل تھا
حدود میں اپنی میں تنہائیوں سے گھبرا کر — جب آتا آئینہ خانہ میں ایک محفل تھا
حسیں نگاہوں سے اکثر لئے حسیں پیغام — مگر جواب میں کیفِ خودی بھی شامل تھا
جھکولے کھاتی رہیں کشتیاں اُمیدوں کی — میں اپنے آپ ہی طوفان تھا آپ ساحل تھا

یکایک ایک قیامت کا انقلاب آیا
مری نگاہ اُٹھی اور تجھے حجاب آیا

خودی کو خود سے کچھ ایسا بھُلا دیا میں نے — شکست کھائی مگر مُسکرا دیا میں نے
نہ وُہ خودی تھی نہ پندار تھا نہ خود بینی — اِس اک نگاہ پہ سب کچھ لٹا دیا میں نے
نفس نفس پہ جو طاری تھا ایک کیف خودی — اسے نیاز سراپا بنا دیا میں نے
شکست کھا کے بڑھی اور آرزوئے شکست — سنبھل سنبھل کے بھی خود کو گرا دیا میں نے
خموش تھا جو مری خود پسندیوں کے سبب — وہ تارِ بربطِ دِل تھرتھرا دیا میں نے
مری شکست کی تکمیل ہو گئی آخر — جنوں کا جوش بڑھا سر جھکا دیا میں نے
خوشی سے، جوشِ الم سے نہ پوچھیئے کیونکر — اِس حادثہ پہ اک آنسو بہا دیا میں نے

تری شکست کا اب اِنتظار ہے مجھ کو
عیاں ہو یا کہ نہ ہو اعتبار ہے مجھ کو

— تاباں نقوی امروہوی

قارُون

(ایک ایکٹ کا ڈرامہ)

افراد:۔

قارون .... شہنشاہ
طام .... شہنشاہ کا خاص مصاحب
سلافیس .... شہنشاہ کی فوج کا آفیسرِ اعلےٰ
انطونی .... گداگر
ملکہ۔ ――――――
دربان وغیرہ۔ ――――――

(۱)

سلافیس:۔ (غمگین لہجے میں) میں نے سُنا۔ بادشاہ سلامت آج رات بھر نہیں سوئے!

طام:۔ چُپ ہو رہیئے۔ یہ نئی بات تو نہیں!

سلافیس:۔ کیوں۔ اُنہیں نیند نہیں آتی کیا؟

طام:۔ وہ راتوں کو جاگتے رہتے ہیں۔ گو یہ کسی کو معلوم نہیں۔

سلافیس:۔ اور تمہیں کیسے معلوم ہے۔

طام:۔ یہ مت پوچھو۔ صرف یقین کرو۔ کہ مجھے معلوم ہے!

سلافیس: آج تم نے انطونی کو دیکھا تھا؟

طام:۔ نہیں۔ نہ جانے وہ آج کیوں غیر حاضر رہا۔ بادشاہ سلامت جھروکے پر بیٹھے اُس کا انتظار کر رہے تھے۔

سلافیس:۔ شاید اسی وجہ سے اُنہیں نیند نہ آئی ہو۔

طام:۔ شاید۔ لیکن انطونی کا پتہ لگانا ہی پڑے گا۔ میرے دل میں خوف پیدا ہو رہا ہے۔

سلافیس:۔ بادشاہ سلامت سے پوچھ کر تلاش کرنا۔

طام:۔ نہیں۔ ایسا نہ ہو۔ وہ آزردہ ہوں۔

سلافیس:۔ مجھے اس وقت دربار میں جانا ہے۔ وہ انطونی کو پوچھیں۔ تو کیا کہوں؟

طام:۔ کہہ دو۔ گداگر محلات کے دروازے پر آگیا تھا۔ گیت گا کر چلا گیا۔

سلافیس:۔ (چونک کر) یا اللہ۔ نہ جانے وہ اور کیا پوچھیں۔ میں نے تو انطونی کو دیکھا ہی نہیں۔

طام:۔ ہمیں محلات کے پہرے داروں سے کہہ رکھنا چاہیئے۔

سلافیس:۔ وہ نہ مانیں گے۔ اُن پر شہنشاہ کی مہربانی ہے۔

طام:۔ وہ دیکھو۔ سردار آرہا ہے۔ ہمیں اُس سے پوچھنا چاہیئے۔

(۲)

(سردار سر جھکا کر آہستہ آہستہ اُن کے پاس آتا ہے اور ایک طرف بیٹھ جاتا ہے)

طام (آہستہ سے) آؤ سردار۔ بادشاہ سلامت راضی تو ہیں؟

سردار: (سر اُٹھا کر) ہاں۔ خدا انہیں عمرِ جاوداں بخشے اور خزانوں کو برکت دے۔

سلافیس:۔ (طام سے) آج سردار کچھ مغموم دکھائی دے رہا ہے۔

طام:۔ خدا کرے ایسا نہ ہو۔ کہو سردار ―!

سردار:۔ (آہستہ سے) آمین۔

سلافیس:۔ (سردار کے نزدیک جا کر) لیکن کیا میرا قیاس ٹھیک نہیں؟

سردار:۔ آج شہنشاہ رات بھر نہیں سوئے!

طام:۔ ایں۔ نہیں سوئے۔ وجہ؟

سردار:۔ صبح سے وہ خاموش ہیں اور خزانوں کی چابیاں.....

سلافلیس :- (چونک کر) خزانوں کی چابیاں کیا؟

سردار :- وہ بکھری پڑی ہیں۔ جن چابیوں نے رات کی تاریکی نہ دیکھی تھی۔ وہ سورج کی کرنوں سے نہا رہی ہیں۔

طام :- یہ تو بُری بات ہے سردار۔ ہمیں اُنہیں خوش کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

سردار :- آپ کر سکیں گے؟

طام :- (خاموش ہو جاتا ہے)۔

سردار :- (سلافلیس سے) اور آپ ——؟

سلافلیس :- ہاں بشرطیکہ گداگر محلات کے دروازے پر گا رہا ہو۔

سردار :- (گنگنا کر) گداگر —— الطلوفی —— گا رہا ہو۔ (زور سے ہنس دیتا ہے)

طام :- (غصے میں) بہادر سردار۔ ہم بادشاہ کے وفادار ہیں۔ ہم جان کی بازی لگا سکتے ہیں۔

سردار :- مبارک ہو یہ جذبہ! یا اللہ ہمیں ایسی ہی توفیق عطا کر—!

طام :- کیا وقت ہو گا سلافلیس!

سلافلیس :- (آسمان کی طرف دیکھ کر) دوپہر قریب ہے۔

طام :- دوپہر۔ آج الطلوفی کو دیر کیوں ہو گئی؟

سردار :- (چونک کر) کل آپ نے اسے دیکھا تھا؟

(طام اور سلافلیس ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں)

طام :- آج الطلوفی کو دیر کیوں ہو گئی؟ -

سردار :- (چونک کر) کل آپ نے اُسے دیکھا تھا؟

(طام اور سلافلیس ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں)

طام :- (کھانس کر) "ہاں - نہیں - وہ آیا تھا۔"

سردار :- (حیرت میں) آیا تھا۔ کس وقت؟

طام :- بادشاہ سلامت نے اسے دیکھا ہو گا۔

سردار :- نہیں۔ وہ کل سے ہی اُس کا انتظار کر رہے ہیں۔

سلافلیس :- کل شاہی نقارہ بجایا گیا تھا؟

سردار :- بجایا گیا تھا۔ لیکن الطلوفی کے گیت کے بغیر ہی — تھوڑی دیر کے لئے!

طام :- اوہ۔ کتنی بدمزگی۔ نہ جانے الطلوفی کو کیا سزا ملے گی۔

سردار :- وہ شہنشاہ کا محافظ ہے۔ یہ آپ بھول گئے!

سلافلیس :- "ہاں وہ عجیب گداگر ہے۔ شاہی خزانوں کا محافظ!

(۳)

(دربار میں وزراء، اُمراء اور مصاحب بیٹھے ہیں۔ بادشاہ کے تخت کے دائیں بائیں دو پہلے چوب لئے چوبدار کھڑے ہیں۔ تخت کے پیچھے ایک سردار سنہری چھاتہ لئے کھڑا ہے۔ سب دروازے کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ بادشاہ سلامت کے آنے کا انتظار ہے)

ایک دربان :- (بلند آواز میں) "بادشاہ سلامت آ رہے ہیں۔"

"درباری چونک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ قارون درباری لباس پہن کر آتا ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے آٹھ دس مصاحب نذر کا جھنڈ تھامے چلے آتے ہیں۔ بادشاہ سر جھکا کر تخت پر بیٹھ جاتا ہے۔ اس کے بعد سب بیٹھ جاتے ہیں۔"

دوسرا دربان :- "بادشاہ سلامت زندہ باد"

(سب زور سے کہہ اُٹھتے ہیں) "بادشاہ سلامت زندہ باد"

طام :- (ایک دربان سے) شاہی رقاصہ کو بلاؤ۔

(دربان جانے لگتا ہے۔ بادشاہ اپنا ہاتھ اُٹھا کر اُسے روکنے کا اشارہ کرتا ہے)

قارون :- "آج کسی خاص بات کا فیصلہ تو نہیں کرنا ہے۔"

طام :- (ہاتھ جوڑ کر) شہنشاہ سلامت! ملک میں ہر طرف سے امن و امان کی خبر آئی ہے۔

قارون :- مجھے ملک کی پروا نہیں۔

طام :- وزراء کو ملک کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے شہنشاہ! وہ اُسی کا اناج کھاتے ہیں۔

قارون :- (غصے میں) بادشاہ محض بادشاہ ہو گا۔

طام :- (کانپ کر) بادشاہ خدا کی رحمت کا سایہ اور ہمارا آقا ہے۔

قارون :- (سلافلیس سے) مصر کے خزانوں پر حملہ کرنے کے لئے فوج تیار ہو گی۔

سلافلیس :- (ادب سے) جونہی بادشاہ کا فرمان ہو گا۔ کوچ کا حکم دے دیا جائے گا۔

قارون :- میں نے سُنا ہے۔ وہاں کے قلعوں میں بے پناہ دولت ہے۔

سلافلیس :- خدا کرے۔ وہ دولت جہاں پناہ کے خزانوں میں پہنچ جائے۔

سب مصاحب :- آمین۔ آمین۔ آمین۔

قارون: - مال و دولت ہی دنیا میں سب کچھ ہے۔

طام: - شہنشاہ سلامت! مقدس کتابوں میں کچھ اور ہی لکھا ہے!

قارون: - (چونک کر) کیا؟

طام: - لکھا ہے "خدا کی بندگی اور خدمتِ خلق کے برابر کوئی دولت نہیں۔"

قارون: - (غصے میں) اُن کتابوں کو میرے سامنے پیش کیا جائے۔

طام: - شہنشاہ کا فرمان بجا لایا جائے گا۔

قارون غصے میں اُٹھ ٹہلنے لگتا ہے۔ درباری خوف کے مارے سہم جاتے ہیں۔ طام کانپتا ہوا باہر چلا جاتا ہے۔

سلافیس: - (اُٹھ کر) اگر حکم ہو۔ تو تب تک شاہی رقاصہ کو طلب کیا جائے۔

قارون: - رقاصہ نہیں۔ الظونی کہاں ہے؟

سلافیس: - وہ کل محلات کے دروازے پر......

قارون: - (چونک کر) آگیا تھا۔؟

سلافیس: - (اِدھر اُدھر دیکھ کر) بادشاہ سلامت! اُس وقت نقارہ بج رہا تھا۔ محلات میں موسیقی ناچ رہی تھی۔

قارون: - تم نے اُسے دیکھا ہوگا۔

سلافیس: - نہیں جہاں پناہ۔ طام نے اسے دیکھا ہے۔ وہ کہتا تھا۔ الظونی کل بہت اداس تھا۔

قارون: - گویا وہ یہاں آگیا تھا۔

سلافیس: - ہاں شہنشاہ۔ لیکن آکر چُپ چاپ چلا گیا۔ دربانوں سے بھی بات نہ کی۔

قارون: - (تخت کے آگے جھک کر) یا اللہ۔ یا اللہ میرے محافظ کو وسعتِ دل عطا کر۔"

(طام کتاب لے کر آجاتا ہے)

طام: - (قارون کے آگے کتاب رکھتے ہوئے) اے شہنشاہ کتاب حاضر ہے۔

قارون: - (کتاب کے ورق اُلٹنے کے بعد) اسے پڑھ کر سناؤ۔

(طام کتاب کا ایک حصہ پڑھتا ہے)

...... یہ لکھا گیا ہے تمہارے لئے کہ کام آئے

تمہیں اس شعل کی طرح جو فنا کر دیتی ہے تاریکی کو

کہ یہ دنیا ہے سارہی فانی۔ اور تجھے پیدا کیا گیا مشیت ایزدی سے کہ کرو تم اُس کی بندگی۔ اُس کی اطاعت عمر بھر اسے اپنا آقا جان کر اور کرو نیکی اُن کے ساتھ جو اُس نے پیدا کئے اِس وسیع دنیا میں بمت اُلجھ دولت میں۔ دامن کو بچا سیم و زر کی فریب ادا آلائش سے۔ کیونکہ بنائی گئی ہے دولت صرف اُن کے لئے۔

جنہیں نہیں کیا منور حق نے اپنی ضیا کے رحمت سے!

...... یہ لکھا گیا ہے تیرے لئے ہی .....

....

طام پڑھتا جاتا ہے اور قارون غصے سے کانپ رہا ہے۔ اُس کے ہونٹ تھر تھراتے ہیں۔ بدن میں لغزش پیدا ہوتی ہے۔

قارون: - (دونوں ہاتھ اُٹھا کر) بس۔ بس طام۔ بند کر دو اِس کتاب کو۔ میں اپنے خزانوں کی بے عزتی نہیں دیکھ سکتا۔

سلافیس: - جہاں پناہ ایسا کبھی نہ ہوگا۔ ہم اِس کی حرمت کے پاسبان ہیں۔

(مجلس برخاست ہوتی ہے۔ بادشاہ غمگین ہو کر چلے جاتے ہیں۔)

(۴)

بادشاہ محل سرا میں بیٹھا ہے۔ خزانوں کی چابیاں اُس کے ہاتھ میں ہیں۔ سامنے ملکہ بیٹھی ہے۔ بادشاہ چابیوں کے ساتھ کھیل رہا ہے۔

ملکہ: - (مسکرا کر) جہاں پناہ کے مزاج بھی کیسے ہیں کہ چابیوں سے کھیل رہے ہیں

قارون: - (سر اُٹھا کر آہستہ سے) یہ چابیاں ہی میری زندگی کا سرمایہ ہیں۔ تم ملکہ ہو۔ نہیں جانتی۔ یہ چابیاں میں نے کیونکر حاصل کی ہیں۔ کتنے خون کئے ہیں۔ کتنے شہر لوٹے ہیں۔ تم یہ نہیں جانتی۔

ملکہ: - مجھے اِن چابیوں سے نفرت ہے۔ یہ انسانی زندگیاں تلف کر کے حاصل کی گئی ہوں۔

قارون: - (غصے میں) نفرت؟ ملکہ کیا تم میرے خزانوں سے نفرت کرتی ہو؟

ملکہ: - (تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد) میں نے کل بہت بُرا خواب دیکھا ہے۔ اللہ خیر کرے

قارون: - خواب وہم کا دوسرا نام ہے۔ میں اپنے خزانوں کی عبادت

معبود کی طرح کرتا ہوں۔

ملکہ:۔ (مضبوطی سے) ایسا نہ کہئے شہنشاہ۔ خدا لاشریک ہے!

قارون:۔ قارون کی بات قانون ہے۔ تم نہیں جانتی۔ تمہارے سینے میں عورت کا دل ہے سپاہی کا دل نہیں۔

ملکہ:۔ میں سچائی کو ظاہر کرنے سے نہیں ڈرتی۔ یہ خزانے . . . .

قارون:۔ تم خزانوں کی بے حرمتی کرنے کی سزا پانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ تمہارے خون سے خزانوں کا یہ آمدہ زنگا جائیگا۔

ملکہ:۔ میرا سر حاضر ہے۔

ملکہ سر جھکاتی ہے۔ قارون شمشیر اٹھاتا ہے۔ اسی وقت دروازے پر ایک خادمہ آکر کہتی ہے۔

خادمہ:۔ (گھبراتی ہوئی) بادشاہ سلامت۔ دربان نے خبر دی ہے کہ محلات کے دروازے پر ایک عجیب فقیر شہنشاہ سے ملنا چاہتا ہے۔

(قارون کے ہاتھ سے شمشیر چھوٹ جاتی ہے۔ وہ باہر چلا جاتا ہے۔ اسی وقت ایک ملنگ فقیر داخل ہوتا ہے)۔

فقیر:۔ (مسکرا کر بے پروائی سے) بادشاہ قارون!

قارون:۔ (غصے میں کانپ کر) تم شہنشاہ کے آگے کھڑے ہو۔ جانتے ہو۔

فقیر:۔ (مسند پر بیٹھ کر) جانتا ہوں۔ قارون!

قارون:۔ میں نصف دنیا کا شہنشاہ ہوں!

فقیر:۔ (طنزاً) نصف دنیا؟ ہاہاہا . . . . . اور میں دنیا و عقبیٰ دونوں کا شہنشاہ ہوں۔ لاؤ دو خیرات۔ دیر مت کرو۔ وہ دیکھو طوفان اٹھتا ہے۔ بجلیاں کوند رہی ہیں۔

(قارون اٹھ کر جھروکے سے دیکھتا ہے۔ باہر طوفان اٹھا ہوا ہے۔ بادل گرج رہے ہیں۔)

فقیر:۔ قارون۔ مجھے خیرات دو۔ دیر ہو رہی ہے۔

قارون:۔ خیرات؟ شہنشاہ اور خیرات؟

فقیر:۔ ہاں۔ جلد کرو۔ دیر مت لگاؤ۔ کہاں ہیں تمہارے خزانوں کی چابیاں؟

قارون:۔ میں الظوفی کے سوا کسی کو خیرات نہیں دیتا۔

فقیر:۔ (رک رک کر) الظوفی کے سوا۔ تم اسے پہچان سکو گے؟

قارون:۔ ہاں۔ وہ میرا محافظ ہے۔

فقیر:۔ محافظ۔ تم جیسے شہنشاہ کا۔ جس کا دین و ایمان سیم و زر ہے۔ لاؤ دو چابیاں . . . . . .

قارون:۔ (غصے میں) ایسا نہیں ہوگا فقیر۔ تم میرے محلات سے نکل جاؤ۔

فقیر قارون کو دیکھ کر باہر چلا جاتا ہے۔ قارون جھروکے سے دیکھ رہا ہے۔ خزانے مسمار ہو کر پانی میں غرق ہو رہے ہیں۔ وہ جلد جلد چابیاں لے کر باہر نکلتا ہے تاکہ آخری وقت خیرات دے سکے۔

لیکن محلات کے دروازے پر وہی فقیر گاتا ہوا نظر آتا ہے ؎

ہو گیا جو ہونا تھا اب تم کیوں پچھتاؤ
جاؤ ملو وحدت میں اس کی، ہیکے ہی گن گاؤ

قارون:۔ (اسے پہچانتے ہوئے) الظوفی۔ میرے محافظ میرے خزانوں کو بچاؤ۔ میری ملکہ نے برا خواب دیکھا ہے۔

الظوفی:۔ (مسکرا کر) بادشاہ قارون۔ نصف دنیا کا شہنشاہ! جو خیرات نہیں دیتا۔

فقیر اٹھ کر چلا جاتا ہے۔ تاریکی اور طوفان میں وہ کھو جاتا ہے۔ قارون چابیاں ہاتھ میں لے کر اس کے پیچھے بھاگتا جاتا ہے اور کہتا ہے۔ "الظوفی۔ لے و خیرات لے لو چابیاں۔"

روئق کاشمیری

بکھرے ہوئے پھول

زندگی کو لوگ خواب سے تعبیر کرتے ہیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ زندگی، بیداری کا ایک ایسا ناتمام افسانہ ہے، جس کا عنوان بھی افسانہ نویس نے متعین نہیں کیا

خوشی نہ پھولوں کے جھرمٹ میں ملتی ہے اور نہ جگمگاتے ہوئے قمقموں کے آغوش میں، ہم نے باغیچوں اور سبزہ زاروں میں لوگوں کی آنکھوں کو اشک آلود دیکھا ہے۔ اور نغمہ و شباب کی محفلوں میں بھی آہ و فریاد کی صدائیں سُنی ہیں، مسرت صرف اطمینانِ قلب کا نام ہے۔ یہ ہو تو کانٹوں کے بستر پر بھی مسرت کا خواب دیکھ سکتے ہو، ورنہ خیال کی بے چینی تو پھولوں کی سیج کو بھی، کانٹوں کا بچھونا بنا دیتی ہے۔ خوش رہنا چاہتے ہو تو خیال پر قابو حاصل کرنے کی کوشش کرو ؞

کثرت کے ساتھ تصویر کھنچوانے والے خود پرست اور غرورِ حسن کے مریض ہوتے ہیں ؞

قدرت نے ہر چیز کو حسین پیدا کیا ہے۔ تتلی بھی حسین ہے اور بھونرا بھی حسین ہے، نقاش کو اپنے ہر نقش سے محبت ہوتی ہے، مگر دیکھنے والے تمام نقوش کو ایک ہی زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس میں نقاش کا نہیں، دیکھنے والوں کا قصور ہے ــــ دُنیا حسن کی حقیقت سے کسقدر بے خبر ہے۔

جذبۂ شہرت کا پہلا وار اخلاق پر پڑتا ہے۔ تم جتنا زیادہ مشہور ہونا چاہو گے، اتنا ہی اخلاق کی سرحد سے دُور ہوتے جاؤ گے ؞

شبنم کی بوندیں دامن کو نمناک بنا سکتی ہیں۔ مگر پیاس نہیں بجھا سکتیں ؞

عورت کی محبّت، مرد کی محبّت کے مقابلہ میں بہت زیادہ پائدار ہوتی ہے۔ مرد صرف ایک جھلک دیکھ کر پکار اُٹھتا ہے :۔

"بہ خالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را"

عورت طویل نظارے کے بعد بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلتی، عورت کا دل محبت کا خاموش سمندر ہے۔ لیکن جب اس میں تلاطم پیدا ہوتا ہے۔ تو ہمالیہ کی چوٹیاں بھی زیرِ آب ہو جاتی ہیں ؞

پیانو بجانیوالی اُنگلیوں کو دیکھو گے، تو سامعہ نغمہ سے پورے طور پر لطف اندوز نہ ہو سکیگا۔ ایک ہی وقت میں تمام قوتوں سے لُطف حاصل کرنا چاہو گے، تو تمام قوتیں تشنۂ لذت اور تمام کیفیتیں ادھوری رہ جائیں گی ؞

جب زبان اور دِل ایک نہیں ہوتے، بڑی سے بڑی تقریر بے تاثیر ثابت ہوتی ہے، ہر مقرر کہتا ہے کہ میری ہر بات دل کی گہرائیوں سے نکل رہی ہے۔ اور اِس میں خونِ جگر کی بوندیں شامل ہیں۔ نیز بہت کم باتوں کا لوگوں پر اثر ہوتا ہے۔ قصور سُننے والوں کا نہیں، خونِ جگر کی بُوندوں (؟) کا ہے۔

جو لوگ تاج محل کے صرف پتھروں کا، محرابوں اور نقش و نگار کا مطالعہ کرتے ہیں۔ وہ شاہجہاں کے جذبۂ محبت کی توہین کرتے ہیں۔ دن میں کتنی مرتبہ سیاحوں کی نظریں، شاہجہاں کی رُوح کو کپکپانے پر مجبور کرتی ہوں گی! آرٹ (Art) کے پُوجنے والی دُنیا! محبت پر رحم کر!

بچّہ کے استفسارات پر ناراض ہو گے تو اُس کی قوتِ دریافت مجروح ہو جائے گی ؞

انقلاب باہر سے نہیں آتا۔ قوم و ملک کے اندر ہی پیدا ہوتا ہے۔ باہر کے انقلاب کو دعوت دو گے۔ تو تمہاری مظلومیت میں کمی نہ ہوگی۔ کچھ اضافہ ہو جائیگا ؎

غلامی کی دستاویز قبول کرنے کے یہ معنی ہیں کہ تم نے اپنے قتل نامہ پر دستخط کر دیئے ؎

جو سفر صرف تفریح کے لئے کیا جاتا ہے۔ وہ ہوا کی موج کی مانند ہے۔ کہ آیا اور گزر گیا۔ سفر یہ سمجھ کر کرو۔ کہ کائنات کا ہر ذرہ قدرت کا ایک صحیفہ ہے۔ ان صحیفوں کو دل کی نگاہ سے پڑھو ؎

بہت سے لوگوں کی کلائیوں پر قیمتی گھڑیاں بندھی ہوتی ہیں۔ مگر وہ وقت کی پابندی نہیں کرتے ؎

تمدن کی غلامی سب سے بڑی غلامی ہے۔ یہ مختلف قسم کے لباس آرائش و زینت کے اسباب۔ کھانے کے طریقے اور آداب سب کے سب غلامی کے آثار و علائم ہیں۔ فطرت آزاد تکلفات سے پاک ہوتی ہے ؎

ایک دوست نے اپنی پریشاں حالی کا مجھے خط لکھا۔ میں نے اُس کا جواب دیا:۔

"تم ناامیدی کے بیابان میں بیٹھے ہوئے ہو۔ اور میں تمنا کے ۔"

"آبشاروں میں ہوں۔ اور لب تر نہیں کر سکتا۔"

"انصاف سے کہو کس کی حالت دردناک ہے ؟"

دُنیا کی کوئی چیز دوشیزگی کی قیمت نہیں ہو سکتی ۔

جب کوئی میرے جسم پر عطر ملتا ہے۔ تو سوچتا ہوں۔ کہ کتنے پھولوں کا خون کرنے کے بعد یہ چند بُوندیں مہیا ہوئی ہونگی ۔

مَوجِ نسیم نہ بن سکو۔ تو کم سے کم قطرۂ شبنم بن جاؤ۔ جس سے تھوڑی دیر کے لئے پھُول کی شادابی تو ہو جاتی ہے ؎

ماہر القادری

قطعات

کام دنیا کا کوئی مشکل نہیں — دل ہی محنت کی طرف مائل نہیں
پا سے ہمت چاہیئے اے راہرو — دوریٔ منزل کے ہم قائل نہیں

نیاز مند کسے، کس کو بے نیاز کہوں — کہوں میں غزنوی کس کو، کسے ایاز کہوں
ہر ایک درد کی شدت سے ہی یہاں بیتاب — جہاں مریض ہوں سب، کس کو چارہ ساز کہوں

احسان اللہ خاں مضطر

میر انیس

میر انیس پر اُردو زبان جتنا بھی ناز کرے کم ہے۔ اُن کا نام اُس وقت تک زندہ رہے گا۔ جب تک کہ سُورج۔ چاند اور ستارے اپنی ضیا پاشیوں سے زمین کو فیضیاب کرتے رہیں گے۔ جس طرح اسلام تا قیامت حضرت سید الشہدا کا احسانمند رہے گا۔ اِسی طرح اُردو ادب ہمیشہ کے لئے میر مرحوم کا شکر گزار رہے گا۔ انہوں نے اردو کو وُہ وقعت بخشی کہ فارسی ادب کے مقابل لا کھڑا کیا۔ خود فرماتے ہیں ۔

سبک ہو چلی تھی ترازوئے شعر * مگر ہم نے پلہ گراں کر دیا
میرا شکر کر اے زمینِ سخن * تجھے بات میں آسماں کر دیا

آپ کا نام ببر علی تھا اور انیسؔ تخلص۔ فیض آباد میں اغلباً ۱۲۱۶ میں پیدا ہُوئے۔ شاعری آپ کو ورثہ میں ملی تھی۔ چنانچہ فخریہ کہا کرتے تھے۔

پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں
عمر گزری ہے اس دشت کی سیاحی میں

پردادا کا نام میر ضاحک تھا۔ جو نہایت خوشگو شاعر تھے۔ دادا میر حسن دہلوی تھے۔ جنہوں نے مثنوی سحر البیان لکھ کر نام پیدا کیا۔ آپ میر مستحسن خلیق کے بیٹے تھے۔ اور مرثیہ گوئی کا فن انہی سے سیکھا تھا۔ مگر آپ کی شہرت سب سے پہلے ایک غزلگو کی حیثیت سے شروع ہوئی تھی پہلی ہی غزل پر دھوم مچ گئی۔ لیکن باپ نے بلا کر کہا "بیٹا! بس اس پہلی غزل کو آخری سمجھو اور اپنی علمی استعداد اور لیاقت کو اس شغل میں صرف کرو۔ جو سرمایۂ دین ہے۔ اور تمہارے آبا و اجداد کا پیشہ ہے۔" چنانچہ اس دن کے بعد آپ نے غزل کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہا اور مرثیہ گوئی میں منہمک ہو گئے۔ مولٰنا آزاد لکھتے ہیں۔ "دُنیا کو ترک کرکے دین کے دائرہ میں آ گئے۔ نیک نیتی کی برکت نے اسی میں دین بھی دیا اور دُنیا بھی۔" جو کچھ لکھتے اُس کی اصلاح والد سے لے لیتے تھے۔ مرزا دبیر سے آپ کی لگتی تھی۔ اِس لئے کوشش یہ تھی کہ۔ اپنے حریف کو اس میدان میں نیچا دکھا دیں چنانچہ رات دن یہی شغل رہتا۔ روز بروز اُن کی زبان صاف۔ اور شستہ ہوتی گئی۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں لکھنؤ میں جو اُن دنوں شیعیت کا مرکز تھا۔ اُن کی شاعری کا خوب چرچا ہو گیا۔ عرصہ تک ساکنان لکھنؤ اُن کے کلام بلاغت نظام سے محظوظ ہوتے رہے۔ ۱۸۵۹ء میں نواب قاسم علی خان نے عظیم آباد بلا بھیجا۔ بارہ برس تک وہیں قیام پذیر رہے اور ۱۸۷۱ء میں نواب تہور جنگ بہادر کی طلب پر حیدر آباد تشریف لے گئے۔ بڑی قدر ہوئی۔ مکان پر ہر وقت ملاقاتیوں کا ہجوم رہتا تھا۔ آخر کئی سال وہاں بسر کرکے واپس وطن کا رُخ کیا۔ اور تھوڑے ہی عرصہ بعد ۲۹ شوال ۱۲۹۹ھ کو جمعہ کے روز داعی اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اب مرثیہ گوئی کا بازار یک لخت سرد پڑ گیا۔

ارباب دانش جانتے ہیں کہ اُردو شاعروں میں انیسؔ کا کیا مرتبہ ہے؟ اور جو کچھ انہوں نے لکھا ہے وُہ کس قدر قیمتی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ملک کے بہت سے فرزندوں نے ایسے عظیم الشان شاعر کی بھی وُہ قدر نہ کی جو ہونا چاہئے تھی۔ مختلف اعتراض کئے گئے ہیں۔ جو بالکل بے جا اور غیر مناسب ہیں۔ بقول سید وصی رضا "اگر خوش قسمتی سے یورپ کے کسی خطہ کو اُن کا وطن ہونے کا شرف حاصل ہوتا۔ تو آج لوگ اُن کے ایک ایک بند پر وجد کرتے۔ اُن کے کلام پر سر دھنتے۔ اور دُوسروں سے اُن کے ادبی معجزات کا اعتراف سُن کر جامے میں پھولے نہ سماتے۔ مگر بدقسمتی سے وُہ ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ ان کی شہرت بھی ہندوستان سے باہر نہ پھیل سکی اور وُہ اِس عالمگیر شہرت سے محروم رہے۔ جس کا فخر ہومر اور شیکسپیئر کو حاصل ہوا۔ اگر غور کیا جائے تو اُن کے مراثی اسی عالمگیر قدر و منزلت کے مستحق ہیں۔ جو گیٹے کی فاوسٹ یا ملٹن کی پیراڈائیز لاسٹ کے حصہ میں آئی۔ یہی نہیں بلکہ اُن کے لگائے ہوئے باغ پر اعتراضات کی اوس اُن کی ریاضت کو خاک میں ملا رہی ہے۔ ہم مانتے ہیں انیس سے مقتضائے بشریت لغزشیں اور غلطیاں کیں اور ضرور کیں مگر اس سے اُن کے کمال شاعری کا اعتراف نہ کرنا ظلم ہے"۔ صاحب نقد الادب لکھتے ہیں :- "انیس نے

لاکھوں شعر کہہ ڈالے اور اگر ان میں سے بعض میں کچھ خامیاں رہ گئیں تو اس سے ان کے کمال پر حرف نہیں آ سکتا۔" بحیثیت مجموعی اس میں کوئی شک نہیں کہ وُہ اُردو کے بے نظیر اور عدیم المثال شاعر۔ فصاحت بلاغت کا اُن پر خاتمہ ہو گیا تھا۔ انہیں نفسیات انسانی سے پوری پوری واقفیت تھی۔ اور جذبات کو الفاظ کا جامہ کچھ اس طرح سے پہناتے تھے کہ "سُنتے ہی درد لہو بن کر آنکھوں سے ٹپکتا تھا۔ دلوں پر چوٹ لگتی اور شدید جذبہ طاری ہو جاتا تھا" مثلاً جب حضرت قاسم میدان جنگ کو روانہ ہوتے ہیں۔ اور نئی نویلی دلہن کو مایوسیوں کے سیاہ بادل ہر طرف سے گھیر لیتے ہیں۔ تو میر انیسؔ رخصت کے اس جانگداز واقعہ کو اسی طرح نظم کرتے ہیں۔ ؎

دولہا کو اتنی بات سُنا کر اک آہ کی
صورت بتاتے جاؤ ہمارے نباہ کی

یہاں لفظ "آہ" جذبات کی کس قدر ترجمانی کر رہا ہے۔ شدتِ جذبات ہونٹوں پر قفل لگا دیتی ہے۔ اور دردِ دل کا اظہار بہت کم الفاظ میں ہو سکتا ہے ؛

آپ کے پاس الفاظ کا ایک ذخیرہ تھا کہ کبھی ختم ہونے میں نہ آتا۔ ایک ہی مضمون کو کئی طرح ادا کیا۔ اور ہر دفعہ پہلے سے بہتر۔ خود فرماتے ہیں۔

گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اک پھول کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھوں

گل رعنا کا مصنف لکھتا ہے: "بیان کرنے کے لئے نئے نئے اسلوب اُردو شاعری میں بکثرت پیدا کر دیئے۔ واقعہ کو سو سو طرح سے بیان کر کے قوتِ متخیلہ کی جولانیوں کے لئے ایک نیا میدان صاف کر دیا۔ اُردو زبان کا ایک بڑا حصہ جس کو شاعروں کے قلم نے چھوا تک نہ تھا۔ شعرا سے روشناس کرایا۔"

مولانا حالی فرماتے ہیں۔ "اُردو شاعری میں جو بند پانی کی طرح سے بے حس و حرکت پڑی تھی۔ تموّج بلکہ تلاطم پیدا کر دیا۔" خمخانہ جاوید کے مؤلف لالہ سری رام دہلوی اس طرح اظہار رائے فرماتے ہیں :۔

"انیسؔ نے اپنے قادر الکلام طبع کے زور سے ایجاد مضامین کے دریا بہا دیئے۔ اور ایک محدود اور مذہبی مضمون کو سینکڑوں نئے دلنشین رنگوں میں اس خوبی سے ادا کیا کہ مرثیہ گوئی کو ایک مستقل فن بنا دیا۔ رزم۔ بزم، صبح، شام غرض جس چیز کو لیا اُسے کمال کو پہنچا دیا۔"

یہاں منشی امیر احمد صاحب بی۔ اے کا ارشاد بھی خالی از دلچسپی نہیں ہو گا۔

"چند ماہران فن نے اس صنف (مرثیہ گوئی) میں وُہ وُہ صناعیاں اور نازک خیالیاں صرف کیں اور اپنے زورِ طبع سے شستگئ زبان اور لطافت بیان کے ساتھ ساتھ تشبیہوں اور استعاروں کے وُہ ناپیدا کنار دریا بہا دیئے۔ کہ یورپ اور ایشیا کے کل شاعروں نے ازمنۂ مظلمہ کے انتہائی کناروں سے اس وقت تک میدانِ جنگ کی پرشور و ہیبت انگیز تصویر دکھاتے یا قتل و خونریزی کا قیامت خیز نمونہ پیش کرنے یا شجاعت و جوانمردی، سفاکی و بے رحمی کا نقشہ اُتارنے میں برسوں خونِ جگر پی کر جو کچھ رطب و یابس لکھا تھا۔ انہوں نے چند سال میں گرد اباد کر کے ایک طرف تو فردوسی اور نظامی کا بازار سرد کر دیا۔ اور دوسری جانب ہومر اور ملٹن کو صرف اپنے منہ میاں مٹھو بننے کے قابل بنا دیا۔"

اس بارے میں مولانا آزاد مرحوم کا قول بھی قابل ذکر ہے۔

"سکندر نامہ جس کی تعریف میں لوگوں کے لب خشک ہیں۔ اس میں صرف چند میدانِ جنگ ہیں۔ اسی طرح بزم کی بھی چند ہی تمہیدیں ہیں اسی طرح شاہنامہ جو فردوسی کی عمر بھر کی کمائی ہے۔ اس میں بھی رزم و بزم کا حصہ تھوڑا سا ہے۔ لیکن انیسؔ و دبیر کی طرف دیکھو۔ انہوں نے ایجاد مضامین کے دریا بہا دیئے۔ ایک مقرری مضمون کو سینکڑوں رنگ سے ادا کیا۔ ہر مرثیہ کا چہرہ نیا۔ آمد نئی۔ رزم جدا۔ بزم جدا۔ ہر میدان میں مضمون اچھوتا۔ تلوار نئی۔ نیزہ نیا۔ گھوڑا نیا۔ انداز نیا۔ مقابلہ نیا۔ اور اسی پر کیا منحصر ہے۔ صبح کا عالم دیکھو۔ تو سبحان اللہ۔ رات کی رخصت سیاہی کا پھٹنا۔ آفتاب کا طلوع۔ مرغزار کی بہار۔ شام ہے تو شام غریباں کی اُداسی۔ غرض جس حالت کو لیا ہے۔ فوٹو کھینچ کر رکھ دیا ہے؛

گر رزم پر خامہ فرسائی کی ہے۔ تو لڑائی کی تیاری۔ جنگ کا زور شور۔ تیغوں اور تلواروں کی جھنکار۔ نقاروں کی گونج۔ گھوڑوں کی تیزی و تندی اور بہادروں کی رجز خوانی وغیرہ کے بیان میں وہ کمال دکھایا ہے کہ جنگ کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انیس ابھی ابھی وہ واقعہ دیکھ کر آئے ہیں۔ اور ہم سے بیان فرما رہے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں :۔

گر بزم کی جانب ہو توجہ دم تحریر
کھچ جائے ابھی گلشن فردوس کی تصویر
دیکھے نہ کبھی صحبت انجم فلک پیر

ہو جائے ہوا بزم سلیماں کی بھی توقیر
یوں تختِ حسینانِ معانی اُتر آئے
ہر چشم کو پریوں کا اکھاڑا نظر آئے
آؤں طرف رزم ابھی چھوڑ کے جب بزم
خیبر کی خبر لائے میری طبع اولوالعزم
قطع سر اعدا کا ارادہ ہو جو بالجزم
دکھلائے یہیں سب کو زباں معرکۂ رزم
جل جائیں عدو آگ بھڑکتی نظر آئے
تلوار پہ تلوار چمکتی نظر آئے

ذیل میں گھوڑے کی تعریف میں لکھا ہے۔ کیا پُر زور الفاظ استعمال کئے ہیں۔

پھرتا تھا کیا صفوں میں فرس جھوم جھوم کے
سرعت بلائیں لیتی تھی مُنہ چوم چوم کے
پامال تھے پرے سپہ شام و روم کے
غُل تھا یہ غول میں پسرِ سعد شوم کے
رخش ایسا روم و رے میں نہیں شام میں نہیں
یہ شوخیاں تو ابلقِ ایام میں نہیں
وہ جست و خیز و سرعت و چالاکی سمند
ہانپے میں تھے ڈھلے ہوئے سب اس کے جوڑ بند
سم قرصِ ماہتاب سے روشن ہزار چند
نازک مزاج و شوخ و سیہ چشم ارجمند
گرد اُڑ گئی ہوا سے ذرا باگ اُڑ گیا
پُتلی سوار کی نہ پھری تھی کہ مڑ گیا
بجلی کبھی بنا کبھی راہوار بن گیا
آیا عرق تو ابر گہربار بن گیا
گر قطب گاہ گنبد دوار بن گیا
نقطہ کبھی بنا کبھی پرکار بن گیا
حیراں تھے اس کی گشت پہ لوگ اس ہجوم کے
تھوڑی سی جا میں پھرتا تھا کیا جھوم جھوم کے

جب اُن کا قلم اظہار آلام و مصائب کے لئے اُٹھتا ہے۔ تو دل اہل جاتا ہے کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔ یہاں امام پاک کی بے کسی، تنہائی اور مایوسی کا عالم ملاحظہ ہو۔ پڑھتے ہی بے اختیار آنسوؤں کے چشمے اُبل پڑتے ہیں۔ جگر پاش پاش ہو جاتا ہے۔

آج شبیر پہ کیا عالمِ تنہائی ہے
ظلم کی چاند پہ زہرا کے گھٹا چھائی ہے
اُس طرف لشکرِ اعدا میں صف آرائی ہے
یاں نہ بیٹا نہ بھتیجا نہ کوئی بھائی ہے
برچھیاں کھاتے چلے جاتے ہیں تلواروں میں
مار لو پیاسے کو ہے شور ستمگاروں میں
برچھی آکر کوئی پہلو میں لگا جاتا ہے
مارتا ہے کوئی نیزہ تو غش آجاتا ہے
بڑھتے ہیں زخم بدن زور گھٹا جاتا ہے
بند آنکھیں ہیں سر ایک جھکا جاتا ہے
گرد زہرا و علیؑ گریہ کناں پھرتے ہیں
غُل ہے گھوڑے سے امامِ دوجہاں گرتے ہیں
زیں سے ہوتا ہے جدا دوشِ محمد کا مکیں
چمنِ فاطمہ کا سرو ہے مائل بہ زمیں
برچھیاں گرد ہیں اور بیچ میں ہے سرورِ دیں
ہے یہ نزدیک گرے مُہرِ نبوت کا نگیں
پاؤں ہر بار رکابوں سے نکل جاتے ہیں
یا علیؑ کہتی ہے زینب تو سنبھل جاتے ہیں
لاکھ شمشیریں ہیں اور ایک تنِ اطہر ہے
ایک مظلوم ہے اور ظالموں کا لشکر ہے
سینکڑوں خنجر فولاد ہیں اور اک سر ہے
نہ کوئی یار نہ ہمدم نہ کوئی یاور ہے
باگ گھوڑے کی لٹکتی ہے اُٹھا سکتے نہیں
سامنے اہلِ حرم روتے ہیں جا سکتے نہیں
کہتے ہیں ظالموں سے خشک زباں دکھلا کر
بہرِ حق پانی کا اک جام پلا دو لا کر
اہلِ کیں کہتے ہیں یہ تیغِ ستم چمکا کر
آبِ شمشیر پیو برچھیوں کے پھل کھا کر
یہ سخن سُن کے بھی غصہ نہیں فرماتے تھے
یاس سے سوئے فلک دیکھ کے رہ جاتے تھے

عرض کرتے ہیں یہ خالق سے کہ اے ربِ غفور
تُو ہے عالم کہ نہیں کچھ ترے بندے کا قصور
کرتے ہیں یہ مجھے بے جرم دخطا تیغوں سے چُور
ہاتھ اُمت پہ اُٹھانا نہیں مجھ کو منظور
جانتے ہیں کہ محمدؐ کا نواسہ ہُوں میں
پانی دیتے نہیں دو روز کا پیاسہ ہُوں میں

اس کے علاوہ مناظرِ قدرت کی تصویر کھینچنے میں وہ خاص مہارت رکھتے تھے۔ اور اس صنف میں اُنہیں دُنیا بھر میں درجۂ امتیاز حاصل ہے۔ ان کے صبح و شام کے رنگین مناظر کی تصویروں سے ہمارا نگارخانۂ ادب سجا ہُوا ہے۔ صبح کا سماں ملاخطہ ہو۔

پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زارِ صبح
گلزارِ شب خزاں ہوئی آئی بہارِ صبح
کرنے لگا فلک زرِ انجم نثارِ صبح
سرگرم ذکرِ حق ہوئے طاعت گزارِ صبح
تھا چرخ اخضری پہ یہ رنگ آفتاب کا
کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا

چلنا وہ بادِ صبح کے جھونکوں کا دم بدم
مُرغانِ باغ کی وہ خوش الحانیاں بہم
وہ آب و تابِ نہر وہ موجوں کا پیچ و خم
سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم
کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہُوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہُوا

وہ نورِ صبح اور وہ صحرا وہ سبزہ زار
تھے طائروں کے غول درختوں پہ بے شمار
چلنا نسیمِ صبح کا رہ رہ کے بار بار
کُوکُو وہ قمریوں کی وہ طاؤس کی پکار
وا تھے دریچے باغِ بہشتِ نعیم کے
ہر سُو رواں تھے دشت میں جھونکے نسیم کے

آمد وہ آفتاب کی وہ صبح کا سماں
تھا جس کی ضَو سے وجد میں طاؤسِ آسماں
ذروں کی روشنی پہ ستاروں کا تھا گماں
نہرِ فرات بیچ میں تھی مثلِ کہکشاں
ہر نخل پر ضیائے سرِ کوہِ طور تھی
گویا فلک سے بارشِ بارانِ نور تھی

وہ پھولنا شفق کا وہ مینائے لاجورد
مخمل سی وہ گیاہ وہ گُل سبز و سُرخ و زرد
رکھتی تھی پھونک کر قدم اپنا ہوائے سرد
یہ خوف تھا کہ دامنِ گُل پر پڑے نہ گرد
دھوتا تھا دل کے داغ چمن لالہ زار کا
سردی جگر کو دیتا تھا سبزہ کچھار کا

مزید برآں وہ ایک اعلیٰ ناصح بھی تھے۔ وہ دُنیائے دُوں سے نفرت و حقارت کی پُر زور تلقین فرماتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

اس منزلِ فانی میں نہ دل اپنا لگاؤ
اُلفت نہ کرو اس سے چلے چھوڑ کے جاؤ
یہ عاریتی جا ہے نہ گھر اپنا بناؤ
باشندئے دُنیا سے بس اب ہاتھ اُٹھاؤ
چلتے ہوئے ہرگز کوئی کام آ نہ سکیگا
ہمراہ کچھ اسباب وہاں جا نہ سکیگا

اس زیست پہ بھُولو نہ اجل کو بھی کرو یاد
گھر سینکڑوں یاں سیلِ فنا نے کیئے برباد
دُنیا میں عمارت نہ بنا کر ہو کوئی شاد
اس قالبِ خاکی کی عجب سُست ہے بُنیاد
کل اوج پہ جو لوگ تھے وہ زیرِ زمیں ہیں
ہے خاک کا ڈھیر اب نہ مکاں ہیں نہ مکیں ہیں

کس کس گُلِ رنگیں کی نہ اس باغ میں تھی دھوم
اِک آن میں شبنم کی طرح ہو گئے معدوم
دِکھلا رہی ہے رنگ عجب ہستیٔ موہوم
کیا قصد ہے گلچینِ اجل کا نہیں معلوم
اس باغ میں جس سرو کو دیکھا تو رواں ہے
جس گُل پہ بہار آج ہے کل اس پہ خزاں ہے

اُن کی رُباعیاں اردو زبان کا گراں قدر سرمایہ ہیں۔ اُن میں سے اکثر ضرب الامثال بن کر زبان زدِ خلائق ہو کر رہ گئیں۔ چنا

رباعیاں بمصداق "مُشتے نمونہ از خروارے" لکھ دی جاتی ہیں۔

۱۔ نمود و بود کو عاقل حباب سمجھے ہیں
وہ جاگتے ہیں جو دُنیا کو خواب سمجھے ہیں
ارے نہ آئیو دُنیائے دُوں کے دھوکے میں
سراب ہے یہ جسے موجِ آب سمجھے ہیں

۲۔ نافہم سے کب دادِ سخن لیتا ہوں
دشمن ہو کر دوست سب کی سُن لیتا ہوں
چھُپتی نہیں بوئے دوستانِ یکرنگ
کانٹوں کو ہٹا کے پھُول چُن لیتا ہوں

۳۔ کس مُنہ سے کہوں لائقِ تحسیں ہوں میں
کیا لطف جو گل کہے کہ رنگیں ہوں میں
ہوتی ہے حلاوتِ سخن خود ظاہر
کہتی ہے کہیں شکر کہ شیریں ہوں میں

۴۔ افسوس جہاں سے دوست کیا کیا نہ گئے
اِس باغ سے کیا کیا گلِ رعنا نہ گئے
تھا کونسا نخل ایسا جو مُرجھا نہ گیا
وہ کون سے پھُول تھے جو مُرجھا نہ گئے

۵۔ یہ اوج یہ مرتبے ہُما کو نہ ملے
یہ دلقِ مرقع امرا کو نہ ملے
بخشی ہے خدا نے ہم کو وہ دولتِ فقر
برسوں ڈھونڈے تو بادشہ کو نہ ملے

۶۔ عزت رہے یار و آشنا کے آگے
محجوب نہ ہوں شاہ و گدا کے آگے
یہ پاؤں چلیں تو راہِ مولا میں چلیں
یہ ہاتھ اُٹھیں جب تو خدا کے آگے

۷۔ دُنیا جسے کہتے ہیں بلا خانہ ہے
پامال ہے جو عاقل و فرزانہ ہے
مابین زمین و آسماں یوں ہم ہیں
جیسے دو آسیا میں اک دانہ ہے

۸۔ اب گرم خبر موت کے آنے کی ہے
ناداں تجھے فکر آب و دانے کی ہے
ہستی کے لئے ضرور اک دن ہے فنا
آنا ترا دلیل جانے کی ہے

۹۔ مال و زر و افسر و حشم ملتا ہے
ممکن ہے نگیں، طبل و عَلم ملتا ہے
عنقا۔ گوگرد سُرخ۔ پارس۔ اکسیر
یہ سب ملتے ہیں دوست کم ملتا ہے

۱۰۔ جو شے ہے فنا اُسے بقا سمجھا ہے
جو چیز ہے کم اُسے سوا سمجھا ہے
ہے بحرِ جہاں میں عمر مانندِ حُباب
غافل اس زندگی کو کیا سمجھا ہے

۱۱۔ کیا کیا دُنیا سے صاحبِ مال گئے
دولت نہ گئی ساتھ نہ اطفال گئے
پہنچا کے لحد تک پھر آئے سب لوگ
ہمراہ اگر گئے تو اعمال گئے

۱۲۔ گر لاکھ برس جئے تو پھر مرنا ہے
پیمانۂ عُمر ایک دن بھرنا ہے
ہاں توشۂ آخرت مہیّا کر لے
غافل تجھے دُنیا سے سفر کرنا ہے

باقر جعفری

افکارِ تازہ

یہ کس کے دل کی کہانی سُنائی جاتی ہے　　وہ کہہ رہے ہیں مجھے نیند آئی جاتی ہے
نگاہِ شوق پہ حسرت سی چھائی جاتی ہے　　اِس احتیاط سے چلمن اُٹھائی جاتی ہے

مانا مقامِ عشرتِ ہستی بلند ہے　　میں دل کو کیا کروں کہ اسے ناپسند ہے
آنکھوں میں آچکی ہے محبّت کی واردات　　طوفانِ بےپناہ پیالوں میں بند ہے

نگاہِ شوق سے کیا بچ سکوگے　　کیا بھی تم نے تو پردہ کیا کیا
مجھی کو گھور کر محفل میں دیکھا　　بجز میرے وہاں کوئی نہ تھا کیا

"ساقی"

یہ وصال و ہجر کی بحث کیا کہ عجیب چیز ہے عشق بھی　　تجھے پا کے ہے وہی دردِ دل وہی تنگِ زخمِ جگر بھی ہے
ترے کیفِ حسن کی جان ہے مری بیدلی و فسردگی　　جسے کہتے ہیں غمِ رائگاں وہ لئے ہوئے کچھ اثر بھی ہے
نہ رہا حیات کی منزلوں میں وہ فرقِ نازو نیاز بھی　　کہ جہاں ہے عشقِ برہنہ پا وہیں حسن خاک بسر بھی ہے

"زمانہ"

دم بخود اُٹھنے لگے پردے حریمِ ناز کے　　اور کیا اِس سے زیادہ چشمِ حیراں چاہیئے
ہاں بتا تو ہی مجھے کچھ اے شکیبِ ناتواں　　تاکجا ضبطِ جنونِ فتنہ ساماں چاہیئے

"ندیم"

وہ تو کب ملتے ہیں، لیکن آپ کھو جاتا ہوں میں　　بس اسی منزل میں کچھ تسکین سی پاتا ہوں میں
اپنے دل کو دے رہا ہوں آپ ہی کیا کیا فریب　　آہ اس بیکس کو کس کس طرح بہکاتا ہوں میں
مجھ سا بےتاب و تواں اور امتحانِ عاشقی　　ذکر بھی کرتے ہوئے اب اسکا تھراتا ہوں میں

"جامعہ"

ہاں مرگ و حیات کے سمجھتا ہوں میں راز　　آغاز انجام ہے تو انجام آغاز
دنیا ہے زمانہ جب اجل کی دھمکی　　دِل سے آتی ہے قہقہوں کی آواز

میں ڈوب کے غرقِ سرگرانی نہ رہا　　کیا لہر اُٹھے بحر میں پانی نہ رہا
سمجھا جو حیات کو تو بخشی گئی موت　　جب موت عطا ہوئی تو فانی نہ رہا

"کلیم"

مختار

قومیت کی تعمیر میں سائنس کی اہمیت

سائنس نام ہے کائنات کے باضابطہ مطالعہ اور قدرت کی تمام چیزوں کے باقاعدہ علم کا چنانچہ سائنس کی مختلف شاخیں عالم وجود کی مختلف اشیاء کا مطالعہ کرتی ہیں۔ اگر طبیعیات میں مختلف قسم کے طبعی تغیرات اور قوتوں کا مطالعہ کر کے مختلف اصول قائم کئے جاتے ہیں اور اُن کی مدد سے مشینیں تیار کی جاتی ہیں۔ تو کیمیا میں مختلف مادوں کی خاصیتوں کا مطالعہ کر کے عناصر اور ان کے مرکبات تیار کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح علم نباتات کا کام عالم نباتات کا مطالعہ اور علم الاجسام کا مقصد مختلف اجسام اور ان کی ساخت سے بحث کرنا ہے۔ غرضیکہ سائنس عالم فطرت کے ہر علم پر حاوی اور قدرت رکھتی ہے اور اس کا مقصد ان تمام چیزوں کی جو کائنات میں موجود ہیں ماہیت معلوم کرنا اور ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا ہے۔

تاریخ عالم کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ابتدائی انسان قدرت کے پوشیدہ خزانوں سے ناواقف تھا اور دنیا کی مختلف چیزوں کی ماہیت یا دوسرے الفاظ میں سائنس نہ جاننے کی وجہ سے مفلس، بیکار اور غیر متمدن تھا۔ لیکن جوں جوں لوگوں کا علم بڑھتا گیا۔ اسی طرح وہ زیادہ مرفہ الحال اور مہذب ہوتے گئے یہاں تک کہ آج دنیا میں سائنس کا دور دورہ ہے۔ اور انسان قدرت کی بہترین نعمتوں سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ ترقی کی اس منزل تک پہنچنے میں زمانہ مختلف دوروں سے گزرا اور ہر دور میں جو قوم زمانے کے مطابق ہوتی وہی دنیا کی سب سے افضل، ترقی یافتہ اور مہذب قوم ہوتی تھی۔ اور اسی کی سیادت دنیا پر تسلیم کی جاتی تھی۔ چنانچہ ایک زمانہ تھا جب قوت اور طاقت کی تمام عالم پر فرمانروائی تھی وہ دنیا کی سب سے مہذب اور ترقی یافتہ قومیں تھیں جو جسمانی اعلیٰ قوت کی مالک تھیں۔ لیکن زمانے نے کروٹ بدلی اور ترقی کا معیار قوت سے بدل کر علم و ہنر اور صناعی صلاحیت ہو گیا۔ چنانچہ اس عہد میں وہ قومیں صاحب اقتدار تھیں جو مختلف فنون اور علوم کی مالک تھیں انہیں کے ہاتھ میں دنیا کی تمام قیادت تھی اور وہ قومیں جو طاقتور تھیں ان کی مطیع اور ان کے اقتدار کا ذریعہ بن گئیں۔

زمانہ صرف اسی حالت پر قائم نہ رہا بلکہ اس نے تہذیب کا معیار پھر بدلا اور اس مرتبہ عنانِ قیادت ان قوموں کے ہاتھ میں آئی جو فطرت کے مطالعہ اور قدرت کے علم سے واقف تھیں۔ یعنی جن کی قومیت کی بنیاد علم سائنس پر تھی وہ دنیا کی سب سے زیادہ مہذب اور ترقی یافتہ قومیں مانی گئیں اور وہ قومیں جن کا سرمایہ صرف طاقت یا ادب تھا ان کی غلام اور مطیع ہو گئیں۔

زمانہ کے اس آخری انقلاب نے ایشیا کی قیادت اور تہذیب و تمدن کو ختم کر کے یورپ کو اقتدار بخشا اور مشرق جو اب تک تہذیب و تمدن کا مرکز اور علوم کا علمبردار تھا مغرب کے آگے جھک گیا۔ ایشیا اپنے قدرتی وسائل دولت یعنی اپنی زرخیزی کی وجہ سے مرفہ الحال تھا۔ اسی لئے تہذیب کا مرکز بھی تھا۔ اور یورپ اس حیثیت سے غریب تھا اور قدرتی وسائل دولت کی کمی کی وجہ سے مفلس اور غیر متمدن تھا۔ لیکن جب اہلِ یورپ نے سوچنا اور سمجھنا شروع کیا یعنی سائنس کو انہوں نے اپنی ترقی کا ذریعہ بنایا تو ان کی ویران اور بنجر زمینیں کیمیاوی کھادوں کی مدد سے سرسبز اور لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں تبدیل ہو گئیں۔ خوفناک اور تاریک جنگلات جو کل تک بالکل بے مصرف تھے۔ دنیا کی نعمتیں پیدا کرنے لگے۔ ان کا ہر پتہ اور تنکا بیش بہا دولت میں تبدیل ہو گیا۔ اونچائی سے گرنے والے پانی کے دھارے جو کل تک سیلاب اور مصیبت کا باعث تھے۔ آج قدرت کی بہترین نعمت یعنی بجلی جیسی قوت محرکہ پیدا کرنے لگے۔ کوئلے اور لوہے کی کانیں جو کل تک بیکار تھیں۔ ان سے آج دیو قامت مشینیں اور سونے کے مول بکنے والے اوزار بننے لگے۔ غرضیکہ یورپ جو ایشیا کے مقابلے میں کہیں زیادہ غریب اور بیکار تھا۔ سائنس کی ترقیوں کی بدولت نہ صرف انتہائی زرخیز اور دولت و تہذیب کا مرکز بن گیا۔ بلکہ طاقت اور علوم بھی انہیں کے قبضہ میں آ گئے۔ اور اہلِ ایشیا جو اب تک تہذیب اور دولت کے مرکز اور علوم کے مخزن تھے اور جو اپنے قدرتی وسائل دولت پر قانع ہونے کی وجہ سے سائنس سے زیادہ فائدہ نہ اٹھا سکے تھے۔ یورپ کے نہ صرف مطیع اور غلام بن گئے بلکہ

انہوں نے اپنے وسائل دولت کو بھی یورپ کی ترقی کا ذریعہ بنا دیا اور خود بالکل مفلس اور غلام ہو کر رہ گئے۔

کم و بیش یہی حالت ہمارے ہندوستان کی ہے جس نے اپنے قدرتی وسائل دولت پر قناعت کی تھی اور علوم جدیدہ سے زیادہ فائدہ نہ اٹھایا تھا ایک ترقی یافتہ اور علوم جدیدہ سے فیضیاب ہونے والی قوم کا غلام ہو گیا۔ آپ یقین مانیے کہ اگر تہذیب و تمدن اور ترقی کا معیار وہی رہتا جو کبھی سائنس کی ترقی سے قبل تھا۔ اور انگلستان و ہندوستان کی تجارت پر سخت پابندیاں عاید نہ ہوتیں اور اٹھارھویں صدی کے آخر میں سائنس کی ایجادیں وجود میں نہ آتیں تو یقیناً آج انگلستان ہندوستان کا کم از کم معاشی حیثیت سے ضرور غلام ہوتا۔ لیکن اٹھارھویں صدی کے آخر کی ایجادوں یعنی Arkwright کی Spinning-jenny کی James Hargreaves Samuel Crompton کی کاتنے کی مشینیں اس کے علاوہ Power loom اور Mule وغیرہ ایجادوں نے صورت ہی بدل دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جتنا مال ہندوستان سے انگلستان جاتا تھا اس سے کہیں زیادہ انگلستان سے بن کر ہندوستان آنے لگا۔ آخر ہندوستان کی گھریلو اور غیر سائنٹیفک صنعت انگلستان کی کثیر پیداوار (Mass Production) اور سائنٹیفک صنعت کے سامنے کس طرح چل سکتی تھی۔ بالآخر ہندوستان کو انگلستان کی ایجادوں کی وجہ سے غلام بننا پڑا۔ اس کے بعد جیمس واٹ کے دخانی انجن نے تو زمانہ کا رخ ہی بدل دیا جس کی وجہ سے انگلستان دنیا کا سب سے زیادہ دولتمند ملک اور تہذیب و تمدن کا مرکز بن گیا۔ دنیا کا ایک بڑا حصہ خصوصاً ہندوستان اور امریکہ اس صنعت کے لئے خام پیداوار مہیا کرنے لگے اور خود مفلس ہو گئے۔ ہندوستان کی تمام صنعت ایک قلیل مدت میں بالکل فنا ہو گئی اور ہندوستان و امریکہ کی خام پیداوار کوڑیوں کے مول انگلستان جانے اور مصنوعہ شکل میں آکر سونے کے مول بکنے لگیں۔ لیکن امریکہ نے زمانہ کے گُر کو سمجھ لیا اور اس نے اپنی قومیت کی بنیاد سائنس پر رکھ کر انگلستان سے آزادی حاصل کی اور آج وہ دنیا کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ، مہذب ملک ہے اور معاشی لحاظ سے تمام دنیا پر چھایا ہوا ہے۔

کیا ہندوستان امریکہ کی طرح عروج اور ترقی حاصل نہیں کر سکتا؟

یقیناً کر سکتا ہے۔ اس لئے کہ اس کے معاشی حالات امریکہ سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں۔ ہندوستان خام اشیاء اور بہت سی حیثیتوں سے ترقی کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ جدید ہندوستان کی تعمیر سائنس کی مستحکم بنیادوں پر رکھی جائے اور اس کو اصل اصول بنا کر قدرتی دولت کو خاطر خواہ استعمال کیا جائے اور قدرت کے عطیات کی صحیح معنوں میں قدر کی جائے۔ یہ کام کچھ مشکل نہیں بشرطیکہ ہم لوگوں میں ولولہ اور جوش ہو۔ آزادی کے لئے سچی تڑپ اور ترقی کی امنگ ہو۔ ہمارے سامنے نہ صرف امریکہ بلکہ جاپان کی مثال بھی ہے جس نے سائنس کو اپنا نصب العین بنا کر انتہائی عروج حاصل کیا ہے۔ جاپان ۱۸۶۹ء سے قبل صرف ایک زراعتی ملک تھا۔ جاپانیوں نے ترقی کے راز کو سمجھا اور ۱۸۷۲ء سے انہوں نے جدوجہد شروع کی۔ ابتدا میں انہوں نے کپڑے کی صرف چار ملیں سائنٹیفک اصولوں پر قائم کیں۔ اور لوگوں نے علوم سائنس کی طرف توجہ کی۔ حکومت نے غیر ممالک میں طلبا بھیجے جنہوں نے اپنی انتہائی کوششوں سے نہ صرف سائنس کو سیکھا بلکہ مختلف ممالک کے تجارتی راز بھی معلوم کئے۔ اور ان کی ایجادوں کو سمجھ کر اپنے ملک میں انہیں چیزوں کو تیار کیا اور اپنے حالات کے مطابق بہت سی نئی نئی چیزیں تیار کیں، سامان تیار کرنے کے سستے طریقے نکالے۔ اور ایک قلیل مدت میں انہوں نے ایسی ترقی حاصل کی کہ اس کا شمار آج صف اول کی قوموں میں ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر ہندوستان ورٹمبرگ کی مثال کو مشعل راہ بنا سکے اور اس سے سبق حاصل کر سکے تو اس کے لئے ترقی کی راہیں کھلی اور عروج کی منزل یقینی ہے۔ جرمنی کے اس چھوٹے سے ٹکڑے نے جو ہندوستان کی طرح زراعتی ملک تھا۔ ایک ہی نسل کی کوششوں سے اور سائنس کی ایجادوں کی مدد سے ایک بہترین صنعتی ملک کا درجہ حاصل کر لیا۔ حالانکہ آج سے پچاس برس قبل اس کے لئے اپنی ہی آبادی کے لئے خوراک اور روزگار مہیا کرنا بھی مشکل تھا۔ آج وہ اس وقت سے کہیں زیادہ آبادی کا کفیل اور دولت و تہذیب کا مرکز ہے۔

آج جبکہ سائنس کی ایجادوں نے ہر قوم کے لئے ترقی کی راہیں کھول دی ہیں، کیا ہندوستان اس وقت بھی ان سے محروم رہیگا۔ آج جبکہ سائنس کی بدولت بنجر علاقے سرسبز باغات بن گئے ہیں۔ دنیا کے ذرے ذرے نے دولت اگلنا شروع کر دی ہے۔ جب ہستی یہ ذلیل سے ذلیل اور بدترین چیزیں اگر سائنس کی مدد سے سونے میں تبدیل نہیں ہو جاتیں تو چاندی اور سونے کے مول فروخت ضرور ہوتی ہیں۔ اگر تارکول جیسی بدصورت اور ذلیل شے سے تین سو سے زیادہ مفید مصنوعات رنگ اور خوشبوؤں کی صورت میں نکالی جا سکتی ہیں تو کیا ہندوستان کے قدرتی وسائل دولت کو منظم کر کے کھویا ہوا اقتدار اور عروج حاصل نہیں

کیا جاسکتا - ہندوستانی قومیت کی ترقی کے لئے اس وقت اہل امریکہ جیسے بلند ارادوں اور اہل جاپان کے سے ولولوں اور حوصلوں کی ضرورت ہے - آج بھی اگر ہم کو اپنی پستی اور کمزوری کا احساس ہو جائے تو ہم نہایت ہی قلیل مدت میں دوسری قوموں کی طرح ترقی کر سکتے ہیں - خصوصاً اس صورت میں جبکہ ہندوستان کی خام پیداوار ...... اس قدر زیادہ ہے کہ ابتدا میں تمام پیداوار کا صحیح مصرف نکالنا بھی مشکل ہوگا - اسی طرح قوت محرکہ اتنی زیادہ ہندوستان میں پیدا کی جاسکتی ہے - جو نہ صرف کافی بلکہ ضرورت سے زیادہ ہوگی - غرضیکہ اگر آج بھی ہم صحیح معنوں میں ترقی کرنے کا مصمم ارادہ کر لیں اور اپنی ترقی کا ذریعہ سائنس کو بنا کر اپنے قدرتی وسائل دولت کو ضائع نہ جانے دیں اور نہ کوڑیوں اور دمڑیوں کے مول ہندوستانی دولت باہر بھیجیں بلکہ خود ہندوستان اس سے فائدہ اٹھائے اور اپنی ملکی دولت کو ترقی دے تو یقیناً ہم دیکھیں گے کہ ایک قلیل مدت میں ہندوستان بھی امریکہ اور جاپان کی طرح تہذیب و تمدن کا مرکز - علوم کا مخزن اور دورِ جدید کے انتہائی ترقی یافتہ ممالک میں شمار ہونے لگے گا - اور آج ہندوستان کو شب و روز کے جن مصائب اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے کل نہ صرف مٹ جائیں گی بلکہ ہماری ترقی کا ذریعہ اور رحمت بن جائیں گی - آج جو سیلاب اور طوفان ہمارے لئے قہر ثابت ہو رہے ہیں - کل ہماری بنجر زمینوں کو زندہ کرنے اور قوت محرکہ پیدا کرنے کا مرکز بن جائیں گے - گرد و غبار اور گرمیوں میں اڑنے والی ریت سے ایسے مسالے تیار ہو سکتے ہیں جو آسمان سے باتیں کرنے والی عمارتیں تعمیر کر سکتے ہیں - ہمالیہ اور کشمیر کے خوفناک اور تاریک جنگلات ہماری تحقیق اور کوششوں کے بعد صنعت و حرفت کا مرکز بن سکتے ہیں - اور اسکی سڑنے اور گلنے والی لکڑیاں پھلوں اور پھولوں سے قیمتی اشیا پیدا کی جاسکتی ہیں - ہماری سرسبز و شاداب زمینیں جن کی قوت پیداوار روز بروز گھٹ رہی ہے اور عنقریب بنجر ہونے والی ہیں سائنس کی کوششوں سے پھر سونا اگلنے لگیں گی - حقیقت تو یہ ہے کہ دنیا میں بہت کم ممالک بلکہ شاید صرف امریکہ ایسا ملک ہے جو ہندوستان سے قدرتی وسائل دولت میں مقابلہ کر سکتا ہے - اس لئے اگر ہندوستان سائنس کی مدد سے اپنے تمام زراعتی اور صنعتی وسائل دولت سے خاطر خواہ فائدہ اٹھائے تو اس کی دولت کا شمار محال اور تہذیب و تمدن کی ترقی کا اندازہ مشکل ہوگا -

یوں تو دنیا کی کوئی صنعت ہندوستان کے لئے ناممکن نہیں کیونکہ ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں دنیا کی تقریباً ہر چیز کم و بیش پیدا ہوتی ہے - لیکن یہاں ان سب کے ذکر کی گنجائش اس تھوڑے سے وقت میں نظر نہیں آتی - اس لئے مندرجہ ذیل سطور میں صرف اہم صنعتوں کا جو سائنس کی توجہ اور مدد کی محتاج ہیں نہایت ہی مختصر الفاظ میں ذکر کیا جاتا ہے -

۱ - سوتی کپڑے کی صنعت - یوں تو آج بھی ہندوستان میں کافی ملیں موجود ہیں - لیکن اس صنعت کو سائنٹفک طور پر اور اعلیٰ پیمانے پر چلانے کے لئے بہترین روئی پیدا کرنے - کپڑے رنگنے اور ملوں کے اندر جہاں تاگا کاتا جاتا ہے - مرطوب فضا اور مناسب حالات پیدا کرنے کے لئے سائنس کی تحقیقات کی سخت ضرورت ہے -

۲ - اونی کپڑے کی صنعت :- ہندوستان میں اون کی صنعت اسقدر ترقی یافتہ نہیں جسقدر ہونا چاہیئے - اس کے لئے رنگ کاٹنے اور رنگنے کے اچھے مرکبات درکار ہیں - جن کو معمولی تجربات کے بعد حاصل کیا جاسکتا ہے -

۳ - ریشم کی صنعت :- ریشم کی صنعت ہندوستان میں بالکل ابتدائی اور پست حالت میں ہے - اس کے علاوہ مصنوعی سلک کا ہندوستان میں بالکل رواج نہیں حالانکہ Celluse اور مختلف قسم کے محلل Salve-nts ہندوستان میں بکثرت تیار کئے جاسکتے اور مصنوعی ریشم سازی کو بہت کافی ترقی دی جاسکتی ہے -

۴ - کاغذ کی صنعت :- ہندوستان میں کاغذ کی صنعت کو ترقی دینے کے بہت زیادہ مواقع حاصل ہیں - جنگلات سے بہترین قسم کی لکڑی بانس گھاس اور بھوسا وغیرہ بکثرت اور بہت کم قیمت میں حاصل کر کے مختلف کیمیاوی طریقوں سے کاغذ کی بہت اچھی لُبدی تیار کی جاسکتی ہے - لیکن آج کل صرف معمولی کاغذ کے لئے لُبدی ہندوستان میں تیار کی جاتی ہے اور اچھا کاغذ یورپ کی لُبدی سے بنتا ہے - حالانکہ تھوڑی سی محنت تحقیق اور تجربات کے بعد بہت اچھے نتائج برآمد ہو سکتے ہیں -

۵ - رنگ اور رنگ سازی :- ہندوستان میں نیل اور بہت سے رنگ کثیر مقدار میں پیدا ہونے کے باوجود بھی ہر سال کروڑوں روپے کے رنگ باہر سے آتے ہیں - اور ہندوستان کے رنگ بالکل ضائع جاتے ہیں - چمڑا رنگنے کے لئے مختلف قسم کی وارنشیں اور روغن ہندوستان میں بہت ہی اچھے اور سستے تیار کئے جاسکتے ہیں -

۶ - سائنس کی معلومات کی کمی اور بے توجہی کی وجہ سے روزانہ

لاکھوں جانوروں کے کھر، سینگ، ہڈیاں اور خون بیکار رہ جاتے ہیں۔ حالانکہ ان سے بہت سی کار آمد مصنوعات بھی تیار کی جا سکتی ہیں جو یورپ سے لاکھوں روپیہ خرچ کر کے منگائی جاتی ہیں۔ ان چیزوں کی صنعت بہت ہی آسان اور نفع بخش ہونے کی وجہ سے بہت آسانی سے رائج کی جا سکتی ہے۔

۷۔ تیل اور مختلف قسم کی چربیاں ہندوستان میں غیر محدود مقدار میں پیدا ہوتی ہیں۔ اور اس سے بھی زیادہ پیدا کی جا سکتی ہیں۔ لیکن ان سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا جا رہا ہے۔ حالانکہ تیل کی بنی ہوئی چیزیں ہر سال کروڑوں روپے کی یورپ سے آتی ہیں۔ صابن۔ موم بتی اور پیرافین وغیرہ کی صنعت کے لئے بیحد مواقع حاصل ہیں۔

۸۔ ہندوستان میں بہترین قسم کی شکر تیار کی جا سکتی ہے۔ اور گزشتہ چند سالوں سے اس صنعت کی طرف کافی توجہ کی جا رہی ہے۔ لیکن اس صنعت کو ترقی دینے کے لئے سائنس کی تحقیقات کی سخت ضرورت ہے۔ گنے کے رس سے ۵۰ فی صدی شکر حاصل کی جاتی ہے اور باقی شکر شیرے کی صورت میں بالکل ضائع جاتی ہے۔ جس کا کوئی مصرف نہیں۔ حالانکہ اس فضول اور بیکار چیز سے نہایت ہی سستا الکحل تیار کیا جا سکتا ہے۔ جو موٹر اور دوسری مشینوں میں امریکہ اور انگلستان کی کمپنیوں کے قیمتی پٹرول کی بجائے استعمال کیا جا سکتا ہے اور اس طرح سے ہندوستان میں پٹرول کی تلافی۔ نہایت ہی سستے الکحل سے کی جا سکتی ہے۔ لیکن شاید حکومت ہند اپنے اغراض و مقاصد کی خاطر اسے تیار کرنے کی اجازت نہ دے۔

۹۔ ہر سال کروڑوں روپوں کی ادویات ہندوستان میں یورپ اور امریکہ سے آتی ہیں۔ حالانکہ یہ قیمتی دوائیں خود ہمارے ملک میں تیار کی جا سکتی ہیں۔ اس لئے کہ اُن پودوں میں جن سے یہ دوائیں تیار کی جاتی ہیں بہت کم ایسے ہیں جو ہندوستان میں پیدا نہیں ہوتے یا پیدا نہیں کئے جا سکتے۔ اس کے علاوہ ہمارے ملک کے طبیب آج بھی قدیم زمانہ کی طرح دواؤں میں جڑی بوٹیاں لکڑیاں اور پتے استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ ترقی اور تہذیب و تمدن کے اس دور میں سائنس کی مدد سے دواؤں کے مفید اجزا نکال کر استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ جو بوٹیوں اور پتیوں سے کہیں مفید ثابت ہوں گے اور اس سے نہ صرف ملکی صنعت کو ترقی ہوگی بلکہ یونانی اور ویدک طبوں کے دن بھی پھر جائیں گے۔ اور ڈاکٹری کے مقابلے میں وہ مٹنے کی بجائے پھر ترقی کرنے لگیں گے۔

۱۰۔ معدنی پیداوار:۔ ہندوستان معدنی پیداوار کے لحاظ سے بھی کسی دوسرے ملک سے کم نہیں۔ مختلف دھاتیں اور ان کے مرکبات کثیر مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ سوڈیم اور پوٹیشیم کے مرکبات سلکن، تانبا، لوہا، سیسہ، اسٹرانشیم، کیلشیم، شورہ، نمک، گریفائٹ۔ گندھک، عنبر، ٹین، ہیرا، چاندی، سونا اور کوئلہ وغیرہ ہندوستان میں بکثرت پیدا ہوتا ہے میگنیز اور ابرق غالباً دنیا میں سب سے زیادہ ہندوستان میں پیدا ہوتا ہے۔ لیکن ہندوستان کی یہ تمام معدنی پیداوار یا تو ضائع ہو رہی ہے۔ یا باہر جاتی ہے۔ جس سے فائدہ اہل یورپ اٹھاتے ہیں۔ اور انہیں اشیاء کے مرکبات جو کہ ہندوستان کے ملوں میں بآسانی تیار کئے جا سکتے ہیں۔ یورپ سے بن کر ہندوستان آتے اور سونے کے مول بکتے ہیں۔ اس کے علاوہ یورانیم اور ریڈیم کی کچی دھاتیں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ جو انگلستان اور یورپ بہت کم قیمت میں جاتی ہیں۔ اور وہاں ان سے یورانیم اور ریڈیم جیسی قیمتی اشیاء نکال کر بڑی بڑی قیمتوں میں فروخت کی جاتی ہیں۔

۱۱۔ اسلحہ اور گولہ بارود:۔ ہندوستان میں گندھک، شورہ، پکرک ایسڈ، گلیسرین اور نائٹرک ایسڈ وغیرہ بہت کافی پیدا ہوتے ہیں۔ جن کی مدد سے ہندوستان کی صنعت اسلحہ سازی کو ترقی دی جا سکتی ہے۔ بہترین قسم کے کارتوس گولیاں، بم، توپیں اور دوسری پھٹنے والی چیزیں تیار کی جا سکتی ہیں۔ جن کے بغیر ہندوستان نہ کبھی ترقی کر سکتا ہے اور نہ اس خود غرض دنیا میں اپنے ملک اور اپنے حقوق کی حفاظت کر سکتا ہے۔

۱۲۔ جنگلات کی پیداوار:۔ ہندوستان کی بیش بہا دولت ہمالیہ اور کشمیر کے جنگلوں میں ضائع جا رہی ہے۔ حالانکہ ان خوفناک اور تاریک جنگلات کے ہر ذرے اور ہر تنکے سے بہترین نعمتیں پیدا کی جا سکتی ہیں۔ بہترین لکڑی جو نہ صرف صنعت میں کام آ سکتی ہیں بلکہ اس کو کشید کر کے میتھائل الکوہل Acetone اور —— Acetic Acid وغیرہ جیسے مفید محلل . Salvents تیار کئے جا سکتے ہیں جن کی کہ موجودہ صنعت میں بہت ضرورت ہوتی ہے۔ لاکھوں قسم کے پھل ہر سال پیدا ہوتے ہیں اور انہیں جنگلات میں سڑ گل جاتے ہیں۔ حالانکہ ان کو آسانی سے محفوظ کیا جا سکتا ہے اور ان سے مختلف قسم کے وہ تیزاب حاصل کئے جا سکتے ہیں جو لاکھوں روپیہ خرچ کر کے یورپ سے منگائے جاتے ہیں۔ معلوم نہیں کتنے پھول روزانہ کھلتے اور بیکار

جاتے ہیں۔ ان کی ساری خوشبو اور تمام رنگ خاک میں مل جاتا ہے۔ ان کے علاوہ جنگلات کی پیداوار سے گوند۔ پیرافین اور لاکھ وغیرہ بھی کثیر مقدار میں حاصل کی جاسکتی ہیں۔

۱۳۔ زراعت:۔ ہندوستانی زراعت غالباً سب سے زیادہ سائنس کی مدد کی محتاج ہے۔ اس کے سرسبز کھیتوں اور سونا اگلنے والی زمینوں کی قوت پیداوار روز بروز گھٹتی جا رہی ہے اور اگر یہی رفتار تنزل کی رہی تو ممکن ہے کچھ عرصہ کے بعد شمالی ہند کی سرسبزی و اد بال ہمارے غلط استعمال اور علوم سائنس کی کمی کی وجہ سے بنجر اور ویران علاقوں میں تبدیل ہو جائیں۔ ان زمینوں کی خاطر اگر تحقیق و جستجو کی جائے تو مختلف کیمیاوی کھادوں کے ذریعہ ان کی قوت پیداوار میں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ زراعت کے سلسلہ میں جو ضمنی اشیاء حاصل ہوتی ہیں۔ ان کا بہترین استعمال نکالا جاسکتا ہے۔ اور ہندوستان کے حالات اور زمینوں کے مطابق زراعت کے نئے نئے طریقے دریافت کئے جاسکتے ہیں۔ جن سے ہمارے کھیتوں کی پیداوار امریکہ اور روس کی طرح کئی گنا بڑھ سکتی ہے۔ اور زراعت میں بہت سی سہولتیں بھی پیدا کی جاسکتی ہیں۔

۱۴۔ بجلی کی قوت:۔ ہندوستان میں قوت محرکہ کے پیدا کرنے کے لئے لکڑی اور کوئلے کی کوئی کمی نہیں۔ اس کے علاوہ سینکڑوں آبشار ہیں جن سے ۴۰ لاکھ اسپی طاقت سے بھی زیادہ بجلی حاصل کی جاسکتی ہے۔ لیکن ان سے صرف ایک لاکھ اسپی طاقت کی بجلی حاصل کی جاتی ہے۔ اور قدرت کی یہ نعمت بالکل بیکار اور ضائع جا رہی ہے۔

۱۵۔ ہر سال ہندوستان کے لاکھوں غریب اور مفلس کسان۔ دریاؤں کے سیلاب، لُو، دھوپ اور آندھیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان کی گاڑھی کمائی اور جان سے زیادہ عزیز کھیتیاں موسم کی بدعنوانیوں کا شکار ہو جاتی ہیں۔ حالانکہ طوفان اور سیلاب کی ان آفتوں سے سائنس کی مختلف تجربہ گاہیں اور موسم وغیرہ کا مطالعہ کرنے والے شعبے قائم کرکے ان بلاؤں سے بچنے کی تدابیر اور ان سے تحفظ کا مناسب انتظام کیا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ آج امریکہ اور دوسرے ممالک سائنس کی ان خدمات سے فائدہ اٹھا کر اپنے جان و مال کی حفاظت کرتے ہیں۔

مذکورہ بالا صنعتوں کا حال آپ لوگوں نے سُنا اور سننے سے زیادہ اس کی ابتری کا مشاہدہ بھی کیا ہوگا۔ اس صنعتی لیستی اور علوم سائنس سے فائدہ نہ اٹھانے کی ذمہ داری تمام تر گورنمنٹ پر ہے۔ لیکن غیروں سے شکوہ کیا۔ ہم کو اپنوں سے شکایت کرنا چاہیئے۔ جنہوں نے سائنس کی تعلیم کی طرف کوئی توجہ نہ کی اور اب تک اس کو ناقابلِ التفات سمجھتے رہے۔ لیکن جن لوگوں نے سائنس کی تعلیم حاصل کی ان سے اور بھی زیادہ شکایت ہے۔ اس لئے کہ انہوں نے ایک مفید علم حاصل کرنے کے باوجود اس سے ملک کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔ انہوں نے سائنس کی تعلیم کو محض تفریح اور ڈگری حاصل کرنے کا مقصد بنایا۔ اور اس قابلقدر علم سے جس کے مطالعہ اور جس کے تجربات میں انہوں نے اپنا بہترین وقت صرف کیا۔ صرف اتنا فائدہ اٹھایا کہ آج سرکاری دفاتر میں کلرک اور محرروں کے اعلیٰ اور قابلقدر فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ان کے علاوہ ہندوستانی کے نام نہاد شاہی ریسرچ انسٹیٹیوٹ سب سے زیادہ قابل مذمت ہیں جو ہندوستان کی کوئی قابلقدر خدمت انجام نہیں دے رہے ہیں۔ اور جن کے اخراجات ہندوستان کے لئے گراں اور جن کا وجود مضر ثابت ہو رہا ہے۔ غرضیکہ ہندوستان کی قدرتی پیداوار اور اس کی ناقدری کی داستان بہت طویل ہے۔ جس کے ذکر کے لئے دفاتر درکار ہیں۔ اب افکار و نارو نے اور افسوس کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اس وقت اس امر کی ضرورت ہے کہ اپنے ترقی کے جذبے اور قوتِ عمل سے کام لیں۔ اور دنیا پر اپنی حیثیت اور اہمیت جتا دیں۔ ہم کو چاہیئے کہ جدید ہندوستان کی تعمیر کو علوم سائنس کی مستحکم بنیادوں پر اٹھائیں۔ جس طرح دنیا کی دوسری قوموں نے ان سے فائدہ اٹھا کر عروج حاصل کیا ہے۔ انہیں کی طرح ہم بھی ترقی کی راہ میں گامزن ہو جائیں اور اپنے مقصد کے حصول میں ہر ممکن کوشش صرف کریں۔

"جامعہ"

قسمت بھی ایک عجیب معمہ ہے، ہزار کوشش کیجئے، لاکھ سر ماریئے لیکن یہ عقدہ کبھی وا نہیں ہوتا۔ مدن نے بہتیری کوشش کی کہ اُس کی شادی سوشیلا سے نہ ہو۔ اِس نے اپنی ماں سے بھی صاف صاف اَور غیر مبہم الفاظ میں کہہ دیا کہ وُہ سوشیلا سے کبھی شادی نہ کرے گا، لیکن اس کی پتا کے سامنے ایک نہ چلی۔ اس کے والد ذرا پُرانی قسم کے اِنسان واقع ہوئے تھے۔ وُہ مدن لال کی منگنی بچپنے ہی میں اپنے ایک دوست کی لڑکی سوشیلا سے کر چکے تھے، اِس لئے اب سماج میں ناک کٹنے کے خوف سے انہوں نے مدن لال کی شادی زبردستی سوشیلا کے ساتھ کر دی۔ بیاہ ہُوا اَور بڑی دھوم دھام اَور شان و شوکت کے ساتھ ہُوا، شہر کے بڑے بڑے اُمرا اور حکام اِس میں شامل ہوئے۔ تین چار روز غریبوں اَور فقیروں نے خوب پیٹ بھر کر کھایا۔ لیکن مدن غریب کی تمام اُمیدیں خاک میں مل گئیں +

(۲)

مدن لال کے والد لالہ ہیرالال گورنمنٹ آف انڈیا کے دفتر میں ایک بڑے عہدے پر متمکن تھے۔ چار پانچسو روپیہ ماہوار تنخواہ پاتے تھے۔ اِس کے علاوہ ذاتی جائداد بھی بہت کافی تھی۔ مدن ان کا اکلوتا بیٹا تھا اس لئے وُہ اس کی تعلیم و تربیت میں بہت کوشاں رہتے تھے۔ لیکن تھے ذرا پُرانے خیالات کے بزرگ انہیں بیسویں صدی کی یہ شعلہ آشام تہذیب ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ یہ انہیں کی تربیت کا نتیجہ تھا کہ مدن بی۔ اے پاس کر چکنے کے بعد بھی اسقدر شرمیلا واقع ہُوا تھا کہ جب کبھی باپ کے پاس بیٹھتا تو بات بھی کرنی دشوار ہو جاتی۔ لیکن ساتھ ہی لالہ ہیرالال اسکے مستقبل کی طرف سے بھی غافل نہیں تھے۔ وہ اپنے بیٹے کے مستقبل کو بہت زیادہ شاندار دیکھنے کے متمنی تھے۔ اسی غرض کے لئے بیرسٹری کی اعلیٰ تعلیم دلانے کے لئے اسے ولایت بھیج دیا تھا۔ جب مدن ولایت سے ڈگری لیکر واپس آیا تو اس میں ایک نمایاں تبدیلی ہو چکی تھی، تین سال کے مختصر عرصے میں یورپ کی آنکھیں چوندھیا دینے والی تہذیب نے اس کی کایا ہی پلٹ کر رکھدی۔ وُہ اپنی پسند کی شادی کے رنگین خواب دیکھ رہا تھا، لیکن جب اسکی شادی سوشیلا سے کر دی گئی تو اس کے وُہ رنگین خواب جنہیں دیکھ دیکھ کر وُہ جیتا تھا، اَور اس کی وُہ سُنہری دُنیا جس کے صرف تصوّر ہی سے اِس کا دل خوشی سے اُچھلنے لگتا تھا۔ اسی طرح غائب ہو گئے۔ جس طرح سُورج کے نکلنے سے شبنم +

(۳)

سوشیلا میں یوں تو کوئی نقص نہ تھا، شکل صورت کے لحاظ سے بھی اچھی تھی۔ معمولی پڑھی لکھی بھی تھی۔ لیکن بیچاری سیدھی سادی مذہب کی پابند عورت تھی۔ اَور یہی اس کا سب سے بڑا قصور یا نقص تھا۔ مدن لال کو ایسی بیوی پسند نہیں تھی۔ وُہ ایسی بیوی کو وبالِ جان سمجھتا تھا۔ وُہ ایسی بیوی چاہتا تھا جو ذرا تیز ہو، اس کے دوست جب اس کے گھر آئیں تو انہیں اپنا دوست سمجھکر ان سے ہاتھ ملائے، مُسکرا مُسکرا کر اِن سے گفتگو کرے۔ پارٹیوں اَور ڈنرز میں اِس کے ہمرکاب ہو۔ شام کو اس کے ساتھ سینما جایا کرے۔ لیکن سوشیلا سے یہ اُمید رکھنا کہ وُہ غیر مردوں سے ہاتھ ملائیگی، سودائے خام سے کم نہ تھا، اِن حالات میں جب طرفین میں اختلاف کی ایک وسیع خلیج حائل ہو تو دونوں میں نبھے تو کیسے اَور نباہ ہو تو کیونکر؟

(۴)

مدن پھر بیرسٹر تھا۔ شادی سے دو ڈھائی ماہ بعد اس نے اپنے پتا سے کہا کہ یہاں پریکٹس بہت کم ہے اِس لئے وُہ پٹنہ جاکر پریکٹس کرنی چاہتا ہے۔ ہیرالال بھی بڑے جہاندیدہ انسان تھے۔ زمانے کی اونچ نیچ سے اچھی طرح واقف تھے۔ فوراً بھانپ گئے کہ مدن لال کا کیا ارادہ ہے۔ وُہ خوب سمجھتے تھے کہ اگر اس وقت اسے اجازت نہ دی گئی تو شائد بیٹے سے بھی ہاتھ دھونا پڑے۔ دوسری طرف اپنی بہو کا بھی خیال تھا جسے اسقدر اُمیدوں سے بیاہ کر لائے تھے۔ بڑے مخمصے میں پھنسے تھے۔ بالآخر کچھ سوچ بچار کے بعد اجازت

دے دینے کا ہی فیصلہ کیا، لیکن ساتھ ہی یہ بھی طے کیا کہ اگر اس نے وہاں جا کر کچھ اَور گُل کھلائے تو وہ اسے اپنی جائداد سے محروم کر دیں گے، اجازت دینے سے پیشتر انہوں نے سوشیلا کو بھی اطلاع دینی مناسب سمجھی۔ اس نے جب یہ سُنا تو اس کے آنسو نکل پڑے۔ لیکن دل پر جبر کر کے اور آنسو پونچھ کر کہنے لگی۔ "پرماتما کے لئے اُنہیں روکئے نہیں، جہاں وہ جانا چاہتے ہیں اُنہیں اجازت دے دیجئے، داسی کو اگر وُہ اپنے چرنوں میں رکھنا نہیں چاہتے تو ان کی خوشی۔" لالہ ہیرا لال نے جب یہ سُنا تو اپنی بہو کی بیکسی دیکھ کر اُن کے دل پر ایک چوٹ سی لگی، اور بہو کی وفاشعاری پر بےساختہ اُن کے منہ سے آفریں نکل گئی، آخر کار مدن کو اجازت مل گئی۔ اور وُہ اگلے دن ماتا، پتا اور بیوی کے جذبات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے شام کی گاڑی سے پٹنہ روانہ ہو گیا لیکن ....

قسمت خاموش کھڑی مُسکرا رہی تھی

(۵)

پٹنہ میں مدن کی پریکٹس خوب چلی، چند ہی ماہ میں اس کی آمدنی سینکڑوں سے گزر کر ہزاروں تک جا پہنچی۔ وُہ بہت سرعت کے ساتھ ترقی کر رہا تھا۔ شہر میں وُہ ایک قابل بیرسٹر مشہور تھا۔ بڑے بڑے حکام سے اسکی ملاقات تھی۔ لیکن سب سے زیادہ وُہ ضلع کے کلکٹر مسٹر رتن چند سے بے تکلف تھا، کلکٹر صاحب کی ایک لڑکی بھی تھی۔ جس کا نام لیلا تھا۔ لیلا بی۔اے میں پڑھتی تھی۔ شکل صورت کے اعتبار سے وہ ہزاروں میں ایک تھی۔ مدن نے جب اُسے دیکھا تو پہلی مرتبہ اسے یہ احساس ہُوا کہ شائد اس کے وہ رنگیں اَور سہانے خواب پورے ہو جائیں۔ لیلا کی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ اور اس کی دلجوئی کی غرض سے کلکٹر صاحب نے اسے پوری پوری آزادی دے رکھی تھی۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ کی ملاقات میں مدن لیلا کے ساتھ بے تکلف ہو گیا۔ اور ظاہر بھی کیا کہ وُہ غیر شادی شدہ ہے +

(۶)

جون کا مہینہ تھا، گرمی اپنے پورے جوبن پر تھی۔ اُمرا گرمی سے تنگ آئے ہوئے پہاڑوں پر جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ لیلا کا کالج بھی موسم گرما کی تعطیلات کے لئے بند ہو چکا تھا۔ کلکٹر صاحب نے بھی دو ماہ کی رخصت حاصل کی اور لیلا کے ساتھ مصوری جانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ مدن کو بھی اس بات کا پتہ لگ گیا۔ چنانچہ روانگی سے پیشتر رات کو وہ انہیں رخصت کرنے آیا، اس وقت کوئی آٹھ اَور نو کے درمیان عمل ہو گا۔ لیلا سامانِ سفر تیار کرنے میں مصروف تھی اَور کلکٹر صاحب اپنے ایک دوست کے ہاں دعوت کھانے گئے تھے۔ مدن کو آتا دیکھ کر لیلا باہر نکل آئی اَور دونوں باہر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ "کل تم جا رہی ہو لیلا" "کبھی کبھی ہمیں بھی یاد کر لیا کرنا۔" مدن نے پُوچھا "خوب" لیلا نے کہا "یہ یاد کرنے کی بھی ایک ہی رہی۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ آپ بھی ہمارے ساتھ ہی مصوری چلیں۔" "اس سے زیادہ خوش قسمتی میرے لئے اَور کیا ہو سکتی تھی کہ تمہارے ساتھ چلتا۔ لیکن کام اسقدر ہے کہ مجبور ہوں، ہاں البتہ پندرہ بیس روز تک ضرور مصوری آؤنگا۔" مدن نے ابھی یہ جملہ ختم کیا ہی تھا کہ کلکٹر صاحب آ گئے۔ "کیوں بیٹی لیلا سب سامان تیار ہے نا۔" انہوں نے پوچھا "جی ہاں" لیلا نے جواب دیا "بیرسٹر صاحب بھی ہمیں رخصت کرنے آئے ہیں۔ اَور آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" "خوب خوب" کلکٹر صاحب نے کہا اور ساتھ ہی وہ برامدے سے نکل کر باہر آ بیٹھے۔ تھوڑی دیر کے بعد مدن رخصت ہو کر اپنی کوٹھی پر واپس آیا۔ اس وقت وہ کچھ مضمحل اور پریشان سا تھا۔ اُلجھن کے آثار اس کے چہرہ سے ہویدا تھے۔ نہ معلوم کیا سوچ رہا تھا؛

(۷)

اتوار کا دن تھا، مدن ابھی سو کر ہی اُٹھا تھا کہ اسے خیال آیا آہ! لیلا کے خط کو آئے ہوئے تین چار روز ہو گئے ہیں اَور اسے ابھی جواب نہیں دیا، نہ معلوم لیلا نے کیا خیال کیا ہوگا۔ اس خیال کے آتے ہی وُہ فوراً اُٹھ کر لکھنے والی میز پر جا بیٹھا اور خط لکھنا شروع کیا ـــــ خط بہت لمبا تھا، جس کا مضمون کچھ اس قسم کا تھا کہ اسے دن گزارنے مشکل ہو رہے ہیں۔ اَور وہ جلد از جلد مصوری آ کر اپنے مستقبل کے متعلق فیصلہ کرنا چاہتا ہے۔ ایک خط اس نے اپنے والد کو بھی لکھا جس میں اس نے لکھا کہ کام کی بے حد زیادتی ہے۔ اس لئے وُہ مناسب وقت پر اُن کے خط کا جواب نہ دے سکا۔ چند در چند وجوہ کی بنا پر فی الحال وہ سوشیلا کو نہیں بلا سکتا۔ دونوں خط لکھ کر انہیں دوبارہ پڑھا اور ایک انگڑائی لیکر ہاتھ سے رکھ دئے۔ عین اس وقت دروازہ کھلا اور خادم حجامت کا سامان لئے ہوئے داخل ہُوا۔ "دیکھو! یہ خط نہایت ضروری ہیں۔ انہیں پہلی ڈاک سے نکل جانا چاہئے حجامت کا سامان رکھ کر انہیں ابھی لیٹر بکس میں ڈال آؤ۔" مدن نے اپنے نوکر کو حکم دیا۔ ساتھ ہی اس نے دونوں خطوں کو لفافہ میں رکھ کر ٹکٹ لگائے۔ اور پتہ لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ اسے مدن کی بدقسمتی کہئے یا سوئے اتفاق کہ جس وقت وُہ پتہ لکھنے لگا تو اسے مطلق خیال نہ رہا کہ لیلا کا خط کونسا ہے اَور اس کے والد کا کونسا، چنانچہ وُہ لیلا والے خط پر والد کا پتہ لکھ گیا اَور دوسرے خط پر لیلا کا۔ تھوڑی دیر میں نوکر آیا اَور خط لے کر چلتا بنا +

(۸)

کچھ عرصہ سے مدن کا خط نہ آنے کی وجہ سے لالہ ہیرالال بہت پریشان تھے۔ زیادہ فکر انہیں اپنی بہو کی طرف سے تھا۔ جسے اسقدر شوق سے بیاہ کر لائے تھے۔ وہ اُس وقت کو کوس رہے تھے۔ جب انہیں مدن کی شادی کا خیال پیدا ہُوا تھا۔ کبھی اپنے آپ کو بُرا کہتے کہ کیوں مَیں نے مدن کی شادی کی۔ کاش اس کی شادی ہی نہ کرتا۔ کبھی وہ مدن پر نفرین کرتے اور کہتے کہ کاش وُہ پیدا ہوتے ہی مرگیا ہوتا۔ اس وقت بھی وہ ایسے ہی پراگندہ خیالات میں غلطاں و پیچاں بیٹھے تھے کہ ڈاکیہ آیا اور ایک خط دے کر چلا گیا۔ خط دیکھا تو مدن کا تھا۔ بہت خوش ہوئے، جلد جلد چاک کرنا شروع کیا۔ ساتھ ہی ساتھ دِل میں خوش تھے کہ ضرور بیوی کو بُلایا ہوگا۔ خط کھولا۔ پڑھا تو ٹھٹک گئے۔ ایک دفعہ اَور پڑھا، پھر لفافہ دیکھا کہ شائد غلطی سے آگیا ہو۔ لیکن نام اپنا ہی تھا اَور تحریر بھی مدن ہی کے ہاتھ کی تھی، پھر پڑھا اور خط ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر جا پڑا۔ غصّہ کے مارے اِن کا چہرہ لال ہو رہا تھا۔ اَور مدن کو بُرا بھلا کہہ رہے تھے۔ "ہاں بھلا ایسے ایسے کاموں سے اسے فرصت ملے تبھی تو وُہ کسی کے خط کا جواب دے۔ میں بھی تو حیران تھا کہ اسے فرصت کیوں نہیں ملتی۔" کچھ دیر بعد وُہ کسی گہری سوچ میں پڑگئے۔ "ہاں۔ ہاں بس بالکل ٹھیک ہے۔ اس کا علاج ہی یہ ہے۔" وہ یکایک چلّا اُٹھے اور اُٹھ کر اندر چلے گئے۔ "ابھی ابھی ایک دوست کا تار آیا ہے اَور مَیں نے شام کی گاڑی سے بمعہ سوشیلا کے مصوری جانا ہے۔" انہوں نے نہایت اطمینان سے اپنی بیوی سے کہا۔ اَور شام کی گاڑی سے وہ مصوری جا رہے تھے +

(۹)

اگلے دِن نو بجے وُہ مصوری جا پہنچے۔ سامان وغیرہ ایک ہوٹل میں رکھوایا۔ غسل کیا پھر دونوں نے تھوڑا سا ناشتہ کیا اور سفر کی تکان اُتارنے کے لئے سوشیلا تو دوسرے کمرے میں جاکر لیٹ گئی۔ لیکن لالہ جی کو نیند کہاں۔ وُہ تو کلکٹر صاحب کا پتہ معلوم کرنے کے لئے بے چین تھے۔ مصوری میں ان کی کوئی جان پہچان بھی نہ تھی جس سے پتہ چلنے کی اُمید ہوسکتی، آخر انہی خیالات میں انہیں نیند آگئی اَور سو گئے۔ بارہ بجے اُٹھے دیکھا تو سوشیلا ابھی تک سو رہی تھی، غسل کیا اَور بہرے کو کھانا لانے کا حکم دیا۔ کھانا کھانے کے دوران میں انہیں ایک خیال آیا کہ شائد اس بہرے کو کلکٹر صاحب کی بابت کچھ معلوم ہو، چنانچہ یہ سوچکر انہوں نے بہرے سے دریافت کیا کہ دس بارہ دن ہوئے یہاں ایک کلکٹر صاحب آئے تھے وُہ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اتفاق سے مسٹر رتن چند جب یہاں آئے تھے تو پہلے اسی ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ اِس لئے اس بہرے کو ان کی قیام گاہ معلوم تھی۔ "جی ہاں دیکھئے نا۔ وہ سامنے جو دو کوٹھیاں نظر آتی ہیں۔" بہرے نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وُہ دائیں ہاتھ والی کوٹھی میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔" لالہ جی یہ سُنکر اچھل پڑے۔ اب انہیں یقین ہوگیا کہ وہ جس مقصد کے لئے آئیں ہیں وہ ضرور پورا ہو جائے گا۔ چنانچہ شام ہی کو وُہ کلکٹر صاحب کے ساتھ والی کوٹھی میں جا ٹھہرے +

(۱۰)

اپنے سُسر کے کہنے پر سوشیلا نے ایک دن لیلا کی دعوت کردی۔ دعوت تو ملاقات کا ایک بہانا ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں دونوں خوب گھُل مل گئیں۔ گویا دونوں برسوں کی سہیلیاں معلوم ہوتی تھیں۔ سوشیلا نے اپنا کوئی راز لیلا سے چھپا نہ رکھا تھا۔ یہاں تک کہ یہ بھی بتا دیا کہ اس کی شادی مدن سے ہوئی تھی۔ لیکن اب مدن اس کی کوئی پرواہ نہیں کرتا لیلا نے جب یہ سنا تو اِسے رنج بھی ہُوا اَور غصّہ بھی آیا۔ رنج تو اسے سوشیلا کی حالت پر آیا اور غصّہ اس بات کا تھا کہ مدن نے اب تک اس سے یہ بات چھپا رکھی تھی۔ چنانچہ اس نے تہیّہ کرلیا کہ ایک دفعہ تو مدن کو اس جھوٹ کا مزا ضرور چکھائے گی۔ رات ہی کو اس نے کلکٹر صاحب کو تمام بات بتادی اَور وُہ تجویز بھی جو اس نے مدن سے بدلہ لینے کے لئے سوچی تھی۔ وہ تجویز یہ تھی کہ مدن جب مصوری آئے تو اس کی شادی لیلا سے کردی جائے۔ لیکن دراصل لیلا کی بجائے سوشیلا کو دلہن بنایا جائے۔ کلکٹر صاحب کو بھی یہ تجویز بہُت پسند آئی۔ اگلے دن وُہ لالہ ہیرالال سے بھی ملے اَور سب کچھ خود طے کیا۔ انہیں بھی مدن کے رویہ پر سخت غصّہ آرہا تھا +

(۱۱)

پانچ چھ دن کے بعد مدن بھی دِل میں حسرتوں اور ارمانوں کا ایک طوفان لئے ہوئے آپہنچا۔ کلکٹر صاحب نہایت گرمجوشی سے ملے۔ لیلا بھی مُسکراتی ہوئی ملی گو اس کی مُسکراہٹ شرارت پر ہی مبنی تھی۔ مدن گو اصرار کے باوجود ہوٹل ہی میں ٹھہرا۔ لیکن اس کے وقت کا بہُت سا حصّہ کلکٹر صاحب اَور لیلا کے ساتھ گزرتا۔ لیلا جو جو باتیں مدن سے کرتی وُہ سوشیلا کو بھی جاکر بتا دیتی۔ آخر ایک دن مدن آیا تو کلکٹر صاحب نے بیاہ شادی کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ مدن تو آیا ہی اسی غرض کے لئے تھا، کلکٹر صاحب نے مدن سے کہا کہ وُہ جلد از جلد لیلا کی شادی کرکے اس فرض سے سبکدوش ہو جانا چاہتے ہیں۔ مدن بھی راضی ہوگیا۔ چنانچہ طے ہُوا کہ شادی مصوری ہی

میں ہو۔ کلکٹر صاحب نے کہا کہ وُہ جہیز وغیرہ کے سخت خلاف ہیں۔ اس لئے جو کچھ وُہ دیں گے نقدی ہی کی صورت میں اور مدن کو بھی زیورات وغیرہ کا فکر نہیں کرنا چاہیئے۔ چنانچہ شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ بارات وغیرہ کی بھی کوئی ضرورت نہیں سمجھی گئی ؎

(۱۲)

تمام کوٹھی کی صفائی ہوئی۔ اسے خوب سجایا گیا۔ سوشیلا اور لیلا دونوں ہی خوش تھیں۔ لیلا کو تو بدلا لینے کی خوشی تھی اور سوشیلا کو خاوند کے ملنے کی۔ آخر کار شادی کی تاریخ آپہنچی۔ سہ پہر کو مدن بھی آ گیا۔ شادی کی رسومات ایک پنڈت نے انجام دیں، بیاہ ختم ہؤا۔ چاروں طرف سے پنڈتوں نے مدن کو مبارکباد دی اور اسے باہر مردانے میں بٹھایا گیا۔ رات ہوئی مدن خوش خوش حجرۂ عروسی میں داخل ہؤا۔ وُہ بہت خوش تھا۔ گویا اسے ہفت اقلیم کی بادشاہی مل گئی تھی۔"

"رہنے بھی دو لیلا، اب اس گھونگٹ کو، اب اس سے کام نہ چلے گا" یہ کہہ کر اس نے زبردستی گھونگٹ اُٹھا دیا اور ساتھ ہی اس کے مُنہ سے نکلا "اُف . . . . ارے . . . . توبہ . . . . قسمت۔"

باہر لالہ ہیرالال اور دوسرے لوگ زور زور ہنس رہے تھے ؎

"تاثیر احمد"

میرا دل

وُہ جس پہ راز فطرت کے ہمیشہ کھلتے رہتے ہیں — سمندر عشق کے گہرائیوں میں جس کی بہتے ہیں

وُہ جس میں ممتزج ہیں شعلہ و شبنم کی تاثیریں — فدا ہیں خامشی پہ جس کی آتش ریز تقریریں

مسلسل بارشِ الہام جس پہ ہوتی رہتی ہے — وُہ جس میں سو طرح کے بیج فطرت بوتی رہتی ہے

وُہ پروردہ محبّت کا، پجاری حُسنِ فطرت کا — وُہ محسوسات کی ندی، وہ احساسات کا دریا

وہ عقدے بیکراں ہستی کے ہر دم کھولنے والا — وہ خاموشی کے پردے میں پیاپے بولنے والا

وہ جس کی وسعتوں میں گم ہیں لاتعداد دنیائیں — کئی مسرور دنیائیں، کئی ناشاد دنیائیں

یہی وہ دل ہے جس نے ہاں مجھے شاعر بنایا ہے

اختر کو ہر نہفتہ راز فطرت کا بتایا ہے

اختر چکوالی بی۔ اے

ٹالسٹائی کی ڈائری

۱۸۵۳ء

یکم جنوری۔ فوج کی ٹکڑی کے ساتھ آگے بڑھا۔ تندرست اور خوش ہوں[1]

۲۔۴ جنوری۔ شرلے نا میں شراب پی اور گرانز نی پہنچا۔ جہاں میرا بھائی شراب کے نشے میں مست پڑا تھا[2]۔ میں خوش اور تندرست ہوں۔

۵ جنوری۔ آج دن بھر کچھ نہیں کیا۔ کچھ سوچا بھی نہیں۔ گرانزنی میں رہنا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ یہاں ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ کچھ کام کرنے کیلئے بیقرار ہو رہا ہوں ÷

۶۔ جنوری۔ کیسے احمق ہیں! ان لوگوں کے طریق خصوصاً! اپنے بھائی کی شراب خوری مجھے بہت بُری معلوم ہوتی ہے۔ جنگ ایسی ناپسندیدہ اور بُری چیز ہے کہ جو شخص اِس میں حصّہ لیتا ہے اپنی رُوح کو ہلاک کر ڈالتا ہے۔ کیا میں صحیح راستے پر ہوں؟ میرے خدا مجھے سمجھاؤ۔ اور اگر میں غلطی پر ہوں۔ تو مجھے معاف کرو ÷

۷۔ جنوری۔ صبح طبیعت ناموافق رہی۔ شام کو نورنگ ٹوکری میں شراب کی بوتلیں لے کر آیا۔ مجھے نشے نے مغلوب کر لیا۔ ٹینز جنسک کے افسر نہ جانے کہاں سے کئی فاحشاؤں کو ساتھ لائے۔ میں نے پھر شراب پی۔ بانودِچ بھی نشے میں چُور تھا۔ وہ میری انگلیاں توڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ اور بولا۔ "میں بے وقوفی کر رہا ہوں"۔ درد اور نشے کے باعث مجھے غصہ آگیا۔ اور میں نے اُسے بے وقوف اور چھچھورا کہہ ڈالا۔ اُس نے چشم پُرنم ہو کر مجھ سے بچوں کی طرح بے باکانہ باتیں کیں۔ میں نے کہا۔ میں سپاہیوں کی طرح جھگڑا کرنا نہیں چاہتا۔ اور معاملے کو اِس طرح طول دینا مجھے منظور نہیں ÷

۸۔ جنوری۔ آج صبح میں نے اُس سے کہا کہ میں نے (کل) شراب پی تھی۔ میں نے جو کچھ کہا۔ اسے معاف کرنا۔ اس پر اُس نے بے وقوفی کے ساتھ کہا۔ "میں تمہیں معاف کرتا ہوں۔ قصور تمہارا ہی تھا۔" کل جیسے ہی میں اپنی دُعا ختم کر چکونگا۔ پہلے ملنے والے شخص سے میں معافی طلب کرونگا۔ اور اگر وہ معاف نہ کریگا۔ تو میں اسے جنگ مقابلہ کے لئے للکارونگا۔ پہلے وہ فائر کریگا اور میں ہاتھ نہ اُٹھاؤں گا۔ میں نے نادانی کی۔ یانووِچ اچھا آدمی ہے۔ اور اس طرح میں اُسے نقصان پہنچا سکتا ہوں۔ نکولینکا یہاں سے چلا گیا۔ یہ منظر اُس کے لئے ناگوار اور محض غیر دلچسپ تھا۔ کیونکہ اس معاملہ کے رفت گذاشت کرنے کا طریقہ اسے نظر نہیں آتا تھا۔ وہ متکبّر ہے۔ پھر بھی میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ اور اسے ناخوش دیکھ کر مجھے صدمہ ہوتا ہے۔ گذشتہ دو روز سے میں کئی بار فوج سے علیحدہ ہو جانے کے معاملے پر غور کر چکا ہوں۔ لیکن بخوبی غور کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا۔ کہ میں نے جو دستور العمل بنایا ہے۔ اسے تبدیل نہیں کرنا چاہئے۔ وہ (دستور العمل) ہے اِس سال کے آخری حملے میں حصّہ لینا۔ جس میں مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ یا تو میں کام آجاؤں گا۔ یا زخمی ہو جاؤنگا۔ جو خدا کی مرضی ہوگی۔ وہی ہوگا۔ خدایا! مجھے بھُول نہ جانا۔ مجھے سمجھاؤ۔ طاقت۔ استقامت اور عقل دو ÷

۹۔ جنوری۔ میں نے اپنے خیال کو پورا کیا۔ یانووِچ نے فوراً معافی مانگ لی۔ لیکن کوئی بھی جان نہیں سکتا۔ کہ اس سے اِس موضوع پر دوبارہ گفتگو کرنے میں مجھے کتنی دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ افسرانِ بالا مجھ پر ناک بھوں سکوڑ رہے ہیں۔ لیکن میں اس کی بہت کم پروا کرتا ہوں۔ میں کچھ لکھنا چاہتا تھا۔ مگر زندگی کی یہ غیر مطمئن صورت مجھے کسی بات پر قائم نہیں رہنے دیتی ÷

۱۰ جنوری۔ گھوڑے پر سوار ہو کر ایندھن لانے کے لئے باہر

---

[1] اس وقت ٹالسٹائی دوسری آرٹلری بریگیڈ کی چوتھی بیٹری میں امیدوار افسر کے عہدے پر کام کر رہے تھے۔ یہ فوج کاکیشیا کے کوہستانی سردار شامل کے خلاف روانہ کی گئی تھی ÷

[2] ٹالسٹائی کا بڑا بھائی نکولا جس کا خاندانی نام نکولینکا تھا ÷

گیا - موسم بہت خراب ہے - مجھے سردی لگ گئی - شام کے وقت میں اچھی طرح نہ لکھ سکا - سر میں درد ہو گیا - میں جسم میں چستی لانے کے لئے بہت فکر مند ہوں ٭

۱۱ - جنوری - کچھ کام نہیں کیا - مانش کو وچ کے ساتھ گپ شپ کرتا رہا - اور اس سے یہ بھی کہہ دیا - کہ اگر ترقی ہوتی ہے تو میرا خیال ترقی کا حق اس (مانش کو وچ) کیلئے چھوڑ دینے کا ہے - اب کچھ نہ کچھ ضرور لکھونگا - طبیعت گھبرا رہی ہے ٭

۱۲ر جنوری - رفتہ رفتہ افسردوں کا غصہ سکوں پذیر ہوتا نظر آتا ہے "پریفرنس[1]" میں چھ روبل برباد ہوئے - "بنیک[2]" میں کھیلنا چاہتا ہوں - کوڑی پاس نہیں رہ گئی ہے - میں نے ایک تصویر بنانے کیلئے خاکہ تیار کیا ہے - جس کا نام ہوگا - "رقص اور .. .."

میرے گلے میں درد ہے - تاہم طبیعت بشاش ہے ٭

۱۳ - ۱۴ر جنوری - گلے میں درد رہا - لیکن ۱۴ر جنوری کو میں نے ارمی نیسکی کے ساتھ شراب پی - نہ بشاش ہوں - نہ مضمحل - آج تھوڑے پیسے لگا کر کھیلا - لیکن کھیل کا زور بڑھتا ہی جا رہا ہے - زندگی پر جمود طاری ہوتا جا رہا ہے - مانش کو وچ نے مجھے میرا نتیجہ مستقبل بتا دیا - یہ بالکل واضح تھا - کہ میری زندگی میں جلد ہی انقلاب ہونیوالا ہے - فی الاصل میں چاہتا بھی یہی ہوں - حقیقت یہ ہے کہ راستبازانہ زندگی گزارنے میں ہی مجھے خوشی ہے ٭

۱۵ر جنوری - صبح کچھ دور تک چہل قدمی کی - اب میں بیوسکی کو بالکل نہیں چاہتا - وہ یہیں ہے - "کونک[1]" لوگ مجھے بہت پریشان کر رہے ہیں - بالٹا[2] کو بھگا رہا ہوں - تھوڑا لکھ سکا ہوں - یہ عجیب بات ہے - کہ میں جس موضوع پر لکھنا چاہتا ہوں - اُسی میں پسماندہ رہ جاتا ہوں - برابر ایسا ہی ہوتا ہے "پریفرنس" نہیں کھیلا - تاشش کھیلنے کو طبیعت بہت للچائی ٭

---

[1] و [2] مختلف قسم کے جوئے ٭

[1] ایک طرح کے دوست جن کی کیفیت ٹالسٹائی نے اپنی خالہ کو ایک خط میں لکھی ہے - کہ کونک بننے پر تحفۂ محبت دینا پڑتا ہے اور دوست کے گھر دعوت کھانی پڑتی ہے - بعد ازاں پرانی رسم کے مطابق (جو اب معدوم ہے) موت و زندگی سب کے لئے ایک دُوسرے کے دوست بن جاتے ہیں - اس کا مطلب یہ ہے - کہ اگر اپنے دوست سے اس کی دولت اس کی بیوی - اس کے ہتھیار یا بیش قیمت چیز جو اُس کے پاس ہو مانگوں وہ مجھے دے دے - اور وہ جو مانگے - وہ مجھے بھی دے دینا پڑیگا ٭

[2] ایک پہاڑی بہادر ٭

ترجمہ

خواجہ محمود جاوید ایم - اے

قطعات

فطرت عالم طراز ہے میری ہر ادا پردہ ساز ہے میری
جا رہا ہوں جہاں سے آیا ہوں زندگی ایک راز ہے میری

خیالِ من و تو فراموس کردوں مجاز و حقیقت ہم آغوش کردوں
گراں باریٔ رنج و غم سے خودی کو سبکبار کردوں سبکدوش کردوں

احسان اللہ خاں مضطر

صفحۂ اطفال

"مِس فلورا"

(گزشتہ سے پیوستہ)

پڑوس کے کسی لڑکے نے کوٹھے پر ایک بندر
کو دیکھ پایا۔ شور مچانے لگا۔ کہ

بندر بندر بندر

اس کا اتنا کہنا تھا۔ کہ آس پاس کے سب
لڑکے جمع ہو گئے اور قلقاریاں مارنے لگے

"لے مالو روٹی تیری ماں موٹی"

یہ شور سُن کر کلوا بھی باہر نکل آئے۔ اور اُونچے
سُروں میں پروٹسٹ گانے لگے۔ پھر تو محلّے
میں جتنے کُتّے اور کُتیاں تھیں۔ ان کی محفل جم
گئی۔ بھوں بھوں بھوں سے کان پڑی آواز
سُنائی نہ دیتی تھی۔

چمپا بولی۔

آگیا۔ وہ مری لیا کلوا اِس کا جائے ستیاناس
مجھے لنڈی بوچی کر دیا۔ بھئی سچ تو یہ ہے۔ یہ
شادی مجھے بڑی مہنگی پڑی۔ برادری میں
منہ دکھانے کے لائق نہ رہی۔

لالو۔ دیکھو پھر ابھی تمہارا بدلہ لئے لیتے ہیں۔ اِس
لُنڈرے کو وہ مزا چکھائیں۔ کہ چھٹی کا دُودھ
یاد آجائے۔

فلورا۔ یہ موقع مناسب نہیں۔ کُتّوں کی یلغار
ہے۔ پھر کلوا بڑا خونخوار۔ ناحق میں کسی مہمان
کے چوٹ پھینٹ لگ جائیگی۔ اِس وقت
طرح دے دو۔ پھر دیکھا جائیگا۔

چنوا۔ میں نے تو مِنّت مان رکھی ہے۔ اس کلوا
نامعقول سے چمپا بہن کا بدلہ ضرور لینا ہے
ہمارے دوستوں پر کُتّوں کے دانت تیز
ہو جائیں۔ تو پھر عزّت کیا رہی۔ لالو ذرا
آگے کو بڑھو۔ کلوا جیالا ہے۔ وہی آگے
بڑھے گا۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ ہم بندر
ہیں بندر۔ بلاؤ نہیں کہ یوں چُپ چپاتے
زخم کھالیں۔ لالو نے ایک سُنی نہ دو جھٹ
منڈیر پر کُود گیا۔ پھر تو کُتّوں نے آواز
ملا کر خیر مقدم کی نظمیں گانی شروع کیں۔

تو محلّہ سر پہ اُٹھالیا۔اور کلوا میر مشاعرہ بن کر چھلانگیں لگانے لگا۔

سارے بندر ایک ایک کرکے کلوا پر ٹوٹ پڑے باقی کتّے تو اس معرکے سے دُم دبا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔کلوا نے جی کڑا کرکے لالُو کے بڑک مار ہی دیا۔چنوا قدوقامت میں چھوٹا موٹا گدھا تھا۔ کلوا کو لالو پہ حملہ آور دیکھ کر کود پڑا۔اس کے ساتھ باقی بندر بھی کُود گئے۔پھر کیا تھا۔کلوا پر بے بھاؤ کی پڑنے لگیں۔دو ہی منٹ میں ٹیاؤں ٹیاؤں کرنے لگے۔باقی حریف کتّے اپنے دروازوں کے سامنے بھوں بھوں کرتے رہے۔کسی کو اتنی ہمّت نہ ہوئی۔کہ کلوا کا ساتھ دے مصیبت میں دردی ساتھ دیتا ہے۔یا غرضی۔کلوا نے اپنی سینہ زوری اور طاقت کے نشے میں پڑوس کی کتّا برادری کو بہت دبا رکھا تھا۔کتّے دل میں تو خوش ہو رہے تھے۔برادری کے پاس سے دُور کھڑے پروٹسٹ کرتے رہے۔مگر کوئی پاس آ کر نہ پھٹکا۔بندروں نے مل جُل کر کلوا کو لہو لہان کردیا۔چنوا نے دُم کاٹ لی۔اور لالُو نے اس کے کان جڑ سے الگ کرڈالے۔ایک براتی نے ٹانگ چبا ڈالی۔پڑوس کے بچے بھی پتہ توڑ ہو گئے تھے۔ اب وہ لاٹھیاں لے کر آگئے تھے۔دو چار تو اپنے باپ کو ساتھ لے آئے۔آپ جانیں۔بندر ہو یا ہاتھی ریچھ ہو یا شیر۔انسانی برادری سے کنّی کاٹ جاتے ہیں۔

کلوا کو ادھ مُوا کر ہی چکے تھے۔چمپا نے مردوں کو آتے دیکھا۔تو شور مچانا شروع کیا۔

اے دُولھا میاں تمہیں میری جان کی قسم بس اب بس کرو۔مراتی کا خوب قیمہ بنا چکے ہو۔دیکھو گھر کے مردوے نکل آئے ہیں۔تمہاری جان سے ستّر پہرے دُور کہیں دشمنوں کو آزار نہ پہنچ جائے۔اِدھر فلورا نے قسمیں دیں تو لالُو کے کہنے سننے سے چنوا نے کلوا کی اَدھ موئی لاش کو چھوڑا۔اور آدمیوں کی بھیڑ کی طرف خوں خوں کرکے دوڑا۔پہلے حملے میں آدمی بھی پیچھے ہٹ گئے اور یہ سب دیوار پھلانگ کر کوٹھے پر آچڑھے۔اِس طرف سے آواز آئی۔فرزند میری بندوق اُٹھالا۔چھپا کے سے لا یہ بھاگ نہ جائیں۔چمپا نے یہ سُنا تو کہا۔

بھائیو! اب معاملہ خطرناک ہے۔بندوقوں کا مقابلہ کسی کے بس کا روگ نہیں۔رسمیں سب ختم ہو چکی ہیں۔اب بسم اللہ کر کے بارات کی رُخصت ہو جائے۔ گیارھویں والے پیر کی امان۔

کسی ہتنٹے نے بندوق چلا دی۔ تو ناحق کسی کی جان
خطرے میں پڑ جائیگی۔ پیر گگڑوں شاہ کے بہت
کہنے سننے سے بارات خوشی کے نعرے لگاتی
ہوئی دلھن کو لے کر رخصت ہوئی۔ فلورا چلتے وقت
چمپا سے مل کر رونے لگی۔ چمپا بولی۔
رونا کاہے کا۔ خوشی کا وقت ہے۔
"پنچ مل خدا۔ خدا مل پنچ"۔ پنچوں نے تمہارا ہاتھ
چودھری چنوا کے ہاتھ میں دیا ہے۔ عزت آبرو سے
اپنے گھر رخصت ہو رہی ہو۔ اس سے بڑھ کر خوش
نصیبی کیا ہوگی۔ ہر ہفتے تمہیں لینے آیا کرونگی۔
فلورا نے آنسو بھری آنکھوں سے ایک نگاہ گھر پر
ڈالی اور چنوا کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر روانہ ہوئی
اتنے میں بندوق آئے ساری بارات پیڑوں کو
پھلانگتی چھتوں پر چھلانگیں لگاتی کہیں کی کہیں
پہنچ گئی۔
ادھر کلوا کچھ دیر تڑپے تڑپائے۔ بدن سے
خون زیادہ نکل چکا تھا۔ میاں اسلم کی بیوی نے
وٹرنری اسپتال بھیج کر چمپا کو بچا لیا تھا۔ اس غریب
کی کسی نے خبر نہ لی۔ اور تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ صبح
کو بھنگی نے ٹانگ کھینچ کر کوڑے کی گاڑی میں ڈال
دیا۔ اور شہر سے باہر جا کر پھینک دیا۔ گدھوں اور
چیلوں کی بن آئی۔ تکا بوٹی کر کے کھا گئے۔" ہمیشہ
رہے نام اللہ کا"۔
فلورا دلھن بیاہی ہوئی چار باغ پہنچیں۔ تو بندریوں
کی ایک ٹولی نے ان کا استقبال کیا۔
چنوا دولھا کی بہن منی بندریا نے گولر پر چڑھنے نہ
دیا۔ راستہ گھیر لیا۔ اور بولی۔ پہلے میرا حق دلواؤ۔
تب بھابی جان کو گولر پر چڑھنے دونگی۔ چنوا نے
باغ کے کنارے کا گولر راستہ گھرائی کی رسم میں بہن
کے نام کیا۔ تب منی نے راستہ دیا۔ اور دلھن کا پنجہ
پکڑ کے گولر پر لے کر چڑھی۔
ڈومنیوں نے اپنا راگ چھیڑ دیا۔ بندریوں نے
باری باری سے پکے گولر بیل میں دیئے۔
دولھا چودھری کی خیر۔ دلھن لائی مبارک۔ پیر بالو شاہ
برکت دے۔ دولھن دودھوں نہائے۔ پوتوں
پھلے۔ پھلواسے بچے پالنے نصیب ہوں۔ بچوں
سے چاروں گولر آباد رہیں۔ ہمارا حق بھی ہے۔
دعائیں مانگتے مانگتے زبان گھس گئی۔ تب یہ دن
پیر بالو شاہ نے دکھایا ہے۔ چودھری کو میری ماں
نے دودھ پلایا ہے۔ جب پہلی چھلانگ تم نے
لگائی ہے تو میری نانی نے پیر صاحب کے کونڈے
کئے۔ اماں بہشتن نے گیارھویں والے پیر کی گیارھویں

منائی۔ آج کو وہ ہوتیں۔ تو ایک گولر کا پیڑ لئے بغیر
میں یہاں سے نہ ٹلتی۔
چنوا نے کمپنی باغ کی ایک جامن ڈومنیوں کو دی۔
دعائیں دیتی۔ بدھائیاں گاتی ڈومنی بندریاں
گولر سے اتریں۔ منی کی جوان بیٹی گلنزارو نے گینڈول
کی گت پر ناچ دکھایا۔ سارے بندروں نے
تالیاں بجائیں اور فضائیوں میں سے لوٹتے ہوئے نان
گلنزارو کو دے دیئے۔ پھر کھیر کھلانے کی رسم ادا ہونے
لگی۔ دولھا کی نانی نے دولھا دولھن کو آمنے سامنے
بٹھا کر کمہاری سے چھینا ہوا گوٹے ٹھپے کا ایک دوپٹہ
دونو کے سر پر ڈالا۔ اور رامن حلوائی کی دوکان کی
اڑائی فیرنی کی ہانڈی بیچ میں رکھی۔ نند کے کہنے سے
دلھن نے پنجے میں فیرنی ہانڈی سے نکالی۔ اور پنجہ بڑھا
دیا۔ دولھا نے جھپ سے آگے بڑھ کر کھیر پر منہ مارا۔
کہ نند کے اشارے سے دلھن نے پنجہ کھینچ لیا۔ اس پر
ساری بندریوں میں ہنسی پڑ گئی اور دولھا سے چھیڑخانیاں
ہونے لگیں۔ دوسری بار دلھن نے کھیر کا پنجہ آگے
بڑھایا۔ تو اب کے دولھا پہلے سے چوکنے تھے۔ ایک ہاتھ
سے پنجہ پکڑا اور کھیر پر منہ مارا۔ اس دفعہ کھیر کھانے میں
کامیاب ہو گئے۔ بندریوں نے تالیاں بجائیں اور اس
طرح کھیر کھانے کی رسم ادا ہوئی۔ اس کے بعد رونمائی
کی رسم کا تقاضا ہوا اور گوٹے والا دوپٹہ دولھن کو سر
سے پاؤں تک اڑھا دیا گیا۔

سب سے پہلے ننیا ساس نے سر سے دلھن کا گھونگٹ
کھول کر منہ دیکھا۔ اور بولی پیر بانو شاہ کی مہربانی سے
دولھن چندے آفتاب چندے ماہتاب ہے۔ ناک
نقشہ آسمانی بندر نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔ آج
کو اس بندی کی بیٹی زندہ ہوتی۔ تو اپنی بہو کو دیکھ کر کیسی
کیسی خوشیاں مناتی (آنکھوں میں آنسو بھر کر) جان
ہارنے بیٹے کے بیاہ کی منتیں مان رکھی تھیں۔ رتجگا کرونگی۔
کونڈے کھلاؤنگی۔ پیر بیری شاہ کا دونا چڑھاؤنگی۔
پیر بانو شاہ میرے جیتے جی یہ شبھ گھڑی لاؤ۔ چنوا کی
مٹکنا سی دولھن گولر پر پھلانگیں لگاتی دیکھوں۔ مگر
بدنصیب کو یہ خوشی دیکھنی نصیب نہ تھی۔ اب اس کی
روح بندروں کی بہشت میں خوش ہو رہی ہوگی۔ یہ
کہہ کر ننیا ساس نے چار باغ کا لدا پھندا امرود کا پیڑ
رونمائی میں دلھن کو دیا۔ دلھن آداب بجالائی۔

پھر نند نے گھونگٹ کھول کر منہ دیکھا۔ اور لگی بھاوج
کی تعریفیں کرنے چشم بد دور میری آنکھوں میں خاک۔
دلھن کی دسوں انگلیاں دس چراغ ہیں۔ آنکھیں کیسی
رسیلی ہیں۔ دیکھنے والی آنکھ جھپ جاتی ہے۔ منہ کا
دہانہ جیسے خوبصورت سیپ۔ دانت موتی کی طرح

چمکتے ہیں۔ چار باغ کی ملکھن کا بڑا گدھا رُونمائی میں بھاوج کے
نام کیا۔ بھاوج نے اُٹھ کر سلام کیا۔ برادری کی بوڑھی جوان
بندریوں نے گھونگٹ کھول کھول کر مُنہ دیکھا۔ کسی نے گولر رُونمائی
میں دئے۔ کسی نے نان۔ کسی نے مٹھائی۔ کسی نے کیک۔ ایک بندریا
نے کلو قصائنی سے چھینا ہوا دوپٹہ دیا اور بولی۔
پرسوں سے ساری برادری کی بہنیں کہاروں اور قصائیوں
کے کوٹھوں پہ پھر رہی ہیں۔ جو جس کے ہاتھ لگا۔ رُونمائی کے لئے
چھین لائی۔ جمیا کے ابا کلو قصائنی سے یہ دوپٹہ چھین لائے۔
ہنتنی چھنتی رہ گئی کہ

ہائے ہائے میرا نیا دوپٹہ

منگلو کے باپ دوڑیو۔ موا بندر چھینے لئے جا رہا ہے کوٹھے کی
منڈیر پہ ابھی تھا۔ قصائی ہنیا کوٹھے پر چڑھ گیا۔ جمیا کے ابا کو
للکارنے لگا۔ جمیا کے ابا تم جانو بے جگرے بندر ہیں۔ خوں خوں
کر کے جو اس پر دوڑے۔ مراتی چھپر پہ کود گیا۔ بھاگتے کی
پگڑی بھی چھین لائے۔ پگڑی سے تو میں نے بچوں کا مُنہ لپیٹا
کیا۔ سردی میں سکڑتے پھرتے تھے۔ دوپٹہ قیمتی تھا۔ یہ میں
دلھن کے لئے لے آئی۔ بلو بندریا نے شیرمال رُونمائی میں پیش
کئے اور کہنے لگی۔
میں اور چھمو کے باپ کل سے موُنج کُٹوں کی گلی میں پھر رہے
تھے۔ کوئی ڈھب کی چیز ہی ہاتھ نہ لگی۔ گلی میں سے سینی میں
کوئی شیرمال لئے جا رہا تھا۔ بہتیری روکتی رہ گئی۔ کہ بیچ گلی
میں کسی پر جھپٹا مت مارو۔ سارے موُنج کُٹے مراتی گلی میں
موُنج کوٹ رہے ہیں۔ دوڑ پڑینگے۔ نہ مانے اور منڈیر سے
پھلانگ لگا کر سینی پہ کود پڑے۔ سینی والا ڈر گیا کہ یہ کیا
مصیبت ٹوٹی۔ سینی پھینک گلی سے اُڑن چھو ہو گیا۔
ایک موُنج کُٹے موُئے نے آ کر دھم سے اپنی مونگری
ان کے سر پہ رسید کی۔ پھر تو مجھ سے بھی نہ رہا گیا۔
کوٹھے سے کود دی۔ اس کی جُروا آگ جلا رہی تھی۔ اُس
نے جو آگ میں پھونک ماری۔ میں نے اُس کا جُوڑا چولھے
میں دے دیا۔ شطّارہ نے شور ڈال دیا۔
"جل گئی مر گئی۔ اری میرے بال جھونڈے گئے"۔
ساری عورتیں دوڑی آئیں۔ چھمو کے باپ نے مونگری
تو کھالی۔ مگر موُنج کُٹے کے کپڑے تار تار کر دیئے۔
اور ایک دفعہ ہی جو اُس کے سینے میں سر مارا۔ دھڑام
سے نالی میں گر پڑا۔ میں مار کھانے سے پہلے کوٹھے پر
پہنچ چکی تھی۔ چھمو کے ابا دس شیرمال بغل میں دبا منڈیر
پر آ دھمکے۔ منڈیر سے ہم دونو پیپل پر۔
پیپل سے جامن پر۔ غیبا تیں شور مچاتی رہ
گئیں۔ اور ہم چار باغ پہنچ گئے۔

(باقی آئندہ)

تاجور

کیفِ مُطالعہ

حضرتِ دیوانہ کی کیفیات[1] کو دیکھ کر بے اختیار زبان ہوش پہ آتا ہے ؎

سُن کے اُس کا ہوشمندانہ کلام
پوچھتے ہیں سب کہ یہ دیوانہ تھا

شائع کنندہ فرم نے حضرت دیوانہ کا تعارف کرانے میں یونیورسٹی کی ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی اور ڈی لٹ کی ڈگریوں کو شمار کرانا ضروری خیال کیا۔

مگر حقیقت یہ ہے۔کہ ان کا اسم گرامی ان ڈگریوں کا محتاج نہیں۔شاعرانہ برادری میں وہ خود اپنا تعارف اس طرح کراتے ہیں ؎

یہ آئے حضرت دیوانہ جن کا ذکر ہوتا تھا
ہیں اپنے ہم پیالہ پیتے ہیں اور خوب پیتے ہیں
بدولت مہرِ یاراں باوجود نفرتِ اعدا
خدا کا شکر ہے جیتے ہیں یہ اور خوب جیتے ہیں

'دیوانہ' اور "خوب پیتے ہیں" سمندِ ناز پہ اک اور تازیانہ لگا۔اس میں شاعر کے رُوحانی سرُور کا تعارف ہے 'خدا کا شکر ہے۔ جیتے ہیں یہ اور خوب جیتے ہیں'۔ پہلا جُزو دُنیاوی کشمکش کا مرقع ہے۔مگر اس قدر کہ کر تعارف کنندہ کو شاعر کی فلسفیانہ رفعتِ خیال یاد آتی ہے۔اور وہ کہتا ہے۔" اور خوب جیتے ہیں"۔ وہ خود فرماتے ہیں ؎

اس حسن پرست کو پاؤ گے ہرگز نہ گلی بازاروں میں
دیوانے کو جلوہ پیرا دیکھو اُس کی تحریروں میں

یاد آیا میکہ زمانہ تعلیم میں یونیورسٹی کے اعلیٰ مدارج کو طے کرتا ہؤا یہ نوجوان فلسفی اپنی چشم جذبات سے سامان دُنیا کا جائزہ لے رہا تھا۔مادی دُنیا کے مشاہیر کو دیکھا۔تو کہا ؎

ترا ذوقِ عمل بس گرمئ خون جگر تک ہے
ترا دعوٰئ ایماں نشۂ فتح و ظفر تک ہے

طبقۂ متوسط کو دیکھا تو کہا ؎

خود غرض دُنیا کی حالت دیکھ کر خلوت میں ہوں
سچ تو یہ ہے چھُوٹ کر اس سے بڑی راحت میں ہوں

بزمِ احباب کو دیکھا تو درد محسوس کیا۔اور کہا ؎

جس نے دیکھا ہو خودی کا کاروبارِ جاں گزا
کیوں نہ بے خود ہو نہ دیوانہ بنے وہ کس طرح

دنیائے شاعری میں دیکھا کہ ؎

عشرت فانی کا مضموں شاعروں کو ہے پسند
ہیں ملمع ساز و قصہ باف اب اربابِ فن

نوجوان فلسفی کہ جس کی امنگ یہ تھی کہ ؎

یہی دُنیا نہیں سب کچھ یہی فرصت نہیں سب کچھ
ہمیں گلگشت کرنی ہے بہت سے آسمانوں میں

اس کے جذبات کو صدمہ پہنچا۔اور اُس نے شاعر سے کہا ؎

تجھ کو خدا نے دی تھی بہار آفریں نظر
تو نے نظر کر بیچ دیا برگ و گُل کے ہاتھ

جب یہ نوجوان یورپ پہنچا۔تو بول اُٹھا ؎

تعلیم خودی کا دیکھنا ہو انجام تو دیکھو یورپ کو
ہیں غیر تو غیر آخر حائل اپنوں میں بھی دیواریں ہیں

غرضکہ نوجوان فلسفی نے یہ طے کر کے کہ ؎

فکرِ معاش چاہیئے ذکرِ خدا کے بعد
فکرِ معاش موجِ سکوں سے فزوں نہیں

کارزارِ زندگی میں قدم رکھا تو دیکھا ؎

---

[1] کیفیات۔ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ کی منتخب اُردو غزلیات کا مجموعہ۔

ہوس پرست رات دن حزینِ حادثات ہے
خود اس پہ گرچہ منحصر حدوث کی حیات ہے
اور کہہ اُٹھا ؎
کسی کو فکرِ خسروئ خونفشاں جو ہو تو ہو
خدا پرست کو کہاں سرِ سیاسیات ہے
رقیبوں سے واسطہ پڑا۔ مقابلہ بھی دل ناتواں نے خوب کیا۔ مگر جس کا طریق کار یہ ہو کہ ؎
ہر اک طرح کے کشت و خوں سے صوفیہ نفور ہیں
نہ ڈھائینگے حریمِ دل ہو یا کہ سومنات ہو

یا

ہے عرض یہی مانگ کے پینے میں ہے ذلت
یہ کس نے کہا تجھ سے کہ تُو بادہ کشی چھوڑ

یا

ڈرتے رہے ہیں تجھ سے خطا و صواب میں
کہنا ہے بس یہی ہمیں روزِ حساب میں
وہ رقیبوں کے اڑنگوں کا کیا جواب دیتا۔ آخر انجام جو ہونا تھا۔ وہی ہؤا۔ مگر وہ فلسفہ ہی کیا جو شکست کو فتح نہ سمجھے۔ ہاں تو فلسفی نے کیا کیا۔ ملاحظہ فرمائیے ؎
دشمن کے حملے کا نہ دیا ہم نے کچھ جواب
دُشمن کو اس کی نظروں میں آخر زبوں کیا
ہم نے شکست میں بھی لئے فتح کے مزے
صیّادِ غم کو صبر سے صید زبوں کیا

و

کچھ لُطف اُٹھا سکا نہ حریف اپنی فتح سے
دیکھا جو ہم حزیں نہیں اپنی شکست سے
اہل دُنیا کی ستم ظریفانہ یا خلقی بے اعتنائی اصحاب کمال کے لئے ہمیشہ دلشکن اور یاس آفریں ہوتی ہے۔ مگر اہل دل اس کی پروا نہیں کرتے۔ ایسا کونسا ادیب یا شاعر ہے جس کو اپنی تصنیفات کی طباعت اور اشاعت میں اہل مطابع کا خود غرضانہ برتاؤ دلشکن معلوم نہ ہؤا ہو۔ اور پھر بدقسمت ہندوستان کی فرقہ بندی۔ خود ادیبانِ اُردو کا باہمی سلوک۔ کمزور طبائع مایوس ہو کر خاموش بیٹھ جائیں مگر اہل کمال ان تجربات کے بعد کہ ؎
بِکتا نہیں ہے مُفت بھی کوئی ہُنر کو آج
بہر تجارت اور ہی کوئی متاع ڈھونڈھ
کچھ اس قدر نازک مزاج اور شکی ہو جاتا ہے۔ کہ اس کو بلا وجہ بھی دُنیا کے طرز میں بے اعتنائی اور کم التفاتی کی جھلک نظر آتی ہے۔ مگر وہ دُنیا کی نسبت اپنے نُقطۂ نظر کو تبدیل بھی نہیں کر سکتا گو بعض اوقات وہ خود کہتا ہے ؎
مجھ سے خفا نہ ہوں بھی تو جیسے ہیں وہ خفا
غیروں سے ہوں خفا بھی تو جیسے خفا نہیں
مگر جب وہ دیکھتا ہے کہ ؎
اسپِ تازی شدہ مجروح بزیر پالان
طوقِ زرّیں ہمہ در گردنِ خرمے بینم (حافظ)
تو اُس کو دُنیا سے نفرت ہو جاتی ہے اور وہ کہتا ہے ؎
عدوئے سفلہ کی دُنیا میں شہرت ہوتی جاتی ہے
ہمیں اب اور بھی دُنیا سے نفرت ہوتی جاتی ہے
رفتہ رفتہ اس کو نظر آتا ہے ؎
زمانہ کی سِفلہ نوازی سے مجھے
کرے گی کسی روز بے آبرو
تو وہ ایک شریفانہ اور فلسفیانہ احتیاط کرتا ہے کہ ؎
جہانِ سفلہ پرور سے مجھے اس درجہ نفرت ہے
کہ اب اپنا کمالِ فن جہاں سے میں چھپاتا ہوں
اس حالت میں تعجب کیا کہ اس کو ایک روز یہ کہنا پڑے۔
شعر ہر پہلو سے اپنا کامیاب
میری گمنامی خدا کا راز ہے
جناب دیوانہ! یہ تصویر کا خاکہ آپ کے حسب حال تو ہونے سے رہا۔ میرے حسب حال ہو تو تعجب نہیں مگر آفریں ہے آپ کی نظر باریک بیں کو۔ سچ یہ ہے کہ مجموعہ کا نام **کیفیات** اسم بامسمیٰ ہے جس کی تصدیق آپ کے اس شعر سے ہوتی ہے ؎
میرے طرزِ ادا میں میرا طرزِ زیست ہے پنہاں
مرا مضمون میرے مقصودِ ہستی سے عبارت ہے
ہاں! تو دُنیا کو دیکھا اور یہ بھی دیکھا ؎
مزا یہ تو دیکھو کہ خود بے وفا ہے
مگر ہم سے دُنیا وفا چاہتی ہے

دُنیا کے تلخ تجربات کے بعد پرستاران خودی نے کیا مشورہ دیا۔ وہ سُننے کے قابل ہے ؎

ہم نہ باندھیں گے آشیاں اپنا
برق کو اضطراب رہنے دو
مشورے دو نہ خود فروشی کے
ہم کو ناکامیاب رہنے دو
جنسِ اُلفت نہ تم کرو ارزاں
اپنے رُخ پر نقاب رہنے دو

یہ سچ بھی ہے کہ جس صاحبِ کمال کا مسلک یہ رہا ہو کہ ؎

سب کچھ کیا خوشامدِ بیجا مگر نہ کی
کرنا نہ تھا جو کام وہ ہم نے نہیں کیا

وہ اس مشورہ پر کیسے کاربند ہو سکتا تھا۔ خود فروشی کے راستہ میں یہ رکاوٹ تھی۔ مگر حضرتِ دیوانہ کے کلام سے یہ پتہ صاف طور سے نہیں لگتا۔ کہ اُس زمانہ میں "گندم نمائی و جو فروشی" کا طریقہ رائج ہو گیا تھا یا نہیں۔ غالباً یہ مشورہ نہیں ملا۔ اور اگر ملا۔ تو اُس استغنا پسند پاکیزہ طبیعت نے کہ جس کا مقصود یا معیارِ حیات یہ ہو کہ ؎

ہر اک صبح و مسا صبحِ ازل شامِ ابد سمجھو
نہیں ہر اک قدم آئینہ دارِ لُطفِ منزل ہو
گزر جائیں یُونہی دن رات یا رب ایک حالت پر
مجھے پستی و اوج زندگی سے کچھ نہ حاصل ہو

اُس کو پسند نہ فرما کر اور ہی طریقہ اختیار کیا۔ جس کو اس طرح بیان کیا گیا ہے ؎

بنا پایا اپنا نہیں جب کسی کو
تو خود ہو رہا آغوش میں کسی کا

کیفیات کے مطالعہ کے بعد جناب دیوانہ کا یہ رازِ سربستہ افشا ہو جاتا ہے۔ کہ وہ کس کے ہو رہے۔ اگر اس عقدہ کا حل پہلے ہی معلوم ہو جائے تو اس نسخۂ لاجواب کے مطالعہ کا لطف بیحد بڑھ جائے۔ اس خیال سے ناظرین کی سہولت کی خاطر عرض کیا جاتا ہے۔ کہ یہ حل ایک موہنی منتر ہے۔ جس کا نام **رُوحانیت** ہے۔ کسی بلند حوصلہ اور ہونہار ہستی کا محض دُنیا کی چال ڈھال سے متنفر ہو کر رُوحانیت کی جانب رجُوع ہونا ایک اہم اور غیر معمولی واقعہ ہے جس کو حضرت دیوانہ نے سادہ الفاظ میں مندرجہ بالا شعر میں بیان کر دیا ہے۔ کمزور طبیعتوں کے رُوحانیت کی جانب رجُوع ہونے کو **ویدانت درشن** میں ایک عجیب پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ کہ یہ حالت اس مایوسی کا نام ہے کہ جس کو انسان باوجود کوشش بیحد دُور نہ کر سکے۔ حضرت دیوانہ کو یہ جتانا تھا کہ پاسے اس مایوسی سے واسطہ نہیں پڑا۔ مگر کسی کمزور طبیعت کے غیر متوقع رُجحان روحانی کو دیکھ کر ویدانت درشن کے دقیق فلسفہ کو وہ سیدھے سادے عام فہم الفاظ میں اس طرح بیان فرماتے ہیں ؎

مصیبتیں ہمیں لے جاتی ہیں دعا کی طرف
جو یہ نہ ہوں تو نہ جائے بشر خدا کی طرف

یا

اقبال میں ہے خدا سے انکار
ہے راہِ خدا کا رہبر ادبار

اہل ہنود نے ہمیشہ **شاعری** کو معرفت یا رُوحانیت کا جزو بنایا۔ ان کی دھرم پستکیں تمام منظوم ہیں۔ سنسکرت زبان میں نثر لکھنے کا رواج بہت بعد میں شروع ہوا۔ **ہندو دھرم** کی تاریخِ قدیم کو اگر تفصیل وار بیان کیا جائے۔ تو عرفان۔ عقیدت۔ شاعری اور موسیقی کے چار حصّوں میں کل مضمون سما سکتا ہے۔ مشرقی ادیب یا فلسفی شاعر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بظاہر یہ دعوٰی مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔ مگر سچ یہ ہے۔ کہ مشرقی دل و دماغ کو سمجھنا آسان کام نہیں۔ اس مادیت کے زمانے میں جب کہ ہر شخص خودی اور خود غرضی کا شکار نظر آتا ہے۔ اور بقول حضرت دیوانہ

غلامی کا ہے عہدِ حکمرانی
غلامی میں اب اپنی آبرو ہے

ہندوؤں کے اس قسم کے دعاوی کا مبالغہ معلوم ہونا یا غلط قرار دیا جانا قدرتی امر ہے۔ قصہ کوتاہ حضرت دیوانہ کی رُوحانیت اور شاعری لازم و ملزوم ہیں۔ اُن کو **عقیدت** اور **اظہارِ عقیدت** کہنا غلط نہ ہوگا ؎

جناب دیوانہ! اگر رسمی تنقید پر اکتفا کیا جائے۔ تو یہ کہہ دینا کافی ہے۔ کہ **کیفیات** جدید اُردو شاعری کی سرمایۂ ناز ہے آپ نے سنگلاخ زمینوں میں وہ لہلہاتی کیاریاں آراستہ کی ہیں کہ ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔ مگر محض رسمی تنقید پر اکتفا کرنا کفرانِ نعمت سے کم نہیں۔ جب مجھ پر طوالت کا الزام لگایا جائیگا۔ تو میرا یہ جواب کافی ہوگا۔ کہ لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم۔

ناظرین کو **کیفیات** کے مطالعہ میں اوّلاً شاعری اور ثانیاً

معرفت سے واسطہ پڑیگا۔ اس لئے حضرت دیوانہ کو اوّل بہ حیثیت شاعر پیش کرنا زیادہ مناسب ہے۔ جب اُنہوں نے "تو خود ہو رہا آمرزش میں کسی کا" کی منزل کو طے کیا تھا۔ اس وقت اردو شاعری کیا تھی؟ لارڈ میکالے کا یہ مقولہ کہ" اصلی شاعری میجک لینٹرن کی مثال تاریکی ہی میں اپنا رنگ جما سکتی ہے" دراصل شاعری کی توہین ہے۔ یہ مقولہ مادہ پرست اور شہید خودی مغرب کے حسب حال ہو تو ہو۔ مگر مشرق کے حسب حال نہیں۔ مولانا آزاد نے **آبِ حیات** کے خاتمہ پر اردو شاعری کے تبصرہ کا خلاصہ اس طرح کیا ہے۔

" اے با اقبال بزرگو! افسوس کہ تمہاری شاعری نے بہت کم عمر پائی۔ قسمت نے تمہیں اچھے سامان دیئے .. .. .. اب نہ وہ سامان ہونگے نہ ویسے قدر دان ہونگے۔ نہ کوئی اس شاخ کو ہرا رکھ سکیگا۔ نہ تم سے بڑھ کر پھل پھول لگا سکیگا۔ ہاں تمہاری لکیروں کے فقیر تمہارے ہی ہجر و وصل اور خط و خال کے مضمون لینگے۔ انہیں لفظوں کو الٹیں پلٹیں گے۔ اور تمہارے چبائے ہوئے نوالوں کو مُنہ میں پھراتے رہینگے۔"

آبِ حیات کی اشاعت کے بعد مولانا آزاد کی حیات ہی میں جدید اُردو شاعری کی داغ بیل پڑ گئی تھی۔ علامہ اقبال۔ ترجمان قوم چکبست ماہر جذبات سرور۔ افتخار ان عقید تمندی فرحت۔ تمنّا۔ اُفق اور یادگار سلف شعلہ نے اردو شاعری کی کایا پلٹ دی تھی۔ مگر جمہور شاعری پر ان کا رنگ نہ چڑھا تھا۔ حضرت دیوانہ نے کیا دیکھا ؎

عشرت فانی کا مضموں شاعروں کو ہے پسند
ہیں ملمع ساز و قصہ باف اب ارباب فن

اس کا نتیجہ کیا ہوتا؟

شاعر ناکام کی سب حسرتیں کام آگئیں
قیس مجازی یا حقیقی صرف دیواں ہو گئیں

اس شاعری سے حضرت دیوانہ کا انحراف کرنا قدرتی تھا۔ اُنہوں نے اپنے ہمعصروں سے کہا ؎

تعلّیاں مبالغے ہیں زشت بد مذاقیاں
حقائق نہفتہ کے جمال کو عیاں کرو
بناؤ مطمح نظر اسی کو اے سخنورو
تموّل ادا سے حال بیکساں بیاں کرو

و

تجھ کو خدا نے دی تھی بہار آفریں نظر
تو نے نظر کو بیچ دیا برگ و گل کے ساتھ

و

یہی دُنیا نہیں سب کچھ یہی فرصت نہیں سب کچھ
ہمیں گلگشت کرنی ہے بہت سے آسمانوں میں

مگر نقّار خانہ میں طوطی کی آواز کون سُنتا تھا۔ وسعت نظر۔ صفائے قلب اور ایثار کا قحط۔ کوئی شاعری کو لیڈری کا ذریعہ بنانا چاہتا ہے۔ کوئی اس کو تنور بنا کر روٹیاں پکانا چاہتا ہے۔ پھر اس مشورہ پر عمل کون کرے۔ آخر کار ؎

رہ گیا اک میں طلب گار دوام معرفت
بک چکے آسائشوں کے ہاتھ ابنائے زمن

حضرت دیوانہ نے شاعری کا نصب العین حسب ذیل مقرر کیا

جذبات جانِ شعر ہیں جذباتِ شعر جاں
شاعر کی آپ بیتی ہے مسطور شعر میں
جوہر ہے اپنے تجربہ کا شمع زندگی
پیدا برنگ نغمہ ہے وہ نُور شعر میں
جو آنے والی نسلوں کو ہادی کا کام دے
وہ حسن انتقاد ہے منظور شعر میں
تھی وسعتِ خیال جو بیروں حدود سے
دلپسند ہو گئی ہے وہ محصور شعر میں
آزادیوں سے ہے چمنِ زیست کی بہار
تم ان کے ترک پر نہ ہو مجبور شعر میں

حضرت دیوانہ نے اصوٗل کو ہاتھ سے نہ دیا ؎

ہے غایتِ سخن آزادیٔ سخن کی حریف
جو رستگار سخن داں نہیں تو کچھ بھی نہیں

اُنہوں نے قواعد عروض کا حتی الوسع نہایت زیادہ لحاظ رکھا۔ اور ہر موقعہ پر جراُت اور قدرتی آمد سے کام لیا۔ اور زبان کی لچک کو مضبوط بنایا۔ جب وہ اُن بلند پروازیوں میں محو تھے۔ کہ جن کی بابت وہ کہتے ہیں ؎

فکرِ سخن میں اکثر میں اُس جگہ گیا ہوں
جس جا پر ایک میں تھا اور اک مرا خدا تھا

تو وہ خود محسوس کرتے تھے۔ کہ اس میدان معرفت میں باطنی اور ظاہری دو نو قسم کا امن ہے ؎

کریں گے عیب گیر کیا سخن پہ حرف گیریاں
کہ بابِ معرفت میں ہیں مری سخن طرازیاں

حضرت دیوانہ اپنے کلام کی خصوصیت خود یہ فرماتے ہیں ؎

افکار و تجربات کا جوہر ہے فلسفہ
جوہر ہے فلسفہ کا ہمارے کلام میں

شکر ہے کہ اب اس میدان میں وہ تنہا بادیہ پیما نہیں ہیں۔

آج بھی ارضِ ہند میں حسنِ ازل کے ہیں شہید
لیتا ہوں اپنا نام میں ایک مثال کے لئے

لوگ کچھ کہیں مگر حضرت دیوانہ اپنی کامیابی سے مطمئن ہیں ؎

کفر کا اس میں ہر اک انداز ہے ٭ نظم دیوانہ بت طناز ہے
شعر ہر پہلو سے اپنا کامیاب ٭ میری گمنامی خدا کا راز ہے
ہر سحر مرغ ثناخواں شاخ پہ ٭ اک نئی لے میں نوا پرداز ہے

دوسری خصوصیت کے اکتساب پر حضرت دیوانہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اگر **کیفیات** کا مطالعہ غور سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ گزشتہ اور موجودہ تحریکات و واقعات کی نسبت حضرت دیوانہ نے اپنی رائے کو رمز و کنایہ میں کس کس خوبی سے ظاہر کیا ہے۔ اس خصوصیت کو وہ خود اس طرح بیان فرماتے ہیں ؎

اظہار حق ہے رمز و کنایہ سے خوب تر
ذکر مے و ایاغ بلاغت نظام ہے

رمز و کنایہ کا لطف ملاحظہ ہو۔

(۱) ہم دیکھتے ہیں نقش و نگار صنم کہاں
محو یتیں ہیں حضرت بت کے حضور میں

(۲) ہر اک طرح کے کشت و خوں سے صوفیہ نفور ہیں
نہ ڈھائینگے حرم دل ہو یا کہ سومنات ہو

(۳) صنمکدوں میں آکے وحشتیں بھی رام ہو گئیں
ہوس کی موت عشق ہے غم صنم نجات ہے

(۴) مٹ سکتا ہے مٹائے سے ہر فرق و امتیاز
یہ اور بات ہے کہ نہ ملنے کی چاہ ہو

ہم ایسے کشتۂ ہوسِ زندگی نہیں
عزت کے ساتھ ہو تو ہمارا نباہ ہو

دل دے کے تمکو اپنا سمجھتے ہیں ہم تمہیں
تم جانو تم کو اب بھی اگر اشتباہ ہو

(۵) حسن زاروں میں رہو یا بادہ خانوں میں رہو
ایک ہے مے کا مزا اور دیدبازی کا مزا

(۶) مطلب کی دوستی ہے غرض کا ہے اتحاد
دل آسکے نہ، آگئے دینار ہاتھ میں

(۷) ہو قوم میں کس طرح صلاحیت نیکی
افراد میں جب خوبی کردار نہیں ہے

(۸) لے سکتا ہوں میں اپنی دعاؤں سے وہی کام
مانا کہ میرے ہاتھ میں تلوار نہیں ہے

(۹) جسے خدا کی نظم کائنات کا لحاظ ہو
وہ دین و دل کی بزم میں فساد کیوں بپا کرے

(۱۰) ہمیں بھی ہر نئی طلب میں ملتا ہے نیا مزا
کہو کسی کو روپ وہ نئے نئے بھرا کرے

(۱۱) تیرے کوچے میں ہم ذلیل ہوئے
بارے ارماں نکل گیا دل کا

(۱۲) بندگی میں شرمساری ہے ضرور
خواجہ کے در پر تمہیں جانا نہ تھا

(۱۳) بت شکن لے گیا زر و گوہر
رہ گئی حسن و عشق کی دولت

(۱۴) دیکھی نہ واہ واہ کی حقدار کوئی بات
غیرت نے یہ نہ چاہا کریں آہ آہ ہم

(۱۵) ہر غم نصیب کیلئے روتے ہیں اشک خوں
اپنے لئے نہ ایک بھی آنسو بہا سکے

(۱۶) اک حال پہ قائم ہے تو دیوانہ تمہارا
دنیا کی نہ پوچھو یہ کبھی کچھ ہے کبھی کچھ

(۱۷) پیری و جوانی میں نہیں فرق رہا کچھ
اب عشق ترا عام ہوا پیر و جواں میں

(۱۸) منصب کی برتری کا ہمیں فرض احترام
کیجئے مگر حضور کی نخوت کو کیا کریں

(۱۹) گئی رونق مسجد اب میکدے میں
ہجوم آج کل اس میں کم دیکھتے ہیں

(۲۰) کولھو کے بیل سے نہیں انسان بہتر

دن بھر چلا اُسی جگہ لیکن ہے شام کو

(۲۱) شیطاں کو سوجھتی ہے ہمیشہ نئی نئی
گو ہے سیاہ کار پہ روشن دماغ ہے

(۲۲) ناکامیوں میں بھی چھپی ہیں کامرانیاں
یہ بات قطع راہِ محبّت میں دیکھئے
دیکھا بہت حضور کا انصاف دہر میں
باقی جو رہ گیا سو قیامت میں دیکھئے

(۲۳) وہ کسی کا نہیں گیا اس کی شکایت اے دل
تُو تو اپنا ہے مگر تیرا بھروسہ کیا ہے

(۲۴) ہم بے زباں ہیں کیوں نہ ہو وہ شوخ بدزباں
ہم عجز خُو ہیں جب تو وہ کیوں تُند خو نہ ہو

(۲۵) میخانے میں پینے کا مزا اور ہی کچھ ہے
اور یوں تو غنیمت ہے کسی بزم دمکا نہیں

(۲۶) ہے عرض یہی مانگ کے پینے میں ہے ذِلّت
یہ کس نے کہا تجھ سے کہ تُو بادہ کشی چھوڑ

(۲۷) ایک میخانہ تھا باقی ہم سے آزادوں کا گھر
نامِ آزادی یہ سو بھی آہ! چھِن جانے کو ہے

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ مدعیان زباندانی نے بلا وجہ فصیح اور جامع الفاظ کو جو روزمرہ استعمال میں آتے ہیں۔ متروک قرار دیا ہے۔ مثلاً 'مت'۔ 'پر' بمعنی مگر۔ شکر ہے۔ کہ حضرت دیوانہ صاحب نے ان مدعیان زباندانی کی پیروی نہیں کی۔

اگرچہ قواعد عروض کے دلدادہ شاید دو چار سقم نکالدیں۔ مگر وہ سقم پچھلی صدی کے ساتھ رخصت ہو چکے۔ اب شاعری آمد ہے نہ کہ آورد۔ حضرت دیوانہ کا یہ طرز مخصوص کہ فارسی الفاظ کی ہندوستانی جمع بنائی جائے۔ مثلاً محویتیں مصیبتیں وغیرہ ہر اک ہندوستانی کو جو اردو کو ہندوستانی زبان سمجھتا ہے۔ نہایت پسند آئیگا؛

اگر اس مضمون کا مقصود یہ ہوتا کہ حضرتِ دیوانہ کے شاعرانہ کمال کی تعریف کی جائے۔ تو شاید جو کچھ لکھ چکا ہوں۔ اس میں کچھ اور اضافہ کر کے مضمون کو ختم کر دیتا۔ مگر شاعرانہ کمال کی جستجو کے خیال سے کیفیات کا مطالعہ بہت ضروری نہیں۔ شاعرانہ کمال سے کم و بیش اساتذہ سلف کا کلام بھرا پڑا ہے۔ اس نسخۂ لاجواب کی خصوصیت فلسفۂ رفیع - روحانیت اور وحدانیت کے رموز کا بہت سیدھی سادھی زبان میں انکشاف ہے۔ یہ خوبی اور خصوصیت بدرجۂ اتم **گیتا نجلی** میں موجود ہیں۔ اس کا فلسفہ بھی زیادہ رفیع ہے۔ مگر اُس فلسفہ کو سمجھنا اور ذہن نشین کر لینا ہر شخص کے لئے ممکن نہیں۔ وہ فلسفہ مسلسل ہے اور اُردو داں اصحاب تک جو اس کا ترجمہ پہنچا ہے وہ نثر میں ہے۔ **کیفیات** اُردو نظم میں اسی فلسفہ کو آسان کر کے تغزل کے چٹخارے کے ساتھ۔ سرور مے۔ گل و بلبل۔ ہجر و وصل کے رنگوں سے آراستہ دکھاتا ہے۔ جس سے مضمون دلچسپ۔ اور دُنیا داروں کے لئے قابل فہم ہو جاتا ہے۔ مگر خواہ **گیتا نجلی** کا مطالعہ کیجئے۔ خواہ **کیفیات** کا۔ اس وقت تک لطف اندوز ہونا مشکل ہے۔ جب تک کہ آپ خود فلسفی نہ ہوں۔ یا کم از کم فلسفۂ رفیع سے آپ کو آگاہی اور لگاؤ نہ ہو۔ یہ فلسفہ جس قدر عظیم الشان ہے۔ اسی قدر آسان ہے۔ بشرطیکہ صفائے قلب میسر ہو۔ فلسفۂ عرفان کا جوہر وید مقدس میں بھرا ہے۔ وید مقدس کا جوہر اور آسان ہو کر اُپنشدوں میں ترتیب دیا گیا۔ اُپنشدوں کا خلاصہ گیتا میں آگیا۔ گیتا کے رموز حقانی کی دلچسپیاں محسوس کرنے کے لئے ایک عمر درکار ہے۔ مگر کبیر جی نے کہا ہے ؎

نیارا نیارا ہوت ہے جُگ جُگ کا بیوہار
چر جا تپ ست جُگ بکھے دوا پر جُگ آدھار
سیوا ہوم اپاسنا عمل تریتا بیچ
کلجگ میں بھگتی بھئی کیا اوتم کیا نیچ

اگر کوئی گیتا کا خلاصہ دریافت کرے۔ تو اس کے جواب میں صرف یہ کہدینا کافی ہے ؎

دِل میں تو افکار باطل ہیں قطار اندر قطار
اور زباں پر یہ مقالاتِ بصیرت کی بہار
چھوڑ دے اوہامِ باطل راہِ نو طرزِ قدیم
میری شرناگت میں آ یہ ہے صراط المستقیم
بارِ عصیاں گر ہے بھاری فکر کرتا ہے فضول
مجھ سے گر وابستگی ہے مغفرت ہو گی حصُول

کرشن مہاراج کے زمانہ تک عموماً وصل حق کو "من دیگرم تو دیگری" کے اصول پر مبنی سمجھ کر منزل دشوار سمجھا جاتا تھا۔ اور رسائی کے لئے 'شغل'۔ 'فکر' اور تصوّر کے طریقوں پر عمل کیا جاتا تھا۔ گویا ہجر کی کڑی منزلوں کو طے کر کے وصل کی نوبت آتی

تھی۔ مگر اُس رہبر کامل نے اس مقصود کو 'من تو شدم تو من شدی' کے اصول پر قائم کر کے زمانہ کی دماغی حالت کو بدلنے کا موقعہ فراہم کیا۔ پہلے کثرت میں وحدت نظر آتی تھی۔ تو اب وحدت میں کثرت نظر آنے لگی ٭

اس فلسفہ رفیع کی مختصر تفصیل اس طرح بیان کیجا سکتی ہے۔ کہ ہستیٔ انسانی وجود واجب کا جزو ہے۔ اور یہ جدائی محض عارضی اور سطحی ہے۔ کل اور جزو کے درمیان ہمیشہ کشش عمل پذیر ہے۔ دونو کا ایک دوسرے کی جانب رجحان ہے۔ صرف فرق اس قدر ہے۔ کہ انسانی دماغ علائق دُنیا سے متاثر ہو کر یا من دیگرم تو دیگری کے وہم میں گرفتار ہو کر اپنی جزوی کشش کو کمزور یا معطل یا معدوم کر کے کل سے دُور ہو جاتا۔ مگر کل کی کشش چونکہ زیادہ طاقتور اور کارگر ہے۔ اس کو سنبھالتی ہے۔ اور جس وقت ذرا بھی جزوی کشش برقرار ہو جاتی ہے۔ تو کل کی کشش ایک دم اس کو اپنے وجود میں شامل کر لیتی ہے۔ گویا کثرت میں وحدت کی بجائے وحدت میں کثرت ہو جاتی ہے اور اسی طرح **بھگتی یوگ** کا آغاز وصلِ حقیقی یا احساسِ حضوری سے ہوتا ہے۔ جو دراصل ایک دماغی کیفیت ہے۔ جس کا مقتضا یہ ہے۔ خواہش اور انجام کو بالائے طاق رکھ کر انسان افعال کو محض ادائے فرضِ بشریت سمجھ کر کرے اور اپنی ہستی کو وجود واجب کا جزوِ غیر منقسمہ سمجھ کر خود پر مانما کو ہی اپنے افعال کا فاعل سمجھے۔ **کیفیّات** دراصل ایک مرقع ہے۔ کہ جس میں بھگتی یوگ کے مختلف تاثرات کو دکھایا ہے۔ چونکہ یہ یوگ صفائے قلب اور دماغی کیفیت سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے اس میں گورُو اور مُرشد کی بھی ضرورت نہیں جیسا کہ حضرت دیوانہ خود فرماتے ہیں ؎

احسان راہبر کا لیا سر پہ مفت میں
لے جاتا شوق منزلِ مقصود کی طرف
پیغمبروں کی عظمتیں سب کچھ سہی یہاں
ہیں کس شمار میں وہ خدا کی جناب میں
جس کا ہر اشک ندامت ہو کفیل مغفرت
بار احسانِ شفاعت سر پہ لے وہ کس لئے

فی الحقیقت اس حوصلہ افزا یقین کے ہوتے ہوئے کہ کل کی طاقتور کشش ہمیشہ اپنے جزو کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ کسی کی رہبری اور شفاعت کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ اس ہمّت افزا یقین کو حضرت دیوانہ نے کس کس اسلوب سے بیان کیا ہے۔ وہ قابل دید ہے ؎

بندۂ خاص کی اُسے رہتی ہے ہر گھڑی تلاش
کس نے یہ کہہ دیا خدا بندے سے بے نیاز ہے

خدا کا خود اپنے بندے کو تلاش کرنا اور اس کو اپنے عطا و عفو سے بہرہ اندوز کرنا ایسا خیال نہیں۔ کہ جس کو انسان بلا اعتقاد و احساس اس قدر صفائی سے کہہ سکے ؎

نہیں بندے ہی کو دیدار کا شوق
خدا کو بھی کسی کی جستجو ہے

اسی سے مِلتا جُلتا حضرتِ دیوانہ کا دوسرا اعتقاد عجوبۂ روزگار اور اُن کی عقیدت مندی کا اظہار ہے ؎

کرتے رہو گناہ بھی حضرت کبھی کبھی
تا بے سبب یہ کارِ نماز و وضو نہ ہو
میری نظر میں عفو خطا کی ہیں لذّتیں
مجھ سادہ دل کے واسطے لُطفِ خطا نہیں

اگر گناہ نہ کیا تو نماز و روزہ کا ثمرہ عفو خطا کا موقعہ پیش نہ آیا۔ اور عابد عفو خطا کی لذّت سے محروم رہا۔ لہذا اس لذت کے حاصل کرنے کے لئے نہ کہ خطا کا لطف اُٹھانے کے لئے گناہ کرنا ایک نہایت لطیف جذبۂ عقیدت و محبّت ہے۔ یہ وہ شوخی ہے۔ کہ جس کے ارتکاب سے ہونہار معصوم بچّے اکثر اپنے والدین کی اُلفت قلبی کو معرضِ ظہور میں لاتے ہیں ٭

جس وقت قلب کو حضوری کا ذرا بھی احساس ہو جاتا ہے۔ تو وہ یہ کہہ کر کہ سپردم بتو مایۂ خویش را فرزانہ یا بیگانہ یا دیوانہ ہو جاتا ہے اِس کیفیت کا اظہار حضرتِ دیوانہ اس طرح کرتے ہیں ؎

عشق پر حُسن کا احسان یہی کیا کم ہے
فکرِ فردا غم امروز سے آزاد کیا

اِس لطیف احساس کے شروع ہوتے ہی قلب انسانی مختلف کیفیات کا مرقع بن جاتا ہے۔ اور اپنے افعال کو جن کا فاعل وہ پرماتما کو سمجھتا ہے۔ ایسے سانچے میں ڈھالتا ہے۔ کہ وہ افعال سزاوار وجود واجب ہوں۔ وہ اپنے گرد و پیش کے حالات میں جس فضا کو دیکھنا چاہتا ہے۔ اُس کا نمونہ **کیفیّات** میں جا بجا نظر آتا ہے۔ مشتے نمونہ از خروارے ؎

تیری غیرت تیری خود داری اِک افسونِ خودی
موت سے گر کفر کی لرزاں ترا ایماں نہیں

سکھائے نفس کی تہذیب جو تعلیم وہ اچھی
وہی بہتر ہے مذہب جس کا نصب العین خدمت ہو
وہ حُریّت نہیں اچھی جو خونریزی سے حاصل ہو
وہ دولت ہے بُری ایمان و غیرت جس کی قیمت ہو

اسی دُنیا کو نہ فردوس بنا لیتے ہم
اگر انسان کو انسان نہ اذیت دیتا

مانا ہے مجھ کو فکرِ فلک آشیاں پہ ناز
درد و سلوک بھی تو ہے میرے غرور میں

کرے گا درد کا اپنے علاج تا بہ کجا
جو بے نیازیٔ درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

ہے وحش و طیر پہ تیرا شرف محبّت سے
تو اہلِ حق کا نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

مخلوقات کو 'اہل حق' کے نام سے موسوم کرنا معمولی دل و دماغ کا کام نہیں
خود عارف کے قلب کی کیا کیفیت ہوتی ہے اور وہ اپنی حالت سے کس درجہ مطمئن ہوتا ہے۔ اس کو حضرت دیوانہ سے بڑھ کر کوئی فرزانہ بھی بیان نہیں کر سکتا۔ ملاحظہ فرمائیے ؎

مَیں سب جانتا ہوں جو تقدیر میں ہے
فضول آزمودہ کا ہے آزمانا
ہری گھاس ٹھنڈی ہوا چہچہاہٹ
طبیعت ہوئی جاتی ہے عاشقانہ
ہُما بن کے دیوانہ گذران کر لے
جو ہو برق کو ناگوار آشیانہ

آخری شعر کے فلسفیانہ اور تو کلانہ تخیل پر حضرت دیوانہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

قوت بازو سے کچھ تم کو ہُوا حاصل تو کیا
عیش گذراں ہے وہ کوئی رنج بے پایاں نہیں

خود کیا کرتا ہے ہر کام کا کرنے والا
مُفت بدنام ہے۔ انساں سے کیا ہوتا ہے

گلزارِ حسن بھی ہے نسیم وفا بھی ہے
میرے خدا نے میرے لئے کیا نہیں کیا
جو کچھ دیا مفید وہی تھا میرے لئے
جو تھا مضر خدا نے مجھے وہ نہیں دیا

کسی سامان دُنیا کی عدم موجودگی کو یہ سمجھ کر کہ وہ ہمارے لئے مضرت رساں ہے۔ اور اس لئے خدا نے اس سے ہم کو محروم رکھ کر اس کی مضرت سے بچایا۔ شکرانہ بجا لانا کمال اطاعت ہے ٭

گذر جائیں یُونہی دن رات یا رب ایک حالت پر
مجھے پستی و اوج زندگی سے کچھ نہ حاصل ہو

ملا تو بے طلب نہیں گلہ ہے کیف و کم کا کیا
ہماری پاسداریاں ہماری بے زبانیاں

طولِ امل کے حلقہ میں ہوتا اسیر تو
اچھّا ہے تیرا چاہا جو اے دل نہ ہو سکا

جب **عین الیقین** کی کیفیت بڑھ کر **محویت** کے درجہ پر پہنچتی ہے۔ تو قلب انسان سراپا سرور ہو کر عقل و خرد خیرباد کہتا ہے۔ اس کی کیفیت کا مرقع حسب ذیل ہے۔

تنبیہ

رکھ نہ چنداں تکیہ عقل و دل پہ اے عصیاں سرشت
خُلد میں ثابت ہوئے دُشمن یہی تیرے لئے

اگر غور کیا جائے تو یہ شعر جو بظاہر کوئی خصوصیت نہیں رکھتا۔ معانی سے مالامال ہے۔ شعر کی جان خطاب 'عصیاں سرشت' ہے۔ یہ خطاب 'عصیاں سرشت' ہو یا 'نسیاں سرشت' عقل و دل کے کمال کے منافی ہے۔ دُوسرا مصرعہ پہلے مصرعہ کے دعویٰ کا ثبوت ہے۔ دوسرے مصرعہ میں "ثابت ہوئے" تناسخ کے خیال کے لحاظ سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ گویا بار بار جنم لینا اور خلد سے بدر کیا جانا اس بات کا ثبوت ہے۔ کہ انسان عصیاں سرشت اپنے دل و

دماغ پر بھروسہ کرکے جو افعال کرتا ہے۔ اور اس بھروسہ پر جن کا خود فاعل بنتا ہے۔ وہ قابل پذیرائی نہیں ہوتے۔ اس معمولی کیفیت کے بعد عقل اور جذبہ عقیدت کی کشمکش ملاحظہ ہو ے

ادھر عقل انجام پرور کے تنکے
اُدھر جذبۂ دِل کی طغیانیاں ہیں

انسان جب ذرا بھی کامیابی سے روشناس ہو جاتا ہے۔ تو جامہ میں پھولا نہیں سماتا۔ اور اپنی عقل کو انجام پرور سمجھ کر اپنے فاعل ہونے پہ فخر کرتا ہے۔ مگر جذبۂ عقیدت کے طوفان میں یہ فخر و غرور تنکوں کی طرح بہ جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ عقل و فہم کا کام عین الیقین کی حد پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس سے آگے ان سے کام لینا ناکامیابی اور خامی کی دلیل ہے۔ حضرتِ دیوانہ کے دو شعر یاد رکھنے کے قابل ہیں ے

حُسنِ عمل نتیجہ ہے لطفِ خیال کا
لُطفِ خیال عکس ہے تیرے جمال کا

در تک ترے لے آئے ہیں عقل و خرد مجھے
اب آگے کام ہے دِلِ وا رفتہ حال کا

اسی مضمون کو ایک اور بہتر اسلوب میں اس طرح بیان فرماتے ہیں ے

تھا آفتاب و ذرّہ کے بیچ اِک معاملہ
مُوسیٰ نے اپنے ہوش کو کیوں درمیاں کیا

یہ **محویت** کا عالم عارف کو کس قدر بیخود بنا دیتا ہے۔ اس کو ذیل کا استفہامیہ شعر ظاہر کرتا ہے ے

کوئی مِل جائے اگر عارف کامل ہم کو
اس سے پُوچھیں کہ بایں وصف وہ کیا مانتا ہے

اسی کیفیت کو دوسرے پیرایہ میں اس طرح ظاہر کیا ہے ے

یہ رہا بتکدہ مسجد بھی بہت دُور نہیں
کہئے اے شوقِ نیاز آپ کا ایما کیا ہے

اسی فلسفۂ رفیع کی ایک اور دلکش تصویر ملاحظہ کیجئے۔

کششِ طرفین

صنعت گرِ ازل کا ہے اک نقشِ دِلنشیں
وہ صنعتِ لطیف تمنّا کہیں جسے

عین الیقین

تو نے ہمیں جدا کیا دلبر سے اے حیات
ہے دردِ ہجر دل کا دھڑکنا کہیں جسے

کیوں واہمہ نے موت کا ساحل بنا لیا
کب دیکھا زندگی کا کنارا کہیں جسے

محویت

اہلِ نمانہ کو نہ ہوئی آج تک نصیب
وہ حیرتِ جمال کہ سجدہ کہیں جسے

حق الیقین

جب سَعی مِٹ گئی تو میسّر ہُوا وصال
مرگِ خودی ہے وصلِ خدا کا کہیں جسے

دریائے وحدت آیا نظر چار سُو رواں
دیکھا نہیں وجود وہ قطرا کہیں جسے

اسی تصویر کو دُوسرے انداز میں ملاحظہ کیجئے۔

مرا دوست ہے مجمعِ حُسن و خوبی
سمائے گا دل میں سماتے سماتے

غضب دلکشی تھی مری داستاں میں
ہیں حیرت میں ڈُوبا سناتے سُناتے

مری جان مفقود ہونے لگا ہے
مزا رنج کا غم اُٹھاتے اُٹھاتے

پڑا رہنا تھا شیخ سجدے میں تجھ کو
عبث اُٹھ گیا سر جھکاتے جھکاتے

اُردو اور فارسی کی شاعری میں شراب کے معنی کچھ اور ہی ہیں۔ مگر اکثر شعرا اس کا ذکر کرتے کرتے بہک جاتے ہیں۔ حضرت دیوانہ لاکھ دیوانہ ہوں مگر بہکتے نہیں۔ مفت کی پیتے ہیں۔ مگر اعتدال اور متانت کے ساتھ۔ اُن کی مے نوشی ملاحظہ ہو ے

دُنیا کہے کہ پیتا ہے بے صرفہ یہ عزیز
کسبِ کمال اتنا تو اے بادہ نوش کر

گرہ میں گو درم نہ تھے ملی شراب بےطلب
رہیں گی یاد ساقیا تیری گدا نوازیاں

توبہ ہو کیا کہ یاد ہیں اب بھی وہ سب مزے
دراصل لطف مے سے میں منکر ہوا نہیں

ہے عرض یہی مانگ کے پینے میں ہے ذلّت
یہ کس نے کہا تجھ سے کہ تو بادہ کشی چھوڑ

میخانے میں پینے کا مزا اور ہی کچھ ہے
اور یوں تو غنیمت ہے کسی بزم و مکان میں

ہم اوج بام دُنیا تھا فرش میکدے کا
اس اوج پر سے لطف نقّارگی سوا تھا

اُس کو پیمانے سے عداوت ہے
جو سمجھ دار پینے والا ہے

تیری قسمت میں تو نہیں اے شیخ
کیا ہمیں بھی پلا نہیں سکتا

گئی رونقِ مسجد اب میکدے سے
ہجوم آج کل اس میں کم دیکھتے ہیں

ایک صاحب نے فرمایا۔ کہ یہ شراب مشکبو نہیں۔ اُن سے پوچھا کہ مُشک کی خوشبو کیسی ہوتی ہے۔ تو معلوم ہوا۔ کہ اُنہوں نے کبھی مُشک کی خوشبو سونگھی نہیں۔ مُفت۔ بے طلب اور میخانہ میں پئیں۔ اور خوب پئیں۔ حتیٰ کہ پیمانہ سے نفرت ہو۔ اور پھر لطف مے میں لطف نقّارگی لیں۔ بہکنے کا نام نہیں۔ لڑکھڑانے کا کام نہیں۔ ہم لوگوں کے روبرو اس کو شراب معرفت کے نام سے موسوم کیا جائے۔ پھر وہ شراب کیسی ہو؟ اور مے نوش کیسا ہو؟

فلسفۂ افعال

گیتا میں فلسفۂ افعال کو اس طرح بیان کیا گیا ہے ؎

نہیں بالذّات کوئی فعل ممنوع
ہوا ہے فعل خود قدرت سے موضوع

اگر فاعل وہ خود کو مانتا ہے
نہیں رازِ حقیقت جانتا ہے
صفات و فعل دونوں سے جدا ہے
وجودِ ذات تو نورِ خدا ہے
ملیں احساس و محسوسات باہم
نہیں ہے ذاتِ عارف کو کوئی غم

نہ فاعل بن کے قیل و قال کیجئے
تصدّق مجھ پہ سب افعال کیجئے

یہ قولِ عاقلانِ ذی ہُنر ہے
وُہی انسان عارف سر بسر ہے
نہیں جس کو نتیجے سے غرض ہے
جو دائم مطمئن اور بے غرض ہے
نہیں گر فعل عکسِ آرزو ہے
تو کرنا بھی نہ کرنا ہو بہو ہے
اگر اُمید سے ہے رستگاری
تخیّل امر ہے گر اختیاری
نہ پابندی کوئی لاحق ہوئی ہے
نہ خاطر فعل کی شائق ہوئی ہے
نہ اُس کا فعل کوئی بند ہوگا
نہ وہ افعال کا پابند ہوگا

بظاہر صرف محسوسات ہے وہ
مگر دراصل محوِ ذات ہے وہ
ہر اک ہے فعل قدرت کا تقاضہ
عمل اُس کا ہے قدرت کا تماشہ
نہیں تر دامنی کا خوف طاری
نہیں چہرے پہ طاری شرمساری

حضرت دیوانہ نے انسانی طبع کی کمزوریوں کو حالاتِ گرد و پیش اور قدرت کا مقتضا سمجھ کر ہمدردانہ نقطۂ نظر سے کام لیا ہے۔ جو خالی از لطف نہیں ؎

اگرچہ پیر ہو گئے وہی ہیں عشق بازیاں
کہ مختصر نہ ہو سکیں امید کی درازیاں

وابستہ شباب تھے سب زندگی کے لُطف
پیری میں اب گناہ کا بھی وہ مزا نہیں

پیری میں اب کریں گے جو پیری میں ہو روا
ہم نے وُہی کیا جو روا تھا شباب میں

دوبارہ عمر مجھ کو ملے بھی اگر یہاں
پھر بھی یہی گناہ کروں میں شباب میں

جنہیں دیکھ کر اب بھی ہوتی ہے حیرت
جوانی کی وہ چند نادانیاں ہیں

تھیں مقتضائے وقت جوانی کی مستیاں
مل بیٹھتے ہیں بلبلوں سے گُلِ بہار میں

جو شخص اپنے ہر اک فعل کو مقتضائے وقت و مشیئت ایزدی قرار دے کر اپنے آپ کو ذمہ وار نہ سمجھے۔ وہ اوروں کے افعال کا شاکی نہیں ہو سکتا۔ اوروں کے اخلاق سے گرے ہوئے سلوک کو دیکھ کر وہ دُنیا سے نفرت کرنے لگے۔ مگر مخصوص اشخاص سے اُس کو شکایت نہیں ہوتی۔ اور وہ اپنے صبر و تحمل پر تکیہ کر کے بدسلوکی کرنے والے کو اس کے ضمیر کے سپرد کرتا ہے۔ وہ شکوہ و فریاد کر کے ایسے لوگوں کو خوش ہونے اور فخر کرنے کا موقعہ نہیں دیتا۔ حضرتِ دیوانہ کا شعار کیا ہے ؎

ہم نے شکست میں بھی لئے فتح کے مزے
صیّادِ غم کو صبر سے صیدِ زبوں کیا
کچھ لُطف اُٹھا سکا نہ حریف اپنی فتح سے
دیکھا جو ہم حزیں نہیں اپنی شکست سے

اُردو کے شعرا کا ہمیشہ یہی عزم بالجزم رہتا ہے۔ کہ وہ قیامت کے روز حشر برپا کرینگے۔ شکوہ و فریاد کا دفتر کھولینگے دامنگیر ہونگے۔ اور اگر ستمگار اس وقت شرمندہ اور خواستگارِ معافی ہوگا۔ تو وہ نخرے بتائینگے۔ یہ تو خدا جانے کہ یہ شیخ چلی کے منصوبے پُورے ہونگے یا نہیں مگر ؎

دل کے خوش کرنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

حضرت دیوانہ نے بھی غالباً رسماً محشر کے میدان میں تفتیش کی کارروائی کا خیال کیا۔ مگر حسب عادت اس میں بھی فیاضی طبعی سے کام لیا۔ چنانچہ ملاحظہ ہو ؎

عقدہ شکست و فتح کا یوم حساب کو کھُلا
جیت سے اُن کو شرم ہے ہار پہ مجھ کو ناز ہے

محرومیوں کا اپنی گِلہ تھا سُوئے ادب
ہم پیش گاہِ حشر میں خاموش ہی رہے

ڈرتے رہے ہیں تجھ سے خطا و صواب میں
کہنا ہے بس یہی ہمیں روزِ حساب میں

شکوہ کسی کے ظلم و ستم کا کریں تو ہم
محشر میں لیکن اُن کی ندامت کو کیا کریں

لُطفِ سخن

اگرچہ **کیفیات** کو گُلدستۂ غزلیات بتایا گیا ہے۔ اور غزل کے لغوی معنی اور عام مفہوم کچھ اور ہی ہے۔ مگر حضرت دیوانہ نے جن کا تخلص برعکس نہند نامِ زنگی کافور کا مصداق ہے۔ تغزل کے شیشوں میں بادۂ فلسفہ کو بھرا ہے ؎

گو ہم نے وہی بلبل و گُل کی کہیں باتیں
تاثیر ہر اک بات میں بھر دی ہے نئی اور

اِس میں شک نہیں کہ فلسفیانہ تغزل کی یہ فراوانی اور شعرا کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ اس کی یہ وجہ نہیں۔ کہ شعرا کے طبقہ میں فلسفہ دانوں کا قحط تھا۔ بلکہ زاویہ نظر کا اختلاف۔ زمانہ کی رفتار۔ مذہب کی پاسداری اور صحبت کا اثر رنگ لائے بنا نہیں رہتے۔ اُردو زبان کے ہندو شعرا میں بھگتوں کی تعداد بہت کافی ہوئی ہے گیتا کے متعدد منظوم ترجمے موجود ہیں۔ مگر **کیفیات** کی دو خصوصیا

ہیں۔ اوّلاً اس کے فلسفیانہ مضامین اور ثانیاً حضرت دیوانہ کا عالم باعمل ہونا۔ ان دو ہی وجوہات سے یہ نوبت آئی۔ اُن کو کہنا پڑا ؂

میری گمنامی خدا کا راز ہے

اب مختلف آیدا۔ اشعار بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں ؂

ہم دیکھتے ہیں نقش و نگار صنم کہاں
محو ہیں ہیں حضرت بُت کے حضور میں

ایماں جو نہ دل میں ہو آتے ہیں نظر پتھر
نظروں سے میری دیکھو انوار صنم خانہ

یہ اشعار بظاہر بُت پرستی کی تائید کرتے ہیں۔ مگر درحقیقت یہ بتکدہ میں خلوص قلب کی فضا میں حاضر و ناظر۔ بسیط کل و محیط کل پرماتما کے جلوہ میں محو ہونے کے لُطف کا بیان ہے جس میں یہ ظاہر کیا گیا ہے۔ کہ خلوص قلوب چشم بصیرت سے ہر جگہ حتیٰ کہ پتھر کی مُورتی میں بھی خدا کا جلوہ دیکھ سکتا ہے۔ اور کثرت میں وحدت کا نظارہ پیدا کر سکتا ہے ؂

جانا تو اُسے تُو نے پرہ خود سے جدا سمجھا
کیا جانے خدا کو تو جب خود کو نہیں جانا

جب جُزو کا پتہ نہ ہو کُل کا ہو کیا قیاس
ہو تیری کیا خبر نہیں اپنی خبر مجھے

خدا کو خود سے جدا جاننے کا صاف مطلب یہ ہے۔ کہ کُل اور جزو کے باہمی رشتے سے ناواقفیت ہے۔ اور ایسی حالت میں انسان خود شناس نہیں۔ جو جزو کو نہیں جانتا وہ یقیناً کل سے ناواقف ہے۔ اور وہ نہ کثرت میں وحدت کو دیکھ سکتا ہے۔ اور نہ وحدت میں کثرت کو ؂

میرے مٹانے میں کوئی حکمت ضرور ہے
اُس کی رضا تھی آیا رضا اُس کی تھی گیا

اسی مضمون پر خاقانیٔ ہند حضرت ذوق کا مشہور شعر ہے ؂

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

اسی کے ہم پلّہ محب وطن حضرت چکبست کے دو شعر ہیں ؂

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انہی اجزا کا پریشاں ہونا

فنا کا ہوش آنا زندگی کا دردِ سر جانا
اجل کیا ہے خمار بادہ ہستی اُتر جانا

اسی مضمون پر خاکسار نے بھی ایک شعر عرض کیا ہے ؂

تقاضا زندگی کا تھا چمکتے ہیں شرر ہو کر
اجل آئے گی گُل ہونگے چراغ رہگزر ہو کر

تمام اشعار پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ سوائے حضرت دیوانہ کے اور کسی شاعر نے حیات و ممات کی فلسفیانہ ماہیت کی جانب توجہ نہیں کی۔ حیات کیوں لائی اور قضا کیوں لے چلی۔ زندگی میں ظہور ترتیب کیوں ہُوا۔ اور پھر یہ اجزا پریشاں کیوں ہوئے۔ بادہ ہستی کا خمار کیسے آیا اور کیوں اُتر گیا۔ زندگی کا تقاضا کیوں ہُوا۔ اور اجل کیوں آئیگی۔ ان سوالات کے جواب اور اشعار میں نہیں ملتے۔ اور شعرا اس کو مادہ کا فعل سمجھتے ہیں۔ زندگی اور موت محض دو حالتوں کے نام ہیں۔ وہ خود فاعل نہیں ہو سکتے ہیں۔ اُن کی حیثیت مفعول کی ہے۔ ان سوالات کا جواب حضرت دیوانہ کے شعر میں ہے۔ "اس کی رضا تھی آیا رضا اُس کی تھی گیا"۔ "آیا" اور "گیا" دونو ماضی مطلق ہیں۔ گویا شعر کی ترتیب سے پیشتر آنا اور جانا ہو چکا ہے۔ جس سے حضرت دیوانہ کا عقیدہ تناسخ ظاہر ہے۔ گویا آواگون پرماتما کی مرضی کا ظہور ہے۔ یہ مرضی کیوں ہے؟ اس کا جواب بہت طویل ہے۔ جس کی تفصیل مختلف عقاید کے مطابق مختلف ہے۔ اور تفصیل اور تطویل کو حکمت پر چھوڑ دینا۔ کہہ دینا اور اس کی جستجو میں اسپ خرد کو جولاں نہ کرنا عین عقیدتمندی ہے مولانا روم یہ کہہ کر کہ ؂

ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ام
ہفت صد ہفتاد قالب دیدہ ام

اور اس مضمون پر روشنی نہ ڈال سکے۔ مہرشی روبندرا ناتھ ٹیگور نے گیتانجلی کا آغاز ہی اس طرح کیا ہے۔ کہ

"تو نے مجھے غیر متناہی بنا دیا۔ ایسی ہی تیری مرضی ہے۔ اس کمزور ظرف کو تُو بار بار خالی کرتا ہے اور ہمیشہ ایک تازہ زندگی سے معمور کر دیتا ہے"

سب کہتے ہیں کہ کوئی محبت میں مر مِٹا
خود مِٹنے والا خوش کہ محبت سے جی گیا

یہی مضمون رشکِ عرفی حضرت غالب کے مشہور شعر میں اِس طرح بیان کیا گیا ہے ؎

محبت میں نہیں کچھ فرق مرنے اور جینے میں
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

اگر حضرت غالب کے شعر میں "جس کافر پہ دم نکلے" نہ ہوتا۔ تو شعر پھیکا ہو جاتا۔ اور پہلے مصرعہ کا لطف جاتا رہتا۔ مگر شعر سے رنگِ مجاز غائب ہو جاتا۔ لفظ 'کافر' فریق ثانی یعنی محبوب کے جور و ستم کا مظہر ہے۔ اور 'دم نکلنا' ہجر کی طرف اشارہ ہے۔ ان باتوں سے کل اور جزو کا باہمی تعلق اور ایک دوسرے کی جانب رجحان ثابت نہیں ہوتا۔ دم نکلنا محبوب کے ستم یا ہجر کا نتیجہ ہے۔ نہ کہ فرطِ محبت میں مر مٹنا کہ جو طریقتِ فنا (عشق) میں منزل محویت ہے۔ ایسی حالت میں دونو شعر گو بظاہر یکساں معلوم ہوتے ہیں۔ مگر دراصل دونو میں حق اور مجاز کا بعد المشرقین ہے۔ حضرت دیوانہ کا شعر عشق حقیقی کی تصویر ہے۔ کہ جس میں عارف کا یہ محسوس کرنا۔ کہ "محبت سے جی گیا" بلحاظ زبان اور بلحاظ تخیل آپ اپنی نظیر ہے۔ وہ اس کو 'مرمٹنا' نہیں سمجھتا۔ بلکہ اور لوگ ناآشنائے کوچہ معرفت ایسا کہتے ہیں۔ ؎

نظامِ حق کی سِلک میں تو اپنی رُوح کو پرو
گم اس میں ہو کے دیکھ تو جو رُوحِ کائنات ہے

وجودِ واجب کو رُوحِ کائنات کے نام سے موسوم کرنا دریا کو کوزے میں بند کر دینا ہے۔ اور کُل کے بے شمار اجزا کے اس میں سمانے کو نظام حق کی سلک کہنا پُر بلاغت تشبیہ ہے جس میں لفظ 'نظام' کی اہمیت کی پہچاننا آسان کام نہیں۔ ایک لفظ میں عرفان کا دفتر کا دفتر پنہاں ہے۔ دوسرے مصرعہ میں "دیکھ تو" گم ہونے کے لطف کو ناقابل بیان قرار دیتا ہے۔ اور شاعر دو لفظوں میں کہہ دیتا ہے۔ 'دلِ من داند و من دانم و داند دلِ من' ؎

رات دن دریائے حیرت میں جو مستغرق رہے
بار بار اے شیخ سجدہ میں پڑے وہ کس لئے

یہی خیال ایک اور شعر میں حضرت دیوانہ نے اس طرح ظاہر کیا ہے

اہلِ نماز کو نہ ہوئی آج تک نصیب
وہ حیرتِ جمال کہ سجدہ کہیں جسے

'حیرت جمال' کو سجدہ کے نام سے موسوم کرنا یا حیرتِ جمال کے ہوتے ہوئے سجدہ کو غیر ضروری قرار دینا عالمِ باعمل فلسفی کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا۔ خدا کو جدا سمجھ کر سجدہ کرنے کے تو معنی ہو سکتے ہیں۔ مگر واصل حق ہو کر یا حق الیقین کی منزل پر پہنچ کر جب کہ من تو شدم تو من شدی کا منظر ہو سجدہ کرنے کے کچھ معنی نہیں۔ علامہ اقبال کا مشہور مطلع ؎

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

بلند زبان و خیال نہایت بلند شعر ہے۔ مگر اس میں عابد و معبود کو فی الحال ہی نہیں بلکہ آئندہ بھی بہ 'لباس مجاز' جدا تصور کیا ہے۔ مگر دیدار کے نتیجہ یعنی حیرت کو علامہ اقبال نے نظر انداز کر دیا۔ اس لحاظ سے باوجود لاجواب اظہارِ فرطِ عقیدت کے شعر کا مفہوم حقیقت شناسی سے دُور ہو جاتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں لکھنؤ کے ایک باکمال شاعر کا مقطع ؎

یہ گُل ریاضِ حبیب ہے اسے ڈھونڈھ گلشنِ ناز میں
مرا سجدہ داغِ ریا نہیں جو ملے جبینِ نیاز میں

حقیقت سے قریں تر اور رشادابی خیال اور عقیدت مندی سے مالامال ہے۔ مگر سجدہ کو حیرت جمال قرار دینا بہترین فلسفہ ہے ؎

جس کا ہر اشک ندامت ہو کفیلِ مغفرت
بارِ احسانِ شفاعت سر پہ لے وہ کس لئے

اشک ندامت کا کفیل مغفرت ہونا انتہائے عقیدتمندی ہے۔ علامہ اقبال نے بھی اس خیال کو بڑے مؤثر پیرایہ میں اس طرح ظاہر کیا ہے ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لئے ٭ قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

تڑپ کے شانِ کریمی نے لے لیا بوسہ ٭ کہا جو سر کو جھکا کر گنہگار ہوں میں

علامہ اقبال کے دوسرے شعر کے ہم پلہ حضرت دیوانہ کا یہ شعر بھی داد کے قابل ہے ؎

جن کے لینے کیلئے تیار دوزخ بھی نہ تھا ٭ ہو گیا حقدار جنت کا وہ یہ کہہ کر 'خدا'

جنابِ دیوانہ! آپکی تصنیف کے بصیرت افروز مطالعہ سے شائقین کو روحانی مسرت ہوتی ہے۔ جبکہ مدعیان زباندانی مجازی شاعری اور قواعد عروض کی نام نہاد پابندی پر عمریں خراب کر رہے ہیں۔ آپنے کیفیات کو تصنیف کر کے اردو علم ادب پر احسان کیا۔ خدمت وطن سرانجام دی اور سرور روحانی سے لطف اندوز ہوئے۔ آپکی فلسفیانہ طبیعت مشتاق شہرت نہیں۔ آپکی بلند خیالی طلبگار معاوضہ نہیں۔ کاش کہ آپکا یہ شعر آپکے معاصروں کیلئے مشعل راہ ہو۔

تعریف کا بھوکا ہوں نہ تنقید سے خائف ٭ شکرانۂ نعمت ہے مرا زمزمۂ ساز

جگپت سرنداس ماتھر (بی اے۔ ایل ایل بی وکیل ڈیرہ دون)

تنقید و تبصرہ

دلّی کا سنبھالا :۔ مصنفہ خواجہ محمد شفیع۔
سائز ۲۰×۳۰/۱۶ ۔ صفحات ۱۵۶ مجلد۔ قیمت ایک روپیہ عہ ر
ناشر۔ مکتبہ جامعہ دہلی۔

یہ کتاب اُس زبان میں لکھی گئی جو اب فنا ہوتی جا رہی ہے۔
اگر دہلی کی نتھری ہوئی زبان کے چٹخارے لینا ہو تو اس کو ضرور پڑھئے۔

"دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں روزگار"

یہ اسی اُجڑے دیار کی داستان ہے۔ گو ہونے کو دلّی اب بھی آباد ہے مگر وہ پہلی سی آب و تاب کہاں۔ وہ دن گزر گئے اور وہ ہستیاں افسانہ ہوگئیں۔ جن کے دم قدم سے دلّی کی رونق باقی تھی۔ مگر دلّی نے مٹتے مٹتے بھی ایک سنبھالا لیا اور اپنے جوہروں کو اس تابانی سے نمایاں کیا کہ جس نے دیکھا اس کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔

"دلّی کا سنبھالا" میں اُن لوگوں کا تذکرہ ہے جو اگرچہ اس شہر کے دور انحطاط میں پیدا ہوئے اور پروان چڑھے مگر ان کی جامع کمال شخصیت زندہ سے زندہ قوم کیلئے مایۂ رشک ہو سکتی ہے۔

خواجہ صاحب نے ان لوگوں کا تذکرہ اس سحر آگیں انداز میں کیا ہے کہ بیساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سُنی سنائی باتیں نہیں بلکہ آنکھوں دیکھے واقعات بیان کر رہے ہیں۔

قطراتِ شبنم :۔ مسٹر گوردھن داس بی۔ اے کی ادبی پیشکش ہے۔ جو شاعرانہ نثر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر مشتمل ہے۔ مصنف نے زندگی کے بعض اہم اور بعض رومانی مسائل پر طبع آزمائی کی ہے اور اس امر کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ یہ اُنکی پہلی کوشش ہے۔ کتاب ہر لحاظ سے قابل ستائش ہے۔ ان کے تخیل میں رفعت اور طرز تحریر میں روانی موجود ہے۔ امید ہے کہ آگے چل کر پختگی بھی پیدا ہو جائیگی۔ کتاب مجلد ہے۔ قیمت ایک روپیہ۔

ملنے کا پتہ مکتبہ اردو لاہور۔

جوئبار :۔ بانگِ درا سائز مجلد۔ صفحات ۹۴ قیمت عمر

ملنے کا پتہ:۔ قصر اردو ملتان چھاؤنی۔

مسٹر بھیم حسین ظفر اردو زبان کے ایک خوش فکر شاعر ہیں۔ اور اُن کا کلام شاہکار میں اکثر شائع ہوتا رہا ہے۔ زیر نظر کتاب انہی کے نتائج فکر کا مجموعہ ہے اور نظموں غزلوں اور ہندی گیتوں پر مشتمل ہے۔ ظفر صاحب کا مذاق سلجھا ہوا ہے اور اُن کی طبیعت میں روانی ہے۔ اگرچہ وہ ایک ایسے ماحول میں پیدا ہوئے جو یکسر غیر شاعرانہ تھا۔ مگر ان کی طبیعت کا رجحان ان کو شاعر بنا کر ہی رہا۔ اور شاعر بھی بُرا نہیں۔ امید کی جانی چاہیئے کہ مستقبل قریب میں مسٹر ظفر کا شمار اردو کے بلند پایہ شاعروں میں ہونے لگے گا۔ کتاب کے شروع میں حضرات م۔ ن۔ راشد اور احسان دانش کے دیباچے بھی شامل ہیں۔

انسان :۔ مصنفہ لالہ کانشی رام صاحب چاولہ۔ سائز ۲۰×۳۰/۸ صفحات ۲۸۸۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب۔ قیمت آٹھ آنے جو ضخامت اور کتاب کے نفس مضمون کے اعتبار سے بہت کم ہے۔

اس وقت جبکہ انسانیت صراطِ مستقیم سے بھٹک چکی اور انسان اپنے مقصد زلیست کو فراموش کر چکا ہے۔ اس قسم کی کتابوں کی بہت ضرورت ہے۔ ہم خوش ہیں کہ فاضل مصنف نے وقت کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ایک اہم کمی کو پورا کیا ہے۔ کتاب حد درجہ مفید اور دلچسپ ہے اور اس میں انسانی اخلاق کو سدھارنے کے لئے بہت سی باتیں لکھی گئی ہیں جن پر عمل کرنے سے انسان اپنی زندگی کو اپنے لئے اور دوسروں کے لئے مفید بنا سکتا ہے۔ مصنف سے اس پتہ پر مل سکتی ہے:۔

لالہ کانشی رام چاولہ سپرنٹنڈنٹ دفتر ڈپٹی کمشنر ہوشیارپور

ہندوستانی کشیدہ کاری :۔ مرتبہ محترمہ مس امتہ اللہ صاحبہ ہیڈ مسٹرس سرسکندر گرلز انڈسٹریل سکول۔ ناشران دی انڈین ہینڈل آرٹ اینڈ انڈسٹری ہاؤس الہ یار سٹریٹ برانڈرتھ روڈ لاہور قیمت ایک روپیہ۔

یہ کتاب کشیدہ کاری کے متعلق مفید ہدایات اور عمدہ نمونوں پر مشتمل ہے اور لڑکیوں کے لئے بہت سود مند ہو سکتی ہے امید ہے مقبول ہوگی ۔

گوپال متل

بزمِ انتخاب

ظفر کی اخلاقی شاعری

ظفر کی اخلاقی شاعری کے مطالعہ سے آپ کو معلوم ہوگا کہ ظفر کی طبیعت پر حزن و ملال کس قدر غالب ہے، تلخیوں، ناکامیوں اور نامرادیوں کے ہجوم میں اس کی زندگی محض داغِ تمنا اور سراپا آرزو بن کر رہ گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسے حسرت زدہ اور ارمان سوختہ انسان کے دل و دماغ پند و نصیحت کے لئے کس قدر موزوں ہوں گے۔ ظفر نے اس سلسلہ میں جتنے اشعار کہے ہیں وہ محض ایک فلسفی کے خیالات نہیں ہیں۔ بلکہ اپنی وارداتِ زندگی سے جو کچھ اس نے محسوس اور اخذ کیا، ان کو اشعار کی شکل میں منسلک کر دیا ہے۔ وہ الفاظ کے گورکھ دھندوں اور خیالات کے ہنگاموں میں اپنے اور اپنے ناظرین کو گم کرنا نہیں چاہتا ہے۔ بلکہ سیدھے سادے الفاظ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہے پیش کر دیتا ہے، اس کی تمام زندگی اور پھر اس کے اشعار آنکھوں کے سامنے ہوتے ہیں تو پڑھنے والوں پر ایک خاص قسم کا اثر ہوتا ہے۔ جو غیر ارادی طور پر دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔

شاہجہاں اور جہانگیر کا آخری جانشین گویا اپنی سلطنت کی ویرانی کا یہ عبرتناک مرقع کھینچتا ہے۔

جہاں ویرانہ ہے، پہلے کبھی آباد گھریاں تھے
شغال اب ہیں جہاں رہتے کبھی بستے بشریاں تھے
جہاں چٹیل ہے میداں اور سراسر ایک خارستاں
کبھی یاں قصر و ایواں تھے، چمن تھے اور شجریاں تھے
جہاں پھرتے بگولے ہیں اڑاتے خاک صحرا میں
کبھی اڑتی تھی دولت، رقص کرتے سیم بریاں تھے
جہاں ہیں سنگ ریزے، تھے یہاں یاقوت کے تودے
جہاں کنکر پڑے ہیں اب، کبھی رہتے گہریاں تھے
جہاں سنسان اب جنگل ہے اور ہے شہرِ خاموشاں
کبھی کیا کیا تھے ہنگامے یہاں اور شور و شریاں تھے

جہاں اب خاک پر ہے نقش پائے آہوئے صحرا
کبھی محوِ تماشا دیدۂ اہلِ نظریاں تھے
ظفر احوال، عالم کا کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے
کہ کیا کیا رنگ اب ہیں اور کیا کیا پیشتر یاں تھے

اس ماتم میں دنیا کی بے ثباتی کا پورا نقشہ ہے، ظفر کی زندگی اور اس کا المناک خاتمہ کچھ ایسا تھا کہ وہی دنیا کی بے ثباتی کی مکمل اور پر درد تصویر کھینچ سکتا تھا۔ ایک جگہ کہتا ہے۔

صبح گلشن میں صبا تیرا اگر ہووے گزر
کہیو بلبل سے ذرا اتنا کہ اے شوریدہ سر
کر رہی ہے چہچے کیا شاخِ گل پر بیٹھ کر
یہ چمن یونہی رہے گا اور ہزاروں جانور
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گے

یہ تو شعر و شاعری کی زبان تھی، مگر اسی کو صاف صاف ایک پوری غزل میں دوسری جگہ بیان کرتا ہے۔

جو تماشا دیکھنے دنیا میں تھے آئے ہوئے
کچھ نہ دیکھا پھر چلے آخر وہ پچھتائے ہوئے
فرشِ مخمل پر بھی مشکل سے جنہیں آتا تھا خواب
خاک پر سوتے ہیں اب وہ پاؤں پھیلائے ہوئے
جو مہیائے فنا ہستی میں ہیں مثلِ حباب
ہوتے ہیں اوّل ہی سے پیدا وہ کفنائے ہوئے
غنچے کہتے ہیں کہ ہوگا دیکھئے کیا اپنا رنگ
جب چمن میں دیکھتے ہیں پھول کمھلائے ہوئے
غافلو اس اپنی ہستی پر کہ ہے نقشِ بر آب
موج کے مانند کیوں پھرتے ہو بل کھائے ہوئے

اسی لئے وہ دنیا اور دنیا کی تمام چیزوں کو عبث اور ہیچ سمجھتا ہے، اس کی زندگی اور اس کی زندگی کی تمام نیرنگیاں عبرت کا پیام تھیں۔ ایک عظیم الشان سلطنت کی بیخ کنی اور اس کی نظروں کے سامنے ہو رہی تھی۔ ایک پر جلال پر ہیبت اور پر شکوہ خاندان کے خدم و حشم، عز و شان اور سطوت و جبروت

کا خاتمہ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، تختِ طاؤس پر بیٹھنے والوں کا جانشین ہمالیہ سے راسکماری تک کے فاتح کا وارث اور کوڑیوں کی طرح زر و جواہر لٹانے والے کی یادگار، چند دمڑیوں کا محتاج ہو رہا تھا، ایسی حالت میں دل اور جگر کے زخموں سے یہ درد انگیز چیخیں کیوں نہیں نکلتیں کہ:

سب کارِ جہاں ہیچ ہے، سب کارِ جہاں ہیچ
اس ہیچ سے امید ہے اے ہیچداں، ہیچ
مانندِ حباب ایک نفس میں ہے خرابی
اس منزلِ فانی میں ہے بنیادِ مکاں ہیچ
اک عمر رہے مایۂ دنیا سے گراں بار
آخر کو جو دیکھا تو بجز بارِ گراں، ہیچ
اس باغ میں تھوڑی سی بہار اور پھر اس پر
اے نو گُلِ خندہ مجھے تشویشِ خزاں ہیچ
ہو جنسِ تنک مایۂ ہستی کا نہ خواہاں
یہ جنس، یہ بازار، یہ گوہر، یہ دکان، ہیچ
آوازِ طرب گوشِ دلِ محوِ فنا سے
جز نالہ و فریاد و بجز آہ و فغاں ہیچ
پایا نہ بجز داغِ سیہ کاریٔ یک عمر
نقشِ قدمِ قافلۂ عمرِ رواں، ہیچ
کیا دیکھیں ظفرؔ خانۂ ہستی کا تماشہ
اس وہم کدہ میں ہے بجز وہم و گماں، ہیچ

مگر ظفرؔ جانتا تھا کہ اس کی اور اس کے خاندان کی زندگی کی داستان خواہ کیسی ہی دردناک اور عبرتناک ہو، وہ انسانیت کی دنیا میں گنہگار اور مجرم ہوگا، اگر وہ لوگوں کے لئے صرف الم و یاس اور حسرت و حرمان کا پیام چھوڑ جائے گا، وہ اس سے واقف تھا کہ زمانہ انقلاب آفریں ہے اس دنیا میں:-

نہ دائم غم ہے نے عشرت کبھی یوں ہے کبھی ووں ہے
تبدّل یاں ہے ہر ساعت کبھی یوں ہے کبھی ووں ہے
کوئی دن ہے بہارِ گل پھر آخر ہے خزاں بالکل
چمن ہے منزلِ عبرت کبھی یوں ہے کبھی ووں ہے

"معارفا"

معاشری اصلاح اور قومی ترقی

غلو مذہب اور اس کا اثر معاشرت پر

مسلمانوں کو اپنا مذہب بہت پیارا ہے۔ وہ اس کی راہ میں اپنی زندگی اور اپنا مال و متاع سب کچھ قربان کر سکتے ہیں۔ جہاں اسلام پر، شعائرِ اسلام پر، ایک لفظ آئے وہاں یہ اپنا خون پسینہ ایک کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ اپنے مذہب سے ان کی یہ شیفتگی اور والہانہ عقیدت یقیناً قابلِ قدر ہے۔ اور یہی ان کا حقیقتاً وہ جوہر ہے جو ان کی ہزار کمزوریوں کے باوجود ان کی پوزیشن قائم رکھے ہوئے ہے۔

اسلام نے ہر جگہ عقل کو مخاطب کیا ہے، اپنے پیروؤں سے تدبّر کرنے اور عقل سے کام لینے کا ہر جگہ مطالبہ کیا ہے۔ لیکن افسوس کہ عرصہ سے یہ بات ان سے مفقود ہو چکی ہے۔ کورانہ تقلید ان کا شیوہ ہو گئی۔ یہ لکیر کے فقیر ہو گئے اور عقل و تدبر سے ان کو دور کا بھی واسطہ نہ رہا۔ اس ایک نقصان سے ہی ان میں ہر طرح کی برائیاں اور بے عقلی کی باتیں زندگی کے ہر شعبہ میں ظاہر ہوئی ہیں۔ اور برابر ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ ایک موٹی سی مثال آپ کے سامنے پیش کروں۔ قرآن پاک اور حدیث شریف میں تعمیر مساجد کو نیک کام اور باعثِ اجر و ثواب ٹھہرایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ قرآن و حدیث ہی میں اور بھی بہت سے کام بھی موجب خیر اور باعث اجر قرار دئے گئے ہیں۔ بھوکے کو کھانا کھلانا۔ پیاسے کو پانی پلانا۔ قرضدار کا قرض ادا کرنا، بیوہ اور یتیموں کی خبرگیری کرنا، مفلسوں، ناداروں اور حاجت مندوں کی حاجت روائی کرنا، جاہلوں کو تعلیم دلانا وغیرہ۔ اب ہر مسلمان جس کو خدا نے صاحب استطاعت بنایا ہے۔ جب کبھی کسی نیک کام کا ارادہ کرتا ہے اس کو سب سے پہلے مسجد ہی بنانے کا خیال آتا ہے۔ اور وہ مسجدوں کے کافی تعداد میں ہوتے ساتھ اسی جگہ ایک اور مسجد بنا کر کھڑی کر دیتا ہے، جہاں اس کی قطعاً ضرورت نہ تھی اور جو مصلین کے نہ ہونے کی وجہ سے ویران پڑی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی ایسے بہت سے کام تھے جو باعث خیر و برکت بھی تھے۔ اور جو ملکی یا قومی فوری ضروریات کے لحاظ سے بہت اہم قرار دئے جا سکتے تھے۔ لیکن ان کی طرف قطعاً توجہ نہیں کی جاتی۔ ایک بستی جہاں کنواں نہ ہو، ایک ایسا گاؤں جہاں شفاخانہ نہ ہو، ایک ایسا موضع جہاں درسگاہ نہ ہو۔——
بلا سے نہ ہو۔ مسلمان جب سوچے گا مسجد ہی بنوانے کا تصفیہ کرے گا۔ اگر اس وقت ذرا عقل سے کام لیکر مختلف کاموں میں سے ایک کا انتخاب موقع و محل کی ضروریات کا لحاظ رکھ کر کیا جاوے تو وہی کام زیادہ فائدہ رساں زیادہ موزوں اور زیادہ باعث اجر و ثواب ہو سکتا ہے۔

آج وطنی ضروریات کے لئے روپیہ کی حاجت ہے۔ قومی تعلیم

کے انتظام کے لئے سرمایہ کی ضرورت ہے - اگر اصحاب حیثیت عقل کی روشنی میں صحیح موقع و محل کا تعین کرلیں تو کچھ مشکل نہیں کہ موجودہ وطنی انجمنیں اور ادارے، مالی لحاظ سے مطمئن ہو کر مستحکم بنیادوں پر قائم ہو جائیں اور قومی ترقی نام ہے ان ہی اداروں اور انجمنوں کے پھولنے اور پھلنے کا -

شادی بیاہ کی رسومات اور ان کا اثر معاشرت پر:- شادی جس کے اصل معنی خوشی کے ہیں اور مسلمانوں میں اس کا استقبال اگرچہ نہایت شاندار طریقہ پر شادیانے بجا کر اور آتش بازی چھوڑ کر کیا جاتا ہے - لیکن یہ شادی کا پہلا دن ہی ایک مسلسل اور ہولناک ٹریجڈی کا پہلا دن ہوتا ہے اور اس ایک دن کی شادی کی وجہ سے بعد میں جو جو مصیبتیں اور پریشانیاں لاحق ہوتی ہیں ان کو دیکھتے ہوئے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ پہلا دن شادی کا نہیں بلکہ غمی کا تھا -

شادی کے ایک دن ہی نہیں بلکہ اس کی سلسلہ جنبانی ہونے ہی جن رسوم کی بھرمار ہوتی ہے ان کی کوئی حد نہیں - غریب سے غریب آدمی بھی اس وقت غنی بن جاتا ہے اور بے دریغ روپیہ قرض لیکر اپنی خوشی سے پھلجھڑیاں چھوڑتا ہے اور طرح طرح کے بیہودہ کھیل تماشوں میں صرف کرتا ہے - ان بیہودہ رسوم کو مستحبات یا واجبات ہی کا درجہ حاصل نہیں ہے بلکہ فرائض سے بھی بڑھ کر ان کا شمار ہوتا ہے - ایک غریب سے غریب آدمی پر بھی سب رسوم کی ادائیگی لابد ضروری ہے - بغیر ان کے اول تو شادی ہو ہی نہیں سکتی اور اگر کسی نے ہمت کر کے کر دی تو اپنے خاندان میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا، عزیز و اقارب اس سے ملنا جلنا ترک کر دینگے اور وہ خود مارے ندامت کے زمین میں گڑا جائے گا گویا اس نے سوسائٹی کا بڑا جرم کیا ہے - ہاں عزیز و اقارب اور خود اس کو خوشی اس وقت حاصل ہو گی جب شادی کے بعد قرض کا انبار اس کی گردن پر ہو جائے اور قرضخواہ شادی کے بعد ہی سے آئے دن تقاضا کر کے ادھر میاں بیوی کا عیش اور ادھر ماں باپ کی نیند حرام کر کے جائداد کو نیلام پر چڑھا دے -

ان شادیوں کی ایک دوسری خصوصیت یہ ہے کہ شادی، بیاہ ہونے کے لئے طرفین کی رضامندی حاصل کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی - اکثر صورتوں میں تو ان میں اپنا نیک بد سمجھنے اور برے بھلے میں تمیز کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی اور جن میں ہوتی ہے ان میں لڑکے یا لڑکی کو یہ اختیار نہیں ہوتا کہ وہ اپنا رفیق حیات اپنی مرضی اور منشار سے منتخب کرے - بلکہ والدین یا سرپرستوں کی مرضی اور حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینا ہوتا ہے اور اس کو لڑکے اور لڑکی کی اطاعت اور فرمانبرداری کا بہترین ثبوت تصور کیا جاتا ہے - لڑکی کے منہ سے اس معاملہ میں ایک لفظ بھی نکلنا اس درجہ کی بیحیائی میں شمار ہوتا ہے - جو ناقابل درگزر نہیں - اول تو ان بے زبان کے منہ سے اس قسم کی کوئی بات نکلنے ہی کیوں لگی - لیکن اگر کسی باہمت لڑکی نے اپنی زندگی خراب ہوتے دیکھ کر اس قسم کا کوئی اشارہ کیا تو بس سمجھئے آفت آگئی، ہر طرف سے تھو تھو ہونے لگتی ہے - اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر وہ ایسی غیر مانوس ہستیوں سے جوڑا ملتا ہے جن کے طبائع مختلف، خیالات مختلف، ذوق مختلف، غرض کسی چیز میں مطابقت اور ہم رنگی نہیں ہوتی - اور اس سے جو نتائج آجکل کی شادیوں کے فوراً بعد ہی رونما ہوتے ہیں - وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں - ظاہر ہے کہ طوطی اور کوا کبھی بھی ایک ساتھ زندگی نہیں گزار سکتے - آپ ہزار ان دونوں کو ایک قفس میں بند کر کے رکھیں ان کی معاشرت کبھی نہیں بدل سکتی - اس پر طرفہ تماشا یہ کہ ان تمام بے ہودہ ڈھکوسلوں کو مذہب کی پیروی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے - حالانکہ یہ چیزیں مذہب کے اتنی ہی مخالف ہیں جتنی عقلِ سلیم کے - پھر یہاں یہ بھی اگر آپ سن لیں تو اچھا ہو کہ حق انتخاب کو والدین جو بلا شرکت غیرے اپنا حق تصور کرتے ہیں - اس میں ان کی پسند اور انتخاب کی بڑی وجہ مال و جاہ اور دولت و ثروت کا حصول ہوتا ہے اسی وجہ سے ایسی مثالیں اکثر دیکھنے میں آتی ہیں کہ ایک نوجوان لڑکی کی شادی تین چار گنے عمر والے سے ہو جاتی ہے جو صاحب مرتبہ اور دولت مند ہو - اب مہر کا مسئلہ سامنے لایئے، تو یہاں بھی والدین کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ جو بڑے سے بڑا عدد یاد ہو وہی مہر مقرر ہو جائے - اور یہ فریق ثانی کی طرف سے بہت آسانی سے یوں پورا ہو جاتا ہے - کہ یہ چیز کبھی دینے کی تو ہے نہیں - جس میں کچھ قیل و قال کی گنجائش ہو - اس کا خمیازہ اس وقت بھگتنا پڑتا ہے جب میاں بیوی میں اختلاف کی وجہ سے تفریق کی نوبت آئے اور میاں بھی طلاق دے کر اپنا پیچھا چھڑانے پر تیار ہوں لیکن مہر کی ادائیگی کے تصور ہی سے کلیجہ منہ کو آنے لگے اور یوں مہر نہ ادا کرنے کی وجہ بیوی کو "معلقہ" بنا کر رکھنا پڑے - یہاں طلاق کا لفظ آگیا تو اس کے متعلق بھی اتنا کہہ دوں کہ طلاق کا لفظ منہ سے نکالنا موجودہ معاشرت میں اتنا بڑا جرم سمجھا جاتا ہے جو ناقابلِ معافی ہے - چاہے میاں بیوی کڑھ کڑھ کر جان ہی کیوں نہ دیدیں - بس یہی نہیں کر سکتے - اس سے خاندان کی بدنامی لازم آتی ہے - جو خاندان کے لئے اتنا بدنما داغ ہے جو کبھی نہیں مٹ سکتا -

صرف ایک شادی کے معاملہ میں جہالت کے باعث ان بیہودہ رسوم
اور ان میں گھڑت ڈھکوسلوں کو معاشرت میں وہ درجہ حاصل ہو چکا ہے
جس نے اصل اسلامی معاشرت کے چہرہ کو چھپا دیا ہے اور سماج میں ان
کو وہ رتبہ مل چکا ہے کہ اب ان کی مکمل اصلاح معجزہ سے کم نہیں معلوم ہوتی۔
شکر ہے کہ کچھ ہی خواہان وطن نے شادی کی چند در چند اور پیچیدہ رسوم
میں سے سب سے زیادہ خطرناک اور مضر رسم کے استیصال کا بیڑا اٹھایا
ہے۔ اور ان کی کوششوں سے بچپن کی شادی کے خلاف ایک طرح کا عام
جذبہ پیدا ہو گیا ہے۔ "Age consent committee" -
نے جس میں ۹ ہندوستانی اور ایک یورپین ممبر تھا۔ اپنی رپورٹ میں تحریر کیا
تھا کہ ہندوستان کی تقریباً نصف لڑکیوں کی شادی ۱۵ سال سے کم عمر میں
ہو جاتی ہے۔ سن ۱۹۲۱ء کی مردم شماری میں درج ہے کہ "دس سال کی عمر سے
کم میں بیس لاکھ لڑکیوں کی شادی ہو چکی تھی اور ایک لاکھ ان میں سے بیوہ
بھی بن چکی تھیں"۔ ساردا ایکٹ پاس کرنے کی جو ضرورت محسوس کی گئی اس
سے اس مسئلہ کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس قانون کے مطابق
عورت کی عمر جب تک ۱۴ اور مرد کی ۱۸ سال نہ ہو جائے شادی جائز نہیں
سمجھی جاتی۔

لیکن اس ایک خرابی کے علاوہ اور جو جو رسوم مسلمانوں میں پائی جاتی
ہیں، اُن کے دفعیہ کے لئے بھی ایک متحدہ اور منظم کوشش کی ضرورت
ہے۔ اور اس کے لئے عوام کے ذہن و دماغ سے جہالت اور توہمات
کا پردہ دور کرنا ہی ضروری ہوگا۔ ورنہ ان کی جہالت اور توہم پرستی قومی ترقی
کی راہ میں ہمیشہ سنگ گراں ثابت ہوتی رہے گی۔

"جامعہ"

ہندوستانی موسیقی

رقص و سرود میں قدیم ایام سے اب تک جو فوقیت۔ اور برتری
ہندوستان کو حاصل رہی ہے۔ اس کی نظیر روئے زمین پر نہیں ملتی
ہندوستانی موسیقی کو مذہبی روایات کے مطابق دیوتاؤں سے منسوب
کیا جاتا ہے۔ کہ "برہما" (خالق) نے اس کی بنیاد رکھی شیو نے مکمل کی۔ بعد
دیو رشی نارد نے اسے انسانوں تک پہنچایا محققین کا خیال ہے۔ کہ موسیقی
کی ابتدا نٹ راج شنکر سے ہوئی۔ اُنہوں نے عوام کو "نٹ ودیا" کا سبق
دیا۔ قدیم کتب میں ہندی موسیقی یا "سنگیت کلا" سام وید سے منسوب ہے۔
ان تمام تذکروں کے باوجود ہمیں موسیقی کی ابتدا سے متعلق کوئی مستند
اور تشفی بخش ثبوت نہیں مل سکتا۔ بعضوں نے تو اس کی ابتدا سے متعلق
ایک دلچسپ کہانی بیان کی ہے۔ کہ "ایک عجیب پرندہ جس کا نام موسیقار
ہے (جو کوہ قاف میں رہتا ہے) چونچ میں سات سوراخ ہوتے ہیں۔
اور ہر سوراخ سے ایک خاص قسم کا سُر نکلتا ہے۔ وہ ان سُروں کو ملا کر
موسم اور وقت کے مطابق مختلف قسم کے نغمے پیدا کرتا ہے۔ اس طرح مختلف
راگ اور راگنیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس کی زندگی ہزار ہا سال کی ہوتی
ہے۔ اور جب اس کی موت کا وقت قریب آتا ہے۔ تو وہ خس و خاشاک
کے ایک گھونسلے پر بیٹھ کر انواع و اقسام کے دلآویز نغمے الاپتا ہے۔ جب وہ
دیپک راگ گاتا ہے۔ تو اس راگ کی تاثیر سے اس کے گھونسلے میں آگ
لگ جاتی ہے۔ اور وہ اپنی آگ میں جل کر خاکستر ہو جاتا ہے۔ پھر
قدرتاً اس کی خاک سے ایک انڈا پیدا ہوتا ہے۔ جو اپنے مقررہ وقت
کے بعد ایک نیا موسیقار بن جاتا ہے۔

یہ ہندی راگ کی مختصر اور دلچسپ تاریخ ہے۔ جو پُرانی کتب
اور سینہ بہ سینہ روایات سے ہم تک پہنچی ہے۔ اور جو مذہبی عقائد اور
باشندوں کے مجلسی اطوار، اور رسم و رواج پر بھی روشنی ڈالتی ہے

زمانہ سلف میں راگ تعلیم کا جزو تھا۔ اور نوجوان راگ کے
ذریعے مذہبی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ وہ دیوتاؤں کی حمد و ثنا اور دُعا
میں بھی موسیقی کا خیال رکھتے تھے۔ گویا راگ مذہب کا جزو لاینفک تھا۔
کوئی مذہبی رسم ایسی نہ تھی۔ جس میں راگ کو دخل نہ ہو۔ مندر اور شوالے
گانے والے پجاریوں سے بھرے پڑے تھے۔ گویئے ہر قسم کے ٹیکس سے
مستثنےٰ خیال کئے جاتے تھے۔ بعض خاندان نسلاً بعد نسلٍ راگ ودیا
سیکھتے تھے۔ اس طرح مختلف زمانوں میں مختلف اُستاد پیدا ہوئے۔
خود وید مقدس میں بھی اس امر کی شہادت ہے۔ کہ ویدک زمانے میں
مختلف آلات موسیقی مثلاً ڈنڈبھی، ادا میر، بھومی، اگاتی، کھنڈا اکرکاری
وانا (سو تاروں والی) اور وینا رائج تھے۔ فلوٹ کی قسم کے ہوائی
آلات میں تناوا (لکڑی کی فلوٹ) ندی (بانس کی فلوٹ) اور باکرا
کثرت سے مروج تھے۔ اس زمانے میں موسیقی ایک فن کی حیثیت رکھتی
تھی۔ یہ زمانہ اولیں ترقی کرتے کرتے ویدک زمانے تک پہنچا۔ جیسا کہ
سام وید (جو انڈو آرین کے زمانے یعنی مسیح سے دو سو برس پہلے
کا زمانہ ہے) گانے کے طریقے سے ظاہر ہے۔ سام وید اور رگ وید اس
امر کی سب سے پہلی مثالیں ہیں۔ کہ الفاظ گائے جانے لگے۔ سام وید مقررہ
قواعد کے تحت گا کر پڑھا جاتا تھا۔ موجودہ زمانے کے مندروں میں

گانے والوں کا (جو سام وید کے منتر گاتے ہیں) دعویٰ ہے۔ کہ یہ فن انہیں زمانہ سلف سے ملا ہے۔

اس کے بعد شام وید کے منتروں سے سات سُر نکلے۔ اوّل اوّل سام وید کے منتروں میں دو سُر تھے۔ ایک اداتار (اونچا) اور دوسرا ان اداتار (نااونچا) رفتہ رفتہ درمیانی سُر بھی تصدیق ہو گئے۔

پرتھما (پہلا) دوہتہ (دوسرا) ترتیہ (تیسرا) اور چترتھا (چوتھا) ان کے نام اکیرا تسکیھا میں جو چار سو برس قبل مسیح لکھی گئی ملتے ہیں۔ رفتہ رفتہ تین سُر کرشتہ (اونچا) مندرا (چھوٹا) اور اتسوریہ (انتہائی) زیادہ کئے گئے۔ اس طرح سات سُر مکمل ہو گئے۔ شام وید میں اونچائی سے نیچے کی طرف جانے والوں کے سُروں کا سلسلہ ہے۔ اور نیچے سے اوپر کی طرف چلنا سازندے پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ یہ قدرتی امر ہے۔ کہ کوئی گویا جو ساز بجا رہا ہو۔ اپنے گانے کو نچلے سُروں میں شروع کرتا ہے۔ کیونکہ یہ بلند اور صاف ہوتے ہیں۔

اس کے بعد بھرت کی نیتہ شاستر (پانچ سو برس بعد مسیح) کی فن موسیقی پر ایک جدا فصل ہے۔ جس پر ہندی راگ کے سات سُروں کا مفصل ذکر ہے۔ یہ سات سُر ۲۲ سرتی میں تبدیل ہو گئے۔ اس کتاب میں ان کے نام بھی لکھے ہیں۔ جو آج کل ہندوستان میں اس طرح سے مشہور ہیں:-

شادجا۔ رکھبا۔ گندھرا۔ مادھیما۔ پنچما۔ دکھیوتہ۔ نشدھا۔ (یا) سا۔ ری۔ گا۔ ما۔ پا۔ دھا۔ نی۔ کہلاتے ہیں۔ نیتہ شاستر میں گراما اور جتی کا مفصل حال لکھا ہے۔ اور سورو سرتی اور مرچنا یعنی (ٹیک) کی مکمل تشریح ہے۔

اس کے بعد ہندی راگ راگنیوں سے متعلق کئی کتابیں لکھی گئیں۔ جن میں سے چند جو زیادہ اہم اور قابل ذکر ہیں۔ وہ سنگیت رتناکر۔ سندر راگ۔ چندر اودے۔ راگ مالا۔ راگ منجری۔ اور نرتن نرنیہ بجز اوّل الذکر کے باقی حال ہی میں ریاست بیکانیر کے شاہی دار المطالعہ میں ملی ہیں۔ ان کے علاوہ سنگیت درپن مصنفہ دمودر مد (عہد جہانگیری) سنگیت پریجت مصنفہ پنڈت اہوبالا (سترھویں صدی) نغمات آصفی مصنفہ محمد رضا (۱۸۱۳ء) اور انیسویں صدی کے آخر میں رابندرناتھ ٹیگور کے چچا ایس۔ ایم۔ ٹیگور کی بہت سی کتابیں ہیں۔ جن میں یونیورسل ہسٹری آف میوزک (Universal History of Music) جنوبی ہند کے راگ کی مکمل تصویر ہے۔ اس کتاب کا تعلق سودھ میلا کلانِدھی سے ہے۔ جو رام آتیہ نے ۱۵۵۰ء کے قریب لکھی تھی۔ اور حالیہ تصنیفوں میں جو اردو میں ہیں۔ سب سے زیادہ نفع بخش "معرف النغمات" راجہ علی خاں تعلقدار اکبر کی تصنیف ہے۔

پیراجین پُستکوں میں گانے کی سولہ ہزار طرزیں اور تین سو ساٹھ تال لکھے ہیں۔ شمالی ہند کی موسیقی میں یہ طرزیں کم ہوتے ہوتے چھ راگ، چھ راگ راگنیاں اور سولہ ٹکڑوں پر ختم ہو گئیں۔ اور تال صرف ۹۲ رہ گئے۔

راگوں کے علاوہ چار مت ہیں۔ جن کے نام ان دیوتاؤں کے نام سے منسوب ہیں۔ جن سے ان کی ابتدا ہوئی۔ ہر ایک مت ظاہر کرتا ہے۔ کہ سُروں کو کسی خاص طرز پر نکالنا چاہئے۔ گو ہر ایک مت کی طرز اور زیر و بم مخصوص ہے۔ ان متوں کے نام۔

(۱) شیمشور۔ (۲) کالی ناتھ (۳) بھرت اور (۴) ہنومان مت ہیں۔ یہی چار مت عرصہ تک مروّج رہے۔ لیکن عہد مغلیہ میں دربار اکبری کے مشہور گویّے تان سین نے سائنس کا بغور مطالعہ کرکے صرف ایک مت پر اکتفا کیا۔ اور وہ ہنومان مت ہے۔ جو آج تک شمالی ہند میں پسند کیا جاتا ہے۔ تان سین نے تان کو ۹۲ سے گھٹا کر ۱۲ کر دیا۔ درباری راگ سب سے پہلے عہد اکبری میں رائج ہُوا۔ اور اس وقت سے یہ ڈراما اور مندر کے راگ کے پہلو بہ پہلو ترقی کر رہا ہے۔ تان سین جیسے موسیقی داں کا رتبہ رکھنے والے بہت کم ہیں۔ تاہم بعض ماہرین نے ضرور کمال حاصل کیا ہے۔ جن میں داں اودے پور کی شہزادی شاعر میرا بائی۔ ہندی رامائن کے مصنف تلسی داس اور پندریکا مشہور ہیں۔ جنوبی ہند میں تیغ راج مشہور گویا اور شاعر تھا۔ تیغ راج نے انیسویں صدی کے شروع میں بہت سے شاگرد بنائے جو اس وقت تک موجود ہیں۔ ہندی راگ یا راگنی کے قواعد بنانے والے جانتے تھے۔ کہ بعض آوازیں بعض موسموں سے ہم آہنگ ہو جاتی ہیں۔ اس لئے خاص راگ خاص موسموں میں گائے جانے لگے۔ اگر راگ ودیا کا ماہر کسی راگ یا راگنی کو مناسب وقت یا موسم میں الاپے تو سرور اور سکونِ قلب حاصل ہوتا ہے۔ راگ سے مریض تک اچھے ہو جاتے ہیں۔ اس لئے راگوں کے لحاظ سے دن کو سات حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:-

۱ - ۶ بجے صبح سے ۹ بجے صبح تک .. .. نرانہ نرم - خواب آور اور صاف ؞

۲ - ۹ بجے صبح سے ۱۲ بجے دوپہر تک .. .. سب صفا -

۳ - ۱۲ بجے دوپہر سے ۳ بجے تک .. .. .. سب تیز ہو جاتے ہیں

۴ - ۳ بجے سے ۶ بجے تک .. .. .. گا - ما - نی تیز اور ری - دھا - ہموار -

۵ - ۶ بجے سے ۹ بجے رات تک .. .. زیر و بم پھر تیز ہو جاتے ہیں ؞

۶ - آدھی رات سے ۳ بجے صبح تک .. .. .. ری اور پا تیز باقی ہموار ؞

۷ - ۳ بجے سے ۶ بجے صبح تک .. .. .. ہموار تیز ہو جاتے ہیں ؞

یہ تو راگ راگنیوں کے لحاظ سے مخصوص وقت کی تقسیم تھی۔ تان سین کے رائج کردہ ہنومان مت کے مطابق چھ راگنیاں یہ ہیں بھیرو، ہنڈول - دیپک - سری - میگھ اور مالکونس لیکن تان سین کی شہرت کا راز دھروپد میں تھا - جو ایک نہایت ہی مشکل راگنی ہے - جس کے سمجھنے اور گانے والے اب بھی رام پور میں موجود ہیں ؞

(سب رس)

شاعر کی موت

رات شامیانہ کی طرح سارے شہر پہ چھائی ہوئی تھی - برف باری نے ساری کائنات کو سفید لباس میں ملبوس کر دیا تھا۔ انسان جاڑے سے ہارا ہؤا - بازاروں سے بھاگ کر اپنے نشیمن میں چھپ چکا تھا - نصف شب کی ہوا مکانوں کے گرد اِس طرح آہ و زاری کر رہی تھی - جیسے پتھر کی قبروں کے درمیان کوئی بیوہ اپنے شوہر کا ماتم کرتی ہو ؞

شہر کے کنارے محلوں اور منزلوں سے علیحدہ، ایک شکستہ چھوٹا سا مکان تھا - جس کے کھنبے جھکے ہوئے تھے - برف کے بوجھ سے چھت بیٹھی جا رہی تھی - اس مکان کے کونے میں پھٹے پُرانے بستر پہ ایک شخص نزاعی کیفیت میں پڑا ہؤا ایک مدھم چراغ کو دیکھ رہا تھا - جو تاریکی پہ غالب آنا چاہتا تھا - مگر ہمیشہ مغلوب ہو جاتا ہے - یہ ایک نوجوان ہے - جس کو عنفوانِ شباب میں ہی یہ معلوم ہو گیا ہے - کہ اب زندگی کے کھیڑوں سے آزاد ہونے کا وقت آ گیا ہے - وہ موت کا انتظار کر رہا ہے - اور اُس کے زرد چہرے پہ اُمید کی جھلک - اور ہونٹوں پہ غمگین تبسّم ہے ؞

یہ بیکس شاعر جو اپنے لطیف اقوال سے انسانی دلوں کو خوش کرنے آیا تھا - سرمایہ داروں کے شہر میں بھوکا مر رہا ہے - ایک شریف جو قدوسی نعمتوں کے ساتھ زندگی کو شیریں بنانے آیا تھا - ہماری دُنیا سے رُخصت ہو رہا ہے - قبل اس کے کہ انسانیت اس کے لئے مُسکرائے - دم توڑنے والا اپنی آخری سانس پھینک رہا ہے - اور اُس کے پاس کوئی نہیں ہے - سوائے ایک چراغ کے جو اُس کا رفیق تنہائی ہے - اور چند اوراق جس پہ اُس کی پاک رُوح کے خیالات ہیں ؞

اس جاں بلب نوجوان نے اپنی باقی قوّت کو جو ختم ہونے والی تھی - جمع کیا - اور آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھا کر اپنی خشک آنکھوں کو اس طرح حرکت دی - گویا وہ اپنی آخری نگاہوں سے بوسیدہ جھونپڑی کی چھت کو چیر کر بادلوں کے پیچھے چھپے ہوئے تاروں کو دیکھنا چاہتا ہے ؞

وہ کہنے لگا " آ، دلنواز موت! آ میں تیرا بہت مشتاق ہوں - میرے پاس آ - اور مادّیت کے بند کھول دے جس کے بوجھ سے میں تھک گیا ہوں - آ - آ مجھ سے قریب ہو جا - اے شیریں موت اور مجھے ان انسانوں کے چنگل سے نکال لے جو مجھے اپنے درمیان اجنبی سمجھتے ہیں - محض اس لئے کہ میں ملائکہ سے سُنے ہوئے آسمانی الہامات کو اُن کی زبان میں بیان کر دیتا ہوں ؞

جلدی آ - پیاری موت - لوگ مجھ سے بے پروا ہیں - اُنہوں نے مجھے گوشۂ نسیاں میں ڈال دیا ہے - صرف اس لئے کہ میں اُن کی طرح سرمایہ کا حریص نہیں ہوں - اور اپنے سے کمزور پر حکومت کرنا نہیں چاہتا ہوں ؞

آ - میرے پاس آ - اے راحت بخش موت! مجھے اپنے محبّت بھرے سینے سے چمٹا لے - اور میرے ہونٹوں کو پیار کر - جنہوں نے کبھی ماں کے پیار کا مزا نہیں چکھا - جو اپنی بہن کے رُخساروں سے نہیں ملے - اور جنہوں نے کبھی اپنی محبوبہ کا بوسہ نہیں لیا ؞

اس وقت دم توڑنے والے کے پاس ایک خوبصورت

غیر انسانی عورت کا خیال کھڑا تھا - جو برف کی طرح سفید و شفاف کپڑے پہنے تھی - اور اپنے ہاتھ میں کلیوں کا ایک خوبصورت تاج لئے ہوئے تھی - جو فردوسی باغوں سے چنی گئی تھیں ٭

وہ نوجوان سے قریب ہوئی - اور گلے سے لگا لیا - اس کی آنکھیں بند کر دیں - تاکہ دل کی آنکھوں سے دیکھے - اُس کی ہونٹوں کا محبت بھرا بوسہ لیا - وہ بوسہ جس نے اس ہونٹوں پر تسکین بخش مسکراہٹ چھوڑ دی ٭

اب اس گھر میں کچھ نہیں تھا - سوائے مٹی کے ڈھیر اور چند منتشر اوراق کے جو تاریکی میں پڑے ہوئے تھے - صدیاں گزر گئیں - اور اہل وطن انکار و غفلت کی نیند میں غافل رہے - بارے وہ جاگے - اور اُن کی آنکھوں نے انکار کی تاریک رات کے بعد اعتراف کی روشن صبح دیکھی - ایک پبلک پارک میں مرحوم شاعر کا عظیم الشان اسٹیچو نصب کیا - اور سال میں ایک روز اُس کی برسی اور دن (ڈے) منانے کے لئے مقرر کر دیا -

آہ! "انسان کتنا بھولا ہے -"

(ساقی)

معزز الفاظ کی توہین

زبان کے بعض الفاظ جو نہایت مقدس و متبرک یا بیحد معزز و محترم تھے آج کل ہم نے اُن کو ایک نیا لباس پہنایا ہے - جس کے بعد ان لفظوں کی شکل بالکل مسخ اور برعکس ہو گئی ہے - اور ہمارے اخلاق کی خرابی اور اور مذاقِ سلیم کی بدذوقی کی وجہ سے جو لفظ جتنا زیادہ مقدس تھا وہ اب اتنا ہی بدترین سمجھا جاتا ہے اور جو لفظ جس قدر زیادہ معزز تھا آج کل ویسے ہی ذلیل معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے - مثلاً چند الفاظ عرض کرتا ہوں -

(۱) "حضرت" اس سلسلے میں سب سے زیادہ جس مقدس لفظ کی توہین اور بے عزتی کی جا رہی ہے وہ لفظ "حضرت" ہے - ظاہر ہے کہ یہ لفظ خدا تعالیٰ کے پاک نبیوں، اولیاء اور مقدسین مذہب کے نام کے ساتھ تعظیماً استعمال کرنے کے لئے وضع کیا گیا تھا - مگر اردو زبان کی بدقسمتی اور ہماری کور ذوقی دیکھئے کہ آج کل یہی مقدس ترین لفظ بدترین شریر، نہایت اوباش اور چھٹے ہوئے بدمعاش، بے حد چالاک، عیار اور مکار انسان کے لئے بولا جاتا ہے - افسوس صد افسوس -

(۲) "خلیفہ" یہ لفظ مذہب اسلام کی نہایت مقدس اصطلاح ہے - اللہ تعالیٰ یا انبیائے کرام کے نائبین کو اس معزز لقب سے یاد کیا جاتا ہے جیسے خلیفۃ اللہ یا خلیفۃ الرسول - خود اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا - "انی جاعلٌ فی الارض خلیفہ" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشینوں کو "خلفائے راشدین" کہتے ہیں - لیکن آہ کس قدر افسوس ہے کہ اس قدر متبرک لفظ ہماری زبان میں آکر اپنی تمام عزت و وقعت کھو بیٹھا اور آج کل نائی اور حجام یا پہلوان کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے -

(۳) "صلواۃ" اس لفظ کو دیکھیے اور ہماری اخلاقی حالت پر روئیے - کون نہیں جانتا کہ اس کے حقیقی اور واقعی معنی "نماز، دعا، درود بخشش اور خدا کی رحمت و سلامتی" کے ہیں - مگر درحقیقت رونا آتا ہے جب ہم کسی سے یہ فقرہ سنتے ہیں "خواہ مخواہ اس نے مجھے ہزارہا صلواتیں سنائیں" مطلب یہ ہے کہ بہت سی گالیاں دیں - اب بتلائیے نماز و دعا اور گالی و دشنام میں کتنا فرق ہے؟ مگر ہم روزمرہ یہ لفظ بولتے ہیں اور کبھی قطعاً ہمیں خیال نہیں آتا کہ کس قدر پاک اور متبرک لفظ کو کتنی بری اور بیہودہ جگہ استعمال کر رہے ہیں -

(۴) "علامہ یا علامہ دہر" فاضل یگانہ اور عالم بے مثل اس لفظ کے معنی ہیں - جو ظاہر ہے کہ بہت بڑا لفظ ہے - مگر ہماری قدردانی دیکھئے کہ آجکل یہ لفظ بڑی حرافہ، نہایت چالاک، بڑی عیارہ اور نہایت دھوکہ باز عورت کے لئے بولا جاتا ہے -

(۵) "ملا" اس لفظ کا بھی حشر اردو میں آکر علامہ جیسا ہوا - اس کے معنی بہت بڑے عالم اور فاضل ادیب کے ہیں - اس سے زیادہ اس لفظ کی بدقسمتی اور کیا ہو گی کہ ایک زمانہ تھا جب کہ یہ لفظ فیضی، ابو الفضل اور جامی جیسے فضلائے یگانہ کے ناموں کا جز تھا اور آجکل جاہل، بیوقوف، کودن اور احمق کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے - نیز ان فقیر نما انسانوں کے لئے جو مسجدوں کے حجروں میں رہتے اور محلے کے گھروں کی روٹیوں پر جو بطور خیرات وہ دونوں وقت مانگ کر لے آتے ہیں، گزر کرتے ہیں -

(۶) "مولوی یا مولانا" اس لفظ کے معنی ہیں وہ شخص جو خدا کا ہو رہے - یا صاحب علم - مگر اس لفظ کی آجکل وہ مٹی پلید ہوئی ہے کہ خدا کی پناہ - مسلمانوں میں ہر وہ شخص جو تحریک خلافت، تحریک ہجرت اور ترک موالات میں شامل تھا - یا جس نے ذرا سی ڈاڑھی رکھ لی بس وہ مولوی ہے - خواہ کندۂ ناتراش اور جاہل محض ہی ہو - یہ لفظ جہلا کے لئے اب

اسقدر کثرت سے استعمال کیا جانے لگا ہے کہ اصلی اور حقیقی عالم اپنے آپ کو مولوی کہلاتے ہوئے شرمانے لگے ہیں۔

(۷) "قبلہ" مسلمانوں کے سب سے زیادہ مقدس مقام کعبہ کو کہتے ہیں۔ یعنی جدھر منہ کر کے سب مسلمان پانچ وقت نماز ادا کرتے ہیں۔ مگر آج کل اخلاق اس قدر خراب ہو گئے ہیں کہ ہر اچھے لفظ کو قصداً نہایت بُرے معنوں میں ڈھال لیا گیا ہے۔ چنانچہ قبلہ آج کل نہایت عیار مکار اور چالاک آدمی کے متعلق بولتے ہیں۔

(۸) "اللہ" اب بھلا بتائیے کہ خدا تعالیٰ سے زیادہ مقدس ہستی ایک مسلمان کے لئے اور کون سی ہو سکتی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اس قادر و قیوم ذات کو بھی ہم نے خالی نہ چھوڑا۔ وہ ذات پاک جو آسمانوں اور زمینوں کی مالک اور ان کی خالق ہے، وہ شہنشاہ جو دونوں جہانوں کا مالک اور آقا ہے ہم نے اس کے متعلق جو فقرے اور محاورے ایجاد کر رکھے ہیں وہ انتہائی غریبی اور مفلسی کو ظاہر کرتے ہیں۔ چنانچہ جب ہم کہیں گے کہ "گھر میں اندھی اللہ ہے" "یا اللہ کا نام ہے۔" تو ہمیشہ اس کے یہی معنی ہوتے ہیں کہ گھر میں نہایت مفلسی، غریبی اور محتاجی ہے اور اس وقت محتاج یا سائل کو دینے کے لئے کچھ بھی نہیں۔ کتنے افسوس کا مقام ہے کہ اس مطلب کو ظاہر کرنے کے لئے ہم نے نام بھی چھانٹا تو اس ذات اقدس کا جس کے قبضہ قدرت میں تمام جہان کے خزانے ہیں اور بڑے بڑے باجبروت شہنشاہوں کو دم کے دم میں خاک میں ملا سکتا ہے۔ کیا ہمیں دنیا جہان میں کوئی اور لفظ اللہ کے سوا اس مطلب کو ظاہر کرنے کے لئے نہیں مل سکتا تھا؟

(۱۰) "استاد" ماں باپ کے بعد تعظیم و تکریم کے لحاظ سے استاد کا درجہ اخلاق کی قدیم کتابوں میں تسلیم کیا گیا ہے۔ مگر ہماری بول چال میں اگر اس لفظ کے معنی نہایت چالاک، فریبی اور دغاباز کے ہو گئے۔ زمانے کا انقلاب ہے۔

(۱۱) "گرو"۔ اس لفظ کی قسمت بھی بالکل لفظ استاد کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔

شاہکار کے متعلق
ارکانِ حکومت، عمائدِ ملک اور اہلِ علم و قلم حضرات کی راؤں کے چند اقتباسات

ہز ایکسیلنسی سر ہربرٹ ولیم ایمرسن کے۔ سی۔ آئی۔ ای۔ آئی۔ سی۔ ایس
سابق گورنر پنجاب

"میں آپ کے اِس اقدام سے دلچسپی رکھتا ہوں اور اس کی کامیابی کا متمنی ہوں۔"

آنریبل سر ملک فیروز خاں نون ایم۔ اے (آکسن) بیرسٹرایٹ لاء
سابق وزیر تعلیم پنجاب۔ حال کمشنر فار انڈیا (انگلستان)

"میں شاہکار کے مضامین نہایت دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ شاہکار کا اہم ترین مقصد عوام کو غیر ممالک کے متعلق واقفیت بہم پہنچانا ہے ہمارے اکثر اردو رسائل و جرائد سیر و سیاحت، تاریخِ جدید اور روزانہ واقعات پر کوئی روشنی نہیں ڈالتے۔"

آنریبل ڈاکٹر میاں سر فضل حسین مرحوم۔ ایم۔ اے۔ ایل ڈی۔ بارایٹ لاء
کے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ سابق ممبر تعلیمات حکومتِ ہند و وزیر تعلیم پنجاب

"شاہکار اعلیٰ پایہ کا ماہنامہ ہے۔ عمدہ اصولوں پر چلایا جا رہا ہے۔ اور زبانِ اردو ملک کے لئے مفید ہے۔ مجھے رسالے کا خریدار بنالیں اور اس کا خیر خواہ معاون تصور کریں۔"

آنریبل سر جوالا پرشاد واستو۔ کے۔ ٹی۔ وزیر تعلیم صوبجات متحدہ

"میں اسے اوّل درجہ کی چیز سمجھتا ہوں اور آپ کو مبارکباد دیتا ہوں میں اس کا خریدار بننا پسند کروں گا۔"

رائٹ آنریبل نواب حیدر نواز جنگ بہادر سر اکبر حیدری صدر اعظم
مملکت آصفیہ دکن

"مجھے شاہکار پڑھ کر بڑی مسرت ہوئی۔ میری رائے ہے کہ اس کا خیر مقدم اردو صحافت کی تاریخ میں ایک ممتاز نشانِ راہ کی حیثیت سے کرنا چاہئیے دلچسپ اور ہادیانہ مضامین کی اشاعت سے آپ کا مجلّہ اردو دنیا کی خدمت بجا لاسکتا ہے۔ اُسے اردو کے وہ تمام شیدائی بیحد پسند کریں گے۔ جو اس زبان میں مختلف ترین موضوعات پر اظہار خیال دیکھنے کے متمنی ہیں۔"

آنریبل جسٹس خواجہ سر محمد نور بی۔ اے۔ ایل۔ وائس چانسلر
پٹنہ یونیورسٹی۔ جج ہائیکورٹ پٹنہ

"ترتیب مضامین اعلیٰ ہے اور مقالات قیمتی اور ہادیانہ ہیں۔"

ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب۔ ایل ایل۔ ڈی۔ ممبر اسمبلی۔
وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

"میں نے رسالہ شاہکار کا مطالعہ کیا۔ اس کی ظاہری شان اور باطنی خوبیاں ناقابلِ انکار ہیں۔ اس کے علمی اور تعلیمی مضامین بہت بلند پایہ ہیں اور تعلیمات پر اس کی رائے قابلِ وقعت ہوتی ہے۔ ایسے بلند اور مفید علمی رسالے کی ادبِ اردو کو ضرورت تھی۔"

مرزا محمد سعید صاحب ایم۔ اے۔ آئی۔ ای۔ ایس ریٹائرڈ
سابق نائب معتمد تعلیمات حکومت ہند

مضامین کا انتخاب و ترتیب۔ مطالب کا مفاد و تنوع۔ تصاویر کی زیبائش اردو صحافت کے لئے مایۂ ناز خیال کئے جاسکتے ہیں۔ یہ امر واقعی ہے کہ شاہکار سے بہتر رسالہ اب تک شائع نہیں ہوا۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔
پروفیسر لسانیات عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن

اس قسم کے دیدہ زیب رسالے کی اردو کو بہت سخت ضرورت تھی۔ اگرچہ پنجاب سے اس طرح کے اور بھی رسالے نکلتے رہے ہیں۔ لیکن شاہکار اپنے گوناگوں خصوصیات کی بنا پر سب پر سبقت لے گیا ہے۔ خاص کر تحقیقی اور تنقیدی مقالات و مضامین کی وجہ سے اردو کے سنجیدہ اور علمی رسائل میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس پایہ کے اعلیٰ علمی مقالات کے ساتھ ساتھ ظاہر بینیوں اور عام دلچسپی رکھنے والے اصحاب کے مذاق کا بھی خیال رکھنا نہایت مشکل امر ہے۔ اور بڑی خوشی ہوتی ہے جب شاہکار میں دونوں خوبیاں ہم پہلو نظر آتی ہیں۔

ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ لٹ پروفیسر پنجاب یونیورسٹی:

شاہکار درحقیقت شاہکار صحافت ہے۔ گزشتہ بیس سال میں پنجاب کی ادبی فضا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے آج اچھا کہنے والوں اور اچھی سمجھ رکھنے والوں کی تعداد درجنوں سے سینکڑوں ہوچکی ہے۔ اس حیرت افزا انقلاب کے محرکین میں سب سے ممتاز درجہ علامہ تاجور صاحب کا ہے۔ اللہ دے

تو عروسِ ادب کو ایسے ہی جاں نثار و خدمت گزار دے۔ کیا نظم اور کیا نثر۔ دونوں میں اس صاحبِ کمال نے نہ صرف خود اعجازِ قلم دکھایا بلکہ بیسیوں کو ادب کی سیدھی راہ پر بھی

[illegible]

شاہکار لاہور

ایڈیٹر:- پروفیسر تاجور نجیب آبادی

ادارہ:- خواجہ محمود جاوید ایم۔ اے
گوپال متل بی۔ اے

چندہ:- سالانہ چھ روپے۔ ششماہی تین روپے آٹھ آنہ۔ نمونہ آٹھ آنہ۔

جلد (۸) — نمبر ۲

فہرست مضامین بابت نومبر ۱۹۳۸ء

۱۔ مختصرات — تاجور و گوپال متل — ۴۸۰
۲۔ تنوبرات — گوپال متل — ۴۹۰
۳۔ مقوقس مصری — جناب عبدالرحمٰن صاحب ناصر اصلاحی — ۵۰۱
۴۔ کامیاب مصنف — جناب اثر چکوالی بی۔ اے — ۵۰۷
۵۔ معراجِ محبت — حضرتِ خورشید بی۔ ایس۔ سی — ۵۰۹
۶۔ شہرِ خموشاں — جناب رونق کاشمیری — ۵۱۴
۷۔ مختار :- اس ماہ کا بہترین افسانہ — ۵۱۹
۸۔ صفحۂ اطفال :- منقول از "پریم" — ۵۱۵
۹۔ افکار تازہ :- ماخوذ — ۵۳۱
۱۰۔ بزمِ انتخاب :- تازہ ترین اخبارات و رسائل سے اہم اور متنوع اقتباسات — ۵۳۱

حصۂ نظم

۱۱۔ محسوسات — حضرت ماہر القادری — ۴۸۹
۱۲۔ عروسِ نو — جناب محمد یونس سلیم بی۔ اے — ۴۹۷
۱۳۔ آنسو — گوپال متل — ۴۸۴
۱۴۔ غزل — جناب رہبر بی۔ اے — ۵۰۸
۱۶۔ غزل — جناب صادق منشی فاضل — ۵۰۶
۱۷۔ قطعہ — جناب احسان اللہ خاں مضطر — ۵۲۵

افسانے

۱۸۔ جبنی — جناب رونق کاشمیری — ۴۹۲
۱۹۔ سانپ کا انتقام — گوپال متل — ۴۸۵
۲۰۔ عاصم — جناب ایچ۔ اے تائب بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی وکیل — ۵۱۱
۲۱۔ عروسِ فردوس — جناب جاوید (علیگ) — ۵۲۶
۲۲۔ باورچی خانے کا بھوت — جناب عنایت اللہ انبالوی بی۔ اے — ۵۳۲
۲۳۔ احساسِ عشق — جناب اثر چکوالی بی۔ اے — ۴۹۸

ایم ہادی حسن اختر پرنٹر پبلشر نے آزاد ہند پریس ہسپتال روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر شاہکار ... سے شائع کیا

مختصرات

کانگریسی رہنماؤں کی اردو دشمنی

تاریخ ہندوستان کا ایک سطحی طالب علم بھی اس واقعیت سے باخبر ہے کہ اردو زبان مختلف اقوام ہند کے باہمی ارتباط و اختلاط کے سبب ان کی معاشرتی ضرورتوں کے پیش نظر عالم وجود میں آئی - ہندوستان اس کا مولد ہندوستان ہی اس کا وطن اور ہندوستانیوں ہی نے اسے پروان چڑھایا ہے - اس لئے حقیقتہً ملک کی مشترکہ زبان کہلائے جانے کی یہی مستحق ہے - ہندوستان کے گوشے گوشے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے ہندوستان سے باہر دُنیا کے جس جس حصے میں ہندوستانی پہنچے ہوئے ہیں - اردو کو تحفۂ وطن کی صورت میں ساتھ لے گئے ہیں - امریکہ، افریقہ اور یورپ میں رہنے والے ہندوستانی خواہ ہندوستان کے کسی گوشے اور کسی قوم سے متعلق ہوں - آپس میں اردو ہی بولتے ہیں اور فارسی رسم الخط ہی میں اردو زبان میں مراسلت و مکاتبت کرتے ہیں - مختصر یہ کہ ہندوستان کی دو ڈھائی سو زبانوں میں اردو کے بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد تیس کروڑ سے [illegible] ہیں - دوسرے لفظوں میں اردو صحیح معنی میں ملک کی مشترکہ زبان اور ہندوستان کی لینگوا فرینکا ہے - اس کا رسم الخط مختصر نویسی کا بہترین نمونہ سمجھا جاتا ہے - ہمسایہ ممالک کی زبانوں کے بہت سے الفاظ اردو زبان میں مِل جُل کر اردو کا جُزو بن گئے ہیں - اِن کی زبانوں کا رسم الخط بھی اردو رسم الخط ہی سے ملتا ہے - .. .. -

.. .. گویا اردو زبان اور اس کا رسم الخط ہمسایہ سلطنتوں سے آزاد ہندوستان کے تعلقات خوشگوار بنانے میں بہت معاون ہو سکے گا -

مشہور فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی، مسٹر فیلن، ڈاکٹر اسپرنگر، وغیرہ اردو زبان کی اس امتیازی برتری کا اعتراف کر چکے ہیں - سر تیج بہادر سپرو جیسا ذمہ دار اور آزاد خیال ہندوستانی رہنما اردو زبان کو مشترکہ ملکی زبان تسلیم کرتے ہوئے اس کی غور و پرداخت اور ترقی پر بار بار اہل ملک کو توجہ دلاتا رہتا ہے - آج سے چند سال پیشتر خود مہاتما گاندھی ایک مضمون میں تحریر کر چکے ہیں کہ اردو زبان ملک کی ایک زندہ زبان ہے -

اور چونکہ فارسی اور عربی زبانیں اس کا ماخذ ہیں - اس لئے اُردو میں آزادی، آزاد خیالی اور زندگی کے عناصر ہندوستان کی دوسری زبانوں کی بہ نسبت زیادہ پائے جاتے ہیں "

اردو ادب کے ذخیرۂ بیکراں میں ہندوستان کی تمام قوموں اور مذہبوں کا تاریخی اور مذہبی لٹریچر منتقل ہو چکا ہے - دوسرے لفظوں میں بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو زبان کا ادب تمام اقوام ہند کے ادبیات کا نمائندہ ادب ہے اور اِس حیثیت سے بھی اردو زبان یہ حق رکھتی ہے کہ اسے آزاد ہندوستان کی مشترکہ اور سرکاری زبان تسلیم کیا جائے - ہندی زبان اور دیوناگری رسم الخط کسی پہلو سے بھی اردو اور اُس کے رسم الخط کے مقابلے میں نہیں لائے جا سکتے - کل کی بات ہے کہ ہندوستانی ادیب، اہلِ صحافت، اہلِ سیاست اور خود اربابِ حکومت اردو کے اس امتیاز میں اور کسی زبان کو اس کا حریف نہیں مانتے تھے - لیکن پالیٹکس کا بُرا ہو کہ حق و باطل کی تمیز مٹا دیتی ہے - اور عموماً پالیٹیشنوں کے خدا اور ضمیر کی قائم مقام ڈپلومیسی بن جاتی ہے - پنڈت مالویہ اردو زبان کے شاعر ہیں اور ان کی تقریر عربی و فارسی کے الفاظ کی بھرمار کے سبب علمائے اسلام کی زبان سے لگا کھاتی ہے - بابو راجندر پال نے بی - اے تک فارسی پڑھی ہے - اب سے پہلے اردو زبان میں ان کی تحریریں ادیبانہ شکوہ رکھتی تھیں - پنڈت موتی لال کے خاندان کی اردو زبان دلی اور لکھنو کے قدیم شائستہ اور مہذب خاندانوں کی طرح مستند سمجھی جاتی ہے - آنجہانی لالہ لاجپت رائے اپنی تقریر و تحریر میں نہایت شُستہ اور رُفتہ اردو استعمال کرتے تھے - اب بھی کہ ہندی زبان کانگریسی حکومتوں کے زیر سایہ پروان چڑھائی جا رہی ہے - ملک میں اردو زبان کے ہندو شعرا کی تعداد ہندوستان کی تمام زبانوں کے شعرا کی تعداد سے زیادہ ہی ہے - مگر اندھیر یہ ہو رہا ہے کہ عام سمجھائی ہندوؤں سے قطع نظر کانگریسی رہنما بھی آزادی کے اسقدر خواہشمند نہیں معلوم ہوتے، جسقدر اردو کو مٹانے کے آرزومند نظر آتے ہیں - ان کی زبانوں پر رواداری کے حرف قریب الفاظ ہیں - مگر ان کے دماغوں میں اردو کو ملک کی زبانوں میں شودر بنانے کی اسکیمیں پرورش پا رہی ہیں -

ہندی میں نامانوس انگریزی الفاظ کی بھرمار تو اس لئے قابلِ برداشت

کہ اس سے زبان سرمایہ دار بن رہی ہے۔ جن سینکڑوں برس کے عربی فارسی الفاظ جو زبان کا جزو بن چکے ہیں اور جنہیں بڑا سے ہندی شعرا بھی بے تکلف استعمال کر چکے ہیں۔ اُن کا امتزاج اس سبب سے زبان کو غیر ملکی اور خالص اسلامی زبان بنا دیتا ہے۔ کہ وہ عربی الفاظ قرآن میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اور ملک کی زبان اُن سے بھرشٹ ہو رہی ہے۔

یہ ہے کانگریسی رواداری اور اس پہ اقلیتوں کو سرمن دیا جا رہا ہے کہ

"وہ چپ چاپ کان دبا کر کانگریس میں شامل ہو جائیں۔
کانگریس اُن کے کلچر زبان اور مذہب کی حفاظت کریگی۔"

"بزیرِ دلقِ مرقع کمند ہا دارند
درازدستیٔ ایں کوتہ آستیناں بیں"

یو۔پی کا سوشلسٹ وزیرِ تعلیم تو اِس سلسلے میں مصنوعی رواداری کو بھی ضروری خیال نہیں کرتا۔ اردو کی مخالفت اور ہندی کی حمایت میں اُس کی تقریریں اور تحریریں بے حجاب اور بے لاگ ہو رہی ہیں۔ مسٹر آر ایس پنڈت جو نہرو خاندان سے ازدواجی رشتہ قائم کرنے کے سبب کانگریسی رہنماؤں میں آملے ہیں۔ اردو اُن کی مادری اور تعلیمی زبان ہے۔ ہندی میں اظہارِ خیال کی قدرت بھی نہیں رکھتے۔ مگر یہ بزرگ بھی لیڈری کے خمار میں مبتلا ہو کر مسٹر سمپورنانند وزیرِ تعلیم یو پی کے اردو کش لشکر میں شامل ہو گئے ہیں۔ مہاتما گاندھی جن کے شردھالو انہیں "مہادیو" کا درجہ دے چکے ہیں اپنی چند سال پہلے کی تحریر کو نسیاً منسیاً کر کے "ہندی ہندوستانی" کا نیا نظریہ پیش کرتے ہوئے اردو کو قرآن اور مسلمان کی زبان بتا رہے ہیں۔ کیسا ظلم ہے کہ ایک پنج صد سالہ ترقی پذیر علوم و فنون کی سرمایہ دار، ملک کے عام و خاص کی ترجمان زبان کو صرف اس قصور پہ مٹایا جا رہا ہے کہ قرآن کے رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ اور مسلمان اس سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

ملک کے اردو اخبارات، اردو اہلِ قلم اور بعض رہنماؤں کے احتجاج پہ کانگریسی سامراج نے صرف یہ رواداری برتی کہ "مسلمان چاہیں تو اردو رسم الخط اختیار کر سکتے ہیں۔"

پٹنہ میں بابو راجندر پال نے ہمارے بھولے بھالے بوڑھے ادیب ڈاکٹر عبدالحق سیکرٹری انجمن ترقی اردو کو اپنی نمائشی رواداری دکھا کر نہایت شاطری سے اپنا ہمزبان بنا لیا اور ایک ایسے مشترکہ اعلان پہ اُن سے دستخط کرا لئے جو اردو زبان کے حال اور مستقبل کو اردو کا مدفن بنا دیتا ہے۔

یہ کہنا کہ جو مسلمان اردو زبان کی تعلیم اور اس رسم الخط میں لکھنا چاہیں گے انہیں ایسا کرنے کی آزادی حاصل ہوگی۔ مسلمانوں کے لئے کوئی ایثار یا اُن پر کوئی احسان نہیں بلکہ عملی طور پہ اردو زبان کو ملیامیٹ کر دینے کے مساوی ہے۔ کیونکہ آج جب کہ کانگریسی اقتدار ریاستوں کی حکومت کی طرح برائے نام اور انگریزی تسلط کا دستِ نگر ہے۔ اردو کے اساتذہ بھی یو۔پی اور دوسرے کانگریسی صوبوں میں اپنے افسرانِ معائنہ کو ہندی زبان اور دیوناگری رسم الخط میں درخواستیں بھیجنے ہی میں اپنی ملازمت کی خیر سمجھتے ہیں۔ مجھے یو پی کے کئی مسلمان ڈپٹی انسپکٹران مدارس نے بتایا کہ اردو زبان کو بطور مضمون اختیار کرنے والے طلبہ کو اسکولوں کے ہندو ہیڈ ماسٹر عام طور پر صاف کہہ دیتے ہیں۔ کہ تھوڑے سے طالب علموں کے لئے اردو کی تعلیم کا انتظام نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے تم ہندی زبان ہی لے لو۔"

ہندی نواز افسرانِ معائنہ سے مرعوب اور ان کے التفات کے دستِ نگر مسلم اساتذہ اپنا استحقاق توجہ اسی میں خیال کرتے ہیں کہ اردو پڑھنے والے طلبہ کو کہہ سُن کر ہندی اختیار کرنے پر مجبور کریں۔

یو۔پی کے وزیرِ تعلیم اور دوسرے کانگریسی رہنما مہاتما گاندھی کی الشور بانی کی شہ پہ کھلے بندوں ہندی زبان کی بیجا حوصلہ افزائی اور اردو کی تخریب کے درپے ہیں۔ اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان بتانا اور اس لئے مسلمانوں کو اِس حاتمانہ ایثار سے ممنون کرنا کہ "انہیں اردو پڑھنے لکھنے کی آزادی ہوگی۔"

درحقیقت اردو زبان کی تاریخ سے دانستہ آنکھیں بند کرنا اور اُن ہزاروں ہندو شاعروں، ادیبوں اور مصنفوں کی محنت و جانکاہی پر خاک ڈالنا ہے جنہوں نے اسے ملکی زبان سمجھتے ہوئے اپنی عزیز زندگی اس کی خدمت پر نچھاور کی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اردو مسلمان کی نہ مذہبی زبان ہے نہ حکومتی۔ مسلمان فاتح دنیا کے جس گوشے میں پہنچے وہاں ان کی مذہبی اور حکومتی زبان عربی بھی ان کے ساتھ گئی اور دیکھتے دیکھتے اُس خطے میں عربی زبان نے مذہبی، تعلیمی، تصنیفی اور دفتری زبان کا رتبہ حاصل کر لیا۔

اسپین میں ہفت صد سالہ اسلامی حکومت کی تاریخ اس کی شہادت دے سکتی ہے۔ دُور کیوں جائیں۔ ہندوستان کے ہمسایہ ملک ایران ہی کی اسلامی حکومت کی تاریخ سے اس دعوے کی ناطق تصدیق ہو سکے گی۔

صرف ایک ہندوستان واحد ملک ہے جہاں مسلمان حکمرانوں نے عربی زبان کو سرکاری زبان نہیں بنایا۔ بلکہ اقوامِ ہند کے ارتباط سے جو ایک مخلوط زبان یہاں پیدا ہوئی اُسی کی سرپرستی کرتے رہے۔ اسی حد سے

آجکل کے آزاد ہندوستان میں مطلق العنان ہندی نواز افسران کے خود اقتدار کا اندازہ کرنا آسان ہے۔

بڑھی رواداری کا انتقام اب کانگریسی حکمراں اس صورت میں لینا چاہتے ہیں کہ اردو زبان کو قرآن اور مسلمان کی زبان بتا کر اُسے نہ صرف اس کی ہندوستان گیر حیثیت سے گرا رہے ہیں۔ بلکہ ایک تہمت کے طور پر اپنے مسلمانوں کے سر تھوپ کر ان ملیچھوں کے ساتھ اس شودر بھاشا کو بھی مٹانے کے آرزو مند ہیں۔

اِدھر مسٹر جناح کا اردو زبان کو مسلم حقوق میں داخل کرنا ایک مصیبت بالائے مصیبت ہے۔ جو مسلمانوں کے ہاتھوں اردو پر نازل کی جا رہی ہے۔ کیونکہ مسلم مطالبات میں عربی زبان بطور ہماری ملی زبان کے شامل کی جا سکتی ہے نہ کہ اردو۔ اردو ملک کے تمام فرقوں کی زبان ہونے کی حیثیت میں مسلمانوں یا کسی خاص فرقے کی زبان نہیں ہے۔ اردو زبان کو مشترکہ ملکی زبان تسلیم کئے جانے کے متعلق ہمارا مطالبہ مسلمان ہونے کی حیثیت میں نہیں ہندوستانی ہونے کی حیثیت میں ہونا چاہیئے! یعنی ہم ہندوستانی ہیں اور بہ حیثیت ہندوستانی اردو زبان کو ہندوستان کی واحد سرکاری زبان قرار دینے پر اصرار کرتے ہیں۔

اردو ہندی کا سوال یوپی کے سابق لفٹنٹ گورنر سر میکڈانلڈ کے عہدِ حکومت کی ایک نفرت انگیز یادگار ہے۔ برطانوی سامراج کے اس شاطر علم بردار نے ہندو مسلمانوں میں تفرقہ ڈال کر برطانوی تسلط کو پائدار بنانے کی خاطر یہ فتنہ برپا کیا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے اردو کی ہندوستان گیری ہندو مسلمانوں کے ساتھ ہی اربابِ حکومت میں بھی طے شدہ حقیقت کے طور پر تسلیم کی جاتی تھی۔

میری رائے ہے کہ مسلمانوں کے جماعتی مطالبات میں اردو کے تحفظ و بقا کا مطالبہ اردو زبان کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ اس مطالبے سے دوسرے لوگوں کو خواہ مخواہ یہ مغالطہ ہوتا ہے کہ واقعی اردو مسلمانوں کی زبان ہے اسے ہندوستان گیری کا حق نہیں پہنچتا۔

مسلم مطالبات میں عربی زبان کی ترویج، تحفظ اور بقا کا مطالبہ شامل کرنا چاہیئے۔ کیونکہ عربی زبان ۱۴ سو برس سے مسلمانوں کی مذہبی اور حکومتی زبان چلی آتی ہے اور دنیا کی چند زندہ، پائندہ اور ترقی یافتہ علمی زبانوں میں اُس کا شمار ہوتا ہے۔

ہندی اور اس کا ماخذ سنسکرت برادرانِ وطن کی مذہبی زبانیں ہیں۔ اور انصاف اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے کہ یہ دونوں زبانیں مردہ اور نیم مردہ ہو چکی ہیں۔ مہاتما بدھ اور بدھ حکمرانوں نے ان پر جو کاری ضرب لگائی تھی اُس کا اندمال شنکر اچاریہ کی چارہ سازی سے بھی نہ ہو سکا۔ اب انہیں قانونی جبر و اقتدار سے ۳۵ کروڑ ہندوستانیوں کے منہ میں ٹھونسنا ظالمانہ حماقت اور غیر عادی حادثہ نہیں تو اور کیا ہے؟۔

اردو کی ہمہ گیری ہمہ رسی ہر دلعزیزی اور فطری دلکشی کا یہ حق ہے کہ ہندوستان کے انصاف پسند اور حق رساں اہلِ نظر اسے واحد مشترکہ ملکی اور دفتری زبان تسلیم کرانے کے لئے کانگریس کے مغرور لیڈروں اور میسو کمیٹیوں سے متحدہ مطالبہ کریں۔

نواب سر مزمّل اللہ خاں کی وفات

نواب سر مزمّل اللہ خاں مرحوم کی وفات سے ملک کا ایک ایسا علم پرور، اہل علم نواز مخیر رئیس کم ہو گیا جس کی دریا نوالی سے علمی و تعلیمی ہندوستان کا گوشہ گوشہ سیراب ہو رہا تھا۔

عزت جاہ و مال میں نواب صاحب مرحوم کے حریف اس موجودہ زمانے میں ملک میں بہت نایاب ہیں۔ بہت بڑے صاحبِ جائداد ہونے کے ساتھ ہی وہ پبلک اور حکومت کے طبقات میں حد درجہ ہردلعزیز تھے۔ دولت و تمول کی فراوانی کے باوجود ان کے ذاتی اخراجات کفایت شعاری سے بڑھ کر بظاہر بخل کے حدود تک پہنچ جاتے تھے۔ لیکن قومی اور تعلیمی کاموں میں ان کے سحاب کرم کی بارش سیلاب رواں و دواں کی صورت ملکی اداروں کو سیراب کرتی رہی۔ وہ بہادروں کی طرح دولت حاصل کرتے تھے اور مہاتماؤں کی طرح اُسے لٹاتے تھے۔

علی گڑھ کالج کو مسلم یونیورسٹی بنا کر اُس کی عظمت و شان کو قائم رکھنے میں نواب صاحب مرحوم کی حاتمانہ سخاوت کو بہت دخل ہے۔ ان کی وفات ملکی ادارات اور خاص طور پر مسلم یونیورسٹی کے لئے ایک حادثہ عظیم سمجھی جا سکتی ہے۔

خدائے برتر مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کے خورد سال یتیم کو حوادثِ زمانہ سے محفوظ رکھ کر ان کا صحیح جانشین بنائے آمین۔

تاجور

امن کا دیوتا ہٹلر

اس حقیقت نفس الامری سے کسی ذی ہوش شخص کو انکار نہیں ہو سکتا کہ میونخ کانفرنس کے فیصلے بھیڑ کو بھیڑیے کے سپرد کرنے کے مترادف تھے اور جہاں تک انگلستان اور فرانس کے رویے کا تعلق ہے اسے تو اعتراف شکست کے علاوہ اور کوئی نام دیا ہی نہیں جا سکتا۔ لیکن انگریزی پریس کی ڈھٹائی دیکھئے کہ ان لوگوں کو امن کے دیوتا کا نام دیا جا رہا ہے ۔ جو زیکوسلاویکیہ کو موت کے منہ میں دھکیلنے کا موجب ہوئے۔ کبھی مسٹر چیمبرلین کی قصیدہ خوانی ہو رہی ہے اور کبھی فرانسیسی نمائندہ کی، لیکن اس قصیدہ خوانی کو جائز اور برحق ثابت کرنے کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ ہٹلر کی شان میں بھی کچھ تعریفی کلمات کہہ دیئے جائیں۔ چنانچہ اب انگریزی اخبارات میں ہٹلر کی تعریف بھی شروع ہوگئی ہے بلکہ ایک کثیر الاشاعت اخبار نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ ہٹلر کو قیامِ امن کے سلسلے میں نوبل پرائز دیا جائے۔ گویا اس اخبار کے نزدیک ہٹلر کا آسٹریا کو غصب کر جانا زیکوسلاویکیہ کی جمہوریت کا خاتمہ کر دینا اور اپنے حزب آشام والنٹیروں کو اسپین میں بھیج کر وہاں جدال و قتال کا بازار گرم کر دینا یہ سب کچھ قیام امن کے لئے تھا۔ اگر قیام امن اسی کا نام ہے تو پھر درندگی اور ڈکیتی کسے قرار دیا جائیگا

فلسطینی عربوں کا جوشِ جہاد

فلسطینی عرب اپنے وطن عزیز کو آزاد کرانے کے لئے جس شجاعت بہادری اور جانسپاری کا ثبوت دے رہے ہیں اس کی نظیر مشکل ہی سے ملے گی۔ عربی اخبارات میں ایک خط شائع ہوا ہے جو فلسطین کی ایک خاتون نے شام سے اپنے بیٹے کو لکھا ہے۔ بیٹے نے جہادِ حریت میں شرکت کے لئے والدہ کی اجازت طلب کی تھی ۔ اس کے جواب میں والدہ نے جو خط لکھا اس کا ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے :۔

"میرے فرزند! خدا تمہیں اسلام کا خادم بنائے اور تم سے وہ کام لے جو اس کی مرضی کے مطابق ہو۔ تم مجھ سے پوچھتے ہو کہ فلسطین کے ہنگامہ میں کیا کروں! فرزند! مجھے تو خیال تھا کہ تم نے اسلام اور وطن کی خدمت کرتے کرتے جان دیدی ہوگی۔ دل میں سوچتی تھی کہ آہ میرے فرزند! تیری شہادت کی خبر بھی مجھے نہیں ملی۔ اگرچہ تو شہید ہو چکا ہے کیونکہ کئی ماہ سے کوئی اطلاع نہیں ملی۔ لیکن کیا اچھا ہوتا کہ کوئی مجھے اس شہادت کی تفصیل بتاتا اور میں خوش ہو ہو کر سنتی۔ مگر تم زندہ ہو اور مجھے یقین ہے کہ اس لئے زندہ ہو کہ وطن کی راہ میں جان دیکر لازوال زندگی حاصل کرو۔ تم پوچھتے ہو کیا کروں؟ اور پھر مجھ سے اللہ کی راہ میں جان دینے کی اجازت طلب کرتے ہو؟ فرزند یہ وقت اجازت طلب کرنے کا نہیں ہے۔ اس وقت ہمارے بھائی ہماری مائیں اور بچے ایک ایک کرکے ذبح کئے جا رہے ہیں۔ فرض کرو کہ میں تم کو اجازت بھی نہ دوں تو کیا تم میری محبت میں قوم اور اسلام کی محبت کو بھول جاؤ گے؟ نہیں مجھے بھی مرنا ہے اور تم کو بھی دنیا سے گزرنا ہے۔ کیا اچھا ہو کہ اسلام کی راہ سے یہ سفر اختیار کیا جائے؟

میں دیکھتی ہوں کہ میری بہنوں نے اپنے پانچ فرزند اسلام پر قربان کر دیئے ہیں۔ میرا کوئی نہیں، سوائے تمہارے کہ تم ہی میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہو۔ اگر تم نے مظلوموں کی حمایت میں کچھ بھی حق ادا نہ کیا تو اپنی بہنوں میں مجھے سربلند کرنے کا موقعہ کس طرح ملے گا۔ جاؤ دیر نہ کرو۔ کہ یہ وقت دیر کرنے کا نہیں۔ اللہ تمہارا ساتھی ہو۔ حق تمہاری دستگیری کریگا۔

جس وقت تمہارا خون گریگا میں سمجھوں گی کہ مجھے معاوضہ مل گیا۔ زندہ رہے تو ملاقات کریں گے اور سب سے اچھی ملاقات تو وہاں کی ہوگی جہاں اوّل و آخر جمع کئے جائیں گے۔"

جس ملک کی مائیں اسقدر ایثار پیشہ ہوں اسے کون غلام رکھ سکتا ہے کبھی وقت تھا کہ ہندوستان کی مائیں بھی اسی ایثار اور قربانی کا ثبوت دیا کرتی تھیں اور اپنے بچوں کو ان کا پہلا سبق ہی ہوا کرتا تھا۔ کہ وقت آنے پر ہنستے کھیلتے وطن پر قربان ہو جانا۔ کاش وہ وقت پھر آجائے اور ہندوستانی ماؤں کی خواب آور لوریاں شجاعت آموز ترانوں میں تبدیل ہو جائیں۔

کمال اتاترک

جدید ترکی کے معمار مصطفےٰ کمال پاشا کی صحت یابی پر ہر طرف اظہارِ مسرت و اطمینان کیا جا رہا ہے۔ اس نے اپنے بے پناہ عزم غیر معمولی تدبر اور فقید المثال شجاعت سے کام لیکر نہایت بے سروسامانی کی حالت میں اپنے وطن کی قسمت کو بدل دیا۔ اور یورپ کے "مرد بیمار" کا شمار زندہ قوموں میں ہونے لگا۔ جہاں عظمت کے اعتبار سے اسے ہر لحاظ سے ہٹلر

اور مسولینی کے ہم رتبہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ وہاں ایک چیز اسے ان دونوں سے ممتاز کرتی ہے اور وہ ہے انانیت اور خود پرستی کا فقدان۔ کامیابی کے انتہائی منازل طے کر لینے کے باوجود اس کی زندگی بہت سادہ ہے اور اس نے اہل ترکی پر اپنی شخصیت کو ٹھونسنے کی بالکل کوشش نہیں کی۔ گو عملی طور پر وہ ترکی کا بے تاج بادشاہ ہے۔ مگر وہ خود اپنے آپ کو ترکی کا ایک ادنیٰ خادم تصور کرتا ہے۔ ایک مرتبہ ایک اخبار نویس نے اس کا موازنہ سٹالن اور ہٹلر سے کیا تھا۔ اتاترک نے اس کے خلاف احتجاج کیا اور کہا کہ مجھے صرف کمال ہی کہنا چاہیئے۔ زیادہ سے زیادہ "کمال آف ٹرکی" اس کے علاوہ کسی اور عزت افزائی کا اہل میں خود کو نہیں پاتا۔ اس انکسار کی مثال دنیا کے اور کسی ڈکٹیٹر میں نہیں ملے گی۔

غدّاری کی سزا

جو لوگ ذاتی اغراض کے لئے قومی مفاد کو فروخت کر دیتے ہیں اور غداری کے جرم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ وہ آنے والی نسلوں کے ہاتھوں کس طرح ذلیل ہوتے ہیں۔ اس کا ثبوت اس سلوک سے ملتا ہے جو اہل سرنگا پٹم میر صادق کی قبر سے روا رکھتے ہیں۔

یہ شخص سلطان ٹیپو کا وزیر مال تھا اور عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ اس شخص نے انگریزوں سے روپیہ لیکر سرنگا پٹم کا قلعہ ان کے حوالہ کر دیا تھا۔ جب وہ محاصرہ کی کامیابی کے بعد شہر سے باہر جانے کی کوشش کر رہا تھا تو ایک مشتعل ہجوم نے اسے قتل کر دیا تھا۔ جہاں اس کی موت واقع ہوئی۔ وہیں اس پر مٹی ڈال دی گئی اور ایک ٹیلہ کی شکل میں اس کی قبر بنا دی گئی۔ اب جو شخص اس ٹیلے کے نزدیک سے گزرتا ہے وہ اظہار حقارت کے لئے اس پر تھوکتا ہے۔ یا اس پر کوئی ٹوٹی ہوئی جوتی رکھ دیتا ہے۔ سلطان ٹیپو کی یاد میں جو سالانہ یوم منایا جاتا ہے اس روز بھی اس غدار کو فراموش نہیں کیا جاتا۔ جہاں مجاہد اعظم سلطان ٹیپو کی قبر پر پھولوں کے ہار چڑھائے جاتے ہیں۔ وہاں اس شخص کی قبر پر جوتوں کے ہار چڑھائے جاتے ہیں اور اس پر سنگباری کی جاتی ہے۔

جو لوگ موجودہ وقت میں اپنی ناسعد اغراض کے لئے قوم و وطن کے بہترین مفاد سے غداری کر رہے ہیں انہیں میر صادق کے انجام سے سبق لینا چاہیئے۔ جو سلوک آجکل اس کی قبر سے ہو رہا ہے وہی سلوک آنے والی نسلیں ان لوگوں کی قبروں سے روا رکھیں گی اور قیامت تک انکی ذلت اور خواری کا سامان ہوتا رہے گا۔ گوپال متل

آنسو

مجھے یارا نہیں شکوے کا اب اے داورِ محشر
وہ دیکھ آنکھوں سے ہیں حُسنِ پشیماں کی رواں آنسو

نیازِ عاشقی سے ہے غرورِ حُسن بے پروا
کہ اس درگاہ میں جاتے ہیں اکثر رائگاں آنسو

بس اب اے ہم نشیں ضبطِ تمنّا غیر ممکن ہے
مجھے ڈر ہے نہ کہہ دیں دردِ دل کی داستاں آنسو

یہ کس کی یاد آئی اے دل آخر ماجرا کیا ہے
یکایک ہو گئے کیوں آج آنکھوں سے رواں آنسو

تمہارے ظلم کی فریاد ہرگز رُک نہیں سکتی
مری مظلومیوں کے بن رہے ہیں ترجماں آنسو

گوپال متل

سانپ کا انتقام

ذیل کا سچا افسانہ چیرو کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ چیرو کا شمار دُنیا کے بہترین نجومیوں میں ہوتا ہے۔ گو علم نجوم کی صحت یا عدم صحت کے متعلق قطعی رائے دینا مشکل امر ہے۔ مگر یہ بات آسانی سے کہی جا سکتی ہے۔ کہ چیرو کی پوزیشن کا انسان فریبی نہیں ہو سکتا۔ کتاب کے شروع میں اُس نے تحریر کیا ہے۔ کہ اس کے پاس متعلقہ اصحاب کے حلفیہ بیانات موجود ہیں۔ ان افسانوں پر یہ کلیہ بالکل صادق آتا ہے۔ کہ سچائی افسانے سے زیادہ حیرت انگیز ہوتی ہے ٭

گوپال متّل

جیوفری گبسن نے صرف ۲۷ سال کی عمر میں اپنی رجمنٹ میں کپتان کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ میری ملاقات کے وقت اگر اسے کسی بات کا افسوس تھا۔ تو صرف یہ کہ اُس نے کسی جنگ میں حصّہ نہیں لیا۔ وہ ان مافوق العادت لوگوں میں سے تھا۔ جنہیں دُوسروں کی جان لینے میں ایک خاص قسم کی قلبی مسرت حاصل ہوتی ہے ٭

اُس نے جب سے کالج چھوڑا تھا یہ دُھن اُس پر سوار تھی۔ اور وہ ان لوگوں میں ہرگز نہیں تھا۔ جو اپنے جذبات کو چھپاتے ہیں۔ وہ کھلے الفاظ میں اقرار کرتا تھا۔ کہ اُسے جان لینے میں لطف آتا ہے اور اسی لطف کی غرض سے اُس نے فوجی ملازمت اختیار کی تھی۔ کیونکہ وہ جنگ میں شامل نہیں ہو سکا تھا۔ اس لئے اُس نے بڑے بڑے شکاروں میں حصّہ لینا شروع کیا۔ اور شیر۔ چیتے۔ اور ہاتھی مارنے کے عوض بہت سے انعامات حاصل کئے ٭

البتّہ ایک چیز ایسی ضرور تھی۔ جس سے وہ ڈرا کرتا تھا۔ اور وہ تھے سانپ۔ یہ بات اور بھی حیرت انگیز ہے۔ کہ اس کی جنم کنڈلی بھی اسی قسم کی اُفتادِ طبیعت ظاہر کرتی تھی۔ میں اُسے ایسی کوئی بات کہنی نہ چاہتا تھا۔ جو اُسے ناگوار گزرے۔ اِس لئے اس کا ہاتھ اور جنم کنڈلی دیکھ کر صرف اتنا کہا۔ کہ ایک سال کے اندر اندر اُسے کسی لڑکی سے دیوانہ وار محبت ہو جائے گی۔ اور وفورِ جذبات سے وہ فوراً ہی شادی کر لیگا۔

جیوفری گبسن کے متعلق یہ گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔ کہ وہ عورت پرست ہے۔ اُس نے مجھے بتایا۔ کہ اس وقت تک اُسے ایسی کوئی عورت نہیں ملی۔ جس نے اُس کی توجہ کو اپنی طرف کھینچا ہو۔ یا اُس نے اُس کو کسی قدر پسند بھی کیا ہو۔ وہ اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اور ابھی وہ بچّہ ہی تھا۔ کہ اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے والد نے دوسری شادی کا خیال ہی چھوڑ دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہؤا۔ کہ گبسن کی پرداخت ایسے ماحول میں ہوئی۔ کہ اُسے عورتوں کے متعلق کسی حیثیت سے بھی کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔

لیکن اس کا ہاتھ پکار پکار کر کہہ رہا تھا۔ کہ گو باقی تمام باتوں میں وہ عام آدمیوں کی طرح ہے۔ مگر محبّت کے معاملے میں اس کا جادۂ اعتدال سے منحرف ہو جانا یقینی امر ہے۔ اگر اُسے کسی سے محبت ہوئی۔ تو وہ اس قدر شدید ہو گی۔ کہ اُس کا المیہ بن جانا لازمی اور لابدی ہے۔ اس کے ہاتھ کی لکیروں سے یہ امر اس قدر غیر مبہم طور پر مترشح تھا۔ کہ میں نے اُسے اس کے متعلق خبردار کرنا بھی ضروری خیال نہ کیا۔ خواہ اس کے نتائج کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔

اُس کے ہاتھ کی یہ لکیر اس قدر واضح اور صاف تھی۔ کہ اس کی تقدیر اٹل نظر آتی تھی۔ لکیر کا آخری حصہ ظاہر کرتا تھا۔ کہ محبّت کا المیہ اس کی اور اس کی بیوی کی موت پر منتج ہو گا۔

دُنیا میں بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں۔ جو تقدیر کے خلاف جنگ کر سکتے ہیں۔ یا اگر مصیبت آئے بھی تو اُس کا روشن پہلو دیکھنے کی ہی کوشش کرتے ہیں۔ مگر بعض لوگوں کی اُفتاد کا

کوئی روشن پہلو ہوتا ہی نہیں۔ جیوفری گبسن اسی ذیل میں آتا تھا۔

اُسے ٹالنا آسان نہ تھا۔ وہ واضح سوالات دریافت کرتا تھا۔ اور واضح جوابات کا ہی متمنی تھا۔

"اگر تمہارے نزدیک مجھ پر مجنونانہ محبّت کا حملہ ہونے والا ہے۔ تو مسٹر جیرو تمہارا اندازہ غلط ہے۔" اُس نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ میرا اندازہ غلط ہو" میں نے جواب دیا "مگر ایک سال گزر نے دو۔ تم اس شدّت کے ساتھ محبّت کرنے لگو گے۔ کہ میں اس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا۔"

"اس کے باوجود تم کہتے ہو کہ اس کا نتیجہ مسرّت نہ ہوگی۔ افسانے کی کتابوں میں لکھا ہے کہ محبّت زندگی کا عظیم ترین تحفہ ہے تو پھر میں اس سے کیوں محروم رہونگا۔"

"میں نے یہ نہیں کہا تھا۔ کہ محبّت تمہارے لئے مسرت کا موجب نہ ہوگی۔ اس کے خلاف تمہاری مسرّت اس قدر جامع اور کامل ہوگی کہ جب تم اس سے محروم ہو جاؤ گے۔ تو زندگی تمہارے لئے مہمل اور بے معنی بن کر رہ جائیگی۔"

"اچھا نجومی صاحب" اُس نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "ان حالات میں غالباً تم یہ پیشگوئی نہیں کرو گے۔ کہ میری عمر لمبی ہوگی۔ جس قدر مواد موجود ہے۔ اُسے جیوری کے روبرو پیش کیجئے۔ تاکہ ملزم کو اپنی قسمت کا فیصلہ معلوم ہو جائے۔"

میں جانتا تھا کہ جو کچھ میں اس سے کہونگا۔ وہ یقین نہ کریگا۔ اس لئے جو کچھ میں نے محسوس کیا۔ اسے چند الفاظ میں بتا دیا۔

"ایک سال کے اندر اندر کسی دُور اُفتادہ ملک میں شادی ایک انتہائی مسرّت کا سال۔ محبوبہ کی موت اور اس کے چند ماہ بعد تمہاری۔"

"مجھے لکھ لینے دو۔" اُس نے کسی قدر دانت پیس کر کہا۔ "یہ اتنا اچھا مذاق ہے کہ اسے جلدی سے فراموش نہ کرنا چاہیئے۔ لیکن میں اتنا اضافہ ضرور کرونگا۔ کہ آج شام کو میرے کلب میں نصف درجن لوگ تمہارا مذاق اُڑا رہے ہونگے۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے۔ کہ تم نے شادی کسی دُور اُفتادہ ملک میں کہی ہے۔ شاید یہ امر تمہارے لئے دلچسپی کا موجب ہو۔ کہ آج ہی صبح مجھے دفتر جنگ سے ایک خط موصول ہُوا ہے جس میں ہندوستان میں مجھے ایک بہت اچھے عہدے کی پیشکش کی گئی ہے۔ (خط میز پر رکھتے ہوئے) حاشیہ پر میں نے پنسل سے جو نوٹ لکھا ہے۔ اس سے تم اندازہ لگا سکتے ہو۔ کہ میرا ارادہ اس پیشکش کو قبول کرنے کا نہ تھا۔ لیکن تمہاری "دور اُفتادہ ملک میں شادی" کی پیشگوئی نے میرے اشتیاق کو بھڑکا دیا ہے۔ اب میں اسے قبول کر لونگا۔"

"اور تمہاری خونریزی کے شوق کو اس فیصلے میں کوئی دخل نہیں۔" میں نے استفسار کیا۔

"شاید ایسا بھی ہو۔ اور اس خواہش کو تمہاری مختصر زندگی کی پیشگوئی سے تعلق بھی ہو۔ مگر شادی —— نہیں یقین رکھئے۔ کہ خونریزی کا جذبہ مجھے ہندوستان نہیں لے جا رہا۔"

تقریباً ایک سال بعد جیوفری نے مجھے خط لکھا۔ اس کا مختصر اقتباس حسب ذیل ہے۔ "غیر معمولی بات وقوع پذیر ہو گئی ہے۔ چند ماہ پیشتر مدراس کی ریذیڈنسی میں میری اس عورت سے ملاقات ہو گئی۔ جس کے متعلق تم نے پیشگوئی کی تھی۔ وہ ایک انگریز لڑکی ہے۔ اور میری ہم عمر۔ وہ میری جائے پیدائش سمرسٹ ہی کی رہنے والی ہے اگر اس کا کوئی مقصد زندگی ہے۔ تو بس ہندوستان کا سفر کرنا۔ اور شکار کھیلنا +

مجھے اس کے ساتھ پہلی ہی نگاہ میں محبت ہو گئی۔ ایسی محبت کہ میں اس سے پیشتر اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں اسے ایک لمحے کے لئے بھی اپنی نگاہوں سے اوجھل کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ اور اس کا بھی میری طرف یہی رویّہ تھا۔ جتنی جلدی ہو سکا۔ ہم نے شادی کر لی۔ اور اب ہماری مسرّت کی معراج ہے۔

ایک رات اُسے میری وہ نوٹ بک مل گئی۔ جس میں میں نے تمہاری پیشگوئی کو درج کیا تھا۔ 'ایک دُور اُفتادہ مُلک میں شادی۔ ایک انتہائی مسرّت کا سال۔ محبوبہ کی موت اور اس کے چند ماہ بعد تمہاری۔'

اُسے تمہاری پیشگوئی میں اس درجہ یقین ہے۔ کہ اس کے نزدیک اس کی موت ایام زچگی میں ہوگی۔ میں اس کی پیدائش کا صحیح دن اور وقت بھیجتا ہوں۔ خدا کے لئے اس خط کا جواب دو۔ اور لکھو۔ کہ آیا اس کے خدشات صحیح ہیں۔ اس کا ہماری زندگی پر بہت گہرا اثر پڑیگا۔"

جب پیدائش کا صحیح وقت معلوم ہو۔ تو مناسب جنم کنڈلی بنا کر بہ آسانی معلوم کیا جا سکتا ہے۔ کہ کسی شخص کی موت کس قسم کی ہوگی۔ اس سلسلے میں یہ بات بالکل واضح تھی۔ کہ ایام زچگی میں اُسے کوئی خطرہ

نہ تھا۔

میں نے اُسے حسب ذیل خط لکھ دیا۔ "اپنی بیوی سے کہئے۔ کہ اس کے خدشات بے بنیاد ہیں۔ اگر خطرہ ہوُا۔ تو جانوروں یا سانپوں کے سلسلے میں ہوگا۔ اور ممکن ہے۔ کہ تمہارا خونریزی کا شوق اس کا موجب ہو۔ اپنے ہتھیاروں کو ایک طرف رکھ دو۔ شاید اس طرح تم اپنی تقدیر سے نبرد آزما ہو سکو —— یہ صرف اسی کی موت ہے۔ جو تمہاری موت کا موجب ہو گی۔"

تقریباً ایک سال تک جیوفری گبسن کے متعلق مجھے اور کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ اس کے بعد ایک دوپہر کو ایک شخص جسے میں مشکل ہی سے پہچان سکا۔ کہ وہ جیوفری گبسن ہے۔ گرتا پڑتا میرے کمرے میں آیا۔ اور آہوں کے درمیان مجھے مندرجۂ ذیل کہانی سُنائی۔

میرے خط کا ان پر بہُت اثر ہوتا تھا۔ اور ان کی مسرت دن دُونی اور رات چوگنی ترقی کر رہی تھی۔ کہ تقدیر نے اپنا وار کر دیا۔

"ایک انتہائی مسرت کا سال قریب الاختتام تھا۔ لیکن میرے دوست میں تمہارے انتباہ کو یاد نہ رکھ سکا۔ اور اپنے خونریزی کے شوق کو خیرباد نہ کہہ سکا۔ اُف! میرے خدا! اگر ایسا ہو سکتا۔ تو میری بیوی اب بھی میرے ہمراہ ہوتی÷

شکار کی وہ بھی اتنی ہی شائق تھی۔ جتنا میں۔ وہ ہر شکار میں میرے ساتھ ہوتی۔ اور تنہا بھی اُس نے بعض اوقات قابل تعریف نشانہ بازی کا ثبوت دیا۔ وہ تمام جانوروں سے بے خوف تھی۔ مگر ایک چیز جس سے اُس کی رُوح کانپ جاتی تھی۔ وہ سانپ تھے۔

ایک مرتبہ ہم ایک جنوبی صوبہ میں کسی راجہ کے یہاں شکار کھیل رہے تھے۔ صبح کی سیر کے دوران میں مَیں نے دو بہُت بڑے سانپوں کو ایک چٹان کے نزدیک دیکھا۔ وہ آپس میں ملے ہوئے تھے۔ جیسے ہم بغل ہو رہے ہوں۔ میرے پاس صرف ایک دونالی بندوق تھی۔ لہذا میں ان کے نزدیک چلا گیا۔ تاکہ پہلے ایک کو نشانہ بناؤں۔ اور پھر فوراً ہی دُوسرے کو۔

جونہی میں نے نشانہ باندھا۔ ایک سانپ نے اپنا سر اُوپر اُٹھا لیا۔ اور میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے گولی چلا دی۔ جو اُس کی آنکھوں کے درمیان لگی۔ وہ فوراً ہی گر پڑا۔ مُردہ۔

میں نے دوسرے سانپ کو تلاش کیا۔ مگر وہ گھاس میں گم ہو گیا۔

میں اپنی کامیابی پر بہت مسرور تھا۔ کیونکہ میں نے پہلی مرتبہ ایک بڑے سانپ کا شکار کیا تھا۔ میں نے اُس کی گردن کے گرد رسّی ڈالی اور اُسے کھینچ کر اس خیمے تک لے گیا۔ جو راجہ صاحب نے ہمارے لئے مخصوص کر چھوڑا تھا۔ یہ ایک نہایت ہی خوبصورت سانپ تھا۔ اور اُس کے جسم پر گولی کے سوراخ کے علاوہ اور کوئی نشان نہ تھا۔ گولی کا سوراخ اُس کی دونو آنکھوں کے درمیان ماتھے کے عین وسط میں تھا۔

میں نے راجہ اور اپنی بیوی کو تمام واقعہ سُنایا۔ کہ کس طرح دونو سانپ اکٹھے سو رہے تھے۔ میری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی۔ جب راجہ نے سانپ کے جسم کو دیکھ کر دونو ہاتھ ملنے شروع کر دئے۔

"میرے دوست" اُس نے کہا۔ "تم نے بہت بڑا کام کیا۔ تم نے اُس وقت گولی چلائی۔ جب نر اور مادہ آپس میں ملے ہوئے تھے۔ مادہ کو تو تم نے ہلاک کر دیا۔ مگر اب نر رات دن تمہارا پیچھا کرتا رہیگا۔ اور اپنا انتقام لے کر چھوڑیگا۔"

"فضول" میں نے ہنس کر کہا۔ "اس خیال کی بنا توہم پرستی کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ ہندوستان میں مروّجہ دیگر توہمات کی طرح یہ بھی ایک افسانہ ہے۔"

لیکن میری بیوی نہیں ہنسی۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی۔ "میرا خیال ہے۔ کہ راجہ صاحب درست کہتے ہیں۔ جیوفری! خدا کے لئے جتنی جلدی ہو سکے۔ ہمیں روانہ ہو جانا چاہیئے۔ آؤ جلدی سے بمبئی چلے جائیں۔

اور راجہ نے سنجیدگی سے کہا "پہلے جہاز میں سوار ہو کر گھر کا راستہ لو۔ صرف سمندر ہی تمہیں سانپ کے انتقام سے بچا سکتا ہے۔

ہم بمبئی سے دو صد میل کے فاصلے پر تھے۔ سُورج غروب ہونے سے پہلے ہم اپنے لمبے سفر پر روانہ ہو گئے۔ جونہی رات آتی تھی۔ میری بیوی کی حالت خراب سے خراب تر ہو جاتی تھی۔ یہ خیال اس کے دماغ پر مسلّط ہو چکا تھا۔ کہ سانپ ہمارا پیچھا کر رہا ہے۔ جونہی گاڑی کسی سٹیشن پر ٹھہرتی۔ وہ کانپنے لگتی۔ اور جب تک گاڑی حرکت میں نہ آجاتی۔ اُسے چین نہ آتا۔

جب بمبئی پہنچے۔ تو رات کافی جا چکی تھی۔ اور ہم بہُت تھکے ہوئے تھے۔ لہذا فوراً ہی ہم نے ہوٹل کا راستہ لیا۔

اگر کوئی شخص مجھے یہ کہتا۔ کہ میری بیوی جیسی انگریز نوجوان لڑکی جسے شکار کا شوق ہو اور زندگی سے عشق۔ ایک سانپ کے متعلق وہم کی وجہ سے اس قدر پریشان اور حواس باختہ ہو سکتی ہے۔ تو میں نے

دیوانہ قرار دیتا - لیکن یہ سب کچھ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا - خیر جس قدر میرے امکان میں تھا - میں نے اپنی بیوی کی تسکین کا سامان کیا -

میرے خدا! مجھے اس سے کس درجہ محبت تھی - وہ جتنی پریشان ہوتی تھی اُتنا ہی خود کو اس کی حالت کا ذمہ دار سمجھ کر میں اپنے آپ کو ملامت کر رہا تھا - تمہارے الفاظ جو میں نے اپنی ڈائری میں لکھے تھے دن رات میرے کانوں میں گونجتے رہتے تھے - ایک انتہائی مسرت کا سال اور اس کے بعد ــــ

اس کی پریشانی میری وجہ سے تھی - اسے کبھی بھول کر بھی تو اپنا خیال نہیں آیا - میں نے اس کے ساتھ فضول بحث کی - کہ اگر سانپ نے ہمارا پیچھا کیا بھی - تو دو سو میل کا سفر طے کرنے میں اسے کافی مدت لگیگی - مگر اس کا کیا کیا جائے - کہ ہمیں خوامخواہ دیر ہو رہی تھی جن جن جہازوں نے تین ہفتے تک روانہ ہونا تھا - ان کی تمام نشستیں مخصوص ہو چکی تھیں -

چند دن کے بعد دیر اس کے لئے قابل برداشت ہو گئی ہمارے خطرات کا مذاق اُڑانے کے علاوہ ہوٹل کے مینجر نے ہمیں یہ یقین بھی دلایا - کہ برآمدے کے گرداگرد جو خاردار تار لگی ہوئی ہے - وہ خطرناک سے خطرناک سانپ کو ہلاک کر سکتی ہے -

اس طرح دن گزرنے گئے - اور تقریباً تین ہفتے کے بعد ہم انگلستان جانے کیلئے اپنی نشستیں بک کرانے میں کامیاب ہو گئے - ٹکٹوں کو دیکھ کر اُسے اس درجہ مسرت ہوئی - کہ اُس نے ان کو اپنے بستر کے سرہانے کی طرف دیوار سے آویزاں کر دیا -

آخر کار پیکنگ وغیرہ سے فارغ ہو کر جب وہ سو گئی - تو میں نے اطمینان کا سانس لیا - نصف شب ہو گئی - . . . .

. . . . لیکن میرا دل نہ چاہا - کہ میں اُسے تنہا چھوڑ کر ساتھ والے کمرے میں چلا جاؤں - آہ اگر ہم عقل کو خیر باد کہہ کر صرف واہمے سے کام لے سکیں - تو کتنے خطرات سے بچ جائیں!

عقل مجھے کہتی تھی کہ بارہ گھنٹے کے بعد ہم خوش و خرم اپنے وطن کو جانے کیلئے جہاز پر سوار ہو جائیں گے - لیکن واہمہ کہتا تھا - کہ لمحہ بہ لمحہ کوئی اندوہناک حادثہ نزدیک سے نزدیک تر آ رہا ہے -

خیر سب باتوں کے باوجود بہت زیادہ تھکن محسوس کرتے ہوئے میں کونے میں پڑے ہوئے کوچ پر دراز ہو گیا - اور جلد ہی گہری نیند کے مزے لینے لگا - اگر میں ایسا نہ کرتا - تو صورت حالات کتنی مختلف ہوتی - ممکن تھا - کہ میرے حواس کو ایک سانپ کے جنبش کرنے کی آواز سُنائی دیتی جو کمرے میں داخل ہونے کے لئے خاردار تار سے جدوجہد کر رہا تھا -

سُورج طلوع ہو رہا تھا - میں کسی قدر گھبرا کر دفعتاً جاگ پڑا - مجھے کچھ محسوس ہو رہا تھا - مگر خمار کی حالت میں یہ نہ معلوم ہو سکا - کہ کیا ہے - جب کچھ اور روشنی پھیلی - تو میں نے اپنی بیوی کے بستر کی طرف دیکھا - وہ ایک بچے کی طرح پُرسکون نیند کا لُطف اُٹھا رہی تھی -

میں اُٹھ بیٹھا - اور کمرے کی تاریکی پر سُورج کی کرنوں کی یورش دیکھنے لگا - دفعتہً میں نے ایک سیاہ سائے کو اپنی بیوی کے چہرے کی طرف رینگتے دیکھا -

لیکن اب کیا بن سکتا تھا - سانپ ڈنک مار چکا تھا - ایک چیخ کے ساتھ جس نے میرا خون منجمد کر دیا - میری بیوی تڑپ کر بستر سے اُٹھی - اور میری گود میں آ رہی -

ہر ممکن تدبیر کی گئی - لیکن ہر چارہ بعد از وقت تھا - سانپ نے دونو آنکھوں کے درمیان پیشانی کے عین وسط میں کاٹا تھا - اس صُورت میں کوئی علاج ممکن ہی نہ تھا - زہر تمام جسم میں پھیلتا گیا - اور چند لمحوں میں اُس عورت نے جو مجھے اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز تھی - میرے آغوش میں دم توڑ دیا - اس کے ہونٹ میرے ہونٹوں سے واصل تھے ✤

یہ تھی وہ کہانی جو میں نے جیوفری گبسن کی زبانی سنی - وہ اس کی لاش اپنے ساتھ انگلستان لے آیا تھا - جنگ عظیم شروع ہو گئی - لیکن اسے طبی وجوہ کی بنا پر شامل نہ کیا گیا - چند ماہ بعد وہ مر گیا - اور سمرسٹ کے چھوٹے سے قبرستان میں اپنی بیوی کی آغوش میں دفنا دیا گیا ✤

(ترجمہ)

گوپال مِتّل

محسوسات

عشق کی زندگی کو کیا کہیئے
اپنی قسمت کسی کو کیا کہیئے

اُن لبوں کی ہنسی کو کیا کہیئے
پھول کی پنکھڑی کو کیا کہیئے

اک ذرا سی امید پر یہ حال
آدمی کی خوشی کو کیا کہیئے

سامنے اشک ریز ہے شبنم
مسکراتی کلی کو کیا کہیئے

پرسشِ حالِ دل ہے ہنس ہنس کر
اُس کی ظالم ہنسی کو کیا کہیئے

حُسن پر اعتمادِ چارہ گری
عشق کی سادگی کو کیا کہیئے

اُن کی چلمن کو چھُو رہی ہے نگاہ
جرأتِ عاشقی کو کیا کہیئے

موجِ بادِ صبا بھی کانپ اُٹھی
زُلف کی برہمی کو کیا کہیئے

اُن کے رُخ پر نظر نہیں جمتی
چاند کی روشنی کو کیا کہیئے

وہ پشیماں سے ہو گئے ماہرؔ
آپ کی شاعری کو کیا کہیئے

"ماہرؔ القادری"

تنویرات

رُوسی تمدن کی بعض خصوصیات

رُوس نے دُنیا کو اس وقت محوِ حیرت بنا رکھا ہے۔ اس کے کٹر سے کٹر مخالف بھی اپنے دل کی گہرائیوں میں یہ بات محسوس کر رہے ہیں۔ کہ اس کے اقتصادی اور معاشرتی نظام میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ اگر دُنیا ان خوبیوں کو اپنانے سے قاصر ہے۔ یا انکار کرتی ہے۔ تو یہ اُس کی اپنی بدقسمتی ہے *

انسان فطرتاً قدامت پرست واقع ہُوا ہے۔ اور ہر نئی چیز سے گھبراتا ہے۔ لہذا روس کے متعلق عوام کی غلط فہمیاں اور شکوک بلا وجہ نہیں۔ رُوس کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔ کہ اس کا مطالعہ ہمدردانہ زاویۂ نگاہ سے کیا جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے۔ کہ ہم ایک لمحہ کیلئے بالکل خالی الذہن ہوجائیں اور جمہوریت مذہب اور روایتی اخلاق کے متعلق تمام خیالات کو اپنے دماغ سے نکال دیں *

رُوسی نظام ایک نیا تجربہ ہے۔ اور ہر نیا تجربہ یقینی طور پر ناقص نہیں ہوتا۔ گو اس کے اچھا ہونے کی ضمانت بھی نہیں دی جا سکتی۔ بہرحال اچھائی اور بُرائی کا فیصلہ مشاہدے اور مطالعے پر ہونا چاہئے۔ غلط پروپیگنڈے کے زیر اثر نہیں۔

اس وقت تمام دُنیا اقتصادی بدحالی کا شکار ہو رہی ہے یورپی ممالک انتہائی کوششوں کے باوجود معیارِ طلائی کو دوبارہ قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ پیداوار کی زیادتی دُنیا کی خوشحالی میں اضافہ کرنے کی بجائے طرح طرح کی مشکلات پیدا کرنے کا موجب بن رہی ہے۔ بیکاری روز افزوں ہے۔ اور اگر اس کا تدارک نہ کیا گیا۔ تو یہ ہماری معاشرتی زندگی کے لئے خطرۂ عظیم ثابت ہوگی۔ قصہ مختصر یہ کہ زندگی کے ہر شعبے میں بے چینی اور اختلال رُونما ہے۔ لیکن روس میں حالت بالکل مختلف ہے۔ وہاں بیکاری بالکل نہیں۔ اور ہر طرف خوشحالی اور فارغ البالی کے آثار نمایاں ہیں۔ آخر یہ فرق کیوں ہے۔ اور اس کی کیا وجوہات ہیں۔ ہمیں اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا ہے۔

روس باقی دُنیا سے دو باتوں میں مختلف ہے۔ اوّل یہ کہ وہاں سوسائٹی کی بنیاد انفرادیت کی بجائے اجتماعیت پر ہے دوم یہ کہ وہاں کا اقتصادی نظام مکمل طور پر منضبط ہے۔ وہاں پر مزدوروں کے لئے مشترکہ کھانے کے کمرے۔ کلب اور تھیئٹر ہیں۔ بچوں کی پرورش مشترکہ بچہ خانوں میں ہوتی ہے۔ اور ان کی نگہداشت کے لئے ان کی ماؤں کو فضول وقت ضائع نہیں کرنا پڑتا۔ جس کو وہ دیگر تعمیری کاموں میں صرف کرتی ہیں۔ لوگ ذاتی فائدے کے لئے نہیں۔ بلکہ اجتماعی بہبود کے لئے کام کرتے ہیں۔ فیکٹریوں میں مزدور حصہ دار ہیں۔ اور وہ اُن کے انتظام پر تنقید و تبصرہ بھی کر سکتے ہیں۔ فیکٹریوں سے جو زائد منافع ہوتا ہے۔ اسے عوام کی بھلائی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اور سبھی اس سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ مزدوروں کے لئے بہتر مکانات بنائے جاتے ہیں۔ نئی مشینیں خریدی جاتی ہیں۔ اور بچوں کی تعلیم و تربیت کے انتظامات کی اصلاح کی جاتی ہے۔

رُوس میں عملی مساوات ہے۔ مزدور اپنے افسروں کو جھک جھک کر سلام نہیں کرتے۔ حاکم اور محکوم میں بیگانگی اور بُعد نہیں پایا جاتا۔ وہ آپس میں اس طرح گفتگو کرتے ہیں۔ جیسے وہ ہم رتبہ اور ہم پایہ ہوں۔ سرکاری افسر انتہائی کوشش کرتے ہیں۔ کہ ان کے لباس اور کردار سے عمومیت نماں ہو۔ اور کسی قسم کا خاص امتیاز ظاہر نہ ہو۔ وہاں یہ امر اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا۔ مساوات کا ڈھنڈورہ تو سبھی ملک پیٹتے ہیں۔ مگر ذرا اس لفظی مساوات

کا اس عملی مساوات سے موازنہ کیجئے - اور بتایئے - کہ روس اسی نفرت اور حقارت کا مستحق ہے - جو سرمایہ دار ممالک کے پروپگنڈا سے ظاہر ہوتی ہے -

اگر ایثار کوئی اچھی چیز ہے - اور خود غرضی سے بہتر ہے - تو اُس کی مثال رُوس سے روشن تر اور کہیں نہیں مل سکتی - وہاں ہر شخص قومی مفاد کو ذاتی فائدے سے مقدم خیال کرتا ہے - وُہ یہ نہیں سوچتا - کہ فلاں کام سے اس کی ذاتی آمدنی میں کس قدر اضافہ ہوگا - بلکہ یہ کہ اس سے مُلک و قوم کی کس قدر بھلائی ہوگی - شاید سرمایہ دار مُلکوں میں یہ بات عجیب معلوم ہو - کیونکہ وہاں خود غرضی کو فطری جذبہ خیال کیا جاتا ہے - لیکن جو لوگ فطرت انسانی سے کماحقہ واقفیت رکھتے ہیں - وہ جانتے ہیں - کہ انسانی فطرت ایسی نہیں جسے تبدیل نہ کیا جا سکے - لوگوں کے سامنے نئے آدرش رکھے جا سکتے ہیں - اور ان کی ذہنیت کو نئے سانچوں میں ڈھالا جا سکتا ہے - روس کے ارباب اقتدار اس بات کو اچھی طرح سمجھے ہوئے ہیں - انہوں نے عوام کے خیالات کا کانٹا بدل دیا ہے - اس طرح وہ انفرادیت کی بجائے اجتماعیت کے شیدا ہو گئے ہیں -

رُوس میں طبقاتی تفریق بالکل نہیں - وہاں فوجی لوگ کھیتوں میں کام کرتے ہیں - اور اس میں کوئی ذلت محسوس نہیں کرتے - اگر سڑکوں وغیرہ کی مرمت کرنی ہو - تو عوام اس کے لئے بطور والنٹیر بھرتی ہو جاتے ہیں اور کسی قسم کا کوئی معاوضہ نہیں لیتے - روسی زبان میں ان والنٹیروں کو سا ڈنک کہتے ہیں - بعض اوقات بڑی بڑی شخصیتیں حتیٰ کہ سٹالن تک ان میں شامل ہو جاتے ہیں - اس ضمن میں والنٹیروں کے جذبۂ خدمت گذاری کی نسبت اس رسم کی جدت زیادہ قابل داد ہے - غور کیجئے کہ اگر اس رسم پر دیگر ممالک میں عملدرآمد کیا جائے تو کس قدر شور و شر برپا ہو - اگر حکومت برطانیہ اپنی فوجوں سے سڑکوں کی مرمت کا کام لینا شروع کرے تو شاید اُسے اگلے ہی روز مستعفی ہونا پڑے - ٹریڈ یونین اسکے خلاف سب سے زیادہ واویلا کریگی اور اسکے جلسوں میں نہایت دردمندانہ الفاظ میں اس مقصد کی قرار دادیں پاس کی جائینگی - کہ حکومت مزدوروں کی روزی چھیننے پر تُلی ہوئی ہے - اور ان کا گلا گھونٹنا چاہتی ہے - قیدیوں سے دیگر ممالک میں بہت کم مفید کام لئے جاتے ہیں - لیکن روس میں حالت بالکل مختلف ہے - وہاں قیدیوں سے ایسے ہزارہا مفید کام لئے جاتے ہیں - جو اُن کی صحت اور ملک دونو کے لئے منفعت بخش ہوتے ہیں - روس میں پیداوار کی زیادتی مشکلات کا باعث نہیں - بلکہ حقیقی فارغ البالی کا موجب ہوتی ہے - کیونکہ وہاں کے کھیت اور کارخانے کسی فرد واحد کی ملکیت نہیں ہوتے - بلکہ تمام قوم کے مملوکہ ہیں اور قوم کی ضروریات لامحدود ہیں -

سرمایہ دار ممالک کی تمام مشکلات کا راز اس امر میں مضمر ہے - کہ وہاں پیداوار مُلکی مفاد کے لئے نہیں - بلکہ سرمایہ داروں کے فائدے کے لئے ہوتی ہے - سامان موجود ہوتا ہے - مگر عوام کے پاس خریدنے کے ذرائع نہیں ہوتے - کیونکہ اشیا دولت سے خریدی جاتی ہیں - اور دولت عوام کی بجائے سرمایہ داروں کی محدود تعداد کے ہاتھوں میں اکٹھی ہو جاتی ہے - وہاں کے مزدور اس لئے کام نہیں کرتے - کہ وہ کوئی مُلکی ضرورت انجام دیں - بلکہ اس لئے کہ انہیں اس کا زیادہ سے زیادہ معاوضہ ملے *

سرمایہ دار نہیں چاہتے - کہ پیداوار اس قدر بڑھ جائے کہ وہ اشیا کی ارزانی کا موجب ہو - اور اُن کے نفع میں کمی واقع ہو - مزدور یہ برداشت نہیں کر سکتے - کہ لوگ رضاکارانہ طور پر کام کرتے پھریں - اور اُن کی اُجرتوں میں کمی واقع ہو - غرض ہر شخص کا زاویۂ نگاہ انفرادی ہے - اور قوم کے فائدے کی فکر کسی کو بھی نہیں - سرمایہ دارانہ نظام غلط بنیادوں پر قائم ہے - اور جب تک ان بنیادی نقائص کو دُور نہیں کیا جاتا - مشکلات کا رُونما ہونا لازمی اور لابُدی ہے - اس سلسلے میں روس کے معاشری - اور اقتصادی نظام کا مطالعہ ہمارے لئے بہت کچھ مفید ہو سکتا ہے *

گوپال مِتّل بی - اے

خط و کتابت کرتے وقت

چٹ نمبر کا حوالہ ضرور دیں ورنہ عدم تعمیل کی شکایت معاف *

(مینیجر)

جمنی

"ہری ہر" ابھی ابھی میڈیکل کالج سے گریجویٹ ہوکر نکلا تھا۔ اس نے کلکتہ کے ایک گوشے میں دو کمرے کرایہ پر لیے اور دروازہ پر ایک چمکدار بورڈ جس پر اس کا نام اور ڈگری درج تھی لگا دیا اسکی بیٹھک کا سامان چند کرسیوں، میزوں اور اوزاروں پر مشتمل تھا۔ اس کے علاوہ کئی قطاریں خالی اور بھری بوتلوں اور سامان جراحی کی تھیں۔ لیکن مریض اسکے پاس نہ آتے تھے۔ اسی وجہ سے "ہری ہر" بیٹھک میں بیٹھنے کی نسبت برآمدے میں بیٹھنے کا عادی ہوگیا۔ برآمدے میں ایک آرام کرسی تھی۔ جس پر بیٹھکر وہ مایوس نگاہوں سے اپنی بیٹھک کی طرف دیکھتا۔ لیکن اس سے بھی اس کے دل کو تسکین نہ ہوتی تھی۔ لہذا اب زیادہ تر برآمدے کے جنگلے کے سہارے کھڑا ہوکر سڑک کے کنارے ہمسایہ مکانوں کی طرف دیکھنا اس کا معمول ہوگیا تھا۔ جن کی نسبت تمام حالات اور اسرار جاننے کا اُسے از حد شوق تھا۔

~~~~~~~~

ہری ہر کے مکان کے ایک طرف خالی زمین کا ایک ٹکڑا تھا۔ جس کے وسط میں ایک مسمار شدہ مسجد کھڑی تھی۔ جس کے چاروں طرف قسم قسم کے بوٹے اُگ آئے تھے۔ مسجد کی زمین پر ہر شام مٹی کے چراغوں سے روشنی ہوتی تھی جس سے اس سنسان رقبہ کی تاریکی زیادہ ہیبت ناک معلوم ہوتی تھی۔ لیکن ہری ہر اس میں کوئی معمہ نہ پاسکا اور نہ ہی کوئی ایسی داستان سُن سکا۔ جو اس مسجد کی تباہ شدہ عظمت سے منسوب کی جاسکتی ہو۔

دوسری طرف جے کشن بابو کا مکان تھا جو ٹرنکوں اور صندوقوں کا سوداگر تھا۔ اُس نے دو شادیاں کی تھیں اور اب آٹھ خوبصورت لڑکیوں اور پانچ لڑکوں کا باپ تھا۔ یہ تمام کنبہ اس چھوٹے دو منزلہ مکان میں بمشکل سما سکتا تھا۔ مکان میں جگہ کی اسقدر قلت تھی کہ تل دھرنا بھی مشکل تھا۔ صبح ہوتے ہی وہاں ایک نہ ختم ہونے والا شور شروع ہو جاتا۔ کچھ نوکر پانی بھرنے کو جاتے کچھ برتن صاف کرنے لگتے۔ اور کوئی آگ جلانے میں مصروف ہو جاتا۔ مرد دفتر جانے سے پیشتر کھانا کھا لینے کے عادی تھے۔ جب شام کو تاریکی آہستہ آہستہ روئے کائنات پر تسلط جما دیتی تھی۔ یہ شور بھی بتدریج کم ہونا شروع ہو جاتا تھا۔ کچھ عورتیں اپنے بال سنوارتی تھیں۔ نہاتی تھیں۔ بچوں کو مارتی تھیں۔ اور پھر مردوں کے تھکے ہوئے پاؤں سفوف سے دھوتی تھیں۔

یہ کنبہ جو کام کرتا تھا۔ اس میں سادگی اور صفائی کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی تھی۔ اسکا کوئی پہلو تاریک نہ تھا البتہ وہ مکان جو ہری ہر کے مکان کے بالمقابل گلی میں واقع تھا۔ ہری ہر کے خیال میں کسی سربستہ راز کا حامل تھا مختلف خیالات اس کے دماغ میں آتے اور گذر جاتے۔ اس طرح کہ دن بدن اس کا شک قوی تر ہوتا گیا۔ لیکن وہ اہلِ مکان کو نہ جانتا تھا۔ اور یہ بھی اُسے معلوم نہ تھا۔ کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ اور کون ہیں۔ وہ ان کی نسبت طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرتا۔ اور جو رائے ایک دن قائم کرتا۔ اس کو دوسرے دن مسترد کر دیتا۔ اس طرح یہ معمہ پیچیدہ تر ہوتا گیا۔

یہ مکان جس کی متعلق ہری ہر کو شک تھا۔ سرخ اینٹوں سے بنا ہوا تھا۔ اسکا صحن پختہ فرش کا بنا ہوا تھا۔ اور ایک طرف کے بند کواڑ اس کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہے تھے۔ اور ایسے معلوم ہوتے تھے گویا اندھے کی پلکیں۔

انہیں اس طرح بند ہوئے غالباً کئی سال گذر گئے ہوں گے۔ ہر صبح آفتاب عالمتاب روئے عالم پر سنہری کرنوں کا جال بچھا دیتا تھا لیکن یہ کواڑ اس عطیہ کو قبول کرنے کیلیے نہ کھولے جاتے تھے۔

~~~~~~~~

ہری ہر صبح سویرے جاگتا تھا۔ وہ طالب علمی کے زمانہ سے جبکہ امتحان کیلیئے اسے سر توڑ کوشش کرنی پڑتی تھی۔ سویرے اٹھنے کا عادی ہوگیا تھا وہ اگرچہ بیدار ہوکر پھر سونے کی کوشش کرتا تھا، لیکن ہر روز ناکام رہتا تھا۔ ہمسایہ مکانوں سے پانی بھرنے کی، برتن صاف کرنے اور عورتوں اور بچوں کے بولنے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ اور ان کے مرد اٹھ کر سیر و تفریح میں مصروف ہو جاتے تھے۔ باہر برآمدے میں گیلے کپڑے جو دھوپ میں سکھانیکے لیے ڈالے جاتے تھے، لٹکے ہوئے نظر آتے تھے۔ لیکن

ہری ہر کو سرخ اینٹوں والے مکان میں زندگی کے کوئی آثار نظر نہ آتے تھے۔ اُسے معلوم نہ تھا کہ اس میں کون گوشہ نشین رہتا ہے۔ مکان کے اگلے دروازے پر صبح ایک نوکر بازار سے سودا لا کر دستک دیتا تھا۔ دروازہ کھل جاتا تھا۔ وہ اندر داخل ہو جاتا تھا۔ دروازہ پھر بند ہو جاتا تھا۔ دن بھر فقیر دروازہ پر پکارتے تھے۔ "جان مال کی خیر۔ بڑی مائی غریبوں کو کچھ دے دو۔" دروازہ آہستہ آہستہ کھل جاتا اور نقاب پوش نوکرانی دکھائی دیتی جو فقیروں کو خیرات دیکر جلدی سے دروازہ بند کر کے چلی جاتی۔

سخت گرمیوں میں بھی جب جانور برآمدے کے جنگلے پر گرمی سے ستائے ہوئے اور پیاس سے تڑپتے ہوئے بیٹھے ہوتے تھے۔ یہی نوکرانی ایک کواڑ کے پیچھے سے ہاتھ نکال کر ایک ڈبے میں پانی ڈال دیتی تھی۔ جو جانور پی لیتے۔ وہ بھوکے کتے کو بھی جو دن بھر زبان نکالے ہوئے دروازہ کے پاس بیٹھا رہتا فراموش نہ کرتی۔ اسی طرح دن گزر جاتا۔ مکان کے کواڑ ہمیشہ بند رہتے۔ اور بیرونی دنیا کے شور و شر کو اندر داخل ہونے سے روکے رہتے تھے۔ دنیا کے حوادث اسے متاثر نہ ہونے دیتے تھے۔ دوسرے مکانوں میں دن بھر دروازوں کے کھلنے اور بند ہو جانے کا شور سنائی دیتا تھا۔ مرد دفتروں کو جاتے، بچے مدرسوں کو جاتے، لڑکیاں "فری سکول" سے واپس آتیں اور پانی کے نلکوں پر گھڑے لے جاتی تھیں۔ کچھ بازار سے مسالہ خریدنے جاتی تھیں۔ معصوم بچے ایک مکان سے دوسرے مکان تک دوڑتے اور گڑیوں کے ساتھ کھیلتے پھرتے تھے۔ ان کا دروازہ کھلا رہنے کی وجہ سے بیرونی دنیا کے ساتھ تعلق تھا شام ہونے کے باوجود بھی دروازوں پر دستک سنائی دیتی تھی۔ کیونکہ مرد بہت رات گئے تھیٹروں سے واپس آتے تھے۔ ان کی دستک گھر کے نوکروں کو میٹھی نیند سے جگا دیتی تھی۔ اور ہمسائے بھی بے آرام ہو جاتے تھے۔ لیکن سرخ مکان ہمیشہ خاموش رہتا تھا اور بالکل جدا۔ ہری ہر نے کبھی کسی مہمان کو اس مکان میں داخل ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ اور نہ اس نے کبھی وہاں سے ہنسنے یا رونے کی یا کسی بچے کے چلنے پھرنے کی آواز سنی تھی۔ لیکن یہ قیاس کرنا بھی مشکل تھا کہ مکان میں کوئی تارک الدنیا رہتا ہے۔

کبھی کبھی جب نقاب پوش نوکرانی دروازہ کھولتی تو ہری ہر کو بھی مکان کے اندرونی حصہ کا مشاہدہ کرنے کا موقعہ مل جاتا تھا۔ اس نے ایک دفعہ ایک بڑا کمرہ جس کا فرش سنگ مرمر کا بنا ہوا تھا دیکھا اور ایک آبنوس کا پلنگ جس پر سفید بستر تھا۔ ایک قد آدم آئینہ اور خوبصورت رنگ برنگی ساڑھیاں لٹکی ہوئی دیکھی تھیں۔ لیکن صرف ایک ہی نظر سے۔ وہ ایک جان بخش خوشبو جو ہزاروں پھولوں سے گزر کر آتی تھی۔ دروازہ کھلنے کے وقت سونگھ سکتا تھا۔ لیکن یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ یہ خوشبو کس خوبصورت چیز سے آئی ہے۔ کیا کسی نے کوئی خوبصورت پری اس خاموش اور تاریک مکان میں قید کر رکھی ہے۔ کیا یہ خوشبو اس کی زلفوں سے آئی ہے۔ ہری ہر کا دل اس خوبصورت ہستی کو دیکھنے کے لئے بیتاب ہو جاتا تھا

دوپہر کے وقت جب سڑکوں پر خاموشی چھا جاتی تھی۔ اور آس پاس کے لوگ بھی خاموش ہو جاتے تو ہری ہر ایک چٹائی بچھا کر سونے کی کوشش کرتا۔ لیکن سرخ مکان کا قیدی اس خاموشی کا فائدہ اٹھا کر ہری ہر کو کچھ کہنا چاہتا۔ جس کی وجہ سے اس کی نیند اچاٹ ہو جاتی۔ کوئی شخص اندر آنے والے کمرہ میں متحرک دکھائی دیتا۔ بند کھڑکیوں کے نزدیک اس کا عکس محسوس ہوتا۔ "خوبصورت قیدی" بھاگنے کی کوشش کرتا تھا۔ کیا وہ قید اور تنہائی سے تنگ آ گیا تھا؟ وہ اس مکان کی طرف کان لگا دیتا۔ آہستہ آہستہ کسی کی غمگین حالت میں رونے کی آواز سنائی دیتی۔ وہ فوراً باہر نکلتا، لیکن وہاں کواڑ بدستور بند ہوتے تھے۔ اور ہیبتناک خاموشی۔ وہ خیال کرتا۔ کہ قیدی خواب گراں میں ہے اور اس میں اس وقت زندگی کے کوئی آثار نہیں۔ ایک رات جب چاند پورے جوبن سے آسمان پر چمک رہا تھا۔ ہری ہر اپنے مکان کے کوٹھے پر بیٹھا تھا اور چاند کی ان کرنوں سے جو ناریل کے گھنے درختوں سے چھن کر زمین پر پڑ رہی تھیں حظ اٹھا رہا تھا۔ اس نے آواز سی سنی۔ جو المناک اور عجیب سی تھی۔ کوئی اپنی معشوقہ کی تلاش میں اس تاریک گوشے کے نزدیک آ گیا تھا۔ کیا اس دنیا سے جو منور اور روشن ہے اُسے کوئی دلچسپی نہیں۔" اس نے سوچا۔ اسے کسی غیر معمولی خوشی کا احساس ہوا۔ کتنا خوشگوار منظر تھا۔ رات کی ہوا خوشبو سے لبریز ہو گئی۔ اور تاریکی زندگی کی طرح متحرک معلوم ہونے لگی۔ شاید یہ جگہ کسی مخفی محبت کی آماجگاہ تھی۔ جو انسانی صورت سے شرم محسوس کرتی تھی۔

اسی طرح دن گزرتے گئے۔ کئی موسم آئے اور گزر گئے

لیکن قیدی کو چھوڑانے کی کوئی کوشش نہ کی گئی - آہستہ آہستہ اُسکا یہ خیال بھی تبدیل ہونا شروع ہو گیا - اور ہری ہر کی دلچسپی کم ہوتی گئی - لیکن اچانک ایک چاندنی رات کو سرخ مکان کا دروازہ کھل گیا - نقاب پوش نوکرانی باہر آئی اور ہری ہر کے مکان کے سامنے کھڑی ہو گئی "ڈاکٹر صاحب میرے ساتھ آئیے" اُس نے کہا" ہری ہر بغیر کسی سوال کے اُٹھا اور زینوں سے اُتر کر سرخ مکان کے اگلے دروازے کے پاس آ گیا - اس نے کبھی کسی غیر آدمی کو اس راستے سے داخل ہوتے نہیں دیکھا تھا - اس وجہ سے اُسے اندر جانے میں ہچکچاہٹ محسوس ہوئی - لیکن نوکرانی نے کہا" مہربانی کر کے اندر چلئے "

ہری ہر اندر داخل ہوا - برآمدہ سنگ مرمر کا تھا - اور رات کی تاریکی میں خوب چمک رہا تھا - اس نے کھلے دروازے سے اندر جھانکا - یہ "باتھ روم" تھا - اس کے درمیان ایک پانی سے بھرا ہوا چینی کا ٹب تھا - اور اُس کے پاس ایک چھوٹی سی میز پہ چاندنی کے برتنوں میں عطر اور تیل رکھے تھے - پہلی منزل کو ایک سیڑھی لگی ہوئی تھی جس کے اوپر آبنوس کے فریم میں آئینہ آویزاں تھا - کمرے کے وسط میں چاندی کا جھاڑ لٹک رہا تھا - لیکن اس میں بتیاں نہ تھیں - ہری ہر پہلی منزل کے ایک کمرے کے پاس پہنچ گیا - دروازے پہ ایک سرخ پردہ لگا ہوا تھا - نوکرانی نے پردہ ہٹا کر ہری ہر کو اندر داخل ہونے کے لئے کہا - ہری ہر نے کمرے کو ایکدم پہچان لیا - اس نے یہ کمرہ کئی بار دروازہ کھلتے اور بند ہونے کے وقت دیکھا تھا - وہی آبنوس کا پلنگ . . . . . وہی سفید بستر اور تکیہ وہی آئینہ اور وہی شمعدان - بستر کے پاس ایک چھوٹی سی تپائی تھی جس پر پھولوں کا گلدستہ رکھا تھا - ایک الماری میں خوبصورت کپڑے آویزاں تھے - ایک جوڑا سرخ سلیپر کا اور ایک جوڑا زرکار جوتیوں کا بھی تھا - ایک چھوٹی سی میز پر چاندی کے برتنوں میں عطر تھے -

بیمار کا نام ؟ کتنا عجب مکان ہے - ہری ہر نے اپنے دل میں کہا شاید میں کسی آسمانی ہستی کے سونے کے کمرے میں غلطی سے داخل ہو گیا ہوں - لیکن اس میں کوئی شخص دکھائی نہ دیا - وہ جانتا تھا کہ خوبصورت قیدی کی غضبناک آنکھیں دیکھنے سے پہلے وہاں سے بھاگ نکلے - اگرچہ وہ اسے وہاں دیکھ نہ سکا - لیکن اس کی ہستی کا احساس کمرے کے ہر کونے اور ہر گوشے سے ہوتا تھا - کیا کسی جادو کے اثر سے وہ غائب ہو گیا ہے ؟

نوکرانی اس کمرے سے چلی گئی - اور دوسرا پردہ جو ایک چھوٹے کمرے کے دروازے پر لٹک رہا تھا اٹھا دیا - یہ کمرہ بظاہر خالی تھا اور تاریک صرف ایک کونے میں ایک بستر پر اسے کوئی پڑا ہوا محسوس ہوا - نوکرانی نے چراغ روشن کیا - اب ہری ہر نے بیمار کو دیکھ لیا - ایک ہڈیوں کا پتلا بستر پہ لیٹا تھا - بیمار نے سر اُٹھا کر دیکھا - روشنی دیکھتے ہی وہ قدرے گھبرا گیا اور پوچھا - "یہ روشنی کیسی ؟" خوف کی وجہ سے اس کے چہرے پہ مُردنی چھا گئی - نوکرانی نے ڈاکٹر کی طرف اشارہ کیا - بیمار نے اس کی طرف منہ پھیر کر پوچھا - "ڈاکٹر صاحب ! کیا آپ بتا سکتے ہیں - مجھے کیا بیماری ہے ؟ ہری ہر نے کہا - "میں اسی کام کے لئے آیا ہوں -"

بیمار نے کہا :" پھر مہربانی کر کے جلدی کریں - کیونکہ اب اس کے آنے کا وقت نزدیک ہے -"

ہری ہر نے حیرت سے پوچھا - "کس کے آنے کا وقت ؟" بیمار نے ہاتھ سے اشارہ کر کے اس کے کان میں کہا " جمنی آ رہی ہے - جمنی ——— ؟ "

ہری ہر کی گزشتہ یادداشت تازہ ہو گئی - اس نے کہا " کون جمنی ؟"

بیمار نے سرد آہ کھینچی - اور کہا ——— جمنی ——— ؟ آہ وہی تو ہے کیا آپ اسے دیکھ نہیں سکتے - کیا اس کا کمرہ معلوم نہیں ہوتا - کیا یہ ایک دن کا کام ہے - میں نے یہ تمام چیزیں عمر بھر سخت محنت کر کے جمع کی ہیں - اور اپنا خون پسینہ ایک کر کے انہیں حاصل کیا ہے - یہی وجہ ہے کہ یہ مکان آج اسقدر خوبصورت معلوم ہوتا ہے - ڈاکٹر صاحب بتائیں کیا یہ اس کو خوش کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں ——— ؟"

ہری ہر اس سے کچھ سمجھ نہ سکا - پھر بھی اس نے کہا " ہاں کافی تو ہے !"

بیمار کے چہرے پہ ایک مایوس کن تبسم نمودار ہوا - " پھر یہ تاخیر کیسی ؟" اس نے پوچھا - اول تو مجھ سے غلطی ہوئی - لیکن اسے بھی غریب سے کام نہیں لینا چاہیئے تھا - اُسے لازم نہیں کہ مجھے بھی اس طرح عذاب دے - میں نہیں سمجھ سکتا کہ عورتیں عذاب دینے میں خوشی کیوں محسوس کرتی ہیں - میں اسے کسی طرح بھی مطیع نہ کر سکا - کیونکہ وہ ایک شہزادی تھی - اور میں غریب مزدور - میں اسی وجہ سے اُسے گھر میں نہ لایا - مبادا وہ میری غربت سے تنگ آ جائے - شہزادی کے لئے محل بنانے میں کافی وقت کی ضرورت ہے -

وہ میری اَن تھک کوششوں اور سرگرمیوں کی کوئی قدر نہ کرتی تھی - میری زبان اسے مطیع کرنے میں ناکام رہی - اس لئے میں نے

خیال کیا کہ میں اسے سونے کے پنجرے میں قید کر دوں - اس وجہ سے میں نے اس مکان کے اردگرد بہت اونچی دیوار چنوا دی - جہاں سے پرندے بھی پر مار نہیں سکتے - لیکن وہ یہاں سے نکل گئی - معلوم نہیں کس طرح - پھر میں نے تمام کھڑکیاں اور دروازے بند کر دیئے - جس طرح آج تم دیکھتے ہو - ایک ہی دروازہ آمد و رفت کے لئے کھلا رکھا - لیکن روشنی کی طرح اسے کھڑکیاں اور دروازے روکنے سے محروم رہ گئے ہیں تمام دن سارے کمروں میں خاک چھانتا ہوں کہ مبادا کوئی سوراخ کھلا رہ گیا ہو لیکن ——— آہ ——— میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا -

ہری ہر نے پوچھا " اگر وہ بھاگ گئی ہے تو آپ مزید تکلیف کیوں کرتے ہیں - مریض نے ہنس کر کہا " آپ نہیں جانتے وہ ساحرہ ہے جو ہر رات تاریکی میں میرے غم کو تازہ کرنے کے لئے آجاتی ہے اور دور سے میرے ساتھ ہم کلام ہوتی ہے - صبح ہوتے ہی وہ ہوا میں غائب ہو جاتی ہے - میں اپنی آنکھوں سے اسے نہیں دیکھ سکتا - ہرچند میں اس کی تلاش مکان کے کونے کونے میں کرتا ہوں - میں سمجھتا ہوں کہ وہ کسی دروازے سے آتی ہے اور واپس چلی جاتی ہے - میں باغ کا دروازہ اس کے آنے کے لئے رات کو کھلا چھوڑ دیتا ہوں - اور جلیسے ہی وہ اندر آتی ہے دروازہ اندر کی طرف سے مقفل ہو جاتا ہے -

میں نے ایسا دو دفعہ کیا - لیکن وہ آندھی کی طرح بھاگ گئی اور پھر ہم اس کو کہیں بھی تلاش نہ کر سکے - ہرچند میں اور میری نوکرانی نے ہر جگہ دیکھا - آج دو راتوں سے اس کی آمد کی خوشی کا احساس کم ہو گیا ہے کیونکہ اس نے مجھے کہہ دیا ہے کہ اگر ایسا دوبارہ کرو گے - تو یا تو میں اپنے آپ کو ہلاک کر دوں گی یا غائب ہو جاؤں گی - اور پھر تم مجھے کبھی نہ دیکھو گے - ڈر کی وجہ سے پھر میں نے یہ چال کبھی نہیں چلی - دراصل وہ اس مکان کی قسمت کی دیوی ہے اس کو راضی کرنے کے لئے میں کبھی کسی فقیر کو خالی ہاتھ جانے نہیں دیتا - اور نہ بھوکے کتے کو دروازے سے ہٹاتا ہوں - لیکن با ایں ہمہ اس کو راضی نہیں کر سکتا - "

بیمار نے بہت باتیں کیں - اس وجہ سے وہ ہانپنے لگا - ڈاکٹر ہری ہر نے اسے تسکین دی اور اپنا کام کرنے لگا - اس کے بعد بصد مشکل اس کو سلایا - اور خود باہر نکل آیا - دروازے کے پاس نوکرانی اس کا انتظار کر رہی تھی - ہری ہر نے پوچھا - " اس کو کیا تکلیف ہے - کہیں شب بیداری کے مرض میں تو مبتلا نہیں ؟ -

نوکرانی نے کہا - میں نے اس کو کبھی سوتے نہیں دیکھا - ساری رات وہ باتیں کرتا رہتا ہے - کبھی ہنستا ہے، کبھی روتا ہے - جمنی اس کے ساتھ ہر وقت ہوتی ہے -

ڈاکٹر نے پوچھا لیکن جمنی ہے کہاں ؟ نوکرانی نے کہا " وہ یہیں ہے "

ہری ہر نے کہا - " پھر کیا وجہ ہے کہ اسے کوئی دیکھ نہیں سکتا - "

نوکرانی نے کہا وہ آسانی سے دیکھی جا سکتی ہے - لیکن یہ دیوانہ اسے پہچان نہیں سکتا - ڈاکٹر نے کہا " کتنی عجیب بات ہے کہ جس سے اسے اس قدر محبت ہو اسے پہچان نہ سکے - عورت کے چہرے پر مایوسانہ تبسم نمودار ہوا - اس نے کہا - " عجیب کیوں ہے - عجیب تو جب ہوتا اگر وہ اسے پہچان لیتا - چالیس برس گزر گئے - جب اس نے جمنی کو دیکھا تھا - ہری ہر کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی - اس نے حیرانگی سے پوچھا " اس سے تمہارا کیا مطلب ہے ؟ "

نوکرانی نے کہا " جب اکھیلاس رام نگر کے ایک زمیندار کی لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا - اس وقت اس کی عمر پندرہ سال کی تھی اور اکھیلاس کی بیس سال کی تھی وہ اس بڑے زمیندار کا محتاج تھا اور اس وقت اس کے پاس ایک کوڑی بھی نہ تھی - جس کو وہ اپنی ملکیت کہہ سکتا - "

بڑے آدمی اس غریب مزدور کے - " جنونِ عشق " پر ہنس دیتے تھے - وہ کہتے تھے کہ اس کی خواہش بہت بلند ہے لیکن ——— " اکھیلاس کے دل پر چوٹ لگی - اس نے کہا اچھا جس دن میں اس کے قابل ہو جاؤں گا - واپس آؤں گا - پھر کسی کو مجھے روکنے کی جرأت نہ ہوگی -

اس کے بعد وہ روپیہ کمانے کیلئے چلا گیا - زمیندار بھی اپنی لڑکی کی شادی کا عہد و پیمان اچھے گھرانوں میں کرنے لگا - لیکن لڑکی نے شادی کرنے سے انکار کر دیا اور صاف کہہ دیا کہ میں شادی نہیں کروں گی - اکھیلاس چار برس کے بعد واپس آگیا - اس کو ۸۰ روپے کی نوکری مل گئی تھی اور لڑکی بھی اب تک کنواری تھی - لیکن خود پسند اور مغرور آدمی ضد کرنے اور روڑے اٹکانے لگے - انہوں نے اس سے مذاق کے طور پر کہا کہ پان سپاری کے لئے تو کافی کماتا ہے - لیکن پوشاک اور خوراک کہاں سے بہم پہنچائے گا -

اکھیلاس جمنی کو ایک بار دیکھنا چاہتا تھا - لیکن اسے وہاں سے بری طرح نکال دیا گیا - اور وہ چلا گیا - اس وقت کسی کو پتہ نہیں لگا کہ وہ کس طرف گیا - لڑکی کی عمر بھی بڑھتی گئی - لیکن کسی نے اس کو شادی کرنے کے لئے تنگ نہیں کیا - آخر کار وہ ایک نوجوان عورت بن گئی - اس کے رشتہ دار عام لوگوں کے سامنے منہ دکھانے کے قابل نہ رہے - انہوں

نے اکھیلاس کی تلاش میں قاصد بھیجے - کیونکہ وہ اب اسے داماد بنانے کے خواہاں تھے - لیکن آہ ـــــ اس وقت اکھیلاس تھا - جس نے انکار کر دیا - اُس نے کہا "میرا مکان ابھی تیار نہیں ہوا -"

کچھ مدت کے بعد دوسرا قاصد گیا - اکھیلاس نے اسے یہ کہہ کر واپس کر دیا - کہ ابھی جواہرات تیار نہیں ہوئے - تیسرا آدمی بھی یہ پیغام لے کر واپس آگیا کہ ابھی سامان تیار نہیں ہوا تھا - آخر کار سب سمجھے کہ وہ پاگل ہو گیا ہے - اسی طرح وقت گزرتا گیا - اور وہ ہوا ـــــ جو ناشدنی تھا کنبے کے سبب مرد جمنی کو اکیلے چھوڑ کر رحلت کر گئے - اور وہ اُن کی وارث بن گئی -

---

ایک دن مشہور ہو گیا کہ اکھیلاس لڑکی کے ساتھ شادی کرنے کے لئے واپس آگیا ہے - جمنی نے جب یہ خبر سنی تو دوڑی اور اُٹھ کر ایک نقاب پہن لی - وہ اُسے ملنے کے لئے چلی گئی - لیکن اس وقت تک وہ بالکل بدل چکی تھی - اُس کے سر کے بال سفید ہو گئے تھے - اس کے منہ کے دانت گر گئے تھے - جب وہ اکھیلاس کے پاس پہنچی اور مسکرائی تو اکھیلاس نے غضبناک حالت میں کہا ـــــ "کیا تم نے اب تک کافی پیغام نہیں بھیجے - تم بڑھی ـــــ بدشکل ـــــ ڈائن ـــــ مجھ سے کیا چاہتی ہو ـــــ جاؤ ـــــ اور میرے پاس جمنی کو بھیجدو -"

جمنی کو اپنے سامنے کی دُنیا تاریک دکھائی دی ـــــ وہ وہاں سے واپس آگئی اور کافی آنسو بہانے کے بعد اسے چھٹی لکھی - جس میں لکھا کہ میں اپنی نوکرانی کو تمہارے پاس بھیجتی ہوں - مجھے شادی کا انتظام بھی کرنا ہے - میں نے تم کو کئی بار بلا بھیجا - مگر تم نے ہر بار انکار کر دیا اور نہیں آئے - تم کس طرح امید کرتے ہو کہ میں تمہارے پہلے ہی بلاوے پر حاضر ہو جاؤں ـــــ میری نوکرانی کو میرے آنے تک ہر ایک چیز کے لئے اپنے پاس رہنے دو -

اکھیلاس نے اسی پر اکتفا کیا - دوسرے دن جمنی اپنے گھر سے چھپ کر نکلی اور اکھیلاس کے پاس آئی - اس نے اپنا نام نوکرانی مشہور کروا دیا ـــــ اور اکھیلاس کا کام کرنے لگی اور اس کے مکان کو باقاعدہ صاف ستھرا رکھنے لگی - لیکن وہ اسے پہچان نہ سکا - آخر ایک دن اس نے خوبصورت ریشمی جوڑے اور طلائی زیور زیب تن کئے اور اس کے پاس چلی گئی - اکھیلاس نے جیسے ہی جمنی کی آواز سنی وہ اُٹھ کھڑا ہوا - کیونکہ آواز ہی ایک چیز تھی - جو اس وقت تک تبدیل نہ ہوئی تھی - اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے - لیکن اس نے راز کو چھپائے رکھنے کا فیصلہ کیا - اس طرح دن گزر رہے ہیں اور وہ (جمنی) رات کی تاریکی میں آکر اکھیلاس سے ہم کلام ہوتی ہے - یہ پاگل اسقدر بھی نہیں سوچ سکتا کہ جس عورت سے اس کو عشق ہے - وہ مر چکی ہے - اور اب کسی طرح واپس نہیں آسکتی - وہ جمنی کے حُسن کی تعریف میں ہر رات گیت گاتا رہتا ہے - وہ آپس میں باتیں بھی کرتے ہیں - لیکن ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے - تاریکی میں وہ گزشتہ صحبت کی میٹھی داستان دہراتے ہیں - لیکن صبح ہوتے ہی جمنی پوشیدہ ہو جاتی ہے - وہ نالہ و زاری کو ہر طریقے سے روکتی ہے - مبادا اکھیلاس اس کی آواز کو پہچان جائے -

ہری ہر نے پوچھا - "لیکن جمنی ہے کہاں؟ مہربانی کر کے مجھے ایک دفعہ اس کو دیکھنے دو -"

اس نے مصنوعی ہنسی ہنس کر اپنے چہرے سے نقاب اٹھا دیا - اور کہا - "میں جمنی ہوں -"

(ترجمہ)

رونق کاشمیری

رباعی

دُنیا پہ ستم نفس پہ بیداد کرے
بھولے سے نہ اصل اپنی کبھی یاد کرے
جیسے تری تخلیق ہیں یہ رات یہ دن
جس طرح سے چاہے انہیں برباد کرے

نجم آفندی

رہی ہے میرے خوابوں میں ہمیشہ آرزو تیری
مری فطرت کیا کرتی تھی اکثر جستجو تیری

عروسِ نو تجھے بن کر یہاں آنا مبارک ہو — بہارِ نوجوانی کا یہ دن پہلا مبارک ہو
مبارک ہو کہ آخر آج یہ روزِ سعید آیا — مبارک ہو ہماری زیست کا دورِ جدید آیا
مبارک ہو تجھے میرا رفیقِ زندگی ہونا — رہینِ سرخوشی ہونا، شریکِ بےکسی ہونا
فرشتے ایک ہی رشتے میں دو موتی پروتے ہیں — مبارک ہو کہ دو بچھڑے ہوئے دل ایک ہوتے ہیں
کریں گے ایک ہو کر سیرِ باغِ زندگانی کی — ہوا کھائیں گے مل کر گلستانِ شادمانی کی
بنائیں گے بہم قصرِ محبت ایک دل ہو کر — وفاداری کے فرض انجام دیں گے مستقل ہو کر
لگائیں گے نرالا باغ اک ایثار و اُلفت کا — محبت کا، عقیدت کا، مسرت کا، صداقت کا،
بسائیں گے ہم اِس دُنیا سے ہٹ کر اک نئی دُنیا — محبت سے رچی دُنیا، لطافت سے بھری دُنیا
نظامِ زندگی جس کا مسرت آشنا ہوگا — جہاں زہرابِ غم میں بھی شرابوں کا مزا ہوگا

وہ دُنیا سرخوشی کا ایک بحرِ بیکراں ہوگی
مسرت ہی مسرت اِس جہاں میں حکمراں ہوگی

(۲)

حیا کب تک خدارا سر اُٹھاؤ ناز سے دیکھو — میں جس انداز کا خواہاں ہوں اُس انداز سے دیکھو
کہو تو یہ حنائی ہاتھ اُٹھا دوں رُوئے درخشاں سے — اجازت ہو تو کسبِ نُور کر لُوں ماہِ تاباں سے
تمہارے اک تبسم میں حیاتِ شادماں میری — سکونِ بےکراں میرا، نشاطِ جاوداں میری
اب آنکھیں کھول دو، دیکھو محبت کی سفارش ہے — نہ ٹھکراؤ کہ پہلی شب کی، یہ پہلی گذارش ہے

ذرا بولو کہ دُنیا جاگ اُٹھے شادمانی کی
ذرا ہنس دو کہ کلیاں پھُول ہو جائیں جوانی کی

محمد یونس سلیم (بی۔ اے)

احساسِ عشق

(ایک ایکٹ کا ڈرامہ)

افراد:۔

شجاع .. .. بادشاہ
نکہت .. .. شجاع کی حسین و جمیل دختر
امان .. .. شاہی فوج کا ایک بہادر سپاہی
لڑکا .. .. امان کا ملازم

پہلا منظر۔

(سلیم آباد شجاع کا پایۂ تخت۔ راحت منزل اُس کا عالیشان محل، جس کی چاروں جانب ایک خوبصورت، سرسبز اور شاداب باغیچہ ہے۔ شام کا وقت ہے۔ راحت منزل کی مختلف نشست گاہیں نہایت قیمتی اشیائے زینت سے سجی ہوئی ہیں۔ مگر ایک نشست گاہ کی سجاوٹ ان سب سے زیادہ ہے۔ جو بادشاہ کی آرامگاہ معلوم ہوتی ہے۔ اس کے فرش پر ایرانی قسم کے قیمتی قالین بچھے ہوئے ہیں۔ دیواروں پر ہاتھی دانت کی بنی ہوئی مختلف جانوروں کی تصویریں آویزاں ہیں۔ جو تیز ضو قمقموں سے جگمگا کر ایک عجیب بہار پیدا کر رہی ہیں۔ شجاع ایک نیلگوں صوفے پر بیٹھا ہوا ہے۔ وہ ساٹھ برس کا معمر آدمی ہے۔ مگر اس کی شکل سے ابھی تک ایک وجاہت اور جلال ٹپک رہا ہے۔ نکہت شجاع کے دائیں طرف صوفے پر دراز ہے۔ دونو کسی گہری سوچ میں کھوئے ہوئے ہیں۔ اُن کے چہروں پر تفکرات کے آثار نمایاں ہیں۔)

شجاع ۔ نہ جانے جنگ کا کیا حشر ہوا؟ معلوم نہیں کلیم خاں (سپہ سالار اعظم) نے ابھی تک حالات سے کیوں مطلع نہیں کیا؟

نکہت ۔ شام ہو چکی ہے۔ خیر نہیں۔ کیا بات ہے!!

شجاع ۔ خدا نیک خبر لائے!

نکہت ۔ (آمین)

(یکایک ایک نوجوان سپاہی اندر داخل ہوتا ہے۔ اُس کا قد دراز اور جسم سڈول اور مضبوط ہے، اُس کی شکل و صورت نہایت دلآویز ہے۔ اُس کے جسم پر جگہ جگہ ضربیں آئی ہوئی ہیں۔ اندر داخل ہوتے ہی وہ شجاع کو ایک فوجی سلام کرتا ہے)

شجاع ۔ (نہایت بے تابی سے) کیا خبر لائے ہو امان؟

امان ۔ خیریت ہے حضور۔

شجاع ۔ جنگ کا کیا حال ہے؟

امان ۔ لڑائی گھمسان کی ہو رہی ہے۔ مگر حضور ہم تعداد میں بہت کم ہیں۔ اور غیر مسلح! دشمن ہر طرح سے مسلح اور تعداد میں ہم سے بہت زیادہ ہے۔

شجاع ۔ جو خدا کو منظور ہوگا۔

امان ۔ اگرچہ آزادی کا جذبہ ہر سپاہی کے سینے میں مچل رہا ہے۔ اور مُلک کو آزاد کرانے کے لئے ہر شخص دل و جان سے تیار ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ہم تعداد میں کم ہیں۔ اور بے سر و سامان۔

(شجاع امان کے ان الفاظ پر اُس کی جانب غور سے دیکھتا ہے)

شجاع ۔ ایں۔ تمہارے جسم پر اتنی ضربیں!

(شجاع کے اس اظہار تعجب پر نکہت کی نگاہیں یکایک امان کی طرف اُٹھتی ہیں جس سے اُس کے چہرے پر حیرت اور تشویش کے ملے جُلے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں۔)

امان ۔ حضور۔ جنگ میں ایسی ضربیں اکثر آ ہی جایا کرتی ہیں۔

شجاع - لیکن اطلاع کے لئے کلیم خاں نے آپ کو کیوں بھیجا کسی اور کو بھیج دیا ہوتا -

امان - سپہ سالار کا یہ حکم تھا - اُن کا حکم بجالانا ہر سپاہی کا فرض ہے - میں کس طرح انکار کر سکتا تھا - جناب -

شجاع - شاباش! تم کتنے بہادر اور وفادار ہو امان!

(امان شکریے کے طور پر سر جھکا لیتا ہے - ایک لمحے کے لئے آرام گاہ میں خاموشی رہتی ہے - امان کن انکھیوں سے نکہت کی جانب دیکھتا ہے - نکہت بھی گاہے گاہے امان کی جانب دیکھتی ہے)

شجاع - امان جاؤ - تمہیں تکلیف ہو رہی ہوگی -

(امان اجازت پاتے ہی اپنی جائے رہائش پر آجاتا ہے)

دوسرا منظر:-

تین دن کے بعد -

(امان کے زخم مندمل ہو چکے ہیں - وہ دوبارہ جنگ پر جانے کے لئے تیار ہے - شام کا وقت ہے - نکہت محل کے باغ میں سیر کر رہی ہے - سورج کی آخری شعاعیں نکہت کے حسین چہرے سے اٹھکیلیاں کر رہی ہیں - امان باغ میں داخل ہوتا ہے - اُس نے فوجی لباس زیب تن کیا ہوا ہے - نکہت کے قریب آکر رُک جاتا ہے - اور فوجی سلام کرتا ہے - ایک لمحے کے لئے دونو خاموش رہتے ہیں)

نکہت - کیا دوبارہ جنگ پر جا رہے ہو امان؟

امان - شہزادی صاحبہ! میں رات کو چلا جاؤنگا -

نکہت - اچھا تو خدا حافظ!

(امان خاموش رہتا ہے)

نکہت - کہو امان - رُک کیوں گئے -

امان - نہیں شہزادی صاحبہ - میں رُک نہیں گیا - میں حیران ہوں کہ کیونکر اپنے دل کی کیفیت .. ..

نکہت امان کی جانب حیرت سے تکنے لگتی ہے - امان نکہت کی جانب مسلسل دیکھ رہا ہے - نکہت امان کی نگاہوں کا مفہوم سمجھ لیتی ہے - اُس کا چہرہ غصے سے تمتما اُٹھتا ہے - لیکن فی الفور اپنی اصلی حالت پر آجاتا ہے - امان کے چہرے سے بیتابی کے آثار نمایاں ہیں - نکہت خاموش رہتی ہے)

امان - شہزادی نکہت - یہ درست ہے - کہ میں ایک سپاہی ---- بہت معمولی سپاہی ہوں - لیکن اگر جنگ میں قدرت نے مجھے شہرت - ناموری اور پوزیشن عطا کر دی - اگر فتح میرے ہاتھ اور صرف میرے ہاتھ رہی - اور اگر میں نے اپنے عزیز بادشاہ ---- تمہارے والد بزرگوار کو - جو ان دنوں غم و آلام کی زندگی زندگی بسر کر رہے ہیں - راحت و سکون کی زندگی واپس لا کر دی ---- تو کیا اس وقت آپ میرے ان الفاظ کو جن کو اب آپ سُننا بھی گوارا نہیں کرتیں - اپنے دل میں جگہ دیں گی؟ کیا اُس وقت میری اس التجا کا محبت بھرا جواب مل سکیگا؟

(نکہت سورج کی ڈوبتی ہوئی شعاعوں میں ایک لمحے کے لئے امان کے چہرے کی جانب دیکھتی ہے - امان کی آنکھوں میں ایک اُمید جھلک اُٹھتی ہے - نکہت کی نگاہوں میں خاص نرمی آجاتی ہے - اُس کے حسین نازک ہونٹ جُنبش کرتے ہیں)

نکہت - "ہاں"

(یکایک نکہت کے ہاتھ سے اُس کا سبز گوں رومال زمین پر گر پڑتا ہے - امان اُس کو فوراً اُٹھا لیتا ہے - اور اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے)

امان - خدا نہ کرے - شہزادی نکہت! اگر جنگ میں ہم کو شکست نصیب ہوئی - تو یہ رومال آپ کو واپس مل جائیگا - اُس وقت میں اپنی تمام سنہری اُمیدوں کو قطع کر ڈالونگا - میری محبت اُس وقت قبر کی تاریکیوں میں آرام فرما ہوگی - لیکن اگر جنگ ہمارے ہاتھ رہی - اور یقیناً رہیگی - تو یہ رومال ایک وعدہ ہوگا - میری اس التجا کا ---- اور اُس کے جواب کا!

(امان نکہت کو فوجی سلام کرتا ہے اور رخصت ہو جاتا ہے)

تیسرا منظر:-

(شجاع کی فوج کو جنگ میں شکست ہوتی ہے - سلیم آباد پر دشمن کا قبضہ ہو چکا ہے - شجاع اس شکست کی تاب نہ لاکر حرکتِ قلب کے بند ہو جانے کے باعث مر جاتا ہے - نکہت راحت منزل میں بند کر دی جاتی ہے - صبح کا وقت ہے - نکہت محل کے ملحقہ باغ میں مضمحل انداز سے ٹہل رہی ہے - امان کا عہد اُس کو بار بار یاد آرہا ہے - اتنے میں ایک دس سال کا لڑکا

اُس کی جانب آتا ہوا دکھائی دیتا ہے - وہ شکل و صورت سے ملازم معلوم ہوتا ہے - نکہت کے قریب آ کر رُک جاتا ہے - اور تعظیماً سر جھکا دیتا ہے)

لڑکا - کیا آپ ہی بادشاہ مرحوم کی دختر نکہت ہیں ؟

نکہت - تم اُس سے کیا کہنا چاہتے ہو ؟

لڑکا - میں اُن سے ملنا چاہتا ہوں - مجھے اُن سے ایک کام ہے -

نکہت - میرا نام ہی نکہت ہے - کہو مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہو ؟

(لڑکا اپنی جیب سے سبز رنگ کا ایک رومال نکالتا ہے اور نکہت کی جانب بڑھاتا ہے)

لڑکا - یہ رومال میرے آقا نے آپ کو دیا ہے - اور یہ بھی کہا ہے کہ اگرچہ وہ یکسر تباہ و برباد ہو چکا ہے - اور اُس نے بے عزتی اور ذلت کا طوق پہن لیا ہے - لیکن اُس نے اس حسین یادگار کو ضائع نہیں ہونے دیا - اور نہ ہی اُس نے اپنے عہد کو بھلایا ہے -

(نکہت نہایت آزردگی سے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتی ہے - اور رومال لے لیتی ہے)

نکہت - کیا تمہارا آقا ---- تمہارا آقا ابھی تک زندہ ہے ؟

لڑکا - میرے آقا نے مجھے ایسا کہنے کے لئے کچھ نہیں کہا - اُنہوں نے جو کچھ مجھے کہا - وہ میں نے آپ کو عرض کر دیا ہے -

(نکہت اپنا ہاتھ نہایت بے چینی کے ساتھ اپنے کاندھے پر رکھتی ہے)

نکہت - نہیں - عزیز لڑکے - مجھے میری بات کا جواب دو - مجھے بتاؤ - کہ تمہارے آقا کا کیا حال ہے - بتاؤ - عزیز لڑکے مجھے جلد بتاؤ !

لڑکا - کیا آپ اُن کو جانتی ہیں ؟ کیا آپ اُن کی دوست ہیں ؟

نکہت - میں اُن کو جانتی ہوں - میں اُن کی دوست ہوں - او میرے خدا - کہو لڑکے کہو -

لڑکا - اگرچہ اُنہوں نے مجھے زیادہ گفتگو کرنے سے منع کیا ہے - لیکن اگر آپ اُن کی دوست ہیں - تو میں ضرور آپ کو بتاؤں گا - لیکن وہ ایک غریب دوست ہے - اس لئے اُس کی زندگی یا موت کی کسے فکر ہو سکتی ہے ؟

(لڑکے کے آخری الفاظ نکہت کے دل پر ایک تیز نشتر کا کام کرتے ہیں - اُسکی خشک آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو جاتی ہیں)

لڑکا - میرے آقا اُن سپاہیوں سے نہیں - جو میدان جنگ سے بھاگ جاتے ہیں شکست اور فتح خدا کے ہاتھ میں ہوتی ہے وہ شکست کھا چکنے کے بعد بھی آخری دم تک دشمنوں کے ساتھ لڑتے رہے - شکست کی دوسری صبح کو ہم نے ان کو خارجی دروازے کے باہر بیہوش پایا - اُن کا جسم زخموں سے چھلنی ہو چکا تھا - اُس وقت اُن کا زخموں کے باعث بُرا حال تھا - خوب زور کا بخار تھا - ہم اُن کو اُٹھا کر اندر لے آئے - مگر وہ بے ہوش تھے - اُن کے ہاتھ میں ایک چیز تھی ---- یہ رومال تھا - جو ہر وقت اُن کے ہاتھ میں رہا - معلوم نہیں اس رومال میں کیا جادو تھا جس کے باعث وہ کبھی کبھی ہوش میں آ کر دیکھنے لگ پڑتے تھے - بمشکل اُنہوں نے ہم کو یہ رومال آپ تک پہنچانے کیلئے بتایا - اگرچہ ہم نے اُن کی صحت کیلئے جو کچھ ہم سے ہو سکا - کیا - مگر آہ اب وہ آخری سانس لے رہے ہیں - اس دُنیا میں وہ چند لمحوں کے مہمان ہیں ۔

(نکہت ایک درخت کے ساتھ لگی یہ دردناک حالات سُن رہی تھی - وہ رومال کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی ہے - لڑکا نکہت کو مسلسل خاموش دیکھ کر اُس کی جانب دیکھتا ہے - وہ معاملہ کی تہ تک پہنچ چکا ہے)

لڑکا - بیگم - اگر آپ اُن کی دوست ہیں - اور واقعی اُن کو چاہتی ہیں - تو آپ نے یقیناً اُن کو آخری وقت میں کچھ کہنا تو ہوگا -

(لڑکے کے اس سادہ سوال پر نکہت کی آنکھیں بے اختیار آنسوؤں سے بھر جاتی ہیں)

لڑکا - کیا آپ اُن سے کچھ نہیں کہنا چاہتیں ؟

(نکہت کے ہونٹوں کو جنبش ہوتی ہے مگر کوئی آواز نہیں سنائی دیتی)

لڑکا - افسوس ہے کہ میرے آقا کا اس دُنیا میں ایک بھی دوست نہیں !!

(وہ اپنا سر اُٹھاتی ہے - اس کے چہرے کا رنگ چاند کی مانند زرد ہو چکا ہے - وہ رومال کو دوبارہ لڑکے کے ہاتھ میں دے دیتی ہے)

نکہت - عزیز لڑکے جاؤ ! اپنے آقا سے کہو کہ جنگ کی اس شکست نے دوستی کے اس پاک رشتے کو اتنا مضبوط کر دیا ہے - جتنا کامیابی کے بعد بھی ممکن نہ تھا - جاؤ - وہ اس کا مطلب سمجھ لینگے !

(لڑکا چلا جاتا ہے - نکہت بیہوش ہو جاتی ہے - وہ دھڑام سے زمین پر گر پڑتی ہے - اور گرتے ہی جاں بحق تسلیم ہوتی ہے - اُس کے ہونٹوں سے اماں - اماں کی صدائیں ہوا میں گونجتی ہوئی سُنائی دیتی ہیں)

(تاثرات لوئیس - ڈی - برے - رامی) **اثر چکوالی - بی - اے**

مقوقس مصری

مدت ہوئی ہالینڈ کے مشہور پروفیسر ڈی گیج نے ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام "مصر کا مقوقس" تھا۔ انہوں نے اپنی کتاب کا آغاز اس سوال سے کیا تھا کہ

" وہ مقوقس کون ہے؟ جس کا ذکر عربی تاریخ کی کتابوں میں فتح مصر کے موقعہ پر کثرت کے ساتھ موجود ہے؟ کیا آجتک کسی عالم نے یونانی یا دوسری زبان کے کتبوں اور تحریروں میں کسی ایسے شخص کا پتہ لگایا ہے جس کا نام مقوقس ہو؟ جس کی شخصیت پر یہ نام منطبق کیا جا سکے؟"

پروفیسر موصوف نے اس اہم سوال کا اُلٹا سیدھا جواب اپنی مذکورہ بالا تصنیف میں تحریر فرمایا اور مختلف طریقوں سے مقوقس کی شخصیت کا پتہ لگایا۔ لیکن اس معمہ کے حل کرنے کی فکر پروفیسر صاحب ہی کو نہیں تھی بلکہ ان کے ہمعصر رینک صاحب کو بھی۔ جو ایک مشہور جرمن مؤرخ ہیں اس سے اس کی اہمیت صاف صاف نظر آئی۔ اور انہوں نے اپنی کتاب "تاریخ عالم" جلد ۵ میں مقوقس کی شخصیت پر ایک مبسوط اور مفصل بحث کی۔ چونکہ ان دونوں مصنفین کا ذریعہ انکشاف ایک دوسرے سے کچھ مختلف تھا۔ اس وجہ سے دونوں دو مختلف بلکہ متضاد نتیجوں پر پہنچے۔ پروفیسر ڈی گیج کو مقوقس کی تاریخی ہستی و تاریخی اہمیت قطعی و ناقابلِ انکار نظر آئی۔ لیکن رینک نے مقوقس کی ہستی کو ہومر، لقمان، ایسپ، جمشید وغیرہ کے مانند ایک افسانہ قرار دیا۔ اس کے ان تمام واقعات کو جن کو عرب مورخین نے بیان کیا تھا۔ ناقابلِ اعتبار سمجھا۔ پروفیسر صاحب نے تو عرب مؤرخین کے ان تمام بیان کردہ واقعات کو جو مقوقس کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں قابلِ اعتبار سمجھ کر یونانی اور دوسری تاریخوں میں ایسے اشخاص کو تلاش کیا جن سے اس قسم کے کارِ نمایاں سرزد ہوئے ہوں اور جو مقوقس جیسے ایک مبہم نام کا مصداق بن سکتے ہوں۔ لیکن اس کے برعکس اس جرمن مورخ نے عرب مورخین پر تنقید کرتے ہوئے ان باتوں کو بھی قابلِ اشتباہ قرار دیا جو محدثین کے نزدیک ان اسنادِ صحیحہ سے جن کی تاریخی صداقت علاوہ مسلمانوں کے دوسرے مذہب والوں کے نزدیک بھی مسلّم ہے۔ ثابت ہیں اس طرح رینک کے نزدیک صحابہ کا مقوقس کے پاس آنا جانا اور مقوقس کا آنحضرت کی خدمت میں ایک لونڈی ماریہ قبطیہ کو بھیجنا بھی ایک مشتبہ امر ہے۔ رینک نے بعض عربی کتابوں کا مطالعہ تو بے شک کیا۔ لیکن ان واقعات کا انکار محض اس بنا پر کر دیا کہ روایت کی کسوٹی پر صحیح نہیں اُترتے اور نیز اس لئے کہ دوسری قوموں کے مورخین نے مصر کی تاریخ لکھتے وقت ان باتوں کو بالکل بیان نہیں۔

میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ میری نظر ڈی گیج اور رینک کے برابر وسیع نہیں ہے۔ لیکن ان دونوں کے انکشافات میں کچھ غلطیاں نظر آرہی ہیں اور میں خود اس بات کو چاہتا ہوں کہ مقوقس کے معمہ کو حل کر دوں۔ کیونکہ عرب مؤرخین کی تصنیفات کے علاوہ مجھے حسنِ اتفاق سے بیش بہا کتبے بھی مل گئے ہیں جو اس زمانہ کے نوشتہ ہیں۔ جبکہ مسلمان مصر فتح کر رہے تھے۔ ایک اور نادر شئے جو دستیاب ہوتی ہے وہ لشپ آف نیکو کی تاریخ کا ترجمہ ہے۔ یہ لشپ جن کا اسم گرامی یوحنا تھا، فتح مصر کے زمانہ میں حبشہ کے علما میں شمار کئے جاتے تھے اور انہوں نے حبشی زبان میں مصر کی ایک مفصل تاریخ لکھی جس کا ترجمہ زوٹن برگ نے جرمن زبان میں کیا ہے۔ یہ کتاب اگرچہ کتبات کے برابر قابلِ اعتماد نہیں ہے۔ لیکن مصر کے غیر اسلامی امور کو بیان کرنے کے لحاظ سے عربی تاریخوں سے کہیں زیادہ مستند ہے۔

مقوقس کا نام اور قومیت

سب سے پہلے جو سوال ہمارے سامنے پیش آتا ہے وہ یہ ہے کہ مقوقس کا نام کیا تھا؟ مقوقس کو معنوی نام سمجھنا محض ایک فاش غلطی ہے اور جہاں تک میری تحقیق ہے آجتک کسی مصنف نے یہ غلطی نہیں کی ہے۔

عربی کتابات میں صراحتہً مقوقس کا اصلی نام جریج یا جرجہ مذکور ہے اس جریج یا جرجہ کی شکل یونانی کتابات میں (Georgios.) نظر آتی ہے۔ ہمارے نزدیک یونانی (Georgios) اور عربی جریج یا جرجہ ایک ہی شخص کے نام ہیں۔ اگرچہ اس بزرگ نے اپنی کتاب "سوانح محمدؐ جلد ۳ ص ۲۶۵ میں" اس امر کو قابلِ اشتباہ قرار دیا ہے کہ جریج اور Georgios ایک ہی شخص کے نام ہوں۔ لیکن ہمارے نزدیک اس میں کسی قسم کے شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ دونوں یقیناً ایک ہی شخص کے نام ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ علاوہ جریج یا جرجہ کے بعض عربی کتبات میں یہ نام جرجس بھی ملتا ہے۔ اس امر کی تائید لشپ آف نیکو کی تاریخ سے بھی ہوتی

ہے۔ کیونکہ لشپ نے اپنی تاریخ میں ایک شخص جارج مخفف جارجج کے متعلق وہی واقعات بیان کئے ہیں جن کو عرب مصنفین مقوقس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ جارجج شروع شروع میں بگڑ کر جرجس اور پھر جرجہ ہوگیا اور کچھ عرصہ بعد عربوں نے زبردستی اس اسم معرفہ کو تصغیر کا لباس پہنایا اور مقوقس کا اصلی نام جریج سمجھنے لگے۔ جریج کے باپ کا نام بعض کتابات میں مینا اور بعض میں قرقب مذکور ہے۔ بظاہر ان دونوں بیانوں میں تضاد نظر آتا ہے۔ لیکن یہ ظاہری تضاد آسانی کے ساتھ دور بھی کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ مقوقس بے شبہ قبطی النسل تھا اور اس زمانہ میں ایک قبطی کے لیا اوقات دو نام ہوا کرتے تھے۔ اس بنا پر مقوقس کے باپ کا دو ناموں۔ مینا اور قرقب۔ کے ساتھ موسوم ہونا خلاف عقل نہیں۔ مینا کی شکل یونانی کتبات میں میناس (menas) نظر آتی ہے، قرقب کا پتہ یونانی کتبات میں کہیں کہیں چلتا ہے۔ فیوم کے ایک کتبہ میں menas Parhalios نام کا ایک شخص مذکور ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ عربوں نے Parhalios سے فرقب کرلیا اور فرقب محرف ہوکر قرقب ہوگیا۔ اس تفتیش اور چھان بین کے بعد مقوقس کا پورا نام جو ہم نے دریافت کیا وہ یہ ہے۔

"جریج بن مینا قرقب"

باپ کے نام کے علاوہ مقوقس کے دوسرے بزرگوں کا نام کہیں صراحتہً یا اشارۃً مذکور نہیں۔ ہاں مقریزی نے مقوقس کے ماموں کا نام ہاموک بتایا ہے۔ یہ ہاموک وہی ہے جس نے بیٹے سنطانے ۱۹ جولائی سنہ ۶۴۲ء کو مسلمانوں کی رفاقت میں ٹمنس کی یونانی فوج سے لڑتے ہوئے وفات پائی۔

مقوقس بلحاظ قومیت قبطی تھا۔ اور اس کے قبطی ہونے میں کسی مصنف نے آجتک شبہ نہیں کیا۔ مقریزی سے یہ اشتباہ ہوگیا جس کی بنا پر انہوں نے اپنی کتاب ج اس ۲۸۹ میں مقوقس کے لئے لفظ یونانی کی صفت استعمال کی۔ اس قسم کی غلط صفت انہوں نے ایک دوسرے موقع پر بھی استعمال کی ہے۔ شہر قصر (بابلیون) کے قلعہ کا سالار فوج ان کے خیال کے مطابق قبطی تھا۔ حالانکہ صحیح یہ ہے کہ وہ یونانی تھا۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ انہوں نے سہواً مقوقس کی قومیت کو اس سالار فوج کی طرف اور سالار فوج کی قومیت کو مقوقس کی طرف منسوب کردیا۔

مقوقس کا مرتبہ و منصب مقوقس کے نام اور قومیت کو متعین کرنے کے بعد ہمیں اب اس بات پر غور کرنا ہے کہ اس نامور ہستی کی حیثیت مصر میں کیا تھی؟ عرب مورخین میں سے بہتوں کو اس بارے میں بہت کچھ غلط فہمی ہوگئی ہے اور چونکہ ان بزرگوں کو تاریخ مصر کے اسی پہلو کی تنقید اور چھان بین سے کام تھا جس کا تعلق براہ راست اسلام سے ہے۔ اس بنا پر انہوں نے ان غلط بیانیوں پر نظر ثانی کرنے کی بالکل پروا نہ کی۔ جن کا تعلق مقوقس کی ذاتیات سے ہے بعض مورخین اگرچہ اس الزام سے بری ہیں۔ لیکن انہوں نے بھی اس بات کو کما حقہ وضاحت کے ساتھ نہیں بیان کیا کہ مقوقس کی حیثیت مصر میں کیا تھی؟ مقوقس کے مرتبہ و منصب کے بارے میں جو خیالات عام طور پر عرب مصنفین کی کتابوں سے اخذ کئے جاتے ہیں وہ یہ ہیں:۔

(۱) مقوقس اسکندریہ کا بادشاہ تھا۔

(۲) مقوقس پورے ملک مصر کا خود مختار بادشاہ تھا۔

(۳) مقوقس پورے ملک مصر کا بادشاہ تھا۔ لیکن بازنطینی گورنمنٹ کا باجگزار بھی تھا۔

(۴) مقوقس بازنطینی گورنمنٹ کی جانب سے پورے ملک مصر کا گورنر تھا۔

(۵) مقوقس بازنطینی گورنمنٹ کی جانب سے پورے ملک مصر کا حاکم خزانہ تھا۔

(۶) مقوقس بازنطینی گورنمنٹ کی جانب سے مصر کے ایک خاص حصہ کا حاکم خزانہ تھا۔

محض آخری رائے جو بعض کتابوں میں بہت ہی مبہم طریقہ سے مرقوم ہے۔ مجھے صحیح معلوم ہوتی ہے۔ لیکن قرائن سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ حاکم خزانہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے متعلق عارضی طور پر نظم و نسق کا بھی کاروبار تھا۔ کتابات نیز لشپ آف نیکو کی تاریخ سے جو باتیں منکشف ہوتی ہیں ان کی بنا پر نہ تو مقوقس کا خود مختار بادشاہ ہونا ممکن نظر آتا ہے اور نہ پورے ملک مصر کا گورنر یا حاکم خزانہ ہونا قرین قیاس ہے بلکہ ہے۔ لشپ آف نیکو اسی زمانہ میں تھے۔ جبکہ مسلمان مصر فتح کررہے تھے۔ اگرچہ وہ حلبشہ میں تھے۔ لیکن ان کی آمدورفت مصر میں ہمیشہ جاری رہتی تھی۔ مصر کے اس زمانہ کے واقعات جتنا صحیح وہ لکھ سکتے ہیں۔ اس قدر صحیح عرب مورخین جن کا زمانہ بہت ہی موخر ہے۔ یقیناً نہیں لکھ سکتے۔ ان کی تاریخ اور نیز کتابات کے پڑھنے سے اس بات کا صاف پتہ چلتا ہے کہ مصر اس زمانہ میں خود سر سرکش نہیں تھا بلکہ قیصر روم کا مطیع

تھا۔ مصر کے تمام حکام قیصر روم کے حکم سے مقرر ہوتے تھے اس بنا پر مقوقس کا خود مختار یا باجگزار بادشاہ ہونا محض ایک مہمل بات معلوم ہوتی ہے۔ وہ یقیناً قیصر کا ملازم تھا۔ اب اس سوال کو حل کرنا کہ وہ کس قسم کا ملازم تھا؟ کچھ مشکل نہیں، ایلفرڈ بٹلر نے اپنی تاریخ کی جلد ۲ ص ۳۰۲ میں مقوقس کو ہرقل کا عامل خراج قرار دیا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہرقل کی جانب سے اس کام پر مقرر تھا کہ خراج و عُشر وغیرہ رعایا سے وصول کر کے ہر سال اس کی خدمت میں بھیجدیا کرے۔ اس قسم کے عامل خراج جو یونانی کتابت میں پیگارک کے نام سے موسوم ہیں۔ مصر میں کئی ایک ہوا کرتے تھے۔ تمام ملک میں ایک ہی شخص ایسا نہیں ہوتا تھا جو پورے ملک کا خراج وصول کر کے شاہی خدمت میں بھیجتا۔ اگر ہم مقوقس کو پورے ملک مصر کا حاکم خزانہ مانتے ہیں۔ تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ پورے ملک کا خراج ایک ہی شخص قیصر کی خدمت میں وصول کر کے بھیجدیتا تھا۔ حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے۔

مقوقس کا پورے ملک کا یا مصر کے کسی حصہ کا گورنر ہونا ناممکن اس بنا پر ہے کہ اولاً تو نظم و نسق کرنے والے گورنر کئی ایک ہوا کرتے تھے اور نیز مصری گورنر ہمیشہ یونانی یا رومی اشخاص ہوا کرتے تھے۔ مقوقس قبطی تھا۔ قبطیوں کو محکمہ خزانہ کی ملازمت مل سکتی تھی۔ لیکن محکمہ سیاست یا نظم و نسق میں وہ بالکل نہیں دخل دے سکتے تھے۔ ہاں بعض اوقات جب کوئی یونانی یا رومی شخص گورنر کے واسطے دستیاب نہ ہوتا تو قیصر پیگارک یعنی عامل خزانہ ہی کو نظم و نسق کا اختیار دیدیا جاتا تھا۔ جیساکہ مقوقس کو بھی عارضی طور پر حاصل تھا۔

مقوقس کے مرتبہ و منصب کو متعین کرنے کے لئے اگر میں اس زمانہ کا مصری نظام ملکی ناظرین کے سامنے پیش کر دوں تو یقیناً بہت زیادہ مناسب ہوگا۔ یہ نظام ملکی کتابت نیز بشپ آف نیکو کی تاریخ سے مستنبط ہے اور اس کی صحت میں کسی شخص کے شبہہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ ناظرین اس کو اپنے پیش نظر رکھ کر خود ہی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ مقوقس کس قسم کا عہدہ دار رہا ہوگا؟ نیز یہ کہ اس کا خود مختار بادشاہ یا پورے ملک کا گورنر ہونا محال ہے۔ یا ممکن؟

اسلامی حملہ کے پہلے مصر تین صوبوں میں منقسم تھا۔ مصر اعلیٰ مصر اسفل، مصر وسطیٰ۔ ہر صوبہ میں ایک فوجی افسر اپنی فوج کے ساتھ کسی نہ کسی ہیڈ کوارٹر پر قیصر کے حکم سے مقیم رہتا۔ اس فوجی افسر کا لقب ڈوکس تھا اور اس کو ملکی انتظام و سیاست سے کوئی سرکار نہ ہوتا تھا۔ ان تینوں صوبوں میں سے ہر ایک بہت سی قسمتوں پر مشتمل تھا۔ ان قسمتوں کا نام یونانی کتابت میں Nomos اور عربی کتابت میں کورہ ہے ہر قسمت میں دو قسم کے حاکم ہوتے تھے۔ ایک وہ جس کے متعلق سیاسی معاملات ہوتے تھے اور اس کا لقب سٹراٹگوس (Sitratagos) تھا۔ دوسرا وہ جو مالیات کا نگراں ہوتا اور رعایا سے وصول کیا ہوا خراج اور ٹیکس شاہی خدمت میں بھیجتا۔ اس حاکم کا لقب پیگارک تھا۔ پیگارک بالعموم ایک ہی قسمت کے خراج و عشر کا منتظم ہوتا۔ لیکن کبھی کبھی ضرورت کے موقعہ پر اس کے متعلق دو تین بلکہ ایک صوبہ کی تمام قسمتیں ہوجاتیں اور وہ سب کا خراج وصول کرتا۔ صوبہ کا فوجی حاکم ڈوکس اور قسمت کا سیاسی حاکم سٹراٹگوس ہمیشہ رومی یا یونانی ہوا کرتے تھے۔ البتہ پیگارک یونانی اور رومی کے علاوہ قبطی بھی ہو سکتے تھے۔ یہ تینوں حاکم قیصر روم کے حکم سے نامزد ہوتے تھے۔ کبھی کبھی جب کوئی یونانی یا رومی اس قابل نہ ملتا جو قسمت کے سیاسی نظام کو سنبھالتا تو قیصر، پیگارک ہی کو سیاست کا کام بھی سپرد کرتا۔

ان تینوں حاکموں کے فرائض جُدا جُدا تھے۔ ڈوکس محض ضرورت کے موقعہ پر غنیم یا باغیوں سے جنگ کرنے کا بندوبست کرتا۔ سٹراٹگوس کو قسمت کے فوجی معاملات سے کچھ تعلق نہ ہوتا۔ وہ قسمت کے محض ان معاملات کو سنبھالتا۔ جن کے ذریعہ پبلک کے درمیان امن و امان قائم رہتا۔ وہ جج یا منصف کی طرح مقدمات بھی فیصل کرتا اور پولیس کے افسر کی طرح بدمعاشوں کا تدارک بھی کرتا۔ سٹراٹگوس کے پہلو بہ پہلو پیگارک محض ان معاملات کو سنبھالتا جو مالیات سے متعلق ہوتے۔ علاوہ ٹیکس وغیرہ وصول کرنے کے وہ، سرکاری عمارتیں، جہاز، پُل اور نہریں وغیرہ بھی تعمیر کرواتا ٹکسال بازاری ناپ اور پیمانہ کے تعین کے کام بھی اسی حاکم کے متعلق ہوتے۔

مصر سے بازنطینی حکومت کے چلے جانے کے بعد جب اسلامی سلطنت کا زمانہ آیا تو بہت عرصہ تک یہ نظام ملکی اپنی ہی حالت پر قائم رہا۔ حکام کے نام کے سوا کسی اور چیز میں تغیر و تبدل نہیں واقع ہوا۔ حاکم قسمت کا نام مسلمانوں نے سٹراٹگوس کے بجائے صاحب المعونۃ (بنا بر روایت یعقوبی جلد ۲ ص ۴۶۹ و اصطخری و ابن حوقل) یا عامل المعونۃ (بنا بر روایت طبری جلد ۳) رکھا۔ پیگارک کو مسلمانوں نے عامل الخراج یا محض عامل کے نام سے موسوم کیا۔ جس طرح بازنطینی دور میں بعض وقت پیگارک علاوہ خراج کے نظم و نسق بھی سنبھالتا تھا۔ اسی طرح اسلامی زمانہ میں بھی بعض حاکموں کے بارے میں ہمیں کتابت نیز تاریخ ابن اثیر جلد ۴ میں اس قسم کی متعدد نظیر

آتی ہیں "کان عاملا علی خراج کورۃ الفیوم ومعونتہا وجمیع اعمالہا"

بازنطین نیز ابتدائی اسلامی زمانہ میں عامل خراج کے ماتحت بہت سے نائب بھی ہوتے تھے۔ ان مددگار نائبوں میں سے ہر ایک کسی مخصوص ضلع میں خراج وصول کرتا اور وصول کر کے پگارک کے سپرد کرتا۔ اسلامی دور میں شاید اس نائب کو خلیفۃ العامل کہتے تھے۔ جیسا کہ بابیرس کے ایک کتبے سے ظاہر ہوتا ہے۔ خلیفہ کے ماتحت بہت سے عون اور قسطال ہوتے تھے۔ عون اور قسطال کو بازنطینی زمانہ میں بالترتیب Boitinos اور Dioikitis کہتے تھے۔ عون؛ خراج وغیرہ کے وصول کرنے میں خلیفہ کی مدد کرتا اور قسطال خلیفہ کے لئے خزانچی کا کام انجام دیتا تھا۔ محکمہ مال میں ان ملازموں کے علاوہ دوسرے قسم کے اشخاص مثلاً سیکرٹری، محرر وغیرہ کا ذکر ہم کو کہیں نہیں ملتا۔

اسلامی عہد حکومت کے اوائل میں خلیفہ، عون اور قسطال کے عہدے مسلمانوں کے علاوہ عیسائیوں کو آزادی کے ساتھ ملجاتے تھے۔ لیکن جب خلیفہ عبدالملک کا زمانہ آیا تو انہوں نے اس امر میں کچھ ترمیم کی جس کی بنا پر عیسائیوں کیلئے خلیفہ اور عون ہونا بہت زیادہ مشکل بلکہ محال ہوگیا۔ ممکن ہے کہ ایک زمانہ کے بعد قسطال کا عہدہ بھی حاصل کرنا عیسائیوں کے لئے غیر ممکن ہوگیا ہو۔ لیکن ۹۰ھ سے لیکر ۱۰۰ھ تک کے کتبات میں عیسائی قساطیل کے نام مثلاً اسحاق بن سمعون القسطال، یونس بن کیل القسطال، قورنل قسطال وغیرہ وغیرہ ملتے ہیں۔

زمانہ دراز کے بعد پرانے نظام میں بہت زیادہ تغیر و تبدل پیدا ہوگیا۔ بنوامیہ کے آخری دور میں مصر میں عامل خراج بجائے متعدد ہونے کے ایک ہوتا تھا جو صدر مقام قسطاط (یا بلبیس) میں رہتا تھا۔ قسمتوں کا حاکم خراج خلیفہ اور ضلعوں کا حاکم خراج عون ہوتا تھا۔

ناظرین اس مذکورہ بالا نظام ملکی سے خود ہی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مقوقس کس قسم کے عہدہ پر سرفراز رہا ہوگا۔ خود مختار بادشاہ ہونا تو درکنار، پورے ملک کا یا اس کے کسی خاص صوبہ کا اصالتاً گورنر ہونا بھی اس کے لئے غیر ممکن تھا۔ کیونکہ یہ عہدہ جیسا کہ ہم ابھی بیان کرچکے ہیں۔ محض یونانیوں اور رومیوں کو ملتا تھا۔ ہاں محکمہ مال میں مقوقس کے لئے کسی قسم کا امتیاز حاصل کرنا ممکن تھا۔ کیونکہ اس محکمہ میں قبطی بھی ملازم ہوسکتے تھے۔

چونکہ قصص اور افسانہ اور تاریخی روایتوں میں لوگوں نے مقوقس کے جاہ و عظمت کی بہت ہی شاندار تصویر کھینچی ہے۔ اس وجہ سے ہمیں بھی اس تحقیق کے موقعہ پر مصر میں اسلامی حملہ کے وقت مقوقس کا اقتدار اسی قسم کا سمجھنا چاہیئے جو تاریخی نظام ملکی کے لحاظ سے قرین قیاس ہو۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اونچے سے اونچا ہو۔ اس بنا پر ہم مقوقس کو محکمہ مالیات کا سب سے بڑا حاکم یعنی پیگارک سمجھیں گے اور پیگارک بھی اس قسم کا جو ایک قسمت کا نہیں بلکہ پورے ایک صوبہ کا خراج و عشر وغیرہ وصول کرتا رہا ہو۔ اور علاوہ خراج وغیرہ وصول کرنے کے وہ عارضی طور پر نظم و نسق یعنی گورنری کا کام بھی انجام دیتا رہا ہو۔ کیونکہ جیسا کہ ہم پیشتر بیان کرچکے ہیں۔ قیصر کبھی کبھی یونانی یا رومی شخص کے نہ ملنے کی حالت میں قبطی عامل خراج کو عارضی طور پر نظم و نسق کا بھی کام سپرد کردیتا تھا۔ اسلامی حملہ کے وقت عمرو بن العاص اور مقوقس کے درمیان جو واقعات ظہور پذیر ہوئے تھے وہ واضح طور پر اس بات کے ثبوت ہیں کہ مقوقس کو اس وقت سیاست اور نظم و نسق کے امور میں بھی دخل تھا۔ اپنے حکم سے فوجیں مع کمانڈر کے غنیم کے مقابلہ کو بھیجنا۔ صلح کی درخواست کرنی اور اس کی شرائط کو طے کرنا ان سب کاموں کو وہ حاکم ہرگز نہیں انجام دے سکتا جو محض مالیات کا نگراں ہو۔

مقوقس کے عہدہ کی بابت غلط فہمی کیونکر پیدا ہوئی

مقوقس کا اقتدار اگرچہ اسلامی حملہ کے وقت انتہائی عروج پر تھا۔ لیکن پیشتر اس کی یہ حالت نہیں تھی ابتدا میں وہ قیصر کی جانب سے محض ایک قسمت کا پیگارک تھا اور مختلف دور میں بازنطینی گورنمنٹ اس کا تبادلہ مصر کی مختلف قسمتوں میں کرتی رہی۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب ۶۲۸ء میں اس نے پیغمبر عرب کے پاس ایک لونڈی ماریہ قبطیہ کو بھیجا اور اس طرح ان سے دوستانہ تعلقات پیدا کیئے۔ اس وقت وہ اسکندریہ کا عامل خراج تھا۔ حاطب بن ابی بلتعہ جن کو آنحضرتؐ نے مقوقس کے پاس بھیجا تھا۔ اگرچہ مقوقس کے مرتبہ و منصب کی کامل شناخت نہ کرسکے۔ لیکن انہوں نے اس کو اسکندریہ ہی میں پایا تھا۔ "حسن المحاورہ" جلد اول میں یہ حدیث موجود ہے "یحیی بن عبدالرحمٰن بن حاطب عن ابیہ عن جدہ قال بعثنی رسول اللہ صلعم الی المقوقس ملک الاسکندریہ۔"

غالباً پہلی غلط فہمی بعض عرب مورخین کو اسی حدیث کی بنا پر ہوئی۔ حدیث مختلف الفاظ کے ساتھ مروج تھی۔ "ملک الاسکندریہ" کے علاوہ بعض روایت "صاحب الاسکندریہ" اور بعض میں "صاحب خراج الاسکندریہ" کی صفت مقوقس کے لئے استعمال کی گئی ہے

لیکن ان مورخین نے اس اختلاف روایت کی تحقیق تو کی نہیں محض... "ملک الاسکندریہ" کا لفظ لیکر اڑ گئے اور مقوقس کو اسکندریہ کا ایک مستقل بادشاہ سمجھنے لگے۔ حتیٰ کہ اسلامی حملہ کے وقت میں جبکہ مقوقس کا تبادلۂ اسکندریہ سے شہر مصر (بابلیوں) کو ہو چکا تھا اس وقت بھی ان لوگوں نے اس کو "ملک الاسکندریہ" ہی کے لقب سے پکارا۔ اس فاش غلطی میں متاخرین کے زمرہ میں نوبی جیسے اشخاص بھی مبتلا ہیں متقدمین اگرچہ مقوقس کو بادشاہ سمجھنے کی غلطی سے مبرا نہ رہ سکے۔ لیکن انہوں نے اسقدر احتیاط بے شک کی کہ اسلامی حملہ کے وقت مقوقس کو اسکندریہ کا بادشاہ کہنے کے بجائے "ملک مصر" کے لقب سے پکارا (بلاذری) اس مصر سے ان لوگوں کی مراد یقیناً ملک مصر کی وہ مشہور جگہ تھی جو اس زمانہ میں "شہر مصر" کے نام سے موسوم تھی اور جس کو رومی بابلیون کہتے تھے۔ لیکن زمانہ مابعد میں جب لوگوں نے ان کی تصانیف کا مطالعہ کیا تو غلط فہمی کی بنا پر مصر کا مفہوم پورا ملک مصر سمجھا اور مقوقس کو پورے ملک مصر کا خود سر بادشاہ خیال کرنے لگے۔ اس طرح ان لوگوں نے ایک فاش غلطی پہ دوسری فاش غلطی کا اضافہ کیا۔ بعض لوگوں نے حاطب ابن ابی بلتعہ کی حدیث کی تاویل یوں کی ہے۔ کہ مقوقس اصل میں پورے ملک کا بادشاہ تھا۔ لیکن چونکہ اسکندریہ اس زمانہ میں مصر کا مرکزی شہر تھا اور بادشاہ کو جس طرح ملک کی طرف منسوب کر کے فلاں ملک کا بادشاہ کہتے ہیں۔ اسی طرح مرکزی شہر کی طرف بھی منسوب کر کے فلاں شہر کا بادشاہ کہہ سکتے ہیں۔ اس بنا پر صحابیؓ نے مقوقس شاہ مصر کو "ملک اسکندریہ" کہہ دیا۔ یہ تاویل اپنی جگہ پر بہت ہی چست و مضبوط ہے۔ لیکن مصر کا وہ یقینی ملکی نظام جس کو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ اس کو مسترد کر دیتا ہے۔ کیونکہ مقوقس جب قیصر روم کا ماتحت تھا تو اس کے بادشاہ ہونے کے کیا معنی؟

عرب مورخین میں سے ان مستند ہستیوں نے جو مقوقس کو خود سر بادشاہ خیال نہیں کرتیں۔ دو مبہم لفظ۔ عامل "مصر" اپنی تصانیف میں استعمال کیا ہے۔ جن کے معنی سمجھنے میں لوگوں نے بہت غلطی کی ہے ان کی کتابوں میں مقوقس کے بارے میں لکھا ہے۔ کہ وہ مصر کا عامل تھا۔ سب نو سب رینک صاحب جیسے واقف آدمی نے بھی جن کے پیش نظر ابن عبدالکریم کی تاریخ تھی۔ اس کا مفہوم یہی سمجھا کہ مقوقس (عربوں کے خیالات کے لحاظ سے) قیصر روم کی جانب سے پورے ملک مصر کا گورنر جنرل تھا۔ مجھے ابن عبدالحکیم جیسے مستند شخص سے اس بات کی توقع ہرگز نہیں کہ ان کی مراد ان الفاظ سے وہی رہی ہوگی جو رینک صاحب نے سمجھا۔ کیونکہ یہ الفاظ۔ عامل اور مصر مختلف معانی میں استعمال ہوتے ہیں۔ عامل مورخین کی تصانیف میں بالعموم گورنر کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن بعض اوقات اس لفظ سے وہ حاکم بھی مراد ہوتا ہے۔ جو خراج وصول کرتا ہو۔ اور جو بالتخصیص "عامل خراج" کہلاتا ہے۔ اسی طرح مصر کے بھی مختلف مفاہیم ہیں۔ بعض وقت اس کا اطلاق پورے مصر پر اور بعض وقت اس خاص شہر پر ہوتا ہے جہاں آجکل فسطاط آباد ہے اور جو پرانے زمانہ میں بابلیون کہلاتا تھا۔

لفظ عامل سے مراد ان مورخین نے یقیناً "عامل خراج" لیا تھا۔ کیونکہ بعض عربی کتابوں میں مقوقس کو تخصیص کے ساتھ "عامل خراج" ہی کہا گیا ہے۔ ایڈیٹ جیس (Encyclopaedia) جلد دوم میں ہے۔ "وکان العامل علی الخراج بمصر المقوقس من قبل ہرقل الملک" علیٰ ہذا القیاس ان مصنفین کی مراد لفظ مصر سے "ملک مصر" نہیں تھی بلکہ وہ خاص شہر جس کا نام اس زمانہ میں مصر اور بیشتر بابلیون تھا۔ ان مصنفین کا مقصد اس بات کو بیان کرنا تھا کہ مقوقس، ہرقل کی جانب سے شہر مصر اور اس کے گرد و پیش کے مضافات کا "عامل خراج" تھا۔ اگرچہ اس مدعا کے اظہار کے لئے ان مصنفین نے ناکافی الفاظ استعمال کیے۔ لیکن بعض عربی تاریخوں میں ہم کو اس قسم کی عبارت ملتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ "مصر" سے ان لوگوں کی مراد شہر مصر یعنی بابلیون تھی چنانچہ المکیس صفحہ ۲۹ میں سطور ہے۔

"وکان المقوقس عاملا علی مصر	مقوقس ہرقل کی جانب
عن جہۃ ھرقل فاجتمع مصو د ؟	سے مصر کا عامل تھا۔ وہ
کابر القبط وصالحوا عمرو بن العاص	اور قبط کے بڑے بڑے
علی ان یودوا الجزیۃ فلما تحقق	سردار اکٹھے ہوئے اور
الروم الذین بمصر انفاقہم تصالحوا	عمرو بن العاص سے اس
الی الاسکندریۃ وتحصنوا فیھا	شرط پہ صلح کر لی کہ جزیہ

دیں گے۔ جب مصر کے رومیوں کو معلوم ہوا کہ ان لوگوں نے متفق ہو کر صلح کر لی تو وہ بھاگ کر اسکندریہ گئے اور وہاں پناہ لی۔"

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ مقوقس کا دائرہ اقتدار پورے ملک مصر پر نہیں تھا۔ کیونکہ اگر پورے ملک پر تھا تو پورے ملک میں اسکندریہ بھی شامل ہے۔ اگر مقوقس نے تمام ملک مصر کی جانب سے صلح کی اور سب نے اس صلح کو تسلیم کر لیا۔ تو کیا اسکندریہ ملک سے خارج تھا

کہ اس نے تسلیم نہیں کیا اور رومیوں نے وہاں بھاگ کر پناہ لی؟ علاوہ بریں عبارت کے اس ٹکڑے سے کہ "مصر کے رومی بھاگ کر اسکندریہ میں آئے" کیا معنی ہوں گے؟ کیا اس کا یہ مفہوم ہے کہ پورے ملک مصر کے رومی بھاگ کر اسکندریہ میں پناہ گزیں ہوئے؟ ملک مصر اس زمانہ میں رومیوں کے قبضہ میں تھا اور اس کی رومی آبادی اگرچہ قبطیوں کی بہ نسبت بیسیوں گنا کم تھی لیکن جب بھی ملک کے رومیوں کی تعداد اتنی تھی کہ اگر یہ سب لوگ بھاگ کر اسکندریہ جیسے چھوٹے شہر میں آتے تو میرے خیال میں ان تمام رومیوں کو اس کے محدود رقبہ میں کھڑے ہونے کی بھی جگہ نہ ملتی۔

کلکشندی نے مقوقس کے وصول کردہ خراج کی جو مجموعی رقم اپنی تاریخ میں لکھی ہے وہ بھی اس بات کو صاف صاف ثابت کرتی ہے کہ مقوقس کا دائرۂ اقتدار محض شہر مصر اور اس کے گرد و پیش کے مضافات پر تھا ۔ کلکشندی لکھتا ہے کہ مقوقس ہر سال ۰۰۰ ،۲۰ دینار قیصر روم کو بھیجتا تھا ۔ مصر دنیا کے زرخیز ترین ممالک میں شمار کیا جاتا ہے۔ کیا اس پورے ملک سے کل ۰۰۰ ،۲۰ دینار کا خراج رعایا سے وصول ہوتا تھا؟ ہرگز نہیں! بلکہ یہ خراجی رقم اگر شہر مصر اور اس کے مضافات کی بیان کی جائے تو البتہ قرین قیاس ہے۔

لفظ مقوقس کی تحقیق

اگرچہ وہ نامور شخص جس سے مسلمانوں کو فتح مصر کے موقعہ پر سابقہ پڑا ۔ جریج بن مینا کے نام سے موسوم تھا ۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ شخص اپنے علم جریج کے بجائے مقوقس کے نام سے کیوں مشہور ہو گیا؟ تمام عرب اس شخص کو مقوقس بضم میم ۔ و بکسر قاف ثانی پکارتے ہیں ۔ بعض لوگ جن میں رینگ صاحب بھی ہیں ۔ غلطی سے اس لفظ کا تلفظ مقوقس ۔ بفتح قاف ثانی کرتے ہیں لیکن صحیح یہ ہے کہ قاف ثانی مکسور ہے ۔ یوں تو آج تک یہ سوال کسی نے بھی حل نہیں کیا ۔ کہ اگر یہ لفظ علم نہیں تو کیا چیز ہے؟ بعضوں نے بیشک اس کو لقب تسلیم کیا ہے ۔ لیکن یہ نہیں بتلایا کہ جریج ابن مینا کو کس بنا پر یہ لقب ملا؟ اس پر بٹلر صاحب سوانح جلد ۳ ص ۲۶۵۰ میں تحریر فرماتے ہیں ۔ کہ "چونکہ مقوقس عربی زبان میں ایک قسم کے کبوتر کو کہتے ہیں ۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ عربوں نے جریج ابن مینا کو بنظر حقارت اس نام کے ساتھ موسوم کیا تھا ۔ کیونکہ لوگ عام طور پر حقارت کے موقعہ پر اشخاص کو جانوروں کے نام کے ساتھ پکارتے ہیں۔" پروفیسر ڈی گیج صاحب فرماتے ہیں کہ یہ لفظ (مقوقس) کسی ایسے یونانی یا رومی لفظ کی تعریف ہے جو جریج ابن مینا کے لئے منصبی لقب کے طور پر مستعمل تھا۔"

عبدالرحمٰن ناصر اصلاحی

غزل

بتلاش منزل بتگری میں عبث نہیں تگ و تاز میں
کہ حقیقتوں کا سراغ بھی مجھے مل گیا ہے مجاز میں

مری خامشی سے سمجھ رہا ہے کہ مجھ میں تاب فغاں نہیں
تجھے کیا خبر کہ مزا ہے کیا مرے ضبطِ سینہ گداز میں

تو نہ عذر خواہی جرم کر، مری چشم تر پہ بھی کر نظر
کہ جھلک رہی ہیں ندامتیں مرے اشکِ عذر طراز میں

شب انتظار نے بارہا مری آرزوں کا خون کیا
میں فریب خوردہ پھر آ رہا ہوں فریب وعدۂ ناز میں

نہ خدا کے واسطے آج پوچھ شب فراق کی سختیاں
کہ بھری ہیں زہر کی تلخیاں مرے شکوہ ہائے دراز میں

نہ اٹھا مجھے نہ اٹھا مجھے کوئی کہہ دے فتنہ حشر سے
کہ تڑپ تڑپ کے سکوں ملا ہے لحد کی خلوت راز میں

تو سمجھ سکیگا نہ ہمنشیں کہ دقیق معنیٔ حسن ہیں
مرا منتہائے نظر ہے جو وہ ادا میں ہے، نہ وہ ناز میں

میں بتا سکونگا نہ تا سحر ہمہ تن اگرچہ زباں بنوں
کہ بہ رنگ شمع ہے ہم جاں مرے راز زہرہ گداز میں

یہ کلام صادق خستہ حال حدیث راز و نیاز ہے
ہے مرا فسانۂ عاشقی مرے حرف نکتہ نواز میں

صادق (منشی فاضل)

کامیاب مُصنّف

میں اکثر بعض لوگوں سے یہ سُنتا ہوں - کہ فلاں مُصنّف کامیاب ہے - اور فلاں ناکامیاب - مَیں نہیں جانتا کہ اُن کا معیار کامیاب مُصنّف کے لئے کیا ہے - لیکن یہ ضرور ہے کہ وُہ اکثر جن لوگوں کو کامیاب مُصنّف خیال کرتے ہیں - میری نگاہوں میں وُہ کامیاب مُصنّف نہیں کہلائے جا سکتے - اس کی وجہ یہ ہے، کہ میرا معیار کہ کون مُصنّف کامیاب ہے اور کون ناکامیاب اُن سے بالکل مختلف ہے ٭

میرے خیال میں ہر کامیاب مُصنّف کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کی نگاہ "دور رس" ہو، تاکہ وُہ معمولی سے معمولی چیزوں کو ایک خاص اہمیّت دے کر قاری کی نگاہوں میں اُن کو جاذبِ توجہ اور مسرّت انگیز بنا دے - اور انسانی فطرت جن چیزوں کو محض غیر ضروری یا معمولی سمجھ کر نظر انداز کر دیتی ہے، اُن کی اہمیّت سے روشناس ہو کر اُن میں دِلچسپی لے ' کسی مصنّف کا بذات خود فاضل ہونا اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ وہ کامیاب مُصنّف بھی ہے - گو یہ نظریہ غلط طور پر لوگوں میں سرایت کر چُکا ہے - حالانکہ کامیاب مصنف کہلانے کے حقدار کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وُہ فاضل ہی ہو، بلکہ جو چیز اُس کے لئے لابُدی ہے - وُہ یہ ہے کہ وُہ "دور رس" ہو، اور اس کے ساتھ ہی رجائیت پسند بھی! تاکہ اُس کو پڑھنے والے زندگی میں ایک ہم آہنگی، مسرّت اور شادمانی محسوس کر سکیں ٭

"کتابیں" کسی مُصنّف کو کامیاب یا ناکامیاب بنانے کا ایک بہترین ذریعہ ہیں - اس لئے ہر مُصنّف کا یہ فرض ہونا چاہئے کہ وُہ کتابوں کے ذریعے رجائیت کی تعلیم دے، اور اپنی تصانیف میں اس قدر دِلچسپی پیدا کر دے کہ قاری چند لمحوں کے لئے اُس کے خیالات میں سراپا گم ہو جائے اور دُنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر ہو جائے، مگر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے - کہ ایسی "دِلچسپی" مُصنّف اپنی کتابوں میں کیونکر پیدا کر سکتا ہے - اس کے جواب میں مَیں یہ عرض کروں گا کہ ایسی دلچسپی پیدا کرنے کے لئے ہر مصنّف کو چاہئے کہ وُہ اپنی کتاب میں دو متضاد عناصر کی کشمکش پیدا کر دے - کیونکہ یہ دیکھا گیا ہے کہ اگر کوئی مُصنّف اس راہ سے ہٹ کر کوئی اور راستہ تلاش کرتا ہے - تو وہ بھٹک جاتا ہے، اور قاری اُس کی تصنیفات کو رطب ویابس سمجھ کر اُن کی صُورت دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا - چنانچہ ناول اِسی لئے زیادہ دِلچسپ ہوتے ہیں - کہ اُن میں کیریکٹروں کی کشمکس کا خاکہ کھینچا جاتا ہے - اور ناول نگار بہ یک وقت کئی کیریکٹر پیدا کر کے قاری کی توجہ اپنی جانب مائل کر لیتا ہے - یہی دِلچسپی ہمیں "سفر" کی کتابوں میں نظر آتی ہے، جو عجیب و غریب ماحول اور "حرکت" سے پُر ہوتی ہیں ٭

کسی مُصنّف کو کامیاب کہہ لینے سے قارئین کو یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ وُہ ہر لحاظ سے کامیاب ہے - یعنی اُس کی کتابیں طرزِ تحریر، زبان یا واقعات ایسی غلطیوں سے پاک ہیں، بلکہ یہ خامیاں اُس کامیاب مُصنّف میں بھی پائی جا سکتی ہیں - یہ درست ہے کہ یہ خامیاں بہُت بڑی خامیاں ہیں - لیکن یہ تمام خامیاں مُصنّف کی خوبیوں کے آگے ہیچ نظر آتی ہیں - اور سب سے بڑی خوبی جس کے آگے یہ غلطیاں کچھ وقعت نہیں رکھتیں، وُہ وہی ہے، جو مَیں پہلے عرض کر چُکا ہوں، یعنی کتاب میں ایسی "دِلچسپی" پیدا کرنا ——— کہ قاری چند لمحوں کے لئے دنیا و مافیہا سے یکسر بے خبر ہو جائے ٭

اس کے برخلاف ایک ایسا مُصنّف جس کی کتابیں طرزِ تحریر، زبان یا واقعات کے لحاظ سے صحیح اور درست ہوں - لیکن اپنے اندر اتنی صلاحیت ——— اِتنی دلچسپی نہ رکھتی ہوں، کہ قاری کی توجہ کو اپنے میں جذب کر لیں - تو پھر آپ ہی بتائیں، کہ ایسا مُصنّف، کیونکر کامیاب کہلایا جا سکتا ہے ٭

ہر مُصنّف کا یہ اولین فرض ہونا چاہئے کہ وُہ اپنی کتابوں میں اچھی خاصی دِلچسپی پیدا کرے - اور رجائیت کے عنصر کو غالب رکھنے کی کوشش کرے - کیونکہ مطالعہ کوئی فرض نہیں

ہے - بلکہ ہر شخص کو اس بات کا پورا اختیار ہے - کہ وہ جونسی کتب چاہے اپنے زیرِ مطالعہ رکھے - اِس لحاظ سے غیر دلچسپ کتابیں کون پڑھے گا ؛ دوسرے "قصرِ ادب" کی بنیاد دُنیا میں اِس لئے رکھی گئی ہے - کہ انسانی زندگی سے بوجھ ہلکا ہو جائے - اور انسان چند لمحوں کے لئے خاموش گھریلو زندگی، ناکامیوں ——— اور تاریک مستقبل سے بندھی ہوئی اُمیدوں سے رہائی حاصل کرے ٭

(ماخوذ از آگسٹائن برل)

آثر چکوالی بی-اے

غزل

وُہی زندگی موردِ غم بنا دی ۔۔۔ ترے حسن کی جس نے قیمت بڑھا دی

ملی عشق کو اور شہرت جہاں میں ۔۔۔ مری خاک جب سے ہوا نے اُڑا دی

تغافل میں ڈوبی ہے کچھ ایسی دُنیا ۔۔۔ نہیں کوئی سُنتا نفس کی منادی

مری آتشِ دل تماشا ہے ان کا ۔۔۔ لگا دی بجھا دی، بجھا دی لگا دی

بجز غم نہ کچھ عشق میں ہاتھ آیا ۔۔۔ لٹانے کو ہم نے جوانی لٹا دی

بھلا ہو اجل کا پڑا سو رہا ہوں ۔۔۔ مری اس نے کشتی کنارے لگا دی

وُہ اب پوچھتے بھی نہیں کون ہوں میں ۔۔۔ متاعِ خودی جن کی خاطر لٹا دی

مرے دِل کی دُنیا پہ قدرت ہے اسکو ۔۔۔ اسی نے اُجاڑی، اسی نے بسا دی

ستم مہ وشوں کا کرم بن گیا ہے ۔۔۔ کہ جس پر بھی ٹوٹا اسی نے دُعا دی

نہ دیں داد رہبر یہ مرضی ہے ان کی
غزل اک سُنانی تھی ہم نے سُنا دی

رہبر بی-اے

معراجِ محبت ۱؎

دو عاشق جسدم ملتے ہیں، جذبات میں طوفان اُٹھتا ہے،
دل تھر تھر کانپنے لگتا ہے "لب کھل کھل کر رہ جاتے ہیں

ہیر اور رانجھا ــــــ کیا خوب تصویر ہے! یہ چھوٹا سا مرقع، بے لوث، آزاد، دہقانی زندگی کا مظہر ہے۔ حسن و عشق کی داستان نے اسے اور بھی رنگین بنا دیا ہے۔

محبت کی دُنیا کیسی حسین اور خموش ہے! رانجھا ــــــ ہزارے کا رئیس زادہ! ایک چرواہے کی زندگی میں مطمئن کھڑا ہے۔ ہیر ــــــ اُس کی آرزو، اس کی تمنا ــــــ اُس سے ملنے کے لئے آئی ہے۔ دو محبت سے سرشار روحیں ایک درخت کے نیچے یکجا ہیں۔ یہ درخت، تنگدل انسانوں، رسمیات کے غلاموں سے کتنے بلند تر ہوتے ہیں۔ اس کے سائے نے انہیں حاسد فلک کی سرپرستی سے بے نیاز کر دیا ہے۔ ان کے چہروں سے سکون و اطمینان مترشح ہے۔ ان کے خاموش لب تکلم سے زیادہ فصیح اور لسان ہیں۔ ان کی خامشی میں اعترافِ محبت کی جھلک اور پر کیف روحانی جذبات کا پرتو ہے ؛

ہیر کے احمریں، ملائم اور خمدار لبوں میں پیار کا رس، محبت کا گداز ہے۔ عفت کی پاکیزگی ہے۔ آہ! محبت سے لبریز دل کتنے خموش اور عمیق ہوتے ہیں۔ ہیر کی پُرمعنی خاموشی ایک زبان ہے۔ رنگین و رواں۔ جسے نہ الفاظ ٹکڑے ٹکڑے کر سکتے ہیں، نہ محاورات مغالطہ انگیز بنا سکتے ہیں۔ یہ کانوں کی وساطت کی ممنون نہیں بنتی، بلکہ خود بخود دل میں جا اُترتی ہے ؛

ہیر کی اُوپر کو اُٹھی ہوئی نگاہیں کسی مبہم سوال کا جواب دے رہی ہیں۔ ان کے سامنے کچھ نظمیں ہیں، جنہیں قلم نے ابھی نہیں لکھا، کچھ گیت ہیں، جنہیں ساز نے ابھی نہیں چھیڑا۔ دوسری طرف رانجھے کی جھکی ہوئی نظریں ہیں۔ جن کے دامن میں مصیبتوں، مجبوریوں اور امیدوں کی ایک دُنیا آباد ہے۔ آہ! ہم کوشش کے باوجود بھی اسے نظر انداز نہیں کر سکتے ؛

تصویر کے محبت پرور ماحول میں بادلوں کا رواں دواں قافلہ نفاست اور شعریت کا پورا پورا محافظ ہے۔ اُمنگیں پیدا کرنے والے بادل جب کبھی مشرق کی تپتی ہوئی، خشک کشت زاروں پر چھا جاتے ہیں، تو جی ملہار گانے کو مچلتے ہیں۔ رنجور دلوں میں خوشی کی لہریں اُٹھتی ہیں۔ افسردہ طبیعتوں میں تموّج پیدا ہوتا ہے۔ چرواہوں کا فطری ترنم، سکھیوں کے گیت، ساون کی گھٹاؤں میں سرسبز ہوتے ہیں۔ پپیہے کی پی کہاں، اور کوئل کی کوک بارش کی پھوار سے نکھرتی ہیں۔ پس منظر میں بادلوں کا حسین و جمیل تسلسل تصویر میں رومان نگاری کر رہا ہے ؛

بادل یوں تو روزانہ نظروں کے سامنے آتے ہیں، لیکن اس حسنِ گریزپا کی گرفت فقط ایک چابکدست نقاش کا ہی کمالِ فن ہے۔ وُہ ان میں سے دل کش شکلیں منتخب کر کے تصویر میں اپنے اپنے محل پر نقش کرتا ہے۔ نیلے آسمان پر اُودے اور سفید بادل کیا بھلے معلوم ہو رہے ہیں ؛

بلند، آزاد اور منوہر بادلوں کی چوٹیاں ایک ترچھے خط کے تسلسل میں بنائی گئی ہیں۔ ایسا ہی ایک ترچھا خط، ہیر رانجھے اور درخت کے تنے کی چوٹی کی سیدھ سے بنتا ہے۔ ان سے متشابہ ایک تیسرا خط، گاؤں اور عقبی درختوں کی بلندی کے ملاپ سے بن جاتا ہے۔ یہ تمام ترچھے ہم آہنگ خطوط، تصویر سے باہر ایک نقطے پر جا کر مل جاتے ہیں۔ اِس دل کش موزونیت سے مصوّر نے قدرت کی مختلف النوع چیزوں کو ترتیب و تنظیم کے ایک سلسلے میں پرو دیا ہے۔

رانجھے کی شوخ پگڑی تصویر میں جاذبیت کا مرکز ہے۔ ناظرین کی نظریں پگڑی سے ہٹ کر، درخت کے مضبوط، روشن اور خوبصورت تنے کی طرف بڑھتی ہیں، لیکن آتشیں رنگ کی دستار اُنہیں جلد ہی اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ اب کے ناظرین کی نگاہیں رانجھے کی جھکی ہوئی پلکوں کا جائزہ لے کر ہیر کے زرد دوپٹے سے ڈھنپے ہوئے سر پر آ کر رُک جاتی ہیں، لیکن ہیر کی بلندی کی طرف مائل نظریں، اُنہیں ایک بار پھر رانجھے کی طرف

۱؎ مولوی سعید اللہ صاحب آرٹسٹ کی ایک تصویر کا نام ہے۔

لوٹا دیتی ہیں، اور رانجھا کے غریبانہ لباس اور مبہم زندگی کے خیالات میں کھو جاتی ہیں۔ اگر تبدیلی اور تنوع کا قدرتی جذبہ نظروں کو تصویر کی دوسری چیزوں کی طرف متوجہ کرتا ہے، تو متذکرہ بالا تیکھے خطوط کے ذریعہ یہ بیرونی اجتماعی نقطہ پر پہنچ کر، پھر سے تسلسل خطوط کی بدولت رانجھے کی پگڑی پر آکر جم جاتی ہیں۔ اگر پگڑی آتشیں رنگ کی بجائے کسی اور رنگ کی ہوتی تو اس کی دل کشی کا یہ عالم نہ ہوتا۔ اس لئے کہ آتشیں رنگ دوسرے تمام رنگوں سے زیادہ شوخ ہوتا ہے۔ اس میں سُرخ رنگ کی حدت اور زرد رنگ کی چمک ---- دونوں کا التباس ہے۔

روشنی اور سایہ کے اظہار کے لئے مصور نے تہ در تہ رنگ لگائے ہیں۔ روشن جگہیں رنگ لگاتے وقت خالی چھوڑ دی گئی ہیں۔ محبت سے اُلٹا کر مصور نے "گیلے رنگ" برش سے اُٹھا کر، روشنی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ ایک تہ کے خشک ہونے پر، رنگ کا دوسرا پُچا را (Second coat) دیا ہے، لیکن اس خوبی سے کہ رنگ مُردہ (Dead) بھی ہونے نہیں دیئے۔

تصویر کا نام ہیر رانجھا کے پنجابی قصے سے ماخوذ ہے۔ ہیر روزانہ کسی نہ کسی حیلے بہانے، دوست سے ملنے کے لئے چراگاہ میں جایا کرتی تھی۔ اُس کی ماں، اس بات کی خبر پا کر ایک روز بیٹی کو خاندان کے ناموس اور دوشیزگی کی عصمت کا واسطہ دے کر سمجھانے بجھانے لگی۔ ہیر بے بس صید کی طرح دلیر ہو کر، دلائل میں پناہ ڈھونڈتی ہے۔ ماں سے مخاطب ہو کر کہتی ہے کہ یہ وُہ پاک جذبہ ہے، جس سے خدا کی ذات بھی بری نہیں۔ اس نے اپنے محبوب کو عرش پر بُلایا تھا، اُس کا نام "معراج" تھا اور یہ ہماری "محبت کی معراج" ہے۔

مصور کے مقامی لمس (Local Touches) پنجابی زندگی کے مظہر ہیں، البتہ چہروں میں ہندوستانی آرٹ کا تتبع ہے۔ ان کے علاوہ مصور کا ہر خط، پنجابی تہذیب و تمدن میں رچا ہُوا ہے۔ افرادِ تصویر کے دہقانی لباس پنجابی تمدن کے آئینہ دار ہیں۔ زرد، سبز اور بھورے رنگ کی زمیں، پس منظر کا گاؤں، بھینسیں اور چراگاہ سب پنجابی ہیں۔ رانجھا مقامی چرواہوں کی طرح لاٹھی ٹیکے کھڑا ہے۔ یہ مویشیوں کو روکنے تھامنے اور جنگلی جانوروں سے حفاظت کے لئے پاس رکھی جاتی ہے۔ غرض کہ ہر نقش مقامی رنگ میں رنگا ہُوا ہے۔

پنجابی زندگی کا یہ مرقع، فن کاری کے نقطۂ نگاہ سے بہت بلند مرتبت ہے۔ اس میں رنگوں کی آمیزش اور اجزا کی ترتیب (Composition) بے حد جاذبِ نظر ہیں۔ اگر ذرا گہری نظر سے دیکھا جائے تو مصور ہو یا شاعر، اُس کا پیغام صرف اُس وقت مفید اور جاودانی ہو سکتا ہے، جب وُہ ملکی روایات کا سچا علمبردار ہو۔ ان کو اصل مقامی رنگ میں پیش کرنے کا اہل ہو۔ اُس کا طرزِ بیاں، مخلصانہ اور ہمدردانہ ہو۔

بڑی مسرت کی بات ہے کہ مولوی سعیداللہ صاحب کا یہ شاہکار، ان جملہ صفات کا مجموعہ ہے۔ امسال خالصہ کالج امرت سر کی نمائشِ فنونِ لطیفہ میں آپ کو اس تصویر پر ایک نقرئی تمغہ پیش کیا گیا ہے۔

مصور سے تعارف کے ضمن میں اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ آپ مسٹر بی۔ سی سنیال سابق اسسٹنٹ پرنسپل میو سکول آف آرٹس کے شاگردِ رشید ہیں۔ جن کے تیار کردہ مجسمے اور قدرتی مناظرے کلکتہ، بمبئی، دہلی، شملہ اور لاہور کی نمائشوں میں کئی بار خراجِ تحسین وصول کر چکے ہیں۔ اور جن کی متعدد تصاویر وائسریگل ہاؤس میں آویزاں ہیں۔ مولوی سعیداللہ کی تصویر ان کے فنی ذوق اور میلانِ طبیعت کا پتہ دے رہی ہے۔

تصویر کے مجموعی مطالعہ کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ کہ اس کی دل کشی کے دو راز ہیں۔ پہلے مضمون کا انتخاب، دوسرے اشیا کی ترتیب۔ اس لئے تصویر فنی اور تخیلی ---- دونوں پہلوؤں سے مکمل ہے۔

یہ چھوٹا سا مرقع، یہ رنگین حکایت کی رنگیں سی مورت، ناظرین کے دماغ پر محبت کے نقوش اُبھارتی ہے۔ یہ ہمارے جذبات سے اس طرح کھیلتی ہے۔ جس طرح مغنیہ کی حسین انگلیاں ساز کے نازک تاروں سے۔

خورشید
(بی۔ ایس۔ سی)

دُور۔ خوفناک پہاڑوں میں۔ اس دُنیا سے علیحدہ۔ جہاں قُدرت ڈراؤنی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ عاصم نامی ایک شخص رہتا تھا۔ جسے بنی آدم سے نفرت تھی۔

عاصم نے اپنی جوانی کے دن بنی نوع انسان کے ساتھ گزارے۔ انسان کی خوشیوں میں حصّے لئے۔ سب سے محبت سے پیش آیا۔ مگر اس کی ہمدردی نے ایک دن اُسے تمام دولت سے محروم کردیا۔ کوئی فقیر اس کا دروازہ کھٹکھٹا کر اور کوئی تھکا ماندہ مسافر اس سے مل کر اس کی نوازش سے خالی نہ گیا تھا۔ اس نے بھلائی کرنا اس وقت چھوڑی۔ جب اس میں بھلائی کرنے کی طاقت ہی نہ رہی۔

اب حالت یہ ہوگئی۔ کہ جن لوگوں کی اس نے آڑے وقت میں مدد کی تھی۔ ان سے وہ خود امداد کا طالب ہونے لگا۔ لیکن ناشکری دُنیا نے اس سے التفات نہ کیا۔ اس واقعہ نے اس کی آنکھیں کھول دیں۔ اور وہ دُنیا کو کسی اور نگاہ سے دیکھنے لگا۔ اُسے دُنیا میں ہزاروں ایسے گناہ ہوتے دکھائی دینے لگے۔ جن کا پہلے اس کو علم تک نہ تھا۔ وہ جدھر بھی گیا۔ دُنیا کی ناشکرگزاری اور بے وفائی نے اُس کی مایوسی میں اضافہ کیا۔ آخر کار تنگ آکر اس نے ارادہ کر لیا۔ کہ وہ اس دنیا میں ہرگز نہ رہیگا۔ وہ دُنیا جو اس کی ہمدردی کی قیمت نفرت میں ادا کررہی تھی۔ وہ ہرگز رہنے کے قابل نہ تھی۔ وہ چپ چاپ ایک طرف نکل گیا۔ تاکہ تنہائی میں بیٹھ کر سوچا کرے۔ اور صرف ایک ایماندار دل سے گفتگو کیا کرے۔ یعنی صرف اپنے دل سے۔

صرف ایک غار تھی۔ جو کہ اس کو تمام خطرات سے محفوظ رکھتی تھی۔ پھل اس کی خوراک تھے۔ جو کافی دوڑ دھوپ کے بعد دستیاب ہوتے تھے۔ اس طرح وہ تمام دُنیا سے کنارہ کش ہو کر بسر کر رہا تھا۔ اس کا اکثر وقت غور و فکر میں گزرتا تھا۔ دامنِ کوہ میں ایک جھیل تھی۔ جس میں خوفناک پہاڑ کا عکس پڑ رہا تھا۔ وہ اکثر اس جگہ آتا۔ اور حسرت بھری نگاہوں سے آسمان کی طرف دیکھتا۔ "قدرت کس قدر خولصورت ہے"۔ وہ اکثر کہا کرتا۔ قدرت کے وحشتناک مناظر بھی کس قدر حسین ہیں۔ کوہ و میداں کا مقابلہ کیا اچھا نظر آرہا ہے۔ کائنات کا ذرّہ ذرّہ حسین۔ خوبصورت اور فرحت بخش ہے لیکن اِنسان ... ... انسان ایک بدنما داغ ہے۔ قدرت کے دامن پر، خدا کی پیدا کردہ اشیا میں ہر چیز مفید ہے۔ طوفان اور آندھیوں تک میں فائدے مضمر ہیں۔ مگر منحوس اور ناشکرگزار انسان کی ہستی صرف بے سود ہی نہیں۔ بلکہ مضرت رساں بھی ہے۔ اس کے اعمال خود قادرِ مطلق کو پشیمان کرتے ہیں۔ آہ میں اِنسانوں کی نسل میں پیدا ہی کیوں ہُوا۔ میرے خدا تُو نے مجھے اس طرح اندھیرے۔ شک اور مایوسی میں کیوں مُبتلا کر رکھا ہے۔

ابھی عاصم نے مایوسی کا لفظ مشکل سے ادا ہی کیا تھا۔ اور فرطِ یاس سے وہ جھیل میں کُود جانے ہی کو تھا۔ کہ اسے سطحِ آب پر ایک شخص اُبھرتا ہُوا نظر آیا۔ وہ عاصم کی طرف بڑھا آرہا تھا۔ اس غیر متوقع آمد نے عاصم کو اپنے ارادہ سے باز رکھا۔ وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ اور غور سے آنے والے کی طرف دیکھنے لگا۔

"بنی آدم" ۔ دیو نے کہا۔ "اپنے فضول ارادے سے باز آؤ۔ آسمانی باپ نے تمہارا انصاف دیکھ لیا۔ تمہاری مصیبتوں اور تکلیفوں کو دیکھ لیا۔ اور مجھے اُس نے تمہاری مدد کے لئے بھیجا ہے۔ میرا ہاتھ پکڑ لو۔ اور چپ چاپ میرے ہمراہ چلے چلو۔"

عاصم اپنے رہبر کے ساتھ پانی کی سطح پر چلتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ جھیل کے عین درمیان میں پہنچ گئے۔ یہاں وہ دونو ڈوبنے لگے۔ وہ سینکڑوں گز گہرے اُتر گئے۔ عاصم اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ کہ اُس نے اپنے آپ کو ایک نئی دُنیا میں پایا۔ جہاں آج تک انسانی قدم نہ آیا تھا۔ اُس نے تعجب سے چاروں طرف دیکھا۔ وہاں بھی ایک آفتاب تھا۔ ایک آسمان اور سبز گھاس

سے آراستہ زمین ۔

"میں تمہارے تعجب کی وجہ کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں" دیو نے کہا۔ "لیکن ذرا ہوش میں رہو۔ یہ دُنیا اللہ میاں نے ایک پیغمبر کی فرمائش پہ بنائی تھی۔ جو خود کسی دن انہی شکوک میں مبتلا تھا۔ جن میں تم خود مبتلا ہو۔ اور جن کی وجہ سے تم زندگی سے ہاتھ دھو رہے تھے۔ یہاں کے لوگ تمہارے ہمخیال ہیں۔ وہ تمہاری ہی طرح گناہ سے پاک ہیں۔ یہ زمین تمہاری زمین سے مشابہ ہے۔ مگر اس میں وہ ہستیاں ہیں۔ جو گناہ سے مبّرا ہیں۔ اگر تمہیں یہ دنیا اس دُنیا سے زیادہ پسند آئے۔ تو تم یہاں اپنی زندگی کے باقی ایام گزار سکتے ہو۔ مگر مجھے اپنے ساتھ رہنے کی کچھ عرصہ اجازت دو۔ تاکہ تمہارے توہمات کو میں دُور کرسکوں۔ اور تمہارا تعارف اس سوسائٹی سے کرا دوں۔"

"ایک دُنیا گناہ سے پاک۔ انسانی بداخلاقی سے دُور"۔ عاصم خوشی سے چلّایا۔ "میں تیرا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اے خدا آخر تُو نے میری التجا کو قبول کیا۔ مجھے خوشی۔ آرام۔ سکون دینے کے لئے یہ دُنیا کافی ہوگی۔ ان انسانوں میں زندگی گزارنا کیسی خوش نصیبی ہے۔"

"ان باتوں کو چھوڑو۔" دیو نے کہا۔ "اپنے گرد و نواح کو دیکھو۔ ہر چیز کی ماہیت کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ اور اپنے مشاہدے کا نتیجہ مجھ تک پہنچاؤ۔ جہاں دل چاہے چلو۔ میں تمہارے ہمراہ رہونگا۔ اور تمہیں سب کچھ بتلاؤنگا۔"

عاصم اور اس کا ساتھی خاموشی سے کچھ دیر چلتے رہے۔ عاصم متعجب تھا۔ بہت سے مشاہدے کے بعد اُسے معلوم ہُوا۔ کہ یہ دُنیا بھی اُس کی دُنیا سے مشابہ ہے۔ اور اس میں قدیم وحشت کے آثار باقی ہیں۔

عاصم چلّایا۔ "یہ جانور دوسرے جانوروں کا شکار ہو رہے ہیں۔ اگر میرے امکان میں ہوتا۔ تو اس نقص کو رفع کر دیتا۔"

"تمہاری ہمدردی ان حقیر جانوروں کے حق میں قابل تعریف ہے"۔ دیو نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس لحاظ سے یہ دُنیا تمہاری دُنیا سے ملتی جُلتی ہے۔ ایک جانور دوسرے جانور کی زندگی پر گزارا کرتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو۔ تو ان کی کثیر تعداد کو زمین جگہ دینے سے قاصر رہے۔ آپس میں شکار ہو کر ان کی تعداد میں مناسب کمی ہوتی رہتی ہے۔ مگر آؤ ہم وہاں چلیں۔ جہاں انسان رہتے ہیں۔"

جلد ہی انہوں نے جنگل طے کر لیا۔ اور بے گناہ انسانوں کے ملک میں داخل ہو گئے۔ مشکل سے اُنہوں نے جنگل کی حدود طے کی ہونگی۔ جب اُنہوں نے جلدی جلدی قدم اُٹھاتے ہوئے انسان دیکھے۔ عاصم کے چہرے پر خوف سا طاری ہو گیا۔ جب اُس نے گلہریوں کے لشکر کے لشکر دیکھے۔ عاصم چلّایا۔ "خدایا! یہ کیوں بھاگے جا رہے ہیں۔ اتنے حقیر جانوروں سے؟" ابھی یہ فقرہ اُس نے کہا ہی تھا۔ جب کہ اُس نے دو کُتّے ایک آدمی کے پیچھے بھاگتے ہوئے دیکھے۔ "وہ ان کو ہلاک کیوں نہیں کر دیتے؟" اُس نے کہا۔

دیو نے کہا۔ "اب تمہارا رحم ان حقیر جانوروں کے لئے کہاں گیا۔ کیا تمہیں ان جانوروں سے کوئی ہمدردی نہیں؟"

"مجھے اپنی غلطی کا اعتراف کرنا چاہیئے۔" عاصم نے کہا۔ "مجھے اب یقین ہو گیا ہے۔ کہ اس دُنیا میں رہنے کے لئے ہمیں کئی وحوش کو تباہ کر دینا چاہیئے۔ لیکن آؤ کچھ اور دیکھیں۔"

جب وہ آگے بڑھے۔ تو دیکھا۔ نہ کوئی گھروں کے نشاں تھے اور نہ کوئی شہر۔ لوگ معمولی جھونپڑوں میں زندگی بسر کر رہے تھے۔

"یہاں نہ کسی مصوّر کا کام نظر آتا ہے اور نہ ہی کسی نقاش کا۔ اور کچھ دیکھنے سے پہلے تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مگر جس چیز کو عقل کہتے ہیں۔ یہاں وہ کہاں ہے؟" عاصم نے پوچھا۔

"عقل ... ... عقل ایک ایسی چیز ہے۔ جسے یہاں کوئی نہیں جانتا۔ عقل خود غرضی سکھاتی ہے۔ اس لئے اس کی یہاں ضرورت ہی کیا ہے؟ ہر شخص دوسرے کی بھلائی کرتا ہے۔ اور دوسرے سے نیکی کی اُمید رکھتا ہے۔ اگر عقل ہو۔ تو یہ تمام کھیل بگڑ جائے۔"

"یہ درست ہے۔" عاصم نے کہا۔ "لیکن یہاں ہر متنفس تنہائی پسند معلوم ہوتا ہے۔ انجمن اور محفل کا نام تک نہیں۔"

"یہ صحیح ہے۔" دوسرے نے جواب دیا۔ "لیکن انجمنیں یا محفلیں محض خوف یا غرض کی وجہ سے بنتی ہیں۔ یہاں لوگوں کو ایک دوسرے سے ڈرنے کا کوئی خدشہ نہیں۔ اور نہ ہی کوئی انجمنیں بنا کر مطلب براری کی ضرورت ہے۔ یہاں مساوات ہے۔"

"اچھا -" عاصم نے کہا -" اگر مجھے یہاں وقت گزارنا ہے - اور مصوّری ـ عقل اور دوستی سے محروم رہنا ہے - تو کم از کم یہ تو ہو - کہ مجھے ایک موافق رفیق مل سکے - جو مجھے اپنے خیالات سے واقف کرے - اور میں اُس کو اپنے خیالات بتاؤں -"

"یہ کس لئے ؟" اُس نے کہا "یہ سب لوگ تمہارے رفیق ہیں - کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح کیوں دی جائے ؟"

عاصم نے کہا "تاہم لوگ یہاں خوش ہونگے - خدا کے دیئے پر صابر ہیں - نہ ہی وہ زیادہ کے لئے لالچ کرتے ہیں - اور ایک دوسرے کی مدد کا سب کو موقع ملتا ہے -" عاصم نے یہ الفاظ ابھی مشکل سے ادا کئے تھے - کہ اس کے کانوں تک کسی درد آشنا کی چیخ و پکار پہنچی - عاصم جلدی اس کی مدد کے لئے پہنچا - اُس نے چیخنے والے کو تپ دق کی آخری منزل میں پایا -" یہ عجب بات ہے -" عاصم نے کہا "انسان گناہ سے پاک ہوتا ہوا بھی اس مصیبت میں مبتلا ہے -"

دیو نے کہا -" تم کو حیران نہ ہونا چاہئے" مریض نے کہا - "یہ کس قدر بے انصافی ہے - کہ لوگوں کے پاس اتنا ہی ہو - جو مشکل سے ان کی اپنی ضروریات کے لئے کافی ہو - ایسی حالت میں وہ دوسروں کی امداد کیسے کر سکتے ہیں ؟"

" ان کے پاس ضرورت سے زیادہ ہونا چاہئے" عاصم نے کہا - "لیکن میں خود اپنی رائے کے خلاف جا رہا ہوں - آہ یہ سب واہمہ ہے - یہاں صبر و شکر کی موجودگی بھی کوئی ثواب نہیں ہے - اُنہوں نے کبھی کسی کی مہربانی کو قبول نہیں کیا - پھر بھی ان میں ایک خوبی تو ہے - کہ ان کو اپنے ملک سے محبت ہے - اور اس سے بڑھ کر کوئی نیکی نہیں۔"

"صبر" اس کے رہبر نے سنجیدگی سے کہا -" اپنی عقل کو دھوکا مت دو - حب وطن کی بنا خود غرضی پر ہے - رحمت الٰہی کے سوا کوئی چیز گناہ سے مبرا نہیں اور رحمت الٰہی یہاں ہے -"

" عجب بات ہے -" مایوس مسافر چلّا اٹھا -" میں کس قسم کی دُنیا میں دھکیلا گیا ہوں - یہاں سوائے برداشت و صبر کے اور کوئی صفت نہیں - اور اس میں بھی وہ ایک وحشی قوم سے زیادہ بڑھے ہوئے نہیں ہیں - یہاں کوئی خوشی - آزادی - رفاقت - عقل - گفتگو - حب وطن اور دُوسری نیکیوں سے واقف نہیں - یوں معلوم ہوتا ہے - کہ گناہ سے ناواقفیت نیکی کو سمجھنے سے بھی قاصر بنا دیتی ہے - اے میرے رہبر! مجھے میری دُنیا میں واپس چھوڑ آ - وہ اللہ کی بنائی ہوئی دُنیا ہزار درجہ بہتر ہے - لاپرواہی - بے اعتنائی - اور نفرت جو میں برداشت کرتا رہا ہوں - وہ سب مجھے گوارا ہیں - قدرتِ الٰہی میں نقص نکالنا محض جہالت ہے - اب میں اپنی اس زندگی کو گناہ سے پاک رکھونگا - اور دُوسروں کو گناہ سے باز رکھنے کی کوشش کرونگا -"

بہ مشکل اُس نے یہ الفاظ ادا کئے تھے - کہ دیو نے ایک خوفناک دھواں سا پیدا کیا - گرد و نواح میں ایک گرج سی پیدا ہوئی - دیو آندھی میں غائب ہو گیا - عاصم حیرانگی سے اپنی خیالی دُنیا کو تلاش کرنے لگا - اب وہ اپنی اصلی دُنیا میں موجود تھا - اس کا دایاں پاؤں جھیل کے کنارے ڈوبنے کو بڑھ رہا تھا - اور وہ اسی حالت میں کھڑا تھا - جس طرح کہ وہ پہلے سوچ میں غرق کھڑا تھا - یہ تھا قدرت کا ایک کھیل - جس نے اُسے یکسر بدل دیا - اُس نے جھیل کے خاموش اور پُرسکون کنارے کو چھوڑ دیا - اپنے پہاڑی مقام کو الوداع کہا - اور اپنے اصلی گھر کی طرف روانہ ہؤا - اُس نے انہماک سے تجارت شروع کی - اور وہ عقل و تجربہ جو اُس نے تنہائی کے ایام میں حاصل کیا تھا - اُس کو عمل میں لانا شروع کیا - چند سالوں کی کفایت شعاری سے وہ امیر بن گیا - اور گھر بار کا کام خوب چلنے لگا - اس کے بعد اُس نے کبھی دُنیا کی بے مہری کی شکایت نہیں کی ۔

ایچ - اے - نائب
بی - اے - ایل ایل بی - لاہور

شہرِ خموشاں میں

ایسا کونسا گیت سُن رہے ہو
ایسی کونسی چیز دیکھ رہے ہو
کِس نے تمہیں موہ لیا ہے؟ کِس نے تمہیں جکڑ رکھا ہے؟

(۲)

اِس سال دیکھو کتنی خوبصُورت بہار آگئی ہے۔
پیڑ اَور بیلیں۔ چھت اَور آنگن۔ کھیت اور باغیچے۔
سب ڈھک گئے ہیں رنگا رنگ پھُولوں سے۔
اِن کی بھینی بھینی خوشبو پاگل کئے دیتی ہے دل والوں کو۔
کیا اِس خوشبو سے بھی تمہاری نیند نہیں کھُلتی؟

(۳)

اِس چھوٹی سی ندی میں کِتنا پانی آگیا ہے۔ صاف اَور سفید۔
پہاڑوں کا سارا حُسن پِگھل پِگھل کر ہمارے شہر میں سے بہا جا رہا ہے۔
ندی کی اُبھری ہُوئی چھاتی پر جھاڑیوں کے پیلے پیلے پھُول دوشیزاؤں کی طرح ناچ رہے ہیں۔
بُوڑھے اَور جوان ملاح اپنی کشتیوں میں بیٹھے بہار کے گیت گا رہے ہیں۔
کیا اِن کی سُریلی تانوں سے بھی تمہاری نیند نہیں کھُلتی؟

(۴)

نیلے آسمان پر سفید سفید تارے بچّوں کی طرح مُسکرا رہے ہیں۔
شام کے سایوں میں گاؤں کی حسین لڑکیاں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ناچ رہی ہیں۔
دُور کی مسجد سے اذان کی پُرکیف صدا گونج رہی ہے۔
اے نماز گزارو۔ عبادت کا وقت ہوگیا۔ جاگ اُٹھو۔
کیا اب بھی نہ جاگو گے؟

(۵)

وُہ دیکھو رات اپنا مُنہ چھُپائے چلی جا رہی ہے۔
صُبح کی دیوی باریک سفید ساڑھی پہن کر آگئی ہے۔
اِس کا رو پہلا جسم ساڑھی میں سے دکھائی دے رہا ہے۔
جوان مالن اپنے خوبصُورت ہاتھوں سے باغ میں کلیاں چُن رہی ہے۔
اَور اپنے محبُوب کی یاد میں آنسو بہا کر آہستہ آہستہ گنگنا رہی ہے۔
اُس کی میٹھی گنگناہٹ سے بھی کیا تمہاری آنکھ نہ کھُلیگی؟

(۶)

اے سوئے ہوئے بادشاہو! راج سنگھاسن تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ میدانِ کارزار میں جنگ کا بِگل بج اُٹھا۔
اے متوالے شاعرو! شہر کا بچّہ بچّہ تمہیں یاد کر رہا ہے۔ اُٹھو اَور بہار کے گیت لِکھ کر دُنیا کو پاگل بنا دو۔
اے حُسن بے نیاز! عِشق قبروں پر سر جھکائے تمہاری یاد میں رو رہا ہے۔
اے معصُوم بچو! جاگو ماؤں کی گودیں ہاتھ پھیلائے کھڑی ہیں۔
اُن کی چھاتیاں دُودھ سے بھر گئی ہیں۔
جاگو پھر ایک بار۔ جاگ اُٹھو سارے!

(۷)

نہیں جاگو گے؟ کوئی بھی نہیں جاگ اُٹھے گا؟
قدرت کے اِس عجیب میخانے سے کیا کوئی بھی نہیں نِکل سکتا؟
کیا کوئی بھی مے سے بھرے پیالے کو ٹھکرا کر بیدار نہیں ہو سکتا؟
کیا اِتنا نشہ ہے اِس شراب میں جس نے پی لی۔ ابد تک سو گیا؟

رونق کاشمیری

صفحۂ اطفال

مِس فلورا

(گذشتہ سے پیوستہ)

اسلم میاں کی دُلہن بہن کے ہاں سے دو دِن کے بعد لوٹیں۔ دیکھا تو فلورا غائب ہے۔ اِدھر دیکھا اُدھر ڈھونڈھا۔ فلورا ہوتی تو ملتی۔ باہر سے بُلا کر نوکر سے پُوچھا۔ ارے جُمّا فلورا کہاں ہے؟

جُمّا:۔ حضور گھر ہی میں ہو گی۔

بیگم اسلم:۔ گھر میں تو کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ مَیں نے چپّہ چپّہ ڈھونڈ مارا۔

جُمّا:۔ حضور باہر بھی نہیں آئی۔ مَیں تو کہیں آیا نہ گیا۔ نماز پڑھنے البتہ مسجد چلا جاتا تھا۔ باہر وُہ گلی کے کتّوں کے ڈر سے نکلا بھی نہیں کرتی تھی۔ حضور پردے ہو جائیں۔ تو کوٹھے پر چڑھ کر دیکھ لوں۔

بیگم اسلم:۔ ہاں کوٹھے پر دیکھ لو۔ بلکھن پر نظر مارو۔ لو مَیں پردے ہوئی جاتی ہوں۔

چھت پر چڑھا۔ تو وہاں بھی فلورا ندارد۔ بلکھن کی ڈالی ڈالی چھان ماری۔ مگر فلورا کا پتہ نہ پایا۔ آوازیں دیں۔ فلورا فلورا۔ فلورا کہیں ہوتی تو سُنتی۔ نیچے اُتر آیا۔

جُمّا:۔ حضور۔ فلورا کا کہیں پتہ نہیں۔ خدا جانے کدھر کو چل دی۔

بیگم:۔ پھر زمین نگل گئی۔ آسمان کھا گیا۔ کہاں پٹ ہو گئی آخر! مَیں نہیں جانتی۔ میری فلورا کو ڈھونڈ کر پیدا کرو۔ مَیں تم سے بھر لوں گی۔ گھر تمہارے سپرد کر کے گئی تھی۔

جُمّا:۔ حضور مَیں باہر کی نگرانی کر رہا تھا۔ بھلا گھر کے اندر کی مجھے کیا خبر ہو سکتی ہے۔ باہر وُہ نہیں نکلی۔ نکلتی تو فوراً مجھے معلوم ہو جاتا۔

بیگم:۔ شادی کے شیرمال کہاں رکھوا دئے تھے۔

جُمّا:۔ بلّو بوا گھر ہی میں رکھ کر چلی گئی تھیں۔

بیگم:۔ گھر میں رکھ جاتیں تو ملتے نا۔ یہاں تو کہیں رکھے دِکھتے نہیں۔

جُمّا:۔ حضور میرے سامنے بوا کھاری لے کر اندر گئی تھیں۔ اَور جب لوٹیں۔ تو خالی خون ہاتھ میں لئے ہوئے

تھیں۔

بیگم:۔ ہیں یہ کیا ؟ یہ مٹکا بھرے پیڑے کہاں غائب ہو گئے ؟ ارے کوئی چور تو نہیں آ گھسا تھا ؟ لو اور سنو "یک نہ شد دو۔" تمہارے نوکر رکھنے کا کیا فائدہ۔ جب تم گھر کی نگرانی بھی نہیں کر سکتے۔

جُمّا:۔ حضور دس برس مجھے نوکر ہوئے ہو چکے۔ آپ آئے دن برادری محلّے کی شادی بیاہ میں بلوائی جاتی ہیں۔ بھرا گھر میرے سپرد ہوتا ہے۔ کبھی پہلے بھی ایسا ہوا۔ مَیں خُدا نہ کرے۔ چور چکار ہوتا تو کب تک آپ کی نگاہ سے چھپ سکتا تھا ؟

بیگم:۔ مَیں یہ تو نہیں کہتی۔ کہ تم نے چوری کی ہے۔ البتہ تمہاری غفلت ضرور ہے۔

جُمّا:۔ حضور نمازوں کے وقت کو چھوڑ کے اور مَیں کہیں منٹ بھر کے لئے ہلا بھی نہیں۔ اور چور چکار کا یہاں کام کیا۔ شہر بھر جانتا ہے۔ کہ اسلم میاں کے پاس بندوق اور پستول کا لائسنس ہے۔ چور کی موت آئی ہے کہ اِدھر کا رُخ کرے گا۔

بیگم:۔ تم نے یہ چیزیں لی نہیں۔ چور آیا نہیں۔ پھر فرشتے لے اُڑے ؟ غضب خُدا کا پچیس روپے کے پیڑے یوں گھر سے غائب ہو گئے۔ میری نیاز و باز سب دھری رہ گئی۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ پڑوس کی نصیبن بوا آگئیں بیگم کو سلام کیا۔

بیگم:۔ آؤ بوا۔ آج کدھر نکل آئیں۔ خیریت ہے۔ ننھی اچھّی ہے۔

بوا:۔ ہاں اچھّی ہے۔ خیر سے اس کا دولہا چھٹی پہ آیا ہوا تھا۔ جاتے میں ساتھ اسے بھی لے گیا۔ بہن کہتی بھی رہ گئی کہ ننھّی کو پندرہ بیس دِن کے لئے اور روک لو۔ ابھی تو آئی تھی۔ کیا ایسی جلدی پڑ گئی۔ میرے جی میں آئی بھی۔ پھر مَیں نے سوچا کہ بیٹی پرایا دھن۔ اپنے گھر ہی اچھّی ہوتی ہے۔ اِسی لئے نہیں روکا۔ آپ کو سلام کہہ گئی ہے۔

بیگم:۔ جیتی رہے۔ خوش رہے۔ اے بوا۔ آج میرے گھر میں بڑے اچنبھے کی واردات ہو گئی ہے۔

بوا:۔ کیا بات ہوئی بیگم خیر تو ہے ؟

بیگم:۔ شادی کے خوان بھرے شیرمال اور پچیس روپے کے پیڑے گھر سے غائب ہیں۔ مَیں بہن کے ہاں گئی ہوئی تھی۔ اور میری فلورا بھی نہیں نظر آتی۔

بوا:۔ آخر کون لے گیا۔ کون لے جا سکتا ہے۔ پولیس میں رپٹ کرا دیجئے۔ پولیس والے آپ تفتیش کر کے چور کو ڈھونڈ نکالیں گے۔

بیگم:۔ جُمّا جا چھپا کے سے پولیس میں رپٹ لکھوا دے
کہنا ہمارے میاں کی بندریا دو تین دن سے گم
ہے۔ پولیس والے پتہ لگائیں۔
یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ پڑوسن کا لڑکا بشیر
آگیا۔ اور سلام کرکے کہنے لگا۔
بیگم صاحب:۔ پرسوں آپ کے گھر پر بندروں نے
بڑی چڑھائی کر رکھی تھی۔ فلورا اور چمپا بھی انہیں
میں ملی جُلی بیٹھی تھیں۔ بندر کچھ کھا پی رہے تھے۔
اور آپس میں ایسے گھرے ہوئے بیٹھے تھے۔
جیسے کوئی مسکوٹ ہو رہی ہے۔ کتے جو بھونکے
تو بندر نیچے اُتر آئے اور کلوا کتے کو چیر پھاڑ ڈالا۔
پھر جب محلے والوں نے غلیل دکھائی تو بھاگے۔
فلورا بھی ایک بندر کے پنجے میں پنجہ ڈالے
چھلانگیں لگا رہی تھی۔ یہ کیسا تماشا تھا۔
بیگم:۔ ارے کب؟
بشیر:۔ دو تین دن ہوئے ہوں گے۔ آپ گھر پر
شائد تھیں نہیں۔
بیگم:۔ اور جُمّا کہاں مر گیا تھا؟ اس نے نہ دیکھا۔
بشیر:۔ جُمّا بھائی بھی اُس وقت دکھائی نہ دیتے تھے۔
یہ تماشا تو دیکھنے قابل تھا۔
بیگم:۔ ارے جُمّا!

جُمّا:۔ حضور!
بیگم:۔ سُن رہا ہے بشیر کیا کہہ رہا ہے؟
جُمّا:۔ حضور میں تو نماز کے وقتوں کے سوا گھر سے
کہیں آیا گیا نہیں۔ نماز پڑھنے برلب والی مسجد میں
ضرور جاتا تھا۔ ہاں ایک دن شائد پرسوں اترسوں
نماز کے بعد مراد آباد والے مولوی صاحب کا وعظ
سننے ضرور چلا گیا تھا۔ وہاں تین گھنٹے سے زیادہ
نہ لگے ہوں گے۔ وعظ کے ختم ہوتے ہی میں
گھر آگیا۔ جبھی سے فلورا کی چپکار نہیں سُنی۔ یہ تو
میں بھی کئی دن سے دیکھ رہا تھا۔ کہ یا تو چمپا فلورا
سے الگ تھلگ رہا کرتی تھی یا ہر وقت منہ سے
منہ لگائے اس کے ساتھ پھرنے لگی۔
نصیبن:۔ بیگم صاحب! معلوم ہوتا ہے۔ بندر ہی
فلورا کو لے اُڑے۔ ذرا کوٹھے پر تو کسی کو بھیجئے۔
وہاں کھاتے کیا رہے۔
بیگم:۔ ہاں جُمّا کوٹھے پر چڑھ کے دیکھ۔
جُمّا کوٹھے پر چڑھا۔ اور وہیں سے بولا۔ بیگم صاحب
یہاں تو جگہ جگہ بیڑوں کا چُورا اور شیرمالوں کے
ٹکڑے بکھرے پڑے ہیں۔ ہزاروں چیونٹیوں کا
ہجوم ہے۔
بیگم:۔ ہائے ہائے میرے پچیس روپے کے پیڑے

یوں ان نامرادوں نے برباد کئے۔ گھر میں کسی نے پیڑے کا ایک دانہ بھی چکھا ہو تو بُری چیز۔ مَیں نیاز کا ہے کی دلاؤں گی۔ اَور شیرمال بڑی آپا کے گھر کے تھے۔ بھتیجی کی بھتیجی میں نے بھجوائے تھے۔ بادیہ بھرا حلوا بھی انہیں مرانیوں کے نیگ لگا۔ خدا کرے کٹ کٹ نکلے۔

نصیبن:۔ بیگم صاحب۔ یہ ساری چالاکی چمپا کی معلوم ہوتی ہے۔ بندروں نگوڑوں کو کیا پتہ ہوگا کہ شیرمال اَور پیڑے گھر میں رکھے ہیں۔

جُمّا:۔ حضور! بوا کا کہنا ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ فلورا سے چمپا کی ساز باز دیکھ کر مجھے بھی شبہ گزرا تھا۔

بشیر:۔ یہ تو سارے محلّے نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ کہ چمپا اور فلورا دونوں بندروں کے ساتھ رلی ملی بیٹھی کچھ کھا رہی تھیں۔ اَور فلورا کو ایک جنگا دہری بندر کے ساتھ پھلانگتے بھی سب نے دیکھا۔

نصیبن:۔ معلوم ہوتا ہے۔ فلورا کے نکلوانے کا کام چمپا کا ہے۔ اَور کسی کا نہیں۔ ان جانوروں میں ہماری آپ کی طرح سمجھ بوجھ بھی ہوتی ہے۔ آپس میں لین دین بنج بیوپار بھی ہوتا ہے۔ ہم ان کی زبان نہیں تو کیا یہ بے زبان ہیں۔ آپس میں بولتے ہیں لڑتے ہیں۔ میل ملاپ کرتے ہیں۔ ساری باتیں انسانوں کی سی ان میں بھی ہوتی ہیں۔

بیگم:۔ ضرور اس غیبانی چمپا نے بندروں کو گھر میں گھسا کر فلورا کو نکلوایا۔ کیوں ری او نکٹی چڑیل! تجھے اسی دن کے لئے پالا پوسا تھا۔ اس روز کلوا نے لہولہان کر دیا تھا۔ مَیں جانوروں کے ہسپتال نہ بھجواتی تو کبھی کی مر چکی ہوتی۔ مرنے میں رہ ہی کیا گیا تھا۔ کلوا مراتی نے گوشت کا لوتھ بنا دیا تھا۔ نکل فتنی میرے گھر سے غدّار میری پھلروا اسی فلورا کو اپنے لگتوں کے حوالے کر کے تو یہاں دھنا دیکر بیٹھے گی۔ جُمّا نکال اس مالزادی کو گھر میں سے۔

جُمّا:۔ بہت اچھا۔

جُمّا یہ کہہ کے آواز دے کر گھر میں آیا۔ اَور چمپا نے اِدھر سے اُدھر اُدھر سے اِدھر بھاگنا شروع کیا۔ آخر داؤں دے کر دروازے سے نکل گئی۔ اب آگے آگے چمپا اَور پیچھے پیچھے جُمّا۔ محلّے کے کتّوں نے جو یہ کبڈّی دیکھی۔ چمپا کو ہاتھ ہاتھ اُٹھالیا۔ اَور دُم گھسیٹتے ہوئے گلی میں کھینچ لے گئے۔ پھر خُدا جانے نگوڑی کا کیا حشر ہؤا۔ کسی نے پھر اس کی صُورت نہیں دیکھی۔ جُمّا چمپا کو کُتّوں کے چارج میں دے کر لوٹ آیا۔ سچ ہے۔

"جو کسی کے لئے کنواں کھودتا ہے۔ خود ہی اس میں گرتا ہے"

Z. R. Fatima

تاجور

بازار میں مظفر کی دکان اُس کوچے کے عین مقابل میں تھی۔ جہاں شام کو مزدور لوگ کھانے کمانے اور کمانے کھانے کے چکر سے اُکتا کر تھوڑی سی دل لگی خریدنے جاتے ہیں۔ دکان پر ایک بورڈ پر ڈاکٹر ایم مظفر دندان ساز لکھا ہوا تھا۔ دروازوں اور دیواروں پر مختلف سائز کی تصاویر لٹک رہی تھیں۔ جن میں دانت ہونٹ اور مسوڑوں کے ڈراؤنے منظر تھے۔ اندر دو چار الماریوں میں دانتوں کے متعلق سامان چُنا ہوا تھا۔ بائیں طرف چند ایک خوفناک مشینیں کھڑی تھیں۔ جن کو دیکھ کر سلسلاتے ہوئے دانت فوراً دُکھنا بند کر دیتے ۔

مظفر شیشے کی الماری کے پاس کھڑا زنبور صاف کر رہا تھا۔ حمید کرسی پر بیٹھا بازار کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بازار میں دھندلی سی غبار آلودہ چاندنی میں بجلی کی بتیاں ٹمٹما رہی تھیں ۔

سامنے گھر سے ایک مدھم سی چیخ سُنائی دی۔

مظفر کے ہاتھ سے زنبور گر گیا۔ ایک دھماکے سے الماری کا شیشہ چُور چُور ہو کر بکھر گیا۔

حمید چونک پڑا۔ "کیوں کیا ہُوا؟"

"کچھ نہیں"۔ مظفر نے گھبرا کر کہا۔ "ویسے ہی ہاتھ سے زنبور پھسل گیا۔" اُس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ اور دل دھڑک رہا تھا۔

کمرے میں پھر خاموشی چھا گئی۔

"تم یہ آواز سُن رہے ہو؟" مظفر نے رُکتے ہوئے کہا۔

"شاید کوئی چیخ رہا ہے۔"

"ہوں۔ یہ سامنے والے مکان میں۔"

"وہی دُبلی پتلی سی لڑکی جو اُس نکڑ پر بیٹھتی ہے؟"

"ہاں۔ وہی۔"

"بیمار ہے۔"

"نہیں ــــ کوئی پیٹ رہا ہے۔"

"پیٹ رہا ہے؟"

"ہاں"۔

"کیوں؟"

"خدا جانے کیوں؟"

کمرے میں پھر خاموشی چھا گئی۔

دُور ہوا درختوں کی ٹہنیوں سے لپٹ لپٹ کر رو رہی تھی۔ فضا غبار سے بھری ہوئی تھی۔ اس گدلی سی چاندنی میں بجلی کی بتیاں ٹمٹمانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ سامنے پنواڑی کی دکان پر دو ایک لوگ آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ کبھی کبھی کسی کتے کی بھونکنے کی آواز سُنائی دیتی۔ اور ان مدھم چیخوں کو اور بھی مدھم کر دیتی۔ حمید بیٹھا غور سے سُن رہا تھا۔

مظفر۔ (جیسے وہ اپنے آپ سے کہہ رہا ہو) "یہ انسان کی انتہائی ذلت ہے۔ پیٹ بھرنے کی خاطر لوگوں سے پٹنا۔ کس قدر ذلت ہے۔" اُس کا منہ نفرت اور غصے سے دمک رہا تھا ــــ "جو کوئی آتا ہے۔ وہ اُس کو پیٹتا ہے۔ مجھے تو اس عورت پر ترس آتا ہے۔"

"ترس! اگر تم یوں لوگوں پر ترس کھانے لگے تو تمہارا کوئی علاج نہیں! ترس کھانا خودکشی سے کم نہیں۔"

"تم نے اُسے دیکھا بھی ہے؟"

"کسے اُس لڑکی کو؟"

"ہاں۔"

"بے بس نیم جان سی ہے۔"

"ہوں۔"

مقابل کے مکان کا دروازہ کھلا - ایک دُبلا پتلا سا مرد باہر نکلا - اور لاپرواہی سے دُکان کے سامنے سے گزر گیا - اُس کی بھویں تنی ہوئی تھیں - چھاتی بھنچی ہوئی تھی -

"دیکھا تم نے ؟"

"یہی اُسے پیٹ رہا تھا ؟"

"ہاں کس قدر بدصورت بدشکل ہے ۔" مظفر نے غصّے سے کھولتے ہوئے کہا -

شاید اسی نے اُسے یہاں بٹھا رکھا ہے - کیا نام ہے اُس کا ؟"

"چاند !"

مظفر کو اُس کوُچے سے سخت نفرت تھی - جب اُس نے وہاں دُکان بنوائی تھی - تو اُس کوچے کا وہاں وجود نہ تھا - پھر خدا جانے وہ کہاں کہاں سے آگئیں - حتیٰ کہ وہ جگہ اُن کے لئے مخصوص ہو گئی -

شروع شروع میں تو جب کبھی اُس کی نظر اُدھر پڑ جاتی - تو وہ "لاحول" پڑھ کر الماری میں اپنے اوزاروں کا جائزہ لینا شروع کر دیتا - اور رجمید اُسے . . . . . چھیڑتا - تو وہ غصّے سے لال ہو جاتا - پھر اُسے یہ سوُجھی کہ اُسے تو اس صراطِ مستقیم سے گری ہوئی مخلوق کو دیکھ کر عبرت حاصل کرنی چاہئے - مگر اسکے باوجود اُس نے کبھی آنکھ بھر کر اُس کوچے کی طرف نہ دیکھا - شاید وہ ڈرتا تھا - کہ کہیں عبرت حاصل کرتے کرتے وہ یہ نہ بھول جائے - کہ وہ محض عبرت حاصل کرنے کے لئے دیکھ رہا ہے - یا جو نفرت اس کوچے کے متعلق اس نے دِل میں پال رکھی تھی - وہ فوت نہ ہو جائے *

بہرصورت اُسے اُس کوچے والیوں سے سخت نفرت تھی - جو شام کو بھولے بھالے مزدوروں کو دام میں پھنساتی ہیں - یا صبح کی روٹی کے لئے مزدوروں کا کھلونا بننا گوارا کرتی ہیں - یا دُکھے ہوئے دِلوں کیلئے ہمدردی بیچتی ہیں - یا مظلوم مزدوروں کی تشدّد کرنے کی آرزو کو پُورا کرتی ہیں -

شام کو اُس صراطِ مستقیم سے گری ہوئی مخلوق کے کوُچے میں زندگی کے آثار نمودار ہو جاتے اور جاذبیت پیدا کرنے کی اُمید پر وہ لُٹی ہوئی شکلیں اپنے ڈھانچوں میں رنگ بھرنا شروع کر دیتیں اور پھر جب سوُرج چھُپ جاتا - جیسے بلا امتیاز ہر چہرے پر تنقید کرنے کی بے درد عادت ہے - تو وہ اپنی ٹوٹی پھوٹی چوکیوں پر لالٹین کی دھندلی مگر ہمدرد روشنی میں جو بوسیدہ کپڑوں میں بھی ایک دھندلی سی دمک پیدا کر دیتی ہے - مزدوروں کے انتظار میں آ بیٹھتیں -

مزدور دن بھر کی مشقت کے بعد وہاں آ جاتے اور یوُں ہنستے بولتے اور آنکھیں جھپکاتے ہوئے وہاں سے گزرتے جیسے وہ کسی برات کے ساتھ جا رہے ہوں - جیسے وہ غم و فکر سے واقف ہی نہ ہوں - اُنہیں قطعی فراموش ہو جاتا - کہ زندگی اُن کے لئے مسلسل مشقت ہے - یا شاید اسی مشقت اور بے بسی کے احساس کو بھُولنے کیلئے تو وہاں آتے - یہ دیکھنے کیلئے کہ اللہ میاں کی دُنیا میں وہ بھی کچھ حیثیت رکھتے ہیں - اُن سے گری ہوئی مخلوق بھی ہے - جسے وہ حقارت کی نظر سے دیکھ سکتے ہیں - خرید سکتے ہیں - اپنی خواہشات کے پاؤں تلے روند سکتے ہیں - جن کے وہ رزاق بن سکتے ہیں *

اکثر مظفر کو یہ احساس ہوتا - کہ وہ اِدھر دیکھ رہا ہے - اُس وقت اُس کا چہرہ نفرت سے سُرخ ہو جاتا - اور اُس کا ماتھا سمٹ کر گتھیاں بنا لیتا - اور وہ 'لاحول' پڑھ کر کسی زنبور کو صاف کرنے یا کسی تصویر کو سیدھا کرنے میں شدّت سے مصروف ہو جاتا - یا وہ آپ ہی آپ بولنے لگتا "اب مجھے کیا کرنا ہے - ہاں - ٹھیک ہے - تو یہ کس قدر گرمی ہے" اُس وقت اُس کا جی چاہتا - کہ وہ دُکان بند کر کے دُور بھاگ جائے - اور اس گدلی چاندنی میں کسی باغ میں کسی گلاب کی جھاڑی تلے بیٹھ کر رو پڑے - پھر وہ دُکان میں چاروں طرف گھومتا - الماریاں کھولتا - اور بند کر دیتا - قلم کو یہاں سے اُٹھا کر وہاں رکھ دیتا - اور آخر پھر کرسی پر آ بیٹھتا - اور بیسیوں دفعہ سامنے دیوار پر سینما کا اشتہار غور سے پڑھتا - حتیٰ کہ اُسے پھر احساس ہوتا - کہ وہ اُدھر دیکھ رہا ہے -

چاند پھر اپنی چوکی پر آ بیٹھی تھی - اُس کے ہاتھ میں ایک گیند سی تھی - جسے وہ اُچھال رہی تھی - وہ دبی آواز میں کچھ گنگنا رہی تھی - جیسے وہ اس گیند اور گیت کی مدد سے کچھ بھولنے کی کوشش کر رہی ہو - اُس کے چہرے پر انتہائی بے بسی چھائی ہوئی تھی - جب کبھی کوئی اُسے دیکھتا - تو وہ اور بھی سہم جاتی - وہ ان عورتوں میں سے تھی جو سہم کر اور بھی حسین ہو جاتی ہیں -

اُسے دیکھ کر ایک معمولی سے تھکے ہارے مرد کے دل میں بھی

بہ احساس بیدار ہو جاتا۔ کہ میں ایک زبردست مرد ہوں۔ اُس کا سینہ تن جاتا۔ اور اُس کے ماتھے پر "مردمی دقار" اُبھر آتا۔

مظفر ٹوٹے ہوئے شیشے کے ٹکڑے اکٹھے کرنے میں شدّت سے مصروف تھا۔ وہ ایسا محسوس کر رہا تھا۔ جیسے حمید کی موجودگی تمام کمرے میں چھائی ہوئی ہو۔ وہ اُس کا بوجھ اپنی گردن پر محسوس کر رہا تھا۔ اُس کی گردن اکڑی ہوئی تھی۔ اور وہ اِدھر اُدھر مڑ نہ سکتی تھی ؂

حمید بیٹھا غور سے چاند کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کے ہونٹ خودبخود تبسم سے کھل رہے تھے۔ جیسے وہ کوئی لطیفہ سُن رہا ہو۔ اور اُس کی آنکھیں دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے چاندنی میں کوئی گا رہا ہو ؂

"ابھی جوان ہی ہے"۔ حمید نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔

"کون ؟"

"یہی ننگڑ والی لڑکی۔ کیا نام ہے اُس کا ــــ چاند"

"جوان"۔ یہ بات اُسے کبھی نہ سوجھی تھی۔ "بیچاری" اُس نے حقارت سے کہا۔ اور چپ ہو گیا۔

وہ نہیں جانتا تھا۔ کہ وہ اُس کے متعلق کیا کہے۔

"تم نے کبھی اُس سے بات بھی کی ہے ؟"

"میں نے ؟" اُس نے حیرانی سے کہا۔

"کیوں اس میں کوئی بُری بات ـ"

"بُری بات !" وہ سخت پریشان ہو رہا تھا۔

"تمہاری بھی اچھی ہمدردی ہے" حمید نے چھیڑ کر کہا۔

"جو الماریوں کے شیشے پھوڑنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی۔"

مظفر نے پریشانی سے پھوٹے ہوئے شیشے کی طرف دیکھا۔

چلو چل کر اُس سے پوچھیں تو سہی۔ چلو گے ؟"

مظفر نے بیساختہ سامنے پنواڑی کی دکان کی طرف دیکھا۔ جہاں دو ایک آدمی بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ یہ کیا دیوانگی ہے ؟ اُس نے حمید کی طرف ملامت بھری نگاہ ڈالی۔

"تم اُس سے ڈرتے تو نہیں ؟"

"میں۔ میں کیوں ڈرنے لگا ؟" اُس نے ایک جھرجھری لی ــــ،

"چلو تو۔" حمید نے اُٹھ کر اُس کا بازو پکڑ لیا۔ اور اُسے گھسیٹ کر باہر لے گیا۔

"تم بیمار تو نہیں ہو"۔ حمید نے چاند سے پوچھا۔

چاند کی دعوتی مسکراہٹ گھورنے میں بدل گئی۔ مگر وہ گھور نہیں سکتی تھی۔

مظفر نے حمید کو ملامت اور غصّے سے دیکھا۔

"نہیں۔ نہیں" حمید نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم ابھی ابھی چیخ رہی تھیں نا۔ میرا مطلب ہے۔ تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں۔ اگر ہم تمہاری مدد کر سکتے ہوں۔ تو"۔

"آپ کی مہربانی ہے۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں۔"

اُس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ مگر اُس کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔ "آئیے بیٹھئے۔"

مظفر کی نگاہیں اُس کمرے میں آوارہ تھیں۔ جیسے اُسے معلوم نہ ہو۔ کہ اُسے کس طرف دیکھنا ہے۔

"یہ کون آدمی تھا۔ جو ابھی ابھی یہاں سے گیا ہے۔"

حمید نے آنکھوں میں مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ تمہیں اس بے دردی سے کیوں پیٹتا ہے ؟"

"آپ اس بات کو پوچھ کر کیا لینگے۔ جانے دیجئے۔"

"پھر بھی بتاؤ تو سہی۔"

"میں اُس کی باندی ہوں۔ اپنی اپنی قسمت ہے۔"

"مگر وہ تمہیں پیٹتا کیوں ہے ؟"

"اُس کا خیال ہے۔ کہ میں پیسے چُراتی ہوں۔"

مظفر نے بے چینی سے کروٹ لی۔

"تم اپنی کمائی اُسے دیتی ہو۔"

چاند نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"مگر تم ایسی زندگی کس طرح گوارا کرتی ہو ؟ حمید نے بھری ہوئی آواز میں کہا۔

چاند نے ایک بے بس سی مسکراہٹ کی کوشش کی۔

"ہاں۔ لوگ یہی سمجھتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے۔ کہ ہمیں اس زندگی سے دلچسپی ہے" ــــــــ مگر ــــــ

اُس کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو ڈھلک آئے۔

"ہمیں آپ سے بہت ہمدردی ہے۔"

اور وہ خاموش ہو گئے - مظفر کا دل دھڑک دھڑک کر اس مختصر سے کمرے میں گونج رہا تھا - اس کی نگاہیں چاند کے چہرے کی بے بسی پر جمی ہوئی تھیں -

چاند نے مسکرانے کی کوشش کی - آپ کی بڑی مہربانی ہے ــــ "

حمید نے مظفر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا - تم انہیں جانتی ہی ہو گی - یہ میرے دوست ڈاکٹر صاحب ہیں " چاند نے اثبات میں سر ہلا دیا - " ان کو تم سے بہت ہی ہمدردی ہے "۔ مظفر ٹھٹک سا گیا - اُس نے حمید کو ملامت بھری نگاہوں سے دیکھا -

" تمہیں چلاتے ہوئے سُن کر یہ ہمدردی کے مارے دُکان کے شیشے پھوڑتے رہتے ہیں "

چاند مسکرا دی - وہ چپ چاپ مظفر کو دیکھ رہی تھی - اور اُس کی آنکھوں میں بے بسی چپکے چپکے اُسے کسی بات کی دعوت دے رہی تھی - مظفر سخت پریشان تھا - اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا - کہ وہ کیا کرے - " آپ چپ کیوں ہیں ڈاکٹر صاحب " چاند نے مظفر سے مخاطب ہو کر کہا -

" مَیں - مَیں - نہیں میرا مطلب ہے - "

" آپ کی بڑی مہربانی ہے - " وہ زیرِ لب مسکرا رہی تھی -

حمید نے مظفر کی گھبراہٹ محسوس کر کے گفتگو کا موضوع بدل دیا - تو میرا مطلب ہے - تم واقعی اس زندگی کو چھوڑنے کے لئے تیار ہو - اگر ــــ "

" اگر ــــ " چاند نے ایک زہرخند کرتے ہوئے کہا -

" ہاں اگر ــــ " اور اُس نے مظفر کی طرف ایک مظلوم نگاہ ڈالی - اُس نگاہ کو دیکھ کر مظفر نے یوں محسوس کیا - جیسے وہ دُنیا کی بڑی سے بڑی مشکل کو بھی برداشت کر سکتا ہو - وہ اُٹھ بیٹھا -

" چلو چلیں - دیر ہو چکی ہے " وہ دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے -

" اگر تم کو ہماری مدد کی ضرورت ہو " حمید نے اپنی لکڑی سنبھالتے ہوئے کہا -

" آپ کی مہربانی ہے - "

چاند نے اُنہیں راستہ دکھانے کے لئے روشنی اُٹھانے کو ہاتھ بڑھایا - اُس کے بازو پر بہت کا ایک بڑا سا نشان تھا - جس سے خون رِس رہا تھا -

" یہ کیا ہے ؟ " حمید نے گھبرا کر پوچھا -

" ویسے ہی چوٹ لگ گئی تھی - "

مظفر کی نگاہوں میں وہ کمرہ گھوم رہا تھا - " میں جاتا ہوں، آپ ٹھہریئے - میں ابھی ٹنچر لے آتا ہوں ــ میرا مطلب ہے - دوائی ــ یہاں ــــ دُکان سے "

" اچھا تو میں چلتا ہوں " حمید نے مظفر سے مصافحہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا -

مگر مظفر کو اُس وقت یہ احساس نہیں تھا - کہ حمید جا رہا ہے یا پنواڑی کی دُکان پر بیٹھے ہوئے لوگ اُسے یوں بھاگتے ہوئے دیکھ کر ہنس رہے ہیں - یا وہ اُس صراط مستقیم سے گری ہوئی مخلوق سے عبرت حاصل کر رہا ہے - اس کا دماغ شل ہو چکا تھا - اور اُس کا دل دھڑک دھڑک کر اُس سے کچھ کہہ رہا تھا -

مظفر روئی سے اُس کے بازو پر دوائی لگا رہا تھا - اُس کی انگلیاں اُس ڈیلے سے بازو کی گرمی محسوس کر رہی تھیں - اُس کی نگاہیں بازو سے پھسل کر اُس کے جسم پر جا پڑتیں - جہاں قمیص کی سلوٹیں اُبھر اُبھر کر کسی چھپے ہوئے مدوجزر کا اظہار کر رہی تھیں - اور وہ چوری چوری اُسے دیکھ رہا تھا -

چاند اُس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھ رہی تھی جیسے اس چہرے کے اُتار چڑھاؤ میں وہ اپنا مستقبل دیکھ رہی ہو -

" آپ کو کس قدر تکلیف ہے ؟ "

" نہیں تکلیف تو نہیں - ویسے ہی خراشیں سی ہیں - "

" مگر تم اس زندگی کو چھوڑ کیوں نہیں دیتیں ؟ "

" چھوڑ کیسے سکتی ہوں ؟ "

" کیوں تم اُس کی زرخرید ہو ؟ "

" ہاں میں دو سو روپے پر بک چکی ہوں - "

" دو سو روپے ! " وہ کسی سوچ میں پڑ گیا ــــ اچھا اگر تمہیں دو سو روپے مل جائیں تو ؟ پھر تم آزاد ہو جاؤ گی ؟ "

" ہاں - مگر میں کوئی کام نہیں جانتی "

" تم اپنے کسی رشتہ دار کے ہاں چلی جانا - "

" رشتہ دار ! میرا تو کوئی بھی نہیں - بس یہی ایک جان ہے - جسے میں اپنا کہہ سکتی ہوں - " اُس نے اپنے پاؤں کی طرف اشارہ

کر کے کہا ۔

مظفر نے اُس کے پاؤں کی طرف دیکھا ۔ وہاں ایک سیاہ بلی بیٹھی اُسے گھور رہی تھی ۔

وہ خاموش ہو گیا ــــ " تم آزاد ہو جاؤ گی تو تم کسی سے شادی کر لینا ۔ "

" شادی ! " وہ ہنس پڑی ۔ " مجھ سے کون شادی کریگا ؟ "

مظفر کا دل خواہ مخواہ پیچ و تاب کھا رہا تھا ۔ جیسے کسی نے اُسے چڑا دیا ہو ۔ " تم ایسی ذلیل زندگی کیسے بسر کر سکتی ہو ــــ تمہارے دل میں احساس نہیں ۔ تم خود اپنے دل سے واقف نہیں ۔ یہ ذلت کی انتہا ہے ۔ "

چاند اُسے غور سے دیکھ رہی تھی ۔ اُس کا دل دھڑک رہا تھا ۔ خوف سے یا خدا جانے خوشی سے ۔ مظفر کو غصہ چڑھ رہا تھا ۔ خدا جانے کیوں ۔ اُس کا جی چاہتا تھا ۔ کہ وہ اس کے منہ پر تھپڑ مارے یا خود کھڑکی سے کود پڑے ۔

" میں جاتا ہوں ۔ بتی کی ضرورت نہیں میں چلا جاؤنگا ۔ "

" آپ کی بڑی مہربانی ہے " چاند نے چونک کر کہا ۔ جیسے وہ کوئی رنگین خواب دیکھ کر جاگ اُٹھی ہو ۔ مگر مظفر جا چکا تھا ۔

شام کو مظفر سخت پریشان تھا ۔ بن دیکھے وہ یہ محسوس کر رہا تھا ۔ کہ نکڑ پر چاند بیٹھی اُس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی ۔ وہ اُٹھ بیٹھا ۔ اُس نے تیسری دفعہ تصویروں کو ٹھیک کیا ۔ زنبور کو صاف کیا ۔ اور الماریوں کو خدا جانے کس لئے کھولا اور بند کیا ۔ وہ یوں محسوس کر رہا تھا ۔ جیسے وہ کوئی اہم بات بھول چکا ہو ۔ جسے یاد کرنا اشد ضروری ہو ۔ اُس نے اپنی کرسی کو موڑ لیا ۔ اور ایک کتاب پڑھنے بیٹھ گیا ــــ اُس نے دیکھا کہ وہ سامنے دیوار پر سینما کے اشتہار کو گھور رہا ہے ۔

سامنے وہی دُبلا پتلا مرد چاند کی طرف جا رہا تھا ۔

مظفر اُٹھ بیٹھا ۔ ہاں ہاں مجھے تو حمید کے ساتھ سینما جانا ہے دوسرا شو ، بہت تھوڑا وقت باقی ہے ۔ اُس نے دُکان بند کر دی ۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک سہمی ہوئی سی شکل آ کھڑی ہوئی ۔ اُس کی آنکھیں اُسے بُلا رہی تھیں " لاحول ولاقوۃ ۔ ذلیل ہے تو ہُوا کرے ۔ مجھے کیا " وہ اپنے آپ سے باتیں کرتا جا رہا تھا ۔ جیسے وہ خاموشی سے ڈرتا ہو ــــ تو یہ کس قدر گرمی ہے ــــ یہ کتے خدا جانے کیوں بھونکتے ہیں ــــ اس شہر میں کتنے کتے ہیں !! "

" حامد تو کہتا ہے کہ میں نے اپنی آنکھ سے اسے وہاں سے نکلتے دیکھا ہے ۔ " مظفر کے باپ نے کہا ۔

" مگر اباجی میں کب کہتا ہوں کہ میں وہاں نہیں گیا ۔ اُس بیچاری کو تکلیف تھی ۔ میں اُسے دوائی دینے گیا تھا ۔ اس میں کیا بُری بات ہے ؟ "

مگر بیٹا لوگوں کو تو یہ معلوم نہیں کہ تم وہاں دوائی دینے گئے تھے ۔ وہ تو یہ سمجھتے ہیں ۔ کہ تم وہاں گئے تھے " مظفر کے والد نے الماری میں سامان کو گھورتے ہوئے کہا ۔ اُن کی نگاہیں فرش پر اِدھر اُدھر آوارہ تھیں ۔ جیسے اپنی تسکین کے لئے یا سہارا لینے کے لئے کسی چیز کو تلاش کر رہی ہوں ۔

" لوگ ! " مظفر نے دانت پیستے ہوئے کہا ۔ " لوگ تو اندھے ہیں ۔ کمینے ۔ آپ حمید سے پوچھ لیجئے ۔ "

" نہیں بیٹا " اُس کے باپ نے کھانستے ہوئے کہا ۔ جیسے وہ مظفر کے الفاظ اپنی کھانسی سے ناپید کر دینا چاہتے ہوں ۔ جیسے وہ لوگوں کے متعلق ایسے کلمات سُننا نہ چاہتے ہوں ۔ شاید اس لئے کہ اُنہیں لوگوں سے اتفاق تھا ۔ " حمید کی اور بات ہے ۔ تم ہمشیرہ کے سسرال والوں کو تو جانتے ہی ہو ۔ وہ تو صرف بہانا ہی چاہتے ہیں ۔ میں نے تو سُنا ہے کہ تم اس عورت سے ــــ میرا مطلب ہے یعنی ایسی عورتوں سے ہمدردی کرنا بھی گناہ ہے ۔ "

" آپ لوگوں کی باتوں پر یقین کرتے ہیں ۔ اس دُنیا میں لوگ کیا کہیں گے ۔ کے سوا اور کچھ بھی نہیں ۔ میں کوئی بچہ نہیں ــــ اگر مجھے اس لڑکی سے کچھ ہے ۔ تو میں اُس سے نکاح کر سکتا ہوں ۔ میری مرضی بھی تو کوئی چیز ہے ۔ مجھے لوگوں کی پروا نہیں ۔ میں دیکھونگا ۔ لوگ کیا کہیں گے " ۔

اس شام کو وہ سکون سا محسوس کر رہا تھا ۔ سامنے چاند یوں بیٹھی تھی ۔ جیسے وہ مظفر کو قطعی طور پر نہ دیکھ رہی ہو ۔ اتنی دُور ہونے کے باوجود اُس کا انداز ایسی بے بسی سے بھرا تھا ۔ کہ مظفر اپنے دل ہی دل میں اُس پر ترس کھا رہا تھا ۔

ایک چھوٹا سا لڑکا اُس کے پاس آیا " چاند دوائی مانگتی ہے کہتی ہے ۔ تمہاری بڑی مہربانی ہوگی ۔ "

" دوائی۔ کیوں اُسے تکلیف ہے۔ اچھا جاؤ۔ میں دوائی لے کر آتا ہوں۔"

وہ اٹھ بیٹھا۔ اُس کی طبیعت پریشان سی ہو رہی تھی۔ پنواڑی کی دکان پر لوگ اُس کی طرف گھور رہے تھے۔ "پھر کیا ہے" اُس نے دل میں کہا۔ "دیکھتے ہیں تو دیکھا کریں۔" مگر اس نے مٹھی کی شیشی یوں پکڑ رکھی تھی۔ کہ دکان سے لوگ اس دوائی والی شیشی کو واضح طور پر دیکھ سکیں۔

" دوائی لگانے سے کیا فائدہ ہے۔" اُس نے دوائی لگاتے ہوئے کہا۔ "یہ زخم تو پھر کھل جائیں گے۔"

" یہ میرا نصیب۔" چاند نے مزید بے بسی پیدا کر کے کہا۔

" نصیب ۔۔۔ جھوٹ۔ تم خود آزاد ہونا نہیں چاہتیں۔"

" مگر ڈاکٹر صاحب میں اپنے لئے آپ کی بدنامی کیوں کروں۔ لوگ کیا کہیں گے؟"

" لوگ! مجھے لوگوں کی پرواہ نہیں۔ میں تمہیں اپنا بنانے کے لئے تیار ہوں۔ تم میرے ساتھ چلو گی؟"

" مگر مجھ جیسی بدبخت کو ساتھ لے جا کر آپ کیا کریں گے"۔ چاند نے آہ بھر کر کہا۔ جیسے وہ مظفر سے کچھ کہلوانا چاہتی تھی۔

" یہ میری مرضی ہے۔ تم تیار رہو۔ مجھے جواب دو۔"

" ہاں۔ میں جاؤں گی۔" اُس کا بدن ڈھیلا پڑ گیا۔ اُس کی آنکھیں اثبات سے جھک گئیں۔ اُس کا جسم خدا جانے کس بات کا منتظر تھا۔ شاید وہ چاہتا تھا۔ کہ اس اثبات پر کوئی اُسے بھینچ لے۔

" تم تیار رہنا۔ میں کل اس وقت آؤں گا۔ مظفر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

مظفر کو جاتے دیکھ کر چاند جاگ پڑی۔ اس کا وہ سنہری خواب بکھر گیا۔ اُس کا بدن اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑنے پر خود ہی چڑ گیا۔ وہ شرم سی محسوس کر رہی تھی یا شاید غصّہ۔

" ہم جا رہے ہیں بانو۔" چاند اپنی بلّی سے کہہ رہی تھی۔ "یہ دیکھو یہ دو سو روپے ہیں۔ یہ انہوں نے بھیجے ہیں۔ ان کی بڑی مہربانی ہے۔"

" تم جا رہی ہو چاند"۔ اُس کی پڑوسن نے آ کر کہا۔

" ہاں بانو۔ میں جا رہی ہوں ۔۔۔ تم مجھے یاد کیا کرو گی؟"

" کملی ۔۔۔ تمہارے سوا میرا یہاں تھا ہی کون"۔ بانو کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں۔ "مگر تم خوش ہو نہ۔"

" ہاں بہت۔ اس روز روز کے جھگڑے سے تو چھوٹ جاؤں گی۔"

" چاند ایک بات کہوں۔"

" ہاں کہو۔"

" تمہیں اس پر بھروسہ بھی ہے؟ تم ان کی عادتیں جانتی ہی ہو۔ ان کا کوئی اعتبار نہیں۔ وہ اس بات کو کبھی نہیں بھول سکتے۔ کہ وہ ہم کو یہاں سے لے کر گئے ہیں۔ ان کے دل میں ہماری قدر نہیں رہتی۔ یہاں ہمارے پاس آتے ہیں۔ تو انہیں یاد نہیں ہوتا۔ کہ کس کے پاس آئے ہیں۔ اور ہم کیا ہیں۔ مگر ایک دفعہ گھر لے جائیں تو اُن کے لئے یہ بات بھولنی مشکل ہو جاتی ہے۔ شمّو بھی گئی تھی۔ چھ مہینے پٹ پٹ کر واپس لوٹ آئی۔"

" ہاں خدا جانے قسمت میں کیا کیا لکھا ہے۔ کہتی ہوں۔ چلو یہ بھی کر دیکھوں۔"

" نہیں نہیں۔ میں یہ نہیں کہتی۔ کہ وہ ڈاکدر برا ہے۔ وہ تو شریف دکھائی دے ہے۔ ویسے تم خود سوچ لو۔ بس میں یہ کہتی ہوں۔"

سارا دن وہ چیزیں اکٹھی کرتی رہی۔ اور اس کا دل کسی نامعلوم توقع سے دھڑکتا رہا۔ جیسے اُسے کوئی نیا کھلونا ملنے والا تھا۔ اور وہ ایک بچّی تھی۔ اُس کا دل اب "خدا جانے کیا ہوگا" کی دلچسپی سے دھڑک رہا تھا۔

" تم جا رہی ہو چاند؟" بانو کہتی ہے۔ "تم جا رہی ہو"۔ اُس نے ایک کرخت آواز سُنی۔ اور اُس کے بدن میں ایک بجلی سی دوڑ گئی۔

" ہاں میں جا رہی ہوں۔" اُس نے ایک مصنوعی لاپرائی سے کہا۔

وہ دُبلا پتلا مرد کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ "کون جا رہا ہے۔ تم۔ تم کہیں نہیں جا سکتیں۔"

" کیوں نہیں جا سکتی۔ میں تمہاری "باندی" نہیں ہوں۔" اُس نے لپک کر چاند کے بال پکڑ کر گھسیٹ لیا۔ "باندی نہیں تو اور کیا ہے؟"

یہ لو اپنا دو سو روپیہ۔ چاند نے ٹرنک سے نوٹ نکال کر اُس کے پاؤں میں پھینک دیئے۔ "میں اب آزاد ہوں۔"

" روپیہ - یہ تم نے کہاں سے لیا ہے ---- ہاں میں جانتا تھا۔ کہ تم پیسے چرا رہی ہو - یہ روپیہ میرا ہے - تمہارا نہیں - خدا کی قسم میں تمہیں اس جھوٹ کی سزا دونگا۔" اُس نے کونے سے رسہ اُٹھا لیا - اور بیدردی سے اُسے پیٹنے لگا -

چاند دُور سے چیخ رہی تھی - " اور مار لو - اور مار لو - مگر تم مجھے جانے سے روک نہیں سکتے -"

وہ بستر پہ گٹھڑی بنی پڑی تھی - سامنے چوکی پر وہ بیٹھا اُسے گھور رہا تھا -

" میں ابھی جاتی ہوں - میں دیکھوں گی - تم مجھے کیسے روک لوگے -" وہ اُٹھ بیٹھی -

" میں کہتا ہوں چاند تم نہ جاؤ "-

" کیوں نہ جاؤں - مجھے روکنے والے تم کون " چاند نے روتے ہوئے کہا -

" تم پچھتاؤ گی "-

" تمہیں کیا " وہ اُٹھ کر ٹرنک کو تالا لگانے بیٹھ گئی - کمرے میں چاند کی ہچکیوں کے علاوہ بالکل خاموشی تھی - چاند کے چہرے پہ غم کی ایک تصویر کھنچی تھی - جو اُسے اور بھی جاذب بنا رہی تھی - سامنے وہ بیٹھا تھا - اُس کے ماتھے پر بل تھے - کونے میں بلی بیٹھی غرا رہی تھی -

وہ اُٹھ کر چاند کے قریب جا بیٹھا - " چاند " اُس نے اپنا سر چاند کے گھٹنوں پر ٹیک دیا - " تم جا رہی ہو - خدا کیلئے نہ جاؤ "۔

وہ رو پڑا - " تم چلی جاؤ گی - تو میں کس سے لڑا کرونگا - مجھے تم سے محبت ہے -" اُس نے ہچکیوں میں کہا -

چاند کا ہاتھ اُٹھا - اور اُس کے سر کو تھپکنے لگا -

" مگر کیوں " مظفر نے تڑپ کر پوچھا -

" نہیں ڈاکٹر صاحب میں نہیں چاہتی - کہ میری خاطر آپ کی بدنامی ہو -"

" بدنامی "- مظفر پریشان تھا - " مگر کیوں ؟ "

" میں اپنے لئے آپ کی زندگی برباد کرنا نہیں چاہتی -"

" نہیں نہیں - تم کو یہ ذلیل زندگی چھوڑ دینی چاہئے - میں اسے برداشت نہیں کرسکتا -"

" مگر کیوں - میری خاطر اتنا کیوں ؟ "

" کیوں ؟ اُس نے ایک وحشت سی محسوس کرتے ہوئے کہا - " کمینی عورت - فاحشہ -" اُس کا ہاتھ اُٹھا اور اُس نے زور سے چاند کے مُنہ پر تھپڑ مار دیا - " رذیل کسبی -"

ایک ساعت کے لئے چاند کے چہرے پر خدا جانے کیسی چمک سی پیدا ہوئی - پھر وہ بے بسی میں بدل گئی - دو آنسو اُس کی آنکھوں سے ٹپک پڑے -

" مگر آپ ٹھہریئے تو سہی - ذرا ٹھہریئے ڈاکٹر صاحب "- اُس نے منت اور اضطراب سے کہا -

مگر مظفر سیڑھیاں اُتر چکا تھا ۔

(ساقی)

قطعہ

فلک تھا مخالف تو دُشمن زمانہ ہر اِک کی نظر تھی سوئے آشیانہ
جلا کر نشیمن کو اپنے اے مضطر میں گاتا ہوں آزادگی کا ترانہ

احسان اللہ خاں مضطر
صدر بازار ساگر (سی - پی)

عروسِ فردوس

تسنیم اپنے دائیں ہاتھ کی یاسمینی انگلیاں آتشیں رخسار پر رکھے فوارہ کے مرمریں کٹہرے کے پاس کھڑی تھی، پانی کے حسین قطرے اپنی مترنم رنگینیوں کے ساتھ گر گر کر اس کے گورے گورے قدموں کے آگے سجدہ ریز ہو رہے تھے۔ نسیم صبح کے سنکتے ہوئے جھونکے اس کی آبی ساڑی میں حسن افزا ہلکی ہلکی لہریں پیدا کر رہے تھے، شاداب باغیچے کے پھول اس ——— "نسائی شیشے" میں ڈھلی ہوئی احمریں شراب ——— سے مخمور ہو کر دیوانہ وار جھومنے لگے تھے۔ نازنین دوشیزہ کا مستانہ شباب اس کے سفید ملائم جسم سے چھلکا پڑتا تھا، اس کے تبسم ریز لبوں پر لطیف مسرتیں کھیل رہی تھیں۔ سینے میں جوانی کے بے پناہ جذبات اُبھر رہے تھے ......!

آسمانی تارے اس نورانی حسن کو سطحِ ارض پر دیکھ کر پھیکے پڑ چکے تھے، بسنت کی دلفریب صبح اپنی تمام ولولہ انگیزیوں کے ساتھ معراجِ کمال پر تھی، مشرقی افق پر ہلکے ہلکے سنہری بادلوں سے کچھ زردسی روشنی چھن رہی تھی ———!

(۲)

یکایک باہر سڑک پر صدر دروازے کے آگے ایک موٹر آکر رُکی! تسنیم سہم گئی اور لجا کر نسائیت میں ڈوبے ہوئے انداز سے شانوں پر ڈھلکے ہوئے آنچل کو سمیٹا، فوارے سے ہٹ کر دروازے پر نگاہ دوڑائی۔ اور پھرتی کے ساتھ بدن کو چراتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف لپکی۔ ریشمی لباس کی ملائم سرسراہٹ سے فضا میں ایک دلکش موسیقیت پیدا ہو گئی۔

برآمدے میں پہنچ کر ایک بار پھر اُچٹتی ہوئی نظر سے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ نگاہیں صحن سے بھٹکتی ہوئی گئیں اور دروازے پر جم کر رہ گئیں۔......!!

خوبصورت چہرے پر نسائی حیا کی ایک لطیف لہر دوڑ گئی، سرشار آنکھیں مسرت سے چمک اُٹھیں، نیلوفری لبوں پر تبسم رقص کرنے لگا۔ اس کے مخمور جذبات میں اس طرح حرکت ہوئی جس طرح جھیل کے شفاف پانی پر ہلکی ہلکی بوندیں پڑنے سے ایک حسین تموج پیدا ہو جاتا ہے ———!

"پرویز اپنی بڑی ہمشیرہ۔ ثریا ——— کے ہمراہ صحن سے گزر رہا تھا۔"

تسنیم اپنے نوجوان دل کی دھڑکنوں کو سمیٹتی ہوئی کمرے میں داخل ہو گئی۔ وفورِ شوق سے اس کا تنفس تیز ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں پرویز کی صورت پانی میں کانپتے ہوئے چاند کے عکس کی طرح جھلکنے لگی!

دو تین دفعہ وہ باہر جھانکنے کے لئے دروازے تک بڑھی۔ مگر پھر جھجک کر پیچھے ہٹ گئی ———!

یہ حسن و محبت کی دیوی اسی دلفریب اُلجھن میں تھی کہ ثریا کمرے کے اندر داخل ہوئی اور ساتھ ہی پرویز بھی ......!

اشتیاق آمیز نگاہوں کا حسین تصادم ہوا۔ بھرے کٹوروں سے پریم کی شراب چھلکی۔ تسنیم کے پتلے گلابی ہونٹوں کو جنبش ہوئی اور "سرِ دلبراں" "حدیثِ دیگراں" کے سانچے میں ڈھلنے لگا:—

"ثریا! آج سویرے سویرے ہی کیسے آنا ہوا ———؟"

ثریا:۔ "پرویز صاحب کی چھٹیاں ختم ہو گئی ہیں اور آج دس بجے کی گاڑی سے علی گڑھ جا رہے ہیں!"

پرویز:۔ (بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) "تسنیم! خالہ جان کہاں ہیں ———؟"

تسنیم:۔ (مسکراتے ہوئے) "وہ تو نماز پڑھ رہی ہونگی —!"

اس کے بعد تینوں برابر کے وسیع کمرے میں چلے گئے۔ تسنیم کی والدہ نماز پڑھ چکی تھیں۔ والد غسل کر کے باہر نکل رہے تھے تسنیم نے جھٹ آپا سے کہا:۔

"آپا جان! آج پرویز کالج جا رہے ہیں .....!"

اعظم جاہ:۔ "ہیں اتنی جلدی ———؟"

پرویز:۔ "ہاں خالو جان چھٹیاں ختم ہو گئی ہیں ———!"

تسنیم کی والدہ:۔ "دن گزرتے تو کچھ دیر نہیں لگتی ... ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پرویز کل آیا تھا ———!

آخر دونوں بزرگوں نے پرویز کے سر پر ہاتھ پھیرا اور الوداعی دعاؤں کے ساتھ خدا حافظ کہہ کر رخصت کیا ——— !

ثریا اپنی خالہ کے پاس بیٹھی رہی، اعظم جاہ اپنے دفتر چلے گئے۔ پرویز رخصت لے کر اٹھا، تسنیم پر اک جاذبانہ نگاہ ڈالی اور ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھ گیا، وہ کسی رازداں سے تنہائی میں ملنے کے لئے بیتاب ہو رہا تھا، اس کا فریب خوردہ دل جدائی کے بھیانک تصور کی لپٹوں سے جھلس رہا تھا ——— !

محبت نے اپنا مقناطیسی اثر دکھایا۔ تسنیم پروانہ وار اس کی طرف کھنچتی ہوئی آئی اور اس کے برابر کرسی پر بیٹھ گئی ——— !

شعاعِ جمال کی جلوہ پاشیوں سے کمرہ دمکنے لگا، حسن و عشق کے یہ بے لوث مجسمے راز و نیاز کی دلکش نادئیں خاموش بہنے لگے۔ فردوس کی معطر کلیوں کو شرما دینے والے ریاضِ محبت کے یہ پھول ایک دوسرے پر ——— دماغ سے نہ مٹنے والی خوشبوئیں برسانے لگے، امنگوں سے بھرپور نگاہیں بارہا ایک دوسرے پر اُٹھیں مگر چہروں سے پھسلتی ہوئی نیچے جھک گئیں۔ آخر جذبات مچل اُٹھے، ذوقِ تکلم کے لبریز پیمانے چھلک پڑے — !

تسنیم اپنی نظروں کے خوبصورت جھکاؤ میں بیباک شرارتیں سمیٹے ہوئی بولی! —

"پرویز! ہماری معصوم طبیعتوں کا پیارا ملاپ اس وقت ہوا جب ہمارے ننھے دل ابھی پریم کی امرت بھری کسک سے بے نیاز تھے بچپن سے اس دن تک ہم دونوں آغوشِ محبت میں اکٹھے کھیلتے رہے ..... لیکن پرویز! کیا ہم اپنے جیون کی آنے والی بہاریں بھی اسی طرح مل کر کاٹ سکتے ہیں ——— ؟"

——— "پیاری تسنیم! یہی سوال تنہائی کی راتوں کے سناٹے میں اکثر مجھے بھی بیچین کرتا ہے ....! "خالہ جان اگر بجلی نہ گرائیں تو یہ "آشیانِ محبت" جس کا ایک ایک تنکا ہم نے سترہ سال کی طویل کوششوں سے جمع کیا ہے ——— آج بھی نذرِ آتش ہونے سے بچ سکتا ہے۔

ورنہ ....!"

——— "میرے محبوب ترین سرمایہ نازش! آپا جان سے یہ توقع رکھنا سراسر غلطی ہے ......!

میری روحِ حیات! خدا کارساز ہے ——— !

"اچھا پرویز! مجھے علیگڈھ جا کر بھول تو نہیں جاؤ گے ——— ؟"

تسنیم! جس طرح پھول کی پتی پر لرزتے ہوئے اوس کے قطرے میں آفتاب کا "زریں عکس" ..... اُس وقت تک جھلکتا رہتا ہے — جب تک کہ وہ تحلیل نہ ہو جائے۔ اسی طرح میرے جسم کے ذرے ذرے میں سمائی ہوئی تیری "حسین یاد" اس وقت تک نہیں چھوٹ سکتی جبتک کہ میں خود صفحۂ ہستی سے فراموش نہ ہو جاؤں .....!

تسنیم ابھی اس مستانہ تخیل کی داد اپنی خوبصورت شرم آلود مسکراہٹ سے دے ہی رہی تھی کہ ثریا کمرے میں داخل ہوئی ......!

دونوں کے مشکور چہروں پر متبسم حیا کی رنگین موجیں دوڑ گئیں، سازِ محبت کے بیباک نغموں کا تسلسل ٹوٹ گیا، راز و نیاز کی جھلکیاں بند ہو گئیں دلوں کی پُرکیف سنسناہٹ رُک گئی۔ ترنم آفریں لمحوں کی "شعریت" افسردہ ہو گئی ......!

ثریا اپنے بھائی کی ایسی مشغول فرصتوں سے بیحد مانوس ہو چکی تھی۔ اُس پر انتہائی تمنا تھی کہ آسمانِ محبت کے یہ "نورانی ستارے" اسی طرح مل کر چمکتے رہیں — !

پرویز اپنی ہمشیرہ کو دیکھ کر جانے کے لئے اُٹھا — ! کمرے کی دیواریں ہانپنے لگیں، آخری متشائم نگاہیں لڑیں، ڈبڈبائی آنکھوں سے ٹوٹتے ہوئے قطروں نے ایک دوسرے کو الوداع کہا۔ چہروں پہ گڑی ہوئی نظریں جھکیں اور دونوں ایک دوسرے سے اوجھل ہو گئے ——— !

(۳)

دن کے ہنگامے ختم ہو چکے تھے، عروسِ شام اپنی پُرشباب رعنائیوں کے ساتھ بسترِ نور پر مستِ ناز تھی۔ خاموشی نہایت ہلکے ہلکے سُروں میں سکون کے گیت گا کر کائنات کی آبادیوں پر محویت برسا رہی تھی۔ پانی کی تھکی ہوئی موجیں روانی کے جھولوں میں جھولتی ہوئی سو گئی تھیں گلشنِ آفاق پر عالمِ غنچگی طاری تھا، چاند دریائے نور کی سیمابی لہروں پر ہچکولے لیتا ہوا مستانہ وار بہہ رہا تھا، نقرئی روشنی زمین کی وسعتوں میں آوارہ تھی، خوشگوار ہوا کے شیریں جھونکے خستگانِ خواب کو تھپک تھپک کر سلا رہے تھے ——— !

مگر آہ تسنیم ..... حزیں دلوں کی راحت تسنیم .....! اپنی منگنی کی خوفناک خبر سُن کر تڑپ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سے نیند اُچاٹ ہو گئی تھی، وہ تنہائی میں اپنے خوبصورت ہاتھ جوڑ کر اپنی ملتجی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھائے "حاکمِ اعلیٰ" سے یوں گڑگڑا کر فریاد کر رہی تھی :—

"آقا! سُنتی ہوں کہ تو بیکسوں کا آخری سہارا ہے۔ میں مظلوم ہوں تو میرا ہاتھ پکڑ! اور مجھے بحرِ حیات کے طلاطم سے بچا لے!!

کیا مجھے اپنے شریک زندگی کے متعلق رائے دینے کا بھی حق حاصل نہیں! آہ! میں عورت ہوں اور صرف اِسی گناہِ بیگناہی کی پاداش میں میری جوان آرزوؤں کا خون کیا جا رہا ہے۔ سوسائٹی مجھے جس کے ساتھ چاہے شادی کی زنجیروں میں جکڑ دے اور گھلا گھلا کر مار دے! لیکن آہ! میں ـــــ بدنصیب عورت اُف تک نہیں کر سکتی!

میرے مالک بچا! ـــــ تو ہی مجھے سوسائٹی کی معزز سفاکیوں سے بچا!!

میرے کمزور ہاتھوں سے پریم رس کا بھرا ساغر باہیں مروڑ کر چھینا جا رہا ہے ـــ!

میرے مقدس آقا! میں اپنا دل کسی ایک کو دے کر جسم کسی دوسرے کے حوالے نہیں کر سکتی۔ میں پرویز کی ہو چکی ہوں۔ اب کسی ایسے اجنبی کی عمر بھر غلام نہیں بن سکتی۔ جس کو آج تک میری آنکھوں نے دیکھا تک نہیں جس کے مزاج کا دھندلا سا تصور بھی میرے دماغ میں نہیں آسکتا!

آقا! میرے آباء شادی کو بھی ایک بیوپار سمجھے ہوئے ہیں۔ وہ محض مذہب کے فروعی اختلاف کے بہانے میرے رنگین افسانۂ حیات کو دُکھ بھری بپتا بنا رہے ہیں!!

قادرِ مطلق! کیا تو دو بھرپور جوانیوں کو غارت ہونے سے نہیں بچا سکتا! کیا تو دو بیقرار موجوں کو ساحلِ مقصود تک نہیں پہنچا سکتا۔ اُف......!!

آسمان کے تارو! خدا کے حضور میں جا کر میری تائید کرو!

فردوس کی حورو! میری التجائیں خدا تک پہنچاؤ!!.....!!!"

تسنیم کا دم گھٹنے لگا وہ لرز گئی اور مضطربانہ حالت میں ہاتھوں کے ساتھ چہرے کو پکڑ لیا آنکھیں زور سے بند کر لیں اور ایک المناک چیخ مار کر زمین پر گر پڑی.......!

رات کے سنسان سناٹے میں حرکت پیدا ہوئی ـــــ تسنیم کی ماں یہی ہولناک منظر خواب میں دیکھ رہی تھی۔ اس کی نیند اُچٹ گئی۔ وہ گھبرا کر اٹھی اور جھٹ اپنی لڑکی کے بستر پر ایک متجسس نگاہ دوڑائی۔ بستر خالی پا کر اس کے حواس گم ہو گئے، شوہر کو جلدی سے جگایا۔ دونوں اس کی تلاش میں باہر نکلے اور تسنیم کو زمین پر بیہوش پڑا دیکھ کر خوف سے کانپنے لگے ـــــ!

(۴)

اپریل کا مہینہ شروع تھا، پرویز اپنے ہوسٹل کے آراستہ کمرے میں اداس بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے میز پر کتاب کھلی پڑی تھی۔ کبھی کبھی دو چار حرف پڑھتا مگر پھر نڈھال ہو کر پیچھے گر جاتا اور کسی گہرے خیال میں کھو جاتا ـــ! اس کا عمیق تنفس اور بیاضِ چشم کی مایوس صباحت، اس کے شدید ذہنی انتشار کا پتہ دے رہے تھے، اس کے دل و دماغ پر کسی کی یاد مسلط تھی۔

کتاب سے ایک دو فقرے پڑھ کر وہ سوچنے لگا کہ "امتحان بالکل قریب ہے، باوجود کئی خط لکھنے کے آج تیسرا ہفتہ ہوا تسنیم کے متعلق کوئی خبر نہیں آئی۔ آخر......!"

اتنے میں چٹھی رساں نے آکر ایک لفافہ دیا۔ لفافہ ہاتھ میں لیکر وہ خوشی سے اُچھل پڑا اور فوراً پھاڑ کر یوں پڑھنا شروع کیا:۔

از لاہور۔
۱۶ / اپریل

پیارے بھائی پرویز

سخت افسوس ہے کہ تجھے بعض ناگزیر حالات کی وجہ سے جواب نہ دے سکی۔ تمہیں یہ سن کر ضرور صدمہ ہوگا۔ کہ خالو جان نے ہماری تمام پیشکشوں کو ٹھکراتے ہوئے تسنیم کی نسبت منصور کے ساتھ ٹھہرا دی ہے بہن تسنیم اُسی دن سے بیمار ہے۔ علاج کے باوجود بخار میں کوئی افاقہ نہیں ہوتا ـــــ!

اگرچہ میں تمہارا دل اس جانگداز خبر سے توڑنا نہیں چاہتی تھی، مگر تمہارے پیہم اصرار نے مجھے شرمندۂ لغزش ہونے پر مجبور کر دیا ـــــ!

تم مایوس ہو کر صبر کا دامن ہاتھ سے نہ دینا، ہماری کوششیں بدستور جاری ہیں.....!"

تمہاری دعاگو
ثریا

خط پڑھ کر پرویز کی آنکھیں خون کے آنسو پی کر رہ گئیں۔ اس کی امیدوں کی دُنیا لُٹ چکی تھی۔ وہ کرسی سے لڑکھڑاتا ہوا اُٹھا اور اس دردناک صدمے سے چور ہو کر پلنگ پر گر پڑا ـــــ!

نوکر دوپہر کا کھانا لے کر آیا مگر یہ پُرہول منظر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اُس نے چند مسلسل سوالات میں بےچینی کی وجہ معلوم کرنا چاہی مگر پرویز نے

سوائے اس کے کچھ نہ کہا کہ: "جمن ذرا یہ کمبل میرے اوپر ڈال دو — مجھے بخار آ رہا ہے"!

نوکر کمبل اوڑھا کر چل دیا۔ ڈاکٹر صاحب تشریف لائے۔ بخار ۱۰۴ ڈگری تک پہنچ چکا تھا۔

چھ دن تک مزارِ محبت پر یہ شمع گھل گھل کر اسی طرح جلتی رہی۔ آخر ساتویں روز کہیں جا کر بخار ٹوٹا۔ ڈاکٹروں نے اطمینان کا دم لیا۔ مگر اب پرویز وہ پہلا پرویز نہیں تھا بلکہ ایک نوشگفتہ غنچہ —— جس پر خزاں چھا گئی ہو —! ایک اشکِ حسرت —— جو پلکوں میں آ کر رہ گیا ہو! ایک اسیرِ قفس —— جس کا ذوقِ جستجو مجروح ہو چکا ہو!!!

اب وہ رونقِ شباب کا ماتم دار تھا۔ دنیا میں اس کے لئے کوئی دلبستگی باقی نہ تھی۔ اس کو اپنا موضوعِ زندگی بے عنوان سا نظر آنے لگا — بیماری نے اس کو سخت لاغر کر دیا۔ اس کی جنوں زائیاں استعجاب انگیز حد تک پہنچ گئیں، وہ تنہائی میں بارہا تسنیم کے ساتھ جذباتی مکالمے کا مرتکب ہوتا اور پھر اپنی حالت پر حیراں ہو کر رہ جاتا ——!

(۵)

بی۔ اے کے سالانہ امتحان میں صرف ایک ہفتہ باقی تھا۔ پرویز کا گزشتہ تعلیمی ریکارڈ اس کی قابلِ رشک ذہانت کا ایک چمکتا ہوا ثبوت تھا۔ پروفیسروں کی رفیع توقعات کی روشنی میں اس کی شاندار کامیابی یقینی تھی!

مگر باوجود اس کے پرویز امتحان سے سخت گھبرا رہا تھا۔ اس کا بدن امتحان کے خوف سے جھنجھنا اٹھتا تھا —— آہ! کسی کو کیا معلوم کہ قسمت اس کے ساتھ کیا ستم ظریفی کرنے والی ہے، سوسائٹی کی نبرد شیں اس کی کامیابی کے راستے میں کس طرح حائل ہو جائیں گی۔

آخر امتحان آ گیا اور پرویز اس میں شامل ہو گیا۔ امتحان میں اس کے تخیل پر ایک معمائی کیفیت چھا رہی تھی، وہ بڑی کاوش سے ایک دو لفظ لکھتا مگر پھر اس کا دماغ اضطراری جذبات سے الجھ کر رہ جاتا، اس کو خود معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ کیا لکھ رہا ہے، وہ مشکل سے دو تین سوالوں کے نامکمل جوابات لکھتا کہ وقت ختم ہو جاتا۔ اس کو اپنی کامیابی کی ذرا بھی امید نہ تھی ——!

آخری پرچہ پورا بھی چھوڑ کر پرویز اسٹیشن پر جا پہنچا، اس کی سانس اکھڑ رہی تھی، دل دھڑک رہا تھا، مکان جانے کا ارادہ ملتوی کر کے جھٹ شملے کا ٹکٹ لیکر گاڑی میں سوار ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر آپا کو لکھا کہ مجھے ڈاکٹر نے تفریح کے لئے شملہ بھیجا ہے، جس وقت صحت ٹھیک ہو گی، میں حاضر ہو جاؤں گا۔

شملے کے قیام نے پرویز کو اور بھی نحیف کر دیا۔ آٹھوں پہر تسنیم کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہ تھا۔ جدائی کے لرزہ خیز تصور سے اس کی مظلوم آنکھیں ہر وقت اشکبار رہتیں اور وہ ہر روز خدا کے سامنے حاضر ہو کر اس طرح دل کی بھڑاس نکالتا:۔

"اے خدا! ہماری جوانیوں کو اس طرح غارت نہ کر! سماج ہماری مسرتوں کو تباہ کرنے پر تلا ہوا ہے، تو ہمیں اس کے خود غرضانہ مظالم سے بچا لے!!

بے گناہ تسنیم بستر پر پڑی گھل رہی ہے۔ اگر اور نہیں تو اس کے پاک دل سے میری تکلیف وہ یاد نکال دے!

وہ محض اپنی فطری وفاشعاری کے الزام میں روحانی اذیتوں میں مبتلا ہے۔ الٰہی! تو اس کے معصوم شباب پر ایک نظر کر.....!

آہ تسنیم! پیاری تسنیم!! تو عورت نہیں ایک دیوی ہے۔ تو اس دنیا میں کیوں بھیجی گئی۔ جہاں ہر طرف انسانی ہوس کاریوں کی تاریک گھٹا چھا رہی ہے ——!

تیری معصوم سیرت اور پاک عصمت کی مثال فردوس کے گوشوں میں ڈھونڈے نہیں ملتی ——! مگر آہ..... سوسائٹی تیرے خلوص کو زخمی کرنا چاہتی ہے۔ وہ تیرے فطری گداز ترنم کو مسخ کرنے کی مذموم کوشش کر رہی ہے......!

تسنیم! تو مجھے بھول جا —— بھول جا ——!! خدا کے واسطے تو مجھے بھول جا —— ! میں تجھ سے خوش ہوں۔ تو اپنے آپ کو بھی خوش رکھ......!!!"

پرویز اپنی زندگی کے سنسان اسی دلگداز شغلِ فراق میں کاٹتا رہا۔ اس کا رنگین شباب اسی دردناک سانحۂ حیات کی نذر ہونے لگا، اس کے چہرے کی رنگت زرد پڑ گئی، گفتار میں سوز اور رفتار میں خستگی پیدا ہو گئی۔

مگر تسنیم کی نہ بھولنے والی یاد ہر روز نئی قوت کے ساتھ اس کی روح کی گہرائیوں میں پیوست ہوتی گئی.....!

(۶)

دو ہفتے اسی طرح گزر گئے۔ مگر تسنیم کی حالت روز بروز خراب ہوتی گئی، اعظم جاہ چودہ روز سے اپنے کام پر نہیں گئے تھے، مزدوروں نے ان کی عدم موجودگی سے ناجائز فائدہ اٹھانا شروع کیا۔ جس کی وجہ سے ان کے

میں ایک لاکھ روپے کا نقصان رہا — ان انقلاب نے انہیں کچھ اس طرح جھنجھوڑا کہ وہ سخت گھبرا گئے اور فوراً اپنے اکلوتے لڑکے اشفاق کو جو بنوں میں پولیس انسپکٹر تھا بلا بھیجا۔

ان دنوں اشفاق اپنے افسر بالا شہاب احمد کا خاص طور پر مرکزِ التفات تھا۔ پہلے وہ سب انسپکٹر کے عہدے پر فائز تھا مگر اب شہاب کی خوشنودی کے صلے میں وہ انسپکٹر ہو گیا تھا، جس کے لئے وہ صحیح طور پر اُس کا شرمندۂ احسان تھا، اشفاق اُس کی ہر بات کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے کو اپنے لئے باعثِ افتخار سمجھتا تھا۔

شہاب کی عمر ۳۵ برس کی تھی۔ مگر وہ اُس دوران میں تین دوشیزہ لڑکیوں کا ذخیرۂ حیات لوٹ چکا تھا، وہ تین دفعہ اشفاق کے ہمراہ لاہور آیا تھا اور پرویز کی امانت کو غاصبانہ نظروں سے تاکتا رہا تھا۔ اب اس کی ہوسناک نگاہیں تسنیم کے دامنِ عصمت پر جمی ہوئی تھیں۔ آخر اُس نے اشفاق کو ترقی دیکر اپنے حصولِ مقصد کا آلۂ کار بنا لیا، اشفاق کے والدین اس کی کسی بات کو رد نہیں کرتے تھے ....!

اباجان کے بلانے پر اشفاق فوراً چھٹی لے کر مکان پر پہنچا —
تسنیم کی ناساز حالت دیکھ کر سخت آزردہ ہوا، ڈاکٹروں کا علاج زیادہ احتیاط سے شروع کیا گیا۔ مگر دو تین روز کے بعد جب اُس نے منگنی کی خبر سُنی تو اُس کے بدن میں آگ لگ گئی، اس کو اپنے خود غرضانہ عزائم اور ذاتی مفاد سب خاک میں ملتے نظر آئے۔

آخر اسی روز اُس نے اپنے والدین کی رضامندی سے اپنی ہمشیرہ کی نسبت توڑ دی۔ اور دل ہی دل میں اُس کا رشتہ شہاب کے ساتھ منسوب کر دیا۔ تسنیم اپنے بھائی کی آمد کو ایک معجزۂ محبت سمجھنے لگی۔ اُس کی ڈوبتی ہوئی نبضیں اُچھل پڑیں اور چند ہی دنوں میں اُس کی صحت سنبھلنے لگی ——!

ثریا اور اُس کے والدین اس حوصلہ افزا خبر سے بیحد خوش ہوئے۔ چنانچہ اسی وقت پرویز کو تار دیا گیا۔

پرویز کا دل اس حیات بخش بشارت کے سنتے ہی کنول کے پھول کی مانند کھل گیا۔ مایوسی کی ظلمتیں چھٹ گئیں اور اپنے لاغر بدن میں ایک روحانی انقلاب محسوس کرنے لگا، کملائے ہوئے چہرے سے سب کلفتیں دُھل گئیں، اُس کی غم آلود آہیں لوحِ ماضی میں جذب ہو کر رہ گئیں، اور دل کے تاریک گوشے شمعِ امید سے منور ہو گئے ——!

اسی وقت گھر جانے کی تیاری شروع کر دی۔ تیسرے روز وہ لاہور جا پہنچا۔

تسنیم سے ملنے کے لئے اُس کے دل میں چشمۂ شوق اُبل رہا تھا۔ سامان گھر بھجوا کر سیدھا خالہ کے مکان پر گیا ——!

تسنیم بستر پر لیٹی ہوئی تھی (پاس صرف ایک نوکرانی تھی) پرویز کو دیکھ کر فوراً اُٹھ بیٹھی، اُس کی آنکھیں روشن ہو گئیں چہرے پر فرحت بخش رونق نمودار ہوئی۔ لبوں پر تبسم رقص کرنے لگا وہ اپنی دھیمی آواز میں بے اختیار بولی:-

"پرویز ......!"
"تسنیم ....!"
"آپ آ گئے .....!"

(کرسی پر بیٹھتے ہوئے) "ہاں تسنیم ... آہ کس قدر کمزور ہو گئی ہو! تمہاری بیماری نے تم سے جوہرِ شباب چھین لیا ہے .....!!"

"پرویز! جب بہار آتی ہے تو خزاں سے مرجھائے ہوئے پھول کھل جاتے ہیں ..... صدف سے نکل کر گوہر چمکنے لگتا ہے .....
آپ کی صحبت میں یہ کمزوری جلدی دور ہو جائے گی مگر پرویز آپ ....؟"

تسنیم! جب پرندے کا ایک پر زخمی ہو جائے تو دوسرا بھی ناقابلِ پرواز ہو جاتا ہے ..... تسنیم! ہم دونوں محبت کے فرشتے کے دو پر ..... ہیں!

"اچھا تسنیم میں گھر سے ہو کر آتا ہوں۔"

کچھ دن کم ایک مہینہ تک یہ محبت کے اسیر باہمی صحبت کی بہاریں لوٹتے رہے۔ ان کا رنگینِ شباب پھر کروٹیں بدلنے لگا۔ زندگی کی بجھی ہوئی اُمیدیں دوبارہ زندہ ہونے لگیں ——!

اشفاق بنوں چلے گئے۔ پرویز کے پاس ہونے کی خبر موصول ہوئی اس کامیابی سے دونوں کی خوشیوں میں اضافہ ہو گیا۔ وہ ایک دوسرے کی روحانی پرور صحبت میں روحانی غذا حاصل کر کے تجدیدِ حیات کے لطف اُٹھانے لگے، دلوں میں مستقبل کے نشاط انگیز خیال سما رہے تھے .....!

مگر آہ! زمانے کی گردش نے غضب ڈھایا، سماجی خود غرضیوں کے سیاہ بادل گھر کر چھا گئے —— شہاب اور تسنیم کے رشتے کی تیاریاں ہونے لگیں ——!!

اس لرزہ خیز واقعہ سے دونوں پر بجلی ٹوٹ پڑی۔ امیدوں کی بلند عمارتیں ڈھیر ہو کر رہ گئیں ——۔

شادی شروع ہو گئی۔ دونوں کے دل لپکتے ہوئے شعلے کی طرح بل کھا رہے تھے مگر رخصتی کے ایک دن قبل تسنیم کے دل میں اس قدر درد اٹھا جس نے دوسرے ہی روز پرویز کی امانت کا خونی فیصلہ سنا دیا —— ! تسنیم وفا کی دیوی سسرال کو رخصت ہونے کی بجائے یہ کہتے ہوئے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئی کہ ؎ حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم ؛ شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم

جاوید بیگ

افکارِ تازہ

شباب و عشق کا اپنا بھی اِک زمانہ تھا — خبر نہیں کہ حقیقت تھی یا فسانہ تھا
الٰہی توبہ میں اس جذبِ دل سے باز آیا — کہ آج اس کا ہر انداز والہانہ تھا
نظر نے اور کیا کیا حصولِ غم کے سوا — کہ ربطِ خاصِ محبت تو غائبانہ تھا

"جامعہ"

میں رسما اب سکونِ دل کی اس سے بھیک کیا مانگوں — جو میرے دِل میں رہ کر دِل کا درماں ہو نہیں سکتا
چنوں پھول اور کانٹے چھوڑ دوں یہ کیا قیامت ہے — ہوائے گل میں اتنا تنگ داماں ہو نہیں سکتا

"زمانہ"

رفتہ رفتہ عشق کو تصویرِ غم کر ہی دیا — حسن بھی کتنا خرابِ گردشِ ایام تھا
بے خطا تھا حسن ہر جور و جفا کے باوجود — عشق کے ذمے مگر الزام ہی الزام تھا

خونیں چشمے اُبل رہے ہیں یا رب — خنجر سینوں پہ چل رہے ہیں یا رب
تجھ کو بھی خبر ہے کہ تری دُنیا میں — چھوٹوں کو بڑے نگل رہے ہیں یا رب

"پنچ ویکلی"

کوئی منزل حسن سے خالی نہیں پاتا ہوں میں — وہ مرے ہمراہ ہوتے ہیں جہاں جاتا ہوں میں
ایک دم کو بھی اگر کچھ آپ میں آتا ہوں میں — اپنا عالم دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں میں
روز اک تازہ تمنا دِل میں پاتی ہے جگہ — اپنا دامن آپ ہی کانٹوں میں الجھاتا ہوں میں

"اجمل"

کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے بہت سوچا ہے — آپ کا راز تو شائد نہیں حسرت میری

نازک ہے مزاج آپ کے بیمار کا بے حد — اُٹھے گا نہ اس سے کبھی احسان قضا کا

"سب رس"

کچھ مضطرب سی عشق کی دُنیا ہے آجتک — جیسے کہ حسن کو نہیں دیکھا ہے آجتک
تو نے کبھی کیا تھا جو ذکرِ غمِ فراق — دل کو لگا ہوا وہی کھٹکا ہے آجتک
تو نے جھلک دکھا کے جیسے منہ چھپا لیا — وہ چشمِ شوق محوِ تماشا ہے آجتک

حسن بھی جانتا کچھ سوزشِ اُلفت کے مزے — شعلۂ شمع سے پروانہ بنایا ہوتا
لذتِ درد باندازۂ دل دے ورنہ — درد کو دل جو بنایا نہ بنایا ہوتا

"ساقی"

باورچی خانے کا بھوت

غروب آفتاب سے ذرا پہلے ہم دو دوست ایک برآمدے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ کہ اتنے میں نصراللہ خاں تشریف لائے اور علیک سلیک کے بعد میرے پہلو میں بیٹھ گئے۔ چائے سے فارغ ہونے کے بعد اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اور گفتگو کا موضوع ہر دو چار منٹ کے بعد بدلتا گیا۔ سردی زیادہ ہو گئی۔ اس لئے برآمدے میں بیٹھنا دشوار ہو گیا۔ ہم اُٹھ کر اندر کمرے میں جا بیٹھے اور گفتگو کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔

نصراللہ خاں ہمارے دیرینہ دوست تھے۔ اور اکثر ہماری صحبتوں میں حصہ لیتے رہتے تھے۔ گذشتہ بیس پچیس روز سے ہم نے ان کی شکل نہ دیکھی تھی۔ اب جو آئے تو سب نے کہا کہئے اتنی مدت سے کہاں غائب رہے۔ نصراللہ خاں نے سگرٹ کا ایک کش لگایا اور مسکراتے ہوئے کہا۔ بابا ہم ملازم آدمی ہیں۔ کوئی اپنے اختیار میں تو ہے ہی نہیں کہ جہاں چاہیں رہیں۔ محکمہ والے جہاں چاہتے ہیں پھینک دیتے ہیں۔ اور پھر پولیس والوں کو تو ایک جگہ چین سے رہنے ہی نہیں دیا جاتا۔ ابھی ابھی ایک تفتیش کے سلسلے میں گیا تھا۔ آج بیس دن کے بعد واپس آیا ہوں۔

ہوا کی تیزی بڑھ گئی۔ اور بادلوں کی وجہ سے تاریکی میں بھی اضافہ ہو گیا۔ دروازوں اور کھڑکیوں کی چقیں جو کنڈوں کے ساتھ اپنا سر دے دے کر مار رہی تھیں اور ہر دو سیکنڈ کے بعد کھٹاک کھٹاک کی آواز سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی تھی۔

کیسی بھیانک رات ہے۔ میں نے اپنے دل میں کہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے جنوں نے ہمارے مکان کا محاصرہ کر لیا ہے۔

تڑاخ سے ایک کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا اور شیشے کے ٹکڑے چھر چھر کرتے نیچے آ پڑے۔ راشد! میں نے اپنے نوکر کو آواز دی سب کھڑکیاں بند کر دو۔ ہوا بہت تیز ہے۔ شیشے ٹوٹ رہے ہیں۔

حمید صاحب میرے مقابل کی کرسی پر بیٹھے دھوئیں کے گولے بنا بنا کر اڑا رہے تھے۔ میری آواز سے کچھ چونک پڑے اور بولے۔ کہیں آپ کے مکان میں آسیب تو نہیں ہے؟

"آسیب" میں نے قہقہہ لگا کر کہا۔ آپ بھی آسیب کے قائل ہیں۔ میاں آسیب واسیب کیا ہے۔ یہ تو لوگوں کے ڈھکوسلے ہیں۔ جب چاہتے ہیں۔ طرح طرح کی باتیں گھڑ لیتے ہیں۔

ڈھکوسلے! حمید نے استفہامیہ انداز میں کہا۔ آپ کے خیال میں ہونگے میں تو اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ اور جو چیز انسان خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔ اس سے انکار ہو بھی کیسے سکتا ہے۔

نصراللہ خاں نے کہا۔ میں نے خود تو کوئی واقعہ نہیں دیکھا۔ مگر سُنا ضرور ہے۔

"سُنا" حمید نے جوش میں آ کر کہا آپ کہتے ہیں۔ "سُنا ہے! میں نے خود۔ خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

ایک لمحے کے لئے خاموشی چھا گئی۔ ہوا کی تیزی بدستور تھی۔ اور گھڑی کی ٹک ٹک کے سوا کوئی آواز نہ آ رہی تھی۔ انگیٹھی کے کوئلے مدھم پڑ چکے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا گویا راکھ کی سفید چادریں اوڑھے سو رہے ہیں۔

راشد! میں نے اپنے نوکر کو آواز دی۔ "انگیٹھی میں کچھ کوئلے ڈال جاؤ۔" ٹن! گھڑی نے آدھا بجایا۔ سب کی نظریں یکلخت گھڑی کی طرف اُٹھیں۔ "ساڑھے گیارہ"۔ نصراللہ نے متعجب ہو کر کہا۔ چلنا چاہئے اب بہت دیر ہو گئی ہے۔ "بیٹھئے!" میں نے ان کا بازو تھامتے ہوئے کہا۔ اتنے دنوں کے بعد تو آپ آئے ہیں۔ بیٹھئے ذرا حمید صاحب کا چشم دید واقعہ بھی سُن لیجئے۔

"حمید صاحب!" نصراللہ نے گردن پھراتے ہوئے کہا "تو پھر سُنا دیجئے کیا واقعہ ہے۔ ہم بھی دیکھیں کہ آپ کے بیان میں کہاں تک حقیقت ہے"۔

'تمام تر'۔ حمید نے کہا۔ 'تمام تر حقیقت۔ آپ لوگ کرتے ہیں سُنی سنائی باتیں۔ اور میں جو کچھ کہہ رہا ہوں۔ وہ حقیقت ہے سراسر حقیقت۔ آپ اسے مانیں یا نہ۔ مجھے اس سے بحث نہیں۔ مگر واقعہ بالکل سچا ہے۔

اب بھی جب کبھی مجھے اس کا خیال آتا ہے۔ میرے جسم میں کپکپی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور میرا رواں رواں کانپنے لگتا ہے۔ اس سے پہلے میں بھی یہ سمجھا کرتا تھا۔ کہ یہ نرے ڈھکوسلے ہیں۔ اور کچھ نہیں۔ لیکن جب سے یہ واقعہ پیش آیا۔ مجھے انکار کی جرأت نہیں ہوتی۔

حمید نے سگرٹ کا ایک لمبا کش لیا۔ اور اس کی راکھ جھاڑتے ہوئے بولا۔ کوئی چار برس ہوئے۔ مجھے شکار کا بہت شوق تھا۔ صبح و شام شکار کے پروگرام بناتا رہتا تھا۔ جہاں ایک دن کی بھی مہلت ملی۔ اور بندوق اٹھا کر چلدیا۔ ایک دن ہم چار شکاری اور سب کے سب دلیر اور اچھے نشانہ باز۔ موٹر میں بیٹھ کر بہت دور نکل گئے ابھی سورج غروب نہ ہؤا تھا۔ کہ ہم ایک گھنے جنگل کے پاس سے گزر کر ایک بہت بڑے مکان کے پاس پہنچے۔ مکان کیا اچھی خاصی کوٹھی تھی۔ تھی تو عمدہ۔ مگر ویران۔ دیواروں کی سفیدی جگہ جگہ سے جھڑ رہی تھی۔ احاطے کے درخت سوکھے ہوئے اور بیلیں خشک پڑی تھیں۔

"عزیز بیگ!" میں نے اپنے دوست سے کہا۔ "کوٹھی تو شاندار ہے۔ مگر کسی کی غفلت کا شکار ہو رہی ہے"۔

ہم اس کوٹھی کے احاطے کے پاس سے گزر رہے۔ اور مالک مکان کی لاپرواہی و بے توجہی پر فقرے چست کرتے ہوئے آگے نکل گئے۔ سامنے کوئی ایک میل کے فاصلے پر ایک قصبہ تھا۔ ہم وہاں جا اترے اور قصبے کے ذیلدار کے ہاں مہمان ٹھہرے۔ تھوڑا بہت شکار جو ہمارے پاس تھا۔ اُن کی نذر کیا۔ اور رات وہیں بسر کرنے کی ٹھانی۔

کھانے سے فراغت پا کر ہم نے اس مکان کی نسبت گفتگو شروع کی۔ "وہ مکان"۔ ذیلدار نے خوفزدہ ہو کر کہا۔ "نہایت خطرناک مکان ہے وہاں بہت سے واقعات ایسے ہوئے ہیں۔ کہ جن کے سننے سے بدن کا رونگٹا رونگٹا کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور جسم میں تھرتھری پیدا ہو جاتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "یہ سب سُنی سنائی باتیں ہیں۔ ہم نے ایسی باتیں بہت سُنی ہیں۔ کل صبح سے ہم اسی مکان میں ٹھہرینگے دیکھ لیں گے کیا ہوتا ہے؟"

ذیلدار نے بہتیری طرح سے سمجھایا۔ مگر ہم اپنی ضد پر اڑے رہے۔ "سُنیئے" اُس نے کہا۔ "ابھی کوئی ایک سال ہؤا۔ یہاں ایک انجینئر صاحب ٹھہرے تھے۔ لوگوں نے بہتیرا منع کیا۔ مگر نہ مانے۔ رات کو اُن کی وہ گت بنی۔ کہ بھاگتے ہی نظر آئے۔"

میں نے کہا۔ کچھ بھی ہو۔ ہم اس مکان میں ضرور ٹھہرینگے۔

اگلے دن صبح کو دو تین بھنگی بھیج کر اس کی صفائی کرائی اور اپنا بستر بوریا سنبھال وہاں جا اُترے۔ مکان کی اندرونی حالت اچھی خاصی تھی۔ ہر طرف روشنی۔ ہر طرف ہوا۔ غلاظت اور گندگی نام کو بھی نہ تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آتے تھے۔ اور طبیعت ایسی بشاش تھی۔ کہ باید و شاید۔

ہم نے نوکر سے چائے پکانے کو کہا۔ اور خود تھوڑی دیر کے لئے باہر چلے گئے۔ نوکر نے باورچی خانے میں آگ جلائی۔ اور پانی کی کیتلی رکھ کر دُودھ لینے چلا گیا۔ ہم کوٹھی کے احاطے میں اِدھر اُدھر گھومتے رہے۔ اور کوٹھی کی خوبصورتی و عمدگی کی تعریف کرتے رہے۔ اتنے میں نوکر دودھ کا برتن ہاتھ میں لئے کانپتا ہؤا آیا۔

ہیں! میں نے اُس کی طرف دیکھ کر کہا۔ تمہیں کیا ہؤا ہے۔ حضور۔ حضور! واصف نے ہانپتے ہوئے کہا۔ کیتلی میں تو خون اُبل رہا ہے۔

خون! میں نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ اور ہم ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ اور جلد جلد قدم اُٹھاتے ہوئے باورچی خانے کی طرف بڑھے۔ جا کر دیکھا۔ تو سچ مچ خون اُبل رہا تھا۔ اور اس کے چھینٹے اُڑ اُڑ کر چاروں طرف پڑ رہے تھے۔

ہم نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اور باہر نکل آئے۔ واصف! میں نے نوکر کو آواز دی۔ کیتلی اُتار لو۔ اور اسے دھو کر اپنے سامنے پانی اُبلنا رکھو۔ گو ہم سب ڈر گئے تھے۔ مگر . . . . میں نے کہا۔

یہ کسی کی شرارت معلوم ہوتی ہے - ممکن ہے - ذیلدار نے ہی کسی کو سکھا دیا ہو - اور اُس نے ہمیں پریشان کرنے کے لئے ایسا کیا ہو -

خیر بات آئی گئی ہوئی - شام کا کھانا کھا کر ہم اپنے اپنے بستروں پر جا لیٹے - اپنی اپنی بندوقیں ساتھ رکھ لیں - اور دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے اور اگلے دن کا پروگرام بناتے رہے ۔

جنگل کی تیز ہوا سائیں سائیں کرتی چل رہی تھی - اور گیدڑوں کی ہوک اور قصبے کے کتوں کی آوازیں اسکے ساتھ مل کر اسے اور بھی خوفناک بنا رہی تھیں - کمرے میں کوئی آواز نہ تھی - اور ہر طرف تاریکی و خاموشی کا غلبہ تھا -

معاً ایک آواز پیدا ہوئی - اور بلند ہوتے ہوتے گونج میں تبدیل ہو گئی - پھر چیخوں اور رونے کی سی آواز آنے لگی - پھر پکڑ دھکڑ کا شور سنائی دیا - اور پھر خاموشی چھا گئی -

کچھ دیر سکون رہا - اور کوئی آواز نہ آئی - میں نے منہ پھرا کر عزیز بیگ سے کچھ کہنا چاہا - لیکن ابھی اس کی طرف دیکھا بھی نہ تھا - کہ سامنے کا دروازہ کھڑاک سے کھلا - اور ہم سب کی نظریں ایک دم اُس طرف اُٹھ گئیں - میں نے واصف کو آواز دینی چاہی - مگر بول نہ سکا - اُٹھنا چاہا - تو ایسا محسوس ہُوا - گویا ہزاروں من کی سِل چھاتی پر دھری ہے ۔

اتنے میں دوسرا دروازہ کھلا اور پھر یکے بعد دیگرے سب دروازے اور کھڑکیاں کھل گئیں - جنگل کی تیز ہوا کمرے میں سے ہوتی ہوئی گزرنے لگی - اور کواڑوں کے کھلنے - بند ہونے اور شیشوں کے ٹوٹنے سے وہ شور پیدا ہُوا کہ الاماں -

خدا خدا کر کے رات ختم ہوئی - صبح کی سفیدی دکھائی دی - تو جان میں جان آئی - اُٹھ کر دیکھا - تو سب بندوقوں کی نالیاں ٹیڑھی - اب تو بہت پریشان ہوئے - میں نے بندوقیں اُٹھا کر ایک طرف رکھ دیں - اور زور زور سے کہا - اگر ہمیں اس طرح تنگ کیا جائیگا - تو ہم بالکل نہیں جائیں گے ہم ابھی باہر جاتے ہیں - ہماری بندوقیں درست ہو گئیں - تو ہم چلے جائیں گے - یہ کہ کر میں نے اپنے دوستوں کو ساتھ لیا - اور سب باہر چلے گئے - ہماری گفتگو میں رات کے واقعات کا تذکرہ یقینی تھا - ہم اُن کے متعلق بحث کرتے ہوئے کافی دُور نکل گئے - واپس آ کر دیکھا - تو بندوقیں بالکل ٹھیک تھیں -

" اب یہاں سے چلے جانا چاہئے ۔" رحمت علی نے ہم سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا - خوب میں نے جواب دیا - ایسی جلدی گھبرا گئے - ابھی تو ہم نے معاملہ کی تہ کو پہنچنا ہے - ہم ایسی جلدی یہاں سے جانے والے نہیں -

عزیز بیگ اور نصرت اللہ نے بھی میری ہاں میں ہاں ملائی - اور کہا - دیکھا جائیگا - آج ہم بندوقیں بھر کر اپنے اپنے ہاتھوں میں رکھیں گے - اور تمام رات نہیں سوئینگے ۔

دن بھر کوئی واقعہ پیش نہ آیا - اور ہم اپنی اپنی بندوقیں لے کر اِدھر اُدھر پرندوں کا شکار کرتے رہے - اندھیرا ہونے پر واپس لوٹے - اور کھانے سے فراغت پا کر اپنی اپنی چارپائیوں پر جا بیٹھے - کچھ دیر تو باتوں میں لگے رہے - لیکن دن بھر کی دوڑ دھوپ سے سب تھکے ہوئے تھے - اس لئے باری باری سے اونگھنے لگے - رات اندھیری تھی - اور بادلوں کی وجہ سے تاریکی اور بھی غالب تھی - میں نے ہزار کوشش کی - کہ آنکھ نہ لگے - مگر ذرا سی دیر کے لئے آنکھیں بند ہو ہی گئیں - مشرقی دریچے کے کواڑ بہت زور سے کھلے - اور کوئی چیز زور سے میری چھاتی پر آ گری -

بے ساختہ میری چیخ نکل گئی - اور میں نے اسے ایک دم پرے پھینک دیا - میرے تینوں ساتھی اپنی بندوقیں سنبھالے میری طرف آئے - آ کر دیکھا تو تازہ گوشت کا ایک بڑا لوتھڑا میری چارپائی سے کوئی دو گز پرے پڑا تھا ۔

میرا دل ابھی تک زور زور سے دھڑک رہا تھا - اور خوف کے مارے تمام جسم کانپ رہا تھا -

گھبراؤ نہیں - عزیز بیگ نے تسلی دیتے ہوئے کہا - اب ہم کھڑکی بند کئے دیتے ہیں - اور تمام دروازوں کی چٹخنیاں دیکھ لیتے ہیں - پھر اگر کوئی دروازہ کھلا - تو ہم فوراً فائر کر دیں گے - یہ کہ کر اُن تینوں نے تمام دروازوں کی چٹخنیاں دیکھیں - اور انہیں خوب مضبوطی سے بند کر دیا - واصف!

عزیز بیگ نے نوکر کو آواز دیتے ہوئے کہا - ہوشیار رہو - خبردار - سونا مت -

بہت اچھا حضور - واصف نے اپنی کوٹھڑی میں سے جواب دیا - آپ بے فکر رہیں - ابھی وہ اپنی اپنی چارپائیوں پر بیٹھے بھی نہ تھے - کہ دو بلیاں باورچی خانے میں لڑتی ہوئی سنائی دیں - اور اُن کا شور آہستہ آہستہ بلند ہونے لگا - تھوڑی ہی دیر میں شور بہت بڑھ گیا - اور ہم بندوقیں اور ٹارچیں لئے ہوئے اس طرف بڑھے - ہمارے دیکھتے دیکھتے دونو بلیاں اِدھر اُدھر بھاگ گئیں - اور خون سے لتھڑا ہوا ایک سر باورچیخانے کے فرش پر رہ گیا - ہم نے قریب جاکر دیکھا - تو اس میں سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے - اور تمام فرش پر لہو ہی لہو پڑا تھا - ایسا معلوم ہوتا تھا - گویا کوئی ابھی ابھی کسی کو قتل کر گیا ہے -

اب ہم بلیوں کی تلاش میں چلے - مگر بلیاں کہاں تھیں مکان کا کونہ کونہ دیکھ مارا - لیکن کہیں نظر نہ پڑیں - تمام دروازے تمام کھڑکیاں بدستور بند تھیں - اور بلیوں کا کہیں پتہ نہ تھا -

اب تو ہم بہت ڈرے - اور کچھ دیر تک بول بھی نہ سکے - بلیوں کو نہ پاکر باورچی خانے کی طرف چلے - دیکھا تو سر غائب ہے - اور فرش پر کہیں بھی خون کا نشان نہیں - ہمارے دل زور زور سے دھڑک رہے تھے - اور جی یہ چاہتا تھا - کہ اسی دم یہاں سے بھاگ جائیں - مگر باہر جانے کی کسی میں ہمت نہ تھی - لاچار اپنی چارپائیوں پر آ بیٹھے ؎

عزیز بیگ نے ہمت کی اور زور زور سے کہا - اس طرح تنگ کرنے سے کیا فائدہ ہے - اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے - کہ آپ کو کیا تکلیف ہے - تو ہم اسے دُور کرنے کی کوشش کرینگے -

یہ ہمارا وعدہ ہے - اور ہم ضرور اسے پورا کریں گے -

اس کے بعد تمام رات کوئی پریشانی نہ ہوئی لیکن نیند بھی کسی کو نہ آئی - اور سب سہمے ہوئے بیٹھے رہے - صبح ہوئی تو ہم پھر گھر کے کونے کونے میں پھرنے لگے - باورچی خانے میں جا کر دیکھا - تو ایک بوسیدہ کاغذ کا ٹکڑا پڑا تھا - اور اس پر مندرجۂ ذیل عبارت خون سے لکھی ہوئی تھی -

"آج سے سو سال قبل ہم چار بھائی سکھوں کی لڑائی میں اس جگہ شہید ہوئے تھے - ہماری لاشیں اسی جگہ دفن ہیں - افسوس ہے - کہ ہمارے مزار پر چراغ کی بجائے آگ جلائی جاتی ہے -"

اخاہ! میں نے وہ کاغذ عزیز بیگ کو دکھاتے ہوئے کہا - یہ دیکھئے - آپ کے سوال کا جواب موجود ہے -

ہم اس تحریر کو لے کر ذیلدار کے ہاں پہنچے - اور پھر مالک مکان کو جاکر دکھلائی - اُس نے اسی دن باورچی خانے والے کمرے میں ایک مزار بنوا دیا - اور اُس دن سے آج تک وہاں ہر روز چراغ جلایا جاتا ہے - جگہ کو صاف رکھا جاتا ہے - اب مالک مکان خود اس میں رہتا ہے - اور اُسے آج تک کبھی کوئی پریشانی نہیں اُٹھانی پڑی ؟"

یہ ہے وہ واقعہ جس کے متعلق میں اس قدر وثوق سے کہہ رہا تھا - اب آپ اسے ڈھکوسلا سمجھئے یا میرے تخیل کا نتیجہ - مگر سچی بات تو یہ ہے - کہ میرے ساتھ یہ واقعہ اسی طرح پیش آیا تھا ؎

ہم سب یہ سن کر بہت حیران ہوئے - اور کچھ دیر تک اس واقعہ کی نوعیت پر غور کرتے رہے -

ٹن - گھڑی نے ایک بجایا - اور سب کی نظریں دفعتہً اُوپر اُٹھیں - اُف! کتنی رات گزر گئی ہے - نصراللہ نے سب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا - آیئے حمید صاحب چلیں - یہ کہہ کر وہ دونو اُٹھ کر چل دیئے - اور میں اپنی کرسی پر بیٹھا اس تمام واقعہ کو اپنے دل ہی دل میں دہراتا اور تنقید کرتا رہ گیا ؎

ایم عنایت اللہ بی - اے انبالوی

بزمِ انتخاب

فتنۂ حرم

اک دن جو بہرِ فاتحہ اک بنتِ مہر و ماہ پہونچی نظر جھکائے ہوئے سوئے خانقاہ
زہاد نے اٹھائی جھجکتے ہوئے نگاہ ہونٹوں میں دب کے ٹوٹ گئی ضربِ لا الٰہ
برپا ضمیرِ زہد میں کہرام ہوگیا
ایماں، دلوں میں لرزہ بر اندام ہوگیا

یوں آئی ہر نگاہ سے آوازِ الاماں جیسے کوئی پہاڑ پہ آندھی میں دے اذاں
دھڑکے وہ دل کہ روح سے اٹھنے لگا دھواں ہلنے لگیں شیوخ کے سینوں پہ داڑھیاں
پرتو فگن جو جلوۂ جانانہ ہوگیا
ہر مرغِ خلد، حسن کا پروانہ ہوگیا

اس آفتِ زمانہ کی سرشاریاں، نہ پوچھ بکھرے ہوئے شباب کی بیداریاں، نہ پوچھ
رخ پر ہوائے شام کی گلباریاں، نہ پوچھ کاکل کی ہر قدم پہ فسوں کاریاں، نہ پوچھ
عالم تھا وہ خرام میں اُس گلعذار کا
جیسے نزول، رحمتِ پروردگار کا

گردن کے لوچ میں، خمِ چوگاں لئے ہوئے چوگاں کے خم میں گوئے دل وجاں لئے ہوئے
رخ پر لٹوں کا ابرِ پریشاں لئے ہوئے کافر گھٹا کی چھاؤں میں قرآں لئے ہوئے
آہستہ چل رہی تھی عقیدت کی راہ سے
یا لو نکل رہی تھی دلِ خانقاہ سے

آنکھوں میں آگ عشوۂ آہن گداز کی لہریں ہر ایک سانس میں سیلابِ ناز کی
لپٹیں ہوا کے دوش پہ، زلفِ دراز کی آئینے میں دمک، رخِ آئینہ ساز کی
آغوشِ مہر و ماہ کی، گویا، پلی ہوئی
سانچے میں آدمی کے، گلابی ڈھلی ہوئی

ساون کا ابر، کاکلِ شبگوں کے دام میں موجیں شرابِ سرخ کی، آنکھوں کے جام میں
رنگِ طلوعِ صبح، رخِ لالہ فام میں چلتا ہوا شباب کا جادو خرام میں
انساں تو کیا، یہ بات پری کو ملی نہیں
ایسی تو چال کبکِ دری کو ملی نہیں

ڈوبی ہوئی تھی جنبشِ مژگاں شباب میں یا دل دھڑک رہا تھا محبت کا خواب میں
چہرے پہ تھا عرق، کہ نمی تھی گلاب میں یا اوس موتیے پہ شبِ ماہتاب میں

آنکھوں میں کہہ رہی تھیں یہ موجیں خمار کی
یوں بھیگتی ہیں چاندنی راتیں بہار کی

بات اس نے فاتحہ کو اٹھائے جو ناز سے   آنچل ڈھلک کے رہ گیا زلفِ دراز سے
جادو ٹپک پڑا نگہِ دل نواز سے   دل ہل گئے جمال کی شانِ نیاز سے
پڑھتے ہی فاتحہ جو وہ اک سمت پھر گئی
اک پیر کے تو ہات سے تسبیح گر گئی

فارغ ہوئی دعا سے جو وہ مشعلِ حرم   کانپا لبوں پہ سازِ عقیدت کا زیر و بم
ہونے لگی روانہ بہ اندازِ موجِ یم   انگڑائی آ چلی تو بہکنے لگے قدم
انگڑائی فرطِ شرم سے یوں ٹوٹنے لگی
گویا صنمکدے میں کرن پھوٹنے لگی

ہر چہرہ چیخ اٹھا کہ ترے سامنے جائیں گے   اے حسن، تیری راہ میں دھونی رمائیں گے
اب اس جگہ سے اپنا مصلّے اٹھائیں گے   قربانِ گاہِ کفر پہ ایماں چڑھائیں گے
کھاتے رہے فریب بہت خانقاہ میں
اب سجدہ ریز ہوں گے نئی بارگاہ میں

سورج کی طرح زہد کا ڈھلنے لگا غرور   پہلوئے عاجزی میں مچلنے لگا غرور
رہ رہ کے کروٹیں سی بدلنے لگا غرور   رخ کی جوان لَو سے پگھلنے لگا غرور
ایماں کی شان عشق کے سانچے میں ڈھل گئی
زنجیرِ زہد سرخ ہوئی، اور گل گئی

پل بھر میں زلفِ لیلیٰ تمکیں بگڑ گئی   دم بھر میں پارسائی کی بستی اجڑ گئی
جس نے نظر اٹھائی، نظر رخ پہ گڑ گئی   گویا ہر اک نگاہ میں زنجیر پڑ گئی
طوفانِ آب و رنگ میں زہاد کھو گئے
سارے کبوترانِ حرم ذبح ہو گئے

زاہد، حدودِ عشقِ خدا سے نکل گئے   انسان کا جمال جو دیکھا، مچل گئے
ٹھنڈے تھے لاکھ، حسن کی گرمی سے جل گئے   کرنیں پڑیں تو برف کے تودے پگھل گئے
القصہ دیں، کفر کا دیوانہ ہو گیا
کعبہ ذرا سی دیر میں بت خانہ ہو گیا

(کلیم)   جوش

مصریوں کے بعض دلچسپ طریقے

مصر کے باشندے عام طور پر نہایت زندہ دل اور دلچسپ ہوتے ہیں۔ خوب باتیں کرتے ہیں۔ بات بات میں لطیفے پیدا کرتے ہیں۔ مصر میں رہ کر آدمی کا جی گھبرا نہیں سکتا۔ جی گھبرائے تو کسی چائے خانے میں جا بیٹھے۔ ایسی باتیں سنے گا کہ ہنستے ہنستے پیٹ پھول جائے گا۔

مصری آپس میں ذرا سی بات پر لڑ جاتے ہیں۔ بازاروں میں

ہر وقت یہ نظارہ دکھائی دیتا ہے کہ ایک مصری دوسرے مصری کا گریبان پکڑے کھڑا ہے اور دونوں اتنے زور سے چلاتے ہیں کہ بس خیال ہوتا ہے ایک کی جان تو ضرور چلی جائے گی، مگر فوراً ہی راہگیر جمع ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں "اللّھم صلّی" لڑنے والے یہ سنتے ہی چپ ہو کر راہ گیروں کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اب بحث شروع ہوتی ہے۔ دونوں اپنی اپنی شکائتیں پیش کرتے ہیں ــــ راہ گیر دونوں کی پیٹھ ٹھونک کر کہتے ہیں "معلیش" یعنی جانے بھی دو۔ بس لڑائی ختم ہو گئی۔ دونوں ہنستے ہوئے اپنی اپنی راہ چلے گئے۔

مصر میں ایک عجیب دستور یہ ہے کہ جب کسی دوکاندار سے کوئی گاہک جھگڑتا ہے، تو تمام راہ گیر گاہک کی طرف داری کرتے ہیں اور دوکاندار پر بُری طرح لے دے کرتے ہیں، لیکن اسی سلسلے میں ایک اور مضحکہ خیز دستور یہ ہے کہ آپ فرض کیجئے تین پیسے کی چیز خریدی اور اکنی، دوکاندار کو دی۔ وہ دوکاندار باقی ایک پیسہ واپس نہیں کرے گا۔ یہ عام دستور ہے کہ ایک دو پیسہ دوکاندار واپس ہی نہیں کرتے۔ اگر آپ مطالبہ شروع کر دیں تو دوکاندار بگڑ جائے گا۔ اور کہے گا کیا فقیر ہو؟ اب جتنے راہ گیر ہوں گے آپ ہی کو ملامت کریں گے کہ اتنی سی بات کے لئے کیوں لڑ رہے ہو!

مجھ پر اسی قسم کا ایک واقعہ گزر چکا ہے۔ میں نے ایک دن گنے خریدے۔ دوکاندار کو ایک ملیم یعنی ایک پیسہ واپس کرنا تھا، مگر اس نے واپس نہیں کیا۔ مجھے غصہ معلوم ہوا اور میں نے مطالبہ کیا تو لڑنے پر آمادہ ہو گیا۔ میں نے کہا، اپنے گنے واپس لے لو۔ اُس نے اس سے بھی انکار کیا۔ آخر میں نے پولیس کو بلایا۔ اب تمام راہ گیر اور پولیس سب مجھی کو بُرا کہنے لگے۔ کہ ارے بھئی ایک پیسے کی بھی کوئی حقیقت ہے! میں نے بہت بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ معاملہ ایک پیسہ کا نہیں بلکہ اصول کا ہے۔ مگر کسی نے ایک نہ سُنی، لیکن میں بھی اڑا رہا۔ اور پیسہ وصول ہی کر کے ہٹا۔

ایک اور عجیب طریقہ ہے کہ آپ مثلاً انگور خریدیں تو جتنے ایک آنے کے ملیں گے اتنے ہی دو آنے کے۔ ایک مدت کے بعد یہ بات میں نے محسوس کی تو ایک ایک آنہ کر کے چیز خریدی۔ اس پر دوکاندار بگڑ گیا اور میرے ہاتھ سودا بیچنے ہی سے انکار کر دیا!

مصریوں کا دستور ہے کہ ننگے نہاتے ہیں۔ حمام میں بھی اور دریا پر بھی۔ آڑ کی جگہ میں نہیں بلکہ سب ایک ہی ساتھ بیٹھے اور کھڑے اس انداز سے نہاتے ہیں، گویا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ اگر کوئی لنگی باندھ کر نہائے، تو اُس سے گھن کھاتے ہیں، کیونکہ سمجھتے ہیں اسے آتشک کی بیماری ہے!

مصری اُس پنیر کے بڑے دلدادہ ہوتے ہیں۔ جس کا نام اُن کی زبان میں "مش" ہے۔ کرتے یہ ہیں کہ پنیر کو کسی گھڑے میں رکھ کر بند کر دیتے ہیں۔ اور جب سڑنے کے بعد اُس میں کیڑے پڑ جاتے ہیں بلکہ پورا پنیر کیڑوں کا مجموعہ بن جاتا ہے، تو اُسے بڑے شوق سے کھاتے ہیں، حالانکہ اس میں ایسی سخت تعفن ہوتی ہے کہ آدمی کا دماغ پھٹ جائے۔ مگر انہیں یہ بدبو بہت اچھی لگتی ہے!

ایک خاص قسم کی مچھلی کے بھی مصری عاشق ہیں، جسے "فسیخ" کہتے ہیں۔ اس مچھلی میں بہت ہی مکروہ بُو ہوتی ہے اور بڑے بڑے کیڑے ہوتے ہیں۔ مگر مصری نہ کیڑوں کی پرواہ کرتے ہیں۔ نہ بُو کی، بلکہ چُن چُن کر کیڑے کھا جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فسیخ کا کیڑا بہت ہی لذیذ ہوتا ہے!

مصر میں شادی کرنا سب سے زیادہ آسان کام ہے اور طلاق اس سے بھی زیادہ آسان۔ ۱۹۱۸ء تک کا حال جانتا ہوں کہ عوام الناس میں دوشیزہ کا مہر، دس پونڈ ہوتا تھا اور بیوہ یا مطلقہ کا پانچ پونڈ بلکہ اس سے بھی کم۔ اگر یہ رقم آپ کے پاس موجود ہے تو جب چاہیے شادی کر لیجئے، پھر پورا نہیں بلکہ آدھا ہی مہر ادا کرنا پڑتا ہے اور باقی آدھا، شوہر کی موت کے وقت ادا ہوتا ہے یا طلاق کے وقت۔ والدین اس رقم کو اپنے صرف میں نہیں لاتے، بلکہ جہیز تیار کرنے میں صرف کر دیتے ہیں۔ طلاق کے وقت شوہر صرف وہی چیزیں اپنے قبضے میں رکھ سکتا ہے۔ جو اُس نے خود اپنے روپیہ سے خریدی ہیں۔ عام طور پر شوہر اپنے کپڑوں کے سوا کچھ اپنے قبضہ میں رکھ نہیں سکتا۔

("ہند" کلکتہ)

پشکن

روس کے گزشتہ سیاسی انقلاب نے پرانے نظام کو بے طرح درہم و برہم کر دیا۔ نہ صرف حکومت اور سماج میں ایک زبردست تبدیلی رونما ہو گئی بلکہ ادب پر بھی اس کا ایک گہرا اثر پڑا۔ ظاہر ہے کہ جب زندگی کے ہر شعبے میں پہلی بات نہ رہی تو شاعری اس سے مستثنا کیونکر رہتی۔ چنانچہ جدید رجحانات کے لحاظ سے مقبول ترین شاعر

الگزانڈر بلاک ہے لیکن اس سے یہ ہرگز نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ شعرا میں پشکن کا درجہ کچھ کم ہو گیا ۔ وہ بھی اپنے زمانے کا ایک زبردست باغی اور انتہا پسند تھا ۔ روسی ادب کے دوسرے سنہری دور میں جو نئی رُوح اُس نے پھونکی اُس کی وجہ سے اُس کا رتبہ ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے ۔

پشکن کی شاعری کا ستارہ افقِ ادب پر انقلابِ فرانس کے بعد نمودار ہوا ۔ روسی شاعری کے اس وقت دو گروہ تھے ۔ ایک قدامت پسند اور دوسرا انتہا پسند ۔ پشکن بہت جلد ہی نئی تحریکات کا علمبردار بن گیا ۔ پشکن کی ادبی تخلیق کے تین بڑے پہلو ہیں ۔ شاعری ۔ ڈرامہ اور مکتوب نویسی ۔ لیکن اس وقت ہم اُس کی شاعری سے ہی بحث کریں گے اور شاعری بھی صرف بزمیہ ۔ مگر سب سے پہلے ضروری ہے کہ اس پرجوش ، سرکش ، اور رومانوی شخصیت کے سوانح پر ایک جھلکتی ہوئی نظر ڈالی جائے ۔

پشکن ۲۶ مئی ١٧٩٩ء کو ماسکو میں پیدا ہوا ۔ وہ ایک قدیم گھرانے سے تعلق رکھتا تھا ۔ اسے افریقہ کا حبشی خون ورثے میں ملا تھا ۔ کیونکہ اُس کی پھوپھی پیٹرِ اعظم کے حبشی ملازم ہنی بال کی بیٹی تھی ۔ نو سال کی عمر تک اس میں ہونہار بروا والی کوئی بات نظر نہ آئی ۔ لیکن اس کے بعد سے اُسے مطالعے کا ایک ایسا زبردست شوق پیدا ہوا ۔ جو تمام عمر اُس کا دامنگیر رہا ۔ پشکن کا حافظہ غضب کا تھا ۔ کیمرے کی طرح اس کا ذہن ہر چھوٹی سے چھوٹی تفصیل کو اپنی گرفت میں لے آتا ۔ اس لئے جو کچھ بھی وہ پڑھتا اس کے ذہن پر ایک مستقل نقش کی حیثیت اختیار کر لیتا ۔ شروع شروع میں وہ فرانسیسی میں لکھے ہوئے مذاحیہ ڈرامے اپنی بہنوں کو پڑھ کر سناتا رہا ۔ یہی اس کی اولین ادبی کارگزاری تھی ۔ ١٨١٢ء میں اُسے سینٹ پیٹرسبرگ کے نواح میں زارسکو سیلو کے سکول میں بھیجا گیا ۔ سکول کا زمانہ اُس کی ذہانت کے لحاظ سے کوئی قابلِ ذکر چیز نہیں ہے ۔ مدرسے کے سرٹیفکیٹ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ ایک اوسط درجے کا طالب علم تھا ۔ لیکن اس زمانۂ تعلیم میں اس نے اپنے مطالعے کا شوق پوری شدت کے ساتھ جاری رکھا ۔ اس زمانے میں اس کا محبوب شاعر مشہور فرانسیسی ادیب والٹیر تھا ۔ اس نے اپنی شاعری کا آغاز پہلے فرانسیسی اور پھر روسی زبان میں کیا اور اپنی زمانۂ طالب علمی ہی میں لکھی ہوئی نظموں کو بعد میں کلیات میں بھی شامل کر لیا ۔ یہ ابتدائی کلام اگرچہ کوئی خاص درجہ نہیں رکھتا ۔ اس کے باوجود اس سے ایک نئے اور قابلِ توجہ انداز کا اظہار ہوتا ہے ۔ نہ صرف اس کے ہمعصروں بلکہ اس زمانے کے مشہور روسی ادیبوں نے بھی اُس کی ذہانت اور جودتِ طبع کو پہچانا ۔ انہوں نے گلستانِ ادب کے اس ننھے رنگین نوا طائر کا پُرجوش استقبال کیا اور اس لئے پشکن کو نہایت آسانی کے ساتھ شہرت حاصل ہو گئی ۔ ١٨٢٠ء میں اس نے اپنی نظم "رسلان اور لڈمیہ" شائع کی اور یہ خاص و عام میں یکساں مقبول ہوئی ۔ لیکن عوام کی قبولیت کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی ۔ کیونکہ اُسے اپنے زمانے کے چوٹی کے ادبا کی پسندیدگی حاصل تھی ۔ طالب علمی کی زندگی کو خیرباد کہنے کے ساتھ ہی پشکن کو ادبی حلقوں میں ایک امتیازی رتبہ حاصل ہو گیا ۔

پشکن کی نظموں میں ہمیں کوئی ناہموار بات کبھی دکھائی نہ دیگی ۔ میدانی علاقے میں سطحِ دریا کی یکساں روانی کی کیفیت اس کی نظموں میں پائی جاتی ہے ۔ خواہ ہم تمام نظم کو پڑھیں یا کچھ ٹکڑے چھوڑ کر غور کریں سطحِ دریا کی یکسانیت ان میں بہرصورت موجود رہے گی ۔ وجہ یہ ہے کہ پشکن ہیئت اور اظہار کے لحاظ سے ایک مکمل فن کار تھا ۔ ذیل میں ہم اس کی چند نظمیں درج کرتے ہیں :-

زندگی

خمارِ بادۂ دوشیں کی تلخیاں لے کر،
مرے دماغ میں ہے یادِ عشرتِ ماضی!
مگر شراب کہن سال ہو کے رہتی ہے،
یوں ہی ہیں عمر کے ہمراہ تلخیاں گہری!
ہے راستہ مرا تاریک ، اور مستقبل ،
بس ایک بڑھتا ہوا فکر کا سمندر ہے!
مگر اذیتیں سہہ کر ہوں نقشِ نو تخلیق
یہ ایک اکیلی تمنا ہی دل کے اندر ہے!
مجھے تو زندگیٔ جاوداں سے رغبت ہے،
گریز موت سے ہے مجھ کو، اور نفرت ہے!
میں جانتا ہوں مسرت وہیں نہاں ہوگی ،
ہزار غم ہوں، اذیت ہو اور اندیشے!
سنوں گا نغمہ میں پھر سازِ آسمانی کا،
اثر کے آنسو نکل آئیں گے تخیل سے!
یہاں تک، آخری غمناک لمحہ آئے گا،
اُجالا پھیلے گا اک عشق کے تبسم کا!

سنجوگ

مستِ عشرت کا کوئی مول نہیں،
میرے قریں!

نفس کی ہیجت مستانہ، غضب، سرجوشی،
اِن کی قیمت ہی نہیں!
بازوؤں میں مِرے اک سانپ کی مانند کوئی
جسم حسیں
اینٹھتے اینٹھتے بل کھاتا ہوا اک اُلجھن میں،
اس کی قیمت ہی نہیں
مبکر قریں!
تیز تر ہاتھوں کے سہلانے سے
زخم کے خوف سے اور ہونٹوں کے چھُو جانے سے
ایسی تحریک سے وہ پاس ہی لے آتی ہے
کھیل کی آخری عجیب گھڑیوں کے لمحے!
اس جھجک سے مجھے تم اور رجھالیتی ہو،
درد انگیز مسرت کا مجھے
جلوہ دکھا دیتی ہو!
ایک خوں ریز خوشی ہوتی ہے پہلو میں تمہارے حاصل!
کئی لمحے مرے جاری ہی رہے عرض و نیاز
آخر کار تمہارے دل میں
جاگ اُٹھا نغمۂ راز
بجھ گیا شعلۂ ناز
اور تم مان گئیں، مان گئیں، مان گئیں!
ایک نرمی سے تھے لبریز وہ تسلیم و رضا،
شائبہ ان میں کوئی مست مسرت کا نہ تھا!
سرد مہری تھی حیا کی دل میں،
تم کو پروا نہ تھی اس کی کوئی،
ہے مرا کیفیت دلی ایک سوال!
تم کو لازم ہے کہ دو اس کا جواب!
تم کو پروا نہ تھی اس کی کوئی،
سرد مہری تھی حیا کی دل میں!
لیکن اک بار اُٹھا شعلۂ جوالہ تمہارے دل میں!
ایک تیزی سے لعل گیرو وہ پھر ہو ہی گیا،
مرے شعلے سے!

بے اعتمادی

اپنی باہوں کا حلقہ، سندر انگ پہ جب ڈالا،
اور منہ سے بولی باتیں، (پریم کی میٹھی برساتیں)
خاموشی کے نغمے ہیں، تو اس نازک لمحے میں،
ہٹ کر میرے پہلو سے، توڑ کے بندھن حلقے کے،
کلیاں پیارے گالوں کی، سنبل کالے بالوں کی،
مجھ سے دور ہٹا کر، یوں بولی، سن، کیوں ہے مجنوں؟
مرد، وفا؟ یہ ناممکن! ناممکن یہ باتیں ہیں،
یہ سب تیری گھاتیں ہیں! تو بھولا؟ یہ ناممکن!

سپنا

اب ہیں پیارے! اب ہیں لمحے!

دل کہتا ہے کلفت جائے، سُکھ کی رات ہو سُکھ لوٹ آئے
دن کے پیچھے دن آتا ہے پہلا دن چلتا جاتا ہے!
ہستی کا اک ذرّہ لے کر جیون کا اک پارہ لے کر
میں اور تُو کہتے ہیں، آؤ، جیون کا نقشہ تو بناؤ،
دیکھو انوکھے، نیارے بھاؤ جیون مدھ سے مستی لاؤ!
لیکن یہ سب تو مایا ہے، اک چلتا پھرتا سایا ہے
جگ میں کیوں جینے پہ بھروسہ جینے کے ہے ساتھ ہی مرنا!
جگ میں خوشیاں کس نے دیکھیں؟ سُکھ کی گھڑیاں کس نے دیکھیں؟
مکتی سکھ آنند کے جلوے مرجانے پر ہی دیکھو گے
بیتے سالوں اور جنموں سے ذہنی خلوت کے سپنوں سے
میں نے سُن رکھا ہے نغمہ، سکھ کی من موہن گھڑیوں کا
میں نے دیکھ لیا ہے رستہ، سکھ سندرتا کی لبستی کا

سکھ کی مے کے جام وہاں ہیں
راحت اور آرام وہاں ہیں!

بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق

لغت کا کام عام طور سے لفظوں کے معنے بتانا سمجھا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ قوموں کی طرح قوموں سے متعلق ہر چیز ایک مستقل تاریخ رکھتی ہے۔ زبان قوم کی تاریخ کا نہایت اہم جزو ہے، اس لئے زبان اور اس کے لفظوں کی تاریخ بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے اور یہ تاریخ ہمارے لغت کا بڑا اہم باب ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس کی طرف ابھی

تک ہماری زبان کے لغت نویسوں نے توجہ نہیں کی ہے۔

قومیں اپنی تاریخوں میں کتنی ہی خیانت کریں اور ان کے واقعات کو کتنا ہی اُلٹ پلٹ ڈالیں، مگر زبان اور اُس کے الفاظ کا ذخیرہ ایک سچے امانت دار کی طرح پچھلی روئداد کا ریکارڈ یا مسل ہمارے لئے تیار رکھتا جس سے اُس زبان کے محقق ضرورت کے وقت پوری طرح فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ چنانچہ اگر ہم یہ جاننا چاہیں کہ کسی قوم کے تعلقات اور رابطے دنیا کی کن کن قوموں سے رہے ہیں۔ تو اُس قوم کے لفظوں کے خزانے میں ہمارے لئے معلومات کا بڑا سرمایہ محفوظ ملے گا۔ ہماری ہندوستانی اردو زبان کی عمر چاہے کتنی ہی چھوٹی ہو۔ پھر بھی اُس کی ملکیت میں ایسے لفظوں کی کمی نہیں، جو اپنی مستقل تاریخ رکھتے ہیں اور اپنی خاموش زبان سے ہم کو بتانے کے لئے بہت سے ایسے واقعات یاد رکھتے ہیں جن کو کاغذی تاریخ کے اوراق بھلا چکے ہیں۔

ہم اپنی زبان کے اس قیمتی سرمائے کا آغاز سکوں سے کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ یہ لفظی دولت مضمون کی معنوی دولت کے لئے فال نیک بن سکے۔

کیرانت: "کیرانت"[1] ــــ اودھ کے دیہاتی کاغذوں میں ۱۶ آنے کی تقسیم آنوں پر آنوں کی پائیوں پر اور اُس کے بعد کیرانت اور جو پر ہوتی ہے۔ لفظی بہروپیوں کے پہچاننے والوں کو اس کے پہچاننے میں دقت نہیں ہو سکتی۔ کہ یہ کیرانت عربی قیراط کی خرابی ہے۔ ایک عربی دینار میں ۲۰ یا ۲۴ قیراط ہوتے تھے[2] عربی میں قیراط یونانی سے آیا ہے۔ آج کل انگریزی میں بھی لفظ کیرٹ (Carat) کی صورت میں مستعمل ہے۔ اور انگریزی سونے کے بنے ہوئے زیوروں اور چیزوں میں اتنے کیرٹ گولڈ کی اصلاح کا عام رواج ہے۔

اشرفی: درم اور قیراط جس طرح باہر سے آئے ہوئے نام ہیں، اسی طرح ہمارے سب سے قیمتی سکّے اشرفی کا نام بھی باہر سے آیا ہوا ہے۔ مجھے بہت دنوں سے اس کی اصلیت کی تلاش تھی اور پتا نہ چلنے پر اس کو یہ کہہ کر تسکین دے لی کہ چونکہ یہ طلائی سکہ سب سکوں میں اشرف ہے، اس لئے اشرفی کہلایا۔ مگر دفعۃً ایک غیر متوقع ماخذ سے اس کی اصلیت دریافت ہوئی تو معلوم ہوا کہ سکہ اشرف نہ تھا بلکہ جس بادشاہ کی طرف وہ منسوب ہے، وہ اشرف تھا۔

طلائی سکّے کے لئے سب سے پرانا نام دینار ہے اور یہ بھی یونانی[3] ہے۔ مگر چونکہ عربوں میں یہ سکہ جاری تھا، اس لئے انہوں نے عبدالملک کے زمانے میں ۷۴ھ میں جب اپنا طلائی سکہ ڈھالا تو اُس کا نام دینار ہی رہنے دیا جب اُن کے قدم ہندوستان پہنچے تو ان کا دینار بھی اُن کے ساتھ آیا اور آج تک خاندانی مسلمانوں میں دین مہر کی تعداد میں سکہ رائج الوقت کے ساتھ "چند دینار سرخ" رسمی طور سے جاری ہے۔

تغلق کے زمانے میں ہم کو اشرفی کے لئے دو لفظ ملتے ہیں، ایک تنکۂ زر، یہ تنکہ سکّے کے معنے میں عام طور سے بولا جاتا تھا (برنی ص ۳۱۴ و ص ۳۱۵) اور اسی سے تنخواہوں کی تعیین ہوتی تھی۔ پیادے کی ماہانہ تنخواہ ۴۴ تنکہ اور سوار کی ۷۰ تنکہ تھی۔ (برنی ص ۲۱۹) مخدوم زادہ بغداد کے لئے دس لاکھ تنکہ وظیفہ مقرر ہوا۔ (برنی ص ۴۹۶) مصری خلیفہ کا سفیر جب سلطان محمد تغلق کے دربار میں آیا ہے اور جمعہ کے دن خلیفہ کا نام خطبے میں پہلی دفعہ پڑھا گیا ہے تو "چندیں طبقہا پر از تنکۂ زر و نقرہ تباں نثار شد" (برنی ص ۴۹۲)

اس سے معلوم ہوا کہ اشرفی کے لئے اُس زمانے میں تنکۂ زر بولا جاتا تھا۔ خلجی کے زمانے میں ایک تنکۂ زر ایک تولہ سونے کا ہوتا تھا۔ اور تنکۂ نقرہ ایک تولہ چاندی کا (فرشتہ ص ۱۱۴)۔

روپے کو تنکۂ نقرہ اور اُس سے کم درجے سکے کو صرف تنکہ کہتے تھے۔ یہ لفظ قدیم یادگار کے طور پر آج بھی بعض بعض پرانے خاندانی مسلمانوں میں دین مہر کی تعیین میں بولا جاتا ہے۔ (دیکھو مولانا حالی کا خط بنام سید سلیمان ندوی در معارف)

خیال ہوتا ہے کہ یہی تنکہ تو آج "ٹکے" کی صورت میں ہمارے سامنے نہیں؟

بیمہ: "بیمہ" روپے اور اشرفی کی تقریب سے وہ طریقہ یاد آیا جس سے قیمتی چیزیں محفوظ کر کے ایک شہر سے دوسرے شہر بذریعہ ڈاک بھیجتے ہیں، جس کو ہم آپ بیمہ کہتے ہیں۔ خیال یہ تھا کہ یہ ڈاک کے نئے طریقوں میں سے ہے۔ اور جہاں سے یہ نئے طریقے آئے ہیں۔ وہیں سے یہ لفظ بھی بگڑ کر آیا ہے۔ مگر اتفاق سے سجان رائے کی خلاصۃ التواریخ کا قلمی نسخہ نظر سے گزرا، جو عالمگیری عہد کی تصنیف ہے ۱۱۰۷ھ میں عالمگیر کی تخت نشینی کے چالیسویں سال مرتب ہوئی ہے۔

سجان رائے اہل ہند کی دیانت اور امانت داری کی دلیل میں یہاں

[1] یہ تقسیم کہیں کہیں صوبہ بہار کے سرکاری کاغذوں میں بھی ہے۔

[2] لسان العرب لفظ قرط۔ ج ۹۔

[3] جرجی زیدان نے اس کو لاطینی لکھا ہے۔ تاریخ تمدن اسلامی ص ۱۱۴۔

کے مہاجنوں کے ذریعے سے ترسیلِ زر کا حال لکھتا ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے :-

"لین دین میں یہاں کے لوگوں کی سچائی کا یہ حال ہے کہ کوئی کتنا ہی ناآشنا اور انجان ہو، گواہی اور شہادت کے بغیر ہزاروں روپے امانت صرافوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ یہ صراف بھی ایسے سچے ہوتے ہیں کہ جب اُن سے امانت واپس مانگیئے بلا حیلہ حوالے کے بلے توقف واپس کر دیتے ہیں۔ اور طرفہ یہ کہ اگر کوئی دور دراز راستوں کے ڈر سے اپنا نقد روپیہ اپنے ساتھ نہ لے جا سکتے تو وہ ان کے حوالے کر دیتا ہے۔ یہ دیانتدار صرف ان روپیوں کو اپنی تحویل میں لے کر ہنڈی میں اپنے کارندوں کے نام جو ہر شہر میں اُن کی طرف سے سچائی کی دکان کھولے رہتے ہیں۔ ایک پرچہ لکھ کر دے دیتے ہیں۔ اُن کو یہاں کی زبان میں ہنڈی کہتے ہیں۔ یہ کارندے اگرچہ سیکڑوں میل کی مسافت ہو اس پرچے کو دیکھنے کے ساتھ بلا حجت اُس کو روپیہ دے دیتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اُس پرچے کو جو کاغذ کے ایک ٹکڑے سے زیادہ نہیں ہے اگر مقررہ مقام کے علاوہ مالک کسی دوسری جگہ بھیجنا چاہے تو اُتنے ہی روپے اُس کو فوراً مل جائیں گے، صرف یہ ہوگا کہ خریدنے والا تھوڑا کمیشن (تمتع) اس سے لے لیگا۔"

اب اس کے بعد اصلی فقرہ آتا ہے۔

"عجیب تر آنکہ تاجران بسبب طرق ممالک اقمشہ و امتعہ و دیگر اموال آنہا بجنس و رقرار گاہ سلامت رسانیدہ بمالکان عائدمی نمایند و آں را بزبان ایں مردم بیما گویند۔"

اس عبارت سے یہ معلوم ہو گیا ہوگا کہ پرانے ہندوستان میں منی آرڈر بھیجنے، بنک چیک استعمال کرنے اور قیمتی چیزوں کو ہمیشہ کسی دوسری جگہ بیمہ کر کے بھیجنے کا کیا طریقہ تھا اور اس سے لفظ "بیما" کی قدامت کا حال بھی معلوم ہوا۔

"بزبان ایں مردم بیما گویند" سے خیال ہوتا ہے کہ یہ کوئی ہندی یا سنسکرت کا لفظ ہوگا . . . . مگر میں نے ہندی اور سنسکرت کے عالموں سے اس کی تحقیق چاہی تو کوئی اس کا پتا بتا نہ سکا۔ اس سے وہم جاتا ہے کہ یہ فارسی لفظ "بیم" یعنی خوف سے نہ لیا گیا ہو۔ سجان رائے نے اس بیان کا آغاز بھی ان لفظوں میں کیا ہے :-

" و طرفہ آنکہ اگر بنا بر خوف مسالک ممالک شخصے مبلغہائے نقد بمسافت دور و نزدیک نتواند برد"

اس "لفظ خوف" سے بھی اِدھر ہی خیال جاتا ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ فارسی لغت کی کتابوں میں یہ لفظ نہیں ملتا۔ انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں سید تصدق حسین نامی ایک بزرگ نے لغات کشوری کے نام سے ایک فارسی لغت منشی نولکشور صاحب کے نام سے لکھا ہے۔ اس میں "بیمہ" کے لفظ کے نیچے اس کو فارسی بتا کر یہ تشریح لکھی ہے :-

" بخوف رہزنی جو کسی ساہوکار کو محصول کسی نقد یا مال کے پہنچانے کا دیں اور وہ اس کی حفاظت کا ذمہ دار ہو۔"

لغات کشوری کی امانت و دیانت کا اگر اعتبار کیا جائے تو پھر بیمے کے فارسی ہونے میں کوئی شک نہیں رہ جاتا۔

"ندیم"

بھوپال کے سنگِ مرمر

ریاست بھوپال بندھیاچل کے سلسلہ کوہستان میں اپنے خوشنما مناظر اور فطرت کی حسین آرائشوں کے باعث جس قدر دلپسند اور نظر فریب ہے۔ اُسی قدر وہ قدرت کے پوشیدہ خزانوں سے معمور اور طرح طرح کی معدنیات سے بھرپور ہے ؎

یہ ریاست قرون قبل از تاریخ سے بیس ہزار فٹ والی سنگین سطحوں کو اپنی وادیوں کی آغوش میں سلائے ہوئے سادہ تعمیری پتھروں کی اس قدر بہتات رکھتی ہے۔ کہ جس سے ایک نئی دُنیا ازسرِنو تعمیر ہو سکتی ہے۔ زمانہ مابعد میں قدرت کی فیاضیوں نے یہاں کے تعمیری سامان میں بہت کچھ اضافہ کیا ہے۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ ریاست بروائی کی آتشیں مادوں سے بنی ہوئی سنگلاخ سطحوں نے بھوپال میں آرائشی پتھروں کی کمی کو بھی پورا کر دیا ہے ؎

افسوس کہ دو ہزار برس سے یہ ملک تاریخی انقلاب کی بیدردیوں کا شکار ہو کر اس قدر ویران اور برباد ہو گیا ہے کہ کوسوں تک پھیلی ہوئی شاندار آبادیاں کھنڈرات کی صورت میں منتقل ہو کر نگاہِ ظاہر سے مخفی ہو گئی ہیں۔ اور جہاں کبھی رعایا

پروری کی سرسبزیاں بہار دکھا رہی تھیں۔ وہاں اب صحرائی جانوروں اور خال خال صحرائی آدمیوں کے نشیمن اور جھونپڑیاں نظر آتی ہیں۔

شاندار عمارتوں کے اس اُجڑے ہوئے سہاگ پر تازیانۂ عبرت ہوشنگ شاہ کی فوجِ قلزم موج نے لگایا۔ جب بھوج پور کے عظیم الشان اور بند تالاب بھوپال کو منہدم کرکے عساکر ہوشنگیہ نے اپنے دشمنوں کے ملک کو تباہ کرنے کے لئے طوفان نوح برپا کیا تھا۔ چنانچہ اکبر اعظم نے ہاتھیوں کی شکارگاہ کے لئے اگر ریاست بھوپال کو منتخب کیا تھا۔ تو شاہجہان نے مہاراجہ جھجار سنگھ اور بکرماجیت جیسے شاہانِ والاتبار کی جائے پناہ بھوپال میں گھس کر ان کو یہاں کے جنگلوں میں قتل کیا۔ اور اُن کے چاہ دوز خزانوں کو برآمد کرکے کروڑوں روپیہ دہلی روانہ کیا تھا۔ اور بعدازاں قلعہ گنور کو فتح کرکے رہی سہی صحرائی اقوام کے نظام کو درہم برہم کر دیا تھا۔

انسانی دماغ سے فراموش کردہ اسی مقام کا آرائشی سامان تعمیر .... صنعتِ شاہجہانی کے صَرف میں بالکل اُسی طرح آیا۔ جس طرح کسی ویرانے کا چراغ سحری آخری بار بجھنے کے پہلے اپنی لَو دے جائے۔ چنانچہ روضۂ تاج محل میں آج تک بھوپال کا قیمتی پتھر ریاست بھوپال کی اُس کھدائی کی یادگار ہے۔ جس کو بہت دن تک کام ہونے کی وجہ سے کانِ شاہیہ کے نام سے شہرت حاصل ہے۔

مگر اس کے بعد سنگی صنعت کا ریاست بھوپال میں چراغ گُل ہوگیا۔ اور یہاں بندھیل کھنڈ کی مفرور اقوام اور راجپوتانہ کی مرہٹہ گردی سے ستم رسیدہ مخلوق نے لق و دق جنگل کے برگ و بار میں آکر ایسی پناہ لی۔ کہ آج تک آباد ہیں۔ ان غریبوں کو آج تک اپنی زراعتی ترقیوں سے اتنی فرصت ہی نہیں ملی۔ کہ زراعتی سطح کے نیچے زراعتی پیداوار سے زیادہ قیمتی وسائل پوشیدہ کو برآمد کرتے۔

دورِ جدید کی بہترین تعمیر کا بیش بہا نمونہ جو برطانیہ کے جواہر ریز دماغوں نے نئی دہلی کی عالیشان عمارات بنا کر پیش کیا ہے۔ رائے بہادر دھرم سنگھ صاحب مرحوم کے فراہم کردہ مواد سنگی کا رہین منت ہے۔ جس کو مرحوم کے انتقال سے چند روز قبل مجھے مرحوم کے صاحبزادے نے اپنے اکھڑتے ہوئے کارخانہ میں ملاحظہ کرایا تھا۔ یہاں بارہ کھمبوں میں میں نے وہ تمام اقسام کے پتھر بنی ہوئی حالت اور قدرتی حالت میں بھی معائنہ کئے تھے۔ جو اس قابل قدر ہستی نے بڑی کھوج اور وسیع جستجو کے بعد ہندوستان کے طول و عرض سے لا لاکر جمع کئے تھے۔ لیکن جب بھوپال کے پتھروں کے چند نمونے میں نے یہاں کے کاریگروں اور انجینیروں کو ملاحظہ کرائے۔ تو سب کے سب دست تاسف ملتے تھے۔ کہ نئی دہلی کی تعمیر کے وقت ایسے حسین اور قیمتی پتھر پیش نظر نہ ہوئے۔ ورنہ اس شاندار تعمیر کا نقشہ ہی بدل گیا ہوتا اور ریاست بھوپال اپنے قدرتی ذرائع کی فراوانی کا صلہ کئی کروڑ روپیہ کی آمدنی سے حاصل کر لیتی۔

یہاں نئی دہلی میں سنگ سرخ اور سنگ سفید کے حسن اتصال سے جو دلفریبیاں پیدا کی گئی ہیں۔ اُن سے کئی گنا زیادہ نظرفریب حسنِ صنعت بھوپال کے سادہ پتھر اس لئے پیدا کر سکتے ہیں۔ کہ دہلی میں فقط دو رنگ سفید اور سرخ استعمال کئے گئے ہیں۔ لیکن ریاست بھوپال میں قوس قزح کے ساتوں رنگ کے پتھر پیدا ہوتے ہیں۔ جن کے میل سے انسانی دماغ کہیں بہتر صناعیاں اختراع کرسکتا ہے۔

سادہ اقسام سنگ تعمیر۔ ریاست بھوپال میں مندرجہ ذیل اقسام کے سنگِ تعمیر بہتات سے پائے جاتے ہیں۔ مگر یہ وہ اقسام ہیں۔ جو اہم ہیں۔ اور غیر اہم (کم مفید اور کم خوشنما نہیں) اقسام کے پتھر دوسرے بہتیرے ہیں۔ جن کو بخوف طوالت نظرانداز کیا جاتا ہے۔

(۱) سفید پتھر	(۲) سرخ پتھر
(۳) زرد پتھر	(۴) بنفشئی پتھر
(۵) سبز پتھر	(۶) نیلا پتھر
(۷) نارنجی پتھر	(۸) سفیدی و سبزی آمیز پتھر
(۹) سفیدی و سرخی آمیز پتھر	(۱۰) کاسنی و سفیدی آمیز پتھر
(۱۱) سیاہ و سفید آمیز پتھر	(۱۲) سیاہ پتھر
(۱۳) سیاہ پتھر	(۱۴) جامنی پتھر

(۱۵) سرخ و سفید چھینٹ نرم جو کھدائی کے کام میں آتا ہے

ایسے پتھر بہت ہیں جن میں لہریئے بنے ہوئے ہیں - یا جن میں مختلف قسم کے ابرے ہیں - اور ایسے بھی پتھر وہاں ملتے ہیں - جن پر درخت اور بیل بوٹے بنے ہوئے ہیں - جن کو شجری پتھر کہتے ہیں - اور ایسے پتھر بھی ہیں - جو سنگ طباعت کے کام میں آ سکتے ہیں - یا جن سے قلعی اور چونہ بن سکتا ہے - یا جن سے مختلف قسم کی ریت تیار ہو سکتی ہے - یا جو سیمنٹ میں ملائے جاکر مختلف قسم کی نرمی اور سختی پیدا کر سکتے ہیں - یا جن سے خود سیمنٹ بنائی جا سکتی ہے - یا جن سے جلد سخت ہونے والی سیمنٹ بنائی جا سکتی ہے - یا جن سے سنگ مال تیار کئے جا سکتے ہیں - یا جن سے شیشہ سازی کا کارخانہ جاری کیا جا سکتا ہے +

آرائشی سنگ مرمر - یوں تو آرائش کے لائق بہتیرے پتھر ریاست بھوپال میں دستیاب ہوتے ہیں - اور ان کا تذکرہ یہاں بخوف طوالت نظرانداز کیا جاتا ہے - لیکن عام اور دل پسند اقسام جو اپنے آب و رنگ کے اعتبار سے سنگ مرمر کے بازار میں عمدہ قیمت لا سکتے ہیں - اور بہت اہم ہیں - مندرجۂ ذیل اقسام کے یہاں پائے جاتے ہیں :-

(۱) سفید شفاف سنگ مرمر
(۲) سفید سنگ مرمر
(۳) سفید سیاہ ابرے دار سنگ مرمر
(۴) سفید موتیا سنگ مرمر
(۵) سفید خاکی سنگ مرمر
(۶) سبز سنگ مرمر
(۷) گہرا سبز سنگ مرمر
(۸) سبز سرخ ابرے دار سنگ مرمر
(۹) سبز زرد ابرے دار سنگ مرمر
(۱۰) سبز کاہی سنگ مرمر
(۱۱) سبز سیبی سنگ مرمر چاندی کی جھلک والا
(۱۲) انگوری سنگ مرمر (۱۳) سرخ سنگ مرمر
(۱۴) گلابی سنگ مرمر (۱۵) نارنجی سنگ مرمر
(۱۶) نارنجی سنگ مرمر چاندی کی جھلک والا
(۱۷) زرد سنگ مرمر
(۱۸) زرد سنگ مرمر سیاہ ابرے والا
(۱۹) نیلا سنگ مرمر (۲۰) آبی سنگ مرمر
(۲۱) آبی سنگ مرمر گول ابرے والا -
(۲۲) آبی سنگ مرمر شجری
(۲۳) سیاہ سنگ مرمر (۲۴) کتھئی سنگ مرمر
(۲۵) خاکی سنگ مرمر شفاف لکیر والا
(۲۶) پچرنگا سنگ مرمر
(۲۷) سرخ سفید ابرے والا سنگ مرمر
(۲۸) لمی رنگ سنگ مرمر
(۲۹) سرخ و سبز خطوط دار سنگ مرمر
(۳۰) یشبی سنگ مرمر کپاسی رنگ
(۳۱) سیاہ و سفید چھینٹے دار سنگ مرمر

ان اقسام میں سب عمدہ پالش لاتے ہیں - اور بعض ان میں بہت سخت ہیں - اور بعض نہایت نرم ہیں - ان کے ٹکڑے سیمنٹ کے ساتھ آمیز ہو کر مصنوعی سنگ سازی میں چار چاند لگا سکتے ہیں - اور لکڑی کے فرنیچر میں ملا کر استعمال کرنے سے مختلف قسم کے آرائشی سامان کے لئے کار آمد ہو سکتے ہیں -

اس دورِ جدید میں جب کہ فن سنگتراشی نہ صرف اپنی تیز دستیوں کا رہین منت رہا ہے - بلکہ مشینوں کی ایجادوں سے اہرام مصر کی صناعیاں اور بابل کی کاریگریاں جو مدتوں میں پایۂ تکمیل کو پہنچی تھیں - اب چند دنوں میں مکمل ہو جاتی ہیں - ان گنج قارون کے مساوی القیمت وسائل قدرتی سے اگر اب فائدہ نہ اٹھایا جائیگا - تو کب اٹھایا جائیگا +

(زمانہ)

ہالی وڈ کے چند گھنٹے

ہالی وُڈ کا نام ہر فلم بین کے کانوں تک پہنچ چکا ہے - یہ امریکن صنعت فلمسازی کا مرکز ہے - ہر چند امریکہ کے علاوہ دیگر ممالک میں بھی فلمیں تیار ہوتی ہیں - مگر امریکہ کی فلموں کے مقابلے میں ان کی مانگ بہت محدود ہے - ہالی وُڈ کی فلموں کی مقبولیت کا راز یہ ہے - کہ وہاں فلمیں اس خیال کو سامنے رکھ کر تیار کی جاتی ہیں - کہ یہ ساری دُنیا میں دیکھی جائیں گی - وہاں فلموں کی تیاری پر روپیہ پانی کی طرح بہایا جاتا ہے - اور فلم اسٹاروں کی تنخواہیں اتنی کثیر ہیں - کہ وہ لوگ بہت سے والیان ریاست سے زیادہ مالدار ہیں +

نیویارک سے ہوتا ہوا پانامہ ہوتا ہوا میں لاس اینجلس آیا - یہاں

شاہکار لاہور

ایڈیٹر:- پروفیسر تاجور نجیب آبادی

ادارہ:- خواجہ محمود جاوید ایم۔اے
گوپال متل بی۔اے

چندہ:- سالانہ چھ روپے۔ ششماہی تین روپے آٹھ آنہ۔ نمونہ چھ آنہ

جلد (۸) — نمبر (۳)

فہرست مضامین بابت ماہ دسمبر ۱۹۳۸ء

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	نمبر صفحہ
۱۔	مختصرات	تاجور و گوپال متل	۵۶۲
۲۔	ذاتیات	تاجور	۵۷۱
۳۔	آل انڈیا ریڈیو	پروفیسر سید عابد علی صاحب ایم-اے۔ ایم او یل۔ ایل ایل بی	۵۷۷
۴۔	افسانے کی ترتیب	حضرت امداد صابری	۵۷۸
۵۔	آثار قدیمہ	جناب غلام ابرار صدیقی اثر بی۔اے (علیگ)	۶۰۵
۶۔	افکار تازہ	ماخوذ	۶۰۸
۷۔	بزم انتخاب	اس ماہ کے تازہ ترین اخبارات و رسائل سے اہم اور متنوع اقتباسات	۶۲۲
۸۔	صفحۂ اطفال	منقول از اخبار پریم لاہور	۶۱۶
۹۔	مختار:-	اس ماہ کا بہترین مضمون	۶۰۹

افسانے

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	نمبر صفحہ
۱۰۔	صحت عامہ کے لئے	گوپال متل	۵۷۵
۱۱۔	اجرت	جناب رونق کاشمیری	۵۸۸
۱۲۔	اعجاز	جناب گل سعید	۵۹۵

حصۂ نظم

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	نمبر صفحہ
۱۳۔	غزل	حضرت نجم آفندی	۵۷۴
۱۴۔	غزل	حضرت شاد عارفی	۵۹۴
۱۵۔	پروانۂ جنوں	جناب آثر صکوالی بی۔اے	۵۸۷
۱۶۔	دوست	جناب الطاف مشہدی	۶۰۴
۱۷۔	مرے بغیر	جناب تاباں امروہوی	۵۹۳
۱۸۔	انتباہ	جناب مجید امجد ایڈیٹر عروج جھنگ	۵۷۶
۱۹۔	غزل	جناب دینا ناتھ مست کاشمیری صدر بزم ادب جموں و کشمیر	۵۷۰
۲۰۔	غزل	جناب رہبر بی۔اے	۵۷۳

ایم ہادی حسن اختر پرنٹر و پبلشر نے آزاد ہند پریس ہسپتال روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر شاہکار واقعہ بر مکان میاں علی محمد، علی محمد سٹریٹ (۵۴ سی بیڈن) خواجہ دل محمد روڈ لاہور سے شائع کیا۔

مختصرات

حکومت پنجاب کے وزراء کی تنخواہیں

حکومت پنجاب کے وزراء کی تنخواہوں پر کانگریسی طبقوں میں ایک طوفان بے تمیزی برپا ہے۔ پنجاب کے کانگریسی لیڈر جہاں جاتے ہیں، اتحادی وزیروں کی بیش قرار تنخواہوں کا رونا روتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں کانگریس کے وزیروں کی داستان ایثار کے بیان میں یہ لیڈر اور ان کے اخبارات جس شاعرانہ مبالغہ آرائی سے کام لے رہے ہیں۔ اس کے سامنے مہاتما بدھ کے تیاگ کی کہانی بھی بے حقیقت ہو جاتی ہے۔

حالانکہ کانگریسی وزراء کا پانچسو روپیہ جو تنخواہ کے نام سے مقرر ہے وہ درحقیقت صرف ان کا جیب خرچ ہے۔ ان کے خانگی و مجلسی اخراجات کی کفالت کانگریسی حکومت کرتی ہے۔ انہیں رہنے کے لئے آرام دہ کوٹھیاں، تفریح کے لئے موٹریں سفر کے لئے ہوائی جہاز بہم پہنچائے جاتے ہیں۔

پھر کانگریسی صوبجات کے وزراء میں اکثر تعداد اُن وزیروں کی ہے۔ وزارت سے پہلے جن کی آمدنی دوسو روپے ماہانہ کی بھی نہ تھی۔ مدراس کے وزیر اعظم آنریبل مسٹر راجگوپال آچاریہ کا بیان اس دعوے کی صداقت کو بے ریب و بے مبالغہ بنا دیتا ہے۔ پچھلے دنوں انہوں نے ایک تقریر میں فرمایا کہ "ہمیں پانچسو روپیہ ماہانہ ضرورت سے زیادہ مل رہا ہے۔ وزارت سے پہلے ہماری آمدنی اتنی نہ تھی۔"

اس کے برعکس پنجاب کی اتحادی حکومت کے وزراء نے درحقیقت سہ ہزاری منصب وزارت منظور کر کے بڑا ایثار کیا ہے۔ آنریبل سر سکندر حیات کی تنخواہ ریزرو بنک کے ڈپٹی گورنر کی حیثیت میں ساڑھے سات ہزار روپیہ ماہانہ تھی۔ اور اگر وہ اس منصب سے دست بردار نہ ہوتے تو کچھ مدت میں یقیناً بنک کے گورنر بنائے جاتے۔ گورنری کی صورت میں انہیں بیس ہزار روپیہ ماہانہ تک ترقی ملتی اور ہزاروں روپے ماہانہ سفری الاؤنس اس کے علاوہ ہوتا۔ پھر کیا یہ ایثار کچھ کم ہے کہ ایک بلند اور مستقل منصب سے جس کا مستقبل دولت و عظمت کی طلعتوں سے جگمگا رہا تھا۔ اپنے ہموطنوں کی درخواست پر دست برداری دیکر بے استروں کی مالا وزارت عظمیٰ انہیں گلے میں ڈالنی پڑی۔

آنریبل سر سندر سنگھ کو تو وزارت اسقدر مہنگی پڑی ہے کہ شاید پھر کبھی بھول کر بھی اس کا نام نہ لیں گے۔ شبانہ روز کی وزارتی مصروفیتوں کے سبب اُنہیں اپنے کاروبار میں کئی لاکھ روپے کا نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ یہی حشر میجر خضر حیات خاں ٹوانہ وزیر بلدیات کا ہو رہا ہے۔ کہ منصب وزارت کی مصروفیات کی وجہ سے انہوں نے اپنی نو لاکھ روپے سالانہ کی اسٹیٹ کا انتظام نوکروں کے سپرد کر رکھا ہے۔

اب رہے آنریبل میاں عبدالحی وزیر تعلیمات، آنریبل سر چھوٹو رام وزیر ترقیات، اور آنریبل مسٹر منوہر لال وزیر مالیات۔ یہ ہر سہ حضرات صوبے کے مشہور مقنن، عدالت عالیہ کی بار کے پہلی صف کے چند در چند کامیاب وکیلوں میں سے ہیں۔ ان کے متعلق یہ خیال کرنا کہ تین ہزار روپیہ ماہانہ تنخواہ اُن کی سابقہ حیثیت سے زیادہ ہے۔ حقائق سے آنکھیں بند کر لینے کے برابر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان حضرات کے وزارتیں منظور کر لینے سے پنجاب کے وہ لوگ جن کے پیچیدہ اور اہم مقدمات آئے دن عدالت عالیہ میں پیش ہوتے رہتے ہیں۔ انکی قانونی امداد سے محرومی کو تکلیف دہ محسوس کر رہے ہیں۔ ان ہر سہ وزراء میں کوئی بھی ایسا نہیں جس کی پیشہ ورانہ آمدنی پانچ چھ ہزار روپے ماہانہ سے کم ہوگی۔

سر سکندر نے مرہونہ اراضیات کی واگذاری کا بل پاس کرا کے اپنے خاندان کی کئی لاکھ روپے کی اراضیات کا نقصان اٹھایا، وزیر بلدیات کو پچاس ہزار روپے مالیت کی اراضیات واگذار کرنی پڑیں۔ ان گراں بار نقصانات پر نظر ڈالی جائے تو سکندر کابینہ کے تمام وزیروں کی سہ سالہ تنخواہیں بھی اس نقصان کی تلافی نہیں کر سکتیں۔

ہمارے غریب ملک کو آنریری ورکر لیڈروں کی خدمات جسقدر مہنگی پڑی ہیں، کسی سے پوشیدہ نہیں۔ خلافت فنڈ کا سولہ لاکھ روپیہ ایک [illegible] کے جیب خرچ کی نذر ہو گیا۔

پنجاب کے ایک مرحوم کانگریسی لیڈر نے ریاست کی واگذاری کے [illegible] کے نام پر مہاراجہ نابھہ کا ۲۵ ہزار روپیہ یورپ کی تفریحی سیر پر خرچ کر دیا۔

دہلی کے ایک آنجہانی لیڈر نے مہاراجہ نابھہ کو بحالی تاج و تخت کی ترغیب پیش کر کے ایک لاکھ بیس ہزار روپیہ وصول کیا۔ لیکن تاج

دستخط کی بحالی تو کیا ہوتی۔ اسکی بجائے ہوا یہ کہ گورنمنٹ نے مہاراجہ موصوف کا ۲۵ ہزار روپیہ الاؤنس گھٹا کر ۵ ہزار کر دیا اور جنوبی ہند کے ایک گمنام گوشہ میں اُنہیں ہمیشہ کے لئے نظر بند کر دیا گیا۔

پنجاب کانگریس کے ایک موجودہ لیڈر کانگریسی کارِ دبار کے سلسلے میں جس ایثارِ گراں بار کا ثبوت دے رہے ہیں کانگریس ہی کے دوسرے لیڈروں سے اس کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔

یہ عبرتناک داستان ایک ضخیم کتاب کی وسعت چاہتی ہے الغرض مسلسل تجربات کی تلخی اس حقیقت ثابتہ کی شاہد عادل ہے کہ ہمارے ملک کے آنریری لیڈروں کی مفت کاری بالکل نمائشی ہے۔ اس نمائش کا پس منظر حد درجہ عبرت آموز ہے۔

ان اندوہ آفرین تجربات کی روشنی میں مصالح ملکی کا تقاضا تو یہ ہے کہ مخلص اور جفاکوش رہنماؤں کو ان کی سابقہ حیثیت اور درجے کے مطابق حق الخدمت ضرور دیا جائے۔ کیونکہ کم گیر اور مفت کار رہ کر دوں کی دراز دامنی قومی فنڈز اور قومی ذمہ داریوں کے حق میں تباہ کن ہو چکی ہے اور ہو سکتی ہے۔

پنجاب کے اتحادی وزراء تین ہزار روپے ماہانہ تنخواہ تو ضرور وصول کرتے ہیں۔ مگر یہ بھی تو دیکھنے کی ضرورت ہے کہ انہوں نے دو سال کے مختصر سے وقت میں اہل پنجاب اور پنجاب کی جیسی شاندار خدمات انجام دی ہیں۔ کوئی کانگریسی حکومت اس کی نظیر پیش نہ کر سکیگی مظلوم کسانوں کی اراضیات جو رہن کی آڑ میں نسل در نسل ساہوکار مرتھنوں کے تسلط میں چلی آتی تھیں اور جن کے چھن جانے سے پنجاب کے سیکڑوں زمیندار خاندان۔ زمیندار سے کاشتکار اور کاشتکار سے کمیروں (کاموں) کی پست حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ سکندر گورنمنٹ نے بل پاس کر کے اُن اراضیات کو اصلی مالکوں کے حوالے کر دیا۔ اور اس طرح ۴۲ کروڑ روپے کی قیمتی اراضیات غریب مالکوں کو غیر متوقع طور پر واپس مل گئیں۔ اس زرین کارنامے کے مقابلے میں وزراء کی تین ہزار روپے تنخواہ کا نام لینا بھی کافر[illegible] بن جاتا ہے۔

اپنے مدارس کو چلا رہے ہیں۔ لیکن ان اسکولوں کی عام حالت محکمۂ تعلیم کے افسران کی توجہ کی بہت کچھ محتاج ہو گئی ہے۔ تنخواہ کا وقت پر نہ ملنا تو ایسی مصیبت ہے کہ عام ہونے کے سبب استادوں کے لئے آسان ہو گئی ہے۔ لیکن منیجروں اور بعض جگہ ہیڈ ماسٹروں کی دراز دستیوں کے سبب جو نئی نئی آفتیں سے استادوں کو دوچار ہونا پڑ رہا ہے ان کی جانب سے افسرانِ تعلیم کی بے اعتنائی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔

(۱) داخلے کے وقت در بدر پھر کر طالب علموں کو فراہم کرنا۔

(۲) تعطیلات میں رسید بکتیاں لے کر ہر کس و ناکس سے اسکول کے لئے گدائی کرنا۔

(۳) معائنے کے بعد یا تعطیلات کی تنخواہ سے بچنے کے لئے استادوں کو تعطیل سے پہلے جواب دیدینا۔

(۴) بعض مدارس میں تنخواہ کے رجسٹر پر پوری تنخواہ کی وصولی کے دستخط کرا کے اس کا ایک حصہ مقررہ کمیشن کے بطور منیجروں کو واپس کر دینا۔

(۵) معاشی مجبوری کے سبب منیجر و ہیڈ ماسٹروں کی بیجا [illegible] بلکہ زیادہ گفتاری کو برداشت کرنا۔

اساتذہ کی یہ مشکلات محکمۂ تعلیم کی فوری توجہ کی مستحق ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان عام شکایات اور دوسری قسم کی بدنظمیوں کی تحقیقات کے لئے محکمے کی جانب سے ایک کمیشن کے تقرر کی ضرورت مدت سے محسوس ہو رہی ہے۔

اسسٹنٹ انسپکٹران مدارس کے متعلق

ہر ضلع میں ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس ضلع کا افسر تعلیم ہوتا ہے اور ضلع کی وسعت کے مطابق اس کے تحت میں چند اسسٹنٹ انسپکٹر ہوا کرتے ہیں۔ یہ اسسٹنٹ یا اے ڈی آئی ضلع کی تحصیلوں میں مدارس کی تعلیمی نگرانی کرتے ہیں۔ ان کا تعلق زیادہ دیہاتی مدارس سے ہوتا ہے دیہات کے لوگ افسران کی دیرینہ روایات جبر و قہر کے پیش نظر قدرۃً ڈرپوک ہوتے ہیں۔ اب بھی کہ زمانے میں غلامی اور بندگی کے خلاف ایک انقلاب رونما ہے اور آقائی و غلامی کے قدیم آقائی سرنگوں ہو رہی ہے۔ دیہات کی فضا میں اس انقلاب [illegible] اثر دکھائی دیتا ہے۔

دیہاتی مدرس نمبرداروں، ذیلداروں، زمینداروں اور دست [illegible]

پرائیویٹ اسکولوں کی نگرانی

پنجاب [illegible] پرائیویٹ اسکولوں میں استادوں کے ساتھ زیادتیوں کی داستان اب [illegible] باقی ہے۔ ان میں کچھ اسکول تو ایسے ضرور ہیں کہ ان کے منیجر ایک قومی خدمت سمجھ کر دیانتداری سے

آیئوں سے بدستور خائف و ترساں رہتے ہیں۔

ہر تحصیل کے مدارس میں اے ڈی آئی محکمے کی جانب سے افسر تعلیم کی حیثیت میں پہنچتا ہے۔ بہت سے سعید الفطرت اے ڈی آئی جن پر علم و تعلیم کا صحیح اثر پڑا ہے ان مدارس کے اساتذہ سے احترام ہمدردی اور شرافت کا سلوک کرتے ہیں۔ ان کے حقوق کے ہمدرد، ان کی ضروریات سے باخبر، ان کی کارکردگی سے واقف اور ان کے درد سے آشنا ہونے کے سبب ان کے لئے صحیح معنی میں رہنما ثابت ہوتے ہیں

لیکن پچھلے دنوں بعض اضلاع کے نمائندہ اجتماعوں میں صادق البجہ ہیڈ ماسٹروں کی زبانی بعض اے ڈی آیئوں کی فرعونیت رعونت اور رشوت ستانی کی مسلسل شکایات سن کر افسوس بھی ہوا اور حیرت بھی۔

پولیس کی رشوت ستانیوں کا اتنا شور ہے کہ اس شور میں حکومت کی توجہ خاموش محکموں کے رشوت خواروں کی جانب منعطف ہی نہیں ہوتی اور دیہات سدھار کے محکمے والے گاؤں گاؤں پھرتے ہیں۔ دیہاتیوں کے حالات کی اصلاح کر رہے ہیں، انہیں ترقی کی راہیں دکھا رہے ہیں۔ مگر دیہاتی مدارس میں استادوں کی مشکلات کی جانب یہ بھی زحمت التفات گوارا نہیں کرتے۔

سنا جاتا ہے کہ کچھ اے ڈی آئی جن کی تعداد پندرہ اور بیس فی صدی کے درمیان ہے ایسے ہیں جو اپنے غرور کبریائی میں بدمست ہو کر دیہاتی مدارس کا معائنہ کرنے کے عادی ہیں۔ ان کے حلقہ خدائی میں کسی استاد کی یہ مجال نہیں کہ ان کے قریب آ کر کچھ عرض و معروض کی جرات کرے۔ اے ڈی آئی صاحب اور استادوں میں وہی بعد ہے جو کا فاصلہ جلال افسرانہ کے لئے ضروری ہے۔ پھر ان کی ضروریات کا جبری اور بعض فراہمی استادوں کے لئے فرض تعلیم سے بھی مقدم ہے۔ اور جب تک یہ اے ڈی آئی جو صورۃً انسان اور سیرۃً عذاب الٰہی ہے کسی دیہاتی مدرسے پر مسلط رہتا ہے۔ غریب استادوں سے اس کی فرمائشوں کا سلسلہ کہیں منقطع نہیں ہوتا۔ استادوں کے ساتھ اس قماش کے اے ڈی آئیوں کا انداز تخاطب "تو" اور "تیرا" کے الفاظ سے ہوتا ہے۔ پھر جس استاد سے کسی جا و بیجا شکایت پر خفا ہوتے ہیں وہ مدرسے استادوں اور جماعت کے طالب علموں کے سامنے ہی اپنی خفگی کا ذلیل اظہار کرنے میں تامل نہیں کرتے۔

ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان شکایات میں صداقت کتنی ہے۔ لیکن مختلف اجتماعات اور مختلف اوقات میں بہت سے استادوں سے مشترکہ شکایات سننے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ ممکن ہے شکایات میں کچھ مبالغہ ہو۔ لیکن وہ بے بنیاد ہرگز نہیں۔ قابل غور یہ بات ہے کہ استادوں پر ایسے قہرمان اور جابر لوگوں کو مسلط کر دینے کا نتیجہ یہ نکلیگا کہ ترساں و لرزاں اساتذہ اخلاقی حیثیت سے تباہ ہو جائیں گے۔ اور پھر ان بدقسمت بچوں کے انجام کا خدا ہی حافظ ہوگا۔ جو ان جور پرست استادوں سے تعلیم حاصل کریں گے۔

اربابِ نظر، احبابِ علم و ادب اور رہنمایانِ تعلیم سے التماسِ التفات

تاریخ ادب و صحافت کو زیرِ نظر رکھنے والے حضرات جانتے ہیں کہ اردو زبان میں جدید طرز کا پہلا ماہنامہ سرسید کی نگرانی میں تہذیب الاخلاق کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد یوں تو کئی رسالے جاری ہوئے۔ مگر انیسویں صدی کے قریب الاختتام علی گڑھ سے رسالہ معارف مشرق و مغرب کے معتدل امتزاج کی خصوصیات علم و ادب کا حامل بن کر راہِ صحافت کے رہنما کی حیثیت میں اشاعت پذیر ہوا۔

شمالی ہند میں رسالہ مخزن کی اشاعت بھی نشانِ راہ کا درجہ رکھتی ہے مخزن کا آغازِ اشاعت بیسویں صدی کے آغاز سے ہمکنار رہے۔ مخزن نے اردو ادب کو مغربی ادبیات کے مترجمات سے سرمایہ دار بنایا۔ مخزن درحقیقت جدید تعلیم یافتہ طبقے کے ذوقِ ادب کی تسکین کے لئے جاری ہوا تھا۔ مخزن کی دیکھا دیکھی کانپور سے "زمانہ" اور الہ آباد سے "ادیب" کی اشاعت ہوئی۔ ان پرچوں کی بوقلموں خصوصیات نے ادبی فضا کو حدِ نگاہ تک وسعت بخشی۔

اردو ماہناموں کی اشاعت کا یہ سلسلہ غیر متناہی ہوتا چلا گیا اور گزشتہ دو قرن سے تو گویا ٹکڈسے کا در کھل گیا ہے۔

اردو ماہناموں کے گزشتہ چہل سالہ دورِ حیات کا دامن علم و ادب کی دلفروز طلعتوں سے جگمگا رہا ہے۔ قدیم رنگ کے طرحی رسالوں کی بد مذاقی نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اردو زبان و ادب سے قریب قریب متنفر کر دیا تھا۔ جدید طرز کے رسائل نے اس تنفر کو تعشق میں تبدیل کر دیا۔ سچ یہ ہے کہ اردو ادب کی فطری زندگی انہیں رسالوں سے وابستہ چلی آ رہی ہے۔ لیکن بلند پایہ رسائل نے جہاں صالح اور ذہنیت افروز ادب کی تخلیق سے اردو زبان کو زندہ زبانوں کا حریف بنانے میں خارق عادت کامیابی حاصل کی وہیں "تعرف الاشیاء باضدادھا" کے ارشاد زریں ..... کی تصدیق

کرتے ہوئے قدیم رنگ کی محدود مبتذل اور بے تنوع غزلیات نے روپیہ کے سولہ سو صفحات والے پست مایہ ناولوں کا روپ بدل کر تاریخ بدمذاقی کو دوہرانے کی سعی ناشکور شروع کر دی۔

رفتہ رفتہ لوچ نگاروں کی ذلیل ذہنیت نے ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے جدید طرز کے رسوائے انام "ادبِ لطیف" کی صورت میں ایوانِ اردو کو عفونت زار بنا دیا۔ اور یہ وبا اس درجہ ہمہ گیری اختیار کر گئی کہ متین ادبیات کے چراغ مدھم پڑ گئے۔ راقم الحروف نے رسالہ ادبی دنیا اسی مذاق فاسد کی اصلاح کے لئے جاری کیا تھا۔ ادبی دنیا جس جاہ و جلال سے شائع ہوا اور جن طفرات غیر عادیہ کے ساتھ ادبی فضا پر چھا گیا اردو ادب وصحافت کی تاریخ اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتی۔ مگر میری انتظامی نااہلی حسد پیشہ حریفوں کی ملعون سازش اور خیانت کار کارکنوں پر ضرورت سے زیادہ اعتماد نے اِس فضا پرواز پرچے کو بے بال و پر اور مجھے بے دست و پا کر دیا۔

میں اپنے عہدِ طالب علمی (۱۹۱۲ء) سے میدانِ ادب وصحافت میں اُترا اور آج (۱۹۳۸ء) تک کے ۲۷ سال کی طویل زندگی بسر ہو چکی اور قحط الرجال نے مجھے متعلم سے معلم اور رہرو سے رہنما بنا دیا۔ بلکہ تنہا حالات نامساعد سے جنگ کناں اسی معرکۂ موت وحیات میں مصروف کارزار ہوں۔ شوق بیقرار کی "بڑھے چلو" سے جو قدم اُٹھتا ہے آگے ہی کو بڑھتا ہے۔ ہر قدم پر عاقبت اندیشی اس راہ کی دیوار حائل بن رہی ہے۔ لیکن جنونِ شوق ہر دیوار حائل کو پھلانگ جاتا ہے۔ جانتا ہوں کہ محبت کی طرح یہ راہ بھی بے منزل ہے۔ مگر شکریۂ جنوں کہ دل میں شوق رہ نوردی ہے۔ تمنائے منزل نہیں۔ ایک آغاز بے انجام کشاں کشاں لئے جا رہا ہے۔ چلا جا رہا ہوں۔ نہ پلٹ کر یہ دیکھنے کی اجازت کہ کتنا راستہ طے ہو چکا۔ نہ کوئی یہ بتانے والا کہ اس ادبی "پل صراط" کی کوئی حد بھی کبھی آئے گی کہ نہیں! بظاہر تو ایسا نظر آتا ہے کہ اِس مسافر شکار خارزار کا دامن ابد سے پیوستہ ہے اور میری راہِ زندگی اپنی منزل یہیں بنائے گی

رسالہ ادبی دنیا ایک نشانِ راہ کے طور پر جاری ہوا اور اکثر رسائل بے اعتراف پیروی اس کے ساتھ ہو لئے۔ اس کی جہانگیر شہرت کو دیکھ کر درجنوں ماہنامے ایسے شائع ہوئے جن کے نام کا اخیر جزء "دنیا" ان کے لئے کفیل قبولیت کے طور پر ضروری سمجھا گیا؟ پھر جن کی ہمت بیمار نے راستے کو حریفِ زندگی پایا وہ میری کج راہی کے افسانہائے دراز کی زحمت بیان میں مبتلا ہو گئے۔ دور اندیشی نے انہیں سمجھا دیا کہ۔

"دررہِ منزل لیلیٰ کہ خطرہاست بہ جاں
شرطِ اول قدم آں است کہ مجنوں باشی"

رسالوں کے کاروباری پبلشر کہ جنونِ ادب کی بجائے حرصِ زر رکھتے تھے۔ بھلا میرا ساتھ کیا دیتے؟ عشق بنردشہ طلبگار مرد تھا اور پیشہ ور رسالچیوں میں کوئی اس میدان کا مرد نہ بنا۔

ادبی دنیا کی گراں ارزاں اشاعت نے اگرچہ زندگی کی تمام تر کامیابی مجھ سے اپنی قیمت میں وصول کی۔ مگر ملک کے ادب دوستوں کا مذاق ادبی بلند ہو گیا۔ ہندوستان کے علاوہ بیرونی دنیا کے ہر حلقے میں بود و باش رکھنے والے ہندوستانیوں نے اسے تحفۂ وطن سمجھ کر قبولیت کے ہاتھوں میں لیا۔ ایک بے مایہ اردو خوان سے لے کر والیانِ ریاست، وزرائے حکومت اور رموسجات کے بعض یورپین گورنروں تک نے لمحات فرصت میں اسے مطالعے کی چیز سمجھا۔ اس کی قبولیت کا اندازہ اس امر واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ اس کے ہر نمبر کی اشاعت پر ۱۳ من کاغذ صرف ہوتا تھا۔ اس کے وقار اثر اور متانت رائے نے پنجاب یونیورسٹی کی تحریک اصلاح کو اس حد تک کامیاب بنایا کہ حکومت پنجاب ساٹھ ہزار روپیہ صرف کر کے تحقیقاتی کمیشن کے تقرر پر مجبور ہو گئی۔ مگر اردو ادب کی بدنصیبی کہ شباب ادب وصحافت کے اس افسانۂ دلکش و ناتمام کو تکمیل پذیر ہونے سے پہلے ایک خیانت پیشہ معتبر نما دوست کے فریبِ اعتماد نے میری غیر موجودگی میں ساڑھے چار ہزار روپے کا غبن کر کے اسے میرے ہاتھ سے چھنوا دیا۔ افسوس۔

"آئی تھی اب مزے پہ کہانی شباب کی
کس لطف کے مقام سے افسانہ چھُٹ گیا"

ادبی دنیا کے بعد میں نے رسالہ شاہکار جاری کیا۔ اس نے ادبی دنیا کی رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔

"اردو مرکز" کی جو کتابیں مجھے پبلشر سے رائلٹی میں ملی ہیں یہ میرے بلقیۃ الموت بچوں کا حق تھا۔ مگر میرے شوق دراز دست نے اس حق پر بھی چھاپا مارا اور سات ہزار روپیہ ان کی فروخت کا "شاہکار" کی نذر کر دیا۔ شاہکار کا نقصان جاری انہیں کتابوں کی قیمت فروخت سے پورا کر رہا ہوں۔ اس سلسلے میں مجھے اپنے چند ادب نواز افسرانِ تعلیم کی توجہات کریمانہ کا بانداز احسان مندی اعتراف ہے کہ انہوں نے میری مشکلات کا احساس کرتے ہوئے وقتاً فوقتاً اردو مرکز بکڈپو کی کتابوں کی خریداری فرمائی اور اس طرح مجھے اور میرے عجز ہمت کو رسوا ہونے سے بچا لیا۔

دسمبر کا مہینہ سالناموں کی اشاعت کے فرمودہ کی تقریبات کا مہینہ ہوتا ہے۔ ہر رسالہ سال کے گیارہ ماہ کی ہیچ رفتاری پر پردہ ڈالنے کے لئے دسمبر کے مہینے میں پر پرواز پیدا کر لیتا ہے۔ میرے قارئین میں بھی بہت سے حضرات خواہشمند یا متوقع ہوں گے کہ رسالوں کی ہوا بازی کے اس مقابلے میں "شاہکار" بھی شریک ہو۔ مگر میں چند وجوہ سے اس طوفان پرواز کی شرکت سے معذرت کا اظہار کرتا ہوں۔

(۱) شاہکار سال کے اپنے گزشتہ گیارہ ماہ سے کسی عنوان شرمندہ نہیں۔ کہ سال کے بارہویں مہینے تلافی ندامت ضروری سمجھے۔

(۲) سالنامے کے متعلق میرا ذوقِ نظر اس درجہ بلند واقع ہوا ہے کہ اس نقطۂ رفعت تک پہنچنے کے لئے مجھ میں طاقت پرواز نہیں اور عام سالناموں کی پست سطح پر اُترنا بھی میرے معیارِ ادب کی موت ہے۔

(۳) ۱۹۳۳ء میں رسالہ ادبی دنیا کا نوروز نمبر اور ۱۹۳۶ء میں شاہکار کا سالنامہ جس ادبی شکوہ و طمطراق کے ساتھ شائع ہوا اس سے سالناموں کے لئے میں ایک ایسا بلند معیار قائم کر چکا ہوں جو ماؤنٹ ایورسٹ کی طرح آج تک غیر مفتوح چلا آتا ہے۔ پھر جب تک کسی رسالے کا کوئی خاص نمبر اس ہفت خوانِ رفعت تک رسائی حاصل نہ کرے۔ مجھ سے پست پروازی کے کسی ہنگامے میں شرکت کا مطالبہ صحیح نہیں۔

(۴) ادبی دنیا کو اُس کے نوروز نمبر کی اشاعت کے بعد حادثۂ غبن نے اور "شاہکار" کو اُس کے سالنامے نے میرے ہاتھ سے نکال دیا تھا کیونکہ اپنے بلند معیار کے پیشِ نظر سالنامہ شائع کرنے کے سبب میں اسقدر زیر بار ہو گیا تھا کہ اُس کے گرانبار اخراجاتِ اشاعت کی ادائیگی میرے لئے دشوار ہو گئی اور نتیجتاً یہ دونوں پرچے میرے ہاتھ سے نکل گئے۔ شاہکار تو کسی نہ کسی طرح دوبارہ مجھے مل گیا۔ مگر ادبی دنیا کا رنج گمشدگی میرے دل کے لئے آج تک ایک داغِ آتشیں بن رہا ہے۔

مختصر یہ کہ اپنے پرچے کا خاص نمبر میرے لئے ایک ادبی سانحہ بن جاتا ہے۔ یہ اولوالعزمی مجھے سازگار نہیں۔

(۵) فلمی رسالوں اور ان کی دیکھا دیکھی ادبی رسالوں کے سالناموں نے فلمی اسٹاروں کی تصاویر اور عریاں افسانوں کی اشاعت سے رسالہ خواں پبلک کے تصویری ذوق اور مذاقِ ادب کو اس درجہ پست کر دیا ہے۔ کہ وہ تصویری آرٹ کی لطافتوں اور ادبِ عالیہ سے مانوس ہی نہیں رہے۔ اس لئے اُن کے ذوق کی تسکین میرے پرچے کا کوئی خاص یا عام نمبر نہیں کر سکتا۔

مختصر یہ کہ میرے مذاقِ نظر تک ان کے ذوق کی رسائی نہیں اور اُن کی سطحِ حضیض پر اُترنے کا ایثار مجھے گوارا نہیں۔

مندرجہ وجوہ کی بنا پر میں شاہکار کے سالنامے کی اشاعت سے قصداً گریزاں رہتا ہوں۔ اگرچہ خلوتِ دل کے پردہ بہ پردہ گوشے میں سالنامہ شائع کرنے کی خلش شوق مجھے بے چین ضرور رکھتی ہے۔

اُردو صحافت میں طوفانِ بے امتیازی | بات یہ ہے کہ موجودہ پست نشان دور میں صحافتی معیار کو قائم رکھنا ناممکن سا ہو گیا ہے۔ جس طوفان بے امتیازی میں منشی چمن لال سیوک، حافظ کریم بخش بھٹی اور تاجور ایک ہی زمرے میں شمار کئے جائیں، وہاں بھلا کسی صحافتی اولوالعزمی کے اظہار کو غیرتِ صحافت کیونکر برداشت کر سکتی ہے۔

اہلِ نظر سے شکوہ | اِدھر ملک کے بلند پایہ اہلِ قلم کی مبتذل نوازی کا حال یہ ہے کہ اپنے گرانمایہ جواہر افکار کسی رسالچی کی التجائے نیاز پر کھپا دینے میں مطلق عار محسوس نہیں کرتے۔ جن نام نہاد رسالوں کے عام یا خاص نمبر اپنے ڈمی ایڈیٹروں کے افلاس قابلیت کے سبب پست نگار، فحش نگار اور خام کار نومشقوں کے خرافات کا البم بن کر شائع ہوتے ہیں۔ انہیں کے صفحات میں ملک کے بلند پایہ اہلِ قلم کے گرانمایہ مقالات کی اشاعت دیکھ کر ایک مبتصر کی نگاہ حیرتوں میں ڈوب جاتی ہے۔

مانا کہ اُن رسالوں اور رسالچیوں کے لئے اہلِ قلم کی یہ ظالمانہ فیاضی موجبِ فخر و مباہات ہے لیکن التفاتِ ناروا کے یہ مرتکب حضرات اس احساس سے کیوں دست بردار ہو چکے ہیں۔ کہ عامیانہ اور سطحی پرچوں میں اُن کے جواہرات خزف ریزوں کے ہم قیمت بن جاتے ہیں اور اُن کے ناموں کا مسلمہ شکوہ ان پرچوں کو معیاری اور ان بے سواد رسالہ بازوں کو نگاہِ عام میں مستند ٹھہراتا ہے۔ یہ اردو ادب کی خدمت ہے یا تخریب! کیا اس بخشش ناروا کا ان بے سواد مدیروں کی سرکار سے یہ بے اثر و بے قیمت اعتراف اہلِ قلم کے ایثار پسند پذیری کے لئے وجہ جواز بن سکتا ہے کہ ان کے بے مایہ پرچوں میں مضمون نگاروں کے مضامین کے ساتھ ان کے ناموں کے وقار کو خندہ آفریں القاب کے انبار سے دبا دیا جائے؟۔ آخر یہ فتنۂ خود فروشی کبھی ختم بھی ہو گا؟۔

مشہور افسانہ نگار مرزا ادیب کے ساتھ ایک اَن پڑھ کارفرما کے خوش سواد اسسٹنٹ ابھی ابھی میرے پاس سے اُٹھ کر گئے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ رسالے کے مینجنگ ایڈیٹر کی مجھے ہدایت ہے کہ "رسالے کے خریداروں یا ایک خریدار دینے والوں کے مضامین خواہ کسی درجے کے ہوں ضرور شائع کئے جایا کریں۔"

اب فرمائیے کہ جن رسالوں میں مضامین کے استحقاق اشاعت کا معیار صرف خریدار بننا یا ایک خریدار کی فراہمی قرار پا جائے وہ رسالے اس قابل بھی ہو سکتے ہیں کہ کوئی صاحبِ نظر انشاء پرداز انہیں دیکھنا بھی گوارا کرے۔ چہ جائیکہ اپنی توہین اور ادب کی پامالی کا گناہ سر لے۔

مگر لبا حیرت اور لبا دریغ کہ ہو یہی رہا ہے کہ خزف ریزوں کی اشاعت کرنے والے رسالوں میں بلند ذوق ادیبوں کے جواہر پارے بھی حیرت سوزی کا سامان بہم پہنچا رہے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا یہ "دورانِ باخبر" اپنے ذوقِ انتخاب کی رسوائی پر کیوں اسقدر مصر نظر آتے ہیں؟

حیرت بالائے حیرت یہ ہے کہ محکمۂ تعلیم کا ورنیکولر ایجوکیشن انسپکٹر ایک صحیح مذاقِ علم و ادب کا مالک ہے مگر محکمے کی منظور شدہ لسٹ ان رکیک و سخیف رسالوں کے ناموں سے کسی گناہ پرست کے نامۂ اعمال کی طرح سیاہ نظر آتی ہے!! اور اس نااہل نوازی کے ذریعہ مدارس کے اردو اساتذہ اور اردو پڑھنے والے طلبہ میں بد مذاقی کی تبلیغ عام ہو رہی ہے۔

طرّہ یہ کہ کسی رسالے میں کوئی گندہ اشتہار شائع ہو جائے تو محکمہ ایڈیٹر سے فوراً بازپرس کرنے لگتا ہے۔ لیکن سارے محکمے میں کوئی یہ دیکھنے والا نہیں کہ اکثر منظور شدہ رسالے عریاں رکاکتوں اور لیست نگاریوں کے پلندے بن کر شائع کئے جا رہے ہیں۔ جو کاردان صحافی اپنے پرچوں کو اردو خواں پبلک کے مذاق بیمار و ذوق فاسد کی اصلاح کی خاطر متین بنانے کا ایثار کر رہے ہیں وہ ہر طرح نقصان میں ہیں۔ پبلک انہیں اپنی لیست مذاقی کے پیشِ نظر خشک پاکر ان پر توجہ ضائع کرنا پسند نہیں کرتی۔ اور مدارس کے اساتذہ اپنے منصب رہنمائی کے احساس سے محروم اور عام بد مذاقی کا شکار ہونے کے سبب اُن سے بے نیازی برتتے ہوئے فلمی لپشتاسوں اور کوک شاستری انداز کے پرچوں کے گرویدہ ہو رہے ہیں۔

"شاہکار" اردو ادب و تعلیم کا ملک بھر میں تنہا پرچہ ہے۔ جو ادب عالیہ کی اشاعت و تبلیغ کے ساتھ تعلیمات کی خدمت اور مظلوم اساتذہ کی مؤثر حمایت ابتدا سے کر رہا ہے۔ اساتذہ اس واقعیت سے بے خبر نہیں۔ ایڈیٹر کے نام اپنے نیاز ناموں میں اس کا اعتراف بھی کرتے رہتے ہیں لیکن جب اسکول لائبریری کے لئے پرچوں کی خریداری کا وقت آتا ہے تو صلۂ احسان کے طور پر شاہکار کو بالکل بھول جاتے ہیں۔ اِدھر اضلاع کے اکثر افسران معائنہ بھی چونکہ ذوق ادب سے ناآشنا ہیں۔ اس لئے عموماً تو اُن کے شرف انتخاب سے "شاہکار" محروم ہی رہتا ہے اور اگر جذبۂ انصاف اُن پر طاری ہو بھی جائے تو شاہکار کے میرٹ کو نظر انداز کر کے ہر اہل و نااہل کو خوش کرنے کی سعی فرماتے ہوئے جوہری اور خزف فروش کو برابر کی حیثیت دیکر فرضِ قدر شناسی سے اپنے آپ کو سرخرو سمجھ لیتے ہیں۔

اِس عبرتناک طوفانِ بے امتیازی میں میرے لئے شاہکار کا اجرا اور اس کے گراں بار نقصانات کا تحمل جس درجے سوہانِ روح ہو سکتا ہے اُس کا اندازہ کچھ اہلِ نظر ہی کر سکتے ہیں۔ میں اپنے جنونِ شوق کے ہاتوں مجبور نہ ہوتا تو ادب کے اس زحمتی اور لعنتی ماحول میں ایک سانس کو بھی جرم زندگی قرار دے کر اس سے ہجرت کر جاتا۔ لیکن کیا کروں کہ قدر ناشناسی کی کوئی ٹھوکر کبھی میرے شوقِ عناں گیر و زمام کش کی لا اُبالیانہ تیز روی پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ نااہل نوازی کے متواتر حادثات میرے جذبۂ ادب پرستی کے لئے روزمرّہ کے معمولی واقعات بن گئے ہیں۔

"مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں"

ان ناسازگار حالات نے زندگی کو لطفِ زیست سے محروم کر رکھا ہے۔ مگر دیوانگیٔ شوق کے ہاتوں

"زندگی کی تلخیوں میں بھی جئے جاتا ہوں میں"

یہ داستانِ درد علم و ادب کی بزم بے دماغی و بے سوادی میں گوش شنوا سے محروم ہے کہ

"ساری محفل میں کوئی درد آشنا ملتا نہیں"

لسان الغیب خواجہ حالیؔ نے غالباً انہیں جیسے مصائب ناگفتنی سے دوچار ہو کر اپنی بیکسی کا دردناک اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ

"کوئی ہمدم نہیں ملتا جہاں میں
مجھے کہنا تھا کچھ اپنی زباں میں"

شاہکار کا یہ نمبر اس سال کا بارہواں یعنی آخری نمبر ہے۔ اس سال کے بارہ نمبروں کو تفصیلی اور تنقیدی نگاہ سے دیکھ کر ان کا مقابلہ اُن معاصرین کے سال بھر کے مکمل فائل سے کیجئے جو سال کے گیارہ مہینے تو صرف ضابطے کی خانہ پُری کرتے رہے اور سال کے خاتمے کو "انما الاعمال بالخواتیم"[1] کے پیشِ نظر خاص نمبر کی صورت میں رنگین مگر بے نکہت و بے شمیم کاغذی پھولوں کا ہار بنا کر اس زنجیر دستِ آستین ہار کو نئے سال کے تحفۂ اسیری کے طور پر اپنے خریداروں کے روبرو پیش کرنے کا اہتمام کر رہے ہیں۔

---

[1] اعمال کا دارومدار حُسن خاتمے پر ہے۔

پھر اگر آپ کی نگاہِ بصیرت کو شاہکار میں دوسرے معاصرین کی نسبت امتیازی طلعتیں نظر آئیں تو آئندہ سال کے لئے اس کی سرپرستی قبول فرمائیں ورنہ میری جانب سے اجازت نہیں بلکہ اصرار ہے کہ شاہکار کو رد کر دیجئے۔ اور اپنی پسند کا کوئی دوسرا رسالہ خرید لیجئے! کہ

میں ہمدردی یا قدر افزائی کا سائل نہیں۔ بلکہ قدر شناسی کا طالب ہوں۔

میرا ارادہ ہے کہ بہ شرطِ زندگی و مساعدتِ حالات ۱۹۳۹ء میں اپنے معیار اور شاہکار کے شایانِ شان خاص نمبر شائع کروں۔ مگر خیال رہے کہ یہ ارادہ ہے وعدہ نہیں۔ لبساط بھر اس ارادے کی تکمیل میں جدوجہد کا وعدہ البتہ ضرور کرتا ہوں۔ وباللہ التوفیق۔

اہلِ قلم سے تصدیق | میں نے کئی سال سے ملک کے عالی منزلت اہلِ قلم کو زحمتِ التفات نہیں دی۔ اب وہ اپنی یادداشتوں میں نوٹ فرمالیں کہ ۱۹۳۹ء میں اُن کے بلند اور تازہ ترین جواہرِ افکار پر پہلا حق شاہکار کا ہوگا۔ میرا سوال اس پہلو میں بھی رد نہیں کیا گیا۔ یقیناً اب بھی اردو ادب کے مایۂ ناز انشاپرداز میری طلب نیاز کو شرمندۂ انفعال نہیں بنائیں گے۔

نادار خریدار | شاہکار کا سالانہ چندہ چھ روپے محصول ڈاک کے علاوہ ہے۔ شاہکار کے ۷۲ جہازی صفحات میں عام مروجہ سائز کے تین نمبروں کی برابر مضامین سما جاتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ابتدائے اشاعت سے آج تک خریداروں کا چھ روپے سالانہ چندہ بھی شاہکار کے اخراجات کو کبھی پورا نہ کرسکا۔ لیکن غیر مستطیع اہلِ ذوق کو اصرار ہے کہ نادار خریداروں کے لئے چندے میں رعایت کی جائے۔ بعض اسیرانِ مذاقِ ادب چار روپے بھیج کر صرف نو ماہ کے لئے شاہکار کے خریدار ہو جاتے ہیں کہ سال بھر کا چھ روپیہ ادا کرنے کی مقدرت نہیں رکھتے۔ میں چونکہ افلاس مال و تشنگیٔ ذوق دونوں کا پامال رہا ہوں بڑے کرب سے نادار اہلِ ذوق حضرات کی مجبوریٔ شوق کو محسوس کرتا ہوں اور اس احساس سے متاثر ہو کر فکر اندیشیٔ مآل کے بغیر یہ اعلان کرتا ہوں کہ

جنوری ۱۹۳۹ء سے جو غیر مستطیع خریدار چار روپے کا پیشگی منی آرڈر بھیجدیں گے ان کی خدمت میں سال بھر تک شاہکار بھیجا جائے گا۔ مجھے توقع ہے کہ اس رعایت سے مستطیع حضرات بیجا فائدہ نہ اٹھائیں گے۔ رعایتی چندہ دینے والے خریداروں سے درخواست تو نہیں ہاں امید ضرور ہے کہ وہ رعایت حاصل کر کے اس کی تلافی اپنے حلقۂ اثر میں شاہکار کی توسیعِ اشاعت سے کریں گے۔

انتباہ | رعائتی چندہ والے خریداروں کو چار روپے پیشگی بھیجنے ہوں گے۔ اُن کے نام وی پی پابل نہیں بھیجا جائے گا۔ نہ انہیں رعائتی چندے پر مستقل ہی کا خریدار بنایا جائے گا۔ اس سلسلے میں خط و کتابت بے سود ہوگی۔

خوش معاملہ ایجنٹ | شاہکار کی مہم تبلیغ کے پیشِ نظر یہ تجویز کیا گیا ہے کہ نمونہ کا پرچہ چھ آنے کی بجائے پانچ آنے میں بھیجا جائے۔

اخبارات و رسائل کے خوش معاملہ ایجنٹ اس رعایت کو نوٹ کر لیں جو ایجنٹ مطلوبہ پرچوں کو وی پی کے ذریعے طلب کریں گے انہیں کمیشن وضع کرنے کے بعد ساڑھے تین آنے فی پرچے کے حساب سے مطلوبہ پرچے بھیجے جائیں گے۔ مگر کسی ایجنٹ سے کوئی پرچہ واپس نہیں لیا جائے گا۔

جنوری ۱۹۳۹ء کا شاہکار | جدید سرورق :- شاہکار کا سرورق ہندوستان اور یورپ کے میگزینوں اور ماہناموں کے ٹائٹلوں کے مقابلے میں آرٹ کی حسین لطافتوں کے اعتبار سے ابتدا سے شانِ امتیاز کا حامل رہا ہے۔ لیکن ۱۹۳۹ء کی جنوری سے شاہکار کا نیا.... سرورق اشاعت افروز ہوگا۔ صوبے کے ایک نادرہ کار آرٹسٹ نے بڑی محنت اور دقتِ نظر کو کام فرما کر موجودہ سرورق میں نہایت دلکش فن کارانہ تبدیلیاں کی ہیں۔ یہ سرورق بھی ہفت رنگ ہوگا۔

تصویری آرٹ کے قدر شناس اس قابلقدر سرورق کی فن کارانہ حسین لطافتوں کا اندازہ کر سکیں گے۔

جنوری کے شاہکار میں علامہ ظریف کا وہ موعودہ مزاحیہ مضمون "بیوی سے پہلی جنگ" شائع کیا جارہا ہے۔

ظرافت کے پردے میں چھچھورپن، پھکڑبازی، دل آزاری اور رکیک تمسخر سے مذاقِ ظرافت کو تباہ کرنے والے نام نہاد مزاحیہ نگاروں کے مزاحیہ مضامین کی بھرمار نے صالح اور فاسد ظرافت کا امتیاز مٹادیا ہے۔

یہ حد درجہ دلچسپ، خندہ آفریں مضمون پڑھ کر آپ کو بلند اور صحیح مزاحیہ نگاری کا اندازہ ہو سکے گا۔

طوفانی نغمہ | حضرت احسان دانش کے دلنواز شاعرانہ نغموں سے ایوانِ شاعری کے بام و در پر وجد طاری ہے۔

طوفانی نغمہ اُن کی تازہ ترین اور سب سے بہتر نظم ہے۔ اس اعتراف میں کوئی شاعری نہیں کہ "طوفانی نغمہ" نے احسان دانش کو ملک کے موجودہ معاصرین شعرا پر برتری اور تفوق کا مستحق بنا دیا ہے۔ یہ وجد آفریں نظم جنوری کے شاہکار میں شائع ہوگی۔

سہ رنگی تصویر: رنگین تصاویر کی اشاعت کو جزِ اشاعت بنا لیا جائے تو پھر ہر قسم کی رطب و یابس، اور ذوق سوز تصاویر کی اشاعت بھی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ ایسی تصویروں کی اشاعت پر ایڈیٹر عموماً فنِ تصویر کے نقادوں کی طنزیات کا ہدف بنتا رہتا ہے۔ اِس لئے میں نے فنِ تصویر کے احترام کے طور پر کچھ دنوں سے سہ رو بار رنگین تصاویر کی اشاعت سے ہاتھ روک لیا ہے۔ آئندہ میرا ذوقِ جستجو جس کسی اور جہاں کہیں سے آرٹ کی کوئی بلند تصویر حاصل کرنے میں کامیاب ہوگا صرف اُسی تصویر کو زینتِ اشاعت بنائیں گا۔

اس سلسلے میں اُن فن پرست حضرات سے التماس التفات کرتا ہوں جن کے البم ماہرینِ فنِ مصوّروں کے شاہکاروں کا گنج شائیگاں بن رہے ہیں۔

جنوری ۳۹ء کے شاہکار میں جو سہ رنگی تصویر شائع ہو رہی ہے۔ ریاست رامپور کے مشہور عالم کتب خانے کے لئے خریدی جا رہی تھی مگر ریاست کے ایک ذی رسوخ افسر کی سعی مشکور کے طفیل شاہکار کو ۲۵ روپے میں حاصل ہو گئی۔ بصیرتِ فن رکھنے والے نکتہ بیں حضرات اس نظر نواز تصویر کو محاسنِ فن کا ایک جلوہ زار پائیں گے۔

کچھ اور بھی: پروفیسر عابد علی عابد ایم۔ اے کی تحریک پر نقادانِ ادب کی ایک مجلس قائم ہوئی ہے۔

اِس مجلس کے فاتس و نحتہ بیں ارکان اردو ادب کے مشہور مصنفین، ادبا، و شعراء کے اُن ادبی و علمی کارناموں کو معرضِ شہود پر پیش کریں گے جو اُن کی شہرت پذیر اور مسلمہ خصوصیاتِ نگارش کے سبب نقادوں کی نگاہ سے اوجھل ہو چکے ہیں اور جن کے نشر و تبلیغ سے اردو ادب اور سرمایہ تنقید میں قابلِ قدر اضافہ ہو سکتا ہے۔

اِس سلسلے کے تمام خرد افروز مضامین وقتاً فوقتاً شاہکار میں شائع ہوا کریں گے۔

تاجور

کمال اتاترک

کمال اتاترک کی وفات سے دنیا ایک ایسی عظیم الشان شخصیت سے محروم ہو گئی جس کا بدل آنے والی کئی صدیوں میں بھی مشکل ہی سے پیدا ہو سکے گا۔ اس سے پہلے ترکی کو یورپ کا مردِ بیمار سمجھا جاتا تھا۔ مگر اس مسیحا نفس نے اس میں طاقت و توانائی کی وہ روح پھونکی کہ آج اُس کا شمار دُنیا کی زبردست طاقتوں میں ہوتا ہے۔

کمال اتاترک ایک معمولی سے گھرانے میں پیدا ہوا اور پھر بچپن میں ہی یتیم بھی ہو گیا۔ مگر اس مردِ خدا نے ہمت نہ ہاری اور اپنے بے پناہ عزم کے بل بوتے پر نہ صرف خود ترقی اور اقتدار کی انتہائی منزلیں طے کیں۔ بلکہ اپنے وطنِ عزیز کو بھی قعرِ مذلت سے نکال کر ترقی کی راہ پر گامزن کر دیا۔ اُس نے ترکی کو یورپ کے پنجۂ استبداد سے نجات دلا کر تمام دنیا پر یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں کر دی کہ اگر کوئی قوم ظلم پذیری سے کنارہ کش ہو کر ظلم کے خلاف صدقِ دل سے صف آرا ہو جائے تو اپنی تمام تر ناتوانی کے باوجود کبھی نہ کبھی اسے کامیابی حاصل ہو کر ہی رہتی ہے۔

ہٹلر اور مسولینی کی طرح وہ بھی ڈکٹیٹر تھا اور اپنی قوم کو راہِ راست پر لانے کے لئے بارہا اسے سختی بھی برتنا پڑی۔ لیکن اُس کے اور ان دو ڈکٹیٹروں کے طرزِ عمل میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ جہاں ہٹلر اور مسولینی کی ڈکٹیٹری میں بربریت کے آثار پائے جاتے ہیں وہاں اتاترک کے متعلق یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ وہ اہلِ ترکی کے دلوں پر حکومت کرتا تھا۔

وہ ایک زبردست مصلح تھا اور جدیدیت کا زبردست حامی۔ اُس نے محسوس کر لیا تھا کہ ترکی اپنے بوسیدہ طرزِ تمدن کے ساتھ یورپ کی ترقی یافتہ اقوام سے نبرد آزما ہو کر اپنے غصب شدہ حقوق کی بازیافت کے خواب نہیں دیکھ سکتا۔ لہٰذا اس نے اپنے ملک میں اصلاحات نافذ کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان اصلاحی کوششوں میں ملا صفت لوگوں نے مذہب کے نام پر رخنہ اندازی کرنا چاہی تو اسے اس مخالفت کا بھی سدِ باب کرنا پڑا۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اسے مذہب اسلام سے ہی کد تھی صحیح نہیں۔ وہ ترکی سے مذہب اسلام کا نہیں۔ بلکہ ان بدعتوں کا خاتمہ کرنا چاہتا تھا جو نیم ملاؤں کی طرف سے عوام کو گمراہ کرنے کے لئے پھیلائی جا رہی تھیں۔

اتاترک آج اس دنیا میں موجود نہیں۔ لیکن اس کے زرّیں کارنامے صفحۂ ہستی سے کبھی محو نہیں ہو سکتے اور آنے والی نسلیں قیامت تک اس کا نام عزت اور احترام سے لیتی رہیں گی۔

فلسطینی گول میز کانفرنس

اعرابِ فلسطین نے اپنی آزادی کی جدوجہد میں جس بہادری اور جانبازی کا ثبوت دیا ہے۔ اُس کی نظیر ماضی قریب میں مشکل ہی سے ملیگی حکومتِ برطانیہ کا تشدد کی پالیسی کو خیر باد کہہ کر مصالحانہ رویہ اختیار کرنا گویا ان کے عزمِ راسخ کا اعتراف ہے۔ یہ اعتراف اس امر کا کہ جب کوئی قوم آزاد رہنے کا تہیّہ کر لیتی ہے تو اُسے بندوق کی سنگین سے زیر نہیں کیا جا سکتا۔ جو لوگ سر جھکانے کی بجائے سر کٹانا پسند کریں انہیں غلامی

پر کسی صورت بھی مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

جنگِ عظیم کے دوران میں عربوں کے ساتھ آزادی کا وعدہ کیا گیا تھا اور یہ یقین دلایا گیا تھا کہ ایشیائے کوچک میں عرب ریاستوں کو ایک ہی سلسلے میں پرو دیا جائے گا۔ لیکن جب جنگ ختم ہوئی اور اتحادیوں کو فتح حاصل ہوئی تو عربوں کی یہ دیکھ کر مایوسی کی کوئی حد نہ رہی کہ ان کے ساتھ کئے گئے وعدوں کو ایفا نہیں کیا گیا۔ اعلانِ بالفور نے ان کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اگر اس مایوسی کے عالم میں وہ شورش پسندی پر اتر آئے تو یہ کوئی عجیب بات نہیں۔

جب حکومت برطانیہ کی گولیاں اس شورش کا خاتمہ نہ کر سکیں تو اب برطانوی مدبر اپنی شانِ فرعونی کو خیرباد کہنے پر مجبور ہوئے ہیں اور ایک گول میز کانفرنس کی تجویز پیش کی جا رہی ہے۔ جس میں اعراب فلسطین اور یہودی ایجنسی کے علاوہ ہمسایہ عرب ریاستوں کو بھی اپنے نمائندے بھیجنے کی دعوت دی جائے گی۔ یہ اس لئے کہ یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ یہ سب ریاستیں اعراب فلسطین کی پشت پر ہیں اور موجودہ شورش کے دوران میں فلسطینی عربوں کو مالی امداد بھی دیتی رہی ہیں۔

اس گول میز کانفرنس کا کیا انجام ہوتا ہے اور یہ عربوں کی تالیفِ قلوب کا کس حد تک موجب ہوتی ہے یہ دیکھنا ابھی باقی ہے۔ مگر حکومت برطانیہ کا اس بات پر مصر ہونا کہ کانفرنس میں مفتی اعظم اور اس قسم کے دوسرے مستند رہنماؤں کو شامل نہیں کیا جائے گا نیک فال نہیں۔ ان لوگوں کے اثر و اقتدار اور حقِ نمائندگی سے صرف وہی شخص انکار کر سکتا ہے جس کا دماغ عقل و دانش سے بالکل ہی محروم ہو۔ پھر اس حالت میں ان کے بغیر کانفرنس منعقد کرنا کیا "بغیر دولہا کے بارات" والی بات نہیں۔ برطانوی مدبروں کو یقین رکھنا چاہیئے کہ یہ ڈھونگ کامیاب نہ ہوگا۔　　گوپال متل

غزل

پیار سے مسکرائے کیوں آ گیا اُن کو پیار کیا؟
مجھ کو بھی مرگ و زیست پر مل گیا اختیار کیا؟

دونوں پہ اختیار کیا دونوں کا اعتبار کیا؟
گردشِ چشمِ یار کیا گردشِ روزگار کیا؟

سوجھی ہے اُن کو اور کچھ شوخیٔ حشر کار کیا؟
دیکھ رہے ہیں میری سمت آج وہ بار بار کیا؟

حشر میں بھی کوئی کرے آپ کا انتظار کیا؟
آپ کا اعتبار کیا آپ پہ اختیار کیا؟

دورِ خزاں میں بھی وہی جوشِ جنوں کا حال ہے
دیکھئے اب دکھائے گی آمدِ نو بہار کیا؟

جس پہ نظر ہو آپ کی جس کی نظر میں آپ ہوں
ہاتھ اُسے لگا سکے موت کو اختیار کیا؟

تار تو پیرہن میں اب کوئی نہیں ہے اے جنوں
تجھ کو کھٹک رہا ہے اب تارِ نفس کا خار کیا؟

کھل کے بھی کھل سکا نہ یہ راز یہ راز ہی رہا
موت کا ہے سکون کیا ہستیٔ بیقرار کیا؟

ذرہ و مہر میں ہو تم پھر بھی مگر نظر سے گم
چھپنا ہی تھا تو پھر ہے یہ جلوۂ آشکار کیا؟

آپ خفا جہاں خفا آپ ہیں خوش تو خوش جہاں
میرے لئے خزاں ہے کیا میرے لئے بہار کیا؟

یہ بھی عذابِ جاں مجھے وہ بھی عذابِ جاں مجھے
موت کا انتظار کیا آپ کا انتظار کیا؟

آج یہ پائے ناز سے چھو گئی اُس نگار کے
میری جبیں بھی ہو گئی دہر کی سجدہ زار کیا؟

اس میں بھی صرف کار تم اُس میں وقفِ کار تم
ابرِ تر بہار کیا دیدۂ اشکبار کیا؟

کچھ تو سمجھ میں آئیں بھی تیری یہ کارسازیاں
دہر کا ہے نظام کیا حشر کا انتشار کیا؟

مستیٔ عشق سے مری مست ہے ساقیٔ ازل
میں نہ مگر سمجھ سکا عشق کا ہے خمار کیا؟

دینا ناتھ مست کاشمیری (صدر بزم ادب جموں و کشمیر)

پیری تمام ذکرِ جوانی میں کٹ گئی
کیا رات تھی کہ ایک کہانی میں کٹ گئی
آنکھوں کو شغلِ گریہ رہا رات دن عزیز
دریا کی ساری عمر روانی میں کٹ گئی

عزیز لکھنوی

(مستقل عنوان)

(۱)

پنڈت جفا رام

پنجاب کا مشہور اخبار نویس مشہور ادیب۔ مشہور شاعر اور بے نظیر نقاد ہے۔ اس کی نثر آسان، ادیبانہ اور رطب یابس سے پاک ہوتی ہے۔ اس کی شاعری نثر سے بھی زیادہ بلند اور بہترین شاعرانہ امتیازات کی حامل ہے۔ دیہاتی مناظر کی جب نظم میں تصویر کھینچتا ہے۔ تو فطرت اس تصویر میں بولنے لگتی ہے۔ سیاسیات پر جی لگا کر جب کوئی مقالہ لکھتا ہے۔ تو عبارت کے برفانی قالب میں ایسی آگ بھر دیتا ہے۔ کہ حکومت اس کی سوزش سے تڑپ اٹھتی ہے۔ مگر اپنے قانون گیر و دار کی گیرائی کو اس کے لئے بیکار پاتی ہے۔ ادب و شاعری میں صحیح ذوق کا مالک ہے۔ غور و تامل کے بعد کسی مسئلے پر جو رائے قائم کر لیتا ہے۔ تو کسی کی خوش بیانی اور طلاقت لسانی سے مطلق مرعوب نہیں ہوتا۔ بلا کا ذہین، معاملہ فہم اور نکتہ رس واقع ہوا ہے۔ صحیح معنی میں محب وطن ہے۔ اس کا معیار قوم پروری بہت بلند ہے۔ اکثر کانگریسی رہنماؤں کو ملک کی سیاسی تحریکات کا غیر مخلص غیر ہمدرد اور سیادت کا غیر مستحق خیال کرتا ہے۔ زندگی کے ہر شعبے سے متعلق اس کے خیالات معیاری ہیں۔ ان خوبیوں کے ساتھ بدبخت نے دماغ جرائم اندیش پایا ہے۔ نام سے زیادہ صورت مکروہ ہے۔ اور صورت سے بڑھ کر سیرت کے بعض پہلو گردن زدنی۔

کسی کفش کار آقا کی نگرانی میں کام کرنا پڑے۔ تو ذلیل قسم کے وفادار غلام کی طرح کولھو کا بیل بن کر کام کرتا ہے۔ کوئی مخلص اور مروت کار دوست اپنا کاروبار اس کے سپرد کر بیٹھے۔ تو ایک درندہ ڈاکو بن کر اس کے کاروبار کو تباہ۔ سرمائے کو غبن اور اعتماد کو چکنا چور کر دیتا ہے۔

کوئی ایسا نوکار کار فرما جو اس کی افتاد طبع سے واقف نہ ہو۔ اس کے ان صحافتی کارناموں کی شہرت سے فریب کھا کر اگر اپنے دفتر کی نگرانی سپرد کر دے۔ تو اس کی مروت اور اپنی تن آسانی کے زیر اثر اپنے لئے اوقات کار و حاضری گھٹاتے گھٹاتے مجالس قانون ساز کے سپیکروں کا حریف راحت بن جاتا ہے۔ پھر جتنے وقت دفتر میں رہتا ہے۔ اسے دس حصوں میں تقسیم کر کے صرف ایک حصے میں کام کرتا ہے۔ وقت کے نو حصے کسی ایسی اسکیم کے سوچنے پر صرف کرنے کا عادی ہو جاتا ہے۔ جس سے کار فرما جیل میں۔ اس کا سرمایہ اس کی جیب میں۔ اور یہ اپنی بیوی کو لے کر اپنے اجاڑ گاؤں میں پہنچ جائے۔

اپنی تباہ کار اسکیموں کو بروئے کار لانے کے لئے ۲۴ گھنٹے ایک سیکرٹری کو سائے کی طرح اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ سیکرٹری کے انتخاب میں عموماً حسن مذاق سے کام لیتا ہے۔ کسی البیلے نوجوان کو مستقبل کے سبز باغ دکھا کر تمام اعزا و اقارب سے الگ کر کے اس کے حواس پر طاری ہو جاتا ہے۔ پھر چند روز میں اپنے مخصوص فن کے دقیق رموز و اشارات سے واقف بنا کر اسے ایک بے دماغ جرائم پیشہ بنا دیتا ہے۔ جس دفتر میں بار پاتا ہے۔ یہ لطائف الحیل سیکرٹری کو آنریری ورکر کی حیثیت میں ساتھ لے جاتا ہے۔

کچھ دنوں کے بعد رفقائے کار کو سانٹھ کر کارفرما کے حضور میں اس کی قصیدہ خوانی شروع کرا دیتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ سیکرٹری کو بھی اس کے ساتھ ہی اپنے دفتر کی ایک ضروری لعنت کے طور پر رکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ سیکرٹری کو عموماً محاسب دفتر (اکاؤنٹنٹ) کی خدمت دلانے کی سعی میں سرگرم کار رہتا ہے۔ جب اس مہم کو سر کر لیتا ہے۔ تو اب ہلاکت نصیب دفتر اقتصادی بحران میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور یہ بحران بڑھتے بڑھتے تپ دق میں تبدیل ہونے لگتی ہے۔ پھر ایک دن ایسا آتا ہے۔ کہ دفتر پر قرقی گیر قرضخواہوں کی یلغار۔ کارفرما نواحی آبادیوں میں روپوش۔ اور دفتر کا غبن پیشہ محاسب اپنے گورو کی اشیر داد سے کر کسی نئے اخبار کا ڈیکلریشن لئے عدالت مجاز میں پھرتا دکھائی دیتا ہے۔ ہر کامیاب شبخون کے بعد ہوتا یہ ہے۔ کہ کسی گمنام سی گلی میں جفارام کے نئے اخبار کا دفتر کھل جاتا ہے۔ دفتر میں شہر کے تین چار بدخط کاتب ایک یک چشم ہیڈ کاتب کے زیر حکومت مصروف کتابت نظر آتے ہیں۔ بیچ میں ایک شکستہ میز کے حضور ایک ٹوٹی سی کرسی پر جفارام کی خبیث روح اپنے کریہہ المنظر پیکر میں مشغول مقالہ نگاری دکھائی دیتی ہے۔ فرش پر اُپلوں کی راکھ کا ڈھیر مٹی کا ایک ذلیل سا بدبودار حقہ دو تہائی چلم کا تاج سر پر رکھے مقالہ نگار سے ہمکلام نظر آتا ہے۔ ساتھ کی میز کرسی پر وہ روشن جبیں سیکرٹری مینیجری کے فرائض کی ادائگی میں منہمک۔ سارا کمرہ حقّے کے دھوئیں سے مالامال۔ بس ایک سہ ماہی کے لئے یہ زندہ فلم حیرت تماشا بنی رہتی ہے۔ اس کے بعد اس برہمن دیوتا کی یہ غبنائی ہوئی لکشمی سیماب پائی حاصل کر کے "اک چلتی پھرتی چھاؤں تھی آج آئی کل گئی" کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے ۔

اس سلسلے میں جفارام غلطی یہ کرتا ہے۔ کہ غصب کردہ روپے کو انکم ٹیکس والوں کے خوف سے بنک میں نہیں رکھتا۔ اس کی بیوی کا کورچہ اس دولت کا امین قرار پاتا ہے یہ عمر رسیدہ خاتون ان پڑھ اور ان گڑھ ضرور ہے۔ مگر جفارام کی اسٹیڈی ایک ریسرچ اسکالر کی طرح کر چکی ہے۔ اس کی اخبار نویسانہ زندگی سے بیزار ہے۔ نہ اخبار اور اخبار نویس کے انجام سے خبردار ہے۔ مالیات کی بڑی ماہر ہے۔ جفارام کے ہر نئے اخبار کا بارھواں نمبر شائع ہونے سے پہلے وہ نقدیات کو زیورات میں تبدیل کر لیتی ہے۔ اب جفارام کی یہ مجال کہاں۔ کہ اُس کے حساب کو آڈٹ کرے۔ کہ "باوجودت زمن آغاز نیاید کہ منم" کا معاملہ ہے۔ ادھر جفارام صوفیا سے زیادہ کم سخن اور خفی گفتار۔ اُدھر بیوی لاؤڈ سپیکر سے زیادہ جہیر الصوت اور مولوی عطا اللہ شاہ بخاری سے بڑھ کر طلیق اللسان۔ "بھلا تیرا میرا جوڑ کہاں"!

نتیجہ یہ نکلتا ہے۔ کہ کاتبوں۔ کاغذ فروشوں اور مالکان مطابع کے وارنٹ بدست ہجوم کو اُجڑے دفتر کا مجاور بنا کر رات کی تاریکی میں گورو اور چیلے نئے شکار کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں۔ چھ ماہ اور کبھی سال سال بھر بھی قدرت ان کے جرائم کی پاداش میں ان سے کوچہ گردی کراتی ہے۔ آگے رزق ہوتا ہے۔ اور پیچھے وارنٹ۔ جتنی تیزی سے رزق کی جانب قدم اُٹھاتے ہیں۔ قانونی تعاقب اُسی شدت کے ساتھ ان کے درد تلاش میں سرگرداں ہو جاتا ہے۔ صوبے کی غلہ منڈیوں کے "دھرم ارتھ" کے "ادھشٹاتا" ان دھرم سادھوؤں کو دھرم سیوا کے نام پر جو بھکشا دے دیتے ہیں۔ اسی پر ان خانہ بدوشوں کی بسر اوقات ہوتی ہے۔ ان کے کرموں کی سزا دے کر پھر کسی پچھلے جنم کے گنہگار کو [illegible] کی درندگی کے حوالے کر دیتی ہے۔ اور اس طرح ہر سال چھ ماہ کے بعد تاریخ جرائم اپنے آپ کو دُہراتے ہوئے نئی فلم کی شوٹنگ میں ان جرائم پیشوں کو مصروف کر دیتی ہے ۔ (باقی آئندہ)

۲

چودھری محمد اکبر خاں

ایک قابل، ذی استعداد اور کریم الصفات نوجوان پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے محکمہ تراجم سے وابستہ اس سفارش طلب عہد میں بے سفارش زندگی بسر کر رہا ہے۔ قابل رشک ذہانت غیر معمولی استعدادِ علم و ادب مثالی بلند سیرتی کے سوا کوئی شفیع نہیں رکھتا۔ اس لئے جس منصب رفیع کا مستحق ہے۔ وہ اُس کی پست نشینی سے پرواز نظر کی برابر بلند ہے۔ دیال سنگھ ہائی اسکول کے جشن جوبلی میں میں نے پہلی بار اس کی تقریر سنی تھی۔ اس وقت یہ مڈل کے درجے میں تعلیم پا رہا تھا۔ تقریر کیا تھی۔ بلند خیالات، فصیح الفاظ اور دلکش فقرات کا ایک مترنم سیلاب

رواں تھا۔ نوخیز مقرر کا غریبانہ لباس، پشاوریوں کی سی بے ڈھنگی پگڑی۔ نحیف و نزار جسم میں ہڈیوں کا اُبھار۔ مایوس مگر حق طلب نگاہیں بتا رہی تھیں۔ کہ کسی غریب خاندان کا چراغ ہے ٭

فیشن زدہ کم بینوں نے اس کے لباس کی شکستگی کو دیکھا۔ ان کی ثروت گزینی کی آنکھ اس کی حسین رُوح کو نہ دیکھ سکی۔ مگر گردِ غربت کی تہ در تہ نقاب اس کی سیرت کی طلعتوں کو نگاہِ بصیرت سے چھپا نہ سکی۔ اہل نظر تاڑ گئے۔ کہ شکستہ نیام ایک برق وش شمشیر آبدار کا سرمایہ دار ہے۔ کالج میں مجھے چار سال تک اس نوجوان کو قریب سے دیکھنے کا موقع نصیب ہؤا۔ مجھے اعتراف ہے۔ کہ مڈل کے جس خوردسال بچے کو میں نے اسٹیج پر جواہر فشاں دیکھا تھا۔ کالج کی چہار سالہ علمی زندگی نے اُسے "الشابُ سنًّا و الشیخُ فضلاً"[1] کا صحیح مصداق بنا دیا۔

محمد اکبر خاں بلند ترین مشرقی و مغربی خصوصیات کا جامع ہے تعلیمی مضامین میں اُس کی وسعت نظر کا اعتراف ہر مضمون کے اُستاد نے کیا ہے۔ اور اس کی اُردو نثر حشو و زوائد سے پاک۔ اسلوب نگارش شیریں و دلآویز۔ اس کی شاعری رفعت تخیل۔ دقت مطالب اور جدت بیان کی آئینہ دار ہے۔ اردو اور فارسی میں یکساں طور پر تقریر و تحریر۔ نظم و نثر کی مہارت رکھتا ہے ٭

ادبی مفاخرین ہیں شاید اس کے حریف صوبے میں اور بھی ہوں۔ مگر اس کی بلند نظری۔ بلند سیرتی۔ فطری ذہانت۔ طبعی جودت۔ علمی استعداد۔ ادبی قابلیت۔ سعادت گفتار و کردار کے جلی امتیازات نے اسے معاصرین کے لئے مشعل راہ زندگی بنا دیا ہے ٭

میں اسے اس کے بلند مقام پر دیکھنے کا آرزومند ہوں لیکن آنریبل سر شہاب الدین کا اقتدارِ جوہر نوازی۔ نواب دولتانہ کا جذبۂ ادب پروری۔ سردار انبا شا سنگھ کا مجازِ منصب افزائی اور حکیم احمد شجاع کا التفاتِ مسلسل کہاں سے لاؤں۔ کہ اس جوہر کمال کو طرۂ دستارِ عزت بناؤں میرے پاس مخلصانہ دعاؤں کا سرمایۂ بیکراں البتہ موجود ہے۔ اور اس کا سب سے بڑا حصہ دار اکبر خاں ہے ٭

"تاجور"

[1] عمر میں جوان اور علم و فضل میں بُوڑھا۔

غزل

کبھی کا اُٹھ گیا ہوتا جہاں سے　　لپٹ جاتی ہے اک امید جاں سے
خوشی تو اضطرابِ زندگی ہے　　سکوں ملتا ہے غم کی داستاں سے
خودی کی جستجو میں کھو گیا ہوں　　نہ پردہ اُٹھ سکا اِک درمیاں سے
تمنّا ایک تھی وہ بھی نہیں اب　　نہ مطلب کچھ رہا سود و زیاں سے
نکلتے ہی قفس میں آ پڑا ہوں　　میں کس ساعت اُڑا تھا آشیاں سے
چھپایا ہی نہیں جب آنکھ نے کچھ　　بیاں کرتا تو کیا کرتا زباں سے
عدم کی بات کچھ سنتے کسی سے　　کوئی تو لوٹ کر آتا وہاں سے
مری اغراض ہیں وسعت بداماں　　بھٹکتا جا رہا ہوں کارواں سے

جب احساسِ خودی آتا ہے دل میں
اُلجھ پڑتا ہوں اپنے رازداں سے

رہبر بی۔ اے

غزل

میرے مزاج درد کو رسوا نہ کیجئے
آتا نہیں یقین تو پوچھا نہ کیجئے

للہ یہ نوازش بیجا نہ کیجئے
میری نگاہ سے مجھے دیکھا نہ کیجئے

رحمت کا اعتبار بھی جاتا ہے ہاتھ سے
اب کر چکے گناہ تو پروا نہ کیجئے

یہ دردِ دل سے جنگ یہ غم سے مقابلے
فطرت سے بات بات پہ جھگڑا نہ کیجئے

فکرِ قبول و کاوشِ اُمید و بیم کو
ٹھوکر لگا کے سجدۂ مستانہ کیجئے

دین آپ کی ہے جب تو خوشی کیا ملال کیا
تخصیص ناگوار و گوارا نہ کیجئے

مرنے پہ چلے ہیں جیسے مصیبت سی آگئی
ممکن ہو گر یہ زحمت بیجا نہ کیجئے

دل کے لئے بکے گا دو عالم طراز ابھی
دل ہے تو کائنات کا سودا نہ کیجئے

جس نے سمجھ کی بات کہی دل پہ چوٹ کی
آتا ہے جی میں بات کو سمجھا نہ کیجئے

مفہوم زندگی ہے محبت کا ایک دن
دو دن کی زندگی پہ بھروسا نہ کیجئے

کہہ دو نئے زمانہ کی ترچھی نظر سے نجمؔ
ہم آپ جا رہے ہیں تقاضا نہ کیجئے

نجمؔ آفندی

صحت عامہ کے لئے

ڈاکٹر چیٹرجی کا مقدمہ عنقریب عدالت میں پیش ہوگا۔ ڈاکٹر چیٹرجی کو کون نہیں جانتا۔ ان کی مسیحا نفسی کی دور دور تک دھوم ہے۔ ان کے مداحوں اور عقیدتمندوں کی تعداد اگر لاکھوں نہیں تو ہزاروں تو لازمی طور پر ہوگی۔ دق کے علاج میں ان کی ٹکر کا ڈاکٹر تمام ہندوستان میں کوئی نہیں۔ وہ مریض کو موت کے منہ سے واپس لے آتے ہیں اور جس کی نسبت وہ مایوسی کا اظہار کر دیں اُسے غالباً دنیا کی کوئی طاقت بھی ملک الموت کے چنگل سے رہائی نہیں دلا سکتی۔

لیکن یہ امر کس قدر حیرت انگیز ہے کہ وہی ڈاکٹر چیٹرجی جن کے دست شفا کے چرچے اسقدر تھے آج اس الزام میں ماخوذ ہیں کہ انہوں نے اپنے ایک صحت یافتہ مریض کو اپنے ہی ہاتھوں موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ اور یہ بات ان کے عقیدت کیشوں کے احساسات کے لئے اور بھی زلزلہ افگن ہے۔ کہ انہوں نے اپنے جرم کا اقبال بھی کر لیا ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ چند ماہ پیشتر ڈاکٹر صاحب اپنے مطب میں بیٹھے مریضوں کا معائنہ کرنے میں مصروف تھے کہ ایک مدقوق مریض علاج کی غرض سے آیا۔ وہ مرض کے صدمے سے نحیف و نزار ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے چند لمحے اسے غور سے دیکھا۔ پھر نہایت مایوسانہ انداز میں کہنے لگے "افسوس تمہارے صحت یاب ہونے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ میں ڈاکٹر ہوں کوئی جادوگر نہیں جو مردوں میں جان ڈال دوں۔"

"تو کیا میں مایوس ہو جاؤں۔" مریض نے انتہائے یاس کے عالم میں کہا۔

"بے شک ایک ماہ کے اندر اندر تمہارا دایاں پھیپھڑا بالکل ضائع ہو جائے گا۔ اور بائیں پھیپھڑے کی حالت بھی کچھ زیادہ بہتر نہیں۔ ان حالات میں علاج پر روپیہ برباد کرنا لاحاصل ہے۔"

یہ حوصلہ شکن جواب سُن کر مریض کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ دوسرے مریض محسوس کر رہے تھے کہ ڈاکٹر صاحب نے واقعی اس کے ساتھ ظلم کیا ہے۔ بھلا کسی کا دل توڑنے سے کیا فائدہ۔ اس کا نتیجہ تو یہ ہوگا کہ وہ اپنے وقت سے پہلے ہی مر جائے گا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ چنانچہ چند منٹ کے بعد وہ پھر اسی مریض سے مخاطب ہوئے اور رُکتے رُکتے دریافت کیا۔ "تمہاری مالی حالت کیسی ہے؟"

"میں لکھ پتی ہوں ڈاکٹر صاحب۔ لیکن اس سے فائدہ کیا۔ یہ سب دوسروں کا مال ہے۔ افسوس میرے کوئی اولاد بھی نہیں۔"

"اگر یہ بات ہے تو گھر پہنچتے ہی سفر کی تیاری شروع کر دو۔ اور جتنی جلدی ہو سکے کشمیر پہنچ جاؤ۔ مکمل چھ ماہ ڈل کے کنارے صرف کرو اور اس دوران میں تلسی کے پتوں کے علاوہ اور کوئی چیز استعمال نہ کرو۔ خواہ بھوک کے مارے تمہارا دم نکلنے لگے۔ اپنے ملازموں کو ہدایت کر دو کہ وہ تمہاری ناراضگی اور التجاؤں کی کوئی پرواہ نہ کریں اور تلسی کے پتوں کے علاوہ تمہیں کوئی چیز نہ دیں۔ تمہارے صحتیاب ہونے کا اب یہی ایک امکان باقی ہے۔ اگر زندگی ہوئی تو بچ جاؤ گے۔ ورنہ باقی تو تم میں اب بھی کچھ نہیں رہا۔"

ان الفاظ کے ساتھ ڈاکٹر چیٹرجی نے مریض کو رخصت کر دیا اور اس کے چلے جانے کے بعد حسب دستور اس کی نسبت سب کچھ بھول گئے۔ انہیں دن بھر میں سینکڑوں ہی مریضوں سے واسطہ پڑتا تھا۔ بھلا وہ کس کس کو یاد رکھتے۔ یہ مریض بھی ان مریضوں میں سے ایک تھا جو آتے تھے۔ اور مشورہ لے کر چلے جاتے تھے۔

اس واقعے کے پورے چھ ماہ بعد یعنی آج سے ایک ہفتہ پیشتر ایک ہٹا کٹا شخص ڈاکٹر چیٹرجی کے مطب میں وارد ہوا۔ اور بغیر کچھ کہے سُنے ڈاکٹر صاحب سے لپٹ کر اُن کے قدم چومنے لگا۔

"ہیں ہیں۔ ارے یہ کون دیوانہ ہے۔ نکالو اسے باہر۔" ڈاکٹر صاحب نے کڑک کر کہا۔

"ڈاکٹر صاحب گھبرائیے نہیں میں دیوانہ نہیں ہوں"۔ نووارد نے الگ ہٹتے ہوئے کہا۔ "میں تو آپ کا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں۔ آپ کا مجھ پر بہت بڑا احسان ہے۔ ڈاکٹر صاحب۔"

"پھر وہی بے تکی باتیں آخر کچھ کہو گے بھی۔"

"ڈاکٹر صاحب میں سچ کہتا ہوں واقعی آپ کا مجھ پر بہت بڑا

انسان ہے۔ آپ نے مجھے نئے سرے سے زندگی بخشی ہے۔ یہ زندگی کی مسرتیں، یہ چاند، یہ سورج یہ ہوا۔ ان سب سے میں آپ ہی کی بدولت لطف اندوز ہو رہا ہوں۔ ورنہ میں تو وہی ہڈیوں کا ڈھانچہ ہوں جو آپ کی خدمت میں آج سے چھ ماہ پیشتر حاضر ہوا تھا۔ اگر آپ تلسی کے پتوں والا نسخہ نہ بتاتے تو میں کبھی کا مر چکا ہوتا۔"

"تو کیا تم وہی مریض ہو جو میرے خیال میں لاعلاج تھا اور جسے صرف تسلی دینے کی خاطر میں نے تلسی کے پتے تجویز کئے تھے۔"

"ہاں ڈاکٹر صاحب میں وہی مریض ہوں۔ آپ نے مجھے دوبارہ زندگی بخشی ہے۔ لیکن یاد رکھیے کہ میں بھی اس کا پورا پورا معاوضہ دونگا دس ہزار بیس ہزار جو بھی آپ مانگیں حاضر کر دوں گا۔"

"تو کیا آپ واقعی وہی مریض ہیں۔"

"ہاں ہاں ڈاکٹر صاحب وہی مریض، وہی ہڈیوں کا ڈھانچہ اور وہی مدقوق۔"

"تو آپ بیٹھیے میں دوسرے مریضوں کو رخصت کر کے آپ سے بات کروں گا۔"

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے جلدی جلدی مریضوں کو رخصت کر [illegible] کیا۔ لوگوں کا بیان ہے کہ اس روز ڈاکٹر صاحب نے مریضوں پر کچھ زیادہ توجہ نہیں کی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی گہری سوچ میں پڑے ہیں۔ مریضوں کے چلے جانے کے بعد انہوں نے اپنے سیکرٹری اور چپراسی کو بھی رخصت کر دیا۔ اور جب دیکھا کہ کمرے میں ان کے سوا اور کوئی نہیں تو چپکے سے اپنا پستول نکالا اور اس کی کنپٹی میں تین گولیاں پیوست کر دیں۔

جب پولیس ڈاکٹر صاحب کو گرفتار کرنے آئی تو وہ لاش کی چیر پھاڑ کرنے کے بعد اپنے تجربہ کی میز پر اس کے پھیپھڑوں کا معائنہ کر رہے تھے۔ انہوں نے ایک گھنٹہ کی مہلت چاہی اور اس کے بعد چپکے سے پولیس کے ہمراہ روانہ ہو گئے۔ اپنے بیان میں انہوں نے کہا کہ میں نے اس شخص کو اچھی طرح سمجھ سوچ کر قتل کیا ہے۔ تلسی کے پتے تجویز کرتے وقت مجھے یہ گمان بھی نہ تھا کہ اس سے تیسرے درجے کی دق کا علاج ہو سکتا ہے۔ لیکن اس شخص کی صحتیابی نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ میں اچھی طرح تحقیق کرنا چاہتا تھا کہ انسانی پھیپھڑوں پر ان پتوں کا کیا اثر ہوتا ہے۔ تاکہ اگر واقعی وہ دق کے لئے مفید ہو سکیں تو اس نسخہ کو مشتہر کر کے ہزاروں بدنصیبوں کی جان بچا سکوں جو ہر سال اس موذی مرض کا شکار ہو جاتے ہیں۔ میں نے خیال کیا کہ اگر تمام دنیا کے فائدے کے لئے ایک شخص کو قربان کر دیا جائے تو چنداں معیوب نہیں۔ بہر حال میں قتل کی ذمہ داری سے بچنا نہیں چاہتا اور پھانسی کے تختے پر چڑھنے کے لئے تیار ہوں یہ صحت عامہ کے لئے دوسری قربانی ہوگی۔

گوپال متل

انتباہ

دل ناشادِ اصرف آہ نہ ہو — دیکھ یوں عشق میں تباہ نہ ہو

زیست کیا جو کسی سے پیار نہ ہو — ہو مگر یوں کسی کی چاہ نہ ہو

آج اس درد میں مٹھاس تو ہے — اس میں کل تلخیٔ گناہ نہ ہو

پہلا آنسو ہے، پونچھ لے، لیکن — کہیں یہ سیل بے پناہ نہ ہو

خسِ رقصاں! یہ نغمۂ امواج — کسی طوفاں کا انتباہ نہ ہو

دیکھ اس فرصتِ نظر پہ تجھے
ابدیت کا اشتباہ نہ ہو

مجید امجد بی۔ اے

آل انڈیا ریڈیو لاہور

موسیقی

لاہور ریڈیو سٹیشن کے ارباب اقتدار پر درحقیقت یہ مثل صادق آتی ہے۔ کہ پیش شاعر ملا پیش ملا شاعر۔ پیش ہر دو ہیچ۔ موسیقی کا پروگرام سنئے۔ تو بظاہر اس کے دو شعبے نظر آئیں گے۔ کلاسیکی اور ہلکی پھلکی ٹھمریاں۔ غزلیں وغیرہ۔ جسے یہ بزرگوار light وندلہ کہتے ہیں۔ اگر کوئی کلاسیکی موسیقی کا ماہر شکایت کرے۔ کہ یہ کیا خرافات نشر کرتے ہو۔ تو جواب ملتا ہے۔ کہ ذرا ہماری ہلکی پھلکی چیزیں تو دیکھیئے۔ کتنی سامعہ نواز اور دل افروز ہیں۔ اور اگر ہلکی پھلکی موسیقی کے متعلق کوئی شکایت موصول ہوتی ہے۔ کہ یہ کیا بیہودگی ہے۔ تو کہا جاتا ہے۔ کہ ذرا کلاسیکی موسیقی کا پروگرام دیکھیئے۔ وہ ہماری خاص چیز ہے۔ کلاسیکی موسیقی سے مجھے کوئی ضد نہیں ہے۔ گذشتہ دس سال اسی دشت کی سیاحی میں گزرے ہیں۔ لیکن جس خرافات کو لاہور ریڈیو سٹیشن والے کلاسیکی موسیقی کہتے ہیں۔ اس سے تبرا کرنا تقاضائے ذوق کے ماتحت ہے۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ کلاسیکی موسیقی کے رموز و اشارات ہندو دیومالا سے اس طرح دست و گریباں ہیں۔ کہ جب تک باکمال مغنی ان تمام حسین روایات اور جمیل اشارات پر حاوی نہ ہو۔ جن کا تعلق ہندو صنمیات اور مذہبیات سے ہے۔ اس وقت تک نہ راگ کی صحیح تصویر کھینچ سکتا ہے۔ نہ اس کی فنی نزاکتوں۔ صوتی دلالتوں اور مذہبی خیالوں کو روشن کر سکتا ہے۔ کلاسیکی راگوں میں کہیں ذوق عبودیت کا اظہار ہے۔ کہیں عقیدت کی تصویر ہے۔ کہیں دیوی دیوتاؤں کے روپ کا فنی عکس ہے۔ کہیں انسان کی بے بسی اور بیچارگی کے اشارے ہیں۔ اور یہ تمام رموز راگ کے اصوات کے اتار چڑھاؤ میں اس طرح پوشیدہ ہیں۔ جس طرح چقماق میں آگ۔ مغنی کا فرض ہے۔ کہ ان تمام دلالتوں سے باخبر ہو کر گائے۔ کلاسیکی موسیقی کو عبودیت و عقیدت کے اس پس منظر سے نکال لیجئے اور کسی معمولی فن کار کو اجازت دے دیجئے۔ کہ اُسے اپنی تانوں کا تختۂ مشق بنالے تو یہی سرشاری اور مسرت کا مجموعہ جسے کلاسیکی موسیقی کہتے ہیں۔ خرافات کہلانے کا مستحق ہو جائیگا۔ ظاہر ہے۔ کہ اس قسم کے مغنی جو موسیقی کے ان رموز سے واقف ہوں کم ملتے ہیں۔ اور مل بھی جائیں۔ تو ریڈیو کے ارباب اقتدار کی سرد مہری کی وجہ سے ایک یا دو بار سے زیادہ مدعو نہیں کئے جائیں گے۔ لاہور سے جو چیز کلاسیکی موسیقی کے نام سے نشر کی جاتی ہے۔ وہ راگوں کی ایک مسخ شدہ ' مکروہ' گھناؤنی لاش ہے۔ جس کے روئیں روئیں سے تعفن کے بھبکے نکلتے ہیں۔ اُلٹی سیدھی تانیں۔ بے تال سرگم بے مزہ بولوں اور تال کی تقسیم۔ رسمی قدرت بازی۔ انہی چیزوں کو ریڈیو والوں نے کلاسیکی موسیقی کی خصوصیات سمجھ رکھا ہے دُور کیوں جائیے۔ لاہور کے عجائب گھر ہی میں راگوں اور راگنیوں کی کیا خوبصورت تصویریں موجود ہیں۔ ذرا ریڈیو والے وہ جاکر دیکھ لیں۔ تو اندازہ ہو جائیگا۔ کہ راگ اور راگنیوں کا پس منظر کیا ہے۔ ان سے کیا تاثر پیدا کرنا مقصود ہے۔ ان کا مذہبی اور صنمیاتی پہلو کس قدر روشن ہے۔ ریڈیو والے خدا لگتی صاف کر کے بتائیں۔ کہ ان کے ہاں جو گوئیے کلاسیکی موسیقی کے علمبردار ہو کر آتے ہیں۔ اُن کو اس فن کے مبادیات سے بھی واقفیت ہوتی ہے؟

یہ داستان دراز ہے اور تفصیلی تبصرے کی محتاج ہے انشاءاللہ آئندہ کسی صحبت میں موسیقی پر ایک سیر حاصل تبصرہ کرونگا۔

(پروفیسر) عابد علی ایم اے

افسانہ کی ترتیب

افسانے کے لئے پلاٹ اتنا ہی ضروری ہے۔ جتنا مکان کی تعمیر کے لئے نقشہ جس طرح نقشہ کی مدد سے مکان کی ایک خاص وضع قطع معین کی جاتی ہے۔ اسی طرح پلاٹ سے افسانہ کی ایک شکل معین ہو جاتی ہے۔ چنانچہ کامیاب افسانہ نگار پلاٹ کی تشکیل میں بڑی ہوشیاری اور تجربہ سے کام لیتے ہیں۔ جس ڈھنگ کا افسانہ تحریر کرنا ہوتا ہے۔ اسی قسم کے واقعات منتخب کرتے ہیں۔ اور پھر کمال احتیاط سے انہیں اپنے بیان کی لڑی میں پرو دیتے ہیں۔ اس طرح پلاٹ میں اصلیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ بے جان نہیں رہتا۔

پلاٹ بناتے وقت "قانونِ حیات" (یعنی عمل اور ردِ عمل) کا بھی خیال رکھنا چاہئے۔ اگر اندھا دھند واقعات اور کرداروں کا رشتہ و پیوند ملا دیا جائے۔ تو کامیاب افسانہ تخلیق نہیں ہوتا۔ انجام ہمیشہ ایسے معرکہ آرا وقوعہ پر دکھا سکتے ہیں۔ جو افسانہ کے انجام کے لئے موزوں ترین ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ افسانہ کا پلاٹ محض اتفاقی طور پر نہیں بن جاتا۔ بلکہ بہت کافی غور و فکر کے بعد تیار کیا جاتا ہے۔ چند مسلسل واقعات بیان کر دینے کا نام پلاٹ نہیں ہے۔ پلاٹ تو اسی وقت وجود پذیر ہوتا ہے۔ جب ہر واقعہ کا گذشتہ اور آئندہ واقعے سے ضروری ربط صاف صاف دکھا دیا جائے۔ اگر پلاٹ کو متعدد پرزوں کی ایک کل سمجھیں۔ تو یوں کہا جائیگا۔ کہ اس کل کے جوڑ ڈھیلے نہیں ہوتے۔ بلکہ خوب مضبوطی کے ساتھ ایک دوسرے سے پیوست ہوتے ہیں۔ پلاٹ کا ہر جزو (وقوعہ) اپنی جگہ بالکل مطابق اصل معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ افسانہ نگار اس امر کی پوری پوری احتیاط ملحوظ رکھتا ہے۔ کہ گذشتہ وقوعہ سے اس کا تعلق بالکل قدرتی نظر آئے۔ یوں ہر جزو کل کا ضروری حصہ بن جاتا ہے اور حقیقت یہ ہے۔ کہ اگر ہر جزو اپنی جگہ کارآمد ہونے کے ساتھ ساتھ کل کا ضروری حصہ بھی نہ ہو۔ تو کل (یعنی افسانہ) کی کوئی خاص وضع ہی نہ بن سکے۔ وضع کا تعین ہمیشہ اسی خیال کو سامنے رکھ کر کیا جاتا ہے۔ کہ نقطۂ عروج کی وساطت سے افسانہ کو واحد اثر کا حامل بنایا جائے۔

اسی وجہ سے سچی کہانیاں یعنی اصلی واقعات مکمل پلاٹ نہیں ہوتے۔ توجیہ اور تصور کی قوت کی کارفرمائی کے بعد ہی انہیں کامیاب افسانوں کی شکل دی جا سکتی ہے۔ البتہ سچے واقعات میں افسانہ نگاروں کے لئے پلاٹ بنانے کے واسطے میدان بہت ہوتا ہے۔ گو اپنی اصلی شکل میں سچے واقعاتی پلاٹوں کے اجزا بالکل ہی غیر مربوط ہوتے ہیں۔ یہ تسلیم ہے کہ جس طرح تصوری دُنیا میں عمل اور مکافاتِ عمل کا دور چل رہا ہے۔ اسی طرح یہ دور حقیقی واقعات کی دُنیا میں میں بھی جاری ہے۔ مگر حقیقی واقعات کی دُنیا میں وجوہات اکثر و بیشتر غیر ضروری باتوں اور جزئیات کے انبار تلے دب کر نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ تصورات کی دُنیا میں توجیہ اور تخیل کی مدد سے انہیں اُبھار کر نمایاں کیا جاتا ہے۔ اور مختلف واقعات کے درمیان جو صحیح رشتہ یا تعلق ہے۔ وہ ظاہر ہو جاتا ہے۔

اکثر سُنا جاتا ہے۔ کہ حقیقت افسانہ سے زیادہ عجیب ہو سکتی ہے۔ مگر اس کا عجیب ہونا حقیقت کے لئے عذاب جان ہی ہو سکتا ہے۔ شعاع امید نہیں ہو سکتی۔ حقیقت اپنے اجزا کے درمیان کوئی قدرتی رشتہ و تعلق ظاہر نہیں کر سکتی۔ برخلاف اس کے افسانہ سب سے پہلے یہی کرتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ افسانہ کی تعمیر کے لئے مصالح تخیل ہی مہیا کرتا ہے جسے عقل یا قدرت سے کوئی واسطہ نہیں۔ مگر چونکہ افسانہ کو کامیاب بنانے کے لئے مؤثر انجام پہلے سے متعین کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے تخیل کے ساتھ قوت ادراک کو بھی کام کرنا ہوتا ہے اور وہ جزوی واقعات میں قدرتی رشتہ و پیوند پیدا کر لیتی ہے۔ یہی

پلاٹ کی تشکیل ہے ۔

افسانہ کا پلاٹ سادہ ہوتا ہے۔ چونکہ افسانہ زندگی کو نکھارتا ہے۔ اس لئے پیچیدگی سے اس کو بُعد ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ اختصار اور وحدت تاثر افسانہ کے لئے ضروری ہیں اور پلاٹ کو پیچیدہ بنانے میں انہیں ہاتھ سے دینا پڑتا ہے۔ اس لئے اور بھی افسانہ کے پلاٹ کو پیچیدگی سے بچایا جاتا ہے ۔

مگر پیچیدگی بغیر پلاٹ کیسا؟ پیچیدگی کو پلاٹ سے وہی نسبت ہے جو جان کو جسم سے ہے۔ ناول نویسوں اور ڈرامہ نگاروں کو دیکھو کیسی کیسی پیچیدگیاں پیدا کرتے ہیں۔ ایک ہی نقطۂ عروج سے خبر نہیں کتنے تار لاکر ملا دیتے ہیں۔ کئی کئی متضاد کردار اور متعدد متضاد واقعات کو ایک ہی رشتۂ بیان میں پرو تے چلے جاتے ہیں۔ ناول اور ڈرامے کے پلاٹ سے افسانہ کا پلاٹ کئی لحاظ سے مختلف ہے؟

افسانے کے پلاٹ میں بھی پیچیدگیاں پیدا کی جاتی ہیں۔ مگر فرق یہ ہے۔ کہ ناول اور ڈرامے کے پلاٹ کی بہ نسبت یہ محدود ہوتا ہے۔ سادہ کردار صرف ایک ہی ذریعہ سے ننھی کرنے کے نقطہ عروج سے اس طرح متصادم کئے جاتے ہیں۔ کہ اچھی خاصی پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ہر جزو ایک تار کا کام دیتا ہے۔ اور اپنے مختصر حدود کے اندر رہ کر ہی پلاٹ ناول اور ڈرامے کے وسیع تر پلاٹ کی طرح دلچسپ بن جاتا ہے۔ اس طرح سادگی بجائے کمزوری ثابت ہونے کے افسانہ کے پلاٹ کے حق میں طاقت بن جاتی ہے۔ جہاں بہت سے تار اُلجھائے جاتے ہیں۔ وہاں پڑھنے والے کی توجہ کسی ایک بات پر نہ تو مرکوز رہتی ہے۔ نہ کی جا سکتی ہے۔ اثرات ایک لمحہ کے لئے جگنو کی طرح چمکتے ہیں۔ اور غائب ہو جاتے ہیں۔ پڑھنے والے کے ذہن کی کیفیت اس شخص کی سی ہوتی ہے۔ جو کئی راستوں میں کبھی ایک پر چلے اور کبھی اُسے چھوڑ کر دوسرے پر دوڑنے لگے۔ افسانہ کی پلاٹ کی سادگی پڑھنے والے کے ذہن کو اس کوفت اور انتشار سے بچا لیتی ہے۔ یہاں اثر ایک ہی ہوتا ہے اور پیچیدہ پلاٹ کے کسی ایک اثر سے بہت زیادہ قوی ہوتا ہے۔

مگر کیا سادہ پلاٹ وسیع تر پلاٹ کی بہ نسبت کم قدرتی نہیں ہوتا؟ کیونکہ یہ ظاہر ہے۔ کہ سادہ پلاٹ میں واقعات پر جدا جدا عمل کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک نکتہ قابلِ لحاظ ہے۔ ناول نویس اپنے مطالعہ کے خاموش کمرے میں بیٹھ کر اپنے ناول کے پلاٹ کے لئے واقعات سوچتا ہے۔ ان واقعات کو ایک دوسرے میں اُلجھاتا ہے۔ اور اسی طرح کرداروں کو بھی واقعات اور کرداروں سے بھڑاتا ہے۔ کیا یہ سب قدرتی ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ زندگی پیچیدگیوں سے لبریز ہے۔ مگر ایک فرد ایک وقت میں ایک ہی معاملہ کا تصفیہ کر سکتا ہے۔ اور کرتا ہے۔ کوئی کام شروع کرتے وقت اس کے سامنے ایک ہی بڑا مقصد ہوا کرتا ہے۔ اس کے عمل کا جو اثر دوسروں کی زندگیوں پر پڑتا ہے۔ اور اس اثر سے جو گوناگوں پیچیدگیاں بعد میں نمودار ہوتی ہیں۔ ان کا اسے سان وگمان بھی نہیں ہوتا۔ یہ ظاہر ہے۔ کہ فطرتاً دانشمند انسان پیش بینی سے کام لیتا ہے۔ مگر زیادہ تر اس کا ذہن اپنی حالت پر مرکوز رہتا ہے۔ افسانہ نگار اس بات پر یقین رکھتا ہے۔ کہ حالات و واقعات انسانی زندگی کی زنجیر کی کڑیاں ہیں۔ جو ایک دوسرے سے پیوست تو ہیں۔ مگر اپنی اپنی جگہ آزادانہ حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ ناول نگار اور افسانہ نگار دونوں کے طریق تعمیر میں پلاٹ کے معاملہ میں بڑا اختلاف ہے۔ مگر دونوں کا طریق اپنی اپنی جگہ برمحل اور مناسب ہے۔ پہلا انسان کو اس نظر سے دیکھتا ہے۔ کہ یا وہ معاشرت کی اُلجھنوں میں پھنس گیا ہے۔ دوسرا سمجھتا ہے۔ کہ ہر انسان معاشرت کا ایک فرد ہے۔ جو کسی نہ کسی مقصد کو سامنے رکھ کر مصروفِ عمل ہے۔ اور اپنی اور عام طور پر سوسائٹی کی تقدیر بنا رہا ہے۔ دونو زاویئے اپنی اپنی جگہ درست ہیں۔ مگر دوسرا انسانی زندگی سے زیادہ قریب دکھائی دیتا ہے ۔

عمدہ پلاٹ کی رُوح نقطۂ عروج ہے۔ اور کردار اور عمل سے باقی ڈھانچا بنتا ہے۔ یہ دیکھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ کہ کردار اور عمل جیسے دو اہم عناصر کو کیونکر زیادہ سے زیادہ مؤثر طور پر یوں استعمال کیا جائے۔ کہ نقطہ عروج پیدا ہو جائے۔ ان دونو عناصر میں سے کسی ایک عنصر کی قوت کا اندازہ بذاتہ نہیں کیا جاتا۔ وہ تو اسی وقت معلوم ہوتی ہے۔ جب دوسرے عنصر سے اس کا تصادم ہو۔ اور اس کی متحرک طاقت کا بھید کھلے۔ کردار اس وقت تک غیر یقینی حالت میں رہتا ہے۔ جب تک اس کے

سامنے سدِ راہ نہ آئے۔ عمل صرف اُسی وقت دلچسپ شکل اختیار کرتا ہے۔ جب اس کا تعلق انسانوں سے پیدا ہو۔ فرض کرو۔ کرۂ ارض کے کسی غیر آباد حصہ میں مہیب ترین طوفان باد و باران آتا ہے۔ ہمیں اس میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ کیوں؟ پہلی وجہ تو یہ ہے۔ کہ ہم سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اور اس لئے اس کے اثر سے ہم بالکل آزاد ہیں۔ دُوسری وجہ یہ ہے۔ کہ ہم تو ہم۔ ہم جیسے دیگر انسانوں میں سے بھی کسی ایک متنفس سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اور نہ کسی پر اس کا اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ طوفان باد و باران قدرت کا ایک بے اثر فعل بن کر رہ گیا ہے! افسانہ میں کوئی جزو بیکار و بے اثر نہیں رکھا جا سکتا۔ کردار اور عمل ایک دُوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور نتیجہ نقطۂ عروج کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔ کردار پر کچھ نہ کچھ بیتنی چاہیئے۔ اور کردار کو افسانہ کے عمل کو روکنے یا اسے وسعت دینے کے لئے کوئی نہ کوئی حرکت کرنی چاہیئے۔ جب تک عناصر کو کپڑے کے تاروں کی طرح ایک دوسرے سے مربوط نہ کیا جائے۔ پلاٹ نہیں بنتا۔ کامیاب افسانہ صرف ایک کرداری تصویر نہیں ہوتا۔ بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہوتا ہے۔ صرف ایک دلچسپ پیچیدگی نہیں ہوتا۔ بلکہ اس سے بڑھ کر کچھ ہوتا ہے۔ صرف کسی ایک شخص کا مرقع زندگی نہیں۔ بلکہ اس کے سوا بھی کچھ اپنے اندر رکھتا ہے۔ صرف ایک معرکہ آرا اور سنسنی خیز حادثہ نہیں۔ بلکہ اس کے علاوہ بھی کچھ ہوتا ہے۔ کامیاب افسانہ میں یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ اور یہ سب عناصر اس طرح ایک دوسرے سے ربط دیئے جاتے ہیں۔ کہ افسانہ کے ہیرو پر جو کچھ گزرتی ہے۔ اس سے پڑھنے والا متحیر ہوتا ہے۔ اور کہانی کے نازک مرحلوں پر ہیرو جو کچھ کرتا ہے۔ اس سے پڑھنے والے کو سنسنی محسوس ہوتی ہے۔ یہ سنسنی ڈرامائی سنسنی ہوتی ہے اگر ہیرو افسانہ کے نازک مرحلے پر غیر قدرتی طرزِ عمل پیش نہ کرے ۔!

چونکہ پلاٹ میں اہم ترین چیز نقطۂ عروج ہوتا ہے۔ اس لئے پلاٹ کی تعمیر بھی وہیں سے شروع کی جاتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اگر افسانہ نگار نقطۂ عروج پر پوری توجہ مرکوز کر دے۔ تو اس کے پاس یہ یقین کرنے کے لئے وجہ پیدا ہو جاتی ہے۔ کہ ڈیزائن کے درمیانی اجزا معتدل اور قدرتی ہونگے۔ اس صورت میں جب افسانہ کے آغاز سے پلاٹ بنانا شروع کیا جائے۔ یہ یقین اس قدر پختہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ نتیجہ معلوم ہو جانے کے بعد سبب کا یقین اتنا دشوار نہیں ہوتا۔ جتنا سبب معلوم ہونے کی صورت میں نتیجہ متعین کرنے کی کوشش کرنا ۔

افسانہ میں نقطۂ عروج انجام کے بہت قریب ہوتا ہے۔ یہ تحیر انگیز مراحل میں سب سے زبردست مرحلہ ہوتا ہے۔ اور اسی طرف ابتدا سے افسانہ کا رُخ رہتا ہے۔ اگر نقطۂ عروج کے بعد بھی کچھ بیان کیا جانے لگے۔ تو اثر زائل ہو جائیگا۔ ڈرامہ میں البتہ نقطۂ عروج کہانی کے وسط میں ہوتا ہے۔ کئی جداگانہ عمل جو علیحدہ علیحدہ ظہور پذیر ہوتے رہے ہیں۔ ڈرامے میں اس مرحلے پر ایک ہو جاتے ہیں۔ اور پھر اسی مرحلہ سے لے کر انجام تک یہ بندھن ٹوٹتے رہتے ہیں۔ اور آخر میں تاثر نمودار ہوتا ہے۔ افسانہ میں انجام اور تاثر کا نمودار ہونا ایک ہی مرحلہ ہے۔ انجام کے بعد کسی مزید بندھن کے کھولنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کیونکہ پیچیدگی تو صرف ایک ہوتی ہے اور انجام پر جا کر وُہی کھل جاتی ہے ۔

اور پھر افسانے میں پیچیدگی بذات خود اتنی اہم بھی نہیں ہوتی۔ کہ دلچسپ بن سکے۔ تمام توجہ اس نقطہ پر مرکوز کرا دی جاتی ہے۔ جو پیچیدگی کے نتیجہ کے طور پر برآمد ہوتا ہے یہ نتیجہ یہ دلچسپ ترین مرحلہ، یہ وقوعہ افسانہ کا نقطۂ عروج ہوتا ہے ۔

منشی پریم چند کے بعض افسانوں کے پلاٹوں میں یہ نقص پایا جاتا ہے۔ کہ وہ افسانہ کو اس کے نقطۂ عروج یعنی فیصلہ کُن مرحلہ سے بھی آگے اس لئے لے جاتے ہیں۔ کہ انہیں اپنے کسی محبوب و مرغوب اصُول کو اُبھار کر دکھانا ہوتا ہے۔ مثلاً اُن کے افسانہ "سرِ پُرغرور" کی کہانی یہ ہے۔ کہ سرجو ندی کے کنارے ایک علاقہ میں ایک زمیندار کنور سجن سنگھ تھا۔ جو اتنا سرکش تھا۔ کہ مجسٹریٹ جب اس کے علاقہ میں دورے پر آتے تھے۔ تو نہ تو وہ اُن کے سلام کو آتا تھا۔ اور نہ اُن کے لاؤ لشکر کے لئے رسد وغیرہ کا انتظام کرتا تھا۔ عموماً زمیندار مجسٹریٹوں کی خاطر تواضع کرتے ہیں۔ خودداری کو بھی ہاتھ سے دے بیٹھتے ہیں۔ کیونکہ انہیں اپنا اُلّو سیدھا کرنے

اور رسوخ بے جا حاصل کرنے کی فکر ہوتی تھی۔ برخلاف ان کے کنور سجن سنگھ کی یہ کیفیت تھی۔ کہ جب ایک دفعہ مجسٹریٹ وہاں ایک ہفتہ تک ٹھہرا رہا۔ تب بھی وہ اس سے ملنے نہ آیا۔ ویسے بھی مجسٹریٹ کے کانوں میں کنور کی سرکشی اور غرور اور ہیکڑی کی داستانیں پڑیں۔ کنور صاحب کی اس قدر مذمت سُنی۔ تو مجسٹریٹ کو اشتیاق پیدا ہوا۔ کہ ایسے آدمی سے ضرور ملنا چاہیئے۔ جب وہ کنور صاحب سے ملا تو وہ اس سے بہت مربیانہ انداز سے پیش آئے۔ اس کے بعد کنور صاحب نے مجسٹریٹ کو اپنی گڑھی کی سیر کرائی۔ جس کے چپے چپے پر کنور صاحب کی خاندانی عظمت کا تذکرہ لکھا ہُوا تھا۔ مجسٹریٹ اس مختصر سی ملاقات سے کنور صاحب کا گرویدہ ہو گیا ۔

چند دن بعد ایسا اتفاق ہُوا۔ کہ سُرجو ندی میں سیلاب آیا۔ اور کنارے کے ہزاروں گاؤں غارت ہو گئے۔ سرکار کی طرف سے ایک تحقیقاتی کمیشن بیٹھا۔ زمینداروں کو اس کمیشن کے روبرو شہادتیں دینے کا حکم ہُوا۔ شہادت دینے کے کام میں چونکہ سخن سازی اور خوشامد سے کام لیا جاتا تھا۔ اس لئے کنور سجن سنگھ جن کی زبان خوشامد سے ناآشنا تھی کمیشن کی روبرو صورت سوال بنے ہوئے نہ آ سکے۔ حالانکہ ان کے سارے موضعے سُرجو کے کنارے تھے۔ اور سبھی تباہ ہو گئے تھے ۔

چنانچہ کمیشن نے جب اپنا کام ختم کرنے کے بعد رپورٹ پیش کی۔ تو سیلاب زدہ علاقے میں سجن سنگھ زمیندار کے علاوہ سب کے لگان معاف ہو گئے۔

کنور صاحب نے رپورٹ سُنی۔ پیشانی پر بل نہ آیا۔ اُن کے اسامی گڑھی کے صحن میں جمع تھے۔ یہ حکم سُنا۔ تو آہ و زاری کرنے لگے۔ تب کنور صاحب اُٹھے اور بلند آواز سے بولے۔ میرے علاقہ میں بھی معافی ہے۔ ایک کوڑی لگان نہ لیا جائیگا۔"

یہ اس افسانہ کردار کا نقطۂ عرُوج ہے۔ یہاں پہنچ کر پڑھنے والے کے ذہن پر کنور صاحب کے کیریکٹر کے متعلق یہ حقیقت نقش ہو جاتی ہے۔ کہ یہ شخص آن کا پکا اور بات کا پُورا ہے۔ حکومت اور اختیار کے طوفان میں یہ جڑ سے تو اُکھاڑا جا سکتا ہے۔ مگر خم ہونا ممکن نہیں ۔

مگر منشی صاحب کو چونکہ اپنے محبوب اصُول کی تبلیغ کرنی ہے۔ کہ یہ رنگ صرف انہی لوگوں کا ہو سکتا ہے۔ جو روحانیت میں غرق ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ افسانوں کو آگے بڑھائے جاتے ہیں۔ شنکر نام ایک شاعر یورپ اور امریکہ میں اپنے کمالِ شاعرانہ کا ڈنکا بجا کر ہندوستان واپس آتا ہے۔ اور اجودھیا میں اسے ایڈریس دیا جاتا ہے۔ وہی مجسٹریٹ جو کنور سجن سنگھ کا گرویدہ ہو چکا ہے۔ ایڈریس پڑھتا ہے جب وہ ان الفاظ پر پہنچتا ہے۔ "اے ہمارے رُوحانی گُرو! ہم سچی ارادت سے تمہارے قدموں پر سر جھکاتے ہیں۔" تو کنور صاحب محفل سے اُٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ لوگوں کو اُن کی یہ حرکت بہت بُری معلوم ہوتی ہے۔ اور خود مجسٹریٹ جلسہ ختم ہونے کے بعد کنور صاحب سے وجہ پُوچھتا ہے۔ کنور صاحب بے تکلف جواب دیتے ہیں۔ کہ میں شنکر کو اپنی قوم کا محسن سمجھتا ہوں۔ مگر انہیں اپنا رُوحانی گُرو نہیں مانتا۔ اور نہ اُن کے قدموں پر سر جھکانے کے لئے تیار ہوں۔ اور انجام یہ ہے۔ کہ ایک دفعہ مجسٹریٹ کنور سے ملنے جا رہا ہے۔ تو اسے اونچے کراڑے پر ایک درخت کے نیچے روشنی میں ایک سادھو پیر پھیلائے لیٹا ملتا تھا۔ اور کنور صاحب اس سادھو کے پیروں پر اپنا سر رکھے ہوئے ہیں۔ یوں منشی صاحب کنور کو ترک اور تسلیم استغنا اور بے نیازی کا پتلا دکھا دیتے ہیں۔

مگر بذات خود نقطۂ عرُوج کیا چیز ہوتا ہے؟ بعض اوقات وہ وقوعہ جس کی طرف تمام جزوی واقعات جامع معلوم ہوتے ہیں۔ کہانی کا نقطۂ عروج بن جاتا ہے۔ اکثر وہ صورت حال جو افسانے کی بنیاد اور داستان کا اولین جلوہ معلوم ہوتی تھی۔ ایک تجلی محض کے ساتھ جلوہ گر ہو کر افسانہ کا نقطۂ عروج بنجاتی ہے۔ مگر اکثر یہ بھی دیکھا گیا ہے۔ کہ ان افسانوں میں جو معمولی واقعات اور ناول سے مختلف ہوتے ہیں۔ اور فنی اعتبار سے کامیاب سمجھے جاتے ہیں۔ وہ واحد تاثر، پڑھنے والے کے لئے اس بات کا متجلی ادراک جس نے افسانہ نگار کو افسانہ تحریر کرنے پر اُبھارا تھا۔ عام اس سے کہ وقوعہ ہو یا کوئی جذبہ ہو۔ یا صورت حال ہو۔ وہی نقطۂ عرُوج بنتا ہے۔ کیونکہ وہی افسانہ کا تاثر آفریں

مقصد ہوتا ہے ‏۔

نقطۂ عروج کا اظہار کسی طریق پر بھی ہو۔ مگر افسانہ کے رنگ سے وہ ضرور ہمرنگ ہوتا ہے۔ اگر افسانہ کرداری ہے تو نقطۂ عروج پر پہنچ کر مرکزی کردار کی زندگی کے کسی بہت ہی نازک لمحے پر روشنی پڑے گی۔ اگر افسانہ صورت حال پر ہے۔ تو نقطۂ عروج کے مرحلہ پر پہنچ کر حالات میں کوئی یقینی اہم اور معرکہ آرا تغیر واقع ہوگا۔ اگر افسانہ میں عمل غالب ہے۔ تو نقطۂ عروج کسی تحیر زا اور سنسنی خیز وقوعہ کی صورت میں نمودار ہوگا۔ اگر افسانہ ماحولی افسانہ ہے۔ تو نقطۂ عروج پر ماحول حد درجہ دلکش اور تاثر آفریں بن جائیگا۔ مختصر یہ ہے۔ کہ نقطۂ عروج اور واحد تاثر ایک دوسرے سے مطابقت تامہ رکھتے ہیں ‏۔

یہ نقطۂ عروج کسی پیچیدگی سے پیدا کیا جاتا ہے۔ افسانہ کے واقعات کا دریا موجیں لیتا ہوا آگے بڑھتا ہوتا ہے۔ کہ دفعتاً اس کے راستے میں ایک روک آجاتی ہے۔ یہ روک ضروری ہوتی ہے۔ مگر معمولی درجے کی سد راہ سے نقطۂ عروج پیدا نہیں ہو جاتا۔ کوئی ایسی بات ہونی چاہیئے۔ جو غیر معمولی حیثیت رکھتی ہو۔ اگر افسانہ کی ترقی کے راستے میں دُور ہو جانے والی دشواریاں لائی جائیں۔ تو پلاٹ غیر دلچسپ بن جاتا ہے۔ یہ دشواریاں ناگزیر بھی ہونی چاہئیں۔ اور صبر آزما بھی کشمکش صرف اسی صورت میں پیدا ہوگی۔ اور کشمکش پلاٹ کی جان ہوتی ہے کشمکش جس قدر روح فرسا اور دلچسپ ہوگی۔ انجام یا نقطۂ عروج اسی قدر زیادہ مؤثر بنایا جاسکیگا۔ واقعات کی رفتار کا بھی تیز ہونا ضروری ہے۔ پڑھنے والے کے ذہن کو بڑی سرعت کے ساتھ انجام کی طرف کھینچا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں جب تیزی کے ساتھ پڑھنے والے کے ذہن کو افسانہ نگار اپنی پوری قوت سے انجام یا نقطۂ عروج کی طرف کھینچ رہا ہو۔ معمولی درجے کی دشواریاں پیش کرنا پلاٹ کو غیر دلچسپ بنا دیتا ہے۔ کیونکہ جب دشواریاں راہ میں حائل ہو ہو کر دُور ہوتی رہتی ہیں۔ تو جا بجا کمتر درجے کے نقطہائے عروج پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اور افسانہ کی مجموعی دلچسپی اور اس کے تاثر کے زور میں کمی واقع ہوتی رہتی ہے۔ اور پھر جب انجام سامنے آتا ہے۔ تو پڑھنے کے لئے اس میں دلچسپی یا حیرت یا سنسنی کا کوئی سامان نہیں ہوتا۔ تاثر دھیما رہتا ہے۔ یا ایک سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا۔ اور تاثر نہ ہونے کے معنی یہ ہیں۔ کہ افسانہ اپنی غایت پڑھنے والے کے ذہن پر مرتسم کرنے میں ناکام رہا۔ جو فنی اعتبار سے افسانہ کی موت کے مرادف ہے ‏۔

اگر سد راہ حقیقی اور ناگزیر ہو۔ تو کسی نہ کسی قسم کی کشمکش پیدا ہوگی۔ اگر دو موٹر سائیکلیں دو متضاد سمتوں سے آتی ہوں۔ اور کسی راہ کے موڑ پر ایک دوسرے سے متصادم ہو جائیں۔ تو وہ یقیناً ایک دوسرے کے لئے ناگزیر سد راہ بن گئیں۔ ٹکر ہو جانے کی صورت میں یقیناً کچھ نہ کچھ وقوع پذیر ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے۔ کہ دونو میں سے ایک موٹر سائیکل خفیف سی ضربات کے بعد بچ کر نکل جائے۔ یا وہ بالکل ہی ڈھیر ہو جائے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ دونو ٹکرا کر پاش پاش ہو جائیں۔ اور ان کے سوار قریب ہی لاشوں کی صورت میں پڑے نظر آئیں۔ یہ کشمکش اس قسم کی ہے۔ جس کا کوئی نہ کوئی یقینی نتیجہ عملی صورت میں نکلتا ہے۔ جب دو قوتیں متصادم ہوتی ہیں۔ تو پڑھنے والا یہ توقع نہیں کرتا۔ کہ دونو بالکل ہی تباہ و برباد ہو جائیں گی۔ تاہم اس امر کا یقین آسان نہیں ہوتا۔ کہ افسانہ کے حالات کے مقابلہ پر جو سد راہ آن موجود ہوئی ہے اسے لازمی طور پر پاش پاش ہوتا ہی دکھایا جائیگا۔ اور اس کے بعد افسانہ کے حالات انجام تک بے غل و غش چلے جائینگے بعض اوقات سد راہ اتنی قوی ہوتی ہے۔ کہ اس سے متصادم ہو کر افسانہ کے حالات پر بڑی کاری ضرب لگتی ہے۔ اور اپنے انجام تک افسانہ اسی مضروب حالت میں پہنچتا ہے۔ ایسے افسانہ میں نقطۂ عروج اور کشمکش منطبق ہو جاتے ہیں۔ تاہم یہ یاد رہے۔ کہ سد راہ خود کشمکش نہیں۔ بلکہ سبب کشمکش ہوتی ہے ‏۔

پلاٹ کی دوسری ضرورت یہ ہے۔ کہ افسانہ نگار ایسے حالات پیدا کرتا ہے۔ جو پیچیدگی اور نقطۂ عروج تک مؤثر انداز میں پہنچ سکیں۔ ہر شے حرکت سے لبریز ہونی ضروری ہے۔ تیز گامی سے متعینہ نصب العین کی طرف بڑھا جاتا ہے۔ سر راہ پھول چننے کا کوئی موقع نہیں ہوتا۔ ہر وہ چیز جو پلاٹ میں داخل ہوتی ہے۔ تیز گام ہو جاتی ہے۔ اس اعتبار سے ایسے

عادات پیدا کئے جاتے ہیں - کہ پیچیدگی ان کا فطری اور معقول
نتیجہ معلوم ہوتی ہے - متعدد جزوی امور جن سے اثر گہرا ہوتا
ہے، بعد کو افسانہ میں شامل کر لئے جاتے ہیں - یا کئے جا
سکتے ہیں - مگر پلاٹ بناتے وقت صرف اسباب و علل
کی کارفرمائی دکھانے سے سروکار رکھا جاتا ہے - تاکہ نقطۂ عروج
کا جواز پیدا کیا جا سکے - چنانچہ چند موثر مگر مختصر اشارات
ہیں وہ تمام حالات پڑھنے والے کے سامنے رکھ دیئے جاتے
ہیں - جو پیچیدگی کے اسباب ہیں - افسانہ کی تعمیر کرتے وقت
یہ دیکھنا بہت ضروری ہوتا ہے - کہ حالات اس قدر کافی مضبوط
اور برمحل ہیں - کہ پیچیدگی کا مناسب جواز بن سکیں - حالات کے
بھی مختلف مدارج ہو سکتے ہیں - مثلاً یہ ممکن ہے - کہ مرکزی کردار
میں کوئی کرداری خصوصیت ایسی ہو - کہ اسی کے سبب سے
کوئی واقعہ ظہور پذیر ہو جائے - اور اس واقعہ سے نئے حالات
پیدا ہوں - بہت معمولی سی بات سے نئے حالات کی تخلیق ہو
سکتی ہے - بعض اوقات ایک لفظ یا ایک غیر اہم سے فیصلہ
سے جو اپنی جگہ کچھ بھی وزنی نہیں ہوتا - حالات اور واقعات کی
تخلیق کے لئے دروازہ کھل جاتا ہے ؎

نقطۂ عروج کے تعین کے بعد افسانہ کے کرداروں کا سوال
سامنے آتا ہے - ہر افسانہ میں ایک مرکزی کردار ہوتا ہے -
افسانہ نگار کو یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے - کہ میرے اس افسانہ کا کردار
مرد ہونا چاہئے یا عورت ؟ مرکزی کردار کس قسم کا انسان ہو؟
اس کی فطرت کیسی دکھائی جائے ؟ افسانہ میں کیا کام اس کے
ذمہ ہو ؟ معاشرت کے کس طبقہ سے اس کا تعلق دکھانا موزوں
ہوگا ؟ اس کے چال چلن اور اس کی نقل و حرکت کو بالکل بے
رنگ رکھنا چاہئے - یا اسے عجیب و غریب خصوصیات کا
حامل دکھانا بہتر ہوگا - اس قسم کے سوالات کے جوابات
تلاش کرنے کے لئے افسانہ نگار اپنے افسانے نقطۂ عروج
اور اس کی غرض و غایت پر دوبارہ ایک غائر نظر ڈالتا
ہے - اگر وہ ان کو اچھی طرح سمجھ لیتا ہے - تو پھر مرکزی
کردار کے تعین میں کچھ دشواری نہیں رہتی ؎

یہ ضروری نہیں - کہ مرکزی کردار انسان ہی ہو - کسی
جانور یا بے جان شئے سے بھی مرکزی کردار کا کام لیا جا سکتا
ہے - اردو زبان میں تو ایسی کہانیاں بہت کم ہیں - جن میں
جانور یا بے جان اشیا کو "ہیرو" بنایا گیا ہو - مگر انگریزی میں
اس قسم کے افسانے بڑی کثرت سے پائے جاتے ہیں - مشہور
انگریزی افسانہ نگار رڈیارڈ کپلنگ کی ایک کہانی کا نام ہے
"۰۰۷" یہ "۰۰۷" ایک انجن کا نام ہے - اور اس انجن
کو افسانہ میں ہیرو بنایا گیا ہے - اس کی تمام مشینی خصوصیات کو
برقرار رکھتے ہوئے بھی اسے ایک خاص قسم کی شخصیت بخش
دی گئی ہے - اسی طرح جب کبھی انگریزی زبان کے افسانہ نگار
جانوروں یا بے جان اشیا کو مرکزی کردار بناتے ہیں - تو
انہیں ایک مخصوص شخصیت دے کر اس طرح پیش کرتے ہیں - گویا
ان چیزوں یا جانوروں کے سامنے بھی اسی طرح بعض اغراض ہیں -
جس طرح انسانوں کے کام اغراض کے ماتحت ہوتے ہیں - ان
کے ذہن بھی خود غرضی - غرور اور حوصلہ مندی وغیرہ کے جذبات
سے اسی طرح متاثر ہوتے دکھائے جاتے ہیں - جس طرح انسانی
ذہن مختلف جذبات سے اثرات لیتا ہے ؎

کرداری افسانہ میں مرکزی کردار کی خصوصیات سے
افسانہ کے عمل پر بڑا اثر پڑتا ہے - ایسی صورتوں میں مرکزی
کردار کی فطرت اور اس کی عادات بڑی توجہ سے متعین کی
جاتی ہیں - اوّل یہ دیکھنا ہوتا ہے - کہ مرکزی کردار افسانہ کے
عمل سے مطابقت رکھتا ہو - اور جو کام اس کے ذمے لگایا جائے -
ہر اعتبار سے اس کام کو قابل تشفی حد تک انجام دے دینے کا
اہل ہو - اس میں ماحول کا بھی حصہ ہوتا ہے - مثلاً یہ بات سمجھ
میں آتی ہے - کہ ایک باورچی نے باورچی خانے کا چاقو لے کر
کسی پر حملہ کر دیا - مگر ایک ایسی عورت سے جس کی ساری عمر
گھر کی چار دیواری میں کٹی ہو - ہم یہ توقع نہیں کرتے - کہ وہ
گھر سے باہر آ کر لٹھ چلانے لگے - اگر کسی افسانہ میں ایسا دکھایا
جائیگا - تو افسانہ نگار کی بے راہ روی کا کھلا ہوا ثبوت ہوگا -
مختصر یہ کہ کردار حالات سے مطابق ہونے چاہئیں - اور ان کا
انتخاب اس بات کو سامنے رکھ کر کرنا چاہئے - کہ وہ افسانہ کی
ضرورت کی تکمیل کرتے ہیں ؎

افسانہ کے ہر کردار میں ایک انفرادی شان بھی ہونی
چاہئے - کردار کو کسی مخصوص ٹائپ سے مطابق کر دینا ہی کافی

نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پڑھنے والے مختلف وضع کے انسانوں کے چربے قرطاس پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ مگر وہ یہ بھی چاہتے ہیں۔ کہ ہر اس کردار میں جو اُن کے سامنے پیش کیا جائے۔ ایسی انفرادیت ہو۔ جو اسے اوروں سے ممتاز کر دے مثلاً ایک افسانہ نگار اپنے کسی افسانہ میں یہ دکھاتا ہے۔ کہ ایک چور نے کسی ایک شخص کی چھتری چرائی۔ صرف یہ واقعہ کہ اس نے چھتری چرالی۔ چور کے کیریکٹر کے کسی ایسے پہلو پر روشنی نہیں ڈالتا۔ جو اسے اور چوروں سے ممتاز کر دے۔ اس نے وہی کیا۔ جو سینکڑوں اور ہزاروں دیگر چور کرتے ہیں۔ لیکن اگر افسانہ نگار اس چور کے چوری کرنے کے ایسے طریقے بیان کرنے لگے۔ جو دوسرے چوروں کو معلوم نہیں ہیں۔ تو مذکورہ چور کے کردار میں انفرادیت پیدا ہو جائے گی۔ اور وہ دیگر چوروں سے ممتاز نظر آنے لگیگا ۔

مرکزی کردار کے بارے میں یہ امر اور بھی زیادہ ضروری ہے۔ کہ وہ کوئی ایسی حرکت کرے۔ جو اس کی مخصوص شخصیت کی آئینہ دار ہو۔ ورنہ ہم اس کی انفرادیت کے قائل نہ ہونگے۔ مرکزی کردار کو یہ درجہ اس وقت حاصل ہوتا ہے جب افسانہ نگار نے اس کی تعمیر بڑی احتیاط اور توجہ سے کی ہو۔ ایسی صورت میں افسانہ نگار اپنے افسانہ کے مرکزی کردار کو خوب اچھی طرح پرکھ کر دیکھ لیتا ہے۔ اور جان جاتا ہے۔ کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔ اور افسانہ کے فلاں فلاں مرحلے پر اس سے کیا کام لیا جا سکیگا۔ گویا افسانہ نگار کیلئے یہ امر لابدی ہے۔ کہ وہ اپنے مرکزی کردار سے پوری طرح واقفیت رکھتا ہو۔ سطحی شناسائی سے کام نہیں چلتا۔ وہ اپنے مرکزی کردار کے ہر ایک پہلو سے آگاہ ہوتا ہے۔ اور اسی آگاہی کے بل پر اسے حیثیت دیتا ہے ۔

پروفیسر مجیب نے اپنے افسانہ "باغبان" میں نیاز اور ارجمند کے کرداروں کی مصوری میں اس کا مکمل ثبوت دیا ہے

نیاز	ارجمند
(۱) گوری تھی اور ذرا لمبی	(۱) سانولی اور میانہ قد کی تھی۔
(۲) ناک نقشہ میں کوئی خاص خوبی نہیں تھی۔ مگر اس کے حسن کا انحصار صرف آنکھوں اور ابروؤں پر تھا ۔	(۲) آنکھیں نرگسی اور آبدار تھیں ناک اونچی اور نازک منہ پھول جیسا، بال لمبے گھونگھر والے اور گھنے، جسم نہایت سڈول۔
(۳) اس کی گرم گفتار، اس کی ہنسی اور سب سے زیادہ اس کی پُردرد اور سریلی آواز جو کبھی غزل گا کر سننے والے کو زندہ بنا دیتی تھی۔ کبھی دوہے گا کر بیراگی۔ ایسے تیر تھے۔ جن کا نشانہ خطا نہیں کر سکتا تھا۔	(۳) اس کی ہر جنبش میں ایک ادا تھی۔ جن کی کوئی صفت نہیں تھی۔ جو اس میں موجود نہیں تھی۔

یہ دونوں کا ظاہری نقشہ ہے۔ اب سیرت ملاحظہ ہو:-

نیاز	ارجمند
(۱) بھولی تھی۔ مگر تنک مزاج	(۱) بچپن سے خشک طبیعت رکھتی تھی بہن کی محبت پر اسے اعتبار نہ تھا ۔
(۲) دل کی اتنی اچھی تھی کہ جس شخص سے سابقہ پڑتا تھا۔ اس کی نسبت بہت سی خوبیاں فرض کر لیتی تھی۔ اور جب معلوم ہوتا تھا کہ اس میں یہ خوبیاں نہیں ہیں۔ تو اس طرح خفا ہوتی۔ گویا اسے جان بوجھ کر دھوکا دیا گیا ہے۔ وہ مردم شناس نہ تھی۔ اس کا دوست بننا معمولی آدمیوں کے لئے بڑی ذمہ داری کا کام تھا تاہم اس کی خودسری اور خفگی میں بھی ایک سچی محبت۔ اور وفاداری تھی ۔	(۲) بے حد ضدی تھی۔ بچپن ہی سے دل میں بات رکھنا، بغض اور کینے اور حسد کا بوجھ سنبھالنا سیکھا تھا۔ اور عمر اور تجربہ نے اسے اور چالاک کر دیا تھا ۔
(۳) اس کی طبیعت بغض اور کینے سے پاک تھی۔ نیکی جیسی تعریف کرنے میں جوشیلی تھی۔ ویسی ہی مذمت کرنے میں تیز ۔	(۳) ہوس کی شدت سے وہ سیانی ہو گئی تھی۔ یہ ہوس کہ دنیا کی کوئی نعمت ہاتھ سے نہ جائے نہ شہرت نہ دولت نہ سکون اور اطمینان ۔

نیاز	ارجمند
(۴) اسے یقین تھا کہ موسیقی کا ہر انسانی دل پر اثر ہوتا ہے اور اس لئے ہر شخص کو حسب استعداد اس کی قدردانی پر آمادہ ہو جانا چاہئے۔	(۴) اس نے حسن اور چالاکی کو تمام ہوس کے لئے ہتھیار بنا لیا تھا اور ان ہتھیاروں کے استعمال میں مہارت تامہ حاصل کر لی تھی۔
(۵) اس کا عقیدہ تھا۔ کہ ہر ذی روح ہستی کو انتہائی کمال حاصل کرنے کی آرزو ہمیشہ بیتاب رکھتی ہے۔ اور جو کوئی جو کچھ کرے۔ اس کا اصل مقصد اپنا اور دوسروں کا روحانی فروغ ہونا چاہئے۔ اسی لئے اسے اپنی ہمت اور حوصلے ان تمام نعمتوں سے زیادہ عزیز تھے۔ جو سدمتی مہیا کر سکتی ہے۔	(۵) اس کی ہر بات میں ایک مخفی مطلب ہوتا تھا۔ نہ نیاز کی طرح خفا ہوتی تھی۔ نہ روٹھتی تھی۔ نہ جی کھول کر ہنستی تھی۔ نہ جی بھر کر روتی تھی۔

مصنف کی کردار سے واقفیت کا ثبوت یہ ہے۔ کہ کردار کے جن خصائص کا اُس نے تعارف کے وقت اظہار کیا ہے۔ آگے چل کر واقعات کے بھنور میں پڑنے کے بعد بھی کردار عمل میں انہی خصائص کا اظہار کرے۔ نیاز اور ارجمند کی سیرت کے جو اجزا اوپر درج کئے گئے ہیں۔ جب ہم واقعات میں ان کا اظہار تلاش کرتے ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان کا عمل ان خصائص سے بالکل مطابق ہے۔ جو ابتدا میں بطور تعارف ظاہر کئے گئے ہیں [مثلاً ابتدا میں نیاز کا یہ عقیدہ ظاہر کیا گیا ہے۔ کہ ہر ذی روح ہستی کو انتہائی کمال حاصل کرنے کی آرزو بیتاب رکھتی ہے۔ اور اسی لئے اُسے اپنے حوصلے بہت عزیز تھے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ کالج میں پڑھتے وقت اس کے دل میں بہت سے حوصلے ہیں۔ وہ چاہتی ہے۔ کہ "ہندوستان کی شریف عورتیں گھریلو زندگی کی تنگ حدود سے باہر نکلیں۔ قومی زندگی کو سدھاریں۔ اور سنواریں۔ کنسرٹوں میں ایکٹ کریں۔ جلسوں میں گائیں۔ ملک میں فنون لطیفہ کا معیار بلند کریں۔ اور عصمت کا دامن چھوڑے بغیر اس قابل ہوں۔ تو اپنی روٹی بھی کمایا کریں۔"

بہت جلد کالج کی فضا میں وہ مقبول ہو گئی۔ اور اس کی ہاں میں ہاں ملانے والے نوجوان بھی بہت سے پیدا ہو گئے۔ مگر جب کالج سے نکلنے کے بعد بھی نوجوان جو اس کے مقاصد کے فدائی معلوم ہوتے تھے۔ دُنیا کے دھندوں میں پڑے۔ تو سب کچھ بھول بھال گئے۔ نیاز کے کردار کی خصوصی خصلت کہ وہ لوگوں میں خوبیاں فرض کر لیتی تھی۔ اور پھر جب وہ خوبیاں نہ پاتی تھی۔ تو اس طرح خفا ہوتی تھی۔ گویا اُسے دھوکا دیا گیا ہے۔ اب رنگ لائی۔ وہ نوجوانوں سے خفا ہو کر اس طرح زجر و توبیخ کا نشانہ بنانے لگی۔ کہ سب اس کے ہاں آنے سے ڈرنے لگے۔ یہی صورت نادر حسین کے معاملہ میں بھی پیش آتی ہے۔ ابتدا میں جب نیاز کو یہ دکھائی دیا۔ کہ نادر حسین کو اس کے حوصلوں سے ہمدردی ہے۔ تو وہ نادر حسین کی بڑی آؤ بھگت کرنے لگی۔ بغیر نادر حسین کی صورت سیرت اور مالی حالت اور دُنیوی حوصلوں پر غور کئے۔ مگر جب نادر حسین نے وکالت شروع کرنے کے بعد اس کے ارادوں کی تکمیل کے سلسلے میں امداد دینے میں تنگی وقت کا عُذر کیا۔ تو نیاز اس سے بگڑ بیٹھی۔ اور تعلقات ختم کر دیئے۔ اور یہ سمجھنے لگی۔ کہ اسے دھوکا دیا گیا ہے۔ اور اس کے ساتھ دغابازی کی گئی۔ ہر چند نادر حسین سے اس کی صلح ہو گئی۔ مگر نادر حسین کی نیاز کے دل میں کوئی وقعت نہ رہی۔

ارجمند جو نیاز سے بازی لے جانے کی جی توڑ کوشش کرتی رہتی تھی۔ اس موقع سے بھلا کیوں نہ فائدہ اُٹھاتی۔ اُس نے فوراً نادر حسین کو یہ سمجھتے ہوئے پھانس لیا۔ کہ میں ایک مالدار بیرسٹر کی بیوی بنوں گی۔ نیاز جب اپنے اس ارادے سے نہیں ٹلتی۔ کہ میں گانے کا پیشہ اختیار کروں۔ تو زیب النسا بیگم (اس کی ماں) ایک دعوت کا انتظام کرتی ہیں۔ اور اس دعوت میں ایسے لوگوں کو بلاتی ہیں۔ جو نیاز کی صحیح اعانت کر سکیں۔ اس جلسے میں ایک شخص ہدایت اللہ بھی آتا ہے جس سے نیاز کے تعلقات رفتہ رفتہ بہت گہرے ہو جاتے ہیں۔ وہ نیاز کے مزاج کو بھی سمجھ جاتا ہے۔ اور زیب النسا بیگم کو اطمینان ہوتا ہے۔ کہ بیٹی کے لئے صحیح بر مل گیا۔ مگر ارجمند ہدایت اللہ کے حسن اور دولت پر جو نادر حسین کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔ رال ٹپکا دیتی ہے۔ اور اوپری ترکیبیں کامیابی سے استعمال کر چکنے کے بعد خود نیاز کے آگے جا کر رونے لگتی ہے۔ اور ظاہر کرتی ہے۔ کہ وہ ہدایت اللہ سے شادی کرنی چاہتی ہے۔ اور نیاز ایثار کرتے ہوئے جوش میں اس سے امداد کا وعدہ کر لیتی ہے۔ کرنے کو اُس نے وعدہ کر لیا۔ مگر صدمے

کو برداشت نہ کر سکی - فوراً بخار چڑھتا ہے - رات کو وہ گرمی سے پریشان ہو کر نہا لیتی ہے - اور نمونئے میں مر جاتی ہے -

از اوّل تا آخر کرداروں کی تصویر دں میں مصوّر نے حیرت انگیز استقلال کا ثبوت دیا ہے -

ایسا بہت ہی کم ہوتا ہے - کہ صرف ایک کردار افسانہ کے لئے کافی ہو - بے شک لوگ ایسے افسانے لکھتے ہیں - جن میں خود کلامی ہی میں افسانہ ختم ہو جاتا ہے - مگر ایسے افسانے تو بہت ہی کم تعداد میں ہیں - دوسرے وہ غیر فطری ہوتے ہیں - انسانی فطرت یہ نہیں ہے - کہ وہ اپنے ہی سے باتیں کئے جائیں - انسان ہمیشہ تماشائی، ہمدرد، مخالف یا ساتھی بنے رہتے ہیں - اور انسانوں کی انہی حیثیتوں پر افسانوں کی بنیادیں رکھی جاتی ہیں - تاہم یہ حیثیتیں پلاٹ کی حرکت کے لئے لازمی عنصر نہیں ہوتیں بلکہ بعض اوقات تو ایسا بھی ہوتا ہے - کہ امدادی کردار پلاٹ کے لئے بار بن جاتے ہیں ؛

کسی کردار کی بعض حالتیں یا اس کے اثرات اکثر اس وقت بہترین طور پر اُبھار کر دکھائے جا سکتے ہیں - جب وہ کردار چند اور کرداروں کے مقابل ہو -

" چنگاری " میں مظہر انصاری نے افسانہ کے ہیروئن " بڑی بہو " کو " چھوٹی بہو " سے خوب متصادم کیا ہے - ہرچند مقصود بڑی بہو کو ہی روشنی میں لانا ہے - مگر چھوٹی بہو کے " پاکباز " کردار کی جزوی نقاب کشائی سے بڑی بہو کے عیاش کردار کا رنگ اور بھی زیادہ گہرا سیاہ نظر آنے لگتا ہے - بڑی بہو کے متعلق بتایا گیا ہے - کہ وہ

" ایک عزت دار آدمی کے پلّے بندھی اور ایک صاحب حیثیت گھر کی چار دیواری میں تھی - مگر اپنی فطرت کے لحاظ سے اس بام کی پری معلوم ہوتی تھی - جہاں نسوانی حیا عیاش نگاہوں کے مول لُٹتی تھی "

بڑی بہو کے کردار کے اس پہلو کو عمل پذیر کرنے میں تو مصنف نے کمال کر دیا - شمیم جسے بھابی ناجائز طور پر اپنے دامِ محبت میں اسیر کرنا چاہتی ہیں - چھوٹی بہو اور بھابی ہولی کھیل رہی ہیں - حالات چھوٹی بہو کی زبان سے بیان ہو رہے ہیں -

——" میں کھیل سمجھ رہی تھی - اور کھیل ہی سمجھ کر رنگ اُچھال رہی تھی - مگر بھابی کے انداز اور اُن کی حرکات میں عجب والہانہ پن تھا - چال میں لڑکھڑاہٹ، ہونٹوں پر ایک مخصوص مسکراہٹ ٹھٹھے میں ایک خاص لوچ - نگاہوں میں ایک مدھ بھرا سرور "

پھول اور پھولوں کی " پٹم پٹا " شروع ہوتی ہے -

" تھوڑی دیر تک دُور دُور سے نشانہ بازی کرنے کے بعد دست بدست لڑائی کی نوبت آئی - شمیم نے جامنوں کو ہاتھوں ہی ہاتھوں میں مسل کر ان کا گودا الگ کر رکھا تھا - میں (چھوٹی بہو) ہتھے چڑھی - تو اُس نے ایک ہی جھپٹے میں وہ میرے مُنہ پر مل دیں - بھابی کو کوئی اس وقت دیکھتا تو آرزو کا سراپا اور حسرتوں کا مجسّمہ بنی کھڑی تھیں - اے کاش شمیم کا ہاتھ ہوتا اور اُن کا چہرہ — "

یہ بھابی کا کیریکٹر ہے - اب چھوٹی بہو کا کردار ملاحظہ ہو:-

" رات ہمارے مرد گھر نہیں آئے - شاموں شام خبر آئی - کہ نواب صاحب اپنے ساتھ شکار میں لے گئے ہیں - موسم گلابی جاڑوں سے گزر کر گرمیوں کی طرف جا رہا تھا - سہ پہر کو ایسے بادل گھر کر آئے - کہ سب تاریکی چھا گئی - اور عشا کی اذانوں تک تو یہ حال ہوا - کہ چار کھونٹ گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا - مجھے ان کا خیال آیا - خبر نہیں اس وقت کہاں ہونگے - جنگلوں میں کہیں پڑے ہونگے - خدا خیر کے ساتھ گھر لائے "

ایک خود اپنے سے اور اپنے شوہر سے اس قدر بے خبر ہے کہ ایک نوجوان پر جو اس کے بیٹے کے برابر ہے - دیوانی ہو جاتی ہے - دُوسری کو شوہر کا اتنا خیال ہے - ہرچند چھوٹی بہو کے کردار کو بڑی بہو کے کردار کا جواب یا پس منظر بنا کر پیش کیا گیا ہے - مگر مصنّف کا یہ کمال ہے - کہ اُس نے صرف ایک شعاع سے بڑی بہو کے کردار کی تاریکیوں کا عمق پڑھنے والے کو دکھا دیا - بڑی بہو کے کردار سے ابتدا ہی سے پڑھنے والے کو ایک قسم کی ناگوار دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے - جس میں پسندیدگی کی بہ نسبت نفرت کو زیادہ دخل ہے - مگر چھوٹی بہو کی شوہر پرستی دیکھ کر بڑی بہو کے خلاف ہمارے دل میں تنفر کا ایک اَن مٹ جذبہ لہریں لینے لگتا ہے - یہ کام چھوٹی بہو کے کردار کی جزوی بے نقابی سے جس قدر آسانی سے انجام پا گیا - اور کسی ڈھب سے اس قدر مؤثر طریق سے بآسانی ممکن نہ تھا ——

بعض اوقات افسانہ میں ایک اضافی کردار کی ضرورت پڑتی ہے۔ تاکہ افسانہ کو وقت اور حالات سے زیادہ مؤثر طریق سے وابستہ کیا جا سکے۔ افسانہ کے سارے ہی کردار پلاٹ بنتے وقت افسانہ نگار کے ذہن میں نہیں ہوتے۔ بعض کردار صحیح طور پر افسانہ کی "تشکیل" کے وقت ہی نمودار ہوتے ہیں۔

جہاں تک افسانہ کی فضا کا تعلق ہے۔ وہ پلاٹ بنتے وقت افسانہ نگار کے دماغ میں موجود بھی ہو سکتی ہے۔ اور مفقود بھی۔ خواہ کیسا ہی افسانہ ہو۔ کسی نہ کسی جگہ اور کسی نہ کسی وقت وہ ضرور وقوع پذیر ہوگا۔ بعض افسانہ نگار ایسے افسانے بھی لکھتے ہیں۔ جو ہر جگہ ممکن ہیں۔ ان افسانوں کا موضوع عموماً یہ ہوتا ہے۔ کہ ایک نوجوان کو ایک دوشیزہ سے عشق ہوا۔ اور دونو کی شادی ہو گئی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ فضا کے بغیر افسانہ بے جان سا رہتا ہے۔ کیونکہ فضا کا کرداروں کی نشوونما پر بڑا گہرا اثر ہوتا ہے۔ بعض باتیں بعض کردار ایسی کرتے ہیں۔ یا بعض افعال ان سے ایسے سرزد ہوتے ہیں۔ جو صرف اسی فضا میں ممکن ہیں۔ جس میں مذکورہ کردار پیش کئے جاتے ہیں۔

اسی اعتبار سے یہ معلوم کرنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ کہ آیا فضا حقیقتاً پلاٹ کی حرکت پر کوئی اثر ڈالتی ہے۔ اگر فضا کا پلاٹ پر اثر پڑتا ہو۔ تو افسانہ نگار فوراً محل وقوع اور وقت کا تعین کرتا ہے۔ افسانہ میں وقت کا کوئی تعین نہیں ہوتا۔ عموماً ایک یا دو دن کا وقت لیا جاتا ہے۔ چند گھنٹے یا چند منٹ میں افسانہ تمام ہو سکتا ہے۔ بعض افسانوں میں کرداروں کی عمروں کا پورا پورا زمانہ آجاتا ہے۔ دماغ کی کوئی کیفیت یا حالت ایسی ہوتی ہے۔ جو زندگی بھر کردار میں نشوونما پاتی رہتی ہے۔ اور صرف اختتام عمر پر جا کر اس کا منتہا آتا ہے۔ علت و معلول کے صرف ایک تار کو لیا جاتا ہے۔ اور اسی پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ اس روشنی میں جو کچھ نظر آتا ہے۔ وہی ایک مؤثر افسانہ ہوتا ہے۔ یہی اصول محل وقوع کے معاملے میں بھی صحیح اترتا ہے۔ یہ ممکن ہے۔ کہ افسانہ کا ایک حصّہ ہندوستان میں وقوع پذیر ہو۔ اور دوسرا بحیرہ روم میں تختہ جہاز پر۔ افسانہ کے لئے جگہ اور وقت کی ضرورت نہیں۔ صرف اتنی بات کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔ کہ فضا فطری اور مناسب ہو۔ اور پلاٹ میں کھپ جائے۔

امداد صابری

پروازِ جنوں

موسمِ گُل ہے، شام ہے ساقی
کیا عجب اہتمام ہے ساقی

کہہ رہا ہے یہ رقصِ پروانہ
عشق سوزِ تمام ہے ساقی

امتیازاتِ این و آں سے پرے
میرے دل کا مقام ہے ساقی

حُسن کو اپنی شان پر ہے غرور!
عشق بے ننگ و نام ہے ساقی

بھولتے ہی نہیں روابطِ عشق
زیست کیفِ تمام ہے ساقی

جھک گیا ہے فلک بھی اُن کے حضور
عشق جن کا امام ہے ساقی

ذرہ ذرہ جہانِ وحشت کا!
قابلِ احترام ہے ساقی

اضطرابوں کا ایک طوفاں ہے
زندگی جس کا نام ہے ساقی

عقل کا ذکر چھوڑ، رہنے دے
عقل ابھی ناتمام ہے ساقی

اثر چکوالی بی۔اے

اُجرت

گھر کا مالک اندھا تھا۔
گھر کی مالکہ خوبصورت تھی۔
اور دونوں تھے بے انت غریب!
ایک دن مالک نے آہستہ سے کہا۔ "رجنی!"
رجنی نے اُس کے پاس آکر کہا۔ "ہاں پران پتی!"
مالک نے کہا۔ "میں نے کتنا بڑا پاپ کیا ہے۔ اپنی دُنیا تاریک کرکے میں نے تمہاری دُنیا بھی تاریکیوں سے بھر دی ——— کتنا دُکھ!"
رجنی نے ایسے الفاظ آج تک اپنے مالک کی زبان سے نہیں سُنے تھے۔
اُس نے حیران ہوکر پوچھا۔ "پتی دیو! آپ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں آج؟ کون سا پاپ؟ کیسی تاریکی؟"
مالک نے کہا۔ "تم خوبصورت ہو۔ یہ میں نے سُنا ہے۔ گو دیکھا نہیں۔ لیکن تمہاری سُندرتا کو جس پیار کی۔ جس محبت کی ضرورت تھی۔ وہ میں تمہیں نہ دے سکا۔ رجنی! کیا یہ پاپ نہیں؟"
رجنی نے کہا۔ "نہیں۔ میں ہندو استری ہوں۔ آپ جیسے بھی ہیں۔ میرے نزدیک بھگوان ہیں۔ میرے نزدیک ساری دُنیا سے حسین ہیں۔"
مالک نے آہستہ سے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ لیکن سوچ رہا ہوں۔ میں نے ایسا کیا ہی کیوں؟ میرے سر پر عشق کا بھوت سوار کیوں ہوگیا۔ کیوں میں نے یہ نہیں سوچا۔ کہ مجھے شادی کرنے کا حق نہیں۔"
رجنی نے اُس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔
"ایسا سوچنے کی آج ضرورت ہی کیا تھی۔ چھوڑ دو۔ ان خیالوں کو۔ سوچ سوچ کر آدمی غم کے سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔ جس کا کنارہ کہیں بھی نہیں ملتا!"

مالک نے کہا۔ "بڑا دُکھ ہے رجنی۔ عمر بھر مجھے یہ شوک ستاتا رہیگا۔ میری زندگی شاید اسی شوک میں ختم ہوگی۔ میں نے بڑا پاپ کیا ہے۔ اسی لئے؟"
رجنی نے کہا۔ "شوک کس بات کا ہے؟"
مالک نے کہا۔ "اگر میں نے اپنی چالاکی سے انہیں دھوکا نہ دیا ہوتا۔ تو شاید آج یہ حالت نہ ہوتی۔ وہ مجھ پر وشواس کرکے ایک خوبصورت کلی کو میرے حوالے نہ کرتے۔ رجنی! میں نے تمہیں سچ مچ ایک چہچہانے والے پرندے کی طرح پنجرے میں قید کر ڈالا۔ جہاں نہ تمہیں خوراک ملتی ہے۔ نہ پیار ——— !"
رجنی نے کہا۔ "یہ بھول ہے سوامی۔ مجھے آپ کو دیکھ کر جیسے سب کچھ مل جاتا ہے۔ میں آپ کو دیکھتی ہوں۔ تو ساری دُنیا کا پریم میرے دل میں اُمنڈ آتا ہے۔"
مالک نے آہستہ سے کہا۔ "باتیں"۔
اور پھر رجنی نے دیکھا کہ مالک کا گریبان آنسوؤں سے بھیگ رہا ہے۔
رجنی نے حیرت سے پُوچھا۔ "سوامی"۔
اندھے نے کہا۔ "ہاں رجنی روتا ہوں۔ مجھے رونا ہی چاہیئے۔ میں نے پاپ کیا ہے۔ شاید یہی آنسو میرے پاپ کو دھوسکیں۔"
اسی وقت دروازے پر آکر کسی نے کہا۔ "رات کو ٹھہرنے کی جگہ دوگے مالک؟"
رجنی نے دیکھا۔ ایک بوڑھا ہے۔ سر پر لمبے لمبے سفید بال ہیں۔ چہرہ کشادہ ہے۔ اور ہر انگ سے نُور ٹپکتا ہے۔
مالک نے پوچھا۔ "کون ہے رجنی؟"
رجنی خاموش ہو رہی۔
اور بوڑھے نے کہا۔ "میں ہوں ایک مسافر۔ رات کو

ٹھہرنے کا خیال ہے - جگہ دو گے ؟ "

اندھے مالک نے آنکھیں پونچھ کر کہا ۔" آؤ - بھگوان - جگہ کس کی ہے ؟ گھر کس کا ہے ؟ آؤ اندر آؤ ۔"

بوڑھا اندر چلا آیا ۔

اندھے نے کہا ۔" ساتھ والے کمرے میں بٹھا دو - رجنی وہاں چارپائی بھی ہے - سب کچھ ہے ۔"

اور پھر مالک نے کہا - " رجنی ۔"

رجنی نے کہا - " ہاں پتی دیو سمجھ گئی ۔"

بوڑھے نے عجیب بات دیکھ لی - مالک اندھا - اور مالکن خوبصورت - اس نے دل میں سوچا - " کتنی عجیب بات ہے - اس نے شادی کیوں کی - کب کی ؟ کس نے کرائی ؟ ایک طرف بدصورتی ہے - بھیانک اندھکار ہے - خاموشیاں ہیں محبت کی بجھی ہوئی آگ ہے - اور دوسری طرف حسن ہے - سرتا ہے - محبت کی ابھری ہوئی دنیا ہے کتنی عجیب بات ہے - مالک اندھا اور مالکن خوبصورت ۔"

رجنی نے آگ جلائی اور چاء پکائی ۔

اور جب چاء کی پیالی لے کر بوڑھے کے پاس گئی ۔

تو بوڑھے نے آہستہ سے کہا ۔" یہ تمہارا سوامی ہے کیا ؟

رجنی نے زمین کی طرف دیکھ کر اور چاء کی پیالی تپائی پر رکھتے ہوئے کہا ۔" ہاں "۔

بوڑھے نے کہا ۔" اس کی آنکھیں کب خراب ہوئی تھیں ؟ "

رجنی نے آہستہ سے کہا - " رام جانے ۔"

تب بوڑھے نے کہا ۔" میں ڈاکٹر ہوں - جڑی بوٹیوں کا ماہر - اگر مجھے معلوم ہو سکا - کہ اس کی آنکھیں کب اور کیسے خراب ہو گئی ہیں ـــ تو شاید ـــ "

رجنی نے چونک کر پوچھا ۔" تو کیا ؟ ـــ ٹھیک کر سکیں گے آپ ؟ "

بوڑھے نے مسکرا کر کہا - ہاں ـــ شاید کر سکوں گا ۔"

رجنی نے کہا ۔" میں سوامی سے پوچھتی ہوں ۔ "

اندھے نے کہا ۔" یہ بات نہ پوچھو رجنی - سنو گی - تو دکھ ہوگا ۔"

رجنی نے بے تابی سے کہا ۔" نہیں کہدو مجھے - وہ آپ کی آنکھیں ٹھیک کر دینگے ۔"

اندھے نے اچھل کر کہا - " سچ ؟ "

رجنی نے کہا - " ہاں ـــ کہو نا ـــ "

اندھے نے کہا ۔" میں جنم سے اندھا نہیں تھا - بعد میں اندھا ہو گیا - میں ان دنوں نوجوان تھا - شباب کا زمانہ تھا - میرے عادات خراب ہو گئے - شراب - بدکاری - جوا - سب کچھ کر لیا کرتا تھا - رجنی - اس سے آگے نہ پوچھو ۔"

رجنی نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا - اور کہا - " پھر ـــ ؟ "

اندھے نے کہا ۔" دکھ ہوگا تمہیں - تم مجھ سے نفرت کرو گی - مجھے دھتکارو گی - اس لئے مت پوچھو ۔"

رجنی نے کہا ۔" نہیں سوامی - میں ہندو استری ہوں - آپ شاید بھول گئے ہیں - جوانی میں سب کچھ کر لیا جاتا ہے ۔"

اندھے نے خاموشی سے اپنی نابینا آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا - صرف دیکھا - کہا کچھ نہیں -

رجنی نے کہا - " کہو نا ـــ سوامی ۔"

اندھے نے کہا ۔" ان دنوں میں ایک عورت سے پیار کرتا تھا - وہ بہت حسین تھی - میں نے اس پر اپنا سب کچھ نثار کر دیا - لیکن رجنی ـــ عورت بھی کتنی ذلیل ہو سکتی ہے - وہ جسے میں ـــ اپنی سمجھ رہا تھا - میری نہیں تھی - کسی اور کی تھی - کسی اور کی ـــ جسے وہ چاہتی تھی ۔"

رجنی نے کہا - " اور پھر ـــ "

اندھے نے کہا ۔" پھر کیا ـــ ایک دن اس نے میرا اثاثہ ختم ہوتے دیکھ کر مجھے بے حد شراب پلائی - میں نے محبت میں جھوم جھوم کر پی لی - لیکن جب گھر پہنچا - تو مجھے محسوس ہوا - جیسے میری آنکھوں کا نور لحظہ بہ لحظہ رخصت ہو رہا ہے - ـــ ہمیشہ کے لئے ـــ اور آج تم دیکھتی ہو - میں اندھا ہوں ۔"

رجنی نے سرد آہ بھر کر کہا ۔" اوہ ـــ کتنی ذلیل تھی وہ عورت - سب کچھ چھین کر اسے آپ کی آنکھیں

چھینتے ہوئے بھی رحم نہیں آیا - دیا نہیں آئی - کتنی ذلالت
کتنی کمینگی - کتنی شیطنت - "

اندھے نے کہا - " اس میں اس کا قصور نہیں تھا رجنی -
میرا ہی تھا - کسی پرائی استری کو پیار کی نگاہوں سے دیکھنا
کیا تم جرم نہیں سمجھتی ہو ؟ "

رجنی نے کہا - " ہاں لیکن مردوں کے لئے نہیں - مرد
آزاد ہیں - جو چاہیں کر سکتے ہیں - "

اندھے نے گرج کر کہا - " غلط --- رجنی غلط "

بوڑھے ڈاکٹر نے روٹی کا لقمہ منہ میں ڈالتے ہوئے
کہا - " اچھی بات ہے - میں کوشش کروں گا - "

رجنی نے کہا - " آپ کا شکریہ - عمر بھر آپ کا احسان
مانوں گی - "

ڈاکٹر نے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر آہستہ سے
کہا - " ٹھیک کرنے کی قیمت بہت زیادہ ہے رجنی ---
تم دے سکو گی --- ؟ "

رجنی نے کہا - " میرے پاس جو کچھ ہے - وہ تم لے لو
یہ مکان - یہ باغیچہ - یہ سامان - سب کچھ تمہارا ہوگا - صرف
میرے سوامی کی آنکھیں بنا دو - تاکہ وہ مجھے دیکھ سکیں -
اور میں انہیں دیکھ سکوں - "

ڈاکٹر نے کہا - " مجھے مکان کی ضرورت نہیں - باغیچے
کی بھی نہیں - سامان کی بھی نہیں - روپے پیسے کی بھی نہیں -
سمجھ گئی ؟ --- "

رجنی نے اس کی طرف دیکھا - ڈاکٹر للچائی ہوئی نظروں
سے رجنی کو دیکھ رہا تھا - دیکھ رہا تھا اس کا گلابی چہرہ - دیکھ
رہا تھا اس کے ہونٹوں کی ملاحت - دیکھ رہا تھا اس کا ابھرا
ہوا سینہ - دیکھ رہا تھا اس کے شباب کا حسن - اور اس
حسن کی اچھوتی مستی - "

پھر اس نے آہستہ سے کہا - " رجنی ! "

رجنی نے آنسو بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ کر
کہا - " ہاں ڈاکٹر "

ڈاکٹر نے کہا - " دے سکو گی قیمت ؟ "

رجنی نے آہستہ سے کہا --- " ہاں "

ڈاکٹر نے ہاتھ دھوتے ہوئے کہا - " تب میں ایک
ہفتے کے بعد پھر آؤں گا - سارا سامان لے کر --- اور پھر
ٹھیک کر دوں گا - تمہارے سوامی کی آنکھیں --- "

رجنی نے اسی طرح سے کہا - " اچھا "

ڈاکٹر نے اٹھ کر اپنے بیگ سے ایک سفید رنگ کا
چھوٹا سا پھول نکالا - اور اسے رجنی کو پیش کرتے ہوئے کہا -
--- " یہ لو - "

رجنی نے اپنا منہ دوسری طرف پھیرتے ہوئے داہنے
ہاتھ سے پھول لے لیا - اور باہر چلی آئی -

دوسرے دن مالک نے کہا - " رجنی --- مجھے معلوم ہوتا
ہے - تم کل سے اداس ہو - کیا ٹھیک ہے یہ بات ؟ "

رجنی نے مضبوطی سے کہا - " نہیں - کیسے معلوم ہوا
آپ کو --- یونہی --- "

اندھے نے کہا - " میری آنکھیں نہیں ہیں گو --- لیکن
رجنی --- میں دیکھ سکتا ہوں - جو کچھ میرے اردگرد ہو رہا
ہے - وہ سب ! "

رجنی خاموش رہی ---

اندھا مالک دیوار کا سہارا لیتا ہوا اس کے پاس آگیا -
اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے کہا - " رجنی !
تمہارا چہرہ اترا ہوا ہے - تم اداس ہو - پر کیوں ؟ کہو ! "

رجنی نے ہنس کر کہا - " کچھ بھی نہیں - آپ یہ کیسی باتیں
کر رہے ہیں ؟ "

اندھے نے کہا - " تمہیں میری قسم ! آج تم مسکراتی کیوں
نہیں - گنگناتی کیوں نہیں - وہ پیار کی باتیں - وہ ہندو استری
کا اصول - وہ چہل پہل آج کہاں گئی ؟ "

رجنی پھر بھی نہیں بولی ---

اور اندھے نے پھر کہا - " کہہ دو رجنی ! تمہیں میری قسم
کہہ دو مجھے --- ! "

رجنی نے کہا - " کل وہ ڈاکٹر آیا تھا نا --- "

اندھے نے چونک کر اپنا سر اوپر اٹھایا - اور کہا ---

"ہاں تو ـــ"

رجنی نے کہا۔ "وہ آپ کی آنکھیں ٹھیک کر دیگا ـــ لیکن ـــ"

اندھے نے پوچھا "لیکن کیا ـــ تم نہیں چاہتیں میری آنکھیں ٹھیک ہو جائیں؟"

رجنی نے تنگ ہو کر کہا۔ "یہ بات نہیں ـــ وہ اُجرت بہت مانگتا ہے۔"

اندھے نے کہا۔ "اُجرت؟ کتنی ایک ـــ ؟"

رجنی نے کہا ـــ "بہت ـــ بہت زیادہ ـــ"

اندھے نے کہا۔ "تو فکر ہی کیا ہے۔ میری آنکھیں ٹھیک ہو جائیں گی۔ تو سب چکا دُونگا۔"

رجنی جیسے کوئی بات کہنی چاہتی ہو۔ لیکن کہی نہیں ـــ آہستہ سے بولی۔ "وہ روپیہ پیسہ نہیں مانگتا۔"

اندھے نے حیران ہو کر پوچھا۔ "روپے پیسے نہیں؟ تو کیا مکان؟"

رجنی نے کہا "نہیں مکان بھی نہیں۔"

اندھے نے اور حیران ہو کر پوچھا "مکان بھی نہیں۔ تو کیا باغیچہ؟"

رجنی نے کہا "نہیں ـــ باغیچہ بھی نہیں شاید!"

اندھے نے اپنا سر اوپر اُونچا اُٹھایا۔ اور کہا۔ "پھر کیا؟"

رجنی نے آہستہ سے کہا۔ "نہ جانے کیا۔ میں خود بھی حیران ہوں۔"

اندھے نے دھیمی آواز میں پوچھا۔ "اُس نے کچھ مانگا بھی۔ زبان سے کچھ کہا بھی!"

رجنی پہلے خاموش رہی۔ تب بولی ـــ "نہیں"۔

اندھے نے دیوار کا سہارا لے کر اُٹھتے ہوئے کہا ـــ "سمجھا"

اور کمرے میں پہنچ کر اُس نے سوچا "رجنی! ڈاکٹر نے جو کچھ تم سے مانگا ہے۔ کیا تم اُسے دے دو گی؟ کیا تم وہ اُسے دینے کو تیار ہو۔ میری آنکھوں کے لئے ـــ میری بصارت کے لئے ـــ رجنی! تم میرے پاپ کو دوگنا کیوں کرنے لگی ہو ـــ کیوں تم ـــ لیکن میں اندھا ہوں۔ میں تمہیں کیا کر سکتا ہوں۔ آنکھیں ہوتے ہوئے میں اپنا پاپ نہیں روک سکا۔ اندھا ہو کر تمہارا پاپ کیسے روک سکونگا۔ لیکن رجنی! سوچ لو۔ بھُول نہ جانا۔ مجھے ایسی بصارت کی ضرورت نہیں۔ جو تمہاری انمول قیمت دینے پر مجھے مل سکے۔ تمہاری سب سے بڑی قربانی کرنے پر۔ سب سے بڑا بلیدان کرنے پر۔ آہ رجنی! غریبی بھی کتنا بڑا گناہ ہے ـــ اور غریب ہوتے ہوئے حسین ہونا کتنا بڑا گناہ ہے۔ حسین ہو کر کمزور ہونا کتنا بڑا گناہ ـــ"

اور اُدھر رجنی نے اپنے من میں سوچ لیا ـــ "میں نے سوامی سے یہ بات کہہ ہی کیوں دی ـــ وہ سمجھ گئے ہونگے۔ ان کی آنکھیں نہیں ہیں ـــ تو کیا ہُوا ـــ اُن کا پریم میرے ساتھ ہے۔ میں کتنی ذلیل عورت ہوں۔ اپنے مرد سے دھوکہ کرتی ہوں۔ وہ چیز جس پر اُن کا اور صرف اُن کا ہی حق ہے۔ دُوسرے ایک غیر شخص کے ہاتھ میں دیتی ہوں۔ یہ کتنا بڑا پاپ ہے۔ اس طرح سے ملی ہوئی آنکھوں سے کیا مجھے پیار ملیگا۔ کیا میں اُن میں پھر آج کی طرح محبت کا طوفان موجزن دیکھ سکوں گی۔ کیا وہ راحت۔ وہ کیفیت۔ وہ سرلتا جو اُن کی بند آنکھوں سے آج مل رہی ہے۔ کھُلنے پر ملیگی ـــ نہیں ـــ نہیں ملیگی ـــ یقیناً نہیں ملیگی۔ اور ملنی بھی نہیں چاہئے۔ میرا ضمیر مجھے وہ بہار لُوٹنے نہیں دیگا۔ سدا ہی نفرت کرتا رہیگا۔ لیکن کیا میں سوامی کے لئے۔ اُن کے سُکھ کے لئے بلیدان نہ کر سکوں گی ـــ؟ اتنا بھی جو عورت نہ کر سکے۔ کیا وہ عورت کہلا سکتی ہے؟"

ڈاکٹر نے مغموم حالت میں کہا۔ "مجھے معلوم نہ تھا ـــ کُسُم ـــ"

بیوی نے سر جھکا کر کہا۔ "برادری میں ہم مُنہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔ کُسُم نے ہماری ناک کٹوا دی ـــ"

ڈاکٹر چُپ ہو گیا ـــ اور بیوی نے پھر کہا "میں نے کہا نہ تھا۔ کہ انگریزی تعلیم سے لڑکیاں خراب ہو جاتی ہیں ـــ وہ شرم ـــ وہ حیا ـــ وہ طرز تمدن سب کچھ چلا جاتا ہے"

ڈاکٹر نے آہستہ سے کہا۔ "اگر مجھے یہ بات معلوم ہوتی۔ تو میں پہلے دن ہی ایک معمولی دوا سے کُسُم کا خاتمہ کر دیتا۔ تاکہ آج یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا ـــ"

بیوی نے چونک کر کہا۔ "اوہ!"

ڈاکٹر نے کہا ۔۔۔ "ہاں ۔۔۔ جو لڑکی خاندان کی لاج کو قربان کر کے پرائے شخص سے محبت کرنے لگے۔ اُسے ختم ہی کرنا چاہئے۔ اُس کا زندہ رہنا بدنامی کی آگ کو روشن رکھتا ہے۔"

بیوی نے کہا۔ "لیکن اس میں کُسم کا کیا قصور ۔۔۔ قصور تو اُسی کالجئیٹ کا ہے جس نے ۔۔۔۔۔۔"

ڈاکٹر نے گرج کر کہا۔ "غلط۔ بالکل غلط۔ کُسم راغب نہ ہوتی۔ تو کالجئیٹ میں محبت کی بات کرنے کی ہمت نہ پڑتی ۔۔۔"

بیوی نے کہا۔ "اب ہمیں یہ مکان چھوڑنا پڑیگا۔ کہیں اور جانا پڑیگا۔ کسی اور دیس میں ۔۔۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "لیکن کب تک؟"

بیوی نے کہا۔ "جب تک یہ آگ بجھ نجائے ۔۔۔ بدنامی کی بھڑکی ہوئی آگ!"

ڈاکٹر نے با دلِ ناخواستہ آہستہ سے کہا۔ "اچھا"

اور دوسرے دن جب سامان یکوں پہ بندھنے لگا۔ تو ڈاکٹر اپنا بیگ لے کر باہر نکلے۔ نوکر چاکر اور بیوی سامان ٹھیک طرح سے بندھوانے میں مصروف تھے۔ ڈاکٹر یکے کی دُوسری طرف سڑک کے کنارے بیٹھ گئے۔ سوچنے لگے۔ کیسی عجیب دُنیا ہے۔ مرد کو کوئی پُوچھتا نہیں۔ عورتوں پر ہی سب گرجتے ہیں۔ مرد بھی کتنے ذلیل ہیں۔ کتنے کمینے۔ کتنے بدمعاش۔ کتنے خود غرض۔ اوروں کی لاج کے لُٹیرے۔ چند روزہ حُسن کے پرستار۔ پوست کی سفیدی کے عاشق ذلیل کتنے!"

اور اسی وقت اُنہیں رجنی یاد آگئی۔

اُن کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ سوچنے لگے۔ "میں بھی کتنا ذلیل ہوں۔ جوانی کی حد کو پھاند کر بڑھاپے میں آگیا ہوں۔ پھر بھی کتنا ذلیل ہوں۔ کتنا کمینہ۔ اُس نے رات کو ٹھہرنے کی جگہ دی محبت سے کھانا کھلایا۔ اور میں ۔۔۔ میں نے اُسے کہا "تم میری اُجرت دے سکوگی۔" آہ! ذلیل ڈاکٹر ۔۔۔ لیکن رجنی ۔۔۔ رجنی! تم دیوی ہو ۔۔۔ میں نے پاپ کیا ہے۔ تم معاف کرنا۔ مجھے ایک بار کہہ دینا۔ "میں تمہیں معاف کرتی ہوں۔" میں نے تمہارا پتی پریم سے بھرا ہوا دل ایک ہی لفظ سے توڑ ڈالا۔ تم مجھے معاف کرنا۔ بھول جانا میری بات کو۔ ہاں بھول جانا۔"

اور معاً اُن کے ہاتھ ہاتھ جُڑ گئے۔ آپ ہی آپ۔ اور جھک گیا اُس کا سر زمین کی طرف ۔۔۔ یکے کے نزدیک اُس کی بیوی کھڑی تھی۔ اُس نے یہ حالت دیکھی۔ تو پاس آکر بولی۔ "ڈاکٹر"

ڈاکٹر نے چونک کر کہا۔ "یکہ تیار ہوگیا؟"

بیوی نے آہستہ سے مُسکرا کر کہا۔ "ہاں۔ لیکن آپ کسے نمسکار کرتے تھے؟"

ڈاکٹر نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "رجنی دیوی کو۔"

اندھے نے کہا۔ "دروازے پہ کوئی دستک دے رہا ہے۔ کون ہے۔ ذرا دیکھو تو ۔۔۔؟"

رجنی اُٹھی ۔۔۔ دروازہ کھولا۔

کانپ کر ایک قدم پیچھے ہٹی۔

ڈاکٹر نے زمین کی طرف دیکھ کر کہا۔ "سوامی اندر ہیں؟"

اور اندر سے اندھے نے زور سے کہا۔ "کون ہے رجنی؟"

ڈاکٹر نے اندر داخل ہو کر کہا۔ "سوامی! نمسکار۔"

اندھے نے کہا۔ "کون؟ کون ہو؟"

ڈاکٹر نے کہا۔ "ڈاکٹر"

اندھا بھی جیسے تھرتھرا اُٹھا

اور ڈاکٹر نے کہا۔ "میں سامان لے کر آیا ہوں۔ آج ہی آپ کی آنکھیں ٹھیک کر دُونگا۔"

اندھا خاموش رہا

ڈاکٹر نے پوچھا۔ "آپ خاموش کیوں ہیں۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہئے۔"

اندھے نے کہا۔ "لیکن میں آنکھیں نہیں بنواؤنگا۔ ڈاکٹر آپ کو تکلیف ہوئی ہے۔ مجھے اس کا افسوس ہے۔"

ڈاکٹر کے ہاتھ سے بیگ گر گیا۔ اُس نے چونک کر پوچھا۔ "آنکھیں نہیں بنوائیں گے۔ کیوں؟"

اندھے نے کہا۔ "مرضی۔"

ڈاکٹر اُس کے پاس بیٹھ گیا۔ اور زور سے پکارا۔ "رجنی بیٹی۔"

اندھے نے اپنا سر اوپر اُٹھایا۔ اُس کی نابینا آنکھوں میں جیسے حیرانی بھر گئی۔ اور ڈاکٹر نے پھر پکارا۔ "رجنی بیٹی!"

اندھے نے من ہی من میں کہا۔ "بیٹی!"

رجنی آہستہ آہستہ وہاں آگئی۔ ڈاکٹر نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ "بیٹی۔ سوامی کہتے ہیں۔ میں آنکھیں نہیں بنواؤنگا۔ اس کی وجہ؟"

رجنی خاموش رہی۔

اور اندھے نے کہا۔ "بنواؤنگا۔ اب بنواؤنگا ڈاکٹر۔"

ڈاکٹر نے دیکھا۔ رجنی کے ہاتھ میں وہی سفید پھول ہے۔ جو اس نے ایک ہفتہ پہلے رجنی کو پیش کیا تھا۔ پھول کو دیکھتے ہی ڈاکٹر نے کہا۔ "دے دو مجھے بیٹی۔"

رجنی نے آہستہ سے وہ پھول اس کی طرف پھینک دیا۔

اندھے نے پوچھا — "کیا ہے؟"

رجنی نے کہا — "پتا کی اجرت۔ جو غریب بیٹی انہیں دے سکتی تھی۔"

اور جب اندھے کی آنکھیں بنا کر ڈاکٹر باہر جانے لگا۔ تو دروازے پہ اس نے کہا — "بیٹی! تم مجھے معاف کرنا۔"

رجنی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "پتا! یہ کیا کہہ رہے ہو؟"

ڈاکٹر نے کہا۔ "ہاں۔ ایک بار کہہ دو۔ "میں نے تمہیں معاف کر دیا۔" نہیں تو عمر بھر میرا ضمیر مجھے نفرت کرتا رہیگا۔ مجھے قرار نہیں ملیگا۔ زندگی کا سکھ نہیں ملیگا۔" کہدو ایک بار۔"

رجنی نے آنسو بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اور آہستہ سے کہا۔ "میں نے معاف کر دیا پتا۔"

اور پھر ڈاکٹر چلا گیا ✦

رونق کاشمیری

مرے بغیر

تھا حسن اک حقیقتِ پنہاں مرے بغیر　　جلووں سے اپنے آپ تھا حیراں مرے بغیر

ساکت چمن فضا ہمہ تن خوابِ مستقل　　خاموش کوہ و دشت و بیاباں مرے بغیر

ہستی تمام پرتو تخئیل خود پسند　　عالم تمام خوابِ پریشاں مرے بغیر

کل عالم بسیط پہ بے کیفیوں کا کیف　　کل کائنات سربگریباں مرے بغیر

جوش جنوں نہ شوق و محبت کی کشمکش　　سنساں سارا عالم امکاں مرے بغیر

غنچوں میں نازِ حسن نہ پھولوں میں دلکشی　　محروم زندگی چمنستاں مرے بغیر

سوز و گدازِ عشق سے محروم کائنات　　شیرازۂ حیات پریشاں مرے بغیر

حسن مجاز بے خبرِ لذتِ ستم!　　حیراں مثل دیدۂ حیراں مرے بغیر

میری نظر نے حسن کو مغرور کر دیا
سوز و گدازِ عشق سے معمور کر دیا

تاباںؔ نقوی امروہوی

غزل

یہاں کھڑے مسکرا رہے ہیں، وہاں کھڑے مسکرا رہی ہیں
زہے تقاضائے دلربائی مجھے محبّت سکھا رہی ہیں

اِدھر سے شرما کے جا رہے ہیں، اُدھر سے اِٹھلا کے آ رہی ہیں
ابھی محبّت چھپا رہی تھیں ابھی محبّت جتا رہی ہیں

چمن میں تتلی کی شان سے ہر روش پہ جلوہ دکھا رہی ہیں
شباب کے ولولوں میں ڈوبی ہوئی ادائیں لٹا رہی ہیں

سحر کے ہٹتے ہوئے اندھیرے کا راز ہے اور مری نگاہیں
وہ اپنے چہرے سے رفتہ رفتہ سیاہ چادر ہٹا رہی ہیں

اگر تصوّر نہیں وہی ہیں تو میرے پہلو میں گدگدائیں
یقین مجھ کو ابھی نہیں ہے کہ وہ مرے ساتھ جا رہی ہیں

ہماری یکجائیوں پہ "فرقت نصیب" آپس میں کہہ رہی ہیں
"ابھی مصیبت نہیں پڑی ہے، فریب آغاز کھا رہی ہیں"

بنے ہوئے روحِ شعر و نغمہ، بصد ادائے نظر نوازی
وہ زیرِ رخسار ہاتھ رکھے مری غزل گنگنا رہی ہیں

وہ تو ا کہ جس نے مرے تخیّل پہ اپنا نقشہ جما لیا ہے
مجھے سمجھ کر وہ میری تصویر کو مخاطب بنا رہی ہیں

وہی نتیجہ کہ جس سے میں ابتدائے الفت میں کانپتا تھا
یہ الجھنیں ہیں کہ آج وہ بھی اُسی نتیجہ پہ آ رہی ہیں

کوئی تو پرسانِ حال پوچھے کہ یہ ٹھہر کر جواب کیسے
کوئی تو سوچے کہ ہوش میں ہم کہاں سے رک رک کے کچھ کئے آ رہی ہیں

غمِ جدائی چھپا کے دنیا سے ایک آفت خرید لی ہے
کسی کو میں کچھ بتا رہا ہوں کسی کو وہ کچھ بتا رہی ہیں

جو ہم کو اے شادؔ پیش آتے ہیں روز دنیائے آرزو میں
تمہیں بھی وہ واقعاتِ پُر لطف جستہ جستہ سنا رہے ہیں

شادؔ عارفی

اعجاز

"گزرے ہوئے وقتوں میں ــــ کئی برس کی بات ہے ــــ روڈنوالڈ کی بلند اور رفیع پہاڑیوں کی چوٹی پر۔ جو بالائی جرمنی کا ایک غیر آباد مگر رومانی قطعہ ہے۔ اور جہاں سے دریائے رائین اور مین کے اتصال کا مقام دُور نہیں۔ بیرن ورن لینڈ شارٹ کا ایک چھوٹا سا قلعہ تھا۔ جو اب وقت کے بے پناہ حملوں کی تاب نہ لاتے ہوئے مٹی کا ایک ڈھیر بن چکا ہے۔ جسے صنوبر اور شاہ بلوط کے لمبے لمبے اشجار ڈھانپے ہوئے ہیں۔ تاہم قلعہ کا بلند گھنٹہ گھر اب بھی اُسی طرح اپنے گزرے ہوئے مالکوں کی مانند فخر سے سر اُٹھائے ہوئے دکھائی دے رہا ہے۔

بیرن خاندانِ بوگن کی ایک خشک شاخ تھا۔ جسے ورثہ بہ ورثہ قدیمی جائداد اور دیگر خاندانی تحائف حصہ میں ملے تھے۔ وہ اپنے خاندان کی ایک ہی نشانی تھا۔ اُن کی عزت اور بہادری کا نشان۔ عزت اور بہادری جو اس کے خاندان کا جوہر تھا۔ اگرچہ اُس کے آباؤ اجداد نے بہت سی جائداد صرف اسی بہادری اور عزت کے لئے قربان کر دی تھی۔ تاہم بیرن لینڈ شارٹ پیشتر کی مانند ہی اپنی شان کو برقرار رکھے ہوئے تھا۔ اب جرمنی میں امن و امان کا زمانہ تھا۔ اور جرمن بہادر اپنے پہاڑی قلعوں کو جو شاہین کے پہاڑی گھونسلوں سے مشابہ تھے۔ چھوڑتے ہوئے۔ نیچے میدانوں میں آرام دہ مکانات تعمیر کرتے ہوئے رہائش پذیر ہو گئے تھے۔ مگر بیرن ابھی تک اُن سب سے اُوپر اپنے قدیمی قلعہ میں ہی مقیم تھا۔ وجہ یہ تھی۔ کہ اُس کے آباؤ اجداد کا ایک ہمسایہ امیر سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ اور سلسلہ رقابت بدستور قائم تھا۔

بیرن کی اولاد صرف ایک بیٹی تھی۔ شاید آپ اس سے اتفاق کریں۔ کہ قدرت جب کسی کو صرف ایک ہی بچہ عطا کرتی ہے۔ تو اُسے ہمیشہ ایک عجوبہ اور قابل فخر جوہر سے معمور کر دیا کرتی ہے۔ بس یہی مثال بیرن کی بچی پر صادق آتی تھی۔ کھلائیوں اور اناؤں نے بیرن کو واثق یقین دلایا تھا۔ کہ تمام جرمنی بھر میں اُس کی بیٹی کا حسن میں کوئی ثانی نہیں۔ اور اُن سے بہتر ایسے امور کو دُوسرا کون جان سکتا تھا۔ اُس کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا انتظام اُس کی دو خالاؤں کے سپرد کر دیا گیا۔ اور اُن کی تعلیم کا یہ اثر ہوا۔ کہ اٹھارہ برس کی عمر میں وہ ایک سلیقہ شعار اور باسمجھ لڑکی بن گئی ــ جو امرا کے گھروں میں شاذ و نادر ہی ظہور میں آتا ہے۔ اس نے اب تک تمام بزرگانِ دین کی سوانح عمریاں ختم کر لی تھیں۔ اور اُس کی قوت بیان اس قدر مؤثر ہو گئی تھی۔ کہ جب وہ کسی بزرگ دین کے سوانح کا تذکرہ کرتی۔ تو سامعین یوں محسوس کرتے۔ کہ جیسے واقعہ کے تمام کردار اُن کے سامنے ہیں۔ کلیساؤں کی کہانیاں اُسے ازبر یاد تھیں۔ جرمنی کے مشہور شاعر رزم و انقلاب کے اشعار بھی تمام کے تمام اُس کے دماغ میں محفوظ ہو چکے تھے۔ کتابت نہایت صاف ستھری تھی۔ حتیٰ کہ اُس کی خالائیں اُسے بغیر چشموں کے پڑھ سکتی تھیں۔ یہی نہیں۔ بلکہ بہت سے نسوانی گیت بھی خود اُس کے قلم سے نکل چکے تھے۔ وہ وقت کے لحاظ سے بہترین رقص کر سکتی تھی۔ بربط بجا سکتی تھی۔ اور گا بھی سکتی تھی۔ غرضکہ ہر طرح ایک قابل دوشیزہ بن چکی تھی۔

خالائیں جو اپنے عہد شباب میں اسی کی مانند حسین اور نازک ادا رہی تھیں۔ یقیناً اپنی بھانجی پر ایک بہتر محافظ تھیں یہ ایک مسلم امر ہے۔ کہ درباری یا شاہی اناؤں کے مقابلہ میں دیگر انائیں کسی طرح سخت اور بہتر محافظ ثابت نہیں ہو سکتیں۔ چونکہ یہ خالائیں نہ صرف شاہی خاندان سے تھیں۔ بلکہ شاہی دربار میں گورنس بھی رہ چکی تھیں۔ اس لئے ہر حالت میں بہتر تعلیم دے سکتی تھیں۔ مختصر یہ کہ شہزادی نہ تو کبھی اُن

کی نظروں سے اوجھل ہوتی۔ اور نہ ہی قلعہ کی چہار دیواری سے باہر جا سکتی۔ جب تک کہ وہ اس کے ہمراہ نہ ہوں۔ عمر کی ترقی کے ساتھ اُسے فرمانبرداری اور صحت چلن کے کڑے اصولوں سے آگاہ کرتے رہنا۔ اُن کا فرضِ اولیں تھا۔ اور مردوں کے بارے میں ۔ پَیش ـــــ اُسے انہیں اتنی دُور سے دیکھنے کی تعلیم دی گئی تھی۔ کہ نظر بھی نہ آ سکیں۔ اور پھر ایسی لاپرواہی کے ساتھ۔ کہ وہ کسی طرح آزار نہ ہو جائے ـــــ اُف چاہے دُنیا کا حسین تریں بہادر اُس کے قدموں میں دم ہی کیوں نہ توڑ رہا ہو ۞

بھولی بھالی شہزادی اُن کی اس تعلیم کا اثر قبول کرتے ہوئے صحتِ چلن اور فرمانبرداری میں ایک بے مثال ہستی بن گئی جب کہ دُنیا کی دیگر حسین عورتیں اس پُر نور اور رومان بھرے سنسار میں اپنی حیات کی خبر یئی کو بے فائدہ ضائع کر رہی تھیں۔ اور اُن کی حالت اُس شگفتہ پھول کی مانند تھی۔ جسے ہر بے خطر ہاتھ اُچک کر توڑتا ہے۔ اور اپنی رُوح کو چند ساعت تسکین دے کر پھینک دے۔ بیرن کی لختِ جگر اطمینان سے اُس شگفتہ شگوفہ کی مانند کھلتی چلی جا رہی تھی۔ جو کانٹوں کی حفاظت میں دستِ گلچیں سے محفوظ ہو۔ یعنی اپنی آناؤں کی حفاظت میں رس بھری اور مدہوش کُن جوانی کی روشوں کی طرف بے خطر قدم بڑھاتے چلی جا رہی تھی۔ اور اُس کی اس حالت کو دیکھ کر اُس کی خالائیں خوشی سے پھُولی نہ سمائیں۔ کہ چاہے دُنیا کی تمام عورتیں نسوانی شرم و حیا اور چلن کی قیود کو توڑ دیں۔ مگر بیرن لینڈ شارٹ کی دُختر اور خاندان بوگن کی دارثہ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا ۞

بیرن لینڈ شارٹ کی اولاد گو نہایت مختصر تھی۔ مگر اُس کا گھرانا دیگر امرا سے کسی طرح مختصر نہ تھا۔ کیونکہ اس کی دُور اندیشی اور جوہر ہمدردی نے اُسے تمام کے تمام عزیز و اقارب میں ہر دلعزیز کرتے ہوئے اُن کی محبت سے مالا مال کر رکھا تھا۔ ان رشتہ داروں میں اوّل سے لے کر آخیر تک تمام کے تمام بیرن کے لئے وہی محبت رکھتے تھے۔ جو عزیب اکثر رکھا کرتے ہیں۔ ہر دو طرف سلوک و محبّت قابل قدر تھی۔ اس لئے ہر تقریب اور خوشی کے موقع پر وہ سب بیرن کے ہاں جمع ہو جایا کرتے۔ اور ان تمام تقاریب کے اخراجات صرف بیرن ہی برداشت کرتا۔ اور ان مجلسوں پر جب ان کی ارواح مسرّت سے معمور ہو جاتیں۔ تو اکثر ہر ایک کی زبان سے یہی نکلتا۔ کہ ان دعوتوں اور مجلسوں سے بڑھ کر دُنیا کی اور کوئی شے رُوح پرور اور سرُور کُن نہیں ۞

بیرن اگرچہ ایک معمولی امیر تھا۔ تاہم اُس کا دل غیر معمولی سخاوت اور فراخدلی سے لبریز تھا۔ اور اس امر کو محسوس کرتے ہوئے کہ وہ اپنی گرد و نواح کی ننھی سی دُنیا میں سب سے معزز ہمدرد اور قابل فخر ہستی تصوّر کیا جاتا ہے۔ اُس کی رُوح کو ایک غیر معمولی خوشی اور مسرّت حاصل ہوتی۔ گزرے وقت کے بہادر مجاہدوں اور جنگجوؤں کی رزمیہ حیات کی داستانیں سنانے میں۔ جن میں سے بعض کی تصاویر اُس کے ایوانِ قلعہ کی دیواروں پر آویزاں حاضرین پر جائزہ خیز نظریں ڈالتی تھیں۔ اُسے بے پایاں خوشی ہوتی تھی۔ اور پھر اُس کے سامعین سے زیادہ بہتر طور پر سماعت کرتے ہوئے اُن کی قدر بھی کوئی نہ کر سکتا تھا ۞

کہانیاں جن کا تعلق ارواح سے تھا۔ اور جو گزرے زمانہ میں جرمنوں کے خیال کے مطابق انہی وادیوں اور پہاڑیوں میں مقیم رہا کرتی تھیں۔ اُن پر اُسے کامل یقین تھا۔ اُس کے اقربا اور عزیزوں کا یقین اُس سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر تھا۔ کیونکہ اکثر وہ ان کہانیوں کو کمال تعجّب سے آنکھیں پھاڑے اور بچّوں کی مانند حیرت سے مُنہ کھولے سُنا کرتے تھے۔ چاہے ایک ہی داستان ہزار مرتبہ کیوں نہ دُہرائی جائے۔ یہ تھا بیرن کی حیات کا ایک مدھم سا نقشہ۔ بیرن جو اپنے عزیز و اقارب کا سردار اور ایک چھوٹی سی ریاست کا نواب تھا۔ سب سے بڑی خوشی اُسے اس بات کی تھی۔ کہ وہ مذکورہ افراد کے دائرہ میں زمانہ کا عاقل تریں انسان گردانا جاتا تھا ۞

جس موقع سے اس کہانی کو لگاؤ ہے۔ اس وقت بیرن کے قلعہ میں ایک غیر معمولی اور ذی شان خاندانی تقریب کی تیاریاں جاری تھیں۔ یعنی اس دن بیرن کے ہونے والے داماد یا اُس کی بیٹی کے ہونے والے شوہر کا خیر مقدم کیا جانے والا تھا۔ بیرن اور بوریا کے ایک معزز سردار کے درمیان

اپنی اولاد کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کرتے ہوئے ۔ دو خاندانوں کے ارتباط اور محبت کو مستحکم کرنے کے لئے بیشتر گفتگو ہو چکی تھی ۔ اور افتتاحی رسومات کمال احتیاط اور محنت سے سرانجام دی جا چکی تھیں ۔ اور اب صرف نوجوان جوڑے کو بغیر ایک دوسرے کی دید اور ملاقات کے ازدواجی رشتہ میں جکڑ دینا باقی تھا ۔ شادی کے مراسم کا وقت معیّن ہو چکا تھا ۔ نوجوان کاؤنٹ وان ایلٹن برگ بھی اسی لئے فوج سے رخصت پر بلا لیا گیا تھا ۔ اور اس وقت وہ منزل مقصود کی طرف اپنی دلہن کو لینے کے لئے گامزن بھی ہو چکا تھا ۔ کیونکہ ورٹز برگ سے اس نے پیام بھیجتے ہوئے اپنی آمد کا وقت تک بھی بتا دیا تھا +

اس لئے قلعہ اب اُس کے استقبال کی تیاریوں کی وجہ سے پیشتر سے زیادہ پُر شور ہو گیا تھا ۔ دلہن کو موقع اور وقت کا لحاظ رکھتے ہوئے غسل دلانے اور ملبوس کرنے کا انتظام دو نو خالاؤں کے سپرد تھا ۔ وہ بے چاری تو اُسے غسل دینے کے بعد لباس عروس پر اختلاف رائے کے باعث جھگڑتی ہی رہیں ۔ اُدھر دلہن نے موقع غنیمت سمجھ کر اپنی مرضی کے مطابق اپنے آپ کو ملبوس بھی کر لیا ۔ اور ایسے دیدہ زیب کپڑوں میں جو سے ایک سماوی حُور کی مانند سجا دیں ۔ اور ـــــ کسی کے انتظار نے تو اُسے اور بھی دلفریب اور حسین بنا دیا تھا ۔ اُس کے چہرے درگول گردن کی چمک ۔ سینہ کا لطیف اُتار چڑھاؤ ۔ آنکھوں کا برمعمولی نور ۔ آنکھیں جو کسی کے خیال سے متوالی اور مست ہو رہی تھیں ۔ یہ سب کچھ اُس راز پنہاں کو آشکار کر رہا تھا ۔ جو س کے گداز سینے میں دھڑکتے ہوئے قلب میں پوشیدہ رکھا تھا ۔ س کی خالائیں اُس کے گرد پروانہ کی طرح رقص کرتی پھر رہی تھیں ۔ ونکہ شاید اُن کی دلچسپی کے لئے یہ سب سے بہترین موقع تھا ۔ ہر مرتبہ ن کا موضوع گفتگو اُس سے یہی ہوتا ۔ کہ اُسے آنے والی ہستی سے یا سلوک کرنا چاہئے ۔ اُس کو کیونکر خیر مقدم کہنا چاہئے ۔ اُس سے ذکر اور کیسی گفتگو کرے ـــــ اور ـــــ وغیرہ وغیرہ ✣

بیرن بھی بذاتِ خود ان دلچسپیوں میں کچھ کم حصہ نہ لے رہا ۔ اگرچہ خود اس کے کرنے کا تو کوئی کام ہو ہی نہ سکتا تھا ۔ تاہم لر وہ ایک کاہل انسان تھا ۔ اس لئے وہ اُس وقت خاموش رہ سکتا تھا ۔ جب کہ دوسرے کام میں مشغول ہوں ۔ اس لئے جگہ بجگہ پھرتے ہوئے نوکروں کو محنت سے اور دل لگا کر کام کرنے کی فہمائش کرتا پھرتا ۔ موسم گرما میں کبھی آپ نے نیلی مکھیوں کو عجلت کے ساتھ اِدھر اُدھر اُڑتے دیکھا ہوگا ۔ بس اس کی حالت اُن کے کردار کے مصداق تھی +

اس دوران میں ایک فربہ بچھڑا ذبح کر لیا گیا تھا ۔ اور دوسری طرف تمام جنگل شکاریوں کے شور بے پناہ سے گونج رہا تھا ۔ رسوئی خانہ میں خوب چہل پہل تھی ۔ شراب کے کنٹروں سے انواع و اقسام کی شراب چھوٹے برتنوں میں اُنڈیلی جا رہی تھی ۔ ہائیڈل برگ کی مشہور شراب کے مٹکے کا بھی مُنہ کھول دیا گیا تھا یعنی جرمن مہمانداری کے لحاظ سے جو جرمنی زبان میں ساس براس کہلاتی ہے ۔ ہر شے مہمان کے استقبال کے لئے بے چین نظر آتی تھی ـــــ مگر مہمان کی آمد میں دیر ہوتی چلی جا رہی تھی ۔ شاہ خاور اپنی شعاؤں کو روڈن وال کے دلفریب جنگل پر ڈالنے کے بعد اب پہاڑیوں کی چوٹی پر جا پہنچا تھا ۔ بیرن بیچارہ انتظار میں قلعہ کے بلند مینار پر کھڑا آنکھیں پھاڑے راہ تک رہا تھا ۔ ایک مرتبہ اُس نے خیال کیا ۔ کہ اُس کی نظروں نے کس کو دیکھا ۔ مگر جنگلوں کی وادی سے ٹکراتی ہوئی بازگشت صداؤں کے سوا وہاں کچھ بھی نہ تھا ۔ تھوڑے عرصہ بعد دوبارہ اُس نے شاہسواروں کی ایک جماعت کو دُور پستی کی جانب سڑک پر آتے دیکھا ۔ مگر وہ بھی پہاڑی کے دامن میں پہنچ کر دوسری جانب مُڑ گئے ۔ وہ انتظار میں برابر کھڑا رہا ۔ حتیٰ کہ سورج کی آخری کرن بھی روپوش ہو گئی ۔ اور چمگادڑیں اِدھر اُدھر اُڑنے لگیں ۔ آہستہ آہستہ سڑک نظر کے سامنے مدھم اور اندھیری ہوتی چلی گئی ۔ اب کوئی متنفس بھی اُس پر گامزن دکھائی نہ دیتا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سوائے کسی کسان کے جو تمام دن کی محنت شاقہ کے بعد اپنے گھر کی طرف آہستہ آہستہ ڈگمگاتے ہوئے قدم اُٹھاتا چلا آ رہا ہو ✣

اِدھر جب قلعہ میں یہ حالت تھی ۔ تو دوسری طرف اس سے بھی عجیب واقعہ رونما ہو رہا تھا ۔

نوجوان کاؤنٹ وان ایلٹن برگ ایک عجیب انتشار کی حالت میں اپنا راستہ سُرعت سے کاٹتا ہوا منزل مقصود کی طرف چلا آ رہا تھا ۔ بالکل اُسی انسان ایسی بے صبری کے ساتھ جسے اُس کے عزیزوں نے اُس کی دلہن کے ساتھ کورٹ شپ کا بھی دقعہ نہ

دیا ہو - اور اب وہ دُلہن کو دیکھنے کے لئے نہایت ہی بے قرار ہو - اور اس خیال کے زیر اثر جلد جلد چلا جا رہا ہو - کہ اُس کی دُلہن طعام شب کی مانند اُس کا انتظار کر رہی ہو گی - ورٹز برگ سے اُسے ایک تنومند جوان ساتھی بھی مل گیا تھا - جو اپنی ملازمت کے بیشتر ایام کاؤنٹ کے ہمراہ بسر کر چکا تھا - ہرمن وان سٹارکن فاسٹ ایک زندہ دل بہادر تھا - اور اُس کی شجاعت ضرب المثل تھی - وہ بھی اُن دنوں رخصت پر اپنے گھر آ رہا تھا - اور اُس کے والد کا قلعہ روڈنوالڈ کے جنگل کے نزدیک ہی واقع تھا - اور اس کے خاندان کی بیرن وان لینڈشارٹ سے کسی جائداد پر دیر سے لڑائی چلی آتی تھی ✦

دونو ایک دوسرے کی اچانک ملاقات پر نہایت مسرور تھے - اور اپنی اپنی حیات کے مخصوص کارنامے نمایاں ایک دوسرے کے گوش گذار کرتے ہوئے اپنا سفر طے کر رہے تھے - باتوں باتوں میں کاؤنٹ نے اپنے ساتھی کو یہ بھی بتا دیا - کہ اسی شب وہ ایک دوشیزہ سے شادی کرنے والا ہے - جسے اُس نے آج تک کبھی نہیں دیکھا - البتہ اُس کے حسن کی شہرت ضرور سن چکا ہے - چونکہ ہر دو کا ساتھ قریب قریب کاؤنٹ کے قلعہ تک ضروری تھا اس لئے اب انہیں کسی قسم کا خوف و خدشہ نہ رہا - کبھی کبھی کاؤنٹ بیچارہ کچھ گھبرا سا جاتا - در اصل اُسے اپنی منگیتر کا خیال ستا رہا تھا - اور وہ چاہتا تھا - کہ پر لگا کر فوراً اُس کے پاس جا پہنچے ✦

اس طرح آخر وہ روڈن کے جنگلات میں آ پہنچے - اور اب ایک تیرہ و تار پگڈنڈی پر سے گذر رہے تھے - جسے ہر دو اطراف سے گھنے اشجار نے گھیر کر ایک غار کی صورت دے دی تھی - جس طرح جرمنی کے پہاڑ اور پہاڑی وادیاں اور قلعہ جات ارواح خبیثہ سے پُر تھے - اسی طرح اُس کے جنگلات وحشی لٹیروں سے اَٹے پڑے تھے - جو ہر حالت میں بھوتوں سے زیادہ خوفناک تھے - یہ ڈاکو شکار کی تلاش میں اکثر اِدھر اُدھر گھومتے رہتے تھے - اور ——
ان دو ساتھیوں پر بھی ایسے ہی قزاقوں نے اُس اندھیرے میں حملہ کر دیا - کاؤنٹ نے جو اپنے ساتھی سے کچھ دُور آگے نکل آیا تھا - خوب ڈٹ کر اُن کا مقابلہ کیا - مگر جیسے کہ اس کا ساتھی مدد کے لئے پہنچا - ڈاکو روپوش ہو گئے - اور کاؤنٹ ایک مہلک زخم سے بے ہوش ہو چکا تھا ✦

جاں بلب کاؤنٹ کو کمال احتیاط سے واپس ورٹز برگ پہنچایا گیا - اور ایک مشہور حکیم سے جو امراض جسمانی اور بھوت پریت کے اثرات کو زائل کرنے میں کافی ملکہ رکھتا تھا - علاج معالجہ کرایا گیا - مگر حکیم کا فن کارگر نہ ہو سکا - کیونکہ شاید اپنی شہرت کے لحاظ سے وہ نصف بھی کامل نہ تھا - اب غریب کاؤنٹ کے لمحات حیات صرف گنتی کے تھے ✦

مرتے وقت اُس نے اپنے ساتھی سے نہایت ہی کربیہ لہجہ میں التجا کی - کہ وہ اس کے اس پیام کو بیرن وان لینڈشارٹ تک پہنچا دے - کہ وہ اپنے وعدہ کو ایفا نہ کر سکا - "گو میں محبت میں ... - مجنوں ہو جانے والی ہستی نہیں - تاہم اتنا ضرور ہے - کہ میں جذبات کے لحاظ سے کسی سے بھی کم نہیں" وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا "اس لئے میری آخری درخواست یہی ہے - کہ تم میرے الفاظ کو ضرور بیرن تک پہنچا دو" اور یہ فقرات اُس نے کچھ ایسی منت و صداقت سے ادا کئے - کہ اُس کی وصیت میں ایک لمحہ کی تاخیر بھی نہ کی جا سکتی تھی - اس کے بعد وہ خاموش ہو گیا - اور وان سٹارکن فاسٹ اُسے تسلی دیتا رہا - اور پھر اُس کی وصیت کو ایفا کرنے کا وعدہ کرتے ہوئے اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں دے دیا - کاؤنٹ نے اُسے گرم جوشی سے دبایا —— اور خالی نظروں سے اُس کی جانب تکتا رہا - اس کے بعد اُس نے اپنی ہونے والی رفیقہ حیات اور اپنی ہستی کے متعلق واہی تباہی بولنا شروع کر دیا - اسی حالت ہذیان میں اُس نے حکم دیا - کہ اُس کا گھوڑا تیار کیا جائے - تاکہ وہ بیرن وان لینڈشارٹ کے قلعہ کو جا سکے - مگر انہی خیالات میں جیسے کہ وہ رکاب میں پاؤں دھر رہا ہو - اُس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی ✦

سٹارکن فاسٹ نے مجاہدانہ انداز سے بے جان جسم پر نظر ڈالی - اور پھر کسی گہری سوچ میں غرق ہو گیا - شاید وہ اپنے مرحوم ساتھی کی وصیت پر تبصرہ آرائی کر رہا تھا —— اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سمندر اُمنڈ آیا - اور چند لمحات کے بعد اُسے دل پر ایک بوجھ سا محسوس ہونے لگا - اور دماغ خیالات پریشان سے ماؤف - کیونکہ وعدہ کو ایفا کرنے کے لئے اُسے اپنے قدیم دُشمن سے دوچار ہونا تھا - اور پھر ایک غیر مدعو کردہ مہمان کی صورت میں - اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُسے اس منحوس خبر سے

اُن کی خوشیوں کو غم و رنج میں تبدیل کرنا پڑتا تھا۔ مگر — نہیں۔ اوہ یہ بے وقعت خیالات مجھے ڈرپوک نہیں بنا سکتے۔ میں اُن کی پرواہ نہ کرونگا۔ اُس نے چونکتے ہوئے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا۔ اور پھر یہ کہ خاندان کیبٹ زیبلنن بوگن کی وارثہ اور حور جو مجسمہ شباب وحسن تھی۔ اُکی دید کے لئے بھی کوئی دقّت نہ ہوگی۔ اور چونکہ وہ صنف نازک کے معاملات میں زیادہ دلچسپی لیتا تھا۔ اس لئے اس کو ان خطرات کی کوئی پرواہ نہ رہی ۔

سٹارکن فاسٹ اپنے دوست کی تجہیز و تکفین کی تمام رسومات کا انتظام کرتے ہوئے اور دفنانے کا کردار مرحوم کاؤنٹ کے خادم خاص کے سپرد کرتے ہوئے۔ اُس کی وصیت کو ایفا کرنے کے لئے تیار ہوگیا۔ لاش کو ورٹزبرگ کے گرجاگھر میں اُس کے چند غیر معروف عزیز و اقارب کے پاس دفنایا جانا تھا ۔

ادھر بیرن کے قلعہ میں مہمان انتظار کرتے کرتے مایوس سے ہوگئے۔ دراصل بے قراری تو دعوتِ طعام کا حظ حاصل کرنے کے لئے تھی ——— مگر بیرن بیچارہ ابھی تک مینار پر ہی کھڑا تھا ۔

تاریکی لمحہ بہ لمحہ سرعت سے پھیلتی گئی۔ مگر مہمان کوئی بھی نہ آیا۔ آخر بیرن بھی ایک حسرت بھری نظر ڈالتے ہوئے ایک سرد آہ بھر کر مینار سے نیچے اُتر آیا —— دعوت ——— مگر دعوت تو اب کسی صُورت میں مُلتوی نہ کی جا سکتی تھی۔ گوشت کا رنگ تو ابھی سے تبدیل ہُوا جا رہا تھا۔ باورچی بھی پریشان تھے۔ کہ دیر ہوگئی۔ تو کہیں کھانے خراب نہ ہو جائیں۔ اور دوبارہ مصیبت اُٹھانی پڑے۔ آخر اس انتشار میں بیرن نے دعوت طعام شروع کر دینے کی درخواست کر دی —— اور مہمان میز کے اردگرد جا بیٹھے۔ چند ساعت کے لئے ایک رُوح شکن خامشی اور سکون چھا گیا ——— عین اسی وقت یکایک باہر سے قرنا کی آواز نے کسی مہمان کی آمد کی اطلاع دی۔ اور تمام کے تمام چونکنے ہوگئے۔ دُوسری آواز نے قلعہ کی سکوں پرور فضا کو شور سے پُر کر دیا۔ بگل کا جواب دروازے کے محافظ نے بھی بگل سے ہی دیا۔ اور بیرن اپنے ہونے والے داماد کے استقبال کے لئے اُٹھ کھڑا ہُوا ۔

قلعے کے پُل کا تختہ نیچے گرا دیا گیا —— مہمان گیٹ کے مقابل آگیا ——— وہ سیاہ گھوڑے پر سوار۔ ایک وجیہ اور بہادر نوجوان ہستی تھی۔ مگر اس کے چہرے کی رنگت قدرے زرد تھی۔ مگر آنکھیں ایسے نور سے چمک رہی تھیں۔ جو مسحور کر دے ۔

بیرن اجنبی کو اس تنہا حالت میں دیکھ کر ششدر سا رہ گیا۔ "کیا اُسے یُوں تنہا آنا چاہئے تھا۔" اُس نے دل میں خیال کیا۔ یہ تو اس کی کسرِ شان ہے۔ اور میری عزت کے خلاف۔ اور اس ذی عظمت خاندان کی عزت کے بھی خلاف جس سے وہ وابستہ ہونے والا ہے۔ تاہم دوسرے لمحے اس خیال سے کہ شاید یہ جوشِ شباب ہو۔ جس نے اُسے اپنے احباب اور خدّام سے پہلے آنے پر مجبور کر دیا۔ اُس کا یہ خیال دُور ہوگیا ۔

"مجھے افسوس ہے۔" اجنبی نے کھوئی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا۔ "کہ میں اس غیر موزوں وقت پر آپ کی خدمت میں حاضر ہو سکا۔" مگر بیرن نے شفقت سے اُسے ٹوکتے ہوئے اور باتیں شروع کر دیں۔ اجنبی نے اُس کے الفاظ کی بے پناہ رو کو چند بار روکنے کی کوشش بھی کی۔ مگر بے سود۔ بالآخر اُسے خاموش ہی رہنا پڑا۔ اور جب تک کہ بیرن گفتگو کا سلسلہ ملتوی کرے۔ تو وہ قلعہ کے اندرونی ایوان میں قدم دھر چکے تھے جتنی کچھ کہنا ہی چاہتا تھا۔ کہ ایک مرتبہ اور خواتین نے جو دُلھن کو آگے آگے لئے ہوئے تھیں۔ اُس کی طرف بڑھتے ہوئے اُسے چُپ رہنے پر مجبور کر دیا۔ اُس نے دُلہن کی جانب ایک معنی خیز نظر ڈالی۔ اُس وقت یُوں معلوم دے رہا تھا۔ کہ اُس کی رُوح آنکھوں کے راستے منوّر شعاعوں کی شکل میں اس کی مرمریں شکل پر لوٹ رہی تھی۔ خالہ نے شہزادی کے کان میں کچھ کہا —— اور علیحدہ ہو گئی۔ شہزادی نے کچھ کہنے کے لئے لب کھولے۔ مگر بول نہ سکی۔ تاہم اُس کی نیلگوں آنکھیں ضرور اس کے چہرے پر ایک مرتبہ اُٹھ کر کچھ کہتے ہوئے فوراً نیچے جُھک گئیں۔ اور لبوں پہ ایک گدگدی پیدا کر دینے والا تبسم کھیلنے لگا۔ صرف یہی کافی تھا ——

ایسے وقت میں جب کہ مہمان وہاں پہنچے۔ دیری کے باعث کسی خاص گفتگو کے متعلق کوئی وقت نہ رہا تھا۔ اس لئے بیرن نے گفتگو کو دوسری صبح پر ملتوی کر دیا۔ اور سب ایوان طعام کی طرف چل دیئے ۔

دعوت کا انتظام قلعہ کے سب سے بڑے ایوان میں

کیا گیا تھا - دیوان کی دیواروں پر خاندان کیبٹ زبلین بوگن کے بہادروں کی تصاویر مزین تھیں - اور اس کے علاوہ وہ انعامات جو انہوں نے جنگ اور شکار میں حاصل کئے تھے - ہلکی زرہ بکتریں - نوکیلے بھالے - بوسیدہ علم - بھیڑیوں کے سر خنزیروں کے لمبے لمبے تیز دانت جو صاف کرنے کے بعد کمانوں میں لگا دیئے گئے تھے - بڑے بڑے جنگلی کلہاڑے - بارہ سنگوں کے حسین شاخوں کی مانند پھوٹے ہوئے سینگ وغیرہ وغیرہ بھی - یہ تمام ایک عجیب منظر پیش کرتے تھے ؛

اجنبی نے اس مجلس اور دعوتِ طعام میں کوئی خاص دلچسپی نہ لی - اور نہ ہی کھانے میں اُسے کوئی لطف حاصل ہؤا - کیونکہ اُس کا دماغ صرف دُلہن کے حسن کی بھول بھلیوں اور دیگر خیالات کی کشمکش میں مصروف رہا - دُلہن کے پاس بیٹھے آہستہ آہستہ اُس نے کلام کا سلسلہ جاری رکھا - ایسی آواز میں جو دوسروں تک بمشکل پہنچ سکے - شاید اس لئے کہ محبت کی زبان نہیں ہؤا کرتی - اور اگر ہوتی ہے تو ایسی کہ اُس کی آواز محب و محبوب تک محدود رہے ادھر حسن کے کان بھی اتنے بہرے نہیں ہوتے - کہ وہ ایسی آوازوں کو نہ سُن سکیں ـــــ مہمان کی گفتگو میں کچھ پریشانی اور غم کی علامات سی ظاہر ہوتی تھیں - اگرچہ وہ اس کو چھپانے کی انتہائی کوشش کر رہا تھا - اور اس کا اثر شہزادی پر بھی حاوی ہوتا جا رہا تھا - دُلہن کے رُخساروں پر گہرا رنگ آگیا تھا - کبھی کبھی وہ اس کے سوالات کا جواب بھی آہستہ سے شرماتے ہوئے دے دیتی - مگر نظریں نہ ملاتی - جب اُس کے محب کا دھیان دوسری جانب ہوتا - تب وہ ضرور دُزدیدہ نگاہوں سے دیکھ لیتی - اور ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے دوبارہ نظریں جھکا لیتی - یہ تو تمام سمجھ چکے تھے - کہ جوڑا کام دیوتا کے تیروں کا شکار بن چکا ہے - مگر خالائیں جو ایسے معاملات میں بہتر تجربہ رکھتی تھیں - یہ کہہ رہی تھیں - کہ وہ پہلی نظر میں ہی ایک دوسرے کے ہو چکے تھے - شہزادی بھی پہلی نظر میں ہی - شہزادی جسے اُنہوں نے مردوں کے بارے میں اتنا کڑا اصول بتایا تھا۔

ـــــ مگر نہیں ـــــ شباب اُن سب اصولوں کو ایک لمحہ میں توڑ دیا کرتا ہے ؛

ادھر دعوت بھی اپنی تمام دلچسپی سے جاری تھی - کیونکہ بیچارے مہمان جو دہقانی بھوک سے بے حال ہو رہے تھے - اتنی صبر آزما انتظار کے بعد اب دل بھر کر لطف حاصل کرنا چاہتے تھے - بیرن ساتھ ساتھ اپنی بہترین کہانیاں بھی سناتا جا رہا تھا - اس سے پیشتر شاید ہی اُس نے اُنہیں کبھی اتنے کمال سے بیان کیا تھا - اس کا طرزِ بیان اس وقت نہایت ہی مؤثر تھا - حاضرین غور سے سُن رہے تھے - اور مناسب مواقع پر ہنس بھی دیتے - اگرچہ بیرن کی طرز مزاحیہ نہ تھی - اور اگر کہیں ایسا موقع آجاتا - تو مذاق سنجیدہ ہوتا تھا ؛

اس کے بعد معمولی سمجھ کے دہقانوں نے بھی بہت سی دلچسپ باتیں بیان کیں - جو سوائے ایسے مواقع کے بار بار نہیں دُہرائی جایا کرتیں - ان میں سے بعض نے تو مزاحیہ رنگ میں خواتین کو بھی نصیحتیں کیں - جس سے وہ ہنس ہنس کر بے حال سی ہو گئیں - بیرن کی ایک چہیتے چہرے والی بھتیجی نے اپنے دہن دراز سے چند سرمن بھی گا دیے - جس سے خالائیں بیچاری اپنے اپنے پنکھے اُٹھانے پر مجبور ہو گئیں ؛

حیرت کی بات تھی - کہ اس معمور مسرت موقع پر بھی اجنبی خیالات میں کھویا رہا - جوں جوں رات گزرتی گئی - اُس کے چہرے پر غم و اندوہ اور کرب آمیز پریشانی کے اثرات پیشتر سے زیادہ نمایاں ہوتے چلے گئے - اور اس پر بیرن کے سنجیدہ مذاق اُسے اور بھی پریشان کئے دیتے تھے - بعض وقت تو وہ تمام سے علیحدہ خیالات کی اتھاہ گہرائیوں میں گم ہو جاتا - اور بعض وقت اُس کی بے چین روشن آنکھیں ادھر اُدھر گھومنا شروع کر دیتیں - اُن سے اُس کی اندرونی کشمکش کا بہتر اندازہ لگایا جا سکتا تھا - اب دُلہن کے ساتھ بھی اُس کی گفتگو زیادہ پیچیدہ اور سنجیدہ ہوتی جا رہی تھی - جس سے اُس بیچاری کی پیشانی غم و اندوہ کے گھٹاؤنے بادلوں سے بوجھل ہوتی جا رہی تھی - اور کپکپی کی برقی لہریں اس کے بدن کو بار بار ہلا رہی تھیں ؛

حاضرین مجلس کی نظروں سے بھی یہ سب کچھ مخفی نہ تھا - دُولہا کے اس بے موقع اُداس و پریشان ہو جانے پر اُن کی خوشیوں میں سردی سی آگئی - اور آہستہ آہستہ ہر روح کو بے چینی سی ہونے لگی - حتیٰ کہ اب گاہے بگاہے کانا پھوسی بھی ہونے

لگی۔ اور مہمان ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ پُرمذاق گفتگو اور موسیقی کی صدائیں آہستہ آہستہ معدوم ہوگئیں۔ معمولی گفتگو کے دوران میں بھی دیر تک خاموشی چھائی رہتی ———

اب خوفناک اور خارق عادت واقعات سے لبریز کہانیاں جاری ہوگئیں۔ ایک بھیانک کہانی کے ضمن میں ہی کئی دوسری دہشتناک کہانیاں جاری ہوجاتیں۔ حتیٰ کہ خواتین میں سے بعض نازک دل بے ہوش سی ہوگئیں۔ ہراساں وخوفزدہ تو اکثر ہوجاتی تھیں۔ گوبلن اور ٹیونورا کی داستان جو اب بھی منظوم حالت میں جرمن پڑھتے ہیں۔ سب سے زیادہ خوفناک تھی"

اس کہانی میں دولہا نے بھی خاص دلچسپی لی۔ جب تک کہ کہانی اختتام پذیر نہ ہو۔ وہ برابر بیرن کی طرف دیکھتا رہا۔ اور جونہی کہ داستان کے ختم ہونے کا وقت آیا۔ اُس نے آہستہ آہستہ اپنی جگہ سے اُٹھنا شروع کردیا۔ بیرن کو تو وہ کھڑا ہُوا ایک دیو یا بلند مینار سے کم دکھائی نہ دیتا تھا۔ شاید یہ اُن کہانیوں کا اثر تھا۔ اور جونہی کہ داستان ختم ہوگئی۔ اُس نے الوداعی اجازت کی درخواست کردی۔ ہر طرف تعجب وحیرانگی سی پھیل گئی۔ بیرن تو ہکّا بکّا رہ گیا ٭

"اس آدھی رات کے وقت قلعہ چھوڑو گے۔ ہر شے تمہارے لئے تیار ہے۔ آرام کے لئے کمرۂ خواب بھی مزیّن ہے ——— کیوں ؟"

"نہیں مجھے آج ایک دوسرے کمرے میں سونا ہے" اجنبی نے حزنیہ ادا سے سر ہلاکر جواب دیا۔

اس جواب میں کچھ راز سا تھا۔ بیرن تو سُنتے ہی عجیب وغریب شکوک میں گھر گیا۔ مگر پھر بھی کوشش سے عقل کو ٹھکانے رکھتے ہوئے اُس نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھا۔ اجنبی ہر بات پر چپ چاپ اپنا سر مثبت میں ہلا دیتا۔ اور آخرکار ہاتھ سے خدا حافظ کہہ کر ایوان سے باہر نکل آیا۔ انائیں اور باندیاں دم بخود سی رہ گئیں۔ دُلہن کا سر بھی نیچے کی طرف جھک گیا۔ اور آنکھوں سے آنسوؤں کا تانتا لگ گیا ٭

بیرن بھی اجنبی کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ اور اس طرح وہ بارہ دری تک آپہنچے۔ جہاں ایک سیاہ گھوڑا بے صبری سے ننھے پھلاسے سُموں سے زمین کرید رہا تھا جس وقت وہ صدر دروازہ کی جھکی ہوئی محراب میں پہنچے۔ کہ جہاں ایک مدھم سی روشنی تھی۔ تو اجنبی یکایک ٹھہر گیا۔ اور لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بیرن سے مخاطب ہوکر بولا۔

"اب جب کہ ہم تنہا ہیں۔" اُس نے کہا۔ "میں آپ سے اپنی اس پرسرعت روانگی کا راز بیان کردینا چاہتا ہوں۔ دراصل میں ایک سچے وعدہ میں جکڑا ہُوا ہوں۔"

"ارے تو تم اپنی جگہ کسی دوسرے کو نہیں بھیج سکتے؟"

"اوہ نہیں ——— اس کام کے لئے کوئی دوسرا میری بدل نہیں ہوسکتا۔ میں خود ہی جاؤں گا۔ مجھے ورڑزبرگ کے گرجا گھر میں جانا چاہیئے۔"

"ہاں۔ ہاں"۔ بیرن نے تسلی بخش لہجہ میں جواب دیا۔ "مگر کل تک تو ہرگز نہیں۔ کل صبح اپنی رفیقۂ حیات کو بھی ساتھ لے جانا۔"

"نہیں۔ نہیں" اجنبی نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے جواب دیا۔ میں کسی دُلہن سے وابستہ نہیں۔ البتہ کیڑوں سے ضرور ہوں۔ صرف حشرات الارض میری انتظار میں ہیں۔ میں ——— میں ایک مُردہ انسان ہوں۔ مجھے قزاقوں نے قتل کردیا ہے۔ اور میرا جسم ورڑزبرگ میں پڑا ہے۔ نصف شب کے بعد میں دفنایا جانے والا ہوں۔ قبر میری انتظار میں ہے۔ مجھے اپنے وعدہ کا پابند ہونا چاہیئے"۔

یہ کہتے ہوئے وہ اُچک کر گھوڑے پر سوار ہوگیا۔ اور جھکے ہوئے پُل پر سے گزرتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ جلد ہی گھوڑے کے سُموں کی ٹاپ بھی بگلوں کی آواز میں گُم ہوکر رہ گئی ٭

بیرن سراسیمگی اور پریشانی کی حالت میں واپس ایوان میں لوٹ آیا۔ اور حاضرین کو تمام واقعہ من وعن سُنا دیا۔ دو عورتیں تو غش کھاگئیں۔ اور باقی اس خیال سے کہ اُنہوں نے ایک بھُوت کے ہمراہ کھانا کھایا ہے۔ خوفزدہ ہوگئیں۔ اب اس کے متعلق ہر شخص اپنی اپنی کہہ رہا تھا۔ بعض کہتے تھے۔ وہ ضرور کوئی غیر متمدّن لٹیرا تھا۔ بعض اسے پہاڑیوں کی پاک ارواح میں سے بتاتے تھے۔ بعضوں نے کہا۔ کہ جنگل کے

آوارہ بھوتوں میں سے تھا۔ بعض بولے وہ کوئی دیوتا تھا۔ غرضکہ ہر ایک نے اپنی علیحدہ علیحدہ رائے ظاہر کی۔

بہرحال رات کے تمام شکوک کا ایک نامہ نے جس میں کاؤنٹ کے قتل کی خبر اور ورٹنز برگ میں اُس کی تدفین کا ذکر تھا۔ دوسری صبح قلع قمع کر دیا۔

اب اصلی معنوں میں تمام قلعہ سراپا مایوسی اور غم بن گیا۔ بیرن بے چارہ ایک کمرے میں تن تنہا بند ہو بیٹھا۔ مہمان بھی اس روح شکن واقعہ سے دل برداشتہ ہو کر غم کو دُور کرنے کے لئے قلعہ کے صحن میں اِدھر اُدھر چُپ چاپ گھومنے لگے۔ اور آخر ایوان میں دوبارہ جمع ہو کر اُنہوں نے اس غم کو دُور کرنے کے لئے خوب کھایا پیا۔ اُدھر شہزادی بے چاری کی حالت بھی قابل رحم ہو گئی۔ "پیشتر اس کے کہ وہ اُسے اپنے دھڑکتے ہوئے سینے سے لگائے۔ وہ قبر میں جا سویا —— اوہ اگر وہ بھوت ہوتے ہوئے بھی اتنا وجیہ اور حسین تھا۔ تو زندگی میں کیسا ہوگا۔ اس گوشت پوست کے جامہ میں" ان خیالات کے زیر اثر اس نے قلعہ بھر کو چیخ و پکار سے سر پہ اُٹھا رکھا تھا۔

دوسری شب اُس کی خالہ شہزادی کے ہمراہ اُس کے کمرۂ خواب میں سونے کے لئے ساتھ تھی۔ یہ خالہ تمام جرمنی میں اپنی بھوت پریت کی کہانیوں کو بیان کرنے میں اپنا ثانی نہ رکھتی تھی۔ اس رات بھی وہ ایک ایسی ہی کہانی کہتے کہتے سو گئی۔ ایوان نہایت وسیع تھا۔ سامنے پائیں باغ کی طرف دریچہ کھُلا ہوا تھا۔ شہزادی ایک صنوبر کی چوٹی پر چاندکی نقرئی کرنوں کا ناچ دیکھنے میں محو بستر استراحت پہ خاموش لیٹ رہی تھی۔ رات بھیگنی شروع ہو گئی تھی۔ گھنٹہ گھر کے گھنٹہ نے نصف شب کا گھنٹہ بھی بجا دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی باغ میں سے آئی ہوئی پُر سرور اور روح پرور موسیقی کی تانیں ہوا کے ساتھ اُس کے کانوں۔ ٹکراتے ہوئے رُوح میں سرایت کرنے لگیں۔ کوئی دھیمے سُروں میں گا رہا تھا بستر پرسے اُٹھتے ہوئے وہ دریچہ کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ اور باغ کی طرف نظریں جما دیں۔ درختوں کے درمیان ایک دراز قد ہیولے کھڑا تھا۔ اُس نے روشنی میں اپنا سر اُٹھایا۔ تو شہزادی چونک کر رہ گئی۔ اوہ یہ تو وہی تھا —— وہی دُولھا جسے بھوت بنا دیا تھا اُنہوں نے۔ اُس کا دُولھا۔ یکایک ایک علدوز چیخ سنائی دی جس سے شہزادی کی خالہ جو موسیقی کی آواز سے بیدار ہو کر اب شہزادی کی پُشت پر آ کھڑی ہوئی تھی۔ بے ہوش ہو کر دھم سے فرش پہ گر پڑی۔ اور شہزادی بھی خوف زدہ ہو گئی۔ کچھ دیر بعد شہزادی نے جب دوبارہ اُدھر دیکھا۔ تو ہیولے یا بھوت غائب ہو چکا تھا۔

خالہ بے چاری کو تو اب آرام کی ضرورت تھی۔ اور شہزادی کے بارے میں یہ کہ اُسے آرام سے واسطہ نہ تھا۔ بلکہ اُسے تو اُس بھوت سے محبت ہو گئی تھی۔ کیونکہ اس میں ایک بھوت ہوتے ہوئے بھی مردانہ حُسن کی جھلک نمایاں تھی۔ گو مرد کا ہیولے ہی صرف ایک عورت کے بیمار دِل کی تسکین کا باعث نہیں ہو سکتا۔ تاہم اس حالت میں جب کہ گوشت پوست کا مالک محب نہ مل سکے۔ تو پھر بھی رُوحی ہیولے —— اس واقعہ کے بعد خالہ نے تو صاف کہہ دیا۔ کہ وہ اب سے کبھی وہاں نہ سوئیگی۔ مگر بھانجی بھی بیچاری مجبور تھی۔ کہ وہاں ہی سوئے۔ تاکہ اپنے محب کے دیدار سے تو مشرف ہوتی رہے۔ اور اس لئے اب اُسے تنہا ہی سونا پڑا۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے خالہ سے یہ وعدہ بھی لے لیا۔ کہ وہ اس واقعہ کا اظہار کسی سے نہ کریگی۔ تاکہ وہ اُس مسّرت سے تو دُور نہ ہو جائے۔ جو اس بھوت یا رُوحی محب کے دیکھنے سے حاصل ہو سکتی تھی۔

شریف خالہ نے اپنے وعدہ کو کب تک نبھایا۔ اس کے متعلق وثوق سے نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ وہ عجوبات کو جن میں اعجاز نہ ہو۔ بیان کرنے میں زیادہ دلچسپی لیتی تھی۔ اور پھر سب سے پہلے کسی ایسے واقعہ کو بیان کرنا تو اور بھی قابل فخریات تھی۔ آخر صنف نازک کب تک کسی راز کو پیٹ میں رکھ سکتی ہے۔ یہ بات اب بھی بطور مثال بیان کی جاتی ہے۔ کہ خالہ نے بمشکل اسے ایک کامل ہفتہ تک راز میں رکھا۔ اور بے چاری نے جب ایک صبح جب کہ ناشتہ کی میز پہ یہ خبر سُنی۔ کہ شہزادی قلعہ میں موجود نہیں۔ اس کو بطور راز رکھنے سے قاصر ہو گئی۔

شہزادی کا کمرہ خالی پڑا تھا۔ بستر پہ سلوٹ تک نہ تھی —— اور پرندہ پرواز کر چکا تھا۔

اُس حیرت اور مایوسی کا اندازہ کچھ وہی لوگ لگا سکتے

ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جنہیں کسی بیرن ایسے معزز انسان کی ایسی بے عزتی کو اُس کے دائرۂ احباب میں دیکھنے کا موقع ملا ہو ـــــ حتیٰ کہ غریب عزیز و اقارب بھی سکتہ کے عالم میں رہ گئے۔ اور کانٹے اُن کے ہاتھوں میں جہاں تھے وہیں رہ گئے۔ خالائیں بیچاری تو بیہوش سی ہوگئیں۔ "بھوت۔ بھوت اوہ اُسے بھوت لے گیا" حالت ہذیان میں خدا معلوم وہ کیا کیا بک رہی تھیں۔

غرضکہ خالہ نے اس رات کا تمام واقعہ مختصر الفاظ میں بیان کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا۔ کہ شہزادی کو اُس کا رُوحی دُولھا اپنے ساتھ لے گیا۔ ساتھ کی دو عورتوں نے اس کی تائید کر دی۔ کیونکہ اُنہوں نے رات کو پہاڑی پر گھوڑے کے ٹاپوؤں کی آواز سُنی تھی۔ اس لئے اب اس میں کسی شک کی گنجائش باقی نہ رہی۔ وہ ضرور دولھا کی رُوح ہی تھی۔ جو شہزادی کو اپنے ساتھ قبر میں لے جا رہی تھی۔ حاضرین اس دہشتناک اور ناممکن واقعہ کو سُن کر سن رہ گئے ؎

بیرن کے لئے یہ واقعہ نہایت رُوح شکن تھا ـــ اور پھر بیرن ایسے باپ کے لئے ــــ!

اُس کی بیٹی یا تو قبر میں چلی گئی۔ یا اُسے کسی وحشی ڈاکو کو اپنا داماد بنانا ہوگا۔ اُس نے خیال کیا۔

دوسرے لمحے تمام قلعہ ایک بے پناہ شور سے بھر گیا۔ نوکروں کو گھوڑوں پر روڈن والڈ کی چپہ چپہ زمین چھان مارنے کا حکم دے دیا گیا۔ خود بیرن بھی اپنے فوجی بوٹ پہن۔ تلوار لگا اور وردی پہن کر تیار ہو گیا۔ گھوڑے کے پاس وہ اس مہم پر جانے کو تیار ہی کھڑا تھا۔ کہ کچھ دیکھ کر رُک گیا۔ دُور ایک خاتون خوبصورت ہلکے گھوڑے پر سوار ایک مجاہد کے ہمراہ اُدھر چلی آ رہی تھی۔ گھوڑے کو دوڑاتے ہوئے ایک آن میں وہ قلعہ کے دروازہ کے سامنے آ رُکی۔ اور گھوڑے پر سے کُودتے ہوئے اُس نے اپنے بازو بیرن کی ٹانگوں کے گرد حمائل کر دیئے ۔ یہ اُس کی گم شدہ بیٹی تھی ــ اور ساتھی وہی بھوت ــــ اُس کا دُولھا۔ اُس نے دونو پر ایک نظر ڈالی۔ وہ تذبذب میں پڑ گیا۔ دُولھا اب پیشتر سے تندرست دکھائی دیتا تھا۔ اُس کا لباس بھی شاندار تھا۔ چہرے پر رنج و غم کے آثار بھی نہ تھے۔ اور نہ ہی زردی۔ بلکہ شباب کا سُرخ خون۔ اُس کے چہرے کو گلاب بنائے ہوئے تھا۔ اور بڑی بڑی سیاہ آنکھیں مسرت سے معمور اور روشن تھیں۔ غرضکہ وہ ایک مکمل وجیہ بہادر ــ تھا ؎

نوجوان نے آگے بڑھتے ہوئے تمام واقعہ کمال دلیری سے سے من وعن بیرن سے بیان کر دیا۔ کہ کیونکر کاؤنٹ کو راہزنوں نے قتل کر دیا۔ اور پھور رٹز برگ میں اُس کی رسومات تجہیز و تکفین ادا کی گئیں۔ اور اُس نے اپنے دوست کو کیا وصیت کی۔ اور وہ دوست کیونکر اُس وصیت کو بیرن تک پہنچانے کے لئے اُسی رات قلعہ میں پہنچا۔ اور وہ یہ منحوس خبر بیان کرنے سے کیونکر قاصر رہ گیا۔ یہ دیکھ کر کہ اس مسرت کی گھڑی میں بیرن کا یہ واقعہ سُن کر کیا حال ہوگا۔ اس لئے اُس نے بیرن کو یہ کہہ کر دھوکہ دیا کہ وہ کاؤنٹ کی رُوح ہے۔ اور پھر کہ اُسے شہزادی سے محبت ہو گئی۔ اور وہ محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر کیسے شہزادی سے ملاقاتیں کرتا رہا۔ اور آخرکار اُس نے شہزادی کو جیت لیا۔ اپنے ساتھ لے گیا۔ اور مختصر یہ کہ اب اُس سے شادی بھی کر لی ہے۔ اور وہ وان سٹارکن فاسٹ ہے ؎

دوسرے حالات کے زیر اثر بیرن شاید نہایت خفا ہوتا۔ مگر یہ دیکھ کر کہ اُس کی بیٹی اُسے زندہ سلامت مل گئی۔ اور پھر کوئی بھوت یا رہزن اُسے نہیں لے گیا تھا۔ بلکہ زندہ انسان۔ جو اگرچہ ایک دُشمن خاندان کا ہی فرد تھا۔ وہ چُپ رہ گیا ؎

اُسے اس بات پر ضرور غصہ آ رہا تھا۔ کہ نوجوان نے اُسے یہ کہتے ہوئے کیوں دھوکا دیا۔ کہ وہ کاؤنٹ کی مُردہ رُوح ہے۔ اور ایسا مذاق جو وہ برداشت نہ کر سکے ــــ مگر اُس کے احباب نے یہ سمجھا بُجھا کر اُس کا غصہ فرو کر دیا۔ کہ محبت میں ہر گناہ قابل عفو ہوتا ہے۔ اس لئے بیرن نے اُسی جگہ جوان جوڑے کو معاف کر دیا۔

میرا خیال ہے۔ کہ آپ سمجھ گئے ہونگے۔ کہ یہ اجنبی یا بھوت در اصل کاؤنٹ کی رُوح کا بھوت نہ تھا۔ بلکہ اس کا ساتھی وان سٹارکن فاسٹ تھا ــــ ایک زندہ انسان۔

غرضکہ قلعہ میں دوبارہ مسرت کے شادیانے بجنے لگے۔ مہمانوں نے بھی اجنبی کو اپنے نیک برتاؤ سے اپنی محبت کا بہترین ثبوت دیا ـــ خالائیں بیچاری ضرور اس واقعہ پر متاسف

تھیں۔ کہ اُن کی تربیت کسی کام کی نہ رہی۔ محبت بڑی بلا ہے۔ اور ایک بے چاری تو اسی پر ند رہی تھی۔ کہ اُس کی تمام کہانی بدمزہ ہو گئی۔ کہ آج تک اگر اُسے کسی بھوت کو دیکھنے کا خدا خدا کر کے اتفاق بھی ہُوا تھا۔ تو وہ بھوت بھی دوبارہ زندہ انسان بن گیا۔ مگر شہزادی مسرور تھی۔ کہ اُسے بھوت کی بجائے ایک زندہ محب مل گیا ؞

کہانی کہنے والے نے آخری الفاظ ختم کرتے ہوئے اپنے پائیپ کی راکھ کو انگیٹھی کی روشن آگ میں ڈال دیا۔ اور سامعین کی طرف حیرت سے دیکھ کر وہ اب بھی کتنے ہمہ تن گوش بیٹھے ہیں۔ بولا " اور یوں کہانی ختم ہوتی ہے " کمرہ کی فضا اب بھی خاموش تھی۔۔۔۔

(ترجمہ) گُل سعید

دوست

خوشی سے میرے لئے وجہ اضطراب بنو — جبینِ زلیست پہ آلام کی نقاب بنو

مرے شباب کو غم کی جوانیاں بخشو — زباں کو بیتتے دنوں کی کہانیاں بخشو

حریمِ ناز کے وا مجھ پہ سارے باب کرو — مری نگاہ کو جتنا بھی ہو خراب کرو

مرے لہُو سے نہاؤ مجھے تباہ کرو — مرے لبوں کی خموشی کو وقفِ آہ کرو

مرے خلاف عداوت کی آگ بھڑکاؤ — مجھے حقیر، کمینہ، ذلیل ٹھہراؤ

تمہاری راہ میں آنکھوں کو میں بچھاؤنگا — تمہارے دل کی صداقت کے گیت گاؤنگا

مگر جو دوست کا بہروُپ بھر کے آؤ گے — تو مجھ کو زلیست کے آغوش میں نہ پاؤ گے

خیالِ دوست سے بھی اب تو ڈر گیا ہوں میں — کوئی بھی سامنے آئے تو کانپتا ہوں میں

کیا یہ بھی عہدِ محبت کی یادگار نہ ہو

اسے بھی عشق کے درجے کا مجھ سے پیار نہ ہو

الطاف مشہدی

(آثارِ قدیمہ)

بغداد

یاقوتی کا بیان ہے - کہ خود منصور نے اس شہر کا خاکہ ایک دائرے کی شکل میں بنایا تھا - اس کے چاروں طرف ایک مضبوط شہر پناہ کی دیوار تھی - اور ایک گہری خندق - شہر پناہ میں چار بڑے دروازے تھے - جن میں لوہے کے مضبوط پھاٹک لگے ہوئے تھے - ہر پھاٹک پر گنبد بنے ہوئے تھے - جن پر میناکاری کا نہایت خوبصورت کام بنا ہوا تھا - یہ دروازے اتنے کشادہ اور بلند تھے - کہ ان میں ایک شہسوار اپنا لمبا نیزہ لے کر آسانی سے گزر جاتا تھا - شہر پناہ کے اندر شہر کے مرکز سے کچھ فاصلہ پر شاہی محل کی دیوار شروع ہوتی تھی - اس محل کو "خلد" کہتے تھے - اس محل کے دروازے کا نام "باب الصنہاب" تھا - جس کے پھاٹک سنہرے رنگے ہوئے تھے - اسی دائرہ کے اندر اور خلیفہ کے محل کے نزدیک ہی ایک عالیشان مسجد تھی - جس میں سلطان، شہزادے، امرا، متصدی، خزانچی اور دوسرے اراکین سلطنت نماز پڑھنے جایا کرتے تھے - شہر پناہ کے اندر کا حصہ یعنی شہر خاص "مدینۃ المنصور" کہلاتا تھا - اور حقیقت تو یہ ہے کہ مہدیہ کی تکمیل کے بعد یہ شہر دو نصف دائروں میں تقسیم ہو گیا تھا - ایک دریائے دجلہ کے داہنے کنارے پر - اور دوسرا بائیں کنارے پر تھا - اس سے ملحق علاقوں میں سرسبز و شاداب گلشن، چمن، باغ اور عالیشان کوٹھیاں اور محل تھے - اور نہایت ہی دلکش تفریح گاہیں تھیں - اور دریا کے دونو جانب ان چیزوں کے علاوہ عظیم الشان مسجدیں اور کشادہ و آرام دہ غسلخانے وغیرہ بنے ہوئے تھے - اور نہایت ہی خوشنما اور بڑے سلیقہ سے سجے ہوئے بازار بھی تھے - کہتے ہیں - کہ فارغ البالی کے زمانے میں بغداد کی آبادی بیس لاکھ سے بھی کچھ زیادہ تھی - مہدیہ بہ نسبت مغربی کنارے کے شہر سے زیادہ بارونق جگہ تھی - خلیفہ کا محل "قصر الخلافت" کہلاتا تھا - اس کے چاروں طرف اتنا بڑا باغ تھا - کہ اگر کوئی شخص اس کے گرد گھومنا چاہے - تو کئی گھنٹے درکار ہوتے تھے -

تب جا کر اس کا قطر ختم ہوتا تھا - اس باغ میں جانور خانہ اور پرندگھر کے علاوہ شکار کے لئے بھی جانور پرورش پاتے تھے - محل کے صحن میں باغیچے لگے ہوئے تھے - جن میں طرح طرح کے درخت، پودے اور پھول نہایت ہی حسن و قرینہ سے لگائے گئے تھے - حوض و فواروں کے چاروں طرف بڑے بڑے خوبصورت مجسمے نصب تھے - محل کے اس طرف "طاہری" اور دوسری طرف امرا کے محل تھے - سڑکیں کافی کشادہ تھیں - کسی حالت میں بھی چالیس ہاتھ سے کم چوڑی نہ ہوتی تھیں - یہ سڑکیں دریا کی ایک طرف سے دوسری طرف تک جاتی تھیں - اس طرح یہ شہر کو کئی حصوں میں تقسیم کرتی تھیں - ان میں سے ہر حصہ کے لئے ایک خاص نگراں مقرر تھا - جس کا فرض یہ تھا - کہ وہ اپنے حلقہ کی صفائی اور لوگوں کی صحت و تندرستی اور آرام و آسائش کا ہر طرح خیال رکھے - ہر سڑک کے آخری کونے پر ایک محافظ تعینات ہوتا تھا - جس کا یہ کام ہوتا تھا - کہ وہ حتی الامکان اس حلقہ میں جھگڑا و فساد نہ ہونے دے - ان میں سے ایک حصہ کا نام "ماموریہ" تھا - وہ سب سے زیادہ چوڑا اور لمبا حصہ تھا - اور نہر المولا سے لے کر الاعجاز نامی پھاٹک تک پھیلا ہوا تھا ۔

شہر پناہ میں باہر جانے کے لئے بہت سے دروازے تھے - مغربی حصے کے پھاٹکوں کے نام یہ تھے - (۱) باب الشمسیہ (۲) باب القاتر (۳) باب البصرہ (۴) باب الدیر (۵) باب الشام (۶) باب البستان (۷) باب الطاق (۸) باب الشیراز (۹) باب الخیفران (۱۰) باب الصبیان (۱۱) باب التین (۱۲) باب الاعجاز - ان کے علاوہ مہدیہ میں پانچ پھاٹک تھے - (۱) باب الغرابہ (۲) باب التمار (۳) باب النوبی (اس طرف شاہی آستانہ تھا - جس کو سفیر بوسہ دیتا تھا) (۴) باب العامہ اور (۵) باب المراتب ۔

دریائے دجلہ شمال سے جنوب کو بالکل شہر کے بیچوں بیچ میں ہو کر بہتا تھا - دریا کے شمالی اور جنوبی حصہ میں شہر میں داخل ہونے کے خاص دروازے تھے - اس دونو جگہوں پر برج بنے

ہوئے تھے - جن میں دن رات سپاہیوں کی تعیناتی رہتی تھی - تاکہ وہ شہر کی نگہبانی کرتے رہیں - اور ان راہوں سے کوئی دشمن شہر میں داخل نہ ہو سکے - دریا سے چھوٹی چھوٹی نہریں نکالی گئی تھیں - جو شہر کے تمام خاص خاص حصّوں میں پھیلی ہوئی تھیں - ان سے پانی ہر وقت دستیاب ہو جاتا تھا - کوڑا کرکٹ شہر پناہ کے اندر نہ رہنے پاتا تھا - قصر الخلد کا ایوان اسّی ہاتھ بلند تھا - اس کا گنبد سبز رنگ کا تھا - یہ گنبد شہر بغداد کا طغرائے امتیاز تھا - اور یہ بنی عباس کے عہد کی یادگار تھا - گنبد کے اوپر ایک شہسوار کا مجسمہ نصب تھا - جس کے ہاتھ میں ایک نیزہ تھا۔

محل کے سامنے ایک بہت بڑا چورس اور وسیع میدان تھا - جس کو مربع کہتے تھے - وہ فوجی معائنہ، مقابلہ اور گھوڑ دوڑ کے لئے استعمال ہوتا تھا - رات کو تمام سڑکوں پر اور اس میدان میں روشنی کی جاتی تھی - ہزارہا چراغ جلائے جاتے تھے - دریائے دجلہ کے دونوں کناروں کے چراغوں کا پانی میں عکس نہایت ہی بھلا معلوم ہوتا تھا - منصور اپنی فوج کا معائنہ ایک منبر یا تخت پر بیٹھ کر کیا کرتا تھا - مگر رشید اور مامون وغیرہ صرف معائنہ ہی نہ کرتے تھے - بلکہ فوجی کھیل کود اور مقابلہ وغیرہ میں حصہ بھی لیتے تھے - صرف گھوڑ دوڑ ہی ایک ایسا کھیل ہے - جس کا عرب میں عام رواج تھا - کیونکہ اسلام نے اس کھیل میں بازی لگانے کی اجازت دی ہے - اس لئے اکثر لوگوں کا یہی مشغلہ تھا - چوگان بازی جو اہل ایران کا کھیل تھا - اس کو ہارون رشید نے اپنے یہاں رواج دیا تھا - اور اب اس مربع میں یہی گو چوگان کھیلا جاتا تھا ۔

مہدیہ کی سمت ایک اور بڑا وسیع میدان تھا - جس میں مشرقی کنارے کی فوجیں قواعد کرتی تھیں - اور فن سپہ گری کی مشق کیا کرتی تھیں - اور لوگ تفریح کے لئے شام کو اس طرف آنکلتے تھے - اس کے علاوہ ہر پھاٹک کے سامنے جو کشادہ صحن تھے - ان میں بھی لوگ سیر و تفریح کی غرض سے آیا کرتے تھے - اور وہاں غپ شپ لڑاتے تھے - یا پھر محض اس لئے آتے تھے - کہ وہ ان لوگوں کو اور مسافروں کو دیکھیں - جو دار السلطنت میں داخل ہوتے تھے - ہر قوم و فرقہ کا ایک سردار ہوتا تھا - جو اپنی قوم یا فرقہ کی قیادت کرتا تھا - اور جس سے ہر اجنبی شخص اور نو وارد ہر قسم کی مدد کے لئے مشورہ اور گفتگو وغیرہ کر سکتا تھا - یہ افسر لوگوں کی ہر امکانی مدد بھی کرتے تھے - اور اپنے فرقہ کے اعمال و کردار کو سنوارتے بھی تھے ۔

بغداد ایک عجیب و غریب شہر تھا - جس میں صدہا محل تھے - یہ محل صرف اینٹ اور گارے کے نہ تھے - بلکہ سنگ مرمر کی عالیشان عمارتیں تھیں - حالانکہ یہاں کی عمارتیں دمشق کی عمارتوں ہی کی طرح تھیں - لیکن ایران کا قرب حاصل ہونے کی وجہ سے ان کی آرائش و زیبائش میں ایرانی اثر اور ایرانی مذاق بہت نمایاں تھا - محل پچی کاری اور مینا کاری سے خوب مزین تھے - جنگلے دروازوں اور کھڑکیوں میں ریشمی، زربفت اور کمخواب کے پردے اور مقیش کی جھالریں پڑی رہتی تھیں - کمرے نہایت عمدہ عیش و عشرت کی چیزوں سے سجے رہتے تھے - اور ان میں قیمتی میزیں - چینی کے برتن اور سونے چاندی کے ظروف طاق و الماریوں میں قرینے سے چنے رہتے تھے - قصر شاہی کی رونق قیمتی پتھروں کی پچی کاری سے اور بھی دوبالا تھی - اور آرائش اور کاریگری کے لحاظ سے کمروں اور ایوانوں کے مختلف نام تھے - محل میں ایک نہایت ہی انوکھی چیز تھی - یہ ایک سونے کا درخت تھا - اس کی شاخوں پر جو پرند بیٹھے تھے - وہ بھی خالص سونے کے تھے - اور ان میں ہیرے اور جواہرات جڑے ہوئے تھے - ایک اور خاص کمرہ تھا جس کو ایوان الفردوس کہتے تھے - اس کی دیواروں میں جواہرات کی پچی کاری اور رنگین مصوری، چھتوں کی میناکاری اس پر جھاڑ و فانوس کی روشنی واقعی ایک عجیب سماں دکھاتی تھی - اور حقیقتاً فردوس نظر معلوم ہوتی تھی - دریا کے دونوں جانب میلوں تک عالیشان محل گلشن اور چمن نظر آتے تھے - اور ان سب کے مالک امرا و رؤسا اور ارکین سلطنت ہوتے تھے - دریا کے کنارے پانی تک سنگ مرمر کے زینے بنے ہوئے تھے - مورپنکھی کی روشیں اس قرینہ سے لگائی گئی تھیں - اور ان پر حکومت کی جھنڈیاں اس طرح لہراتی تھیں کہ دریا کے آب رواں میں ان کا عکس نہایت ہی دلکش و جاذب نظر معلوم ہوتا تھا - جہاں بغداد کے عیش و عشرت کے متلاشی ادھر ادھر چہل قدمی کرتے ہوئے نظر آتے تھے - گھاٹوں اور بندرگاہوں پر جو دریا کے دونوں جانب میلوں تک بنے ہوئے تھے - بڑے بڑے جہازوں سے لے کر چھوٹی سے چھوٹی کشتیاں تک لنگرانداز

ہوتی تھیں۔ ان میں خلیفہ کا جہاز سب سے بلند دور ہی سے نظر آتا تھا جس کے چاروں طرف پولیس کی کشتیاں گشت لگاتی رہتی تھیں۔ جن کو "شرادت" کہتے تھے۔

مسجدوں کی عمارتیں اور بھی عظیم الشان تھیں۔ ان کا اعلیٰ نمونہ ان کی کاریگری اور بہترین کام اگر ولید کی دمشق کی مسجد سے سبقت نہ لے گئی تھی۔ تو اس سے کسی حالت میں کم بھی نہ تھی۔ مسجد الجمعہ کے علاوہ شہر کے ہر حصہ میں مسجدیں بنی ہوئی تھیں اسی طرح ہر شہر میں ایک خاص مسجد ضرور تھی۔

دار الخلافہ میں اور سلطنت کے دوسرے بڑے شہروں میں نہایت ہی عمدہ اور بڑے بڑے اسپتال اور دار العلوم تھے۔ ان اسپتالوں کو دار الشفا کہتے تھے۔ یہاں مردوں اور عورتوں کا علاج نہایت ہی اچھی طرح کیا جاتا تھا۔ ہر دار العلوم میں ایک مدرس اعلیٰ ہوتا تھا۔ اور سرکاری شفاخانے کسی مشہور حکیم کی زیر نگرانی ہوتے تھے۔ اس "مریض الستان" کا حاکم ایک قاضی بھی ہوتا تھا۔

مدرسہ نظامیہ کو خود نظام الملک نے ۱۰۶۷ء میں بنوایا تھا۔ اسی طرح مستنصریہ کو مستنصر نے ۱۲۲۶ء میں بنوایا تھا۔ یہ دونوں مدرسے اسلامی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ لیکن ان کے علاوہ بہت سے پرانے قسم کے مدرسے بھی تھے۔ اور طلبا صرف ملک کے نہیں بلکہ دنیا کے گوشہ گوشہ سے اس وقت ان میں تعلیم حاصل کرنے آیا کرتے تھے۔

بنی عباس کی شان و شوکت اور جاہ و ثروت بہ نسبت دمشق کے یہاں زیادہ اور اعلیٰ پیمانہ پر تھی۔ خلیفہ کے محل کی ہر ڈیوڑھی پر ایک دربان زرق برق وردی پہنے مستعد کھڑا رہتا تھا۔ ہادی نے اس بات کا رواج دیا تھا۔ کہ خلیفہ کے جلوس میں غلام برہنہ شمشیر۔ خمیدہ کمان اور بلند نیزہ لے کر چلتے تھے۔ حالانکہ ہارون رشید اور مامون اکثر شہر میں صرف دو ایک سپاہی کے ساتھ پیدل ہی گشت لگانے نکل جاتے تھے۔ کسی تہوار کے دن یا جمعہ کے روز خلیفہ جو خطبہ پڑھتا تھا۔ وہ بڑا موثر ہوتا تھا۔ اور اس سے خلیفہ کی شان و جلال کا اظہار ہوتا تھا۔ سوچ کے دستے جھنڈے لئے ہوئے جلوس کے آگے آگے ہوتے تھے۔ نقاروں اور نفیری کی صدائیں فضا میں گونجنے لگتی تھیں۔ پہلے شہزادگان والاتبار گھوڑوں پر سوار بڑے جاہ و تمکنت کے ساتھ نکلتے تھے۔ ان کے پیچھے سفید گھوڑے پر جاہ و جلال کے ساتھ خلیفہ وقت کی سواری نظر آتی تھی۔ ان کے بعد ارکین۔ سلطنت اور زعماء ریاست اور امرائے دربار ہوتے تھے۔ سب کے پیچھے محافظ ہوتے تھے۔

اس موقع پر خلیفہ ایک سیاہ یا نیلے رنگ کی قبا پہنتا تھا۔ جو کہ گھٹنوں کے نیچے تک لٹکتی رہتی تھی۔ کمر میں یا تو شال کا پٹکا ہوتا تھا۔ یا پھر جواہرات سے مرصع پیٹی ہوتی تھی۔ شالوں کے اوپر ایک قیمتی لبادہ ہوا کرتا تھا۔ اور خلیفہ کے سر پر ایک اونچی نوک دار کلاہ ہوتی تھی۔ اس کلاہ میں سب سے قیمتی ایک ہیرا جڑا رہتا تھا۔ پیغمبر صاحب کی مہر اور عصا لازمی چیزیں ہوتی تھیں۔ عموماً گلے میں ایک سونے کی زنجیر ہوتی تھی۔ جس میں جواہرات آویزاں ہوتے تھے۔ اسی طرح جوتے کے تکسوئے میں بھی قیمتی جواہرات جڑے رہتے تھے۔ قبا جو جسم سے چسپاں رہتی تھی۔ گھٹنوں سے نیچے ہوتی تھی۔ لیکن گردن پر وہ تھوڑی سی کھلی بھی رہتی تھی۔ جس سے اندر کی رنگا رنگ خفتاں دکھائی دیتی تھی۔ آستینوں میں بٹن لگے رہتے تھے۔ لیکن بعد میں ڈھیلی آستینوں کا رواج ہوگیا تھا۔ لوگ کہتے ہیں۔ کہ آستین تین ہاتھ تک چوڑی ہوگئی تھیں۔

غرضکہ بغداد سے اسلام کی شان ٹپکتی تھی۔ اور کیوں نہ ہو۔ بقول یاقوتی "بغداد سلطنت اسلام کا دار الخلافہ اور چشم عراق تھا۔ تہذیب و تمدن، حسن اور فنون لطیفہ کا مرکز تصور کیا جاتا تھا"۔ اور یہ واقعہ بھی تھا۔

غلام ابرار صدیقی اثر بی۔ اے (علیگ)

افکار تازہ

اُمید نہ رکھتے تھے بہت عشق میں لیکن ان باتوں کا مجھ سے تو نہ ہوتا تھا گماں بھی
اِک شامِ گریباں میں فسانہ ہے فسانہ یہ حسن و محبت بھی، جہانِ گزراں بھی

مجھ کو سنبھل تو لینے دے اے عمرِ تیز گام ہے پا بہ گِل صبا تری رفتار دیکھ کر
ہر رنگ میں مسرت و غم ساتھ ساتھ ہیں حیرت زدہ ہوں ربطِ گل و خار دیکھ کر

(ساقی)

پھر اک حسین وعدے سے بے اختیار ہے ناداں دل ہے اور ہوسِ اعتبار ہے
ہے زندگی بذاتِ خود اک دلفریب جھوٹ پھر کیا گلہ جو عشق دروغ اعتبار ہے
ہے تیرے سنگِ در پہ مری رُوح سجدہ ریز روزِ ازل سے موج کو ساحل سے پیار ہے
اظہارِ غم کا خاص سلیقہ ہے خامشی اے عندلیب پھول بھی سینہ فگار ہے

(ادب لطیف)

تُو اپنے جلوہ ہائے خاص کو کیوں عام کرتا ہے یہ ارزانی مرے دل کو گراں معلوم ہوتی ہے

(ہند)

کشتی رواں ہے نغمۂ ساقی کی لَے کے ساتھ موجِ خرامِ آبِ رواں دیدنی ہے آج
دمسازِ ابر و باد ہے رندانہ بانکپن طرفِ کلاہِ پیرِ مغاں دیدنی ہے آج
حسنِ جواں، شرابِ کہن، موجِ برشگال عشرت سرائے بادہ کشاں دیدنی ہے آج

(کلیم)

کیا خبر یہ بزمِ دشمن ہے کہ ہے محفل تری ہر جگہ تجھ کو سمجھ کر سر جھکا دیتا ہوں میں

میں اور شکوہ سنجِ فلک سر بسر غلط اتنی ترے خیال سے فرصت کہاں مجھے
گویا وہ آ ہی جائیں گے پرسش کے واسطے کیا کیا فریب دیتا ہے دردِ نہاں مجھے

(مدینہ)

نعمت ایک ایک یاد آ سکتی ہے دِل میں امید مسکرا سکتی ہے
احسان شناس ہے تو سو غم تیرے اک صبح کی تازگی بھلا سکتی ہے

ہو ذرا دشتِ جنوں میں گام زن ذرّہ ذرّہ رہنما ہو جائے گا
جب ترا دل ہو گیا بے مدعا دِل کا حاصل مدعا ہو جائے گا

(دلگداز)

مختار

اقبال اور ابلیس

ملٹن کی سب سے مشہور نظم " فردوس گم شدہ " ہے۔ اس میں انسان کے زوال کی داستان بیان کی گئی ہے۔ اور خدا کی مصلحتوں کا جواز پیش کیا گیا ہے۔ اس نظم کا خاکہ ملٹن کے دماغ میں بہت دنوں سے تھا۔ اور برسوں اس نے اپنے آپ کو اس کے لئے تیار کیا تھا۔ گویا یہ اس کی زندگی کے تجربات اور فن کارانہ احساسات کا نچوڑ ہے۔ اس میں اس کی شاعری اور مذہبی معتقدات دونو کا بہترین امتزاج ملتا ہے۔ خدا کے کاموں کے جواز میں فرشتوں کے زوال کی داستان بھی بیان کرنی ضروری تھی۔ اور ملٹن نے یہ بھی کیا ہے۔ اس بیان میں بعض ناقابل تشریح وجوہ کی بنا پر بعض ایسی چیزیں آگئی ہیں۔ جو اپنی جگہ پر بہت دلفریب ہیں۔ مگر نظم کے مرکزی خیال اور اس خیال کے ارتقا میں مخل انداز ہوتی ہیں۔ یہ بات خود ملٹن کو محسوس ہوئی۔ اگرچہ بہت بعد میں۔ اور چوتھے باب کے بعد اس نے اس نئے رنگ کو جو ایک ناخواندہ مہمان کی طرح خود بخود آگیا تھا۔ کوشش کر کے دور کر دیا۔ اور نظم کو اسی طرح ختم کیا۔ جس طرح وہ چاہتا تھا۔ مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا ملٹن اپنی نظم کے پہلے چار باب دوبارہ لکھنا نہیں چاہتا تھا۔ شاید وہ لکھ بھی نہیں سکتا تھا۔

ابلیس کی آمد دیکھئے :-

شیطان اب پاس آگیا۔ اور اپنی جگہ سے۔	Satan was now at hand, and from his seat
(وہ) عفریت کھسکتا ہوا آگے بڑھا۔ اتنی تیزی سے	The monster moving onward, came as fast
ہولناک قدم رکھتا ہوا (جن سے) دوزخ کانپنے لگی۔	With horrid strides Hell trembled as he strode

اس کی تعریف سنئے۔

وہ زبردست بڑا فرشتہ (شیطان) جس نے حال میں	That mighty leading angel, who of late
بہشت کے بادشاہ (خدا) کے خلاف بغاوت کی تھی۔ گو شکست پائی۔	Made head against Heaven's King though overthrown

خود اپنے متعلق اس کی کیا رائے ہے۔

وہ جو کہ ایسا ذہن رکھتا ہے جسے نہ وقت بدل سکتا ہے نہ مکان۔	..... one who brings a mind not to be changed by place or time
ذہن بجائے خود قائم ہے۔ اور اپنے میں آپ ہی ہے۔	The mind is its own place and in itself
وہ بہشت کو دوزخ بنا سکتا ہے اور دوزخ کو بہشت	Can make a heaven of hell and hell of heaven.

انسان کے بارے میں اس کا کیا خیال ہے۔ دیکھئے

اگر مجھے لڑنا ضروری ہی ہے	If I must contend
تو مجھ جیسے بہترین کو، بہترین کو مدمقابل بنانا چاہیئے۔ اُس کو	said he, Best with the best,
جس نے مخلوق کو بھیجا ہے۔ نہ کہ اُسے جو خود بھیجا گیا ہے۔	the sender not the sent.
اور پھر فوراً ہی۔	Or all at once

اُس کے عزم اور حوصلے کو دیکھیئے:-

اس سے کیا کہ میدان میں ہار ہوئی۔	What though the field be lost
یہ آخری ہار تو ہے نہیں!	All is not lost;
ناقابل تسخیر ارادہ۔	the unconquerable will.
اور بدلہ لینے کی تیاری، غیرفانی عداوت	And study of revenge, immortal hate
اور وہ ہمت جو نہ پست ہونے والی ہے۔ اور نہ اطاعت قبول کرنے والی ہے۔	A courage never to submit or yield
اور اتنا ہی نہیں کبھی شکست ماننے والی نہیں ہے	And what is else, not to be overcome
یہ شان ہے جسے اُس (خدا) کا غضب	That glory never shall his wrath
یا جلال مجھ سے لے نہیں سکتا	Or might extract from me

اپنے مشیر عزازیل کو یوں غیرت دلاتا ہے:-

گرے ہوئے کروبی! کمزور ہونا ہی مصیبت ہے	Fallen cherub to be weak is miserable
کرنے میں بھی۔ بھگتنے میں بھی۔	Doing or suffering.

دوسرے ساتھیوں سے یہ کہتا ہے۔

یہاں آخر ہم آزاد تو رہیں گے	Here at last we shall be free
حکومت کی اُمنگ قابل قدر ہے چاہے دوزخ ہی کی کیوں نہ ہو	To reign is worth ambition though in hell
بہتر ہے دوزخ میں حکومت کرنا۔ بہ نسبت بہشت کی غلامی کے۔	Better to reign in Hell than serve in Heaven
جاگو۔ اٹھو یا ہمیشہ کے لئے ذلیل رہو	Awake, arise or be for ever fallen

علم و آگہی پر جو بندشیں شجر ممنوعہ کی صورت میں عائد ہیں انہیں یہ کہہ کر توڑنا چاہتا ہے:-

کیا جاننا (علم) گناہ ہے؟	Can it be sin to know?
کیا وہ (اس کی سزا) موت ہے؟	Can it be death
اور کیا وہ (فرشتے) ٹکے ہوئے ہیں صرف جہالت پر؟	And do they only stand by ignorance.

اپنے اور خدا کے متعلق یہ کہتا ہے:-

جس کی عقل برابری کرتی ہے اور جسے طاقت نے ہی بڑے سے بڑا اور خود اپنا ہمسر بنایا ہے	Whom reason hath equalled force hath made supreme. Alone his equal.

ملٹن کو ابلیس سے جو دلچسپی تھی۔ وہ اگرچہ ایک بڑی حد تک اس قسم کی تھی۔ جو ایک خالق کو اپنی مخلوق سے ہوتی ہے۔ ابلیس ملٹن کی تخیل کا پیداوار تھا۔ مگر قیاس یہ کہتا ہے۔ کہ بات اس سے آگے تھی۔ ایک باغی سردار میں وجاہت ظاہری کے علاوہ دوسری باطنی خوبیاں بھی موجود تھیں۔ شاعر ملٹن کے لئے ضرور کشش رکھتا تھا۔ مگر کیا بات تھی۔

جس کی وجہ سے وہ یزدانی قوانین کی تشریح اور تفسیر کرنے کی بجائے شیطانی اعمال کی توجیہ میں مصروف ہوگیا۔ چوتھی کتاب کے بعد اُسے اس کا احساس ہوا۔ کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اور کدھر جا رہا ہے اور پھر سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا۔ کہ وہ تصویر پر جسمانی اور روحانی کثافتوں کے اتنے دھبے ڈال دے۔ کہ ساری شخصیت دھندلی ہو کر رہ جائے۔

ملٹن کا خدا بالکل مطلق العنان ہے۔ اس کا دل پتھر ہے اُسے ابلیس سے جنگ میں اپنی شکست کا اندیشہ بھی ہے اس لئے وہ اپنے بیٹے سے اپنے فرشتوں کو جمع کرنے کو کہتا ہے۔ مگر ملٹن کا شیطان اس خدا سے بالکل مختلف ہے۔ وہ شجاعت و فراست، ہمت و جرأت، صبر و استقلال۔ رحم و کرم اور سعی و محنت کا ایک بے مثل پیکر ہے۔ ملٹن نے اپنے تخیل کی ساری بلندی اور اپنی فہم و فراست کی ساری گہرائی اُسے بخشی ہے۔ وہ شکست سے ہمت نہیں ہارتا۔ مایوسیوں اور ناکامیوں سے مُنہ نہیں موڑتا۔ اُس کا دل نہیں سیماب ہے جو اپنی گذشتہ عظمت حاصل کرنے کو مضطرب ہے۔ جہاں کوئی نہیں جا سکتا وہاں وہ پہنچ جاتا ہے۔ جو کام کوئی نہیں کر سکتا۔ وہ کر لیتا ہے وہ اپنے ساتھیوں کی سقیم حالت کو دیکھ کر روتا ہے۔ اور آدم و حوا کی معصومیت پر ترس کھاتا ہے۔ وہ اُٹھتا ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے طوفان آ رہا ہے۔ اور گرتا ہے۔ تو آسمان سے تارے ٹوٹتے ہیں۔ وہ اُڑتا ہے۔ تو فضائے بسیط کو گھیر لیتا ہے۔ اور اُس کی آمد سے دوزخ تھرّانے لگتی ہے۔

"فردوس گم شدہ" جب پہلی بار شائع ہوئی۔ تو اُس پر یہ عنوان نہ تھا۔ جواب ملتا ہے (۱)۔ لیکن اگر یہ سوال کیا جائے۔ کہ نظم کا ہیرو کون ہے؟ تو اس کا جواب وہی ہو گا۔ جو ڈرائیڈن۔ گوئٹے۔ لارڈ چیسٹرفیلڈ۔ پروفیسر میسن اور دوسرے حضرات دے چکے ہیں۔ یعنی شیطان۔

شیطان ہمیں (Prometheus) کی یاد دلاتا ہے۔ جس نے یونانی خدا (Zeus) سے بغاوت کی تھی اس کی شخصیت کو "شیلے" نے اچھی طرح بے نقاب کیا ہے دونوں باغی ہیں۔ اور دونوں کی بغاوت کے اسباب اوّل تو معمولی نہیں۔ اور دوسرے سب پر ہماری نظر نہیں۔ ابلیس کا وہ غرور جس نے اُسے سجدہ نہ کرنے پر مجبور کیا تھا۔ اُسے ہر خاکستر سے ایک نیا نشیمن تعمیر کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ وہ اُس کی مدد سے اُمید کے اُس ٹوٹے ہوئے آبگینے کو پھر جوڑتا ہے۔ جس میں پیہم شکستوں سے سینکڑوں بال پڑ گئے ہیں۔ آدم کہہ سکتے ہیں۔ کہ اُنھوں نے ایک ایسے دشمن سے شکست کھائی۔ جو اُن کے شان شایاں تھا۔

بات یہ ہے کہ شیطان اور ملٹن دونوں میں لادینی کے جراثیم ہیں۔ دونو آگہی و عرفان پر شدید بندشوں کو نامناسب قرار دیتے ہیں۔ دونو ایک طرح کے مادہ پرست ہیں۔ شیطان صرف ملٹن کا ایک کردار نہیں۔ وہ ملٹن کے دماغ کا ایک حصہ ہے۔ وہ خود ملٹن ہے۔ پروفیسر سرات (Saraut) کی رائے ہے۔ کہ ملٹن کے اندر شیطان موجود تھا۔ اور وہ اُسے نکالنا چاہتا تھا۔ اور اس طرح اُس نے اپنے دل کے بوجھ کو ہلکا کیا۔ اور اپنے اندر والے شیطان کا مقابلہ کیا۔ اُس نے اسے نظم کے سانچے میں ڈھال کر اپنے آپ سے الگ کر دیا۔ ملٹن بدی سے آنکھیں چار کرنے کی جرأت رکھتا تھا۔ اس کی قوت، اُس کی دلکشی، اس کی رعنائی، ان سب سے واقف تھا۔ اور اُنہیں کے داؤں سے اُنہیں شکست دے سکتا تھا۔ وہ یہ نہ جانتا تھا۔ کہ دوسرا پرستار یزداں ہے۔ وہ اپنے نفس کو کچلنا نہیں چاہتا تھا۔ اُس کا مقابلہ کرنا چاہتا تھا۔ ملٹن نے شیطان سے بچنے کے لئے شیطان کو نظم میں بند کر دیا۔ وہ خود محفوظ ہو گیا۔ مگر خبر نہیں۔ اُس کے پڑھنے والے پر کیا گزرے

اقبال نے بھی شیطان کا ایک خاص تصور پیش کیا ہے۔ یہ تصور کئی معنوں میں ملٹن کے تصور سے بلند ہے۔ باوجود تمام باتوں کے ملٹن کی حیثیت شیطان کے سامنے مجبور و بے بس کی سی ہے۔ اقبال اپنے آپ کو آشنائے راز سمجھتے ہیں۔ وہ جبریل کی ہم نوائی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اور ابلیس کو اس وجہ سے اپنی برادری میں آنے اور اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ کہ خود اپنے مرتبے سے واقف ہیں۔ پیام مشرق میں "تسخیر فطرت" کے عنوان سے ایک نظم ہے۔ جس میں "براؤننگ" کے سے ڈرامائی ٹکڑے (Dramatic monologues) ملتے ہیں۔

"انکار ابلیس" ملاحظہ ہو۔

نوری نادان نیم سجدہ بآدم برم
او بہ نہاد است خاک، من بہ نژاد آذرم
مے تپد از سوز من خون رگ کائنات
من بہ دوِ صرصرم، من بہ غوِ تندرم
از نم من موجۂ، چرخ سکون ناپذیر
نقش گر روزگار تاب و تب جوہرم
پیکر انجم ز تو، گردش انجم ز من
جاں بجہاں اندرم زندگیٔ مضمرم
تو بہ بدن جاں دہی شور بجاں من دہم
تو بہ سکوں رہ زنی من بہ تپش رہبرم
من ز تنک مایگاں گدیہ نکردم سجود
قاہرِ بے دوزخم داورِ بے محشرم
آدم خاکی نہاد، دوں نظر و کم سواد
زاد در آغوش تو، پیر شود در برم

اغوائے آدم کے چند شعر ملاحظہ ہوں:-

ہیچ نباید ز تو غیر سجود نیاز
خیز چو سرو بلند اے بعمل نرم گام
کوثر و تسنیم برد از تو نشاطِ عمل
گیر ز مینائے تاک بادۂ آئینہ فام
قطرۂ بے مایہ اے گوہر تابندہ شو
از سر گردوں بیفت گیر بدریا مقام
تو نشناسی ہنوز، شوق بمیرد ز وصل
چیست حیاتِ دوام؟ سوختن ناتمام

اسی خیال کی بنا پر "جاوید نامہ" میں ابلیس کو خواجۂ اہلِ فراق کا لقب دیا گیا ہے۔ اس کا تعارف یوں ہوتا ہے ؎

رند و ملاؤ حکیم و خرقہ پوش
در عمل چوں زاہدانِ سخت کوش
فطرتش بیگانۂ ذوقِ وصال
زہدِ او ترکِ جمالِ لایزال
اندکے در وارداتِ او نگر
مشکلاتِ او ثباتِ او نگر
غرق اندر رزم خیر و شر ہنوز
صد پیمبر دیدہ و کافر ہنوز

اقبال کے استفسار پر ابلیس یہ جواب دیتا ہے ؎

نے مرا افرشتہ نے چاکرے
وحی من بے منتِ پیغمبرے
نے حدیث و نے کتاب آوردہ ام
جانِ شیریں از فقیہاں بردہ ام
رشتۂ دیں چوں فقیہاں کس نرشت
کعبہ را کردند آخر خشت خشت
کیش ما را ایں چنیں تاسیس نیست
فرقہ اندر مذہبِ ابلیس نیست
از وجودِ حق مرا منکر مگیر
دیدہ بر باطن کشا، ظاہر مگیر

یہ شعر دیکھئے ؎

"من بلیٰ" در پردۂ "لا" گفتہ ام
گفتۂ من خوشتر از ناگفتہ ام
تا نصیب از دردِ آدم داشتم
قہرِ یار از بہرِ او نگذاشتم
شعلہ ہا از کشتِ زارِ من دمید
او ز مجبوری بہ مختاری رسید
زشتیٔ خود را نمودم آشکار
با تو دادم ذوقِ ترک و اختیار

نالۂ ابلیس کے نام سے اس نظریئے کا دوسرا پہلو دکھلایا جاتا ہے ؎

اے خداوندِ صواب و ناصواب
من شدم از صحبتِ آدم خراب
ہیچ گہ از حکمِ من سر بر نتافت
چشم از خود بست و خود را در نیافت
صیدِ خود صیاد را گوید بگیر
الاماں از بندۂ فرماں پذیر
از چنیں صیدے مرا آزاد کن
طاعتِ دیروزۂ من یاد کن
پست ازو آں ہمتِ والائے من

وائے من، اے وائے من، اے وائے من

بندۂ صاحب نظر باید مرا

یک حریف پختہ تر باید مرا

آں چناں تنگ از فتوحات آدم

پیشش تو بہر مکافات آدم

منکر خود از تو مے خواہم، بدہ

سوئے آں مرد خدا راہم بدہ

اے خدا یک زندہ مرد حق پرست

لذتے شاید کہ یابم در شکست

"بال جبریل" میں ایک نظم ہے۔ جس کا عنوان ہے جبریل و ابلیس۔ میرے خیال میں یہ اُردو کی بہترین نظموں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے۔ اس کے ایک ایک شعر میں جو معانی و مطالب آ گئے ہیں۔ اُن کی تفسیر کے لئے دفتر چاہیئے۔ نظم ایک مکالمے کی صورت میں ہے۔ جبریل ایک مشفقانہ اور سرپرستانہ لہجے میں دریافت کرتے ہیں ؎

ہمدم دیرینہ کیسا ہے جہان رنگ و بو

ابلیس کا جواب انسانیت کی پوری تاریخ پر محیط ہے۔

سوز و ساز و درد و داغ و آرزو و جستجو

اب کی بار جبریل، ابلیس کو وہ گلیاں یاد دلاتے ہیں۔ جن میں دونوں کی جوانی گزری تھی ؎

ہر گھڑی افلاک پر رہتی ہے تیری گفتگو

کیا نہیں ممکن کہ تیرا چاک دامن ہو رفو

ابلیس کس بلندی سے پکارتا ہے ؎

آہ اے جبریل تو واقف نہیں اس راز سے

کر گیا سرمست مجھ کو ٹوٹ کر میرا سبو

اب یہاں میری گزر ممکن نہیں ممکن نہیں

کس قدر خاموش ہے یہ عالم بے کاخ و کو

جس کی نومیدی سے ہو سوز درون کائنات

اُس کے حق میں تقنطوا اچھا ہے یا لاتقنطوا

مقرب بارگاہ فرشتے کے ترکش میں ایک تیر طعن و طنز کا رہ گیا ہے۔ فرماتے ہیں حضرت جبریل ؎

کھو دیئے انکار سے تو نے مقامات بلند

چشم یزداں میں فرشتوں کی رہی کیا آبرو

ابلیس کا جواب اُردو شاعری کے لئے مایۂ ناز ہے۔ خیالات کی بلندی سے الفاظ کس قدر بلند ہو گئے ہیں ؎

ہے مری جرأت سے مشت خاک میں ذوق نمو

میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پو

دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزم خیر و شر

کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے، میں کہ تو

خضر بھی بے دست و پا، الیاس بھی بے دست و پا

میرے طوفاں، یم بہ یم، دریا بدریا، جو بجو

گر کبھی خلوت میسر ہو، تو پوچھ اللہ سے

قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو؟

میں کھٹکتا ہوں دل یزداں میں کانٹے کی طرح

تو فقط اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو

ایک دوسرا تصور ابلیس کی عرضداشت میں ملاحظہ ہو ؎

کہتا تھا عزازیل خداوند جہاں سے

پرکالۂ آتش ہوئی آدم کی کف خاک

جاں لاغر و تن فربہ و ملبوس بدن زیب

دل نزع کی حالت میں، خرد پختہ و چالاک

ناپاک جسے کہتی تھی مشرق کی شریعت

مغرب کے فقیہوں کا یہ فتویٰ ہے کہ ہے پاک

تجھ کو نہیں معلوم کہ حوران بہشتی

ویرانی جنت کے تصور سے ہیں غم ناک

جمہور کے ابلیس ہیں ارباب سیاست

باقی نہیں اب میری ضرورت تہ افلاک

"ضرب کلیم" میں تقدیر کے عنوان سے اقبال نے محی الدین ابن عربی کا تخیل پیش کیا ہے۔ ابلیس خدا سے کہتا ہے۔ کہ مجھے آدم سے بیر نہ تھا۔ مگر تیری مشیت میں میرا سجدہ کرنا تھا ہی نہیں۔ بارگاہ یزداں سے سوال ہوتا ہے ؎

کب کھلا تجھ پر یہ راز انکار سے پہلے کہ بعد

ابلیس جواب دیتا ہے ؎

بعد، اے تیری تجلی سے کمالات وجود

اب ارشاد ربانی ہوتا ہے ؎

پستیٔ فطرت نے سکھلائی ہے یہ حجت اُسے
کہتا ہے تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود
دے رہا ہے اپنی آزادی کو مجبوری کا نام
ظالم اپنے شعلۂ سوزاں کو خود کہتا ہے دُود

ان اشعار سے اقبال کا خاص تصوّر اچھی طرح واضح ہو ہوگیا ہوگا۔اس کے علاوہ کہیں رسمی تصوّر بھی ملتا ہے۔مثلاً اِس نظم میں جہاں ابلیس اپنے سیاسی فرزندوں سے کہتا ہے ؎

لاکر برہمنوں کو سیاست کے پیچ میں
زناریوں کو دیر کہن سے نکال دو
فکرِ عرب کو دے کے فرنگی تخیلات
اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو

مجلس اقوام کے متعلق ارشاد ہوتا ہے ؎

ممکن ہے کہ یہ داشتۂ پیرک افرنگ
ابلیس کے تعویذ سے کچھ روز سنبھل جائیے

لیکن ہمیں اس سے چنداں بحث نہیں۔ ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ اقبال کا یہ خاص نقطۂ نظر کیا معنے رکھتا ہے۔اور کہاں تک اُن کے عام نقطۂ نظر سے ہم آہنگ ہے۔اس لئے کہ اقبال کے یہاں متضاد باتیں بہت کم ہیں۔اور تمام پردوں سے ایک ہی راگ نکلتا ہے۔

اقبال انسانیت کو فطرت کا محبوب ترین اور مکمل ترین جوھر سمجھتے ہیں۔اُن کے خیال میں فطرت ہستی ابھی خوب سے خوب تر کی جستجو میں ہے۔اُن کا فلسفۂ حیات' زندگی اور موت دونوں کا ایک بلند تصوّر رکھتا ہے۔دوسرے الفاظ میں وہ بندگی کے مقاصد اور امکانات دونوں سے آگاہ ہیں۔وہ ایک مذہبی آدمی ہیں۔اور اسلامی ارکان کی تلقین اور بارگاہ رسالت سے اظہارِ عقیدت دونوں میں بہت آگے ہیں۔مگر باخدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار کے شاید وہ بھی قائل ہیں۔وہ اپنے آپ کو مقرب بارگاہ سمجھتے ہیں۔اور ایک مقرب بارگاہ کی شوخی و گستاخی اکثر حد درجہ عقیدت کی غماز ہوتی ہے علاوہ ازیں شاعر تصویر کا دُوسرا رُخ بھی اکثر پیش کرتا رہتا ہے۔دُنیا جس پہلو کی طرف سے بے اعتنائی برتتی ہے۔شاعر اُسی کو دکھاتا ہے۔کہیں کہیں اسلوب کی خاطر طرزِ بیان میں ایک شوخی ہوتی ہے۔کہیں رفعت تخیل پر شاعر زمان و مکان کے قیود سے بلند ہو جاتا ہے۔یہ تمام چیزیں مل کر ابلیس کے اس خاص تصور کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔

ملٹن جب ابلیس کی شخصیت پر رائے زنی کرتا ہے۔تو اپنی نظم کی کامیابی کے لئے یا اپنے دل کا چور نکالنے کے لئے کردار نگاری کی تکمیل یا اپنے سے انتقام ان میں سے ایک یا دونوں جذبات کی کارفرمائی کا ہمیں قائل ہونا پڑیگا۔بہرحال اُس نے ابلیس کی جو تصویر پیش کی۔اُس میں وہ اپنے اندازے سے زیادہ کامیاب ہو گیا۔مصوّر کبھی کبھی ایک چھوٹا سا خیال لے کر اُٹھتا ہے۔مگر رنگوں کی آمیزش سے اُس میں اور بھی نئے معنی پیدا ہو جاتے ہیں۔اقبال کے یہاں یہ بات نہیں۔وہ جان بوجھ کر خیر و شر کے مسئلے پر ایک نئے نقطۂ نظر سے روشنی ڈالتے ہیں۔اس نقطۂ نظر کے کئی پہلو ہیں۔ایک جگہ کہتے ہیں ؎

قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے ؎

من شدم از صحبتِ آدم خراب

دوسری جگہ لکھتے ہیں

جمہور کے ابلیس ہیں اربابِ سیاست

ابلیس کی نافرمانی میں جہاں اگلے شعرا کو صرف غرور' نافرمانی اور رُسوائی نظر آتی ہے۔اقبال اُس میں اس دُنیا کی رونق ' خیر و شر کی تمام کشمکش اور محفل ہستی کی ہنگامہ آرائی دیکھتے ہیں۔وہ "اصغر" کے ہم خیال ہیں۔کہ ؎

کُفار کا مرجانا خود مرگِ مسلماں ہے

اور شر کی قوتوں کا زوال' دوسرے معنے میں خیر و برکت کا زوال ہے۔وہ خدا کی مصلحتوں سے آگاہ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور اس وجہ سے پکارتے ہیں ؎

جس کی نومیدی سے ہو سوزِ درونِ کائنات
اُس کے حق میں تقنطوا اچھا ہے یا لا تقنطوا

اسی وجہ سے وہ ابلیس کو خواجۂ اہل فراق کا لقب دیتے ہیں۔جس کی وحی "بے منت پیغمبر" ہے۔جس کے مذہب کے اندر فرقے نہیں۔جس نے "نہیں" کے پردے میں "ہاں" کہا۔اور جس نے اپنا سارا حاصل اس لئے جلا دیا۔کہ اُس پر

انسان کی کھیتی لہلہائے۔ جس نے اس وجہ سے انکار کیا۔ کہ یہ انکار اقرار سے زیادہ انسانیت کی ترقی اور بہتری کے لئے ضروری تھا گویا یہ ایک قربانی تھی۔ جو اس لئے کی گئی۔ کہ اس سے انسانیت کو اپنی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے کا موقع ملے ؂

یہی ابلیس ہے۔ جو اس زمانے کے کمزور حریفوں سے پریشان ہے۔ اُس کا شکار اس آسانی سے اسکو مل جاتا ہے۔ کہ فتح میں کوئی لطف باقی نہیں رہا۔ وہ خدا سے "حریف پختہ تر" مانگتا ہے۔ جس سے شکست میں بھی کچھ لطف حاصل ہو ؂

اے خدا ایک زندہ مردِ حق پرست
لذّتے شاید کہ یابم در شکست

اسی خیال کو ایک اور انداز سے بھی پیش کیا گیا ہے۔ شکار کے آسانی سے مل جانے کے معنی یہ بھی ہیں۔ کہ اب حقیقت عام ہو گئی ہے۔ دوسرے الفاظ میں شیطنت چونکہ ہر جگہ پھیل چکی ہے۔ اور اپنا گھر بنا چکی ہے۔ اور نسل، قومیت، کلیسیا، سلطنت تہذیب رنگ وغیرہ کے بُت بنا کر اُن کی پرستش کو مذہب، تہذیب، انسانیت کا نام دے رہی ہے۔ اس لئے شیطان کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ شیطان اپنا فرض پورا کر چکا ؂

جمہور کے ابلیس ہیں اربابِ سیاست
باقی نہیں اب تیری ضرورت تہِ افلاک

خیر و شر کے مسئلے سے دلچسپی فلسفے کے اہم مباحث میں سے ہے۔ پہلے لوگ یہ سوچا کرتے تھے۔ کہ ایک آلپین کی نوک پر کتنے فرشتے رقص کر سکتے ہیں۔ اور بڑی کوشش کے بعد دس ہزار کی تعداد معیّن ہوئی تھی۔ اب خیر و شر کے اسباب و علل پر غور کرتے ہیں۔ اور اُس آزادیٔ خیال سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ جو اس دور کی پیداوار ہے۔ مغربی ادب میں اس آزادیٔ خیال کا مظاہرہ اتنا عام ہے۔ کہ اُس کی مثالیں دینے کی ضرورت نہیں۔

مگر اُردو میں بھی یہ چیز نئی نہیں ہے۔ اوپر یہ کہا جا چکا ہے کہ جدید نسل اُن محوروں پر گردش کرتی ہے۔ جو اقبال نے بنائے ہیں۔ چنانچہ اقبال کی مذہبیت سے متاثر ہو کر "حفیظ" نے شاہنامہ لکھا۔ اور اسی اقبال سے "جوش" نے شعلہ و شبنم کی انقلابی اور دوسری جدید نظموں کے لئے تخیل مستعار لیا۔ ایک ہی خرمن ہے جس سے ہر ایک نے اپنی استعداد اور رجحان کے مطابق خوشہ چینی کی ہے۔ اقبال کے یہاں یہ آزاد خیالی، بیدینی اور لامذہبیت کی وجہ سے نہیں ہے۔ بلکہ جدّتِ خیال اور ندرت ادا کی پروردہ ہے۔ مگر دوسروں کے یہاں دوسرے وجوہات بھی ہیں۔ چنانچہ گذشتہ چند سالوں میں نظم و نثر دونوں میں یہ آزاد خیالی ملتی ہے۔ جو کہیں کہیں بے دینی اور لامذہبیت کی حد تک پہنچ گئی ہے۔ "جوش" کی بعض رباعیات اور نظمیں مضامین فلک پیما۔ انگارے۔ "سجاد انصاری" کا مشہور ڈراما 'روزِ جزا' اور اُن کے مضامین حقیقت عریاں وغیرہ اس سلسلے میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ ان میں سے صرف 'روزِ جزا' کا ذکر ایک خاص وجہ سے ضروری ہے۔ سجاد انصاری اس راز کو صاف صاف بیان کرتے ہیں۔ جسے اقبال نے صرف اشاروں اشاروں میں بیان کیا ہے۔ اُن کا ابلیس اُن کے خدا کے رُوبرو خلعتِ بخشش سے سرفراز ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وہی اُس کے مصالح سے سب سے زیادہ خبردار ہے۔ اقبال یہاں تک نہیں پہنچے ؂

اپنی ایک نظم میں اُنہوں نے "نیٹشا" کے متعلق لکھا ہے کہ

قلب او مومن، دماغش کافر است

لیکن غالباً یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا۔ کہ اگرچہ اُن کے قلب کے مومن ہونے میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اُن کے دماغ میں کافرانہ انداز کارفرما ضرور ہے۔ "گرئٹے" نے شاید اس نکتے کو پیش نظر رکھ کر کہا تھا۔ کہ ہر شاعر کا تھوڑا بہت بیدین ہونا بھی ضروری ہے (A poet must be something of a heathen) دیکھئے! اقبال کے اس شعر میں شاعری اور اس تھوڑی سی بیدینی کا کتنا اچھا اجتماع موجود ہے۔ وہ اجتماع جو "جوش" کو "یزداں شکار" کی ترکیب میں بھی نصیب نہ ہوا ؂

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے ٭ یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

"ہندوستانی" الہ آباد

صفحۂ اطفال

"پیارا دیس"

ہندوستان ہمارا پیارا وطن ہے - ہم سب ہندوستانی ہیں - یوں مذہب کی رُو سے ہم میں کوئی ہندو ہے - کوئی مسلمان - کوئی سکھ ہے - کوئی عیسائی - اور کوئی بدھ ہے - اور کوئی جین - لیکن جہاں تک قومیت کا تعلق ہے - ہم سب ایک ہیں - سب ایک ہی آب و ہوا میں رہتے - ایک ہی طرح کا پانی پیتے ہیں - اور ایک ہی سورج کی روشنی سے فائدہ اُٹھاتے ہیں ۔

جب وطن پر کوئی مصیبت آتی ہے - تب بھی سب کا یکساں نقصان ہوتا ہے - کوئٹہ میں زلزلہ آیا - تو اس کی تباہ کاریوں نے ہندو مسلمان کا کوئی امتیاز نہیں کیا - یہ نہیں ہُوا - کہ ہندو کا تو مکان گر جائے - اور مسلمان کا جُوں کا توں کھڑا رہے - سیلاب آتے ہیں - ان کا بہاؤ بھی سکھ یا عیسائی میں کوئی فرق نہیں کر دانتا - سبھی اس کی رَو میں بہ جاتے ہیں - خواہ ان کا تعلق کسی مذہب سے ہو -

پھر اگر ایسا ہے - تو ہم آپس میں کیوں امتیاز کریں - کیوں نہ سب ایک ہو جائیں - آپس میں پیار و محبّت بڑھائیں - اور وطن کی مشکلات کو دُور کرنے کی مشترکہ اور متحدہ کوشش کریں -

بعض مُصیبتیں ایسی ہیں - جن کا کوئی علاج نہیں - مثلاً زلزلہ اور سیلاب - لیکن بعض مُصیبتیں ایسی بھی ہیں - جن کا متحدہ کوششوں سے تدارک ہو سکتا ہے - آؤ ہم سب ان نیک کوششوں میں لگ جائیں ۔

(گوپال متّل)

"ہمارا مذہب"

ہمارا مذہب ہمیں نیکی اور پاکیزگی کا سبق دیتا ہے - پاکیزگی کا صرف یہ مطلب نہیں - کہ ہم

اُجلے کپڑے پہن لیں - بلکہ یہ کہ اپنے قلب کو بھی صاف رکھیں - صاف ستھرے کپڑے پہننا نہایت ضروری ہے - اس سے ہماری صحت اچھی رہتی ہے - ہمارے ساتھی ہمیں اچھی نظروں سے دیکھتے ہیں - اور بزرگ ہمیں پیار کرتے ہیں - لیکن یہ باتیں صرف اسی وقت ممکن ہیں - جب اچھے کپڑوں کے ساتھ ہماری عادات بھی اچھی ہوں -

ہم اپنے بھائی بہنوں اور ساتھیوں کے ساتھ محبّت اور پریم سے پیش آئیں - ان کی طرف سے اپنے دل میں کدورت نہ رکھیں - بات بات پر ان سے جھگڑا نہ کریں - اور ایک دوسرے کی چغلی نہ کھائیں -

ہم اپنے شہر اور محلّے کے بڑے بوڑھوں کی عزت کریں - اور جہاں تک ہو سکے - ان کی خدمت سے گریز نہ کریں - بزرگوں کی دعاؤں میں بڑی تاثیر ہوتی ہے - اگر ہم حُسنِ خدمت سے ان کو خوش کر سکیں - اور ان کی دعائیں لے سکیں - تو ہماری زندگیاں سُدھر سکتی ہیں - خدا ہم سے خوش ہوگا - ہم پر اپنی برکتیں نازل کرے گا - اور ہمیں ہر قسم کی مصیبت سے بچائے گا -

بچّو! جب نیکی اور پاکیزگی میں اس قدر فائدے ہیں - تو ہم کیوں نہ اس کی عادت ڈالیں - اور اپنے آپ کو خدا کی رحمتوں کا اہل ثابت کریں +

(گوپال متل)

"حسینہ اور ایک درندہ"

کسی شہر میں ایک امیر سوداگر رہتا تھا - اس کی تین بیٹیاں تھیں - دو تو بڑی لڑکیاں بدصورت بھی تھیں - اور چڑچڑا مزاج بھی - لیکن سب سے چھوٹی لڑکی اس قدر حسین اور موہنی تھی - کہ اس کا نام حسینہ رکھا گیا -

قسمت کی بات کہ سوداگر نے تمام روپیہ اللے تللوں میں ضائع کر دیا - اور بہت غریب ہو گیا - آخر اُس نے اپنا مکان بیچ ڈالا - اور اپنی بیٹیوں کے ہمراہ ایک کٹیا میں زندگی بسر کرنے لگا - وہ اتنا مفلس تھا - کہ دو روپیہ ماہوار پر ایک نوکر تک رکھنے کی توفیق نہ تھی - حسینہ نے گھر کا سارا کام کاج اپنے ذمہ لے لیا - بڑی لڑکیاں سورج نکلنے تک بستر پر پڑی رہتیں لیکن حسینہ نے ان کے متعلق کبھی اپنے باپ سے شکایت نہ کی - وہ ان کی بھی خدمت کرتی تھی -

ایک دن کا ذکر ہے - کہ سوداگر اپنے باغ میں کام

کر رہا تھا۔ کہ اسے کسی نے ایک لفافہ دیا۔ سوداگر نے لفافہ کھولا اور پڑھا۔ لکھا تھا۔ "اگر تم فلاں شہر میں چلے جاؤ۔ تو وہاں کسی نہ کسی کام پر لگ جاؤ گے"۔ وہ بڑا خوش ہوا۔ اور سفر کو چلنے کی تیاری کرنے لگا۔

"میں تمہارے لئے کیا لاؤں" اُس نے حسینہ سے پُوچھا۔ "ہمارے لئے خوبصورت کپڑوں کے دو جوڑے لیتے آئیں"۔ بڑی لڑکیوں نے حسینہ کے جواب دینے سے پہلے ہی چلا کر کہا۔ "اچھا میں تمہارے لئے دو جوڑے لیتا آؤں گا"۔ اس کے بعد سوداگر نے حسینہ سے پُوچھا "بیٹی جی! تم کیا چاہتی ہو؟"

حسینہ جانتی تھی۔ کہ اس کا غریب باپ اب قیمتی اشیا نہ خرید سکے گا۔ اس لئے اُس نے آہستہ سے کہا۔ "ابّا جان! گلاب کا ایک خوبصورت پھُول لے آئیں۔"

سوداگر سفر کے لئے چل پڑا۔ اور کئی ہفتوں کے بعد وہ منزل مقصود پر جا پہنچا۔ واپسی پر اس کی مایوسی کی کوئی حد نہ رہی جب اُس نے اپنے آپ کو ایک جنگل میں گُم پایا۔ وہ راستہ بھُول گیا تھا۔ وہ ایک بہت بڑے جنگل میں تھا۔ راستہ بتانے کو کوئی آدمی نظر نہ پڑا۔ آخر وہ راستہ دیکھنے کے لئے ایک درخت پر چڑھا۔ جہاں اُسے دُور سے روشنی نظر آئی۔ وہ درخت سے اُترا۔ اور گھوڑے پر سوار ہو کر جلد ہی ایک سمت چل نکلا۔ چلتے چلتے وہ ایک محل کے سامنے پہنچ گیا۔ وہ گھوڑے سے اُترا۔ اور سیڑھیوں پر چڑھنا شروع کر دیا۔ مکان کے اندر جا کر کیا دیکھتا ہے۔ کہ ہر کمرہ روشنی سے بُقعۂ نور بنا ہُوا ہے۔ گھر کے در و دیوار پکار رہے تھے۔ کہ یہ گھر کسی دولت مند اور صاحب نصیب کا گھر ہے۔ کمرے سجے پڑے تھے۔ اور ہر جگہ قیمتی اشیا قرینے سے رکھی ہوئی تھیں۔

سوداگر ایک بہت بڑے کمرے سے گزرا جس میں روشنی نے چار چاند لگا دیئے تھے۔ درمیان میں ایک خوبصورت میز رکھا تھا جس پر کھانے کی لذیذ اشیا پڑی تھیں۔ سوداگر بھُوکا تھا ہی۔ اُس نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ جب وہ ختم کر چکا۔ تو اُسے نیند نے آگھیرا۔ ساتھ ہی سونے کا کمرہ تھا۔ وہ وہاں گیا۔ اور بستر پر لیٹ کر سو گیا۔

صبح کے وقت جب وہ اُٹھا۔ تو لباس بدلنے کے لئے گیا۔ کیا دیکھتا ہے۔ کہ اس کے پُرانے لباس کی جگہ ایک نیا اور نہایت صاف لباس پڑا ہے۔ وہ یہ دیکھ کر بہت حیران ہُوا۔ اُس نے کپڑے پہنے۔ اور کھانے کے کمرے کی طرف گیا۔ ناشتہ پہلے ہی تیار پڑا تھا۔

لذیذ ناشتہ کے بعد سوداگر باغ میں چہل قدمی کے لئے نکلا۔ قسم قسم اور رنگا رنگ کے پھُولوں سے اس

کی آنکھوں میں طراوت آگئی۔ اور دھیمی دھیمی خوشبوؤں سے اس کا دماغ معطر ہو گیا۔ خاص کر ایک حسین گلاب کے پھول نے اس کو حسینہ کی یاد دلادی۔ سوداگر جھکا۔ اور جھک کر ایک ننھا سا غنچہ شاخ سے توڑ کر اپنے کوٹ میں لگا لیا۔ تاکہ اپنی پیاری بیٹی حسینہ کو دے۔ پھول کا توڑنا ہی تھا۔ کہ اسے ایک آواز سنائی دی۔ سوداگر نے سر اٹھایا۔ تو ایک نہایت ڈراؤنی صورت اس کے سامنے آگئی۔ اس کا تمام جسم آدمی کا تھا۔ لیکن چہرہ ایک بدصورت اور کریہہ شکل کے درندے کا تھا۔

سوداگر کانپ اٹھا۔

"ناشکرے سوداگر" درندے نے گرج کر کہا۔ "کیا میں نے تم کو کھانا نہیں دیا۔ جب تم بھوکے تھے۔ اور کیا میں نے تم کو رات کے آرام کے لئے سارا سامان مہیا نہیں کیا؟ اور تم مجھ کو اس کا صلہ یہ دے رہے ہو۔ کہ میرے پھول چرا رہے ہو۔ ناشکر گزاری ایک ایسا گناہ ہے۔ جس کو میں معاف نہیں کر سکتا۔ ایک گھنٹے کے اندر میں تم کو مار ڈالونگا۔"

"مجھے معاف کر دو۔ میں التجا کرتا ہوں۔ سوداگر اپنے گھٹنوں پر جھک کر استدعا کرنے لگا۔ میں نے صرف ایک پھول اپنی بچی کے لئے توڑا ہے۔ اگر میں نے پہلے تم کو دیکھ لیا ہوتا۔ تو میں تمہارا دلی شکریہ ادا کرتا کہ تم نے مجھے اس قدر آرام دیا۔"

کچھ دیر کی التجاؤں کے بعد درندے نے اس شرط پر غریب سوداگر کو معاف کر دینا منظور کر لیا۔ کہ وہ گھر جانے پر جو پہلی جاندار چیز دیکھے۔ وہ اس درندے کو دے دے۔ سوداگر نے سوچا۔ کہ اس کو خوش آمدید کہنے کے لئے ہمیشہ اس کا کتا پہلے آیا کرتا ہے۔ لہذا وہی کتا وہ اس درندے کے حوالے کر دیگا۔ یہ سوچ کر سوداگر نے وعدہ دے دیا۔ اور چلا گیا۔ گھر پہنچ کر جب سب سے پہلے اس کی نظر حسینہ پر پڑی۔ تو وہ خوف کے مارے کانپ اٹھا۔

"آہا! کس قدر خوبصورت پھول ہے۔" حسینہ نے اپنے ابا کا ہاتھ چومتے ہوئے کہا۔

"افسوس" غریب سوداگر نے غم زدہ ہو کر کہا۔ "تم نہیں جانتیں۔ مجھے یہ کتنا گراں پڑا ہے۔" پھر سوداگر نے اپنی لڑکی کو تمام قصہ سنایا۔

"میری غریب بیٹیو! جب میں چلا جاؤنگا۔ تو تم کیا کرو گی۔ میں نہیں جانتا۔" یہ کہہ کر اس نے قصہ کو ختم کیا۔

"لیکن تم تو نہیں جا رہے۔" حسینہ نے بہادری سے جواب دیا۔ "کیونکہ تمہاری جگہ میں جاؤنگی۔"

سوداگر نے بہتیرا سمجھایا۔ لیکن حسینہ نہ مانی۔ دوسرے روز دونو اس محل کی طرف روانہ ہوئے۔ جہاں ان

کو نہایت عمدہ کھانا ملا - ابھی اُنہوں نے کھانا ختم بھی
نہ کیا تھا - کہ وہی درندہ موجود ہُوا - اُس نے حسینہ
کی طرف دیکھا - اور حسینہ نے اپنی آنکھیں اُٹھائیں -
حسینہ مارے ڈر کے کانپنے لگی - اور اَبّا کے ساتھ چمٹ
گئی یہ کس قدر خوفناک درندہ ہے - وہ مجھے مار ڈالیگا"
وہ یہ سوچ رہی تھی -

لیکن حسینہ جیسی خوبصورت لڑکی کو درندہ بھی مارنا
نہ چاہتا تھا - درندے نے سوداگر سے اس کو چھوڑ جانے
کے لئے کہا اور اطمینان دلایا - کہ حسینہ کو کوئی تکلیف
نہ دے گا -

سوداگر غم سے سر جھکائے گھوڑے پر سوار ہو
کر چلا گیا - اور حسینہ اتنے بڑے محل میں اکیلی رہ گئی -
دن بھر درندہ بالکل حسینہ کے سامنے نہ آیا - اور رات
کو اُس نے حسینہ کے رہنے کے لئے ایک چھوٹا مگر
خوبصورت کمرہ دکھایا - اس کمرہ کے دروازے پر
لکھا ہُوا تھا "حسینہ کا کمرہ" -

حسینہ کی ضروریات کی تمام چیزیں اس میں موجود
تھیں - حسینہ نے رات کو خواب میں ایک پری دیکھی
وہ حسینہ کو کہہ رہی تھی "اے حسینہ تم محفوظ ہو - کسی قسم
کا فکر نہ کرو -"

وہ دوسرے روز صبح کو اُٹھی - اور باغ میں پھرنے
لگی - اس کو کوئی شخص نہیں ملا - جب اُس کو بھوک
محسوس ہوئی - تو وہ کھاتے کے کمرے میں گئی - جہاں
اُس کو وہی درندہ ملا -

کیا تم مجھ کو بہت بدصورت خیال کرتی ہو -"!
درندے نے کہا - "ہاں بالکل بدصورت" - حسینہ
نے جواب دیا -

درندے نے ٹھنڈی سانس بھری اور حسینہ کو
اکیلی رہنے دیا - دوسرے دن حسینہ کے پاس آکر نرمی
سے کہا "حسینہ کیا تم مجھ سے شادی کر لوگی -"

"نہیں - نہیں - ہرگز نہیں" - حسینہ نے چلا کر کہا -
گو وہ درندے کی ممنون احسان تھی - لیکن اس کے
ساتھ شادی کرنے کے خیال سے وہ کانپ اُٹھی - درندہ
اس مرتبہ بھی مغموم ہو کر واپس چلا گیا -

اُسی دن حسینہ نے جادو کے آئینہ میں دیکھا - کہ
اُس کا باپ بہت بیمار ہے - جب وہ درندہ سے دوبارہ
ملی - تو کہنے لگی - مجھے اپنے والد کو دیکھنے کی اجازت
دے دو -"

" اگر تم چلی گئیں - تو میں مر جاؤنگا - درندے نے
کہا - لیکن میں تم کو ناخوش دیکھنے کی نسبت مر جانا بہتر
سمجھتا ہوں - جاؤ - لیکن ایک ہفتہ کے اندر اندر واپس
لوٹ آنا -"

جدائی کے وقت درندہ نے اس کو جادو کی انگوٹھی دی۔ یہ انگوٹھی حسینہ کو آرام سے گھر پہنچا سکتی تھی۔ اور واپس وہیں لاسکتی تھی۔ جب وہ لوٹنا چاہتی۔ حسینہ اس بدصورت جانور کے طرز گفتگو سے بہت اثر پذیر ہوئی تھی۔ اُس نے وعدہ کیا۔ کہ وہ ضرور لوٹ آئیگی۔ اس کے بعد وہ درندے کی اجازت لے کر انگوٹھی کی مدد سے اپنے گھر پہنچ گئی۔

حسینہ کا باپ اس کو دیکھ کر اس قدر خوش ہؤا۔ کہ اس کو جلد ہی صحت ہو گئی۔ حسینہ اپنے گھر اس طرح خوش ہوئی۔ کہ اس کو درندے کا وعدہ بھول گیا۔ ایک ہفتہ گزر گیا۔ اور پھر دوسرا۔ آخر ایک رات حسینہ نے خواب میں دیکھا۔ کہ درندہ مر رہا ہے۔ وہ آنسو بہاتی ہوئی اُٹھی۔ اُس نے جلدی سے کپڑے پہنے اور جادو کی انگوٹھی کے ذریعے سے اسی محل میں پہنچ گئی۔

وہ باغ کی طرف بھاگی۔ اُس نے درندے کو ایک فوارہ کے قریب بیہوش پایا۔ حسینہ نے کچھ پانی کے قطرے اس کے مُنہ پر چھڑکے۔ درندہ ہوش میں آگیا۔ حسینہ کو دیکھ کر وہ مُسکرایا۔

"میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔" اُس نے ہوش میں آتے ہوئے کہا۔ "میں نے بھوکے پیاسے رہ کر خودکشی کرنے کی ٹھان لی تھی۔"

"میں تم کو مرنے نہ دونگی۔" حسینہ نے اپنے دونو ہاتھوں کو آپس میں زور سے دباتے ہوئے کہا۔ "میں تم سے شادی کرونگی۔ پیارے درندے۔ میرا اصول ہے کہ مہربانی خوبصورت چہرہ رکھنے سے بہتر ہے۔"

ابھی اُس نے پوری طرح یہ الفاظ ادا نہ کئے ہونگے۔ کہ درندے کی شکل تبدیل ہونے لگی۔ جب حسینہ نے دوبارہ آنکھیں اُٹھائیں۔ تو اس کو ایک نہایت ہی خوبصورت شہزادہ نظر آیا۔

حسینہ اس قدر حیران ہوئی۔ کہ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ حسینہ کا ہاتھ پکڑ کر حسین شہزادے نے کہا۔ "ایک ذلیل پری نے اس پر جادو کر دیا تھا۔ یہ جادو کا اثر اُس وقت تک زائل نہ ہو سکتا تھا۔ جب تک کوئی مہربان لڑکی اس سے شادی کا وعدہ نہ کرتی۔ کیونکہ وہ بہت بدصورت درندہ تھا۔

حسینہ کا باپ یہ خوشخبری سُن کر بہت خوش ہؤا۔ لیکن حسینہ کی بہنیں حسد سے جلنے لگیں۔ اُنہوں نے شادی کے موقع پر حسینہ کو وہ وہ الفاظ کہے۔ کہ شہزادے نے غُصّے میں آکر ان کو پتھر کے بُتوں میں تبدیل کر دیا۔ اور ان بُتوں کو اُٹھا کر اپنے محل کے دروازے پر کھڑا کر دیا۔ جہاں وہ اب تک موجود ہیں۔

ایچ۔ اے۔ تائب
بی۔ اے۔ ایل ایل بی۔ لاہور

بزمِ انتخاب

شمالی افریقہ کے مسلم ممالک

شمالی افریقہ کے تمام سواحل مصر سے مراکش تک اسلامی ممالک ہیں۔ پہلی صدی ہجری ہی میں مسلمانوں نے یہ ممالک فتح کر لئے تھے۔ اور یہاں کی بربر قومیں عربی زبان اور اسلامی دین اختیار کر چکی تھیں۔ اندرونی علاقوں میں اب تک بربر اپنی قدیم زبان بولتے اور اپنے قدیم رسم و رواج پر قائم ہیں۔ مگر سب کے سب مسلمان ہیں۔ اور عربوں سے اس قدر متاثر ہو چکے ہیں۔ کہ انہیں عربوں سے جدا کرنا ممکن نہیں۔

لیکن یہ بربر بھی صرف مراکش ہی میں پائے جاتے ہیں۔ الجزائر، ٹیونس، طرابلس، مصر کی آبادیاں تمام تر عرب ہیں۔ یا عرب بن چکی ہیں۔ عربیت ان پر اس قدر چھا چکی ہے۔ کہ اُن میں سے جو عرب نہیں ہیں۔ وہ بھی اپنی اصلیت بھول چکے ہیں۔ لہٰذا مصر، طرابلس، ٹیونس، الجزائر، مراکش کو خالص عربی اور اسلامی ممالک ہی تصوّر کرنا چاہئے۔

افریقہ کے یہ تمام شمالی سواحل نہایت زرخیز اور جغرافیائی لحاظ سے بے حساب اہمیت کے مالک ہیں۔ کیونکہ بحر متوسط پر واقع ہیں۔ اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک یورپ کو دھمکا رہے ہیں۔ انہی سواحل پر قبضہ کرنے کے بعد عربوں کے لئے ممکن ہؤا تھا۔ کہ اسپین کو فتح کر کے ایک طرف فرانس تک پہنچ جائیں۔ اور دوسری طرف سسلی کو لے کر شہر رُوم کے پھاٹکوں کو جا کر کھٹکھٹائیں۔

بدقسمتی سے خانہ جنگیوں نے عربوں کی قوت پاش پاش کر ڈالی۔ ورنہ وہ یقیناً پورے یورپ کو مسخر کر لیتے۔ خانہ جنگیوں سے جب کمزور پڑ گئے۔ تو یورپ والوں نے اُنہیں پہلے اپنے براعظم سے نکال دیا۔ پھر خود افریقہ کے مُلکوں پر بڑھے اور ایک ایک کر کے تمام ممالک فتح کر لئے۔ آج مصر سے مراکش تک کوئی مُلک نہیں جو دول یورپ کے قبضہ یا اثر میں نہ ہو۔

مصر میں برطانیہ کا اقتدار قائم ہے۔ طرابلس پر اٹلی کا قبضہ ہے ٹیونس۔ الجزائر اور مراکش کا آدھا حصّہ فرانس کے ہاتھ میں ہے۔ اور مراکش کا باقی آدھا سپین کے قبضہ میں۔ یعنی افریقہ کے ان اسلامی ممالک کی خود مختاری ختم ہو چکی ہے۔ اور وہ سب کے سب یورپ والوں کا شکار بن گئے ہیں۔

مصر کی خود مختاری حقیقی خود مختاری نہیں ہے۔ بلکہ برطانیہ کی ایک سیاسی بازی گری ہے۔ طرابلس بالکل صاف طور پر اٹالین مقبوضہ علاقہ ہے۔ ٹیونس میں دیسی ریاست ویسی ہی ہے۔ جیسی ہندوستان کی کوئی دیسی ریاست۔ الجزائر پر براہ راست فرانس کی حکومت ہے۔ آدھے مراکش پر "سلطان کی حکمرانی ہے۔ مگر یہ سلطان اس سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ کہ فرانس کے ہاتھ میں محض ایک کٹھ پتلی ہے۔ مراکش کا دوسرا حصّہ بالکل سپین کے ہاتھ میں ہے پھر یہ حصّہ بھی جمہوری اسپین کے قبضے میں نہیں۔ بلکہ جنرل فرانکو کے قبضے میں ہے۔ جو جرمنی اور اٹلی کا غلام ہے۔

میونک کانفرنس نے ثابت کر دیا ہے۔ کہ جرمنی اور اٹلی جنگ کے لئے تیار ہیں۔ اور برطانیہ و فرانس طیار نہیں ہیں۔ اگر برطانیہ اور فرانس کمزور نہ ہوتے۔ تو اس طرح ہٹلر کے قدموں پر جھک نہ جاتے۔ زیکوسلاویکیا کو بھینٹ چڑھا کر برطانیہ اور فرانس نے تھوڑی سی مہلت حاصل کی ہے۔ تاکہ خود بھی لڑنے کے لئے تیار ہو جائیں لیکن جرمنی اور اٹلی اتنے بے وقوف نہیں ہیں۔ کہ برطانیہ اور فرانس کو تیاری کرنے کا موقع دیں گے۔

چنانچہ ایک طرف جرمنی وسطی یورپ کو اپنے اثر میں علانیہ لا رہا ہے۔ اور اپنی سابقہ نوآبادیوں کا مطالبہ بھی پیش کر چکا ہے۔ دوسری طرف اٹلی نے برطانیہ کو مجبور کر دیا ہے۔ کہ دونوں میں جو معاہدہ چند ماہ پیشتر طے پا چکا ہے۔ اب اسے نافذ کر دے۔ اس معاہدے کا اصلی

مطلب یہ ہے۔ کہ برطانیہ اٹلی کو ایک بہت بڑی نقد رشوت (قرض کے نام سے) دے۔ اور دوسری طرف سپین میں اُسے آزاد چھوڑ دے۔

فاسسٹ اٹلی اور نازی جرمنی اس وقت یورپ پر چھا گئے ہیں۔ روس کو چھوڑ کر باقی تمام یورپین حکومتیں اٹلی اور جرمنی کے اشاروں پہ چلنے کے لئے مجبور ہیں۔ حالات بتا رہے ہیں۔ کہ اٹلی اور جرمنی برطانیہ اور فرانس کو مہلت دیئے بغیر جلد سے جلد تر ان کے مقبوضات پہ ہاتھ صاف کرنے کی کوشش کریں گے۔

ان مقبوضات میں سب سے پہلے شمالی افریقہ پر دونو کا دھاوا ہوگا۔ اگر آئندہ بارہ مہینے کے اندر اٹلی اور جرمنی نے حملہ کر دیا۔ تو ان علاقوں پر ان کا قابض ہو جانا بڑی حد تک یقینی ہے۔

بحر متوسط میں برطانیہ اور فرانس کی طاقت اتنی زیادہ نہیں ہے کہ اٹلی اور جرمنی کو بڑھنے سے روک سکیں۔ اور اگر اتنی طاقت ہو بھی۔ تو جرمن ہوائی جہازوں سے برطانیہ اور فرانس اس قدر مرعوب ہو چکے ہیں۔ کہ لڑنے کی ہمت نہیں کرینگے۔ اور اپنے یہ زرخیز علاقے حملہ آوروں کے حوالے کر دیں گے۔ جرمنی اور اٹلی کی نظر صرف شمالی افریقہ ہی پر نہیں ہے۔ بلکہ فلسطین اور شام و عراق پر بھی اُن کے دانت ہیں۔ اگر ایسے موقع پر جاپان نے بھی جرمنی اور اٹلی کا ساتھ دیا۔ تو آسٹریلیا، نیوزیلینڈ، سماٹرا، سنگاپور، ہانگ کانگ اور انڈوچائنا کے علاقے بھی برطانیہ اور فرانس کے ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ جاپان کو اگر کسی سے خطرہ ہو سکتا ہے۔ تو وہ صرف امریکہ اور روس ہیں۔ اگر جاپان ان دونو کی طرف سے مطمئن ہو گیا۔ تو پھر اُسے مشرق میں برطانوی اور فرانسیسی مقبوضات ہضم کرنے سے کوئی چیز بھی نہ روکے گی۔

غرضکہ اس وقت شمالی افریقہ کی قسمت ترازو میں ہے۔ کوئی نہیں جانتا۔ سال دو سال کے بعد یہ ملک برطانیہ اور فرانس کے ہاتھ میں رہیں گے۔ یا اٹلی اور جرمنی کے قبضے میں چلے جائیں گے۔

سب سے زیادہ افسوس اس بات کا ہے۔ کہ مصر کے علاوہ ان ملکوں میں کوئی ملک بھی تعلیم و تمدن کے لحاظ سے ذرا بھی قوت نہیں رکھتا۔ اس صورت حال کا لازمی نتیجہ یہی ہو سکتا ہے۔ کہ یہ ملک مدتوں غلامی میں رہیں گے۔ (ہند۔ کلکتہ)

زیک جرمن کشمکش کی ڈائری

۱۲ ستمبر ۳۸ء کے بعد سے جرمنی اور زیکوسلووکیہ کی سوڈیٹن لینڈ کے بارے میں جو کشمکش ہوئی۔ اُس کے چیدہ چیدہ واقعات ذیل میں اختصار کے ساتھ ایک ڈائری کی شکل میں درج کئے جاتے ہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ صورت حال کتنی زیادہ پیچیدہ تھی۔ اور اس صورت کا اور جنگ کیا ردّ عمل ہوتا تھا۔

۱۲ ستمبر۔ نورمبرگ میں نازی کانگریس کے اختتام پر ہر ہٹلر نے تقریر کی۔ فہرر نے سوڈیٹنوں کو خود اختیاری حکومت دیئے جانے کا مطالبہ کیا۔ اور یہ اعلان کیا۔ کہ اگر دوسرے ممالک (غالباً فرانس اور انگلستان) سوڈیٹنوں کی مدد نہ کریں گے۔ تو جرمنی رائخ (پارلیمنٹ) یہ کام کریگی۔

۱۳ ستمبر۔ ہر ہٹلر کی نورمبرگ کی تقریر کے بعد سوڈیٹن لینڈ میں فساد ہوئے۔ زیک گورنمنٹ نے متعدد اضلاع میں مارشل لا جاری کیا۔ سوڈیٹن پارٹی نے اس حکم کی فوری تنسیخ کا مطالبہ کیا۔ پراگ کی زیک گورنمنٹ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔

۱۴ ستمبر۔ مسٹر چیمبرلین نے بذریعہ ہوائی جہاز جرمنی جا کر ہر ہٹلر سے ملاقات کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اور ہر ہٹلر کو مندرجہ ذیل پیغام بھیجا۔

"روز افزوں نزاکت حالات کو دیکھتے ہوئے ہیں مسئلے کے پُرامن تصفیہ کے لئے راہیں نکالنے کے واسطے فوراً آ کر آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں بذریعہ ہوائی جہاز آنا چاہتا ہوں۔ اور کل روانہ ہو جانے کے لئے تیار رہوں۔ مہربانی کر کے ملنے کا وقت اور جگہ بتائیے۔ فوری جواب کے لئے ممنون ہونگا۔"

ہر ہٹلر نے فوراً اس کا جواب دیا۔ اور وزیر اعظم سے ملنے پر آمادگی ظاہر کی۔ اس اثنا میں زیکوسلووکیہ میں بہت سے مزید علاقوں میں مارشل لا جاری کر دیا گیا۔ سوڈیٹن لینڈ کے فسادات کا قلع قمع کر دیا گیا۔

۱۵ ستمبر۔ مسٹر چیمبرلین بذریعہ ہوائی جہاز میونچ پہنچ گئے۔ اور پھر بذریعہ ٹرین وہاں سے برچیسگیڈن گئے۔ جہاں انہوں نے ۲½ گھنٹے تک ہر ہٹلر سے گفتگو کی۔ اس ملاقات کے بعد مندرجہ

ذیل کمیونک شائع ہوا :-

" فیوہرر اور رائخ چانسلر نے آج اوبرسالزبرگ پر مسٹر چیمبرلین وزیر اعظم برطانیہ سے مفصل طور پر تبادلہ خیالات کیا۔ برطانوی وزیر اعظم کل انگلستان واپس ہو جائیں گے۔ تاکہ برطانوی کابینہ سے مشورہ کر سکیں چند دن بعد ایک اور کانفرنس ہوگی "

اسی کے ساتھ سوڈیٹن جرمن پارٹی کے لیڈر ہر ہنلین نے سوڈیٹن لینڈ کو جرمن رائخ سے ملحق کر دینے کا مطالبہ کیا ۔

۱۶- ستمبر - مسٹر چیمبرلین نے لنڈن واپس آکر کابینہ کو ہر ہٹلر سے کی ہوئی گفتگو سے آگاہ کیا - زیک گورنمنٹ نے سوڈیٹن پارٹی کو خلاف قانون قرار دے کر اس کے توڑے جانے کا حکم دیا ۔

۱۸ ستمبر - لنڈن میں فرانس اور انگلستان نے تصفیہ کے لئے تجاویز مرتب کیں -

۱۹ ستمبر - زیک گورنمنٹ نے ان تجاویز پر غور کیا -

۲۰ ستمبر - ڈاؤننگ سٹریٹ (وزیر اعظم برطانیہ کی رہائش گاہ) سے مندرجہ ذیل کمیونک شائع ہوا -

" وزیر اعظم اور جرمن فیوہرر اور چانسلر نے اس گفت و شنید کو دوبارہ شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے - جو برچیسگڈن میں ۲۲ ستمبر کو دن کے تین بجے ملتوی ہوئی تھی ۔"

ہنگری کے وزیر اعظم اور جرمنی میں پولینڈ کے سفیر اچانک برچیسگڈن پہنچے - وہ ہٹلر سے ملے - اور زیکوسلوویکیہ میں اپنی اپنی اقلیتوں کے مطالبات دہرائے -

۲۱ ستمبر - پراگ کی زیک گورنمنٹ کے اینگلو جرمن تجاویز کو منظور کر لینے پر پراگ میں عام مظاہرے ہوئے - بہت رات گئے کثیر مجمعوں نے جرمنی کا مقابلہ کئے جانے کا مطالبہ کیا ۔

۲۲ ستمبر - مسٹر چیمبرلین بذریعہ ہوائی جہاز کولون پہنچے - اور وہاں سے موٹر پر گوڈزبرگ گئے - جہاں وہ ہٹلر سے تین گھنٹے تک گفتگو کرتے رہے - زیکوسلوویکیہ میں ڈاکٹر ہوڈزا کے کابینہ نے استعفیٰ دے دیا - اور انسپکٹر جنرل آف دی آرمی جنرل سیروی کی قیادت میں نیا کابینہ ترتیب پایا ۔

۲۳ ستمبر — یہ کالا جمعہ تھا صبح کو مسٹر چیمبرلین پیٹرز برگ ہوٹل میں ٹھہرے - جو رائن کے کنارے پہاڑی پر واقع ہے - یہ بہت جلد ظاہر ہو گیا - کہ تصفیہ میں کوئی رکاوٹ ہے - یہ رکاوٹ مسٹر چیمبرلین کے اس خط سے پیدا ہوئی تھی - جو انہوں نے چانسلر ہٹلر کے نام لکھا - کہ اس بات کی ضمانت دی جائے - کہ اینگلو جرمن تجاویز کو عمل میں لاتے وقت زیکوسلوویکیہ کے خلاف کوئی فوجی اقدام نہ کیا جائے - کئی گھنٹے کے بعد جواب آیا - اور دس بجے سے پہلے وزیر اعظم ہٹلر سے ملاقات نہ کر سکے - ملاقات دوسرے دن دوپہر کے ۱½ بجے تک جاری رہی - جب ان دونوں کی گفتگو ہو رہی تھی - اسی دوران میں پراگ سے خبر آئی - کہ زیکوسلوویکیہ میں مکمل طور پر فوجی تیاریاں کر لی گئی ہیں -

۲۴ ستمبر - وزیر اعظم برطانیہ جرمنی سے بذریعہ ہوائی جہاز واپس آئے - اور فوراً ڈاؤننگ سٹریٹ گئے - سہ پہر کو انہوں نے کابینہ کے اجلاس کی صدارت کی - جس میں جرمنی کے ساتھ سمجھوتہ کی آخری شرطوں پر بحث مباحثہ ہوا - یہ شرطیں معاملے کو اینگلو جرمن تجاویز سے بہت آگے بڑھا لے گئیں - ان کا خلاصہ یہ تھا - کہ زیکوسلوویکیہ کے وہ علاقے چھ دن کے اندر اندر جرمنی کے حوالے کر دئیے جائیں - جن میں پچاس فی صدی سے زیادہ جرمن نسل کے باشندے آباد ہیں - برطانوی پبلک کے زاویہ نگاہ سے صورت حالات کی نزاکت اب پوری طرح بے نقاب ہو گئی - اور ہر جگہ اس سوال پر بحث ہونے لگی - کہ جنگ ہوگی یا نہیں -

۲۵ ستمبر - برطانوی اور فرانسیسی کابینوں کے مشترکہ اجلاس جاری رہے - زیکوسلوویکیہ پوری طرح مسلح تھا - فرانس میں جنگی تیاریاں جاری تھیں - ہر طرف یہ محسوس کیا جا رہا تھا - کہ حالات نازک سے نازک تر ہوتے جا رہے ہیں ۔

۲۶ ستمبر - اس روز بڑی کثرت سے سیاسی پیشین گوئیاں ہوتی رہیں - صدر امریکہ روزویلٹ نے ہٹلر کو ایک بحری تار دیا - جس میں ہٹلر سے یہ اصرار کیا گیا تھا - کہ تصفیہ پُرامن طریق سے ہی کیا جائے - سر ہوریس ولسن مسٹر چیمبرلین کا ایک خفیہ خط لے کر جرمن چانسلر کے پاس گئے - برٹش فوڈ ڈیفنس پلانز ڈیپارٹمنٹ نے یہ اعلان کیا - کہ بعض غذائی اشیا جیسے بیکن اور مکھن کے نرخوں میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی - برطانیہ کے وار آفس نے احتیاطی تدابیر کے طور پر برطانیہ کے انٹی ایرکرافٹ یونٹ طلب کر لئے - شام

کو ہٹلر نے وہ تقریر کی۔ جس کا بڑی بے چینی سے انتظار کیا جا رہا تھا۔ اس تقریر کے دوران میں اُس نے کہا:۔

میں جرمن عوام کو یہ بتانا چاہتا ہوں۔ کہ سوڈیٹنز کے بارے میں میرے تحمل کا پیالہ لبریز ہونے کے قریب ہے۔ اب مسٹر بینز کو جنگ اور امن دونوں میں سے ایک چیز پسند کرنی ہے۔ اُنہیں اپنا علاقہ یکم اکتوبر کو ہمارے حوالے کر دینا ہے +

۲۷ ستمبر۔ صبح صبح مسٹر چیمبرلین نے مندرجہ ذیل بیان شائع کیا:۔

"میں نے جرمن چانسلر کی تقریر پڑھی۔ انہوں نے میری ان کوششوں کا بھی حوالہ دیا ہے۔ جو میں نے دُنیا کے امن کو بچانے کے لئے کی ہیں۔ میں اس پر اظہار پسندیدگی کرتا ہوں۔ میں ان کوششوں کو ترک نہیں کر سکتا۔ کیونکہ میں یورپ کے ان انسانوں کو جو ایک دوسرے سے جنگ نہیں کرنی چاہتے۔ ایک ایسے مسئلہ پر لہو آشام کشمکش میں دھکیلنا نہیں چاہتا۔ جس (کے حل) پر پہلے ہی رضامندی حاصل کی جا چکی ہے۔"

ایڈمرلٹی کے سیکرٹری نے اعلان کیا۔ کہ بحری بیڑے کو بطور احتیاط تیار رکھنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ برلن وائرلیس نے یہ اعلان کیا۔ اگر ۲۸ ستمبر کو دو بجے تک زیکوسلوویکیہ نے جرمن میمورنڈم کی شرطوں کو قبول نہ کیا۔ تو جرمن فوجوں کی تیاری شروع ہو جائیگی۔

۲۸ ستمبر۔ انگلستان کے دارالعوام میں ٹھیک ۲ بجکر ۵۰ منٹ پر وزیر اعظم سپیکر کی کرسی کے پیچھے سے ایوان میں داخل ہوئے۔ "نمایاں تماشائیوں کی گیلری" میں ڈپلومیٹوں کی ایک کثیر تعداد بیٹھی تھی۔ جو یورپ کی قسمت کا فیصلہ سننے آئی تھی۔ امریکہ فرانس۔ اٹلی اور بلجیم کے سفیر موجود تھے۔ اور بیچ کے سرے پر زیکوسلوویکیہ کا منسٹر ایم مسارک بیٹھا تھا۔ جس کی صورت پر افسردگی برس رہی تھی۔ ایوان کے چپے چپے پر عوام و خواص تھے۔ فضا دم بخود تھی۔ ایوان کے تقریباً" بیس بائیس ممبر ایسے بھی تھے۔ جنہیں یاد تھا۔ کہ کس طرح قریب قریب انہی حالات میں وہ ۱۹۱۴ء میں لارڈ گرے کی تقریر سننے کے لئے جمع ہوئے تھے۔ اور کس طرح وہ جنگ عظیم کی خوفناک خبر سن کر گھروں کو واپس ہوئے تھے۔ اس اثنا میں وزیر اعظم اُٹھے۔ اور انہوں نے اپنے نوٹوں کی مدد سے ایک طویل تقریر شروع کی۔ جس کے دوران میں اُنہوں نے حالات کا صاف اور صریح جائزہ لیا۔ اور یہ بتایا۔ کہ ان حالات سے گزرنے کے بعد ہم ایک ایسی نزاکت حالات سے دوچار ہیں۔ جس کی ۱۹۱۴ء کے بعد سے لے کر اب تک کی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی۔ فضا پر جو مایوسی طاری تھی۔ وہ مسٹر چیمبرلین کے سب کچھ کہنے سُننے سے بھی دُور نہ ہوئی۔ مگر پھر دفعتہً" حالات نے کروٹ بدلی۔ لارڈ ہیلیفیکس کو گیلری میں ایک پیغام موصول ہوا۔ اور وہ تیزی سے اُٹھ کر باہر گئے۔ پھر وزیر اعظم کے پارلیمنٹری پرائیویٹ سیکرٹری ڈگلاس ایوان سے باہر گئے۔ اور کاغذ کے دو ورق لئے ہوئے واپس ہوئے۔ یہ ورق اُنہوں نے سر جان سائمن کو دے دئے۔ سر جان سائمن نے جلدی جلدی اُنہیں پڑھا۔ اور مسٹر چیمبرلین کے حوالے کر دیا۔ مسٹر چیمبرلین نے ایک منٹ تک خاموشی کے ساتھ ان اوراق کو پڑھا۔ اور پھر مُڑ کر سامعین سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔ "میرے پاس آپ سے کہنے کے لئے کچھ اور بھی ہے۔" اور پھر اُنہوں نے میونچ کانفرنس کے انعقاد کی خبر سُنائی۔ ممبران پارلیمنٹ ان کے الفاظ سن کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور چیئرز پر چیئرز دینے لگے۔ یہ معلوم ہوا۔ کہ کسی جھُو منتر سے مایوسی کافور ہو گئی۔ ٹائمز کے الفاظ میں "یوں وہ منظر جو گہری مایوسی سے شروع ہوا تھا۔ اُمید کی شعاع پر ختم ہوا"

۲۹ ستمبر۔ چار طاقتوں کی کانفرنس کا میونچ میں افتتاح ہوا۔ یہ کانفرنس ہر ہٹلر نے مسٹر چیمبرلین کی تجویز پر طلب کی تھی۔ تاکہ یورپ کے امن کو تباہی سے بچانے کی آخری کوشش کی جا سکے۔ برطانیہ اور فرانس کے وزرائے اعظم اور جرمنی اور اٹلی کے ڈکٹیٹر بویریا کے دارالخلافے پہنچے +

۳۰ ستمبر۔ میونچ وائرلیس نے ڈیڑھ بجے دن کو اعلان کیا۔ کہ فیہرر، ڈوس (مسولینی) برطانوی وزیر اعظم اور فرانسیسی وزیر اعظم نے ایک سمجھوتے پر دستخط کر دیئے ہیں۔ جس میں سوڈیٹن لینڈ کو جرمنی کو منتقل کئے جانے کے طریقے ہیں۔ طے یہ پایا۔ کہ یہ علاقہ حلقہ بہ حلقہ یکم سے ۱۰ اکتوبر تک خالی کیا جائیگا۔ اور بین الاقوامی کمیشن بعض دوسرے اضلاع میں رائے عامہ لیگا۔ نئی زیک حکومت نے اس سمجھوتے کو منظور کر لیا۔ میونچ سے رخصت ہونے سے پہلے مسٹر چیمبرلین ہٹلر سے الوداعی ملاقات کرنے گئے۔ اور اس اعلان

پر دونو مدبّروں کے دستخط ہوئے جس میں یہ ظاہر کیا گیا۔ کہ جنگ پر آئندہ بھی پُرامن تصفیہ کو ترجیح دی جائے گی ؞

یکم اکتوبر۔ گذشتہ رات سوڈیٹن لینڈ کے پہلے حلقے سے زیک پولیس اور فوج ہٹالی گئی تھی۔ جرمن فوجوں نے اس پر قبضہ کر لیا۔ جرمن نسل کے باشندوں نے ان کا زبردست خیر مقدم کیا۔ اور بہت سے زیک یہودی اور جرمن سوشل ڈیمو کریٹ پراگ بھاگ آئے۔ پولینڈ کے نوٹ کو احتجاج کے ساتھ منظور کرتے ہوئے زیک حکومت نے ٹشچین کا علاقہ فوراً پولینڈ کے حوالے کر دیا۔ اس میں سے ۵۰ فی صدی سے زیادہ پول بستے ہیں مسٹر ڈف کوپر فرسٹ لارڈ آف ایڈمرلٹی نے وزیر اعظم سے اختلاف کی بنا پر اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا ؞

۲ اکتوبر — برطانیہ میں اس اتوار کو امن کا اتوار منایا گیا۔ اور تھینکس گِونگ سروس ہوئیں۔ جرمن اور پولش فوجیں ان علاقوں پر قبضہ کر رہی تھیں۔ جو ان کو ملے تھے۔ کہ اسی اثنا میں پراگ کے ہنگیرین سفیر نے ایک نوٹ وزیر خارجہ کے حوالے کیا۔ جس میں اسی قسم کی مراعات طلب کی گئی تھیں ؞

۳ اکتوبر۔ ہر ہٹلر آسچ کے قریب جرمنی کے مقبوضہ علاقے میں داخل ہوا۔ جو ہر ہینلین کا وطن ہے۔ سوڈیٹن لینڈ کا دورہ کرتا ہوا وہ سہ پہر کو اگیر پہنچا۔ جہاں اُس نے ایک پُرجوش تقریر کے دوران میں کہا۔ کہ اب یہ سرزمین جرمن رائخ (پارلیمنٹ) سے کبھی جُدا نہ کی جائیگی۔ اس روز یُورپ کے سب شہروں میں خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ اور پراگ میں صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی۔ برطانوی پارلیمنٹ کے دونو ایوانوں کا مشترکہ اجلاس ہوا۔ اور معاملات خارجہ پر بحث ہوئی۔ وزیر اعظم نے گورنمنٹ کی پالیسی کو ڈیفنڈ کیا۔ اسی اجلاس میں زیکوسلوویکیہ کی حکومت کو دس کروڑ پونڈ کا قرضہ دیئے جانے کا اعلان ہوا ؞ (ریاست دہلی)

مدراس اور ہندی دشمنی

جب سے مدراس کی کانگریسی حکومت نے ہندی کو وہاں کے مدرسوں میں جبری طور پر رائج کرنے کا تہیّہ کیا ہے۔ اُسی وقت سے تمام دراوڑی قوموں اور خاص کر تامل ناڈ والوں کی طرف سے سخت مخالفت شروع ہو گئی ہے۔ اخباروں سے اس کا پُورا اندازہ نہیں ہوتا۔ وہاں جا کر اصل کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ میں حال ہی میں مدراس گیا تھا۔ اور مجھے وہاں کانگریسی غیر کانگریسی اور تامل والوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ منجملہ ان کے ایک مسز مینم بال سیر راج تھیں۔ یہ دُبلی پتلی۔ نکیلی۔ سوکھی الغرض۔ بہت ہی پُرجوش اور مستعد خاتون ہے۔ ہندی کی مخالفت میں جب وہ مجھ سے باتیں کر رہی تھی۔ تو یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ اُس کے مُنہ سے لفظ نہیں بلکہ انگارے نکل رہے ہیں۔ اگرچہ اس کی گفتگو بہت تیز و تند تھی۔ مگر بہت دلچسپ تھی۔ مجھے اس کی پوری گفتگو تو یاد نہیں رہی۔ اور یاد رہتی بھی۔ تو میں لکھنا پسند نہ کرتا۔ لیکن اس کے بعض بعض جملے اور ٹکڑے سُننے کے قابل ہیں۔ وہ کہتی یہ تھی۔ کہ اگر ہندی ہی پڑھنی ہوتی۔ تو کوئی بات نہ تھی۔ مگر یہ برہمن ہندی کے ذریعے سے سنسکرت پھیلانی شروع کر دیں گے۔ اور ہماری زبان و تہذیب کو مٹا ڈالیں گے۔ براہمن چاہتا ہے کہ ہم وہ نامعقول (Wretched) کتاب راماین پڑھیں ؟ ہم ہرگز نہیں پڑھیں گے۔ اور آخر تک اس کا مقابلہ کریں گے۔ وہ ہم میں اور مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنا چاہتا ہے۔ مگر ہم اور مسلمان ایک ہیں۔ اور یہ براہمن (آریہ) غیر ملکی ہے۔ میں نے پوچھا۔ کہ تم اور مسلمان ایک کیونکر ہوئے۔ تو کہنے لگی۔ کہ ہمارے علاقے میں جو مسلمان ہیں وہ کہیں باہر سے تھوڑا ہی آئے ہیں۔ ہمارے ہی بھائی بند تھے۔ جو مسلمان ہو گئے۔ اور اب بھی بھائی بندوں کی طرح رہتے ہیں۔ اگر یہ برہمن ہم پر زیادہ جبر کریں گے۔ تو ہم مسلمان ہو جائیں گے۔ ہم دونو جنگی قومیں ہیں۔ براہمن ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ میرا نام منیم بال ہے۔ پھر میں میراں بائی ہو جاؤں گی۔ مجھے اس پر بے اختیار ہنسی آئی۔ اور وہ بھی خوب ہنسی ؞

غرض تامل ناڈ کا ایک ایک فرد مخالفت پر تُلا ہوا ہے۔ اور ان سب کے خیالات اسی قسم کے ہیں۔ جو میں نے اوپر بیان کئے ہیں۔ مسٹر سی راج گوپال چاریار جہاں جاتے ہیں۔ کالے جھنڈوں سے اُن کا استقبال کیا جاتا ہے۔ روزانہ ان کے مکان کے سامنے کئی کئی شخص دھرنا دیتے ہیں۔ اور گرفتار ہوتے ہیں۔ وہ جلسوں، جلوسوں، کانفرنسوں، دھرنا دینے، فاقہ کرنے اور کالے جھنڈوں سے اپنی مخالفت کا اظہار کر رہے ہیں۔ اس میں لڑکے، جوان، ادھیڑ سب قسم کے لوگ شریک ہیں۔ مخالفت

کی یہ سب ترکیبیں خود کانگریس کی سکھائی ہوئی ہیں - اور آج وہ کانگریس کے خلاف انہیں ترکیبوں سے کام لے رہے ہیں - فاقے کرنے والوں میں سب سے ممتاز مسٹر اسٹالن جگدیسن ہیں - میں بھی انہیں دیکھنے گیا تھا - اس دن (۱۶ جولائی کو) اُن کا ۴۷ واں فاقہ تھا - وہ ایک کوچ پر خاموش پڑے تھے - اُن کے اُوپر ایک سفید چادر پڑی تھی - اور چہرا اور سر کھُلا تھا - لوگوں کا تانتا بندھا ہوا تھا - آتے تھے اور چُپ چاپ دیکھ کر چلے جاتے تھے - دو ایک ہمدرد اُن کے پاس کرسیوں پر بیٹھے تھے - ضعف اور نقاہت کا غلبہ تھا - رنگ زرد پڑ گیا تھا - بڑی بڑی کھُلی آنکھیں بے کسی ظاہر کر رہی تھیں - اس شخص کو دیکھ کر مجھے بہت ترس آیا - اور افسوس بھی ہوا -

ان کی شکایت یہ ہے کہ (۱) حکومت اقلیتوں کی زبان اور تہذیب کی پروا نہیں کرتی (۲) کانگریس نے کبھی یہ فیصلہ نہیں کیا - کہ ہندی جبراً پڑھائی جائے - اور نہ انتخاب کے وقت تقریروں اور تحریروں میں اُس کا اظہار کیا - (۳) وزیر اعظم کا ایک مقصد اس جبری تعلیم سے ایک خاص جماعت کو فائدہ پہنچانا ہے - یعنی ہندی پرچار سبھاؤں کے لوگوں کو جو کانگریس کے رضاکار بھی تھے - روزگار پیدا کرنا ہے (۴) ہندی کے رائج کرنے سے فرقہ واری تفرقہ اور زیادہ بڑھیگا - کیونکہ وزیر اعظم کا اصل مقصد غیر برہمنوں کو دبانا اور پائمال کرنا ہے - پولٹیکل برہمن اب تک اس بات کو نہیں بھولا - کہ وہ آریہ ہے اور غیر برا ہمن دراوڑی ہے (۵) شمالی ہند کے سیاست کاروں کا منصوبہ یہ ہے کہ جب انگریزوں کا قدم درمیان میں نہ رہے تو جنوبی صوبے پر اپنی حکومت جمائیں - ہندی کی جبری ترویج اس منصوبے کو عمل میں لانے کا حرف یہ پہلا قدم ہے (۶) سب سے ضروری اور اہم مسئلہ جہالت کا رفع کرنا ہے - اس لئے جو مصارف ہندی کی جبری تعلیم پر کئے جا رہے ہیں - وہ اگر جہالت رفع کرنے پر کئے جائیں - تو زیادہ مفید ہوگا - (۷) ہندی اگر رائج ہی کرنی ہے - تو اختیاری ہونی چاہئے - اسے جبری قرار دینا کسی حال میں مناسب نہیں -

یہ اور اسی قسم کے دوسرے اعتراض پیش کئے ہیں - ان میں کسی قدر مبالغہ اور بدگمانی پائی جاتی ہے - جو درست نہیں - البتہ اُن کا یہ کہنا کہ مدرسوں میں ہندی ایک اختیاری مضمون رکھا جائے - بہت معقول ہے - جبری رواج کا جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے - وہ ہرگز جائز نہیں ہے - لیکن وزیر اعظم کا اصرار ہے - کہ میں اُسے جبراً رائج کر کے چھوڑونگا - اور مخالفین کی دھمکیوں سے مرعوب نہیں ہونگا - دوسری نازیبا بات جو اس نزاع میں پیدا ہوئی ہے - وہ یہ ہے - کہ جو لوگ وزیر اعظم کے مکان یا بعض مدرسوں کے سامنے (جن میں ہندی جبری تعلیم رائج کی گئی ہے) دھرنا دیتے ہیں - اُنہیں بہت سخت سزائیں دی جاتی ہیں - ایسی معمولی حرکتوں کے لئے چھ چھ مہینے اور سال سال بھر کی قید بامشقت کی سزا انصاف اور انسانیت کے خلاف ہے - یہ مخالفت کی روک تھام نہ ہوئی - بلکہ اچھا خاصا انتقام ہوا - اس پر مخالفوں کا یہ کہنا - کہ جس حکومت کو کانگریس والے شیطانی کہتے تھے - یہ تو اس سے بھی زیادہ شیطانی نکلی - کچھ زیادہ بیجا نہیں ہے -

اس تمام تنازع میں ایک بات اچھی ہوئی - کہ اب وزیر اعظم بجائے ہندی کے ہندوستانی کہنے لگے ہیں - اس میں انجمن ترقی اردو کی کوشش کو بھی کچھ دخل ہے - مخالف یہ کہتے ہیں - کہ یہ محض مسلمانوں کو خوش کرنے کے لئے کیا گیا ہے - ہم اسے ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں - کیونکہ اس بارے میں کانگریس ریزولیوشن کا صاف اور صریح الفاظ میں موجود ہے - البتہ یہ ضرور ہے - کہ جب اُنہوں نے یہ دیکھا - کہ مخالفت دونو طرف سے ہو رہی ہے - تو اُنہوں نے اپنی خیر اسی میں دیکھی کہ ہندی کو چھوڑ کر ہندوستانی کہنے لگے - ورنہ آنریبل راج گوپال آچاریہ جو گاندھی جی کے ہر ارشاد کو الہام و وحی سمجھتے ہیں - ویسے اس پر مشکل سے رضامند ہوتے -

(اُردو - انجمن ترقی اردو)

اشتراکیت کا مقصد

اقتصادی عدم مساوات دُنیا کی پوری تاریخ میں ہمیشہ نمایاں رہی ہے - لیکن اس کی موجودہ شکل اُنیسویں صدی کی صنعتی ترقیوں کا نتیجہ قرار دی جاتی ہے - وہ ترقی جس نے سوسائٹی میں دو بڑے طبقے نمایاں کر دیئے - ایک طبقہ سرمایہ

دارول کا جو بے انتہا منافع سمیٹ رہا ہے - دوسرا طبقہ مزدوروں
کا جو بازار کے تمام جزر و مد اور اتار چڑھاؤ کا ہدف ہے - اور تجارت
وصنعت پر جو برے اثرات طاری ہوتے ہیں - ان کی ساری
مضرتیں اسی کے حصہ میں آتی ہیں ٭

سرمایہ داری کے پیدا ہونے کے دو بڑے اسباب بتائے
جاتے ہیں :-

(۱) وہ اقتصادی اصول جن کی علمائے اقتصادیات نے اٹھارھویں
صدی میں اشاعت کی - اور جو یورپ میں انیسویں صدی کے
نصف اول سے عملی صورت اختیار کرنے لگے -

(۲) وہ حیرت انگیز صنعتی ترقیاں جو انیسویں صدی میں اختراعات
وایجادات کے جلو میں نمودار ہوئیں - اور جن کی حمایت میں علمائے
اقتصادیات نے تجارتی وصنعتی آزادی کا وعظ کیا - لیکن اس
آزادی کا تمام فائدہ صرف سرمایہ داروں کو حاصل ہؤا - مزدور
اس سے بالکل محروم رہے - کیونکہ وہ غریب اس قابل نہیں تھے -
کہ سماج کے اندر اپنی پوزیشن قائم کرکے اس آزادی سے فائدہ اٹھا
سکیں - اور اپنے حقوق اور اپنے مستقبل کو محفوظ کر سکیں - نتیجہ یہ
ہؤا - کہ اس صنعتی ترقی نے جتنی دولت اگلی - وہ سب کی سب
ان چند سرمایہ داروں کے صحن میں جاکر جمع ہو گئی - جو کارخانے قائم
کر سکتے تھے - آلات خرید سکتے تھے - مال تیار کرا سکتے تھے - یا
تجارتی مقابلوں کی گھوڑ دوڑ میں بڑی بڑی بازیاں لگا سکتے تھے -
اس طرح ان کو آپ سے آپ اس بات کا موقع مل گیا - کہ مزدوروں
کو طرح طرح سے ستائیں - ان کی مزدوریاں گھٹائیں - کام کے اوقات
بڑھا دیں - یہاں تک کہ سوسائٹی کا یہ سب سے بڑا حصہ بالکل ایک
گرفتار قفس ہو کر صرف نالہ وشیون کے لئے وقف ہو کر رہ گیا ٭

حکومت جو امن وعدل اور قیام توازن کی اصلی ذمہ دار
ہے - آزادی تجارت وصنعت کے اصول کو تسلیم کرکے اب ان
معاملات میں مداخلت کے حق سے بالکل دستکش ہو چکی تھی - نتیجہ
یہ ہؤا - کہ جو طبقہ اس آزادی تجارت کی تیغ سے نیم بسمل تھا - اس
نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا - کہ صنعت وتجارت کی یہ آزادی
اس کے حق میں سم قاتل ہے - بس یہ تخیل ہماری اس بحث میں اشتراکیت
کا پہلا بیج ہے - جو بویا گیا - اس اشتراکیت نے سب سے پہلے وقت
کی اقتصادیات کے اس آزادی صنعت وتجارت والے اصول کی
دھجیاں اڑائیں - اور اسی اصل کے اختلاط سے انتظام کی خرابی اور اقتصادی
واجتماعی پراگندگی کی تمام ذمہ داریاں اسی اصول کے سر تھوپ دیں -
پھر اس کے بعد اس نے تنقید کا دوسرا قدم اٹھایا - اور نفس نظام
سرمایہ داری پر تنقید شروع کر دی - جو تمام نفع اٹھا کر چند آدمیوں
کے ہاتھ میں دے دیتا ہے - اور کاریگروں اور مزدوروں کو فقر
وفاقہ میں سسکنے کے لئے چھوڑ دیتا ہے ٭

اشتراکیت کے تخیل کا ابتدائی نقطہ یہ ہے - لیکن ہم کو اس
کے اندر کی حقیقت اس سے زیادہ وضاحت سے سمجھ لینی چاہئے ٭

اشتراکیت کا بنیادی تخیل یہ ہے - کہ فرد کو جماعت کے
مفاد کے لئے قربان کر دیا جائے - اس پہلو سے یہ انفرادیت اور
اقتصادی آزادی کے تخیل سے ٹکراتی ہے - "انفرادیت" فرد کے
شرف اور اس کی شخصیت کے قیام وحفاظت کی علمبردار ہے - اور
یہ چیز صحیح طور پر اسی وقت تک محفوظ رہ سکتی ہے - جب تک
اقتصادی آزادی جو نظام اجتماعی کی اساس اور انفرادی جدوجہد
کا اصلی سرچشمہ ہے - قائم رہ سکے - انفرادیت حکومت کو اس زحمت
میں مبتلا نہیں کرتی - کہ وہ افراد کی خوش بختی و بدبختی کی کلی طور پر ذمہ دار
ہو جائے - بلکہ یہ چاہتی ہے - کہ حکومت ایسی ضمانتیں مہیا کر دے
کہ افراد اپنے دائرہ کے اندر زیادہ سے زیادہ آزادی کے
ساتھ اپنے کاموں میں مشغول رہ سکیں - یہ چاہنے کی علت محض یہ
نہیں ہے - کہ وہ فرد کی آزادی اور اس کے مفاد خود غرضانہ کو
زیادہ سے زیادہ محفوظ دیکھنے کی خواہشمند ہے - بلکہ اس کی اصلی
وجہ یہ ہے - کہ اس کے نزدیک ہیئت اجتماعیہ کی تمام کامیابی درحقیقت
افراد کی کامیابی پر منحصر ہے - بس اس بنا پر کوئی وجہ نہیں ہے کہ
ہیئت اجتماعیہ کو ترجیح دے کر افراد کو اس کی قربان گاہ پر
نذر چڑھا دیا جائے - بلکہ انصاف یہ ہے - کہ ایک اعتدال کے ساتھ
دونوں کو نشوونما دینے اور بڑھانے کی کوشش کی جائے - کیونکہ ایک
کی ترقی دوسرے کی ترقی اور ایک کی بربادی دوسرے کی بربادی
ہے - اشتراکیت یا اجتماعیت (ان دونوں میں سے جو نام بھی موزوں
سمجھا جائے) حکومت یا بادشاہ کی امداد وحمایت پر بھروسا نہیں
کرنا چاہتی - یہ اپنی حفاظت اور اپنی طاقت دونوں ایک زبردست
اجتماعی تغیر کے ذریعے حاصل کرنا چاہتی ہے - اس اجتماعی تغیر کے
بہت سے طبعی، اقتصادی اور نفسیاتی عناصر ہیں - جن پر بحث کرنے

کی یہاں گنجائش نہیں ہے - شاید ہم آگے اس پر کچھ روشنی ڈال سکیں - یہاں اشتراکیت کا نقطۂ نظر سمجھنے کے لئے بالا جمال اُن کا یہ خیال سامنے رکھنا چاہئے - کہ وہ کہتے ہیں - کہ سوسائٹی کا ہر نظام لازماً بدلتا رہتا ہے - اور اس تبدیلی کا بہت کچھ تعلق سوسائٹی کی عقلی جد و جہد اور اجتماعی علوم کی ترقی اور ان کی عملی تطبیق سے ہے - پس جس رفتار سے یہ علوم ترقی کرتے جائیں گے - اور زندگی عملاً اُس کے سانچے میں ڈھلتی جائیگی - اسی رفتار سے زندگی کے تمام وصفی قوانین اور اُن کے تمام معروف ضوابط بدلتے جائیں گے - یہاں تک کہ عقل اجتماعی ترقی کے آخری زینہ پر قدم رکھ دیگی - اور اس وقت زندگی کے مختلف نظاموں میں سے صرف وہ نظام باقی رہ سکیگا - جو "انسب" (The Fittest) ہوگا - اور ظاہر ہے کہ وہ انسب نظام یہ موجودہ نظام نہیں ہو سکتا - جس نے دُنیا کے بہت بڑے حصّہ کو صرف مُٹھی بھر سرمایہ داروں کا غلام بنا رکھا ہے یہ نظام بالکل فاسد ہے - زندگی کی فطری وضع اس کو ہرگز قبول نہیں کر سکتی - ضروری ہے کہ یہ بدل جائے - کیونکہ یہ حق اور مساوات کے بالکل منافی ہے ٭ (کلیم)

زندہ اور فطری زبان

ایک دھوکا - زبان کے بارے میں اعتدال سے دور جا پڑنے کا سبب وہ مغالطہ ہے - جو ہندی خوانوں اور اُردو خوانوں کے اعداد و شمار سے پیدا ہو گیا ہے - لوگوں نے اس بات کو ذرا دیر سے سمجھا - کہ زبان کے مسئلہ میں اکثریت اور اقلیت بے اثر چیزیں ہیں - اور اوٹ شماری سے اگر ایک جانب ۹۹ اور دوسری جانب ایک نسبت ہو - جب بھی ننانوے زبان کی قدرتی شکل کو مسخ نہیں کر سکتے - ہم دیکھتے ہیں - کہ ہمارے صوبے کے ۶۰ فی صدی مصنف اپنی تحریروں میں فارسی و عربی لفظوں سے پرہیز کر رہے ہیں - مگر جب وہ لکھنے بیٹھتے ہیں - تو کہیں قلم سے "تاکہ" نکل جاتا ہے کہیں - "تاہم" "مگر" "اگر" کا شمار نہیں - بیچارہ کانٹا چھانٹتا ہے پُرانے دفینے سے پرنتو، کنتو، اتھوا نکالا جاتا ہے -

لفظوں کی جیتی جاگتی زندہ دل سپاہ کے ساتھ ڈیڑھ ہزار برس کے گڑے ہوئے مُردے لا کھڑے کئے جاتے ہیں - اس طرح شدھ ہندی کی صورت وجود میں آتی ہے - پھر بھی ہندی کے والنٹروں کو حکم ہوتا ہے - کہ ایک ساتھ مل کر پکار آؤ - کہ "ہندی جیوت بھاشا ہے -" مگر سامنے انقلاب زندہ باد کے نعرے بلند ہو کر ان بلند بانگ دعووں کی پُول کھول دیتے ہیں -

لطیفہ - اس موقع پر میں اپنے ایک شدھ ہندی نویس دوست کا ذکر کرنا چاہتا ہوں - آدمی ملنسار ہیں - اور وطنی جذبات سے پُر - ایک روز میں ان سے ملنے گیا - از راہِ محبّت فرمانے لگے میں نے اپنے چچا کو ایک پتر لکھا ہے - آپ کو سُناؤں - اس خط میں شدھ ہندی کو نہایت مستعدی سے نباہا گیا تھا - مجھ کو خط پڑھ کر سُناتے جاتے تھے - اور فرماتے جاتے تھے - مولوی صاحب آپ ہندی کم جانتے ہیں - سمالوچنا کی درشٹ (تنقیدی نظر) سے دیکھئیگا ایک جگہ غریب سے لغزش ہو گئی تھی - "لیکن" لکھ گیا تھا - اس جگہ پر پہنچتے ہوئے بولے - ارے رام رے - "لیکن" نہیں کنتو ہونا چاہیئے - میں ہنس پڑا اور کہا - لیکن سے ہرج کیا ہے - میرے دوست نے فرمایا کہ شدھ ہندی کے مریادا (خالص ہندی کے منصب عزت) سے یہ لیکھ گر جائیگا -

ہمارے ہندی کے ودوانوں کا یہ مت ہے - کہ جو شبد ہماری سنسکرت بھاشا میں ہیں - اُن کے بدلے آنیہ بھاشا (غیر زبان) کے شبدوں کا پریوگ اُچت (مناسب) نہیں - یہ خیالات شخصی نہیں - عام ہو چکے ہیں - انہیں خیالات نے ہندی کی اصلی صورت کو مسخ کیا ہے - اُردو سے جو دُوری برتی جا رہی ہے - وہ کسی لسانی ضرورت پر نہیں ہے -

اس قدر ہوشیاری اور مستعدی کے باوجود بھی بسا اوقات اصلی زبان سے گریز مشکل ہو جاتی ہے - جس طرح ہندوستان میں رہ کر انگلینڈ کی ہوا میں سانس لینا ناممکن ہے - اُسی طرح دورِ موجودہ میں زبانِ قدیم کا مُلکی اور قومی بننا غیر ممکن ہے - اب وہ دن قریب ہیں - کہ دماغوں سے یہ غلط فہمی دُور ہو جائے - بدیسی چیزوں کی طرح فارسی عربی کے وہ الفاظ بھی جو مدت سے تحریر و تقریر میں آتے رہنے سے ہندوستانی زبان و ادب کا زیور بن چکے ہیں - غیر ہندوستانی قرار پا کر خارج کرنے کے قابل نہیں - ان حضرات کو سمجھنا چاہیئے - بدیشی اشیا کا بائیکاٹ ہماری ملکی تجارت کے فروغ کا باعث اور بدیسی الفاظ کا اخراج اس کے برعکس زبان کے سرمائے کو گھٹا کر اس کا گلا گھونٹنے والی سکیم ہے - ان حضرات کی

خدمت میں مسٹر بسمبھر لال کی مندرجۂ ذیل روشن رائے پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

"ہماری غلطیاں یا باہر والوں کی خود غرضانہ دست اندازیوں سے ترقی کی۔ یہ باڑھ ماری گئی۔ لیکن اس تحریک کے اثرات ہماری زندگی میں اتنی گہرائی تک پیوست ہو چکے ہیں۔ کہ اُنہیں باہر نکالنے کی کوشش خودکشی کے مصداق ہے۔ کون سمجھدار ہندو گلاب کو باغ سے اس لئے نکال پھینکیگا۔ کہ وہ ایران سے آیا ہے۔ یا روٹی کھانا بند کر دیگا۔ کیونکہ اس کی زبان میں اس کے لئے کوئی لفظ نہیں ہے۔ ہماری پوشاک کا نصف بہتر حصّہ مسلمانوں کی دین ہے۔ شمالی ہند میں ہر ہندو شادی کے وقت نوشہ بنتا ہے۔ اور اس کی شادی سہرے اور جامے کے بغیر پوری نہیں ہوتی۔ ہماری بہنوں کے بہت سے زیور، ہمارے کل پُرزے یہاں تک کہ چارپائی اور بستر اور رشتہ داروں کے القاب، رنگ و روغن، بہیوں کے کاغذات، میوے اور مٹھائیاں غرض ہر کہیں اسلامی تہذیب کا نقش موجود ہے۔ کاغذ، قلم، دوات، سیاہی اور عینک کے بغیر ہمارے مصنّفوں کا کام ایک دن بھی نہیں چل سکتا۔"

(اُردو ہندی کا قضیہ از بشمبھر ناتھ بحوالہ اُردو اپریل نمبر ۳۷ء)

پس برادرانِ وطن! فارسی عربی کے الفاظ ہندوستانی کے لئے غیر ملکی نہیں۔ اور نہ باعثِ ننگ ہیں۔ وہ ہماری زبان کے لئے سرمایۂ ناز ہیں۔ ان انمول رتنوں سے زبان کے خزانے کو پُر کرنے کی بجائے ادب ہندی کے تاج میں جڑ کر اسے جگمگانے کی بجائے تم اسے نکال کر پھینک رہے ہو۔ یقیناً یہ تنگ نظری نہیں بیہوشی ہے وطنیت کے علم برداروں سے ہرگز یہ توقع نہیں کی جا سکتی تعصب تصویر کا ایک ہی رُخ دکھلاتا ہے۔ فارسی عربی لفظوں کا محض بدیسی ہونا یاد رہ گیا۔ باقی خوبیاں (چلن، رواج، لوچ، گھلاوٹ، شیرینی، بانکپن، تیکھاپن وغیرہ) سب بھُول گئیں۔ یا نظر انداز کر دی گئیں۔

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا۔ وہ ادبی زبان کی اس شق کے متعلق تھا۔ کہ اُردو ہندی کا ذخیرہ الفاظ کس قسم کا ہے۔ اور ذخیرہ الفاظ کی بنا پر دونوں میں فرق کیا ہے۔ ہم نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی۔ کہ ہندی ادبی زبان میں سوائے اس کے اور کوئی معیار نہیں۔ کہ ایسی زبان لکھی جائے۔ جو اُردو سے تمیز پا سکے۔ کہیں کہیں تو پُورے پیرے گراف میں سنسکرت آمیز چھٹا (بہار) ہے۔ تو کہیں "سادہ شُستہ اور دل نشین پیرایہ بیان"، کہیں دونوں کی گنگا جمنی شان سے مشترت ہندی وجود میں آجاتی ہے۔ اگر ہماری ذہنیت تفرقہ اور تمیز کی طلبگار نہ ہو۔ تو سہ رنگی کی جگہ یک رنگی نظر آئے نیچے ایک پیرے گراف رسالہ مادھوری سے نقل کر کے اس ذہنیت کو میں اور صاف کرنا چاہتا ہوں:-

زمین کی چھوٹی چھوٹی مالکیت کے سمبندھ میں کمیشن کا کہنا ہے۔ کہ اس سے پیداوار کو نقصان پہنچتا ہے۔ ہندو اور مسلمان دونوں میں پترک سمپت سبھی پتروں کو برابر ملتی ہے۔ پر اس رہتے ہی ہو ہی کیا سکتا ہے۔ بدیہہ کاری منڈل دوارا کھیتی کرنے سے اس اثر کو دُور کیا جا سکتا ہے۔ پنجاب کے کاری منڈل نے آشاتیت اُنت کی ہے۔ پرمدھیہ دیس میں قانون دوارا یہ ترٹ دُور کی گئی ہے۔ مادھوری کھنڈ ۱ سنکھیا ۲ (مارگ شیرش ناتھ)	زمین کی چھوٹی ملکیت کے بارے میں کمیشن کا بیان ہے۔ کہ اس سے پیداوار کو نقصان پہنچتا ہے۔ ہندو اور مسلمان دونوں میں موروثی جائداد سب ہی بیٹوں کو برابر ملتی ہے۔ پر اس بارے میں ہو ہی کیا سکتا ہے۔ البتہ کو اپریٹو سوسائٹی کے ذریعے کھیتی کرنے سے نقص کو دُور کیا جا سکتا ہے۔ پنجاب کو آپریٹو سوسائٹی نے اُمید سے بڑھ کر ترقی کی ہے لیکن مدھ دیس میں قانون کے ذریعے اس نُقص کو دُور کیا گیا ہے۔

زبان کے نیچرل انداز میں ہر لفظ برمحل آتا ہے۔ یہ الفاظ اپنی جگہوں میں اس طریقے سے جمے ہوئے ہیں۔ کہ ان کو نکال کر دوسرا لفظ رکھا جائے۔ تو بدلا ہُوا لفظ اَن فٹ ہونے کے سبب فوراً چغلی کھاتا ہے۔ اُوپر کے دو نمونے اس حقیقت کی توضیح کرتے ہیں۔ کالم ۲ میں زبان کا سیدھا سادہ غیر مصنوعی انداز ہے۔ جس میں ملکیت، زمین، کمیشن، بارے، بیان، نقص، البتہ، کو آپریٹو سوسائٹی، ذریعہ، امید، قانون کے عام فہم اور برمحل الفاظ آئے ہیں۔ کالم ۱ میں زمین قانون اور پیداوار کمیشن کو صحیح سلامت چھوڑ کر تمام الفاظ کے بدلے سنسکرت الفاظ سے پُر زور کیا گیا ہے۔ 'ملکیت' کو 'مالکیت' کی صورت میں مسخ کیا گیا ہے۔ اُردو سے تمیز دلانے والی ذہنیت کے سوا اس 'شُدھی' کا سبب کیا ہو سکتا ہے ملزم کا بیان، سرکاری وکیل کا بیان، خفیہ پولیس کا بیان، کلکٹر کا بیان، رام کا بیان، رحیم کا بیان،